مالک حقیقی این کتاب اللہ جل شانہ

کلیات میر

بترتیب جدید

مع مقدمہ و فرہنگ

فہرست مضامین

کلیات میر تقی میر

فہرست مضامین کلیاتِ میر تقی میر

مقدمہ
کلیاتِ میر

از مصنّف دردمولوی عبدالباری صاحب آسی

شجرۂ خاندانِ میر

- جدکلاں
  - جد
    - پسرکلاں فاترالعقل
    - محمد علی
      - زوجۂ اولیٰ
        - محمد حسن
        - محمد محسن
      - زوجۂ ثانیہ
        - محمد تقی
          - عسکری
          - فیض علی
          - دختر
        - محمد رضی
        - دختر
          - محمد حسین کلیم

میر صاحب کے پر دادا مع اپنے قبیلہ کے حجاز سے ہندوستان پہونچے اور میر صاحب کے خود نوشتہ تذکرہ ذکر میر کے مطابق پہلے دکن میں ٹھہرے اور پھر کچھ مجبوریوں کی وجہ سے احمد آباد گجرات میں آکر مقیم ہوئے۔ مگر آب ودانہ کی کشش وہاں سے اکبرآباد لے آئی اور اسی سرزمین میں پیوند خاک ہوئے ان کے دادا اکبرآباد میں فوجدار مقرر ہوئے اور پچاس برس کے سن میں وہ بھی رہنورد فنا ہوئے۔ دو لڑکے ان سے یادگار رہے ایک کو خلل دماغ تھا۔ جن کو جوانا مرگی نصیب ہوئی لہٰذا ان کا ذکر قابلِ حذف ہے۔ دوسرے میر صاحب کے والد جن کا نام محمد علی۔ یا عبداللہ تھا۔ اور علی متقی ان کے پیر کا بخشا ہوا لقب تھا۔

سیادتِ میر اُردو کے تذکرہ نویسوں میں میر صاحب کی سیادت کے متعلق اختلافات چلے آتے ہیں لہٰذا اُس پر جسٹس سرشاہ محمد سلیمان صاحب بالقابہ نے جو کچھ بحث وتحمیص فرمائی ہے میں اُسی کو

نقل کیے دیتا ہوں۔ اہل نظر اس سے نتیجہ نکال سکیں گے۔

"ان کے نسب کے متعلق آزاد نے لکھا ہے کہ یہ شرفائے اکبرآباد سے تھے۔ اپنے کو سید کہتے تھے لیکن اُن کے زمانے میں کچھ لوگ اس دعوے پر حرف زن تھے۔ تذکرہ شورش میں ہے کہ خطاب سیادت اُن کو شاعری کی درگاہ سے عطا ہوا۔ اور آبحیات میں آزاد نے لکھا ہے کہ چند کہن سال بزرگوں سے سُنا گیا کہ میر کے والد نے اُن کو متنبہ کیا تھا کہ میر تخلص کرنے سے سید بنجائیں گے۔ اسکے بعد سودا کا ایک شعر آزاد نے نقل کیا ہے جو کلیات میں نہیں پایا جاتا اور وہ میر کی شرافت کی ہجو میں ہے۔

ؔ بیٹھے تنور طبع کو جب گرم کر کے میر
کچھ شیرمال سامنے کچھ نان کچھ پنیر

سودا کا ایک دوسرا شعر جو مشہور ہے اور جس میں میر ہی کے خاندان کی طرف اشارہ ہے یہ ہے۔ؔ

میری کے اب تو سارے مستعد صالح ہیں
بیٹا تو گندنا بنا اور آپ کو تھمیر

بلا کسی شہرت یا بنیاد کے ذات پر حملہ کرنا ایک تعجب خیز بات تھی۔ زمانہ حال کے تمام نکتہ چین آزاد کے اس شبہ کرنے پر مضحکہ کرتے ہیں اور دلیل میں یہ پیش کرتے ہیں کہ میر ہمیشہ اپنے کو سید کہتے تھے اور ذکر میر میں بھی اپنے کو میر لکھا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا لقب میر مشہور تھا۔ لکھنؤ میں ان کو سب سید یقین کرتے تھے اور خود میر نے اپنے کو برابر سید لکھا ہے۔

ؔ پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

لیکن مطبوعہ ذکر میر میں بھی میر نے اپنے کو سوائے میر تقی لکھنے کے صاف طور پر سید ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ اپنے دادا یا پردادا کا نام ظاہر نہیں کیا ہے۔ اپنے والد کو بھی سید نہیں لکھا ہے۔ اور نہ اپنے بھائیوں میں سے کسی کو میر یا سید کے لقب سے یاد کیا ہے۔ بخلاف اس کے غیروں کو مثلاً امان اللہ، کمل خاں اور سعادت علی خاں کو سید لکھا ہے۔ البتہ مولوی مسعود حسن رضوی کے نسخے میں حقیقت حال مصنف کے زیر عنوان اپنے متعلق یہ لکھا ہے کہ "کمینہ فقیر و شاعر و متوکل دانستہ بطریق در چیزے می فرستد۔ مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمہ[1] میں یہ لکھا ہے کہ میر صاحب نے ذکر میر میں ہر مقام پر اپنے والد کے نام کے ساتھ میر کا لفظ لکھا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ میر صاحب اپنے والد کو ہر جگہ میر علی متقی لکھتے ہیں اسی سے مولوی محمد عسکری نے بھی نقل کیا ہے لیکن ایسا لکھنا نہایت تعجب خیز ہے

[1] مقدمہ ذکر میر ۲

کلیاتِ میر کلیاتِ میر

کیونکہ ذکر میر میں برابر اپنے والد کو علی متقی - یا درویش یا عزیز مردہ کہکر حوالہ دیا گیا ہے۔ کسی جگہ میر علی متقی مجھے نہیں ملا۔ صرف ایک[1] جگہ میر محمد علی درج ہے۔ حقیقت میں علی متقی جب ان کا لقب تھا تو اسکے پہلے میر لکھنا ہرگز موزوں نہ ہوتا۔ نہ کوئی درویش صفت بزرگ خود اپنے کو ایسا کہلانا پسند کرتا۔ البتہ مضامین کے عنوان جو چھپے ہیں اُن میں میر علی متقی لکھا ہے۔ مگر مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمہ میں خود تسلیم کیا ہے کہ یہ عنوان اصل میں موجود نہیں ہے اور وہ خود ان کے اضافہ کیے ہوئے ہیں۔ مولوی مسعود حسن رضوی کے نسخہ میں بھی اس قسم کے عنوان موجود نہیں ہیں - اور نہ مولوی محمد شفیع کے نسخے میں ہیں -

دوسرا دعوی دونوں صاحبوں نے یہ کیا ہے کہ اس کتاب میں میر نے اپنے والد کی زبانی اپنا نام میر محمد تقی لکھا ہے - اوّل تو اُن کے والد کی زبانی اسطرح پر خطاب کیا جانا مجھے نہیں ملا۔ دوم یہ کہ اگر ہو بھی تو تعجب خیز بات ہوگی کہ ایک صوفی منش درویش اپنے دس سال کے بیٹے کو میر محمد تقی کہہ کر پکارے - یہ صحیح ہے کہ میر نے اپنے کو اور دوسروں کی زبانی بھی میر محمد تقی لکھا ہے - مگر واضح رہے کہ یہ کتاب اُنھوں نے ساٹھ سال کی عمر میں لکھی تھی جب وہ خود میر مشہور تھے - نہ تو وہ اقوال جو اُنھوں نے اپنے والد یا سید امان اللہ کے نقل کیے ہیں لفظ بہ لفظ اصلی ہوسکتے ہیں - نہ اس کی اُمید کی جاسکتی ہے کہ دس سال کی عمر میں جو کچھ اُنھوں نے کانوں سے سُنا اسے بجنسہٖ بعد کو قلمبند کیا - جب تخلص میر تھا تو میر صاحب مشہور ہوجانا مشکل نہ تھا - اور اگر حقیقت میں وہ سید نہ تھے اور سید بن بیٹھے تو ذکر میر میں اپنے کو میر لکھنا بھی کوئی غیر قابل قیاس بات نہیں ہوسکتی - لیکن اگر ذکر میر میں جیسا لکھا ہے صحیح ہے کہ میر دس سال کے تھے جب اُنکے والد نے انتقال کیا تو یہ قصہ کہ اُن کے والد نے ان کو متنبہ کیا تھا کہ میر تخلص کرنے سے سید بنجاؤ گے ناقابل یقین ہوگا تحقیق صرف یہاں تک ہے کہ میر اپنے کو سیّد ضرور کہتے تھے اور سیّد مشہور تھے اسی کے ساتھ کچھ لوگوں نے ہجو میں اُن کی سیادت پر شبہ کیا - اب اتنے زمانے کے بعد کہ درحقیقت میر سید تھے یا جیسا اکثر لوگوں نے اس زمانے میں کہا سید بن بیٹھے تھے مشکل ہے "

مندرجۂ بالا خیالات اور فیصلوں سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مضمون نگار کو مولانا آزاد کے خیال یا اُن کی بیان کی ہوئی روایت سے کہ میر صاحب سید نہ تھے ایک حد تک اتفاق ہے پھر بھی مولانا آزاد ہی کا یہ جملہ کہ سیادت میں شبہ نہ کرنا چاہیئے - اگر وہ سید نہ ہوتے تو خود کیوں کہتے - اُن کے پہلے خیالات کی تردید کے لیے بہت کافی ہے - اس پر میر صاحب کا

[1] ذکر میر صفحہ ۔

بار بار اپنے آپ کو سید بتانا۔

اے غیر میر تجھ کو گر جوتیاں نہ مارے
سید نہ ہووے پھر تو کوئی چمار ہووے

کب اقتدا ہو مجھ سے کسی کی سوائے میر
بندہ ہوں دل سے میں اُسی سیّد امام کا

سیّد ہیں میر صاحب درویش دردمند
سر رکھیے اُنکے پاؤں پہ جائے ادب ہے یہ

دخیل ذات نہیں عشق میں کہ میر کو بھی
ذلیل کیسے ہیں اُن کی ہے گو کہ ذات بڑی

غیرت سے تنگ آئے غیروں سے لڑ مرینگے
آگے بھی میر سید کرتے گئے ہیں ساکا

در پہ سے تیرے اب کے جاؤں گا تو جاؤں گا
یاں پھر اگر آؤں گا سیّد نہ کہاؤں گا

منکر نہیں ہے کوئی سیادت کا میر کی
ذاتِ مقدس اُن کی یہی ذات ہو تو ہو

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

(معاملاتِ عشق) جانتے تھے کہ ہے یہ دلدادہ
سیدِ خستہ خاک اُفتادہ

(در ہجو نااہل) رکھتی ہے میری شرافت اشتہار
گو یہ نا سید کہے ہے کیا چمار

(مختار سلطنت کی زبانی) تم بنی فاطمہ ہو ہم ہیں غلام
ہے غلامی تمھاری اپنا کام

اتنی شہادتوں کے علاوہ یہ شہادت بھی ہے کہ جب خواجہ محمد باسط نے ان کو نواب امیر الامرا صمصام الدولہ کے سامنے بغرض ملازمت پیش کیا تو انھوں نے سوال کیا کہ "این پسر از کیست" اس پر اُنھوں نے جواب دیا کہ "از میر محمد علی است"۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود ہمارے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے اگر کہنے والا کہدے کہ میر صاحب سیادت کے مدعی تھے اور یہ سب باتیں میر صاحب ہی کی بیان کی ہوئی ہیں ان پر اعتماد کیا ہو سکتا ہے۔

مگر ہاں اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ میر صاحب کے والد بزرگوار اُس وقت کے ایسے باکمال بزرگوں میں تھے کہ اُن کے ملنے اور اُن کی دست بوسی کرنے کے بڑے بڑے لوگ آرزومند رہتے تھے۔ اُن کے کمال روحانی کے متعلق میر صاحب نے اپنے تذکرہ ذکر میر میں کئی حکایتیں بیان کی ہیں۔ جن کا یہاں ذکر کرنا تطویل کا باعث ہوگا۔ مگر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وہ شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی کے مرید تھے۔ اور بیرونِ شہر متصل عیدگاہ سکونت گزین تھے۔

ولادت میر | اسوقت تک میر صاحب کی سوانحعمری کے متعلق جتنے مضمون نکلے ہیں اُن میں ناسخ مرحوم کے اس مصرع تاریخ سے ؎ واویلا مُرد شہ شاعراں + تاریخ وفات ۱۲۲۵ھ

مطابق ۱۸۱۰ء قرار پائی ہے اور یہ صحیح بھی ہے۔ مگر اُن کے سنہ ولادت میں بڑے اختلافات ہیں اور ان میں بہت سے قیاسات سے کام لیا گیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی عمر اور اُنکی مدت حیات واقعی طور پر معلوم نہیں ہو سکی۔ مولانا آزاد مرحوم نے سو برس جس کے رو سے ۱۱۲۵ھ میں اور تذکرۂ جہاں میں اسّی برس عمر بتائی ہے جسکے رو سے ۱۱۴۵ھ میں ولادت قرار پاتی ہے۔ اسی طرح مصحفی نے اپنا تذکرہ جو ۱۲۰۹ھ میں لکھا ہے اُن کی عمر اسّی سے متجاوز بتائی ہے۔ اگر بارہ سو نو (۱۲۰۹) سے اسّی (۸۰) نکال دیں تو ۱۱۲۹ھ سنہ ولادت مانا جا سکتا ہے مگر ان سب پر جب ناقدانہ نگاہیں پڑی ہیں تو قیاس صحت اور اصلیت سے زیادہ قریب ہو گیا ہے چنانچہ مولوی عبدالحق نے روایت و درایت کو ملاتے ہوئے ۱۱۳۷ھ سنہ ولادت قرار دیا ہے مگر اس پر بھی تنقید کی گئی اور سر شاہ سلیمان صاحب نے ۱۱۳۶ھ کو صحیح مانا ہے۔ مگر اب کہ واقعات صحیح طور پر معلوم ہو گئے ہیں ان قیاس آرائیوں کی ضرورت نہیں۔ جیساکہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

عالی جناب راجہ صاحب محمود آباد دام اقبالہ کی لائبریری میں میر صاحب کے ایک دیوان چہارم کا قلمی نسخہ موجود ہے جسکی خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) یہ دیوان خود میر صاحب مغفور و مرحوم نے اپنے شاگرد محمد محسن المخاطب بہ زین الدین احمد کو اپنے ہاتھ سے عنایت فرمایا۔

(۲) یہ دیوان میر حسن علی تجلی داماد میر مغفور کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ جو غالباً میر صاحب کے ایما سے لکھا گیا۔ اور جسے میر صاحب نے دیکھا کیونکہ وہ اُن کے پاس نہ ہوتا تو وہ محمد محسن کو کیونکر دیتے۔

(۳) اس دیوان پر میر صاحب کے کچھ سوانح حیات ہیں جن سے بہت سی ایسی باتوں پر روشنی پڑتی ہے جو اب تک تذکرہ نویسوں کی نظر سے مخفی تھیں۔

(۴) اس پر بعض شاہانِ اودھ کی مہریں ہیں جن سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ شاہی کتب خانوں کی زینت رہ چکا ہے۔

(۵) اس دیوان میں کچھ غزلیں زیادہ ہیں۔ اور ایک مثنوی بھی ہے جو اب تک کسی دوسرے دیوان میں نظر نہیں آئی۔

اس دیوان کے ٹائیٹل کے صفحہ پر جو سادہ ہے محمد محسن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ

عبارت موجود ہے۔

"بروز جمعہ بستم شعبان المکرم وقت شام سنہ ۱۲۲۵ھ یکہزار و دوصد و بست و پنج ہجری بود کہ میر محمد تقی صاحب میرؔ تخلص صاحب این دیوانِ چہارم در شہر لکھنؤ در محلۂ سٹھہٹی بعد طے نہ عشرۂ عمر بجوار رحمت ایزدی پیوستند۔ و بروز شنبہ بست و یکم ماہ مذکور سنہ الیہ وقت دوپہر در اکھاڑۂ بھیم کہ قبرستان مشہور است نزد قبور اقربائے خویش مدفون شدند و چہار دیوانِ خود را کہ این دیوانِ چہارم ہم ازانجملہ است بہ محررِ سطور محمد محسن المخاطب بہ زین الدین احمد تجاوز اللہ عن سیاٰتہ در حین حیاتِ خویش بکمال رغبت بحل کردہ بخشیدند۔ خدایش بیامرزاد۔"

تاریخ وفات نثر میں لکھکر دو قطعۂ تاریخ نظم بھی درج کر دیے ہیں جو ذیل میں درج ہیں۔

قطعۂ تاریخ نمبر ۱

محمد تقی میرؔ شاعر کہ بود مسلّم ورا تخت و تاجِ سخن
باقلیم معنی ز اربابِ شعر ستانندہ او بود باجِ سخن
ز مرگش چو بے نور شد شعر سال نوشتم بمردہ سراجِ سخن

سنہ ۱۲۲۵ھ

تخرجہ (۲)

میر تقی استادِ فنِ شعر مرد وزد دنیا سوئے عدم شد
گشت چو اشعارش ہمہ بے سر میر تقی استاد رقم [illegible]

سنہ ۱۲۲۶ھ

بارہ سو چھبیس ہیں پہلے مصرع کے اشارے گشت چو اشعارش ہمہ بے سر کے مطابق اشعار کا الف نکالنے سے سنہ ۱۲۲۵ھ رہجاتے ہیں۔ اس نسخہ کے ایک صفحہ پر نوادر الکملا کی عبارت بھی درج ہے جو آگے چلکر حسب ضرورت نقل کی جائے گی مگر فی الحال سنہ ولادت کے تعین کے جھگڑے کو صاف کر دینا ہے کہ اس عبارت کے دیکھنے کے بعد ہم کو کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ میر صاحب نے ۹۰ برس کی عمر پائی اور سنہ ۱۲۲۵ھ میں سے جب نوّے منہا کر دیجیے تو سنہ ۱۱۳۵ھ باقی رہتے اور یہی سنہ ولادت ہے۔ اور اسی کی ایک دوسری عبارت

سے بھی تائید ہوتی ہے جو اس کتاب کے ایک دوسرے صفحہ پر نوادر الکملا سے نقل کی گئی ہے" کہ
در اواخر یک ہزار و یک صد و سی و پنج ہجری ولادت واقع شدہ"

تربیت میر | میر صاحب نے اپنی تعلیم و تربیت کے متعلق کوئی تفصیلی اور واضح بیان نہیں دیا
مگر کچھ واقعات ہیں جن سے پتہ چل جاتا ہے۔ ان کو ذرا پھیلا کر لکھنے کی ضرورت ہے۔

ہم اپنے مضمون میں بیان کر چکے ہیں کہ میر صاحب کے والد ایک باکمال صوفی تھے جن سے اکثر خرق عادات کی سی باتیں بھی سرزد ہوتی تھیں۔ چنانچہ ان واقعوں میں سے ایک واقعہ یہ بھی ہے۔

ایک مرتبہ میر صاحب کے والد گھر میں مضطرب و سراسیمہ سے آئے۔ بڑھیا ماما سے کہا کہ کچھ کھانے کی چیز گھر میں ہو تو لاؤ۔ وہ بولی کہ گھر میں تو کوئی سامان نہیں ہے۔ بازار جاتی ہوں وہاں سے سودا سلف لاؤں تو کچھ پکاؤں۔ بڑھیا کچھ آٹا دال وغیرہ لے کر لپٹی تو انھوں نے کھانے کے تیار کرنے کے لیے جلدی مچائی۔ بڑھیا بگڑ کر بولی کہ صاحب فقیر ہو تو فقیری کے انداز سیکھو صبر کرو۔ درویشی کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ بڑھیا کا کہنا تیر کا کام کر گیا اُس سے تو کچھ نہ کہا۔ لیکن اُٹھے آنسوؤں سے بھیگا ہوا رومال اُٹھایا۔ اور چلنے لگے۔ ماما بیچاری ڈر گئی۔ دوڑ کے ان سے لپٹ گئی۔ اور پوچھا کہاں چلے۔ بیٹھو۔ انھوں نے جواب دیا۔ کچھ حرج نہیں۔ تم میرے لیے کھانا پکاؤ میں ذرا لاہور میں ایک درویش سے مل آؤں ابھی واپس آتا ہوں بڑھیا نے بہتیرا سمجھایا بجھایا مگر وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا اب کیا ہو سکتا تھا۔ مجبور چپ ہو رہی اور یہ چل کھڑے ہوئے۔ نہ پاس ساز و سامان۔ نہ زاد راہ۔ نہ روپیہ نہ پیسہ۔ مگر توکل بر اللہ اکثر لاہور پہونچ ہی گئے جس درویش کی ملاقات کا شوق کھینچ کر لے گیا تھا۔ اُس سے دریائے راوی کے کنارے پر ملاقات ہوئی۔ اور اُس سے کچھ صحبت برآر نہ ہوئی تو یہ پلٹ کر دلّی آئے یہاں آ کر میر قمر الدین منت خلف میر عبدالرشید عزّت کے یہاں فروکش ہو گئے۔ یہ زائرین اور معتقدین کے ہجوم کو برداشت نہ کر سکے راتوں رات دلّی سے چل کھڑے ہو گئے۔ اور دو تین روز کے سفر کے بعد بیانہ پہونچے۔ یہاں ایک نوجوان سید زادے پر اُن کی جاذبانہ نگاہ نے ایسا اثر ڈالا کہ وہ آسیب زدوں کی طرح بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ لوگوں نے یہ حالت دیکھی تو ان کی منت سماجت کی کہ اس پر مہربانی فرمائیے۔ انھیں بھی کچھ رحم آ گیا۔ تھوڑا سا پانی لیا۔ اس پر کچھ پڑھ کر دم کیا۔ اس میں سے کچھ منھ پہ چھڑکا کچھ پلایا۔ جوان کو ہوش آیا تو مؤدبانہ سامنے

بیٹھ گیا۔ اور پھر لجاجت کے ساتھ التجا کی کہ چند روز غریب خانے پر قیام فرمائیے۔ اُنھوں نے یہ سنکر منظور کر لیا کہ خیر۔ مگر میں مستعد سفر ہوں۔ لوگوں نے کہا کہ جسوقت جو مرضی مبارک ہوگی اُس پر عمل کیا جائے گا۔ بس اتنا ہے کہ چلیے کچھ ماحضر نوش فرمائیے اور عزت بڑھائیے۔ اُنھوں نے پھر کہا کہ ہم لوگ کبھی کسی سے خوش ہیں کبھی ناخوش ہم سے کوئی متعرض نہ ہو۔

بگفت احوالِ ما برقِ جہان ست — دمے پیدا و دیگر دم نہان ست
گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینیم — گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینیم

سب نے یکزبان ہوکر عرض کیا کہ آپ کیا فرماتے ہیں ہم سب خادم ہیں کبھی ایسا نہ ہوگا۔ غرضکہ عہد لیکر وہاں سے گئے۔ اتفاق کی بات کہ اسی روز اس نوجوان کی شادی تھی۔ لوگوں نے ان سے بھی شرکت شادی کی درخواست کی اُنھوں نے کہا فقیر کو ان جھگڑوں سے کیا مطلب۔ بعدہ نوجوان سے کچھ تجرد اور ترک ماسوا کی باتیں کیں۔ اُدھر برات گئی۔ اور ادھر یہ رخصت ہوکر اکبرآباد آپہونچے۔ یہ تو چلے ہی آئے۔ مگر اُدھر جب برات واپس آئی تو دولھا کو ان کے چلے جانے کا حال معلوم ہوا۔ دنیا نگاہوں میں تیرہ و تار ہو گئی۔ دل طپاں۔ جذب حقیقی دامن کشاں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیچارے نے گھر پر پانی تک نہ پیا۔ نئی نویلی دولھن کو چھوڑ چھاڑ تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ کئی روز تک جنگلوں میں خاک چھانتا آہ و فریاد کرتا پڑا پھرا۔ ہر شخص سے فقیر کا پتہ پوچھا۔ مگر حاصل کچھ نہ ہوا۔ آخر "خدا خود میر سامان ہست ارباب توکل را" ایک دن کوئی خضر راہ مل گیا۔ اور اُسکو انتہائی سراسیمہ دیکھ کر رحم کھاکر پوچھا۔ کسے ڈھونڈھتا ہے۔ اُس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنا مطلب ادا کیا۔ اُس نے کہا جا سیدھا اکبرآباد چلا جا علی متقی وہیں ہیں ڈھونڈھ لے۔ یہ سُنکر غریب پوچھتا پاچھتا اکبرآباد آیا۔ اور منزل مقصود تک پہونچ گیا اُنھوں نے تسلی دیکر وہیں ٹھہرا لیا۔ پھر یہانتک سلسلۂ موانست مستحکم ہوا کہ علی متقی اسکو برادر عزیز کہنے لگے۔ یہی نہیں بلکہ تمام سیاہ و سپید کا اسی کو مالک کر دیا۔ اس شخص کا نام سید امان اللہ تھا۔ جو بعد کو علی متقی کی نظر فیض اثر سے درویشی کے مقام اعلیٰ تک فائز ہوا یہی وہ ذات ہے جو میر صاحب کی تربیت و تعلیم کی اولین ذمہ دار ہے۔ میر صاحب کی عمر اسوقت سات سال کی تھی۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں۔

"من دراں ایام ہفت سالہ بودم۔ باخودم مانوس ساخت و درگر بیانم انداخت یعنی با مادر و پدرم نہ گزاشت و بفرزندی خویشم برداشت۔ لمحہ از خود جدایم نمی کرد و بنازم نعم

می پرورد۔ چنانچہ روز و شب با او میماندم و قرآن شریف بخدمت او میخواندم"

میر صاحب ان بزرگ کے سایۂ عاطفت میں تقریباً تین سال تک رہے۔ جب ان کی عُمر دس برس کی ہوئی تو سید امان اللہ کو حکم قضا و قدر نے ان سے ہمیشہ کے لیے جُدا کر دیا۔ اسی لیے قیاس چاہتا ہے کہ جب یہ سات برس کی عمر میں قرآن شریف پڑھتے تھے تو دس برس کی عُمر میں قرآن شریف کے علاوہ رسمی درسیات کی کتابیں بھی پڑھی ہونگی اور کچھ نہ کچھ سیکھ گئے ہونگے۔ اسکے علاوہ چونکہ اپنے عم بزرگوار سید امان اللہ کے ساتھ اکثر کاملین کی صحبت میں جاتے تھے اور انکی باتیں سنتے اور یاد رکھتے تھے تو اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ اُن کو کچھ ادراک و شعور بھی حاصل ہو گیا ہوگا۔ پھر سید امان اللہ کی وفات کے بعد انھیں کچھ نہ کچھ وقت ایسا بھی ملا جسمیں اپنے والد بزرگوار کا فیض تربیت حاصل کیا۔ جیسا کہ اُن کی خود نوشتہ سوانحعمری ذکر میر کی اُن نصیحتوں سے معلوم ہوتا ہے جو ان کے والد نے تلقین صبر کے لیے کیں۔ بلکہ اُنھیں سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ میر علی متقی اُن کو اسوقت ذی شعور سمجھتے تھے۔ چنانچہ میر صاحب کا بیان ہے کہ میں سیّد امان اللہ کی بیوقت موت سے بہت رنجیدہ رہتا تھا تو میرے والد مجھکو یہ کہکر سمجھاتے تھے۔

"کہ اے پسر من ترا بسیار میخواہم۔ اما ازیں غم می کاہم کہ من نیز بر سر راہم۔ گاہ شگفتہ کہ ماہ من نہ طفل ہالہ۔ الحمد للہ کہ دہ سالہ۔ چہ بہ کاہش اُفتادہ آخر درویش زادہ۔ دل قوی دار۔ خود را بخدا سپار۔"

مگر ان سب باتوں کے باوجود بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ اُن کی تعلیم نامکمل تھی۔ اور وہ ابھی درسیات رسمی تمام نہ کر چکے تھے کہ اُن کے والد کے انتقال کے سبب سے اُن کی جان پر قیامت گزر گئی۔ اُنھوں نے ذکر میر میں اس واقعۂ فاجعہ کو یوں بیان کیا ہے۔

وفات میر علی متقی ایک روز میر علی متقی کو اپنے ہمشیرزادہ محمد باعث کی عیادت کے لیے بیرونِ شہر پناہ سے شہر کے محلہ عالم گنج تک پیادہ پا دھوپ میں جانا پڑا۔ دن بھر وہاں رہے اور شام کو وہاں سے پلٹ کر اپنی مسجد میں نماز پڑھی۔ فراغتِ نماز کے بعد بستر استراحت پر دراز ہوئے اتنے میں میر صاحب پہونچے تو فرمایا کہ آج معلوم ہوتا ہے کہ دھوپ کی شدت اور گرمی نے نقصان پہونچایا ہے۔ سر میں درد بھی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ بخار ہو جائے گا۔ اسیوجہ سے شب کو بغیر کچھ کھائے پیئے سو گئے۔ صبح کو بہت تیز بخار ہو گیا۔ انکے قدیم معالج ابو الفتح نے علاج کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ بخار ٹھہر گیا۔ اور روزانہ شام کو تیز ہونے لگا۔ ایک مہینہ کے بعد معالج

اس عیجے پر پہو نچے کہ بخار ہڈیوں میں اثر کر گیا - جب مرض نے بہت زیادہ ترقی کی تو غذا بھی چھوٹ گئی - اور آخر کار مریض اور تیمارداروں کو اُمید شفا باقی نہ رہی - ایک روز میر صاحب اور ان کے بڑے بھائی محمد حسن کو بلایا اور فرمایا کہ میں ایک فقیر ہوں - میرے پاس روپیہ نہ پیسہ نہ سامان نہ جائداد - البتہ تین سو جلدیں کتابوں کی ہیں - لاؤ انھیں کو دونوں بھائیوں میں تقسیم کر دوں - محمد حسن نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں طالب علم ہوں اور کتابیں صرف میرے ہی کام آسکتی ہیں - محمد تقی سوائے اسکے کہ ضایع کر دے اور کیا کریگا - انھوں نے مطلب سمجھ لیا - اور کہا خیر ہم سمجھ گئے - یاد رکھو کہ اللہ غیور ہے اور غیور کو دوست رکھتا ہے - محمد تقی تمھارا دست نگر کبھی نہ ہوگا - زیادہ ستاؤ گے تو اُسکی سزا پاؤ گے - وہ تمھیں کیفر کردار کو پہنچائیگا اور سمجھ لو کہ اُسکے سامنے تمھارا چراغ ہرگز ہرگز جل نہیں سکتا ہے - اسکے بعد میر صاحب کیطرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ میں بازار کے بنیوں کا تین سو روپیہ کا مقروض ہوں - جب تک وہ ادا نہ کرو میری تجہیز و تکفین نہ کرنا - میر صاحب نے کہا کہ گھر کا اثاثہ تو صرف یہی کتابیں تھیں جو بھائی جان کی ملک میں آگئیں - اب ادائے قرض کی مجھ سے کیا سبیل ہوگی - انھوں نے کہا کہ گھبراؤ مت - خدا کارساز ہے - ہنڈی راستہ میں ہے - روپیہ آتا ہے - جی چاہتا ہے کہ میرے سامنے ہی آجائے - مگر موت قریب تر ہے اور فرصت کم لہذا خدا حافظ -

شفیق باپ کے انتقال کے بعد میر صاحب پر جو قیامت گزر رہی اسکا اظہار دوسرے لوگوں کے لیے بھی سامان سوہان روح سے کم نہیں - ایک لاوارث مفلس غریب بچہ اور اُسپر قرض خواہوں کا تقاضہ - تنہائی - اسپر بھائی کی بے اعتنائی - غرض مصائب گوناگوں کا ایک سمندر تھا جو موجیں مار رہا تھا - مگر یہ اسکی ہمت تھی کہ کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا - امداد غیبی کا منتظر رہا - اور آخر کار یہ سب ابتدائی مشکلات خدا نے حل کر دیں -

سید امان اللہ کے انتقال کے وقت میر صاحب دس برس کے تھے - تو والد کے انتقال کے وقت دس مہینے زیادہ سے زیادہ اور گزر چکے ہوں گے - کیونکہ سید امان اللہ عید کے مہینے میں راہی عدم ہوئے اور والد رجب کے مہینے میں عالم باقی کو سدھارے - مگر یہاں ایک ایسی گتھی پڑ جاتی ہے جو سلجھائے نہیں سلجھتی - میر صاحب سے میر صاحب کے والد مرحوم کی باتیں اور وصیتیں اور قرضداروں کا مطالبہ میر صاحب کا رسوم موتے کو ادا کرنا - اور تمام معاملات کو طے کرنا - اسکے بعد اپنے بھائی کو خانہ داری کے

امور کا متکفل بن کر کے خود تلاش معاش میں پھرنا اپنی خودداری اور غیرت کو کام میں لانا اور کسی سے کوئی امداد نہ چاہنا۔ اور مزید براں یہ کہ اپنے عمِ مرحوم یعنی سید امان اللہ کے ساتھ اکثر درویشوں اور خدارسیدوں کی صحبت میں جاکر فیض صحبت اُٹھانا۔ یہ سب باتیں ایسی نہیں ہیں جو ایک دس بارہ برس کے بچے کے لیے موزوں ہوں۔ سر شاہ سلیمان صاحب کا خیال ہے کہ میر صاحب نے اپنی اُسوقت کی عمر کا اندازہ صحیح نہیں کیا۔ میں بھی اسی کی تائید کرتا ہوں۔ ورنہ پھر ایک اور بھی قباحت پیدا ہوتی ہے کہ میر صاحب ذکر میر میں تحریر فرماتے ہیں۔

"خدائے کریم مرا شرمندۂ احسان کسے نکرد۔ دست نگر برادر کہ سر بہ سر من داشت نساخت۔ نقل ماتم درویش قسمت ساختم۔ کار را بہ لطفِ خداوند انداختم۔ دم خود را بہ برادر خورد سپردہ بہ تلاش روزگار در اطراف شہر اُستخواں شکستم لیکن طرفے نہ بستم۔ یعنی چارۂ کار در وطن نیافتم۔ ناچار بغربت شتافتم۔ رنج راہ بر خود ہموار کردم شدائد سفر اختیار کردم۔ بہ شاہجہاں آباد دہلی رسیدم۔ بسیار گردیدم شفیقے نہ دیدم۔"

اس عبارت سے صریحی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ یہ رسوم دنیوی موتی کے ادا کرنے کے بعد ہی فوراً اکبرآباد سے چل کھڑے ہوئے۔ یا زیادہ سے زیادہ کچھ دنوں اپنے وطن مالوف میں سرگرم تلاش معاش رہے۔ اس کے بعد دہلی پہونچے۔ حالانکہ درایت و قیاس کبھی اس امر محال کے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے کہ ایک دس گیارہ برس کا بچہ اکبرآباد سے دہلی تک کا اس زمانہ میں سفر کرے کہ قافلے لٹتے تھے۔ راستے محفوظ و مصئون نہ تھے۔ قدم قدم پر خون بہائے جاتے تھے۔ پھر یہ سب کچھ بھی ہو تو اسوقت ان کے اعزا و قریب نے کیونکر ان کو اس دور و دراز مسافت طے کرنے کی اجازت دی۔

میرے اس بیان کی تائید اُس تحریر سے بھی ہوتی ہے جو اُس نسخہ کے ایک صفحہ پر لکھی ہے جس کا میں ابھی حوالہ دے چکا ہوں اور جو کسی کتاب نوادر الکملاء سے نقل کیگئی ہے۔ "بعد واقعۂ ہائلہ پدر بزرگوار بہ عمر ہفدہ سالگی در دہلی رفت"۔ سترہ نہ سہی تو یہ اپنے والد کے انتقال کے وقت تیرہ چودہ برس کے ضرور تھے۔ کیونکہ جب اُن کا انتقال ہوگیا اور یہ ضروری رسوم سے فراغت حاصل کر چکے تو اُنھوں نے گھر کا کاروبار اپنے چھوٹے بھائی کو سونپا اور خود اکبرآباد یا نواح اکبرآباد میں دو ڈھائی یا تین برس تک تلاش معاش میں پھرتے رہے۔ جب یہاں کوئی صورت نہ نکلی تو دلی کا رُخ کیا۔ پھر اگر ردا مت

نوادر الکملا کو صحیح مانئے تو سترہ برس کی عمر بھی ممکن ہے۔

دہلی کا پہلا سفر میر صاحب ذکر میر میں کہتے ہیں کہ "بہ شاہجہان آباد دہلی رسیدم بسیار گردیدم وشفیقی نہ دیدم"۔ اس عبارت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ پہلی مرتبہ دہلی جاکر یہ کہاں مقیم ہوئے اتنا البتہ ہوا کہ خواجہ محمد باسط نے جو امیر الامرا صمصام الدولہ کے بھتیجے تھے اُن سے ان سے کسی طرح ملاقات ہوئی اور اُنھوں نے مہربانی کر کے انھیں امیر الامرا کے حضور میں پیش کیا اور امیر الامرا نے خواجہ باسط سے پوچھا کہ یہ لڑکا کون ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ میر محمد علی کے صاحبزادے ہیں۔ امیر الامرا سمجھ گئے کہ میر محمد علی مرحوم ہو چکے ہیں۔ فوراً حکم دیا کہ ان کے مرحوم باپ کے بہت سے حقوق میرے ذمہ ہیں۔ ایک روپیہ روزانہ ان کو میری سرکار سے دیا جایا کرے میر صاحب نے عرض کیا کہ جب بندگانِ حضور نے اتنا کرم فرمایا ہے تو اتنی اور عنایت فرمائی جائے کہ میری اس عرضداشت پر دستخط فرما دیے جائیں۔ یہ کہکر جیب سے درخواست نکالی اور پیش کر دی۔ عیش پسند امرا کوتاہ قلم کاہل زبان ہوا ہی کرتے ہیں۔ اُنھوں نے ٹالنے کے لئے جواب دیا کہ "وقت قلمدان نیست" میر صاحب کو یہ سُن کر ہنسی آگئی۔ نواب نے متعجب ہو کر دیکھا اور پوچھا۔ کیوں ہنسی کیا ہے۔ ہنسے کیوں۔ انھوں نے بے باکانہ کہدیا کہ میں حضور کے اس فقرہ کا مطلب نہیں سمجھا کہ وقت قلمدان نیست۔ اگر آپ یہ فرماتے کہ دستخط کا وقت نہیں یا قلمدان بردار نہیں تو خیر ایک بات بھی تھی۔ مگر یہ تو عجیب انشا ہے۔ قلمدان کوئی جاندار تو ہے نہیں وہ تو لکڑی ہے وقت اور غیر وقت کی پابندی اُس پر عائد نہیں ہوتی جس نوکر سے فرما دیجیے وہ لاکر حاضر خدمت کر دے۔ بات معقول تھی سُن کے نواب کو بھی ہنسی آگئی اور اُسی وقت دستخط کر کے عرضی حوالے کر دی یہیں سے اس نکتہ کو سمجھ لینا چاہیے کہ نہ خواجہ محمد باسط ایک بچے کی نواب کے سامنے پیش کرنے کی درخواست کرتے۔ نہ میر دس گیارہ برس کے ہو کر اُن کے اس فقرے پر اعتراض کر سکتے تھے۔ لامحالہ اُن کی عمر ضرور سترہ برس کی تھی۔ لیکن غالباً سترھواں برس شروع ہوا تھا۔ جس کا سبب آگے چل کر معلوم ہوگا مگر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ میر صاحب کی لیاقت علمی اتنی ضرور تھی کہ وہ فارسی کے فصیح و غیر فصیح صحیح و غیر صحیح جملوں کا اندازہ کر سکتے تھے۔ معاش کی طرف سے میر صاحب کو گونہ اطمینان ہو گیا چنانچہ لکھتے ہیں "آں روزینہ می یافتم۔ نان و نمک می خوردم و بسر می بردم" مگر حرماں نصیبی کسی حالت میں

پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ع بہ زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست" یہ اطمینان مستقل نہ رہ سکا۔ کوئی ایک ہی برس بعد ۱۱۵۱ھ میں امیرالامرا صمصام الدولہ نادرشاہ کے ہنگامہ و آشوب میں مارے گئے۔ اور یہ پھر بیکار اور پریشان روزگار ہو گئے۔

سرشاہ سلیمان صاحب نے دیباچہ مثنویات میر میں تحریر فرمایا ہے کہ میر صاحب دہلی چلے گئے اور سراج الدین علی خاں آرزو کے ساتھ رہنے لگے۔ میر صاحب کے بیان سے اسکا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ پہلی مرتبہ خدا جانے وہاں رہے یا اور کہیں۔ مگر وہ کسی کے مہمان نہ تھے بلکہ اُن کا روزینہ جو مقرر ہو گیا تھا اُسی سے بسر اوقات کرتے تھے۔ جیسا کہ عبارت منقولۂ بالا سے ظاہر ہے۔

اس انقلاب کے بعد وہ دہلی سے پھر اکبرآباد چلے آئے۔ اور غالباً یہاں کچھ قیام بھی کیا۔ مگر اسوقت ان کے ساتھ کوئی عزیز و قریب دوست و حبیب محبت کے ساتھ پیش نہیں آیا۔ خود کہتے ہیں کہ "کسانیکہ پیش درویش خاکپائے مرا کحل بصری ساختند کیار از نظرم انداختند"۔ غرض کہ وطن میں اطمینان نصیب نہ ہوا۔ اور پھر دلّی کی طرف چلے اور اس مرتبہ اپنے سوتیلے بھائی محمد حسن کے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کے ساتھ رہنے لگے۔

میر صاحب کا دہلی میں دوسری مرتبہ قیام

میر صاحب کے والد کے انتقال کو اب عرصہ گزر چکا تھا۔ اور خیال ہے کہ بھائیوں عزیزوں قریبوں کی وہ کاوشیں بھی باقی نہ رہی ہونگی جو اس تازہ تازہ واقعہ کے بعد خانگی نزاع۔ ترکے وغیرہ کے جھگڑوں کی وجہ سے ہوا کرتی ہے۔ پھر آخر کیا ہوا کہ ایکدم اعزا و اقربا توجہ اُن لوگوں نے بھی ان سے آنکھیں پھیریں جو ان کے والد مرحوم کے جاں نثار تھے۔ اور جو کچھ بھی نہیں تو ان کو بڑے باپ کا بیٹا تو ضرور جانتے تھے۔ اگرچہ اُن کو ان کی امداد کرنا چاہیئے تھی۔ مگر امداد نہ کرتے تو کم از کم انکے دشمن تو نہ ہو جاتے۔ اسکے علاوہ یہ بات بھی آسانی سے سمجھ میں آنے والی نہیں کہ انکے بھائی اگرچہ سوتیلے تھے۔ مگر وہ بھی آخر بزرگ زادے تھے حافظ تھے تعلیم یافتہ تھے۔ یکبارگی انسانیت اور ہمدردی کو چھوڑ کر کیوں ان سے بگڑ بیٹھے۔ اور پھر بگڑے تو ایسے بگڑے کہ دلّی تک ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور وہاں بھی اپنے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کو یہ لکھ بھیجا کہ "میر محمد تقی فتنۂ روزگار است زنہار بہ تربیت او نہ باید پرداخت"۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس پر امتداد زمانہ نے ایک نہایت تاریک پردہ ڈال دیا تھا۔ مگر مولوی عبدالسلام نے شعرالہند میں تذکرہ

بہارِ بےخزاں سے یہ عبارت نقل کر کے ایک حد تک اس رازِ سربستہ کو ظاہر کیا ہے:-

"بہ شہر خویش با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود در پردہ تعشق طبع و میل خاطر داشت۔ آخر عشق او خاصیت مشک پیدا کردہ میخواست کہ بخیہ بہ چارسوئے رسوائی کند و حسن بے پردہ بہ جلوہ گری درآید۔ از ننگ افشائے راز از وطن و اقربا بادلے لبل پروردۂ حسرت و حرمان باخاطر ناشاد دست و گریبان۔ قطع رشتۂ حب وطن ساختہ از اکبرآباد و بعد از خانہ برانداز یہا بہ شہر لکھنؤ رسید و ہمیں جا بصد حسرت جانکاہ جلاوطنی و حرماں نصیبی از دیدار یار ودیعت جاں بجہاں آفریں داد۔ تا بقید رشتۂ حیات بود طوقِ محبت در گردن و سلسلۂ دیوانگی بپا داشت۔"

اس بیان کو مکمل طریقہ پر نہ بھی مانا جائے تو بھی کئی ایک مفید باتیں سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ (۱) پہلی مرتبہ دہلی سے واپسی کے بعد میر صاحب کی عمر اتنی تھی کہ وہ تعلق خاطر اور تعشق پیدا کر سکیں (۲) ان کے بڑے بھائی کی ناراضی بیجا نہ تھی۔ (۳) سراج الدین علیخاں آرزو جو ایک قدیم وضع کے بزرگ تھے اس آوارگی اور بدچلنی کو پسند کر سکتے تھے۔ اور اس حالت میں اُن کی تلخ نوایانہ نصایح میر صاحب کے دل پر نشتر کا کام دے سکتی تھیں۔ اور یہ بات جدائی فیمابین کا سبب ہو سکتی تھی۔" بہرحال میر صاحب دوبارہ دہلی پہونچے اور اپنے سوتیلے خالو کے مکان پر مقیم ہوئے۔ اور اتنے دن رہے کہ شہر کے بعض کاملین سے اُنھوں نے کچھ کتابیں پڑھیں اور اس قابل ہو گئے کہ کسی پڑھے لکھے آدمی کے مخاطب صحیح ہو سکیں۔

یہ تحصیلِ علوم میں مشغول تھے اور گو کسی جگہ ان کا سلسلۂ معاش مستحکم نہ ہوا تھا کہ ان کے بھائی حافظ میر محمد حسن کا خط اپنے خالو یا ماموں آرزو کے نام پہونچ گیا جس میں انکی شکایتیں تھیں۔ اور وہ اسکو پڑھ کر چراغ پا ہو گئے۔ اور ان پر متشددانہ تنبیہ کرنے لگے۔ عشق و محبت کا داغ۔ بے روزگاری۔ پریشان حالی۔ رنج غربت۔ ان سب چیزوں نے ملکر دل و دماغ پر ایک خاص اثر کیا۔ اور آخرکار یہ مجنون ہو گئے۔ اور ان کو چاند میں ایک صورت نظر آنے لگی جس کا انھوں نے ذکرِ میر میں بھی مفصل ذکر کیا ہے۔ اور مثنوی خواب و خیال میں بھی وہی افسانہ بیان کیا گیا ہے مناسبتِ محل کے لحاظ سے ہم کچھ شعر نقل کر کے خود انھیں کی زبان سے آپ کو یہ پُرلطف داستان سناتے ہیں۔

در و بام پر چشم حسرت پڑی	چلا اکبرآباد سے جس گھڑی

پس از قطع رہ لائے دلی میں بخت
جگر جورِ گردوں سے خوں ہو گیا
ہوا خبط سے مجھ کو ربطِ تمام
یہ وہمِ غلط کاریاں تک کھنچا
نظر رات کو چاند پر گر پڑے
مہِ چاردہ کا رآتش کرے
نظر آئے اک شکل مہتاب میں

بہت کھینچے یاں میں نے آزارِ سخت
مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا
لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام
کہ کارِ جنون آسمان تک کھنچا
تو گویا کہ بجلی سی دل پر پڑے
ڈروں یاں تلک میں کہ جی غش کرے
کمی آئے جس سے خور و خواب میں

احباب و اعزا نے علاج معالجہ شروع کیا۔ خصوصاً فخر الدین خاں کی بیوی نے جو میر صاحب سے قرابت قریبہ بھی رکھتی تھیں۔ جھاڑ پھونک تعویذ گنڈے بھی کرائے اور اطبا سے بھی رجوع کی آخر کار ان کو صحت کاملہ ہو گئی۔

میر صاحب اور خان آرزو میں کشیدگی بڑھتی گئی۔ اور آخر کار ایک روز یہ اُن سے جدا ہو گئے مولانا آزاد دہلوی نے آبحیات میں اس جدائی کو مذہبی رنگ دیدیا ہے۔ اور فرما گئے ہیں۔ "چونکہ خان آرزو حنفی مذہب تھے اور میر شیعہ اور نازک مزاج۔ اسی وجہ سے کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ ہو گئے۔" مولانا عبدالحق صاحب اور مولانا عبدالحیٔ مؤلف گل رعنا اس کو قبول نہیں کرتے۔ سر شاہ سلیمان صاحب کو اس کا ایک حد تک یقین ہے۔ اور وہ فرماتے ہیں کوئی خاص وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس خیال کو بالضرور غلط قرار دیا جائے۔

ایک شیعہ اور ایک سُنی کے اختلاف مذہب اور اختلاف خیال سے انکار نہیں۔ ایسا ہوتا رہا ہے اور ایسا ہو سکتا ہے۔ مگر اس جگہ پر چند شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ میر صاحب دہلی میں دوسری مرتبہ تقریباً ۱۱۵۲ ہجری میں پہونچے ہیں۔ اور تذکرۂ نکات الشعرا ۱۱۲۵ھ میں لکھا ہے۔ جس میں جا بجا خان آرزو کا نہایت ادب سے ذکر کیا ہے۔ چنانچہ مرزا معز فطرت موسوی خاں کے حال میں انھیں استاد و پیر و مرشد بندہ لکھا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ ایسا فاضل ہندوستان میں کوئی نہیں بلکہ ولایت میں بھی شبہ ہے۔ اب خان آرزو کے انتقال کو لیجیے وہ ۱۱۶۹ھ میں فوت ہوئے۔ ذکر میر کو لیجیے تو ۱۱۷۰ھ میں وہ تصنیف ہونا شروع ہوئی اور ۱۱۹۷ھ میں مع لطائف وغیرہ ختم ہوئی۔ اب خیال کیجیے کہ ۱۱۵۳ھ سے گیارہ سو ستر تک میر صاحب خان آرزو کی کوئی شکایت نہیں کرتے۔ ۱۱۶۹ھ میں خان موصوف کا انتقال ہو جاتا ہے تو وہ

بیس برس پہلے کا دکھڑا بیان کرتے ہیں۔ یہ ایسی بوالعجبی ہے جو سمجھ میں نہیں آتی۔ دو باتیں ہیں یا تو وہ خان آرزو کی زندگی میں کوئی ایسی بات کہنا ہی نہ چاہتے تھے کہ وہ ناراض ہوں اور اُن کا راز ظاہر ہونے پر خانِ موصوف کوئی معقول جواب دیں یا پھر ادنیٰ ادنیٰ باتوں کو اُن کے انتقال کے بعد بڑھا چڑھا کر بیان کر دیا۔ یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ خان آرزو اگر دراصل اسقدر اوچھے خیالات کے آدمی تھے تو انھوں نے اتنے طویل زمانے تک کہ میر صاحب نے تعلیم بھی حاصل کی کسی قابل بھی ہوئے۔ ملازم بھی ہو گئے۔ اپنے یہاں ٹھہرنے کی اجازت ہی کیوں دی۔ اور کیونکر اتنی بڑی مدت تک ضبط کیے رہے۔ اور کیوں اُن کی تعلیم و تربیت کے کفیل ہوئے۔ ان سب کو چھوڑ کر خان آرزو کے اخلاق و عادات کو لیجیے تو کوئی تذکرہ اُن کے معاصرین کا ایسا نہیں ملتا۔ جن میں اُن کے محاسن نہ شمار کرائے گئے ہوں۔ ایک فرد بھی ایسا نہیں کہ میر صاحب کی طرح اُن کی تنک مزاجی کا ذکر کرتا ہو۔ بہر حال یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ میر صاحب نے یہ واقعات سراسر غلط لکھے ہیں۔ مگر کچھ نہ کچھ خلط مبحث ضرور ہوا۔ معلوم نہیں کب ان کے بھائی کا خط آیا کن اسباب کی بنا پر انھوں نے ایسا لکھا۔ اور کیوں خان موصوف بگڑ بیٹھے۔ اور کب جدائی ہوئی۔ پھر لطف یہ کہ میر صاحب بھی باوجود ان شکایتوں اور حکایتوں کے لکھتے ہیں "کہ آں عزیز دنیا دار واقعی بود۔ نظر بر خصوصیت ہمشیرزادۂ خود بدمن اندیشید،" سبحان اللہ کیا دنیا داری ہے کہ ذرا سی بات پر ظاہر داری کو ترک کر کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا لگانے کو تیار ہو گئے۔ ان سب کے علاوہ اسی قلمی نسخے میں جسکا ہم نے ذکر کیا ہے نوادر الکملا سے جو عبارت نقل کی ہے۔ اُس میں یہ فقرے بھی ہیں۔

"بخانۂ سراج الدین علی خاں آرزو اقامت ورزیدہ تکمیل علوم عقلی و نقلی نمودہ۔ بعد مرورِ دہور کہ جدائی فیما بین واقع شد۔ بہ رُوسائے عظام در خورد و برخوردہ۔"

مرورِ دہور کے معنے سب جانتے ہیں مگر پھر بھی اس مدت طویل کی صراحت نہیں ہے۔ آزاد کے اس فقرے پر کہ یہ شیعہ تھے اور آرزو حنفی ایک بات اور بھی غور کرنے کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ میر صاحب کے اعزا و اقربا آبا و اجداد سنی المذہب تھے۔ سید امان اللہ ایک صوفی و سلیح المشرب سنی تھے۔ اُن کے انتقال کو اُسوقت تک کہ یہ دوبارہ دلی گئے کوئی بڑا زمانہ نہیں گزرا تھا پھر مولانا آزاد کو یہ کہاں سے متحقق ہوا کہ یہ اسوقت شیعہ مذہب تھے۔ شاید انھیں اسباب

اورگرد وپیش پرنظر ڈالتے ہوئے سرشاہ سلیمان صاحب نے اوائلِ شاعری کو مستثنیٰ کرتے ہوئے ان کے مذہبی معتقدات کے بارے میں یہ فقرے لکھے ہیں ''اسی کے ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کم سے کم زمانہ عروج شاعری میں ان کا مذہب اہلِ تشیع کا تھا'' یہ رائے بھی صرف اسی قیاس پر مبنی ہے کہ میر صاحب کی لکھی ہوئی منقبتیں اور مرثیے وغیرہ موجود ہیں۔

تکمیل تعلیم میر

یہ لکھا جا چکا ہے کہ ان کی تعلیم وتربیت کا زمانہ سیّد امان اللہ کے وقت سے شروع ہوا۔ پھر کچھ مدّت تک اپنے والد بزرگوار سے فیضِ تربیت حاصل کیا۔ تا اینکہ دہلی میں آئے تو ان کو انشائے فصیح اور غیر فصیح کا احساس تھا۔ مگر قیاس یہ چاہتا ہے کہ اوّل میں خود خانِ آرزو نے ان کی تربیت کی طرف توجہ کی۔ جیسا کہ بقول میر ان کے بھائی کے خط سے واضح ہوتا ہے۔ کہ ''میر محمد تقی فتنۂ روزگار است زنہار بہ تربیتِ او نہ باید پرداخت'' دوسرے خود میر صاحب کا اقرار موجود ہے وہ تذکرہ نکات الشعرا میں اُن کو اُستاد و پیر و مرشد لکھتے ہیں۔ مگر جب ذکر میر لکھی جاتی ہے تو اُن کو یاد آتا ہے کہ میر جعفر پٹنے کے رہنے والے اُن کے اُستاد تھے جو روزانہ اُن کو پڑھانے آتے تھے۔ حالانکہ غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی خانِ آرزو ہی کے یہاں آتے تھے۔ کیونکہ میر صاحب اس واقعہ کا اسطرح ذکر فرماتے ہیں کہ میں ایک روز بازار میں ایک کتاب کا جز لیے بیٹھا تھا۔ ایک جوان شخص میر جعفر اسطرف سے گزرا مجھے دیکھا۔ اور بیٹھ گیا۔ اور ازراہ قیافہ شناسی کہنے لگا کہ معلوم ہوتا ہے تم علم کے شوقین ہو۔ اگر واقعی میرا خیال صحیح ہے تو میں تمھیں پڑھانے کے لیے آیا کروں۔ کیونکہ میں بھی علم دوست ہوں مگر کوئی ہم مذاق اور مخاطب صحیح نہیں ملتا۔ انھوں نے کہا کہ میں مستطیع نہیں ہوں کہ کچھ خدمت کرسکوں تاہم للّٰہ یہ زحمت گوارا فرمایئے تو عنایت ہوگی۔ اُنھوں نے جواب دیا مگر پھر بھی بغیر ناشتے کے کہیں آنا جانا دشوار ہے۔ میر صاحب بولے کہ اگرچہ کچھ میرے پاس بھی نہیں مگر خیر خدا مالک ہے اسکے بعد وہ نہ معلوم کتنی مدت تک کبھی کبھی آتے رہے اور میر صاحب حتی الوسع خدمت کرتے رہے یہاں تک کہ وہ اپنے وطن عظیم آباد کو چلے گئے۔

غور طلب یہ امر ہے کہ اسقدر افلاس اور بیکاری کا زمانہ سوائے سراج الدین علیخاں آرزو کے یہاں کے قیام کے اور کون سا ہوسکتا ہے۔ یہاں سے میر صاحب کے ایثار کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یقینی وہ اُسی ناشتے وغیرہ میں سے جو اُن کے لیے آتا تھا۔ اپنے شفیق اُستاد کی بھی خدمت کرتے ہونگے۔ اور اگر یہ نہیں تو ایسی بےکسی کا اظہار ممکن نہ تھا۔ اور نہ زمانہ ملازمت کے بعد

اُن کو تعلیم کی ضرورت باقی رہی ہوگی۔ یہ امر بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ اُن کا زمانۂ ملازمت اور فراغت معیشت اُن کی شاعری کے بعد شروع ہوا اور یہاں تک وہ نہ شاعری کا ذکر کرتے ہیں اور نہ خود شاعر ہونے کے مدعی ہیں۔ بہر حال تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ اُنھوں نے فارسی میں ایک ادیب کامل کا درجہ حاصل کیا۔ اور عربی میں مطول تک استعداد بہم پہونچانا خود اُن کی تحریر سے ظاہر ہے۔ ممکن ہے کہ اسکے علاوہ اور درسیات عربیہ پر بھی عبور حاصل کیا ہو۔ جیسا کہ اُن کے کلام کے بعض جملے اور الفاظ مستعمل پتہ دیتے ہیں۔

ذوق شعر اور شاگردی

اس بات میں کوئی شک وشبہ کی گنجایش نہیں ہے کہ میر فطری شاعر پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے دل میں ذوق شعر ازلی تھا۔ اُن کے متعلق کئی بزرگوں کی پیشین گوئیاں تھیں کہ یہ بہترین شاعر ہونگے۔ چنانچہ پہلے اُنکے والد بزرگوار ہی کو لیجیے۔ میر صاحب فرماتے ہیں کہ "ہرگاہ مرادر بغل کشیدے۔ وبنظر شفقت رنگ کاہی مرادیدے۔ گفتے۔ کہ اے سرمایۂ جان این چہ آتشے است کہ در دلت نہان است۔ وچہ سوزیست کہ ترا با جان است۔"

ایک مرتبہ سیّد امان اللہ کے ساتھ احسان اللہ درویش کے یہاں جاتے ہیں تو وہ فرماتے ہیں۔ "ایں بچّہ ہنوز سوزن بال است۔ اما چنیں معلوم میشود کہ اگر بخوبی پر برآرد بیک پرواز آنطرف آسمان خواہد رفت۔"

اسی طرح خواجہ ناصر عندلیب نے خود میر صاحب سے فرمایا تھا۔ کہ "اے میر تو میر مجلس خواہی شد۔"

ایک باخدا کی تعلیم وتربیت اور متفرق درویشوں کے فیض صحبت نے اُن کے دل میں سوز وگداز بھر دیا تھا۔ اُس کی تحریک کی ضرورت تھی جس کے لیے غیب سے یہ سامان ہوا کہ میر صاحب کی ایک شخص سیّد سعادت علی نامی امروہوی سے ملاقات ہوئی اُنھوں نے شعر ریختہ کہنے کی ترغیب دی اور میر صاحب مشق سخن کرنے لگے۔ اور چند روز میں وہ ترقی کی کہ شعرائے دہلی ان کو نہ صرف خوش گو بلکہ مستند ماننے لگے۔

اس واقعے سے یہ دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ میر صاحب سید سعادت علی کے شاگرد ہو گئے بلکہ واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب اس سے پہلے شاید فارسی میں شعر کہنے لگے تھے مگر چونکہ کلام فارسی میں کوئی خاص وزن نہ تھا۔ اور اسکے علاوہ ریختے کا رواج عام ہو رہا تھا۔ اسی

واسطے ان کے مشیر نے ان کو اپنی زبان میں شعر کہنے کی ہدایت کی۔ رہی شاگردی یہ بالکل طے شدہ بات ہے۔ کہ گو اپنی ذاتی رنجشوں کی وجہ سے میرؔ صاحب نے ذکرِ میرؔ میں آرزو کو اپنا اُستاد نہیں بتایا ہے۔ مگر اس کی تصنیف سے بہت پہلے وہ اُن کی شاگردی کا اقرار کر چکے ہیں۔ علاوہ اس کے دوسرے شواہد بھی موجود ہیں جو میر صاحب کے معاصرین کے ہیں اور جن کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

میر حسنؔ اپنے تذکرہ شعرائے اُردو میں لکھتے ہیں "برادرزادہ سراج الدین علی خاں آرزو و ہم از شاگردان اوست" اسی طرح قائمؔ اپنے تذکرہ مخزنِ نکات میں کہتے ہیں "محمد تقی المتخلص میرؔ۔ اصل و منشائے وے دار الخلافت اکبر آباد است۔ در خدمت خان آرزو کہ خالو او بود نکتے دانش اندوختہ" یہاں تک تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مگر حکیم قدرت اللہ قاسم نے معلومات میں اضافہ کر کے اس راز کو فاش کرتے ہوئے ہمارے اس خیال کو یقین کا درجہ بخشدیا ہے۔ چنانچہ اپنے تذکرہ مجموعۂ نغز میں میرؔ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "پسر شوہر ہمشیرۂ سخن پرداز بدیہہ گو سراج الدین علی خاں آرزو ست۔ نسبت تلمذ ہم بجناب افادت انتساب خان مشار الیہ دارد۔ اما بنا بر نخوتے کہ در سرش جا گرفتہ ازیں امر کہ فی الحقیقت فخر وے است ابائے کُلّی بمیاں آرد" یہیں سے یہ گمان بھی پیدا ہوتا ہے کہ مخزن نکات یعنی تذکرۂ قائمؔ ۱۱۶۵ھ میں لکھا گیا۔ اور تذکرہ شعرائے اُردو میر حسن کہ ۱۱۹۳ھ میں تمام ہوا یہاں تک میر کے متعلق ان دونوں معاصرین کو گمان بھی نہیں کہ وہ خان موصوف کی شاگردی سے منکر ہونگے یا منکر ہیں اور نہ خود میر صاحب کو اسوقت تک کوئی انکار معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذکرِ میر جو ۱۱۹۷ھ میں ختم ہوئی وہ ان دونوں تذکروں کے بعد کی تصنیف ہے۔ اور اسی میں انھوں نے خان آرزو کی شاگردی کو ختم کر کے اُن کی شکایت کی ہے۔ یہ خبر مشہور ہوئی ہے اور تذکرۂ قاسم میں حکیم قدرت اللہ قاسم نے اس قضیۂ نامرضیہ کو صاف بھی کر دیا۔ کیونکہ یہ تذکرہ ۱۲۲۱ھ میں تمام ہوا جب کہ میرؔ صاحب زندہ و سلامت موجود تھے۔

خان آرزو کا فیضِ صحبت

میر صاحب کی مشق سخن بڑھی اور تمام خوش گویانِ شہر اُن کے کمالِ فن کے معترف ہو گئے بلکہ یوں کہیے کہ اُن کا ایک رنگ خاص قرار پا گیا۔ جس کے متعلق اُن کے کلام پر رائے دیتے ہوئے ہم ذرا تفصیل کے ساتھ بحث کرینگے۔ اسوقت صرف اتنا کہنا ہے کہ جیسے وہ بیان و اظہارِ جذبات کے لحاظ سے اپنے

رنگ کے بلا شرکت غیرے مالک ہیں۔ اسی صورت سے اُن کے یہاں الفاظ در الفاظ میں بھی فارسی کی ترکیبیں اور فارسی کے اکثر الفاظ اس قسم کے ہیں کہ اردو شاعری کے شروع سے اسوقت تک کسی شاعر ریختہ گو کے یہاں نہیں ہیں۔ اور اگر کہیں ہیں تو وہ شاذ ہیں جو معدوم کا درجہ رکھتے ہیں۔ مثال کے لیے ذیل کے چند الفاظ و ترکیبات ملاحظہ ہوں۔

آش مال۔ استخواں شکنی۔ برخویش چیدہ۔ بزآویزی۔ بزگیری۔ بے تہ۔ بے ہیچ۔ ترسل جناغ۔ جیغہ جیغہ ابرو۔ خایہ گزک۔ درونہ۔ دریائے لنگردار۔ دل زدہ۔ زنجیرہ۔ زنخ زن۔ زیادہ سری۔ سجادۂ محرابی۔ سرنشین۔ شیرہ خانہ۔ شیشہ جان۔ صورت باز۔ طفلانِ تہ بازار۔ غنچہ پیشانی۔ کل مکل۔ ماہ ماہ کہنا۔ نرگسی زن۔ یاد بود۔ یال وگوپال۔ اور اسی قسم کے بہت سے الفاظ انکی تصانیف اُردو فارسی میں موجود ہیں۔ مگر آپ کو سنکر تعجب ہوگا کہ یہ سب وہ لفظ ہیں جو آرزو نے اپنے لغت چراغ ہدایت میں اس دعوے کے ساتھ لکھے ہیں۔

"کہ داخل ہیچ کتاب لغت مثل فرہنگ جہانگیری و سروری و برہان قاطع وغیرہا نیست و سبب تالیف آنست کہ چوں اکثر ہم مصروف مطالعہ و خواندن کتب جدید و قدیمہ فارسی دیدم و معنی بعضے از الفاظ و اکثر اصطلاح درکتب مذکورہ نیافتم۔ ہر ہر چہ اطلاع دست بہم داد بہ اسناد آن از اشعار اُستادان دریں نسخہ درج کردم مگر بعض کہ از محاورہ دانان بہ تحقیق پیوستہ و سند آن در اشعار بزرگاں بہم نہ رسیدہ"۔

پھر جب مشہور لغات اور بڑے بڑے محاورہ دانوں کے کلام میں بھی یہ الفاظ نہیں تو میر صاحب کے یہاں انکے پائے جانے کو سوائے اسکے کہ خان آرزو کا فیض صحبت ہو اور کیا کہا جائے۔ اور کیا خیال کیا جاسکتا ہے۔ میں تو جب میر صاحب کی نثر فارسی یا نظم اُردو کو دیکھتا ہوں تو خان آرزو کی کوششوں کی ایک مجسم تصویر نگاہ میں پھر جاتی ہے۔

ان تمام توجیہات کا ماحصل یہ نکلتا ہے کہ میر صاحب مدت تک خان آرزو کے یہاں رہکر کسب کمال کرتے رہے۔ ایک روز یہ اتفاق ہوا کہ اُنھوں نے میر صاحب کو کھانے پر بلایا۔ اور اُنکی زبان سے کوئی بات نکل گئی جسکو یہ برداشت نہ کر سکے اور بغیر کھانا کھائے ہوئے گھر سے باہر چلے گئے۔ ارادہ تھا کہ جامع مسجد جائیں اور وقت گزاریں۔ مگر اتفاق سے راستہ بھول کر حوض قاضی پر جا نکلے۔ اور پانی پینے لگے۔ اتنے میں ایک شخص علیم اللہ نامی آگے بڑھا ان سے مل کر پوچھا کہ کیا جناب کا نام میر محمد تقی میر ہے۔ انھوں نے پوچھا

کہ آپ نے کیونکر پہچانا - وہ کہنے لگا کہ آپ کی حرکات مجنونانہ کی تو شہر بھر میں دھوم ہے - خیر گزارش یہ ہے کہ اعتماد الدولہ قمر الدین کے داماد آپ کی ملاقات کے بڑے مشتاق ہیں اگر میرے ساتھ تشریف لے چلیے تو ملاقات بھی ہو جائے گی - اور اس بہانے سے میرا سلام بھی ہو جائے گا - میر صاحب نے منظور کر لیا اور ساتھ ہو لیے - پہونچے - علیم اللہ نے ملایا - رعایت خاں بڑے تپاک سے پیش آیا - اور زمرۂ مصاحبین میں ملازم رکھ لیا - اور اب ذرا فراغت کے ساتھ زندگی گزرنے لگی -

میر صاحب کی زندگی کا انقلابی دور تو اُسوقت شروع ہوا تھا جبکہ اُن کے والد ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا - اور وہ ایک حد تک بے یار و مددگار رہ گئے تھے - مگر اس مصاحبت کی ملازمت کو بھی دورنگی زمانہ کا سنگ بنیاد کہہ دیا جائے تو شاید غلط نہ ہو - یہیں سے اُنھیں زمانۂ بوقلموں کے وہ وہ رنگ اور وہ سرد و گرم دیکھنے پڑے جنھوں نے ہمیشہ کیلیے اُن کے دل پر ایسا نقش عبرت بٹھا دیا جس سے زندگی اور زندگی کے عروج علو مدارج اور عیش و عشرت کی اُن کی نگاہ میں ہوا کے جھونکوں اور بچوں کے گھروندوں سے زیادہ وقعت نہیں رہی - درویشوں اور خدا پرستوں کی تربیت سے دل پہلے ہی گداز تھا - ان چیزوں نے اور بھی موم بنا دیا - وہی آج ہیں کہ محفل امرا میں میر مجلس ہیں - جملہ اسباب طرب اور سامان راحت کے مالک ہیں - وہی دوسرے دن ہیں کہ نان شبینہ کو محتاج ہیں نہ کوئی دوست ہے نہ پرسان حال - دہلی جو مدتوں سے امن و امان کا گہوارہ بنی ہوئی تھی - روز کی خانہ جنگیوں اور طوائف الملوکی سے مرکز گردش و انقلاب ہو گئی ؎

چور اُچکے سکھ مرہٹے شاہ و گدا سب خواہاں ہیں
چین سے ہیں جو کچھ نہیں رکھتے فقر بھی اک دولت ہے یہاں

غرضکہ سکون اور راحت و عیش تو درکنار - زندگیوں - آبروؤں کے لالے پڑ گئے - یہ بھی اُسی انقلاب روزگار کے ساتھ صبح و شام کی دورنگیوں کا مطالعہ کرتے رہے - یعنی عافیت کے ساتھ چند ہی روز گزرے تھے کہ درّانیوں کا حملہ ہوا - رعایت خاں کے ساتھ میر صاحب کو بھی جانا پڑا - محمد شاہ کا دور حیات ختم ہوا - احمد شاہ کو تخت پر بٹھایا گیا - جاوید خاں خواجہ سرا کا دور دورہ ہوا - مرہٹوں کی شورش ہوئی سانبھر کے قریب مرہٹوں سے جنگ ہوئی - جس میں رعایت خاں کے ساتھ یہ بھی تھے

اور یہیں سے خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار سراپا انوار کی زیارت کو گئے وہاں سے دہلی واپس آئے تو پھر بیکار ہو گئے ۔ چندے تکلیف اُٹھا کر نواب بہادر کی مصاحبت میں رہے ۔ کچھ سانسیں اطمینان و راحت سے لیں ۔ عربی کی تعلیم کی تکمیل کا خیال ہوا مطوّل پڑھنا شروع کیا ۔ ایکا ایکی پھر ہوا بدل گئی ۔ صفدر جنگ نے نواب بہادر کو دغا سے مروا ڈالا ۔ اور انکو پھر بیکاری سے سابقہ پڑا ۔ مگر چونکہ اب مشہور ہو چکے تھے اسواسطے جلدی ایک صورت نکل آئی ۔ نجم الدین سلام کے ذریعے سے مہانرائن دیوان نے ان کو بلایا اور زمرۂ متوسلین میں شامل کر لیا ۔ کچھ دن پھر فراغت سے گزرے ۔ اتنے میں وزیر اور بادشاہ میں صف آرائی ہوئی اور باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی ۔ یہ بغاوت اور عداوت کوئی چھ مہینے تک جاری رہی ۔ میر صاحب چونکہ وزیر کے متوسلین میں سے تھے اسلیے سخت پریشان ہوئے اسی زمانہ میں شماتت ہمسایہ کے خوف سے خان آرزو کے یہاں سے بالکل علیحدہ ہو کر میر خاں انجام کی حویلی میں جا رہے ۔ مگر زمانہ جو پلٹا تو واقعات کو کہیں سے کہیں لے پہونچا ۔ صفدر جنگ کا انتقال ہوا اور اُن کی جگہ شجاع الدولہ صوبہ دار اودھ بنائے گئے ۔ خان آرزو اس اُمید پر کہ اسحاق خاں مرحوم کے بھائی جو ان کے مربی اور محسن ہیں وہیں ہیں اودھ پہونچے اور وہیں انتقال ہو گیا ۔ بعد کو اُنکی وصیت کے مطابق لاش دہلی میں لائی گئی ۔

میر صاحب کے عروج شاعری کا یہی زمانہ تھا ۔ بڑے بڑے لوگ ان کے عالی خیالات اور ان کے اچھوتے جذبات کے قدردان پیدا ہو گئے تھے ۔ دلی ان کے کمالات سے گونج رہی تھی ۔ ہر شخص ان کی ملاقات کا شائق تھا ۔ چنانچہ اسی دوران میں ایک روز راجہ جگل کشور نے انھیں اپنے مکان پر بلایا ۔ کچھ سنا سنایا اور اپنا کلام اصلاح کے لیے پیش کیا ۔ میر صاحب کا دل و دماغ بھلا ان مزخرفات کے دیکھنے کی کب تاب لا سکتا تھا ۔ انھوں نے دنیاداری بھی نہ برتی ۔ اور چین بر جبین ہو کر تمام کلام پر چھری پھیر دی ۔ ایسی حالت میں کیا صحبت درگیر ہو سکتی تھی ۔ نتیجہ یہی ہوا کہ وہی ابتری اور پریشان حالی جو دامنگیر حال تھی دامن گیر رہی اور راجہ سے انھیں کوئی فائدہ نہ پہونچ سکا ۔ اتنا ضرور ہوا کہ انکے ذریعہ سے راجہ ناگر مل تک پہونچ گئے ۔ یہ اُسوقت دیوان خالصہ تھے ۔ یہاں بھی میر صاحب کے کلام کی تو بڑی حد تک تعریف ہوتی رہی ۔ مگر بدقسمتی سے اُن کے جود و سخا سے متمتع ہونے کا ان کو ذرا بھی موقع نہ ملا ۔ مگر اتنا ہوا کہ راجہ کے لڑکے نے خواجہ غالب کی سفارش سے میر صاحب کا کچھ

درماہہ ضرور مقرر کر دیا جو ایک سال تک اُن کو ملتا رہا اور پھر خود راجہ نے بھی ایک سال کی تنخواہ دلوادی۔ اس سے کچھ نہ کچھ کام چل گیا اور اسکے بعد بھی میر صاحب وقتاً فوقتاً ان سے کچھ نہ کچھ متمتع ہوتے رہے۔ اِس دوران میں راجہ ترقی کر کے نائب وزیر ہوئے۔ عمدۃ الملک خطاب پایا۔ مگر ہنوز میر صاحب کو کوئی فائدہ پہونچنے نہیں پایا تھا کہ ناگاہ نادر شاہ درانی کا دوسرا حملہ شروع ہوا۔ راجہ ناگرمل کو بھی دلّی چھوڑنا پڑی اور اپنے متعلقین و متوسلین کو لیکر سورج مل جاٹ کے قلعوں میں جاکر پناہ گزین ہو گئے۔ میر صاحب بھی ساتھ ساتھ تھے۔ دلّی میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ نالیوں میں خون بہنے لگا۔ اور شہر کا شہر زیر و زبر ہو کر رہ گیا۔

اُدھر دُرّانی دلّی کو تاراج کر کے عالمگیر ثانی کو تخت سلطنت پر بٹھا کر متھرا کو زیر و زبر کرتا اکبرآباد پہونچا۔ ادھر سردار جھنکو کی سرکردگی میں دکن کی فوج نے پھر دلی کو جولانگاہ بنادیا۔ دھوکے سے انتظام الدولہ اور عالمگیر ثانی کو بھی قتل کیا گیا۔ اور اسی دوران میں دُرّانیوں اور دکنیوں میں جھڑپ ہو گئی۔ غریب دلی پھر لوٹی گئی۔ اور ابکی بار ایسی تباہ ہوئی جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ اُدھر میر صاحب راجہ ناگرمل سے معافی مانگ کر طرح طرح کی سختیاں اُٹھاتے معہ متعلقین برسانہ پہونچے اور وہاں سے کمھیر گئے۔ یہاں بہادر سنگھ پسر رادھا کشن خزانچی صفدر جنگ نے ان کی بڑی دلدہی کی اور بے انتہا آدمیت سے پیش آیا۔ مگر پھر بھی اذیتیں اُٹھانا پڑیں۔ کچھ عرصہ کے بعد جب دکنیوں اور دُرّانیوں کی فیصلہ کن جنگ ہو چکی تو راجہ ناگرمل کمھیر پہونچے۔ راجہ کے صاحبزادے رائے بشن سنگھ نے میر صاحب کو ٹھہرا لیا تھا اور کچھ درماہہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ مگر یہ بددل تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے راجہ سے عرض کیا کہ اب تک حضور کا انتظار تھا۔ ورنہ مجھے یہاں رہنے کی تاب نہیں۔ اجازت عطا فرمائی جائے کہ بندہ رخصت ہو۔ راجہ نے کہا کہ میر صاحب کچھ خیر ہے یہ آپ فرما کیا رہے ہیں۔ ایسے پرآشوب زمانے میں میں آپ کو جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اسکے بعد تنخواہ مقرر کر دی اور کچھ زرِ نقد سے امداد بھی کی۔ مجبوراً اُن کو پھر وہیں قیام کرنا پڑا۔ اور یہ قیام قریب قریب مستقل رہا۔ جب دکنیوں نے شکست فاش کھائی اور دُرّانیوں کا پورا پورا تسلط ہو گیا۔ تو دلّی میں ذرا پھر سکون و اطمینان کی لہر دوڑی اور کوئی خوف و خطر باقی نہ رہا۔ تمام سرداران قدیم کے پتہ پر فرمان بھیجکر عزت و احترام کے ساتھ اُن کو طلب کیا گیا۔ اسی دوران میں راجہ ناگرمل کے نام بھی پیام پہونچا۔ چنانچہ یہ دلی آگئے اور میر صاحب کی بھی واپسی ہو گئی

اس مرتبہ دلّی کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ نہ وہ مکان نہ وہ مکین۔ نہ وہ محلے نہ بازار۔ ہر طرف وحشت ہر طرف ویرانی نہ دوست نہ آشنا۔ میر صاحب کے قلب پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ اس بات کی طرف اُن کے بعض شعر بھی اشارہ کرتے ہیں ؎

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُنھیں	تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا
دلّی میں اب کے آکر اُن یاروں کو نہ دیکھا	کچھ وے گئے شتابی کچھ ہم بدیر آئے
منزل نہ کر جہاں کو کہ ہم نے سفر سے آ	جس کا لیا سراغ سُنا وے گزر گئے
شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا اُن کی	اُنھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

اسی دوران میں راجہ ناگر مل کو شجاع الدولہ کے پاس اس لیے بھیجا گیا کہ درانیوں سے وزیر الممالک کی صفائی ہو جائے۔ میر صاحب بھی اس سفر میں ساتھ رہے۔

سورج مل جاٹ کی بغاوت کی ابتدا ہوئی اور وہ اکبر آباد پر متصرف ہو گیا۔ خود بادشاہ کو اُسکی گوشمالی کے لیے جانا پڑا۔ سورج مل نے ناگر مل سے امداد چاہی کہ کسی طرح وہ آڑے آئے۔ اسی لیے ناگر مل کو اکبر آباد جانا پڑا۔ میر صاحب بھی اسی تقریب سے تیس برس کے بعد اپنے وطن مالوف پہونچے اور اپنے بزرگوں کے مزاروں پر فاتحہ پڑھنے اور عزیزوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ مگر چونکہ زمانہ کی آب و ہوا کے ساتھ ساتھ اکبر آباد بھی بدل گیا تھا اس لیے کچھ جی نہ لگا۔ پھر بھی چار مہینے رہے۔ بعدہ پھر راجہ کے ساتھ ہی سورج مل کے قلعوں میں واپس آ گئے۔

اسی طرح ایک مرتبہ اسکے بعد جب رگھوناتھ راؤ دکھنی کی فوج نے ملک میں فتنہ و فساد پھیلا رکھا تھا اور سورج مل جاٹ کے لڑکے جواہر سنگھ سے اُن کی آویزش کا خوف تھا۔ درّانیوں کے جدید حملے کی خبریں اُڑ رہی تھیں تو ناگر مل کو پھر آگرے جانا پڑا۔ میر صاحب ہمراہ رکاب تھے اس لیے وہ بھی دوبارہ وطن کی ہوا کھا آئے۔ مگر صرف پندرہ روز قیام کر کے واپس آ گئے۔

زمانہ بدلتا رہا۔ تازہ واقعات ہوتے رہے۔ مگر اس سانحے کو میر صاحب نے سانحۂ عظیم لکھا ہے۔ کہ سورج مل جاٹ کا لڑکا کسی معمولی آدمی کے ہاتھ سے اکبر آباد میں قتل ہو گیا۔ اسکے بھائی راؤ رتن سنگھ کو ریاست ملی وہ شرابی اور بدکردار تھا کسی نے اُس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اور پھر کھیری سنگھ اُسکے لڑکے کو گدی ملی اور سورج مل کا چوتھا لڑکا نول سنگھ سرپرست قرار پایا۔

اور جاٹوں کی شورش بیجانے پھر زور پکڑا۔ راجہ ناگرمل کو کامان جانا پڑا یہ ایک سرحدی مقام تھا۔ اور راجہ مادھو سنگھ کے لڑکے پرتھی سنگھ کے قبضہ میں تھا۔ میر صاحب بھی راجہ کے ساتھ وہاں گئے اور کچھ دن قیام کرنا پڑا۔ راجہ نے میر صاحب کو بادشاہ سے صفائی کرانے کے لیے بھیجا اور یہ حسام الدین خاں سے ملکر تمام معاملات طے کرآئے۔ مگر راجہ پھر چھوٹے لڑکے کے کہنے سے دکنیوں سے جا ملا۔ میر صاحب کو بڑا رنج ہوا۔ اگرچہ یہ پھر بھی راجہ کے ساتھ رہے۔ مگر نہایت شرمندہ اور بددل رہے۔ آخر دہلی آگئے۔ متعلقین کو عرب سرائے میں چھوڑا اور آپ تلاش معاش میں گھومتے رہے۔ لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ نہایت پریشان تھے۔ لشکر میں ایک ایک کے سامنے ضرورتوں کا اظہار کیا کسی نے نہ سنی۔ بہزار دقت وجیہ الدین خاں برادر حسام الدولہ نے کچھ مقرر کیا جس سے خوش وناخوش زندگی گزر رہی تھی۔

مگر باایں ہمہ مصائب دلّی میں ان کا دل زندہ تھا۔ وہ اپنے یہاں مشاعرے بھی کرتے تھے اور اس پابندی کے ساتھ کہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ اسی شغل کے لیے مخصوص تھی۔ اپنے خاص دوستوں سے اُن کی ہم جلیسی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ہنستے بولتے تھے بذلہ سنجی کرتے تھے۔ باہم گپیں تک مارتے تھے۔ احباب سے ملنا جلنا۔ لوگوں کا ان کے پاس آنا۔ اور اُن کا دوسروں کے یہاں جانا جاری تھا۔ شہر میں جابجا جو مطارحے اور مشاعرے کی محفلیں ہوتی تھیں وہ اُن میں شریک ہوتے تھے۔ خواجہ میر درد۔ میر سجاد۔ میر علی نقی کافر کے یہاں کی صحبت شعر خوانی کا انھوں نے خود پتہ دیا ہے اور عجب نہیں کہ میاں مصحفی کے یہاں بھی کبھی تشریف لے جاتے ہوں۔

اُن کی شعر و شاعری کا عروج دہلی ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ اور نہ صرف شروع ہوا تھا بلکہ وہ اس حد تک پہونچ گیا تھا کہ لوگ اُن کے شعروں پر سر دُھنتے تھے۔ جابجا اُن کی غزلوں کی نقلیں لی جاتی تھیں۔ اسکی گواہی وہ خود دیتے اور فرماتے ہیں۔

کس نے سن شعر میر یہ نہ کہا	کہیو پھر ہائے کیا کہا صاحب
اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میر	پہ میرے شعر نے روئے زمیں تمام لیا
یہ میر ستم کشتہ کسی وقت جواں تھا	انداز سخن کا سبب شور و فغاں تھا
جادو کی پڑی پرچۂ ابیات تھا اس کا	منھ تکئے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا

جس راہ سے وہ دلزدہ دلی میں نکلتا
ساتھ اس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا

افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک
آندھی تھا بلا تھا کوئی آشوب جہاں تھا

میرؔ دریا ہے سنی شعر زبانی اُس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اُسکی

ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اُسکی

مرثیئے دل کے کئی کہکے دیئے لوگوں کو
شہر دلی میں ہے سب پاس نشانی اُسکی

پھر یہی نہیں کہ دلی اُن کے کمالات کی جولانگاہ تھی بلکہ اُنھوں نے بیان کیا ہے کہ

سرسبز ملک ہند میں ایسا ہوا کہ **میرؔ**
یہ ریختہ لکھا ہوا تیرا دکن گیا

سرسبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ
ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکن بیچ

کچھ ہند ہی میں **میرؔ** نہیں لوگ جیب چاک
ہے میرے ریختوں کا دوانا دکن تمام

دور تک رسوا ہوا ہوں شہروں شہروں ملک ملک
میرے شعر و شاعری کا تذکرہ گھر گھر ہے اب

ملکوں ملکوں شہروں شہروں قریہ قصبہ دیہہ دیار
شعر و بیت و غزل پر اپنی ہنگامہ ہے گھر گھر آج

شعر ہمارے عالم کے ہر چار طرف کیا دوڑے ہیں
کس وادی آبادی میں یہ حرف و سخن مشہور نہیں

ہر چند شعر **میرؔ** کا دل معتقد نہ تھا
پر اس غزل کو ہم نے بھی سنکر لکھا رکھا

ذوق سخن ہوا ہے اب تو بہت ہمیں بھی
لکھ لیں گے **میرؔ** جی کے اشعار چیدہ چیدہ

اشعار **میرؔ** سب نے چن چن کے لکھ لیے ہیں
رکھینگے یاد ہم بھی کچھ بیتیں چیدہ چیدہ

امرا کی محفلوں میں ان کی غزلوں کی داد دی جاتی تھی۔ اور لوگ ان سے محظوظ ہوتے تھے۔ صوفیا کی خانقاہوں میں اہل دل کو ان پر وجد و حال آتا تھا۔

مطرب سے غزل **میرؔ** کی کل ہم نے پڑھائی
اللہ رے اثر سب کے تئیں رقت سی آئی

جس شعر پر سماع تھا کل خانقاہ میں
وہ آج میں سنا تو ہے میرا کہا ہوا

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک **میرؔ** کی شب کو
مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو

ہے مری ہر اک غزل پر اجتماع
خانقہ میں کرتے ہیں صوفی سماع

وجد میں رکھتا ہے اہل شعر کو
میرے شعر و شاعری کا استماع

ان اشعار کو میرؔ کی تعلی شاعرانہ سمجھنا غلطی ہوگی۔ ذکر میر دیکھنے کے بعد فوراً یقین ہو جاتا ہے کہ عوام و خواص۔ امیر و فقیر۔ شاہ و گدا ہر ایک کے تقرب کی وجہ میرؔ کے لیے صرف شاعری تھی ورنہ اور کوئی چیز ایسی نہ تھی کہ وہ ان جگہوں میں رسائی حاصل کر سکتے۔ یہ اور بات ہے کہ آتی

قدردانی کے بعد بھی میر صاحب سمجھتے تھے کہ میرے کمال کی صحیح داد نہیں دی جاتی۔ اور جیسے جواہر ہیں اُن کے مطابق کوئی خریدار نہیں ملتا۔ وہ سمی داد کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسکو فن کی ایک توہین جانتے تھے۔ ذیل کے شعر دیکھئے۔

فکر کو نازک خیالوں کی کہاں پہونچے ہیں یار ۔۔۔ ورنہ ہر مصرع میں یاں معشوق شوخ و شنگ ہے
سرسری کچھ سُن لیا پھر واہ وا کر اُٹھ گئے ۔۔۔ شعر یہ کم فہم سمجھے ہیں خیال بنگ ہے

ان کا احساس کمال بڑھ رہا تھا اور اسی احساس کیوجہ سے ان کی شاعرانہ نازک مزاجی کی حد یہاں تک پہونچی تھی کہ وہ معاصرین کو ہیچ و پوچ ناقابل مہمل گو وغیرہ سبھی کچھ سمجھ کر اپنی غزلوں میں اُن پر صاف صاف چوٹیں کرنے لگے تھے۔

کہاں عاجز سخن قادر سخن ہوں ۔۔۔ نہیں ہے شبہ یاروں کے سخن میں
کس کا ہے قماش ایسا گودڑ بھرے ہیں سارے ۔۔۔ دیکھو نہ جو لوگوں کے دیوان نکلے ہیں
دعوے کو یار آگے معیوب کر چکے ہیں ۔۔۔ اس ریختے کو ورنہ ہم خوب کر چکے ہیں
خیروں نے ریختہ کو دوں ریختہ بنایا ۔۔۔ جوان دنوں ہیں بالے لڑکوں کی بالیاں ہیں
بات بنانا مشکل سا ہے شعر سبھی یاں کہتے ہیں ۔۔۔ فکر بلند سے یاروں کو اک ایسی غزل کہہ لانے دو

اُستاد ناشاد دوسری بات ہے اور ان باتوں کا تحمل دوسری شئے۔ معاصرین ان کو مغرور کہنے لگے۔ میر صاحب نے یہ اور غضب کیا کہ ایک نظم اژدرنامے کے نام سے لکھ ڈالی اور ستم بالائے ستم یہ کہ سرمشاعرہ سُنانے بیٹھ گئے۔ اس میں تمام معاصر شعرا کو چھوٹے سانپ سنپولیوں اور دوسرے کیڑے مکوڑوں سے تشبیہ دی ہے۔ اور اپنے آپ کو ایک اژدہا بتایا ہے۔ بھلا ٹھنڈے دل سے کون اس کو سُن سکتا۔ چنانچہ محمد امان نثار نے سرمشاعرہ اس کے جواب میں غزل پڑھی اس کا مقطع یہ ہے۔

حیدر کرار نے وہ زور بخشا ہے **نثار** ۔۔۔ ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلے چیر کر

لوگوں نے یہ غزل سُنکر نثار کی خوب خوب تعریفیں کی۔ اور میر صاحب کو خفیف ہونا پڑا۔
ایک تو فن شعر میں یہ خاص بات ہے کہ خوش گو کے لوگ خواہ مخواہ دشمن ہو جایا کرتے ہیں۔ اسپر جب اُسکی طرف سے کوئی خاص مظاہرہ ہو تو مخالفت دونی ہو جاتی ہے۔ یہی ہوا کہ میر صاحب کے مخالفین کی تعداد بڑھ گئی۔ بقا نے بھی شاید اسی وجہ سے یہ شعر کہا۔

پگڑی اپنی سنبھالیے گا **میر** ۔۔۔ اور بستی نہیں یہ دلی ہے

میر صاحب کی روانگی لکھنؤ ہمعصروں کی مخالفت دہلی کی تباہی و بربادی معیشت کی فکر احبار و اعزا کی جدائی ۔ آئے دن کی مصیبت نے میر صاحب کو نہ صرف دل برداشتہ بلکہ عزلت گزین اور صحیح معنی میں گوشہ نشین بنا دیا تھا ؂

میر صاحب کو دیکھیے جو بنے	اب بہت گھر سے کم نکلتے ہیں
کیا کہیں میر جی ہم تم سے معاش اپنی غرض	غم کو کھا یا کریں ہیں لوہو پیا کرتے ہیں

ان کو سوائے شاعری کے کسی سے تعلق خاطر باقی نہ رہا تھا ۔ بار بار دلی چھوڑنے کا ارادہ بھی کرتے تھے ۔ مگر بے سرو سامانی کے ہاتھوں مجبور تھے کرتے تو کیا کرتے اور جاتے تو کہاں جاتے ۔

اس کو میر صاحب کی خوش قسمتی کہیئے یا حسن اتفاق سے تعبیر کیجیے کہ وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بہادر کو کسی طرح سے اُن کا خیال آیا ۔ اور نواب سالار جنگ خلف اسحاق خاں موتمن الدولہ اور اُن کے برادر خرد اسحاق خاں نجم الدولہ سے میر صاحب کا ذکر کیا ۔ اور فرمایا اگر میر محمد تقی یہاں آجائیں تو اچھا ہے ۔ یہ لوگ چونکہ خان آرزو کے مربی اور قدر دان تھے اور انھیں کی وجہ سے میر صاحب سے بھی تعلقات تھے ۔ لہذا اس موقع کو میر صاحب کے لیے فال مبارک خیال کر کے زادراہ سرکار سے لیکر ان کو خط لکھدیا کہ صورت حال یہ ہے ۔ فوراً لکھنؤ پہونچو ۔ دلی کی خانہ جنگیوں ، بدامنیوں نے میر صاحب کو مدتوں سے نہ صرف دلتنگ بلکہ برداشتہ خاطر بنا رکھا تھا ۔ اور وہ اگرچہ دلی کو جان سے پیارا جانتے تھے ۔ مگر با اینہمہ اُسکے چھوڑ دینے پر آمادہ بیٹھے تھے خط اور زادراہ پاتے ہی ع رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں ۔ کہتے اور فرخ آباد کیطرف سے قطع منازل کرتے ہوئے لکھنؤ پہونچے ۔ ہرچند کہ فرخ آباد کے رئیس اعظم مظفر جنگ نے چندروز ٹھہرنے کے لیے ان سے اصرار بھی کیا ۔ مگر اُنھوں نے منظور نہ کیا ۔

لکھنؤ پہونچ کر نواب سالار جنگ خلف اسحاق خاں مرحوم کے یہاں فروکش ہوئے ۔ اور وہ بڑی تواضع کے ساتھ پیش آئے ۔ اور اسکے بعد موقع محل دیکھ کر وزیر الممالک کے حضور میں بھی عرض کر دیا کہ میر صاحب یہاں پہونچ چکے ہیں ۔

اُس زمانے میں لکھنؤ میں مرغ بازی کا بڑا چرچا تھا ۔ گلی کوچوں میں مرغوں کی پالیاں ہوتی تھیں ۔ چنانچہ خود نواب کو بھی اس کا ایک ذوق تھا ۔ اور اسی تقریب سے میر صاحب کو شرف باریابی نصیب ہوا ۔ مرغ لڑ رہے تھے ۔ وزیر الممالک نواب آصف الدولہ مصروف تماشا

تھے۔ میر صاحب بھی اس مجمع میں تھے۔ یکایک نواب کی نظر ان پر پڑی اور فوراً بشرے سے
معلوم کر کے پوچھا کیا تم میر محمد تقی ہو۔ انھوں نے مؤدبانہ سلام کیا۔ نواب سراپا اخلاق سراسر
تہذیب۔ ہمہ تن محبت تھے۔ بغلگیر ہوئے۔ اور اپنے نشستگاہ خاص تک لے گئے۔ کچھ کلام
سنایا۔ میر صاحب نے جی کھول کر داد سخن دی۔ نواب نے ازراہ قدردانی ان سے بھی پڑھنے
کے لیے کہا۔ انھوں نے بھی کچھ سنایا۔ نواب سالار جنگ نے اسیوقت عرض کیا کہ اب یہ
حسب الحکم حاضر ہو گئے ہیں کوئی مناسب جگہ ان کے لیے تجویز کر دی جائے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ
عنقریب کچھ مقرر کر کے اطلاع دی جائیگی۔ دو تین روز بعد پھر یہ طلب کیے گئے۔ اور انھوں
نے ایک قصیدہ مدحیہ پیش کیا جس کا مطلع یہ بتایا جاتا ہے۔

ہوا کیسے ہیں از بس شکوہ فلک تحریر ‏ سیہ ہے کاغذ مشقی کے رنگ لوح ضمیر

اسکے بعد بقول آزاد دو سو روپیہ اور بقول میر لطف تین سو روپیہ ماہوار مقرر ہو گئے۔ اور اب
میر صاحب فارغ البالی کے ساتھ لکھنؤ میں رہنے لگے۔ یا بالفاظ دیگر اُن کو اپنے اظہار کمال کیلیے
وہ وقت مل گیا جو اب تک نہ مل سکا تھا۔

لکھنؤ کا قیام

میر صاحب کے بعض معاصرین میر صاحب سے پہلے لکھنؤ آ چکے تھے۔ چنانچہ
ان میں مرزا سودا اور میر سوز خاص طریقہ سے ذکر کے قابل ہیں۔ یہاں ان لوگوں
کے کمال کا سکہ اتنا بیٹھ گیا تھا کہ خود نواب آصف الدولہ میر سوز کے شاگرد ہو گئے تھے میر صاحب
کا ذکر خیر بھی ادبی مجلسوں اور علمی محفلوں میں برابر آتا رہا ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ اہالیان لکھنؤ
اُن کے روشناس نہ تھے۔ مگر غائبانہ سب کے سب ان کے کمال کے معرف تھے۔ یہاں پہونچنے
پر اُن کی ویسی قدر و منزلت ہوئی جو ہونا چاہیئے تھی۔ اور اُسی طرح اُن کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔
جس کی اُمید کی جاسکتی تھی۔ دربار آصفی میں ان کی بڑی عزت تھی۔ اور وزیر الممالک ان کو اتنا عزیز
رکھتے تھے کہ سفر و حضر میں کہیں جدا نہ کرتے تھے۔ جشن شادی اور کھیل تماشوں کی محفلیں تک ان سے
خالی نہ ہوتی تھیں۔ میر صاحب کے لکھے ہوئے شکار نامے۔ ہولی نامہ۔ مثنوی کدخدائی آصف الدولہ
وغیرہ اس کی گواہ ہیں۔ مگر بعض تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ وہ اپنی گرفتہ مزاجی کے سبب سے
دربار میں کم جاتے تھے۔ بلکہ یہ لطیفہ بھی لکھا گیا ہے۔ کہ ایک مرتبہ میر صاحب غزل پڑھ رہے
تھے نواب سن رہے تھے۔ مگر اس حالت میں بھی نواب اپنی چھڑی سے مچھلیوں کے ساتھ
کھیلتے جاتے تھے۔ میر صاحب غزل پڑھتے پڑھتے رک گئے۔ اور عرض کیا کہ جب حضور متوجہ

ہونگے تو عرض کرونگا۔ نواب نے جواب دیا کہ شعر خود متوجہ کرلیگا۔ میر صاحب نے غزل پڑھنا بند کردی اور اپنے گھر چلے آئے۔ چند روز بعد نواب بازار سے گزرے تو میر صاحب کو کہیں دیکھا اور ارشاد فرمایا کہ میر صاحب اب آپ دربار میں تشریف نہیں لاتے۔ میر صاحب نے عذر گناہ بدتر از گناہ کی مصداق یہ جواب دیدیا کہ بازار میں باتیں کرنا شرفا کا دستور نہیں ہے۔

نواب آصف الدولہ کے انتقال کے بعد بھی یہ دربار سے وابستہ تو رہے مگر صحبت درگیر ہونے کے باعث دربار کا آنا جانا بند تھا۔ ایک روز نواب سعادت علی خاں کی سواری چوک میں تحسین کی مسجد کے سامنے سے ہوکر گزری۔ عوام و خواص تعظیماً سروقد کھڑے ہو گئے۔ مگر میر صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے جیسے بیٹھے تھے بیٹھے رہے۔ انشاء ساتھ تھے اُنھوں نے بتایا کہ یہ میر تھے۔ نواب کے حُسن اخلاق کو دیکھیے کہ اُنھوں نے جاتے ہی میر صاحب کے لیے خلعت بحالی اور ایک ہزار روپیہ نقد روانہ کیا۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ ایک ملازم کے ہاتھ روانہ کیا گیا۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ میر صاحب نے اسکو واپس کردیا۔ مگر بعد کو میر انشاء اللہ خاں انشاء گئے میر صاحب کو سمجھایا بجھایا اور نواب کا عطیہ قبول کرنے پر مجبور کیا۔ کبھی کبھی یہ دربار جانے لگے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیے کہ وہ مشاعروں وغیرہ سے دست بردار ہو گئے۔ بلکہ وہ ادبی صحبتوں میں ہمیشہ شریک ہوتے رہے اور لوگ ان کے کلام کو دل میں جگہ دیتے رہے۔ سب نے اُنکو استاد مانا۔ اور مسلک شاعری کا پیشوا جانا۔ مگر انسان طبعاً اور فطرتاً ماضی پرست واقع ہوا ہے۔ میر صاحب اس قدردانی کے باوجود بھی دلی کو ہمیشہ لکھنؤ پر ترجیح دیتے تھے۔ اور برابر اُسکو یاد کرتے رہتے تھے۔ ذیل کے اشعار اُن کے اس کرب کو ظاہر کرتے ہیں۔ اُن کے یہ خیال شاعرانہ نہیں بلکہ اس اشتیاق نے اُن کو دعائیں مانگنے پر مجبور کردیا تھا۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تعریف میں قصیدہ لکھتے ہوئے آخر میں کہتے ہیں:

گر دی کرے تنک بھی اعانت تری تو پھر — آجائے پختگی پہ مرا یہ خیال خام
یعنی کہ دیکھوں حضرت دلی کی پھر نواح — معلوم ہے سوائے ترے حاصل کلام

ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں — دلی سے بھی دیار ہوتے ہیں

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے — جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ہر روز نیا ایک تماشا دیکھا — ہر کوچے میں سو جوان رعنا دیکھا
دلی تھی طلسمات کہ ہر جا کہ میر — ان آنکھوں سے آہ ہم نے کیا کیا دیکھا

ایک جگہ نہایت درد انگیز لہجے میں ہوا کے ہاتھوں دلّی والوں کو پیام بھیجتے ہیں اور کہتے ہیں۔

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گزار
کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حال زار

خاکِ دہلی سے جدا ہم کو کیا یکبارگی
آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار

منصب بلبل غزلخوانی تھا سو تو ہے اسیر
شاعری زاغ و زغن کا ہو نہ ہووے اب شعار

اس نظم میں ۳۲ شعر ہیں اور سب کے سب ہیں نہایت درد انگیز انداز میں اگلی صحبتوں کو یاد کیا گیا ہے۔ پھر یہی نہیں ہے بلکہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ لکھنؤ سے ان کو ایک خاص تنفر تھا جیسا کہ ان شعروں سے معلوم ہوتا ہے۔

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یہاں

برسوں سے لکھنؤ میں اقامت ہے مجھکو لیک
یہاں کے چلن سے رکھتا ہوں عزم سفر ہنوز

آباد اُجڑا لکھنؤ چندوں سے اب ہوا
مشکل ہے اس خرابے میں آدم کی بود و باش

اس تنفر کی وجہ کہیں کہیں ظاہر بھی ہو گئی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ لکھنؤ میں میرے کلام کے سمجھنے والے نہیں ہیں۔ اگر قدردانی بھی ہوتی ہے تو وہ صرف تحسین ناشناس کا درجہ رکھتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

کس کس ادا سے ریختے میں نے کہے ولے
سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

مربوط کیسے کیسے کہے ریختے ولے
سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

بہت کچھ کہا ہے کرو میر بس
کہ اللہ بس اور باقی ہوس

جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا
خریدار لیکن نہ پایا گیا

متاع ہنر پھیر کر لے چلو
بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

گو لکھنؤ ویران ہو ہم اور آبادی میں جا
مقسوم اپنا لائیں گے خلق خدا ملک خدا

کیا قدر ہے ریختہ کی گو میں
اس فن میں نظیری کا بدل تھا

غرض وہ آخر وقت تک لکھنؤ میں رہے مگر دلی کو کبھی نہ بھولے۔ اور جب دلّی کو نہیں بھولے تو شاید لکھنؤ میں خوش بھی نہیں رہے۔

میر صاحب کے اخلاق و عادات

میر صاحب کو اُن کے تمام معاصرین جنہوں نے شعرا کے تذکرے لکھے ہیں نہایت تنک مزاج

مغرور و متکبر لکھا ہے - اور مولانا آزاد دہلوی نے تو آبحیات میں اسکے متعلق کچھ حکایات ایسی لکھی ہیں جن سے اُن کی بد دماغی جنون و وحشت کی حد تک پہونچتی ہے - اگرچہ اسکی بعض محققین نے مخالفت کی ہے - مگر اس کو کیا کیا جائے کہ خود میر صاحب ہی کے کلام سے اس کا کافی ثبوت ملتا ہے - فرماتے ہیں ؎

ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ　　از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

میر کی گرمی تم سے اچنبھا ہے　　کس سے ملتا ہے وہ دماغ جلا

جیسی عزت مرے دیواں میں امیروں کی ہوئی　　ویسی ہی اُن کی بھی ہوگی مرے دیوان کے بیچ

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میر جی　　جوں شیشہ میرے منھ نہ لگو میں نشے میں ہوں

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی　　تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

صحبت کسی سے رکھنے کا اسکو نہ تھا دماغ　　تھا میر بے دماغ کو بھی کیا بلا دماغ

باتیں کرے بہ تشنگی دل کی یہ کہاں　　کرتا ہے اس دماغ جلے کا وفا دماغ

دو حرف زیر لب کہے پھر ہو گیا خموش　　یعنی کہ بات کرنے کا کسکو رہا دماغ

شیریں لباں جہاں کے نہیں چھوٹ جانتے　　ہیں گو کہ میر صاحب و قبلہ کم اختلاط

اس کج خلقی - بیدماغی - نازکمزاجی - غرور - تکبر کی کئی وجہیں ہیں - ایک تو یہ کہ زمانے کے پے درپے مصائب - آئے دن کی مصیبت - فاقہ کشی - نامرادی نے اُن کو چڑچڑا بنا دیا تھا - اور چونکہ وہ دنیا و اہل دنیا سے مایوس ہو گئے تھے - لہذا بغیر کسی رو و رعایت کے ہر شخص سے وہ باتیں کہہ دیتے تھے جو اُن کے جی میں آتی تھیں - اس میں کسی کو بُری بھلی معلوم ہوتی تو وہ اُس کی پروا نہیں کرتے تھے - جیسا کہ فرماتے ہیں ؎

کہنا جس سے جو کچھ ہوگا سامنے میر کہا ہوگا　　بات نہ دل میں پھر گئی ہوگی منھ پر میرے آئی ہوئی

دوسرے اُن کو اپنے اوائل شباب میں جنون ہو چکا تھا - اور گو وہ علاج ہونے پر اس سے صحتیاب ہو گئے تھے مگر پھر بھی کسی قدر اس کا اثر باقی تھا - جس نے اُن کو بددماغ مشہور کر دیا تھا تیسری سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اُن کو اپنے کمال کا احساس اسدرجہ بڑھ گیا تھا کہ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے - اور اس میں یہ امتیاز بھی باقی نہ رہا تھا کہ کم از کم اُن ہی لوگوں سے ایسی باتیں کریں جو شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے ہوں - بلکہ برعکس اس کے وہ ہر شخص سے یکساں پیش آتے تھے - (چونکہ تھے) وہ اُن ہاتھوں اور اُن گودوں کے پرورش یافتہ تھے جن کے نزدیک ریا ایک جرم ہے

اور قناعت اور توکل استغنا ایک خاص چیز ہے۔ دنیا اور اہل دنیا اُن کی نگاہ میں بے وقعت۔ چھوٹے اور بڑے اُن کے نزدیک یکساں۔ بادشاہ اور فقیر ایک درجہ رکھنے والے ہیں۔ پھر اگر اور کچھ نہیں تو میر صاحب کیا اتنے بے لاگ اور صاف گو بھی نہ ہوتے کہ لوگ اُن کو مغرور سمجھ لیں میر صاحب کے اخلاق وعادات پر نوادر الکلام میں بڑی گہری روشنی ڈالی گئی ہے۔ جسکی یہ عبارت اُس دیوان کے نسخے پر درج ہے جسکا میں ذکر کر چکا ہوں۔ میرے خیال میں اس عبارت کے دیکھنے پر اُنکے حالات آئینہ ہو جاتے ہیں اور ایک حد تک وہ اس جرم سے بھی بری ہو جاتے ہیں جو غرور وتکبر کی وجہ سے اُن پر لگایا جاتا ہے۔

"مرحوم مردے بود متوکل۔ سپاہی پیشہ۔ رقیق القلب۔ پابند وضع۔ جہاندیدہ۔ سرد وگرم زمانہ چشیدہ سرآمد سخنوران ماضی وحال۔ در سخن سنجی بیمثال۔ کم اختلاط۔ وبا دوستاں سراپا ارتباط۔ سنجیدہ۔ از حرص وہوائے دنیا آزاد۔ وکسے راکہ نیاز ز روے۔ ہرگز حملہ براں نیاوردے۔ کسے را بدی نگفت۔ وبدی شنفت۔ استغنائے بیش از بیش۔ بہ تعظیم ہر کہ ومہ پیشا پیش"

یہ چیزیں ہمارے لیے بادی النظر میں نئی معلوم ہوتی ہیں اور خیال ہوتا ہے کہ میر صاحب انسانیت کے بہتر جواہر سے آراستہ تھے یا وقائع نگار نے اِنکا صحیح حال بیان کرنے میں کوتاہی سے کام لیا پھر بھی پابند وضع کم اختلاط۔ بدی شنفت۔ استغنائے بیش از بیش۔ ہمارے سامنے وہی مفہوم پیش کر دیتے ہیں۔ جسکے سب تذکرے گواہ ہیں۔ اور یہی چند فقرے نہیں بلکہ مندرجۂ بالا عبارت کا ہر لفظ اُن کے ایک حال اور ایک صفت پر پوری پوری روشنی ڈالتا ہے۔ جسکی اُن کے حالات اور اُن کی تصانیف سے پوری پوری تائید ہوتی ہے۔

غرضکہ جہاں میر صاحب نہایت خوددار۔ غیور۔ سنجیدہ۔ ظریف۔ دوست اور دوستوں کے قدردان تھے وہاں وہ ہر کس وناکس سے اختلاط بھی نہ بڑھاتے تھے اور دیر آشنائی کے باعث مغرور معلوم ہوتے تھے۔ مگر اُن کے تذکرے اور دوسری تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے لیے حاضر وغائب یکساں تھے۔ اور ہمیشہ اُن کے مداح رہتے تھے۔ معقول بات کے ماننے میں اُن کو کوئی دریغ نہ تھا۔ اسی سے وہ اپنے اس شعر کی زندہ مثال اور بولتی تصویر تھے ؎

حرف وحکایت شکر وشکایت ہے اک وضع ووطیرہ پر
میر کو جاکر ہم نے دیکھا ہے مرد معقول کوئی

اُن میں جیسے حُسن پرستی کا مادہ ودیعت کیا گیا تھا۔ اسی طرح سے درویش مزاجی اور درویش پسندی اُنکی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی۔ ذکرِ میر اور فیضِ میر اسکی شاہد عادل ہیں۔

وہ اپنے اشعار میں اپنی ہمہ دانی کے زعم میں معاصرین پر چوٹیں کرتے رہے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو نہایت بلند رتبہ شاعر مانا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ان کی منصف مزاجی۔ ان کی انسانیت۔ اُن کے انکسار نفس کے جوہر بھی کہیں کہیں نمایاں ہوگئے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

نقصان ہوگا اس میں نہ ظاہر کہاں تلک
ہوویں گے جس زمانے میں صاحب کمال ہم

مستعدوں پر سخن ہے آج کل
شعر اپنا فن سو کس قابل ہے میاں

گئی عمر در بند فکر سخن
سو اس فن کو ایسا بڑا کر چلے

ان کے مزاج میں استغنا حد سے زیادہ تھا۔ وہ اپنی خودداری کے سامنے بڑی سے بڑی دولت کو ٹھوکر مار دیتے تھے۔ وہ امرا کی مجالس میں اپنی شان اور اپنی آن بان کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے اور دم کے دم میں اس تاج دولت کو زمین پر ٹپک دیتے تھے جہاں ان کی عزت پر ذرا سا دھبہ لگتا تھا۔ ذکرِ میر میں کئی واقعے اسی قسم کے درج ہیں۔

ان کی وضع سپاہیانہ تھی۔ اور اسی وجہ سے وہ ہر افتاد کو مردانہ برداشت کرتے تھے۔ وہ فقر و فاقے میں بسر کرنا پسند کرتے تھے مگر کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنا اُن کے لیے انتہائی مشکل کا سامنا تھا۔ اُن کا لباس۔ اُن کی قطع وضع سپاہیانہ تھی۔ مگر جیسے جیسے ان کا سن بڑھتا گیا۔ ویسے ہی دنیا سے نفرت بھی بڑھتی رہی۔ اور آخر کار وہ دُنیا سے نہایت متنفر ہوگئے تھے۔ اُن کے لیے یہ فیصلہ کرنا کہ وہ متکبر تھے یکطرفہ فیصلہ ہے۔ اُن کی مختصر تعریف یہ ہے کہ وہ انسان تھے اور کامل انسان۔

میر کی وفات

تذکروں سے یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ میر صاحب کا ۱۲۲۵ھ میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ لیکن اسکے ماسوا تمام تر حالات تاریکی میں تھے۔ مگر نسخہ مذکورہ دیوان میر جلد چہارم قلمی سے وہ تمام باتیں معلوم ہوگئیں۔ جن سے اُن کے حالات کی تکمیل قرار واقعی ہوتی ہے۔ میر صاحب اپنی عمر کے حصّۂ آخر میں لکھنؤ کے محلہ سٹھٹی میں رہتے تھے۔ گو یہ جگہ آج نہیں ہے اور اکثر لوگ اب اس سے بیخبر ہیں۔ مگر یہ محلہ تھا اور اس وقت میں کافی آبادی تھی۔ جان صاحب اپنے ایک شعر میں اس نام کو لائے ہیں ؎ جہاں جاتی ہے

مردوں کی ستھٹی سی ہے لگ جاتی + یہ مجھ بڑھیا کا کاتا ہے جواتوں کا تماشا ہے ؛ میں نے بعض سن رسیدہ حضرات سے اس کے متعلق دریافت کیا تو اتنا پتہ چلا کہ یہ ایک محلہ تھا جو گومتی کے جنوبی کنارے پر آباد تھا۔ میر صاحب کے بعد بھی عرصہ تک یہ آباد رہا۔ چنانچہ سنا ہے کہ میر انیس کا مکان بھی اسی محلہ میں تھا۔ یہ ممکن ہے کہ میری اس تحقیق میں کمی ہو۔ مگر اس مقام کے ہونے میں شک نہیں۔ بہرحال میر صاحب آخر عمر میں یہیں رہتے تھے۔ اور اگرچہ بعض امراض مزمنہ اور ضعف بصر وغیرہ کی شکایت اُن کو پہلے ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ تاہم نہ وہ معذور تھے اور نہ مجبور۔ اپنے تمام فرائض زندگی آسانی سے ادا کرتے تھے۔ اور شعر و سخن میں بھی برابر حصہ لیتے تھے۔ کہ یکایک آسمان نے نیا دور شروع کیا۔ تین برس اُن کے لیے تین حشر آفریں ہنگامے تھے جنکی وہ تاب نہ لا سکے۔ ایک سال میں اُنکی لڑکی کا انتقال ہوا اور دوسرے میں ایک لڑکے کا۔ اور تیسرے میں اُن کی اہلیہ کا۔ ان حوادث سے وہ نہایت پست اور دل شکستہ ہو گئے۔ اُن کے ہوش و حواس میں ایک وارفتگی سی آگئی۔ اور ایک حد تک گوشہ نشین ہو گئے مشاعروں اور دوسری رنگین مجلسوں میں جانا چھوڑ دیا۔ اور جیسا کہ اوائل حال میں اُنھوں نے اپنی دہلی والی رنگین معاشرت کا ذکر میر کے ان فقروں میں بیان کیا ہے کہ :۔

"ناگاہ در محلہ رسیدم کہ در آنجا می ماندم۔ صحبت میداشتم۔ شعر میخواندم۔ عاشقانہ می زیستم۔ شبہا میگریستم۔ عشق با خوش قداں می باختم۔ ایشاں را بلند می انداختم۔ با سلسلہ مویاں می بودم۔ پرستش نکویاں می نمودم۔ اگر دمے بے ایشاں می نشستم تمنا بر تمنا می شکستم۔ بزم می آراستم۔ خوبان را می خواستم۔ مہمانی می کردم۔ زندگانی میکردم۔"

اُن کا قریب قریب ردعمل ہو گیا۔ اور کیا عجب ہے کہ اس عالم میں وہ شعر و شاعری سے بھی دست کش ہو گئے ہوں۔ اور کچھ بھی نہیں تو وہ ذوق و شوق اور وہ ہنگامی خروش اُن میں نہ رہ گیا ہو۔ جس کے وہ عمر بھر خوگر رہے۔ ذیل کے شعر اُنکے جذبات کے خزینہ دار اور شعر سے بیزاری کے آئینہ دار ہیں۔

لطف سخن بھی پیری میں رہتا نہیں ہے میر
کر فکر اپنی طاقت فکری جو ہو ضعیف

کس کو دماغ شعر و سخن ضعف میں کہ میر
بس بہت وقت کیا شعر کے فن میں ضایع

اب شعر ہم پڑھیں ہیں تو وہ شد و مد نہیں
اب شعر و شاعری کی طرف کم لگا دماغ

اپنا رہے ہے اب تو ہمیں بیشتر خیال
میر اب پیر ہوئے ترک خیالات کرو

بہت ہرزہ گوئی کی یہاں میر صاحب | کر دو ھاں کے کچھ منھ دکھانے کی باتیں

وہ ایک مدت تک اسی عالم میں بسر کرتے رہے۔ انقباض مزاج کے ساتھ ساتھ نظام صحت میں اختلال پیدا ہو گیا۔ عوارض مزمنہ نے ترقی شروع کی۔ دو مرض قدیمی انمیں جلیس تھے۔ اُن میں زیادتی ظہور نے لگی۔ چنانچہ وجع مفاصل اور درد قولنج میں ترقی ہونا شروع ہوئی۔ اور اواخر ماہ ربیع الآخر ہی میں اُنھوں نے امراض مہلک کی صورت اختیار کر لی۔ تمام شاہی طبیب اور مشہور معالج میر صاحب کے شناسا اور دوست تھے۔ علاج معالجے شروع کیے اور سب کی یہ رائے ہوئی کہ لگ کر اور جم کر علاج کرنا چاہیئے۔ اور فی الحال السینی دادینا چاہیئے کہ قبض نہ رہنے پائے۔ اسکے بعد ایک تملیین دی گئی۔ اور اُس نے سم قاتل کا کام کیا۔ اطلاق لطن شروع ہو گیا۔ اور ایک ایک دن میں ڈیڑھ ڈیڑھ سو دست آگئے۔ آخر کار مرض موت سے جا ملا۔ اور ۲۰ شعبان المکرم ۱۲۲۵ھ وقت شام نوّے سال عمر پوری کر کے دنیائے فانی کو خیرباد کہا۔ اور ۲۱ شعبان ۱۲۲۵ھ روز شنبہ دوپہر کے وقت اکھاڑہ بھیم میں جو ایک مشہور قبرستان تھا اپنے اعزا و اقربا کی قبروں کے پاس سپرد خاک کئے گئے۔ قریب قریب چار سو آدمیوں نے اُن کے جنازے کی نماز پڑھی اور بہت سے عقیدتمندوں نے غائبانہ اس فریضہ کو ادا کیا۔ اور بعض شعرا نے تاریخیں کہیں۔ جن میں سے دو تاریخیں ہم نقل کر چکے ہیں۔ اور ناسخ کی تاریخ ؎ واویلا مرد شہ شاعراں ۱۲۲۵ھ مشہور ہے۔

میر صاحب اگرچہ شعر و شاعری کی محفلوں کو مدت سے الوداع کہہ چکے تھے۔ مگر اُن کا ذوق سخن آخر وقت تک جاری تھا۔ اور کچھ نہ کچھ فرماتے ہی رہتے تھے۔ چنانچہ آخر وقت میں اُنھوں نے یہ شعر نظم کیا تھا ؎

ساز یسیج آمادہ ہے سب قافلے کی تیاری ہے
مجنوں ہم سے پہلے گیا ہے اب کے ہماری باری ہے

میر بحیثیتِ شاعر

کوئی نقاد کوئی محقق کوئی تذکرہ نویس۔ کوئی وجدان صحیح کا مالک ایسا نہیں ہے جس نے میر صاحب کی جناب میں ہدیۂ عقیدت اور گلہائے تحسین و آفرین پیش کئے ہوں بندگانِ شعر نے خوشی کے ساتھ اُن کو خدائے سخن مانا۔ اور اُن کی ہر صدائے الست پر بلےٰ کہا۔ شیفتہ گلشن بیخار میں انکو اشعر شعرا۔ میر حسن افصح فصحائے زماں قائم شمع انجمن عشقبازاں۔ شفیق میر میدان سخنوری کہتے ہیں۔ اور اسی طرح ہر ایک شخص اُنکی

توصیف میں رطب اللسان ہے - گمر ہم ان سب سے زیادہ خود میر صاحب پر بھروسہ کھتے ہیں وہ باکمال شاعر ہی نہیں - کامل نقاد بھی ہیں - اُنکی اپنے کلام کی بابتہ جو رائے اور جو احساس ہے اُسکو بجنسہ پیش کیے دیتے ہیں - اسکے بعد دوسروں کی تنقید و تحسین - تقریظ و آفرین کی گنجایش ہی نہیں رہتی - اُنھوں نے بارہا اپنے کلام پہ غائر نظر ڈالی - اور کچھ نہ کچھ کہہ گئے سنیئے فرماتے ہیں -

ریختہ رتبے کو پہونچایا ہوا اُس کا ہے
معتقد کون نہیں میر کی اُستادی کا

نکتہ دانانِ رفتہ کی نہ کہو
بات وہ ہے جو ہووے ابکی بات

جو دیکھو مرے شعر تر کی طرف
تو مایل نہ ہو پھر گہر کی طرف

میر گم کردہ چمن زمزمہ پرواز ہے ایک
جسکی لے دام سے تا گوش گل آواز ہے ایک

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدّت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کرو
چاہیئے اہل سخن میر کو استاد کریں

ہو طرف مجھ پہلواں شاعر کا کب عاجز سخن
سامنے ہونے کو صاحب فن کے قدرت چاہیئے

نہ رکھو کان نظم شاعرانِ حال پر اتنے
چلو ٹک میر کو سُننے کہ موتی سے پروتا ہے

مری خلق محو کلام سب تجھے چھوڑتے ہیں خموش کب
مرا حرف رشک کتاب ہے مری بات لکھنے کا باب ہے

دل کسطرح نہ کھینچیں اشعار ریختے کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

تربت میر پہ ہیں اہلِ سخن
ہر طرف حرف ہے حکایت ہے

تو بھی تقریب فاتحہ سے چل
بخدا واجب الزیارت ہے

اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض
اوّل تو میں سند ہوں پھر یہ مری زباں ہے

نکتہ مشتاق و یار ہے اپنا
شاعری تو شعار ہے اپنا

اس زمیں میں غزل اک اور بھی موزوں کر میر
پاتے ہیں زور ہی لذت تری گفتار کے بیچ

مرغِ چمن نے زور رُلایا سبھوں کے تئیں
میری غزل پڑھی تھی سب اک روضہ خواں کیطرح

یک پرچہ اشعار سے مُنھ باندھے سبھوں کے
جادو تھا مرے خامے کی گو یا کہ زباں میں

ہر چند ہے سخن کو تشبیہ دُر سے لیکن
باتیں مری سُنو تم پھینکو دو گہر کو

اشعار میر پر ہے اب ہائے وائے ہر سو
کچھ سحر تو نہیں ہے لیکن ہوا تو دیکھو

سخن یہی ہے جو کہتے ہیں شعر میر ہے سحر
زبان خلق کو کسطرح کوئی بند کرے

ریختہ کا ہے کو تھا اس رتبۂ اعلیٰ میں میر	جو زمیں نکلی اُسے تا آسماں میں لے گیا
فنِ اشعار میں ہوں پہلوان میر	مجھے ہے یاد اس کشتی کا ہر بند
سخن کے ملک کا میں مستقل امیر ہوں میر	ہزار مدعی بھی مجھ کو وہ دلا نہ کریں
اے میر شعر کہنا کیا ہے کمالِ انساں	یہ بھی خیال سا کچھ خاطر میں آگیا ہے
شاعر نہیں جو دیکھا تو ہے کوئی ساحر	دو چار شعر کہہ کر سب کو رجھا گیا ہے
ہر ورق ہر صفحے میں اک شعرِ شور انگیز ہے	عرصۂ محشر کا عرصہ ہے مرے دیوان کا
رونق آبادی ملکِ سخن ہے اس ملک	ہوں ہزاروں دم الٰہی میر کے اک دم کے بیچ
نہ ہوئے ہم نظیری سے یوں تو	شعر کے فن میں بے نظیر ہوئے

میر صاحب کے اصولِ شاعری

شاعر اور خصوصاً ایک کامل الفن اور ماہر شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اوپر کچھ ایسے قیود عائد کرے اور کچھ ایسے قواعد اور کلیے مقرر کرلے جو اسکے کلام کو دوسرے شعرا سے اچھا نہ بنا سکیں تو متمیز کردیں۔ میر صاحب بھی چند باتوں کو پسند کرتے تھے اور چند کو ناپسند۔

(۱) اُن کا خیال ہے کہ شاعری اک فنِ شریف ہے۔ اور شریف ہی اس فن کو اختیار کرتے تھے۔ اجلاف کا اس کوچے میں گزر نہیں۔

صحبتیں جب تھیں تو یہ فنِ شریف	کسب کرتے جنکی طبعیں تھیں لطیف
تھے میز درمیاں انصاف تھا	خار و خس سے کیا یہ عرصہ صاف تھا
دخل اس فن میں نہ تھا اجلاف کو	کچھ بتاتے بھی تھے سو اشراف کو
تھے جو اُس ایام میں اُستادِ فن	ناکسوں سے وے نہ کرتے تھے سخن
ہم تلک بھی تھی وہی رسمِ قدیم	یعنی جن کے ہوتے تھے ذہن سلیم
پیار کرتے تھے اُنھیں اُستادِ فن	اُن کے ہوتے رہبر راہِ سخن
جلف واں زنہار پاتے تھے نہ بار	شاعری کا ہے کو تھا ان کا شعار
نکتہ پردازی سے اجلافوں کو کیا	شعر سے بزازوں ندافوں کو کیا

(۲) شعر کے لیے علمی قابلیت اور معلومات فن کا ہونا ازبس ضروری ہے۔ چنانچہ اسی بارہ میں مثنوی تنبیہ الجہال میں اُنھوں نے وزیر اصفہان اور ہلالی کا قصہ بیان کیا ہے۔

لے مثنوی تنبیہ الجہال ۱۲

(۳) شعر میں زبان اور روزمرہ نہایت صاف ہو۔ روانی کو کسی صورت میں ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔ رکیک خیالات اور عوام کے جذبات وعادات یا گفتگو سے شعر کو کوئی لگاؤ نہ ہو۔ نکات الشعرا میں قدر کے متعلق فرماتے ہیں کہ "زبان او بہ زبان لوطیاں می ماند"۔

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر — یہ ہماری زبان ہے پیارے

حسن تو ہے ہی کرو لطف زباں بھی پیدا — میر کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں

دیکھو تو کس روانی سے کہتے ہیں شعر میر — دُر سے ہزار چند ہے اُنکے سخن میں آب

(۴) شعر میں کوئی خاص انداز بیان اور کوئی نادر بات ہونا چاہیئے۔

کچھ ہوا ہے مرغ قفس لطف نہ جاوے اُس سے — نوحہ یا نالہ ہر اک بات کا انداز ہے ایک

میر شاعر بھی زور تھا کوئی — دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب

لطف سا پیچدار ہے ہر شعر — ہے سخن میر کا عجب ڈھب کا

شعر میرے ہیں سب خواص پسند — پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

سمجھے انداز شعر کو میرے — میر کا سا اگر کمال رکھے

(۵) شعر میں وہی ترکیب فارسی لانا جائز ہے جو زبان پر بار نہ ہو۔ اس فرق کو غیر شاعر نہیں سمجھ سکتا۔ اور جو ترکیب زبان ریختہ سے مانوس نہ ہو اس کا استعمال معیوب ہے۔ اس بات کا سمجھنا بھی سلیقۂ شاعری پر موقوف ہے۔

(۶) متقدمین میں ایہام کا بڑا رواج تھا اور اب اساتذہ اس کو پسند نہیں کرتے مگر جبکہ نہایت شستگی اور رفتگی سے اسکا استعمال کیا جائے۔ ایک جگہ میاں احسن اللہ کے ذکر میں نکات الشعرا میں کہا ہے "مائل با یہام بود۔ ازیں جہت شعرا و بے رتبہ ماند"۔

کیا جانے دل کو کھینچیں ہیں کیوں شعر میر کے — کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

(۷) تنافر سے کلام کو پاک کرنے کی کوشش ضروری ہے۔

نہم حرفوں کے تنافر کا بھی یاروں کو نہیں — اس پہ رکھتے ہیں تنفر سب مری صحبت سے یہاں

(۸) شاعر کو محاورے میں تصرف کرنا جائز نہیں۔ چنانچہ میر سجاد کے اس شعر پر اُنھوں نے اعتراض کیا ہے ؎

میرا جلا ہوا دل مژگاں کے کب ہے لائق — اس آبلے کو کیوں تم کانٹوں میں اینچتے ہو

(۹) جو طرز کلام اور انداز شعر گوئی میر صاحب نے خود اختیار کیا تھا وہ تمام

صنایع بدایع کا حاوی اور حامی تھا۔ تجنیس۔ ترصیع۔ تشبیہ۔ صفائے گفتگو۔ فصاحت۔ بلاغت۔ ادا بندی۔ خیال اُس میں سب پائی جاتی تھیں۔ اور یہی اُن کو پسند بھی تھا۔ اس لیے کہ زمانہ کی روش یہی تھی۔ مگر ان سب چیزوں سے صرف شعر کے خارجی پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ داخلی اوصاف کے متعلق بھی اُن کے یہ خیال ہیں۔

(۱۰) شعر جذبات دل کا آئینہ ہونا چاہیے۔ اور جو کچھ کہ کہا جائے اُسے تاثیر و تأثر کے ساتھ روح و جسم کا سا قرب حاصل ہو۔ خواہ وہ استعارہ ہی کیوں نہ ہو۔

کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا	سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا
اس پردے میں غم دل کہتا ہے میر اپنا	کیا شعر و شاعری ہے یار و شعار عاشق
مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے	درد و غم کتنے کیے جمع سو دیوان کیا
بے سوز دل کنھوں نے کہا ریختہ تو کیا	گفتار خام پیش عزیزاں سند نہیں

(۱۱) شاعری کو صرف گل و بلبل کے افسانوں تک محدود نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ وہ اس سے بہت وسیع چیز ہے۔ اسی بنا پر اُنھوں نے تاباں کی روش پر نکات الشعرا میں یہ کہکر اعتراض کیا ہے۔ "ہر چند عرصۂ سخن او ہمیں در لفظہائے گل و بلبل تمام است۔ اما بسیار رنگین می گفت۔"

یہ سب چیزیں وہ ہیں جن کا میر صاحب کے اشعار اور نکات الشعرا سے پتہ چلتا ہے۔ مگر اُن کے کلام میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اجمالی طور پر ہم اُنکو بیان کرتے ہیں۔

میر کے کلام پر ایک مجمل تبصرہ

متقدمین کی شاعری کے متعلق نقادین کی عام رائے ہے کہ وہ شاعری کے داخلی پہلو کے مقابلہ میں کبھی خارجی پہلو کو نہیں لیتے۔ لباس۔ زیور۔ حتی کہ سراپا وغیرہ کی کوئی پروا نہیں۔ بلکہ اس کی جگہ جذبات عشقیہ۔ سوز و گداز۔ ناکامی کے بیان۔ محاکات۔ معاملہ بندی وغیرہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ میر صاحب بھی انھیں لوگوں میں سے ہیں۔ وہ بھی حُزن و الم کی ایک تصویر ہیں۔ برشتگی اور دردمندانہ خیالات اُن کے رنگ تغزل کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور بلا مبالغہ اپنے معاصرین اپنے متقدمین۔ اپنے متاخرین سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اور اتنے بڑھے ہوئے کہ اُنکے بعد کے بڑے بڑے باکمالوں نے اُن کے نقش قدم پر چلنے کا ارادہ کیا اور سخت سے سخت کاوشوں اور کوششوں کے بعد بھی اُن تک نہ پہونچنے پر اپنی ناکامی کا نہایت ہمت شکن الفاظ میں اعتراف کیا جیسے (ذوق)

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب	ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

یہ دیکھ کر قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسکی وجہ کیا ہے کہ وہ بغیر شرکت احدے اس جذبہ حزینہ - اور اس واردات قلبیہ کے مالک ہیں - اور اسکے جواب میں یہ بات بھی آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ ؎ قبول خاطر و لطف سخن خداداد است + مگر ساتھ ساتھ اُنکی عاشق مزاجی' اُنکی فطرت حسن پرست - اور اُن کے تلخ تجربات - اُنکی نامرادانہ زندگی - اُنکے انقلاب انگیز ماحول کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - جنکی وجہ سے یہی درد و اثر - برشتگی و شیفتگی - حرمان و مایوسی - اضطراب و قلق فطرت ثانیہ بن کر اُن کے تغزل کا وہ نمایاں جوہر بن گئے کہ آج دیکھنے والوں کی سب سے پہلی نظر اسی خوبی پر پڑتی ہے - کوئی اسکو بہتّر نشتر سے تعبیر کرتا ہے - اور کوئی کہتا ہے کہ وہ اسی کے لیے پیدا ہوئے تھے چنانچہ خود بھی کہتے ہیں ؎

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے	درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

پھر اگر زندگی کی واردات - عشق کے واقعات کو ایک سادہ اور پُر کیف زبان میں نہ بیان کیا جائے تو اس کا دوسروں پر اس درجہ اثر پڑنا غیر ممکن ہے - ہزاروں بلکہ لاکھوں شاعر ہوا کیے ہیں جنھوں نے عمر بھر یہی رونا رویا - ہجر و فراق کے مصائب بیان کرکے وحشت جنون بیاباں گردی - ناصح کی ملامت - رقیبوں کی شرارت کے نقشے کھینچتے رہے - مگر دنیا نے اُن کو آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا - کہ کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے - لامحالہ ضرورت ہوئی کہ اس چیز کو تجزیہ کرکے بتایا جائے جو میر کے کلام میں پوشیدہ ہے - مگر دشواری اور بڑی دشواری یہ ہے کہ فنونِ لطیفہ خواہ وہ شاعری ہو - خواہ مصوری - خواہ موسیقی تجزیہ کے بار کی متحمل نہیں ہوسکتے - اور فنونِ لطیفہ کیا میں تو یہ کہتا ہوں کہ کوئی حسن نہ تجزیہ کا بار اُٹھا سکتا ہے اور نہ کوئی عشق تجزیہ کا خواستگار ہوسکتا ہے - کیا عجب ہے کہ میر نے ایسے ہی موقع پر کہا ہو ؎

کیا جانوں دل کو کھینچیں ہیں کیوں شعر میر کے	کچھ ایسی طرز بھی نہیں ایہام بھی نہیں

پھر بھی جہانتک غور کیا جاتا ہے اُن کے انھیں جذبات میں کئی چیزیں شامل ہیں اور ان کی شمولیت روح و جسم - آب و رنگ کی شمولیت ہے جس کا جدا کرنا اور جدا ہونا محال ہے ؎

یہ جو چشم پُر آب ہیں دونوں	ایک خانہ خراب ہیں دونوں

میں جو بولا تو بولے یہ آواز اُسی خانہ خراب کی سی ہے

میر کے یہ وہ مشہور شعر ہیں۔ سُننے والا اُن کو سُن کر دل تھام کر ایک آہ تو ضرور ہی کر لیتا ہے اور جس قدر دل میں گداز ہوتا ہے اتنا ہی اثر لیتا ہے۔ مگر جب غور کیا جاتا ہے تو ان دونوں شعروں میں نہ تو کوئی نیا مضمون دکھائی دیتا ہے۔ نہ کوئی گہرا فلسفۂ حیات ملتا ہے نہ جذباتِ عشقیہ کی کوئی اچھوتی تصویر نظر آتی ہے۔ نہ کوئی اخلاقی مسئلہ ہے۔ مگر اثر اُتنا ہی ہوتا ہے جسقدر ہونا چاہیئے۔ آخر ذوقِ سلیم کو ماننا پڑتا ہے کہ مجموعی حیثیت سے ان دونوں شعروں میں سیدھی سادہ باتیں ہیں جو دلوں پر تیر و نشتر کا کام کرتی ہیں اور اُن کی تشریح و تجزیہ نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح میر کے بیشتر اشعار ہیں جو سوز و گداز۔ تاثیر و تاثر کے لحاظ سے بے مثل ہیں گو تجزیہ اور تقسیم لطافت کی شمع اُن کے سامنے گل ہو جاتی ہے۔ اور اس کوشش و جستجو کو ناکام واپس آنا پڑتا ہے۔ مگر غور کرنے پر اُن کے مجموعہ کلام میں ان چیزوں کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) کیفیات حسن و عشق۔ واردات محبت حقیقی و مجازی (۲) نفسیات۔ فلسفۂ نفسیات۔
(۳) ندرتِ بیان۔ اسلوب بیان (۴) آلام و مصائب کے تلخ تجربات اور اُنکے اظہار کی قدرت۔
(۵) عاجزانہ یا عاشقانہ طنزیات جو اکثر اشعار کی تہ میں موجود ہیں (۶) تخئیل کی بلندی۔
(۷) اکثر عام اور بیش پا افتادہ مضامین سے احتراز۔ (۸) زبان کی سادگی۔ سلاست۔
(۹) روزمرہ اور محاورات کی صفائی (۱۰) الفاظ میں موسیقیت اور ترنم کے ساتھ روانی
(۱۱) آورد سے احتراز۔ آمد کی پابندی (۱۲) تلمیحات دلنشیں (۱۳) معلومات عامہ کی وسعت
(۱۴) کہیں کہیں تناسب الفاظ جو ایہام کی حد تک پہونچا ہے۔ (۱۵) فارسی ترکیبوں کا نہایت برمحل استعمال۔ (۱۶) بعض جگہ بدیع استعارے اور نازک تشبیہیں (۱۷) کہیں کہیں ہلکی ہلکی متصوفانہ روش (۱۸) ایسی ظرافت جسکو زہر خند سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔
(۱۹) بیباکی اور صاف گوئی (۲۰) نہایت دلکش اور رواں بحروں کا انتخاب۔
(۲۱) دنیا کے سراپا زوال اور فانی ہونے کے عبرتناک مرقعے۔

یہی چیزیں ہیں جو ان کے کلام کے اجزا ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ غزل کے موضوع قدیم کے پابند ہوتے۔ معشوق کو اس کی قدیم صفات سے موصوف کرنے کے باوجود بھی میر کے یہاں یہ چیزیں روشن ستاروں کی طرح چمک رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم ان سب چیزوں

پر علحدہ علحدہ روشنی ڈال کر میر کے بہت سے اشعار اپنے ثبوت دعویٰ کے لیے پیش کریں۔ مگر اول تو طوالت مضمون کا خوف ہے دوسرے میر کا مکمل دیوان آپ کے سامنے ہے اس لیے اس طول عمل کو گوارا کرنا بے معنی سی بات ہے۔ لہذا اس کے بعد اُنکے مختلف اصناف کلام پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

اصناف کلام میر

غزلیات۔ میر صاحب کی غزلیات کے چھ دیوان ہیں۔ اور بیشتر مروجہ بحروں میں اُن کی غزلیں پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ عام طور سے بحیثیت مجموعی اُن کی تمام غزلیں سوز و گداز سے بھری ہوئی ہیں۔ اور یہ دیکھکر کہ وہ اپنے تمام معاصرین بلکہ متقدمین سے بھی اس صنف خاص میں بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ کہنا کچھ بیجا نہیں کہ وہ صرف غزل گوئی کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ مگر ان میں چھوٹی بحروں کی غزلیں نہایت بلند پایہ رکھتی ہیں۔ اور طویل بحروں کی غزلوں میں اکثر حشو اور بھرتی کے اشعار بھی ہیں۔ زمانہ کی عام روش نے امارد پرستی۔ اور شیخ و زاہد کی ہجو رکیک سے اُن کی غزلوں کو بھی پاک نہیں رہنے دیا۔ اور اگر بالاستیعاب اُنکے دیوانوں کا مطالعہ کیا جائے تو ایسے اشعار کی اچھی خاصی تعداد نکل آئے گی۔ اور غالباً یہی دیکھ کر بعض صاف گو نقاد یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اُنکا بلند کلام نہایت بلند ہے۔ اور پست بے انتہا پست۔ پھر بھی مجموعی حیثیت سے وہ ہندوستان کے اکثر غزل گویوں سے ممتاز ہیں۔ اور خواجہ میر درد کے سوائے دوسرا ان کا مقابل نہیں۔

قصائد۔ یوں تو میر ایک قادر الکلام شاعر تھے کون سی ایسی چیز ہے جو اُن کے یہاں نہیں اور کس چیز میں اُن کی شاعری کے خط و خال نہیں پائے جاتے۔ مگر اُستاد ہونا اور بات ہے اور کسی چیز سے طبیعت کی مناسبت ہونا شئے دیگر۔ وہ قصیدہ کہنے پر قادر ضرور تھے۔ اور کوئی شک نہیں کہ اُن کو ایسے مواقع پیش آئے ہونگے جہاں اپنا زور طبیعت دکھانا ضروری ہوتا ہے۔ مگر اُن کی فطرت اور اُنکی افتاد طبیعت۔ اُنکے گرد و پیش سے یہ چیز بہت دور تھی۔ اور یقیناً وہ اس میں سودا یا ذوق کی طرح کامیاب نہیں کہے جا سکتے۔ اُن کے قصیدوں میں نہ زور ہے۔ نہ علو خیال ہے۔ نہ وہ باتیں ہیں جن کی بہتری پر قصیدہ کی بہتری کا انحصار ہے۔ اُستادی ہی اُستادی ہے اور صرف اُستادی سے کام نہیں چلتا۔

رباعیات۔ رباعیات کو کاملین نے فلسفیانہ اور حکیمانہ خیالات کے لیے مخصوص رکھا ہے۔ تصوّف کے رموز و اسرار کو اسی میں ادا کیا گیا ہے۔ چنانچہ فارسی کے مشہور رباعی

کہنے والے حکیم عمر خیام۔ فریدالدین عطارؒ۔ ابوسعید ابوالخیرؒ۔ سحابی وغیرہم کے یہاں برابر یہی روش اور یہی انداز کارفرما ہے۔ مگر ریختہ گویوں نے اسکی زیادہ پابندی نہیں کی۔ میر صاحب نے بھی سوسوا سو رباعیاں کہیں۔ مگر اُن کے مصرف صحیح کے پابند نہ رہنے کی وجہ سے اُنکی رباعیاں اس درجہ پر نہ پہونچ سکیں۔ البتہ خواجہ میر دردؒ نے اُردو اور فارسی میں جسقدر رباعیاں کہیں وہ اُسوقت کے لحاظ سے بہترین نمونہ ہیں۔ دورِ موجودہ میں اُردو میں چند رباعی کے کہنے والے ایسے پیدا ہوگئے ہیں جنکے سامنے پچھلے لوگوں کی رباعیاں دیکھنے کو جی بھی نہیں چاہتا۔

مخمس و مسدس ترکیب بند ترجیع بند مخمس۔ مسدس۔ ترجیع بند میں سے اکثر کو اُنھوں نے اپنے معتقدات مذہبی کے لیے مخصوص کیا ہے۔ چنانچہ ایک ہفت بند۔ ایک ترجیع بند۔ دس مخمس۔ تین مسدس میں صرف منقبت کہی گئی ہے۔ اور ایک مسدس میں نعت ہے۔ اور اس سے اُن کے خلوص عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔ تین مخمس ایسے ہیں جن میں اپنی یا دوسروں کی غزلوں کی تضمین ہے۔ دو ترکیب بند عاشقانہ ہیں اور خوب ہیں کچھ مثلث ہیں جنھیں بھی صرف تضمینیں ہیں۔ اور چار مخمسات میں ہجویات ہیں جن کا ذکر ہجویات میں مناسب ہوگا۔

واسوخت واسوخت کا میر صاحب کو موجد بتایا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ مگر اس قسم کی نظمیں بعض پہلے بھی کہی گئی تھیں۔ اور اُسکے نمونے اُردو فارسی میں موجود ہیں میر صاحب کے واسوختوں میں اُن کے متبعین کا ساز ورنہیں ہے۔ مگر اَلْفَضْلُ لِلْمُتَقَدِّم کے بموجب وہ قابل مبارکباد ضرور ہیں کہ اُنھوں نے ایک ایسا راستہ نکالا جپر متاخرین بڑی آسانی سے گام زن ہوسکے۔

ہفت بند۔ ممکن ہے کہ اُردو میں نئی چیز ہو۔ اسکو دیکھ کر ملا محتشم کاشی کا ہفت بند یاد آجاتا ہے۔ پھر بھی میر صاحب کی کوشش رائگاں نہیں ہے۔ اور اگرچہ وہ منقبت کے لیے مخصوص رکھا گیا ہے مگر نہایت عُمدہ ہے۔

مثنویات۔ غزل کے بعد سب سے زیادہ یہی چیز میر صاحب کے یہاں قابل ذکر ہے بعض محققین کا خیال ہے کہ وہ غزل کی طرح مثنوی کے اُستاد نہیں۔ بلکہ مثنوی میں اُن کا کوئی خاص درجہ نہیں یہ رائے پایۂ تحقیق اور درجۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ سر شاہ سلیمان صاحب نے انتخاب مثنویات میر میں مولوی عبدالسلام صاحب مصنف شعر الہند کا یہ قول نقل کیا ہے۔ "وہ مثنویات کے موجد اور عمدہ نمونہ ہیں۔ انکا قدرتی انداز ہے۔ انھیں کی بدولت مثنوی کو ترقی ہوئی۔ میر حسن اور شوق کو

اُنھیں کا مقلد سمجھنا چاہیے ۔ باوجود اسکے یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اکثر مثنویات جس میں کتّے، بلّی بکری اور مرغ وغیرہ کے قصّے درج ہیں نہایت گری ہوئی ہیں ۔ بعض مثنویوں میں ہندی کے ٹھیٹھ اور ثقیل الفاظ ہیں ۔ بعض میں فحش قصّے نظم ہیں ۔"

اسی طرح میرے دوست مجنوں گورکھپوری نے رسالہ ایوان جنوری ۳۵ء میں میر صاحب کی مثنویات کی بابت یہ رائے دی ہے ۔ "غزل کے بعد میر اگر کسی صنف میں ممتاز ہو سکتے ہیں تو وہ مثنوی بالخصوص عشقیہ مثنوی ہے ۔ اور وہ اس لیے کہ عشقیہ میں تغزل کا رنگ بڑی حد تک نباہا جا سکتا ہے ۔"

میرے نزدیک جیسے یہ رائیں نہایت سرسری ہیں اُسی طرح میر حسن اور نواب مرزا شوق کو میر صاحب کا مقلد قرار دینا محل تامل ہے ۔ کیونکہ میر صاحب کی عشقیہ مثنویاں نہایت صاف ۔ رواں ۔ آورد سے پاک وصاف ہیں ۔ اُن کے بیان کی سلاست اور روانی سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے قصداً کسی چیز کے بیان کا اہتمام نہیں کیا ہے ۔ بلکہ بے تکلفانہ جو قلم سے نکلتا گیا اُس کو لکھتے چلے گئے ۔ اسی واسطے اگر تجزیہ کیا جائے تو اکثر مواقع پر اُن کے بیانوں میں کمی نہیں بلکہ ایک تشنگی سی محسوس ہوتی ہے ۔ بخلاف اسکے میر حسن نے اپنی تلاش اور جستجو سے ہر منظر اور ہر محل کے مطابق اُس محل کی ضروریات کو قصداً جمع کر کے بیان کیا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ اُنکی زبان کی گھلاوٹ اور روانی کہیں بھی اس بات کو ظاہر نہیں ہونے دیتی کہ یہاں آورد کا جال بچھا ہوا ہے ۔ یہی حال شوق کا ہے کہ وہ زبان کی شستگی اور محاورات کے پھیر میں گم ہو جاتے ہیں ۔ اور چونکہ وارداتِ قلبی کو بھی نہایت ملائم الفاظ میں محاورات اور روزمرّہ کا زیور پہنا کر لاتے ہیں ۔ اس واسطے پتہ نہیں چلتا کہ یہ آمد ہے یا آورد ۔ بہر نوع میر صاحب کی عشقیہ مثنویاں نہایت صاف اوران باتوں سے بری ہیں ۔ اور پھر مثنوی کے لیے جو چیزیں ضروری ہیں وہ بھی اُن کے ہاتھ سے نہیں جاتیں ۔ تسلسل کا سر رشتہ نہایت مضبوط ہے ۔ مبالغہ سے پاک اغراق اور غلو سے مبرّا ہیں ۔ تشبیہیں کم ہیں ۔ مگر جہاں کہیں ہیں وہ بہت بلند ہیں ۔ پھر بھی اس بات سے انکار نہیں کہ وہ مثنوی کے موجد ہیں اور اس قسم کے قصوں کو شاید اُردو میں پہلے انھوں نے ہی نظم کیا ہے اگرچہ اُن کے دور حیات ہی میں اس کی کثرت ہوئی اور اُنکے اکثر معاصرین نے مثنویاں لکھیں جسکے بعد میر کی اُستادی کے احترام کے سوائے کوئی خاص امتیازی شان ان میں باقی نہیں رہی ۔

اب اُن مثنویوں کو دیکھنا بھی نہایت ضروری ہے جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ بہت گری ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے یہ بات ملحوظ رہنا چاہیے کہ عشقیہ مثنویاں جو اُردو میں شروع ہوئیں وہ صرف فارسی کا اتباع ہیں۔ اور یہ بات چھپی ہوئی نہیں ہے کہ فارسی میں بہتر سے بہتر رزمیہ اور بزمیہ مثنویاں ہیں جو شاعری کی داخلی اور خارجی خوبیوں سے بھری ہوئی ہیں مناظر کے نقشے۔ محاکات کی خوبیاں۔ زبان کی لطافت۔ بیان کی صفائی۔ سبھی کچھ اُنمیں موجود ہے پھر اگر اُن کو دیکھتے ہوئے زبان اُردو میں بھی اس قسم کی چند مثنویاں پیش کی گئیں تو کچھ زیادہ نئی بات نہیں۔ بخلاف اس کے ایسی چیزیں جن پر میر صاحب نے قلم اُٹھایا ہے فارسی میں بھی بہت کم ہیں اُردو میں تو اُن سے پہلے ہونے کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ دنیا۔ جھوٹ۔ ہولی۔ اژدرنامہ۔ تنبیہ الجہال۔ تعریف آغا رشید۔ مذمت آئینہ دار۔ کتے کے پالنے والے کی ہجو۔ ہجو کول مرغ بازی۔ غم نداری بُز بخر۔ بوزنہ۔ موہنی بلّی۔ کتے بلّی کی دوستی۔ خروس وغیرہ۔ یہ سب ندرت سے خالی نہیں ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاعر کے لیے نہ ان میں بیان کی وسعت کی گنجائش ہے۔ نہ تخئیل کی بلندی کا امکان ہے۔ نہ مناظر ہیں۔ نہ مراحل ہیں۔ نہ باغ ہے جس میں روشوں درختوں اور پھولوں کی تعریف کی جائے۔ نہ آبجو ہے۔ نہ ساقی و شراب ہے۔ نہ مغنی و رباب ہے۔ پھر بھی اپنے زور بیان کی عظمت کو بہترین الفاظ۔ برجستہ محاورات کے برمحل استعمال سے قائم رکھنا اور وہ سب چیزیں جو بڑے قصوں کی مثنویوں میں ہوتی ہیں اسی میں لے آنا کس قدر دشوار چیز ہے۔ پھر جب یہ سب چیزیں اُنکی اس قسم کی مثنویوں میں موجود ہیں تو اُنکو نظرانداز کرنا زیادتی کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے۔

اب ذرا اُن مثنویوں کو بھی دیکھیے جن میں اُن کو تفصیل کی گنجائش مل گئی ہے۔ اپنے گھر کا حال۔ برسات کی شکایت۔ وہ سفر جو برسات کے زمانہ میں کیا تھا اور جو جنگ نامے کے نام سے موسوم ہے۔ کتخدائی آصف الدولہ۔ دونوں شکارنامے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن میں مناظر۔ قدرت بیان۔ کثرت الفاظ۔ محاکات۔ حُسنِ بیان۔ ربط و تسلسل وغیرہ اس حد تک ہیں کہ اُن کو دیکھ کر اقرار کرنا پڑتا ہے کہ وہ مثنوی کے بلاشرکت غیرے مالک ہیں۔ اور گو عشقیہ مثنویوں میں اُن کے حریف بھی ہیں۔ مگر ان میں ان کا کوئی جواب نہیں دے سکا۔ اور یہ ایسے شاہکار ادب ہیں جو زبانِ اُردو کے سرمایہ کے لیے باعث ناز ہیں۔

مدحیات میر ابنائے ملوک۔ اُمرا۔ اور اہلِ دول کی مدحیات میں میر صاحب کا رتبہ سودا سے زیادہ بلند نہیں ہے اور اسکی وجہ اُنکی فطری کبیدگی۔ افسردہ خاطری۔ استغنا۔ خودداری سے زیادہ نہیں۔ وہ خوشامد۔ درباداری اور اُسکے نشیب و فراز سے یا واقف ہی نہ تھے۔ یا واقف تھے تو ان کا تحمل اُنکی نازک دماغی سے ہو نہ سکتا تھا۔ اسی وجہ سے اُن کو اس قسم کی مدحیات میں جو زیادہ تر قصیدوں سے وابستہ ہوتی ہیں۔ دوسرے حریفوں کی طرح کامیابی تو نہ ہوئی۔ مگر اسکے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ ان کا اس چیز میں کوئی درجہ ہی نہیں۔ بلکہ پختگی کلام۔ معلومات فن۔ تخئیل کی کارپردازی وغیرہ یہ تو سب کچھ ہے۔ اگر نہیں ہے تو شان نیازمندی کا وہ جوش اور ممدوح کی جا و بیجا حمایت کا وہ خروش نہیں جو قصیدے کی جان اور قصیدہ نگار کی ارفع و اعلیٰ شان ہے۔

ہجویات میر قبل اسکے کہ ہجویات پر کوئی غائر نگاہ ڈالی جاسکے۔ یہ معلوم کرنا ضروری ہے۔ کہ کسی ہجو کرنے والے کو ہجو کی ضرورت کئی وجہوں سے ہوتی ہے۔ یا ذاتی مخاصمت کی بنا پر خواہ اُسکے وجوہات کچھ بھی کیوں نہ ہوں۔ یا کسی فعل کسی رسم کو قبیح سمجھنے پر۔ یا کسی دور کی سوسائٹی کی مختلف خرابیوں پر۔ یا کسی جماعت یا اس جماعت کے کسی فرد کے اخلاق و عادات کو بُرا جاننے پر۔ یا فطرتاً اور طبعاً کسی شئے سے تنفر کرنے اور اُسکو مکروہ سمجھنے پر۔ یا کسی شخص اور کسی چیز سے اذیت اُٹھانے پر۔ یا صرف تمسخر اور تضحیک کی نیت سے۔ یا حکومت و ارکان حکومت کی خامیوں پر۔ یا مذہب اور رسم و رواج کے تعصب پر۔ غرض ایسی ہی چیزیں ہیں جو ہجو کی بانی ہوتی ہیں۔

ہجو میں طعن۔ طنز۔ تشنیع۔ پھبتی۔ ظرافت۔ تمسخر وغیرہ سبھی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور کبھی محض ایک چیز ہی پر پوری ہجو کا انحصار ہوتا ہے۔ اسی طرح ذاتیات کو بھی ہجو میں پورا دخل ہوتا ہے۔ مگر وہ ہجو بدترین ہجو ہے جسمیں ذاتیات کے جھگڑوں کو بروئے کار لایا گیا ہو۔ یا اس میں مذہبی تعصبات کو دخل دیا گیا ہو۔ یا فواحش سے زبان قلم کو آلودہ کیا گیا ہو۔ یہ بات سودا کے یہاں بہت زیادہ ہے۔ بخلاف اسکے میر صاحب کا دامن زیادہ تر ان الواث سے پاک و صاف ہے۔ اُنھوں نے نہ کہیں مذہبیات کی طرف رُخ کیا ہے۔ اور نہ اختلاف مذہب کے سبب سے حریفوں کو بُرا کہا ہے۔ نہ سودا کی طرح کسی کی بہو بیٹیوں کو گالیاں دیکر تمسخر کیا ہے۔ بلکہ اُن کی تمامتر ہجویات کوئی نہ کوئی اصلاحی پہلو لیے ہوئے ہیں۔ چنانچہ میرے نزدیک سب سے زیادہ ہجو بلا سس راسے کی ہے جس میں میر صاحب کچھ نہ کچھ اپنی حدود مقررہ سے بڑھ گئے ہیں

مگر پھر بھی ہجو کا اصل منشا وہی شریف گردی کا نقشہ کھینچنا۔ اور کم مایہ کم پایہ لوگوں کا عروج دکھانا ہے۔ دوسری ہجو۔ ہجو لشکر میں سلطنت مغلیہ کے آخری دور کی ابتری۔ بے زری اور امرا کی بے پروائی کی ایک مکمل تصویر پیش کرنا۔ تیسری ہجو خواجہ سرائے کو ایک خاص انداز میں لکھا گیا ہے۔ یعنی صرف ایک حکایت کہکر کنایتہً تعریضی پردے میں یہ نصیحت کی گئی ہے کہ ہر یکے را بہر کارے ساختند۔ آدمی کو چاہیے کہ اپنے رتبے اور اپنے عہدے سے زیادہ باتیں نہ بنائے۔ مثنوی ہجو مرغبازاں میں لکھنؤ کی سوسائٹی کی کمزوریاں اور خرابیاں بیان کی ہیں۔ اسی طرح اپنے گھر کی مذمت میں دو مثنویاں کہی ہیں۔ مگر اُن میں محاکات اور تفصیل کا کمال دکھایا ہے۔ انکو پڑھکر آج تک میر صاحب کی مجبوری معذوری افلاس ادبار کی افسردہ تصویریں سامنے آجاتی ہیں۔ برسات کی ہجو مناظر نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ ہجو نااہل میں اپنے آپکو اپنے مدمقابل کے مقابلہ میں اعلےٰ و افضل ثابت کرنے کی مکمل کوشش اور اُسی کے ساتھ اُس کو حقیقی نااہل ثابت کرنے کی سعی ہے۔ کتے پالنے والے کی مثنوی ایک ناصحانہ کارنامہ ہے۔ تنبیہ الجہال جاہلوں کے واسطے تازیانۂ عبرت ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ فن نظم کا بڑا درجہ ہے۔ اور ہر عامی اسکو اختیار نہیں کرسکتا۔ اژدرنامہ میں اپنے معاصرین کو صرف شاعرانہ انداز میں بُرا کہہ کر اپنے آپ کو بڑھایا ہے۔ اور اسکے مجرم صرف وہی نہیں ہیں بلکہ حمد یانہ پیرائے میں بہت سے نام آور بھی کرچکے ہیں۔ مذمت آئینہ دار سے دلی نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔ میر صاحب کی وضعداری اور اجلاف و اشراف میں فرق کرنے کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے۔ مثنوی مذمت کذب میں طنز و کنایہ اور آپ بیتی داستان ہے۔ جس کو سُنکر لطف آتا ہے۔ ہجو اکول کی بنا صرف تمسخر اور مزاح پر ہے اس سے زیادہ نہیں۔

اُن کی ہجویات کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ الفاظِ مناسب کو اس طرح سے صرف کرتے ہیں کہ نہ صرف نظم کا بلکہ ہجو کا زور چہار چند ہو جاتا ہے۔ وہ اس فن میں معلومات کے دریا بہاتے چلے جاتے ہیں۔ اور باوجودیکہ ہجو سب سے بُری چیز ہے۔ مگر سب سے اچھی معلوم ہوتی ہے۔

اُن کی ہجویات میں بے باکی۔ اور اوباشی کا کوئی نام و نشان نہیں۔ بلکہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ایک جہاندیدہ گرم و سرد زمانہ چشیدہ کچھ نصیحتیں کر رہا ہے۔ اور کہیں کہیں وہ اپنے انداز کلام میں ظرافت اور زہر خند کو بھی شامل کر لیتا ہے۔

اُن کی ہجویات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہجو تو ضرور کر رہے ہیں۔ مگر دل کے بُرے نہیں وہ زبان سے سب کچھ کہتے جاتے ہیں۔ مگر عداوت کے غبار سے ان کا دل پاک ہے۔

اُن کی ہجویات پتہ دیتی ہیں کہ وہ کج رفتار زمانے کی روش سے تنگ آ کر کچھ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ورنہ اُن کو کسی سے عداوت ذاتی نہیں۔ ہجویات میں اُن کا مد مقابل اُن کا معاصر سودا ہے۔ اور اسکو اس فن خاص میں اُن سے بہت آگے بتایا جاتا ہے۔ اگر بیباکی۔ شوخ طبعی۔ تمسخر۔ تلخ گوئی۔ فحاشی ہی کا نام ہجو ہے تو بیشک یہ خیال درست ہے۔ ورنہ اصل یہ ہے کہ میر طنز و تعریض کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ صرف ہجو ہی نہیں اُن کے متین کلام میں بھی طنزیات اس درجہ کے ہیں کہ جنکا کہیں جواب نہیں۔ اور ہجو تو طنز کی اتنی محتاج ہے کہ جتنی دوسری چیز کی نہیں پھر ان کی ہجویات پر دوسروں کی ہجویات کو ترجیح دیدینا بے سوچے سمجھے ایک بات کہدینا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ اُن کی طنزیات کہیں بھی حاسدانہ اور مخاصمانہ انداز کی نہیں ہیں۔ بلکہ ہر جگہ معلوم ہوتا ہے کہ طنز کرنے والا ایک پُر سوز دل رکھتا ہے۔ وہ جس آگ سے خود جلا ہے اس سے دوسرے کو بھی جلانا چاہتا ہے اور بس۔

تصانیف میر (۱) کلیات نظم اُردو جس میں غزلیات کے چھ دیوان۔ مثنویاں۔ تضمینیں۔ قطعات۔ رباعیات۔ ترکیب بند۔ ترجیع بند۔ واسوخت۔ قصاید۔ وغیرہ سبھی چیزیں شامل ہیں۔ اور جن میں سے ہر صنف کلام کے متعلق علیحدہ علیحدہ اظہار خیال کیا گیا ہے۔

(۲) **نکات الشعرا**۔ یہ اُردو کے قدیم شعرا کا تذکرہ ہے۔ جو فارسی زبان میں لکھا ہے۔ اور ریختہ گویوں کا سب سے پہلا تذکرہ ہونے کا اس کو شرف حاصل ہے۔ اگرچہ اس میں شعرا کے حالات بہت مختصر ہیں۔ مگر جو کچھ ہیں وہ بہت غنیمت ہیں۔ میر صاحب نے اس میں کہیں کہیں کسی شاعر پر اعتراض بھی کیے ہیں۔ اور بہت سی جگہ دل کھول کر داد بھی دی ہے۔ جس سے ہلکی سی تنقید کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے۔ اس تذکرہ کی عبارت نہایت سلیس اور بامحاورہ ہے سنہ تصنیف ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۲ء

(۳) **ذکر میر**۔ یہ میر صاحب کے واقعات اور سوانحعمری کا مجموعہ ہے۔ اگرچہ اس میں شاعرانہ حالات اور واقعات نہیں ہیں مگر پھر بھی تاریخی حیثیت سے نہایت کارآمد ہے۔ سلطنت مغلیہ کے آخری دور کی کمزوریوں اور شریف گردیوں کا عبرتناک مرقع ہے۔ اس کی فارسی عبارت بے انتہا چست ہے۔ کہیں کہیں مقفیٰ بھی ہے۔ مگر اس سے عام روش

کے مطابق مطلب و مقصد کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔

(۴) **فیضِ میر** - یہ فارسی زبان میں ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جسے اُنھوں نے اپنے صاحبزادے فیض علی کے لیے لکھا۔ اس میں درویشوں کے پانچ قصے۔ اور میر صاحب کی عقیدتمندی کا بیان ہے۔ آخر میں کچھ فحش لطیفے بھی تھے۔ مگر اُن کو حذف کر کے مولوی مسعود حسن صاحب رضوی ادیب اُردو لیکچرار یونیورسٹی لکھنؤ نے مع ترجمہ شایع کر دیا ہے۔

(۵) **مجموعہ مراثی** - اگرچہ مجھے اسکے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا لیکن اُس کا وجود یقینی تھا۔ معلوم ہوا کہ مولانا مسعود حسن صاحب رضوی ادیب کے کتبخانہ میں یہ موجود ہے اور ضخامت میں بھی اچھا خاصہ ہے لہذا میں نے ایک نظر اُسکو دیکھا۔ چونکہ پورے طور پر پڑھا نہیں اسلیے میں میر صاحب کی مرثیہ گوئی کے متعلق کوئی رائے نہیں رکھتا۔ یہ مجموعہ قلمی ۲۶/۱۲ ۸/۱ پر ۱۲۰ صفحہ میں ہے۔

(۶) **دیوان فارسی** - یہ ہنوز مکمل طور پر طبع نہیں ہوا مگر میں نے مکمل دیوان قلمی دو مرتبہ دیکھا۔ مقدمہ لکھنے کے بعد مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی کے کتبخانہ کا موجودہ نسخہ بھی نگاہ سے گزرا۔ یہ تقریباً دو سو صفحہ ۲۲/۲۹ ۸/۱ پر ہے۔ میر صاحب کی فارسی نثر نہایت بہتر ہے۔ اگرچہ مادری زبان نہ ہونے کی وجہ سے فارسی کے بعض محاورات میں اُن سے لغزشیں ہوئی ہیں۔ مگر اسکے باوجود بھی اُن کی طرز خاص۔ روانی۔ اور شگفتگی عبارت داد کے قابل ضرور ہے۔ اور کیا تعجب ہے اگر فارسی دیوان میں بھی وہی دلکشی وہی خاص ترکیبیں اور محاورات وہی سوز و گداز۔ وہی میر کی ریختہ گوئی کا انداز موجود ہو۔ اسی وجہ سے نہایت صفائی کے ساتھ یہ کہدینا چاہیے کہ وہ اگرچہ صرف میر کے انداز ریختہ گوئی سے کچھ گرا ہوا ہے لیکن دیکھنے والے کے لیے جاذب توجہ ضرور ثابت ہوتا ہے اور اسی لیے اگرچہ میر صاحب کو ہندوستان کے بعض مشاق فارسی گویوں کی صف اعلیٰ میں جگہ نہیں دی جاسکتی پھر بھی وہ قابل ذکر ضرور ہیں۔ گو میر صاحب اپنے کلام فارسی کو قابل اعتنا نہ جانتے تھے اور جانتے کیونکر۔ شاعری جذبات قلبیہ کے ہیجان کا نتیجہ ہے۔ مگر جب شعر صرف تفنن طبع کی نیت سے کہا جائے تو پھر اس کا کوئی خاص درجہ نہیں رہتا۔ میر صاحب نے بھی یہ دیوان خانہ پری کے لیے کہا تھا۔ چنانچہ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔ "دعویٰ شعر فارسی ندارد۔ مگر نا بیش ہم کم از ریختہ نیست۔ میگفت کہ سالے ریختہ موقوف کردہ بودم دراں حال دو ہزار شعر گفتہ دیوان کردم"۔ اگرچہ مصحفی کی رائے ان کے فارسی کلام کے بارہ میں سراسر ہماری تائید کرتی ہے

مگر جو اصل حقیقت اور قدر و قیمت ہے وہ میر صاحب کے اشعار سے معلوم کرنا چاہیئے۔

اے ز انعامِ تو وا شد غنچۂ امکانِ ما
آب در جو دارد از لطفِ تو باغِ جانِ ما

باکرم گر کار افتد جرمِ ما را نیست قدر
یک پرِ کاہ است کوہِ شاخِ عصیانِ ما

دیدۂ تر کے تسلی بخشِ عاشق می شود
منبعِ طوفاں شود یا رب سرِ مژگانِ ما

ایں نہ پنداری کہ مردن موجبِ آسودگیست
مرگ ہم یک منزلے ست از راہِ پایانِ ما

میر اگر این ست جوشِ گریہ در ہجرانِ یار
ابر خواہد برد آب از دیدۂ گریانِ ما

چو اشکند کز ازل بودہ است
سرے با شکستن بسوئے مرا

بمردن تسلی شدم ورنہ میر
نہایت نبود آرزوئے مرا

زنی تا چشم برہم مہر رنگِ کینہ می گیرد
مروت آشنائی نیست ہرگز خوش نگاہاں را

بایراں میروم دہ پانزدہ بیتم عنایت کن
رہ آورد یست میر اشعارِ تو اہلِ صفاہاں را

اشک گرمم ہمہ دردِ است خدا را دریاب
از رہ دورِ دل ایں قاصد زود آمدہ را

گرچہ موجود نہ گشتیم ولے سہل مگیر
ایں غلط کاری وہم بہ نمود آمدہ را

از ما حکایتِ غمِ دل میتواں شنید
ما خوب میکنیم بیاں ایں مقالہ را

یکرہ تو ہم بپرس از وے نسیمِ صبح
من خود نیافتم سببِ داغِ لالہ را

غافل ز دل مشو کہ غنیمت شمردہ اند
اہلِ نظر معاملۂ ایں رسالہ را

سینہ صافیہائے من از گریۂ دیرینہ است
سیلہا جاروب کش بودہ است ایں ویرانہ را

طالعِ آنکہ بہ نخچیرگہِ عشق رسید
سر ہر صید نہ بندند بہ فتراک آنجا

آنکہ داری سرِ آں کوچہ اگر خواہی رفت
یادگاریست ز ما ہم دلِ صد چاک آنجا

میر جائے کہ بہ نیرانِ محبت میسوخت
صبح دیدیم بجا ماندہ کفِ خاک آنجا

شدہ تیغے بلند و کشتہ شدیم
ما ندیدیم روئے قاتل را

سرکن اشعارِ ماتمِ دلِ میر
برخواں واقعاتِ مقبل را

بجمعِ ماتمیاں حرفِ من اثر دارد ... بہ بزمِ عیش نداند کسے زبانِ مرا

زضعف میر بچشمِ کسے نمی آیم
لطافتے است چو جاں جسمِ ناتوانِ مرا

بحقِ دیدۂ نمناک ساغرے ناب ... بہ بخش بارِ خدایا شراب خواراں را
زباز پرسِ قیامت چہ غم کرین باشد ... وسیلۂ سرِ زلفش سیاہ کاراں را

لختِ دل ہر شب بدامانم نمی دانم چرا ... ہر سحر سر در گریبانم نمی دانم چرا
باب لطفش نیستم لیکن چو ازرہ میرسم ... بر در او دیر میمانم نمی دانم چرا
چارۂ من دلربایاں جملہ میدانند لیک ... کس نمیگوید کہ میدانم نمی دانم چرا
او غرورِ حسن دارد زاں سبب پروا ش نیست ... منکہ ضبطِ خویش نتوانم نمی دانم چرا

مدتے شد میر مژگانم زمن برگشتہ است
خار خارش ہست با جانم نمی دانم چرا

دل کہ در سینہ می تپید مرا ... ایں زماں از مژہ چکید مرا

دست ہر دم بہ تیغ بردنِ او
میر در خاک و خوں کشید مرا

گہ گہ چو آفتاب بسرم رسیدہ باش ... اُفتادگانِ سایۂ دیوارِ خویش را
جور و جفاست کارِ تو و من زسادگی ... موقوفِ رحم داشتہ ام کارِ خویش را

سودائے ماست میر بہ عیارِ پیشہ ای
کو بارہا فروخت خریدارِ خویش را

ما بہ یک دید چمن از دور دل خوش میکنیم ... برنہ تا بدستِ گل گوشۂ دستارِ ما
من بخاکِ رہ برابر گشتم دیگرہ نگفت ... بود خاک افتادۂ در سایۂ دیوارِ ما

کاروانِ گریہ ایم و نیز از دل می رسیم
نیست چیزے میر غیر از درد و غم در بارِ ما

بیا بہ طوفِ شہیدِ نگاہ خوباں را ... بہ بیں مروتِ چشمِ سیاہ خوباں را
ملک اگر ہمہ بر عرش می برد لیکن ... جگر کجا کہ نویسد گناہ خوباں را

عمرِ من بر درِ کسے بگذشت ... کہ نیاید کسے بجز ما

حیف در شورہ زار عالم میر
سبز ناگشتہ سوخت دانۂ ما

تاکہ سیر عالم تنزیہ عمرے کردہ ایم
محرمی معلوم شد لفظِ زبانِ دیگر است

وسعت اینجا نمی آید بچشم تنگ ما
این لغت جائے نمی یابند در فرہنگ ما

میر صاحب کے وہ دوست جو شاعر تھے

میر صاحب کی اُفتادِ طبیعت - خودداری - عزلت پسندی - استغنا - کی وجہ سے کس کو گمان ہو سکتا ہے کہ اُن کے کچھ شاعر دوست بھی ہونگے - مگر ایسا نہیں ہے - وہ خوددار سہی - خود بیں سہی - مگر ان کی خودداری اور خود بینی نااہلوں کے ساتھ تھی - وہ گردن بلندوں کے سامنے سرِ نیاز نہیں جھکاتے تھے - اور اُن سے ہمچشمی اور مساوات کا برتاؤ رکھتے تھے - جیسا کہ اُن کے اکثر واقعات سے ظاہر ہوتا ہے - مگر اپنے دوستوں کے ساتھ سراپا ارتباط اور سراسر اختلاط تھے - اور جب اُنکی دیر آشنائی ختم ہو کر دوستی و محبت کا رنگ بدلتی تھی - پھر اس میں کبھی فرق نہ آتا تھا - چنانچہ نجم الدین علیخاں سلام - خلف شرف الدین علیخاں پیام اُن کے ہر وقت کے دمساز اور رفیق - حریف ظریف اور خالص دوست تھے - اُن کے ساتھ برابر مشق سخن سنجی بھی ہوتی تھی - اور کبھی بھی لڑائی جاتی تھیں (۲) خواجہ میر درد یہ بھی میر صاحب کے مخلص دوست تھے اور میر صاحب خود بھی ان سے خلوص برتتے تھے - ان کے یہاں جو ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو مشاعرہ ہوتا تھا - میر صاحب اس میں برابر شریک ہوتے تھے - اور آخر میں انھیں کے ایما سے یہ مشاعرہ میر صاحب کے مکان پر منعقد ہونے لگا تھا - (۳) میر سجاد - یہ اکبر آباد کے باشندے تھے مگر قیام ان کا بھی شاہجہاں آباد میں تھا - انکے یہاں بھی مشاعرہ ہوتا تھا اور میر صاحب التزاماً اس میں شریک ہوتے تھے - ان کے ساتھ میر صاحب کو اخلاص تھا - (۴) میر ولایت علیخاں برادر محتشم علیخاں حشمت - (۵) اشرف علیخاں فغاں (۶) محمد اسماعیل بیتاب (۷) انعام اللہ خاں یقین (۸) میاں شہاب الدین ثاقب (۹) سید عبدالولی عزلت (۱۰) میر عبدالحی تاباں (۱۱) حسن علی شوق (۱۲) قائم چاندپوری - (۱۳) فضل علی دانا (۱۴) میر حسن (۱۵) ہدایت اللہ ہدایت (۱۶) محمد عارف عارف (۱۷) بیدار (۱۸) لالہ ٹیک چند بہار (۱۹) میر عبدالرسول نثار (۲۰) محمد امان اللہ غریب (۲۱) محمد محسن محسن - (۲۲) ضیاء الدین ضیاء (۲۳) میاں ابراہیم (۲۴) میر گھاسی میر علی نقی (ان کے یہاں بھی مشاعرہ ہوتا تھا) -

میر صاحب کے شاگرد میر ایسی طبیعت کے لوگوں کی شاگردی کو نباہنا بڑا مشکل کام ہے۔ پتھر کا کلیجہ فولاد کا دل ہوتا تو یہ صحبت برآر ہوتی۔ اسی لیے بہت سے لوگ اُن کی تنک مزاجی سے عاجز آ آکر دوسروں کے شاگرد ہو گئے۔ اور اب صحیح طور پر پتہ نہیں چلتا کہ کتنے لوگ ایسے تھے جنکو اُنکے تلمذ کا شرف حاصل تھا۔ پھر بھی سر شاہ سلیمان صاحب نے انتخاب مثنویاتِ میر میں یہ نام گنائے ہیں۔ سخن۔ عشق۔ آرزو۔ آبرو۔ راسخ۔ تجلی۔ ان کے علاوہ۔ نثار۔ جگن۔ محمد محسن۔ مجنوں نکیبا بھی اس زمرہ میں داخل ہوئے۔ مگر افسوس ہے کہ اتنے بڑے کامل الفن کو کوئی ایسا شاگرد نہ ملا جو ان کے نام کو زندہ رکھتا۔

میر صاحب کے حریف (۱) خاکسار۔ اُنھوں نے سید الشعرا اپنے لیے خطاب تجویز کیا تھا۔ جو غالبًا تخلص میر کا جواب تھا۔ میر صاحب کے تذکرے نکات الشعرا کے جواب میں ایک تذکرہ لکھا تھا۔ جو ہمیشہ نایاب رہا اور اب بھی نایاب ہے۔ میر صاحب نے ان کے کلام پر اعتراض بھی کیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اُن سے اُن کو ان سے ایک قسم کی مخاصمت تھی۔ (۲) عاجز یہ بھی میر صاحب کے حریف تھے اور میر صاحب نے ان کے کلام پر اعتراض بھی کیے ہیں (۳) بقا یہ میر و سودا دونوں کے حریف تھے اور دونوں استادوں کے کمالاتِ فن کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ میر صاحب کے لیے کہا ؎

پگڑی اپنی سنبھالیے گا میر	اور بستی نہیں یہ دلّی ہے

ایک مرتبہ یہ کہہ کر دونوں کو لے ڈالا ؎

میر و مرزا کی شعر خوانی نے	بسکہ عالم میں دھوم ڈالی تھی
کھول دیوان دونوں صاحب کے	اے بقا ہم نے جب زیارت کی
کچھ نہ پایا سوائے اسکے سخن	ایک تو تو کہے ہے اک ہی ہی

ایک مرتبہ بقا نے یہ شعر کہا ؎

سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں	ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دوآبے میں

اسکے بعد میر صاحب کا یہ شعر اُن کی نگاہ سے گزرا ؎

وے دن گئے کہ آنکھیں دریاں سی بہتیاں تھیں	سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبہ

بقا نے سمجھا کہ میر نے میرے یہاں سے سرقہ کیا ہے۔ اسپر جھنجھلا کر یہ قطعہ لکھ ڈالا۔

میر نے گر ترا مضمون دوآبے کا لیا	اے بقا تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہے

یا خدا میری آنکھوں کو دو آبہ کر دے	اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تر بینی ہو

سودا - اگرچہ میران کو اور یہ میر کو اُستادِ فن جانتے تھے - پھر بھی دونوں کے دیوانوں میں ایسے شعر موجود ہیں جن میں ایک دوسرے پر چوٹیں کی گئی ہیں - اِن لوگوں کے علاوہ بھی بہت سے ایسے لوگ ہیں جنکے لیے میر صاحب کے قلم سے توصیفی جملے نکلے ہیں یا انکی مذمت کی گئی ہے مگر ہر ایک کو انتخاب کرنا فرصت چاہتا ہے -

میر صاحب کے اخلاف و اعزا

میر صاحب کے دو بیٹے تھے - ایک میر عسکری عرف میر کلو عرش - مگر نساخ کا قول ہے کہ یہ زار تخلص کرتے تھے - دوسرے میر فیض علی فیض - جو اکثر مواقع پر میر صاحب کے ساتھ رہے - بعض تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ ان میں بھی باپ ہی کی طرح عجب و تکبر پایا جاتا تھا -

تذکرہ شمیم سخن کی روایت ہے کہ میر صاحب کی ایک لڑکی بھی شاعرہ تھیں اور بیگم تخلص کرتی تھیں - ان کے نام سے دو شعر بھی نقل کیے گئے ہیں - میر محمد رضی ان کے حقیقی اور محمد حسن اور محمد محسن ان کے سوتیلے بھائی تھے - خان آرزو اُن کے سوتیلے ماموں یا خالو تھے - محمد حسین کلیم میر صاحب کے عزیز قریب اور بہنوئی تھے - یہ دلّی کے باشندے اسحاق خاں شہید کے بھائی اور مرزا محمد علی کے متوسلین میں تھے - میر قمرالدین منت وغیرہ بھی اُن کے عزیز تھے - تجلی اُن کے بھانجے اور داماد تھے - اور محمد محسن خود بقول میر صاحب اُن کے برادر زادے تھے - اور نہ معلوم کتنی ایسی ہی رشتہ داریاں ہونگی جنکی تفصیل لکھنا اور ڈھونڈھنا بیکار ہے -

کلیاتِ میر بصورتِ موجودہ

کلیات میر کے ایڈیشن متعدد مرتبہ شایع ہو چکے ہیں - اور سب سے پہلا چھپا ہوا وہ نسخہ ہے جو کلکتہ فورٹ ولیم سے کاظم علی جوان وغیرہ کی تصحیح و نظر ثانی کے بعد غالباً میر صاحب کی زندگی ہی میں شایع ہو گیا تھا - یا شایع ہونا شروع ہوا تھا - یہ نسخہ دوسرے مطبوعہ نسخوں سے زیادہ صحیح ہے - مگر ایسا نہیں ہے کہ اسکو مستند علیہ سمجھا جائے اس میں اکثر جگہ قبیح غلطیاں رہ گئی ہیں - یہ نسخہ تصحیح کے وقت ہمارے پیش نظر تھا - اسکے علاوہ دوسرا وہ نسخہ جو نولکشور پریس ہی سے ۱۸۶۶ء میں بغیر حاشیہ کے چھپا تھا - اسکے بعد بھی جو اور اڈیشن یہاں سے چھپے وہ بھی موجود تھے

ان کے علاوہ دو قلمی قدیم نسخے جو مکمل تو نہ تھے مگر پھر بھی دونوں کو ملاکر بہت سا کام دے سکتے تھے - ان میں کا ایک نسخہ سنہ ۱۲۴۹ھ کا لکھا ہوا تھا - تیسرا ایک قلمی نسخہ جسمیں صرف اول دوم دیوان ہے جو لکھنؤ محلہ نوبستہ میں لکھا گیا تھا یہ کہ مطبع ہذا کے محفوظ نسخوں میں موجود ہے وہ بھی پیش نظر تھا مثنویات کا انتخاب جو سر شاہ سلیمان صاحب نے شایع کیا ہے - ان سب نسخوں سے مقابلہ اور تصحیح کرکے - ان کے علاوہ بھی دوسری جگہوں سے امداد حاصل کی گئی - اور اب اُمید ہے کہ یہ کتاب اُن تمام نسخوں سے بہتر ثابت ہوگی جو اب تک کلیات میر کے نام سے شایع ہوئے ہیں -

چونکہ قلمی نسخوں کی ترتیب مختلف تھی - اور مطبوعہ سب نسخوں کی ترتیب ایک تھی انمیں ایک خاص نقص یہ تھا کہ کوئی چیز ترتیب وار نہ تھی - کہیں عشقیہ قصہ مثنوی میں اور اسی کے ساتھ ہجو اسی کے بعد مدح وغیرہ - لہٰذا ہر چیز کا ایک سلسلہ علیحدہ قائم کرکے ہر ایک کے پہلے صفحہ میں ٹائیٹل یا لوح کی ایک صورت قائم کردی گئی -

مطبوعہ نسخوں میں بعض چیزیں نامکمل تھیں اُن کو قلمی نسخوں کی مدد سے مکمل کیا گیا - اور بعض چیزیں نئی زیادہ کی گئیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے -

ترجیع بند درمنقبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ جو صفحہ ۷۶۰ پر درج ہے اسکے اول کے سات بند اور بند ہشتم کے تین شعر کسی مطبوعہ نسخے میں نہیں ہیں - یہ ایک قلمی نسخے سے لیے گئے -

اسی طرح دو مثنویاں جو درج ذیل ہیں کسی مطبوعہ نسخے میں نہیں ہیں یہ قلمی دستیاب ہوئیں -

دو غزل جو دوسرے مطبوعہ نسخوں میں نہیں ہے قلمی نسخوں سے لی گئی -

میر کے کلام میں بہت سے ایسے اُردو الفاظ مستعمل ہوئے ہیں جو اب نہیں بولے جاتے اور نہ موجودہ لغات میں ملتے ہیں - اُنکو نہایت تحقیق سے لکھا گیا ہے - نیز فارسی کے اکثر مشکل محاورات جو دوسرے شعرا کے یہاں نہیں وہ کلام میر میں ملتے ہیں - ان سب کے لیے ایک فرہنگ مرتب کردی گئی ہے جو آخر میں شامل ہے -

چونکہ یہ کلیات تقریباً گیارہ سو صفحات پر ختم ہوا ہے - اس لئے مضامین کی ایک فہرست بھی اول کتاب میں شامل کردی گئی ہے جس سے کسی خاص مضمون کے نکالنے میں مدد ملتی ہے -

عبدالباری آسی ۲۷ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثنوی در ہجو شخصے ہیچمداں کہ دعوے ہمہ دانی داشت

اس چرخ بے مدار کے کیا کیا کروں گلے
میرے جگر میں جیسے ستارے ہیں آبلے

تنکا سا اُن نے جور و جفا کر سکھا دیا
پھر تس پہ میرے رونے نے مجھ کو بہا دیا

اُس مجمع کمال کے گھر لے گیا بہ زور
جس کو تمام فنوں میں گویا کہ تھا عبور

توحید گر کہے تو وہ حق حق بہت کرے
ایسا بکے کہ بات تصوف میں ڈالدے

معروف علم صرف کا تھا لیک اس سے حرف
پوچھو جو اسم آلہ سے تو بول اُٹھے کہ ظرف

یہ سنکے تم ہنسو ہو تو وہ رو کے ایکبار
کہنے لگے کہ اپنا یہ صیغہ نہیں ہے یار

کرتا ہو بحث نحو میں جس دم وہ نارگیر
ہر نحو کا ہے لفظ فقط حرف یادگیر

موضوع اپنا جانتا منطق کو تس اُپر
محمول ابتدا ہی کو کہتا تھا بے خبر

وصف حذاقت اُسکا بیاں کیجیے تو کیا
تجویز کرتا دیکھ کے مبطون کو سنا

فن بیاں میں کیسا ہے تشبیہ کس سے دوں
عالم کنایہ اس سے کیا ہے میں کیا کہوں

پوچھو مجاز کی جو حقیقت ہو لاعلاج
کہنے لگے کہ رات سے بھیکا ملا مزاج

اور لفظ بھی مزاج ہے ناداں سے ہے مجاز
معنے کہے تو اسکے کہے قصۂ دراز

پھر معنے پوچھے حکمت جو یاں مزاج کے
انواع یوں بیاں کرے اسکے علاج کے

اسکی دوائیں کتنی مقرر ہیں طب کے بیچ
تعریض ایک ان میں ہے یعنی سیاہ پیچ

اس کا ضماد کرتے ہیں دو چار روز تک
پھر استعارہ دیویں ہیں تھوڑا کہ جائے پک

ہزیان معنی اس کا ہوا ہر طرف جہاں
پھر وہ مجاز مرسل اسے صبر کر وہاں

اجمالی معنی یہ کہے آخر کو یہ کہا
علم معانی سے جو کیا ایک دن سوال
لیکن مجاز عقلی کو نادان یاد رکھ
ہے اب فصاحت اور بلاغت سو جانے دے
اک دن سوال علم قوافی سے میں کیا
تم آب قافیہ نہ کرو لفظ خاک کا
لیکن مغائرہ ہو مقرر ردیف میں
پھر شعر وصل و ہجر کے موزوں تم کرو
دعویٰ بتاؤں کیا ہے انھیں فن شعر کا
بے علم کرتا قافیہ تنگ اسکی جان پر
کہتا تھا ہائے ہائے مرے بعد ہوگا کیا
پھر تربیت سے انکی مجھے فائدہ بھلا
مرجاؤں گا تو گور پہ میری نہ آئیں گے
لیکن مجھے تو بخل نہیں ہے سنا عزیز
ایما اشارہ رہنے دے کہتا ہوں اب صریح
میں جو سنا ہے کافیہ ہے چھوٹے کاف سے
اور اس میں ایک نکتہ بھی کرتا ہوں میں بیان
ورنہ مرے دہن کو جواہر سے پر کرے
بارے وہ نکتہ یہ ہے لگا کہنے کر خطاب
تصحیح صرف ہو چکی اب معنے اسکے سن
استادوں سے سنا تھا جو میں نے نہیں ہے یاد
ہر اک سے پوچھنے کو نہیں چاہتا ہے جی
یہ کہکے آپ ہی بولا کہ کہنے کا کیا حصول
اس شخص کا جو حدث ہے ہوا یہ اسیر ہے یا
پیر و ید کر کہوں ہوں بنا بر میں احتیاط

تفصیل کرنے کا تو دماغ اب نہیں رہا
کہنے لگا حقیقت عقلی تو ہے محال
یاں کون پوچھتا ہے دل اپنے کو شاد رکھ
یہ دونوں عیب شعر میں اپنے نہ آنے دے
کہنے لگا کہ قید نہیں اس میں مطلقا
یا آتش اور باد کا زنجیر و تاک کا
آتا ہے یہ کچھ اپنے تو ذہن شریف میں
عرصہ ہوا وسیع جواب چاہو سو کہو
معنی جو قافیہ کے کوئی پوچھتا تھا آ
دے مارتا تھا ہاتھوں کو وہ اپنی ٹانگ
ان احمقوں کے جینے کے پیچھے تو مرگیا
ٹوٹے سے بکتے بکتے انھوں کیلیے گلا
دو کوزے آب کے بھی یہ ہرگز نہ لائینگے
سنیو تو گوش دل سے اگر ہے تجھے تمیز
اول ہی لفظ کا نہیں ہے قافیہ صحیح
پس پڑھنا تو غلط ہوا اب سکا قاف سے
پھر بولا ہائے ہائے نہیں کوئی قدردان
یہ نقل اگلوں ہوں میں مجھے سے مراد پردھر
ہے ایک علم جفر میں بھی کافیہ کتاب
ورنہ لگے ہے ذہن میں ان معنوں کو گھن
اوراب جہاں کے بیچ نہیں کوئی اوستاد
لائق نہیں جو پوچھیے اب قافیہ ردی
اس معنی کو کہیے یہ مرے کیجیو قبول
ہر چند اس کو گوز شتر جانے سب دیار
حرف غلط کا تا نہ ہو معنی سے اختلاط

یا پھل ہے وہ حنا کا جو لگتا ہے جھاڑ میں
گر پوچھا کوئی کہ کسے کہتے ہیں رُوی
پھر جا کے کھول جد کی سلنپے کتاب کو
اغلب کہ اسے عزیز وہ جنگل کی ہے جڑی
اک دن بدیع میں جو اُسے امتحاں کیا
کر جمع قلبِ مستوی و قلبِ بعض کو
حالانکہ تین صنعتیں کی جاتیاں بیاں
پوچھا جو اُس سے معنیٔ ایہام کے تئیں
یعنی تھا ایک تت میں اک پہلوانِ زور
بہرام گور اسی ہی کو کہتے ہیں سب عوام
تجنیس کا سوال کیا اُس سے ایک روز
نادان تو نے اسپِ مجنّس نہیں سُنا
لاتے جہاں ہیں شعر میں تجنیس شاعراں
میں نے کہا کہ کہتے ہیں تم کو عروض داں
بولا کہ تیری عقل سے آتا ہے بس عجب
پھر میں کیا سوال بسیط و رمل و رجز
ان میں جو ہے گا فاصلہ مجھ کو بتائیے
بولا کہ تجھ کو عقل نہیں تا کجا کہوں
یہ تینوں رودخانے ہیں دہر بسیط میں
پھر آپ ہی آپ بولا کہ اک اور افادہ سن
بحرِ طویل ایک ہے دریا بہت بڑا
تمثیل اُس کی ڈھونڈھنے اب جائیے کہاں
تشریح میں بھی ایک تھا وہ تلخ بے مثال
تاریخ داں تھا قطع نظر سب کمال کے
کہنے لگا تمھارے پیمبر کے عہد میں

یا کاہِ خشک ہے جو اُگے ہے پہاڑ میں
کہتا رَوی غلط ہے مجھے یاد ہے رُوی
کہتا مرے قیاس میں آتا ہے ہو نہ ہو
ہوتی ہے جنگلی بیل بوبوں اُپر پڑی
اک بار باز سامنے اُس نے وہاں کیا
کہنے لگا کہ عکس ہے اکثر کہاں ہے وہ
اور ایک سمجھا اُن کے تئیں ایسے ہیں کہاں
دینے لگا نشاں مجھے اک نام کے تئیں
دو انگلیوں سے اُن نے اُکھاڑے تھے شاخ گور
در گور یہ تمام کہ کہتے ہیں ناتمام
کہنے لگا اس اسپ کو کہتے ہیں جو ہو یوز
مشتق اسی سے جانے ہے جو ہے پھاگنا
مذکوران سے ہوتے ہیں گھوڑ دوڑ نئے صف وا
بحرِ رمل کی مجھ سے حقیقت کرو بیاں
دریا کا ایک نام ہے پھر کیا کہوں سبب
بحرِ طویل بحرِ مدید اور بحرِ رجز
کابل سے ملکے حیف ہے ناقص جو جائیے
یوں تربیت میں تجھ سے کی میں کہ تلک رہوں
ملتے ہیں رفتہ رفتہ سبھی جا محیط میں
گر قابل اپنے ہونے کی رل میں رکھے ہے ظن
بحرِ خفیف ایک ہے پاس اُسکے آ بنا
جمنا کے پاس جیسے ہے ہنیڈن تمھارے یاں
ہر استخواں کو کہنے لگا نیم کی ہے چھال
کرتا سخن ضرور ہے نبیوں کے حال کے
تاریخ میں جو دیکھا تو عیسیٰ تھا عہد میں

یکبار گی غصا اُٹھے دجال کے اُوپر
علم نجوم میں بھی بڑا تھا اُسے کمال
اکدن کیا سوال شہانِ سلف سے میں
اُس نے کہا کہ خوب کہا طرفہ نقل ہے
امرد تھا ایک اُن نون شیریں تھا اُسکا نام
یہ سُن کے مارا خسرو پرویز نے اُسے
ہے ماجرا یہی جو کہے کوئی کیا ہے کہہ
از آبِ زر بہ خنجر شیرویہ نقش بود
گنتا تھا خوب آپ کو علم حساب میں
کہتا تھا جفت پانچ کا ہوتا ہے کر شمار
پھر طرفہ ہے یہ کہتا اگر ہے نہ چار طاق
علمِ لغت میں عمر بھی اُسکی ہوئی تھی صرف
مثلاً کہا کہ نخل ہے کیا اسکو کر بیاں
بولا کہ اک جزیرہ ہے سمت فرنگ کو
اب خاک سے نہنگ کی واں اک نہال ہے
اسکے ثمر کو بعض تو کہتے ہیں تاڑ پھل
کہتا ہے کوئی کہ کا خرما ہے اسکا بیج
جس کی صدا سے گوشِ بناتِ بحر ہیں کر
یہ کچھ لکھا ہے سارے لغت کی کتابوں میں
تحقیق اپنی یہ ہے کہ ہے نخل اصل حرف
وہ نخل کیا کہ جانور و چارپایہ ہے
سوداگر اس پہ بار کریں ہیں چنار کو
ہر سکے میں اُسکے بالوں کا بھی کرتے ہیں اچار
یہ کہہ کے آپ ہی بولا ہاں ریش اور فش
کرتا تھا شہ کمانی میں اپنے تئیں دخیل

پھر تب سے مجھ کو علم نہیں ہے کہ ہیں کدھر
شاید کہ اس ستارے کا ہے گا محل وبال
پرویز کے اُنھوں میں خصوصاً سلف ہے میں
رکھتا ہے حافظ میں اسے جسکو عقل ہے
یہ اسکی دشمنی میں ہوا یہ نہیں تلخ کام
بیدم کیا ہے خنجر پر تیز سے اُسے
اور شعر جو زباں سے پڑھا اپنی سو ہے یہ
کیں راشب بہ تیشۂ فرہاد می رسد
لیکن بیاں وہ کرتا نہیں جو کتاب میں
گر دیکھیے تو اسکو وہ ہووے ہزار بار
پس کیوں لکھا لغت میں خناصر کو چار طاق
کرتا سوال اس سے جو جا کر میں ایک حرف
وہ در جواب اسکے دہن کھول کر زباں
مارا تھا ان فرنگیوں نے اس نہنگ کو
شیرِ ولنگ کا وہ سدا پائمال ہے
بے مغزوں کا جو فرقہ ہے کہتا ہے نارجیل
اک کہتے ہیں فرنگ میں ہے ایک بادریج
صدمہ سے جسکے ٹوٹ گئی کوہ کی کمر
زبدہ ضریری شرح وقایہ کے باو میں
تصحیف ہو گئے سے جو تو ہے خ سے طرف
دم اتنی لمبی ہے کہ وہی سر کا سایہ ہے
اس پر بناتے ہیں گے رہوں میں منار کو
اس ہی کو کہتے ہیں گے مدائن میں سوسمار
آتا ہے جو کہ اپنے تئیں سمجھے ہے پیش کش
زاغ کماں کو دیکھ کے کہتا کہ ہے یہ چیل

دعویٰ تھا علم تیر میں اس کو بہت بڑا / پرے کے لیس ہاتھ میں ہوتا جو وہ کھڑا
پھر دیکھ بھال اسکو وہ کہتا کہ مجھ کو بھی / معلوم کیا ہے خوب ولیکن یہ ہے وہی
جب سوکھتا ہے اسکی سلاخوں کا کر خمیر / چاکوں اُپر کھار بناتے ہیں لیس و تیر
غرہ تھا ڈھولک اپنی بجانے پہ اور کبھو / آتا جو کوئی ہاتھ میں لے اُسکے روبرو
اس پر لگا ٹھکور تعجب سے پھر شتاب / کہتا روئی بھری ہے بہت اس میں وا اب
آواز خوش کی اسکی گلو سوزی پیش بول / گاتا تو باجتا تھا گلا جیسے پھوٹا ڈھول
لکڑی بھی پھینکتا تھا بہت خوب بیچ سے وہ / ہوتا تھا کچھ بہت جو کھڑا ہوتا دھیج سے وہ
شاگرد اس کا پوچھتا گر اس سے آن کر / مونڈھے اُپر لگاتے ہیں جو وار تان کر
اسکو اگر کہیں تو کہیں کیا وہ سر اُٹھا / کہتا کہ کڑک وہی ہے جو تجھ کو دیا بتا
تھا گھوڑے کا بھی خوب مبصر وہ مرد لیک / ایک میرے مہربان بھتیجے گھوڑا تھا انکا ایک
گھوڑے کی آنکھ پر تھی رسولی پہ گند تر / رہتی تھی اس کمیت کی وہ حائل نظر
تشریف لائے ذات شریف اسجگہ کہیں / واں گھوڑوں کی رسولی کی تھیں باتیں جہاں میں
کہنے لگا کہ ایک نظر مجھ کو بھی دکھاؤ / یہ چشم ہے خدا سے کہ اسکا اثر نہ پاؤ
اس گھوڑے کے سوار کے پھر جی میں آگیا / کھلوا منگا یا تھان سے وہ اسپ آنکھ مُندا
لاگا سئیس سامنے اسکے پھر آؤ نے / اور آنکھ اپنے گھوڑے کی اسکو دکھاؤ نے
ہر چند انکھیاں پھاڑ کے دیکھے یہ کہیں / اسکو تو پھوٹی آنکھوں سے پر سوجھتا نہیں
یکچشم دیکھ کہنے لگا نوچ پوچ حلق / گھوڑے کے موترا ہے رسولی کہے ہے خلق
پھر اس نظر پہ طرفہ تو یہ ہے کہ روکے جب / کہنے لگا کہ تب تو جہاں میں پڑی ہے ڈوب
شوخی کرے ہے ابلق ایام نابکار / ورنہ پیادے مجھسے پھریں ایسے ہوں سوار
جو جو ہوئے ہیں چرخ سے مجھ پر ستم مدام / جیتا رہا تو سیر کروں گا گلے تمام

اپنی تو بدزبانی نہ تھی خامے کا شعار
پر یہ بھی ہے جریدۂ عالم میں یادگار

--- ✻ ---

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جنگنامہ

اب کے نواب رامپور آیا
ناگہاں اس طرف خدا لایا

آگے آتا تھا بہرِ سیر و شکار
بازی کیسر ردہلی سے اس بار

گرد تھی فوج کی سپہر تلک
بنگیا اور ایک تازہ فلک

جمع افغاں پسر تھے اس جاگہ
لیک سارے تھے جنگ ناآگہ

یہ نہ سمجھے وزیر کوہ وقار
بے تحمل سے رہ میں دیر گزار

یعنی تخریب ایک آن میں ہے
روکشی ان کی کسرِ شان میں ہے

بے تہی سے وہ پیش جنگی کر
وانچے دے دے گرے ہراول پر

دیکھ کر لوگ تھوڑے ٹوٹ پڑے
پکے پھوڑے کے زنگ پھوٹ پڑے

جتھے تلوار دنیں فرنگی سے
مرے مارے بہت کرفنگی سے

تھا تہور نہ یہ شجاعت تھی
ساعتِ جنگ یا قیامت تھی

تھے تلنگے روہیلے محو جنگ
لوتھوں سے ہوگیا تھا عرصہ تنگ

گورے کالے جدا جدا کیا تھے
دونوں مردم گیا سے یکجا تھے

دیو کا بھی نہ ٹھہرے پاس جا
تھا اُنھوں کا جہاں ثباتِ پا

سہل سردار سمجھا یہ مرنا
اللہ اللہ ترا جگر کرنا

توپ پر آن کر چلی تلوار
جھیل کر زخم لڑ موا سردار

صاحب اک اور اسکی جا آیا
جن نے ایسی بلا کو چنوا یا

جنگ مغلوبہ تھی گتھے باہم
مرتے تھے دونوں اور سکے رستم

صاحب انگریز کے گرے اکثر
تھک گئے لڑتے مرتے ہم دیگر

تاک کر باڑھ پہلو سے ماری
صف الٹ دی حریف کی ساری

لشکری سب سراں سمیت رہے
سبز جو کچھ ہوئے تھے کھیت ہرے

نعش پر نعش گر کے ڈھیر ہوئے
بھوکے مرتے کہ جی سے سیر ہوئے

پیچھے سردار تھا پٹھانوں کا
دیکھا جانا جو ان نے جانوں کا

خواب غفلت سے چونک اٹھا جاگا
دست پاچہ ہو اگیا بھاگا

مارے بھاگوں کو فوج نے لوٹا
مرگیوں میں سے بھی نہ اک چھوٹا

غارت از بس کر لشکری لائے
نعشوں سے اشرفی روپے پائے

وہ جو بھاگا تھا معرکہ سے رئیس
بھاگا یوں جیسے پیش اسپ سئیس

ہوتے جو ہیں روہیلے ظلم شعار
لٹتے جاتے تھے شہر راہ گزار

رامپور میں بھی آکے رہ نہ سکا
وہ خدا گیر بات کہہ نہ سکا

بھاگا واں سے ہے لیکے کچھ اسباب
کہ لگا آیا لشکر نواب

لی پناہ ان نے جاکے زیر کوہ
واں بھی تھا ساتھ کوہ کوہ انبوہ

تھا پہاڑوں کے آگے جنگل بھی
وہیں ناکہ بہ تھا یہ دنگل بھی

وھاں روہیلے ہوئے اکٹھے سب
بعد دو چار پنج روز و شب

عجز کی راہ سے کیا پیغام
ہم ہیں نواب کے کمینے غلام

بندے رہتے ہیں باوجود خطا
تم سے صاحب امیدوار عطا

لطف کریے امیدواروں پر
رحم کریے گناہگاروں پر

ہم غلامی میں ہوتے ہیں حاضر
اب نہ خدمت سے ہو وینگے قاصر

کسو صاحب کو ہو حضور سے حکم
سوجب طوع وہ ہے دور سے حکم

کہ مجھے اپنے ہاتھ لے جاوے
پاؤں کتنے کے عاجز آ پاوے

ذات نواب ہے کرم سیرت
کہا صاحب کو تم بصد عزت

معرفت اپنے جاکے لاؤ اسے
پاس خیمہ میں لا بٹھاؤ اسے

یا کہ خیمہ جدا کرو استاد ہم اُسے وقت پر کریں گے یاد
لایا صاحب چنانچہ خود جا کر پاس کرنا ہے تالفہ جا کر
سر میں اسکے خیال باطل تھا آپ بھی وہ جوان جاہل تھا
گفتگو میں کجی لگا کرنے ہوا موجود مارنے مرنے
چاہتا تھا کہ آپ کو مارے بارے ہتھیار چھین گئے سارے
رفقا کے تئیں نکال دیا رنجبہ کر ٹہلوؤں کو ٹالدیا
اُٹھ گئے جو حرامزادے تھے ہو چکے دل میں جو ارادے تھے
عاقبت اس کو باندھ کر بھیجا کہا پلٹن سے لکھنؤ لے جا
جمع تھے لوگ سو پریشاں ہیں رہ گئے ہیں سو عجز کیشاں ہیں
جنگ نے صبح کے تئیں ہے نہ شام آشتی کے ہیں اب پیام و سلام
غالباً صبح آج کل ہووے ہر طرف جنگی خلل ہووے
لے کے اب ملک و مال سب نواب راہ لیتے ہیں لکھنؤ کی شتاب
سال تاریخ کا تھا مجھ کو خیال لطف کے ردے کی ملک نے مقال
کاسے سخن گستر و جہاں استاد فتح نواب سے کر اب دل شاد

۱۱ ۷ ۹
۱۲ ۰ ۹

میر کوئی غزل کہو اب تم
لذتِ شعر میں رہو خود گم

یہہ مثنوی تمام ہوئی

غزل

(یہ غزل ایک قلمی نسخے تحریر شدہ ۱۲۲۹ھ میں موجود ہے)

گرد سر پھرکے کرتے پھروں پاس
سو تو ہم لوگ اُس کے آس نہ پاس

خط پہ خط بھیجتا تھا لکھوا کر
جب تلک یار تھا نہ حرف شناس

دل نہ باہم ملے تو ہجراں ہے
ہم وے رہتے ہیں گوکہ پاس ہی پاس

عرش و دل میں رہے مگر برسوں
وہم ہے پر کہیں کہیں ہے قیاس

ہے چلا جب سے وہ پریشاں ربط
جمع اک دم رہے نہ میرے حواس

ناامیدی بھی حد رکھتی ہے
جیتا کب تک رہے گا کوئی نراس

جز خدا ہم کسو سے ڈرتے نہیں
گھر ہمارا ہے واں جہاں ہر اس

میں تو حیرانِ کار ہوں بیہوش
کیونکہ نکلے گی میرے دل کی بھڑاس

میر وحشی کا دل ہے بے طاقت
چلتا پھرتا ہے پر اُداس اُداس

غزل دوم غیر مطبوعہ

رہے عمر بھر دیکھتے سادگاں کو
یہی جینے نہیں دیتے دلدادگاں کو

خبر قاصدوں کو نہیں اپنی شاید
بہت دور بھیجا فرستادگاں کو

عجب سادگوں میں ہے قشقوں کی خوبی
نہ ہو عجب کیوں برہمن زادگاں کو

نہال اور سرو اُسکے حیراں کھڑے ہیں
کیا پائے گیر اُن نے آزادگاں کو

رہے زیر دیوار ہم میر برسوں
نہ پوچھا کبھی خاک اُفتادگاں کو

گذارش

مجھے فخر ہے کہ سالہاسال کی محنت اور کاوش کے بعد کلام افصح الفصحا میر تقی میر بترتیب جدید ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ میر کا کلیات اب تک عام طریقے سے نہایت لاپروائی کے ساتھ غلطیوں کی نذر ہوتا رہا ہے لیکن اس مرتبہ خصوصیت کے ساتھ متعدد قلمی اور سابقہ مطبوعہ نسخوں سے اسکی تصحیح کا پورا اہتمام کیا گیا جسکو مصوّر درد مولوی عبدالباری آسیؔ اور جناب مولوی سید جعفر علی صاحب فاضل دیوبند نے نہایت غور اور امعان نظر کے ساتھ اصل پر نظر ثانی کر کے کئی کئی مرتبہ کاپیوں اور پروفوں کو دیکھ کر صحیح کیا اور بعد کو آسیؔ صاحب نے اس پر فرہنگ اور مقدمہ کا اضافہ فرمایا۔ اس میں جو حواشی دیے گئے ہیں وہ بھی میرؔ کے کلام کے توازن کے لیے بہت موزوں ہیں امید ہے کہ مبصرین و ماہرین کی نگاہوں میں یہ مطبع کی گراں بہا خدمت درجۂ قبول پائیگی اور شائقین اسکی قدردانی فرما کر مطبع کو ایسی دوسری اہم خدمات ادبی و علمی کے لیے آمادہ فرمائینگے

المشتہر
مینیجر نولکشور پریس صیغۂ بکڈپو لکھنؤ

دیوانِ اوّل

میر تقی میر دہلویؒ

۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غزل

تھا مستعار حسن سے اُس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرہ ظہور تھا

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا

مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

منعم کے پاس قاقم و سنجاب تھا تو کیا
اُس رند کی بھی رات گزر گئی[1] جو عور تھا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

قطعہ

کل پانوں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

کیا میں بھی پریشانیِ خاطر سے قریں تھا
آنکھیں تو کہیں تھیں دلِ غمدیدہ کہیں تھا

کس رات نظر کی ہے سوئے چشمکِ انجم
آنکھوں کے تلے اپنے تو وہ ماہ جبیں تھا

آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لئے لیکن
ہونٹھوں پہ مرے جب نفسِ بازپسیں تھا

اب کوفت سے ہجراں کی جہاں تن پہ رکھا ہاتھ
جو درد و الم تھا سو کہے تو کہ وہیں تھا

جانا نہیں کچھ جز غزل آکر کے جہاں میں
کل میرے تصرف میں یہی قطعہ زمیں تھا

قطعہ

نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انھوں کا
جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیرِ نگیں تھا

مسجد میں امام آج ہوا آکے کہاں سے
کل تک تو یہی میر خرابات نشیں تھا

---

[1] گزرگئی - بروزن 'فعولن' اب متروک ہے کیونکہ اس طرح صرف 'گزرگی' رہ جاتا ہے -

نکلے ہے چشمہ جو کوئی جوش زناں پانی کا
یاد دہ ہے وہ کسو چشم کی گریانی کا

لطف اگر یہ ہے بتان صندل پیشانی کا
حسن کیا صبح کے پھر چہرۂ نورانی کا

کفر کچھ چاہیے اسلام کی رونق کیلئے
حسن زنار ہے تسبیح سلیمانی کا

درہمی حال کی ہے سارے مرے دیواں میں
سیر[1] کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا

جان گھبراتی ہے اندوہ سے تن میں کیا کیا
تنگ احوال ہے اس یوسفِ زندانی کا

کھیل لڑکوں کا سمجھتے تھے محبت کے تئیں
ہے بڑا حیف ہمیں اپنی بھی نادانی کا

وہ[2] بھی جانے ہے لہو رو کے لکھا ہے مکتوب
ہم نے سرنامہ کیا کاغذ افشانی کا

اُس کا منہ دیکھ رہا ہوں سو وہی دیکھوں ہوں
نقش کا سا ہے سماں میری بھی حیرانی کا

بت پرستی کو تو اسلام نہیں کہتے ہیں
معتقد کون ہے میر ایسی مسلمانی کا

جامۂ مستیِ عشق اپنا مگر کم گھیر تھا
دامنِ تر کا مرے دریا ہی کا سا پھیر تھا

دیر[3] میں کعبے گیا میں خانقہ سے اب کی بار
راہ سے میخانہ کی اس راہ میں کچھ پھیر تھا

بلبلوں نے کیا گل افشاں میر کا مرقد کیا
دُور سے آیا نظر تو پھولوں کا اک ڈھیر تھا

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو اُن نے مروت کو کیا ہوا

اُمیدوارِ وعدۂ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا

کب تک تظلم آہ بھلا مرگ کے تئیں
کچھ پیش آیا واقعہ رحمت کو کیا ہوا

اُس کے گئے پر ایسی گئی دل سے ہمنشیں
معلوم بھی ہوا نہ کہ طاقت کو کیا ہوا

بخشش نے مجھ کو ابرِ کرم کی کیا خجل
اے چشم جوش اشکِ ندامت کو کیا ہوا

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف
اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

تھی صعب عاشقی کی بدایت ہی میر پر
کیا جانئے کہ حال نہایت کو کیا ہوا

[1] سیر کر تو بھی الخ فی زماننا اس کو یوں کہا جائیگا "دیکھ لے تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا" یا تو بھی اس مجموعۂ پریشانی کی سیر کر۔

[2] کسی استاد کا شعر ہے۔ سوادِ دیدہ حل کردم نوشتم نامہ سوئے تو ؛ کہ تا ہنگام خواندن چشم من افتد برُوئے تو۔ مرزا غالبؔ: آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا ؛ تجھ پہ کھل جائے کہ مجھ کو حسرتِ دیدار ہے

[3] مرزا عبد التقی بیگ تل شاگرد مرزا غالبؔ: حوض کوثر پہ جا نکلتا ہے ؛ یہی رستہ شراب خانے کا۔

شبِ ہجر میں کم تظلّم کیا — کہ ہمسایگاں پر ترحّم کیا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات؟ — کلی نے یہ سن کر تبسّم کیا

زمانے نے مجھ جرعہ کش کو ندان — کیا خاک و خشتِ سرِ خم کیا

جگر[۱] ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک — پلک تک گیا تو تلاطم کیا

کسو وقت پاتے نہیں گھر اسے
بہت میرؔ نے آپ کو گم کیا

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا — دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند — یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

حرف نہیں جاں بخشی میں اس کی خوبی اپنی قسمت کی — ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی — چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں — بانکے ٹیڑھے ترچھے تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی — کوسوں اس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کس کا کعبہ کیسا قبلہ، کون حرم ہے کیا احرام — کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا۔ رات کو تھا میخانے میں — جبّہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی مستی میں انعام کیا

کاش اب برقع منھ سے اٹھا دے، ورنہ پھر کیا حاصل ہے — آنکھ مندے پر ان نے گو دیدار کو اپنے عام کیا

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے — رات کو رو رو صبح کیا۔ یا دن کو جوں توں شام کیا

صبح چمن میں اس کو کہیں تکلیفِ ہوا لے آئی تھی — رخ سے گل کو مول لیا۔ قامت سے سرو غلام کیا

ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیے — بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

کام ہوئے ہیں سارے ضائع ہر ساعت کی سماجت سے — استغنا کی چوگنی ان نے جوں جوں میں ابرام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی — سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

چمن میں گل نے جو کل دعویٔ جمال کیا — جمالِ یار نے منھ اس کا خوب لال کیا

فلک نے آہ تری رہ میں ہم کو پیدا کر — برنگِ سبزۂ نورستہ پائمال کیا

[۱] مرزا غالبؔ دہلوی ؎ دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا غالبؔ ۔ آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا۔

رہی تھی دم کی کشاکش گلے میں کچھ باقی
سو اُس کی تیغ نے جھگڑا ہی انفصال کیا

مری اب آنکھیں نہیں کھلتیں ضعف سے ہمدم
نہ کہہ کہ نیند میں ہے تو یہ کیا خیال کیا

بہارِ رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو
چمن کو یُمنِ قدم نے ترے نہال کیا

جواب نامہ سیاہی کا اپنی ہے وہ زلف
کسو نے حشر کو ہم سے اگر سوال کیا

لگا نہ دل کو کہیں کیا سُنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میرؔ کا اس عاشقی نے حال کیا

دیکھے گا جو تجھ رو کو سو حیران رہے گا
وابستہ ترے مو کا پریشان رہے گا

وعدہ تو کیا اُس سے دمِ صبح کا لیکن
اُس دم تئیں مجھ میں بھی اگر جان[1] رہے گا

منعم نے بِنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا
پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا

چھوٹوں کہیں ایذا سے، لگا ایک ہی جلاد
تا حشر مرے سر پہ یہ احسان رہے گا

چپٹے رہیں گے دشتِ محبت میں سر و تیغ
محشر تئیں خالی نہ یہ میدان رہے گا

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

دل دینے کی ایسی حرکت اُن نے نہیں کی
جب تک جئے گا میرؔ پشیمان رہے گا

تا گور کے اوپر وہ گُل اندام نہ آیا
ہم خاک کے آسودوں کو آرام نہ آیا

بے ہوشِ مےِ عشق ہوں کیا میرا بھروسا
آیا جو بخود صبح تو میں شام نہ آیا

کس دل سے ترا تیرِ نگہ پار نہ گزرا
کس جان کو یہ مرگ کا پیغام نہ آیا

دیکھا نہ اُسے دُور سے بھی منتظروں نے
وہ رشکِ مہِ عید لبِ بام نہ آیا

سو بار بیاباں میں گیا محملِ لیلیٰ
مجنوں کی طرف ناقہ کوئی گام نہ آیا

اب کے[2] جو ترے کوچے سے جاؤں گا تو سُنیو
پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا

نے خون ہو آنکھوں سے بہا ٹک نہ ہوا داغ
اپنا تو یہ دل میرؔ کسو کام نہ آیا

۱؎ جان میر تقی سے پہلے اور میر تقی کے معاصرین کے یہاں بصورت تذکیر بھی پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ مرزا رفیع سوداؔ کے اس شعر میں
؎ تیشے سے جو کوہ کن نے سر کو پٹکا ۔ شیریں کا یہ سُن کے جان تن سے بھٹکا
مگر اب بالاتفاق دہلی اور لکھنؤ کے فصحا میں مؤنث بولا جاتا ہے۔ آسی
۲؎ مصحفی کا شعر اسی انداز کا ہے ؎ مرضِ عشق سے گر اب کے سنبھل جاؤں گا ۔ تو میں دو چار برس کو کہیں ٹل جاؤں گا

جس سر کو غرور آج ہی یاں تاج وری کا
کل اُس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

شرمندہ ترے رُخ سے ہی رُخسار پری کا
چلتا نہیں کچھ آگے ترے کبک دری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لُٹا راہ میں یاں ہر سفری[1] کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہی اس آشفتہ سری کا

ہر زخمِ جگر داورِ محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینہ کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

صد موسمِ گل ہم کو تہِ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا

اس رنگ سے جھمکے ہے پلک پر کہ کہے تو
ٹکڑا ہے ترا اشک عقیقِ جگری کا

کل سیر کیا ہم نے سمندر کو بھی جا کر
تھا دستِ نگر پنجۂ مژگاں کی تری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہی بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا

منھ تکا ہی کرے ہی جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئنہ کس کا

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہوں
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

تھے بُرے مغبچوں کے تیور لیک
شیخ میخانے سے بھلا کھسکا[2]

داغ آنکھوں سے کھل رہے ہیں سب
ہاتھ دستہ ہوا ہے نرگس کا

بحر کم ظرف ہے بسانِ حباب
قطعہ کاسہ لیس اب ہوا ہی تو جس کا

فیض اے ابر چشمِ تر سے اُٹھا
آج دامن وسیع ہی اس کا

تاب کس کو جو حال میرؔ سنے
حال ہی اور کچھ ہی مجلس کا

وہ اک روش سے کھولے ہوئے بال ہو گیا
سنبل چمن کا مُفت میں پامال ہو گیا

اُلجھاؤ پڑ گیا جو ہمیں اُس کے عشق میں
دل سا عزیز جان کا جنجال ہو گیا

کیا امتدادِ مدتِ ہجراں بیاں کروں
ساعت ہوئی قیامت و مہ سال ہو گیا

[1] سفری بمعنی مسافر۔
[2] کھسکا۔ قافیہ معمولہ۔

دعویٰ کیا تھا گل نے ترے رخ سے باغ میں[1]
سیلی لگی صبا کی سو منھ لال ہوگیا

قامت خمیدہ رنگ شکستہ بدن نزار
تیرا تو میرؔ غم میں عجب حال ہوگیا[2]

بیتاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا
جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا

پودا ستم کا جس نے اس باغ میں لگایا
اپنے کیے کا اُن نے ثمرہ شتاب دیکھا

دل کا نہیں ٹھکانا۔ بابت جگر کی گم ہے
تیرے بلاکشوں کا ہم نے حساب دیکھا

آباد جس میں تجھ کو دیکھا تھا ایک مدت
اُس دل کی مملکت کو اب ہم خراب[3] دیکھا

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو
ہے خیر میرؔ صاحب! کچھ تم نے خواب دیکھا

دل بہم پہنچا بدن میں تب سے سارا تن جلا
آپڑی یہ ایسی چنگاری کہ پیراہن جلا

سرکشی ہی ہی جو دکھلاتی ہے اس مجلس میں داغ
ہوسکے تو شمع ساں دیجے رگِ گردن جلا

بدر ساں اب آخر آخر چھا گئی مجھ پر یہ آگ
ورنہ پہلے تھا مرا جوں ماہ نو دامن جلا

کب تلک دھونی لگائے جوگیوں کی سی ہوں
بیٹھے بیٹھے در پہ تیرے تو مرا آسن جلا

گرمی اُس آتش کے پرکالے سے رکھے چشم تب
جب کوئی میری طرح سے دیوے سب تن من جلا

ہو جو منت[4] سے تو کیا وہ شب نشینی باغ کی
کاٹ اپنی رات کو خار و خسِ گلخن جلا

سوکھتے ہی آنسوؤں کے نور آنکھوں کا گیا
بجھ ہی جاتے ہیں دیے جس وقت سب روغن جلا

شعلہ افشانی نہیں یہ کچھ نئی اس آہ سے
دوں لگی ہے ایسی ایسی بھی کہ سارا بن جلا

آگ سی اک دل میں سلگے ہے کبھو بھڑکی تو میرؔ
دیگی میری ہڈیوں کا ڈھیر جوں ایندھن[5] جلا

[1] لاعلم ــہ دعویٰ کیا تھا گل نے کل اُس کے رنگ و بو کا ؎ دھولیں صبا نے ماریں شبنم نے منھ پہ تھوکا۔ ۱۲
ایسا ہی ایک اور شعر ہے ــہ چمن میں گل نے جو کل دعویٰ جمال کیا ؎ صبا نے مار طمانچہ منھ اُس کا لال کیا۔

[2] حسرت موہانی ــہ عشق بتاں کو جی کا جنجال کرلیا ہے ؎ حسرت یہ تو نے اپنا کیا حال کرلیا ہے۔

[3] فی زماننا۔ اب ہم نے خراب دیکھا" کہیں گے۔

[4] احسان لینے کی مذمت میں کسی اُستاد کا یہ شعر بھی بہت خوب ہے ــہ دیوار بارِ منت مزدور سے ہے خم ؎ اے خانماں خراب احساں اُٹھائیے
یا یہ شعر ذوقؔ دہلوی کا ــہ نہ پکڑیں دامن الیاسؑ گرداب بلا میں ہم ؎ کہ بدتر ڈوب مرنے سے ہے جینا اس سہارے کا

[5] جوں ایندھن۔ قدما کے یہاں اکثر اس قسم کی ترکیبیں ملتی ہیں مگر زمانہ حال کے فصحا کے نزدیک مختلف فیہ ہیں ۱۲

حالِ دلِ میرؔ کا رو رو کے سب اے ماہ سنا ‌ ‌ ‌ شب کو القصہ عجب قصۂ جانکاہ سنا

نابلد ہو کے رہِ عشق میں پہنچوں تو کہیں ‌ ‌ ‌ ہمرہِ خضر کو یاں کہتے ہیں گمراہ سنا

کوئی ان طوروں سے گزرے ہے ترے غم میں مری ‌ ‌ ‌ گاہ تو نے نہ سنا حال مرا گاہ سنا

خوابِ غفلت میں ہیں یاں سب، تو عبث جاگا میرؔ ‌ ‌ ‌ بےخبر دیکھا انھیں میں[1] جنھیں آگاہ سنا

جب جنوں سے ہمیں توسل تھا ‌ ‌ ‌ اپنی زنجیرِ پا ہی کا غل تھا

بسترا تھا چمن میں جوں بلبل ‌ ‌ ‌ نالہ سرمایۂ توکل تھا

یک نگہ کو وفا نہ کی گویا ‌ ‌ ‌ موسمِ گل صفیرِ بلبل تھا

ان نے پہچان کر ہمیں مارا ‌ ‌ ‌ منھ نہ کرنا ادھر تجاہل تھا

شہر میں جو نظر پڑا اس کا ‌ ‌ ‌ کشتۂ ناز یا تغافل تھا

اب تو دل کو نہ تاب ہے نہ قرار ‌ ‌ ‌ یادِ ایام جب تحمل تھا

جا پھنسا دامِ زلف میں آخر ‌ ‌ ‌ دل نہایت ہی بے تامل تھا

یوں گئی قد کی خم ہوئے جیسے ‌ ‌ ‌ عمر اک رہروِ سرِ پل تھا

خوب دریافت جو کیا ہم نے ‌ ‌ ‌ وقتِ خوش میرؔ نکہتِ گل تھا

آگے جمالِ یار کے معذور ہو گیا ‌ ‌ ‌ گل اک چمن میں دیدۂ بے نور ہو گیا

یک چشم منتظر ہے کہ دیکھے ہے کب سے راہ ‌ ‌ ‌ جوں زخم تیری دوری میں ناسور ہو گیا

قسمت تو دیکھ شیخ کو جب لہر آئی تب ‌ ‌ ‌ دروازہ شیرہ خانے کا معمور ہو گیا

پہنچا قریبِ مرگ کے وہ صیدِ ناقبول ‌ ‌ ‌ جو تیرے صیدگاہ سے ٹک دور ہو گیا

دیکھا یہ ناؤ نوش کہ نیشِ فراق سے ‌ ‌ ‌ سینہ تمام خانۂ زنبور ہو گیا

اس ماہِ چاردہ ۱۴ کا چھپے عشق کیونکہ آہ ‌ ‌ ‌ اب تو تمام شہر میں مشہور ہو گیا

شاید کسو کے دل کو لگی اس گلی میں چوٹ ‌ ‌ ‌ میری بغل میں شیشۂ دل چور ہو گیا

دیکھا جو میں نے یار تو وہ میرؔ ہی نہیں ‌ ‌ ‌ تیرے غمِ فراق میں رنجور ہو گیا

---

[1] یعنی میں نے جنھیں آگاہ سنا۔

فرہاد ہاتھ تیشہ پہ ٹک رہ کے ڈالتا
پتھر تلے کا ہاتھ ہی اپنا نکالتا

بگڑا اگر وہ شوخ تو سنیو کہ رہ گیا
خورشید اپنی تیغ و سپر ہی سنبھالتا

یہ سر تبھی سے گوئے ہے میدان عشق کا
پھرتا تھا جن دنوں میں تو گیندیں اچھالتا

بن سکے پھوڑتے بنتی نہ تھی کوہکن کے تئیں
خسرو سے سنگ سینہ کو کس طور ٹالتا

چھاتی سے ایک بار لگاتا جو وہ تو میر
برسوں یہ زخم سینے کا ہم کو نہ سالتا

گل شرم سے بہ جائیگا گلشن میں ہو کر آب سا
برقع سے گر نکلا کہیں چہرہ ترا مہتاب سا

گلبرگ کا یہ رنگ ہے مرجاں کا ایسا ڈھنگ ہے
دیکھو نہ جھمکے ہے پڑا وہ ہونٹھ لعل ناب سا

وہ مایۂ جاں تو کہیں پیدا نہیں جوں کیمیا
میں شوق کی افراط سے بیتاب ہوں سیماب سا

دل تاب ہی لایا نہ ٹک تا یاد رہتا ہمنشیں
اب عیش روزِ وصل کا ہے جی میں بھولا خواب سا

سناہٹے میں جان کے ہوش و حواس و دم نہ تھا
اسباب سارا لے گیا آیا تھا اک سیلاب سا

ہم سرکشی سے مدتوں مسجد سے بچ بچ کر چلے
اب سجدے ہی میں گزرے ہے قد جو ہوا محراب سا

تھی عشق کی وہ ابتدا جو موج سی اٹھی کبھو
اب دیدۂ تر کو جو تم دیکھو تو ہے گرداب سا

بہکے جو ہم مست آگئے سو بار مسجد سے اٹھا
واعظ کو مارے خوف کے کل لگ گیا جلاب سا

رکھ ہاتھ دل پر میر کے دریافت کر کیا حال ہے
رہتا ہے اکثر یہ جواں کچھ ان دنوں بیتاب سا

مر رہتے جو گل بن تو سارا یہ خلل جاتا
نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا

پیدا ہے کہ پنہاں تھی آتش نفسی میری
میں ضبط نہ کرتا تو سب شہر یہ جل جاتا

میں گریۂ خونیں کو روکے ہی رہا۔ ورنہ
یک دم میں زمانہ کا یاں رنگ بدل جاتا

بن پوچھے کرم سے وہ جو بخشش نہ دیتا تو
پرسش میں ہماری ہی دن حشر کا ڈھل جاتا

استادہ جہاں میں تھا۔ میدانِ محبت میں
واں رستم اگر آتا تو دیکھ کے ٹل جاتا

وہ سیر[1] کا وادی کے مائل نہ ہوا۔ ورنہ
آنکھوں کو غزالوں کی پاؤں تلے مل جاتا

[1] سیر۔ اب بالاتفاق تانیث بولا جاتا ہے لیکن میر سے پہلے اور میر کے زمانے میں مذکر بھی بولا جاتا تھا جیسا کہ ذیل کے اشعار سے پتہ چلتا ہے

خود میر کا ایک شعر ہے۔ لاہو خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں ؎ نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کا

مرزا رفیع السودا کا شعر ہے۔ بسکہ پوچھوں ہوں میں اپنی چشم خوں آلود کو ؎ جامہ کا ہر ایک تختہ سیر ہے گلزار کا

بیتاب دلوں یوں میں کاہے کو تلف ہوتا
یا تو ہی ترے لب کی ملتی تو سنبھل جاتا

اُس سیم بدن کو تھی کب تاب تعب اتنی
وہ چاندنی میں شب کی ہوتا تو پگھل جاتا

مارا گیا تب گزرا بوسے سے ترے لب کے
کیا میر بھی لڑکا تھا باتوں میں بہل جاتا

سُنیو جب وہ کبھو سوار ہوا
تا بہ روح الامین شکار ہوا

اُس فریبندہ کو نہ سمجھے آہ
ہم نے جانا کہ ہم سے یار ہوا

نالہ ہم خاکساروں کا آخر
خاطرِ عرش کا غبار ہوا

مر چلے بے قرار ہو کر ہم
اب تو تیرے تئیں قرار ہوا

وہ جو خنجر بکف نظر آیا
میر سو جان سے نثار ہوا

مانندِ شمعِ مجلس شب اشکبار پایا
القصہ میر کو ہم بے اختیار پایا

احوال خوش اُنھوں کا ہم بزم میں جو تیرے
افسوس ہے کہ ہم نے واں کا نہ بار پایا

چیتے جو ضعف ہو کر زخمِ رسا سے اُس کے
سینے کو چاک دیکھا دل کو فگار پایا

شہرِ دل ایک مدت اُجڑا بسا غموں میں
آخر اُجاڑ دینا اُس کا قرار پایا

اتنا نہ تجھ سے ملتے نے دل کو کھو کے روتے
جیسا کیا تھا ہم نے ویسا ہی یار پایا

کیا اعتباریاں کا پھر اُس کو خوار دیکھا
جس نے جہاں میں آ کر کچھ اعتبار پایا

آہوں کے شعلے جس جا اُٹھتے تھے میر سے شب
واں جا کے صبح دیکھا مشتِ غبار پایا

مارا زمیں میں گاڑا۔ تب اُس کو صبر آیا
اس دل نے ہم کو آخر یوں خاک میں ملایا

اس گل زمیں[ك] سے اب تک اُگتے ہیں سرو جس جا
مستی میں جھکتے جس پر تیرا پڑا ہے سایا

یکساں ہے قتل گہ اور اُس کی گلی تو مجھ کو
واں خاک میں میں لوٹا یاں لوہو میں نہایا

پوجے سے اور پتھر ہوتے ہیں یہ صنم تو
اب کس طرح اطاعت اُن کی کروں خدایا

تا چرخ نالہ پہنچا لیکن اثر نہ دیکھا
کرنے سے اب دعا کے میں ہاتھ ہے اُٹھایا

تیرا ہی منھ تکے ہے کیا جانیے کہ نو خط
کیا باغِ سبز تو نے آئینہ کو دکھایا

ك مرزا غالب دہلوی ؒ ۔ مدفنِ عاشق سے اُگتی ہے جو کوسوں تک حنا ؎ کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

شادابی و لطافت ہرگز ہوئی نہ اُس میں
تیری مسوں پہ گرچہ سبزے نے زہر کھایا

آخر کو مر گئے ہیں اُس کی ہی جستجو میں
جی کے تئیں بھی کھویا لیکن اُسے نہ پایا

لگتی نہیں ہے دارو، ہیں سب طبیب حیراں
اک روگ میں بسا ہا جی کو کہاں لگایا

کہہ ایچ اُس کے مُنہ کو جی میں ڈرا یہاں تو
بارے وہ شوخ اپنی خاطر میں کچھ نہ لایا

ہونا تھا مجلس آرا اگر غیر کا تجھے تو
مانند شمع مجھ کو کاہے کے تئیں جلایا

تھی یہ کہاں کی یاری آئینہ رو کہ تو نے
دیکھا جو میر کو تو لے ایچ مُنہ بنایا

شکوہ کروں میں کب تک اُس اپنے مہرباں کا
القصہ رفتہ رفتہ دشمن ہوا ہے جاں کا

گریہ پہ رنگ آیا، قید قفس سے شاید
خوں ہوگیا جگر میں اب داغ گلستاں کا

لے جھاڑو ٹوکرا ہی آتا ہے صبح ہوتے
جاروب کش مگر ہے خورشید اُس کے ہاں کا

دی آگ رنگِ گل نے واں اے صبا چمن کو
یاں ہم جلے قفس میں سُن حال آشیاں کا

ہر صبح میرے سر پر اک حادثہ نیا ہے
پیوند ہو زمیں کا۔ شیوہ اس آسماں کا

قطعہ

ان صید افگنوں کا کیا ہو شکار کوئی
ہوتا نہیں ہے آخر کام اُن کے امتحاں کا

تب تو مجھے کیا تھا تیروں سے صید اپنا
اب کرتے ہیں نشانہ ہر میرے استخواں کا

فتراک جس کا اکثر لوہو میں ترپے[1] ہے
وہ قصد کب کرے ہے اس صیدِ ناتواں کا

کم فرصتی جہاں کے مجمع کی کچھ نہ پوچھو
احوال کیا کہوں میں اس مجلسِ رواں[2] کا

سجدہ کریں ہیں سُنکر اوباش سارے اُس کو
سیّد پسر وہ پیارا ہے گا امام بانکا[3]

ناحق شناسی ہے یہ زاہد نہ کر برابر
طاعت سے سَو برس کی سجدہ اس آستاں کا

جس دن کہ اُس کے مُنہ سے برقع اُٹھیگا سُنیو
اُس روز سے جہاں میں خورشید پھر نہ جھانکا[4]

ناحق یہ ظلم کرنا انصاف کر پیارے
ہے کون سی جگہ کا۔ کس شہر کا۔ کہاں کا

سودائی ہو تو رکھے بازارِ عشق میں پا
سر مفت بیچتے ہیں یہ کچھ چلن ہے واں کا

سَو گالی ایک چشمک اتنا سلوک تو ہے
اوباش خانہ جنگ اُس خوش چشم بدزباں کا

---

[1] "رہے ہے" اب متروک ہے۔ اس کی بجائے "رہتا ہے" فصیح ہے۔
[2] "مجلس رواں" دُنیا کو مجلس رواں کہنا، نہایت لطیف ہے کیونکہ یہاں کی ہر چیز سفری اور ہر شے گزراں ہے۔
[3] [4] قافیے معمولہ

قطعہ

یا روئے یا رُلایا اپنی تو یوں ہی گزری
کیا ذکر ہم صفیراں، یارانِ شادماں کا

قیدِ قفس میں ہیں تو خدمت ہے نالگی کی
گلشن میں تھے تو ہم کو منصب تھا روضہ خواں کا

پوچھو تو میر سے کیا کوئی نظر پڑا ہے
چہرہ اُتر رہا ہے کچھ آج اُس جواں کا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

قسم جو کھائیے تو طالعِ زلیخا کی
عزیزِ مصر کا بھی صاحب اک غلام لیا

خراب رہتے تھے مسجد کے آگے میخانے
نگاہِ مست نے ساقی کی انتقام لیا

وہ کج روش نہ ملا راستی میں مجھ سے کبھی
نہ سیدھی طرح سے اُن نے مرا سلام لیا

مزا دکھا دیں گے بیرحمی کا تری صیاد
گر اضطرابِ اسیری نے زیرِ دام لیا

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

شعر

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میر
پہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا

سیر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا
جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوست پیکاں تیر کا

سب کھلا باغِ جہاں اِلّا یہ حیران و خفا
جس کو دل سمجھے تھے ہم سو غنچہ تھا تصویر کا

بوئے خوں سے جی رُکا جاتا ہے اے بادِ بہار
ہو گیا ہے چاک دل شاید کسو دلگیر کا

کیونکہ نقاشِ ازل نے نقش ابرو کا کیا
کام ہے اک تیرے منھ پر کھینچنا شمشیر کا

رہ گزر سیلِ حوادث کا ہے بے بنیاد دہر
اس خرابے میں نہ کرنا قصد تم تعمیر کا

بس طبیب اُٹھ جا مری بالیں سے مت دے دردِ سر
کام جاں آخر ہوا اب فائدہ تدبیر کا

نالہ کش ہیں عہدِ پیری میں بھی تیرے در پہ ہم
قد خمیدہ گشتہ ہمارا حلقہ ہے زنجیر کا

جو ترے کوچہ میں آیا۔ پھر وہیں گاڑا اُسے
تشنۂ خوں میں تو ہوں اس خاکِ دامنگیر کا

خوں سے میرے ہوئی یک دم خوشی تم کو تو لیک
مفت میں جاتا رہا جی ایک بے تقصیر کا

لختِ دل سے جوں چھڑی پھولوں کی گوندھی ہے ولے
فائدہ کچھ اے جگر اس آہِ بے تاثیر کا

گورِ مجنوں سے نجا دیں گے کہیں ہم بے لو
عیب ہے ہم میں جو چھوڑیں ڈھیر اپنے پیر کا

کس طرح سے مانیے یارو کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اُڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا

شب دردِ غم سے عرصہ مرے جی پہ تنگ تھا / آیا شبِ فراق تھی یا روزِ جنگ تھا

کثرت میں دردِ غم کے نہ نکلی کوئی طپش / کوچہ جگر کے زخم کا شاید کہ تنگ تھا

لایا مرے مزار پہ اُس کو یہ جذبِ عشق / جس بیوفا کو نام سے بھی میرے ننگ تھا

دیکھا ہو صید گہ میں تری صید کا جگر / باآنکہ چھن رہا تھا یہ ذوقِ خدنگ تھا

دل سے مرے لگا نہ ترا دل ہزار حیف / یہ شیشہ ایک عمر سے مشتاقِ سنگ تھا

مت کر عجب جو میرؔ ترے غم میں مر گیا
جینے کا اس مریض کے کوئی بھی ڈھنگ تھا

دل میں بھرا ز بسکہ خیالِ شراب تھا / مانند آئینہ کے مرے گھر میں آب تھا

موجیں کرے ہے بحرِ جہاں میں ابھی تو تو / جانے گا بعدِ مرگ کہ عالم حباب تھا

اُگتے تھے دستِ بلبل و دامانِ گل بہم / صحنِ چمن، نمونۂ یوم الحساب تھا

ٹک دیکھ آنکھیں کھول کے اُس دم کی حسرتیں / جس دم یہ سوجھے گی کہ یہ عالم بھی خواب تھا

دل جو نہ تھا تو رات زخود رفتگی میں میرؔ
گہ انتظار و گاہ مجھے اضطراب تھا

کیا طرح ہے آشنا کا ہے۔ گہے نا آشنا / یا تو بیگانے ہی رہیے، ہو جیے یا آشنا

پائمالِ صد جفا ناحق نہ ہو اے عندلیب / سبزۂ بیگانہ بھی تھا اِس چمن کا آشنا

کون ہے یہ بحرِ خوبی کی پریشاں زلف ہے / آتی ہے[1] آنکھوں میں میرے موجِ دریا آشنا

بلبلیں پائیز میں کہتی تھیں ہوتا کاشکے / قطعہ / یک مژہ رنگِ فراری اس چمن کا آشنا

کو گل[2] و لالہ کہاں سنبل سمن ہم نسترن / خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا

کیا کروں کس سے کہوں، اتنا ہی بیگانہ ہے یار / قطعہ / سارے عالم میں نہیں پاتے کسی کا آشنا

جس کی میں چاہی وساطت اُن نے یہ مجھ سے کہا / ہم تو کہتے گرمیاں ہم سے وہ ہوتا آشنا

یوں سُنا[3] جا ہے کہ کرتا ہے سفر کا عزم جزم / قطعہ / ساتھ اب بیگانہ وضعوں کے ہمارا آشنا

شعرِ صائب کا مناسب ہے ہماری اور سے / سامنے اُس کے پڑھے گر یہ کوئی جا آشنا

[1] آتی ہے آنکھوں میں میرے موجِ دریا آشنا۔ یعنی میری نظر کو موجِ دریا آشنا معلوم ہوتی ہے۔

[2] مرزا غالب دہلوی ؒ ؎ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں ؛ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں۔

[3] یوں سُنا جا ہے، بجائے یوں سُنا جاتا ہے۔ کے متروک ہے۔

آنا بجانِ ما ہمہ بیم و تا بمنزلِ دیگراں	فرق باشد جانِ ما از آشنا تا آشنا

داغ ہے تاباں[1] علیہ الرحمہ کا چھاتی پہ میرؔ
ہو نجات اُس کو بچارا ہم سے بھی تھا آشنا

گل کو محبوب ہم قیاس کیا
فرق نکلا بہت جو باس[2] کیا

دل نے ہم کو مثالِ آئینہ
ایک عالم کا روشناس کیا

کچھ نہیں سوجھتا ہمیں اُس بن
شوق نے ہم کو بےحواس کیا

عشق میں ہم ہوئے نہ دیوانے
قیس کی آبرو کا پاس کیا

دور سے چرخ کے نکل نہ سکے
ضعف نے ہم کو مورطاس کیا

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں
میرؔ کو تم عبث اُداس کیا

مفت آبروے زاہدِ علامہ لے گیا
اک مُغبچہ اتار کے عمامہ لے گیا

داغِ فراق و حسرتِ وصل آرزوے شوق
میں ساتھ زیرِ خاک بھی ہنگامہ لے گیا

پہنچا نہ پہنچا آہ گیا سو گیا غریب
وہ مرغِ نامہ بر جو مرا نامہ لے گیا

اُس راہزن کے ڈھنگوں سے دیوے خدا پناہ
اک مرتبہ جو میرؔ جی کا جامہ لے گیا

کا جی جامہ

[1] تاباںؔ مرحوم کا نام میر عبدالحیٔ تھا۔ رضوی سید تھے۔ دہلی ان کی زاد بوم تھی۔ ایسے حسین و جمیل تھے کہ لوگ ان کو یوسفِ ثانی کہتے تھے۔ ان کے تلمذِ شاعری میں اختلاف ہے۔ شیخ حاتمؔ نے ان کو اپنا شاگرد بتایا ہے۔ شیفتہؔ نے گلشنِ بیخار میں سوداؔ کا شاگرد بیان کیا ہے۔ خود ان کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ محمد علی حشمتؔ کے شاگرد تھے۔ اوائلِ جوانی سے میخواری کی عادتِ قبیحہ پیدا ہو کر طبیعتِ ثانیہ بن گئی تھی اور اسی نے ان کی تندرستی کو خراب کیا بلکہ اسی میں ان کی جان گئی۔ مگر مرنے سے سات آٹھ روز پہلے شراب سے یک لخت توبہ کرلی اور اپنے دوستوں اور ملاقاتیوں کو رقعہ لکھ لکھ کر ترکِ مینوشی سے خبردار کردیا تھا اور اپنا گواہ بنالیا تھا۔ نہایت خوشگو شاعر تھے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کے مُرید تھے۔ افسوس کہ عالمِ شباب میں انتقال کیا سنہ ۱۲۱۱ھ تک زندہ تھے۔ اب ان کا ایک مختصر دیوان چھپ گیا ہے ۱۲ آسی

[2] باس کیا۔ یعنی سونگھا۔ باس کرنا اب متروک ہے۔

اے لوگو یاں سے عاقبت کار جائے گا
غافل نہ رہ کہ قافلہ اک بار جائے گا

موقوف حشر پر ہی سو آتی بھی وہ نہیں
کب درمیاں سے وعدۂ دیدار جائے گا

چھوٹا جو میں قفس سے تو سب نے مجھے کہا
بیچارہ کیونکہ تا سرِ دیوار جائے گا

دیگی نہ چین لذتِ زخم اُس شکار کو
جو کھا کے تیرے ہاتھ کی تلوار جائے گا

آوے گی[۱] اک بلا ترے سر سُن لے ای صبا
زلفِ سیہ کا اُس کے اگر تار جائے گا

باہر نہ آتا چاہ سے یوسفؑ جو جانتا
لے کارواں مرے تئیں بازار جائے گا

تدبیر میرے عشق کی کیا فائدہ طبیب
اب جان ہی کے ساتھ یہ آزار جائے گا

آئے بن اُس کے حال ہوا جائے ہے تغیر
کیا حال ہوگا پاس سے جب یار جائے گا

کوچہ میں اُس کے رہنے سے باز آ وگرنہ میر
اک دن تجھے وہ جان سے بھی مار جائے گا

کیا کہوں کیسا ستم غفلت سے مجھ پر ہو گیا
قافلہ جاتا رہا میں صبح ہوتے سو گیا

بیکسی مدت تلک برسا کی اپنی گور پر
جو ہماری خاک پر سے ہو کے گزرا رو گیا

کچھ خطرناکی طریقِ عشق میں پنہاں نہیں
کھپ گیا وہ راہرو اس راہ ہو کر جو گیا

مدعا جو ہے سو وہ پایا نہیں جاتا کہیں
ایک عالم جستجو میں جی کو اپنے کھو گیا

میر[۲] ہر یک موج میں ہے زلف ہی کا سا دماغ
جب سے وہ دریا پہ آ کر بال اپنے دھو گیا

مت ہو دشمن ای فلک مجھ پائمالِ راہ کا
خاک اُفتادہ ہوں میں بھی اک فقیر اللہ کا

سیکڑوں طرحیں نکالیں یار کے آنے کی لیک
عذر[۳] ہی جا ہے چلا اُس کے دلِ بدخواہ کا

گر کوئی پیرِ مغاں مجھ کو کرے تو دیکھے پھر
میکدہ سارے کا سارا صرف ہے اللہ کا

کاش تیرے غم رسیدوں کو بُلا دیں حشر میں
ظلم ہے اک خلق پر آشوب اُن کی آہ کا

جو سُنا ہشیار اس میخانہ میں تھا بے خبر
شوق ہی باقی رہا ہم کو دلِ آگاہ کا

باندھ مت رونے کا تار اے ناقباحت فہم چشم
اس سے پایا جائے ہے سر رشتہ جی کی چاہ کا

شیخ مت کر ذکر ہر ساعت قیامت کا کہ ہے
عرصۂ محشر نمونہ اُس کی بازی گاہ کا

۱؎ مومن خاں مومن دہلوی ؎ ہم نکالیں گے سُن ای موج ہوا بل تیرے ؎ اُس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہونگے
۲؎ صفحہ ۱۲ سطر ۱۶ دیکھئے کہ موج دریا کو وہاں بھی زلف سے تشبیہ دی ہے۔ ۳؎ عذر ہی جا ہے چلا یعنی عذر ہی چلا جاتا ہے۔ ۱۲ آسی

شہر میں کس مُنھ سے آوے سامنے تیرے کہ شوخ
چھائیوں سے بھر رہا ہے سارا چہرہ ماہ کا

سر فرو لاتی نہیں ہمت مری ہر اک کے پاس
ہوں گدائے آستاں میں میر حضرت شاہ کا

ایسی گلی اک شہر اسلام نہیں رکھتا
جس کوچے میں وہ بت صد بدنام نہیں رکھتا

آزار نہ دے اپنے کانوں کے تئیں اے گل
آغاز مرے غم کا انجام نہیں رکھتا

ناکامیِ صد حسرت خوش لگتی نہیں ورنہ
اب جی سے گزر جانا کچھ کام نہیں رکھتا

ہو خشک تو بہتر ہے، وہ ہاتھ بہاراں میں
مانند نے نرگس جو جام نہیں رکھتا

بن اُس کے ہم آغوشی بیتاب نہیں اب بھی
مدت سے بغل میں دل آرام نہیں رکھتا

میں داڑھی تری واعظ مسجد ہی میں منڈواتا
پر کیا کروں ساتھ اپنے حجام نہیں رکھتا

وہ مفلس اُن آنکھوں سے کیونکر کے بسر آوے
جو اپنی گرہ میں اک بادام نہیں رکھتا

کیا بات کروں اُس سے مل جائے جو دہ میں تو
اس ناکسی سے روئیے دشنام نہیں رکھتا

یوں تو رہ و رسم اُس کو اس شہر میں سب سے ہے
اک میر ہی سے خط و پیغام نہیں رکھتا

خوبی کا اس کی بسکہ طلبگار ہو گیا
گل باغ میں گلے کا مرے ہار ہو گیا

کس کو نہیں ہی شوق ترا پر نہ اس قدر
میں تو اسی خیال میں بیمار ہو گیا

میں نو دمیدہ بال چمن زاد طیر تھا
پر گھر سے اُٹھ چلا سو گرفتار ہو گیا

ٹھہرا گیا نہ ہو کے حریف اُس کی چشم کا
سینہ کو توڑ تیر نگہ پار ہو گیا

ہی اُس کی حرف زیر لبی کا سبھوں میں ذکر
کیا بات تھی کہ جس کا یہ بستار ہو گیا

تو وہ متاع ہی کہ پڑی جس کی تجھ پہ آنکھ
وہ جی کو بیچ کر بھی خریدار ہو گیا

کیا کہیے آہ عشق میں خوبی نصیب کی
دلدار اپنا تھا سو دل آزار ہو گیا

آٹھوں پہر لگا ہی پھرے ہی تمھارے ساتھ
کچھ ان دنوں میں غیر بہت یار ہو گیا

کب رو ہی اُس سے بات کے کرنے کا مجھ کو میر
ناکردہ جرم میں تو گنہگار ہو گیا

تیر جو اُس کمان سے نکلا
جگرِ مرغ جان سے نکلا

نکلی تھی تیغ بے دریغ اُس کی
میں ہی اک امتحان سے نکلا

گو کٹے سر کہ سوزِ دل جوں شمع
اب تو میری زبان سے نکلا

آگے اے نالہ بے خدا کا ناؤں
بس تو نہ آسمان سے نکلا

چشم و دل سے جو نکلا ہجراں میں
نہ کبھو بحر و کان سے نکلا

مر گیا جو اسیرِ قیدِ حیات
تنگنائے جہان سے نکلا

دل سے مت جا کہ حیف اُس کا وقت
جو کوئی اس مکان سے نکلا

اس کی شیریں لبی کی حسرت میں
شہد پانی ہو شان سے نکلا[3]

نامرادی کی رسم میرؔ[1] سے ہے
طور یہ اس جوان سے نکلا

گرمی سے میں تو آتشِ غم کی پگھل گیا
راتوں کو روتے روتے ہی جوں شمع گل گیا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

گرمیِ عشق مانعِ نشو و نما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

مستی میں چھوڑ دیر کو کعبہ چلا تھا میں
لغزش بڑی ہوئی تھی و لیکن سنبھل گیا

ساقی نشے میں تجھ سے لنڈھا شیشۂ شراب
چل اب کہ دخترِ تاک کا جوبن تو ڈھل گیا

ہر ذرہ خاک تیری گلی کی ہے بیقرار
یاں کون سا ستم زدہ ماٹی میں رل گیا

عریاں تنی کی شوخی سے دیوانگی میں میرؔ
مجنوں کے دشتِ خار کا داماں بھی چل گیا

سنا ہے حال ترے کشتگاں بچاروں کا
ہوا نہ گور گڑھا ان ستم کے ماروں کا

ہزار رنگ کھلے گل چمن کے ہیں شاہد
کہ روزگار کے سر خون ہے ہزاروں کا

ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں
نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کا

عرق فشانی سے اُس زلف کی ہراساں ہوں
بھلا نہیں ہے بہت ٹوٹنا بھی تاروں کا

علاج کرتے ہیں سودائے عشق کا میرے
خلل پذیر ہوا ہے دماغ یاروں کا

تری[2] ہی زلف کو محشر میں ہم دکھا دیں گے
جو کوئی مانگے گا نامہ سیاہ کاروں کا

نگاہِ مست کے مارے ترے خراب ہیں شوخ
نہ ٹھور ہے نہ ٹھکانا ہے ہوشیاروں کا

کریں ہیں دعویٔ خوش چشمی آہوانِ دشت
ٹک ایک دیکھنے چل ملک ان گنواروں کا

۱ میر تقی ۲ جوابِ نامہ سیاہی کا اپنی ہے وہ زلف ۔ کسو نے حشر میں ہم سے اگر سوال کیا ۔ ۳ شہد کا چھتہ

تڑپ کے مرنے سے دل کے کہ مغفرت ہوئے ‏— جہاں میں کچھ تو رہا نام بیقراروں کا

تڑپ کے خرمنِ گل پر کبھی گرا ہے بجلی ‏— جلانا کیا ہے مرے آشیاں کے خاروں کا

تمھیں[1] تو زہد و ورع پر بہت ہی اپنے غرور ‏— خدا ہے شیخ جی ہم بھی گناہگاروں کا

اُٹھے ہے گرد کی جا نالہ گورسے اُس کی
غبار میر بھی عاشق ہے شہسواروں کا

دل سمجھا نہ محبت کو کچھ اُن نے کیا یہ خیال کیا
خوں ہو یہ سب آپھی[2] گیا جو عشقِ حسن و جمال کیا

آنکھیں کفک سے اُس کی لگا کر خاک برابر ہم بھی ہوئے
مہندی کے رنگ اُن پاؤں نے تو بہتوں کو پامال کیا

یوں نکلے ہے فلک ایدھر سے نازکناں جو جانے تو
خاک سے سبزہ میری اُگا کر اُن نے مجھکو نہال کیا

آگے جواب سے اُن لوگوں کے بارے معافی اپنی ہوئی
ہم بھی فقیر ہوئے تھے لیکن ہم نے ترک سوال کیا

حال نہیں ہے عشق سے مجھ میں کس سے میر اب حال کہوں
آپ ہی چاہ کر اُس ظالم کو یہ اپنا میں حال کیا

گزرا بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا ‏— خانہ خراب ہوجیو اس دل کی چاہ کا

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر دیکھتا نہیں ‏— مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا

صد خانماں خراب ہیں ہر ہر قدم پہ دفن ‏— کشتہ ہوں یار میں تو ترے گھر کی راہ کا

اک قطرہ خون ہوکے پلک سے ٹپک پڑا ‏— قصہ یہ کچھ ہوا دل غفراں پناہ کا

تلوار مارنا تو تمھیں کھیل ہے ولے ‏— جاتا رہے نہ جان کسو بیگناہ کا

بدنام و خوار و زار و نزار و شکستہ حال ‏— احوال کچھ نہ پوچھئے اس روسیاہ کا

ظالم[3] زمیں سے لوٹتا دامن اٹھاکے چل ‏— ہوگا کمیں میں ہاتھ کسو دادخواہ کا

[1] مرزا داغ دہلوی سے صبر لے زاہد نا فہم نہ میخواروں کا ۔ بخشنے والا بھی دیکھا ہے گنہگاروں کا
[2] آپھی کے بجائے اب تنہا ’’آپ ہی‘‘ بولتے ہیں۔
[3] تذکرہ میر میں پہلا مصرع اس طرح لکھا ہے۔ ظالم زمیں سے لوٹتا دامن اٹھاکے پھن مگر وہ صحیح نہیں ہے۔

اے تاجِ شہ نہ سر کو فرو لاؤں تیرے پاس
ہے معتقد فقیر نمد کی کلاہ کا

بیمار تو نہ ہووے جیے جب تلک کہ میرؔ
سونے نہ دے گا شور تری آہ آہ کا

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا
جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

ہر قدم پر تھی اُس کی منزل لیک
سر سے سودائے جستجو نہ گیا

سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں
لیکن اے داغ دل سے تو نہ گیا

دل میں کتنے مسودے تھے ولے
ایک پیش اُس کے روبرو نہ گیا

سبحہ گرداں ہی میرؔ ہم تو رہے
دستِ کوتاہ تا سبو نہ گیا

گل و بلبل بہار میں دیکھا
ایک تجھ کو ہزار میں دیکھا

جل گیا دل سفید ہیں آنکھیں
یہ تو کچھ انتظار میں دیکھا

آبلے کا بھی ہونا دامنگیر
تیرے کوچے کے خار میں دیکھا

تیرہ عالم ہوا یہ روزِ سیاہ
اپنے دل کے غبار میں دیکھا

جن بلاؤں کو میرؔ سنتے تھے
اُن کو اس روزگار میں دیکھا

کئی دن سلوک وداع کا مرے درپئے دلِ زار تھا
کبھو درد تھا، کبھو داغ تھا، کبھو زخم تھا، کبھو وار تھا

دمِ صبح بزمِ خوش جہاں، شبِ غم سے کم نہ تھے مہرباں
کہ چراغ تھا سو تو دُود تھا، جو پتنگ تھا سو غبار تھا

دلِ خستہ جو لہو ہو گیا تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک
کبھو سوزِ سینہ سے داغ تھا، کبھو درد و غم سے فگار تھا

دلِ مضطرب سے گزر گئی شبِ وصل اپنی ہی فکر میں
نہ دماغ تھا نہ فراغ تھا، نہ شکیب تھا نہ قرار تھا

جو نگاہ کی بھی پلک اٹھا تو ہمارے دل سے لہو بہا
کہ وہیں وہ ناوکِ بے خطا، کسو کے کلیجے کے پار تھا

لہ مسودہ ایہام بمعنی منصوبہ ہے۔

یہ تمھاری اندنوں دوستاں مژہ جس کے غم میں ہے خونچکاں
وہی آفتِ دلِ عاشقاں کسو وقت ہم سے بھی یار تھا

نہیں تازہ دل کی شکستگی یہی درد تھا یہی خستگی
اُسے جب سے ذوقِ شکار تھا اسے زخم سے سروکار تھا

کبھو جائے گی جو اُدھر صبا۔ تو یہ کہیو اُس سے کہ بے وفا
مگر ایک میر شکستہ پا ترے باغِ تازہ میں خار تھا

مہر کی تجھ سے توقع تھی ستمگر نکلا
موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا

داغ ہوں رشکِ محبت سے کہ اتنا بیتاب
کس کی تسکیں کے لئے گھر سے تو باہر نکلا

جیتے جی آہ ترے کوچے سے کوئی نہ پھرا
جو ستم دیدہ رہا جاکے سو مر کر نکلا

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

اشکِ تر، قطرۂ خوں، لختِ جگر، پارۂ دل
قطعہ ایک سے ایک عدد آنکھ سے بہ کر نکلا

کنج کاوی جو کی سینے کی غمِ ہجراں نے
اس دفینے میں سے اقسامِ جواہر نکلا

(حاشیہ: لہ گنج)

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میر
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

رہے خیال تنک ہم بھی روسیاہوں کا
لگے ہو خون بہت کرنے بیگناہوں کا

نہیں ستارے یہ سوراخ پڑ گئے ہیں تمام
فلک حریف ہوا تھا ہماری آہوں کا

گلی میں اُس کی پھٹے کپڑوں پر مت جا
لباس فقر ہے واں فخر بادشاہوں کا

تمام زلف کے کوچے ہیں مار پیچ اُس کے
تجھی کو آوے دلا چلنا ایسی راہوں کا

اسی جو خوبی سے لائے تجھے قیامت میں
تو حرف کن نے کیا گوش دادخواہوں کا

تمام عمر رہیں خاکِ زیرِ پا اُس کے
جو زور کچھ چلے ہم عجز دستگاہوں کا

کہاں سے تہ کریں پیدا یہ ناظمانِ حال
کہ پوچ بافی ہی ہے کام اُن جلاہوں کا

حساب کا ہے کا روزِ شمار میں مجھ سے
شمار ہی نہیں ہے کچھ مرے گناہوں کا

تری جو آنکھیں ہیں تلوار کے تلے بھی ادھر
فریب خوردہ ہے تو میر کن نگاہوں کا

لہ اسی اندازِ بیان کا ایک شعر مصحفی کا ؎ مصحفی ہم تو سمجھتے تھے کہ ہوگا کوئی زخم ؛ تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا ۱۲۔

اُس کا خرام دیکھ کے جایا نہ جائے گا
اے کبک پھر بحال بھی آیا نہ جائے گا

ہم کشتگانِ عشق ہیں ابرو و چشمِ یار
سر سے ہمارے تیغ کا سایا نہ جائے گا

ہم رہروانِ راہِ فنا ہیں برنگِ عمر
جاویں گے ایسے کھوج بھی پایا نہ جائے گا

پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہیگا دل
تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا

اپنے شہیدِ ناز سے بس ہاتھ اٹھا کہ پھر
دیوانِ حشر میں اُسے لایا نہ جائے گا

اب دیکھ لے کہ سینہ بھی تازہ ہوا ہی چاک
پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جائے گا

ہم بیخودانِ محفلِ تصویر اب گئے
آئندہ ہم سے آپ میں آیا نہ جائے گا

گو بیستوں کو ٹال دے آگے سے کوہکن
سنگِ گرانِ عشق اُٹھایا نہ جائے گا

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

ایسا ترا رہ گزر نہ ہوگا
ہر گام پہ جس میں سر نہ ہوگا

کیا اُن نے نشے میں مجھکو مارا
اتنا بھی تو بے خبر نہ ہوگا

دھوکا ہے تمام بحرِ دُنیا
دیکھے گا کہ ہونٹھ تر نہ ہوگا

آئی جو شکست آئینہ پر
روئے دلِ یار ادھر نہ ہوگا

دشمنوں سے کسی کا اتنا ظالم
ٹکڑے ٹکڑے جگر نہ ہوگا

اب دل کے تئیں دیا تو سمجھا
محنت زدوں کے جگر نہ ہوگا

قطعہ

دُنیا کی نہ کر تو خواستگاری
اس سے کبھو بہرہ ور نہ ہوگا

آ خانہ خرابی اپنی مت کر
قحبہ ہے یہ اس سے گھر نہ ہوگا

ہو اس سے جہاں سیاہ تد بھی
نالے میں مرے اثر نہ ہوگا

پھر نوحہ گری کہاں جہاں میں
ماتم زدہ میرؔ اگر نہ ہوگا

غم اُس کو ساری رات سُنایا تو کیا ہوا
یا روز اُٹھ کے سر کو پھرایا تو کیا ہوا

اُن نے تو مجھ کو جھوٹے بھی پوچھا نہ ایکبار
میں نے اُسے ہزار جتایا تو کیا ہوا

خواہاں نہیں وہ کیوں ہی میں اپنی طرف سے یوں
دل دے کے اُس کے ہاتھ بکایا تو کیا ہوا

اب سعی کر سپہر کہ میرے موئے گئے
اُس کا مزاج مہر پہ آیا تو کیا ہوا

مت رنجہ کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد ⁂ دل[1] ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا
میں صیدِ ناتواں بھی تجھے کیا کرونگا یاد ⁂ ظالم اک اور تیر لگایا تو کیا ہوا
کیا کیا دعائیں مانگی ہیں خلوت میں شیخ یوں ⁂ ظاہر جہاں سے ہاتھ اٹھایا تو کیا ہوا
وہ فکر کر کہ چاک جگر پاوے التیام ⁂ ناصح جو تو نے جامہ سلایا تو کیا ہوا

جیتے تو میرؔ اُن نے مجھے داغ ہی رکھا
پھر گور پر چراغ جلایا تو کیا ہوا

گرچہ سردارِ مزوں کا ہے امیری کا مزا ⁂ چھوڑ لذت کے تئیں لے تو فقیری کا مزا
اے کہ آزاد ہے ٹک چکھ نمک مرغ کباب ⁂ تا تو جانے کہ یہ ہوتا ہے اسیری کا مزا

ہم تو گمراہ جوانی کے مزوں پر ہیں میرؔ
حضرت خضرؑ کو ارزانی ہو پیری کا مزا

دل جو تھا اک آبلہ پھوٹا گیا ⁂ رات کو سینہ بہت کوٹا گیا
طائر رنگ حنا کی سی طرح ⁂ دل نہ اُس کے ہاتھ سے چھوٹا گیا
میں نہ کہتا تھا کہ منہ کر دل کی اور ⁂ اب کہاں وہ آئینہ ٹوٹا گیا
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے ⁂ یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

میرؔ کس کو اب دماغِ گفتگو
عمر گزری ریختہ چھوٹا گیا

یاد ایام کہ یہاں ترکِ شکیبائی تھا ⁂ ہر گلی شہر کی یہاں کوچۂ رسوائی تھا
اتنی گزری جو ترے ہجر میں سو اُسکے سبب ⁂ صبر مرحوم عجب مونس تنہائی تھا
تیرے جلوہ کا مگر رو تھا سحر گلشن میں ⁂ نرگس اک دیدۂ حیران تماشائی تھا

یہی زلفوں کی تری بات تھی یا کاکل کی
میرؔ کو خوب کیا سیر تو سودائی تھا

اے دوست کوئی مجھ سا رسوا نہ ہوا ہوگا ⁂ دشمن کے بھی دشمن پر ایسا نہ ہوا ہوگا
اب اشکِ حنائی سے جو تر نہ کرے مژگاں ⁂ وہ تجھ کفِ رنگیں کا مارا نہ ہوا ہوگا
ٹک گورِ غریباں کی کر سیر کہ دنیا میں ⁂ ان ظلم رسیدوں پر کیا کیا نہ ہوا ہوگا

[1] دل بدست آور کہ حج اکبر است ⁂ از ہزاران کعبہ یک دل بہتر است ۔ کعبہ بنگاہ خلیل آزر است ⁂ دل گزرگاہ جلیل اکبر است۔

ہے قاعدۂ کلی یہ کوئے محبت میں
دل گم جو ہوا ہوگا پیدا نہ ہوا ہوگا

اس کہنہ خرابے میں آبادی نہ کر منعم
اک شہر نہیں یاں جو صحرا نہ ہوا ہوگا

آنکھوں سے تری ہم کو ہے چشم کہ اب ہووے
جو فتنہ کہ دنیا میں برپا نہ ہوا ہوگا

جز مرتبۂ کل کو حاصل کرے ہے آخر
اک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

صد نشتر مژگاں کے لگنے سے نہ نکلا خوں
آگے تجھے میر ایسا سودا نہ ہوا ہوگا

عالم میں کوئی دل کا طلبگار نہ پایا
اس جنس کا یاں ہم نے خریدار نہ پایا

حق ڈھونڈنے کا آپ کو آتا نہیں ورنہ
عالم ہے سبھی یار کہاں یار نہ پایا

غیروں ہی کے ہاتھوں میں رہے دست نگاریں
کب ہم نے ترے ہاتھ سے آزار نہ پایا

جاتی ہے نظر خس پہ گہ چشم پریدن
یاں ہم نے پرکاہ بھی بیکار نہ پایا

تصویر کے مانند لگے در ہی سے گزری
مجلس میں تری ہم نے کبھو بار نہ پایا

سوراخ ہے سینے میں ہر اک شخص کے تجھ سے
کس دل کے ترا تیر نگہ پار نہ پایا

مربوط ہیں تجھ سے بھی یہی ناکس و نااہل
اس باغ میں ہم نے گل بے خار نہ پایا

دم بعد جنوں مجھ میں نہ محسوس تھا یعنی
جامہ میں مرے یاروں نے اک تار نہ پایا

آئینہ بھی حیرت سے محبت کی ہوئے ہم
پر سیر ہو اس شخص کا دیدار نہ پایا

وہ کھینچ کے شمشیر ستم رہ گیا جو میر
خوں ریزی کا یاں کوئی سزاوار نہ پایا

کیا مرے آنے پہ تو اے بت مغرور گیا
کبھی اس راہ سے نکلا تو تجھے گھور گیا

لے گیا صبح کے نزدیک مجھے خواب اے وائے
آنکھ اس وقت کھلی قافلہ جب دور گیا

گور سے نالے نہیں اٹھتے تو نہ آگتی ہے
جی گیا پر نہ ہمارا سر پرشور گیا

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم نے جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور گیا

ناتواں ہم ہیں کہ ہیں خاک گلی کی اس کے
اب تو بے طاقتی سے دل کا بھی مقدور گیا

لے کہیں منھ پہ نقاب اپنے کہ اے غیرت صبح
شمع کے چہرۂ رخشاں سے تو اب نور گیا

نالۂ میر نہیں رات سے سنتے ہم لوگ
کیا ترے کوچہ سے اے شوخ وہ رنجور گیا

خواہ مجھ سے لڑ گیا اب خواہ مجھ سے مل گیا
کیا کہوں اے ہمنشیں میں تجھ سے حاصل دل گیا

اپنے ہی دل کو نہ ہو وا شد تو کیا حاصل نسیم
گو چمن میں غنچۂ پژمردہ تجھ سے کھل گیا

دل سے آنکھوں میں لہو آتا ہے شاید رات کو
کشمکش میں بیقراری کی یہ پھوڑا اچھل گیا

قیس کا کیا کیا گیا اودھر دل و دیں، ہوش و صبر
جس طرف صحراے لیلیٰ کا چلا محمل گیا

رشک کی جا گہ ہے مرگ اُس کشتۂ حسرت کی میر
نعش کے ہمراہ جس کی گور تک قاتل گیا

تا بمقدور انتظار کیا
دل نے اب زور بے قرار کیا

دشمنی ہم سے کی زمانے نے
کہ جفاکار تجھ سا یار کیا

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یہاں وہی ہے جو اعتبار کیا

ایک ناوک نے اُس کی مژگاں کے
طائرِ سدرہ تک شکار کیا

صد رگِ جاں کو تاب دے باہم
تیری زلفوں کا ایک تار کیا

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

سخت کافر تھا جن نے پہلے میر
مذہبِ عشق اختیار کیا

شب تھا نالاں عزیز کوئی تھا
مرغِ خوش خواں عزیز کوئی تھا

تھی تمھارے ستم کی تاب اُس تک
صبر جویاں عزیز کوئی تھا

شب کو اُس کا خیال تھا دل میں
گھر میں مہماں عزیز کوئی تھا

چاہ بیجا نہ تھی زلیخا کی
ماہِ کنعاں عزیز کوئی تھا

اب تو اُس کی گلی میں خوار ہے لیک
میر بیجاں عزیز کوئی تھا

پھوٹا کیے پیالے لنڈھتا پھرا قرابا
مستی میں میری تھا یاں اک شور اور شرابا

حکمت ہی کچھ جو گردوں یکساں پھرا کرے ہے
چلتا نہیں وگرنہ شام و سحر عرابا

باہم ہوا کریں ہیں دن رات نیچے اوپر
یہ نرم شانے لونڈے ہیں مخمل دوخوابا

ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں
نے عشق کو ہے صرفہ نے حسن کو محابا

ہرچند ناتواں ہیں پر آگیا جو جی میں
دیں گے ملا زمیں سے تیرا فلک قلابا

وے[1] دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں ۔ سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبا
منہ دھوتے وقت اُس کے اکثر دکھائی دے ہے ۔ خورشید لے رہا ہے اک روز آفتابا
اب شہر ہر طرف سے میدان ہو گیا ہے ۔ پھیلا تھا اس طرح کا کاہیکو یاں خرابا

دل تفتگی کی اپنی ہجراں میں شرح کیا دوں
چھاتی تو میرؔ میری جل کر ہوئی ہے تابا

دکھ اب فراق کا ہم سے سہا نہیں جاتا ۔ پھر اس پہ ظلم یہ ہے کچھ کہا نہیں جاتا
ہوئی ہے اتنی تری عکسِ زلف کی حیراں ۔ کہ موجِ بحر سے مطلق بہا نہیں جاتا
نہیں گزرتی گھڑی کوئی مجھ خراب پر آہ ۔ کہ جس میں غم سے ترے جی ڈہا نہیں جاتا
ستم کچھ آج گلی میں تری نہیں مجھ پر ۔ کب آ کے خون میں میں یاں نہا نہیں جاتا

خراب مجھ کو کیا اضطرابِ دل نے میرؔ
کہ ٹک بھی اس کنے اُس بن رہا نہیں جاتا

سمجھے تھے میرؔ ہم کہ یہ ناسور کم ہوا ۔ پھر ان دنوں میں دیدۂ خونبار نم ہوا
آئے برنگِ ابرِ عرق ناک تم ادھر ۔ حیران ہوں کہ آج کدھر کو کرم ہوا
تجھ بن شراب پی کے ہوئے سب ترے خراب ۔ ساقی بغیر تیرے انھیں جام سم ہوا
کافر ہمارے دل کی نہ پوچھ اپنے عشق میں ۔ بیت الحرام تھا سو وہ بیت الصنم ہوا
قطعہ
خانہ خراب کس کا کیا تیری چشم نے ۔ تھا کون یوں جسے تو نصیب ایک دم ہوا
تلوار کس کے خون میں سر ڈوب ہے تری ۔ یہ کس اجل رسیدہ کے گھر پر ستم ہوا
قطعہ
آئی نظر جو گور سلیمانؑ کی ایک روز ۔ کوچے پر اُس مزار کے تھا یہ رقم ہوا
کاے سرکشاں جہاں میں کھینچا تھا میں تو سر ۔ پایانِ کار مور کے خاک قدم ہوا

نشر

[1] بقار اللہ بقاؔ اکبرآبادی کا دوآبے کے متعلق یہ شعر ہے ؎ سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں ؛ ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دوآبے میں
بقار کا خیال تھا کہ اسی شعر سے دوآبے کا لفظ لیکر میرؔ نے یہ شعر کہا ہے ؎ وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں ؛ سوکھا الخ
چنانچہ اسی بنا پر انھوں نے یہ قطعہ کہا ؎ میرؔ نے گر ترا مضمون دوآبے کا لیا ؛ اے بقاؔ تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہو ؛ یا خدا میرؔ کی آنکھوں کو دوآبہ کر دے
اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تربینی ہو ؎ میرؔ و سوداؔ سے بقاؔ کی برابر نوک جھونک ہوا کرتی تھی چنانچہ ایک اور موقع پر کہا ہے ؎ پگڑی اپنی سنبھالئے گا میرؔ ؛ اور بستی نہیں یہ دلّی ہے ۔
ایک اور موقع پر کہا ہے ؎ میرؔ و مرزا کی شعر خوانی نے ؛ بسکہ عالم میں دھوم ڈالی تھی ؛ کھول دیوان دونوں صاحب کے ؛ اے بقاؔ ہم نے جب زیارت کی ؛
کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن ؛ ایک تو تو کہے ہے اک ہی ہی ۔ مستفاد از گل رعنا

قطعہ

افسوس کی بھی چشم تھی اُن سے خلافِ عقل
بارِ علاقہ سے تو عبث پشت خم ہوا

اہلِ جہاں ہیں سارے ترے جیتے جی تلک
پوچھیں گے بھی نہ بات جہاں تو عدم ہوا

کیا کیا عزیز دوست ملے میر خاک میں
نادان یہاں کسو کا کسو کو بھی غم ہوا

دل و دماغ ہی اب کس کو زندگانی کا
جو کوئی دم ہے تو افسوس ہے جوانی کا

اگرچہ عمر کے دس دن یہ لب رہے خاموش
سخن رہیگا سدا میری کم زبانی کا

سبک ہو آوے جو مندیل رکھ نماز کو شیخ
رہا ہے کون سا اب وقت سرگرانی کا

ہزار جان سے قربان بے پری کے ہیں
خیال بھی کبھو گزرا نہ پرفشانی کا

پھرے ہی کھینچے ہی تلوار مجھ پہ ہر دم تو
کہ صید ہوں میں تری دشمنی جانی کا

نمود کرکے وہیں بحرِ غم میں بیٹھ گیا
کہے تو میر بھی اک بلبلا تھا پانی کا

باز

موا میں سجدہ میں پر نقش میرا بار رہا
اُس آستاں پہ مری خاک سے غبار رہا

جنوں میں ابکی مجھے اپنے دل کا غم ہے حیف
بھرلی جبکہ نہ جامے میں ایک تار رہا

بشر ہی وہ پہ کھلا جب سے اُس کا دامِ زلف
سرِرہ اُس کی فرشتے ہی کا شکار رہا

کبھو نہ آنکھوں میں آیا وہ شوخ خواب کی طرح
تمام عمر ہمیں اُس کا انتظار رہا

شرابِ عیش میسر ہوئی جسے اک شب
پھر اُس کو روزِ قیامت تلک خمار رہا

قطعہ

بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا
وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا

وہ دل کہ شام و سحر جیسے پکا پھوڑا تھا
وہ دل کہ جس سے ہمیشہ جگر فگار رہا

تمام عمر گئی اُس پہ ہاتھ رکھتے ہمیں
وہ دردناک علی الرغم بیقرار رہا

ستم میں غم میں سرانجام اُس کا کیا کہیے
ہزاروں حسرتیں تھیں تسپہ جی کو مار رہا

بہا تو خون ہو آنکھوں کی راہ بہ نکلا
رہا جو سینۂ سوزاں میں داغدار رہا

سو اُس کو ہم سے فراموش کاریوں لیگئے[1]
کہ اُس سے قطرۂ خوں بھی نہ یادگار رہا

گلی میں اُس کی گیا سو گیا نہ بولا پھر
میں میر میر کر اُس کو بہت پکار رہا

[1] لے گئے کا استعمال بروزن فعلن اب متروک ہی۔

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا
اُس کی دیوار کا سر سے مرے سایا نہ گیا

کاو کاو مژۂ یار و دلِ زار و نزار
گتھ گئے ایسے شتابی کہ چھڑایا نہ گیا

وہ تو کل دیر تلک دیکھتا ایدھر کو رہا
ہم سے ہی حالِ تباہ اپنا دکھایا نہ گیا

گرم رو راہِ فنا کا نہیں ہو سکتا پتنگ
اس سے تو شمع نمط سر بھی کٹایا نہ گیا

پاسِ ناموسِ محبت تھا کہ فرہاد کے پاس
بیستوں سامنے سے اپنے اٹھایا نہ گیا

خاک تک کوچۂ دلدار کی چھانی ہم نے
جستجو کی پہ دلِ گم شدہ پایا نہ گیا

آتشِ تیز جدائی میں یکایک اس بن
دل جلا یوں کہ تنک جی بھی جلایا نہ گیا

مہ نے آ سامنے شب یاد دلایا تھا اُسے
پھر وہ تا صبح مرے جی سے بھلایا نہ گیا

زیرِ شمشیرِ ستم میر تڑپنا کیسا!
سر بھی تسلیمِ محبت میں ہلایا نہ گیا

جی میں آتا ہے کہ کچھ اور بھی موزوں کیجے
دردِ دل ایک غزل میں تو سنایا نہ گیا

دل کے تئیں آتشِ ہجراں سے بچایا نہ گیا
گھر جلا سامنے پر ہم سے بجھایا نہ گیا

دل میں رہ دل میں کہ معمارِ قضا سے اب تک
ایسا مطبوع مکاں کوئی بنایا نہ گیا

کبھو عاشق کے ترے جبہے سے ناخن کا خراش
خطِ تقدیر کے مانند مٹایا نہ گیا

کیا تنک حوصلہ تھی دیدۂ دل اپنی آہ
ایک دم رازِ محبت کا چھپایا نہ گیا

دل جو دیدار کا قاتل کے بہت بھوکا تھا
اُس ستم کشتہ سے اک زخم بھی کھایا نہ گیا

میں تو تھا صیدِ زبوں صیدگہِ عشق کے بیچ
آپ کو خاک میں بھی خوب ملایا نہ گیا

شہرِ دل آہ عجب جائے تھی پر اس کے گئے
ایسا اُجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا

آج رہتی نہیں خامے کی زباں رکیے معاف
حرف کا طول بھی جو مجھ سے گھٹایا نہ گیا

گُل میں اُس کی سی جو بو آئی تو آیا نہ گیا
ہم کو بن دوشِ ہوا باغ سے لایا نہ گیا

آہ جو نکلی مرے منھ سے تو افلاک کے پاس
اُس کے آشوب کے عہدے سے بر آیا نہ گیا

گُل نے ہر چند کہا باغ میں رہ پر اُس بن
جی جو اچٹا تو کسو طرح لگایا نہ گیا

سر نشینِ رہِ میخانہ ہوں میں کیا جانوں
رسم مسجد کے تئیں شیخ کہ آیا نہ گیا

حیف ہے جنگی وہ اس وقت میں پہنچا جس وقت
اُن کنے حال اشاروں سے بتایا نہ گیا

خطرِ راہِ محبت کہیں جوں حرف مٹے
جس سے اُس طرف کو قاصد بھی چلایا[1] نہ گیا

خوفِ آشوب سے غوغائے قیامت کیلئے
خون خوابیدۂ عشاق جگایا نہ گیا

میر مت عذر گریباں کے پھٹے رہنے کا کر
زخمِ دل چاکِ جگر تھا کہ سلایا نہ گیا

ادھر آکر شکار افگن ہمارا
مشبک کر گیا ہے تن ہمارا

گریباں سے رہا کوتہ تو پھر ہے
ہمارے ہاتھ میں دامن ہمارا

گئے جوں شمع اُس مجلس میں جلنے
سبھوں پر حال ہے روشن ہمارا

بلا جس چشم کو کہتے ہیں مردم
وہ ہے عینِ بلا مسکن ہمارا

ہوا رونے سے رازِ دوستی فاش
ہمارا گریہ تھا دشمن ہمارا

بہت چاہا تھا ابرِ تر لے لیکن
نہ منت کش ہوا گلشن ہمارا

چمن میں ہم بھی زنجیری رہے ہیں
سنا ہوگا کبھو شیون ہمارا

کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

نہ بہکے میکدے میں میر کیونکر
گرو سو جا ہے پیراہن ہمارا

گلیوں میں اب تلک تو مذکور ہے ہمارا
افسانۂ محبت مشہور ہے ہمارا

مقصود کو تو دیکھیں کب تک پہنچتے ہیں ہم
بالفعل اب ارادہ تا گور ہے ہمارا

کیا آرزو تھی جس سے سب چشم ہو گئے ہیں
ہر زخم سو جگہ سے ناسور ہے ہمارا

ہیں آہ عشق بازی چوپڑ عجب بچھائی
کچی پڑیں ہیں نردیں گھر دور ہے ہمارا

تا چند پشتِ پا پر شرم و حیا سے انکھیں
احوال کچھ بھی تم کو منظور ہے ہمارا

بے طاقتی کریں تو تم بھی معاف رکھیو
کیا کیجیے کہ دل بھی مجبور ہے ہمارا

ہیں مشتِ خاک لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

---

[1] 'چلایا نہ گیا' بجائے 'بھیجا نہ گیا'۔ فی زمانہ متروک ہے۔

سحر گہ عید میں دورِ سبو تھا
پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا
نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا

چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ
کہ ہر غنچہ دلِ پُر آرزو تھا

گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا
جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا

کروگے یاد باتیں تو کہوگے
کہ کوئی رفتۂ بسیار گو تھا

جہاں پُر ہے فسانے سے ہمارے
دماغِ عشق ہم کو بھی کبھو تھا

مگر دیوانہ تھا گل بھی کسو کا
کہ پیراہن میں سو جاگہ رفو تھا

کہیں کیا بال تیرے کھل گئے تھے
کہ جھونکا باؤ کا کچھ مشک بو تھا

نہ دیکھا میرؔ آوارہ کو لیکن
غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

راہِ دورِ عشق سے روتا ہے کیا[1]
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

قافلے میں صبح کے اک شور ہے
یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں
تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا

یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں
داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز
میرؔ اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

رونا تنک اک تھنبھا تو غمِ بیکراں سہا
دس دن رہے جہان میں ہم سو دہا دہا

پہلو میں اک گرہ سی تہِ خاک ساتھ ہے
شاید کہ مر گئے پہ بھی خاطر میں کچھ رہا

آنکھوں نے رازداری محبت کی خوب کی
آنسو جو آتے آتے رہے تو لہو بہا

آئے تھے اک امید پہ تیری گلی میں ہم
سو آہ اس طرح چلے لوہو میں ہم نہا

کس کس طرح سے میرؔ نے کاٹا ہے عمر کو
اب آخر آخر آن کے یہ ریختہ کہا

یکسانہ جی گرفتاری سے شیون میں رہا
ایک دل غمخوار رکھتے تھے سو گلشن میں رہا

پنجۂ گل کی طرح دیوانگی میں ہاتھ کو
گر نکالا میں گریباں سے تو دامن میں رہا

[1] یہ شعر اس طرح بھی مشہور ہے ؎ ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا الخ مگر صحیح اسی طرح ہے جیسا کہ نقل ہوا۔

شمع ساں جلتے رہے لیکن نہ توڑا یار سے
رشتۂ الفت تمامی عمر گردن میں رہا

ڈر سے اُس شمشیر زن کے جوہرِ آئینہ ساں
سر سے لیکر پاؤں تک میں غرقِ آہن میں رہا

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

در پئے دل ہی رہے اس چہرہ کے خالِ سیاہ
ڈر ہمیں ان چوٹوں کا روزِ روشن میں رہا

آہ کس انداز سے گزرا بیاباں سے کہ میر
جی ہر اک نخچیر کا اُس صید افگن میں رہا

غمزے نے اُس کے چوری میں دل کی ہنر کیا
اُس خانماں خراب نے آنکھوں میں گھر کیا

رنگ اُڑ چلا چمن میں گلوں کا تو کیا نسیم
ہم کو تو روزگار نے بے بال و پر کیا

نافع جو تھیں مزاج کو اوّل سو عشق میں
آخر اُنھیں دواؤں نے ہم کو ضرر کیا

کیا جانوں بزمِ عیش کہ ساقی کی چشم دیکھ
میں صحبتِ شراب سے آگے سفر کیا

جس دم کہ تیغِ عشق کھنچی بوالہوس کہاں
سُن لیجیو کہ ہم ہی نے سینہ سپر کیا

دل زخمی ہو کے تجھ تئیں پہنچا تو کم نہیں
اس نیم کشتہ نے بھی قیامت جگر کیا

ہے کون آپ میں جو ملے تجھ سے مستِ ناز
ذوقِ خبر ہی نے تو ہمیں بے خبر کیا

وہ دشتِ خوفناک رہا ہے مرا وطن
سُن کر جسے خضر نے سفر سے حذر کیا

کچھ کم نہیں ہیں شعبدہ بازوں سے میگسار
دارو پلا کے شیخ کو آدم سے خر کیا

ہیں چاروں طرف خیمے کھڑے گردباد کے
کیا جانیے جنوں نے ارادہ کدھر کیا

لکنت تری زبان کی ہے سحر جس سے شوخ
اک حرفِ نیم گفتہ نے دل پر اثر کیا

بے شرم محض ہے وہ گنہگار جن نے میر
ابرِ کرم کے سامنے دامان تر کیا

تا کسی سے پاس میرے یار کا آنا گیا
بس گیا میں جان سے اب اُس سے یہ جانا گیا

کچھ نہ دیکھا پھر بجز اک شعلۂ پُر پیچ و تاب
شمع تک ہم نے تو دیکھا تھا کہ پروانا گیا

ایک ہی چشمک تھی فرصتِ صحبتِ احباب کی
دیدۂ تر ساتھ لے مجلس سے پیمانا گیا

گل کھلے صد رنگ تو کیا بے پری سے ای نسیم
مدتیں گزریں کہ وہ گلزار کا جانا گیا

دور تجھ سے میر نے ایسا تعب کھینچا کہ شوخ
کل جو میں دیکھا اُسے مطلق نہ پہچانا گیا

ہاتھ سے تیرے اگر میں ناتواں مارا گیا
سب کہیں گے یہ کہ کیا اک نیم جاں مارا گیا

یک نگہ سے بیش کچھ نقصاں آیا اُسکے تئیں
اور میں بیچارہ تو اے مہرباں مارا گیا

وصل و ہجراں سی جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

دل نے سر کھینچا دیارِ عشق میں ای بوالہوس
وہ سراپا آرزو آخر جواں مارا گیا

کب نیازِ عشق نازِ حسن سے کھینچے ہی ہاتھ
آخر آخر میرؔ سر بر آستاں مارا گیا

محبت کا جب زور بازار ہوگا
بکیں گے سر اور کم خریدار ہوگا

نہ خالی رہے گی مری جاگہ گر میں
نہوں گا تو اندوہ بسیار ہوگا

یہ منصور کا خون ناحق کہ حق تھا
قیامت کو کس کس سے خوں دار ہوگا

عجب شیخ جی کی ہے شکل و شمائل
ملے گا تو صورت سے بیزار ہوگا

کھنچے عہدِ خط میں بھی دل تیری جانب
کبھو تو قیامت طرحدار ہوگا

زمیں گیر ہو عجز سے تو کہ اک دن
یہ دیوار کا سایہ دیوار ہوگا

نہ پوچھ اپنی مجلس میں ہے میرؔ بھی یاں
جو ہوگا تو جیسے گنہگار ہوگا

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے جب نہیں آتا

ہوش جاتا نہیں رہا لیکن
جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا

صبر تھا ایک مونسِ ہجراں
سو وہ مدت سے اب نہیں آتا

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

عشق کو حوصلہ ہے شرط ارنہ — قطعہ
بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا

جی میں کیا کیا ہے اپنے ای ہمدم
پر سخن تا بلب نہیں آتا

دور بیٹھا غبارِ میرؔ اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

کب تک تو امتحاں میں مجھ سے جدا رہے گا
جیتا ہوں تو تجھی میں یہ دل لگا رہے گا

یاں ہجر اور ہم میں بگڑی ہے کب کی صحبت
زخمِ دل و نمک میں کب تک مزا رہے گا

تو برسوں میں ملے ہے یاں فکر یہ رہے ہے
جی جائے گا ہمارا اک دم کو یا رہے گا

غافل نہ رہیو ہرگز نادان داغِ دل سے
بھڑکے گا جب یہ شعلہ تب گھر جلا رہے گا

مرنے پر اپنے مت جا سالک طلب میں اُس کی
گو سر کو کھو رہیگا پر اُس کو پا رہے گا

عمرِ عزیز ساری دل ہی کے غم میں گزری
بیمارِ عاشقی یہ کس دن بھلا رہے گا

دیدار کا تو وعدہ محشر میں دیکھ کر کے
بیمارِ غم میں تیرے تب تک تو کیا رہے گا

گیا ہے جو اٹھ گیا ہے پر بستۂ وفا ہے
قیدِ حیات میں ہے تو میر آ رہے گا

جو یہ دل ہے تو کیا سر انجام ہوگا
تہِ خاک بھی خاک آرام ہوگا

مرا جی تو آنکھوں میں آیا یہ سنتے
کہ دیدار بھی ایک دن عام ہوگا

نہ ہوگا وہ دیکھا جسے کبک تو نے
وہ اک باغ کا سرو اندام ہوگا

نہ نکلا کر اتنا بھی بے پردہ گھر سے
بہت اس میں ظالم تو بدنام ہوگا

ہزاروں کی یہاں لگ گئیں چھت سے آنکھیں
تو اے ماہ کس شب لبِ بام ہوگا

جگر چاکی ناکامیٔ دنیا ہے آخر
نہیں آئے جو میر کچھ کام ہوگا

خواب میں تو نظر جمال پڑا
پر مرے جی ہی کے خیال پڑا

وہ نہانے لگا تو سایۂ زلف
بحر میں تو کہے کہ جال پڑا

میں نے تو سر دیا پر اے جلاد
کس کی گردن پہ یہ وبال پڑا

شیخ قلاش ہو جوے میں نہ لاؤ
یہاں ہمارا بھی ہے مال پڑا

خوبرو اب نہیں ہیں گندم گوں
میر ہندوستاں میں کال پڑا

سلہ[1]

نہ پوچھ خواب زلیخا نے کیا خیال لیا
کہ کاروان کا کنعاں کے جی نکال لیا

رہِ طلب میں گرے ہوتے سر کے بھل ہم بھی
شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا

رہوں ہوں برسوں سے ہمدوش پر کبھو ان نے
گلے میں ہاتھ مرا پیار سے نہ ڈال لیا

بتاں کی میر ستم وہ نگاہ ہے جس نے
خدا کے واسطے بھی خلق کا وبال لیا

سلہ[1] ایک قلمی نسخہ مرقومہ ۱۲۲۳ھ محفوظ ندوۃ العلما لائبریری میں یہ غزل نہیں پائی جاتی۔ آسی

نقاش دیکھ تو میں کیا نقش یار کھینچا
اُس شوخ کم نما کا نت انتظار کھینچا

رسم قلم و عشق مت پوچھ کچھ کہ ناحق
ایکوں کی کھال کھینچی ایکوں کو دار کھینچا

تھا بد شراب ساقی کتنا کہ رات مرے
میں نے جو ہاتھ کھینچا اُن نے کٹار کھینچا

مستی میں شکل ساری نقاش سے کھنچی پر
آنکھوں کو دیکھ اُس کی آخر خمار کھینچا

جی کھنچ رہے ہیں ادھر عالم کا ہوگا بلوا
گر شانے تو نے اُس کی زلفوں کا تار کھینچا

تھے شب کسے کسائے تیغ کشیدہ کف میں
پر میں نے بھی بغل میں بے اختیار کھینچا

پھرتا ہے میر تو جو پھاڑے ہوئے گریباں
کس کس ستم زدے نے دامانِ یار کھینچا

یہ حسرت ہے مروں اس میں لیے لبریز پیمانا
مہکتا ہو نپٹ جو پھول سی دارو سے میخانا

نہ وے زنجیر کے غل ہیں نہ دے جرگے غزالوں کے
مرے دیوان پن تک ہی رہا معمور ویرانا

مرا سر نزع میں زانو پہ رکھ کر یوں لگا کہنے
کہ اے بیمار میرے تجھ پہ جلد آساں ہو مر جانا

نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنی
گیا ہو میر دیوانہ رہا سودا[1] سو مستانا

بارہا گور دل جھنکا لایا
اب کے شرطِ وفا بجا لایا

قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل
سارے عالم میں میں دکھا لایا

دل کہ اک قطرہ خوں نہیں ہے بیش
ایک عالم کے سر بلا لایا

[1] سودا۔ یعنی مرزا رفیع المتخلص بہ 'سودا' جو میر صاحب کے مشہور معاصر۔ شاہ حاتم کے شاگرد۔ اور دلی کے قدیم باشندے تھے، ایک ضخیم کلیات جس میں سب قسم کا کلام موجود ہے اور جو اب مطبع ہذا میں نہایت اہتمام سے بترتیب جدید چھاپا گیا ہے، اُن سے یادگار ہے۔ میر صاحب اُن کو بڑا زبردست شاعر مانتے ہیں چنانچہ نکات الشعراء میں ان کے متعلق یہ رائے لکھی ہے

"جوانیست خوش خلق و خوش خوئے گرم جوش، یار باش شگفتہ رو، مولد او شاہجہان آباد است، نوکر پیشہ و غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید۔ سر آمد شعرائے ہندی اوست۔ بسیار خوش گو است۔ ہر شعرش دامن لطف رستہ رستہ۔ در چمن بندی الفاظش گل معنی دستہ دستہ۔ ہر مصرع برجستہ اش از سرو آزادہ دیدہ۔ پیش فکر عالیش طبع عالی ترمندہ شاعر ریختہ چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ او را شاید۔"

مرزا سودا دہلی کی طوائف الملوکی کے زمانہ میں لکھنؤ چلے آئے اور یہاں کے حکمرانوں کے درباری شعرا میں منسلک ہے اور پھر عمر بھر لکھنؤ سے نہ نکلے چنانچہ ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱ء میں یہیں انتقال کیا اور یہیں مدفون ہوئے۔

سب پہ جس بار[۱] نے گرانی کی / اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا
دل مجھے اُس گلی میں لیجاکر / اور بھی خاک میں ملا لایا
ابتدا ہی میں مر گئے سب یار / عشق کی کون انتہا لایا
اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میر / پھر ملیں گے اگر خدا لایا

کیا عجب پل میں اگر ترک ہو اُس سے جاں کا / ہو جو زخمی کسو برہم زدنِ مژگاں کا
اُٹھتے پلکوں کے گرے پڑتے ہیں لاکھوں آنسو / طرح ڈالا ہے مری آنکھوں نے اب طوفاں کا
جلوۂ ماہ تہِ ابرِ تُنک بھول گیا / اُن نے سوتے میں دوپٹے سے جو منہ کو ڈھانکا
منہ لگاتا ہے ٹپکنے جو پلک ماروں ہوں / اب تو یہ رنگ ہے اس دیدۂ اشک افشاں کا
ساکنِ کو کو ترے کب ہے تماشے کا دماغ / آئے فردوس بھی چلکر نہ ادھر کو جھانکا
اُٹھ گیا ایک تو اک مرنے کو آ بیٹھے ہے / قاعدہ ہے یہی مدت سے ہمارے ہاں کا
کارِ اسلام ہے مشکل ترے خال و خط سے / راہزنِ دیں ہے کوئی دزد کوئی ایماں کا
چارۂ عشق بجز مرگ نہیں کچھ اے میر / اس مرض میں ہے عبث فکر تمھیں درماں کا

ہر دم طرف ہے ویسے مزاجِ کرخت کا / ٹکڑا مرا جگر ہے کہو سنگِ سخت کا
سبزانِ تازہ رو کی جہاں جلوہ گاہ تھی / اب دیکھیے تو واں نہیں سایہ درخت کا
جوں برگ ہائے لالہ پریشان ہو گیا / مذکور کیا ہے اب جگرِ لخت لخت کا
دلی میں[۲] آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں / تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا
خاک سیہ سے میں جو برابر ہوا ہوں میر / سایہ پڑا ہے مجھ پہ کسو تیرہ بخت کا

[۳] ہم عشق میں نہ جانا غم ہی سدا رہیگا / دس دن جو ہے یہ مہلت سو یہاں دہا رہیگا
برقع اُٹھے پہ اُس کے ہوگا جہان روشن / خورشید کا نکلنا کیونکر چھپا رہیگا

۱ حافظ ـــ آسماں بارِ امانت نتوانست کشید ؎ قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند۔
۲ دلی کی طوائف الملوکی کی طرف اشارہ کیا ہے۔
۳ میر صاحب کا وہ شعر بھی د ہر کر مضمون کا خوب ہے جو صفحہ ۲۹ سطر ۱۷ پر درج ہے۔

اک وہم سی رہی ہے اپنی نمود تن میں / آتے ہوا بتو آؤ پھر ہم میں کیا رہیگا

مذکورِ یار ہم سے مت ہمنشیں کیا کر / دل جو بچا نہیں ہے پھر اس میں جا رہیگا

[۱] دل ہی کے غم میں گزری اپنی تو عمر ساری / بیمارِ عاشقی یہ کس دن بھلا رہیگا

اُس گل بغیر جیسے ابرِ بہار عاشق / نالاں جدا رہیگا، روتا جدا رہیگا

دانستہ ہے تغافل غم کہنا اس سے حاصل / تم دردِ دل کہوگے وہ سر جھکا رہیگا

اب جھمکی اُس کی تم نے دیکھی کبھو جو یارو / برسوں تلک اسی میں پھر دل سدا رہیگا

کس کس کو میر نے کہہ کر دیا ہے بوسہ / وہ ایک ہی مفتن یوں ہی چما رہیگا

بھلا ہوگا کچھ اک احوال اس سے یا بُرا ہوگا / مآل اپنا ترے غم میں خدا جانے کہ کیا ہوگا

تفحص فائدہ ناصح تدارک تجھ سے کیا ہوگا / وہی پاوے گا میرا دردِ دل جس کا لگا ہوگا

کسو کو شوق یارب بیش اس سے اور کیا ہوگا / قلم ہاتھ آگئی ہوگی تو سو سو خط لکھا ہوگا

دُکانیں حسن کی آگے ترے تختہ ہوئی ہوں گی / جو تو بازار میں ہوگا تو یوسف کب بکا ہوگا

معیشت ہم فقیروں کی سی اخوانِ زماں سے کر / کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہوگا

خیال اس بیوفا کا ہمنشیں اتنا نہیں اچھا / گماں رکھتے تھے ہم بھی یہ کہ ہم سے آشنا ہوگا

قیامت کرکے اب تعبیر جس کو کرتی ہے خلقت / وہ اُس کوچہ میں اک آشوب سا شاید ہوا ہوگا

عجب کیا ہے ہلاکِ عشق ہیں فرہاد و مجنوں کے / محبت روگ ہے کوئی کہ کم اُس سے جیا ہوگا

نہ ہو کیوں غیرتِ گلزار وہ کوچہ خدا جانے / لہو اُس خاک پر کن کن عزیزوں کا گرا ہوگا

بہت ہمسائے اس گلشن کے زنجیری رہا ہوں میں / کبھو تم نے بھی میرا شور نالوں کا سنا ہوگا

نہیں جز عرش جاگہ راہ میں لینے کو دم اس کے / قفس سے تن کے مرغِ روح میر جب رہا ہوگا

کہیں ہیں میر کو مارا گیا شب اُس کے کوچے میں / کہیں وحشت میں شاید بیٹھے بیٹھے اُٹھ گیا ہوگا

یہاں نام یار کس کا وردِ زباں نہ پایا / پر مطلقاً کہیں ہم اُس کا نشاں نہ پایا

وضعِ کشیدہ اُس کی رکھتی ہے داغ سب کو / نیوتا کسو سے ہم وہ ابرو کماں نہ پایا

پایا نہ یوں کہ کریے اُس کی طرف اشارت / یوں تو جہاں میں ہم نے اُسکو کہاں نہ پایا

یہ دل کہ خون ہووے بر جا نہ تھا وگرنہ / وہ کونسی جگہ تھی اُس کو جہاں نہ پایا

[۱] میرسہ عمر عزیز ساری دل ہی کے غم میں گذری + بیمار عاشقی یہ کس دن بھلا رہیگا۔

فتنے کی گرچہ باعث آفاق میں وہی تھی / لیکن کمر کو اُس کی ہم درمیاں نہ پایا
محروم سجدہ آخر جانا پڑا جہاں سے / جوشِ جباہ سے ہم وہ آستاں نہ پایا

ایسی ہی میر کی بھی مدت سے رونی صورت
چہرے پہ اُس کے کس دن آنسو رواں نہ پایا

پھر شب نہ لطف تھا نہ وہ مجلس میں نور تھا / اس روئے دل فروز ہی کا سب میں ظہور تھا (دلفریب)
کیا کیا عزیز خلع بدن ہائے کر گئے / تشریف تم کو یہاں تئیں لانا ضرور تھا
کیونکر تو میری آنکھ سے ہو دل تلک گیا / یہ بحر موج خیز تو عسر العبور تھا
شاید نشے میں اُس سے یہ سفاکیاں ہوئیں / زخمی جو اُس کے ہاتھ کا نکلا سو چور تھا

جیتے جی پاس ہو کے نہ نکلا کسو کے میر
وہ دور گرد بادیۂ عشق دُور تھا

ہے حال جائے گریہ جانِ پُر آرزو کا / روئے نہ ہم کبھو ٹک دامن پکڑ کسو کا
جاتی نہیں اُٹھائی اپنے پہ یہ خشونت / اب رہ گیا ہے آنا میرا کبھو کبھو کا
اس آستاں سے کس دن پُرشور سر نہ پٹکا / اُس کی گلی میں جا کر کس رات ہیں کوکا
شاید کہ مند گئی ہے قمری کی چشم گریاں / کچھ ٹوٹ سا چلا ہے پانی چمن کے جو کا
اپنے تڑپنے کی تو تدبیر پہلے کر لوں / تب فکر میں کروں گا زخموں کے بھی رفو کا
دانتوں کی نظم اُس کی ہنسنے میں جن نے دیکھی / پھر موتیوں کی لڑ پر اُن نے کبھو نہ تھوکا
یہ عیش گہ نہیں ہے یہاں رنگ اور کچھ ہے / ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا
بلبل غزل سرائی آگے ہمارے مت کر / سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا
گلیاں بھری پڑی ہیں اے یار زخمیوں سے / مت کھول پیچ ظالم اُس زلف مشکبو کا

وے پہلی التفاتیں ساری فریب نکلیں
دینا نہ تھا دل اس کو میں میر آہ چوکا

میں بھی دنیا میں ہوں اک نالہ پریشاں یکجا / دل کے سو ٹکڑے مرے پر سبھی نالاں یکجا
پند گویوں نے بہت سینے کی تدبیریں کیں / آہ ثابت بھی نہ نکلا یہ گریباں یکجا
تیرا کوچہ ہے ستمگار وہ کافر جاگہ / کہ جہاں مارے گئے کتنے مسلماں یکجا
سر کے باندھا ہے کفن عشق میں تیرے یعنی / جمع ہم نے بھی کیا ہے سر و ساماں یکجا

کیونکہ بڑھتے ہیں ترے پاؤں نسیم سحری — اُس کے کوچے میں ہی صد گنجِ شہیداں یکجا
تو بھی رونے کو بلا دل ہی ہمارا بھی بھرا — ہو جو اے ابر بیاباں میں گریباں یکجا

بیٹھ کر میرؔ جہاں خوب نہ رویا ہووے
ایسی کوچہ میں نہیں ہے تیرے جاناں یکجا

فلک[1] کا منہ نہیں اس فتنہ کے اٹھانے کا — ستم شریک ترا یار ہے زمانے کا
ہمارے ضعف کی حالت سے دل قوی رکھیو — کہیں خیال نہیں یاں بحال آنے کا
تری ہی راہ میں مارے گئے سبھی آخر — سفر تو ہم کو ہی در پیش جی سے جانے کا
بسانِ شمع جو مجلس سے ہم گئے تو گئے — سُراغ کیجو نہ پھر تو نشان پانے کا
چمن میں دیکھ نہیں سکتے ٹک کہ چھپتا ہے — جگر میں برق کے کانٹا تجھ[2] آشیانے کا
ٹک آ تو تا سرِ بالیں نہ کر تعلل کیا — تجھے بھی شوخ یہی وقت ہے بہانے کا
سراہا[3] اُن نے ترا ہاتھ جن نے دیکھا زخم — شہید ہوں میں تری تیغ کے لگانے کا

شریعت مگر رہا ہی تمام عمر اے شیخ
یہ میرؔ اب جو گدا ہے شراب خانے کا

کل شبِ ہجراں تھی لب پر نالہ بیمارانہ تھا — شام سے تا صبحدم بالیں پہ سر یکجا نہ تھا
شہرۂ عالم اسی یمنِ محبت نے کیا — ورنہ مجنوں ایک خاک افتادۂ ویرانہ تھا
منزل اس مہ کی رہا جو مدتوں اے ہمنشیں — اب وہ دل گویا کہ اک مدت کا ماتم خانہ تھا
اک نگاہِ آشنا کو بھی وفا کرتا نہیں — وا ہوئیں مژگاں کہ سبزہ سبزۂ بیگانہ تھا
روز و شب گزرے ہی پیچ و تاب میں رہتے تجھے — اے دلِ صد چاک کس کی زلف کا تو شانہ تھا
یاد ایام ہے کہ اپنی روز و شب کی جائے باش — یا درِ باز بیاباں یا درِ میخانہ تھا
جس کو دیکھا ہم نے اس وحشت کدہ میں دہر کے — یا سڑی یا خبطی یا مجنون یا دیوانہ تھا
بعد خوں ریزی کے مدت بے حنا رنگیں رہا — ہاتھ اُس کا جو مرے لوہو میں گستاخانہ تھا
غیر کے کہنے سے مارا اُن نے ہم کو بے گناہ — یہ نہ سمجھا وہ کہ واقع میں بھی کچھ تھا یا نہ تھا

[1] حکیم مومن خاں مومنؔ دہلوی سے ہزار لطف ہیں جو ہر ستم میں جاں کیلئے ؛ ستم شریک ہوا کون آسماں کیلئے۔
[2] مجھ آشیانے کا ۔ میرے آشیانے کا ۔ کی جگہ اب متروک ہے۔
[3] مرزا غالبؔ دہلوی سے نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو ؛ یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں۔

صبح ہوتے وہ بنا گوش آج یاد آیا مجھے
جو گرا دامن پہ آنسو گوہرِ یک دانہ تھا

شب فروغِ بزم کا باعث ہوا تھا حسنِ دوست
شمع کا جلوہ غبارِ دیدۂ پروانہ تھا

رات اُس کی چشمِ میگوں خواب میں دیکھی تھی میں
صبح سوتے سے اُٹھا تو سامنے پیمانہ تھا

رحم کچھ پیدا کیا شاید کہ اس بے رحم نے
گوش اُس کا شب ادھر تھا آخرِ افسانہ تھا

میرؔ بھی کیا مست طافح[عہ] تھا شرابِ عشق کا
لب پہ عاشق کے ہمیشہ نعرۂ مستانہ تھا

پیغامِ غمِ جگر کا گلزار تک نہ پہنچا
نالہ مرا چمن کی دیوار تک نہ پہنچا

اس آئنہ کے مانند زنگار جس کو کھاوے
کام اپنا اُس کے غم میں دیدار تک نہ پہنچا

جوں نقشِ پا ہے غربت حیران کار اُس کی
آوارہ ہو وطن سے جو یار تک نہ پہنچا

لبریز شکوہ تھے ہم لیکن حضور تیرے
کارِ شکایت اپنا گفتار تک نہ پہنچا

بے چشمِ نم رسیدہ پانی چُوا نہ کوئی
وقتِ اخیر اُس کے بیمار تک نہ پہنچا

یہ بختِ سبز دیکھو باغِ زمانہ میں سے
پژمردہ گل ہی اپنی دستار تک نہ پہنچا

قطعہ

مستوری خوبروئی دونوں جمع ہوویں
خوبی کا کام کس کی اظہار تک نہ پہنچا

یوسف سے لیکے تا گل پھر گل سے لیکے تا شمع
یہ حسن کس کو لیکر بازار تک نہ پہنچا

افسوس میرؔ وے جو ہونے شہید آئے
پھر کام اُن کا اُس کی تلوار تک نہ پہنچا

اُس کا خیال چشم سے شب خواب لے گیا
قسمے کہ عشق جی سے مرے تاب لے گیا

کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشمِ گریہ ناک
مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا

آوے جو مصطبے[۱] میں تو سن لو کہ راہ سے
واعظ کو ایک جامِ مئے ناب لے گیا

نے دل رہا بجا ہے نہ صبر و حواس و ہوش
آیا جو سیلِ عشق سب اسباب لے گیا

میرے حضور شمع نے گریہ جو سر کیا
رویا میں اس قدر کہ مجھے آب لے گیا

احوال اس شکارِ زبوں کا ہے جائے رحم
جس ناتواں کو مفت نہ قصاب لے گیا

منہ کی جھلک سے یار کے بے ہوش ہو گئے
شب ہم کو میرؔ پرتوِ مہتاب لے گیا

۱؎ مصطبہ بمعنی میخانہ عہ بدمست۔

کب تلک یہ ستم اٹھائیے گا
ایک دن یوں ہی جی سے جائیے گا

شکلِ تصویرِ بیخودی کب تک
کسو دن آپ میں بھی آئیے گا

سب سے مل چل کہ حادثے سے پھر
کہیں ڈھونڈا بھی تو نہ پائیے گا
جل

نہ موئے ہم اسیری میں تو نسیم
کوئی دن اور باؤ کھائیے گا

کہیے گا اُس سے قصۂ مجنوں
یعنی پردے میں غم سنائیے گا

اُس کے پابوس کی توقع پر
اپنے تئیں خاک میں ملائیے گا

اُس کے پاؤں کو جا لگی ہے حنا
خوب سے ہاتھ اُسے لگائیے گا

قطعہ
شرکتِ شیخ و برہمن سے میر
کعبہ و دیر سے بھی جائیے گا

اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدی مسجد
کسی ویرانے میں بنائیے گا

دل پہنچا ہلاکی کو نپٹ کھینچ کسالا
لے یار مرے سلمہ اللہ تعالا

کچھ میں نہیں اس دل کی پریشانی کا باعث
برہم ہی مرے ہاتھ لگا تھا یہ رسالا

معمور شرابوں سے کبابوں سے ہے سب دیر
مسجد میں ہے کیا شیخ، پیالا نہ نوالا

گزرے ہے لہو واں سرِ ہر خار سے اب تک
جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پاؤں کا چھالا

گر قصد اُدھر کا ہے تو ٹک دیکھ کے آنا
یہ دیر ہے زہاد نہو خانۂ خالا

جس گھر میں ترے جلوے سے ہو چاندنی کا فرش
واں چادرِ مہتاب ہے مکڑی کا سا جالا

قطعہ
دشمن نہ کدورت سے مرے سامنے ہوجو
تلوار کے لڑنے کو مرے کیجو[1] حوالا

ناموس مجھے صافی طینت کی ہے ورنہ
رستم نے مری تیغ کا حملہ نہ سنبھالا

دیکھے ہے مجھے دیدۂ پرخشم سے وہ میر
میرے ہی نصیبوں میں تھا یہ زہر کا پیالا

پل میں جہاں کو دیکھتے میرے ڈبو چکا
اک وقت میں یہ دیدہ بھی طوفان رو چکا

افسوس میرے مردے پر اتنا نہ کر کہ اب
پچھتانا یوں ہی سا ہے جو ہونا تھا ہو چکا

[1] کیجو بجائے کیجیو اور ہوجو بجائے ہوجیو اور اسی قسم کے صیغے اب متروک ہیں زمانۂ مرزا غالب رح تک استعمال میں تھے۔ چنانچہ اُن کے یہاں ایسے الفاظ کا اس طرح استعمال ہوا ہے مثلاً ؎
وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا! رکھ لیجو میرے دعویٔ وارستگی کی شرم۔ بخلاف اسکے کیجے لیجے بروزن فعلن اب بھی استعمال ہوتے ہیں:

لگتی نہیں پلک سے پلک انتظار میں
آنکھیں اگر یہی ہیں تو بھر نیند سو چکا

اک چشمک پیالہ ہے ساقی بہار عمر
جھپکی لگی کہ دور یہ آخر ہی ہو چکا

ممکن نہیں کہ گل کرے ویسی شگفتگی
اس سرزمیں میں تخم محبت میں بو چکا

پایا نہ دل بہایا ہوا سیل اشک کا
میں پنجۂ مژہ سے سمندر بلو چکا

ہر صبح حادثے سے یہ کہتا ہے آسماں
دے جام خون میر کو گر منہ وہ دھو چکا

دیر و حرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا
ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا

پلکوں سے تیری ہم کو کیا چشم داشت یہ تھی
ان برچھیوں نے بانٹا باہم جگر ہمارا

دنیا و دیں کی جانب میلان ہو تو کہئے
کیا جانئے کہ اس بن دل ہے کدھر ہمارا

ہیں تیرے آئینے کی تمثال ہم نہ پوچھو
اس دشت میں نہیں ہے پیدا اثر ہمارا

جوں صبح اب کہاں ہے طول سخن کی فرصت
قصہ ہی کوئی دم کو ہے مختصر ہمارا

کوچے میں اس کے جا کر بنتا نہیں پھر آنا
خون ایک دن گریگا اس خاک پر ہمارا

ہے تیرہ روز اپنا لڑکوں کی دوستی سے
اس دن ہی کو کہے تھا اکثر پدر ہمارا

سیلاب ہر طرف سے آئیں گے بادیہ میں
جوں ابر روتے ہوگا جس دم گزر ہمارا

نشو و نما ہے اپنی جوں گردباد الٹی
بالیدہ خاک رہ سے ہے یہ شجر ہمارا

یوں دور سے کھڑے ہو کیا معتبر ہے رونا
دامن سے باندھ دامن اے ابر تر ہمارا

جب پاس رات رہنا آتا ہے یاد اس کا
تھمتا نہیں ہے رونا دو دو پہر ہمارا

اس کارواں سرا میں کیا میر بار کھولیں
یہاں کوچ لگ رہا ہے شام و سحر ہمارا

غم رہا جبتک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا

حسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا

دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک
قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا

سنتے ہیں لیلیٰ کے خیمہ کو سیاہ
اس میں مجنوں کا ولے ماتم رہا

جامۂ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نامحرم رہا

زلفیں کھولے تو تو ٹک آیا نظر
عمر بھر یاں کام دل برہم رہا

اُس کے لب سے تلخ ہم سنتے رہے / اپنے حق میں آبِ حیواں سم رہا
میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی / ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

صبحِ پیری شام ہونے آئی میر
تو نہ چیتا یہاں بہت دن کم رہا

چوری میں دل کی وہ ہنر کر گیا / دیکھتے ہی آنکھوں میں گھر کر گیا
دیر میں میں خاک بسر ہی رہا / عمر کو اس طور بسر کر گیا
دل نہیں ہے منزلِ سینہ میں اب / یہاں سے وہ بیچارہ سفر کر گیا
حیف جو وہ نسخۂ دل کے اوپر / سرسری سی ایک نظر کر گیا
کس کو میرے حال سے تھی آگہی / نالۂ شب سب کو خبر کر گیا
گو نہ چلا تا مژہ تیرِ نگاہ / اپنے جگر سے تو گزر کر گیا

مجلسِ آفاق میں پروانہ ساں
میر بھی شام اپنی سحر کر گیا

وهاں وہ تو گھر سے اپنے پی کر شراب نکلا / یہاں شرم سے عرق میں ڈوب آفتاب نکلا
آیا جو واقعے میں درپیش عالمِ مرگ / یہ جاگنا ہمارا دیکھا تو خواب نکلا
دیکھا جو اوس پڑتے گلشن میں ہم تو آخر / گل کا وہ روئے خنداں چشمِ پُر آب نکلا
پردے ہی میں چلا جا خورشید تو ہی بہتر / اک حشر ہے جو گھر سے وہ بے حجاب نکلا
کچھ دیر ہی لگی نا دل کو تو تیر لگتے / اس صیدِ ناتواں کا کیا جی شتاب نکلا
ہر حرفِ غم نے میرے مجلس کے تئیں رُلایا / گویا غبارِ دل کا پڑھتا کتاب نکلا
روئے عرق فشاں کو بس پونچھ گرم مت ہو / اُس گل میں کیا رہیگا جس کا گلاب نکلا
مطلق نہ اعتنا کی احوال پر ہمارے / نامے کے نامے ہی میں سب پیچ و تاب نکلا
شانِ تغافل اپنے نو خط کی کیا لکھیں ہم / قاصد موا تب اُس کے منہ سے جواب نکلا

کس کی نگہ کی گردش تھی میر رو بمسجد
محراب میں سے زاہد مست و خراب نکلا

دامانِ کوہ میں جو میں دھاڑھ مار رویا / اک ابر وهاں سے اُٹھ کر بے اختیار رویا
پڑتا نہ تھا بھروسہ عہدِ وفائے گل پر / مرغِ چمن نے سمجھا میں تو ہزار رویا

ہر گل زمیں یہاں کی رونے ہی کی جگہ تھی
مانند ابر ہر جا میں زار زار رویا

تھی مصلحت کہ رک کر ہجراں میں جان دیجے
دل کھول کر نہ غم میں میں ایک بار رویا

دو

اک عجز عشق اس کا اسباب صد الم تھا
کل میر سے بہت میں ہو کر دوچار رویا

اس چہرہ کی خوبی سے عبث گل کو جتایا
یہ کون شگوفہ سا چمن زار میں لایا

وہ آئینہ رخسار دم باز پس آیا
جب حس نہ رہا ہم کو تو دیدار دکھایا

کچھ ماہ میں اس میں نہ تفاوت ہوا ظاہر
سو بار نکالا اسے اور اس کو چھپایا

اک عمر مجھے خاک میں ملتے ہوئے گزری
کوچہ میں ترے آن کے لوہو میں نہایا

سمجھا تو مجھے مرگ کے نزدیک پس از دیر
رحمت ہے مرے یار بہت دور سے آیا

یہ باغ رہا ہم سے وے جا نہ سکے ہم
بے بال و پری نے بھی ہمیں خاک اڑایا

میں صید رسیدہ ہوں بیابان جنوں کا
رہتا ہے مرا موجب وحشت مرا سایا

یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ
یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا

رو میں نے رکھا ہے در ترسا بچگاں پر
رکھیو تو مری شرم بڑھاپے میں خدایا

ٹالا تھیں کچھ مجھ کو پتنگ آج اڑاتے
بہتوں کے تئیں باؤ کا رخ ان نے بتایا

ایسے بت بے مہر سے ملتا ہے کوئی بھی
دل میر کو بھاری تھا جو پتھر سے لگایا

دل جو زیر غبار اکثر تھا
کچھ مزاج ان دنوں مکدر تھا

اس پہ تکیہ کیا تو تھا لیکن
رات دن ہم تھے اور بستر تھا

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم
یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا

بعد اک عمر جو ہوا معلوم
دل اس آئینہ رو کا پتھر تھا

بار سجدہ ادا کیا تہ تیغ
کب سے یہ بوجھ میرے سر پہ تھا

کیوں نہ ابر سیہ سفید ہوا
جب تلک عہد دیدۂ تر تھا

اب خرابا ہوا جہان آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

قطعہ

بے زری کا نہ کر گلہ غافل
رہ تسلی کہ یوں مقدر تھا

اتنے منعم جہان میں گزرے / وقت رحلت کے کس کنے زر تھا
صاحبِ جاہ و شوکت و اقبال / اک ازاں جملہ اب سکندر تھا
تھی یہ سب کائنات زیرِ نگیں / ساتھ مور و ملخ سا لشکر تھا
لعل و یاقوت ہم زر و گوہر / چاہیے جس قدر میسر تھا
آخر کار جب جہاں سے گیا / ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا
عیبِ طولِ کلام مت کریو / کیا کروں میں سخن سے خوگر تھا
خوش رہا جب تلک رہا جیتا
میر معلوم ہے قلندر تھا

تیرا رخِ مخطط قرآن ہے ہمارا / بوسہ بھی لیں تو کیا ہے ایمان ہے ہمارا
گر ہے یہ بیقراری تو رہ چکا بغل میں / دو روز دل ہمارا مہمان ہے ہمارا
ہیں اس خراب دل سے مشہور شہرِ خوباں / اس ساری بستی میں گھر ویران ہے ہمارا
مشکل بہت ہی ہمسا پھر کوئی ہاتھ آنا / یوں مارنا تو پیارے آسان ہے ہمارا
ادریس و خضر و عیسیٰ قاتل سے ہم چھڑائے / ان خوں گرفتگاں پر احسان ہے ہمارا
ہم وے ہیں سن رکھو تم مر جائیں رک کے یکجا / کیا کوچہ کوچہ پھرنا عنوان ہے ہمارا
ہیں صید گہ کے تیری صیاد کیا نہ دھڑکے / کہتے ہیں صید جو ہے بیجان ہے ہمارا
کرتے ہیں باتیں کس کس ہنگامہ کی یہ زاہد / دیوانِ حشر گویا دیوان ہے ہمارا
ماہیتِ دو عالم کھاتی پھرے ہے غوطے / یک قطرہ خون یہ دل طوفان ہے ہمارا
کیا خانداں کا اپنے تجھ سے کہیں تقدس / روح القدس اک ادنیٰ دربان ہے ہمارا
کرتا ہے کام وہ دل جو عقل میں نہ آوے / گھر کا مشیر کتنا نادان ہے ہمارا
بنجر زمین دل کی ہے میر ملک اپنی
پر داغ سینہ مُہری فرمان ہے ہمارا

کب مصیبت زدہ دل مائلِ آزار نہ تھا / کون سے درد و ستم کا یہ طرفدار نہ تھا
آدمِ خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ / آئینہ تھا یہ ولے قابلِ دیدار نہ تھا
دھوپ میں جلتی ہیں غربت وطنوں کی لاشیں / تیرے کوچے میں مگر سایۂ دیوار نہ تھا
صد گلستاں تہِ یک بال تھے اس کے جبتک / طائرِ جاں قفسِ تن کا گرفتار نہ تھا

حیف سمجھا ہی نہ وہ قاتلِ ناداں ورنہ ۔ بے گنہ مارنے قابل یہ گنہگار نہ تھا
عشق کا جذب ہوا باعثِ سودا ورنہ ۔ یوسفِ مصر زلیخا کا خریدار نہ تھا
نرم تر موم سے بھی ہم کو کوئی دیتی قضا ۔ سنگ چھاتی کا تو یہ دل ہمیں درکار نہ تھا

رات حیران ہوں کچھ چپ ہی مجھے لگ گئی میر
درد پنہاں تھے بہت پر لبِ اظہار نہ تھا

جی اپنا میں نے تیرے لئے خوار ہو دیا ۔ آخر کو جستجو نے تری مجھ کو کھو دیا
بیطاقتی سکوں نہیں رکھتی ہے ہمنشیں ۔ رونے نے ہر گھڑی کے مجھے توڑ بو دیا
اے ابر اس چمن میں نہ ہوگا گلِ امید [۱] ۔ یہاں تخمِ یاس اشک کو میں ہر جگے بو دیا

پوچھا جو میں نے دردِ محبت سے میر کو
رکھ ہاتھ اُن نے دل پہ ٹک اک اپنے رو دیا

خط منہ پہ آئے جاناں خجلی پہ جان دیگا ۔ ناچار عاشقوں کو رخصت کے پان دیگا
سارے رئیس اعضا ہیں معرضِ تلف میں ۔ یہ عشق بے محابا کس کو امان دیگا
پائے پر آبلے سے میں گم شدہ گیا ہوں ۔ ہر خار بادیہ کا میرا نشان دیگا
داغ اور سینے میں کچھ جگر ہی ہے عشق دیکھیں ۔ دل کو جگر کو کس کو اب درمیان دیگا
نالہ ہمارا ہر شب گزرے ہے آسماں سے ۔ فریاد پر ہماری کس دن تو کان دیگا
مت رغم سے ہمارے پیارے حنا لگاؤ ۔ پابوس پر تمھارے سر تو جوان دیگا

گھر چشم کا ڈبوست دل کے گئے پہ رو رو
کیا میر ہاتھ سے تو یہ بھی مکان دیگا

ہوتا ہے یہاں جہاں میں ہر روز و شب تماشا ۔ دیکھا جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا
ہرچند شورِ محشر اب بھی ہے در پہ لیکن ۔ نکلے گا یار گھر سے ہو ویگا جب تماشا
بھڑکی ہے آتشِ غم منظور ہے جو تجھ کو ۔ جلنے کا عاشقوں کے آ دیکھ اب تماشا

طالع جو میر خواری محبوب کو خوش آئی
پر غم یہ ہے مخالف دیکھیں گے سب تماشا

[۱] میر صاحب کا ایک شعر اور بھی ایسے ہی انداز کا ہے ؎
ممکن نہیں کہ گل کرے ویسی شگفتگی ؛ اس سرزمیں میں تخمِ محبت میں بو چکا

کل چمن میں گل و سمن دیکھا
آج دیکھا تو باغ بن دیکھا

کیا ہی گلشن میں جو قفس میں نہیں
عاشقوں کا جلا وطن دیکھا

ذوقِ پیکان تیر میں تیرے
مدتوں تک جگر نے چمن دیکھا

گھر کے گھر جلتے تھے پڑے تیرے
داغ دل دیکھے بس چمن دیکھا

ایک چشمک دو صد سنانِ مژہ
اس نکیلے کا بانکپن دیکھا

حسرت اُس کی جگہ تھی خوابیدہ
میرؔ کا کھول کر کفن دیکھا

جدا جو پہلو سے وہ دلبر یگانہ ہوا
طپش کے یہاں تئیں دل نے کہ دردِ شانہ ہوا

جہاں کو فتنہ سے خالی کبھو نہیں پایا
ہمارے وقت میں تو آفتِ زمانہ ہوا

خلش نہیں کسو خواہش کی رات سے شاید
سرشک یاس کے پردے میں دل روانہ ہوا

ہم اپنے دل کی چلے دل ہی میں لیے یہاں سے
ہزار حیف سرِ حرف اس سے وا نہ ہوا

کھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اُس کی میرؔ
سمندِ ناز پہ ایک اور تازیانہ ہوا

کیا دن تھے وے کہ یہاں بھی دلِ آرمیدہ تھا
رو آشیانِ طائرِ رنگِ پریدہ تھا

قاصد جو وہاں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا
بیچارہ گریہ ناک گریباں دریدہ تھا

اک وقت ہم کو تھا سرِ گریہ کہ دشت میں
جو خار خشک تھا سو وہ طوفاں رسیدہ تھا

جس صید گاہِ عشق میں یاروں کا جی گیا
مرگ[1] اُس شکار گہ کا شکارِ رمیدہ تھا

مت پوچھ کس طرح سے کٹی رات ہجر کی
ہر نالہ میری جان کو تیغ کشیدہ تھا

حاصل نہ پوچھ گلشنِ مشہد کا بوالہوس
یہاں پھل ہر اک درخت کا حلقِ بریدہ تھا

دل بیقرار گریۂ خونیں تھا رات میرؔ
آیا نظر تو بسمل در خوں طپیدہ تھا

کثرتِ داغ سے دل رشکِ گلستاں نہ ہوا
میرا دلخواہ جو کچھ تھا وہ کبھو یہاں نہ ہوا

جی تو ایسے کئی صدقے کئے تجھ پر لیکن
حیف یہ ہے کہ تنک تو بھی پشیماں نہ ہوا

آہ میں کب کی کہ سرمایۂ دوزخ نہ ہوئی
کونسا اشک مرا منبعِ طوفاں نہ ہوا

[1] مرگ۔ اب فصحا اس کی تانیث کو مرجح سمجھتے ہیں۔

گو توجہ سے زمانے کی جہاں میں مجھ کو
جاہ و ثروت کا میسر سر و ساماں نہ ہوا

شکر صد شکر کہ میں ذلت و خواری کے سبب
کسی عنوان میں ہم چشم عزیزاں نہ ہوا

برق مت خوشی کی اور اپنی بیاں کر صحبت
شکر کر یہ کہ مرا وہاں دل سوزاں نہ ہوا

دل بے رحم گیا شیخ لئے زیر زمیں
مر گیا پر یہ کہن گبر مسلماں نہ ہوا

کون سی رات زمانے میں گئی جس میں میر
سینۂ چاک سے میں دست و گریباں نہ ہوا

تیرے قدم سے جا لگے جس پہ مرا ہو سر لگا
گو کہ مرے ہی خون کی دست گرفتہ ہو حنا

سنگ مجھے بجاں قبول اس کے عوض ہزار بار
تا بجا یہ اضطراب دل نہ ہوا ستم ہوا

کس کی ہوا کہاں کا گل ہم تو قفس میں ہیں اسیر
سیر چمن کی روز و شب تجھ کو مبارک اے صبا

کن نے بدی ہے اتنی دیر موسم گل میں ساقیا
دُکھ بھی ہے دو آتشہ زور ہی سرد ہی ہوا

فصل خزاں تلک تو میں اتنا نہ تھا خراب گرد
مجھ کو جنوں ہو گیا موسم گل میں کیا بلا

جان بلب رسیدہ سے اتنا ہی کہنے پائے ہم
جاوے اگر تو یار تک کہیو ہماری بھی دُعا

بوئے کباب سوختہ آتی ہے کچھ دماغ میں
ہووے نہ ہووے ای نسیم رات کسی کا دل جلا

میں تو کہا تھا تیرے تئیں آ و سمجھ نہ ظلم کر
آخر کار بیوفا جی ہی گیا نہ میر کا

تابو خزاں سے ضعف کا گلشن میں بن گیا
دوش ہوا پہ رنگ گل یاسمن گیا

برگشتہ بخت دیکھ کہ قاصد سفر سے میں
بھیجا تھا اُس کے پاس سو میرے وطن گیا

خاطر نشان ای صید فگن ہو گی کب تری
تیروں کے مارے میرا کلیجہ تو چھن گیا

یادش بخیر دشت میں مانند عنکبوت
دامن کے اپنے تار جو خاروں سے تن گیا

مارا تھا کس لباس میں عریانی نے مجھے
جس سے تہ زمین بھی میں بے کفن گیا

آئی اگر بہار تو اب ہم کو کیا صبا
ہم سے تو آشیاں بھی گیا اور چمن گیا

سرسبز ملک ہند میں ایسا ہوا کہ میر
یہ ریختہ لکھا ہوا تیرا دکن گیا

لخت جگر تو اپنے اک لخت رو چکا تھا
اشک فقط کا جھمکا آنکھوں سے لگ رہا تھا

دامن میں آج دیکھا پھر لخت میں نے آیا
ٹکڑا کوئی جگر کا پلکوں میں رہ گیا تھا

اس قیدِ جیب سے میں چھوٹا جنوں کی دولت
ورنہ گلا یہ میرا جوں طوق میں پھنسا تھا

مشتِ نمک کی خاطر اس واسطے ہوں حیراں
کل زخمِ دل نہایت دل کو مرے لگا تھا

ای گردبادِ مت دے ہر آن عرضِ وحشت
میں بھی کسو زمانے اس کام میں بلا تھا

بن کچھ کہے سُنا ہے عالم سے میں نے کیا کیا
پر تو نے یوں نہ جانا ای بے وفا کہ کیا تھا

روتی ہے شمع اتنا ہر شب کہ کچھ نہ پوچھو
میں سوزِ دل کو اپنے مجلس میں کیوں کہا تھا

قطعہ

سر مار کر ہوا تھا میں خاک اس گلی میں
سینے پہ مجھ کو اس کا مذکور نقش پا تھا

سو بخت تیرہ سے ہوں پامالِ صبا میں
اس دن کے واسطے میں کیا خاک میں ملا تھا

قطعہ

یہ سرگزشت میری افسانہ جو ہوئی ہے
مذکور اُس کا اُس کے کوچے میں جابجا تھا

سُنکر کسی سے وہ بھی کہنے لگا تھا کچھ کچھ
بیدرد کتنے بولے ہاں اُس کو کیا ہوا تھا

کہنے لگا کہ جانے میری بلا عزیزاں
احوال تھا کسی کا کچھ میں بھی سُن لیا تھا

آنکھیں مری کھلیں جب جی میر کا گیا تب
دیکھے سے اُس کو ورنہ میرا بھی جی جلا تھا

سرِ دورِ فلک بھی دیکھوں اپنے روبرو ٹوٹا
کہ سنگِ محتسب سے پائے خُم دستِ سبو ٹوٹا

کہاں[1] آتے میسر تجھ سے مجھ کو خود نما اتنے
ہوا یوں اتفاق آئینہ میر روبرو ٹوٹا

کفِ چالاک میں تیری جو تھا سر رشتہ جانوں کا
گریباں سے مرے ہر اک ترا ٹانکا رفو ٹوٹا

طراوت تھی چمن میں سرو گویا اشکِ قمری سے
اُدھر آنکھیں مُندیں اُس کی کہ ایدھر آبِ جو ٹوٹا

خطر کر تو نہ لگ چل ای صبا اُس زلف سے اتنا
بلا آوے گی تیرے سر جو اُس کا ایک مو ٹوٹا

وہ بیکس کیا کرے گر تو رہی دل ہی کی دل ہی میں
نپٹ بیجا ترا دل میر سے ای آرزو ٹوٹا

آنکھوں میں جی مرا ہی ادھر یار دیکھنا
عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا

کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہی
چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا

آنکھیں چرائیو نہ ٹک ابرِ بہار سے
میری طرف بھی دیدۂ خونبار دیکھنا

ای ہمسفر نہ آبلے کو پہنچے چشمِ تر
لاگا[2] ہی میرے پانوں میں آخار دیکھنا

[1] مصرعۂ ثانی تذکرۂ میر میں اس طرح ہی۔ ع۔ بجس اتفاق آئینہ تیرے روبرو ٹوٹا نسخۂ کلکتہ میں اسی طرح ہی اور نسخۂ کشوری طبع اوّل میں بجائے میرے۔ تیرے ہی ۱۲۔ [2] لاگنا بمعنی لگنا اب متروک ہی ۱۲۔ آسی

ہونا نہ چار چشم دل اس ظلم پیشہ سے
ہشیار زینہار خبردار دیکھنا

صیاد دل ہی داغ جدائی سے رشکِ باغ
تجھ کو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھنا

گر زمزمہ یہی ہی کوئی دن تو ہم صفیر
اس فصل ہی میں ہم کو گرفتار دیکھنا

بلبل ہمارے گل پہ نہ گستاخ کر نظر
ہو جائیگا گلے کا کہیں ہار دیکھنا

شاید ہماری خاک سے کچھ ہو بھی ای نسیم
غربال کرکے کوچۂ دلدار دیکھنا

اُس خوش نگہ کے عشق سے پرہیز کیجو میر
جاتا ہی لیکے جی ہی یہ آزار دیکھنا

غلط ہے عشق میں ای بُلہوس اندیشہ راحت کا
رواج اس ملک میں ہی درد و داغ و رنج و کلفت کا

زمین اک صفحۂ تصویر بیہوشاں سے مانا ہے
یہ مجلس جب سے ہی اچھا نہیں کچھ رنگ صحبت کا

جہاں جلوے سے اس محبوب کے یکسر لبالب ہے
نظر پیدا اگر اوّل پھر تماشا دیکھ قدرت کا

ہنوز آوارۂ لیلیٰ ہے جانِ رفتۂ مجنوں کی
موئے پر بھی رہا ہوتا نہیں وابستہ الفت کا

حریفِ بے جگر ہی صبر ورنہ کل کی صحبت میں
نیاز و ناز کا جھگڑا گرو تھا ایک جرأت کا

نگاہِ یاس بھی اس صید افگن پر غنیمت ہی
نہایت تنگ ہے ای صید بسمل وقت فرصت کا

خرابی دل کی اُس حد ہی کہ یہ سمجھا نہیں جاتا
کہ آبادی بھی یہاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدت کا

نگاہِ مست نے اُس کی لٹائین خانقہ ساری
پڑا ہی برہم اب تک کارخانہ زہد و طاعت کا

قدم ٹک دیکھ کر رکھ میر سر دل سے نکالے گا
پلک سے شوخ تر کانٹا ہے صحرائے محبت کا

جو اس شور سے میر روتا رہیگا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہیگا

میں وہ رونیوالا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہیگا

مجھے کام رونے سے اکثر ہی ناصح
تو کب تک مرے منھ کو دھوتا رہیگا

بس ای گریہ آنکھیں تری کیا نہیں ہیں
کہاں تک جہاں کو ڈبوتا رہیگا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہی
جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہیگا

تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے
ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہیگا

بس ای میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہیگا

لے مطابق اصل

نئے طرزوں سے میخانے میں رنگِ مے جھلکتا تھا
گلابی روتی تھی وہاں جام ہنس ہنس کر چھلکتا تھا

ترے اس خاک اڑانے کی دھمک سے اے مری وحشت
کلیجہ ریگِ صحرا کا بھی دس دس گز تھلکتا تھا

گئی تسبیح اس کی نزع میں کب میرؔ کے دل سے
اسی کے نام کی سمرن تھی جب منکا ڈھلکتا تھا

تجھ سے ہر آن مرے پاس کا آنا ہی گیا
کیا گلہ کیجے غرض اب وہ زمانا ہی گیا

چشم بن اشک ہوئی یا نہ ہوئی یکساں ہے
خاک میں جب وہ ملا موتی کا دانا ہی گیا

بزمِ مجنوں میں خرد مند کوئی جا نہ سکا
عاقبت سر کو قدم کر یہ دِوانا ہی گیا

ہم اسیرِ دل کو بھلا کیا جو بہار آئی نسیم
عمر گزری کہ وہ گلزار کا جانا ہی گیا

جی گیا میرؔ کا اس لیت و لعل میں لیکن
نہ گیا ظلم ہی تیرا نہ بہانا ہی گیا

دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یہاں آگے درد تھا

اک گردِ راہ تھا پئے محمل تمام راہ
کس کا غبار تھا کہ یہ دنبالہ گرد تھا

دل کی شکستگی نے ڈرائے رکھا ہمیں
وہاں چیں جبیں پر آئی کہ یہاں رنگ زرد تھا

مانندِ حرف صفحۂ ہستی سے اٹھ گیا
دل بھی مرا جریدۂ عالم میں فرد تھا

تھا پشتہ ریگِ بادیہ اک وقتِ کارواں
یہ گردباد کوئی بیاباں نورد تھا

گزری مدام اس کی جوانانِ مست میں
پیرِ مغاں بھی طرفہ کوئی پیر مرد تھا

عاشق ہیں ہم تو میرؔ کے بھی ضبطِ عشق کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

گئے قیدی ہو ہم آواز جب صیاد آ ٹوٹا
یہ ویراں آشیانے دیکھنے کو ایک میں چھوٹا

مرا رنگ اڑ گیا جس وقت سنگِ محتسب آگے
بغل سے گر پڑا مینا و ساغر جو پر ہو پھوٹا

مرا وعدہ ہی آ پہنچا ترے آنے کے وعدے تک
ہوا میں موت سے بیچارہ ہا اے شوخ تو چھوٹا

کفِ جاناں سے کیا امکاں رہائی میرؔ کوئی ہو
اچنبھا ہے جو اس کے ہاتھ سے رنگِ حنا چھوٹا

برقع اٹھا تھا رخ سے مرے بدگمان کا
دیکھا تو اور رنگ ہے سارے جہان کا

مت[1] مانیو کہ ہوگا یہ بے درد اہلِ دیں
گر آوے شیخ پہن کے جامہ قرآن کا

۱؎ ذوق دہلوی: جھوٹ ہی جانوں کلام اس دشمنِ ایمان کا ؎ پہن کر جامہ بھی وہ آوے اگر قرآن کا

خوبی کو اُس کے چہرہ کی کیا پہنچے آفتاب
ہے اس میں اُس میں فرق زمین آسمان کا

ابلہ ہے وہ جو ہووے خریدار گلرخاں
اس سودے میں صریح ہے نقصان جان کا

کچھ اور گاتے ہیں جو رقیب اُس کے روبرو
دشمن ہیں میری جان کے یہ جی ہے تان کا

تسکین اُس کی تب ہوئی جب چُپ مجھے لگی
مت پوچھ کچھ سلوک مرے بدزبان کا

قطعہ

یہاں بلبل اور گل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول
گلگشت[۵۱] سرسری نہیں اس گلستان کا

گل یادگار چہرۂ خوباں ہے بے خبر
مرغ چمن نشاں ہے کسو خوش زبان کا

تو برسوں میں کہے ہے ملوں گا میں میر سے
یہاں کچھ کا کچھ ہے حال ابھی اس جوان کا

مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ ساغر نہ ہووے گا
مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا

کیا ہے خوں مرا پامال یہ سرخی نہ چھوٹے گی
اگر قاتل تو اپنے پاؤں تئیں پانی سے دھووے گا

کوئی رہتا ہے جی بے جی ترے کوچے کے آنے سے
تبھی آسودہ ہوگا میر جب جی کو کھووے گا

مجھے زنہار خوش آتا نہیں کعبہ کا ڈھایا
صنم خانہ ہی یہاں اے شیخ تو نے کیوں نہ بنوایا

زہے اے عشق کی نیرنگ سازی غیر کو اُن نے
جلایا بات کہتے وہاں ہمیں مرنے کو فرمایا

بھری آئی اگر تیرے درد دل میں میر ایسی تو
کہ کہتے روبرو اُس شوخ کے قاصد کا منہ آیا

نقش بیٹھے ہے کہاں خواہش آزادی کا
ننگ ہے نام رہائی تری صیادی کا

داد دے ورنہ ابھی جان پہ کھیلوں ہوں میں
دل جلانا نہیں دیکھا کسی فریادی کا

شہر کی سی رہی رونق اُسی کے جیتے جی
مر گیا قیس جو تھا خانہ خدا وادی کا

شیخ کیا صورتیں رہتی تھیں بھلا جب تھا دیر
رو بہ ویرانی ہوا اس کعبہ کی آبادی کا

ریختہ[۵۲] رتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے
معتقد کون نہیں میر کی اُستادی کا

کام پل میں مرا تمام کیا
غرض اُس شوخ نے بھی کام کیا

سرو و شمشاد خاک میں مل گئے
تو نے گلشن میں کیوں خرام کیا

سعی طوف حرم نہ کی ہرگز
زاہد آستاں پر ترے مقام کیا

۵۱ یہ زمانہ مونث بولا جاتا ہے ۱۲ ۵۲ قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ ٭ اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی ۱۲

تیرے کوچے کے رہنے والوں نے / یہیں سے کعبہ کو سلام کیا
اُس کے عیار پن نے میرے تئیں / خادم و بندۂ و غلام کیا
حالِ بد میں مرے بتنگ آکر / آپ کو سب میں نیک نام کیا
قطعہ
ہو گیا دل مرا تکبر جب / درد نے قطعۂ پیام[۱] کیا
دلی کے کج کلاہ لڑکوں نے / کام عشاق کا تمام کیا
کوئی عاشق نظر نہیں آتا / ٹوپی والوں نے قتلِ عام کیا
عشقِ خوباں کو میرؔ میں اپنا / قبلہ و کعبہ و امام کیا

رات پیاسا تھا میرے لوہو کا / ہوں دِوانہ ترے سگِ کو کا
شعلۂ آہ جوں توں اب مجھ کو / فکر ہے اپنے ہر بُنِ مو کا
ہے مرے یار کے مسوں کا رشک / کشتہ ہوں سبزۂ لبِ جو کا
بوسہ دینا مجھے نہ کر موقوف / ہے وظیفہ یہی دُعاگو کا
شورِ قلقل کی ہوتی تھی مانع / ریشِ قاضی پہ رات میں تھوکا
عطر آگیں ہے بادِ صبح مگر / کھل گیا پیچ زلفِ خوشبو کا
ایک دو ہوں تو سحرِ چشم کہوں / کارخانہ ہے وہاں تو جادو کا
قطعہ
میرؔ ہر چند میں نے چاہا لیک / نہ چھپا عشق طفلِ بدخو کا
نام اُس کا لیا اِدھر اُودھر / اُڑ گیا رنگ ہی مرے رو کا

آیا تھا خانقہ میں وہ نورِ دیدگاں کا / تہ کر گیا مُصلیٰ عزلت گزیدگاں کا
آخر کو خاک ہونا درپیش ہے سبھوں کو / ٹک دیکھ مُنہ کدھر ہے قامت خمیدگاں کا
جو خارِ دشت میں ہے سو چشمِ آبلہ سے / دیکھا ہوا ہے تیری محنت کشیدگاں کا

[۱] پیام سے مُراد شرف الدین علی خاں پیام اکبر آبادی ہیں جس قطعہ کو میر صاحب نے پیش کیا ہے وہ قطعہ انھیں کا ہے یہ عہد محمد شاہ بادشاہ میں زندہ تھے فارسی کے شعر خوب کہتے تھے۔ اُردو کے بعض شعر پتہ دیتے ہیں کہ ریختہ کے بھی اُستاد ہوں گے "میر نے لکھا ہے کہ میں نے اُن کو کئی بار دیکھا اُنکا ریختہ کا دیوان بھی تھا۔ اُنکی عبارت یہ ہے "شاعر قرار داد شاعران فارسی عہد خود بود، و صاحب دیوان ریختہ نیز از خاک پاک اکبر آباد است۔ بندہ اکثر ملاقات کردم چنانچہ با نجم الدین علی سلام کہ خلف الصدق اوست فقیر را اخلاص للہیت تا شبہ اتفاق باہم نشستن و ذکر شعر کردن و گپ زدن می افتد ۱۲۔ انتہی

اب زیرِ خاک رہنا مشکل ہے کشتگاں کو
آرام کھو چلا تو ان آرمیدگاں کا

تیرِ بلا کا ہردم اب میرؔ ہے نشانہ
پتھر جگر ہے اُس کے آفت رسیدگاں کا

صحرا میں سیلِ اشک مرا جا بجا پھرا
مجنوں بھی اُس کی موج میں مدت بہا پھرا

طالع جو خوب تھے نہ ہوا جاہ کچھ نصیب
سر پر مرے کروڑ برس تک ہما پھرا

آنکھیں برنگِ نقشِ قدم ہوگئیں سفید
نامے کے انتظار میں قاصد بھلا پھرا

ٹک بھی نہ مڑ کے میری طرف تو نے کی نگاہ
اک عمر تیرے پیچھے میں ظالم لگا پھرا

دیر و حرم میں کیونکہ قدم رکھ سکے گا میرؔ
ایدھر تو اُس سے بُت پھرے اُودھر خدا پھرا

کس شام سے اُٹھا تھا مرے دل میں درد سا
سو ہو چلا ہوں پیشتر از صبح سرد سا

بیٹھا ہوں جوں غبارِ ضعیف اب گزر میں
پھرتا رہا ہوں گلیوں میں آوارہ گرد سا

قصدِ طریقِ عشق کیا سب نے بعدِ قیس
لیکن ہوا نہ ایک بھی اُس رہ نورد سا

حاضر یراقِ بیمزگی کس گھڑی نہیں
معشوق کچھ ہمارا ہے عاشق نبرد سا

کیا میرؔ ہی یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا
نمناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا

ترے عشق میں آگے سودا ہوا تھا
پر اتنا بھی ظالم نہ رسوا ہوا تھا

خزاں التفات اس پہ کرتی بجا تھی
یہ غنچہ چمن میں ابھی وا ہوا تھا

کہاں تھا تو اس طور آنے سے میرے
گلی میں تری کل تماشا ہوا تھا

گریباں سے تب ہاتھ اُٹھایا تھا میں نے
مری اور دامانِ صحرا ہوا تھا

زہے طالع اے میرؔ اُن نے یہ پوچھا
کہاں تھا تو اب تک تجھے کیا ہوا تھا

آہ کی میں دلِ حیران و خفا کو سونپا
میں نے یہ غنچۂ تصویر صبا کو سونپا

تیرے کوچے میں مری خاک بھی پامال ہوئی
تھا وہ بیدرد مجھے جن نے وفا کو سونپا

اب تو جاتا ہی ہے کعبہ کو تو بتخانے سے
جلد پھر پہنچیو اے میرؔ خدا کو سونپا

گلہ نہیں ہے ہمیں اپنی جاں گدازی کا
جگر پہ زخم ہے اُس کی زباں درازی کا

سمندِ ناز نے اُس کے جہاں کیا پامال
وہی ہے اب بھی اُسے شوق ترکتازی کا

ستم ہیں قہر ہیں لونڈے شراب خانے کے
اُتار لیتے ہیں عمامہ ہر نمازی کا

الٹ پلٹ مری آہِ سحر کی کیا ہے کم
اگر خیال تمھیں ہووے نیزہ بازی کا

بتاؤ ہم سے کوئی آن تم سے کیا بگڑی
نہیں ہے تم کو سلیقہ زمانہ سازی کا

خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب لیکن
رہے ہے خوف مجھے واں کی بے نیازی کا

چلو ہو راہِ موافق کہے مخالف کے
طریق چھوڑ دیا تم نے دل نوازی کا

کسو کی بات نے آگے مرے نہ پایا رنگ
دلوں میں نقش ہے میری سخن طرازی کا

لبسانِ خاک ہو پامال راہ خلق ای میر
رکھے ہے دل میں اگر قصد سر فرازی کا

کیا کہیے کہ خوباں نے اب ہم میں ہے کیا رکھا
اُن چشم سیاہوں نے بہتوں کو سلا رکھا

جلوہ ہے اُسی کا سب گلشن میں زمانے کے
گل پھول کو ہے اُن نے پردہ سا بنا رکھا

جوں برگِ خزاں دیدہ سب زرد ہوئے ہم تو
گرمی نے ہمیں دل کی آخر کو جلا رکھا

کہیے جو تمیز اُس کو کچھ اچھے برے کی ہو
دل جس کسو کا پایا چٹ اُن نے اڑا رکھا

تھی مسلکِ الفت کی مشہور خطرناکی
میں دیدہ و دانستہ کس راہ میں پا رکھا

خورشید و قمر پیارے رہتے ہیں چھپے کوئی
رخساروں کو گو تو نے برقع سے چھپا رکھا

چشمک ہی نہیں تازے شیوے یہ اُسی کے ہیں
جھمکے سے دکھا دے کر عالم کو لگا رکھا

لگنے کے لیے دل کے چھڑ کا تھا نمک میں نے
سو چھاتی کے زخموں نے کیا دیر مزا رکھا

کشتے کو اس ابرو کے کیا میل[۱] ہو ہستی کی
ہیں طاق بلند اوپر جینے کو اٹھا رکھا

قطعی ہے دلیل ای میر اُس تیغ کی بے آبی
رحم اُن نے مرے حق میں مطلق نہ روا رکھا

کام میرا بھی ترے غم میں کہوں ہو جائے گا
جب یہ کہتا ہوں تو کہتا ہے کہ ہوں ہو جائیگا

خون کم کر اب کہ کشتوں کے تو پشتے لگ گئے
قتل کرتے کرتے تیرے تئیں جنوں ہو جائیگا

[۱] میل بمعنی خواہش اب بالاتفاق مذکر ہے جیسا کہ آتش کے اس شعر میں ہے

اس گل سے عرض حال کی حسرت ہی رہ گئی ؛ کانٹے پڑے زباں میں جو میل بیاں ہوا ۱۲ آسی

اُس شکار انداز خونیں کا نہیں آیا مزاج ورنہ آہوئے حرم صید زبوں ہو جائیگا
بزمِ عشرت میں ملامت ہم نگوں بختوں کے تئیں جوں حبابِ بادہ ساغر سرنگوں ہو جائیگا

کیا کہوں میں میر اُس عاشق ستم محبوب کو
طور پر اُس کے کسو دن کوئی خوں ہو جائیگا

سینہ دشنوں سے چاک تا نہ ہوا دل جو عقدہ تھا سخت وا نہ ہوا
سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں دل سے اک داغ ہی جدا نہ ہوا
ظلم و جور و جفا ستم بیداد عشق میں تیرے ہم پہ کیا نہ ہوا
ہم تو ناکام ہی جہاں میں رہے یہاں کبھو اپنا مدعا نہ ہوا

میر افسوس وہ کہ جو کوئی
اُس کے دروازے کا گدا نہ ہوا

یار عجب طرح نگہ کر گیا دیکھنا وہ دل میں جگہ کر گیا
تنگ قبائی کا سماں یار کی پیرہن غنچہ کو تہ کر گیا
جانا ہی اس بزم سے آیا تو کیا کوئی گھڑی گو کہ تو رہ کر گیا

وصفِ خط و خال میں خوباں کے میر
نامۂ اعمال سیہ کر گیا

آہِ سحر نے سوزشِ دل کو مٹا دیا اس باد نے ہمیں تو دیا سا بجھا دیا
سمجھی نہ بادِ صبح کہ آکر اُٹھا دیا اس فتنۂ زمانہ کو ناحق جگا دیا
پوشیدہ رازِ عشق چلا جائے تھا سو آج بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اُٹھا دیا
اس موج خیز دہر میں ہم کو قضا نے آہ پانی کے بلبلے کی طرح سے مٹا دیا
تھی لاگ اُس کی تیغ کو ہم سے سو عشق نے دونوں کو معرکے میں گلے سے ملا دیا
سب شورِ ما و من کو لئے سر میں مر گئے یاروں کو اس فسانے نے آخر سلا دیا
آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں مشتِ غبار لیکے صبا نے اُڑا دیا
اجزا بدن کے جتنے تھے پانی ہو بہ گئے آخر گدازِ عشق نے ہم کو بہا دیا
کیا کچھ نہ تھا ازل میں نہ طالع جو تھے درست ہم کو دلِ شکستہ قضا نے دلا دیا
گویا محاسبہ مجھے دینا تھا عشق کا اس طور دل سی چیز کو میں نے لگا دیا

مدت رہیگی یاد ترے چہرے کی جھلک | جلوے کو جس نے ماہ کے جی سے بھلا دیا
ہم نے تو سادگی سے کیا جی کا بھی زیاں | دل جو دیا تھا سو تو دیا سر جدا دیا
بوئے کباب سوختہ آئی دماغ میں | شاید جگر بھی آتشِ غم نے جلا دیا
تکلیف دردِ دل کی عبث ہمنشیں نے لی | دردِ سخن نے میرے سبھوں کو رُلا دیا

اُن نے تو تیغ کھینچی تھی پر جی چلا کے میر
ہم نے بھی ایک دم میں تماشا دکھا دیا

ردیف بائے موحدہ

رکھتا ہی ہم سے وعدہ ملنے کا یار ہر شب | سو جاتے ہیں ولیکن بختِ کنار ہر شب
مدت ہوئی کہ اب تو ہم سے جدا رکھے ہے | اُس آفتاب رو کو یہ روزگار ہر شب
دیکھیں ہیں راہ کس کی یارب کہ اختروں کی | رہتی ہیں باز آنکھیں چندیں ہزار ہر شب
دھوکے ترے کسو دن میں جان دے رہونگا | کرتا ہے ماہ میرے گھر سے گزار ہر شب
دل کی کدورت اپنے اک شب بیاں ہوئی تھی | رہتا ہی آسماں پر تب سے غبار ہر شب
کس کے لگا ہے تازہ تیرِ نگاہ اُس کا | اک آہ میرے دل کی ہوتی ہی پار ہر شب
مجلس میں میں نے اپنا سوزِ جگر کہا تھا | روتی ہی شمع تب سے بے اختیار ہر شب

مایوس وصل اُس کے کیا سادہ مردماں ہیں
گزرے ہی میر اُن کو امیدوار ہر شب

اب وہ نہیں کہ آنکھیں تھیں پُر آب روز و شب | ٹپکا کرے ہی آنکھوں سے خوناب روز و شب
اک وقت رونے کا تھا ہمیں بھی خیال سا | آتے تھے آنکھوں سے چلے سیلاب روز و شب
اُس کیلئے نہ پھرتے تھے ہم خاک چھانتے | رہتا تھا پاس وہ دُرِ نایاب روز و شب
قدرت تو دیکھ عشق کی مجھ سے ضعیف کو | رکھتا ہے شاد بے خور و بے خواب روز و شب
سجدہ اُس آستاں کا نہیں یوں ہوا نصیب | رگڑا ہے سر میانۂ محراب روز و شب
اب رسم ربط اُٹھ ہی گئی ورنہ پیش ازیں | بیٹھے ہی رہتے تھے بہم احباب روز و شب

دل کس کے رو و مو سے لگایا ہے میر نے
پاتے ہیں اُس جوان کو بیتاب روز و شب

روتا کیے ہیں غم سے ترے ہم تمام شب — پڑتی رہی ہے زور سے شبنم تمام شب
رکنے سے دل کے آج بچا ہوں تو اب جیا — چھاتی ہی میں رہا ہے مرا دم تمام شب
یہ اتصال اشک جگر سوز کا کہاں — روتی ہے یوں تو شمع بھی کم کم تمام شب
قطعہ
شکوہ عبث ہے میر کہ کڑھتے ہیں سارے دن — یاں دل کا حال رہتا ہے درہم تمام شب
گزرا کیے جہاں میں خوشی سے تمام روز — کس کی کٹی زمانے میں بے غم تمام شب

ہوتا نہ پائے سرو جو جوئے چمن میں آب — تو کون قمریوں کے چواتا دہن میں آب
اس پر لہو کے پیاسے ہیں تیرے لبوں کے رشک — اک نام کو رہی ہے عقیق یمن میں آب
شب سوزِ دل کہا تھا میں مجلس میں شمع سے — روتی ہے یہاں تلک کہ بھرا ہے لگن میں آب
دل لے گیا تھا زیرِ زمیں میں بھرا ہوا — آتا ہے ہر مسام سے میرے کفن میں آب
دریا میں قطرہ قطرہ ہے آب گہر کہیں — ہے میر موج زن ترے ہر اک سخن میں آب

کس کی مسجد، کیسے بتخانے کہاں کے شیخ و شاب — ایک گردش میں تری چشم سیہ کے سب خراب
تو کہاں اس کی کمر کیدھر نہ کریو اضطراب — اے رگ گل دیکھیو کھاتی ہے جو تو پیچ و تاب
موند رکھنا چشم کا ہستی میں عین دید ہے — کچھ نہیں آتا نظر جب آنکھ کھولے ہے حباب
تو ہو اور دنیا ہو ساقی میں ہوں مستی ہو مدام — پر بط صہبا نکالے اڑ چلے رنگ شراب
ہے ملاحت تیرے باعث شور پر تجھ سے نمک — ٹک تو رہ پیری چلی آتی ہے اے عہد شباب
کب تھی یہ بے جرأتی شایانِ آہوئے حرم — ذبح ہوتا تیغ سے یا آگ میں ہوتا کباب
کیا ہو رنگِ رفتہ کیا قاصد ہو جس کو خط دیا — جز جوابِ صاف اس سے کب کوئی لایا جواب
قطعہ
وائے اس جینے پر اے مستی کہ دورِ چرخ میں — جام مے پر گردش آوے اور میخانہ خراب
چوب حرفی بن الف بے میں نہیں پہچانتا — ہوں میں ابجد خواں شناسائی کو مجھ سے کیا حساب
قطعہ
مت ڈھلک مژگاں سے اب تو اے سرشک آبدار[1] — مفت میں جاتی رہے گی تیری موتی کی سی آب
کچھ نہیں بحرِ جہاں کی موج پر مت بھول میر — دور سے دریا نظر آتا ہے لیکن ہے سراب

[1] یہ شعر تذکرۂ میر میں اس طرح ہے ؎ مت ڈھلک مژگاں سے میرے اے سرشک آبدار ؎ مفت ہی جاتی رہے گی تیری موتی کی سی آب

دیکھ خورشید تجھ کو اے محبوب
عرق شرم میں گیا ہے ڈوب

آئی کنعاں سے بادِ مصر ولے
نہ گئی تا بکلبۂ یعقوب ؑ

بن عصا شیخ یک قدم نہ رکھے
راہ چلتا نہیں یہ خربے چوب

اس لئے عشق میں نے چھوڑا تھا
تو بھی کہنے لگا بُرا کیا خوب

پی ہوئے تو لہو پیا ہوں میں
محتسب آنکھوں پر ہے کچھ آشوب

میر شاعر بھی زور کوئی تھا
دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب

ردیف تا

روزانہ ملوں یار سے یا شب ہو ملاقات
کیا فکر کروں میں کہ کسو ڈھب ہو ملاقات

نے بخت کی یاری ہے نہ کچھ جذب ہے کامل
وہ آپھی ملے تو ملے پھر جب ہو ملاقات

دوری میں کروں نالہ و فریاد کہاں تک
اک بار تو اُس شوخ سے یارب ہو ملاقات

جاتی ہے غشی بھی کبھو آتے ہیں بخود بھی
کچھ لُطف اُٹھے بارے اگر اب ہو ملاقات

وحشت ہی بہت میر کو مل آئیے چل کر
کیا جانئے پھر یاں سے گئے کب ہو ملاقات

سب ہوئے نادم پئے تدبیر ہو جاناں سمیت
تیر تو نکلا مرے سینے سے لیکن جاں سمیت

تنگ ہو جاویگا عرصہ خفتگانِ خاک پر
گر ہمیں زیرِ زمیں سونپا دلِ نالاں سمیت

بلغ کر دکھلائیں گے دامانِ دشتِ حشر کو
ہم بھی وھاں آئے اگر مژگانِ خوں افشاں سمیت

قیس و فرہاد اور وامق عاقبت جی سے گئے
سب کو مارا عشق نے مجھ خانماں ویراں سمیت

اُٹھ گیا پردہ نصیحت گر کے لگ پڑنے سے میر
پھاڑ ڈالا میں گریباں رات کو داماں سمیت

پلکوں پہ تھے پارۂ جگر رات
ہم آنکھوں میں لے گئے بسر رات

اک دن تو وفا بھی کرتے وعدہ،
گزری ہے اُمیدوار ہر رات

مکھڑے سے اُٹھائیں اُن نے زُلفیں
جانا بھی نہ ہم گئی کدھر رات

تو پاس نہیں ہوا تو روتے
رہ رہ گئی ہے پہر پہر رات

کیا دن تھے کہ خون تھا جگر میں
رو اُٹھتے تھے بیٹھ دو پہر رات

دھاں تم تو بناتے ہی رہے زلف
عاشق کی بھی یاں گئی گزر رات

ساقی کے جو آنے کی خبر تھی
گزری ہمیں ساری بے خبر رات

کیا سوزِ جگر کہوں میں ہمدم
آیا جو سخن زبان پر رات

صحبت یہ رہی کہ شمع رو کی
لے شام سے تا دمِ سحر رات

کھلتی ہے جب آنکھ شب کو تجھ بن
کٹتی نہیں آتی پھر نظر رات

دن وصل کا یوں کٹا کہے تو
کاٹی ہے جدائی کی مگر رات

کل تھی شبِ وصل اک ادا پر
اس کی گئے ہوتے ہم تو مر رات

جاگے تھے ہمارے بختِ خفتہ
پہنچا تھا بہم وہ اپنے گھر رات

کرنے لگا پشتِ چشمِ نازک
سوتے سے اُٹھا جو چونک کر رات

تھی صبح جو منہ کو کھول دیتا
ہر چند کہ تب تھی اک پہر رات

پر زلفوں میں منہ چھپا کے پوچھا
اب ہووے گی میرؔ کس قدر رات

جینا ہی نہیں ہو جسے آزارِ محبت
مایوس ہوں میں بھی کہ ہوں بیمارِ محبت

چھٹتا

امکان نہیں جیتے جی ہو قید سے آزاد
مر جائے تبھی چھوٹے گرفتارِ محبت

تقصیر نہ خوباں کی نہ جلاد کا کچھ جرم
تھا دشمنِ جانی مرا اقرارِ محبت

ہر جنس کے خواہاں ملے بازارِ جہاں میں
لیکن نہ ملا کوئی خریدارِ محبت

اس راز کو رکھ جی ہی میں تا جی بچے تیرا
زنہار جو کرتا ہو تو اظہارِ محبت

ہر نقش قدم پر ترے سر بیچے ہیں عاشق
ٹک سیر تو کر آج تو بازارِ محبت

کچھ مست ہیں ہم دیدۂ پُر خون جگر سے
آیا ہی ہے ساغرِ سرشارِ محبت

بیکار نہ رہ عشق میں تو رونے سے ہرگز
یہ گریہ ہی ہے آبِ رُخِ کارِ محبت

مجھ سا ہی ہو مجنوں بھی یہ کب مانے ہے عاقل
ہر سر نہیں اے میرؔ سزاوارِ محبت

جی میں ہے یادِ رخ و زلفِ سیہ فام بہت
رونا آتا ہے مجھے ہر سحر و شام بہت

دستِ صیاد تلک بھی نہ میں پہنچا جیتا
بیقراری نے لیا مجھ کو تہِ دام بہت

ایک دو چشمک ادھر گردشِ ساغر کہ مدام ۔ سر چڑھی رہتی ہے یہ گردشِ ایام بہت

دل خراشی و جگر چاکی و خون افشانی ۔ ہوں تو ناکام پہ رہتے ہیں مجھے کام بہت

پھر نہ آئے جو ہوئے خاک میں جا آسودہ
غالباً زیرِ زمیں میرؔ ہے آرام بہت

کیا کہیں اپنی اُس کی شب کی بات ۔ کہیے ہووے جو کچھ بھی ڈھب کی بات

اب تو چپ لگ گئی ہے حیرت سے ۔ پھر کھلے گی زبان جب کی بات

نکتہ دانانِ رفتہ کی نہ کہو ۔ بات وہ ہے جو ہووے اب کی بات

کس کا روئے سخن نہیں ہے اُدھر ۔ ہے نظر میں ہمارے سب کی بات

ظلم ہے قہر ہے قیامت ہے ۔ غصے میں اُس کے زیرِ لب کی بات

کہتے ہیں آگے تھا بتوں میں رحم ۔ ہے خدا جانیے یہ کب کی بات

گو کہ آتش زباں تھے آگے میرؔ[1]
اب کی کہیے گئی وہ تب کی بات

ہر سحر دم کروں ہوں الحاح یا انابت ۔ تو بھی مری دُعا سے ملتی نہیں اجابت

مت لے حساب طاقت اے ضعف مجھ سے ظالم ۔ لائق نہیں ہے تیرے یہ کونسی ہے بابت

کیا کیا[2] لکھا ہے میں نے وہ میرؔ کیا کہے گا
گم ہووے نامہ بر سے یارب مری کتابت

ردیف تائے ہندی

نہ پایا دل ہوا روزِ سیہ سے جس کا جالٹ پٹ ۔ کسو کی زلف ڈھونڈی ہو بہو کا کل کو سب لٹ لٹ

تو کن نیندوں پڑا سوتا تھا دروازہ کو موندے شب ۔ میں چوکھٹ پر تری کرتا رہا سر کو پٹک کھٹ کھٹ

چٹیں[3] لگتی ہیں دل پر بلبلوں کے باغباں تو جو ۔ چمن میں توڑتا ہے ہر سحر کلیوں کے تئیں چٹ چٹ

ترے ہجراں کی بیماری میں میرؔ ناتواں کو شب
ہوا ہے خواب سونا آہ اس کروٹ سے اُس کروٹ

[1] مرزا غالبؔ نے سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی ؛ یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے۔
[2] خط لکھ کے اور بھی میں پڑا پیچ و تاب میں ؛ کیا جانے لکھ دیا اُسے کیا اضطراب میں (ذوق) [3] چُٹیں یعنی چوٹیں بتخفیف واو اب متروک ہے۔

ردیف جیم

آئے ہیں میر منھ کو بنائے جفاسے آج / شاید بگڑ گئی ہے کچھ اُس بیوفا سے آج

واشد ہوئی نہ دل کو فقیروں کے بھی ملے / کھلتی نہیں گرہ یہ کسو کی دعا سے آج

جینے میں اختیار نہیں ورنہ ہمنشیں / ہم چاہتے ہیں موت تو اپنی خدا سے آج

ساقی ٹک ایک موسمِ گل کی طرف بھی دیکھ / ٹپکا پڑے ہے رنگ چمن میں ہوا سے آج

تھا جی میں اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے میر / پر کچھ کہا گیا نہ غمِ دل حیا سے آج

ردیف جیم فارسی

کاش اُٹھیں ہم بھی گنہگاروں کے بیچ / ہوں جو رحمت کے سزاواروں کے بیچ

جی سدا ان ابروؤں ہی میں رہا / کی بسر ہم عمر تلواروں کے بیچ

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر / منھ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

ہیں عناصر کی یہ صورت بازیاں / شعبدے کیا کیا ہیں ان چاروں کے بیچ

جب سے لے نکلا ہے تو یہ جنسِ حسن / پڑ گئی ہے دھوم بازاروں کے بیچ

عاشقی و بیکسی و رفتگی / جی رہا کب ایسے آزاروں کے بیچ

جو سرشک اُس ماہ بن جھمکے ہے شب / وہ چمک کاہے کو ہے تاروں کے بیچ

اُس کے آتشناک رخساروں بغیر / لوٹیے یوں کب تک انگاروں کے بیچ

بیٹھنا غیروں میں کب ہے ننگِ یار / پھول گل ہوتے ہی ہیں خاروں کے بیچ

یارو مت اُس کا فریبِ مہر کھاؤ / میر بھی تھے اُس کے ہی یاروں کے بیچ

فائدہ مصر میں یوسف رہے زندان کے بیچ / بھیجدے کیوں نہ زلیخا اُسے کنعان کے بیچ

تو نہ تھا مردنِ دشوار میں عاشق کی آہ / حسرتیں کتنی گرہ تھیں رمقِ جان کے بیچ

چشمِ بد دور کہ کچھ رنگ ہے اب گریہ پر / خون جھمکے ہے پڑا دیدۂ گریان کے بیچ

حال گلزارِ زمانہ کا ہے جیسے کہ شفق / رنگ کچھ اور ہی ہو جائے ہے اک آن کے بیچ

تاک کی چھاؤں میں جوں مست پڑی سوتی ہیں / اینڈتی ہیں نگہیں سایۂ مژگاں کے بیچ

جی لیا بوسۂ رخسارِ مخطط دے کر
عاقبت اُن نے ہمیں زہر دیا پان کے بیچ

دعویِ خوش دہنی اُس سے اسی مُنھ پر گل
سر تو ٹک ڈال کے دیکھ اپنے گریبان کے بیچ

کان رکھ رکھ کے بہت دردِ دلِ میرؔ کو تم
سنتے تو ہو پہ کہیں درد نہ ہو کان کے بیچ

کر نہ تاخیر تو اک شب کی ملاقات کے بیچ
دن نہ پھر جائیں گے عشاق کے اک رات کے بیچ

حرف زن مت ہو کسو سے تو کہ اے آفتِ شہر
جاتے رہتے ہیں ہزاروں کے سر اک بات کے بیچ

میری طاعت کو قبول آہ کہاں تک ہوگا
سبحہ اک ہاتھ میں ہے جام ہے اک ہات کے بیچ

سُرمگیں چشم پہ اُس شوخ کے زنہار نہ جا
ہے سیاہی مژہ میں وہ نگہ گھات کے بیچ

بیٹھیں ہم اُس کے سگِ کو کے برابر کیونکر
کرتے ہیں ایسی معیشت تو مساوات کے بیچ

قطعہ

تابِ طاقت کو تو رخصت ہوئے مدت گزری
پند گو یوں ہی نکر اب خلل اوقات کے بیچ

زندگی کسکے بھروسے پہ محبت میں کروں
ایک دل غمزدہ ہے سو بھی ہے آفات کے بیچ

بے مے و مغبچہ اک دم نہ رہا تھا کہ رہا
اب تلک میرؔ کا تکیہ ہے خرابات کے بیچ

ساتھ ہو اک بیکسی کے عالمِ ہستی کے بیچ
باز خواہِ خوں ہے میرا گو اسی بستی کے بیچ

عرش پر ہے ہم نمد پوشانِ اُلفت کا دماغ
اوج دولت کا سا ہے یہاں فقر کی پستی کے بیچ

ہم سیہ کاروں کا ہنسنا دہ ہی میخانے کی اور
آ گئے ہیں میرؔ مسجد میں چلے مستی کے بیچ

ردیف حائے حطی

ہونے لگا گدازِ غمِ یار بے طرح
رہنے لگا ہے دل کو اب آزار بے طرح

اب کچھ طرح نہیں ہے کہ ہم غم زدے ہوں شاد
کہنے لگا ہے منھ سے ستمگار بے طرح

جاں بر تمھارے ہاتھ سے ہوگا نہ اب کوئی
رکھنے لگے ہو ہاتھ میں تلوار بے طرح

فتنہ اُٹھیگا ورنہ نکل گھر سے تو شتاب
بیٹھے ہیں آ کے طالبِ دیدار بے طرح

لوہو میں شور بور ہے دامان و جیبِ میرؔ
بپھرا ہے آج دیدۂ خونبار بے طرح

؎ موافق اصل ۱۲

خاطر کرے ہی جمع وہ ہر بار ایک طرح
کرتا ہے چرخ مجھ سے نئے یار ایک طرح

میں اور قیس و کوہ کن اب جو زباں پہ ہیں
مارے گئے ہیں سب یہ گنہگار ایک طرح

منظور اس کو پردے میں ہیں بے حجابیاں
کس سے ہوا دچار وہ عیار ایک طرح

سب طرحیں اس کی اپنی نظر میں تھیں کیا کہیں
پر ہم بھی ہو گئے ہیں گرفتار ایک طرح

گھر اس کے جا کے آتے ہیں پامال ہو گئے ہم
کریئے مکاں ہی اب سر بازار ایک طرح

قطعہ

گہ گل ہی گاہ رنگ گہے باغ کی ہے بو
آتا نہیں نظر وہ طرح دار ایک طرح

نیرنگ حسن دوست سے کر آنکھیں آشنا
ممکن نہیں وگرنہ ہو دیدار ایک طرح

ہر طرح تو ذلیل ہی رکھتا ہے میر کو
ہوتا ہے عاشقی میں کوئی خوار ایک طرح

ردیف دال مہملہ

کیا ہی یہ جو گاہے آجاتی ہی آندھی کوئی زرد
یا بگولا جو کوئی سر کھینچے ہے صحرا نورد

شوق میں یہ محمل لیلیٰ کے ہو کر بیقرار
اک نہاد وادی مجنوں سے اٹھ چلتی ہی گرد

وجہ دم سردی نہیں میں جانثار ہونے کے بعد
مینہ برسا ہی کہیں شاید ہوا آتی ہی سرد

باز رکھا باطن پیر مغاں نے شیخ کو
مل گیا اس پیر زن کو غیب سے اک پیر مرد

ایک شب پہلو کیا تھا گرم ان نے تیرے ساتھ
رات کو رہتا ہی اکثر میر کے پہلو میں درد

آوے گی میری قبر سے آواز میرے بعد
ابھریں گے عشق دل سے ترے راز میرے بعد

جینا مرا تو تجھ کو غنیمت ہے ناسمجھ
کھینچے گا کون پھر یہ ترے ناز میرے بعد

شمع مزار اور یہ سوز جگر مرا
ہر شب کریں گے زندگی ناساز میرے بعد

حسرت ہی اس کے دیکھنے کی دل میں بے قیاس
اغلب کہ میری آنکھیں رہیں باز میرے بعد

کرتا ہوں میں جو نالے سرانجام باغ میں
منہ دیکھو پھر کریں گے ہم آواز میرے بعد

بن گل موا ہی میں تو پہ تو جا کے لوٹیو
صحن چمن میں اسے پر پرواز میرے بعد

بیٹھا ہوں میر مرنے کو اپنے میں مستعد
پیدا نہ ہوں گے مجھ سے بھی جانباز میرے بعد

نہ پڑھا خط کو یا پڑھا قاصد
آخر کار کیا کہا قاصد

کوئی پہنچا نہ خط مرا اُس تک
میرے طالع ہیں نارسا قاصد

سرنوشتِ زبوں سے زیرِ خاک
راہ کھولی نہ کر تو جا قاصد

گر پڑا خط تو تجھ پہ حرف نہیں
یہ بھی میرا ہی تھا لکھا قاصد

یہ تو رونا ہمیشہ ہے مجھ کو
پھر کبھو پھر کبھو بھلا قاصد

اب غرض خامشی ہی بہتر ہے
کیا کہوں تجھ سے ماجرا قاصد

شب کتابت کے وقت گریہ میں
جو لکھا تھا سو بہ گیا قاصد

کہنہ قصہ لکھا کروں تا کے
بھیجا کب تک کروں نیا قاصد

ہے طلسمات اُس کا کوچہ تو
جو گیا سو وہیں رہا قاصد

باد پر ہے برات جس کا جواب
اُس کو گزرے ہیں سالہا قاصد

نامۂ میر کو اُڑاتا ہے
کاغذِ باد کر گیا قاصد

ہوں رہگزر میں تیرے ہر نقشِ پا ہے شاہد
اُڑتی ہے خاک میری بادِ صبا ہے شاہد

طوفِ حرم میں بھی میں بھولا نہ تجھ کو اے بت
آتا تھا یاد تو ہی میرا خدا ہے شاہد

شرمندۂ اثر کچھ باطن مرا نہیں ہے
وقتِ سحر ہے شاہد دستِ دعا ہے شاہد

نالے میں اپنے پنہاں میں بھی ہوں ساتھ تیرے
شاہد ہے گردِ محمل، شورِ درا ہے شاہد

ایذا ہجر میر پر جو وہ تو کھول ہی گا میں
بارے یہ کہہ کہ تیری خاطر میں کیا ہے شاہد

اے گلِ نو دمیدہ کے مانند
ہے تو کس آفریدہ کے مانند

ہم امیدِ وفا پہ تیری ہوئے
غنچۂ دیر چیدہ کے مانند

خاک کو میری سیر کرکے پھرا
وہ غزالِ رمیدہ کے مانند

سر اُٹھاتے ہی ہو گئے پامال
سبزۂ نو دمیدہ کے مانند

نہ کٹے رات ہجر کی جو نہ ہو
نالہ تیغِ کشیدہ کے مانند

ہم گرفتارِ حال ہیں اپنے
طائرِ پر بریدہ کے مانند

دل تڑپتا ہے اشکِ خونیں میں
صیدِ در خوں طپیدہ کے مانند

تجھ سے یوسف کو کیونکہ نسبت دیں
تب شنیدہ ہو دیدہ کے مانند

میر صاحب بھی انکے ہاں تھے لیک
بندۂ زر خریدہ کے مانند

قفس تو یھاں سے گئے پر مدام ہے صیاد
چمن کی صبح کوئی دم کو شام ہے صیاد

بہت ہیں ہاتھ ہی تیرے نگر قفس کی فکر
مرا تو کام انھیں میں تمام ہے صیاد

چمن میں ہیں نہیں ایسا پھنسا کہ یوں چھوڑوں
مجھے تو ہر رگِ گل تارِ دام ہے صیاد

یہی گلوں کو تنک دیکھوں اتنی مہلت ہو
چمن میں اور تو کیا مجھ کو کام ہے صیاد

ابھی کہ وحشی ہی اس کشمکش کے بیچ ہی میر
خدا ہی اس کا ہے جو تیرا رام ہے صیاد

میرے سنگِ مزار پر فرہاد[1]
رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد

ہم سے بن مرگ کیا جدا ہو ملال
جان کے ساتھ ہے دلِ ناشاد

موند آنکھیں سفر عدم کا کر
بس ہے دیکھا نہ عالمِ ایجاد

فکرِ تعمیر میں نہ رہ منعم
زندگانی کی کچھ بھی ہے بنیاد

خاک بھی سر پہ ڈالنے کو نہیں
کس خرابے میں ہم ہوئے آباد

سنتے ہو ٹک سنو کہ پھر مجھ بعد
نہ سنوگے یہ نالہ و فریاد

لگتی ہے کچھ سموم سی تو نسیم
خاک کس دل جلے کی کی برباد

بھولا جائے ہے غمِ بتاں میں جی
غرض آتا ہے پھر خدا ہی یاد

تیرے قیدِ قفس کا کیا شکوہ
نالے اپنے سے اپنی ہے فریاد

ہر طرف ہیں اسیر ہم آواز
باغ ہے گھر ترا تو اے صیاد

ہم کو مرنا یہ ہے کہ کب ہوں کہیں
اپنی قیدِ حیات سے آزاد

ایسا وہ شوخ ہے کہ اٹھتی صبح
جانا سو جائے اسکی ہے معتاد

نہیں صورت پذیر نقش اس کا
یوں ہی تصدیع کھینچے ہے بہزاد

[1] فرہاد ۔ یا کوہ کن ایک سنگتراش کا نام جو شیریں معشوقۂ خسرو کا عاشق تھا ۔ جس نے شیریں کے لئے ایک نہر دودھ لانے کی پہاڑ میں کھود دی تھی اور خسرو پرویز نے فریب دیکر اس کو ہلاک کرا دیا ۔ اس کے قصّے کو شیریں خسرو نظامی وغیرہ میں بیان کیا ہے ۔ ۱۲ آسی [2] میر صاحب بھی اس کی بزم میں تھے ؛ جیسے کوئی فقیر ہوتا ہے ۔

قطعہ

خوب ہے خاک سے بزرگوں کی چاہنا تو مرے تئیں امداد
پر مروت کہاں کی ہے ای میرؔ تو ہی مجھ دل جلے کو کر ارشاد

نامرادی ہو جس پہ پروانہ
وہ جلاتا پھرے چراغِ مُراد

ردیف رائے مہملہ

اُودھر تلک ہی چرخ کے مشکل ہے ٹک گزر اے آہ پھر اثر تو ہے برچھی کی چوٹ پر[1]
دھڑکا تھا دل طپیدنِ شب سے سو آج صبح دیکھا وہی کہ آنسوؤں میں چو پڑا جگر[2]
ہم تو اسیرِ کنجِ قفس ہو کے مر چلے ای اشتیاقِ سیرِ چمن تیری کیا خبر
مت عیب کر جو ڈھونڈوں میں اُسکو کہ مدعی یہ جی بھی یوں ہی جائیگا رہتا ہے تو کدھر
آئی ہی بوجھیو تو بلا اپنے سر صبا وے مشکفام زلفیں پریشاں ہوئیں اگر[3]
جاتی نہیں ہے دل سے تری یادِ زلفِ رُو روتے ہی مجھ کو گزرے ہے کیا شام کیا سحر
کیا جانوں کس کے تئیں لبِ خنداں کہے ہے خلق میں نے جو آنکھیں کھول کے دیکھیں سو چشمِ تر
ای سیل ٹک سنبھل کے قدم با دیے ہیں رکھ ہر سمت کو ہے تشنہ لبی کا مری خطر

کرتا ہے کون منع کہ سج اپنی تو نہ دیکھ
لیکن کبھی تو میرؔ کے کر حال پر نظر

غیروں سے وے اشارے ہم سے چھپا چھپا کر پھر دیکھنا ادھر کو آنکھیں ملا ملا کر
ہر گام سدرہ تھی بتخانے کی محبت کعبے تلک تو پہنچے لیکن خدا خدا کر
نخچیر گہ میں تجھ سے جو نیم کشتہ چھوٹا حسرت نے اُس کو مارا آخر لٹا لٹا کر
اک لطف کی نگہ بھی ہم نے نہ چاہی اُن سے رکھا ہمیں تو اُن نے آنکھیں دکھا دکھا کر
ناصح مرے جنوں سے آگہ نہ تھا کہ ناحق گو در کیا گریباں سارا سلا سلا کر
اک رنگ یاں ہی اسکا خون کی جا ہے جی بھی پھبتا ہے اُس کو کرنا باتیں چبا چبا کر
جوں شمعِ صبحگاہی اکبار بجھ گئے ہم اُس شعلہ خو نے ہم کو مارا جلا جلا کر

[1] یعنی پھر اثر یقینی ہے
[2] چو پڑا۔ یعنی ٹپک پڑا۔ چونا بمعنی ٹپکنا۔ [3] ہم نکالینگے سن اے موجِ صبا بل تیرا + اسکی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہونگے (مومن)

س حرف ناشنو سے صحبت بگڑ ہی جاوے ۔ ہر چند لاتے ہیں ہم باتیں بنا بنا کر

میں منع میر تجھ کو کرتا نہ تھا ہمیشہ
کھوئی نہ جان تو نے دل کو لگا لگا کر

نہ ہو ہرزہ درا اتنا خموشی اے جرس بہتر ۔ نہیں اس قافلے میں اہل دل ضبط نفس بہتر
نہونا ہی بھلا تھا سامنے اُس چشم گریاں کے ۔ نظر ای ابر تر آ بھی نہ آوے گا برس بہتر
سدا ہو خار خار باغباں گل کا جہاں مانع ۔ سمجھ ای عندلیب اُس باغ سے کنج قفس بہتر
برا ہے امتحاں لیکن نہ سمجھے تو تو کیا کریے ۔ شہادت گاہ میں بسمل سب اپنے بلہوس بہتر
سیہ کردوں گا گلشن دودِ دل سے باغباں میں بھی ۔ جلا آتش میں میرے آشیاں کے خار و خس بہتر
کیا داغوں سے رشکِ باغ ای صد آفریں الفت ۔ یہ سینہ ہم کو بھی ایسا ہی تھا درکار بس بہتر
قدم تیرے چھوے تھے جن نے اب وہ ہاتھ ہی سر سے ۔ مرے حق میں نہونا ہی تھا یہاں تک دسترس بہتر

عبث پوچھے ہی مجھ سے میر میں صحرا کو جاتا ہوں
خرابی ہی یہ دل رکھا ہی جو تو نے تو بس بہتر

دیکھوں میں اپنی آنکھوں سے آوے مجھے قرار ۔ اے انتظار تجھ کو کسی کا ہو انتظار
ساقی تو ایکبار تو توبہ مری تڑا ۔ توبہ کروں جو پھر تو ہے توبہ ہزار بار
کیا زمزمہ کروں ہوں خوشی تجھ سے ہمصفیر ۔ آیا جو میں چمن میں تو جاتی رہی بہار
کس ڈھب سے راہِ عشق چلوں ہی یہ ڈر مجھے ۔ پھوٹیں کہیں نہ آبلے ٹوٹیں کہیں نہ خار
کوچے کی اُس کے راہ نہ بتلائی بعد مرگ ۔ دل میں صبا رکھے تھی مری خاک سے غبار
اے پائے خم کی گردش ساغر ہو دستگیر ۔ مر ہوں دردِ سر ہو کہاں تک مرا خمار

وسعت جہاں کی چھوڑ جو آرام چاہے میر
آسودگی رکھے ہی بہت گوشۂ مزار

یہ عشق بے اجل کش ہی بس اے دل اب توکل کر ۔ اگرچہ جان جاتی ہی چلی لیکن تغافل کر
سفر ہستی کا مت کر سرسری جوں باد اے رہرو ۔ یہ سب خاک آدمی تھے ہر قدم پر ٹک تامل کر
سن اے بیدرد گلچیں غارتِ گلشن مبارک ہے ۔ پہ ٹک گوشِ مروت جانبِ فریادِ بلبل کر
یہ وعدہ تیرے آنے کا نہ کچھ امید طالع سے ۔ دلِ بیتاب کو کس منھ سے کہیے ٹک تحمل کر
یہ کیا جانوں کہ کیوں رونے لگا ہنسنے سی ہکر میں ۔ مگر یہ جانتا ہوں سینہ بھر آتا ہی پھر کھل کر

مرے پاس اُس کی خاکِ پائے بیماری میں رکھا تھا — نہ آیا سر مرا بالیں پہ اودھر جو گیا ڈھل کر
تجلی جلوہ ہیں کچھ بام و دَر غم خانہ کے میرے — وہ رشکِ ماہ آیا ہمنشیں لبِ بام نکل کر
تری خاموشی سے قمری ہوا شورِ جنوں رسوا — ہلاکِ طوقِ گردن کو بھی ظالم باغ میں غل کر

گدازِ عاشقی کا میرؔ کے شب ذکر آیا تھا
جو دیکھا شمعِ مجلس کو تو پانی ہو گئی گھل کر

کر رحم ٹک کب تک ستم مجھ پر جفاکار اس قدر — یک سینہ خنجر سیکڑوں اک جان و آزار اس قدر
بھاگے مری صورت سے وہ عاشق میں اُسکی شکل پر[لہ] — میں اُس کا خواہاں یہاں تلک وہ مجھ سے بیزار اس قدر
منزل پہنچنا اک طرف نے صبر ہے نے ہے سکوں — یکسر قدم میں آبلے پھر راہِ پُر خار اس قدر
ہے جائے ہر دل میں ترے آ در گزر کر بے وفا — کر رحم ٹک اپنے اُپر مت ہو دل آزار اس قدر
جز کشمکش ہووے تو کیا عالم سے ہم کو فائدہ — یہ بے فضا ہے اک قفس ہم ہیں گرفتار اس قدر
قطعہ
غیر اور بغل گیری تری عید اور ہم سے بھاگنا — ہم یار ہوں یوں غمزدے خوش ہوئیں اغیار اس قدر

طاقت نہیں ہے بات کی کہتا تھا نعرہ مار لے
کیا جانتا تھا میرؔ ہو جاوے گا بیمار اس قدر

قیامت تھا سماں اُس خشمگیں پر — کہ تلواریں چلیں ابرو کی چیں پر
نہ دیکھا آخر اُس آئینہ رو کو — نظر ہے کر بھی نگاہِ واپسیں پر
گئے دن عجز و نالہ کے کہ اب ہے — دماغ نالہ چرخِ ہفتمیں پر
ہوا ہے ہاتھ گلدستہ ہمارا — کہ داغِ خون بہت ہے آستیں پر
قطعہ
خدا جانے کہ کیا خواہش ہے جی کو — نظر اپنی نہیں ہے مہر و کیں پر
پر افشانی قفس ہی کی بہت ہے — کہ پرواز چمن قابل نہیں پر
قطعہ
جگر میں اپنے باقی رو لے تو رولے — اگرچہ کچھ نہیں اے ہمنشیں پر
کبھو جو آنکھ سے چلتے ہیں آنسو — تو پھر جاتا ہے پانی سب زمیں پر

قدم دشتِ محبت میں نہ رکھ میرؔ
کہ سر جاتا ہے گام اوّلیں پر

لہ مرزا غالب دہلوی ؒ ؎ ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار ؛ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔

دل دماغ و جگر یہ سب اک بار — کام آئے فراق میں اے یار
کیوں لہ نہ ہو ضعف غالب اعضا پر — مر گئے ہیں قشون کے سردار
گل پژمردہ کا نہیں ممنون — ہم اسیروں کا گوشۂ دستار
مت نکل گھر سے ہم بھی راضی ہیں — دیکھ لیں گے کبھو سرِ بازار
سیکڑوں حرف ہیں گرہ دل میں — پر کہاں پائیے لبِ اظہار
سیر کر دشتِ عشق کا گلشن — غنچے ہو ہو رہے ہیں ہو ہو خار
روز محشر ہے رات ہجراں کی — ایسی ہم زندگی سے ہیں بیزار
بحثِ نالہ بھی کیجیو بلبل — پہلے پیدا تو کر لبِ گفتار
چاکِ دل پر ہیں چشمِ صد خوباں — کیا کروں یک انار و صد بیمار
شکر کر داغِ دل کا اے غافل — کس کو دیتے ہیں دیدۂ بیدار
گو غزل ہو گئی قصیدہ سی — عاشقوں کا ہے طولِ حرف شعار
ہر سحر لگ چلی تو ہے تو نسیم — اے سیہ مست ناز ٹک ہشیار
شانہ سانے ہزار نکلیں گے — جو گیا اُس کی زلف کا اک تار
واجب القتل اس قدر تو ہوں — قطعہ کہ مجھے دیکھ کر کہے ہے پکار
یہ تو آیا نہ سامنے میرے — لاؤ میری میاں سپر تلوار
آ زیارت کو قبرِ عاشق پر — قطعہ اک طرح کا ہے یہاں بھی جوشِ بہار
نکلے ہے میری خاک سے نرگس — یعنی اب تک ہے حسرتِ دیدار
میر صاحب زمانہ نازک ہے — قطعہ دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار
سہل سی زندگی پہ کام کے تئیں — اپنے اوپر نہ کیجیے دشوار
چار دن کا ہے مجہلہ یہ سب — سب سے رکھیے سلوک ہی ناچار
کوئی ایسا گناہ اور نہیں — یہ کہ کیجے ستم کسی پر بار
دھاں جہاں خاک کے برابر ہے — قطعہ قدرِ ہفت آسمان ظلم شعار
یہی درخواست یاں دل کی ہے — نہیں روزہ نماز کچھ درکار
در مسجد پہ حلقہ زن ہو تم — قطعہ کہ رہو بیٹھ خانۂ خمار

لہ یہ مصرع نکات الشعرا و تیر میں اس طرح لکھا ہے - ع "کیوں نہ ہو تیغ ضعف اعضا پر"

جی میں آوے سو کیجو پیارے — ایک ہونا نہ در پئے آزار

حاصلِ دو جہاں ہے اک حرف
ہو مری جان آگے تم مختار

لبوں پر ہے ہر لحظہ آہِ شرربار — جلا ہی پڑا ہے ہمارا تو گھربار
ہوئیں کس ستمدیدہ کے پاس یکجا — نگاہیں شرر ریز پلکیں جگربار
کبھو کوئی دیکھے اُسے سیر کیونکر — کہ ہے اُس تنِ نازک اوپر نظربار
حلاوت سے اپنی جو آگاہ ہو تو — چپک جائیں باہم دے لعلِ شکربار
سبک کر دیا دل کی بیطاقتی نے — سجانا تھا اس کی طرف ہم کو ہر بار
× گدھا سا لدا پھرتا ہے شیخ ہر سو — کہ جبّہ ہے اک بار و عمّامہ سربار
مرے نخلِ ماتم پہ ہے سنگ باراں — نہایت کو لایا عجب یہ شجربار
ہمیں بار اُس در پہ کثرت سے کیا ہو — لگا ہی رہے ہے سدا واں تو دربار
یہ آنکھیں گئیں ایسی ہو کر درافشاں — کہ دیکھے سے آیا ترا ابرِ گہربار
کب اس عمر میں آدمی شیخ ہوگا — کتابیں رکھیں ساتھ گو ایک خربار

جہاں میر رہنے کی جاگہ نہیں ہے
چلا چاہیے یہاں سے اسباب کر بار

غصے سے اُٹھ چلے ہو جو دامن کو جھاڑ کر — جاتے رہیں گے ہم بھی گریبان پھاڑ کر
دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے — پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اُجاڑ کر
یارب رہِ طلب میں کوئی کب تلک پھرے — تسکین دے کہ بیٹھ رہوں پاؤں گاڑ کر
منظور ہو نہ پاس ہمارا تو حیف ہے — آئے ہیں آج دُور سے ہم تجھ کو تاڑ کر
غالب کہ دیوے قوتِ دل اس ضعیف کو — تنکے کو جو دکھاوے ہے پل میں پہاڑ کر
نکلیں گے کام دل کے کچھ اب اہلِ ریش سے — کچھ ڈھیر کر چکے ہیں یہ آگے اُکھاڑ کر

اس فن کے پہلوانوں سے کشتی رہی ہے میر
بہتوں کو ہم نے زیر کیا ہے پچھاڑ کر

مرتے ہیں تیری نرگسِ بیمار دیکھ کر — جاتے ہیں جی سے کس قدر آزار دیکھ کر
افسوس وے کہ منتظر اک عمر تک رہے — پھر مر گئے ترے تئیں اک بار دیکھ کر

ناخواندہ خطِ شوق لگے چاک کرنے تو
قاصد تو کہیو ٹک کہ جفا کار دیکھکر

کوئی جو دم رہا ہی سو آنکھوں میں ہی بھر آب
کر لو ٹک ایک وعدۂ دیدار دیکھکر

دیکھیں جدھر وہ رشکِ پری پیشِ چشم ہی
حیران رہ گئے ہیں یہ اسرار دیکھکر

جاتا ہے آسماں لئے کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھکر

تیرے خرام ناز پہ جاتے ہیں جی چلے
رکھ ٹک قدم زمیں پہ ستمگار دیکھکر

طالع نے چشم پوشی کی یہاں تک کہ ہمنشیں
چھپتا ہی مجھ کو دور سے اب یار دیکھکر

جی میں تھا اُس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہیے میر
پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھکر

دیکھ اُس کو ہنستے سب کے دم سے گئے اُکھڑ کر
ٹھہری ہے آرسی بھی دانتوں زمیں پکڑ کر

کیا کیا نیاز طینت اے ناز پیشہ تجھ بن
مرتے ہیں خاک رہ سے گوڑے رگڑ رگڑ کر

قد کش چمن کے اپنی خوبی کو یہ چلے ہیں
پایا پھل اُس سے آخر کیا سرو نے اکڑ کر

وہ سر چڑھا ہی اتنا اپنی فروتنی سے
کھویا ہمیں نے اُس کو ہر لحظہ پاؤں پڑ کر

پائے ثبات بھی ہی نام آوری کو لازم
مشہور ہی نگیں جو بیٹھا ہی گھر میں گڑ کر

دوری میں دلبروں کی کٹتی ہی کیونکہ سب کی
آدھا نہیں رہا ہوں تجھ سے تو میں بچھڑ کر

اب کیسا زہد و تقوی دار دہی اور ہم ہیں
بنت العنب کے اپنا سب کچھ گیا گھسٹ کر

دیکھو نہ چشم کم سے معمورۂ جہاں کو
بنتا ہی ایک گھر یہاں سو صورتیں بگڑ کر

اُس پشت لب کے اوپر دانے عرق کے یوں ہیں
یاقوت سے رکھے ہیں جوں موتیوں کو جڑ کر

ناسازگاری اپنے طالع کی کیا کہیں ہم
آیا کبھو نہ یہاں ٹک غیروں سے یار لڑ کر

اپنے مزاج میں بھی ہی میر ضد نہایت
پھر مر کے ہی اُٹھیں گے بیٹھیں گے ہم جو اڑ کر

کہتا ہی کون تجھ کو یہاں یہ نہ کر تو وہ کر
پر ہو سکے جو پیارے دل میں بھی ٹک جگہ کر

وہ تنگ پوش اک دن دامن کشاں گیا تھا
رکھی ہیں جانمازیں اہل ورع نے تہ کر

کیا قصر دل کی تم سے ویرانی نقل کریے
ہو ہو گئے ہیں ٹیلے سارے مکان ڈھہ کر

ل میر صاحب ہی کا دوسرا شعر ہی ~ کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا ! یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا ۔
ایسا ہی میر صاحب کا ایک اور شعر ہی ~ کہتے تھے اُس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہیے لیک ! وہ آگیا تو سامنے اُس کے نہ آئی بات ۔

ہم اپنی آنکھیں کب تک یہ رنگِ عشق دیکھیں
آنے لگا ہی لوہو رخسار پر تو بہہ کر

رنگِ شکستہ اپنا بے لطف بھی نہیں ہی
یہاں کی تو صبح دیکھی اک آدھ رات رہ کر

برسوں عذاب دیکھے قرنوں تعب اٹھائے
یہ دل حزیں ہوا ہے کیا کیا جفائیں سہہ کر

ایکوں کی کھال کھینچی ایکوں کو دار کھینچا
اسرار عاشقی کا چھپتا ہے یار کہہ کر

طاعت کوئی کرے ہی جب ابر زور جھومے
گر ہو سکے تو زاہد اس وقت میں گنہ کر

کیوں تو نے آخر آخر اس وقت منہ دکھایا
دی جان میر نے جو حسرت سے اک نگہ کر

شیخی کا اب کمال ہے کچھ اور
حال ہے اور قال ہے کچھ اور

وعدے برسوں کے کن نے دیکھے ہیں
دم میں عاشق کا حال ہے کچھ اور

سہل مت بوجھ یہ طلسمِ جہاں
ہر جگہ یاں خیال ہے کچھ اور

تو رگِ جاں سمجھتی ہوگی نسیم
اُس کے گیسو کا بال ہے کچھ اور

نہ ملیں گو کہ ہجر میں مر جائیں
عاشقوں کا وصال ہے کچھ اور

کوز پشتی پہ شیخ کی مت جاؤ
اُس پہ بھی احتمال ہے کچھ اور

اس میں اُس میں بڑا تفاوت ہے
کبک کی چال ڈھال ہے کچھ اور

میر تلوار چلتی ہی تو چلے
خوش خراموں کی چال ہی کچھ اور

دل جو اپنا ہوا تھا زخمی چور
ضبطِ گریہ سے پڑ گئے ناسور

صبح اُس سرد مہر کے آگے
قرصِ خورشید ہو گیا کافور

ہم ضعیفوں کو پائمال نہ کر
دولتِ حُسن پر نہ ہو مغرور

عرش پر بیٹھتا ہے کہتے ہیں
گر اُٹھے ہی غبار خاطرِ مور

شکوۂ آبلہ ابھی سے میر
ہے پیارے ہنوز دلی دُور

غیروں سے مل چلے تم مستِ شراب ہو کر
غیرت سے رہ گئے ہم یکسو کباب ہو کر

اُس روئے آتشیں سے برقع سرک گیا تھا
گل بہ گیا چمن میں خجلت سے آب ہو کر

کل رات مند گئیں تھیں بہتوں کی آنکھیں غش سے
دیکھا کیا نہ کر تو سر مستِ خواب ہو کر

پردہ[1] رہے گا کیونکر خورشیدِ خاوری کا
نکلے ہے صبح وہ بھی اب بے نقاب ہو کر

یک قطرہ آب میں نے اس دور میں پیا ہے
نکلا ہے چشمِ تر سے وہ خونِ ناب ہو کر

آبیٹھتا تھا صوفی ہر صبح میکدے میں
شکرِ خدا کہ نکلا واں سے خراب ہو کر

شرم و حیا کہاں تک ہیں میر کوئی دن کے
اب تو ملا کرو تم ٹک بے حجاب ہو کر

ہو آدمی اے چرخ ترکِ گردشِ ایام کر
خاطر سے ہی مجھ مست کی تائیدِ دورِ جام کر

دنیا ہے بے صرفہ نہ ہو رونے میں یا کڑھنے میں تو
نالہ کو ذکرِ صبح کر گریہ کو وردِ شام کر

مستِ جنوں رہ روز و شب تنہا ہو شہر و دشت میں
محبس میں اپنی نقلِ خوش زنجیر کا بادام کر

جتنی ہو ذلت خلق میں اتنی ہو عزت عشق میں
ناموس سے آ در گزر بے ننگ ہو کر نام کر

مر رہ کہیں بھی میر جا سرگشتہ پھرنا تا کجا
ظالم کسو کا سن کہا کوئی گھڑی آرام کر

رہنے کا پاس نہیں ایک بھی تار آخرکار
ہاتھ سے جائے گا سررشتۂ کار آخرکار

لوحِ تربت پہ مری پہلے یہ لکھیو کہ اسے
یار دشمن ہو گیا جان سے مار آخرکار

مشتِ خاک اپنی جو پامال ہے یاں اس پہ نہ جا
سر کو کھینچے گا فلک تک یہ غبار آخرکار

چشم وا دیکھئے اس باغ میں کیجو نرگس
آنکھوں سے جاتی رہے گی یہ بہار آخرکار

اول کارِ محبت تو بہت سہل ہے میر
جی سے جاتا ہے ولے صبر و قرار آخرکار

خط میں ہے کیا سماں پسینے پر
موتی گویا جڑے ہیں مینے پر

کوئی ہوتا ہے دل طپش سے برا
ایک دم کے لہو نہ پینے پر

دل سے میرے شکستیں الجھی ہیں
سنگ باراں ہے آبگینے پر

چاکِ سینہ سے کھل گئے ٹانکے
کیا رفو کم ہوا ہے سینے پر

جورِ دلبر سے کیا ہوں آزردہ
میر اس چار دن کے جینے پر

---

[1] پردہ رہنا۔ مراد عیب چھپا رہجانا۔ شرم رہجانا۔ بات رہجانا ۔ برق لکھنوی

نام عالم میں رہے بات خدایا رہ جائے + پردۂ خاک میں چھپ جاؤں تو پردہ رہ جائے

ہم بھی پھرتے ہیں یک حشم لیکر دستۂ داغ و فوجِ غم لیکر

دست کش نالہ پیش رو گریہ آہ چلتی ہے یہاں علم لیکر

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لیکر

اُس کے اوپر کہ دل سے تھا نزدیک غمِ دُوری چلے ہیں ہم لیکر

بارہا صید گہ سے اُس کے گئے داغِ یاس آہوئے حرم لیکر

ضعف یہاں تک کھنچا کہ صورت گر رہ گئے ہاتھ میں قلم لیکر

دل پہ کب اکتفا کرے ہے عشق جائیگا جان بھی یہ غم لیکر

شوق اگر ہے یہی تو اے قاصد ہم بھی آتے ہیں اب رقم لیکر

میر صاحب ہی چوکے اے بدعہد ورنہ دینا تھا دل قسم لیکر

داڑھی سفید شیخ کی تو مت نظر میں کر بگلا شکار ہووے تو لگتے ہیں ہاتھ پر

اے ابرِ خشک مغز سمندر کا منھ نہ دیکھ سیراب تیرے ہونے کو کافی ہے چشم تر

آخر عدم سے کچھ بھی نہ اکھڑا مرا میاں مجھ کو تھا دستِ غیب پکڑ لی تری کمر

سوتا تھا بے خبر تو نشے میں جو رات کو سو بار میر نے تری اٹھ اٹھ کے لی خبر

پشت پا ماری بسکہ دنیا پر زخم پر پڑ گیا مرے پا پر

ڈوبے اچھا ہے آفتاب ہنوز کہیں دیکھا تھا تجھکو دریا پر

گردمے ہوں آؤ شیخ شہر ابر جھوما ہی جا ہے صحرا پر

دلِ پُرخوں تو تھا گلابی شراب جی ہی اپنا چلا نہ صہبا پر

یہاں جہاں ہیں اک شہر کو آج رات پڑے ہیں چشم بینا پر

فرصتِ عیش اپنی یوں گزری کہ مصیبت پڑی تمنا پر

طارم تاک سے لہو ٹپکا سنگِ باراں ہوا ہے مینا پر

میر کیا بات اُس کے ہونٹھوں کی جینا دوبھر ہوا مسیحا پر

جھوٹے بھی پوچھتے نہیں تک حال آن کر انجان اتنے کیوں ہوئے جاتے ہو جان کر

وے لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے
پیدا کیے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر

جھمکے دکھا کے باعثِ ہنگامہ ہی رہے
پر گھر سے در پہ آئے نہ تم بات مان کر

کہتے نہ تھے کہ جان سے جاتے رہیں گے ہم
اچھا نہیں ہے آؤ نہ ہمیں امتحان کر

کم گو جو ہم ہوئے تو ستم کچھ نہ ہو گیا
اچھی نہیں یہ بات مت اتنی زبان کر

ہم وے ہیں جن کے خون سے تری راہ سب ہے گل
مت کر خراب ہم کو تو اوروں میں سان کر

تا کشتۂ وفا مجھے جانے تمام خلق
تربت پہ میری خون سے میرے نشان کر

ناز و عتاب و خشم کہاں تک اٹھائیے
یارب کبھو تو ہم پہ اسے مہربان کر

افسانے ما و من کے سنیں میر کب تلک
چل اب کہ سو رہیں منھ پہ دوپٹے کو تان کر

آزار دیکھے کیا کیا ان پلکوں سے اٹک کر
جی لے گئے یہ کانٹے دل میں کھٹک کھٹک کر

سرو و تدرو دونوں پھر آپ میں نہ آئے مٹک
گلزار میں چلا تھا وہ شوخ ٹک لٹک کر

کب آنکھ کھول دیکھا تیرے تئیں سرہانے
ناچار مر گئے ہم سر کو پٹک پٹک کر

حاصل بجز کدورت اس خاک داں سے کیا ہے
خوش وہ کہ اٹھ گئے ہیں داماں جھٹک جھٹک کر

یہ مشتِ خاک یعنی انسان ہی ہے روکش
ورنہ اٹھائی کن نے اس آسماں کی ٹکر

دل کام چاہتا ہو اب اس کے گیسوؤں سے
واں مر گئے ہیں کتنے برسوں اٹک اٹک کر

ٹک منھ سے اس کے دیشب برقع سرک گیا تھا
جاتی رہی نظر سے مہتاب سی چھٹک کر

دھولا چکے تھے مل کر کل لونڈے میکدے کے
پر سر گراں ہو واعظ جاتا رہا سٹک کر

کل رقصِ شیخ مطلق دل کو لگا نہ میرے
آیا وہ حیز شرعی کتنا مٹک مٹک کر

منزل کی میر اس کی کب راہ تجھ سے نکلی
یاں خضر سے ہزاروں مر مر گئے بھٹک کر

ردیف رائے ہندی

آشوب دیکھ چشم تری سرے ہیں جوڑ
پلکوں کی صف سے بیٹھ گئیں منھ کو موڑ موڑ

لاکھوں جتن کیے نہ ہوا ضبط گریہ لیک
سنتے ہی نام آنکھ سے آنسو گرے کروڑ

زخم دروں سے میرے نہ ٹک بے خبر رہو
اب ضبط گریہ سے ہے ادھر ہی کو سب نچوڑ

زبان کرنا - زبان چلانا

گرمی سے برشکال کی پروا ہی کیا ہمیں
برسوں رہی ہی جان کے رُکنے کی جاں مروڑ

بلبل کی اور چشمِ مروّت سے دیکھ ٹک
بیدردیوں چمن میں کسو پھول کو نہ توڑ

کچھ کوہکن ہی سے نہیں تازہ ہوا یہ کام
بہتیرے عاشقی میں ہوئے سر کو پھوڑ پھوڑ

بیطاقتی سے میر لگے چھوٹنے پران
ظالم خیال دیکھنے کا اُس کے اب تو چھوڑ

ردیف زائے معجمہ

ہوتا نہیں ہی باب اجابت کا وا ہنوز
بسمل پڑی ہے چرخ پہ میری دعا ہنوز

دن رات کو کھنچا ہے قیامت کا اور ہمیں
پھرتا ہوں منہ پہ خاک ملے جا بجا ہنوز

خط کاڑھ لاکے تم تو مُنڈا بھی چلے ولے
ہوتی نہیں ہماری تمھاری صفا ہنوز

غنچے چمن چمن کھلے اس باغ دہر میں
دل ہی مرا ہے جو نہیں ہوتا ہی وا ہنوز

احوال نامہ بر سے مرا اُن کے کہہ اُٹھا
جیتا ہے وہ ستمزدہ مہجور کیا ہنوز

غنچہ نہ بوجھ دل ہی کسی مجھ سے زار کا
کھلتا نہیں جو سعی سے تیری صبا ہنوز

توڑا تھا کس کا شیشۂ دل تو نے سنگدل
ہی دل خراش کوچے میں تیرے صدا ہنوز

چلو میں اُس کے میر لہو تھا سو پی چکا
اُڑتا نہیں ہی طائرِ رنگِ حنا ہنوز

بے بال و پر اسیر ہوں کنج قفس میں میر
جاتی نہیں ہی سر سے چمن کی ہوا ہنوز

ضبط کرتا نہیں کنارہ ہنوز
ہے گریبان پارہ پارہ ہنوز

آتشِ دل نہیں بجھی شاید
قطرۂ اشک ہی شرارہ ہنوز

اشک جھمکا ہی جب نہ نکلا تھا
چرخ پر صبح کا ستارہ ہنوز

لب پہ آئی ہی جان کب کی ہے
اُس کے موقوف یک اشارہ ہنوز

عمر گزری دوائیں کرتے میر
دردِ دل کا ہوا نہ چارہ ہنوز

مرگیا میں پہ مرے باقی ہیں آثار ہنوز
تر ہیں سب سر کے لہو سے در و دیوار ہنوز

دل بھی پُر داغ چمن ہی پر اُسے کیا کیجے
جی سے جاتی ہی نہیں حسرتِ دیدار ہنوز

بہہ گئے عمر ہوئی ابرِ بہاری کو دلے
لہو برسا رہے ہیں دیدۂ خونبار ہنوز

بد نہ لیجائیو پوچھوں ہوں تجھی سے یہ طبیب
یہ ہوا کوئی بھی اس درد کا بیمار ہنوز

بارہا چل چکی تلوار تری چال پہ شوخ
تو نہیں چھوڑتا اس طرز کی رفتار ہنوز

ایک دن بال فشاں ٹک ہوئے تھے خوش ہو کر
ہیں غمِ دل کی اسیری میں گرفتار ہنوز

کوئی تو آبلہ پا دشتِ جنوں سے گزرا
ڈوبا ہی جائے ہے لوہو میں سرِ خار ہنوز

منتظر قتل کے وعدے کا ہوں اپنے یعنی
جیتا مرنے کو رہا ہے یہ گنہگار ہنوز

اُڑ گئے خاک ہو کتنے ہی ترے کوچے سے
باز آتے نہیں پر تیرے ہوادار ہنوز

قطعہ

ایک بھی زخم کی جا جس کے نہ ہو تن پہ کہیں
کوئی دیتا ہے سنا دیسی کو آزار ہنوز

ٹک تو انصاف کر اے دشمنِ جانِ عاشق
میان سے نکلی پڑے ہے تری تلوار ہنوز

قطعہ

میر کو ضعف میں میں دیکھ کہا کچھ کئے
ہے تجھے کوئی گھڑی قوتِ گفتار ہنوز

ابھی اک دم میں زباں چلنے سے رہ جاتی ہے
دردِ دل کیوں نہیں کرتا ہے تو اظہار ہنوز

آنسو بھر لاکے بہت حزن سے یہ کہنے لگا
کیا کہوں تجھ کو سمجھ اس پہ نہیں یار ہنوز

آنکھوں میں آن رہا جی جو نکلتا ہی نہیں
دل میں میرے ہے گرہ حسرتِ دیدار ہنوز

مجھکو پوچھا بھی نہ یہ کون ہے غمناک ہنوز
ہو چکے حشر میں پھرتا ہوں جگر چاک ہنوز

اشک کی لغزشِ مستانہ پہ مت کیجو نظر
دامنِ دیدۂ گریاں ہے مرا پاک ہنوز

پھر نظر دیکھنے پاتا نہیں میں نزع میں بھی
منہ کے تئیں پھیرے ہی لیتا ہے وہ بیباک ہنوز

بعد مرنے کے بھی آرام نہیں میر مجھے
اُس کے کوچے میں ہے پامال مری خاک ہنوز

ہو چکا خونِ جگر رونا نہیں کچھ کم ہنوز
ہیں مژہ دستورِ سابق ہی پہ میرے نم ہنوز

دل جلوں پر روتے ہیں جن کو ہے کچھ سوزِ جگر
شمع بجھتی ہے ہماری گور پر ماتم ہنوز

وضع یکساں اس زمانے میں نہیں رہتی نہیں
قد ترا چوگاں رہا ہے کس طرح سے خم ہنوز

آ رہا ہے جی مرا آنکھوں میں اک پل دو رہو
پر نہیں جاتا کسی کے دیکھنے کا غم ہنوز

وہ جو عالم اُس کے اوپر تھا سو خط نے کھو دیا
مبتلا ہے اس بلا میں میر اک عالم ہنوز

ردیف سین مہملہ

ای ابرِ تر تو اور کسی سمت کو برس
اس ملک میں ہماری ہی یہ چشمِ تر ہی بس

حیراں تو دیکھ پھول بکھیرے تھی کل صبا
اک برگِ گل گرا نہ جہاں تھا مرا قفس

مژگاں بھی بہ گئیں مرے رونے سے چشم کی
سیلاب موج مارے تو ٹھہرے ہی کوئی خس

مجنوں کا دل ہوں محملِ لیلیٰ سے ہوں جدا
تنہا پھروں ہوں دشت میں جوں نالۂ جرس

ای گریہ اُس کے دل میں اثر خوب ہی کیا
روتا ہوں جب میں سامنے اسکے تو دے ہے ہنس

اُس کی زباں کے عہدے سے کیونکر نکل سکوں
کہتا ہوں ایک میں تو سُناتا ہے مجھکو دس

حیراں ہوں میرؔ نزع میں اب کیا کروں بھلا
احوالِ دل بہت ہی مجھے فرصتِ یک نفس

کیونکہ نکلا جائے بحرِ غم سے مجھ بے دل کے پاس
آ کے ڈوبی جاتی ہے کشتی مری ساحل کے پاس

ہی پریشاں دشت میں کس کا غبارِ ناتواں
گرد کچھ گستاخ آتی ہے چلی محمل کے پاس

گرم ہوگا حشر کو ہنگامۂ دعویٰ بہت
کاشکے مجھ کو نہ لے جاویں مرے قاتل کے پاس

دور اس سے جوں ہوا دل پر بلا ہے مضطرب
اس طرح تڑپا نہیں جاتا کسو بسمل کے پاس

بوئے خوں آتی ہی بادِ صبحگاہی سے مجھے
نکلی ہے بیدرد شاید ہو کسو گھائل کے پاس

آہ نالے مت کیا کر اس قدر بیتاب ہو
ای ستمکش میرؔ ظالم ہے جگر بھی دل کے پاس

مر گیا میں ملا نہ یار افسوس
آہ افسوس صد ہزار افسوس

ہم تو ملتے تھے جب اہا ہا ہا
نہ رہا وہ وہیں روزگار افسوس

یوں گنواتا ہے دل کوئی مجھ کو
یہی آتا ہے بار بار افسوس

قتل گر تو ہمیں کرے گا خوشی
یہ توقع تھی تجھ سے یار افسوس

رخصتِ سیرِ باغ تک نہ ہوئی
یوں ہی جاتی رہی بہار افسوس

خوب بدعہد تو نہ مل لیکن
میرے تیرے تھا یہ قرار افسوس

خاک پر میرؔ تیری ہوتا ولے
نہ ہوا اتنا اقتدار افسوس

ردیف شین معجمہ

ہر جزر و مد سے دست و بغل اُٹھتے ہیں خروش — کس کا ہے راز بحر میں یارب کہ یہ ہیں جوش
ابروئے کج ہے موج کوئی چشم ہے حباب — موتی کسی کی بات ہے سیپی کسی کا گوش
ان مغبچوں کے کوچے ہی سے میں کیا سلام — کیا مجھ کو طوفِ کعبے سے میں رندِ دُرد نوش
حیرت سے ہووے پرتوِ مہ نورِ آئینہ — تو چاندنی میں نکلے اگر ہو سفید پوش
کل ہم نے سیرِ باغ میں دل ہاتھ سے دیا — قطعہ — اک[۵۱] سادہ گل فروش کا آکر سبد بدوش
جاتا رہا نگاہ سے جوں موسمِ بہار — آج اس بغیر داغ جگر ہیں سیاہ پوش
شب اس دلِ گرفتہ کو وا کر بزورِ مے — قطعہ — بیٹھے تھے شیرہ[۵۲] خانہ میں ہم کتنے ہرزہ کوش
عبرت بھی ہے ضرور ٹک اے جمع تیز ہوش — آئی صدا کہ یاد کرو دورِ رفتہ کو
جمشید[۵۳] جس نے وضع کیا جام کیا ہوا — وے صحبتیں کہاں گئیں کیدھر وے ناؤ نوش
جز لالہ اُس کے جام سے پاتے نہیں نشاں — ہے کوکنار اُس کی جگہ اب سبو بدوش

۵۱ اک سادہ گلفروش کا یعنی گلفروش کا ایک سادہ رو لڑکا ۔ ۵۲ شیرہ خانہ شراب خانہ ۔

۵۳ جمشید۔ جم۔ جمشاسپ۔ جمشیدون۔ یہ سب ایک معنی میں آتے ہیں اور ان سب سے مُراد شاہ جمشید بن ونیکان بن تہمورس بن ایران بن ہوشنگ بن آدم ہے۔ تواریخ قدیم کی روایات کی رو سے جب اس نے سات سو سولہ سال تمام ایران پر حکومت کی یہاں تک کہ ضحاک برادر شداد بن عاد علوانی نے جو صابئین کے آئین کا پیرو اور مخالف مذہب مروجہ تھا خروج کیا ۔ اور جمشید پر غالب ہوا۔ جمشید سیستان کی طرف بھاگ گیا۔ اور کورنگ شاہ کی دختر کو اپنے عقد میں لا کر رہنے لگا۔ اجداد رستم اُسی کی اولاد سے ہیں۔ اس کے بعد ضحاک کے ہاتھ سے مارا گیا۔ نہایت عادل، نیکدل، موحد، بادشاہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شہروں کی آبادی کے طریقے۔ آداب حرب۔ سلاح وغیرہ کا وہ موجد تھا اور ہبوطِ آدم کے دو ہزار چار سو انتیس سال بعد اس کی حکومت کا زمانہ تھا۔ ترکیب شراب بھی اُسی کے زمانے میں دریافت ہوئی۔ واضح ہو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی جم کہا جاتا ہے مگر آپ کا زمانہ جمشید سے دو ہزار اور کچھ سال بعد کا ہے لہٰذا جہاں کہیں دیو و دد اور خاتم وغیرہ کے ساتھ جم کا لفظ آئے وہاں حضرت سلیمان علیہ السلام سے مُراد ہوگی اور جم سے بعض جگہ سکندر بھی مُراد ہے۔ جامِ جم سے مراد یہ ہے کہ زمانۂ جمشید میں جام ایجاد ہوا۔ اور جامِ گیتی نما دوسری چیز تھا کہ اس کو ریاضی اور ہیئت کی رُو سے خطوط وغیرہ کھینچ کر تیار کیا گیا تھا۔ جس سے احوالِ عالم معلوم ہوتا تھا۔ ۱۲۔ آسی (مستفاد از کتب تواریخ و لغت)

جھومے ہے بید جائے جوانانِ مے گسار | بالائے خم ہے خشت سر پیر مے فروش

میر اس غزل کو خوب کہا تھا ضمیر[1] نے
پر اے زباں دراز بہت ہو چکی خموش

دل تو افگار ہے جگر ہے ریش | اک مصیبت ہے میرے تئیں درپیش
پان تو لیتا جا فقیروں کے | برگ سبز ست تحفۂ درویش

فکر کر زادِ آخرت کا بھی
میر اگر تو ہے عاقبت اندیش

ردیف صاد مہملہ

شیخ ہو دشمن زنِ رقاص | کیوں نہ القاص[2] لا یحب القاص

ردیف ضاد معجمہ

سال میں ابر بہاری تجھ سے اکباری ہے فیض | چشمِ نم دیدہ سے عاشق کی سدا جاری ہے فیض

ردیف طائے مہملہ

سب سے آئینہ نمط رکھتے ہیں خوباں اختلاط | ہوتے ہیں یہ لوگ بھی کتنے پریشاں اختلاط
تنگ آیا ہوں میں رشکِ تنگ پوشی سے تری | اس تنِ نازک سے یہ جامے کو چسپاں اختلاط

ردیف ظائے معجمہ

غیر مجھ کو جو کہتے ہیں محظوظ | تجھ سے ملتے ہیں رہتے ہیں محظوظ

[1] ضمیر سے مراد شیخ مداری ہیں جن کا تخلص ضمیر تھا۔ اکبر آباد کے رہنے والے تھے اپنا ابتدائی کلام ولی محمد نظیر اکبر آبادی کو دکھایا بعدازاں میر محمدی بیدار کے شاگرد ہوئے میر کے معاصرین میں تھے یہ دو شعر انھیں کے ہیں ؎

چشم بد دور جدھر آپ گزر کیجئے گا ٭ ایک عالم کے تئیں زیر و زبر کیجئے گا
وہ ابھی تو تو گل آرزو، وہ ہنوز تازہ بہار ہے ٭ نہ کچھ اپنے ہی سے اُسے خبر نہ حنا سے کچھ سروکار ہے

[2] قصہ گو، قصہ گو کو دوست نہیں رکھتا۔

ردیف عین مہملہ

سب پہ روشن ہے کہ شب مجلس میں جب آئی ہو شمع
اس بھبوکے سے کو بیٹھا دیکھ جلجاتی ہے شمع

ردیف غین معجمہ

ہم اور تیری گلی سے سفر دروغ دروغ
کہاں دماغ ہمیں اس قدر دروغ دروغ

تم اور ہم سے محبت تمہیں خلاف خلاف
ہم اور اُلفتِ خوبِ دگر دروغ دروغ

غلط غلط کہ رہیں تم سے ہم تنک غافل
تم اور پوچھو ہماری خبر دروغ دروغ

فروغ کچھ نہیں دعوی کو صبح صادق کے
شب فراق کو کب ہے سحر دروغ دروغ

کسو کے کہنے سے مت بدگماں ہو میر سے تو
وہ اور اُس کو کسو پر نظر دروغ دروغ

شیخ سچ خوب ہے بہشت کا باغ
جائیں گے گر و نا کرے گا دماغ

ردیف فا

آجکل کاہے کو بتلاتے ہو گستاخی معاف
راستی یہ ہے کہ وعدے ہیں تمہارے سب خلاف

آہ برچھی سی لگی تھی تیرے بن دل کی طپش
ہجر کی شب مجھ پہ گزری غیرتِ روزِ مصاف

ایک دن میں نے لکھا تھا اُس کو اپنا دردِ دل
آج تک جاتا نہیں سینے سے خامے کے شگاف

پانوں پر سے اپنے میرا سر اُٹھانے مت جھکو
تیغ باندھی ہے میاں تم نے کمر میں خوش غلاف

صف اُلٹ جا عاشقوں کی گر ترے ابرو ہلیں
ایک دم تلوار کے چلنے میں ہو وے ملک صاف

شیخ مت روکش ہو مستوں کا تو اس بجتے اُپر
لینے استنجے کو ڈھیلا تیری ٹل جاتی ہے ناف

عشق کے بازار میں سودا نہ کیجو تو تو میر
سر کو جب واں بیچ چکتے ہیں تو یہ ہے دست لاف

غالب ہے تیرے عہد میں بیداد کی طرف
ہر خون گرفتہ جائے ہے جلاد کی طرف

کن نے لیا ہے تم سے مچلکہ کہ داد دو
ٹک کان ہی رکھا کرو فریاد کی طرف

ہر تارِ زلف قیمتِ صد فردوس ہے ترا
کرتا ہے کون طرہ شمشاد کی طرف

لہ آجکل تبلانا - وعدہ خلافی کرنا۔

ہم نے تو پر فشانی نہ جانی کر ایک بار ۔۔۔ پرواز کی چمن سے سو صیاد کی طرف

حیران کارِ عشق ہی شیریں کا نقش میر
کچھ یوں ہی دیکھنا نہیں فرہاد کی طرف

جو دیکھو مرے شعرِ تر کی طرف ۔۔۔ تو مائل نہ ہو پھر گہر کی طرف
کوئی داد دل آہ کس سے کرے ۔۔۔ ہر اک ہی سو اُس فتنہ گر کی طرف
محبت نے شاید کہ دی دل میں آگ ۔۔۔ دُھواں سا ہی کچھ اس نگر کی طرف
لگیں ہیں ہزاروں ہی آنکھیں اُدھر ۔۔۔ اک آشوب ہی اُس کے گھر کی طرف
بہت رنگ ملتا ہی دیکھو کبھو ۔۔۔ ہماری[1] طرف سے سحر کی طرف
بخود کس کو اُس تابِ رُخ نے رکھا ۔۔۔ کرے کون شمس و قمر کی طرف
نہ سمجھا گیا ابر کیا دیکھکر ۔۔۔ قطعہ ۔۔۔ ہوا تھا مری چشمِ تر کی طرف
ٹپکتا ہے پلکوں سے خوں متصل ۔۔۔ نہیں دیکھتے ہم جگر کی طرف
مناسب نہیں حالِ عاشق سے صبر ۔۔۔ رکھے ہی یہ دارو ضرر کی طرف
کسے منزلِ دلکش دھر ہیں ۔۔۔ نہیں میل خاطر سفر کی طرف

رگِ جاں کب آتی ہی آنکھوں میں میر
گئے ہیں مزاج اُس کمر کی طرف

ردیف قاف

درد ہی خود ہی خود دوا ہے عشق ۔۔۔ شیخ کیا جانے تو کہ کیا ہے عشق
تو نہ ہووے تو نظمِ کل اُٹھ جائے ۔۔۔ سچے ہیں شاعراں خدا ہے عشق

ردیف کاف تازی

بے چین مجھ کو چاہتا ہر دم ہی زیرِ خاک ۔۔۔ چھاتی پہ بعدِ مرگ بھی دل جم ہی زیرِ خاک
آسودگی جو چاہے تو مرنے پہ دل کو رکھ ۔۔۔ آشفتگی طبع بہت کم ہی زیرِ خاک
تنہا تو اپنی گور میں رہنے پہ بعدِ مرگ ۔۔۔ مت اضطراب کر لو کہ عالم ہی زیرِ خاک

[1] ہماری طرف سے دیکھو۔ یعنی ہماری خاطر سے یا ہمارے کہنے سے دیکھو۔

رو دیا تھا نزع میں میں اُسے یاد کر بہت
اب تک مری ہر ایک مژہ نم ہے زیرِ خاک

کیا آسماں پہ کھینچے کوئی میرؔ آپ کو
جانا جہاں سے سب کو مسلّم ہے زیرِ خاک

اب وہ نہیں کہ شورش رہتی تھی آسماں تک
آشوبِ نالہ اب تو پہنچا ہے لامکاں تک

بہہ بھی گیا بدن کا سب ہو کے گوشت پانی
اب کارد اے عزیزاں پہنچی ہے استخواں تک

تصویر کی سی شمعیں خاموش جلتے ہیں ہم
سوزِ درون ہمارا آتا نہیں زباں تک

روتے پھرے ہیں لوہو اک عمر اس گلی میں
باغ و بہار رہی ہے جاوے نظر جہاں تک

آنکھیں جو روتے روتے جاتی رہیں بجا ہے
انصاف کر کہ کوئی دیکھے ستم کہاں تک

بے لطف تیرے کیونکر تجھ تک پہنچ سکیں ہم
ہیں سنگِ راہ اپنے کتنے یہاں سے وہاں تک

ہم بے نصیب سر کو تجھ سے کیوں نہ پھوڑیں
پہنچا کبھو نہ جبہہ اُس سنگِ آستاں تک

مانند طیرِ نو پر اٹھے جہاں سے گئے ہم
دشوار ہے ہمارا آنا پھر آشیاں تک

تن کام میں ہمارے دیتا نہیں دہی کچھ
حاضر ہیں میرؔ ہم تو اپنی طرف جاں تک

ہے بعد مرے مرگ کے آثار سے اب تک
سوکھا نہیں لوہو در و دیوار سے اب تک

رنگینیِ عشق اُس کی ملے پر ہوئی معلوم
صحبت نہ ہوئی تھی کسی خونخوار سے اب تک

کب سے متحمل ہے جفاؤں کا دلِ زار
زنہار وفا ہو نہ سکی یار سے اب تک

ابرو ہی کی جنبش نے یہ پتھراؤ کر گئے ہیں
مارا نہیں اُن نے کوئی تلوار سے اب تک

وعدہ بھی قیامت کا بھلا کوئی ہے وعدہ
پر دل نہیں خالی غمِ دیدار سے اب تک

مدت ہوئی گھٹ گھٹ کے ہیں شہر میں مرتے
واقف نہ ہوا کوئی اس اسرار سے اب تک

برسوں ہوئے دل سوختہ بلبل کو موئے لیک
اک دود سا اُٹھتا ہے چمن زار سے اب تک

کیا جانیے ہوتے ہیں سخن لطف کے کیسے
پوچھا نہیں اُن نے تو ہمیں پیار سے اب تک

اس باغ میں اغلب ہے کہ سرزد نہ ہوا ہو
یوں نالہ کسو مرغِ گرفتار سے اب تک

خط آئے پہ ہے دن ہی سیہ تم سے ہمارا
جاتا نہیں اندھیر یہ سرکار سے اب تک

نکلا تھا کہیں وہ گلِ نازک شبِ مہ میں
سو کوفت نہیں جاتی ہے رخسار سے اب تک

دیکھا تھا کہیں سایہ ترے قد کا چمن میں
ہیں میرؔ جی آوارہ پریدار[۵۱] سے اب تک

۵۱ پریدار .. آسیب زدہ ۔ جس پر پری کا سایہ ہو۔

میر گم کردہ چمن زمزمہ پرداز ہے ایک
جس کی لے دام سے تا گوش گل آواز ہی ایک

کچھ ہوا ای مرغ قفس لطف نہ جاوے اس سے
نوحہ یا نالہ ہر اک بات کا انداز ہی ایک

ناتوانی سے نہیں بال فشانی کا دماغ
ورنہ تا باغ قفس سے مری پرواز ہی ایک

گوش کو ہوش کی ٹک کھول کے سن شور جہاں
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہی ایک

چاہے جس شکل سے تمثال صفت اس میں در آ
عالم آئینہ کے مانند در باز ہے ایک

بالیں پہ میری آوے گا تو گھر سے جب تلک
کر جاؤں گا سفر ہی میں دنیا سے تب تلک

اتنا دن اور دل ہے طپش کر لیں کاوشیں
یہ مجہلہ[١] تمام ہی ہے آج شب تلک

نقاش کیونکہ کھینچ چکا تو شبیہ یار
کھینچوں ہوں ایک ناز ہی اسکا میں اب تلک

شب کوتہ اور قصہ مری جان کا دراز
القصہ اب کہا کروں تجھ سے میں کب تلک

باقی یہ داستان ہی اور کل کی رات ہے
گر جان میری میر نہ آ پہنچے لب تلک

شوق ہے تو ہے اس کا گھر نزدیک
دوری رہ ہے راہ بر نزدیک

آہ کرنے میں دم کو سادھے رہ
کہتے ہیں دل سے ہے جگر نزدیک

ڈوبیں دریا و کوہ و شہر و دشت
تجھ سے سب کچھ ہی چشم تر نزدیک

حرف دوری ہی گرچہ انشا لیک
دیجو خط جا کے نامہ بر نزدیک

دور اب بیٹھتے ہیں مجلس میں
ہم جو تم سے تھے بیشتر نزدیک

خبر آتی ہے سو بھی دور سے یہاں
آؤ یکبار بے خبر نزدیک

توشۂ آخرت کا فکر رہے
جی سے جانے کا ہی سفر نزدیک

دور پھرنے کا ہم سے وقت ہی کیا
پوچھ کچھ حال بیٹھ کر نزدیک

مر بھی رہ[٢] میر شب بہت رو دیا
ہی مری جان اب سحر نزدیک

کہیں پہنچو جو مجھ بے پا و سر تک
کہ پہنچا شمع ساں داغ اب جگر تک

کچھ اپنی آنکھ میں یہاں کا نہ آیا
خزف سے لیکے دیکھا دُر تر تک

جسے شب آگ سا دیکھا سلگتے
اسے پھر خاک ہی پایا سحر تک

[١] مجہلہ مجازاً مخمصہ جھگڑا جھمیلا۔ عوام اسکو مجہلا کہتے ہیں

[٢] سودا اتری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات + ہو نیکو سحر آئی ہے ظالم کہیں مر بھی

ترا منہ چاند سا دیکھا ہے شاید
کہ انجم رہتے ہیں ہر شب ادھر تک

جب آیا آہ تب اپنے ہی سر پر
گیا یہ ہاتھ کب اس کی کمر تک

ہم آوازوں کو سیر اب کی مبارک
پر و بال اپنے ایسے ہی تھے پر تک

کھنچی کیا کیا خرابی زیر دیوار
ولے آیا نہ وہ ٹک گھر سے در تک

گلی تک تیری لایا تھا ہمیں شوق
کہاں طاقت کہ اب پھر جائیں گھر تک

قطعہ

یہی درد جدائی ہے جو اس شب
تو آتا ہے جگر مژگان تر تک

دکھائی دیں گے ہم میت کے رنگوں
اگر رہ جائیں گے جیتے سحر تک

کہاں پھر شور و شیون جب گیا میر
یہ ہنگامہ ہے اس ہی نوحہ گر تک

دست و پا مارے وقت بسمل تک
ہاتھ پہنچا نہ پائے قاتل تک

کعبہ پہنچا تو کیا ہوا اے شیخ
سعی کر ٹک پہنچ کسی دل تک

در پئے محمل اس کے جیسے جرس
میں بھی نالاں ہوں ساتھ منزل تک

بجھ گئے ہم چراغ سے باہر
کہیو اے باد شمع محفل تک

نہ گیا میر اپنی کشتی سے
ایک بھی تختہ پارہ ساحل تک

جاتے ہیں لے خرابے کو سیل آسماں تلک
طوفاں ہے میرے اشک ندامت سے یہاں تلک

شاید کہ دیوے رخصت گلشن ہو بے قرار
میرے قفس کو لے تو چلو باغباں تلک

قید قفس سے چھوٹ کے دیکھا جلا ہوا
پہنچے نہ ہوتے کاشکے ہم آشیاں تلک

اتنا ہوں ناتواں کہ در دل سے اب گلہ
آتا ہے ایک عمر میں میری زباں تلک

میں ترک عشق کر کے ہوا گوشہ گیر میر
ہوتا پھروں خراب جہاں میں کہاں تلک

کب دسترس ہے لعل کو تیرے سخن تلک
رسوائیاں گئی ہیں عقیق یمن تلک

آزادگی یہ چھوڑ قفس ہم نجا سکے
حسن سلوک ضعف سے صحن چمن تلک

تر دستیاں ہوں دست و گریباں ہاتھ کے
زیر زمیں بھی پہنچیں گے چاک کفن تلک

مارا گیا خرام بتاں پر سفر میں میر
اے کبک کہتا جائیو اس کے وطن تلک

ردیف کاف فارسی

جب سے خط ہی سیاہ خال کے تھانگ
تب سے لٹتی ہے ہند چاروں دانگ

بات اہل کی چلی ہی جاتی ہے
ہے مگر عوج[1] بن عنق کی ٹانگ

بن جو کچھ بن سکے جوانی میں
رات تو تھوڑی ہے بہت ہے سانگ

عشق کا شور کوئی چھپتا ہے
نالۂ عندلیب ہے گل بانگ

اس ذقن میں بھی سبزی ہی خط کی
دیکھو جیدھر کوئی پڑی ہی بھانگ

کس طرح اُن سے کوئی گرم ملے
سیم تن پگھلے جاتے ہیں جوں رانگ

چلی جاتی ہی حسب قدر بلند
دُور تک اس پہاڑ کی ہی ڈانگ

نقرہ باطل تھا طور پر اپنے
ورنہ جاتے یہ دَوڑ ہم بھی پھلانگ

میں نے کیا اس غزل کو سہل کیا
قافیے ہی تھے اس کے اوٹ پٹانگ

میرؔ بندوں سے کام کب نکلا
مانگنا ہے جو کچھ خدا سے مانگ

ردیف لام

فصلِ خزاں میں سیر جو کی ہم نے جائے گل
چھانی چمن کی خاک نہ تھا نقشِ پائے گل

اللہ رے عندلیب کی آوازِ دل خراش
جی ہی نکل گیا جو کہا اُن نے ہائے گل

مقدور تک شراب سے رکھ انکھڑیوں میں رنگ
یہ چشمکِ پیالہ ہے ساقی ہوائے گل

یہ دیکھ سینہ داغ سے رشکِ چمن ہی یہاں
بلبل ستم ہوا نہ جو تونے بھی کھائے گل

بلبل ہزار جی سے خریدار اُس کی ہی
ای گلفروش کرلو سمجھ کر بہائے گل

نکلا ہی ایسی خاک سے کس سادہ رو کی یہ
قابل درود بھیجنے کے ہے صفائے گل

بارے سرشکِ سرخ کے داغوں سے رات کو
بستر پہ اپنے سوتے تھے ہم بھی بچھائے گل

---

[1] عوج بن عنق ایک طویل القامت آدمی کا نام جو زمانۂ حضرت آدم علیہ السلام میں پیدا ہوا اور موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک زندہ رہا۔ اس کی عمر تین ہزار برس کی ہوئی۔ کہتے ہیں کہ طوفانِ نوح بھی اُس کی کمر تک آیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا اُس کے ٹخنے پر مارا۔ اسی صدمے سے وہ مر گیا۔ اہل لغت کہتے ہیں کہ اُس کے باپ کا نام عوق (بالضم) ہی عنق جو عام طور پر مشہور ہی یہ غلط ہی ۱۲ آسی (فرہنگ آنند راج)

آ عندلیب صلح کریں جنگ ہو چکی — لے اے زباں دراز تو سب کچھ سوائے گل
گلچیں سمجھ کے چنیو کہ گلشن میں میر کے — لختِ جگر پڑے ہیں نہیں برگہائے گل

گل کی جفا بھی جانی دیکھی وفائے بلبل — یک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل
کر سیر جذبِ الفت گلچیں نے کل چمن میں — توڑا تھا شاخِ گل کو نکلی صدائے بلبل
کھٹکے ہیں خار ہو کر ہر شب دلِ چمن میں — اتنے لب و دہن پر یہ نالہائے بلبل
یکرنگیوں کی راہیں طے کر کے مر گیا ہے — گل پر گئیں نہیں یہ ہیں نقشِ پائے بلبل
آئی بہار و گلشن گل سے بھرا ہے لیکن — ہر گوشۂ چمن میں خالی ہے جائے بلبل
پیغام بے غرض بھی سنتے نہیں ہیں خوباں — پہنچی نہ گوشِ گل تک آخر دعائے بلبل
یہ دلخراش نالے ہر شب کے میر تیرے — کر دیں گے بے نمک ہی شورِ نوائے بلبل

کیسا چمن اسیری میں کس کو ادھر خیال — پرواز خواب ہو گئی ہے بال و پر خیال
مشکل ہے مٹ گئے ہوئے نقشوں کی پھر نمود — جو صورتیں بگڑ گئیں ان کا نہ کر خیال
مو کو عبث ہے تاب کلی یوں ہی تنگ ہے — اس کا دہن ہے وہم و گمان دگر خیال
رخسار پر ہمارے ڈھلنے کو اشک کے — دیکھے ہے جو کوئی سو کرے ہے گہر خیال
کس کو دماغِ شعر و سخن ضعف میں کہ میر — اپنا رہے ہے اب تو ہمیں بیشتر خیال

سیر کر عندلیب کا احوال — ہیں پریشاں چمن میں کچھ پر و بال
تپِ غم تو گئی طبیب ولے — پھر نہ آیا کبھو مزاج بحال
سبزۂ نو رستہ رہگذار کا ہوں — سر اٹھایا کہ ہو گیا پامال
کیوں نہ دیکھوں چمن کو حسرت سے — آشیاں تھا مرا بھی یہاں پر سال
سرد مہری کی بسکہ گلرو نے — اوڑھی ابرِ بہار نے بھی شال
ہجر کی شب کو یہاں تئیں تڑپا — کہ ہوا صبح ہوتے میرا وصال
ہم تو سہہ گزرے کجروی تیری — نہ نبھے گی پر اے فلک یہ چال
دیدۂ تر پہ شب رکھا تھا میر — لکۂ ابر ہے مرا رومال

جائیں ہیں فرش رہ تری مست حال چل — اے رشک حور آدمیوں کی سی چال چل

اک آن میں بدلتی ہے صورت جہان کی — جلد اس نگار خانے سے کر انتقال چل

سالک بہر طریق بدن ہے وبال جاں — یہ بوجھ تیرے ساتھ جو ہے اس کو ڈال چل

آوارہ میرے ہونے کا باعث وہ زلف ہے — کافر ہوں اس میں ہووے اگر ایک بال چل

دنیا ہے میر حادثہ گاہ مقرری
یہاں سے تو اپنا پانوں شتابی نکال چل

شرط یہ ابر میں ہم میں ہے کہ رو دیں گے کل — صبح کہ اٹھتے ہی عالم کو ڈبو دیں گے کل

آج آوارہ ہوائے بال اسیران قفس — یہ گل و باغ و خیابان نہ ہو دیں گے کل

وعدۂ وصل رہا ہے شب آئندہ پہ میر
بخت خوابیدہ جو ٹک جاگتے سو دیں گے کل

مندا ہے اختلاط کا بازار آج کل — لگتا نہیں ہے دل کا خریدار آج کل

اس مہلت دو روزہ میں خطرے ہزار ہیں — اچھا ہے رہ سکو جو خبردار آج کل

اوباشوں ہی کے گھر بچھے پائے گئے ہیں روز — مارا پڑے گا کوئی طلبگار آج کل

ملنے کی رات داخل ایام کیا نہیں — برسوں ہوئی کہاں تئیں اے یار آج کل

گلزار ہو رہا ہے مرے دم سے کوئے یار — اک رنگ پر ہے دیدۂ خونبار آج کل

تا شام اپنا کام کھنچے کیونکہ دیکھئے — پڑتی نہیں ہے جی کو جفاکار آج کل

کعبہ تلک تو سنتے ہیں ویرانہ و خراب — آباد ہے سو خانۂ خمار آج کل

ٹھوکر دلوں کو لگنے لگی ہے خرام میں — لاوے گی اک بلا تری رفتار آج کل

ایسا ہی مغبچوں میں جو آنا ہے شیخ جی — تو جا رہے ہیں جبہ و دستار آج کل

حیران میں ہی حال کی تدبیر میں نہیں — ہر اک کو شہر میں ہے یہ آزار آج کل

اچھا نہیں ہے میر کا احوال ان دنوں
غالب کہ ہو چکے گا یہ بیمار آج کل

کرو تم یاد گر ہم کو رہے ہے تم میں بھی اکثر دل — مثل مشہور ہے یہ تو کہ ہے دنیا میں دل بر دل

بھلا تم نقد دل لیکر ہمیں دشمن گنو اب تو
کبھو کچھ ہم بھی کرلیں گے حساب دوستاں در دل

رہتا نہیں ہے کوئی گھڑی اب تو یاں دل — آزار دل ستم زدہ دل بیقرار دل

ردیف میم

کیا کہوں کیا رکھتے تھے تجھ سے ترے بیمار چشم — تجھ کو بالیں پر نہ دیکھا کھولی سو سو بار چشم
ہجر میں پاتا نہیں گریے کے سر رشتے کو میں — ہر سحر اٹھ باندھے ہے آنسوؤں کا تار چشم
گو نیا ناسور زخم دل تھی یہ ای ہمنشیں — پیش ازیں کیا کیا ہمیں دکھلاتی تھی خونبار چشم
سیکڑوں ہوں کشتنی تو لاویں کچھ تاب نگاہ — ایک دو کا کام کب ہے اس سے ہو دوچار چشم
جرم کیا غیروں کا طالع چشم پوشی کرتے ہیں — دیکھ کر احوال میرا موندلے ہے یار چشم

روز و شب وا رہنے سے پیدا ہے میر آثار شوق
ہے کسو نظارگی کا رخنۂ دیوار چشم

کیا بلبل اسیر ہے بے بال و پر کہ ہم — گل کب رکھے ہے ٹکڑے جگر اس قدر کہ ہم
خورشید صبح نکلے ہے اس نور سے کہ تو — شبنم گرہ میں رکھتی ہے یہ چشم تر کہ ہم
جیتے ہیں تو دکھاویں گے دعوائے عندلیب — گل بن خزاں میں اب کی وہ رہتی ہے مر کہ ہم
یہ تیغ ہے یہ طشت ہے یہ ہم ہیں کشتنی — کھیلے ہے کون ایسی طرح جان پر کہ ہم
تلواریں تم لگاتے ہو ہم ہیں گے دم بخود — دنیا میں یہ کرے ہے کوئی درگذر کہ ہم
اس جستجو میں اور خرابی تو کیا کہیں — اتنی نہیں ہوئی ہے صبا دربدر کہ ہم

جیتے ہیں اور روتے ہیں لخت جگر ہے میر
کرتے سنا ہے یوں کوئی قیمہ جگر کہ ہم

آئے تو ہو طبیباں تدبیر گر کرو تم — ایسا نہ ہو کہ میرے جی کا ضرر کرو تم
رنگ شکستہ میرا بے لطف بھی نہیں ہے — ایک آدھ رات کو تو یاں بھی سحر کرو تم
تھی چشم داشت مجھ کو ای دلبراں یہ تم سے — دل کو مرے اٹھا کر آنکھوں میں گھر کرو تم
اس بزم خوش کے محرم ناآشنا ہیں سارے — کس کو کہوں کہ واں تک میری خبر کرو تم
ہے بیچدار ازبس راہ وصال و ہجراں — ان دو ہی منزلوں میں برسوں سفر کرو تم
یہ ظلم ہے تو ہم بھی اس زندگی سے گذرے — سوگند ہے تمھیں اب جو درگذر کرو تم
روئے سخن کہاں تک غیروں کی اور آخر — ہم بھی تو آدمی ہیں ٹک منھ ادھر کرو تم

ہو عاشقوں میں اُس کے تو آؤ میر صاحب قطعہ
گردن کو اپنی مو سے باریک تر کرو تم

کیا لطف ہے وگرنہ جس دم وہ تیغ کھینچے
سینہ سپر کریں ہم قطعِ نظر کرو تم

جانا کہ شغل رکھتے ہو تیر و کماں سے تم
پر مل چلا کرو بھی کسو خستہ جاں سے تم

ہم اپنی چاک جیب کو سی رہتے یا نہیں
پھاٹے[۱] میں پاؤں دینے کو آئے کہاں سے تم

اب دیکھتے ہیں خوب تو وہ بات ہی نہیں
کیا کیا وگرنہ کہتے تھے اپنی زباں سے تم

تنکے بھی تم ٹھہرتے کہیں دیکھے ہیں تنک
چشمِ وفا رکھو نہ خسانِ جہاں سے تم

جاؤ نہ دل سے منظرِ تن میں ہے جا یہی
پچھتاؤ گے اُٹھو گے اگر اس مکاں سے تم

قصہ مرا سنو گے تو جاتی رہے گی نیند
آرامِ چشم مت رکھو اس داستاں سے تم

کھل جائیں گی پھر آنکھیں جو مر جائیگا کوئی
آتے نہیں ہو باز مرے امتحاں سے تم

جتنے تھے کل تم آج نہیں پاتے اتنا ہم
ہر دم چلے ہی جاتے ہو آبِ رواں سے تم

رہتے نہیں ہو بن گئے میر اس گلی میں رات
کچھ راہ بھی نکالو سگِ پاسباں سے تم

کرتے نہیں ہیں دوری سے اب اس کی باک ہم
نزدیک اپنے کب کے ہوئے ہیں ہلاک ہم

بیٹھے ہم اپنے طور پہ مستوں میں جب اُٹھے
جوں ابرِ تر لیے اُٹھے دامن کو پاک ہم

آہستہ اے نسیم کہ اطرافِ باغ کے
مشتاقِ پر فشانی ہیں اک مشتِ خاک ہم

شمع و چراغ و شعلہ و آتش شرار و برق
رکھتے ہیں دل جلے یہ بہم سب تپاک ہم

مستی میں ہم کو ہوش نہیں نشأتین کا
گلشن میں اینڈتے ہیں پڑے زیرِ تاک ہم

جوں برق تیرے کوچہ سے ہنستے نہیں گئے
مانندِ ابر جب اُٹھے تب گریہ ناک ہم

مدت ہوئی کہ چاکِ قفس ہی سے اب تو میر
دکھلا رہے ہیں گل کو دلِ چاک چاک ہم

نہ پھر رکھیں گے تیری رہ میں پا ہم
گئے گزرے ہیں آخر ایسے کیا ہم

کھنچے گی کب وہ تیغِ ناز یا رب
رہے ہیں دیر سے سر کو جھکا ہم

نہ جانا یہ کہ کہتے ہیں کسے پیار
رہیں بے لطفیاں ہی یاں تو باہم

[۱] پھٹے میں پاؤں ڈالنا کسی کے معاملہ میں خواہ مخواہ دخل دینا۔

بنے کیا خال و زلف و خط سے دیکھیں — ہوئے ہیں کتنے یہ کافر فراہم
مرض ہی عشق کا بیڈول ہے کچھ — بہت کرتے ہیں اپنی سی دوا ہم
کہیں پیوند ہوں یا رب زمیں کے — پھریں گے اس سے یوں کب تک جدا ہم
ہوس تھی عشق کرنے میں ولیکن — بہت نادم ہوئے دل کو لگا ہم
کب آگے کوئی مرتا تھا کسی پر — جہاں میں کر گئے رسم وفا ہم
تعارف کیا رہا اہل چمن سے — ہوئے اک عمر کے پیچھے رہا ہم
ہوا جس کے لئے اس کو نہ دیکھا
نہ سمجھے میر کا کچھ مدعا ہم

اگر راہ میں اس کی رکھا ہے گام — گئے گزرے خضر علیہ السلام
دہن یار کا دیکھ چپ لگ گئی — سخن یہاں ہوا ختم حاصل کلام
مجھے دیکھ منھ پر پریشاں کی زلف — غرض یہ کہ جاتو ہوئی اب تو شام
سر شام سے رہتی ہیں کاہشیں — ہمیں شوق اس ماہ کا ہے تمام
قطعہ
قیامت ہی یہاں چشم و دل سے ہے — چلے بس تو وہاں جا کے کریے قیام
نہ دیکھے جہاں کوئی آنکھوں کی اور — نہ لیوے کوئی جس جگہ دل کا نام
جہاں میر زیر و زبر ہو گیا
خراماں ہوا تھا وہ محشر خرام

گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم — لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم
کام کیا آتے ہیں گے معلومات — یہ تو سمجھے ہی نہ کہ کیا ہیں ہم
ای بتاں اس قدر جفا ہم پر — عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم
سرمہ آلودہ مت رکھا کر چشم — دیکھ اس وضع سے خفا ہیں ہم
ہے نمک سود سب تن مجروح — تیرے کشتوں میں میرزا ہیں ہم
خوف ہم کو نہیں جنوں سے کچھ — یوں تو مجنوں کے بھی چچا ہیں ہم
آستاں پر ترے ہی گزری عمر — اسی دروازے کے گدا ہیں ہم
کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر
گوئیا جنس ناروا ہیں ہم

حذر کہ آہِ جگر تفتگاں بلا ہے گرم　　ہمیشہ آگ ہی برسی ہے یہاں ہوا ہے گرم
ہزار حیف کہ درگیر صحبت[1] اُس سے نہیں　　جگر کی آگ نے ہنگامہ کر رکھا ہے گرم
کہاں ہے تیغ و سپر آفتاب کی بارے　　وہ سرد مہر ہمارا بھی اب ہوا ہے گرم
نہ اتنی دار دپی ظالم کہ اس خمار میں ہوں　　مزاج گرم ہے پھر اور یہ ہوا ہے گرم

گیا جہان سے خورشید ساں اگرچہ میر
ولیک مجلسِ دُنیا میں اُس کی جا ہے گرم

کرتے ہیں گفتگو سحر اُٹھ کر صبا سے ہم　　لڑنے لگے ہیں ہجر میں اُس کے ہوا سے ہم
ہوتا نہ دل کا تا یہ سر انجام عشق میں　　لگتے ہی جی کے مر گئے ہوتے بلا سے ہم
چھوٹا نہ اُس کا دیکھنا ہم سے کسو طرح　　پایانِ کار مارے گئے اِس ادا سے ہم
داغوں ہی سے بھری رہی چھاتی تمام عمر　　یہ پھول گل چنا گئے باغِ وفا سے ہم
غافل نہ اپنی دیدہ درائی سے ہم کو جان　　سب دیکھتے ہیں پر نہیں کہتے حیا سے ہم
دو چار دن تو اور بھی آ تو کراہتاً　　اب ہو چکے ہیں روز کی تیری جفا سے ہم

آئینے کی مثال پس از صد شکست میر
کھینچا بغل میں یار کو دستِ دعا سے ہم

ردیف نون

بیکلی بے خودی کچھ آج نہیں　　ایک مدت سے وہ مزاج نہیں
درد اگر یہ ہے تو مجھے بس ہے　　اب دوا کی بھی احتیاج نہیں
ہم نے اپنی سی کی بہت لیکن　　مرضِ عشق کا علاج نہیں

شہرِ خوبی کو خوب دیکھا میر
جنسِ دل کا کہیں رواج نہیں

وحشت میں ہوں بلا گر وادی پہ اپنی آؤں　　مجنوں کی محنتیں سب میں خاک میں ملاؤں
ہنسکر کبھو بلایا تو برسوں تک رُلایا　　اُس کی ستم ظریفی کس کے تئیں دکھاؤں

[1] صحبت درگیر ہونا فارسی محاورہ درگیر شدن صحبت کا ترجمہ ہے۔ یعنی صحبت کا قایم رہنا اور نبھنا۔
محسن تاثیر ؎ دیدہ تا بستم خیال آں پری تسخیر شد + تا بگل این درگرفتم صحبتم درگیر شد

فریادی ہوں تو ٹپکے لہو ہو مری زباں سے
نالے کو بلبلوں کے خاطر میں بھی نہ لاؤں

پوچھو نہ دل کے غم کو ایسا نہ ہووے یاراں
مانند روضہ خواں کے مجلس کے تئیں رلاؤں

اک دم تو چونک بھی پڑ شور و فغاں سے میرے
ای بخت خفتہ کب تک تیرے تئیں جگاؤں

از خویش رفتہ ہر دم فکرِ وصال میں ہوں
کتنا میں کھویا جاؤں یارب کہ تجھ کو پاؤں

عریاں تنی کی شوخی وحشت میں کیا بلا تھی
تہ گرد کی نہ بیٹھی تا تن کے تئیں چھپاؤں

اگلے خطوں نے میرے مطلق اثر نہ بخشا
قاصد کے بدلے اب کے جادو مگر چلاؤں

دل تفتگی نے مارا مجھ کو کہاں فرہ دے
اک قطرہ آب تا میں اس آگ کو بجھاؤں

آسودگی تو معلوم ای میر جیتے جی یہاں
آرام تب ہی پاؤں جب جی سے ہاتھ اٹھاؤں

سوزشِ دل سے مفت گلتے ہیں
داغ جیسے چراغ جلتے ہیں

اس طرح دل گیا کہ اب تک ہم
بیٹھے روتے ہیں ہاتھ ملتے ہیں

بھری آتی ہیں آج یوں آنکھیں
جیسے دریا کہیں اُبلتے ہیں

دمِ آخر ہے بیٹھ جا مت جا
صبر کر ٹک کہ ہم بھی چلتے ہیں

تیرے بیخود جو ہیں سو کیا چیتیں
ایسے ڈوبے کہیں اُچھلتے ہیں

فتنہ در سر بتانِ حشر خرام
ہائے رے کس ٹھسک سے چلتے ہیں

نظر اُٹھتی نہیں کہ جب خوباں
سوتے سے اٹھ کے آنکھ ملتے ہیں

اس سرِ زلف کا خیال نہ چھوڑ
سانپ کے سر ہی یہاں کچلتے ہیں

تھے جو اغیار سنگ سینے کے
اب تو کچھ ہم کو دیکھ ٹلتے ہیں

شمع رو موم کے بنے ہیں مگر
گرم ٹک ملئے تو پگھلتے ہیں

میر صاحب کو دیکھئے جو بنے
اب بہت گھر سے کم نکلتے ہیں

آیا کمال نقص مرے دل کی تاب میں
جاتا ہے جی چلا ہی مرا اضطراب میں

دوزخ کیا ہے سینہ مرا سوزِ عشق سے
اس دل جلے ہوئے کی سبب ہوں عذاب میں

مت کر نگاہِ خشم یہی موت ہے مری
ساقی نہ زہر دے تو مجھے تو شراب میں

بیدار شورِ حشر نے سب کو کیا ولے
ہیں خونِ خفتہ اُس کے شہید دکی خواب میں

دل لیکے رد بھی تک نہیں دیتے کہیں گے کیا
خوبان بہ معاملہ یوم الحساب میں
جا کر درِ طبیب پہ بھی میں گرا و لے
جز آہ اُن نے کچھ نہ کیا میرے باب میں
قطعہ
عیش و خوشی ہے شیب میں ہو گو پہ وہ کہاں
لذت جو ہے جوانی کے رنج و عتاب میں
دیں عمرِ خضر موسمِ پیری میں تو نہ لے
مرنا ہی اس سے خوب ہے عہدِ شباب میں
قطعہ
آ نکلے تھے جو حضرتِ منیر اس طرف کہیں
میں نے کیا سوال یہ اُنکی جناب میں
حضرت سنو تو میں بھی تعلق کروں کہیں
فرمانے لاگے رو کے یہ اُس کے جواب میں

تو جان لیک تجھ سے بھی آئے جو کل تھے یہاں
ہیں آج صرف خاک جہان خراب میں

بے روئے و زلفِ یار ہے رونے سے کام یہاں
دامن ہے منھ پہ ابر نمط صبح و شام یہاں
آوازہ ہے جہاں میں ہمارا اُسنا کرو
عنقا[1] کے طور زیست ہے اپنی بنام یہاں
وصفِ دہن سے اس کے نہ آگے قلم چلے
یعنی کیا ہے خامہ نے ختم کلام یہاں
غالب[2] یہ ہے کہ موسمِ خط وہاں قریب ہے
آنے لگا ہے متصل اُس کا پیام یہاں
مت کھا فریبِ عجزِ عزیزانِ حال کا
پنہاں کئے ہیں خاک میں یاروں نے دام یہاں
کوئی ہوا نہ دست بسر شہرِ حسن میں
شاید نہیں ہے رسمِ جوابِ سلام یہاں

ناکام رہنے ہی کا تمھیں غم ہے آج منیر
بہتوں کے کام ہو گئے ہیں کل تمام یہاں

نہ گیا خیالِ زلفِ سیہ جفا شعاراں
نہ ہوا کہ صبح ہووے شبِ تیرہ روزگاراں
نہ کہا تھا اے رفوگر ترے ٹانکے ہونگے ڈھیلے؟
نہ سیا گیا نہ آخر دلِ چاکِ بیقراراں
ہوئی عید سب نے پہنے طرب و خوشی کے جامے
نہ ہوا کہ ہم بھی بدلیں یہ لباسِ سوگواراں
خطرِ عظیم میں ہیں مری آہ و اشک سے سب
کہ جہان رہ چکا پھر جو یہی ہے باد و باراں
کہیں خاک کو کو اُس کی تو صبا نہ دیجو جنبش
کہ بھرے ہیں اُس زمیں میں جگرِ جگر فگاراں
رکھے تاجِ زر کو سر پہ چمن زمانہ میں گل
نہ شگفتہ ہو تو اتنا کہ خزاں ہے یہ بہاراں
نہیں تجھ کو چشمِ عبرت یہ نمود میں ہے ورنہ
کہ گئے ہیں خاک میں مل کئی تجھ سے تاجداراں

[1] حکماء کے نزدیک عنقا صرف ایسی چیز کا نام ہے جس کا وجود نہو اور یہ کہ وہ ایک جانور ہے ایک غلط خیال مشہور ہو گیا ہے ورنہ حقیقت
[2] لا اعلم سے ہاں تھا اُس سے پہلے جب تک جواب صاف تھا اب تو خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگا۔

تو جہاں سے دل اُٹھا یہاں نہیں رسم دردمندی
کسی نے بھی یوں نہ پوچھا ہوئے خاک کیا ہزاراں

یہ سنا تھا میر ہم نے کہ فسانہ خواب لائے
تری سرگزشت سن کر گئے اور خواب یاراں

اُس کے کوچے سے جو اُٹھ اہلِ وفا جاتے ہیں
تا نظر کام کرے رو کے غش آ جاتے ہیں

متصل روتے ہی رہیے تو بجھے آتشِ دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

وقتِ خوش اُن کا جو ہم بزم ہیں تیرے ہم تو
در و دیوار کو احوال سنا جاتے ہیں

جا چکی طاقتِ پا آہ تو کرئے گا کیا
اب تو ہم حال کبھو تم کو دکھا جاتے ہیں

ایک بیمارِ جدائی ہوں میں آپھی تس پر
پوچھنے والے جدا جان کو کھا جاتے ہیں

غیر کی تیغِ زباں سے تری مجلس میں تو ہم
آگے روز ایک نیا زخم اُٹھا جاتے ہیں

عرضِ وحشت نہ دیا کر تو بگولے اتنی
اپنی وادی[عہ] پہ کبھو یار بھی آ جاتے ہیں

میر صاحب بھی ترے کوچے میں شب آتے ہیں لیک
جیسے[1] دریوزہ گری کرنے گدا جاتے ہیں

کہیو قاصد جو وہ پوچھے ہمیں کیا کرتے ہیں
جان و ایمان و محبت کو دعا کرتے ہیں

عشق آتش بھی جو دیوے تو نہ دم ماریں ہم
شمعِ تصویر ہیں خاموش جلا کرتے ہیں

جائے ہی نہ مرضِ دل تو نہیں اُس کا علاج
اپنے مقدور تلک ہم تو دوا کرتے ہیں

اُس کے کوچے میں نہ کر شورِ قیامت کا ذکر
شیخ یہاں ایسے تو ہنگامے ہوا کرتے ہیں

بے بسی سے تو تری بزم میں ہم بہرے بنے
نیک و بد کوئی کہے بیٹھے سنا کرتے ہیں

رخصتِ جنبشِ لب عشق کی حیرت سے نہیں
مدتیں گزری کہ ہم چپ ہی رہا کرتے ہیں

تو پری شیشے سے نازک ہے نہ کر دعوی مہر
دل ہیں پتھر کے انھوں کے جو وفا کرتے ہیں

تجھ سے لگ جا کے یہ یوں جاتے رہیں مجھ کو حیف
دیدہ و دل نے نہ جانا کہ دغا کرتے ہیں

فرصتِ خواب نہیں ذکرِ بتاں میں ہم کو
رات دن رام کہانی سی کہا کرتے ہیں

مجلسِ حال میں موزوں حرکت شیخ کی دیکھ
غیر شرعی بھی دم رقص مزا کرتے ہیں

یہ زمانہ نہیں ایسا کہ کوئی زیست کرے
چاہتے ہیں جو برا اپنا بھلا کرتے ہیں

محض ناکارہ بھی مت جان ہمیں تو کہ کہیں
ایسے ناکام بھی بیکار پھرا کرتے ہیں

[1] میر صاحب بھی اُس کی بزم میں تھے۔ جیسے کوئی فقیر ہوتا ہے۔ [عہ] اپنی وادی پہ آنا یعنی ضد پر آنا۔

تجھ بن اس جان مصیبت زدہ غمدیدہ پہ ہم — کچھ نہیں کرتے تو افسوس کیا کرتے ہیں

کیا کہیں میر جی ہم تم سے معاش اپنی غرض
غم کو کھایا کریں ہیں لوہو پیا کرتے ہیں

غزل

مستوجب ظلم و ستم و جور و جفا ہوں — ہر چند کہ جلتا ہوں پہ سرگرم وفا ہوں

آتے ہیں مجھے خوب سے دونوں ہنر عشق — رونے کے تئیں آندھی ہوں کڑھنے کو بلا ہوں

اس گلشن دنیا میں شگفتہ نہ ہوا میں — ہوں غنچۂ افسردہ کہ مردود صبا ہوں

ہم چشم ہے ہر آبلۂ پا کا مرا اشک — از بسکہ تری راہ میں آنکھوں سے چلا ہوں

دامن نہ جھٹک ہاتھ سے میرے کہ ستم گر — ہوں خاک سر راہ کوئی دم میں ہوا ہوں

دل خواہ جلا اب تو مجھے ای شب ہجراں — میں سوختہ بھی منتظر روز جزا ہوں

گو طاقت و آرام و خور و خواب گئے سب — بارے یہ غنیمت ہے کہ جیتا تو رہا ہوں

اتنا ہی مجھے علم ہے کچھ میں بھی بہر چیز — معلوم نہیں خوب مجھے بھی کہ میں کیا ہوں

تب گرم سخن کہنے لگا ہوں میں کہ اک عمر — جوں شمع سر شام سے تا صبح جلا ہوں

سینہ تو کیا فضل الٰہی سے سبھی چاک
ہے وقت دعا میر کہ اب دل کو لگا ہوں

جنس گراں کو تجھ سے جو لوگ چاہتے ہیں — دے روگ اپنے جی کو ناحق بساہتے ہیں

اس میکدے میں ہم بھی مدت سے ہیں ولیکن — خمیازہ کھینچتے ہیں ہر دم جماہتے ہیں

ناموس دوستی سے گردن بندھی ہے اپنی — جیتے ہیں جب تلک ہم تب تک نباہتے ہیں

سہل اس قدر نہیں ہے مشکل پسندی میری — جو تجھ کو دیکھتے ہیں مجھ کو سراہتے ہیں

وے دن گئے کہ راتیں نالوں سے کاٹتے تھے
بے ڈول میر صاحب اب کچھ کراہتے ہیں

یہ ترک ہو کے خشن کج اگر کلاہ کریں — تو بوالہوس نہ کبھو چشم کو سیاہ کریں

تمھیں بھی چاہیے ہے کچھ تو پاس چاہت کا — ہم اپنی اور سے یوں کب تلک نباہ کریں

رکھا ہے اپنے تئیں روک روک کر ورنہ — سیاہ کر دیں زمانے کو ہم جو آہ کریں

جو اس کی اور کو جانا ملے تو ہم بھی ضعیف — ہزار سجدے ہر اک گام سر بہ راہ کریں

ہوائے میکدہ یہ ہے تو فوت وقت سے ظلم — نماز چھوڑ دیں اب کوئی اور گناہ کریں

ہمیشہ کون تکلف ہے خوب رویوں کا
گزار ناز سے ایدھر بھی گاہ گاہ کریں

اگر اٹھیں گے اسی حال سے تو کہیو تو
جو روز حشر تجھی کو نہ عذرخواہ کریں

بڑی بلا ہیں ستم کشتۂ محبت ہم
جو تیغ برسے تو سر کو نہ کچھ پناہ کریں

اگرچہ کاہل ہیں پر دیدنی ہیں ہم بھی میر
ادھر کو یار تامل سے گر نگاہ کریں

راضی ہوں گو کہ بعد از صد سال و ماہ دیکھوں
اکثر نہیں تو تجھ کو میں گاہ گاہ دیکھوں

جی انتظار کش ہے آنکھوں ہیں بند در پر
آجا نظر کہ کب تک میں تیری راہ دیکھوں

آنکھیں جو کھل رہی ہیں مرنے کے بعد میری
حسرت یہ تھی کہ اس کو میں اک نگاہ دیکھوں

یہ دل وہ جا ہے جس میں دیکھا تھا تجھ کو بستے
کن آنکھوں سے اب اجڑا اس گھر کو آہ دیکھوں

دیکھوں تو چاند اب کا گزرے ہے مجھ کو کیسا
دل ہے کہ تیرے منہ پر بے مہر و ماہ دیکھوں

چشم و دل و جگر یہ سارے ہوئے پریشاں
کس کس کی تیرے غم میں حالت تباہ دیکھوں

آنکھیں تو تو نے دی ہیں اے جرم بخش عالم
کیا تیری رحمت آگے اپنے گناہ دیکھوں

قطعہ
مرنا ہے یا تماشا ہر اک کی ہے زباں پر
اس مجھلے کو چل کر میں خواہ نخواہ دیکھوں

دیکھوں ہوں آنکھ اٹھا کر جس کو تو یہ کہے ہے
ہوتا ہے قتل کیونکر یہ بے گناہ دیکھوں

ہوں میں نگاہ بسمل گو اک نظر تھی فرصت
تا میر روئے قاتل تا قتل گاہ دیکھوں

مشہور ہیں دلوں کی مرے بیقراریاں
جاتی ہیں لامکاں کو دل شب کی زاریاں

چہرے پہ جیسے زخم ہے ناخن کا ہر خراش
اب دیدنی ہوئی ہیں مری دستکاریاں

سو بار ہم نے گل کے کہے پر چمن کے بیچ
بھر دی ہیں آب چشم سے راتوں کو کیاریاں

کشتے کی اس کے خاک بھری جسم زار پر
خالی نہیں ہیں لطف سے لوہو کی دھاریاں

تربت سے عاشقوں کے نہ اٹھا کبھو غبار
جی سے گئے وے نہ گئیں رازداریاں

اب کس کس اپنی خواہش مردہ کو روئیے
تھی ہم کو اس سے سیکڑوں امیدواریاں

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

کیا جانتے تھے ایسے دن آ جائیں گے شتاب
روتے گزرتیاں ہیں ہمیں راتیں ساریاں

گل نے ہزار رنگ سخن سر کیا ولے
دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں

جاؤگے بھول عہد کو فرہاد و قیس کے
گر پہنچیں ہم شکستہ دلوں کی بھی باریاں

بچ جاتا ایک رات جو کٹ جاتی اور میرؔ
کاٹیں تمھیں کوہکن نے بہت راتیں بھاریاں

گر کچھ ہو درد آئینہ یوں چرخِ زشت میں
ان صورتوں کو صرف کرے خاک و خشت میں

رہتا ہے سوزِ عشق سے دوزخ میں روز و شب
لیجائے گا یہ سوختہ دل کیا بہشت میں

آسودہ کیونکہ ہوں میں کہ مانند گردباد
آوارگی تمام ہے میری سرشت میں

کب تک خراب سعی طوافِ حرم رہوں
دل کو اُٹھا کے بیٹھ رہوں گا کنشت میں

ماتم کے ہوں زمین پہ خرمن تو کیا عجب
ہوتا ہے نیل چرخ کی اس سبز کشت میں

سرمست ہم ہیں آنکھوں کے دیکھے سے یار کے
کب یہ نشہ ہے دخترِ رز تجھ پلشت میں

نامے کو چاک کرکے کرے نامہ بر کو قتل
کیا یہ لکھا تھا میرؔ مری سرنوشت میں

درد و اندوہ میں ٹھہرا جو رہا میں ہی ہوں
رنگِ رو جس کے کبھی منھ نہ چڑھا میں ہی ہوں

بد کہا میں نے رقیبوں کو تو تقصیر ہوئی
کیوں ہے بخشو بھی بھلا، سب میں بُرا میں ہی ہوں

اپنے کوچے میں فغاں جس کی سنو ہو ہر رات
وہ جگر سوختہ و سینہ جلا میں ہی ہوں

خار کو جن نے لڑی موتی کی کر دکھلایا
اس بیابان میں وہ آبلہ پا میں ہی ہوں

لطف آنے کا ہے کیا بس نہیں اب تابِ جفا
اتنا عالم سے بھرا جاؤ نہ کیا میں ہی ہوں

قطعہ

اس ادا کو تو ٹک اک سیر کر انصاف کرو
وہ بُرا ہے گا بھلا دوستو یا میں ہی ہوں

میں یہ کہتا تھا کہ دل جن نے لیا کون ہے وہ
یک بیک بول اُٹھا اس طرف آ میں ہی ہوں

جب کہا میں نے کہ تو ہی ہے تو پھر کہنے لگا
کیا کرے گا تو مرا دیکھوں تو جا میں ہی ہوں

سنتے ہی ہنس کے ٹک اک سوچیو کیا تو ہی تھا
جن نے شب رو کے سب احوال کہا میں ہی ہوں

میرؔ آوارۂ عالم جو سُنا ہے تو نے
خاک آلودہ وہ اے بادِ صبا میں ہی ہوں

کاسۂ سر کو لئے مانگتا دیدار پھرے
میرؔ وہ جان سے بیزار گدا میں ہی ہوں

نکلے ہے جنسِ حسن کسی کاروان میں
یہ وہ نہیں متاع کہ ہو ہر دُکان میں

جاتا ہے اک ہجومِ غمِ عشق جی کے ساتھ
ہنگامہ لے چلے ہیں ہم اُس بھی جہان میں

یارب کوئی تو واسطہ سرگشتگی کا ہے
اک عشق بھر رہا ہے تمام آسمان میں

ہم اُس سے آہ سوزِ دل اپنا نہ کہہ سکے
تھے آتشِ دروں سے پھپھولے زبان میں

قطعہ
غم کھینچنے کو کچھ تو توانائی چاہیے
سو یہاں نہ دل ہے نے تاب نہ طاقت ہے جان میں

غافل نہ رہیو ہم سے کہ ہم وے نہیں رہے
ہوتا ہے اب تو حال عجب ایک آن میں

وے دن گئے کہ آتشِ غم دل میں تھی نہاں
سوزش رہے ہے اب تو ہر اک استخوان میں

دل نذر و دیدہ پیشکش اے باعثِ حیات
سچ کہہ کہ جی لگے ہے ترا کس مکان میں

کھینچا نہ کر تو تیغ کہ اک دن نہیں ہیں ہم
ظالم قباحتیں ہیں بہت امتحان میں

پھاڑا ہزار جا سے گریبانِ صبر میر
کیا کہہ گئی نسیمِ سحر گل کے کان میں

زباں رکھ غنچہ ساں اپنے دہن میں
بندھی مٹھی چلا جا اس چمن میں

نہ کھول اے یار میرا گور میں منھ
کہ حسرت ہے مری جاگہ کفن میں

رکھا کر ہاتھ دل پر آہ کرتے
نہیں رہتا چراغ ایسی پون میں

جلے دل کی مصیبت اپنی سن کر
لگی ہے آگ سارے تن بدن میں

نہ تجھ بن ہوش میں ہم آئے ساقی
مسافر ہی رہے اکثر وطن میں

خردمندی ہوئی زنجیر ورنہ
گزرتی خوب تھی دیوانہ پن میں

کہاں کے شمع و پروانے گئے مر
بہت آتش بجاں تھے اس چمن میں

کہاں عاجز سخن قادر سخن ہوں
ہمیں ہے شبہ یاروں کے سخن میں

گدازِ عشق میں بہہ بھی گیا میر
یہی دھوکا سا ہے اب پیرہن میں

جن کیلئے اپنے تو یوں جان نکلتے ہیں
اس راہ میں وے جیسے انجان نکلتے ہیں

کیا تیرِ ستم اُس کے سینے میں بھی ٹوٹے تھے
جس زخم کو چیروں ہوں پیکان نکلتے ہیں

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

کس کا ہے قماش ایسا گودڑ بھرے ہیں سارے
دیکھو نہ جو لوگوں کے دیوان نکلتے ہیں

قطعہ
گہ لوہو ٹپکتا ہے گہ لختِ دل آنکھوں سے
یا ٹکڑے جگر ہی کے ہر آن نکلتے ہیں

کریے تو گلہ کس سے جیسی تھی ہمیں خواہش
اب ویسے ہی یہ اپنے ارمان نکلتے ہیں

جاگہ سے بھی جاتے ہو منہ سے بھی خشن ہو کر — قطعہ
وے حرف نہیں ہیں جو شایان نکلتے ہیں

سو کاہے کو اپنی تو جوگی کی سی پھیری ہے
برسوں میں کبھو ایدھر ہم آن نکلتے ہیں

ان آئنہ رویوں کے کیا میر بھی عاشق ہیں
جب گھر سے نکلتے ہیں حیران نکلتے ہیں

تو گلی میں اس کی جا آوے اے صبا نہ چنداں
کہ گڑے ہوئے پھر اکھڑیں دل چاک دردمنداں

ترے تیر ناز کی جو یہ ہدف ہوئے ہیں ظالم
مگر آہنی توے ہیں جگر نیازمنداں

کبھو زلف سے بتاں کی نہ ہوا رہا ہیں ہرگز
یہی ہیں شکار خستہ یہی عنبریں کمنداں

تبھی کوند کوندا اتنا تو زمیں سے جائے مل مل
نہیں دیکھے برق تو نے دم خندہ اس کی دنداں

ہیں صفا کیا دل اتنا کہ دکھائی دیوے منھ بھی
و لے صفت اس آئینہ کو نہیں لیتے خودپسنداں

کھلیں آنکھیں ہیں جو دیکھا سو غم اور چشم گریاں
کسے کہتے ہیں نہ جانا دل شاد و روئے خنداں

تو زبوں شکار تو تھا و لے میر قتلگہ میں
ترے خوں سے ہیں حنائی کف پائے صید بنداں

کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہگیں نہیں
اس غم کدہ میں آہ دل خوش کہیں نہیں

کرتا ہے ابر دعوئ دریا دلی عبث
دامن نہیں مرا تو تری آستیں نہیں

آگے تو لعل نوخط خوباں کے دم نہ مار
ہر چند اے مسیح وے باتیں رہیں نہیں

یہ درد اس کے کیونکہ کروں دل نشیں کہ آہ
کہتا ہوں جس طرح سے کہے ہے نہیں نہیں

ماتھا گیا ہے صرف سجود در بتاں
مانند ماہ نو کے مرے اب جبیں نہیں

گھر گھر ہے ملک عشق میں دوزخ کی تاب و تب
بھڑکا نہ ہم کو شیخ یہ آتش یہیں نہیں

فکر بلند سے میں کیا آسماں اسے
ہر اک سے میر خوب ہو یہ وہ زمیں نہیں

وعدے کو یار آگے معیوب کر چکے ہیں
اس ریختے کو ورنہ ہم خوب کر چکے ہیں

مرنے سے تم ہمارے خاطر نچنت رکھیو
اس کام کا بھی ہم کچھ اسلوب کر چکے ہیں

حسن کلام کھینچے کیونکر نہ دامن دل
اس کام کو ہم آخر محبوب کر چکے ہیں

ہنگامۂ قیامت تازہ نہیں جو ہوگا
ہم اس طرح کے کتنے آشوب کر چکے ہیں

رنگ پریدہ قاصد باد سحر کبوتر
کس کس کے ہم حوالے مکتوب کر چکے ہیں

تنکا نہیں رہا ہے کیا اب نثار کریے
آگے ہی ہم تو گھر کو جاروب کر چکے ہیں

کیا جانئے کہ کیا ہے اے میر وجہ ضد کی
سو بار ہم تو اُس کو محجوب کر چکے ہیں

جو حیدری نہیں اُسے ایمان ہی نہیں
ہو گر شریف مکہ مسلمان ہی نہیں

وہ ترک صید پیشہ مرا قصد کیا کرے
دُبلے پنے سے تن میں مرے جان ہی نہیں

خال و خط ایسے فتنے نگاہیں یہ آفتیں
کچھ اک بلا وہ زلفِ پریشان ہی نہیں

ہیں جزوِ خاک ہم تو غبارِ ضعیف سے
سر کھینچنے کا ہم کنے سامان ہی نہیں

دیکھی ہو جس نے صورتِ دلکش وہ ایک آن
پھر صبر اُس سے ہو سکے امکان ہی نہیں

خورشید و ماہ و گل سبھی اودھر رہے ہیں دیکھ
اس چہرہ کا اک آئینہ حیران ہی نہیں

یکساں ہے تیرے آگے جو دل اور آرسی
کیا خوب و زشت کی تجھے پہچان ہی نہیں

سجدہ اُس آستاں کا نہ جس کو ہوا نصیب
وہ اپنے اعتقاد میں انسان ہی نہیں

کیا تجھکو بھی جنوں تھا کہ جامے میں تیرے میر
سب کچھ بجا ہے ایک گریبان ہی نہیں

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں
اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں

عجز و نیاز اپنا اپنی طرف ہے سارا
اس مشتِ خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں

صورت پذیر ہم بن ہرگز نہیں وے معنی
اہلِ نظر ہمیں کو معبود جانتے ہیں

عشق اُن کی عقل کو ہے جو ما سوا ہمارے
ناچیز جانتے ہیں نابود جانتے ہیں

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے
اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

یارب کسے ہے ناقہ ہر غنچہ اس چمن کا
راہِ وفا کو ہم تو مسدود جانتے ہیں

یہ ظلم بے نہایت دشوار تر کہ خوباں
بد وضعیوں کو اپنی محمود جانتے ہیں

کیا جانے دابِ صحبت از خویش رفتگاں کا
مجلس میں شیخ صاحب کچھ کود جانتے ہیں

مر کر بھی ہاتھ آوے تو میر مفت ہے وہ
جی کے زیان کو بھی ہم سود جانتے ہیں

تلوار غرقِ خوں ہے آنکھیں گلابیاں ہیں
دیکھیں تو تیری کب تک یہ بد شرابیاں ہیں

جب لے نقاب منھ پر تب دید کر کہ کیا کیا
در پردہ شوخیاں ہیں پھر بے محابیاں ہیں

چاہے ہے کج ہوں ہیں ہفت آسماں کے اوپر
دل کے مزاج میں بھی کتنی شتابیاں ہیں

جی بکھرے دل ڈہے ہے سر بھی گرا پڑے ہے
خانہ خراب تجھ بن کیا کیا خرابیاں ہیں

مہمان میر مت ہو خوانِ فلک پہ ہرگز
خالی یہ مہر و مہ کی دونوں رکابیاں ہیں

سن گوشِ دل سے اب تو سمجھ بے خبر کہیں
مذکور ہو چکا ہے مرا حال ہر کہیں

اب فائدہ سراغ سے بلبل کے باغباں
اطرافِ باغ ہوں گے پڑی مشت پر کہیں

عاشق ترے ہوئے تو ستم کچھ نہ ہو گیا
مرنا پڑا ہے ہم کو خدا سے تو ڈر کہیں

قطعہ

کچھ کچھ کہوں گا روز یہ کہتا تھا دل میں میں
آشفتہ طبع میر کو پایا اگر کہیں

سو کل ملا مجھے وہ بیاباں کی سمت کو
جاتا تھا اضطراب زدہ سا اُدھر کہیں

لگ چل کے میں برنگِ صبا یہ اُسے کہا
اے خانماں خراب ترا بھی ہے گھر کہیں

آشفتہ جا بجا جو پھرے ہے تو دشت میں
جاگہ نہیں ہے شہر میں تجھ کو مگر کہیں

خوں بستہ اپنی کھول مژہ پوچھتا بھی گر
رکھ ٹک تو اپنے حال کو مدِّ نظر کہیں

آسودگی سی جنس کو کرتا ہے کون صرف
جانے ہے نفع کوئی بھی جی کا ضرر کہیں

موتی سے تیرے اشک ہیں غلطاں کسو طرف
یاقوت کے سے ٹکڑے ہیں لختِ جگر کہیں

تا کے یہ دشت گردی و کب تک یہ خستگی
اس زندگی سے کچھ تجھے حاصل بھی مر کہیں

کہنے لگا وہ ہو کے پرآشفتہ یک بیک
مسکن کرے ہے دہر میں مجھ سا بشر کہیں

آوارگوں کا ننگ ہے سننا نصیحتیں
مت کہیو ایسی بات تو بارِ دگر کہیں

تعیینِ جا کو بھول گیا ہوں پہ یہ ہے یاد
کہتا تھا ایک روز یہ اہلِ نظر کہیں

بیٹھے اگرچہ نقش ترا تو بھی دل اٹھا
کرتا ہے جائے باش کوئی رہ گزر کہیں

کتنے ہی آئے لے کے سر پر خیال پر
ایسے گئے کہ کچھ نہیں اُن کا اثر کہیں

اب کچھ ہمارے حال پہ تم کو نظر نہیں
یعنی تمھاری ہم سے وے آنکھیں نہیں رہیں

اس بزم کے چراغ بجھے تھے جو یار میر
اُن کے فروغ باغ میں گل ہیں کہیں کہیں

پلکوں سے تیرے شائق ہم سر جو پٹکتے ہیں
ہر دم جگروں میں کچھ کانٹے سے کھٹکتے ہیں

میں پھاڑ گریباں کو درویش ہوا آخر
وے ہاتھ سے دامن کو اب تک بھی جھٹکتے ہیں

یاد آوے ہے جب شب کو وہ چہرۂ مہتابی
آنسو مرے پلکوں سے تارے سے چھٹکتے ہیں

کی راہبری میری صحرائے محبت میں
یھاں حضرت خضرؑ آپھی مدت سے بھٹکتے ہیں

جاتے نہ کوئی دیکھا اُس تیغ کے منھ اوپر
وھاں میان سے وہ لے ہے یھاں یار سٹکتے ہیں

کیا تم کو اچنبھا ہے سختی کا محبت میں
دشوار ہی ہوتا ہے دل جن کے اٹکتے ہیں

تو طرۂ جاناں سے چاہے ہے ابھی مقصد
برسوں سے پڑے ہم تو اے میر لٹکتے ہیں

سب خوبیاں ہیں شیخ مشیخت پناہ میں
پر ایک حیلہ سازی ہے اُس دستگاہ میں

مانند شمع ہم نے حضور اپنے یار کے
کارِ دنا تمام کیا ایک آہ میں

میں صید جو ہوا تو ندامت لیے ہوئے
اک قطرہ خون بھی نہ گرا صیدگاہ میں

پہنچے نہیں کہیں کہ نہیں واں سے اُٹھ چلے
القصہ ایک عمر سے ہم ہیں گے راہ میں

نکلا تھا آستین سے کل مغبچے کا ہاتھ
بہتوں کے خرقے چاک ہوئے خانقاہ میں

بخت سیہ تو دیکھو کہ ہم خاک میں ملے
سرمے کی جا ہوئے تری چشم سیاہ میں

بیٹھے تھے میر یار کے دیدار کو سو ہم
اپنا یہ حال کر کے اٹھے اک نگاہ میں

کیا جو عرض کہ دل سا شکار لایا ہوں
کہا کہ ایسے تو میں مفت مار لایا ہوں

کہے تو نخل صنوبر ہوں اس چمن میں میں
کہ سر سے پانوں تلک دل ہی بار لایا ہوں

جہاں میں گریہ نہ پہنچا بہم مجھے دلخواہ
پہ نوحؑ کے سے تو طوفاں ہزار لایا ہوں

نہ تنگ کر اسے اے فکر روزگار کہ میں
دل اُس سے دم کے لیے مستعار لایا ہوں

پھر اختیار ہے آگے ترا یہ ہے مجبور
کہ دل کو تجھ تئیں بے اختیار لایا ہوں

یہ جی جو میرے گلے کا ہے ہار تو ہی لے
ترے گلے کے لئے میں یہ ہار لایا ہوں

چلا نہ اُٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر
ابھی تو اُس کی گلی سے پکار لایا ہوں

جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب بُرائیاں دیکھیں

تری گلی سے سدا اے کشندۂ عالم
ہزاروں آتی ہوئی چارپائیاں دیکھیں

گیا نظر سے جو وہ گرمِ طفلِ آتش باز
ہم اپنے چہرے پہ اُڑتی ہوائیاں دیکھیں

ترے وصال کے ہم شوق میں ہو آوارہ
عزیز دوست سبھوں کی جدائیاں دیکھیں

ہمیشہ مائلِ آئینہ ہی تجھے پایا
جو دیکھیں ہم نے یہی خودنمائیاں دیکھیں

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

بنی نہ اپنی تو اُس جنگجو سے ہرگز میر
لڑائیں جب سے ہم آنکھیں لڑائیاں دیکھیں

خوش قداں جب سوار ہوتے ہیں
سرو قمری شکار ہوتے ہیں

تیرے بالوں کے وصف میں میرے
شعر سب پیچدار ہوتے ہیں

آؤ یادِ بتاں پہ بھول نہ جاؤ
یہ تغافل شعار ہوتے ہیں

دیکھ لیویں گے غیر کو تجھ پاس
صحبتوں میں بھی یار ہوتے ہیں

صدقے ہو لیویں ایک دم تیرے
پھر تو تجھ پر نثار ہوتے ہیں

ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں
دلی سے بھی دیار ہوتے ہیں

رفتہ رفتہ یہ طفل خوش ظاہر
فتنۂ روزگار ہوتے ہیں

اُس کے نزدیک کچھ نہیں عزت
میر جی یوں ہی خوار ہوتے ہیں

وے جو حسن و جمال رکھتے ہیں
سارے تیرا خیال رکھتے ہیں

شب جو وہ مہ کبھو سہی ہے یہاں
مدتوں پار سال رکھتے ہیں

ان لبوں کا جواب وہ ہی لعل
ہم تجھی سے سوال رکھتے ہیں

گل ترے روزگار خوبی میں
منہ طمانچوں سے لال رکھتے ہیں

دہنِ تنگ کے ترے مشتاق
آرزوے محال رکھتے ہیں

خاکِ آدم ہی ہے تمام زمین
پانوں کو ہم سنبھال رکھتے ہیں

یہ جو سر کھینچتے قیامت ہیں
دل کو ہم پائمال رکھتے ہیں

اہلِ دل چشم سب تری جانب
آئینہ کی مثال رکھتے ہیں

گفتگو ناقصوں سے ہے ورنہ
میر جی بھی کمال رکھتے ہیں

صبر و طاقت کو کڑھوں یا خوش دلی کا غم کروں
اس میں حیراں ہوں بہت کس کس کا میں ماتم کروں

موسم حیرت ہے دل بھر کر تو رونا کل چکا
اتنے بھی آنسو بہم پہنچیں کہ مژگاں نم کروں

ہوں سیہ مست سر زلف صنم معذور رکھ
شیخ اگر کعبے سے آوے گفتگو درہم کروں

ریزۂ[۱] الماس یا مشت نمک ہے کیا برا
جو میں اپنے ایسے زخم سینہ کو مرہم کروں

گرچہ کس گنتی میں ہوں پر ایک دم مجھ تک تو آ
یا ادھر ہوں یا ادھر کب تک شمار دم کروں

بس بہت رسوا ہوا میں اب نہیں مقدور کچھ
وہ طرح ڈھونڈوں ہوں جس میں ربط تجھ سے کم کروں

گو دھواں اٹھنے لگا دل سے مرے پر پیچ و تاب
میر اس پر قطع ربط زلف خم در خم کروں

کیا میں نے رو کر فشار گریباں
رگ ابر تھا تار تار گریباں

کہیں دست چالاک ناخن نہ لاگے
کہ سینہ ہے قرب جوار گریباں

نشان اشک خونیں کے اٹھتے چلے ہیں
خزاں ہو چلی ہے بہار گریباں

جنوں تیری منت ہے مجھ پر کہ تو نے
نہ رکھا مرے سر پہ بار گریباں

زیارت کروں دل سے خستہ جگر کی
کہاں ہوگا یارب مزار گریباں

کہیں جائے یہ درد دامن بھی جلدی
کہ آخر ہوا روزگار گریباں

پھروں میر عریاں نہ دامن کا غم ہو
نہ باقی رہے خار خار گریباں

بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں[۲]
طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں

عشق میں ایذائیں سب سے پائیاں
رہ گئے آنسو تو آنکھیں آئیاں

نخل حق ہم کو بھی وہ ہی چاہیے
جوں ہماری ہوتی ہیں پہنائیاں

اس مژہ برہم زدہ نے بارہا
عاشقوں میں برچھیاں چلوائیاں

نو نہال آگے ترے ہیں جیسے ہوں
ڈالیاں ٹوٹی ہوئیں مرجھائیاں

ایک بھی چشمک اس مہ کی سی کر
آنکھیں تاروں نے بہت جھمکائیاں

ایک نے صورت نہ پکڑی پیش یار
دل میں شکلیں سیکڑوں ٹھہرائیاں

[۱] مرزا غالب دہلوی سے فراغت کس قدر ہوتی مجھے تشویش مرہم سے ؎ بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر
[۲] صیغہ ہائے جمع مونث کو فی زمانا اس طرح استعمال کرنا متروک ہے

رو ہت اپنی اس گلی میں کم نہیں
ہر جگہ ہر بار ماریں کھائیاں

بوسہ لینے کا کیا جس دم سوال
اُن نے باتیں ہی ہمیں بتلائیاں

رو کشی کو اُس کے منہ بھی چاہیے
ماہ کے چہرہ پہ ہیں سب جھائیاں

مضطرب ہو کر کیا سب میں سبک
دل نے آخر خفتیں دلوائیاں

چل چمن میں یہ بھی ہے کوئی روش
ناز تا کے چند بے پروائیاں

شوق قامت میں ترے اے نونہال
گل کی شاخیں لیتی ہیں انگڑائیاں

پاس مجھ کو بھی نہیں ہے میر اب
دور پہنچی ہیں مری رسوائیاں

دیکھیں تو تیری کب تک یہ کج ادائیاں ہیں
اب ہم نے بھی کسو سے آنکھیں لڑائیاں ہیں

ٹک سن کہ سو برس کی ناموسِ خامشی کھو
دو چار دل کی باتیں اب منہ پر آئیاں ہیں

ہم وے ہیں خوں گرفتہ ظالم جنھوں نے تیری
ابرو کی جنبش اوپر تلواریں کھائیاں ہیں

آئینہ ہو کے صورت معنی سے ہے لبالب
راز نہان حق میں کیا خود نمائیاں ہیں

کعبے میں میر ہم پر یا سر گراں ہے تراہ
یا بتکدے میں ہم نے دھولیں لگائیاں ہیں

میں کون ہوں اے ہمنفساں سوختہ جاں ہوں
اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں

پنجہ ہے مرا پنجۂ خورشید میں ہر صبح
میں شانہ صفت سایۂ زلفِ بتاں ہوں

دیکھا ہے مجھے جن نے سو دیوانہ ہے میرا
میں باعثِ آشفتگیِ طبعِ جہاں ہوا

تکلیف نہ کر آہ مجھے جنبشِ لب کی
میں صد سخن آغشتہ بخوں زیرِ زباں ہوں

ہوں زرد غمِ تازہ نہالانِ چمن سے
اس باغِ خزاں دیدہ میں میں برگِ خزاں ہوں

رکھتی ہے مجھے خواہشِ دل بلکہ پریشاں
در پے نہ ہو اس وقت خدا جانے کہاں ہوں

اک وہم نہیں بیش مری ہستی موہوم
اس پر بھی تری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں

خوشباشی و تنزیہ و تقدس تھی مجھے میر
اسباب پڑے یوں کہ کئی روز سے یہاں ہوں

اب آنکھوں میں خوں دمبدم دیکھتے ہیں
نہ پوچھو جو کچھ رنگ ہم دیکھتے ہیں

جو بے اختیاری یہی ہے تو قاصد
ہمیں آکے اُس کے قدم دیکھتے ہیں

لگے داغ رہتا ہے دل کہ جگر خوں
ان آنکھوں سے کیا کیا ستم دیکھتے ہیں

اگر جان آنکھوں میں اُس بن ہے تو ہم
ابھی اور بھی کوئی دم دیکھتے ہیں

لکھیں حال کیا اُس کو حیرت سے ہم تو
لگے کاغذ و گہ قلم دیکھتے ہیں

وفا پیشگی قیس تک تھی بھی کچھ کچھ
اب اس طور کے لوگ کم دیکھتے ہیں

کہاں تک بھلا روؤگے میر صاحب
اب آنکھوں کے گرد اک ورم دیکھتے ہیں

بہت ہی اپنے تئیں ہم تو خوار پاتے ہیں
وہ کوئی اور ہیں جو اعتبار پاتے ہیں

تری گلی میں میں سو دیا تھا دل جلا یکشب
ہنوز وھاں سے دلِ داغدار پاتے ہیں

ہنوویں شیفتہ کیوں اضطراب پر عاشق
کہ جی کو کھو کے دلِ بیقرار پاتے ہیں

گلہ عبث ہے تری آستانہ بوسی کا
مسیح و خضر بھی وھاں کم ہی بار پاتے ہیں

قطعہ

تڑپ ہے قیس کے دل میں تہ زمیں اس سے
غزالِ دشت نشانِ مزار پاتے ہیں

دگرنہ خاک ہوئے کتنے ہی محبت میں
کسی کا بھی کہیں مشتِ غبار پاتے ہیں

تسلی آوے اجل میر جاوے یہ رونا
کہ میرے شور سے تصدیع یار پاتے ہیں

عام حکم شراب کرتا ہوں
محتسب کو کباب کرتا ہوں

ٹک تو رہ اے بنائے ہستی تو
تجھ کو کیسا خراب کرتا ہوں

قطعہ

کوئی بجھتی ہے یہ بھڑک میں عبث
تشنگی پر عتاب کرتا ہوں

سر تلک آب تیغ میں ہوں غرق
اب تئیں آب آب کرتا ہوں

جی میں پھرتا ہے میر وہ میرے
جاگتا ہوں کہ خواب کرتا ہوں

ہم تو مضطرب لپیر کے جاتے ہیں
گو رقیباں کچھ اور گاتے ہیں

خاک میں لوٹتے تھے کل تجھ بن
آج لوہو میں ہم نہاتے ہیں

اے عدم ہونے والو تم تو چلو
ہم بھی اب کوئی دم میں آتے ہیں

ایک کہتا ہوں میں تو منہ پہ رقیب
تیری پشتی سے سو سناتے ہیں

دیدہ و دل شتاب گم ہوں میر
سر پہ آفت ہمیشہ لاتے ہیں

آتا ہے دل میں حال بد اپنا بھلا کہوں
پھر آپ ہی آپ سوچ کے کہتا ہوں کیا کہوں

پروانہ پھر نہ شمع کی خاطر جلا کرے
گر بزم میں یہ اپنا ترا ماجرا کہوں

مت کر خرام سر پہ اٹھاوے گا خلق کو
بیٹھا اگر گلی میں ترا نقش پا کہوں

دل اور دیدہ باعث ایذا و نور عین
کس کے تئیں برا کہوں کس کو بھلا کہوں

آوے سموم جائے صبا باغ سے سدا
گر شمہ اپنے سوز جگر کا میں جا کہوں

جاتا ہوں میر دشت جنوں کو میں اب یہ کہہ
مجنوں کہیں ملے تو تری بھی دعا کہوں

مرے آگے نہ شاعر نام پاویں
قیامت کو مگر عرصے میں آویں

پری سمجھے تجھے وہم و گماں سے
کہاں تک اور ہم اب دل چلاویں

مزاج اپنا غیور از بس پڑا ہے
ترے غم میں کسے خاطر میں لاویں

پھرے ہے شیخ مجلس ہی میں رقصاں
ادھر آ نکلے تو ہم بھی نچاویں

لنڈھائے ابر اب مت آ صبا دا
کہیں میری بھی آنکھیں ڈبڈباویں

قدم بوسی تلک مختار ہیں غیر
زیادہ لگ چلیں تو سریں کھاویں

قطعہ

نہ آیا وہ تو کیا ہم نیم جاں بھی
بغیر اس کے ملے دنیا سے جاویں

چلے ہے تو تو اے جان المناک
ٹک اک رہ جا کہ ہم رخصت ہو آویں

چلا مقدور سے غم میر آگے
زمیں پھٹ جائے یارب ہم سماویں

مثال سایہ محبت میں جال اپنا ہوں
تمھارے ساتھ گرفتار حال اپنا ہوں

سرشک سرخ کو جاتا ہوں جو پیے ہر دم
لہو کا پیاسا علی الاتصال اپنا ہوں

اگرچہ نشہ ہوں سب میں خم جہاں میں لیک
برنگ موج عرق انفعال اپنا ہوں

مری نمود نے مجھ کو کیا برابر خاک
میں نقش پا کی طرح پائمال اپنا ہوں

ہوئی ہے زندگی دشوار مشکل آساں کر
پھروں چلوں تو ہوں جی میں وبال اپنا ہوں

ترا ہے وہم کہ یہ ناتواں ہے جامے میں
وگرنہ میں نہیں اب اک خیال اپنا ہوں

بلا ہوئی ہے مری گو کہ طبع روشن میر
ہوں آفتاب ولیکن زوال اپنا ہوں

کھو دیں ہیں نیند میری مصیبت بیانیاں
تم بھی تو ایک رات سنو یہ کہانیاں

کیا آگ دیجے طور کو کی ترک سرکشی
اُس شعلہ کی دہی ہیں شرارت کی بانیاں

صحبت رکھا کیا وہ سفیہ و ضلال سے
دل ہی میں خوں ہوا کیں مری نکتہ دانیاں

ہم سے تو کینے ہی کی ادائیں چلی گئیں
بے لطفیاں یہی یہی نامہربانیاں

تلوار کے تلے ہی گیا عہد انبساط
مر مر کے ہم نے کاٹی ہیں اپنی جوانیاں

گالی سوائے مجھ سے سخن مت کیا کرو
اچھی لگی ہیں مجھ کو تری بد زبانیاں

غیروں ہی کے سخن کی طرف گوشِ یار تھی
اس حرف ناشنو نے ہماری نہ مانیاں

یہ بیقراریاں نہ کبھو اُن نے دیکھیاں
جاں کاہیاں ہماری بہت سہل جانیاں

مارا مجھے بھی سان کے غیروں میں ان نے میر
کیا خاک میں ملائیں مری جاں فشانیاں

تا پھونکیے نہ خرقۂ طامات کے تئیں
حسنِ قبول کیا ہو مناجات کے تئیں

کیفیتیں اٹھی ہیں یہ کب خانقاہ میں
بدنام کر رکھا ہے خرابات کے تئیں

ڈریے خرامِ ناز سے خوباں کے ہمنشیں
ٹھوکر سے یہ اٹھاتے ہیں آفات کے تئیں

ہم جانتے ہیں یا کہ دل آشنا زدہ
کہیے سو کس سے عشق کے حالات کے تئیں

خوبی کو اُس کی ساعدِ سیمیں کی دیکھ کر
صورت گروں نے کھینچ رکھا ہات کے تئیں

اتنی بھی حرف ناشنوی غیر کے لئے
رکھ کان ٹک سنا بھی کرو بات کے تئیں

سید ہو یا چمار ہو اس جا وفا ہے شرط
کب عاشقی میں پوچھتے ہیں ذات کے تئیں

آخر کے یہ سلوک ہم اب تیرے دیکھ کر
کرتے ہیں یاد پہلی ملاقات کے تئیں

آنکھوں نے میر صاحب و قبلہ ورم کیا
حضرت بکا کیا نہ کرو رات کے تئیں

ے جامی سے بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی ؎ کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست
ہندی شاعر کہتا ہے ے ذات پات پوچھے نہ کوئے ؎ ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے۔

نہ اک یعقوب رویا اس الم میں
کنواں اندھا ہوا یوسفؑ کے غم میں

کہوں کب تک دم آنکھوں میں ہے میرے
نظر آوے ہی گا اب کوئی دم میں

دیا عاشق نے جی تو عیب کیا ہے
یہی میرؔ اک ہنر ہوتا ہے ہم میں

چاہتے ہیں یہ بتاں ہم پہ کہ بیداد کریں
کس کے ہوں کس سے کہیں کس کنے فریاد کریں

ایک دم پر ہے بنا تیری سو آیا کہ نہیں
وہ کچھ اس زندگی میں کر کہ تجھے یاد کریں

کعبہ ہوتا ہے دوانوں کا مری گور سے دشت
مجھ سے دو اور گڑیں یہاں تو سب آباد کریں

ہم تو راہب نہیں ہیں واقفِ رسمِ سجدہ
ہیں کدھر شیخِ حرم کچھ ہمیں ارشاد کریں

ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کریں
چاہیئے اہلِ سخن میرؔ کو استاد کریں

ہجراں کی کوفت کھینچے بیدم سے ہو چلے ہیں
سر مار مار یعنی اب ہم بھی سو چلے ہیں

جوئیں رہیں گی جاری گلشن میں ایک مدت
سایہ میں ہر شجر کے ہم زور رو چلے ہیں

لبریز اشک آنکھیں ہر بات میں رہا کیں
رو رو کے کام اپنے سب ہم ڈبو چلے ہیں

پچھتائیے نہ کیونکر جی اس طرح سے دیکر
یہ گوہرِ گرامی کہہ مفت کھو چلے ہیں

قطعِ طریق مشکل ہے عشق کا نہایت
وے میرؔ جانتے ہیں اس راہ جو چلے ہیں

جب[1] دردِ دل کا کہنا میں دل میں ٹھانتا ہوں
کہتا ہے بن سنے ہی میں خوب جانتا ہوں

شاید نکل بھی آوے دل گم جو ہو گیا ہے
اس کی گلی میں بیٹھا میں خاک چھانتا ہوں

اس دردِ سر کا لٹکا سے لگا ہے میرے
سو سر کا ہووے صندل میں میرؔ مانتا ہوں

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھئے کیا ہے کیا نہیں
تم تو کرو ہو صاحبی بندہ میں کچھ رہا نہیں

بوئے[2] گل اور رنگِ گل دونوں ہیں دلکش اے نسیم
لیک بقدرِ یک نگاہ دیکھئے تو وفا نہیں

شکوہ کروں ہوں بخت کا اتنے غضب نہو بتاں
مجھ کو خدا نخواستہ تم سے تو کچھ گلا نہیں

[1] مرزا غالبؔ دہلوی سے ؎ ہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب ؎ کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیے۔
[2] مصرعہ تذکرہ میر میں اس طرح ملتا ہے ؎ بوئے گل اور رنگِ گل اللہ ہی اللہ ہے نسیم ؎ لیک بقدرِ یک نگاہ دیکھیے تو وفا نہیں

نالے کیا نہ کر سُنا نوحے مرے پہ عندلیب — بات میں بات عیب ہے میں نے تجھے کہا نہیں
چشم سفید و اشک سرخ آہ دلِ حزیں ہے یہاں — شیشہ نہیں ہے مے نہیں ابر نہیں ہوا نہیں
ایک فقط ہے سادگی تس پہ بلائے جاں ہے تو — عشوہ کرشمہ کچھ نہیں آن نہیں ادا نہیں
آب و ہوائے ملکِ عشق تجربہ کی ہے میں بہت — کر کے دوائے دردِ دل کوئی بھی پھر جیا نہیں
ہووے زمانہ کچھ سے کچھ چھوٹے ہے دل لگا مرا — شوخ کسی ہی آن میں تجھ سے تو میں جدا نہیں
ناز بتاں اُٹھا چکا دیر کو میرؔ ترک کر — کعبے میں جا کے رہ میاں تیرے مگر خدا نہیں

خوبرو سب کی جان ہوتے ہیں — آرزوئے جہان[۱] ہوتے ہیں
گوش دیوار تک تو جا نالے — اس میں گل کو بھی کان ہوتے ہیں
کبھو آتے ہیں آپ میں تجھ بن — گھر میں ہم میہمان ہوتے ہیں
دشت کے پھوٹے مقبروں پہ نہ جا — روضے سب گلستان ہوتے ہیں
غمزۂ چشم خوش قدانِ زمیں — فتنۂ آسمان ہوتے ہیں

قطعہ
کیا رہا ہے مشاعرے میں اب — لوگ کچھ جمع آن ہوتے ہیں
میرؔ و مرزا رفیع[۲] و خواجہ میر[۳] — کتنے یہ اک جوان ہوتے ہیں

۱ اعلانِ نون بعد عطف و اضافت اب فصحا جائز نہیں رکھتے۔ ۲ یعنی مرزا رفیع سودا

۳ خواجہ میر یعنی حضرت خواجہ میر درد دہلوی جو میر تقی میرؔ کے معاصر ہی نہیں بلکہ خاص کرم فرما تھے اور آپ ہی کے والد ماجد خواجہ ناصر عندلیبؔ نے میر صاحب کو دُعا دی تھی "کہ میر تو میرِ مجلس خواہی شد"۔ یہ غالباً اسی مشاعرہ کا ذکر ہے جو خواجہ میر درد کے مکان پر منعقد ہوتا تھا اور جو اُنھوں نے خوشی سے میر صاحب کے یہاں منتقل کر دیا تھا اور میر صاحب بھی اُس کو مدتوں نباہتے رہے۔

خواجہ میر درد اُردو اور فارسی کے زبردست اُستاد اور نہایت مستند تھے میر صاحب نے اپنے تذکرے میں اُن کے متعلق رائے لکھی ہے۔ "شاعر زور آور ریختہ۔ درکمال علاقگی دارستہ خلیق متواضع۔ آشنائے درست شعر فارسی ہم میگوید۔ اما بیشتر باعث گرمی بازار وسعت مشرب اوست۔ غرض از آشنائی مطلب اوست متوطن شاہجہان آباد۔ بزرگ بزرگزادہ جوان صالح از درویشی بہرہ وافی دارد فقیر را بخدمت او بندگی خاص است الخ"۔ عمر بھر دہلی میں رہے انتقال بھی دہلی ہی میں ہوا۔ سنہ ولادت ۱۱۳۳ھ اور سنہ وفات ۱۱۹۹ھ ہے۔ آپ کی تصانیف قریب گیارہ بارہ کے ہیں۔ انتہی۔

تجھ عشق میں[1] تو مرنے کو تیار بہت ہیں
یہ جرم ہے تو ایسے گنہگار بہت ہیں

اک زخم کو میں ریزۂ الماس سے چیرا
دل پر ابھی جراحتِ نوکار بہت ہیں

کچھ انکھڑیاں ہی اسکی نہیں اک بلا کہ بس
دل زینہار دیکھ خبردار بہت ہیں

بیگانہ خو رقیب سے وسواس کچھ نہ کر
فرماوے ٹک زباں سے تو پھر یار یہ بہت ہیں

کوئی تو زمزمہ کرے میر آسا دلخراش
یوں تو قفس میں اور گرفتار بہت ہیں

جنوں میرے کی باتیں دشت اور گلشن میں جب چلیاں
نہ چوبِ گل نے دم مارا نہ چھڑیاں بید کی ہلیاں

گریباں شورِ محشر کا اٹھایا دھجیاں کر کر
فغاں پر ناز کرتا ہوں کہ بل بے تیری ہتھ بلیاں

تفاوت کچھ نہیں شیریں و شکر اور یوسف میں
سبھی معشوق اگر پوچھے کوئی مصری کی ہیں ڈلیاں

ترے غمزے نے جور و ظلم سے آنکھیں غزالوں کی
بیاباں میں دکھا مجنوں کو پاؤں کے تلے ملیاں

چمن کو آج مارا ہی میاں تک رشکِ گل رو نے
کہ بلبل سر پٹکتی ہے نہیں منہ کھولتیں کلیاں

مری آہِ سحر کی برچھیاں سختی کے ترچھوں پر
نگاہیں کر کے گر پڑتی ہے بجلی کی بھی اچھلیاں

صنم کی زلف میں کوچہ ہے سر بستہ ہر اک مو پر
نہ دیکھی ہونگی تو نے خضر یہ ظلمات میں گلیاں

دوانہ ہو گیا تو میر آخر ریختہ کہہ کہہ
نہ کہتا تھا میں اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

ایسے محروم گئے ہم تو گرفتارِ چمن
کہ موئے قید میں دیوار بدیوارِ چمن

سینہ پر داغ کا احوال میں پوچھوں ہوں نسیم
یہ بھی تختہ کبھو ہووے گا سزاوارِ چمن

باغباں باغ اجاڑے ہی اگر دینا تھا
تھے زرِ داغ سے ہم بھی تو خریدارِ چمن

وے گنہگار ہمیں ہیں کہ جنھیں کہتے ہیں
عاشقِ زارِ چمن مرغِ گرفتارِ چمن

خون ٹپکے ہے پڑا نوک سے ہر اک کی ہنوز
کس ستمدیدہ کی مژگاں ہیں یہ خارِ چمن

باغباں ہم سے خشونت سے نہ پیش آیا کر
عاقبت نالہ کشاں بھی تو ہیں درکارِ چمن

کم نہیں ہے دلِ پر داغ بھی اے مرغِ اسیر
گل میں کیا ہے جو ہوا ہے تو طلبگارِ چمن

گل پہ ایسی تو پڑی اوس خزاں میں کہ نسیم
سرد ہی ہو گئی واں گرمیِ بازارِ چمن

کیا جزا ٹھہرتی ہے دیکھئے کل حشر کو میر
داغ ہر ایک مرے دل پہ ہے خوندارِ چمن

[1] اصل نسخوں میں یہ غزل اسی طرح ہے۔

بزم میں جو ترا ظہور نہیں
شمع روشن کے منہ پہ نور نہیں

کتنی باتیں بنا کے لاؤں ایک
یاد رہتی ترے حضور نہیں

قطعہ
فکر مت کر ہمارے جینے کا
تیرے نزدیک کچھ یہ دور نہیں

پھر جئیں گے جو تجھ سا ہے جاں بخش
ایسا جینا ہمیں ضرور نہیں

عام ہے یار کی تجلی میر
خاص موسیٰ و کوہِ طور نہیں

دامن پہ تیرے گرد کا کیونکر اثر نہیں
ہم دل جلوں کی خاک جہاں میں کدھر نہیں

اتنا رقیب خانہ برانداز سے سلوک
جب آنکلتے ہیں تو سنتے ہیں کہ گھر نہیں

دامان و جیب دیدہ و مژگان و آستیں
اب کون سا رہا ہے کہ ان میں سے تر نہیں

ہر نقشِ پا ہے شوخ ترا رشکِ یاسمن
کم گوشۂ چمن سے ترا رہگزر نہیں

آتا ہی میر کوچے میں ہوتا جو میر یہاں
کیا جانئے کدھر کو گیا کچھ خبر نہیں

ساقی کے باغ پر جو کچھ کم نگاہیاں ہیں
مانند جام خالی گل سب جماہیاں ہیں

تیغ جفائے خوباں بے آب تھی کہ ہمدم
زخم بدن ہمارے تفسیدہ ماہیاں ہیں

مسجد سے میکدے پر کاش ابر روز برسے
دھاں روسفیدیاں ہیں یہاں روسیاہیاں ہیں

جس کی نظر پڑی ہے اُن نے مجھے بھی دیکھا
جب سے وہ شوخ آنکھیں بے سر اسپاہیاں ہیں

غالب تو یہ ہے زاہد رحمت سے دور ہووے
در کار واں گنہ ہیں یہاں بیگناہیاں ہیں

یہ ناز و سرگرانی اللہ رے کہ ہر دم
نازک مزاجیاں ہیں یا کج کلاہیاں ہیں

شاہد لوں میر کس کو اہل محلے میں
محضر پہ خوں کے میرے سب کی گواہیاں ہیں

تجھے بھی یار اپنا یوں تو ہم ہر بار کہتے ہیں
ولے کم ہیں بہت وے لوگ جن کو یار کہتے ہیں

جہاں کے بیچ طے ہیں مست طافح ہی نظر آئے
نہ تھا اس دور میں آیا جسے ہشیار کہتے ہیں

سمجھ کر ذکر کر آسودگی کا مجھ سے اے ناصح
وہ میں ہی ہوں کہ جس کو عافیت بیزار کہتے ہیں

مسافر ہو وے جی اُس کا خراماں دیکھکر تجھ کو
جسے میرے وطن میں کبکِ خوش رفتار کہتے ہیں

معاذ اللہ دخلِ کفر ہو اسلام میں کیوں ہم
غلط اور پوچ نامعقول بعضے یار کہتے ہیں

علم کو کب ہے وجہ تسمیہ لازم سمجھ دیکھو — سلیمانی میں کیا زنار ہی زنار کہتے ہیں
تری آنکھوں کو آؤں دیکھنے میں تو عجب مت کر — کہ بہتر ہے عیادت اور انھیں بیمار کہتے ہیں
عجب ہوتے ہیں شاعر بھی میں اس فرقے کا عاشق ہوں — کہ بے دھڑکے بھری مجلس میں یہ اسرار کہتے ہیں
مزے ان کے اُڑا لیکن نہ یہ سمجھیں تو بہتر ہے — کہ خوباں بھی بہت اپنے تئیں عیار کہتے ہیں

سگِ کو میر میں اس شیرِ حق کا ہوں کہ جسکو سب
نبیؐ کا خویش و بھائی حیدرِ کرارؑ کہتے ہیں

ایک پرواز کو بھی رخصتِ صیاد نہیں — ورنہ یہ کنجِ قفس بیضۂ فولاد نہیں
شیخ عزلت تو تہِ خاک بھی پہنچیگی بہم — مفت ہے سیر کہ یہ عالمِ ایجاد نہیں
داد لے چھوڑوں میں صیاد سے اپنے لیکن — ضعف سے میرے تئیں طاقتِ فریاد نہیں
کیوں ہے معذور بھی رکھیوں تو سمجھ دل میں شیخ — یہ قدح خوار مرے قابلِ ارشاد نہیں

کیا کہوں میر فراموش کیا اُن نے تجھے
میں تو تقریب بھی کی پر تو اُسے یاد نہیں

آجائیں ہم نظر جو کوئی دم بہت ہے یہاں — مہلت ہمیں بسانِ شرر کم بہت ہے یہاں
یک لحظہ سینہ کوبی سے فرصت ہمیں نہیں — یعنی کہ دل کے جانیکا ماتم بہت ہے یہاں
حاصل ہے کیا سوائے ترائی کے دہر میں — اُٹھ آسماں تلے سے کہ شبنم بہت ہے یہاں
مائل بغیر ہونا تجھ ابرو کا عیب ہے — تھی زور یہ کماں ولے خم چم بہت ہے یہاں
ہم رہروانِ راہِ فنا دیر رہ چکے — وقفہ بسانِ صبح کوئی دم بہت ہے یہاں
اس بتکدے میں معنی کا کس سے کریں سوال — آدم نہیں ہے صورتِ آدم بہت ہے یہاں
عالم میں لوگ ملنے کی گوں اب نہیں رہے — ہر چند ایسا ویسا تو عالم بہت ہے یہاں
ویسا چمن سے سادہ نکلتا نہیں کوئی — رنگینی ایک اور خم و چم بہت ہے یہاں
اعجازِ عیسوی سے نہیں بحث عشق میں — تیری ہی بات جانِ مجسم بہت ہے یہاں
میرے ہلاک کرنے کا غم ہے عبث تمھیں — تم شاد زندگانی کرو غم بہت ہے یہاں
دل مت لگا رُخِ عرق آلود یار سے — آئینہ کو اُٹھا کہ زمیں نم بہت ہے یہاں

شاید کہ کام صبح تک اپنا کھنچے نہ میر
احوال آج شام سے درہم بہت ہے یہاں

آہ وہ عاشقِ ستم ترکِ جفا کرتا نہیں
اور مطلق اب دماغ اپنا وفا کرتا نہیں

بات میں غیروں کو چپ کر دوں ولیکن کیا کروں
وہ سخن نشنو تنک میرا کہا کرتا نہیں

روز بدتر جیسے بیمارِ اجل ہے دل کا حال
یہ سمجھ کر ہمنشیں اب میں دوا کرتا نہیں

گویا بابِ اجابت ہجر میں تیغا ہوا
ورنہ کس شب آپ کو میں بددعا کرتا نہیں

بیکسانِ عشق اُس کی آہ کس کے پاس جائیں
گور بن کوئی صلا میں لب کو وا کرتا نہیں

چھوٹنا ممکن نہیں اپنا قفس کی قید سے
مرغِ سیر آہنگ کو کوئی رہا کرتا نہیں

چرخ کی بھی کج ادائی ہم ہی پر جاتی ہے پیش
ناز کو اس سے تو اک دم بھی جدا کرتا نہیں

دیکھ اُسے بیدید ہو آنکھوں نے کیا دیکھا بھلا
دل بھی بد کرتا ہے مجھ سے تو بھلا کرتا نہیں

کیا کہوں پہنچا کہاں تک میر اپنا کارِ شوق
یاں سے کس دن اک نیا قاصد چلا کرتا نہیں

لیتے ہیں سانس یوں ہم جوں تار کھینچتے ہیں
اب دل گرفتگی سے آزار کھینچتے ہیں

سینہ سپر کیا تھا جن کے لئے بلا کا
وے بات بات میں اب تلوار کھینچتے ہیں

مجلس میں تیری ہمکو کب غیر خوش لگے ہے
ہم بیچ اپنے اُس کے دیوار کھینچتے ہیں

بیطاقتی نے ہم کو چاروں طرف سے کھویا
تصدیع گھر میں بیٹھے ناچار کھینچتے ہیں

منصور کی حقیقت تم نے سنی ہی ہوگی
حق جو کہے ہے اُس کو یاں دار کھینچتے ہیں

شکوہ کروں تو کس سے کیا شیخ کیا برہمن
ناز اُس بلائے جاں کے سب یار کھینچتے ہیں

ناوک سے میر اُس کے دل بستگی تھی مجھ کو
پیکاں جگر سے میرے دشوار کھینچتے ہیں

سمجھا تنک نہ اپنے تو سود و زیاں کو میں
مانا کیا خدا کی طرح ان بتاں کو میں

لاویں اُسے بھی بعد مرے میری لاش پر
یہ کہہ رکھا ہے اپنے ہر اک مہرباں کو میں

گردش فلک کی کیا ہے جو دورِ قدح میں ہے
دیتا رہوں گا چرخ مدام آسماں کو میں

جی جاوے تو قبول ترا غم نہ جائیو[1]
رکھتا نپٹ عزیز ہوں اس میہماں کو میں

عاشق ہے یا مریض ہے پوچھو تو میر سے
پاتا ہوں زرد روز بروز اس جواں کو میں

[1] نہ جائیو۔ دعائیہ۔ غالبؔ نے بھی اسی طرح دعائیہ استعمال کیا ہے ع تمھارے آئیو اے طرہ ہائے خم بخم آگے۔

کرنالہ کشی کب تئیں اوقات گزاریں / فریاد کریں کس سے کہاں جاکے پکاریں

ہر دم کا بگڑنا تو کچھ اب چھوٹتا ہے اُن سے / شاید کسی ناکام کا بھی کام سنواریں

دل میں جو کبھو جوشِ غم اُٹھتا ہے تو تا دیر / آنکھوں سے چلی جاتی ہیں دریا کی سی دھاریں

کیا ظلم ہے اُس خونیِ عالم کی گلی میں / جب ہم گئے دو چار نئی دیکھیں مزاریں

جس جا کہ خس و خار کے اب ڈھیر لگے ہیں / یہاں ہم نے انھیں آنکھوں سے دیکھیں ہیں بہاریں

کیونکر کہ رہے شرم مری شہر میں جب آہ / ناموس کہاں اُتریں جو دریا پہ اتاریں

وے ہونٹھ کہ ہے شورِ مسیحائی کا جن کے / دم لیویں نہ دو چار کو تا جی سے نہ ماریں

منظور ہے کب سے سرِ شوریدہ کا دینا / چڑھ جائے نظر کوئی تو یہ بوجھ اُتاریں

بالیں پہ سرِ اک عمر سے ہے دستِ طلب کا / جو ہے سو گدا کس کنے جا ہاتھ پساریں

ان لوگوں کے تو گرد نہ پھر سب ہیں لباسی / سو گز بھی جو یہ پھاڑیں تو اک گز بھی نہ دوریں

ناچار ہو رخصت جو منگا بھیجی تو بولا / میں کیا کروں جو میر جی جاتے ہیں سدھاریں

یوں ہی حیران و خفا جوں غنچۂ تصویر ہوں / عمر گزری پر نہ جانا میں کہ کیوں دلگیر ہوں

اتنی باتیں مت بنا مجھ شیفتہ سے ناصحا / پند کے لائق نہیں میں قابلِ زنجیر ہوں

سرخ رہتی ہیں مری آنکھیں لہو رونے سے شیخ / مے اگر ثابت ہو مجھ پر واجب التعزیر ہوں

نے فلک پر راہ مجھ کو نے زمیں پر رو مجھے / ایسے کس محروم کا میں شورِ بے تاثیر ہوں

جو مرے حصے میں آوے تیغ جمدھر سبل و کارد / یہ فضولی ہے کہ میں ہی کشتۂ شمشیر ہوں

کھول کر دیوان میرا دیکھ قدرت مدعی / گرچہ ہوں میں نوجواں پر شاعروں کا پیر ہوں

اس قدر بے ننگ خبطوں کو نصیحت شیخ جی / باز آؤ ورنہ اپنے نام کا میں میر ہوں

کہے ہے کوہکن کر فکر میری خستہ حالی میں / الٰہی شکر کرتا ہوں تری درگاہ عالی میں

میں وہ پژمردہ سبزہ ہوں کہ ہو کر خاک سے سرزد / یکایک آگیا اس آسماں کی پائمالی میں

تو سچ کہہ رنگِ پاں ہے یہ کہ خونِ عشق بازاں ہے / سخن رکھتے ہیں کتنے شخص تیری لب کی لالی میں

بُرا کہنا بھی میرا خوش نہ آیا اسکو تو ورنہ / تسلی یہ دلِ ناشاد ہوتا ایک گالی میں

مرے اُستاد کو فردوسِ اعلیٰ میں ملے جاگہ / پڑھایا کچھ نہ غیر از عشق مجھ کو خردسالی میں

نگاہِ چشمِ پرخشمِ بتاں پر مت نظر رکھنا ملا ہی زہر اے دل اس شرابِ پرتگالی میں
شرابِ خون بن ترشحے دل لبریز رہتا ہی بھرے ہیں سنگریزے میں نے اس مینائے خالی میں

خلاف ان اور خوباں کے سدا جی میں رہتا ہی
یہی تو میر اک خوبی ہی معشوقِ خیالی میں

آہ اور اشک ہی سدا ہی یہاں روز برسات کی ہوا ہی یہاں
جس جگہ ہو زمین تفتہ سمجھ کہ کوئی دل جلا گڑا ہی یہاں
گو کدورت سے وہ نہ دیوے رو آرسی کی طرح صفا ہی یہاں
رند مفلس جگر میں آہ نہیں جانِ محزون ہے اور کیا ہی یہاں
کیسے کیسے مکان ہیں ستھرے قطعہ ایک ازاں جملہ کربلا ہی یہاں
اک سسکتا ہی ایک مرتا ہے ہر طرف ظلم ہو رہا ہی یہاں
صد تمنا شہید ہیں یکجا سینہ کوبی ہی تعزیا ہی یہاں
دیدنی ہی غرض یہ صحبتِ شوخ روز و شب طرفہ ماجرا ہی یہاں
خانۂ عاشقاں ہی جائے خوب جائے رونے کی جابجا ہی یہاں
کوہ و صحرا بھی کر نہ جائے باش قطعہ آجتک کوئی بھی رہا ہی یہاں
ہی خبر شرط میر سنتا ہے تجھ سے آگے یہ کچھ ہوا ہی یہاں

موت مجنوں کو بھی یہیں آئی
کوہکن کل ہی مرگیا ہی یہاں

جہاں اب خارزاریں ہو گئی ہیں یہیں آگے بہاریں ہو گئی ہیں
جنوں میں خشک ہو رگہائے گردن گریباں کی سی تاریں ہو گئی ہیں
سُنا جاتا ہی شہرِ عشق کے گرد مزاریں ہی مزاریں ہو گئی ہیں
اسی دریائے خوبی کا ہی یہ شوق کہ موجیں سب کناریں ہو گئی ہیں

انھیں گلیوں میں جب روتے تھے ہم میر
کئی دریا کی دھاریں ہو گئی ہیں

خوش نہ آئی تمھاری چال ہمیں یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں
حال کیا پوچھ پوچھ جاتے ہو کبھو پاتے بھی ہو بحال ہمیں

وہ دہاں وہ کمر ہی ہے مقصود ‏— اور کچھ اب نہیں خیال ہمیں
اُس مہِ چار دہ کی دُوری نے ‏— دنوں ہی دن میں کیا ہلال ہمیں
نظر آتے ہیں ہوتے جی کے وبال ‏— حلقہ حلقہ تمھارے بال ہمیں
تنگی اس جا کی نقل کیا کریے ‏— یہاں سے واجب ہے انتقال ہمیں
صَرف للہ خم کے خم کرتے ‏— نہ کیا چرخ نے کلال ہمیں
مغبچے مال مست ہم درویش ‏— کون کرتا ہے استمال ہمیں
کبتک اس تنگنا میں کھینچیے رنج ‏— یہاں سے یا رب تو ہی نکال ہمیں
ترک سبزانِ شہر کریے اب ‏— بس بہت کر چکے نہال ہمیں

وجہ کیا ہے کہ میر مُنھ پہ ترے
نظر آتا ہے کچھ ملال ہمیں

نہ کیونکہ شیخ توکل کو اختیار کریں ‏— زمانہ ہووے مساعد تو روزگار کریں
گیا وہ زمزمۂ صبح فصل گل بلبل ‏— دُعا نہ پہنچے چمن تک ہم اب ہزار کریں
تمام صید سر تیر جمع ہیں لیکن ‏— نصیب اُس کے کہ جس کو ترا شکار کریں
تسلی تو ہو دل بیقرار خوباں سے ‏— یہ کاش ملنے نہ ملنے کا کچھ قرار کریں
ہمیں تو نزع میں شرمندہ آ کے اُن نے کیا ‏— رہا ہے ایک رمق جی سو کیا نثار کریں
رہی سہی بھی گئی عمر تیرے پیچھے یار ‏— یہ کہہ کہ آہ ترا کب تک انتظار کریں
کریں ہیں حادثے ہر روز وار آخر تو ‏— سناں آہ دل شب کی ہم بھی پار کریں
یہ قتل غیر ہی کیا کام ہمنشیناں آج ‏— جو دشمنی نہ کرے وہ تو اُس کو یار کریں

ہوا ہوں خاک اسی واسطے کہ خوباں میر
گزار گور پہ میری بھی ایک بار کریں

یہ غلط کہ میں پیا ہوں قدحِ شراب تجھ بن ‏— نہ گلے سے میرے اُترا کبھو قطرہ آب تجھ بن
یہی بستی عاشقوں کی کبھو سیر کرنے چل تو ‏— کہ محلے کے محلے پڑے ہیں خراب تجھ بن
میں لہو پیوں ہوں غم میں عوض شراب ساقی ‏— شبِ میغ ہوگئی ہے شبِ ماہتاب تجھ بن
گئی عمر میری ساری جیسے شمع باد کے بیچ ‏— یہی رونا جلنا گلنا یہی اضطراب تجھ بن
سبھی آتشیں ہیں نالے سبھی زمہریری آہیں ‏— مری جان پر رہا ہے غرض اک عذاب تجھ بن

ترے غم کا شکر نعمت کروں کیا اے مغبچے میں — نہوا کہ میں نہ کھایا جگر کباب تجھ بن
نہیں جیتے جی تو ممکن ہمیں تجھ بغیر سونا — مگر آنکہ مر کے کیجے تہِ خاک خواب تجھ بن

یہی حال ہو کے مرتا جو درنگ میر کرتا
یہ بھلا ہوا ستمگر کہ موا شتاب تجھ بن

تکلیف باغ کن لے کی تجھ خوش نہال کے تئیں — دیتا ہے اک رنگ ترا گلستاں کے تئیں
تنکا بھی اب رہا نہیں شرمندگی ہے جو — گر پڑ کے برق یاد دے آشیاں کے تئیں
آئے عدم سے ہستی میں تس پر نہیں قرار — ہو ان مسافروں کا ارادہ کہاں کے تئیں
سنتا ہے میں باغ کے کچھ اٹھتے ہیں نسیم — مرغ چمن بنے خوب ستھا ہی فغاں کے تئیں
اک گردش اے فلک کہ ہوا ٹنائے راہ سے — کنعاں کی اور راہ غلط کارواں کے تئیں
تو اک زباں یہ چپکی نہیں رہتی عندلیب — رکھتا ہے منھ میں غنچہ گل سو زباں کے تئیں

ہم تو ہوئے تھے میر سے اس دن ہی نا امید
جس دن سنا کہ ان نے دیا دل بتاں کے تئیں

موئے سہتے سہتے جفا کاریاں — کوئی ہم سے سیکھے وفا داریاں
ہماری تو گزری اسی طور عمر — یہی نالہ کرنا یہی زاریاں
فرشتہ جہاں کام کرتا نہ تھا — مری آہ نے برچھیاں ماریاں
گیا جان سے اک جہاں لیک شوخ — نہ تجھ سے گئیں یہ دل آزاریاں
کہاں تک یہ تکلیف ما لا یطاق — ہوئیں مدتوں ناز برداریاں
خط و کاکل و زلف و انداز و ناز — ہوئیں دامِ رہ صد گرفتاریاں
کیا درد و غم نے مجھے نا امید — کہ مجنوں کو یہ ہی تھیں بیماریاں
تری آشنائی سے ہی حد ہوئی — بہت کی تھیں دنیا میں ہم یاریاں

نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں
کھنچیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں — وقت ملنے کا مگر داخل ایام نہیں
مثل[1] عنقا مجھے تم دور سے سن لو ورنہ — ننگ ہستی ہوں مری جائے بجز نام نہیں

[1] میر کا یہ شعر بھی ایسا ہی ہے — آوازہ ہی جہاں میں ہمارا سنا کرو — عنقا کی طرح زیست ہوا اپنی بنام یاں

خطِ راہِ وفا بلکہ بہت دُور کھنچا — عمر گزری کہ ہم نامہ و پیغام نہیں
رازپوشی محبت کے تئیں چاہیے ضبط — سو تو بیتابیِ دل بن مجھے آرام نہیں

بیقراری جو کوئی دیکھے ہے سو کہتا ہے
کچھ تو ہے میر کہ اک دم تجھے آرام نہیں

کیا ظلم کیا تعدی کیا جور کیا جفائیں — اس چرخ نے کیاں ہیں ہم سے بہت ادائیں
دیکھا کہاں وہ نسخہ اک روگ میں بسا ہا — جی پھر کبھو نہ پنپا بہتیری کیں دوائیں
اک رنگِ گل نے رہنا یھاں بو نہیں کیا ہے — اس گلشنِ جہاں میں ہیں مختلف ہوائیں
ہے فرش عرش تک بھی قلب حزیں کا اپنے — اس تنگ گھر میں ہم نے دیکھی ہیں کیا فضائیں
شب نالہ آسماں تک جی سخت کرکے پہنچا — تھیں نیم کشتۂ یاس اکثر مری دُعائیں
روکش تو ہو ترا پر آئینے میں کہاں یہ — رعنائیاں ادائیں رنگینیاں صفائیں
ہے امر سہل چاہت لیکن نباہ مشکل — پتھر کرے جگر کو تب تو کرے وفائیں

نازِ بتانِ سادہ ہے اللہ اللہ اے میر
ہم خط سے مٹ گئے پر اُن کے نہیں ہے بھائیں

آرزوئیں ہزار رکھتے ہیں — تو بھی ہم دل کو مار رکھتے ہیں
برق کم حوصلہ ہے ہم بھی تو — دلکِ بیقرار رکھتے ہیں
غیر ہی موردِ عنایت ہے — ہم بھی تو تم سے پیار رکھتے ہیں
نہ نگہ نے پیام نے وعدہ — نام کو ہم بھی یار رکھتے ہیں
ہم سے خوش زمزمہ کہاں یوں تو — لب و لہجہ ہزار رکھتے ہیں
چوٹٹے دل کے ہیں بتاں مشہور — بس یہی اعتبار رکھتے ہیں

پھر بھی کرتے ہیں میر صاحب عشق
ہیں جواں اختیار رکھتے ہیں

گذر جان سے اور ڈر کچھ نہیں — رہِ عشق میں پھر خطر کچھ نہیں
ہے اب کام دل جس پہ موقوف تو — وہ نالہ کہ جس میں اثر کچھ نہیں
ہوا مائل اُس سرو کا دل مرا — بجز جور جس سے ثمر کچھ نہیں
نہ کر اپنے محزوں کا ہرگز سراغ — گئے گزرے بس اب خبر کچھ نہیں

تری ہو چکی خشک مژگاں کی سب — لہو اب جگر میں مگر کچھ نہیں
حیا سے نہیں پشتِ پا پردہ چشم — مرا حال مدِ نظر کچھ نہیں
کروں کیونکہ انکارِ عشق آہ میں — یہ رونا بھلا کیا ہے گر کچھ نہیں

کمر اُس کی رشکِ رگِ جاں ہے میرؔ
غرض اُس سے باریک تر کچھ نہیں

نالۂ قیدِ قفس سے چھوٹ اب اک دم نہیں — گوشِ گل سے لگتے تھے جا کے سو وہ موسم نہیں
ہم پہ کھینچی تیغ تو غیروں کو ٹک لگنے نہ دے — وے اگر ہو دیں گے اُس کے درمیاں تو ہم نہیں

بت برہمن کو کوئی نامحرم نہیں اللہ کا
ہے حرم میں شیخ لیکن میرؔ وہ محرم نہیں

تری ابرو و تیغِ تیز تو ہمدم ہیں یہ دونوں — ہوئے ہیں دل جگر بھی سامنے رستم ہیں یہ دونوں
نہ کچھ کاغذ میں ہے تہ نے قلم کو درد نالوں کا — لکھوں کیا عشق کے حالات نامحرم ہیں یہ دونوں
لہو آنکھوں سے بہتے وقت رکھ لیتا ہوں ہاتھوں کو — جراحت ہیں اگر وے دونوں تو مرہم ہیں یہ دونوں
کسو چشمہ پہ دریا کے دیا اوپر نظر رکھیے — ہمارے دیدۂ نم دیدہ کیا کچھ کم ہیں یہ دونوں
لبِ جاں بخش اُس کے مار ہی رکھتے ہیں عاشق کو — اگرچہ آبِ حیواں ہیں و لیکن سم ہیں یہ دونوں
نہیں ابرو ہی مائل جھک ہی ہے تیغ بھی ایدھر — ہمارے کشت و خوں میں متفق باہم ہیں یہ دونوں
کھلے سینے کے داغوں پر ٹھہر رہتے ہیں کچھ آنسو — چمن میں مہر ورزی کے گل و شبنم ہیں یہ دونوں
کبھو دل رکنے لگتا ہے جگر گاہے تڑپتا ہے — غمِ ہجراں میں چھاتی کے ہمارے جم ہیں یہ دونوں

خدا جانے کہ دُنیا میں ملیں اس سے کہ عقبیٰ میں
مکاں تو میرؔ صاحب شہرۂ عالم ہیں یہ دونوں

لب ترے لعلِ ناب ہیں دونوں — پر تمامی عتاب ہیں دونوں
رونا آنکھوں کا روئیے کب تک — پھوٹنے ہی کے باب ہیں دونوں
ہے تکلف نقاب دے رخسار — کیا چھپیں آفتاب ہیں دونوں
تن کے معمورہ میں یہی دل و چشم — گھر تھے دو سو خراب ہیں دونوں
کچھ نہ پوچھو کہ آتشِ غم سے — جگر و دل کباب ہیں دونوں
سو جگہ اُس کی آنکھیں پڑتی ہیں — جیسے مستِ شراب ہیں دونوں

پانؤں میں وہ لشہ طلب کا نہیں
اب تو سرمستِ خواب ہیں دونوں

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدۂ و دل عذاب ہیں دونوں

بحث کا ہیکو لعل و مرجاں سے
اُس کے لب ہی جواب ہیں دونوں

آگے دریا تھے دیدۂ تر میر
اب جو دیکھو سراب ہیں دونوں

ردیف واو

فلک نے گر کیا رخصت مجھے سیرِ بیاباں کو
نکالا سر سے میرے جائے مو خارِ مغیلاں کو

وہ ظالم بھی تو سمجھے کہہ رکھا ہی ہم نے یاراں کو
کہ گورستان سے گاڑیں جدا ہم اہلِ ہجراں کو

نہیں یہ بیدِ مجنوں گردشِ گردونِ گرداں نے
بنایا ہی شجر کیا جانیے کس موپریشاں کو

ہوئے تھے[1] جیسے مرجاتے پر اب تو سخت حسرت ہے
کیا دشوار نادانی سے ہم نے کار آساں کو

کہیں نسلِ آدمی کی اُٹھ سنجاوے اس زمانے میں
کہ موتی آبِ حیواں جانتے ہیں آب انساں کو

تجھے گر چشمِ عبرت ہی تو آندھی اور بگولے سے
تماشا کر غبار افشانیٔ خاکِ عزیزاں کو

ہوائے ابر میں گرمی نہیں جو تو نہ ہو ساقی
دمِ افسردہ کردے منجمد رشحاتِ باراں کو

جلیں ہیں کب کے مژگاں آنسوؤں کی گرمجوشی سے
اس آبِ چشم کی جوشش نے آتش دی نیستاں کو

غرورِ ناز سے آنکھیں نہ کھولیں اُس جفا جو نے
ملا پانؤں تلے جبتک نہ چشمِ صد غزالاں کو

نہ سمجھی چشمِ طمع خوانِ فلک پر خام دستی سے
کہ جامِ خون دی ہی ہر سحر یہ اپنے مہماں کو

بنے ناواقفِ شادی اگر ہم بزمِ عشرت میں
دہانِ زخمِ دل سمجھے جو دیکھا روئے خنداں کو

نہیں ریگِ رواں مجنوں کی دل کی بیقراری نے
کیا ہی مضطرب ہر ذرہ گردِ بیاباں کو

کسی کے واسطے رسوائے عالم ہو پہ جی میں رکھ
کہ مارا جائے جو ظاہر کرے اس رازِ پنہاں کو

گری پڑتی ہی بجلی ہی تبھی سے خرمنِ گل پہ
تک اک ہنس میری رونے پر کہ دیکھے تیرے دنداں کو

غرورِ ناز قاتل کو لئے جا ہے کوئی پوچھے
چلا تو سونپ کر کس کے تئیں اس صیدِ بیجاں کو

وہ تخمِ سوختہ تھے ہم کہ سرسبزی نہ کی حاصل
ملایا خاک میں دانہ نمط حسرت سے دہقاں کو

ہوا ہوں غنچۂ پژمردہ آخر فصل کا تجھ بن
نہ دے برباد حسرت کشتۂ سر در گریباں کو

جو دیکھا نسی

[1] ہوئے تھے جیسے - یعنی جیسے ہی پیدا ہوئے تھے ۱۲

غم و اندوہ و بیتابی الم بیطاقتی حرماں
کہوں اے ہمنشیں تا چند غم ہائے فراواں کو

بہت روئے جو ہم یہ آستیں رکھ منہ پہ ای بجلی
نہ چشم کم سے دیکھ اس یادگارِ چشم گریاں کو

مزاج اس وقت ہی اک مطلع تازہ پہ کچھ مائل
کہ بے فکر سخن بنتی نہیں ہرگز سخنداں کو

نسیم مصر کب آئی سوادِ شہر کنعاں کو
کہ بھر جھولی نہ یہاں سے لیگئی گلہائے حرماں کو

زبانِ نوحہ گر ہوں میں قضا نے کیا ملایا تھا
مری طینت میں یارب سودۂ دلہائے نالاں کو

کوئی کانٹا سرِ رہ کا ہماری خاک پر بس ہی
گل گلزار کیا درکار ہی گورِ غریباں کو

یہ کیا جانوں ہوا سینے میں کیا اس دل کو ناصح
سحر خوں بستہ تو دیکھا تھا میں نے اپنی مژگاں کو

گل و سنبل ہیں نیرنگ قضا مت سرسری گزرے
کہ بگڑی زلف و رخ کیا کیا بنا آئی اس گلستاں کو

صدا لے آہ جیسے تیر جی کے پار ہوتی ہے
کسو بیدرد نے کھینچا کسو کے دل سے پیکاں کو

کریں بالِ ملک فرشِ رہ اس ساعت کہ محشر میں
لہو ڈوبا کفن لاویں شہیدِ ناز خوباں کو

کیا سیر اس خرابے کا بہت اب چلئے سو رہیے
کسو دیوار کے سایہ میں منہ پر لیکے داماں کو

بہائے سہل پر دیتے ہیں کس محبوب کو کف سے
قلم اس جرم پر کرنا ہے دستِ گلفروشاں کو

تری ہی جستجو میں گم ہوا ہی کہہ کہاں کھویا
جگر خوں گشتہ دلِ آزردہ میر اُس خانہ ویراں کو

قد کھینچے ہی جس وقت تو ہی طرفہ بلا تو
کہتا ہی ترا سایہ پری سے کہ ہی کیا تو

گر اپنی روش راہ چلا یار تو ای کبک
رہ جائیگا دیوارِ گلستاں سے لگا تو

بے گل نہیں بلبل تجھے بھی چین پہ دیکھیں
مر رہتے ہیں ہم ایک طرف باغ میں یا تو

خوش رو ہی بہت ای گل تر تو بھی ولیکن
انصاف ہی منہ تیرے ہی ولیا ہی بھلا تو

کیا جانیے ای گوہرِ مقصد تو کہاں ہی
ہم خاک میں بھی مل گئے لیکن نہ ملا تو

اس جینے سے اب دل کو اٹھا بیٹھیں گے ہم بھی
ہی تجھ کو قسم ظلم سے مت ہاتھ اُٹھا تو

منظر میں بدن کے بھی یہ اک طرفہ مکاں تھا
افسوس کہ شک دل میں ہمارے نہ رہا تو

تھے چاک گریبان گلستاں میں گلوں کے
نکلا ہی مگر کھولے ہوئے بندِ قبا تو

بیہوشی سی آتی ہی تجھے اُس کی گلی میں
گر ہو سکے ای میر تو اُس راہ نہ جا تو

خط لکھکے کوئی سادہ نہ اُس کو ملول ہو / ہم تو ہوں بدگمان جو قاصد رسول ہو
چاہوں تو بھر کے کولی اُٹھالوں ابھی تمھیں / کیسے ہی بھاری ہو مرے آگے تو پھول ہو
سرمہ جو نور بخشے ہے آنکھوں کو خلق کی / شاید کہ راہِ یار کی ہی خاک دھول ہو
جاویں نثار ہونے کو ہم کس بساط پر / اک نیم جان رکھیں ہیں سو وہ جب قبول ہو
ہم اُن دلوں میں لگ نہیں پڑتے ہیں صبح شام / ورنہ دعا کریں تو جو چاہیں حصول ہو
دل لیکے لونڈے دلی کے کب کا پچا گئے / اب اُن سے کھائی پی ہوئی شے کیا وصول ہو

ناکام اس لئے ہو کہ چاہو ہو سب کچھ آج
تم بھی تو میر صاحب قبلہ عجول ہو

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو / ہاں کہو اعتماد ہے ہمکو
شوق ہی شوق ہے نہیں معلوم / اُس سے کیا دل نہاد ہے ہمکو
خط سے نکلے ہے بیوفائی حُسن / اس قدر تو سواد ہے ہمکو
آہ کس ڈھب سے روئیے کم کم / شوق حد سے زیاد ہے ہمکو
شیخ و پیر مغاں کی خدمت میں / دل سے اک اعتقاد ہے ہمکو
سادگی دیکھ عشق میں اُسکی / خواہش جان شاد ہے ہمکو
بدگمانی ہے جس سے تس سے آہ / قصد شور و فساد ہے ہمکو
دوستی ایک سے بھی تجھ کو نہیں / اور سب سے عناد ہے ہمکو

نامرادانہ زیست کرتا تھا
میر کا طور یاد ہے ہم کو

صیاد کینے پہ اُس بت کی طبع آئی ہو / پھر ایک بس ہے وہی گو اُدھر خدائی ہو
مدد نہ اتنی بھی کی بخت ناموافق نے / کہ مدعی سے اُسے ایک دن لڑائی ہو
ہنوز طفل ہے وہ ظلم پیشہ کیا جانے / لگاوے تیغ سلیقہ سے جو لگائی ہو
لبوں سے تیرے تھا آگے ہی لعل سرخ و زرد / قسم ہے میں نے اگر بات بھی چلائی ہو
خدا کرے کہ نصیب اپنے ہو نہ آزادی / کدھر کے ہوجے جو بے بال و پر رہائی ہو
مزے کو عشق کی ذلت کے جانتا ہے وہی / کسو کی جن نے کبھو لات مُکّی کھائی ہو
اُس آفتاب سے تو فیض سب کو پہنچے ہے / یقین ہے کہ کچھ اپنی ہی نارسائی ہو

کبھو ہی چھیڑ کبھو گالی ہی کبھو چشمک ۔ بیان کریے جو ایک اُس کی بے ادائی ہو
دیارِ حسن میں غالب کہ خستہ جانوں نے ۔ دوا کے واسطے بھی مہر ٹک نہ پائی ہو
ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہی سے ۔ اگر نصیب ترے کوچہ کی گدائی ہو
جو کوئی دم ہو تو لوہو سا پی کے رہجاؤں ۔ غموں کی دل میں بھلا کب تلک سمائی ہو
مغاں سے راہ تو ہو جائے رفتہ رفتہ شیخ ۔ ترا بھی قصد اگر ترکِ پارسائی ہو

کہیں تو ہیں کہ عبث میرؔ نے دیا جی کو
خدا ہی جانے کہ کیا جی میں اُس کے آئی ہو

اے چرخ مت حریفِ اندوہ بیکساں ہو ۔ کیا جانے منھ سے نکلے نالہ کہ کیا سماں ہو
کب تک گرہ رہیگا سینہ میں دل کے مانند ۔ اے اشکِ شوق اک دم رخسار پر رواں ہو
ہم دور ماندگاں کی منزل رساں نگر اب ۔ یا ہو صدا جرس کی یا گردِ کارواں ہو
مسند نشین ہو گر عرصہ ہی تنگ اُس پر ۔ آسودہ وہ کسو کا جو خاکِ آستاں ہو
تا چند کوچہ گردی جیسے صبا زمیں پر ۔ اے آہِ صبحگاہی آشوبِ آسماں ہو
گر ذوقِ سیر ہے تو آوارہ اس چمن میں ۔ مانندِ عندلیبِ گم کردہ آشیاں ہو
یہ جان تو کہ ہے اک آوارہ دست بر دل ۔ خاکِ چمن کے اوپر برگِ خزاں جہاں ہو
کیا ہے حباب ساں یہاں آ دیکھ اپنی آنکھوں ۔ گر پیرہن میں میرے میرا تجھے گماں ہو
از خویش رفتہ ہر دم رہتے ہیں ہم جو اس بن ۔ کہتے ہیں لوگ اکثر اس وقت تم کہاں ہو
پتھر سے توڑ ڈالوں آئینہ کو ابھی میں ۔ گر روئے خوبصورت تیرا نہ درمیاں ہو
اس تیغ زن سے کہیو قاصد مری طرف سے ۔ ابتک بھی نیم جاں ہوں گر قصد امتحاں ہو
ہمسایہ اس چمن کے کتنے شکستہ پر ہیں ۔ اتنے لئے کہ شاید اک باؤ گلفشاں ہو

میرؔ اُس کو جان کر تو بے شبہ ملیو رہ پر
صحرا میں جو نمد مو بیٹھا کوئی جواں ہو

گرچہ کب دیکھتے ہو پر دیکھو ۔ آرزو ہے کہ تم ادھر دیکھو
عشق کیا کیا ہمیں دکھاتا ہے ۔ آہ تم بھی تو اک نظر دیکھو
یوں عرق جلوہ گر ہے اُس منھ پر ۔ جس طرح اوس پھول پر دیکھو
ہر خراش جبیں جراحت ہے ۔ ناخن شوق کا ہنر دیکھو

تھے ہمیں آرزوِ لبِ خنداں
سو عوض اُس کے چشمِ تر دیکھو

رنگِ رفتہ بھی دل کو کھینچے ہے
ایک شب اور یہاں سحر دیکھو

دل ہوا ہے طرف محبت کا
خون کے قطرے کا جگر دیکھو

پہنچے ہیں ہم قریب مرنے کے
یعنی جاتے ہیں دور اگر دیکھو

لطف مجھ میں بھی ہیں ہزاروں میر
دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو

آرام ہو چکا مرے جسمِ نزار کو
رکھے خدا جہاں میں دلِ بیقرار کو

پانی پہ جیسے غنچۂ لالہ پھرے بہا
دیکھا ہے آنسوؤں میں دلِ داغدار کو

برسا تو میرے دیدۂ خونبار کے حضور
پر اشکِ انفعال ہے ابرِ بہار کو

ہنستا ہی میں پھروں جو مرا کچھ ہو اختیار
پر کیا کروں میں دیدۂ بے اختیار کو

آیا جہاں میں دوست بھی ہوتی ہیں یکدگر
مجھ سے تو دشمنی ہی رہی میرے یار کو

سو بار یوں تو غیروں سے کرتی ہو ہنس کے بات
کچھ منہ بنا رہے ہو ہماری ہی بار کو

سرگشتگی سوائے نہ دیکھا جہاں میں کچھ
اک عمرِ خضر سیر کیا اس دیار کو

کس کس کی خاک اب کی ملائی ہے خاک میں
جاتی ہے پھر نسیم اسی رہ گذار کو

اے وہ کوئی جو آج پیئے ہے شرابِ عیش
خاطر میں رکھیو کل کے بھی رنج و خمار کو

خوباں کا کیا جگر جو کریں مجھ کو اپنا صید
پہچانتا ہے سب کوئی تیرے شکار کو

جیتے جی فکر خوب ہے ورنہ یہ بد بلا
رکھے گا حشر تک تہ و بالا مزار کو

گر ساتھ لے گڑا تو دلِ مضطرب تو میر
آرام ہو چکا ترے مشتِ غبار کو

اچھی لگے ہے تجھ بن گلگشتِ باغ کس کو
صحبت رکھے گلوں سے اتنا دماغ کس کو

بے سوز داغِ دل پر گر بھی جلے بجا ہے
اچھا لگے ہے اپنا گھر بے چراغ کس کو

صد چشم داغ و آہیں دل پر مرے ہیں وہ ہوں سا
دکھلا رہا ہے لالہ تو اپنا داغ کس کو

گلچینِ عیش ہوتے ہم بھی چمن میں جا کر
آہ و فغاں سے اپنی لیکن فراغ کس کو

اُس کی بلا سے جو ہم اے میر گم بھی ہوویں
ہم سے غریب کا ہو فکرِ سراغ کس کو

دن گزرتا ہے مجھے فکر ہی میں تا کیا ہو ۔ رات جاتی ہے اسی غم میں کہ فردا کیا ہو
سب ہیں دیدار کے مشتاق پر اس سے غافل ۔ حشر برپا ہو کہ فتنہ اٹھے آیا کیا ہو
خاک حسرت زدگاں پر تو گزر بے وسواس ۔ ان ستم کشتوں سے اب عرض تمنا کیا ہو
گر بہشت آوے تو آنکھوں میں مری پھیکی لگے ۔ جن نے دیکھا ہو تجھے محو تماشا کیا ہو
شوق جاتا ہے ہمیں یار کے کوچے کو لئے ۔ جائے معلوم ہو کیا جانیے اس جا کیا ہو
ایک رونا ہی نہیں آہ و غم و نالہ و درد ۔ ہجر میں زندگی کرنیکے تئیں کیا کیا ہو
خاک میں لوٹوں کہ لوہو میں نہاؤں میں میر ۔ یار مستغنی ہے اس کو مری پروا کیا ہو

ویسا کہاں ہے ہم سے جیسا کہ آگے تھا تو ۔ اوروں سے مل کے پیارے کچھ اور ہو گیا تو
چالیں تمام بیڈھب باتیں فریب ہیں سب ۔ حاصل کہ اے شکر لب اب وہ نہیں رہا تو
جاتے نہیں اٹھائے یہ شور ہر سحر کے ۔ یا اب چمن میں بلبل ہم ہی رہیں گے یا تو
آ ابر ایک دو دم آپس میں رکھیں صحبت ۔ کڑھنے کو ہول ہیں آندھی رونے کو ہے بلا تو
تقریب پر بھی تو تو پہلو تہی کرے ہے ۔ دس بار عید آئی کب کب گلے ملا تو
تیرے دہن سے اس کو نسبت ہو کچھ تو کہئے ۔ گل گو کرے ہے دعویٰ خاطر میں کچھ نہ لا تو
دل کیونکہ راست آوے دعوائے آشنائی ۔ دریائے حسن وہ مہ کشتی بکف گدا تو
ہر فرد یاس ابھی سے دفتر ہے تجھ گلے کا ۔ ہے قہر جبکہ ہوگا حرفوں سے آشنا تو
عالم ہے شوق کشتہ خلقت ہے تیری رفتہ ۔ جانوں کی آرزو تو آنکھوں کا مدعا تو
منھ کرے جس طرف کو سو ہی تری طرف ہے ۔ پر کچھ نہیں ہے پیدا کیدھر ہے اے خدا تو
آتی بخود نہیں ہے باد بہار اب تک ۔ دو گام تھا چمن میں ٹک ناز سے چلا تو
کم میری اور آنا کم آنکھ کا ملانا ۔ کرنے سے یہ ادائیں ہے مدعا کہ جا تو
گفت و شنود اکثر میری تری رہے ہے ۔ ظالم معاف رکھیو میرا کہا سنا تو
کہہ سا تجھ کے موئے کو اے میر روئیں کب تک ۔ جیسے چراغ مفلس اک دم میں جل بجھا تو

خوبی یہی نہیں ہے کہ انداز و ناز ہو ۔ معشوق کا ہے حسن اگر دل نواز ہو
سجدہ کا کیا مضائقہ محراب تیغ میں ۔ پر یہ تو ہو کہ نعش پہ میری نماز ہو

اک دم تو ہم میں تیغ کو تو بیدریغ کھینچ / تا عشق میں ہوس میں تنک امتیاز ہو
نزدیک سوزِ سینہ کے رکھ اپنے قلب کو / وہ دل ہی کیمیا ہے جو گرم گداز ہو
ہے فرق ہی میں خیر نکر آرزوے وصل / مل بیٹھیے جو اس سے تو شکوہ دراز ہو
جوں توں کی اس کی چاہ کا پردا کیا ہے میں / اے چشم گریہ ناک نہ افشائے راز ہو
جوں[51] چشمِ بسملی نہ مندی آوے گی نظر / جو آنکھ میرے خونی کے چہرے پہ باز ہو

ہم سے بہ غیر عجز کبھو کچھ بنا نہ میر
خوش حال وہ فقیر کہ جو بے نیاز ہو

نالہ مرا اگر سببِ شور و شر نہو / پھر مر بھی جائیے تو کسو کو خبر نہو
دل پر ہوا سو آہ کے صدمے سے ہو چکا / ڈرتا ہوں یہ کہ اب کہیں ٹکڑے جگر نہو
برچھی سی پار عرش کے گزری ہے عاقبت / آہِ سحر میں میری کہاں تک اثر نہو
سمجھا ہوں تیری آنکھ چھپانے سے خوش نگاہ / مدنظر یہ ہے کہ کسی کی نظر نہو
قطعہ
کھینچے ہے دلکو زلف سے گاہے نگہ سے گاہ / حیراں نہووے کوئی تو اس طرز پر نہو
سو دل سے بھی نہ کام چلے اس کے عشق میں / اک دل رکھوں ہوں میں تو کدھر ہو کدھر نہو
قطعہ
جس راہ ہو کے آج میں پہنچا ہوں تجھ تلک / کافر کا بھی گزار الٰہی ادھر نہو
یکجا نہ دیکھی آنکھوں سے ایسی تمام راہ / جس میں بجائے نقشِ قدم چشمِ تر نہو
ہر اک قدم پہ لوگ ڈرانے لگے مجھے / ہاں ہاں کسو شہیدِ محبت کا سر نہو
چلیو سنبھل کے سب یہ شہیدانِ عشق ہیں / تیرا گزار تا کہ کسو نعش پر نہو
دامن کشاں ہی جا کہ طپش پر طپش ہے دفن / زنہار کوئی صدمے سے زیر و زبر نہو
مضطر ہو اختیار کی وہ شکل دل میں ہیں / اس راہ ہو کے جاؤں یہ صورت جدھر نہو
لیکن عبث نگاہ جہاں کیجیے اس طرف / امکان کیا کہ خون مرے تا کمر نہو
حیراں ہوں میں کہ ایسی یہ مشہد ہے کونسی / مجھ سے خراب حال کو جس کی خبر نہو
آتا ہے یہ قیاس میں اب تجھ کو دیکھ کر / ظالم جفا شعار ترا رہ گزر نہو

اٹھ جائے رسمِ نالہ و آہ و فغاں سب
اس تیرہ روزگار میں تو میر اگر نہو

۵۱ جوں چشمِ بسمل یعنی چشمِ بسمل کی مانند۔

ہم سے تو تم کو ضد سی پڑی ہے خواہ نخواہ رُلاتے ہو
آنکھ اُٹھا کر جب دیکھے ہیں اوروں میں ہنستے جاتے ہو

جب ملنے کا سوال کروں ہوں زلف و رُخ دکھلاتے ہو
برسوں مجھ کو یوں ہی گزرے صبح و شام بتاتے ہو

بکھری رہے ہیں مُنہ پر زلفیں آنکھ نہیں کھل سکتی ہے
کیونکہ چھپے میخواری شب جب ایسے رات کے ماتے ہو

سروِ قد و بالا ہوتا ہے در ہم برہم شاخِ گل
ناز سے قد کش ہو کے چمن میں ایک بلا تم لاتے ہو

صبح سے یاں پھر جان و دل پر روزِ قیامت رہتی ہے
رات کبھو آرہتے ہو تو یہ دن ہم کو دکھلاتے ہو

جن نے تم کو نہ دیکھا ہووے اُس سے آنکھیں مارو تم
ایک نگاہِ مفتن کر تم سو سو فتنے اُٹھاتے ہو

چشم تو ہے اک دید کی جا پر کب تکلیف کے لائق ہے
دل جو ہے دلچسپ مکاں تم اس میں کب کب آتے ہو

راحت پہنچی ٹک تم سے تو رنج اُٹھایا برسوں تک
سہلاتے ہو جو کبھو تو بھیجا بھی کھا جاتے ہو

ہو کے گدائے کوئے محبت زور صدا یہ نکالی ہے
اب تو میرجی راتوں کو تم ہر در پر چلّاتے ہو

وہی جانے جو حیا کشتہ وفا رکھتا ہو
اور رُسوائی کا اندیشہ جدا رکھتا ہو

کام لے یار سے جو جذبِ رسا رکھتا ہو
یا کوئی آئنہ سا دستِ دُعا رکھتا ہو

عشق کو نفع نہ بیتابی کرے ہے نہ شکیب
کرے تدبیر کہ جو درد دوا رکھتا ہو

میں نے آئینہ صفت در نہ کیا بند غرض
اسکو مشکل ہے جو آنکھوں میں حیا رکھتا ہو

ہائے اس زخمیِ شمشیرِ محبت کا جگر
درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو

اُس سے تشبیہ تو دیتے ہیں پہ نا شاعر لیک
سیب کچھ اُس ذقن آگے جو مزا رکھتا ہو

آدے ہے پہلے قدم سر ہی کا جانا درپیش
دیکھتا ہو جو رہِ عشق میں پا رکھتا ہو

ایسے تو حال کے کہنے سے بھلی خاموشی | کہئے اُس سے جو کوئی اپنا کہا رکھتا ہو
کیا کرے وصل سے مایوس دل آزردہ جو | زخم ہی یار کا چھاتی سے لگا رکھتا ہو
کب تلک اُس کے اسیران بلا خانہ خراب | قطعہ | ظلم کی تازہ جو ہر روز بنا رکھتا ہو
ایک دم کھولے لکے زلفوں کی کمندوں کے تئیں | مدتوں تک دلِ عاشق کو لگا رکھتا ہو

گل ہو، مہتاب ہو، آئینہ ہو، خورشید ہو، میر
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہو

مت پوچھو کچھ اپنی باتیں کہیے تو تم کو ندامت ہو
قد قامت پر کچھ ہے تمھارا لیکن قہر قیامت ہو

ربطِ اخلاص اے دیدۂ و دل بھی دُنیا میں ایک سے ہوتا ہے
لگ پڑتے ہو جس سے تس سے تم بھی کوئی ملامت ہو

آج سحر ہوتے ہی کچھ خورشید ترے منہ آن چڑھا
روک سکے ہے کون اُسے سر جس کے ایسی شامت ہو

چاہ کا دعویٰ سب کرتے ہیں مانئے کیونکر بے آثار
اشک کی سرخی، زردی مُنہ کی عشق کی کچھ تو علامت ہو

سرو و گل اچھے ہیں دونوں رونق ہیں گلزار کی لیک
چاہیے رُو اُس کا سا رُو ہو، قامت ویسا قامت ہو

مل بیٹھے اُس نائی کے سے کوئی گھڑی جو نزاہد تو
جتنے بال ہیں سارے سر پہ ویسے ہی اُسکی حجامت ہو

ہو جو ارادہ یہاں رہنے کا رہ سکیئے تو رہیئے آپ
ہم تو چلے جاتے ہیں ہر دم کس کو قصدِ اقامت ہو

کس مدت سے دُوری میں تیری خاکِ رہ سے برابر ہوں
کر لیے رنجہ قدم ٹک مجھ تک جو کچھ پاسِ قدامت ہو

منہ پر اُس کی تیغِ ستم کے سیدھا جانا ٹھہرا ہے
جینا پھر کج دار و مریز اِس طور میں ہو ٹک یا مت ہو

شور و شغب کو راتوں کے ہمسایے تمھارے کیا رو دیں | ایسے فتنے کتنے اٹھیں گے میر جی تم جو سلامت ہو

شیخ جی آؤ مصلیٰ گروِ جام کرو
جنسِ تقویٰ کے تئیں صرفِ مے[۵۱] جام کرو

فرشِ مستاں کرو سجادۂ بے تہ کے تئیں
مے کی تعظیم کرو شیشہ کا اکرام کرو

دامنِ پاک کو آلودہ رکھو بادے سے
آپ کو مغبچوں کے قابلِ دشنام کرو

نیکنامی و تفاوت کو دعا جلد کہو
دین و دل پیشکشِ سادۂ خودکام کرو

ننگ و ناموس سے اب گزرو جوانوں کی طرح
پر فشانی کرو اور ساقی سے ابرام کرو

خوب اگر جرعۂ مے نوش نہیں کر سکتے
خاطر جمع مے شام سے یہ کام کرو

اٹھ کھڑے ہو جو جھکے گردنِ مینائے شراب
خدمتِ بادہ گساراں ہی سر انجام کرو

مطرب آ کر جو کرے چنگ نوازی تو تم
پیرہن مستوں کی تقلید سے انعام کرو

خنکی اتنی بھی تو لازم نہیں اس موسم میں
پاس جوشِ گل و دل گرمیٔ ایام کرو

سایۂ گل میں لبِ جو پہ گلابی رکھو
ہاتھ میں جام کو لو آپ کو بدنام کرو

آہ تا چند رہو خانقہ و مسجد میں
ایک تو صبح گلستان میں بھی شام کرو

رات[۵۲] تو ساری گئی سنتے پریشاں گوئی
میرؔ جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

کون[۵۳] کہتا ہے نہ غیروں پہ تم امداد کرو
ہم فراموش ہوؤں کو بھی کبھو یاد کرو

ہیں یہاں مجھ سے وفا پیشہ نہ بیداد کرو
نہ کرو ایسا کہ پھر میرے تئیں یاد کرو

ایسے ہم پیشہ کہاں ہوتے ہیں اے غمزدگاں
مرگِ مجنوں پہ کڑھو ماتمِ فرہاد کرو

اے اسیرانِ تہِ دام نہ تڑپو اتنا
تا نہ بدنام کہیں چنگلِ صیاد کرو

گو کہ حیرانیٔ دیدار ہے اے آہ و سرشک
کوئی روشن کرو آنکھیں کوئی دلشاد کرو

کیا ہوا ہے ابھی تو ہستی ہی کو بھولے ہو
آخر کار محبت کو ٹک اک یاد کرو

اول عشق ہی میں میرؔ جی تم رونے لگے
خاک ابھی منہ کو ملو نالہ و فریاد کرو

۵۱ اس شعر کے قوافی میں ایطائے جلی ہے۔ مگر قدیم سے قدیم نسخوں میں بھی اسی طرح ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تصحیح سے سہواً رہ گیا ہو اور مصرع ثانی میں بجائے جام خام ہو۔ واللہ اعلم۔
۵۲ سوداؔ دہلوی ؎ سوداؔ تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات ؛ ہونے کو سحر آئی ہے ظالم کہیں مر بھی
۵۳ مرزا غالبؔ دہلوی ؎ تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو ؛ مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

دل صاف ہو تو جلوہ گہِ یار کیوں نہو
آئینہ ہو تو قابلِ دیدار کیوں نہو

عالم تمام اُس کا گرفتار کیوں نہو
وہ ناز پیشہ ایک ہے عیار کیوں نہو

مستغنیانہ تو جو کرے پہلے ہی سلوک
عاشق کو فکرِ عاقبتِ کار کیوں نہو

رحمت غضب میں نسبتِ برق و سحاب ہے
جس کو شعور ہو تو گنہگار کیوں نہو

دشمن تو اک طرف کہ سبب رشک کا ہے یاں
در کا شگاف رخنۂ دیوار کیوں نہو

آیاتِ حق ہیں سارے یہ ذرّاتِ کائنات
انکار تجھ کو ہووے سو اقرار کیوں نہو

ہر دم کی تازہ مرگِ جدائی سے تنگ ہیں
ہونا جو کچھ ہو آہ سو یکبار کیوں نہو

موئے سفید ہم کو کہے ہے کہ غافلاں
اب صبح ہونے آئی ہے بیدار کیوں نہو

نزدیک اپنے ہم نے تو سب کر رکھا ہے سہل
پھر میرؔ اس میں مردنِ دشوار کیوں نہو

عاشق ہوئے تو گو غمِ بسیار کیوں نہو
ناسورِ چشم ہو مژہ خونبار کیوں نہو

کامل ہوا اشتیاق تو اتنا نہیں ہے دور
حشرِ دگر بہ وعدۂ دیدار کیوں نہو

گلگشت کا بھی لطفِ دل خوش سے ہے نسیم
پیشِ نظر وگرنہ چمن زار کیوں نہو

مخصوص دل ہے کیا مرضِ عشق جاں گداز
ای کاش اُس کو اور کچھ آزار کیوں نہو

آوے جو کوئی آئینہ بازارِ دہر میں
بارے متاعِ دل کا خریدار کیوں نہو

مقصودِ دردِ دل ہے نہ اسلام ہے نہ کفر
پھر ہر گلے میں سبحہ و زنار کیوں نہو

شاید کہ آوے پرسشِ احوال کو کبھو
عاشق بھلا سا ہووے تو بیمار کیوں نہو

تلوار کے تلے بھی ہیں آنکھیں تری اُدھر
تو اس ستم کا میرؔ سزاوار کیوں نہو

ایسا ہے ماہ گو کہ وہ سب نور کیوں نہو
ویسا ہی پھول فرض کیا حور کیوں نہو

کھویا ہمارے ہاتھ سے آئینہ نے اُسے
ایسا جو پاوے آپ کو مغرور کیوں نہو

حق بر طرف ہے منکرِ دیدارِ یار کے
جو شخص ہووے آنکھوں سے معذور کیوں نہو

گیسوئے مشکبو کو اُسے ضد ہے کھولنا
پھر زخمِ دل فگاروں کا ناسور کیوں نہو

صورت تو تیری صفحۂ خاطر پہ نقش ہے
ظاہر میں اب ہزار تو مستور کیوں نہو

صافی شست سے ہے غرض مشقِ تیر سے
سینہ کسو کا خانۂ زنبور کیوں نہو

مجنوں جو دشت گرد تھا ہم شہر گرد ہیں
آوارگی ہماری بھی مذکور کیوں نہ ہو

تلوار کھینچتا ہے وہ اکثر نشے کے بیچ
زخمی جو اُس کے ہاتھ کا ہو چور کیوں نہ ہو

خالی نہیں غزل کوئی دیوان سے مرے
فسانہ عشق کا ہے یہ مشہور کیوں نہ ہو

مجھ کو تو یہ قبول ہوا عشق میں کہ میرؔ
پاس اُس کے جب گیا تو کہا "دُور کیوں نہ ہو"

ہر دم وہ شوخ دست بہ شمشیر کیوں نہ ہو
کچھ ہم نے کی ہے ایسی ہی تقصیر کیوں نہ ہو

اب تو جگر کو ہم نے بلا کا ہدف کیا
انداز اس نگاہ کا پھر تیر کیوں نہ ہو

جاتا تو ہے کہیں کو تو اے کاروانِ مصر
کنعاں ہی کی طرف کو یہ شبگیر کیوں نہ ہو

حیراں ہیں اسقدر کہ اگر اب کی جائیے
پھر مُنھ ترا نہ دیکھیے تصویر کیوں نہ ہو

تو نے تو رفتہ رفتہ کیا ہم کو ننگِ خلق
وحشت دلا کہاں تئیں زنجیر کیوں نہ ہو

جوں گل کسو شگفتہ طبیعت کا ہے نشاں
غنچہ بھی کوئی خاطرِ دلگیر کیوں نہ ہو

ہووے ہزار وحشت اُسے تو بھی یار ہے
اغیار تیرے ساتھ جو ہوں میرؔ کیوں نہ ہو

دیکھتا ہوں دھوپ ہی میں جلنے کے آثار کو
لے گئی ہیں دور تڑپیں سایۂ دیوار کو

یاب صحت ہے وگرنہ کون کہتا ہے طبیب
جلد اُٹھاؤ میرے دروازہ سے اس بیمار کو

وے جو مستِ بیخودی ہیں عیش کرتے ہیں مدام
سیکڑوں ہیں دہر کے مشکل ہے ٹک ہشیار کو

نقشِ شیریں یادگارِ کوہ کن ہے اس میں جو
ورنہ کیا ہے بیستوں دیکھا ہے میں کہسار کو

کس قدر اُلجھیں ہیں میرے تارِ دامن کہ اب
پانوں میں گڑ کر نہیں چبھنے کی فرصت خار کو

ہے غبار میرؔ اُس کی رہگزر میں اک طرف
کیا ہوا دامن کشاں آتے بھی یہاں تک یار کو

جو میں نہ ہوں تو کرو ترک ناز کرنے کو
کوئی تو چاہیے جی بھی نیاز کرنے کو

نہ دیکھو غنچۂ نرگس کی اور کھلتے ہیں
جو دیکھو اُس کی مژہ نیم باز کرنے کو

نہ سوئے نیند بھر اس تنگنا میں تا نہ موے
کہ آہ جانہ تھی پاؤں کے دراز کرنے کو

جو بید باغی یہی ہے تو بن چکی اپنی
دماغ چاہیے ہر اک سے ساز کرنے کو

وہ گرم ناز ہو تو خلق پر ترحم کر
پکارے آپ اجل احتراز کرنے کو

جو آنسو آویں تو پی جا کہ تا رہے پردہ
بلا ہے چشم تر افشائے راز کرنے کو

سمندِ ناز سے تیرے بہت ہے عرصہ تنگ
تنک تو ترک کر اس ترکتاز کرنے کو

بسان زر ہے مرا جسمِ زار سارا زرد
اثر تمام ہے دل کے گداز کرنے کو

ہنوز لڑکے ہو تم قدر میری کیا جانو
شعور چاہیئے ہے امتیاز کرنے کو

اگرچہ گل بھی نمود اُس کے رنگ کرتا ہے
ولیک چاہیئے ہے منہ بھی ناز کرنے کو

زیادہ حد سے تھی تابوتِ میر پر کثرت
ہوا نہ وقتِ مساعد نماز کرنے کو

کرتے بیاں جو ہوتے خریدار ایک دو
دیکھا کریں ہیں ساتھ ترے یار ایک دو

قیدِ حیات قید کوئی سخت ہے کہ روز
مر رہتے ہیں گے اُس کے گرفتار ایک دو

کس کس پہ اُس کو ہووے نظر یہاں ہر ایک شب
جی دیں ہیں اس کی چشم کے بیمار ایک دو

تو تو دوچار ہو کے گیا کب کا یہاں ہنوز
گزریں ہیں اپنی جان سے ناچار ایک دو

ابروئے تیغ زن کی تمھارے تو کیا چلی
گرے ہے جس کا لاگتے ہی وار ایک دو

ٹک چشم میں بھی میر کا دنبالہ کھینچئے
س مست کے بھی ہاتھ میں تلوار ایک دو

کیا کیا عزیز دوست ملے میر خاک میں
کچھ اس گلی میں ہم ہی نہیں خوار ایک دو

حالِ دل میر کا اے اہلِ وفا مت پوچھو
س ستم کشتہ پہ جو گزری جفا مت پوچھو

صبح سے اور بھی پاتا ہوں اُسے شام کو تند
کام کرتی ہے جو کچھ میری دعا مت پوچھو

استخواں توڑی مری اس کی گلی کے سگ نے
جس خرابی سے میں وہاں اُٹھ رہا مت پوچھو

ہوش و صبر و خرد و دین و حواس و دل و تاب
اُس کے ایک آنے میں کیا کیا نہ گیا مت پوچھو

اشتعالک کی محبت نے کہ دربست پھنکا
شہرِ دل کیا کہوں کس طور جلا مت پوچھو

وقتِ قتل آرزوے دل جو لگے پوچھنے لوگ
میں اشارت کی اُدھر اُن نے کہا مت پوچھو

خواہ مارا اُنھیں نے میر کو خواہ آپ موا
جانے دو یارو جو ہونا تھا ہوا مت پوچھو

نالہ شب نے کیا ہے جو اثر مت پوچھو
ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے جگر مت پوچھو

پوچھتے کیا ہو مرے دل کا تم احوال کہ ہے
جیسے بیمار اجل روز بستر مت پوچھو

مرنے میں بند زباں ہونا اشارت ہے ندیم
یعنی ہے دُور کا درپیش سفر مت پوچھو

کیا پھرے وہ وطن آوارہ گیا اب سو ہی
دل گم کردہ کی کچھ خیر خبر مت پوچھو

لذتِ زہرِ غم فرقتِ دلداراں سے
ہو دے منہ میں جنھوں کی شہد و شکر مت پوچھو

دل خراشی و جگر چاکی و سینہ کاوی
اپنے ناحق میں ہیں سب اور ہنر مت پوچھو

جوں توں کر حال دل اکبار تو میں عرض کیا
میر صاحب جی بس اب بار دگر مت پوچھو

اس کی طرزِ نگاہ مت پوچھو
جی ہی جانے ہے آہ مت پوچھو

کہیں پہنچو گے بے رہی میں بھی
گم رہاں یوں یہ راہ مت پوچھو

تو گرفتارِ دامِ زلف اُس کا
ہے یہی روسیاہ مت پوچھو

ہیں گی برگشتہ وے صفِ مژگاں
پھر گئی ہے سپاہ مت پوچھو

قطعہ
تھا کرم پر اُسی کے شرب مدام
میرے اعمال آہ مت پوچھو

تم بھی اے مالکانِ روزِ جزا
بخشدو اب گناہ مت پوچھو

میر عاشق کو کچھ کہے ہی بنے
خواہ وہ پوچھو خواہ مت پوچھو

محرماں بیدمی کا میری سبب مت پوچھو
ایک دم چھوڑ دو یوں ہی مجھے اب مت پوچھو

گریۂ شمع کا اے ہمنفساں میں تھا حریف
گزری ہے رات کی صحبت بھی عجب مت پوچھو

سر پُر شور سے میرے نہ کرو کوئی سوال
حشر تھی داخلِ خُدّام ادب مت پوچھو

لب پہ شیون مژہ پر خون و نگہ میں اک یاس
دن گیا ہجر کا جس ڈھنگ سے شب مت پوچھو

میر صاحب نئی یہ طرز ہوا اس کی تو کہوں
موجب آزردگی کا وجہِ غضب مت پوچھو

فرصت نہیں تنک بھی کہیں اضطراب کو
کیا آفت آگئی مرے اس دل کی تاب کو

میری ہی چشمِ تر کی کرامات ہے یہ سب
بھرتا تھا ورنہ ابر تو محتاج آب کو

گزری ہے شب خیال میں خوباں کے جاگتے
آنکھیں لگا کے اُن سے میں سوں ہوں خواب کو

خط آگیا پر اُس کا تغافل نہ کم ہوا
قاصد مرا خراب پھرے ہے جواب کو

تیور میں جب سے دیکھے ہیں ساقی خمار کے
پیتا ہوں رکھ کے آنکھوں پہ جامِ شراب کو

اب تو نقاب منہ پہ لے ظالم کہ شب ہوئی — شرمندہ سارے دن تو کیا آفتاب کو

کہنے سے میر اور بھی ہوتا ہی مضطرب
سمجھاؤں کبتک اس دلِ خانہ خراب کو

کیا ہی گر بدنامی و حالت تباہی بھی نہ ہو — عشق کیسا جس میں اتنی روسیاہی بھی نہ ہو
لطف کیا آزردہ ہو کر آپسے ملنے کے بیچ — ٹک تری جانب سے جبتک عذرخواہی بھی نہ ہو
چاہتا ہی جی کہ ہم تو ایک جا تنہا ملیں — نازِ بیجا بھی نہ ہووے کم نگاہی بھی نہ ہو
مجمع ترکاں ہی کوئی دیکھیو جا کر کہیں — جس کا میں کشتہ ہوں اُن میں وہ سپاہی بھی نہ ہو
ناز برداری تری کرتے تھے ایک امید پر — راستی ہم سے نہیں تو کج کلاہی بھی نہ ہو

یہ دعا کی تھی سمجھے کن نے کہ بہرِ قتلِ میر
محضرِ خوں پہ تیرے اک گواہی بھی نہو

اُجرت میں نامہ کی ہم دیتے ہیں جاں تلک تو — اب کارِ شوق اپنا پہنچا ہی یہاں تلک تو
آغشتہ میرے خوں سے ای کاش جا کے پہنچے — کوئی پرِ شکستہ ٹک گلستاں تلک تو
واماندگی نے مارا اثنائے رہ میں ہم کو — معلوم ہی پہنچنا اب کارواں تلک تو
افسانہ غم کا لب تک آیا ہی مدتوں میں — سو جائیو نہ پیارے اس داستاں تلک تو
آوارہ خاک میری ہو کس قدر الٰہی — پہنچوں غبار ہو کر میں آسماں تلک تو
ای کاش خاک ہی ہم ہوتے کہ میر اسمیں — ہوتی ہمیں رسائی اُس آستاں تلک تو

ردیف ہائے ہوز

سو ظلم کے رہتے ہیں سزاوار ہمیشہ — ہم بیگنہ اُس کے ہیں گنہگار ہمیشہ
ایک آن گزر جائے تو کہنے میں کچھ آوے — درپیش ہی یہاں مردنِ دشوار ہمیشہ
دشمن کو نہ کیوں شربِ مدام آوے میسر — رہتی ہے اودھر ہی نگہِ یار ہمیشہ
یوسف سے کئی آن کے تیرے سرِ بازار — بک جاتے ہیں باتوں میں خریدار ہمیشہ
ہی دامنِ گلچینِ چمن جیب ہمارا — دنیا میں رہے دیدۂ خونبار ہمیشہ
جو بن ترے دیکھے ہو سو دوزخ میں ہی یعنی — رہتی ہی اُسے حسرتِ دیدار ہمیشہ
جیتا ہی تو بیطاقتی و بیخودی ہی میر — مردہ ہی غرض عشق کا بازار ہمیشہ

جگر لوہو کو ترسے ہی میں سچ کہتا ہوں دل خستہ
دلیل اسکی نمایاں ہی مری آنکھیں ہیں خوں بستہ

چمن میں دل خراش آواز آتی ہی چلی شاید
پس دیوارِ گلشن نالہ کش ہی کوئی پر بستہ

ترے کوچے میں یکسر عاشقوں کے خار مژگاں ہیں
جو تو گھر سے کبھو نکلے تو رکھیو پانوں آہستہ

مرے آگے نہیں ہنستا تو اک صلح کرتا ہوں
بھلا میں روؤں دو دریا تبسم کر تو یک پستہ

تعجب ہی مجھے یہ سرو کو آزاد کہتے ہیں
سراپا دل کی صورت جس کی ہو وہ کیا ہو وارستہ

تری گلگشت کی خاطر بنا ہی باغ داغوں سے
پر طاؤس سینہ ہی تمامی دست گلدستہ

بجا ہی گر فلک پر فخر سے پھینکے کلاہ اپنی
کہے جو اس زمیں میں میر یک مصرع برجستہ

ہم ہیں مجروح ماجرا ہے یہ
وہ نمک چھڑکے ہی مزا ہے یہ

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ

بود آدم نمودِ شبنم ہے
ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ

شکر اُس کی جفا کا ہو نہ سکا
دل سے اپنے ہمیں گلا ہے یہ

شور سے اپنے حشر ہے پردہ
یوں نہیں جانتا کہ کیا ہے یہ

بس ہوا ناز ہو چکا اغماض
ہر گھڑی ہم سے کیا ادا ہے یہ

نعشیں اُٹھتی ہیں آج یاروں کی
آن بیٹھو تو خوش نما ہے یہ

دیکھ بے دم مجھے لگا کہنے
ہی تو مردہ سا پر بلا ہے یہ

میں تو چپ ہوں وہ ہونٹھ چاٹی ہی
کیا کہوں ریجھنے کی جا ہے یہ

ہے رے بیگانگی کبھو اُن نے
نہ کہا یہ کہ آشنا ہے یہ

تیغ پر ہاتھ دمبدم کب تک
اک لگا چک کہ مدعا ہے یہ

میر کو کیوں نہ مغتنم جانے
اگلے لوگوں میں اک رہا ہی یہ

دلِ پُر خوں ہے یہاں تجھ کو گماں ہی شیشہ
شیخ کیوں مست ہوا ہی تو کہاں ہی شیشہ

شیشہ بازی تو تنک دیکھنے آنکھوں کی
ہر پلک پر مری اشکوں سے رواں ہی شیشہ

روسفیدی ہے نقاب رخ شورِ مستی
ریش قاضی کے سبب پنبہ دہاں ہی شیشہ

منزلِ ہستی کو پہنچے ہے اُنھیں سے عالم
نشہ مے بلد و سنگ نشاں ہی شیشہ

قطعہ

درمیاں حلقۂ مستاں کے شب اپنی جا تھی — دور ساغر ہیں مگر پیرِ مغاں ہی شیشہ
جاکے پوچھا جو میں یہ کارگہِ مینا میں — دل کی صورت کا بھی اے شیشہ گراں ہی شیشہ
کہنے لاگے کہ کدھر پھرتا ہی بہکا اے مست — ہر طرح کا جو تو دیکھے ہی کہ یہاں ہی شیشہ
دل ہی سارے تھے پہ اک وقت میں جو کر کے گداز — شکل شیشہ کی بنائی ہے کہاں ہی شیشہ

جھک گیا دیکھ کے میں میرؔ اُسے مجلس میں
چشمِ بد دور طرحدار جواں ہے شیشہ

جی چاہے مل کسو سے یا سب سے تو جدا رہ — پر ہو سکے تو پیارے ٹک دل کا آشنا رہ
کل بے تکلفی میں لطف اُس بدن کا دیکھا — نکلا نہ کر قبا سے اے گل بس اب ڈھپا رہ
عاشق غیور جی دے اور اُس طرف نہ دیکھے — وہ آنکھ جو چھپا دے تو تو بھی ٹک کھنچا رہ
پہنچیں گے آگے دیکھیں کس درجہ کو ابھی تو — اُس ماہ چاردہ[14] کا سن دہ دو ہی یا کہ بارہ[12]
کھینچا کرے ہی ہر دم کیا تیغ بُلہوس پر — اس ناسزا کے خوں کے اتنا نہ سر چڑھا رہ
مستظہر محبت تھا کوہکن وگرنہ — یہ بوجھ کس سے اُٹھتا ایک اور ایک گیارہ
ہر مشت خاک یہاں کی چاہی ہی اک تأمل — بن سوچے راہ مت چل ہر گام پر کھڑا رہ
شاید کہ سربلندی ہووے نصیب تیرے — جوں گردِ راہ سب کے پانوں سے تو لگا رہ
اُس خطِ سبز نے کچھ رویت نہ رکھی تیری — کیا ایسی زندگانی جا خضر زہر کھا رہ
حد سے زیادہ واعظ یہ کودنا اُچھلنا — کاہے کو جاتے ہیں ہم اے خرس اب بندھا رہ
میں تو ہیں وہم دونوں کیا ہی خیال تجھکو — جھاڑ آستین مجھ سے ہاتھ آپ سے اُٹھا رہ
جیسے خیالِ مفلس جاتا ہی سو جگہ تو — مجھ بینوا کے بھی گھر ایک آدھ رات آ رہ
دوڑے بہت ولیکن مطلب کو کون پہنچا — آئینہ تو بھی ہمسا ہو کر شکستہ پا رہ

جب ہوش میں تو آیا اودھر ہی جاتے پایا
اس سے تو میرؔ چندے اُس کوچہ ہی میں جا رہ

اب حال اپنا اُس کے ہی دلخواہ — کیا پوچھتے ہو الحمد للہ
مرجاؤ کوئی پروا نہیں ہے — کتنا ہے مغرور اللہ اللہ
پیر مغاں سے بے اعتقادی — استغفر اللہ استغفر اللہ
کہتے ہیں اُس کے تو منہ لگیگا — ہو یوں ہی یا رب جوں ہی یہ افواہ

حضرت سے اُسکے جانا کہاں ہے ... اب مر رہیگا یہاں بندہ درگاہ
سب عقل کھوے ہے راہِ محبت ... ہو خضر دل میں کیسا ہی گمراہ
مجرم ہوئے ہم دل دیکے ورنہ ... کسکو کسو سے ہوتی نہیں چاہ
کیا کیا نہ رکھیں تم نے بچائیں ... اچھا رجھایا اے مہربان آہ
گزرے ہے دیکھیں کیونکر ہماری ... اس بے وفا سے نے رسم نے راہ
قطعہ
تھی خواہش دل رکھنا حمائل ... گردن میں اُسکی ہرگاہ و بیگاہ
اس پر کہ تھا وہ شہ رگ سے اقرب ... ہرگز نہ پہنچا یہ دستِ کوتاہ
قطعہ
ہے ماسوا کیا جو میرؔ کہیے ... آگاہ ساری اُس سے ہیں آگاہ
جلوے ہیں اُس کے شانیں ہیں اُسکی ... کیا روز کیا خور کیا رات کیا ماہ

ظاہر کہ باطن اوّل کہ آخر
اللہ اللہ اللہ اللہ

جو ہوشیار ہو سو آج ہو شراب زدہ ... زمین میکدہ یکدست ہے گی آب زدہ
بنے یہ کیونکہ ملی تو ہی یا ہمیں سمجھیں ... ہم اضطراب زدہ اور تو حجاب زدہ
کرے ہے جس کو ملامت جہاں وہ میں ہی ہوں ... اجل رسیدہ جفا دیدہ، اضطراب زدہ
جدا ہو رخ سے تری زلف میں کیوں دل جائے ... پناہ لیتے ہیں سایہ کی آفتاب زدہ

لگا نہ ایک بھی میرؔ اُس کی بیت ابرو کو
اگرچہ شعر تھے سب میرے انتخاب زدہ

جز جرمِ عشق کوئی بھی ثابت کیا گناہ ... ناحق ہماری جان لی اچھے ہو واہ واہ
اب کیسا چاک چاک ہو دل اُس کی ہجر میں ... گتھواں تو لختِ دل سے نکلتی ہے میری آہ
شامِ شبِ وصال ہوئی یہاں کہ اُس طرف ... ہونے لگا طلوع ہی خورشیدِ روسیاہ
گزرا ایکس اس سلوک سے دیکھا نکر مجھے ... برچھی سی لاگ جا ہے جگر میں تری نگاہ
بیتاب یوں کہ سوتپ نہ دینا کہیں مجھے ... اے ضبر میں نے آن کے لی ہے تری پناہ
خون البتہ بار سے رہنے لگی اب تو یہ مژہ ... آنسو کی بوند جس سے ٹپکتی تھی گاہ گاہ

ناحق اُلجھ پڑا ہے یہ مجھ سے طریقِ عشق
جاتا تھا میرؔ میں تو چلا اپنی راہ راہ

کہتے ہیں اُڑ بھی گئے جل کے پرِ پروانہ
کچھ سنی سوختگاں تم خبرِ پروانہ

سعی اتنی یہ ضروری ہے اٹھی بزم سلگ
اے جگر تفتگی بے اثرِ پروانہ

کس گنہ کا ہے پس از مرگ یہ عذر جانسوز
پانوں پر شمع کے پاتے ہیں سرِ پروانہ

آ پڑا آگ میں اے شمع یہیں سے تو سمجھ
کس قدر داغ ہوا تھا جگرِ پروانہ

بزم دنیا کی تو دلسوزی سنی ہوگی میر
کس طرح شام ہوئی یہاں سحرِ پروانہ

ہم سے کچھ آگے زمانے میں ہوا کیا کیا کچھ
تو بھی ہم غافلوں نے آکے کیا کیا کیا کچھ

دل جگر جان یہ بھسمنت ہوئے سینے میں
گھر کو آتش دی محبت نے جلا کیا کیا کچھ

کیا کہوں تجھ سے کہ کیا دیکھا ہے تجھ میں میں نے
عشوہ و غمزہ و انداز و ادا کیا کیا کچھ

دل گیا، ہوش گیا، صبر گیا، جی بھی گیا
شغل میں غم کے ترے ہم سے گیا کیا کیا کچھ

آہ مت پوچھ ستمگار کہ تجھ سے تھی ہمیں
چشم لطف و کرم و مہر و وفا کیا کیا کچھ

قطعہ

نام ہے خستہ و آوارہ و بدنام مرے
ایک عالم نے غرض مجھ کو کہا کیا کیا کچھ

طرفہ صحبت ہے کہ سنتا نہیں تو ایک مری
واسطے تیرے سنا میں نے سنا کیا کیا کچھ

حسرت وصل و غم ہجر و خیالِ رخِ دوست
مر گیا میں پہ مرے جی میں رہا کیا کیا کچھ

دردِ دل، زخمِ جگر، کلفتِ غم، داغِ فراق
آہ عالم سے مرے ساتھ چلا کیا کیا کچھ

چشم نمناک و دل پر جگر صد پارہ
دولتِ عشق سے ہم پاس بھی تھا کیا کیا کچھ

تجھ کو کیا بننے بگڑنے سے زمانے کی کہ یہاں
خاک کن کن کی ہوئی صرف بنا کیا کیا کچھ

قطعہ

قبلہ و کعبہ خداوند و ملاذ و مشفق
مضطرب ہو کے اسے میں نے لکھا کیا کیا کچھ

پر لکھوں کیا رقمِ شوق کی اپنی تاثیر
ہر سر حرف پہ وہ کہنے لگا کیا کیا کچھ

ایک محروم چلے میر ہمیں عالم سے
ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

کیا موافق ہو دوا عشق کے بیمار کے ساتھ
جی ہی جاتے نظر آئے ہیں اس آزار کے ساتھ

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

مر گئے پر بھی کھلی رہ گئیں آنکھیں اپنی
کون اس طرح موا حسرتِ دیدار کے ساتھ

شوق کا کام کھنچا دور کہ اب مہر مثال
چشم مشتاق لگی جائے ہے طومار کے ساتھ

راہ اُس شوخ کی عاشق سے نہیں رُک سکتی — جان جاتی ہے چلی خوبیٔ رفتار کے ساتھ

وے دن اب سالتے ہیں راتوں کو برسوں گزرے — جن دنوں دیر رہا کرتے تھے ہم یار کے ساتھ

ذکرِ گل کیا ہے صبا! اب کہ خزاں میں ہم نے — دل کو ناچار لگایا ہے خس و خار کے ساتھ

کس کو ہر دم ہے لہو رونے کا ہجراں میں دماغ — دل کو اک ربط سا ہے دیدۂ خونبار کے ساتھ

میری اُس شوخ سے صحبت ہے بعینہ ویسی — جیسے بن جائے کسو سادے کو عیار کے ساتھ

دیکھئے کس کو شہادت سے سرافراز کریں — لاگ تو سب کو ہے اُس شوخ کی تلوار کے ساتھ

بیکلی اُس کی نہ ظاہر تھی جو تو اے بلبل
دم کشِ میر ہوئی اُس لبِ گفتار کے ساتھ

ردیف یائے تحتانی

دل کو تسکین نہیں اشکِ دمادم سے بھی — اس زمانے میں گئی ہے برکت غم سے بھی

ہمنشیں کیا کہوں اس رشکِ مہِ تاباں بن — صبحِ عید اپنی ہے بدتر شبِ ماتم سے بھی

کاش اے جانِ المناک نکل جاوے تو — اب تو دیکھا نہیں جاتا یہ ستم ہم سے بھی

آخرِ کارِ محبت میں نہ نکلا کچھ کام — سینہ چاک و دلِ پژمردہ مژہ نم سے بھی

آہ ہر غیر سے تا چند کہوں جی کی بات — عشق کا راز تو کہتے نہیں محرم سے بھی

دوری کوچہ میں اے غیرتِ فردوس ترے — کام گزرا ہے مرا گریۂ آدم سے بھی

ہمت اپنی ہی تھی یہ میر کہ جوں مرغِ خیال
اک پرافشانی میں گزرے سرِ عالم سے بھی

تاب دل صرفِ جدائی ہو چکی — یعنی طاقت آزمائی ہو چکی

چھوٹتا کب ہے اسیرِ خوش زباں — جیتے جی اپنی رہائی ہو چکی

آگے ہو مسجد کے نکلے اُس کی راہ — شیخ سے اب پارسائی ہو چکی

درمیاں ایسا نہیں اب آئینہ — میری اُس کی اب صفائی ہو چکی

ایک بوسہ مانگتے لڑنے لگے — اتنے ہی میں آشنائی ہو چکی

بیچ میں ہم ہی ہوں تو لطف کیا — رحم کر اب بے وفائی ہو چکی

آج پھر تھا بے حمیت میر وہاں — کل لڑائی سی لڑائی ہو چکی

آخر ہماری خاک بھی برباد ہو گئی — اس کی ہوا میں ہم پہ تو بیداد ہو گئی
مدت ہوئی نہ خط ہے نہ پیغام ہے مگر — اک رسم تھی وفا کی بر افتاد ہو گئی
دل کس قدر شکستہ ہوا تھا کہ رات میر
آئی جو بات لب پہ سو فریاد ہو گئی

یہ چشم آئنہ دار رو تھی کسو کی — نظر اس طرف بھی کبھو تھی کسو کی
سحر پائے گل بیخودی ہم کو آئی — کہ اس سست پیماں میں بو تھی کسو کی
یہ سرگشتہ جب تک رہا اس چمن میں — برنگِ صبا جستجو تھی کسو کی
نہ ٹھہری ٹک اک جان بر لب رسیدہ — ہمیں مدعا گفتگو تھی کسو کی
جلایا شب اک شعلۂ دل نے ہم کو — کہ اس تند سرکش میں خو تھی کسو کی
نہ تھی تجھ سے نازک میانانِ گلشن — بہت تو کمر جیسے مو تھی کسو کی
دمِ مرگ دشوار دی جان اُن نے
مگر میر کو آرزو تھی کسو کی

ہے غزل میر یہ شفائی کی — ہم نے بھی طبع آزمائی کی
اُس کے ایفائے عہد تک نہ جیے — عمر نے ہم سے بے وفائی کی
وصل کے دن کی آرزو ہی رہی — شب نہ آخر ہوئی جدائی کی
اسی تقریب اُس گلی میں رہے — منتیں ہیں شکستہ پائی کی
دل میں اُس شوخ کے نہ کی تاثیر — آہ نے آہ نارسائی کی
کاسۂ چشم لیکے جوں نرگس — ہم نے دیدار کی گدائی کی
زور و زر کچھ نہ تھا تو بارے میر
کس بھروسے پہ آشنائی کی

آہ میری زبان پہ آئی — یہ بلا آسمان پر آئی
عالمِ جاں سے تو نہیں آیا — ایک آفت جہان پر آئی
پیری آفت ہے پھر تھا گویا — یہ بلا جس جہان پر آئی
ہم بھی حاضر ہیں کھینچیے شمشیر — طبع گر امتحان پر آئی
آتشِ رنگِ گل سے کیا کہیے — برق تھی آشیان پر آئی

۵۔ بوسۂ یار من ازیں سست وفا مے آید — کلم از دست بگیرید کہ انکار ستدم ۔ نظیری ۔

طاقتِ دل برنگِ نکہتِ گل
پھیر اپنے مکان پر آئی

ہو جہاں میر اور غم اُس کا
جس سے عالم کی جان پر آئی

بات شکوہ کی ہم نے گاہ نہ کی
بلکہ دی جان اور آہ نہ کی

گل و آئینہ ماہ و خور کن نے
چشم اُس چہرہ پر سیاہ نہ کی

کعبے سَو بار وہ گیا تو کیا
جس نے یہاں ایک دل میں راہ نہ کی

واہ اے عشق اس ستمگر نے
جانفشانی پہ میری واہ نہ کی

جس سے تھی چشم ہم کو کیا کیا میر
اس طرف اُن نے اک نگاہ نہ کی

کل میر نے کیا کیا کی مے کے لیے بیتابی
آخر کو گرو رکھا سجادۂ محرابی

جاگا ہے کہیں وہ بھی شب مرتکبِ مے ہو
یہ بات سجھاتی ہے اُن آنکھوں کی بے خوابی

کیا شہر میں گنجائش مجھ بے سر و پا کو ہو
اب بڑھ گئیں ہیں میری اسباب بکم اسبابی

دن رات مری چھاتی جلتی ہے محبت میں
کیا اور نہ تھی جاگہ یہ آگ جو یہاں دابی

سو ملک پھرا لیکن پائی نہ وفا اک جا
جی کھا گئی ہے میرا اس جنس کی نایابی

خوں بستہ نہ کیوں پلکیں ہر لحظہ رہیں میری
جاتے نہیں آنکھوں سے لبِ یار کے عنابی

جنگل ہی ہرے تنہا رونے سے نہیں میرے
کوہوں کی کمر تک بھی جا پہنچی ہے سیرابی

تھے ماہ وشاں کل جو ان کوٹھوں پہ جلوے میں
ہے خاک سے آج اُن کی ہر صحن میں مہتابی

کل میر جو یہاں آیا طور اُس کا بہت بھایا
وہ خشک لبی تس پر جامہ گلے میں آبی

ہمیں آمدِ میر کل بھا گئی
طرح اُس میں مجنوں کی سب پا گئی

کہاں کا غبار آہ دل میں یہ تھا
مری خاک بدلی سی سب چھا گئی

کیا پاسِ بلبل خزاں نے نہ کچھ
گل و برگ بے درد پھیلا گئی

ہوئی سامنے یوں تو ایک ایک کے
ہمیں سے وہ کچھ آنکھ شرما گئی

جگر منہ تک آتے نہیں بولتے
غرض ہم بھی کرتے ہیں کیا کیا گئی

نہ ہمرہ کوئی نہ کسی سے گیا
مری لاش تا گور تنہا گئی

گھٹا شمع ساں کیوں نجاؤں چلا
کوئی رہنے والی ہے جانِ عزیز

تپِ غم جگر کو مرے کھا گئی
گئی گریہ امروز فردا گئی

کئے دست و پا گم جو میر آگیا
وفا پیشہ مجلس اُسے پا گئی

یکسو کشادہ روئی پرچیں نہیں جبیں بھی
ہم چھوڑتے تھے اُس کی کاش اُسکو ہووے کیں بھی

آنسو تو تیرے دامن پونچھے ہے وقت گریہ
ہم نے نہ رکھی منھ پر اے ابر آستیں بھی

کرتا نہیں عبث تو پارہ گلو فغاں سے
گزرے ہے پار دل کے اک نالۂ حزیں بھی

ہوں احتضار میں میں آئینہ رو شتاب آ
جاتا ہے ورنہ غافل پھر دم تو واپسیں بھی

سینے سے تیر اُس کا جی کو تو لیتا نکلا
پر ساتھوں ساتھ اُس کے نکلی اک آفریں بھی

ہر شب تری گلی میں عالم کی جان جا ہے
آگے ہوا ہے اب تک ایسا ستم کہیں بھی

شوخی جلوہ اُس کی تسکین کیونکہ بخشے
آئینوں میں دلوں کے جو ہے بھی پھر نہیں بھی

گیسو ہی کچھ نہیں ہے سنبل کی آفت اُس کا
ہیں برقِ خرمنِ گل رخسارِ آتشیں بھی

تکلیفِ نالہ مت کر ای دردِ دل کہ ہونگے
رنجیدہ راہ چلتے آزردہ ہمنشیں بھی

کس کس کا داغ دیکھیں یارب غمِ بتاں میں
رخصت طلب ہے جاں بھی ایمان اور دیں بھی

زیرِ فلک جہاں ٹک آسودہ میر ہوتے
ایسا نظر نہ آیا اک قطعۂ زمیں بھی

گئی چھاؤں اُس تیغ کی سر سے جب کی
چلے دھوپ میں یہاں تلک ہم کہ تب کی

پڑی خرمنِ گل پہ بجلی سی آخر
مرے خوش نگہ کی نگاہ اک غضب کی

کوئی بات نکلے ہے دشوار منھ سے
ٹک اک تو بھی تو سن کسی جاں بلب کی

تو ستلا جو رکھتا ہے خر سے دگرنہ
ضرورت ہے کیا شیخ دم اک و چپ کی

بکایک بھی آ سر پہ واماندگاں کے
بہت دیکھتے ہیں تری راہ کب کی

دماغ و جگر دل مخالف ہوئے ہیں
ہوئی متفق اب اُدھر رائے سب کی

تجھے کیونکے ڈھونڈھوں کہ سوتے ہی گذری
تری راہ میں اپنے پائے طلب کی

دل عرش سے گذرے ہے ضعف میں بھی
یہ زور آوری دیکھو زاری شب کی

عجب کچھ ہے گر میر آوے میسر
گلابی شراب اور غزل اپنے ڈھب کی

کیسے قدم سے اسکی گلی میں صبا گئی | یوں پھونک کرکے خاک مری سب اڑا گئی

کچھ تھی طپش جگر کی تو بارے مزاج داں | پر دل کی بیقراری مری جان کھا گئی

کس پاس جاکے بیٹھوں خرابی میں اب میں ہائے | مجنوں کو موت کیسی شتابی میں آ گئی

کون اس ہوا میں زخمی نہیں میری آہ کا | بجلی رہی تھی سو بھی تو سینہ دکھا گئی

سودا جو اسکے سر سے گیا زلف یار کا
تو تو بڑی ہی میر کے سر سے بلا گئی

خبر نہ تھی تجھے کیا میرے دل کی طاقت کی | نگاہ چشم ادھر تونے کی قیامت کی

انھوں میں جو کہ ترے محو سجدہ رہتے ہیں | نہیں ہے قدر ہزاروں برس کی طاعت کی

اٹھائی ننگ سمجھ تم نے بات کے کہتے | وفا و مہر جو تھی رسم ایک مدت کی

رکھیں امید رہائی اسیر کاکل و زلف | مری تو باتیں ہیں بجز حرف الفت کی

رہے ہے کوئی خرابات چھوڑ مسجد میں | ہوا منائی اگر شیخ نے کرامت کی

سوال میں نے جو انجام زندگی سے کیا | قد خمیدہ نے سوے زمیں اشارت کی

نہ میری قدر کی اس سنگدل نے میر کبھو
ہزار حیف کہ پتھر سے میں محبت کی

فکر ہے ماہ کے جو شہر بدر کرنے کی | ہے سزا تجھ پہ یہ گستاخ نظر کرنے کی

کہہ حدیث آنے کی اسکے جو کیا شادی مرگ | نامہ بر کیا چلی تھی ہم کو خبر کرنے کی

کیا جلی جاتی ہے خوبی ہی میں اپنی اے شمع | کہہ پتنگے کی بھی کچھ شام و سحر کرنے کی

ابکی برسات ہی کے ذمہ تھا عالم کا وبال | میں تو کھائی تھی قسم چشم کے تر کرنے کی

پھول کچھ لیتے نہ نکلے تھے دل صد پارہ | طرز سیکھی ہے مرے ٹکڑے جگر کرنے کی

ان دنوں نکلے ہے آغشتہ بخوں نالوں کو | دھن ہے نالہ کو کسو دل میں اثر کرنے کی

عشق میں تیرے گزرتی نہیں بن سر پٹکے | صورت اک یہ رہی ہے عمر بسر کرنے کی

کاروانی ہے جہاں عمر عزیز اپنی میر
رہ ہے در پیش سدا اسکو سفر کرنے کی

خرابی کچھ نہ پوچھو ملکت دل کی عمارت کی | انھوں نے آجکل سینو وہ آبادی سی غارت کی

نگاہ مست سے جب چشم نے اسکی اشارت کی | حلاوت مے کی اور بنیاد مے خانہ کی غارت کی

سحر گہ میں نے پوچھا گل سے حالِ زار بلبل کا
پڑے تھے باغ میں یک مشت پر اودھر اشارت کی

جلایا جس تجلی جلوہ گر نے طور کو ہمدم
اسی آتش کے پرکالے نے ہم سے بھی شرارت کی

نزاکت کیا کہوں خورشید رو کی کل شبِ مہ میں
گیا تھا سایہ سایہ باغ تک تس پر حرارت کی

ترے کوچے کے شوقِ طوف میں جیسے بگولا تھا
بیاباں میں غبارِ میر کی ہم نے زیارت کی

میں نے جو بیکسانہ مجلس میں جان کھوئی
سر پر مرے کھڑی ہو شب شمع زور روئی

آتی ہے شمع شب کو آگے ترے یہ کہہ کر
منھ کی گئی جو لوئی تو کیا کرے گا کوئی

بیطاقتی سے آگے کچھ پوچھتا بھی تھا سو
رونے نے ہر گھڑی کے وہ بات ہی ڈبوئی

بلبل کی بیکلی نے شب بے دماغ رکھا
سونے دیا نہ ہم کو ظالم نہ آپ سوئی

اس ظلم پیشہ کی یہ رسمِ قدیم ہے گی
غیروں پہ مہربانی یاروں سے کینہ جوئی

نوبت جو ہم سے گاہے آتی ہے گفتگو کی
منھ میں زباں نہیں ہے اس بدزباں کے گوئی

اس مہ کے جلوے سے کچھ تا میر یاد دیوے
اب کے گھروں میں ہم نے سب چاندنی ہے بوئی

الم سے یھاں تئیں میں مشقِ ناتوانی کی
کہ میری جان نے تن پر مرے گرانی کی

چمن کا نام سنا تھا ولے نہ دیکھا ہائے
جہاں میں ہم نے قفس ہی میں زندگانی[۱] کی

ملائی خوب مری خوں میں خاکِ بسمل گاہ
یہ تھوڑی منتیں ہیں مجھ پہ سخت جانی کی

بتنگ ہوں میں ترے اختلاط سے پیری
قسم ہے اپنی مجھے اس گئی جوانی کی

چلا ہے کھینچنے تصویر میرے بت کی آج
خدا کے واسطے صورت تو دیکھو مانی کی

تری گلی کے ہر اک سگ نے استخواں توڑے
ہماری لاش کی شب خوب پاسبانی کی

رکھے ہیں میر ترے منھ سے بیوفا خاطر
تری جفا کے تغافل کی بدگمانی کی

لاعلاجی ہے جو رہی ہے مجھے آوارگی
کیجیے کیا میر صاحب بندگی بیچارگی

کیسی کیسی صحبتیں آنکھوں کے آگے سے گئیں
دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا یکبارگی

روئے گل پر روز و شب کس شوق سے تکتا ہے باغ
رخنۂ دیوار ہے یا دیدۂ نظارگی

[۱] زندگانی کرنا۔ فارسی کے محاورہ زندگانی کردن کا ترجمہ ہے۔ یعنی زندگی گزارنا

اشکِ خونیں آنکھ میں بھر لا کے پی جاتا ہوں میں
محتسب کہتا ہے مجھ پر تہمتِ میخوارگی

مست زیبادگی کہاں ان سیہ چشموں کا میر
ان کی آنکھوں سے ٹپکتی ہے بڑی عیارگی

گیسوئے اس کے میں نے کیوں آنکھ جا لگائی
جو اپنے اچھے جی کو ایسی بلا لگائی

تھا دل جو پکا پھوڑا بسیاری الم سے
دکھتا گیا دو چنداں جوں جوں دوا لگائی

ذوقِ جراحت اس کا کس کو نہیں ہے لیکن
بخت سکے جسکے اُن نے تیغِ جفا لگائی

دم بھی نہ لینے پایا پانی بھی پھر نہ مانگا
جس تشنہ لب کو اُن نے تلوار آ لگائی

تھا صیدِ ناتواں میں لیکن لہو سے میرے
پالوں پہ اُن نے اپنے بھر کر حنا لگائی

بالعکس آج اُس کے سارے سلوک دیکھے
کیا جانوں دشمنوں نے کل اُس سے کیا لگائی

جو آنسو پی گیا میں آخر کو میر اُن نے
چھاتی جلا جگر میں اک آگ جا لگائی

دو دن سے کچھ بنی تھی سو پھر شب بگڑ گئی
صحبت ہماری یار سے بے ڈھب بگڑ گئی

واشد کچھ آگے آہ سے ہوتی تھی دل کے تئیں
اقلیم عاشقی کی ہوا اب بگڑ گئی

گرمی نے دل کی ہجر میں اُس کے جلا دیا
شاید کہ احتیاط سے یہ تب بگڑ گئی

خط نے نکل کے نقش دلوں کے اٹھا دیئے
صورت بتوں کی اچھی جو تھی سب بگڑ گئی

باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم
کاہے کو میر کوئی دبے جب بگڑ گئی

کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

مغرور بہت تھے ہم آنسو کی سرایت پر
سو صبح کے ہونے کو تاثیر نظر آئی

گل بار کرے ہیگا اسبابِ سفر شاید
غنچہ کی طرح بلبل دلگیر نظر آئی

اُس کی تو دل آزاری بے ہیچ ہی تھی یارو
کچھ تم کو ہماری بھی تقصیر نظر آئی

ہو گئی شہر شہر رسوائی
اے مری موت تو بھلی آئی

یک بیاباں برنگِ صوتِ جرس
مجھ پہ ہے بیکسی و تنہائی

نہ کھینچے تجھ سے ایک جا نقاش
اُس کی تصویر وہ ہے ہرجائی

سر رکھوں اُس کے پانوں پر لیکن
دستِ قدرت یہ میں کہاں پائی

میر جب سے گیا ہے دل تب سے
میں تو کچھ ہو گیا ہوں سودائی

سعیدالزمان

تو گلے ملتا نہیں ہم سے تو کیسی خرمی
عید آئی یہاں ہمارے بر میں جامہ ماتمی

جی بھرا رہتا ہے اب آٹھوں پہر مانند ابر
سیکڑوں طوفاں بغل میں ہے یہ مژگاں نمی

حشر کو زیر و زبر ہوگا جہاں سچ ہے ولے
ہے قیامت شیخ جی اس کارگہ کی برہمی

تجھ سوا محبوب آتش طبع اے ساقی نہیں
ہو پرستاروں میں تیری گر پری ہو آدمی

سامنے ہو جائیں اے ظالم تو دونوں ہیں برے
وہ دمِ شمشیر تیرا یہ ہماری بیدمی

اُس قیامت جلوہ سے بہتیرے ہم سے جی اٹھیں
مر گئے تو مر گئے ہم اُسکے کیا ہوگی کمی

کچھ پریشانی سے ہے سنبل کی جو الجھے ہے گا میر
یک جہاں برہم کرے زلفوں کی اُسکی درہمی

اب ضعف سے ڈھتا ہے بیتابی شتابی کی
اُس دل کے تڑپنے نے کیا خانہ خرابی کی

اِن درس گھوں میں وہ آیا نہ نظر ہم کو
کیا نقل کروں خوبی اس چہرہ کتابی کی

بھنتے ہیں دل اک جانب سکتے ہیں جگر یکسو
ہے مجلس مشتاقاں دُکان کبابی کی

تلخ اُس لب میگوں سے سب سنتے ہیں کس خاطر
تہ دار نہیں ہوتی گفتار شرابی کی

یک بوکشی بلبل ہے موجب صد مستی
پُر زور ہے کیا دارو غنچے کی گلابی کی

اب سوزِ محبت سے سارے جو پھپھولے ہیں
ہے شکل مرے دل کی سب شیشہ حبابی کی

افسردہ مرے منہ سے یاں حرف نہیں نکلا
جو بات کہ میں نے کی سو میر حسابی کی

مجھ سا بیتاب ہووے جب کوئی
بیقراری کو جانے تب کوئی

ہاں خدا مغفرت کرے اُس کو
صبر مرحوم تھا عجب کوئی

جان دے گو مسیح پر اس سے
بات کہتے ہیں تیرے لب کوئی

بعد میرے ہی ہو گیا سنسان
سونے پایا تھا ورنہ کب کوئی

اُس کے کوچہ میں حشر تھی مجھ تک
آہ و نالہ کرے نہ اب کوئی

کہ تلفظ طرب کا سنکے کہے ـ قطعہ ـ شخص ہوگا کہیں طرب کوئی
اور محزوں بھی ہم سنے تھے ولے
میرؔ سا ہو سکے ہی کب کوئی

آگے ہمارے عہد سے وحشت کو جا نہ تھی ـ دیوانگی کسو کی بھی زنجیر پا نہ تھی
بیگانہ سا لگے ہے چمن اب خزاں میں ہائے ـ ایسی گئی بہار مگر آشنا نہ تھی
کب تھا یہ شورِ نوحہ ترا عشق جب نہ تھا ـ دل تھا ہمارا آگے تو ماتم سرا نہ تھی
وہ اور کوئی ہوگی سحر جب ہوئی قبول ـ شرمندۂ اثر تو ہماری دعا نہ تھی
آگے بھی تیرے عشق سے کھینچے تھے درد و رنج ـ لیکن ہماری جان پر ایسی بلا نہ تھی
دیکھے دیارِ حسن کے میں کارواں بہت ـ لیکن کسو کے پاس متاعِ[1] وفا نہ تھی
آئی پری سی پردۂ مینا سے جام تک ـ آنکھوں میں تیری دخترِ رز کیا حیا نہ تھی
اس وقت سے کیا ہے مجھے تو چراغِ وقف ـ مخلوق جب جہاں میں نسیم و صبا نہ تھی
پژمردہ اس قدر ہیں کہ ہے شبہہ ہم کو میرؔ
تن میں ہمارے جان کبھو تھی بھی یا نہ تھی

چھن گیا سینہ بھی کلیجا بھی ـ یار کے تیر جان لیجا بھی
کیوں تری موت آئی ہے گی عزیز ـ سامنے سے مرے ارے جا بھی
حال کہہ چپ ہوا تو میں بولا ـ کس کا قصہ تھا ہاں کہے جا بھی
کہنے لاگا نہ واہی بک اتنا ـ قطعہ ـ کیوں ہوا ہے سڑی ابے جا بھی
میں کہا میرؔ جاں بلب ہے شوخ
تو نے کوئی خبر کو بھیجا بھی

گرم ہیں شور سے تجھ حسن کے بازار کئی ـ رشک سے جلتے ہیں یوسفؑ کے خریدار کئی
کب تلک داغ دکھاویگی اسیری مجھ کو ـ مر گئے ساتھ کے میرے تو گرفتار کئی
وے ہی چالاکیاں ہاتھوں کی ہیں جو اوّل تھیں ـ اب گریباں میں مرے رہ گئے ہیں تار کئی
خوفِ تنہائی نہیں کر تو جہاں سے تو سفر ـ ہر جگہ راہِ عدم میں ملیں گے یار کئی
اضطراب و قلق و ضعف میں کس طور جیوں ـ جان واحد ہے مری اور ہیں آزار کئی

[1] بعض شعراء نے متاع کو مذکر بھی لکھا ہے۔

کیوں نہ ہوں خستہ بھلا میں کہ ستم کے تیرے
تیر میں یار کئی دار ہیں سوفار کئی

اپنے کوچے میں نکلیو تو سنبھالے دامن
یادگارِ مژہ میرؔ ہیں واں خار کئی

میری پرسش پہ تری طبع اگر آوے گی
صورتِ حال تجھے آپھی نظر آوے گی

محو اُس کا نہیں ایسا کہ جو چیتے گا شتاب
اُس کے بیخود کی بہت دیر خبر آوے گی

کتنے پیغام چمن کو ہیں سو دل میں ہیں گرہ
کسو دن ہم تئیں بھی بادِ سحر آوے گی

ابر مت گورِ غریباں پہ برس غافل آہ
ان دل آزردوں کے جی میں بھی لہر آوے گی

میرؔ میں جیتوں میں آؤں گا اُسی دن جس دن
دل نہ تڑپیے گا مرا چشم نہ بھر آوے گی

کیا کروں شرح خستہ جانی کی
میں نے مر مر کے زندگانی کی

حال بد گفتنی نہیں میرا
تم نے پوچھا تو مہربانی کی

سب کو جانا ہی یوں تو پر اے صبر
آتی ہی اک تری جوانی کی

تشنہ لب مر گئے ترے عاشق
نہ ملی ایک بوند پانی کی

بیت بحثی سمجھ کے کر بلبل
دھوم ہے میری خوش زبانی کی

جس سے کھوئی تھی نیند میرؔ نے کل
ابتدا پھر وہی کہانی کی

ہی یہ بازارِ جنوں منڈی ہی دیوانوں کی
یہاں دکانیں ہیں کئی چاک گریبانوں کی

کیونکہ کہیے کہ اثر گریۂ مجنوں کو نہ تھا
گرد نمناک ہے ابتک بھی بیابانوں کی

یہ بگولہ تو نہیں دشتِ محبت میں سے
جمع ہو خاک اُڑی کتنی پریشانوں کی

خانقہ کا تو نہ کر قصد ٹک اے خانہ خراب
یہی اک رہ گئی ہے بستی مسلمانوں کی

سیل اشکوں سے بہی، صرصر آہوں سے اُڑی
مجھ سے کیا کیا نہ خرابی ہوئی ویرانوں کی

دل و دیں کیسے کہ اُس رہزنِ دلہا سے اب
یہ پڑی ہے کہ خدا خیر کرے جانوں کی

کتنے دل سوختہ ہم جمع ہیں اے غیرتِ شمع
کر قدم رنجہ کہ مجلس ہے یہ پروانوں کی

سرگذشتیں نہ مری سن کہ اُچٹتی ہی نیند
خاصیت یہ ہی مری جان ان افسانوں کی

میکدے سے تو ابھی آیا ہی مسجد میں میرؔ
ہو نہ لغزش کہیں مجلس ہی یہ بیگانوں کی

ملا غیر سے جا جفا کیا نکالی — اوکٹ لیکے آخر ادا کیا نکالی

طبیبوں نے تجویز کی مرگ عاشق — مناسب مرض کی دوا کیا نکالی

نہیں اُس گزرگہ سے آتی ادھر اب — نئی راہ کوئی صبا کیا نکالی

دلا اُسکے گیسو سے کیوں لگ چلا تو — یہ اک اپنے جی کی بلا کیا نکالی

رجھا ہی دیا واہ رے قدر دانی — وفا کی ہماری جزا کیا نکالی

دمِ صبح جوں آفتاب آج ظالم — نکلتے ہی تیغ جفا کیا نکالی

لگے دربدر میر چلانے پھرنے — گدا تو ہوئے پر صدا کیا نکالی

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری — نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

برنگِ صوتِ جرس تجھ سے دُور ہوں تنہا — خبر نہیں ہے تجھے آہ کارواں میری

ترے نہ آج کے آنے میں صبح کے مجھ پاس — ہزار جائے گئی طبع بدگماں میری

وہ نقش پائے ہوں میں مٹ گیا ہو جو رہ میں — نہ کچھ خبر ہے نہ سدھ ہے کسی رہرواں میری

شب اُس کے کوچہ میں جاتا ہوں اس توقع پر — کہ ایک دوست ہے واں خواب پاسباں میری

اسی سے دُور رہا اصل مدعا جو تھا — گئی یہ عمر عزیز آہ رایگاں میری

ترے فراق میں جیسے خیال مفلس[۱] کا — گئی ہے فکرِ پریشاں کہاں کہاں میری

رہا میں در پسِ دیوارِ باغ مدت لیک — گئی گلوں کے نہ کانوں تلک فغاں میری

ہوا ہوں گریۂ خونیں کا جب سے دامنگیر — نہ آستین ہوئی پاک دوستاں میری

دیا دکھائی مجھے تو اسی کا جلوہ میر — پڑی جہان میں جاکر نظر جہاں میری

اب کے بھی سیر باغ کی جی میں ہوس رہی — اپنی جگہ بہار میں کنج قفس رہی

میں پا شکستہ جا نہ سکا قافلے تلک — آتی اگرچہ دیر صدائے جرس رہی

لطفِ قبائے تنگ پہ گل کا بجا ہے ناز — دیکھی نہیں ہے اُن نے تری چولی چس رہی

دن رات میری آنکھوں سے آنسو چلے گئے — برسات اب کے شہر میں ساری برس رہی

خالی شگفتگی سے جراحت نہیں کوئی — ہر زخم یاں ہے جیسے کلی ہو بکس رہی

۱؎ خیال مفلس کی ایک اور تشبیہ۔ نمبر ۵ صفحہ ۱۲۷ سطر ۱۸۔

دیوانگی کہاں کہ گریباں سے تنگ ہوں
گردن مری ہے طوق میں گویا کہ پھنس رہی

جوں صبح اس چمن میں نہ ہم کھل کے ہنس سکے
فرصت رہی جو میر بھی سو اک نفس رہی

آجکل بیقرار ہیں ہم بھی
بیٹھ جا چلنے ہار ہیں ہم بھی

آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں
تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی

منع گریہ نہ کر تو اے ناصح
اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

در پئے جان ہے قراول مرگ
کسو کے تو شکار ہیں ہم بھی

نالے کر لو سمجھ کے اے بلبل
باغ میں اک کنار ہیں ہم بھی

مدعی کو شراب ہم کو زہر
عاقبت دوستدار ہیں ہم بھی

گر ز خود رفتہ ہیں تری نزدیک
اپنے تو یادگار ہیں ہم بھی

میر نام اک جواں سنا ہوگا
اسی عاشق کے یار ہیں ہم بھی

غفلت میں گئی آہ مری ساری جوانی
اے عمر گزشتہ میں تری قدر نہ جانی

تھی آبلۂ دل سے ہمیں تشنگی میں چشم
پھوٹا تو نہ آیا نظر اک بوند بھی پانی

مدت سے ہیں اک مشت پر آوارہ چمن میں
نکلی ہے یہ کس کی ہوس بال فشانی

بھاتی ہے مجھے اک طلب بوسہ میں یہ آن
لکنت سے الجھ جاکے اسے بات نہ آنی

یہ جان اگر بید مولہ کہیں دیکھے
باقی ہے کسو موئے پریشاں کی نشانی

دیکھیں تو سہی کب تئیں نبھتی ہے یہ صحبت
ہم جی سے ترے دست ہیں تو دشمن جانی

مجنوں بھی نہ رسوائے جہاں ہوتا نہ وہ آپ
مکتب میں جو کم آتی یہ لیلیٰ تھی دوانی

اک شخص مجھی سا تھا کہ وہ تجھ پہ تھا عاشق
قطعہ
وہ اس کی وفا پیشگی وہ اس کی جوانی

یہ کہہ کے جو رویا تو لگا کہنے نہ کہہ میر
سنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی کہانی

مل بارے ہم سے اس سے ملاقات ہو گئی
دو دو بچن کے ہونے میں اک بات ہو گئی

کن کن مصیبتوں سے ہوئی صبح شام ہجر
سو زلفیں ہی بناتے اسے رات ہو گئی

گردش نگاہ مست کی موقوف ساقیا
مسجد تو شیخ جی کی خرابات ہو گئی

ڈر ظلم سے کہ اسکی جزا بس شتاب ہے
آیا عمل میں یہاں کہ مکافات ہو گئی

خورشید سا پیالۂ مے بے طلب دیا
پیرِ مغاں سے رات کرامات ہو گئی

کتنا خلافِ وعدہ ہوا ہوگا وہ کہ یاں
نومیدی و امید مساوات ہو گئی

آ شیخ گفتگوئے پریشاں پہ تو نہ جا
مستی میں اب تو قبلۂ حاجات ہو گئی

ٹک شہر سے نکل کے مرا گریہ سیر کر
گویا کہ کوہ و دشت پہ برسات ہو گئی

اپنے تو ہونٹھ بھی نہ ہلے اُس کے روبرو
رنجش کی وجہ میر وہ کیا بات ہو گئی

بغیر دل کہ یہ قیمت ہے سارے عالم کی
کسو سے کام نہیں رکھتی جنس آدم کی

کوئی ہو محرمِ شوخی ترا تو میں پوچھوں
کہ بزمِ عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

ہمیں تو باغ کی تکلیف سے معاف رکھو
کہ سیر و گشت نہیں رسم اہلِ ماتم کی

تنک تو لطف سے کچھ کہہ کہ جاں بلب ہوں میں
رہی ہے بات مری جاں بلب کوئی دم کی

گزرنے کو تو کج و واکج اپنی گزری ہے
جفا جو ان نے بہت کی تو کچھ وفا کم کی

گھرے ہیں درد و الم میں فراق کے ایسے
کہ صبحِ عید بھی یہاں شام ہے محرم کی

قفس میں میر نہیں جوشِ داغ سینے پر
ہوس نکالی ہے ہم نے بھی گل کے موسم کی

غم سے یہ راہ میں نے نکالی نجات کی
سجدہ اس آستاں کا کیا پھر وفات کی

نسبت تو دیتے ہیں ترے لب سے پر ایک دن
ناموس یوں ہی جائیگی آبِ حیات کی

صد حرف زیرِ خاک تہِ دل چلے گئے
مہلت نہ دی اجل نے ہمیں ایک بات کی

ہم تو ہی اس زمانے میں حیرت سے چپ نہیں
اب بات جا چکی ہے سبھی کائنات کی

پژمردہ اس کلی کے تئیں اشدن ہے کیا
آہ سحر نے دل پہ عبث التفات کی

حور و پری فرشتہ بشر بار ہی رکھا
دزدیدہ تیرے دیکھنے نے جن پہ گھات کی

اُس لب شکر کے مینگے جہاں الفقہ شناس
اس جا دعا پہنچتی نہیں ہے نبات کی

عرصہ ہے تنگ چال نکلتی نہیں ہے اور
جو چال پڑتی ہے سو وہ بازی کی مات کی

برقع اٹھا تھا یار کے منہ سے سو میر کل
سنتے ہیں آفتاب نے جوں توں کی رات کی

ے غم فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا
مرزا غالب

اب دل کو آہ کرنی ہی صبح و مسا لگی
پژمردہ اس کلی کے تئیں بھی ہوا لگی

کیونکر بجھاؤں آتشِ سوزانِ عشق کو
اب تو یہ آگ دل سے جگر کو بھی جا لگی

دل کو گئے ہی یہاں سے بنی اب کہ ہر سحر
کوچہ میں تیرے زلف کے آنے صبا لگی

بیتابی و شکیب و سفر حاصل کلام
اس دل مریضِ غم کو نہ کوئی دوا لگی

ڈر مجھ نفس سے غیر کہ بھر جی ہی سے گیا
دل کو کسو ستمزدہ کی بد دعا لگی

لگ جائے چپ نہ تجھ کو تو تو کہیو عندلیب
گر بیکلی نے کی ہمیں تکلیف نالگی

کشتہ کا اُس کے زخم نہ ظاہر ہوا کہ میر
کس جائے اُس شہید کے تیغِ جفا لگی

کس حُسن سے کہوں میں اُسکی خوش اختری کی
اس ماہرو کے آگے کیا تاب مشتری کی

رکھنا نہ تھا قدم یہاں جوں باد بے تامل
سیر اس جہاں کی رہرو پر تو نے سرسری کی

شبہا بحالِ سگ میں اک عمر صرف کی ہے
مت پوچھ اُن نے مجھ سے جو آدمی گری کی

پائے گل اُس چمن میں چھوڑا گیا نہ ہم سے
سر پر ہمارے اپنی منّت ہے بے پری کی

پیشہ تو ایک ہی تھا اُس کا ہمارا لیکن
مجنوں کے طالعوں نے شہرت میں یاوری کی [1]

گریہ سے داغِ سینہ تازہ ہوئے ہیں سارے
یہ کشتِ خشک تو نے اے چشم پھر ہری کی

یہ دور تو موافق ہوتا نہیں مگر اب
رکھیے بنائے تازہ اس چرخِ چنبری کی

خوباں تمھاری خوبی تا چند نقل کریے
ہم ریختہ خاطروں کی کیا خوب دلبری کی

ہم سے جو میر اڑ کر افلاک چرخ میں ہیں
ان خاک میں ملوں کی کاہیکو ہمسری کی

دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے
یہ دُھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے

گور کس دل جلے کی ہے یہ فلک
شعلہ اک صبح یہاں سے اُٹھتا ہے

خانۂ دل سے زینہار نہ جا
کوئی ایسے مکاں سے اُٹھتا ہے

نالہ سر کھینچتا ہے جب میرا
شور اک آسماں سے اُٹھتا ہے

لڑتی ہے اُس کی چشمِ شوخ جہاں
ایک آشوب واں سے اُٹھتا ہے

[1] طالعِ شہرت رسوائی مجنوں بیش است ۔ ورنہ طشتِ من و او ہر دو زیک بام اُفتاد ۱۲ لا اعلم - آسی

سُدھ لے گھر کی بھی شعلۂ آواز
دود کچھ آشیاں سے اُٹھتا ہے

بیٹھنے کون دے ہے پھر اُس کو
جو ترے آستاں سے اُٹھتا ہے

یوں اُٹھے آہ اُس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

عشق اک میرؔ بھاری پتھر ہے
کب یہ تجھ ناتواں سے اُٹھتا ہے

کلی کہتے ہیں اُس کا سا دہن ہے
سُنا کریے کہ یہ بھی اک سخن ہے

ٹپکتے درد ہیں آنسو کی جاگہ
الٰہی چشم یا زخمِ کہن ہے

خبر لے پیرِ کنعاں کی کہ کچھ آج
نپٹ آوارہ بوئے پیرہن ہے

نہیں دامن میں لالہ بے ستوں کے
کوئی دل داغ خونِ کوہکن ہے

شہادت گاہ ہے باغِ زمانہ
کہ ہر گل اس میں اک خونیں کفن ہے

کروں کیا حسرتِ گل کو وگرنہ
دلِ پُر داغ بھی اپنا چمن ہے

جو دے آرام ٹک آوارگی میرؔ
تو شامِ غربت اک صبحِ وطن ہے

گلگشت کی ہوس تھی سو تو بگیر آئے
آئے جو ہم چمن میں ہو کر اسیر آئے

فرصت میں یک نفس کی کیا دردِ دل سنو گے
آئے تو تم و لیکن وقتِ اخیر آئے

دلّی میں اب کی آ کر اُن یاروں کو نہ دیکھا
کچھ وے گئے شتابی کچھ ہم بھی دیر آئے

کیا خوبی اس چمن کی موقوف ہے کسو پر
گل گر گئے عدم کو ٹکڑے نظیر[۱] آئے

شکوہ نہیں جو اُس کو پروا نہ ہو ہماری
دروازے جس کے ہم سے کتنے فقیر آئے

عمرِ دراز کیونکر مختار خضر ہے یہاں
ایک آدھ دن میں ہم تو جینے سے سیر آئے

نزدیک تھی قفس میں پروازِ روح اپنی
غنچے ہو گلبنوں پر جب ہم صفیر آئے

یوں بیٹھے بیٹھے ناگہ گردن لگے ہلانے
سر شیخ جی کے گویا مجلس میں پیر آئے

قامت خمیدہ اُس کی جیسی کماں تھی لیکن
قربان گہ وفا میں مانندِ تیر آئے

بن جی دیے نہیں ہے امکاں یہاں سے جانا
بسمل گہ جہاں میں اب ہم تو میرؔ آئے

[۱] نظیر آئے یعنی پھول کی مانند خوبرو پیدا ہوئے۔

کب سے نظر لگی تھی دروازۂ حرم سے
پردہ اٹھا تو لڑیاں آنکھیں ہماری ہم سے

صورت گرِ اجل کا کیا ہاتھ تھا سکے تو
کھینچے وہ تیغِ ابرو فولاد کے قلم سے

سوزش گئی نہ دل کی رونے سے روز و شب کے
جلتا ہوں اور دریا بہتے ہیں چشمِ نم سے

طاعت کا وقت گزرا مستی میں آبِ رز کی
اب چشم داشت اس کی یہاں ہے فقط کرم سے

کڑھیے نہ روئیے تو اوقات کیونکہ گزرے
رہتا ہے مشغلہ سا بارے غم و الم سے

مشہور ہے سماجت میری کہ تیغ برسی
پر میں نہ سر اٹھایا ہرگز ترے قدم سے

بات احتیاط سے کر ضائع نہ کر نفس کو
بالیدگی دل ہے مانندِ شیشہ دم سے

کیا کیا تعب اٹھائے کیا کیا عذاب دیکھے
تب دل ہوا ہے اتنا خوگر ترے ستم سے

ہستی میں ہم نے آکر آسودگی نہ دیکھی
کھلتی نہ کاش آنکھیں خوابِ خوشِ عدم سے

پامال کرکے ہم کو پچھتاؤ گے بہت تم
کمیاب ہیں جہاں میں سر دینے والے ہم سے

دل دہو میر صاحب اس بدمعاش کو تم
خاطر تو جمع کر لو ٹک قول سے قسم سے

رہا ہونا نہیں امکان ان ترکیب والوں سے
کہ بل ہی باندھتے ہیں پیچ پگڑی کے بھی بالوں سے

تجھے نسبت جو دیتے ہیں شرار و برق و شعلہ سے
تسلی کرتے ہیں ناچار شاعر ان مثالوں سے

بلا کا شکر کر اے دل کہ اب معلوم ہوتی ہے
حقیقت عافیت کی اس گلی کے رہنے والوں سے

نہیں اے ہمنفس اب جی میں طاقت دوریٔ گل کی
جگر ٹکڑے ہوا جاتا ہے آخر شب کے نالوں سے

نہیں خالی اثر سے تصفیہ دل کا محبت میں
کہ آئینہ کو ربطِ خاص ہے صاحب جمالوں سے

کہاں یہ قامتِ دلکش کہاں پاکیزگی ایسی
ملے ہیں ہم بہت گلزار کے نازک نہالوں سے

ہدف اس کا ہوئے مدت ہوئی سینہ کو پر اب تک
گتھا نکلے ہے لختِ دل مرا تیروں کے بھالوں سے

ہوا پیرانہ سر عاشق ہو زاہد مضحکہ سب کا
کہن سالی میں ملتا ہے کوئی بھی خرد سالوں سے

رگِ گل کوئی کہتا ہے کوئی اے میر مو اس کو
کمر اس شوخ کی بندھتی نہیں ان خوش خیالوں سے

گئے جی سے چھوٹے بتوں کی جفا سے
یہی بات ہم چاہتے تھے خدا سے

وہ اپنی ہی خوبی پہ رہتا ہے نازاں
مرو یا جیو کوئی اس کی بلا سے

کوئی ہم سے کھلتے ہیں بند اس قبا کے
یہ عقدے کھلیں گے کسو کی دعا سے

پشیمان توبہ سے ہوگا عدم میں
کہ غافل چلا شیخ لطفِ ہوا سے

نہ رکھی مری خاک بھی اس گلی میں
کدورت مجھے ہے نہایت صبا سے

جگر سوئے مژگاں کھنچا جائے ہے کچھ
مگر دیدۂ تر ہیں لوہو کے پیاسے

اگر چشم ہے تو وہی عین حق ہے
تعصب تجھے ہے عجب ماسوا سے

طبیب سبک عقل ہرگز نہ سمجھا
ہوا دردِ عشق آہ دونا دوا سے

ٹک اے مدعی چشمِ انصاف وا کر
کہ بیٹھے ہیں یہ قافیے کس ادا سے

نہ شکوہ شکایت نہ حرف و حکایت
کہو میر جی آج کیوں ہو خفا سے

کبکوں نے تیری چال جو دیکھی ٹھٹھک گئے
دل ساکنانِ باغ کے تجھ سے اٹک گئے

اندوہ وصل و ہجر نے عالم کھپا دیا
ان دو ہی منزلوں میں بہت یار تھک گئے

مطلق اثر نہ اس کے دلِ نرم میں کیا
ہر چند نالہائے حزیں عرش تک گئے

افراطِ گریہ سے ہوئیں آبادیاں خراب ازحد
سیلاب میرے اشک کے اژدر بھی بہک گئے

وے میگسار ظرف جنھیں خم کشی کے تھے
پھر کر نگاہ تو نے جو کی وہیں چھک گئے

چنداے سپہر چھاتی ہماری جلا کرے
اب داغ کھاتے کھاتے کلیجے تو پک گئے

عشاق پر جو صفِ مژگاں پھریں تو میر
جوں اشک کتنے چو گئے کتنے ٹپک گئے

زندگی ہوتی ہے اپنی غم کے مارے دیکھیے
مونڈلیں آنکھیں ادھر سے تم نے پیارے دیکھیے

لختِ دل کب تک الٰہی چشم سے ٹپکا کریں
خاک میں تا چند ایسے لعل پارے دیکھیے

ہوچکا روزِ جزا اب اے شہیدانِ وفا
چونکتے ہیں خونِ خفتہ کب تمھارے دیکھیے

راہِ دورِ عشق میں اب تو رکھا ہم نے قدم
رفتہ رفتہ پیش کیا آتا ہے بارے دیکھیے

سینۂ مجروح بھی قابل ہوا ہے سیر کے
ایک دن تو آن کر یہ زخم سارے دیکھیے

خنجرِ بیداد کو کیا دیکھتے ہو دمبدم
چشم سے انصاف کی سینے ہمارے دیکھیے

ایک خوں ہو یہ گیا وہ رفتے ہی رفتے گئے
دیدۂ و دل ہو گئے ہیں سب کنارے دیکھیے

شست و شو کا اس کے پانی جمع ہو کر رہ بنا
اور منہ دھونے کے چھینٹوں سے ستارے دیکھیے

رہ گئے سوتے کے سوتے کارواں جاتا رہا
ہم تو میر اس رہ کے خوابیدہ ہیں بارے دیکھیے

کس طور ہمیں کوئی فریبندہ لبھالے
آخر ہیں تری آنکھوں کے ہم دیکھنے والے

سو ظلم اُٹھائے تو کبھو دور سے دیکھا
ہرگز نہ ہوا یہ کہ ہمیں پاس بُلالے

اُس شوخ کی سر تیز پلک ہیں کہ وہ کانٹا
گڑ جائے اگر آنکھ میں سر دل سے نکالے

عشق[51] اُن کو ہے جو یار کو اپنے دمِ رفتن
کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے

وے دن گئے جو ضبط کی طاقت تھی ہمیں بھی
اب دیدۂ خونبار نہیں جاتے سنبھالے

احوال بہت تنگ ہے اے کاش محبت
اب دستِ تلطف کو مرے سر سے اُٹھالے

دعوائے قیامت کا مرے خوف اُسے کیا
اک لطف میں وہ مجھ سے تنک رو کے منالے

کہتے ہیں حجابِ رخِ دلدار ہے ہستی
دیکھیں گے اگر یوں ہی بھلا جان بھی جالے

میرؔ اس سے نہ مل آہ کہ ڈرتے ہیں مبادا
بیباک ہے وہ شوخ کہیں مار نہ ڈالے

برنگِ بوئے گل اس باغ کے ہم آشنا ہوتے
کہ ہمراہِ صبا ٹک سیر کرتے پھر ہوا ہوتے

سراپا[52] آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے

فلک اے کاش ہم کو خاک ہی رکھتا کہ اس میں ہم
غبارِ راہ ہوتے یا کسو کی خاکِ پا ہوتے

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

تو ہے کس ناحیہ سے اے دیارِ عشق کیا جانوں
ترے باشندگاں ہم کاش سارے بیوفا ہوتے

اب ایسے ہیں کہ صانع کے مزاج اوپر بہم پہنچے
جو خاطر خواہ اپنے ہم ہوئے ہوتے تو کیا ہوتے

کہیں جو کچھ ملامت گر بجا ہے میرؔ کیا جانیں
اُنھیں معلوم تب ہوتا کہ ویسے سے جدا ہوتے

چمن یار تیرا ہوا خواہ ہے
گل اک دل ہے جس میں تری چاہ ہے

سراپا میں اُس کے نظر کرکے تم
جہاں دیکھو اللہ اللہ ہے

تری آہ کس سے خبر پایئے
وہی بیخبر ہے جو آگاہ ہے

مرے لب پہ رکھ کان آواز سن
کہ اب تک بھی یک ناتواں آہ ہے

گزر سر سے تب عشق کی راہ چل
کہ ہر گام یہاں اک خطرگاہ ہے

۵۱ مرزا غالبؔ دہلوی سے قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب ؎ وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے
۵۲ لا اعلم سے ہم خدا تھے گر نہ ہوتا دل میں کوئی مدعا ؎ آرزوؤں نے ہماری ہم کو بندہ کر دیا

کبھو وادیِ عشق دکھلائیے بہت خضر بھی دل میں گمراہ ہے
جہاں سے تو رختِ اقامت کو باندھ یہ منزل نہیں بےخبر راہ ہے
نہ شرمندہ کر اپنے منہ سے مجھے کہا میں نے کب یہ کہ تو ماہ ہے
یہ وہ کارواں گاہ دلکش ہے میر کہ پھر یہاں سے حسرت ہی ہمراہ ہے

ڈھب ہیں تیری سی باغ میں گل کے بو گئی کچھ دماغ میں گل کے[1]
جائے روغن دیا کرے ہے عشق خونِ بلبل چراغ میں گل کے
دل تسلی نہیں صبا ورنہ جلوے سب ہیں گے داغ میں گل کے
اس حدیقے کے عیش پر مت جا مے نہیں ہے ایاغ میں گل کے
سیر کر میر اس چمن کی شتاب ہے خزاں بھی سراغ میں گل کے

عشق میں نے خوف و خطر چاہیے جان کے دینے کو جگر چاہیے
قابلِ آغوشِ ستم دیدگاں اشک سا پاکیزہ گہر چاہیے
حال یہ پہنچا ہے کہ اب ضعف سے اُٹھتے پلک ایک پہر چاہیے
کم ہیں شناسائے زرِ داغِ دل اُس کے پرکھنے کو نظر چاہیے
عشق کے آثار ہیں اے بلہوس داغ بہ دل دست بسر چاہیے
شرط سلیقہ ہے ہر ایک امر میں عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے
خوف قیامت کا یہی ہے کہ میر ہم کو جیا بار دگر چاہیے

ہستی اپنی حباب کی سی ہے یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
چشمِ دل کھول اُس بھی عالم پر یہاں کی اوقات خواب کی سی ہے
بار بار اُس کے در پہ جاتا ہوں حالت اب اضطراب کی سی ہے
نقطۂ خال سے ترا ابرو بیت اک انتخاب کی سی ہے

[1] سلہ یعنے گل کچھ غرور پیدا ہو گیا ہے ۱۲

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز — اُسی خانہ خراب کی سی ہے
آتشِ غم میں دل بھنا شاید — دیر سے بو کباب کی سی ہے
دیکھئے ابر کی طرح اب کے — میری چشمِ پر آب کی سی ہے

میر اُن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

شمع صفت جب کبھو مر جائیں گے — ساتھ لئے داغِ جگر جائیں گے
تند نہو ہم تو موئے پھرتے ہیں — کیا تری ان باتوں سے ڈر جائیں گے
کھل گئے رخسار اگر یار کے — شمس و قمر جی سے اُتر جائیں گے
خالی نہ چھوڑیں گے ہم اپنی جگہ — گریہ ہی رونا ہے تو بھر جائیں گے

راہ دمِ تیغ پہ ہو کیوں نہ میر
جی پہ رکھیں گے تو گزر جائیں گے

اب جو اک حسرتِ جوانی ہے — عمرِ رفتہ کی یہ نشانی ہے
رشکِ یوسف ہے آہ وقتِ عزیز — عمر اک بارِ کاروانی ہے
گریہ ہر وقت کا نہیں بے ہیچ — دل میں کوئی غمِ نہانی ہے
خاک تھی موج زن جہاں میں اور — ہم کو دھوکا یہ تھا کہ پانی ہے
ہم قفس زاد قیدی ہیں ورنہ — تا چمن ایک پر فشانی ہے
اُس کی شمشیرِ تیز سے ہمدم — مر رہیں گے جو زندگانی ہے
غم و رنج و الم نکویاں سے — سب تمھاری ہی مہربانی ہے

یہاں ہوئے میر تم برابرِ خاک
وہاں وہی ناز و سرگرانی ہے

قیامت ہیں یہ چسپاں جامے والے — گلوں میں جن کی خاطر خنجر ڈالے
وہ کالا چور ہے خالِ رخِ یار — کہ سو آنکھوں میں دل ہو تو چرا لے
نہیں اُٹھتا دلِ محزوں کا ماتم — خدا ہی اس مصیبت سے نکالے
کہاں تک دور بیٹھے بیٹھے کہئے — کبھو تو پاس ہم کو بھی بلا لے
دلا بازی نہ کر ان گیسوؤں سے — نہیں آساں کھلانے سانپ کالے

تپش نے دل جگر کی مار ڈالا
بغل میں دشمن اپنے ہم نے پالے

نہ مہکے بوئے گل اے کاش یک چند
ابھی زخمِ جگر سارے ہیں آلے

کسے قیدِ قفس میں یاد گل کی
پڑے ہیں اب تو جینے ہی کے لالے

ستایا میرؔ غم کش کو کنھوں نے
کہ پھر اب عرش تک جاتے ہیں نالے

اب ظلم ہے اس خاطر تا غیر بھلا مانے
بس ہم نہ بُرا مانیں تو کون بُرا مانے

سرمایۂ صد آفت دیدار کی خواہش ہے
دل کی تو سمجھ لیجے گر چشم کہا مانے

مسدود ہی ہے قاصد بہتر ہے رہِ نامہ
کیا کیا نہ لکھیں ہم تو جو یار لکھا مانے

ٹک حالِ شکستہ کی سننے ہی میں سب کچھ ہے
پردہ تو سخن رس ہے اس بات کو کیا مانے

بے طاقتیٔ دل نے سائل بھی کیا ہم کو
پر میرؔ فقیروں کی یہاں کون صدا مانے

دل کے معمورے کی مت کر فکر فرصت چاہیے
ایسے ویرانے کے اب بسنے کو مدت چاہیے

عشق و میخواری نبھے ہے کوئی درویشی کے بیچ
اس طرح خرچ لا حاصل کو دولت چاہیے

عاقبت فرہاد مر کر کام اپنا کر گیا
آدمی ہووے کسی پیشے میں جرأت چاہیے

ہو طرف مجھ پہلواں شاعر کا کب عاجز سخن
سامنے ہونے کو صاحب فن کی قدرت چاہیے

عشق میں وصل و جدائی سے نہیں کچھ گفتگو
قرب و بعد اس جا برابر ہے محبت چاہیے

نازکی کو عشق میں کیا دخل ہے اے بلہوس
یاں صعوبت کھینچنے کو جی میں طاقت چاہیے

تنگ مت ہو ابتدائے عاشقی میں اس قدر
خیریت ہے میرؔ صاحب دل سلامت چاہیے

بے یار شہرِ دل کا ویران ہو رہا ہے
دکھلائی دے جہاں تک میدان ہو رہا ہے

اس منزلِ جہاں کے باشندے رفتنی ہیں
ہر اک کے یاں سفر کا سامان ہو رہا ہے

اچھا لگا ہے شاید آنکھوں میں یار اپنے
آئینہ دیکھ کر کچھ حیران ہو رہا ہے

گل دیکھ کر چمن میں تجھ کو کھلا ہی جا ہے
یعنی ہزار جی سے قربان ہو رہا ہے

حالِ زبون اپنا پوشیدہ کچھ نہ تھا تو
سنتا نہ تھا کہ یہ صید بیجان ہو رہا ہے

ظالم ادھر کی سدھ لے جوں شمع صبح گاہی
ایک آدھ دم کا عاشق مہمان ہو رہا ہے

قربان گہ محبت وہ جا ہی جس میں ہر سو
دشوار جان دینا آسان ہو رہا ہے

ہر شب گلی میں اُس کی روتے رہے جو ہم تو
اک روز میر صاحب طوفان ہو رہا ہے

تیری گلی سے جب ہم عزم سفر کریں گے
ہر ہر قدم کے اوپر پتھر جگر کریں گے

آزردہ خاطروں سے کیا فائدہ سخن کا
تم حرف سر کروگے ہم گریہ سر کریں گے

عذرِ گناہِ خوباں بدتر گنہ سے ہوگا
کرتے ہوئے تلافی بے لطف تر کریں گے

سر جائیگا ولیکن آنکھیں اُدھر ہی ہونگی
کیا تیری تیغ سے ہم قطع نظر کریں گے

اپنی خبر بھی ہم کو اب دیر پہنچتی ہے
کیا جانے یار اُس کو کبتک خبر کریں گے

گر دل کی تاب و طاقت یہ ہی تو ہمنشیں ہم
شامِ غمِ جدائی کیونکر سحر کریں گے

یہ ظلم بے نہایت دیکھو تو خوبرویاں
کہتے ہیں جو ستم ہی ہم تجھ ہی پر کریں گے

اپنے ہی جی میں آخر انصاف کر کہ کبتک
تو یہ ستم کرے گا ہم در گزر کریں گے

صناع طرفہ ہیں ہم عالم میں ریختے کے
جو میر جی لگے گا تو سب ہنر کریں گے

آنکھیں لڑا لڑا کر کبتک لگا رکھیں گے
اس پردے ہی میں خوباں ہم کو سلا رکھیں گے

فکر دہن میں اُس کی کچھ بن نہ آئی آخر
اب یہ خیال ہم بھی دل سے اُٹھا رکھیں گے

مشتِ نمک کو میں نے بیکار کم رکھا ہے
چھاتی کے زخم میرے مدت مزا رکھیں گے

سبزانِ شہر اکثر درپے ہیں آبرو کے
اب زہر پاس اپنے ہم بھی منگا رکھیں گے

آنکھوں میں دلبروں کی مطلق نہیں مروت
یہ پاسِ آشنائی منظور کیا رکھیں گے

جیتے ہیں جب تلک ہم آنکھیں بھی لڑتیاں ہیں
دیکھیں تو جور خوباں کبتک روا رکھیں گے

اب چاند بھی لگا ہی تیرے سے جلوے کرنے
شبہائے ماہ چندے تجھ کو چھپا رکھیں گے

مژگان و چشم و ابرو سب ہیں ستم کی مائل
ان آفتوں سے دل ہم کیونکر بچا رکھیں گے

دیوانِ میر صاحب ہر یک کی ہی بغل میں
دو چار شعر ان کے ہم بھی لکھا رکھیں گے

تجھ سے دُچار ہوگا جو کوئی راہ جاتے
پھر عمر چاہیئے گی اُس کو بحال آتے

گر دل کی بیقراری ہوتی یہی جواب ہی
تو ہم ستم رسیدہ کا ہیکو جینے پاتے

وے دن گئے کہ اُٹھکر جاتے تھے اُس گلی میں
اب سعی چاہیئے ہی بالیں سے سر اُٹھاتے

کب تھی ہمیں تمنّا ای ضعف یہ کہ تا کہیں
پر زیر تیغ اُس کی ہم ٹک تو سر ہلاتے

گر جانتے کہ یوں ہی برباد جائیں گے تو
کاہے کو خاک میں ہم اپنے تئیں ملاتے

شاید کہ خون دل کا پہنچا ہے وقت آخر
تھم جاتے ہیں کچھ آنسو راتوں کو آتے آتے

اس سمت کو پلٹتی تیری نگہ تو ساقی
حال خراب مجلس ہم شیخ کو دکھاتے

جی دینا دلدہی سے بہتر تھا صد مراتب
ای کاش جان دیتے ہم بھی نہ دل لگاتے

شب کوتہ اور قصّہ ان کا دراز ورنہ
احوال میر صاحب ہم تجھ کو سب سُناتے

ہوں عاجز کہ جسم اس قدر زور سے
نہ نکلا کبھو عہدۂ مور سے

بہت دور کوئی رہا ہے مگر
کہ فریاد میں ہے جرس شور سے

مری خاک تفتہ پر ای ابر تر
قسم ہے تجھے ٹک برس زور سے

ترے دل جلے کو رکھا جس گھڑی
دھواں سا اُٹھا کچھ لب گور سے

نہ پوچھو کہ بے اعتباری سے میں
ہوا اس گلی میں بتر چور سے

جو ہو میر بھی اس گلی میں صبا
بہت پوچھیو تو مری اور سے

مت ہو مغرور ایکہ تجھ میں زور ہی
یھاں سلیماںؑ کے مقابل مور ہی

مر گئے پر بھی ہے صولت فقر کی
چشم شیر اپنا چراغ گور ہی

جب سے کاغذ باد کا ہے شوق اسے
ایک عالم اُس کے او پر ڈور ہی

رہنمائی شیخ سے مت چشم رکھ
وائے وہ جس کا عصاکش کور ہی

لے ہی جاتی ہے زر گل کو اُڑا
صبح کی بھی باد بادی چور ہی

دل کھنچے جاتے ہیں سارے اس طرف
کیونکہ کہئے حق ہماری اور ہی

تھا بلا ہنگامہ آرا میر بھی
اب تلک گلیوں میں اُس کا شور ہی

غیر سے اب یار ہوا چاہیئے
ملتجی ناچار ہوا چاہیے

جسکے تئیں ڈھونڈھیں ہیں ہم سب میں ہی
کس کا طلبگار ہوا چاہیئے

تاکہ وہ ٹک آن کے پوچھے کبھو
اس لئے بیمار ہوا چاہیئے

زلف کسی کی ہو کہ ہو خال و خط
دل کو گرفتار ہوا چاہیئے

تیغِ بلند اُس کی ہوئی بُلہوس
مرنے کو تیار ہوا چاہیئے

مصطبۂ بیخودی ہے یہ جہاں
جلد خبردار ہوا چاہیئے

مول ہے بازار کا ہستی کے یہ کان
دل کے خریدار ہوا چاہیئے

کچھ نہیں خورشید صفت سرکشی
سایۂ دیوار ہوا چاہیئے

کر نہ تعلق کہ یہ منزل نہیں
آہ سُبک بار ہوا چاہیئے

گو سفری اب نہیں ظاہر ہیں میرؔ
عاقبتِ کار ہوا چاہیئے

یہاں سرکشاں جو صاحبِ تاج و لوا ہوئے
پامال ہو گئے تو نہ جانا کہ کیا ہوئے

دیکھی نہ ایک چشمکِ گل بھی چمن میں آہ
ہم آخرِ بہار قفس سے رہا ہوئے

پچھتاؤ گے بہت جو گئے ہم جہان سے
آدم کی قدر ہوتی ہے ظاہر جدا ہوئے

تجھ بن دماغ صحبتِ اہلِ چمن نہ تھا
گل وا ہوئے ہزار ولے ہم نہ وا ہوئے

سر دیجے میرؔ ہم نے فراغت کی عشق میں
ذمہ ہمارے بوجھ تھا بارے ادا ہوئے

اس اسیری کے نہ کوئی اے صبا پالے پڑے
اک نظر گل دیکھنے کے بھی ہمیں لالے پڑے

حسن کو بھی عشق نے آخر کیا حلقہ بگوش
رفتہ رفتہ دلبروں کے کان میں بالے پڑے

مت نگاہِ مست کو تکلیف کر ساقی زیاد
ہر طرف تو ہیں گلی کوچوں میں متوالے پڑے

کیونکہ طے ہو دشتِ شوق آخر کو مانندِ سرشک
میرے پاؤں میں تو پہلے ہی قدم چھالے پڑے

جوش مارا اشکِ خونیں نے مرے دل سے لبس
گھر میں ہمسایوں کے شب لوہو کے پرنالے پڑے

ہیں بعینہ ویسے جوں پردا کرے ہے عنکبوت
روتے روتے بسکہ میری آنکھوں میں جالے پڑے

گرمجوشی سے مرے گریہ کی شب آنکھوں کی راہ
گوشۂ دامن میں میرؔ آتش کے پرکالے پڑے

رنج کھینچے تھے داغ کھائے تھے
دل نے صدمے بڑے اُٹھائے تھے

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

وہی سمجھا نہ ورنہ ہم نے تو
زخم چھاتی کے سب دکھائے تھے

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں
یہاں سمو سرو و گل کے سائے تھے

کچھ نہ سمجھے کہ تجھ سے یاروں نے
کس توقع پہ دل لگائے تھے

فرصتِ زندگی سے مت پوچھو
سانس بھی ہم نہ لینے پائے تھے

میر صاحب رُلا گئے سب کو
کل وے تشریف یہاں بھی لائے تھے

گرے بجبر بلا مژگان تر سے
نگاہیں اُٹھ گئیں طوفان پر سے

ہمیں غش آگیا تھا وہ بدن دیکھ
بڑی کلول ملی ہے جان پر سے

لیا دل اُس مخطط رو نے میرا
اُٹھا لوں میں اُسے قرآن پر سے

کہاں ہیں آدمی عالم میں پیدا
خدائی صدقے کی انسان پر سے

تفنگ اُس کی چلی آواز پر لیک
گئی ہے میر گولی کان پر سے

خوب ہی اے ابر اک شب آؤ باہم روئیے
پر نہ اتنا بھی کہ ڈوبے شہر کم کم روئیے

وقت خوش دیکھا نہ اک دم سے زیادہ دہر میں
خندۂ صبح چمن پر مثلِ شبنم روئیے

شادی و غم میں جہاں کی ایک سے دس کا ہے فرق
عید کے دن ہنسیے تو دس دن محرم روئیے

دیکھا ماتم خانۂ عالم کو ہم مانندِ ابر
ہر جگہ پر جی میں یوں آیا دمادم روئیے

ہو جدا فردوس سے یعنی گلی سے یار کے
مدتوں تک کیجیے غم مثلِ آدم روئیے

اب بے یوں گریے مقرر اُٹھیے جب کہسار سے
وادیِ مجنوں پہ بھی اے ابر اک دم روئیے

عشق میں تقریبِ گریہ کو نہیں درکار میر
ایک مدت صبر ہی کا رکھیے ماتم روئیے

نیلا نہیں سپہر تجھے اشتباہ ہے
دودِ جگر سے میرے یہ چھت سب سیاہ ہے

ابر و بہار و بادہ سبھوں میں ہے اتفاق
ساقی جو تو بھی مل چلے تو واہ واہ ہے

سرمے سے ایسی آنکھیں تمھاری نہیں لگیں
احوال پر ہمارے تمھیں کب نگاہ ہے

کس کس طرح سے ہاتھ نچاتا ہے وعظ میں
دیکھا جو شیخ شہر عجب دستگاہ ہے

ہے روئے عجز میر تری خاک راہ پر
یعنی کہ کام اس کا کچھ اب د براہ ہے

نہیں وہ قید الفت میں گرفتاری کو کیا جانے
تکلف برطرف بے مہر ہے یاری کو کیا جانے

وہ ہے اک مندرس نالہ مبارک مرغِ گلشن کو
وہ اس ترکیبِ نو کی نالہ و زاری کو کیا جانے

ستم ہے تیری خوے خشمگیں پر ٹک بھی دلجوئی
دل آزاری کی باتیں کر تو دلداری کو کیا جانے

گلہ اپنی جفا کا سُن کے مت آزردہ ہو ظالم
نہیں تہمت ہے تجھ پر تو جفا کاری کو کیا جانے

ترا ابرام اس کی سادگی پر میرؔ میں مانا
بھلا ایسا جو ناداں ہو وہ عیاری کو کیا جانے

جوشِ دل آئے بہم دیدۂ گریان ہوئے
کتنے اک اشک ہوئے جمع کہ طوفان ہوئے

کیا چھپیں شہرِ محبت میں ترے خانہ خراب
گھر کے گھر اُن کے ہیں اس بستی میں ویران ہوئے

کس نے لی رخصتِ پرواز پس از مرگ نسیم
مشت پر باغ میں آئی ہی پریشان ہوئے

سبزہ و لالہ و گل ابر و ہوا ہے مے دے
ساقی ہم توبہ کے کرنے سے پشیمان ہوئے

دعویٔ خوش دہنی گرچہ اُسے تھا لیکن
دیکھ کر منہ کو ترے گل کے تئیں کان ہوئے

جامِ خوں بن نہیں ملتا ہے ہمیں صبح کو آب
جب سے اس چرخ سیہ کاسہ کے مہمان ہوئے

اپنے جی ہی نے نہ چاہا کہ پئیں آبِ حیات
یوں تو ہم میرؔ اسی چشمے پہ بیجان ہوئے

یارب کوئی ہو عشق کا بیمار نہ ہووے
مرجائے ولے اس کو یہ آزار نہ ہووے

زنداں میں پھنسے طوق پڑے قید میں مرجائے
پر دامِ محبت میں گرفتار نہ ہووے

اس واسطے کانپوں ہوں کہ ہے آہ نپٹ سرد
یہ بادِ کلیجے کے کہیں پار نہ ہووے

صد نالۂ جانکاہ ہیں وابستہ چمن سے
کوئی بال شکستہ پسِ دیوار نہ ہووے

پژمردہ بہت ہے گلِ گلزار ہمارا
شرمندۂ یک گوشۂ دستار نہ ہووے

مانگے ہے دعا خلق تجھے دیکھ کے ظالم
یارب کسو کو اس سے سروکار نہ ہووے

قطعہ

ہوں دوست جو کہتا ہوں سُن اے جانِ کے دشمن
بہتر تو تجھے ترک ہے تا خوار نہ ہووے

خوباں بُرے ہوتے ہیں اگرچہ ہیں نکو رو
بے جرم کہیں ان کا گنہگار نہ ہووے

باندھے نہ پھرے خون پر اپنی تو کمر کو
یہ جان سبک تن پہ ترے بار نہ ہووے

چلتا ہے رہِ عشق ہی اس پر بھی چلے تو
پر ایک قدم چل کہیں زنہار نہ ہووے

صحرائے محبت ہے قدم دیکھ کے رکھ میرؔ
یہ سیر سرِ کوچہ و بازار نہ ہووے

برقع کو اُٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے
اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے

اے ناقۂ لیلیٰ دو قدم راہ غلط کر
مجنون زخود رفتہ کبھو راہ پر آوے

ٹک بعد مرے میرے طرفداروں کنے تو
کوئی بھیجیو ظالم کہ تسلّی تو کر آوے

کیا ظرف ہے گردون تنک حوصلہ کا جو
آشوب فغاں کے مرے عہدہ سے بر آوے

قطعہ

ممکن نہیں آرام دے بیتابی جگر کی
جبتک نہ پلک پر کوئی ٹکڑا نظر آوے

مت ممتحن باغ ہو اے غیرت گلزار
گل کیا کہ جسے آگے ترے بات کر آوے

کھلتے میں ترے منہ کی کلی پھاڑے گریباں
ہلنے میں ترے ہونٹوں کے گلبرگ تر آوے

ہم آپ سے جاتے رہے ہیں ذوقِ خبر میں
اے جان بلب آمدہ رہ تا خبر آوے

کہتے ہیں ترے کوچہ سے میرؔ آنے کہے ہے
جب جانیے وہ خانہ خراب اپنے گھر آوے

ہے جی میں غزل در غزل اے طبع یہ کہیے
شاید کہ نظیریؔ[1] کے بھی عہدہ سے بر آوے

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

تلوار کا بھی مارا خدا رکھے ہے ظالم
یہ تو ہو کوئی گورِ غریباں میں در آوے

میخانہ وہ منظر ہے کہ ہر صبح جہاں شیخ
دیوار پہ خورشید کا مستی سے سر آوے

کیا جانیں وہ مرغان گرفتار چمن کو
جن تک کہ بصد ناز نسیم سحر آوے

تو صبح قدم رنجہ کرے ٹک تو ہے ورنہ
کس واسطے عاشق کی شب غم بسر آوے

ہر سو سر تسلیم رکھے صید حرم میں
وہ صید فگن تیغ بکف تا کدھر آوے

[1] نظیریؔ۔ مولانا نظیری نیشاپور کے رہنے والے تھے وہاں سے ہندوستان آئے۔ خانخانان کے مائدہ کرم سے فیضیاب ہوئے اور اُسی وقت سے ان کو زبردست شہرت حاصل ہوئی۔ خانخاناں کی مدح میں نہایت پُر زور قصاید کہے اور ایک طویل قیام کے بعد حرمین محترمین کی زیارت کو گئے اور بعد حج وغیرہ پھر ہندوستان آئے۔ ایک مرتبہ جہانگیر نے ایک عمارت کے کتبے کیلئے ان کو حکم دیا۔ انھوں نے ایک غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے سہ اے خاک ذات صندل سر گشتہ سراں را ؛ با دائرہ بیار وب رہت تاجوراں را۔ بادشاہ نے اس کے صلہ میں قریب تین ہزار (۳۰۰۰) بیگہ زمین عنایت فرمائی۔ نظیری نہایت نیک طینت صوفی مشرب مہذب الاخلاق تھے آخر میں ان کا کلام بالکل صوفیانہ ہوتا تھا۔ آخر عمر میں احمد آباد گئے۔ اور قریب بارہ (۱۲) برس زندہ رہ کر ۱۰۲۳ھ میں انتقال کیا اور احمد آباد ہی میں تاج پورہ میں مدفون ہوئے۔ ان کی قبر پر ایک گنبد بنا ہوا ہے۔ ایک ضخیم کلیات اُن سے یادگار ہے۔ میر تقی نے شاید انکی کسی غزل کا کوئی مطلع لیکر یہ غزل کہی ہے۔ یا اُن کی سلاست بیان کی طرف اشارہ ہے۔

دیواروں سے سر مارتے پھرنے کا گیا وقت ۔ اب تو ہی مگر اب کبھو اس اور در آوے
واعظ نہیں کیفیت میخانہ سے آگاہ ۔ اک جرعہ بدل ورنہ یہ مندیل ہر آوے
صناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی ۔ ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے
اے وہ کہ تو بیٹھا ہے سر راہ پہ زنہار ۔ قطعہ ۔ کہیو جو کبھو میر بلا کش ادھر آوے

مت دشت محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو
ہر گام پہ اس رہ میں سفر سے حذر آوے

لگوائے پتھر اور برا بھی کہا کیے ۔ تم نے حقوق دوستی کے سب ادا کیے
کھینچا تھا آہ شعلہ فشاں نے جگر سے سر ۔ برسوں تئیں پڑے ہوئے جنگل جلا کیے
غنچہ نے ساری طرز ہماری ہی اخذ کی ۔ ہم جو چمن میں برسوں گرفتہ رہا کیے
تدبیر عشق میں بھی نہ کرتے قصور یار ۔ جو اس مرض میں ہوتے بھلے ہم دوا کیے
جوں نے نہ تیرے کشتے کے لب سے رہی فغاں ۔ ہر چند بند بند بھی اس کے جدا کیے
کیا حرف دلنشیں ہو مرا جیسے خط مدام ۔ اغیار روسیاہ ترے منھ لگا کیے
پھر شام آشنا نہ کبھو نکلے گلرخاں ۔ ہر صبح ان سے برسوں تئیں ہم ملا کیے
بے عیب ذات ہے گی خدا ہی کی اے بتاں ۔ تم لوگ خوبرو جو کیے بے وفا کیے

اب خاک سی اڑے ہے منھ اوپر وگرنہ میر
اس چشم گریہ ناک سے دریا بہا کیے

کروں جو آہ زمین و زمان جل جاوے ۔ سپہر نیلی کا یہ سائبان جل جاوے
دی آگ دل کو محبت نے جب سے جلتا ہوں ۔ میں جس طرح کسو کا خانمان جل جاوے
دوا پذیر نہیں اے طبیب تپ غم کی ۔ بدن میں ٹک رہے تو استخوان جل جاوے
نہ آوے سوز جگر منھ پہ شمع ساں اے کاش ۔ بیان کرنے سے آگے زبان جل جاوے
ہمارے نالے بھی آتش ہی کے ہیں پرکالے ۔ سنے تو بلبل نالاں کی جان جل جاوے
ہزار حیف کہ دل خار و خس سے باندھے کوئی ۔ خزاں میں برق گرے آشیان جل جاوے
متاع سینہ سب آتش ہے فائدہ کس کا ۔ خیال یہ ہے مبادا دوکان جل جاوے
نہ پوچھ کچھ لب ترسا بچے کی کیفیت ۔ کہوں تو دختر رز کی ... ن جل جاوے
نہ بول میر سے مظلوم عشق ہے وہ غریب ۔ مبادا آہ کرے سب جہان جل جاوے

گزار خوش نگاہاں جس میں ہو میرا بیاباں ہے
سواد بر مجنوں تو چراگاہِ غزالاں ہے

کرے ہے خندۂ دنداں نما تو میں بھی روؤں گا
چمکتی زور ہے بجلی مقرر آج باراں ہے

چمن پر نوحہ وزاری سے کس گل کا یہ ماتم ہو
جو شبنم ہو تو گریاں ہو جو بلبل ہو تو نالاں ہے

ہر اک مژگاں پہ میرے اشک کے قطرے جھمکتے ہیں
تماشا مفت خوباں ہو لبِ دریا چراغاں ہے

کیا تھا جا بجا رنگیں لہو تجھ ہجر میں رو کر
گریباں میر کا دیکھا مگر گلچیں کا داماں ہے

اپنا شعار پوچھو تو مہرباں وفا ہے
پر اُس کے جی میں ہم سے کیا جانیے کہ کیا ہو

بالیں پہ میری آکر ٹک دیکھ شوقِ دیدار
سارے بدن کا جی اب آنکھوں میں آرہا ہو

بے اُس کے رک کے مرتے گرمیِ عشق میں تو
کرتے ہیں آہ جبتک تب تک ہی کچھ ہوا ہو

شکوہ ہے رونے کا یہ بیگانگی سے تیری
مژگانِ تر وگرنہ آنکھوں میں آشنا ہو

مت کر زمین دل میں تخمِ اُمید ضائع
بوٹا جو یہاں اُگا ہے سو اُگتے ہی جلا ہو

شرمندہ ہوتے ہیں گے خورشید و ماہ دونوں
خوبی نے مُنھ کی تیرے ظالم قراں کیا ہو

اے شمع بزمِ عاشق روشن ہو یہ کہ تجھ بن
آنکھوں میں میری عالم تاریک ہو گیا ہو

جیتے ہی جی تلک ہیں سارے علاقے سو تو
عاشق ترا مجردِ فارغ ہی ہو چکا ہو

صد سحر دیکھ رقیمہ خط میر جی کا دیکھا
قاصد نہیں چلا ہے جادو مگر چلا ہے

حرم کو جائیے یا دیر میں بسر کریے
تری تلاش میں اک دل کدھر کدھر کریے

کٹے ہے دیکھیے یوں عمر کب تلک اپنی
کہ سُنیے نام ترا اور چشم تر کریے

دستِ ناز تو مچلا ہے کیا جتائیے حال
جو بے خبر ہو بھلا اُس کے تئیں خبر کریے

ہوا ہے ... کا سو تعب ہے شام
شب فراق کس امید پر سحر کریے

سارہ نہیں
کہ دیدنی ہی نہیں جس پہ نہیاں نظر کریے

راہ کیا کیا لوگ
کبھو تو جانب عشاق بھی گزر کریے

ٹھانے کی طاقت نہیں ہو اب اُس کو
آدے تو ٹک رحم میر پر کریے

ہے
قرباں ترے ہر عضو پہ نازک بدنی ہے

عریانیِ آشفتہ کہاں جائے پس از مرگ — کشتہ ہے ترا اور یہی بے کفنی ہے
سمجھے ہے نہ پروانہ، نہ تھامبے ہے زباں شمع — وہ سوختنی ہے تو یہ گردن زدنی ہے
لیتا ہی نکلتا ہے مرا لختِ جگر اشک — آنسو نہیں گویا کہ یہ ہیرے کی کنی ہے
بلبل کی کفِ خاک بھی اب ہوگی پریشاں — جامے کا ترے رنگ ستمگر چمنی ہے
کچھ تو ابھر اے صورتِ شیریں کہ دکھاؤں — فرہاد کے ذمہ بھی عجب کوہ کنی ہے
ہوں گرمِ سفر شامِ غریباں سے خوشی ہوں — اے صبحِ وطن تو تو مجھے بے وطنی ہے

قطعہ

ہر چند گدا ہوں میں ترے عشق میں لیکن — ان بوالہوسوں میں کوئی مجھ سا بھی غنی ہے
ہر اشک مرا ہے دُرِ شہوار سے بہتر — ہر لختِ جگر رشکِ عقیقِ یمنی ہے

بگڑی ہے نپٹ میر طپش اور جگر سے
شاید کہ مرے جی ہی پر اب آن بنی ہے

اب کرکے فراموش تو ناشاد کروگے — پر ہم جو نہ ہوں گے تو بہت یاد کروگے
زنہار اگر خستہ دلاں بیستوں جاؤ — ٹک پاس ہنرمندیِ فرہاد کروگے
غیروں پہ اگر کھینچوگے شمشیر تو خوباں — اک اور مری جان پہ بیداد کروگے

قطعہ

جاگہ نہیں یہاں رو دیے جس پر نہ کھڑے ہو — کچھ شور ہی شر پر تو مجھے یاد کروگے
اس دشت میں اے راہ رواں ہر قدم اوپر — مانندِ جرس نالہ و فریاد کروگے

گر دیکھوگے تم طرزِ کلام اس کی نظر کر
اے اہلِ سخن میر کو اُستاد کروگے

خوش سرانجام تھے وے جلد جو ہشیار ہوئے — ہم تو اے ہمنفساں دیر خبردار ہوئے
جنسِ دل دونوں جہاں جسکی بہا تھی اس کا — یک نگہ مول ہوا تم نہ خریدار ہوئے
عشق وہ ہے کہ جو تھے خلوتیِ منزلِ قدس — وے بھی رسوائے سرِ کوچہ و بازار ہوئے
سیرِ گلزار مبارک ہو صبا کو ہم تو — ایک پرواز نہ کی تھی کہ گرفتار ہوئے
اس ستمگار کے کوچہ کے ہوادار ہیں — نام فردوس کا ہم لے کے گنہگار ہوئے
وعدۂ حشر تو موہوم نہ سمجھے ہم آہ — کس توقع پہ ترے طالبِ دیدار ہوئے

میر صاحب سے خدا جانے ہوئی کیا تقصیر
جس سے اس ظالمِ نمایاں کے سزاوار ہوئے

ترا اے ناتوانی جو کوئی عالم میں رسوا ہے
توانائی کا منھ دیکھا نہیں ان نے کہ کیسا ہے

نیاز ناتواں کیا ناز سرو قد سے بر آوے
مثل مشہور ہے یہ تو کہ دستِ زور بالا ہے

ابھی اک عمر رونا ہے نہ کھوؤ اشک آنکھوں تم
کرو کچھ سوجھتا اپنا تو بہتر ہے کہ دنیا ہے

کیا اے سایۂ دیوار تو نے مجھ سے رو پنہاں
مرے اب دھوپ میں جلنے ہی کا آثار پیدا ہے

بھلے کو اپنے سب دوڑے ہیں یہ اپنا برا چاہے
چلن اس دل کا تم دیکھو تو دنیا سے نرالا ہے

رہو ملک دور ہی پھرنے دو کوچوں میں مجھے لڑکو
کرو گے تنگ اتنے تم اور تو نزدیک صحرا ہے

گلِ حسن پیچش کاکل کا مجھ سے یوں لگا کہنے
تو اپنی فصد کر جلدی کہ تجھ کو میر سودا ہے

گزار ابر اب بھی جب کبھو ایدھر کو ہوتا ہے
ہماری بیکسی پر زار باراں دیر روتا ہے

ہوا مذکور نام اس کا کہ آنسو بہ چلے منھ پر
ہمارے کام سارے دیدۂ تر ہی ڈبوتا ہے

بجائے سینہ کوبی سنگ سے دل خون ہوتے ہیں
جو ہمدم ایسے جاتے ہیں تو ماتم سخت ہوتا ہے

نہ کی نشو و نما کاہش نے کام اپنا کیا حاصل
فلک کوئی بھی دل سے تخم کینہ بیوقت بوتا ہے

ہلانا ابروؤں کا لے ہے زیرِ تیغ عاشق کو
پلک کا مارنا برچھی کلیجے بیچ چبھوتا ہے

کہاں اے رشکِ آبِ زندگی ہے تو کہ یہاں بن
ہر اک پاکیزہ گوہر جی سے اپنے ہاتھ دھوتا ہے

لگا مرنے کو میرے دیکھیو رہ نا سمجھ سے کہنے
جوانی کی ہے نیند اسکو کہ اس غفلت سے سوتا ہے

پریشاں گرد سا کا ہے جو بلجاتا ہے صحرا میں
اسی کی جستجو میں خضر بھی اوقات کھوتا ہے

نہ رکھو کان نظمِ شاعران حال پر اتنے
چلو ٹک میر کو سننے کہ موتی سے پروتا ہے

ہم تو اس کے ظلم سے ہمدم چلے
رہ سکے ہے تو تو رہ یہاں ہم چلے

ٹوٹے جوں لالہ ستاں سے ایک پھول
ہم بے یہاں سے داغ یک عالم چلے

جنبشِ ابرو تو دھاں رہتی نہیں
کب تلک تلوار یھاں ہر دم چلے

ٹک جگر کے آیا آخر ہو گئے
اشک خونی کچھ مژہ پر جم چلے

دیکھئے بختِ زبوں کیا کیا دکھائے
تم تو خوباں ہم سے ہو برہم چلے

بھاگتے پر بیٹھے تھے گویا غزال
تیری آنکھیں دیکھتے ہی رم چلے

مجھ سے ناشایستہ کیا دیکھا کہ میر
آتے آتے کچھ جو آنسو تھم چلے

غیبت نے ہم کو ذبح کیا نے طاقت ہے نے یارا ہے
اس کتے نے کرکے دلیری صیدِ حرم کو مارا ہے

باغ کو تجھ بن اپنے بھائیں آتش دی ہے بہاراں نے
ہر غنچہ اخگر ہے ہم کو ہر گل ایک انگارا ہے

جب تجھ بن لگتا ہے تڑپنے جائے ہے نکلا ہاتھوں سے
ہے جو گرہ سینے میں اُس کو دل کہیے یا پارا ہے

راہِ حدیث جو ٹک بھی نکلی کون سکھائے ہم کو پھر
روئے سخن پر کس کو دے وہ شوخ بڑا عیّارا ہے

کام اُس کا ہے خون افشانی ہر دم تیری فرقت میں
چشم کو میری آکر دیکھ اب لوہو کا فوّارا ہے

بال کھلے وہ شب کو شاید بسترِ ناز پہ سوتا تھا
آئی نسیمِ صبح جو ایدھر پھیلا عنبر سارا ہے

کس دن دامن کھینچ کے اُن نے یار سے اپنا کام لیا
مدت گزری دیکھتے ہم کو میر بھی اک ناکارا ہے

بندِ قبا کو خوباں جس وقت وا کریں گے
خمیازہ کش جو ہوں گے ملنے کے کیا کریں گے

رونا یہی ہے مجھ کو تیری جفا سے ہر دم
یہ دل دماغ دونوں کب تک وفا کریں گے

ہے دین سر کا دینا گردن پہ اپنی خوباں
جیتے ہیں تو تمھارا یہ قرض ادا کریں گے

درویش ہیں ہم آخر دو اک نگہ کی رخصت
گوشہ میں بیٹھے پیارے تم کو دُعا کریں گے

آخر تو روزی آئے دو چار روز ہم بھی
ترسا بچوں میں جاکر دارو پیا کریں گے

عالم مرے ہے تجھ پر آئی اگر قیامت
تیری گلی کے ہر سو محشر ہوا کریں گے

دامانِ دشت سوکھا ابروں کی بے تہی سے
جنگل میں رونے کو اب ہم بھی چلا کریں گے

لائی تری گلی تک آوارگی ہماری
ذلت کی اپنی اب ہم عزت کیا کریں گے

احوال میر کیونکر آخر ہو ایک شب میں
اک عمر ہم یہ قصہ تم سے کہا کریں گے

ہم ہوئے، تم ہوئے، کہ میرؔ ہوئے
اُس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

جن کی خاطر کی استخواں شکنی
سو ہم اُن کے نشانِ تیر ہوئے

نہیں آتے کسو کی آنکھوں میں
ہو کے عاشق بہت حقیر ہوئے

آگے یہ بے ادائیاں کب تھیں
ان دنوں تم بہت شریر ہوئے

اپنے روتے ہی روتے صحرا کے
گوشے گوشے میں آب گیر ہوئے

قطعہ

ایسی ہستی عدم میں داخل ہے
نے جواں ہم نہ طفلِ شیر ہوئے

ایک دم تھی نمود بود اپنی
یا سفیدی کی یا اخیر ہوئے

یعنی مانندِ صبحِ دُنیا میں
ہم جو پیدا ہوئے سو پیر ہوئے

مت مل اہلِ دُول کے لڑکوں سے
میرؔ جی ان سے مل فقیر ہوئے

توجہ تیری ہی حیرت مری آنکھوں پہ کیا کم ہے
جو میں ہر اک ذرہ دیکھوں کہ یہ تر ہے کہ یہ نم ہے

کرے ہے مو پریشاں غم وفا تو تعزیہ تو لے
حیا کر حقِ صحبت کی کہ اس بیکس کا ماتم ہے

دو رنگی دہر کی پیدا ہے یہاں سے دل اٹھا اپنا
کسو کے گھر میں شادی ہے کہیں ہنگامۂ غم ہے

کہیں آشفتگاں سے میرؔ مقصد ہووے ہے حاصل
جو زلفیں اُس کی درہم ہیں مرا بھی کام برہم ہے

جب کہ پہلو سے یار اُٹھتا ہے
درد بے اختیار اُٹھتا ہے

اب تلک بھی مزارِ مجنوں سے
ناتواں اک غبار اُٹھتا ہے

ہے بگولا غبار کس کا میرؔ
کہ جو ہو بیقرار اُٹھتا ہے

کیا مرے سروِ رواں کا کوئی مائل ایک ہے
سیکڑوں ہم خوں گرفتہ ہیں وہ قاتل ایک ہے

راہ سب کو ہے خدا سے جان اگر پہنچا ہے تو
ہوں طریقے مختلف کتنے ہی منزل ایک ہے

اس مرے بُت نے سبھوں کو حق سہی توڑا اپنا کیا
کام میں اپنے بھی وہ معبودِ باطل ایک ہے

کیا عرب میں کیا عجم میں ایک لیلیٰ کا ہے شور
مختلف ہوں گو عبارات انکا محمل ایک ہے

ایک سے ہے خرمنِ غم دانۂ اشک ایک سے
دیدۂ و دل الغرض دونوں کا حاصل ایک ہے

اس شکار افگن کے کوچہ سے نہیں جاتا ہے ظلم
ایک اگر جی سے گیا تو نیم بسمل ایک ہے

چشم و ابرو ناز و خوبی زلف و کاکل خال و خط
دیکھیے کیا ہو بلائیں اتنی ہیں دل ایک ہے

کام کچھ دنیا کے آسانی میں ہو تو میرؔ کر
مردنِ دشوار بھی درپیش منزل ایک ہے

Saeeduzzaman.

جبتک کڑی اٹھائی گئی ہم کڑے رہے
ایک ایک سخت بات پہ برسوں اڑے رہے

اب کیا کریں نہ صبر ہے دل کو نہ جی میں تاب
کل اس گلی میں آٹھ پہر غش پڑے رہے

وہ گل کو خوب کہتی تھی میں اس کے رو کے تئیں
بلبل سے آج باغ میں جھگڑے بڑے رہے

فرہاد و قیس ساتھ کے سب کے چل بسے
دیکھیں نباہ کیونکہ ہو اب ہم چھڑے رہے

کس کے تئیں نصیب گلِ فاتحہ ہوئے
ہم سے ہزار دل اس کی گلی میں گڑے رہے

برسوں تلک نہ آنکھ ملی ہم سے یار کی
پھر گو کہ ہم بصورتِ ظاہر اڑے رہے

یعنی کہ اپنے عشق کے حیران کار میرؔ
دیوار کے سے نقش در اد پر کھڑے رہے

تقفنہ

شش جہت سے اس میں ظالم بوئے خوں کی راہ ہے
تیرا کوچہ ہم سے تو کہہ کس کی بسمل گاہ ہے

ایک نبھنے کا نہیں مژگاں تلک تو جل ہیں سب
کاروانِ لختِ دل ہر اشک کے ہمراہ ہے

ہم جوانوں کو نچھوڑا اس سے سب بگڑے گئے
یہ دو سالہ دخترِ رز کس قدر نشتاہ ہے

پا برہنہ خاک سر میں مو پریشاں سینہ چاک
حال میرا دیکھنے آ تیرا ہی دلخواہ ہے

اس جنوں پر میرؔ کوئی بھی پھرے ہے شہر میں
جادۂ صحرا اسے کر سازش جو تجھ سے راہ ہے

مشکل ہے ہونا روکش رخسار کی جھلک کے
ہم تو بشر ہیں اس جا پر جلتے ہیں ملک کے

مرتا ہے کیوں تو ناحق یاری برادری پر
دنیا کے سارے ناتے ہیں جیتے جی تلک کے

کہتے ہیں گور میں بھی ہیں تین روز بھاری
جاویں کدھر الٰہی مارے ہوئے فلک کے

لاتے نہیں نظر میں غلطانی گہر کو
ہم معتقد ہیں اپنے آنسو ہی کی ڈھلک کے

کل اک مژہ نچوڑے طوفانِ نوح آیا
فکرِ فشار میں ہوں میرؔ آج ہر پلک کے

تا چند ترے غم میں یوں زار رہا کیجے
امیدِ عیادت پر بیمار رہا کیجے

لے اب ہے جگر کاوی نے سینہ خراشی ہے
کچھ جی میں یہ آئے ہے بیکار رہا کیجے

کیفیت چشماں اب معلوم ہوئی اُنکی
یہ مست ہیں دو خونی ہشیار رہا کیجے

دل جاؤ تو اب جاؤ ہو خون تو جگر ہووے
اک جان ہی کس کس کی غمخوار رہا کیجے

ہی زیست کوئی یہ بھی جو میر کری ہی تو
ہر آن میں مرنے کو تیار رہا کیجے

طاقت نہیں ہی جی میں نے اب جگر رہا ہی
پھر دل ستم رسیدہ اک ظلم کر رہا ہے

مارا ہی کس کو ظالم اس بے سلیقگی سے
دامن تمام تیرا لوہو میں بھر رہا ہے

پہنچا تھا تیغ کھینچے مجھ تک جو بولی دشمن
کیا مارتا ہے اس کو یہ آپھی مر رہا ہے

آنے کہا ہی میرے خوش قد نے رات گزری
ہنگامۂ قیامت اب صبح پر رہا ہے

چل ہمنشیں کہ دیکھیں آوارہ میر کو ٹک
خانہ خراب وہ بھی آج اپنے گھر رہا ہے

قرار دل کا یہ کا ہیکو ڈھنگ تھا آگے
ہمارے چہرے کے اوپر بھی رنگ تھا آگے

اُٹھائیں تیرے لئے بد زبانیاں اُن کی
جنھوں کی ہم کو خوشامد سے ننگ تھا آگے

ہماری آہوں سے سینہ پہ ہو گیا بازار
ہر ایک زخم کا کوچہ جو تنگ تھا آگے

رہا تھا شمع سے مجلس میں دوش کتنا فرق
کہ جل بجھے تھے یہ ہم پر پتنگ تھا آگے

کیا خراب تغافل نے اس کے ورنہ میر
ہر ایک بات پہ دشنام و سنگ تھا آگے

تجھ بن خراب و خستہ زبوں خوار ہو گئے
کیا آرزو تھی ہم کو کہ بیمار ہو گئے

خوبیٔ بخت دیکھ کہ خوبانِ بے وفا
بے ہیچ میرے در پے آزار ہو گئے

ہم نے بھی سیر کی تھی چمن کی پر اے نسیم
اُٹھتے ہی آشیاں سے گرفتار ہو گئے

وہ تو گلے لگا ہوا سوتا تھا خواب میں
بخت اپنے سو گئے کہ جو بیدار ہو گئے

اپنی یگانگی ہی کیا کرتے ہیں بیاں
اغیار رو سیاہ بہت یار ہو گئے

لائی تھی شیخ کو پہ بھی خرابی تری نگاہ
بے طالعی سے اپنی وہ ہشیار ہو گئے

کیسے ہیں نے کہ جیتے ہیں صد سال ہم تو میر
اس چار دن کی زیست میں بیزار ہو گئے

تنگ آئے ہیں دل اس جی سے اُٹھا بیٹھیں گے
بھوکوں مرتے ہیں کچھ اب یار بھی کھا بیٹھیں گے

اب کے بگڑے گی اگر اُن سے تو اس شہر سے جا
کسو ویرانے میں تکیہ ہی بنا بیٹھیں گے

معرکہ گرم تو ٹک ہونے دو خونریزی کا
پہلے تلوار کے نیچے ہمیں جا بیٹھیں گے

ہوگا ایسا بھی کوئی روز کہ مجلس سے کبھو
ہم تو ایک آدھ گھڑی اُٹھ کے جدا بیٹھیں گے

جا نہ اظہارِ محبت پہ ہوسناکوں کی
وقت کے وقت یہ سب منھ کو چھپا بیٹھیں گے

دیکھیں وہ غیرتِ خورشید کہاں جاتا ہے
اب سرِ راہ دمِ صبح سے آ بیٹھیں گے

بھیڑ ٹلتی ہی نہیں آگے سے اُس ظالم کے
گردنیں یار کسی روز کٹا بیٹھیں گے

کب تلک گلیوں میں سودائی سے پھرتے رہیے
دل کو اس زلفِ مسلسل سے لگا بیٹھیں گے

شعلہ افشاں اگر ایسی ہی رہی آہ تو میر
گھر کو ہم اپنے کسو رات جلا بیٹھیں گے

نالہ تا آسمان جاتا ہے
شور سے جیسے بان جاتا ہے

دل عجب جائے ہے ولیکن مفت
ہاتھ سے یہ مکان جاتا ہے

کیا خرابی ہے میکدہ کی سہل
محتسب اک جہان جاتا ہے

جب سرِ راہ آوے ہے وہ شوخ
ایک عالم کا جان جاتا ہے

اس سخن ناشنو سے کیا کہیے
غیر کی بات مان جاتا ہے

عشق کے داغ کا عبث ہے علاج
کوئی اب یہ نشان جاتا ہے

گو وہ ہرجائی آئے اپنی اور
سو طرف ہی گمان جاتا ہے

میر گو عمرِ طبعی کو پہنچا
عشق میں جوں جواں جاتا ہے

مر ہی جاویں گے بہت ہجر میں ناشاد رہے
بھول تو ہم کو گئے ہو یہ تمھیں یاد رہے

ہم سے دیوانے رہیں شہر میں سبحان اللہ
دشت میں قیس رہے کوہ میں فرہاد رہے

کچھ بھی نسبت نہ تھی جب دیر سے تب کیا تھا شیخ
ہم حرم میں بھی رہے تو ترے داماد رہے

دور اتنی تو نہیں شامِ اجل دوری میں
تا سحر ایسی ہی جو زاری و فریاد رہے

بس تو کٹوا ہی چکے میر ترپ سے تو بچیں
جو ٹک اک پانوں رکھے چھاتی پہ جلاد رہے

جب کہ دھونے بیٹھتا ہوں تب کیا کسر رہے ہے
رو ہال دو دو دو دن تک جوں ابر تر رہے ہے

آہِ سحر کی میری برچھی کے وسوسے سے — خورشید کے منھ اوپر اکثر سپر رہے ہے

آگہ تو رہیے اُس کی طرزِ رہ و روش سے — آنے میں اُس کے لیکن کس کو خبر رہے ہے

ان روزوں اتنی غفلت اچھی نہیں ادھر سے — اب اضطراب ہم کو دو دو پہر رہے ہے

آبِ حیات کی سی ساری روش ہے اُسکی — پر جب وہ اُٹھ چلے ہے ایک آدھ مر رہے ہے

تلوار اب لگا ہے بیڈل پاس رکھنے — خون آجکل کسو کا وہ شوخ کر رہے ہے

در سے کبھو جو آتے دیکھا ہے میں نے اُس کو — تب سے اُدھر ہی اکثر میری نظر رہے ہے

آخر کہاں تلک ہم اک روز ہو چکیں گے — برسوں سے وعدۂ شب ہر صبح پر رہے ہے

میر اب بہار آئی صحرا میں چل جنوں کر
کوئی بھی فصلِ گل میں نادان گھر رہے ہے

نالے کا آج دل سے پھر لب تلک گزر ہے — ٹک گوش رکھیو ایدھر ساتھ اُس کے کچھ خبر ہے

اے حُبِّ جاہ والو جو آج تاجور ہے — کل اُس کو دیکھیو تم نے تاج ہے نہ سر ہے

اب کی ہوائے گل میں سیرابی ہے نہایت — جوئے چمن پہ سبزہ مژگانِ چشمِ تر ہے

اے ہمصفیر بے گل کس کو دماغِ نالہ — مدت ہوئی ہماری منقار زیرِ پر ہے

شمعِ اخیرِ شب ہوں سُن سرگزشت میری — پھر صبح ہونے تک تو قصہ ہی مختصر ہے

اب رحم پر اُسی کے موقوف ہے کہ یہاں تو — نے اشک میں سرایت نے آہ میں اثر ہے

تو ہی زمام اپنی ناقے تڑا کہ مجنوں — مدت سے نقشِ پا کے مانند راہ پر ہے

ہم مستِ عشق واعظ بے ہیچ بھی نہیں ہیں — غافل جو بیخبر ہیں کچھ اُن کو بھی خبر ہے

اب پھر ہمارا اُس کا محشر میں ماجرا ہے — دیکھیں تو اس جگہ کیا انصاف داد گر ہے

آفت رسیدہ ہم کیا سر کھینچیں اس چمن میں — جوں نخلِ خشک ہم کو نے سایہ نے ثمر ہے

گر میر اس زمیں میں اور اک غزل تو موزوں
ہے حرف زن قلم بھی اب طبع بھی ادھر ہے

ڈھونڈا نہ پایئے جو اس وقت میں سو زر ہے — پھر چاہ جس کی مطلق ہے ہی نہیں ہنر ہے

ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یہاں — یہ کارگاہ ساری دُکانِ شیشہ گر ہے

ڈھاہا جنوں نے اُس کو ان پر خرابی آئی — جانا گیا اُسی سے دل بھی کسو کا گھر ہے

تجھ بن شکیب تک بے فائدہ ہوں نالاں — مجھ نالہ کش کے تو اے فریاد رس کدھر ہے

صید افگنو ہمارے دل کو جگر کو دیکھو
اک تیر کا ہدف ہے اک تیغ کا سپر ہے

حالِ زمانہ رہتے اک طور پر نہیں ہیں
ہر آن مرتبے سے اپنے انھیں سفر ہے

کافی ہے مہر قاتل محضر پہ خوں کے میرے
پھر جس جگہ یہ جاوے اس جا ہی معتبر ہے

تیری گلی سے بچکر کیوں مہر و مہ نہ نکلیں
ہر کوئی جانتا ہے اس راہ میں خطر ہے

وے دن گئے کہ آنسو روتے تھے میر اب تو
آنکھوں میں لختِ دل ہے یا پارۂ جگر ہے

شب شمع پر پتنگ کے آنے کو عشق ہے
اس دل جلے کی تاب کے لانے کو عشق ہے

سر مار مار سنگ سے مردانہ جی دیا
فرہاد کے جہان سے جانے کو عشق ہے

اُٹھیو سمجھ کے جا سے کہ مانندِ گرد باد
آوارگی سے تیری زمانے کو عشق ہے

بس اے سپہر سعی سے تیری تو روز و شب
یہاں غم ستانے کو ہے جلانے کو عشق ہے

بیٹھی جو تیغ یار تو سب تجھ کو کھا گئی
اے سینے تیرے زخم اُٹھانے کو عشق ہے

اک دم میں تو نے پھونک دیا دو جہاں تئیں
اے عشق تیرے آگ لگانے کو عشق ہے

سودا ہو تب ہو میر کو تو کریے کچھ علاج
اس تیرے دیکھنے کے دِوانے کو عشق ہے

جب سے اُس بیوفا نے بال رکھے
صید بندوں نے جال ڈال رکھے

ہاتھ کیا آوے وہ کمر ہے ہیچ
یوں کوئی جی میں کچھ خیال رکھے

رہروِ راہِ خوفناکِ عشق
چاہیئے پانوں کو سنبھال رکھے

پہنچے ہر اک نہ درد کو میرے
وہ ہی جانے جو ایسا حال رکھے

ہیں زر دوست ہو تو خیر ہے اب
ملئے اُس سے جو کوئی مال رکھے

بحث ہے ناقصوں سے کاش فلک
مجھکو اس زمرہ سے نکال رکھے

سمجھے اندازِ شعر کو میرے
میر کا سا اگر کمال رکھے

یاں جو وہ نونہال آتا ہے
جی میں کیا کیا خیال آتا ہے

اس کے چلنے کی آن کا بے حال
مدتوں میں بحال آتا ہے

پر تو گزرا قفس ہی میں دیکھیں
اب کی کیسا یہ سال آتا ہے

شیخ کی تو نماز پرست جا
بوجھ سر کا سا ڈال آتا ہے

آرسی کے بھی گھر میں شرم سے میر
کم ہی وہ بے مثال آتا ہے

پیری میں کیا جوانی کے موسم کو روئیے
اب صبح ہونے آئی ہے اک دم تو سوئیے

رخسار اس کے ہائے رے جب دیکھتے ہیں ہم
آتا ہے جی میں آنکھوں کو ان میں گڑوئیے

اخلاص دل سے چاہئے سجدہ نماز میں
بیفائدہ ہے ورنہ جو یوں وقت کھوئیے

کس طور آنسوؤں میں نہاتے ہیں غم کشاں
اس آبِ گرم میں تو نہ انگلی ڈبوئیے

مطلب کو تو پہنچتے نہیں اندھے کے سے طور
ہم مارتے پھرے ہیں یونہیں پگ ٹٹوئیے

اب جان جسم خاک سے تنگ آگئی بہت
کبتک اس ایک ٹوکری مٹی کو ڈھوئیے

آلودہ اس گلی کے جو ہوں خاک سے تو میر
آبِ حیات سے بھی نہ وے پانوں دھوئیے

شب گئے تھے باغ میں ہم ظلم کے مارے ہوئے
جان کو اپنی گل مہتاب انگارے ہوئے

گور پر میری پس از مدت قدم رنجہ کیا
خاک میں مجھ کو ملا کر مہرباں بارے ہوئے

آستینیں رکھتے رکھتے دیدۂ خونبار پر
حلق بسمل کی طرح لوہو کے فوارے ہوئے

وعدے ہیں سارے خلاف و حرف ہیں یکسر فریب
تم لڑکپن میں کہاں سے ایسے عیارے ہوئے

پھرتے پھرتے عاقبت آنکھیں ہماری مند گئیں
سو گئے بیہوش تھے ہم راہ کے مارے ہوئے

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی تو پوچھتے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

تم جو ہم سے مل چلے ٹک رشک سب لینے لگے
مہرباں جتنے تھے اپنے مدعی سارے ہوئے

آج میرے خون پر اصرار ہر دم ہے تمہیں
آئے ہو کیا جانئے تم کس کے سنکارے ہوئے

لیتے کروٹ ہل گئے جو کان کے موتی ترے
شرم سے سر در گریباں صبح کے تارے ہوئے

استخواں ہی رہ گئے تھے یہاں تمِ خونریز میر
دانتے پڑ کر تیجے اس شوخ کے آرے ہوئے

کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے
زمیں سخت ہے آسماں دور ہے

جرس راہ میں جملہ تن شور ہے
مگر قافلے سے کوئی دور ہے

۱؎ سعدی سے دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم ؛ باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی عہ [illegible]

تمنائے دل کیلئے جان دی
سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے

نہو کس طرح فکر انجام کار
بھروسے ہے جس پر سو مغرور ہے

پلک کی سیاہی میں ہی وہ نگاہ
کسو کا مگر خون منظور ہے

دل اپنا نہایت ہی نازک مزاج
گرا گر یہ شیشہ تو پھر چور ہے

کہیں جو تسلی ہوا ہو یہ دل
وہی بیقراری بدستور ہے

نہ دیکھا کہ لوہو تھنبا ہو کبھو
مگر چشم خونبار ناسور ہے

تنک[۱] گرم تو سنگریزے کو دیکھا
نہاں اس میں بھی شعلۂ طور ہے

بہت سعی کرئے تو مر رہئے میر
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

اب میر جی تو اچھے زندیق ہی بن بیٹھے
پیشانی پہ دے قشقہ زنار پہن بیٹھے

آزردہ دلِ الفت ہم چپکے ہی بہتر ہیں
سب رو اٹھیگی مجلس جو کرکے سخن بیٹھے

عریان پھریں کبتک اے کاش کہیں آکر
تہ گردِ بیاباں کی بالائے بدن بیٹھے

پیکانِ خدنگ اُس کا یوں سینہ کے اودھر ہے
جوں مارِ سیہ کوئی کاڑھے ہوئے پھن بیٹھے

جز خط کے خیال اُس کے کچھ کام نہیں ہم کو
سبزی پیئے ہم اکثر رہتے ہیں مگن بیٹھے

شمشیر ستم اُسکی اب گو کہ چلے ہر دم
شوریدہ سر اپنے سے ہم باندھ کفن بیٹھے

بس ہو تو ادھر اودھر یوں پھرنے نہ دیں تجھ کو
ناچار ترے ہم یہ دیکھیں ہیں چلن بیٹھے

نہ تنہا داغ تو سینے پہ میرے اک چمن نکلے
ہر اک لختِ جگر کے ساتھ سوزِ خم کہن نکلے

گماں کب تھا یہ پروانہ پر اتنا شمع رویگی
کہ مجلس میں سے جس کے اشک کے بھر بھر لگن نکلے

کہاں تک نازبرداری کروں شامِ غریباں کی
کہیں گردِ سفر سے جلد بھی صبحِ وطن نکلے

جنوں ان شورشوں پر ہاتھ کی چالاکیاں ایسی
میں ضامن ہوں اگر ثابت بدن سے پیرہن نکلے

حرم میں میر جتنا بت پرستی پر ہے تو مائل
خدا ہی ہو تو اتنا بتکدے میں برہمن نکلے

۱؎ یہ شعر قدیم مطبوعہ و قلمی نسخوں میں اسی طرح ہے مجبوراً بحالہ رکھا گیا ممکن ہے کہ دیکھا کے بجائے دیکھو ہو ۱۲ آسی

قصد گر امتحان ہے پیارے — اب تلک نیم جان ہے پیارے
سجدہ کرنے میں سر کٹیں ہیں جہاں — سو ترا آستان ہے پیارے
گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر — یہ ہماری زبان ہے پیارے
کام میں قتل کے مرے تن دے — اب تلک مجھ میں جان ہے پیارے
چھوڑ جاتے ہیں دل کو تیرے پاس — یہ ہمارا نشان ہے پیارے
شکلیں کیا کیا کیاں ہیں جنکی خاک — یہ وہی آسمان ہے پیارے
قطعہ
جا چکا دل تو یہ یقینی ہے — کیا اب اس کا بیان ہے پیارے
پر تبسم کے کرنے سے تیرے — کنج لب پر گمان ہے پیارے
میر عمداً بھی کوئی مرتا ہے — جان ہے تو جہان ہے پیارے

کل وعدہ گاہ میں سے جوں توں کے ہم کو لائے — ہونٹھوں پہ جان آئی پر آہ وے نہ آئے
زخموں پہ زخم جھیلے داغوں پہ داغ کھائے — یک قطرہ خونِ دل نے کیا کیا ستم اٹھائے
اُس کی طرف کو ہم نے جب نامہ بر چلائے — اُن کا نشاں نہ پایا خط راہ میں سو پائے
خوں بستہ جب تلک تھیں دریا رکے کھڑے تھے — آنسو گرے کروڑوں پلکوں کے ٹک ہلائے
اس جنگجو کے زخمی اچھے نہ ہوتے دیکھے — گل جب چمن میں آئے زخم اپنے سب دکھائے
بڑھتیں نہیں پلک سے تا ہم تلک بھی پہنچیں — پھرتی ہیں وے نگاہیں پلکوں کے سائے سائے
پر کی بہار میں جو محبوب جلوہ گر تھے — سو گردش فلک نے سب خاک میں ملائے
ہر قطعہ چمن پر ٹک گاڑ کر نظر کر — بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنائے
یک حرف کی بھی مہلت ہم کو نہ دی اجل نے — تھا جی میں آہ کیا کیا پر کچھ نہ کہنے پائے
چھاتی سے راہ اُن کی پائے سیر بین جنھوں نے — خار و خس چمن سے ناچار دل لگائے
آگے بھی تجھ سے تھا یاں تصویر کا سا عالم — بیدردیِ فلک نے وے نقش سب مٹائے
مدت ہوئی تھی بیٹھے جوش و خروش دل کو — ٹھوکر نے اُس نگہ کی آشوب پھر اُٹھائے
اعجاز عشق ہی سے جیتے رہے وگرنہ — کیا حوصلہ کہ جس میں آزار یہ سمائے
دل گرمیاں انھیں کی غیروں سے جب نہ تب تھیں — مجلس میں جب گئے ہم غیرت نے جی جلائے
جیتے تو میر ہر شب اس طرح عمر گذری — پھر گور پر ہماری بے شمع گو کہ آئے

قبرِ عاشق پر مقرر روز آنا کیجیے
جو گیا ہو جان سے اُس کو بھی جانا کیجیے

رات دارو پیجیے غیروں میں بے لیت و لعل
یہاں سحر سر دُکھنے کا ہم سے بہانا کیجیے

ٹک تمھارے ہونٹھ کے ہلنے سے یہاں ہوتا ہے کام
اُتنی اُتنی بات جو ہووے تو مانا کیجیے

گوشۂ چشمِ بتاں یا کنجِ لب اس وقت میں
جا کہیں ہو تو دل اپنے کا ٹھکانا کیجیے

سیکھیے غیروں کے ہاں چھپ چھپ کے علمِ تیر پر
سارے عالم میں ہمارے تئیں نشانا کیجیے

رفتہ رفتہ قاصدوں کو رفتگی اس سے ہوئی
جی میں ہے اب کی مقرر اپنا جانا کیجیے

نکلے ہے آنکھوں سے تو گردِ کدورت جائے اشک
تا کجا تیری گلی میں خاک چھانا کیجیے

آبشار آنے لگے آنسو کی پلکوں سے تو میر
کب تلک یہ آب چادر منھ پہ تانا کیجیے

خوشاں پوچھیں ٹک ہجراں میں گر مر جائیے
اب کہو اس شہرِ ناپرساں سے کیدھر جائیے

کام دل کا کچھ ٹھکانا ہی نہیں کیونکر بنے
آئیے تا چند و ناامید پھر کر جائیے

مضطرب اس آستاں سے اُٹھ کے کچھ پایا نہ رو
منھ رہا ہے کیا جو پھر اب اس کے در پہ جائیے

بعدِ طوفِ قیس ہو جی زائرِ فرہاد بھی
دشت سے اٹھیے تو کوہوں میں مقرر جائیے

شوق تھا جو یار کے کوچے ہمیں لایا تھا میر
پانوں میں طاقت کہاں اتنی کہ اب گھر جائیے

غالب کہ یہ دلِ خستہ شبِ ہجر میں مر جائے
یہ رات نہیں وہ جو کہانی میں گزر جائے

ہے طرفہ مفتن نگہ اُس آئینہ رو کی
اک پل میں کرے سیکڑوں خوں اور مکر جائے

نہ بُتکدہ ہے منزلِ مقصود نہ کعبہ
جو کوئی تلاشی[1] ہو ترا آہ کدھر جائے

ہر صبح تو خورشید ترے مُنھ پہ چڑھے ہے
ایسا نہ ہو یہ سادہ کہیں جی سے اُتر جائے

یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گلبرگ
ٹک ہونٹھ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے

ہم تازہ شہیدوں کو نہ آ دیکھنے نازاں
دامن کی ترے زہ کہیں لوہو میں نہ بھر جائے

گریے کو مرے دیکھ ٹک اک شہر کے باہر
اک سطح ہے پانی کا جہاں تک کہ نظر جائے

مت بیٹھ بہت عشق کے آزردہ دلوں میں
نالہ کسو مظلوم کا تاثیر نہ کر جائے

اس واسطے سے تختہ جو کوئی پہنچے کنارے
تو میر وطن میرے بھی شاید یہ خبر جائے

[1] تلاشی ترکی لغت ہے بمعنی تلاش کرنے والا اور جو تلاشی کے معنی پر تلاشی استعمال کرتے ہیں [غلط] ہے ۱۲ (آسی)

ہم نے جانا تھا سخن ہونگے زباں پر کتنے
پر قلم ہاتھ جو آئی لکھے دفتر کتنے

میں نے اُس قطعۂ صناع سے سر کھینچا ہے
کہ ہر اک کوچے میں جس کے تھے ہنرور کتنے

کشورِ عشق کو آباد نہ دیکھا ہم نے
ہر گلی کوچہ میں اوجڑ بیٹھے تھے گھر کتنے

آہ نکلی ہے یہ کس کی ہوس سیر بہار
آتے ہیں باغ میں آوارہ ہوئے پر کتنے

دیکھیو پنجۂ مژگاں کی ٹک آتش دستی
ہر سحر خاک میں ملتے ہیں دُرِ تر کتنے

کب تلک یہ دل صد پارہ نظر میں رکھئے
اس پر آنکھیں ہی سئے رہتے ہیں دلبر کتنے

عمر گزری کہ نہیں دودۂ آدم سے کوئی
جس طرف دیکھئے عرصہ میں ہیں ابتر کتنے

تو ہے بیچارہ گدا میرؔ ترا کیا مذکور
مل گئے خاک میں یہاں صاحبِ افسر کتنے

آہ جس وقت سر اُٹھاتی ہے
عرش پر برچھیاں چلاتی ہے

ناز بردار لب ہے جاں جب سے
تیرے خط کی خبر کو پاتی ہے

اے شبِ ہجر راست کہہ تجھ کو
بات کچھ صبح کی بھی آتی ہے

چشمِ بد دُور چشمِ تر اے میرؔ
آنکھیں طوفان کو دکھاتی ہے

طاقت نہیں ہے دل میں نے جی بجا رہا ہے
کیا ناز کر رہے ہو اب ہم میں کیا رہا ہے

جیب اور آستیں سے رونے کا کام گزرا
سارا نچوڑ اب تو دامن پر آرہا ہے

اب چیت گر نہیں کچھ تازہ ہوا ہوں بیکل
آیا ہوں جب بخود میں جی اس میں جا رہا ہے

کا ہیکا پاس اب تو رسوائی دور پہنچی
رازِ محبت اپنا کس سے چھپا رہا ہے

گرد رہ اُس کی یارب کس اور سے اُٹھے گی
سو سو غزال ہر سو آنکھیں لگا رہا ہے

بندے تو طرحدار وہیں طرح کش تمھارے
پھر چاہتے ہو کیا تم اب اک خدا رہا ہے

دیکھ اس دہن کو ہر دم اے آرسی کہ یوں ہی
خوبی کا در کسو کی منہ پر بھی وا رہا ہے

وے لطف کی نگاہیں پہلے فریب ہیں سب
کس سے وہ بیمروت پھر آشنا رہا ہے

اتنا خزاں کرے ہے کب زرد رنگ پر یہاں
تو بھی کسو نگہ سے اے گل جدا رہا ہے

رہتے ہیں داغ اکثر نان و نمک کی خاطر
جینے کا اس سمجھی میں اب کیا مزا رہا ہے

اب چاہتا نہیں ہے بوسہ جو تیرے لب سے
جینے سے میرؔ شاید کچھ دل اٹھا رہا ہے

تڑپنا بھی دیکھا نہ بسمل کا اپنے
میں کشتہ ہوں اندازِ قاتل کا اپنے

نہ پوچھو کہ احوال ناگفتہ بہ ہے
مصیبت کے مارے ہوئے دل کا اپنے

دلِ زخم خوردہ کے اور اک لگائی
مداوا کیا خوب گھائل کا اپنے

ٹک ابرو کو میری طرف کیجے مائل
کبھو دل بھی رکھ لیجے مائل کا اپنے

ہوا دفترِ قیس آخر ابھی یاں
سخن ہے جنوں کے اوائل کا اپنے

رہنائیں رکھیں ہیں نے عالم میں کیا کیا
ہوں بندہ خیالاتِ باطل کا اپنے

مقامِ فنا واقعہ میں جو دیکھا
اثر بھی نہ تھا گور منزل کا اپنے

جب تک کہ ترا گزر نہ ہووے
جادہ مری گور پر نہ ہووے

لے تیغ و سپر کو تو جدھر ہو
خورشید کا منھ اُدھر نہ ہووے

رونے کی ہے جا کہ آہ کریے
پھر دل میں ترے اثر نہ ہووے

بیمار رہے ہیں اُس کی آنکھیں
دیکھو کسو کی نظر نہ ہووے

رکتی نہیں تیغ نالہ ہرگز
جب تک کہ جگر سپر نہ ہووے

کر لے خبر اک نگہ سے ساقی
لیکن کسو کو خبر نہ ہووے

خستے ترے موئے عنبریں کے
کیونکر جئیں صبر گر نہ ہووے

رکھ دیکھ کے راہِ عشق میں پائے
یہاں میر کسو کا سر نہ ہووے

رات گزری ہے مجھے نزع میں روتے روتے
آنکھیں پھر جائیں گی اب صبح کے ہوتے ہوتے

کھول کر آنکھ اُڑا دید[1] جہاں کا غافل
خواب ہو جائیگا پھر جاگنا سوتے سوتے

جم گیا خوں کفِ قاتل پہ ترا میر زبس
اُن نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

یعقوبؑ کے نہ کلبۂ احزاں تلک گئے
سو کاروانِ مصر سے کنعاں تلک گئے

بارے نسیم ضعف سے کل ہم اسیر بھی
سناہٹے[2] میں جی کے گلستاں تلک گئے

[1] دید۔ میر کے زمانہ تک مختلف فیہ تھا۔ چنانچہ سودا کا یہ شعر "تمہارے چہرہ کو دیکھا ہے جب سے خوباں نے ؛ کیا ہے دید مقرر طلاق آئینہ کا" اب مؤنث مستعمل ہے۔۱۲۔ [2] سناہٹا۔ اب بغیر (ہ) کے بولا جاتا ہے اور فصحا اسی کو فصیح جانتے ہیں۔ آسی

رہنے نہ دیں گے دشت میں مجنوں کو چین سے
گر ہم جنوں کے مارے بیاباں تلک گئے

کو موسمِ شباب کہاں گل کسے دماغ
بلبل وہ چہچہے انھیں یاراں تلک گئے

کچھ آبلے دیے تھے رہ آوردِ عشق نے
سو رفتہ رفتہ خارِ مغیلاں تلک گئے

پھاڑا تھا جیب پی کے مئے شوق میں نے میر
مستانہ چاک لوٹتے داماں تلک گئے

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

ہوتا نہیں ہے اُس لبِ نوخط پہ کوئی سبز
عیسیٰ و خضر کیا سبھی یکبار مر گئے

یوں کانوں کان گل نے نہ جانا چمن میں آہ
سر کو پٹک کے ہم پسِ دیوار مر گئے

صد کارواں وفا ہے کوئی پوچھتا نہیں
گویا متاعِ دل کے خریدار مر گئے

مجنوں نہ دشت میں ہے نہ فرہاد کوہ میں
تھا جن سے لطفِ زندگی وے یار مر گئے

افسوس وے شہید کہ جو قتل گاہ میں
لگتے ہی اُس کے ہاتھ کی تلوار مر گئے

تجھ سے دوچار ہوئیگی حسرت کے مبتلا
جب جی ہوئے وبال تو ناچار مر گئے

گھبرا نہ میر عشق میں اس سہل زیست پر
جب بس چلا نہ کچھ تو مرے یار مر گئے

تمام اُس کے قد میں سناں کی طرح ہے
رنگیلی پست اُس جواں کی طرح ہے

پھرے ہے نا احوال کو سُن کے میرے
بھلا تو ہی کہہ یہ کہاں کی طرح ہے

قطعہ

اُڑے خاک گاہے رہے گاہ ویراں
خراب و پریشاں یہاں کی طرح ہے

تعلق کرو میر اس پر جو چاہو
مری جان یہ کچھ جہاں کی طرح ہے

محمل کے ساتھ اُس کے بہت شور میں گئے
نالوں نے میرے ہوش جرس کے اُڑا دیے

فصادِ خوں فساد یہ ہے مجھ سے ان دنوں
نشتر نہ تو لگا دے تو میرا لہو پیے

صورتِ جرس کی طرز بیاباں میں ہائے میر
تنہا چلا ہوں میں دلِ پرشور کو لیے

کہاں تک غیر جاسوسی کے لینے کو لگا آوے
الٰہی اس بلائے ناگہاں پر بھی بلا آوے

رکا جاتا ہے جی اندر ہی اندر آج گرمی سے
بلا سے چاک ہی ہو جاوے سینہ ٹک ہوا آوے

ترا آنا ہی اب مرکوز ہی ہم کو دم آخر
یہ جی صدقے کیا تھا پھر نہ آوے تن میں یا آوے

یہ رسم آمد و رفتِ دیارِ عشق تازہ ہے
ہنسی وہ جائے میری اور رونا یوں چلا آوے

اسیری نے چمن سے میرے دل گرمی کو دھو ڈالا
وگرنہ برق جاکر آشیاں میرا جلا آوے

امید رحم اُن سے سخت نافہمی ہی عاشق کی
یہ بت سنگیں دلی اپنی نہ چھوڑیں گر خدا آوے

یہ فنِ عشق ہی آوے اُسی طینت میں جس کی ہو
تو زاہد پیرِ نابالغ ہی بے تہ تجھ کو کیا آوے

ہمارے دل میں آنے سے تکلف غم کو بیجا ہی
یہ دولت خانہ ہی اُس کا وہ جب چاہے چلا آوے

بہ رنگ بوئے غنچہ عمر اک ہی رنگ میں گزرے
میسر میرؔ صاحب گر دلِ بے مدعا آوے

گو ننگ اُس کو آوے ہی عاشق کے نام سے
ہی میرؔ کام میرے تئیں اپنے کام سے

درد صفر ہی خوب پئیں جس میں صاف مے
کیا میکشوں کو اوّل ماہ صیام سے

پڑھتے نہیں نماز جنازہ پہ اُس کے میرؔ
دل میں غبار جس کے ہو خاک امام سے

اچنبھا ہی اگر چپکا رہوں مجھ پر عتاب آوے
وگر قصہ کہوں اپنا تو سنتے اُس کو خواب آوے

بھرا ہی دل مرا جام لبالب کی طرح ساقی
گلے لگ خوب روؤں میں جو مینائے شراب آوے

بغل پروردۂ طوفاں ہوں میں یہ موج ہی میری
بیاباں میں اگر روؤں تو شہروں میں بھی آب آوے

لپیٹا ہی دلِ سوزاں کو اپنے میرؔ نے خط میں
الٰہی نامہ بر کو اُس کے لیجانے کی تاب آوے

حصول کام کا دلخواہ یہاں ہوا بھی ہی
سماجت اتنی بھی سب سے کوئی خدا بھی ہی

موئے ہی جاتے ہیں ہم دردِ عشق سے یارو
کسو کے پاس اس آزار کی دوا بھی ہی

اُداسیاں تھیں مری خانقہ میں قابلِ سیر
صنم کدہ میں تو ٹک آکے دل لگا بھی ہی

یہ کہئے کیونکہ کہ خوباں سے کچھ نہیں مطلب
لگے جو پھرتے ہیں ہم کچھ تو مدعا بھی ہی

ترا ہی وہم کہ میں اپنے پیرہن میں ہوں
نگاہ غور سے کر مجھ میں کچھ رہا بھی ہی

جو کھولوں سینۂ مجروح تو نمک چھڑکے
جراحت اُس کو دکھانے کا کچھ مزا بھی ہی

کہاں تلک شب و روز آہ دردِ دل کہئے
ہر ایک بات کو آخر کچھ انتہا بھی ہی

ہوس تو دل میں ہمارے جگہ کرے لیکن
کہیں ہجوم سے اندوہِ غم کی جا بھی ہی

غم فراق ہی دُنبالہ گردِ عیشِ وصال ۔۔۔ فقط مزا ہی نہیں عشق میں بلا بھی ہی
قبول کریے تری رہ میں جی کو کھو دینا ۔۔۔ جو کچھ بھی پایئے تجھ کو تو آشنا بھی ہی
جگر میں سوزنِ مژگاں کے تئیں کُڈھب گڑا ۔۔۔ کسو کے زخم کو تو نے کبھو سیا بھی ہی

گزارِ[۵۱] شہرِ وفا میں سمجھ کے کر مجنوں
کہ اس دیار میں میر شکستہ پا بھی ہے

بسکہ دیوانگی حال میں چالاک ہوئے ۔۔۔ سو گریبان مرے ہاتھ سے یہاں چاک ہوئے
سر گر پانوں پہ قاتل کے کٹائی گردن ۔۔۔ اپنے ذمہ سے تو صد شکر کہ ہم پاک ہوئے

پائمالی سے فراغت ہی نہیں میر ہمیں
کوئے دلبر میں عبث آن کے ہم خاک ہوئے

صید افگنوں سے ملنے کی تدبیر کریں گے ۔۔۔ اس دل کے تئیں پیشکشِ تیر کریں گے
فریاد اسیرانِ محبت نہیں بے ہیچ ۔۔۔ یہ نالے کسو دل میں بھی تاثیر کریں گے
دیوانگی کی شورشیں دکھلائیں گی بلبل ۔۔۔ آتی ہی بہار اب ہمیں زنجیر کریں گے
وا اس سے سرِ حرف تو ہو گو کہ یہ سر جائے ۔۔۔ ہم حلق بریدہ ہی سے تقریر کریں گے
رسوائی عاشق سے تسلی نہیں خوباں ۔۔۔ مر جاویگا تو نعش کو تشہیر کریں گے
یارب وہ بھی دن ہوئیگا جو مصر سے چل کر ۔۔۔ کنعاں کی طرف قافلے شب گیر کریں گے
شب دیکھی ہی زلف اُس کی بجز دامِ اسیری ۔۔۔ کیا یار اب اس خواب کی تعبیر کریں گے
غصے[۵۲] میں تو ہوویگی توجہ تیری ایدھر ۔۔۔ ہر کام میں ہم جان کے تقصیر کریں گے
نکلا نہ مناجاتیوں سے کام کچھ اپنا ۔۔۔ اب کوئی خراباتی جواں پیر کریں گے

بازیچہ نہیں میر کے احوال کا لکھنا
اس قصہ کو ہم کرتے ہی تحریر کریں گے

دل کی طرف کچھ آہ سے دل کا لگاؤ ہی ۔۔۔ ٹک آپ بھی تو آیئے یہاں زور باؤ ہی
اُٹھتا نہیں ہی ہاتھ ترا تیغِ جور سے ۔۔۔ ناحق کشی کہاں تئیں یہ کیا سبھاؤ ہی
باغ نظر ہی چشم کی منظر کا سب یہاں ۔۔۔ ٹک ٹھہرو یہاں تو جا تو کہ کیسا دکھاؤ ہی

[۵۱] سودا دہلوی — سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں ⁂ کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہی
[۵۲] غصے میں ترے ہم نے عجب لطف اٹھایا ⁂ اب تو عمداً اور بھی تقصیر کریں گے ۔ ۱۲

تقریب ہم نے ڈالی ہو اُس سے جوئی کی اب
ٹپکا کرے ہو آنکھ سے لوہو ہی روز و شب
ضبط سرشک خونیں سے جی کیونکہ شاد ہو
اب سب کے روزگار کی صورت بگڑ گئی
چھاتی کے میری سارے نمودار ہیں یہ زخم

جوبن پڑے ہو ٹک تو ہمارا ہی داؤ ہو
چہرے پہ میرے چشم ہو یا کوئی گھاؤ ہو
اب دل کی طرف لوہو کا سارا بہاؤ ہو
لاکھوں میں ایک دو کا کہیں کچھ بناؤ ہو
پردہ رہا ہو کونسا اب کیا چھپاؤ ہو

عاشق کہیں جو ہوگے تو جانوگے قدر میر
اب تو کسی کے چاہنے کا تم کو چاؤ ہے

جہاں میں روز ہو آشوب اُس کی قامت سے
ہوا ہوں ہو کے دل افسردہ رنج کلفت سے
جہاں ملے تہاں کافر ہی ہونا پڑتا ہے
تسلی اُن نے نہ کی ایک دو سخن سے کبھو
پلک کے مارتے ہم تو نظر نہیں آتے
امیر زادوں سے دلّی کے مل نہ تا مقدور
یہ جہل دیکھ کہ ان سمجھے میں اُٹھا لایا
رہا نہوگا بخود صانع ازل بھی تب
وہ آنکھیں پھیرے ہی لیتا ہے دیکھتے کیا ہو

اُٹھے ہو فتنہ ہر اک شوخ تر قیامت سے
اُگے ہو سبزۂ پژمردہ میری تربت سے
خدا پناہ میں رکھے بتوں کی صحبت سے
جو کوئی بات کہی بھی تو آدھی لکنت سے
سخن کرو ہو عبث تم ہماری فرصت سے
کہ ہم فقیر ہوئے ہیں اُنھیں کی دولت سے
گراں وہ بار جو تھا بیش اپنی طاقت سے
بنایا ہوگا جب اُس منھ کو دستِ قدرت سے
معاملت ہو ہمیں دل کی بے مروت سے

جو سوچے ٹک تو وہ مطلوب ہم ہی نکلے میر
خراب پھرتے تھے جس کی طلب میں مدت سے

رمق ایک جانِ وبال ہو کوئی دم جو ہو تو عذاب ہے
دلِ داغ گشتہ کباب ہے، جگرِ گداختہ آب ہے
مری خلق محوِ کلام سب مجھے چھوڑتے ہیں خموش کب
مرا حرف رشکِ کتاب ہے مری بات لکھنے کا باب ہے
جو وہ لکھتا کچھ بھی تو نامہ بر کوئی رہتی منھ میں ترے نہاں
تری خامشی سے یہ نکلے ہے کہ جواب خط کا جواب ہے

سلہ میر تقی میر دہلوی سہ مت مل اہلِ دوَل کے لڑکوں سے ؎ میر جی اُن سے مل فقیر ہوئے۔

رہے حال دل کا جو ایک سا تو رجوع کرتے کہیں بھلا
سو تو یہ کبھو ہمہ داغ ہے کبھو نیم سوز کباب ہے

کہیں گے کہو تمھیں لوگ کیا یہی آرسی یہی تم سدا
نہ کسو کی تم کو ہے ٹک حیا نہ ہمارے منھ سے حجاب ہے

چلو میکدے میں بسر کریں کہ رہی ہے کچھ برکت وہیں
لبِ نانِ واں کا کباب ہے دمِ آب وھاں کا شراب ہے

نہیں کھلتیں آنکھیں تمھاری ٹک کہ مآل پر بھی نظر کرو
یہ جو وہم کی سی نمود ہے اسے خوب دیکھو تو خواب ہے

گئے وقت آتے ہیں ہاتھ کب ہوئے ہیں گنوا کے خراب سب
تجھے کرنا ہووے سو کر تو اب کہ یہ عمر برقِ شتاب ہے

کبھو لطف سے نہ سخن کیا کبھو بات کہہ نہ لگا لیا
یہی لحظہ لحظہ خطاب ہے وہی لمحہ لمحہ عتاب ہے

تو جہاں کے بحرِ عمیق میں سرِ پُرہوا نہ بلند کر
کہ یہ پنج روزہ جو بود ہے کسو موج پر کا حباب ہے

رکھو آرزو مئے خام کی کرو گفتگو خطِ جام کی
کہ سیاہ کاروں سے حشر میں نہ حساب ہے نہ کتاب ہے

مرا شور سن کے جو لوگوں نے کیا پوچھنا تو کہے ہے کیا
جسے میر کہتے ہیں صاحبو! یہ وہی تو خانہ خراب ہے

سینہ ہے چاک جگر پارہ ہے دل سب خوں ہے
اُس سے آنکھوں کو ملا جی میں رہے کیونکر تاب
آہ یہ رسمِ وفا ہووے برافتاد کہیں
کبھو اس دشت سے اُٹھتا ہے جو ایک ابرِ تنک
کیونکہ بے بادہ لبِ جو پہ چمن میں یہ رہے
پار بھی ہو نہ سکے کلیجے کے تو پھر کیا بلبل
شہر کتنا جو کوئی ان میں سرشک افشاں ہو

تس پہ یہ جان بلب آمدہ بھی محزوں ہے
چشمِ اعجاز مژہ سحر نگہ افسوں ہے
اس ستم پر بھی مرا دل اُسی کا ممنوں ہے
گرد نمناک پریشاں شدۂ مجنوں ہے
عکس گل آب میں تکلیفِ مئے گلگوں ہے
مصرعِ نالۂ جگر کاوی ہے گو موزوں ہے
روشِ گریۂ غم حوصلۂ ہاموں ہے

خون ہر ایک رقم شوق سے ٹپکے تھا ولے / وہ نہ سمجھا کہ مرے نامہ کا کیا مضموں ہے

میرؔ کی بات پہ ہر وقت یہ جھنجھلایا نہ کر / سڑی ہے خبطی ہے وہ شیفتہ ہے مجنوں ہے

کہنا ترے منہ پر تو نپٹ بے ادبی ہے / زاہد جو صفت تجھ میں ہے سو زن جلبی ہے

اس دشت میں اے سیل سنبھل ہی کے قدم رکھ / ہر سمت کو یہاں دفن مری تشنہ لبی ہے

ہر اک[1] سے کہا نیند میں پر کوئی نہ سمجھا / شاید کہ مرے حال کا قصہ عربی ہے

عزلت سے نکل شیخ کہ تیرے لئے تیار / کوئی ہفت گزی میخ کوئی دہ وجبی ہے

اے چرخ نہ تو روز سیہ میرؔ پہ لانا / بیچارہ وہ اک نعرہ زن نیم شبی ہے

دو سونپ دود دل کو میرا کوئی نشاں ہے / ہوں میں چراغ کشتہ باد سحر کہاں ہے

بیٹھا جگر سے اپنے کھینچوں ہوں اسکی پیکاں / جینے کی اور سے تو خاطر مری نشاں ہے

روشن ہے جلکے مرنا پروانے کا ولیکن / اے شمع کچھ تو کہہ تو تیرے بھی تو زباں ہے

بھڑکے ہے آتش گل اے ابر تر ترحم / گوشے میں گلستاں کے میرا بھی آشیاں ہے

ہم زمزمہ تو ہو کے مجھ نالہ کش سے چپ رہ / اے عندلیب گلشن تیرا لب و دہاں ہے

کس دور میں اٹھایا مجھ سینہ سوختہ کو / پیوند ہو زمیں کا جیسا یہ آسماں ہے

پیر مغاں سعادت تیری جو ایسا آوے / یہ میرؔ میکشوں میں اک طرز کا جواں ہے

ہمسایہ چمن یہ نپٹ زار کون ہے / نالاں و مضطرب پس دیوار کون ہے

مژگاں بھی پھر گئیں تری بیمار چشم دیکھ / دکھ درد میں سوائے خدا یار کون ہے

نالے جو آج سنتے ہیں سو ہیں جگر خراش / کیا جانئے قفس میں گرفتار کون ہے

آیا نہ آشیانۂ بلبل میں کام بھی / مجھ سا تو خار باغ میں بیکار کون ہے

بازار دہر میں ہے عبث میرؔ عرض مہر / یہاں ایسی جنس کا تو خریدار کون ہے

[1] فیضی ؎ کہ اہل بزم عوامند و گفتگو عربی است ۱۲

مجھ سوز بعد مرگ سے آگاہ کون ہے
شمع مزار میر بجز آہ کون ہے

بیکس ہوں مضطرب ہوں مسافر ہوں بیوطن
دوری راہ بن مرے ہمراہ کون ہے

لبریز جس کے حسن سے مسجد ہی اور دیر
ایسا بتوں کے بیچ وہ اللہ کون ہے

رکھیو قدم سنبھل کے کہ تو جانتا نہیں
مانندِ نقشِ پا یہ سرِ راہ کون ہے

ایسا اسیر خستہ جگر میں سُنا نہیں
ہر آہ میر جس کی ہی جانکاہ کون ہی

دیکھا کروں تجھی کو منظور ہی تو یہ ہے
آنکھیں نہ کھولوں تجھ بن مقدور ہی تو یہ ہی

نزدیک تجھ سے سب ہے کیا قتل کیا جلانا
ہم غمزدوں سے ملنا اک دُور ہی تو یہ ہی

رونے میں دن کٹیں ہیں آہ و فغاں سے راتیں
گر شغل ہے تو یہ ہے مذکور ہی تو یہ ہی

چاک جگر کو میرے بر جا ہے جو کہو تم
گر زخم ہے تو یہ ہے ناسور ہی تو یہ ہی

کہتا ہی کوئی عاشق کوئی کہے ہی خبطی
دُنیا سے بھی نرالا رنجور ہی تو یہ ہی

کیا جانوں کیا کسل ہی واقع میں میر کے تئیں
دو چار روز سے جو مشہور ہی تو یہ ہے

کوئی ہوا نہ روکش ٹک میری چشم تر سے
کیا کیا نہ ابر آکر یہاں روز روز برسے

وحشت ہے میری یارو خاطر نہ جمع رکھیو
پھر آوے یا نہ آوے نو پر اُٹھا جو گھر سے

اب جوں سرشک ان سے پھرنے کی چشم مت رکھ
جو خاک میں ملے ہیں گر کر تری نظر سے

دیدار خواہ اُس کے کم ہوں تو شور کم ہو
ہر صبح اک قیامت اُٹھتی ہی اُسکے در سے

داغ ایک ہو چلا بھی خون ایک ہو بہا بھی
اب بحث کیا ہی دل سے کیا گفتگو جگر سے

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے
بہتر کیا ہی میں نے اس عیب کو ہنر سے

انجام کار بلبل دیکھا ہم اپنی آنکھوں
آوارہ تھے چمن میں دو چار ٹوٹے پر سے

بیطاقتی نے دل کی آخر کو مار رکھا
آفت ہمارے جی کی آئی ہمارے گھر سے

دلکش یہ منزل آخر دیکھا تو راہ نکلی
سب یار جا چکے تھے آئے جو ہم سفر سے

آوارہ میر شاید وہاں خاک ہو گیا ہے
اک گرد اُٹھ چلے ہی گاہ اُس کی رہگذر سے

وعدہ وعید پیارے کچھ تو قرار ہووے
دل کی معاملت ہی کیا کوئی خوار ہووے

فتراک سے نہ باندھے دیکھے نہ تو تڑپنا ۔ کس آرزو پہ کوئی تیرا شکار ہووے
ازبس لہو پیا ہے میں تیرے غم میں گلرو ۔ تربت سے میری شاید حشر بہار ہووے
میں مست مرگیا ہوں کرنا عجب نہ ساقی ۔ گر سنگ شیشہ میرا سنگِ مزار ہووے

اے غیر میر تجھ کو گر جوتیاں نہ مارے
سیّد نہ ہووے پھر تو کوئی چمار ہووے

رہی نہ پختگی عالم میں دور خامی ہے ۔ ہزار حیف کمینوں کا چرخ حامی ہے
نہ اٹھ تو گھر سے اگر چاہتا ہے ہوں مشہور ۔ نگیں جو بیٹھا ہے گڑ کر تو کیسا نامی ہے

ہوئی ہیں فکریں پریشان میر یاروں کی
حواسِ خمسہ کرے جمع سو نظامی[1] ہے

انجامِ دلِ غم کش کوئی عشق میں کیا جانے ۔ کیا جانیے کیا ہوگا آخر کو خدا جانے
وھاں آرسی ہے وہ ہے یھاں سنگ ہے چھاتی ہے ۔ گزرے ہے جو کچھ ہم پر سو اُس کی بلا جانے
ناصح کو خبر کیا ہے لذت سے غمِ دل کی ۔ ہے حق بہ طرف اُس کے چکھے تو مزا جانے
میں خطِ جبیں اپنا یارو کسے دکھلاؤں ۔ قسمت کے لکھے کے تئیں یھاں کون مٹا جانے
بیطاقتیِ دل نے ہم کو نہ کیا رُسوا ۔ ہے عشق سزا اُسکو جو کوئی چھپا جانے
اس مرتبہ ناسازی نبھتی ہے دلا کوئی ۔ کچھ خلق بھی پیدا کرتا خلق بھلا جانے

لیجائیے یہ میر اُس کے دروازہ کی مٹی بھی
اس دردِ محبت کی جو کوئی دوا جانے

[1] نظامی گنجوی (ایران) ۵۳۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۹۶ھ میں وفات پائی۔ انھوں نے پانچ مثنویاں لکھیں جن خمسۂ نظامی کے نام سے مشہور ہیں ان میں سے ہر ایک مثنوی کسی خاص فرمائش اور خاص محل پر لکھی گئی۔ چنانچہ خسرو شیریں طغرل ارسلان سلجوقی کے نام پر لکھی اور اُس کے جائزہ میں چودہ ۱۴ گاؤں ملے اور مخزن اسرار بہرام شاہ کے نام پر لکھی اور اُس نے صلہ میں پانچہزار اشرفیاں اور ایک قطار شتر مختلف مال و متاع سے بھرے ہوئے پیش کئے۔ اس وقت ان کا سن تقریباً ۲۵ سال کا تھا۔ اسی طرح لیلیٰ مجنوں منوچہر کے حکم سے ۵۸۴ھ میں تمام کی۔ اسی طرح ہفت پیکر سلطان غیاث الدین کرب ارسلان علاء الدین آقسنقری کی فرمائش سے اور سکندر نامہ کو اپنے شوق سے لکھا مگر ابوبکر نصرۃ الدین کے نام موسوم کیا۔ میر تقی مرحوم نے اسی خمسہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ ہمارے زمانہ میں یہ حال ہے کہ جو حواس خمسہ جمع کرلے وہی نظامی ہے۔ آسی

سنتے ہو روتے دیکھ کر غم سے
چھیڑ رکھی ہے تم نے کیا ہم سے

مند گئی آنکھ ہی اندھیرا پاک
روشنی ہی سو یعنی مردم سے

تم جو دل خواہ خلق ہو ہم کو
دشمنی ہے تمام عالم سے

در ہی آگئی مزاجوں میں
آخر ان گیسوان درہم سے

سب نے جانا کہیں یہ عاشق ہی
بہ گئے اشک دیدۂ نم سے

منفعت یوں ہاتھ سے نہ کھو ہم کو
کہیں پیدا بھی ہوتے ہیں ہم سے

قطعہ

اکثر آلات جور اس سے ہوئے
آفتیں آئیں اس کے مقدم سے

دیکھ وے پلکیں برچھیاں چلیاں
تیغ نکلی اس ابروئے خم سے

قطعہ

کوئی بیگانہ گر نہیں موجود
منہ چھپانا یہ کیا ہی پھر ہم سے

وجہ پردے کی پوچھئے بارے
ملئے اس کے کسو جو محرم سے

درپئے خون میر ہی نہ رہو
ہو بھی جاتا ہے جرم آدم سے

نالۂ عجز نقص الفت ہے
رنج و محنت کمال راحت ہے

عشق ہی گریہ ندامت ہے
ورنہ عاشق کو چشم خفت ہے

تا دم مرگ غم خوشی کا نہیں
دل آزردہ گر سلامت ہے

دل میں ناسور پھر جدھر چاہے
ہر طرف کوچہ جراحت ہے

رونا آتا ہے دم بدم شاید
کسو حسرت کی دل سے رخصت ہے

فتنے رہتے ہیں اس کے سایہ میں
قد و قامت ترا قیامت ہے

نہ تجھے رحم نے اسے ٹک صبر
دل پہ میرے عجب مصیبت ہے

قطعہ

تو تو نادان ہے نپٹ ناصح
کب موثر تری نصیحت ہے

دل پہ جب میرے آکے یہ ٹھہرا
کہ مجھے خوش دلی اذیت ہے

رنج و محنت سے باز کیونکہ رہوں
وقت جاتا رہے تو حسرت ہے

کیا ہی پھر کوئی دم کو کیا جانو
دم غنیمت میاں جو فرصت ہے

قطعہ

تیرا شکوہ مجھے نہ میرا تجھے
چاہئے یوں جو فی الحقیقت ہے

تجھ کو مسجد ہی مجھ کو میخانہ
واعظا اپنی اپنی قسمت ہے

ایسے ہنس مکھ کو شمع سے تشبیہ
شمع مجلس کی رونی صورت ہے

باطل السحر دیکھ باطل ہے
تیری آنکھوں کا سحر آفت ہے

ابر تر کے حضور پھوٹ بہا
دیدۂ تر کو میرے رحمت ہے

کیا ہوا گر غزل قصیدہ ہوئی
عاقبت قصۂ محبت ہے

قطعہ

تربت میر پر ہیں اہل سخن
ہر طرف حرف ہے حکایت ہے

تو بھی تقریب فاتحہ سے چل
بخدا واجب الزیارت ہے

پھر اس سے طرح کچھ جو دعوے کی سی ڈالی ہے
کیا تازہ کوئی گل نے اب شاخ نکالی ہے

سچ پوچھو تو کب ہے گا اس کا سا دہن غنچہ
تسکیں کے لیے ہم نے اک بات بنالی ہے

دیہی کو نہ کچھ پوچھو اک بھرت کا ہے گڑوا
ترکیب سے کیا کہیے سانچے میں کہ ڈھالی ہے

ہم قد خمیدہ سے آغوش ہوئے سارے
پر فائدہ تجھ سے تو آغوش وہ خالی ہے

عزت کی کوئی صورت دکھلائی نہیں دیتی
چپ رہیے تو چشمک ہے کچھ کہیے تو گالی ہے

دو گام کے چلنے میں پامال ہوا عالم
کچھ ساری خدائی سے وہ چال نرالی ہے

ہے گی تو دو سالہ پر ہے دختر رز آفت
کیا پیر مغاں نے بھی اک چھوکری پالی ہے

خونریزی میں ہم سوں کی جو خاک برابر ہیں
کب سر تو فرو لایا ہمت تری عالی ہے

جب سر چڑھے ہوں ایسے تب عشق کریں سو بھی
جوں توں یہ بلا سر سے فرہاد نے ٹالی ہے

ان مغبچوں میں زاہد پھیر زدہ مت آنا
مندیل تری اب کے ہم نے تو بچالی ہے

کیا میر تو روتا ہے پامالی دل ہی کو
ان لونڈوں نے تو دلی سب سر پہ اٹھالی ہے

ناز چمن وہی ہے بلبل سے گو خزاں ہے
ٹہنی جو زرد بھی ہے سو شاخ زعفراں ہے

گر اس چمن میں وہ بھی اک ہی لب و دہاں ہے
لیکن سخن کا تجھ سے غنچے کو منھ کہاں ہے

ہنگام جلوہ اس کے مشکل ہے ٹھہرے رہنا
چتون ہے دل کی آفت چشمک بلائے جاں ہے

پتھر سے توڑنے کے قابل ہے آرسی تو
پر کیا کریں کہ پیارے منھ تیرا درمیاں ہے

باغ و بہار ہے وہ میں کشت زعفراں ہوں
جو لطف اک ادھر ہے تو یہاں بھی کساں ہے

ہر چند ضبط کریے چھپتا ہے عشق کوئی
گزرے ہے دل پہ جو کچھ چہرے ہی سے عیاں ہے

اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض
اوّل تو میں سند ہوں پھر یہ مری زباں ہے

عالم میں آب و گل کا ٹھہراؤ کس طرح ہو
گر خاک ہے اُڑے ہے اور آب ہے رواں ہے

چرچا رہیگا اس کا تا حشر میکشاں میں
خونریزی کی ہماری رنگین داستاں ہے

از خویش رفتہ اُس بن رہتا ہے میر اکثر
کرتے ہو بات کس سے وہ آپ میں کہاں ہے

تیرا خرام دیکھے تو جا سے نہ ہل سکے
کیا جی تدرو کا جو ترے آگے چل سکے

اس دل جلے کی تاب کے لانے کو عشق ہے
فانوس کی سی شمع جو پردے میں جل سکے

کہتا ہے کون تجھ کو کہ اے سینہ رُک نہ جا
اتنا تو ہو کہ آہ جگر سے نکل سکے

گر دو پہر کو اُس کو نکلنے دے ناز کی
حیرت سے آفتاب کی پھر دن نہ ڈھل سکے

کیا اس غریب کو ہو سرِ سایۂ ہما
جو اپنی بے دماغی سے مکھی نہ جھل سکے

ہے جائے حیف بزم جہاں مل لے اے پتنگ
اپنے اُپر جو کوئی گھڑی ہاتھ مل سکے

کس کو ہے آرزوئے افاقت فراق میں
ایسا تو ہو کہ کوئی گھڑی جی سنبھل سکے

مت بہ چشمِ کم سے مری چشم تر کو دیکھ
چشمہ ہے یہ وہ جس سے کہ دریا اُبل سکے

کہتا ہے وہ تو ایک کی دس میر کم سخن
اُس کی زباں کے عہدے سے کیونکر نکل سکے

تغییرِ قافیہ سے یہ طرحی غزل کہوں
تا جس میں زور کچھ تو طبیعت کا چل سکے

خورشید تیرے چہرہ کے آگو نہ آ سکے
اُس کو جگر بھی شرط ہے جو تاب لا سکے

ہم گرم رو ہیں راہ فنا کے شرر صفت
ایسے نہ جائیں گے کہ کوئی کھوج پا سکے

غافل نہ رہیو آہ ضعیفوں سے سرکشاں
طاقت ہے اُس کو یہ کہ جہاں کو جلا سکے

میرا جو بس چلے تو منادی کیا کروں
تا اب سے دل نہ کوئی کسو سے لگا سکے

تدبیر جیب پارہ نہیں کرتی فائدہ
ناصح جگر کا چاک سلا جو سلا سکے

اس کا کمال چرخ پہ سر کھینچتا نہیں
اپنے تئیں جو خاک میں کوئی ملا سکے

یہ تیغ ہے یہ طشت ہے یہ تو ہے بوالہوس
کھانا تجھے حرام ہے جو زخم کھا سکے

اس رشک آفتاب کو دیکھے تو شرم سے
ماہِ فلک نہ شہر میں منہ کو دکھا سکے

کیا دلفریب جائے ہے آفاق ہمنشیں
دو دن کو یہاں جو آئے سو برسوں جا سکے ق

مشعر ہے اس پہ مردن دشوار رفتگاں
یعنی جہاں سے دل کو نہ آساں اٹھا سکے

بدلوں گا اس غزل کے بھی میں قافیہ کو میر
پھر فکر کو نہ عہدے سے اُس کے برآ سکے

کیا غم میں ویسے خاک فتادہ سے ہو سکے
دامن پکڑ کے یار کا جو ٹک نہ رو سکے

ہم ساری ساری رات رہے گریہ ناک لیک
مانند شمع داغ جگر کا نہ دھو سکے

رونا تو ابر کا سا نہیں یار جانتے
اتنا تو روئیے کہ جہاں کو ڈبو سکے

برسوں ہی منتظر سر رہ پر ہمیں ہوئے
اس قسم کا تو صبر کسو سے نہو سکے

رہتی ہے ساری رات مردم سے چہل میر[۱۵]
نالہ رہے تو کوئی محلے میں کسو سکے

آتش کے شعلے سر سے ہمارے گزر گئے
بس اے تپ فراق کہ گرمی میں مر گئے

منزل نہ کر جہاں کو کہ ہم نے سفر سے آہ
جنکا کیا سراغ سنا دے گزر گئے

مشتِ نمک سے بھی تو کبھو یاد کر ہمیں
اب داغ کھاتے کھاتے فلک جی تو بھر گئے

ناصح نہ روویں کیونکہ محبت کے جی کو ہم
اے خانماں خراب ہمارے تو گھر گئے

تلوار آپ کھینچیے حاضر ہے یہاں بھی سر
بس عاشقی کی ہم نے جو مرنے سے ڈر گئے

کردیں گے آسمان و زمیں ایک حشر کو
اُس معرکہ میں یار جی ہم بھی اگر گئے

یہ راہ و رسم دل شدگاں گفتنی نہیں
جانے دے میر صاحب و قبلہ جدھر گئے قطعہ

روز وداع اُسکی گلی تک تھے ہم بھی ساتھ
جب درد مند ہم کو وے معلوم کر گئے

گر یک نگاہِ یاس کی ٹپ سے رو دیا
پھر ہم ادھر کو آئے میاں وے اُدھر گئے

دن کو نہیں ہے چین نہ ہے خواب شب مجھے
مرنا پڑا ضرور ترے غم میں اب مجھے

ہنگامہ میری نعش پہ تیری گلی میں ہے
لیجائیں گے جنازہ کشاں یہاں سے کب مجھے

ٹک داد میری اہل محلہ سے چاہیو
تجھ بن خراب کرتے رہے ہیں یہ سب مجھے

طوفاں بجائے اشک ٹپکتے تھے چشم سے
اے ابر تر دماغ تھا رونے کا جب مجھے

دو[۲] حرف اُس کے منہ کے تو لکھ بھیجیو شتاب
قاصد چلا ہے چھوڑ کے تو جان بلب مجھے

۱۵؎ اسی طرح جو گریہ روتا رہیگا ؎ تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہیگا ۱۲ میر

قطعہ

کچھ ہے جواب جو میں کروں حشر کو سوال | مارا تھا تو نے جان سے کہہ کس سبب مجھے
غیر از خموش رہنے گئے ہونٹھوں کے سوکھنے | لیکن نہیں ہے یار جھگڑنے کا ڈھب مجھے

پوچھا تھا راہ جاتے کہیں ان نے میر کو
آتا ہے اُس کی بات کا اب تک عجب مجھے

قطعہ

کاتب کہاں فراغ جواب شکوہ لکھائیے | بس ہے یہ ایک حرف کہ مشتاق جانیے
غیروں کا ساتھ موجب صد وہم ہے بتاں | اس امر میں خدا بھی کہے تو نہ مانیے
شب خواب کا لباس ہے عریاں تنی میں یہ | جب سوئیے تو چادر مہتاب تانیے
اپنا یہ اعتقاد ہے تجھ جستجو میں یار | لے اس سرے سے اُس سرے تک خاک چھانیے
پھر یا نصیب یہ بھی ہے طالع کی یاوری | مر جائیں ہم تو اس پہ بھی ہم کو نہ جانیے

لوٹے ہے خاک و خون میں غیروں کے ساتھ میر
ایسے تو نیم کشتہ کو ان میں نہ سانیے

مرے اس رُک کے مر جانے سے وہ غافل ہے کیا جانے
گزرنا جان سے آساں بہت مشکل ہے کیا جانے

کوئی سر سنگ سے مارو کسی کا واں نہیں دم ہو
وہ آئینے میں اپنے ناز بر مائل ہے کیا جانے

نظر مطلق نہیں ہجراں میں اس کو حال پر میرے
مرا دل اُس کے غم میں گویا اس کا دل ہے کیا جانے

جنونی خبطی دیوانہ سڑی کوئی عشق کو سمجھے
فلاطوں سے نہیں یہاں بحث وہ عاقل ہے کیا جانے

تڑپنا نقش پائے ناقہ پر جانے ہے اک مجنوں
بیاباں میں وہ لیلی کا کدھر محمل ہے کیا جانے

پڑھایا اُس کو بہتیرا کہ مت لا رازِ دل منھ پر
پہ طفلِ اشک کو دیکھا تو ناقابل ہے کیا جانے

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن سے
یونہیں سودا کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

کب تلک جی رکے خفا ہووے
آہ کریے کہ ٹک ہوا ہووے

جی ٹھہر جائے یا ہوا ہووے
دیکھیے ہوتے ہوتے کیا ہووے

کاہشِ دل کی کیجیے تدبیر
جان میں کچھ بھی جو رہا ہووے

چپ کا باعث ہے بے تمنائی
کہیے کچھ بھی تو مدعا ہووے

بے کلی مارے ڈالتی ہے نسیم
دیکھیے اب کے سال کیا ہووے

مر گئے ہم تو مر گئے تو جیے
دل گرفتہ تری بلا ہووے

عشق کیا ہے درست اے ناصح
جانے وہ جس کا دل لگا ہووے

پھر نہ شیطاں سجود آدم سے
شاید اس پردے میں خدا ہووے

نہ سنا رات ہم نے اک نالہ
غالباً میر مر رہا ہووے

کچھ تو کہہ وصل کی پھر رات چلی جاتی ہے
دن گزر جائیں ہیں پر بات چلی جاتی ہے

رہ گئے گاہ تبسم پہ گہے بات ہی پر
بارے اے ہمنشیں اوقات چلی جاتی ہے

ٹک تو وقفہ بھی کر اے گردشِ دوراں کہ یہ جان
عمر کے حیف ہے کیا سات چلی جاتی ہے

یھاں تو آتی نہیں شطرنج زمانہ کی چال
اور وھاں بازی ہوئی مات چلی جاتی ہے

روز آنے پہ نہیں نسبت عشقی موقوف
عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے

خرقہ مندیل در دامست لئے جاتے ہیں
شیخ کی ساری کرامات چلی جاتی ہے

قطعہ

ہے موذن جو بڑا مرغ مصلی اس کی
مستوں سے ٹوک ہی کی بات چلی جاتی ہے

پانوں رکتا نہیں مسجد سے دمِ آخر بھی
مرنے پر آیا ہے پر لات چلی جاتی ہے

ہر سحر درپئے آرامِ مے آشاماں ہے
مکر و طامات کی اک گھات چلی جاتی ہے

ایک ہم ہی سے تفاوت ہے سلوکوں میں میر
یوں تو اوروں کی مدارات چلی جاتی ہے

منصف جو تو ہے کب تئیں یہ دکھ اٹھائیے
کیا کیجے میری جان اگر مر نہ جائیے

اظہار رازِ عشق کئے بن رہے نہ اشک
اس طفل ناسمجھ کو کہاں تک پڑھائیے

تم نے جو اپنے دل سے بھلایا ہمیں تو کیا
اپنے تئیں تو دل سے ہمارے بھلائیے

فکر معاش یعنی غمِ زیست تا بہ کے
مر جائیے کہیں کہ ٹک آرام پائیے

جاتے ہیں کیسی کیسی لئے دل میں حسرتیں
ٹک دیکھنے کو جاں بلبوں کے بھی آیئے

لوٹوں ہوں جیسے خاک چمن پر میں اے اسیر
گل کو بھی میری خاک پہ ونہی لٹایئے

پہنچا تو ہوگا سمع مبارک میں حال میر
اس پر بھی جی میں آوے تو دل کو لگایئے

نہیں وسواس جی گنوانے کے
ہائے رے ذوق دل لگانے کے

میرے تغیر حال پر مت جا
اتفاقات ہیں زمانے کے

دم آخر ہی کیا نہ آنا تھا
اور بھی وقت تھے بہانے کے

اس کدورت کو ہم سمجھتے ہیں
ڈھب ہیں یہ خاک میں ملانے کے

بس ہیں دو برگ گل قفس میں صبا
نہیں بھوکے ہم آب و دانے کے

مرنے پر بیٹھے ہیں سنو صاحب
بندے ہیں اپنے جی جلانے کے

اب گریباں کہاں کہ اے ناصح
چڑھ گیا ہاتھ اس دوانے کے

چشم انجم سپہر جھپکی ہے
صدقے اس انکھڑیاں لڑانے کے

دل و دین ہوش و صبر سب ہی گئے
آگے آگے تمھارے آنے کے

کب تو سوتا تھا گھر مرے آکر
جاگے طالع غریب خانے کے

قطعہ

مژہ ابرو نگہ سے اس کی میر
کشتہ ہیں اپنے دل لگانے کے

تیر و تلوار و سیل یکجا ہیں
سارے اسباب مار جانے کے

کم فرصتی گل جو کہیں کوئی نہ مانے
ایسے گئے ایام بہاراں کہ نہ جانے

تھے شہر میں اے رشک پری جتنے سیانے
سب ہو گئے ہیں شور ترا سن کے دوانے

ہمراہ جوانی گئے ہنگامے اٹھانے
اب ہم بھی نہیں وے رہے نے وے ہیں زمانے

پیری میں جو باقی نہیں جامے میں تو کیا دور
پھٹنے لگے ہیں کپڑے جو ہوتے ہیں پرانے

مرتے ہی سنے ہم نے کسلمند محبت
اس ورد میں کس کس کو کیا نفع دوا نے

ہے کس کو میسر تری زلفوں کی اسیری
شانہ کے نصیبوں میں تھے یوں ہاتھ بندھانے

ٹک آنکھ بھی کھولی نہ زخود رفتہ نے اس کے
ہر چند کیا شور قیامت نے سرہانے

لوہے کے توے ہیں جگر اہل محبت
رہتے ہیں ترے تیر ستم ہی کے نشانے

کاہیکو یہ انداز تھا اعراضِ بتاں کا　　ظاہر ہے کہ منھ پھیر لیا ہم سے خدا نے
ان ہی چمنوں میں کہ جنھوں میں نہیں اب چھاؤں　　کن کن روشوں ہم کو پھرایا ہے ہوا نے
کب کب مری عزت کے لئے بیٹھے ہو ٹک پاس　　آئے بھی جو ہو تو مجھے مجلس سے اٹھانے
پایا ہے نہ ہم نے دلِ گم گشتہ کو اپنے　　خاک اسکی سرِ راہ کی کوئی کب تئیں چھانے
کچھ تم کو ہمارے جگروں پر بھی نظر ہے　　آتے جو ہو ہر شام و سحر تیر لگانے
مجروح بدن سنگ سے طفلاں کے نہ ہوتے　　کم جاتے جو اُس کوچہ میں پر ہم تھے دوانے
آنے میں تعلل ہے کیا عاقبت کار　　ہم جی سے گئے پر نہ گئے اُس کے بہانے

گلیوں میں بہت ہم تو پریشاں سے پھرے ہیں
اوباش کسو روز لگا دیں گے ٹھکانے

تن ہجر میں اس یار کے رنجور ہوا ہے　　بیطاقتی دل کو بھی مقدور ہوا ہے
پہنچا نہیں کیا سمع مبارک میں مرا حال　　یہ قصہ تو اس شہر میں مشہور ہوا ہے
بیخوابی تری آنکھوں پہ دیکھوں ہوں مگر رات　　افسانہ مرے حال کا مذکور ہوا ہے
کل صبح ہی مستی میں سرِ راہ نہ آیا　　یہاں آج مرا شیشۂ دل چور ہوا ہے
کیا سوجھے اُسے جس کی ہو یوسف ہی نظر میں　　یعقوب بجا آنکھوں سے معذور ہوا ہے
پرشور سے ہے عشق مغنی پسراں کے　　یہ کاسۂ سر کاسۂ طنبور ہوا ہے
تلوار لئے پھرنا تو اب اُس کا سنا ہیں　　نزدیک مرے کب کا یہ سر دُور ہوا ہے
خورشید کی محشر میں کلیش ہو گی کہاں تک　　کیا ساتھ مرے داغوں کے محشور ہوا ہے
اے رشکِ سحر بزم میں لے منھ پہ نقاب اب　　اک شمع کا چہرہ ہے سو بے نور ہوا ہے

اُس شوق کو ٹک دیکھ کہ چشمِ نگراں ہے
جو زخم جگر کا مرے ناسور ہوا ہے

چل قلم غم کی رقم کوئی حکایت کیجے　　ہر سر حرف پہ فریاد نہایت کیجے
گو کہ یہ خاک قدم پر ترے لوٹے اس میں　　اپنا شیوہ ہی نہیں یہ کہ شکایت کیجے
ہم جگر سوختہ کے جی میں جو آوے تو ابھی　　دود دل ہو کے فلک تجھ میں سرایت کیجے
عشق میں آپ کے کریے نہ ہماری تو مگر　　عوض جور و جفا ہم پہ عنایت کیجے

سلہ پہنچا تو ہو گا سمع کا مبارک میں حال میر　　اس پر بھی جی میں آوے تو دل کو لگا ہیے ۲ میر

مت چلا عشق کی رہ کی کہوں یہاں خضر
آپھی گمراہ ہیں ہم کس کو ہدایت کیجے

کس کے کہنے کو ہے تاثیر کہ اک میر ہی سے
رمز و ایماؤ اشارات و کنایت کیجے

دل جو پُر بیقرار رہتا ہے
آجکل مجھ کو مار رہتا ہے

ترے بن دیکھے میں مکدر ہوں
آنکھوں پر اب غبار رہتا ہے

جبر یہ ہے کہ تیری خاطر دل
روز بے اختیار رہتا ہے

دل کو مت بھول جانا میرے بعد
مجھ سے یہ یادگار رہتا ہے

دور میں چشم مست کے تیرے
فتنہ بھی ہوشیار رہتا ہے

بسکہ تیرا ہوا بلا گرداں
سر کو میرے دوار رہتا ہے

ہر گھڑی رنجش ایسی باتوں میں
کوئی اخلاص و پیار رہتا ہے

تجھ بن آئے ہیں تنگ جینے سے
مرنے کا انتظار رہتا ہے

دل کو گو ہاتھ میں رکھو اب تم
کوئی یہ بیقرار رہتا ہے

غیرت مت کھا فریب خلق اس کا
کوئی دم میں وہ مار رہتا ہے

دلبر و دل پرائے ہو ہر دم
یوں کہیں اعتبار رہتا ہے

کیونکہ ہووے عزیز دلہا میر
کس کے کوچے میں خوار رہتا ہے

دہر بھی میر طرفہ مقتل ہے
جو ہے سو کوئی دم کا فیصل ہے

کثرت غم سے دم لگا رکنے
حضرت دل میں آج دنگل ہے

روز کہتے ہیں چلنے کو خوباں
لیکن اب تک تو روز اول ہے

چھوڑ مت نقد وقت نسیہ پر
آج جو کچھ ہے سو کہاں کل ہے

بند ہو تجھ سے یہ کھلا نہ کبھو
دل ہے یا خانۂ مقفل ہے

سینہ چاکی بھی کام رکھتی ہے
یہی گر جب تلک معطل ہے

قطعہ

ابھی ہاتھوں میں شوق کے تیرے
دامن بادیہ کا آنچل ہے

ٹک گریباں میں سر کو ڈال کے دیکھ
دل بھی کیا لق و دق جنگل ہے

ہجر باعث ہے بدگمانی کا
غیرت عشق ہے تو کب کل ہے

مر گیا کوہکن اسی غم میں
آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے

جانگداز اتنی کہاں آوازِ عود و چنگ ہی
دل کے نالوں کا ان پردوں میں کچھ آہنگ ہے

رُو و خال و زلف سے ہیں سنبل و سبزہ و گل
آنکھیں ہوں تو یہ چمن آئینۂ نیرنگ ہے

بیستوں کھودے سے کیا آخر ہوئی سب کارِ عشق
بعد ازاں اے کوہکن سر ہی ترا اور سنگ ہے

آہ ان خوش قامتوں کو کیونکہ بر میں لائیے
جن کے ہاتھوں سے قیامت پر بھی عرصہ تنگ ہے

عشق میں وہ گھر ہی اپنا جس میں ہے مجنوں یہ ایک
ناخلف سارے قبیلہ کا ہمارے ننگ ہے

چشمِ کم سے دیکھ مت قمری تو اس خوش قد کو ٹک
آہ بھی سروِ گلستانِ شکست رنگ ہے

ہم سے تو جایا نہیں جاتا کہ یکسر دل میں وہاں
دو قدم اُسکی گلی کی راہ سو فرسنگ ہے

ایک بوسے پر تو کی ہی صلح پر اے زود رنج
تجھ کو مجھ کو اتنی اتنی بات اوپر جنگ ہے

پانوں میں چوٹ آنے کے پیارے بہانے جانے دے
پیشِ رفت آگے ہمارے کب یہ عذرِ لنگ ہے

قطعہ

فکر کو نازک خیالوں کی کہاں پہنچے ہیں یار
ورنہ ہر مصرع یہاں معشوق شوخ و شنگ ہے

سرسری کچھ سن لیا پھر واہ وا کر اُٹھ گئے
شعر یہ کم فہم سمجھے ہیں خیال بنگ ہے

صبر بھی کرئے بلا پر میر صاحب جی کبھو
جب نہ تب رونا ہی کڑھنا یہ بھی کوئی ڈھنگ ہے

خنجر بکف وہ جب سے سفاک ہو گیا ہی
ملک ان ستمزدوں کا سب پاک ہو گیا ہی

جس سے اسے لگاؤ (ا) رد کھا ہی ہو ملے ہے
سینے میں جل کر از بس دل خاک ہو گیا ہی

کیا جانوں لذتِ درد اس کی جراحتوں کی
یہ جانوں ہوں کہ سینہ سب چاک ہو گیا ہی

صحبت سے اس جہاں کی کوئی خلاص ہوگا
اس فاحشہ پہ سب کو امساک ہو گیا ہی

دیوار کہنہ ہی یہ مت بیٹھ اس کے سایہ
اُٹھ چل کہ آسماں تو سکا واک ہو گیا ہی

شرم و حیا کہاں کی ہر بات پر ہی شمشیر
اب تو بہت وہ ہم سے بے باک ہو گیا ہی

زیرِ فلک بھلا تو رووے ہی آپ کو میر
کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہو گیا ہی

ساقی گھر چاڑ ول اور آیا ہے
دے بھی مے ابر زور آیا ہے

غارت دل کرے ہی ابر سیاہ
بے طرح گھر میں چور آیا ہے

آج تیری گلی سے ظالم میر
لوہو میں شور بور آیا ہے

فقیرانہ آئے صدا کر چلے | میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم | سو اس عہد کو اب وفا کر چلے
شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی | کہ مقدور تک تو دوا کر چلے
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے | ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے
کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ | سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے
بہت آرزو تھی گلی کی تری | سو یہاں سے لہو میں نہا کر چلے
دکھائی دئے یوں کہ بیخود کیا | ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے
قطعہ
جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی | حق بندگی ہم ادا کر چلے
پرستش کی یہاں تک کہ اے بت تجھے | نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے
قطعہ
جھڑے پھول جس رنگ گلبن سے یوں | چمن میں جہاں کے ہم آ کر چلے
نہ دیکھا غم دوستاں شکر ہے | ہمیں داغ اپنا دکھا کر چلے
قطعہ
گئی عمر در بند فکر غزل | سو اس فن کو ایسا برا کر چلے

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

اپنا سر شوریدہ تو وقف خم چوگان ہے
آ بلہوس گر ذوق ہے یہ گو ہے یہ میدان ہے

عالم مری تقلید سے خواہش تری کرنے لگا
میں تو پشیماں ہو چکا لوگوں کو اب ارمان ہے

ہر چند بیش از بیش ہے شوق تو رونیکا تجھے
پر دیدۂ نمناک بھی اے ابر تر طوفان ہے

اس بیدمی میں بھی کبھو دل بھر اٹھے ہے دم ترا
آٹک شتابی بے وفا اب تک تو مجھ میں جان ہے

ہر لحظہ خنجر درمیاں ہر دم زباں زیر زباں
وہ طور وہ اسلوب ہے یہ عہد یہ پیمان ہے

۱؎ ایک سا ہم ہیں جو ہوئے ایسے پشیمان کہ بس + ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارمان ہونگے ۱۲

اس آرزوئے وصل نے مشکل کیا جینا مرا
ورنہ گزرنا جان سے اتنا نہیں آسان ہے

بس بیوقاری ہوچکی گلیوں میں خواری ہوچکی
اب پاس کر ٹک میر کا دو چار دن مہمان ہے

خوب تھے وے دن کہ ہم تیرے گرفتاروں میں تھے
غمزدوں، اندوہ گینوں، ظلم کے ماروں میں تھے

دشمنی جانی ہے اب تو ہم سے غیروں کے لئے
اک سماں سا ہوگیا وہ بھی کہ ہم یاروں میں تھے

مت تبختر سے گزر قمری ہماری خاک پر
ہم بھی اک سروِ رواں کے ناز برداروں میں تھے

مرگئے لیکن نہ دیکھا تو نے اودھر آنکھ اٹھا
آہ کیا کیا لوگ ظالم تیرے بیماروں میں تھے

گرچہ جرمِ عشق غیروں پر بھی ثابت تھا ولے
قتل کرنا تھا ہمیں ہم ہی گنہگاروں میں تھے

اک رہا مژگاں کی صف میں ایک کے ٹکڑے ہوئے
دل جگر جو میر دونوں اپنے غمخواروں میں تھے

جس جگہ دورِ جام ہوتا ہے
وھاں یہ عاجز مدام ہوتا ہے

ہم تو اک حرف کے نہیں ممنون
کیسا خط و پیام ہوتا ہے

تیغ ناکاموں پر نہ ہر دم کھینچ
اک کرشمہ میں کام ہوتا ہے

پوچھ مت آہ عاشقوں کی معاش
روز ان کا بھی شام ہوتا ہے

زخم بن، غم بن اور غصہ بن
اپنا کھانا حرام ہوتا ہے

شیخ کی سی ہی شکل ہے شیطان
جس پہ شب احتلام ہوتا ہے

میر صاحب بھی اُس کے ہاں تھے پر[1]
جیسے کوئی غلام ہوتا ہے

[1] میر صاحب بھی اُس کے ہاں تھے لیک ؛ بندۂ زر خریدہ کے مانند ۱۲ امیر

بیتابیوں میں تنگ ہم آئے ہیں جان سے
وقتِ شکیب خوش کہ گیا درمیان سے

ہم خامشوں کا ذکر تھا شب اُسکی بزم میں
نکلا نہ حرفِ خیر کسو کی زبان سے

آبِ خضر سے بھی نہ گئی سوزشِ جگر
کیا جانئے یہ آگ ہے کس دودمان سے

جز عشق جنگ دہر سے مت پڑھ کہ خوش ہیں ہم
اس قصے کی کتاب میں اس داستان سے

آنے کا اس چمن میں سبب بیکلی ہوئی
جوں برق ہم تڑپ کے گرے آشیان سے

اب چھیڑ یہ رکھی ہے کہ عاشق ہے تو کہیں
القصہ خوش گزرتی ہے اس بدگمان سے

داغوں سے ہے چمن جگر میر دہر میں
اُن نے بھی گل بہت چنے اس گلستان سے

چاک پر چاک ہوا جوں جوں سلایا ہم نے
اس گریباں ہی سے اب ہاتھ اُٹھایا ہم نے

حسرتِ لطفِ عزیزانِ چمن جی میں رہی
سر پہ دیکھا نہ گل و سرو کا سایا ہم نے

جی میں تھا عرش پہ جا باندھئے تکیہ لیکن
بسترا خاک ہی میں اب تو بچھایا ہم نے

بعد یک عمر کہیں تم کو جو تنہا پایا
ڈرتے ڈرتے ہی کچھ احوال سنایا ہم نے

یھاں فقط ریختہ ہی کہنے نہ آئے تھے ہم
چار دن یہ بھی تماشا سا دکھایا ہم نے

بارے کل باغ میں جا مرغِ چمن سے ملکر
خوبیِ گل کا مزا خوب اُڑایا ہم نے

تازگی داغ کی ہر شام کو بے ہیچ نہیں
آہ کیا جانئے دیا کس کا بجھایا ہم نے

دشت و کہسار میں سر مارکے چندے تجھ بن
قیس و فرہاد کو پھر یاد دلایا ہم نے

بےکلی سے دلِ بیتاب کی مر گزرے تھے
سو تہِ خاک بھی آرام نہ پایا ہم نے

یہ ستم تازہ ہوا اور کہ پائیز میں میر
دل خس و خار سے ناچار لگایا ہم نے

ظالم کہیں تو مل کبھو دارو پیئے ہوئے
پھرتے ہیں ہم بھی ہاتھ میں سر کو لئے ہوئے

آؤگے ہوش میں تو ٹک اک سدھ بھی لیجئو
اب تو نشے میں جاتے ہو زخمی سے کئے ہوئے

جی ڈوبتا ہے اُس گہرِ تر کی یاد میں
پایاں کارِ عشق میں ہم مر جیتے ہوئے

سی چاکِ دل کہ چشم سے ناصح لہو تھمے
ہوتا ہے کیا ہمارے گریباں سیئے ہوئے

کافر ہوئے بتوں کی محبت میں میر جی
مسجد میں آج آئے تھے قشقہ دیئے ہوئے

کرو توکل کہ عاشقی میں نہ یوں کروگے تو کیا کروگے
الم جو یہ ہے تو دردمندو کہاں تلک تم دوا کروگے

جگر میں طاقت کہاں ہے اتنی کہ دردِ ہجراں سے مرتے رہیے
ہزار وں وعدے وصال کے تھے کوئی بھی جیتے وفا کروگے

جہاں کی مسلخ تمام حیرت نہیں ہے تس پر نگہ کی فرصت
نظر پڑے گی بسانِ بسمل کبھو جو مژگاں کو وا کروگے

اخیر الفت یہی نہیں ہے کہ جل کے آخر ہوئے پتنگے
ہوا جو یہاں کی یہ ہے تو یارو غبار ہو کر اُڑا کروگے

بلا ہے ایسا طپیدنِ دل کہ صبر اس پر ہے سخت مشکل
دماغ اتنا کہاں رہے گا کہ دست بردل رہا کروگے

عدم میں ہم کو یہ غم رہیگا کہ اوروں پر اب ستم رہیگا
تمھیں تو لت ہے ستانے ہی کی کسو پر آخر جفا کروگے

اگرچہ اب تو خفا ہو لیکن موئے گئے پر کبھو ہمارے
جو یاد ہم کو کروگے پیارے تو ہاتھ اپنے ملا کروگے

سحر کو محرابِ تیغِ قاتل کبھو جو یارو ادھر ہو مائل
تو ایک سجدہ بسانِ بسمل مری طرف سے ادا کروگے

غمِ محبت سے میرؔ صاحب بہ تنگ ہوں میں فقیر ہو تم
جو وقت ہوگا کبھو مساعد تو میرے حق میں دعا کروگے

قطعہ

لو کہ ہو سوئے باغ نکلے ہے | باؤ سے اک دماغ نکلے ہے
ہے جو اندھیر شہر میں خورشید | دن کو لیکر چراغ نکلے ہے
جو بکاری ہی سے رہیگا شیخ | اب تو لیکر چماغ[1] نکلے ہے
دے ہے جنبش جو وھاں کی خاک کو باد | جگر داغ داغ نکلے ہے
ہر سحر حادثہ مری خاطر | بھر کے خون کا ایاغ نکلے ہے

[1] چماغ بروزن براق سر کج عصا جس کو ہانڈی کھتے ہیں ۱۲

اُس گلی کی زمین تفتہ سے دل جلوں کا سراغ نکلے ہے

شاید اُس زلف سے لگی ہو میر
باؤ میں اک دماغ نکلے ہے

ہے خاک جیسے ریگِ رواں سب نہ آب ہے
دریائے موج خیز جہاں کا سراب ہے
روز شمار میں بھی محاسب ہے گر کوئی
تو لے حساب کچھ نہ کر آخر حساب ہے
اس شہرِ دل کو تو بھی جو دیکھے تو اب کہے
کیا جانیے کہ بستی یہ کب کی خراب ہے
منہ پر لئے نقاب تو اے ماہ کیا چھپے
آشوب شہر حسن ترا آفتاب ہے
کس رشکِ گل کی باغ میں زلفِ سیہ کھلی
موج ہوا میں آج نپٹ پیچ و تاب ہے
کیا دل مجھے بہشت میں لے جائے گا بھلا
جس کے سبب یہ جان پہ میری عذاب ہے
سن کان کھول کر کہ تنک جلد آنکھ کھول
غافل یہ زندگانی فسانہ ہو خواب ہے
رہ آشنائے لطفِ حقیقت کے بحر کا
ہے رشکِ زلف و چشم جو موج حباب ہے

آتش ہے سوز سینہ ہمارا مگر کہ میر
نامے سے عاشقوں کے کبوتر کباب ہے

کیا کیا بیٹھے بگڑ بگڑ تم پر ہم تم سے بنائے گئے
چپکے باتیں اُٹھائے گئے سرگاڑے وو ہیں آئے گئے
اُٹھے نقاب جہان سے یا رب جس سے تکلف بیچ میں ہے
جب نکلے اُس راہ سے ہو کر منہ تم ہم سے چھپائے گئے

کب کب تم نے سچ نہیں مانیں جھوٹی باتیں غیروں کی
تم ہم کو یوں نہیں جلائے گئے وے تم کو وہیں لگائے گئے

صبح وہ آفت اُٹھ بیٹھا تھا تم نے نہ دیکھا صد افسوس
کیا کیا فتنے سر جوڑے پلکوں کے سائے سائے گئے

اللہ رے یہ دیدہ درائی ہوں نہ مکدّر کیونکہ ہم
آنکھیں ہم سے ملائے گئے پھر خاک میں ہم کو ملائے گئے

آگ میں غم کی ہو کے گداز اں جسم ہوا سب پانی سا
یعنی بن اُن شعلہ رخوں کے خوب ہی ہم بھی تائے گئے

ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی بھی حد ایک آخر ہوتی ہے
کشتے اُس کی تیغ ستم کے گور تئیں کب لائے گئے

خضر جو مل جاتا ہے گاہے آپ کو بھولا خوب نہیں
کھوئے گئے اُس راہ کے ورنہ کاہیکو پھر پائے گئے

مرنے سے کیا میرؔ جی صاحب ہم کو ہوش تھے کیا کرئے
جی سے ہاتھ اُٹھائے گئے پر اُس سے دل نہ اُٹھائے گئے

ادھر سے ابر اُٹھ کر جو گیا ہے
ہماری خاک پر بھی رو گیا ہے
مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے
مقامر خانۂ آفاق وہ ہے
کہ جو آیا ہے یہاں کچھ کھو گیا ہے
کچھ آؤ زلف کے کوچہ میں درپیش
مزاج اپنا ادھر اب تو گیا ہے

سرھانے میرؔ کے کوئی نہ بولو[1]
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دل پُر خون کی اک گلابی سے
جی ڈھا جائے ہے سحر سے آہ
رات گزرے گی کس خرابی سے
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

[1] سودا: سودا کی جو بالیں پہ ہوا شور قیامت - خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

برقع اُٹھتے ہی چاند سا نکلا
داغ ہوں اُس کی بے حجابی سے

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

دن دوری چمن میں جو ہم شام کریں گے
تا صبح دو صد نالہ سر انجام کریں گے

ہوگا ستم و جور سے تیرے ہی کنایہ
دو شخص جہاں شکوۂ ایام کریں گے

آمیزشِ بیجا ہے تجھے جن سے ہمیشہ
وے لوگ ہی آخر تجھے بدنام کریں گے

نالوں سے مرے رات کے غافل نہ رہا کر
اک روز یہی دل میں ترے کام کریں گے

گر دل ہے یہی مضطرب الحال تو اے میر
ہم زیرِ زمیں بھی بہت آرام کریں گے

دیوانِ دوم

میر تقی میر دہلوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہر ذی حیات کا ہی سبب جو حیات کا
نکلے ہی جی اسی اس کے لئے کائنات کا

بکھرے ہی زلف اس رُخِ عالم فروز پر
ورنہ بناؤ ہووے نہ دن اور رات کا

در پردہ وہی معنی مقوم نہ ہوں اگر
صورت نہ پکڑے کام فلک کی ثبات کا

ہیں مستحیل خاک سے اجزائے نوخطاں
کیا سہل ہی زمیں سے نکلنا نبات کا

مستہلک اس کے عشق کے جانے ہیں قدر مرگ
عیسیٰ و خضر کو ہی مزا کب وفات کا

اشجار خامہ ہوویں جو آب سیہ بحار
لکھنا نہ تو بھی ہو سکے اُس کی صفات کا

اس کے فروغ حسن سے جھمکے ہی سب میں نور
شمع حرم ہو یا کہ دیا سومنات کا

بالذات ہی جہاں میں وہ موجود ہر جگہ
ہی دید چشم دل کے کھلے عین ذات کا

ہر صفحے میں ہی محو کلام اپنا دس جگہ
مصحف کو کھول دیکھ ٹک انداز بات کا

ہم مذنبوں میں صرف کرم سے ہی گفتگو
مذکور ذکر یہاں نہیں صوم و صلوات کا

کیا میر تجھ کو نامہ سیاہی کا فکر ہی
ختم رسل سا شخص ہی ضامن نجات کا

جلوہ نہیں ہی نظم میں حسن قبول کا
دیواں میں شعر گر نہیں نعتِ رسولؐ کا

حق کی طلب ہی کچھ تو محمدؐ پرست ہو
ایسا وسیلہ ہی بھی خدا کے حصول کا

مطلوب ہی زمان و مکان جہان سے
محبوب ہی ملک کا فلک کا عقول کا

احمدؐ کو ہم نے جان رکھا ہی وہی احد
مذہب کچھ اور ہوگا کسی بوالفضول کا

جن مرداں کو آنکھیں دیا ہی خدا نے وے
سرمہ کریں ہیں رہ کی تری خاک دھول کا

مقصود ہی علیؑ کا ولی کا سبھی کا تو
ہی قصد سب کو تیری رضا کے حصول کا

تھی گفتگوئے باغ فدک جڑ فساد کی ـ جانے ہی جس کو علم ہی دیں کے اصول کا
دعویٰ جو حق شناسی کا رکھئے سو اس قدر ـ پھر جان بوجھ کریئے تلف حق بتول کا

پروائے حشر کیا ہی تجھے میرؔ دردہ
ہی عذر خواہ جرم جو وہ تجھ ملول کا

جو معتقد نہیں ہی علیؑ کے کمال کا ـ ہر بال اس کے تن پہ ہی موجب وبال کا
عزت علیؑ کی قدر علیؑ کی بہت ہی دور ـ مورد ہی ذوالجلال کے عزو جلال کا
پایا علیؑ کو جا کے محمدؐ نے اس جگہ ـ جس جا نہ تھا لگاؤ گمان و خیال کا
رکھنا قدم پہ اس کے قدم کب ملک سے ہو ـ مخلوق آدمی نہ ہوا ایسی چال کا
شخصیت ایسی کس کی تھی ختم رسل کے بعد ـ تھا مشورت شریک، حق لایزال کا
توڑا بتوں کو دوش نبی پر قدم کو رکھ ـ چھوڑا نہ نام کعبہ میں کفر و ضلال کا
راہِ خدا میں اُن نے دیا اپنے بھی تئیں ـ یہ جود منہ تو دیکھو کسو اشتمال کا
نسبت نہ بندگی کی ہوئی جس کی واں درست ـ رونا مجھے ہی حشر میں اُس کی ہی چال کا

فکرِ نجات میرؔ کو کیا مدح خواں ہی وہ
اولاد کا علیؑ کی محمدؐ کی آل کا

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا ـ کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا
ہم جاہ و حشم یہاں کا کیا کہیے کہ کیا جانا ـ خاتم کو سلیماں کی انگشترِ پا جانا
یہ بھی ہی ادا کوئی خورشید نمط پیارے ـ منہ صبح دکھا جانا پھر شام چھپا جانا
کب بندگی میری سی بندہ کرے گا کوئی ـ جانے ہی خدا اس کو میں تجھ کو خدا جانا
تھا ناز بہت ہم کو دانست پر اپنی بھی ـ آخر وہ برا نکلا ہم جس کو بھلا جانا
گردن کشی کیا حاصل مانند بگولے کے ـ اس دشت میں سر گاڑے جوں سیل چلا جانا
اس گریۂ خونیں کا ہو ضبط تو بہتر ہی ـ اچھا نہیں چہرے پر لوہو کا بہا جانا
یہ نقش دلوں پر سے جانے کا نہیں اس کو ـ عاشق کے حقوق اکر ناحق بھی مٹا جانا
ڈھب دیکھنے کا ایدھر ایسا ہی تمھارا تھا ـ جاتے تو ہو پر ہم سے ٹک آنکھ ملا جانا
اُس شمع کی مجلس میں جانا ہمیں پھر واں سے ـ اک زخم زباں تازہ ہر روز اٹھا جانا
ہی شورِ قیامت ہم سوتے ہی نہ رہ جاویں ـ اس راہ سے نکلے تو ہم کو بھی جگا جانا

رشتے

کیا پانی کے مول آکر مالک نے گہر بیچا
ہے سخت گراں سستا یوسف کا بکا جانا

ہے میرے ترے نسبت روح اور جسد کی سی
کب آپ سے میں تجھ کو اے جان جدا جانا

جاتی ہے گزر جی پر اس وقت قیامت سی
یاد آوے ہے جب تیرا یکبارگی آ جانا

برسوں سے مری اس کی رہتی ہے یہی صحبت
تیغ اُس کو اُٹھانا تو سر مجھ کو جھکا جانا

کب میر ابسر آئے تم ویسے فریبی سے
دل کو تو لگا بیٹھے لیکن نہ لگا جانا

پائے خطاب کیا کیا دیکھے عتاب کیا کیا
دل کو لگا کے ہم نے کھینچے عذاب کیا کیا

کاٹے ہیں خاک اُڑا کر جوں گردباد برسوں
گلیوں میں ہم ہوئے ہیں اُس بن خراب کیا کیا

کچھ گل سے ہیں شگفتہ کچھ سرو سے ہیں قد کش
اس کے خیال میں ہم دیکھے ہیں خواب کیا کیا

انواع جرم میرے پھر بے شمار و بے حد
روز حساب لیں گے مجھ سے حساب کیا کیا

اک آگ لگ رہی ہے سینوں میں کچھ نہ پوچھو
جل جل کے ہم ہوئے ہیں اُس بن کباب کیا کیا

افراط شوق میں تو روہت رہی نہ مطلق
کہتے ہیں میرے منہ پر اب شیخ و شاب کیا کیا

پھر پھر گیا ہے آکر منہ تک جگر ہمارے
گزرے ہیں جان و دل پر یہیں اضطراب کیا کیا

آشفتہ اُس کے گیسو جب سے ہوئے ہیں منہ پر
تب سے ہمارے دل کو ہے پیچ و تاب کیا کیا

کچھ سوجھتا نہیں ہے مستی میں میر جی کو
کرتے ہیں پوچ گوئی پی کر شراب کیا کیا

دامن وسیع تھا تو کاہیکو چشم ترسا
رحمت خدا کی تجھ کو اے ابر زور برسا

شاید کباب کر کر کھایا کبوتراں نے
نامہ اُڑا پھرے ہے اُس کی گلی میں پرسا

وحشی مزاج ازبس مانوس بادیہ ہیں
ان کے جنوں میں جنگل اپنا ہوا ہے گھر سا

جس ہاتھ میں رہا کی اُس کی کمر ہمیشہ
اُس ہاتھ مارنے کا سر پہ بندھا ہے کرسا

سب پیچ کی یہ باتیں ہیں شاعروں کی ورنہ
باریک اور نازک مو کب ہے اُس کمر سا

طرز نگاہ اُس کی دل لے گئی سبھوں کے
کیا مومن و برہمن کیا گبر اور ترسا

تم واقف طریق بے طاقتی نہیں ہو
یھاں راہ دو قدم ہے اب دور کا سفر سا

کچھ بھی معاش ہے یہ کی اُن نے ایک چشمک
جب مدتوں ہمارا جی دیکھنے کو ترسا

ٹک ترک عشق کرئے لاغر بہت ہوئے ہم
آدھا نہیں رہا ہے اب جسم رنج فرسا

واعظ کو یہ جلن ہے شاید کہ فربہی سے
رہتا ہے حوض ہی میں اکثر پڑا مگر سا

اندازسے ہے پیدا سب کچھ خبر ہے اس کو
گو میرؔ بے سروپا ظاہر ہے بیخبر سا

تیغِ ستم سے اس کی مرا سر جدا ہوا
شکرِ خدا کہ حقِ محبت ادا ہوا

قاصد کو دے کے خط نہیں کچھ بھیجنا ضرور
جاتا ہے اب تو جی ہی ہمارا چلا ہوا

وہ تو نہیں کہ اشک تھمے ہی نہ آنکھ سے
نکلے ہے کوئی لختِ دل اب سو جلا ہوا

حیران رنگِ باغِ جہاں تھا بہت کا
تصویر کی کلی کی طرح دل نہ وا ہوا

عالم کی بے فضائی سے تنگ آگئے تھے ہم
جاگہ سے دل گیا جو ہمارا بجا ہوا

درپے ہمارے جی کے ہوا غیر کے لئے
انجامِ کار مدعی کا مدعا ہوا

اس کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھئے
جیسے کسو کا کوئی نگر ہو لٹا ہوا

بدتر ہے زیست مرگ سے ہجرانِ یار میں
بیمارِ دل بھلا نہ ہوا تو بھلا ہوا

کہتا تھا میرؔ حال تو جب تک تو تھا بھلا
کچھ ضبط کرتے کرتے ترا حال کیا ہوا

رفتار و طور و طرز و روش کا یہ ڈھب ہے کیا
پہلے سلوک ایسے ہی تیرے تھے اب ہے کیا

ہم دل زدہ نہ رکھتے تھے تم سے یہ چشم داشت
کرتے ہو قہر لطف کی جاگہ غضب ہے کیا

عزت بھی بعدِ ذلتِ بسیار چھیڑ ہے
مجلس میں جب خفیف کیا پھر ادب ہے کیا

آئے ہم آپ میں تو نہ پہچانے پھر گئے
اس راہِ صعبِ عشق میں یارو تعب ہے کیا

حیراں ہیں اس دہن کے عزیزانِ خوردہ بیں
یہ بھی مقام ہائے! تامل طلب ہے کیا

آنکھیں جو ہوویں تیری تو تو عین کر رکھے
عالم تمام گر وہ نہیں تو یہ سب ہے کیا

اس آفتاب بن نہیں کچھ سوجھتا ہمیں
گریہ ہی اپنے دن ہیں تو تاریک شب ہے کیا

تم نے ہمیشہ جور و ستم بے سبب کئے
اپنا ہی ظرف تھا جو نہ پوچھا سبب ہے کیا

کیونکر تمہاری بات کرے کوئی اعتبار
ظاہر میں کیا کہو ہو۔ سخن زیرِ لب ہے کیا

اس مہ بغیر میرؔ کا مرنا عجب ہو
ہر چند مرگِ عاشقِ مسکیں عجب ہے کیا

جھمکی دکھا کے طور کو جن نے جلا دیا
آئی قیامت ان نے جو پردا اٹھا دیا

اس فتنے کو جگا کے پشیماں ہوئی نسیم / کیا کیا عزیز لوگوں کو اس نے سلا دیا

اب بھی دماغ رفتہ ہمارا ہے عرش پر / گو آسماں نے خاک میں ہم کو ملا دیا

جانی نہ قدر اُس گہر شب چراغ کی / دل ریزۂ خزف کی طرح میں اُٹھا دیا

تقصیر جان دینے میں ہم نے کبھو نہ کی / جب تیغ وہ بلند ہوئی سر جھکا دیا

گرمی چراغ کی سی نہیں وہ مزاج میں / اب دل فسردگی سے ہوں جیسے بُجھا دیا

وہ آگ ہو رہا ہے خدا جانے غیر نے / میری طرف سے اُس کے تئیں کیا لگا دیا

اتنا کہا تھا فرش تری رہ کے ہم ہوں کاش / سو تو نے مار مار کے آکر بچھا دیا

اب گھٹتے گھٹتے جان میں طاقت نہیں رہی / ٹک لگ چلی صبا کہ دیا سا بڑھا دیا

تنگی لگا ہے کرنے دم اپنا بھی ہر گھڑی / کڑھنے نے دل کے جی کو ہمارے کھپا دیا

کی چشم تو نے باز کہ کھولا درِ ستم / کس مدعیِ خلق نے تجھ کو جگا دیا

کیا کیا زیان میر نے کھینچے ہیں عشق میں / دل ہاتھ سے دیا ہے جدا سر جُدا دیا

بہتوں کو آگے تھا یہی آزار عشق کا / جیتا رہا ہے کوئی بھی بیمار عشق کا

بے پردگی بھی چاہ کا ہوتا ہے لازمہ / کھلتا ہی ہے ندان یہ اسرار عشق کا

زندانی سیکڑوں مرے آگے رہا ہوئے / چھوٹا نہ میں ہی تھا جو گنہگار عشق کا

خواہانِ مرگ میں ہی ہوا ہوں مگر نیا / جی بیچے ہی پھرے ہے خریدار عشق کا

منصور نے جو سر کو کٹایا تو کیا ہوا / ہر سر کہیں ہوا ہے سزاوار عشق کا

جاتا وہی سنا ہمہ حسرت جہاں سے / ہوتا ہے جس کسو سے بہت پیار عشق کا

پھر بعد میرے آج تلک سر نہیں بکا / اک عمر سے کساد ہے بازار عشق کا

لگ جاوے دل کہیں تو اسے جی میں اپنے رکھ / رکھتا نہیں شگون کچھ اظہار عشق کا

چھوٹا جو مر کے قید عبارات میں پھنسا / القصہ کیا رہا ہو گرفتار عشق کا

ق

مشکل ہے عمر کاٹنی تلوار کے تلے / سر میں خیال گو کہ رکھیں یار عشق کا

وہاں رستموں کے دعوے کو دیکھا ہے ہوتے قطع / پورا جہاں لگا ہے کوئی وار عشق کا

کھو ہی رہا نہ جان کو ناآزمودہ کار / ہوتا نہ میر کاش طلبگار عشق کا

ستم سے گو یہ ترے کشتۂ وفا نہ رہا
رہے جہان میں تو دیر میں رہا نہ رہا

کب اُس کا نام لئے غش نہ آگیا مجھ کو
دلِ ستم زدہ کس وقت اُس میں جا نہ رہا

ملانا آنکھ کا ہر دم فریب تھا دیکھا
پھر ایک دم میں وہ بے دید آشنا نہ رہا

موئے تو ہم پہ دلِ پر کو خوب خالی کر
ہزار شکر کسو سے ہمیں گلا نہ رہا

اُدھر کھلی مری چھاتی اِدھر نمک چھڑکا
جراحت اس کو دکھانے کا اب مزا نہ رہا

ہوا ہوں تنگ بہت کوئی دن میں سن لیجو
کہ جی سے ہاتھ اُٹھا کر وہ اُٹھ گیا نہ رہا

قطعہ

ستم کا اس کے بہت میں نزار ہوں ممنون
جگر تمام ہوا خون و دل بجا نہ رہا

اگرچہ رہ گئے تھے استخوان و پوست ولے
لگائی ایسی کہ تسمہ بھی پھر لگا نہ رہا

حمیت اس کے تئیں کہتے ہیں جو میرؔ میں تھی
گیا جہاں سے پہ تیری گلی میں آ نہ رہا

کرتے ہی نہیں ترک بتاں طور جفا کا
شاید ہمیں دکھلا دیں گے دیدار خدا کا

ہے ابر کی چادر شفقی جوش سے گل کے
میخانے کے ہاں دیکھیے یہ رنگ ہوا کا

بہتیری گرو جنس کلالوں کے پڑی ہے
کیا ذکر ہے واعظ کے مصلیٰ و ردا کا

مر جائے گا باتوں میں کوئی غمزدہ یوں ہی
ہر لحظہ نہ ہو ممتحن ارباب وفا کا

تدبیر تھی تسکیں کیلئے لوگوں کی ورنہ
معلوم تھا مدت سے ہمیں نفع دوا کا

ہاتھ آئینہ رویوں سے اُٹھا بیٹھیں شہ کیونکر
بالعکس اثر پاتے تھے ہم اپنی دُعا کا

آنکھ اس کی نہیں آئنہ کے سامنے ہوتی
حیرت زدہ ہوں یار کی میں شرم و حیا کا

برسوں سے تو یوں ہے کہ گھٹا جب اُمنڈ آئی
تب دیدۂ تر سے بھی ہوا ایک جھڑا کا

آنکھ اس سے نہیں اُٹھنے کی صاحب نظروں کی
جس خاک پہ ہوگا اثر اُس کی کفِ پا کا

تلوار کے سایہ ہی میں کاٹے ہے تو اے میرؔ
کس دل زدہ کو ہوئے ہے یہ ذوق فنا کا

رہتا ہے ہڈیوں سے مری جو ہما لگا
کچھ دردِ عاشقی کا اُسے بھی مزا لگا

غافل نہ سوزِ عشق سے رہ پھر کباب ہے
گر لائحہ اس آگ کا ٹک دل کو جا لگا

دیکھا ہمیں جہاں وہ تہاں آگ ہو گیا
بھڑکا رکھا ہے لوگوں نے اس کو لگا لگا

بہات تنک بھی ہو تو سخن کچھ اثر کرے
میں اُٹھ گیا کہ غیر ترے کانوں آ لگا

اب آب چشم ہی ہے ہمارا محیطِ خلق
دریا کو ہم نے لب کا کنارے رکھا لگا

ہر چند اس کی تیغ ستم تھی بلند لیک
وہ طور بد نہیں تو قیامت بھلا لگا

مجلس میں اس کی بار نہ مجھ کو ملی کبھو
دروازے ہی سے گرچہ بہت میں رہا لگا

بوسہ لبوں کا مانگتے ہی منہ بگڑ گیا
کیا اتنی میری بات کا تم کو برا لگا

عالم کی سیر میر کی صحبت میں ہو گئی
طالع سے میرے ہاتھ یہ بے دست و پا لگا

خط سے وہ زور صفائے حسن اب کم ہو گیا
چاہِ یوسف تھا ذقن سو چاہِ رستم ہو گیا

سینہ کوبی سنگ سے دل خون ہونے میں رہی
حق بجانب تھا ہمارے سخت ماتم ہو گیا

ایک سا عالم نہیں رہتا ہے اس عالم کے بیچ
اب جہاں کوئی نہیں یاں ایک عالم ہو گیا

آنکھ کے لڑتے تری آشوب سا برپا ہوا
زلف کے درہم ہوئے اک جمع برہم ہو گیا

اس لب جاں بخش کی حسرت نے مارا جان سے
آبِ حیوان یمن طالع سے مرے سم ہو گیا

وقت تب تک تھا تو سجدہ مسجدوں میں کفر تھا
فائدہ اب جبکہ قد محراب سا خم ہو گیا

عشق ان شہری غزالوں کا جنوں کو اب کھنچا
وحشت دل بڑھ گئی آرام جاں رم ہو گیا

جی کھنچے جاتے ہیں فرطِ شوق سے آنکھوں کی اور
جن نے دیکھا ایک دم اس کو سو بے دم ہو گیا

ہم نے جو کچھ اس سے دیکھا سو خلافِ چشم داشت
اپنا عزرائیل وہ جانِ مجسم ہو گیا

کیا کہوں کیا طرحیں بدلیں چاہ نے آخر کو میر
تھا گرہ جو درد چھاتی میں سو اب غم ہو گیا

کیفی ہو کیوں تو ناز سے پھر گرم رہ ہوا
برسوں سے صوفیوں کا مصلیٰ تو تہ ہوا

معلوم تیرے چہرۂ پُر نور کا سا لطف
بالفرض آسماں پہ گیا پھول مہ ہوا

پوچھ اس سے دردِ ہجر کو جس کا بہ نازکی
جا گہ سے اپنے عضو کوئی بے جگہ ہوا

ہم پلہ اپنا کون ہے اس معرکے کے بیچ
کس کی ترازو یار کا تیرِ نگہ ہوا

ایسا فقیر ہونا بھلا کیا ضرور تھا
دونوں جہاں میں میر عبث روسیہ ہوا

مذکور میری سوختگی کا جو چل پڑا
مجلس میں سن سپند یکایک اچھل پڑا

پہنچے ہے کوئی اس تری نازک کے لطف کو
گل گو چمن میں جامے سے اپنے نکل پڑا

میں جو کہا اک آگ سی سلگے ہی دل کے بیچ
کہنے لگا کہ یوں ہی کوئی دن تو جل پڑا

بل کیوں نہ کھائیے کہ لگا رہنے اب تو وہاں
بالوں میں اور پیچ میں پگڑی کے بل پڑا

تھے اختلال اگرچہ مزاجوں میں کب سے ایک
ملنے میں اُس بلا کے نہایت خلل پڑا

رہتا نہیں ہی آنکھ سے آنسو ترے لئے
دیکھی جو اچھی شئے تو یہ لڑکا مچل پڑا

سر اُس کے پاؤں سے نہیں اٹھتے ستم ہی میر
گر خوش غلاف نیمچہ اُس کا اُگل پڑا

دل فرطِ اضطراب سے سیماب سا ہوا
چہرہ تمام زرد زرِ ناب سا ہوا

شاید جگر گداختہ یک لخت ہو گیا
کچھ آبِ دیدہ رات سے خوں ناب سا ہوا

وے دن گئے کہ اشک سے چھڑکاؤ سا کیا
اب رونے لگ گئے ہیں تو تالاب سا ہوا

اک دن کیا تھا یار نے قدِ ناز سے بلند
خجلت سے سروِ جوئے چمن آب سا ہوا

کیا اور کوئی روئے کہ اب جوشِ اشک سے
حلقہ ہماری چشم کا گرداب سا ہوا

قصہ تو مختصر تھا دلے طول کو کھنچا
ایجاز دل کے شوق سے اطناب سا ہوا

عمامہ ہی مؤذنِ مسجد کہ بارِ سر
قد تو ترا خمیدہ ہو محراب سا ہوا

بات اب تو سُن کہ جائے سخن جن میں ہو گئے
خطِ پشتِ لب کا سبزۂ سیراب سا ہوا

چل باغ میں بھی سوتے سے اُٹھ کر کبھو کہ گل
تک تک کے راہ دیدۂ بے خواب سا ہوا

سمجھے تھے ہم تو میر کو عاشق اُسی گھڑی
جب سُن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا

دیکھ آرسی کو یار ہوا محو ناز کا
خانہ خراب ہوجیو آئینہ ساز کا

ہوتا ہی کون دست بسرِ ان غرور سے
گالی ہی اب جواب سلام نیاز کا

ہم تو سمندِ ناز کے پامال ہو چکے
اس کو وہی ہی شوق ابھی ترکتاز کا

ہی کیمیا گرانِ محبت میں قدرِ خاک
پر وقر کچھ نہیں ہی دلِ بے گداز کا

اس لطف سے نہ غنچۂ نرگس کھلا کبھو
کھلنا تو دیکھ اس مژۂ نیم باز کا

کوتاہ تھا فسانہ جو مر جاتے ہم شتاب
جی پر وبال سب ہی یہ عمرِ دراز کا

مارا نہ اپنے ہاتھ سے مجھ کو ہزار حیف
کشتہ ہوں یار میں تو ترے امتیاز کا

ہلتی ہی یوں پلک کہ گڑی دل میں جا ہی
انداز دیدنی ہی مرے دل نواز کا

پھر میر آج مسجدِ جامع کے تھے امام
داغِ شراب دھوتے تھے کل جا نماز کا

غم ابھی کیا محشرِ مشہور کا — شور سا ہے تو ولیکن دور کا
حق تو سب کچھ ہی ہے تو ناحق نہ بول — بات کہتے سر کٹا منصور کا
بیچ سے کب کا گیا اب ذکرِ لب — اُس دلِ مرحوم کا مغفور کا
طرفہ آتش خیز سنگستان ہے دل — مقتبس یہاں سے ہے شعلہ طور کا
ق مر گئے پر خاک ہے سب کبر و ناز — مت جھکو سر گو کسو مغرور کا
ٹھیکرے کو قدر ہے اس کو نہیں — ٹوٹے جب کاسرِ فغفور کا
ق ہو کھڑا وہ تو پری سی ہے کھڑی — مُنہ کھلے تو جیسے چہرہ حور کا
دیکھ اُسے کیونکر ملک بھیچک نہوں — آنکھ کے آگے یہ پُتلا نور کا

چشم بہنے سے کبھو رہتی نہیں
کچھ علاج اے میر اس ناسور کا

نظر میں طور رکھ اس کم نما کا — بھروسا کیا ہے عمرِ بے وفا کا
گلوں کے پیرہن ہیں چاک سارے — کھلا تھا کیا کہیں بند اُس قبا کا
پرستش اب اسی بت کی ہے ہر سو — رہا ہوگا کوئی بندہ خدا کا
بلا ہیں قادر انداز اس کی آنکھیں — کیا یکہ جنازہ جس کو تاکا
بچا ہے عمر سے اب ایک حسرت — گیا وہ شورِ سر کا زور پا کا
مداوا خاطروں سے تھا وگرنہ — بدایت مرتبہ تھا انتہا کا
لگا تھا روگ جب سے یہ تبھی سے — اثر معلوم تھا ہم کو دوا کا
مروت چشم رکھنا سادگی ہے — نہیں شیوہ یہ اپنے آشنا کا
کہیں اُس زلف سے کیا لگ چلی ہے — پڑے ہے پانوں بے ڈھب کچھ صبا کا
نجا تو دور صوفی خانقہ سے — نہیں تو پاس ہے ابر و ہوا کا
ق نجانو میر کو ایسا ہی چپکا — نمونہ ہے یہ آشوبِ بلا کا

کر دن ہی سے رخصت ورنہ شب کو
نہ سونے دیگا شور اس بے نوا کا

وہ ترکِ مست کسو کی خبر نہیں رکھتا
کہ میں شکارِ زبوں ہوں جگر نہیں رکھتا

بلا سے آنکھ جو پڑتی ہے اُس کی دس جاگہ
ہمارا حال تو مدِّ نظر نہیں رکھتا

رہے نہ کیونکہ یہ دل باختہ سدا تنہا
کہ کوئی آوے کہاں میں تو گھر نہیں رکھتا

جنھوں کے دم میں ہے تاثیر اور ہیں وے لوگ
ہمارا نالۂ جانکاہ اثر نہیں رکھتا

کہیں ہیں اب کی بہت رنگ اُڑ چلا گل کا
ہزار حیف کہ میں بال و پر نہیں رکھتا

تو کوئی زور ہی نسخہ ہے اے مفرحِ دل
کہ طبع عشق میں ہرگز ضرر نہیں رکھتا

خدا کی اُور سے ہے سب یہ اعتبارانہ
جو خوب دیکھو تو میں کچھ ہنر نہیں رکھتا

غلط ہے دعویِ عشق اس فضول کا بے ریب
جو کوئی خشک لب اور چشم تر نہیں رکھتا

جدا جدا پھرے ہے میرؔ سب سے کس خاطر
خیال ملنے کا اُس کے اگر نہیں رکھتا

گیا میں جان سے وہ بھی جو ٹک آتا تو کیا ہوتا
قدم دو ساتھ میری نعش کے جاتا تو کیا ہوتا

پھرا کیا دُور اُس سے مدتوں میں کوہ و صحرا میں
بلا کر پاس اپنے مجھ کو بٹھلاتا تو کیا ہوتا

ہوئے آخر کو سارے کام ضائع ناشکیبی سے
کوئی دن اور تابِ ہجر دل لاتا تو کیا ہوتا

دمِ بسمل ہمارے زیرِ لب کچھ کچھ کہا سب نے
جو وہ بے رحم بھی کچھ منہ سے فرماتا تو کیا ہوتا

کہے سے غیر کے وہ توڑ بیٹھا وو ہیں یاروں سے
کئے جاتا اگر ٹک چاہ کا ناتا تو کیا ہوتا

کبھو سرگرم بازی ہمدموں سے یہاں بھی آ جاتا
ہمیں یک چند اگر وہ اور بہلاتا تو کیا ہوتا

گئے لے میرؔ کو کل قتل کرنے اُس کے در پر سے
جو وہ بھی گھر سے باہر اپنے ٹک آتا تو کیا ہوتا

میں غش کیا جو خط لے اُدھر نامہ بر چلا
یعنی کہ فرطِ شوق سے جی بھی اُدھر چلا

سُدھ لے گئی تری بھی کوئی زلفِ مشکبو
گیسوئے پیچدار جو مُنہ پر بکھر چلا

لڑکا ہی تھا نہ قاتلِ ناکردہ خوں ہنوز
کپڑے گلے کے سارے مرے خوں میں بھر چلا

ہے مایۂ حیات گیا جس کنے سے تو
آفت رسیدہ پھر وہ کوئی دم میں مر چلا

تیاری آج رات کہیں رہنے کی سی ہے
کس خانماں خراب کے اے مہ تو گھر چلا

دیکھو گے کوئی گوشہ نشیں ہو چکا غریب
تیرِ مژہ اُس ابرو کماں کا اگر چلا

بے مے رہا بہار میں ساری ہزار حیف
لطفِ ہوا سے شیخ بہت بے خبر چلا

ہم سے تکلف اُس کا چلا جائے ہے وہی
کل راہ میں ملا تھا سو منہ ڈھانپ کر چلا

یہ چھیڑ دیکھ ہنس کے رُخ زرد پر مرے
کہتا ہے میر رنگ تو اب کچھ نکھر چلا

وہ شوخ ہم کو پاؤں تلے ہی ملا گیا
اس دل نے کس بلا میں ہمیں مبتلا کیا

چھاتی کبھو نہ ٹھنڈی کی لگ کر گلے سے آہ
دل اس سے دُور سینے میں اکثر جلا کیا

کس وقت شرحِ حال سے فرصت ہمیں ہوئی
کس دن نیا نہ قاصد ادھر سے چلا کیا

ہم تو گمانِ دوستی رکھتے تھے پر یہ دل
دشمن عجب طرح کا بغل میں پلا کیا

کیا لطف ہے جئے جو بُرے حال کوئی میر
جینے سے تو نے ہاتھ اُٹھایا بھلا کیا

اس موج خیز دہر میں تو ہے حباب سا
آنکھیں کھلیں تری تو یہ عالم ہے خواب سا

برقع اُٹھا کے دیکھے ہے منہ سے کبھو ادھر
بارے ہوا ہے اندنوں رفعِ حجاب سا

وہ دل کہ تیرے ہوتے رہے تھا بھرا بھرا
اب اس کو دیکھئے تو ہے اک گھر خراب سا

دس روز آگے دیکھا تھا جیسا سو اب نہیں
دل رہ گیا ہے سینے میں جل کر کباب سا

اس عمر میں یہ ہوش کہ کہنے کو نرم گرم
بگڑا رہے ہے ساختہ مستِ شراب سا

ہے یہ فریبِ شوق کہ جاتے ہیں خط چلے
وھاں سے وگرنہ کب کا ہوا ہے جواب سا

کیا سطرِ موجِ اشک روانی کے ساتھ ہے
مشتاقِ گریہ ابر ہے چشمِ پُر آب سا

دوزخ ہوا ہے ہجر میں اس کے جہاں ہمیں
سوزِ دروں سے جان پہ ہے اک عذاب سا

مدت ہوئی کہ دل سے قرار و سکوں گئے
رہتا ہے اب تو آٹھ پہر اضطراب سا

مواج آب سا ہے ولیکن اُٹھے ہے خاک
ہے میر بحرِ بے تہِ ہستی سراب سا

کب لطف زبانی کچھ اُس غنچہ دہن کا تھا
برسوں ملے پر ہم سے صرفہ ہی سخن کا تھا

اسباب تہیا تھے سب مرنے ہی کے لیکن
اب تک نہ موئے ہم جو اندیشہ کفن کا تھا

بلبل کو ہوا پایا گل پھولوں کی دُکاں پر
اس مرغ کے بھی جی میں کیا شوق چمن کا تھا

بیڈول قدم تیرا پڑتا تھا لڑکپن میں
رونا ہمیں اوّل ہی اس تیرے چلن کا تھا

مرغانِ قفس سارے تسبیح ہیں سُبحے گل کی
ہر چند کہ ہر اک کا ڈھلکا ہوا منکا تھا

سب سطح ہے پانی کا آئینے کا سا تختہ
دریا میں کہیں شاید عکس اس کے بدن کا تھا

خوگر نہیں ہم یوں ہی کچھ ریختہ کہنے سے
معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا

بھوویں تنیں تم جس دم سج نکلے تھے اک سیجا
اس دن ہی تمھیں دیکھے ماتھا مرا ٹھنکا تھا

رہ میرؔ غریبانہ جاتا تھا چلا روتا
ہر گام گلہ لب پر یارانِ وطن کا تھا

یہ روش ہے دلبروں کی نہ کسو سے ساز کرنا
کوئی خاک سے ہو یکساں وہی ان کو ناز کرنا

کوئی عاشقوں بتاں کی کرے نقل کیا معیشت
انھیں ناز کرتے رہنا انھیں جی نیاز کرنا

رہیں بند میری آنکھیں شب و روز ضعف ہی سے
نہوا مجھے میسر کبھو چشم باز کرنا

یہ بھی طرفہ ماجرا ہے کہ اسی کو چاہتا ہوں
مجھے چاہیے ہے جس سے بہت احتراز کرنا

نہیں کچھ رہا تو لڑکا سمجھے پر حذر رہے اب
ہوس اور عاشقی میں ٹک اک امتیاز کرنا

کوئی عاشقوں کی چپیٹ انھوں نے اٹھائی بھی ہے
انھیں بات ہو جو تھوڑی اسے بھی دراز کرنا

یہی میرؔ کھینچے قشقہ درِ دیر پر تھے ساجد
نہیں اعتماد قابل انھوں کا نماز کرنا

ایک آن اس زمانے میں یہ دل نہ وا ہوا
کیا جانیے کہ میرؔ زمانے کو کیا ہوا

دکھلاتے کیا ہو دستِ حنائی کا مجھ کو رنگ
ہاتھوں سے میں تمھارے بہت ہوں جلا ہوا

سوزش وہی تھی چھاتی میں مرنے تلک مرے
اچھا ہوا نہ داغ جگر کا لگا ہوا

سر ہی چڑھا رہے ہے ہر اک بادہ خوار کے
ہے شیخ شہر یا کوئی جن ہے چڑھا ہوا

ظاہر کو گو درست رکھا مر کے میں و لے
دل کا لگاؤ کوئی رہا ہے چھپا ہوا

از خویش رفتہ میں ہی نہیں اس کی راہ میں
آتا نہیں ہے پھر کے ادھر کا گیا ہوا

یوں پھر اٹھا نہ جائے گا اے ابر دشت سے
گر کوئی رونے بیٹھ گیا دل بھرا ہوا

لیکر جواب خط کا نہ قاصد پھرا کبھو
کیا جانیے سرنوشت میں کیا ہے لکھا ہوا

گو ہمیں ملے مہندی کے رنگوں فلک و لے
چھوٹے نہ اس سے اس کا لگا یا بندھا ہوا

اٹھتے تعب فراق کے جی سے کہاں تلک
دل جو بجا رہا نہ ہمارا بجا ہوا

دامن سے منہ چھپائے جنوں کب رہا چھپا
سو جا سے سامنے ہے گریباں پھٹا ہوا

دیکھا نہ ایک گل کو بھی چشمک زنی میں ہائے
جب کچھ رہا نہ باغ میں تب میں رہا ہوا

کیا جانیے ملاپ کسے کہتے ہیں یہ لوگ
برسوں ہوئے کہ ہم سے تو وہ ہی لڑا ہوا

بحرِ بلا سے کوئی نکلتا مرا جہاز
بارے خدائے عز و جل ناخدا ہوا

اس بحر میں ایک اور غزل تو بھی میر کہہ
دریا تھا تو تو تیری روانی کو کیا ہوا

اس کام و جان و دل سے جو کوئی جدا ہوا
دیکھا پھر اُس کو خاک میں ہم نے ملا ہوا

کر ترک گرچہ بیٹھے ہیں پر ہے وہی تلاش
رہتا نہیں ہے ہاتھ ہمارا اُٹھا ہوا

کھینچا بغل میں میں جو اُسے مست پاکے رات
کہنے لگا کہ آپ کو بھی اب نشا ہوا

نے صبر ہے نہ ہوش ہے نے عقل ہے نہ دین
آتا ہے اُس کے پاس سے عاشق لٹا ہوا

اُٹھتا ہے میرے دل سے کبھو جوش سا تو پھر
جاتا ہے دونوں آنکھوں سے دریا بہا ہوا

جوں صیدِ نیم کشتہ تڑپتا ہے ایک سا
کیا جانیے کہ دل کو مرے کیا بلا ہوا

خط آئے پر جو گرم وہ پرکار مل چلا
میں سادگی سے جانا کہ اب آشنا ہوا

ہم تو لگے کنارے ہوئے غیر ہمکنار
ایکوں کی عید ایکوں کے گھر میں دہا ہوا

جوں برق مجھ کو ہنستے نہ دیکھا کسو نے آہ
پایا تو ابر سا کہیں روتا کھڑا ہوا

جس شعر پر سماع تھا کل خانقاہ میں
وہ آج میں سنا تو ہے میرا کہا ہوا

پایا مجھے رقیب نے آ اُس کی زیرِ تیغ
دل خواہ بارے مدعی کا مدعا ہوا

بیمارِ مرگ سا تو نہیں روز اب بستر
دیکھا تھا ہم نے میر کو کچھ تو بھلا ہوا

کل دل آزردہ گلستاں سے گزر ہم نے کیا
گل لگے کہنے کہو منھ نہ اُدھر ہم نے کیا

گر گئی خواب سے بیدار تھیں صبح کی باد
بے دماغ اتنے جو ہو ہم پہ مگر ہم نے کیا

سیدھی تلوار کے منہ پر ترے ہم آئے چلے
کیا کریں اس دلِ خستہ کو سپر ہم نے کیا

نیمچہ ہاتھ میں مستی سے لہو سی آنکھیں
سج تری دیکھ کر اے شوخ حذر ہم نے کیا

پاؤں کے نیچے کی مٹی بھی نہ ہوگی ہم سی
کیا کہیں عمر کو اس طرح بسر ہم نے کیا

کھا گیا ناخنِ سرتیز جگر دل دونوں
رات کی سینہ خراشی میں ہنر ہم نے کیا

کام اُن ہونٹھوں سے وہ لے جو کوئی ہم سا ہو
دیکھتے دیکھتے ہی آنکھوں میں گھر ہم نے کیا

جیسے حسرت لئے جاتا ہے جہاں سے کوئی
آہ یوں کوچۂ دلبر سے سفر ہم نے کیا

بارے کل بھڑ گئے اس ظالمِ خونخوار سے ہم — منصفی کیجے تو کچھ کم نہ جگر ہم نے کیا

اس رخ و زلف کی تسبیح ہی یہاں اکثر میر
ورد اپنا یہی اب شام و سحر ہم نے کیا

اس قدر آنکھیں چھپاتا ہی تو اے مغرور کیا — ٹک نظر ایدھر نہیں کہ اس سے ہی منظور کیا
وصل و ہجراں سے نہیں ہی عشق میں کچھ گفتگو — لاگ دل کی چاہیے ہی یہاں قریب و دور کیا
ہو خرابی اور آبادی کی عاقل کو تمیز — ہم دِوانے ہیں ہمیں ویران کیا معمور کیا
اُٹھ نہیں سکتا ترے در سے شکایت کیا مری — حال میں اپنے ہوں عاجز میں مجھے مقدور کیا
سب ہیں یکساں جب فنا یکبارگی طاری ہوئی — ٹھیکرا اس مرتبے میں کیا سرِ فغفور کیا
لطف کے حرف و سخن پہلے جو تھے بہرِ فریب — مدتیں جاتی ہیں اُن باتوں کا اب مذکور کیا
دیکھ بہتی آنکھ میری ہنس کے بولا کل وہ شوخ — یہ نہیں اب تک ہوا مُنہ کا ترے ناسور کیا
میں تو دیکھوں ہوں تمھارے مُنہ کو تم نے دل لیا — تم مجھے رہتے ہو اکثر مجلسوں میں گھور کیا
ابر سا روتا جو میں نکلا تو بولا طنز سے — آرسی جا دیکھ گریے سے ہی مُنہ پر نور کیا

سنگِ بالیں میر کا جو بات کا روڑا ہوا
سخت کر جی کو گیا اس جا سے وہ رنجور کیا

جوں ابرِ قبلہ دل ہی نہایت ہی بھر رہا — رونا مرا سنوگے کہ طوفان کر رہا
شب میکدہ سے وارِدِ مسجد ہوا تھا میں — پر شکر ہی کہ صبح تئیں بے خبر رہا
دل جس سے ایکبار نہ پھر تو ہوا دوچار — رُک رُک کے وہ ستم زدہ ناچار مر رہا
تسکینِ دل ہو تب کہ کبھو آ گیا بھی ہو — برسوں سے اس کا آنا یہی صبح پر رہا
اس زلف و رخ کو بھولے مجھے مدتیں ہوئیں — لیکن مرا نہ گریۂ شام و سحر رہا
رہتے تو تھے مکاں پہ ولے آپ میں نہ تھے — اُس بن ہمیں ہمیشہ وطن میں سفر رہا
اب چھیڑ یہ رکھی ہی کہ پوچھے ہی بار بار — کچھ وجہ بھی کہ آپ کا منہ ہی اُتر رہا
الدم میں یہ عجب کہ مرے سر پہ پھر گیا — جو آبِ تیغ برسوں تری تا کمر رہا

کاہے کو میں نے میر کو چھیڑا کہ ان نے آج
یہ دردِ دل کہا کہ مجھے دردِ سر رہا

دل دفعۃً جنون کا مہیا سا ہو گیا — دیکھی کہاں وہ زلف کہ سودا سا ہو گیا

ٹک جوش سا اُٹھا تھا مرے دل سے رات کو
دیکھا تو ایک پل ہی میں دریا سا ہو گیا

بے رونقی باغ ہے جنگل سے بھی پرے
گل سوکھ تیرے ہجر میں کانٹا سا ہو گیا

جلوہ ترا تھا جب تئیں باغ و بہار تھا
اب دل کو دیکھتے ہیں تو صحرا سا ہو گیا

کل تک تو ہم وے ہنستے چلے آئے تھے ہمیں
مرنا بھی میر جی کا تماشا سا ہو گیا

دل کی واشد کیلئے کل باغ میں ہیں ٹک گیا
سن گلہ بلبل سے گل کا اور بھی جی رک گیا

عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں
لگ اٹھی یہ آگ ناگاہی کہ گھر سب پھک گیا

ہم نہ کہتے تھے کہ غافل خاک ہو پیش از فنا
دیکھ اب پیری میں قد تیرا کدھر کو جھک گیا

خدمت معقول ہی سب مغبچے کرتے رہے
شیخ آیا میکدے کی اور جب تب تھک گیا

میر اس قاضی کے لونڈے کے لئے آخر موا
سب کو قضیہ اس کے جینے کا تھا بارے چک گیا

پھرتا ہے زندگی کے لئے آہ خوار کیا
اس وہم کی نمود کا ہے اعتبار کیا

کیا جانیں ہم اسیر قفس زاد اے نسیم
گل کیسے باغ کہتے ہیں کس کو بہار کیا

آنکھیں برنگ نقش قدم ہو گئیں سفید
پھر اور کوئی اُس کا کرے انتظار کیا

سیکھی ہے طرح سینہ فگاری کی سب مری
لائے تھے ساتھ چاک دل ایسا انار کیا

سرکش کسو سے ایسی کدورت رکھے وہ شوخ
ہم اس کی خاک راہ ہیں ہم سے غبار کیا

نے وہ نگہ چبھی ہے نہ وے پلکیں گڑ گئیں
کیا جانئے کہ دل کو ہے یہ خار خار کیا

لیتا ہے ابر اب تئیں اس ناحیے سے آب
روئے ہیں ہم بھی برسوں تئیں زار زار کیا

عاشق کے دل سے رکھ نہ تسلی کی چشم داشت
ہے برق پارہ یہ اسے آوے قرار کیا

صحبت رہی بگڑتی ہی اُس کینہ ور سے آہ
ہم جانتے نہیں ہیں کہ تو ہے پیار کیا

مارا ہوا ایک دو کو تو ہو مدعی کوئی
کشتوں کا اُس کے روز جزا ہیں شمار کیا

مدت سے جرگہ جرگہ سیر ہیں غزال
کم ہو گیا ہے یاروں کا ذوق شکار کیا

یار کا

پاتے ہیں اپنے حال میں مجبور سب کو ہم
کہنے کو اختیار ہے پر اختیار کیا

آخر زمانہ سازی سے کھویا نہ وقر میر
یہ اختیار تم نے کیا روزگار کیا

[1] مرزا غالب: دل ہیں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا۔

غنچہ ہی وہ دہان ہی گویا
ہونٹھ پر رنگ پان ہی گویا

میرے مرنے سے بھی وہ چونکے ہی
اب تلک مجھ میں جان ہی گویا

چاہیے جیتے گزرے اس کا نام
منہ میں جب تک زبان ہی گویا

سربسر کیں ہی لیک وہ پرکار
دیکھو تو مہربان ہی گویا

حیرت روئے گل سے مرغ چمن
چپ ہی یوں بے زبان ہی گویا

مسجد ایسی بھری بھری کب ہی
میکدہ اک جہان ہی گویا

جائے ہی شور سے فلک کی طرف
نالۂ صبح بان ہی گویا

بسکہ ہیں اس غزل میں شعر بلند
یہ زمین آسمان ہی گویا

وہی شور مزاج شیب میں ہی
میر اب تک جوان ہی گویا

ان سختیوں میں کس کا میلان خواب پر تھا
بالیں کی جاے ہر شب یھاں سنگ زیر سر تھا

ان ابرو و مژہ سے کب میرے جی میں ڈر تھا
تیغ و سناں کے منہ پر اکثر مرا جگر تھا

ان خوبصورتوں کا کچھ لطف کم ہی مجھ پر
یک عمر ورنہ اس جا پریوں ہی کا گزر تھا

تیشے سے کوہ کن کے کیا طرفہ کام نکلا
اپنے تو ناخنوں میں اس طور کا ہنر تھا

عصمت کو اپنی وھاں تو روتے ملک پھریں ہیں
لغزش ہوئی جو مجھ سے کیا عیب میں بشر تھا

کل ہم وہ دونوں یکجا ناگاہ ہو گئے تھے
وہ جیسے برق خاطف میں جیسے ابر تر تھا

ہوش اڑ گئے سبھوں کے شور سحر سے اس کے
مرغ چمن اگرچہ یکمشت بال و پر تھا

پھر آج یہ کہانی کل شب پہ رہ گئی ہی
سوتا نہ رہتا ٹک تو قصہ ہی مختصر تھا

رشک اس شہید کا ہی خضر و مسیح کو بھی
جو کشتہ اس کی جانب دو گام پیشتر تھا

ہشیاری اس کی دیکھو کیفی ہو مجھ کو مارا
تا اس کے سب کہیں یہ وہ مست و بیخبر تھا

صد رنگ ہی خرابی کچھ تو بھی رہ گیا ہی
کیا نقل کریے یارو دل کوئی گھر سا گھر تھا

تھا وہ بھی اک زمانہ جب نالے آتشیں تھے
چاروں طرف سے جنگل جلتا دھر دھر تھا

جب نالہ کش ہوا وہ تب مجلسیں رلائیں
تھا میر دل شکستہ یا کوئی نوحہ گر تھا

تیغ لے کر کیوں تو عاشق پر گیا
زیر لب جب کچھ کہا وہ مر گیا

تڑپے زیرِ تیغ ہم بے ڈول آہ
دامنِ پاک اس کا خوں میں بھر گیا

خاک ہی پکڑے اگر سونا بھی پھر
ہاتھ سے جس کے وہ سیمیں بر گیا

کیا بندھا ہے اس کے کوچے میں طلسم
پھر نہ آیا جو کوئی ادھر گیا

خانداں کیا کیا ہوئے اس بن خراب
آج تک وہ شوخ کس کے گھر گیا

ابرو و مژگاں ہی میں کاٹی ہے عمر
کیا سنان و تیغ سے میں ڈر گیا

کہتے ہیں ضائع کیا اپنے تئیں
میر تو دانا تھا یہ کیا کر گیا

جی رک گئے اے ہمدم دل خون ہو بھر آیا
اب ضبط کریں کب تک منہ تک تو جگر آیا

تھی چشم دمِ آخر وہ دیکھنے آوے گا
سو آنکھوں میں جی آیا پر وہ نہ نظر آیا

بے سدھ پڑے ہیں سارے سجادوں پہ اسلامی
دارو پیے وہ کافر کاہے کو ادھر آیا

ہر خستہ ترا خواہاں یک زخمِ دگر کا تھا
کی مشقِ ستم تو نے پر خون نہ کر آیا

گلبرگ ہی کچھ تنہا پانی نہیں خجالت سے
جنبش سے ترے لب کی یاقوت بھی تر آیا

بالفعل تو ہے قاصد محو اس خط و گیسو کا
ٹک چیتے تو ہم پوچھیں کیا لے کے خبر آیا

تابوت پہ بھی میرے پتھر پڑے لے جاتے
اس نخل میں ماتم کے کیا خوب ثمر آیا

ہے حق بطرف اس کے یوں جس کے گیا ہو تو
سج ایسی تری دیکھی ہم کو بھی خطر آیا

کیا کہیے کہ پتھر سے سر مارتے ہم گزرے
یوں اپنا زمانہ تو بن یار بسر آیا

صنعت گریاں[1] ہم نے کیں سیکڑوں یہاں لیکن
جس سے کبھو وہ ملتا ایسا نہ ہنر آیا

در ہی کے تئیں تکتے پتھرا گئیں آنکھیں تو
وہ ظالم سنگیں دل کب میر کے گھر آیا

یار ہے میر کا مگر گل سا
کہ سحر نالہ کش ہے بلبل سا

یہاں کوئی اپنی جان دو دشوار
وہاں وہی آہ سو ہے تساہل سا

دودِ دل کو ہمارے ٹک دیکھو
یہ بھی پُر پیچ اب ہے کاکل سا

شوق ان اس کے لمبے بالوں کا
یہاں چلا جائے ہے تسلسل سا

[1] آزاد، معاصرِ ولی سے ؎ آئیں جہاں کی ساری آزاد صنعتیں پر ؛ جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا
میر تقی میر سے ؎ صنعت گریاں بہتیری کیں لیک دریغ ہزار دریغ ؛ جس سے یار بھی ملتا ہم سے ایسا وہ نہ ہنر آیا

کب تھی جرأت رقیب کی اتنی / تم نے بھی کچھ کیا تغافل سا
یک نگہ ایک چشمک ایک سخن / اس میں بھی تم کو ہے تامل سا
بارے مستوں نے ہوشیاری کی / دے کے کچھ محتسب کا منہ جھلسا
شرم آتی ہے پہنچتے ادھر / خط ہوا شوق سے ترسل سا
ٹوٹی زنجیر پائے **میر** مگر / رات سنتے رہے ہیں ہم غل سا

چمن میں جاکے جو میں گرم وصفِ یار ہوا / گل اشتیاق سے میرے گلے کا ہار ہوا
تمہارے ترکشِ مژگاں کی کیا کروں تعریف / جو تیر اس سے چلا سو جگر کے پار ہوا
ہماری خاک پہ اک بیکسی برستی ہے[1] / ادھر سے ابر جب آیا تب اشکبار ہوا
کریں نہ کیونکہ یہ مژگاں بلند پروازی / انھوں کا طائر سدرہ نشیں شکار ہوا
کبھو بھی اس کو تہِ دل سے ملتے پایا پھر / فریب تھا وہ کوئی دن جو ہم سے یار ہوا
بہت دنوں سے دروں میں اضطراب سا تھا / جگر تمام ہوا خون تب قرار ہوا
شکیب **میر** جو کرتا تو وقر رہ جاتا / ادھر کو جاکے عبث یہ حبیب خوار ہوا

ایک دل کو ہزار داغ لگا / اندرونے[2] میں جیسے باغ لگا
اس سے یوں گل نے رنگ پکڑا ہے / شمع سے جیسے لیں چراغ لگا
خوبی یک پیچہ بندِ خوباں کی / خوب باندھوں گا گر دماغ لگا
پانوں دامن میں کھینچ لیں گے ہم / ہاتھ گر گوشۂ فراغ لگا
میر اس بے نشاں کو پایا جان / کچھ ہمارا اگر سراغ لگا

تیغ کی اپنی صفت لکھتے جو کل وہ آگیا / ہنس کے اس پرچے کو میرے ہی گلے بندھوا گیا
دست و پا گم کرنے سے میرے کھلے اسرارِ عشق / دیکھ کر کھویا گیا سا مجھ کو ہر یک پا گیا
داغِ محجوبی ہوں اس کا میں کہ میرے روبرو / عکس اپنا آرسی میں دیکھ کر شرما گیا
ہم بشر عاجز ثباتِ پا ہمارا کس قدر / دیکھ کر اس کو ملک سے بھی نہ یہاں ٹھہرا گیا
یار کے بالوں کا بندھنا تھا ہی پگڑی کے ساتھ / ایک عالم دوستاں اس پیچ میں مارا گیا

[1] میر تقی میر سے ادھر سے ابر جو اُٹھ کر گیا ہو۔ ہماری خاک پر بھی رو گیا ہے۔ [2] اندرونے یعنی دل باطن

ہم نہ جانا اختلاط اس طفل بازی کوش کا
گرم بازے آگیا تو ہم کو بھی بہلا گیا (بازی)

کیا کروں ناچار مرنے کو ہوا تیار میں
دل کی روز و شب کی بیتابی سے جی گھبرا گیا

جی کوئی لگتا ہے اُس کے اُٹھ گئے پر باغ میں
گل نے بہتیرا کہا ہم سے نہ ٹک ٹھہرا گیا

ہو گئے تحلیل سب اعضا مرے پا کر گداز
رفتہ رفتہ ہجر کا اندوہ مجھ کو کھا گیا

یوں تو کہتا تھا کوئی ویسے کو باندھے ہی گلے
پر وہ پھندنا سا جو آیا میرؔ بھی پھندلا گیا

دل عشق میں خوں دیکھا آنکھوں کو گیا دیکھا
پیغمبر کنعاں نے دیکھا نہ کہ کیا دیکھا

مجروح ہے سب سینہ تس پر ہے نمک پاشی
آنکھوں کے لڑانے کا ہم خوب مزا دیکھا

یکبار بھی آنکھ اپنی اُس پر نہ پڑی مرتے
سَو مرتبہ بالیں سے ہم سر کو اٹھا دیکھا

کاہش کا مری اب یہ کیا تجھ کو تعجب ہے
بیماری دل والا کوئی بھی بھلا دیکھا

آنکھیں گئیں پھر تجھ بن کیا کیا نہ عزیزوں کی
پر تو نے مروت سے ٹک اُن کو نہ جا دیکھا

جی دیتے ہیں مرنے پر سب شہر محبت میں
کچھ ساری خدائی سے یہ طور نیا دیکھا

کہہ دل کو گنوایا ہے یا رنج اُٹھایا ہے
اے میرؔ تجھے ہم نے کچھ آج خفا دیکھا

ناگہ جو وہ صنم ستم ایجاد آگیا
دیکھے سے طور اس کے خدا یاد آگیا

پھوڑا تھا سر تو ہم نے بھی پر اس کو کیا کریں[۱]
جو چشم روزگار میں فرہاد آگیا

اپنا بھی قصد تھا سر دیوار باغ کا
توڑا ہی تھا قفس کو پہ صیاد آگیا

جور و ستم اُٹھانے ہی اُس کے پڑیں گے شیخ
مسجد میں گر وہ عاشق بیداد آگیا

دیکھیں گے آدمی کی روش میرؔ ہم تری
گر سامنے سے ٹک وہ پری زاد آگیا

گر مجھ سوختہ کے پاس سے جانا کیا تھا
آگ لینے[۲] مگر آئے تھے یہ آنا کیا تھا

برسوں یک بوسۂ لب مانگتے جاتے ہیں ہمیں
رات آتے ہی کہا تم نے جو مانا کیا تھا

دیکھنے آئے دم نزع لئے منہ پہ نقاب
آخری وقت مرے منہ کا چھپانا کیا تھا

جب نہ تب مرنے کو تیار رہے عشق میں ہم
جی کے تئیں اپنے کبھو ہم نے نہ جانا کیا تھا

مدعی ہوتے ہیں اک آن میں اب تو دلدار
مہر جب رسم تھی یارب وہ زمانا کیا تھا

[۱] طالع شہرت رسوائی مجنوں بشماست ؛ ورنہ طشت من و او ہر دو زیک بام افتاد (لا اعلم)

عزت و عشق کہاں جمع ہوئے اے ہمدم ننگ خواری تھا اگر دل کا لگانا کیا تھا

گر خطِ سبز سے اس کے نہ تمھیں تھی کچھ لاگ
پھر بھلا میر جی یہ زہر کا کھانا کیا تھا

وارد گلشن غزل خواں وہ جو میر یہاں ہوا دامن گل گریۂ خونیں سے سب افشاں ہوا
طائرانِ باغ کو تھا بہت بختی کا دماغ پر ہر اک دردِ سخن سے میر کے نالاں ہوا
دل کی آبادی کو پہنچا اپنے گویا چشم زخم دیکھتے ہی دیکھتے یہ شہر سب ویراں ہوا
سبز بختی پر ہے اس کے طائر سدرہ کو رشک جو شکار اس تیغ کے سایہ تلے بیجاں ہوا
خاک پر بھی دوڑتی ہے چشم مہر و ماہ چرخ اس دنی الطبع کے گھر جا کے میں مہماں ہوا
تھا جگر میں جب تلک قطرہ ہی تھا خوں کا سرشک اب جو آنکھوں سے تجاوز کر چلا طوفاں ہوا
اس کے میرے بیچ میں آئینہ آیا تھا ولے صورتِ احوال ساری دیکھ کر حیراں ہوا
دل نے خوں ہو عشق خوباں میں بھی کیا بدلے ہیں رنگ چہروں کو غازہ ہوا ہونٹھوں کا رنگِ پاں ہوا
تم جو کل اس راہ نکلے برق سے ہنستے گئے ابر کو دیکھو کہ جب آیا ادھر گریاں ہوا
جی سے جانا بن گیا اس بن ہمیں پل مارتے کام تو مشکل نظر آتا تھا پر آساں ہوا

جب سے ناموس جنوں گردن بندھا ہے تب سے میر
جیبِ جاں وابستۂ زنجیر تا داماں ہوا

آیا ہے ابر جب کا قبلہ سے تیرا تیرا مستی کے ذوق میں ہیں آنکھیں بہت ہی خیرا
خجلت سے اُن لبوں کے پانی ہو بہ چلے ہیں قند و نبات کا بھی نکلا ہے خوب شیرا
مجنوں نے حوصلے سے دیوانگی نہیں کی جاگہ سے اپنی جانا اپنا نہیں وتیرا
اس راہزن سے مل کر دل کیونکہ کھو نہ بیٹھیں انداز و ناز اپنے غمزہ اُٹھائی گیرا
کیا کم ہے ہولناکی صحرائے عاشقی کی شیروں کو اس جگہ پر ہوتا ہے قشعریرا
آئینے کو بھی دیکھو پر ٹک ادھر بھی دیکھو حیران چشمِ عاشق دمکے ہے جیسے ہیرا
نیت پہ سب بنا ہے یہاں مسجد اک بڑی تھی پیرِ مغاں موا سو اس کا بنا حظیرا
ہمراہِ خوں تلک ہے ٹک پانوں کے چھوئے سے ایسا گناہ مجھ سے وہ کیا ہوا کبیرا

غیرت سے میر صاحب سب جذب ہو گئے تھے
نکلا نہ بوند لوہو سینہ جوان کا چیرا

یہاں اپنی آنکھیں پھر گئیں پردہ نہ آ پھر / دیکھا نہ بدگمان ہمارا بھلا پھرا

آیا نہ پھر وہ آئینہ رو ٹک نظر مجھے / میں منہ پر اپنے خاک لیے جا بجا پھرا

کیا اور جی رندھے کسو کا تیرے ہجر میں / سو بار اپنے منہ سے جگر تو گیا پھرا

اللہ رے دلکشی کہیں دیکھا جو گرم ناز / جوں سایہ اس کے ساتھ فلک پھر لگا پھرا

سن لیجو ایک بار مسافر ہی ہو گیا / بیمار عشق گو رہے گو بارہا پھرا

کہہ وہ شکستہ پا ہمہ حسرت نہ کیونکہ جاے / جو ایک دن نہ تیری گلی میں چلا پھرا

طالع پھرے سپہر پھرا قلب پھر گئے / چندے وہ رشک ماہ جو ہم سے جدا پھرا

پر بے نمک ہے ملنے کی اس وقت میں تلاش / بارے وہ ربط و دوستی سب کا مزا پھرا

آنسو گرا نہ راز محبت کا پاس کر / میں جیسے ابر برسوں تئیں دل بھرا پھرا

بے صرفہ رونے لگ گئے ہم بھی اگر کبھو / تو دیکھیو کہ بادیہ سارا بہا پھرا

بندہ ہے پھر کہاں کا جو صاحب ہوے دماغ / اس سے خدائی پھرتی ہے جس سے خدا پھرا

خانہ خراب میر بھی کتنا غیور تھا / مرتے موا پر اس کے کبھو گھر نہ جا پھرا

پھرتے کب تک شہر میں اب سوئے صحرا رو کیا / کام اپنا اس جنوں میں ہم نے بھی یکسو کیا

عشق نے کیا کیا تصرف یاں کیے ہیں آجکل / چشم کو پانی کیا سب دل کو سب لوہو کیا

نکہت خوش اس کے پنڈے کی سی آتی ہے مجھے / اس سبب گل کو چمن کے دیر میں نے بو کیا

کام میں قدرت کے کچھ بولا نہیں جاتا ہے ہائے / خوبرو اس کو کیا لیکن بہت بدخو کیا

جانا اس آرام گہ سے ہے بعینہ بس یہی / جیسے سوتے سوتے ایدھر سے ادھر پہلو کیا

ہو لیتی اسلام سے کیا کیا پھرے ہیں جیب چاک / تو نے مائل کیوں ادھر کو گوشۂ ابرو کیا

وہ اتو کش کا ابھی پر کیا ہے سرگرم جفا / مارے تلواروں کے ان نے بہتوں کو اتو کیا

ہاتھ پر رکھ ہاتھ اب وہ دو قدم چلتا نہیں / جن نے بالش خواب کا برسوں مرا بازو کیا

پھول نرگس کا لیے بھچک کھڑا تھا راہ میں / کس کی چشم پرفسوں نے میر کو جادو کیا

عاشق ترے لاکھوں ہوئے مجھ سا نہ پھر پیدا ہوا / تجھ پر کوئی ایسی کام جاں دیکھا نہ یوں مرتا ہوا

مدت ہوئی الفت گئے برسوں ہوئے طاقت گئے / دل مضطرب ایسا نہ تھا کیا جانیے اب کیا ہوا

۱ہ غیبت اس کے تئیں کہتے ہیں جو ہجر میں تھی ؛ گیا جہاں سے پہ تیری گلی میں آ نہ رہا ۔

کل صبح سیر باغ میں دل اور میرا رک گیا
بلبل نہ بولا منہ سے کچھ گل ٹک نہ مجھ سے وا ہوا

وے دن گئے جو یہاں کبھو اٹھتا تھا دل سے جوش سا
اب لگ گئے رونے جہاں پل مارتے دریا ہوا

کتنوں کے دل بیجاں ہوئے کتنے نہ جانا کیا ہوئے
چلنے میں اس کے دو قدم ہنگامہ اک برپا ہوا

مستی میں لغزش ہو گئی معذور رکھا چاہیے
اے اہل مسجد اس طرف آیا ہوں میں بہکا ہوا

جوں حسن ہے اک فتنہ گر تو عشق بھی ہے پردہ در
وہ شہرۂ عالم ہوا میں خلق میں رسوا ہوا

فرہاد و مجنوں ووں گئے ہم اور وامق یوں چلے
اس عارضے سے چاہ کے وہ کون سا اچھا ہوا

یا حرف خط ہے درمیاں یا گیسوؤں کا ہے بیاں
کیا میر صاحب کے تئیں پھر اندنوں سودا ہوا

تمام روز جو کل میں پیے شراب پھرا
بسان جام لیے دیدۂ پر آب پھرا

اثر بن آہ کے وہ منہ ادھر نہ ہوتا تھا
ہوا پھری ہے مگر کچھ کہ آفتاب پھرا

نہ لکھے خط کی نمط ہو گئیں سفید آنکھیں
تجھے بھی عشق ہے قاصد بھلا شتاب پھرا

وہ رشک گنج ہے نایاب تھا بہت ورنہ
خرابہ کونسا جس میں نہ میں خراب پھرا

کسو سے حرف محبت کا فائدہ نہ ہوا
بغل میں میں تو لیے یہاں بہت کتاب پھرا

لکھا تو دیکھ کہ قاصد پھرا جو مدت میں
جواب خط کا مرے صاف بے جواب پھرا

کہیں ٹھہرنے کی جا یہاں نہ دیکھی میں نے میر
چمن میں عالم امکاں کے جیسے آب پھرا

بے رنگ بے ثباتی یہ گلستاں بنایا
بلبل نے کیا سمجھ کر یہاں آشیاں بنایا

اڑتی ہے خاک یارب شام و سحر جہاں میں
کس کے غبار دل سے یہ خاکداں بنایا

اک رنگ پر نہ رہنا یہاں کا عجب نہیں ہے
کیا کیا نہ رنگ لائے تب یہ جہاں بنایا

آئینے میں کہاں ہے ایسی صفا کے تو
جبہوں سے راستوں کے وہ آستاں بنایا

سرگشتہ ایسی کس کی ہاتھ آ گئی تھی مٹی
جو چرخ زن قضا نے یہ آسماں بنایا

نقش قدم سے اس کے گلشن کی طرح ڈالی
گرد رہ اس کی لے کر سرو رواں بنایا

ہونے پہ جمع اپنے پھولا بہت تھا لیکن
کیا غنچہ تنگ آیا جب وہ دہاں بنایا

اس صحن پر یہ وسعت اللہ رے تیری صنعت
معمار نے قضا کے دل کیا مکاں بنایا

دل ٹک ادھر نہ آیا ایدھر سے کچھ نہ پایا
ق
کہنے کو ترک لے کر اک سوانگ یہاں بنایا

دریوزہ کرتے گزری گلیوں میں عمر اپنی
درویش کب ہوئے ہم تکیہ کہاں بنایا

وہ تو مٹا گیا تھا تربت بھی میر جی کی
دو چار اینٹیں رکھ کر پھر میں نشاں بنایا

اُس کام جان و دل نے عالم کا جان مارا
زلفوں کی درہمی سے برہم جہان مارا

بلبل کا آتشیں دم دل کو لگا ہمارے
ایسا کنھوں نے جیسے چھاتی میں بان مارا

خوں کچھ نہ تھا ہمارا مرکوزِ خاطر اُس کو
للہ اک ہمیں بھی یوں درمیان مارا

سرچشمہ حسن کا وہ آیا نظر نہ مجھ کو
اس راہزن نے غافل کیا کاروان مارا

صبر و حواس و دانش سب عشق کے زبوں ہیں
میں کاوشِ مژہ سے عالم کو چھان مارا

کیا خون کا مزا ہے ای عشق تجھ کو ظالم
ایک ایک دم میں تونے سو سو جوان مارا

ہم عاجزوں پر آکر یوں کوہِ غم گرا ہے
جیسے زمیں کے اوپر ایک آسمان مارا

کب جی بچے ہے یارو خوش رو دمو بتاں سے
گر صبح بچ گیا تو پھر شام آن مارا

کہتے نہ تھے کہ صاحب اتنا کڑھا نہ کریے
اس غم نے میر تم کو جی سے ندان مارا

یہ میر ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا
اندازِ سخن کا سبب، شور و فغاں تھا

جادو کی پڑی پرچۂ ابیات تھا اس کا
منہ تکتے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا

جس راہ سے وہ دل زدہ دلی سے نکلتا
ساتھ اُس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا

افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک
آندھی تھا، بلا تھا، کوئی آشوبِ جہاں تھا

کس مرتبہ تھی حسرتِ دیدار مرے ساتھ
جو پھول مری خاک سے نکلا نگراں تھا

مجنوں کو عبث دعوئے وحشت ہے مجھی سے
جس دن کہ جنوں مجھ کو ہوا تھا وہ کہاں تھا

غافل تھے ہم احوالِ دلِ خستہ سے اپنے خرابہ
وہ گنج اسی کنج خرابی میں نہاں تھا

کس زور سے فرہاد نے خارا شکنی کی
ہر چند کہ وہ بیکس و بیتاب و تواں تھا

گو میر جہاں میں کنھوں نے تجھ کو نہ جانا
موجود نہ تھا تو تو کہاں نام و نشاں تھا

عشق کو بیچ میں یا رب تو نہ لایا ہوتا
یا تن آدمی میں دل نہ بنایا ہوتا

دل نہ تھا ایسی جگہ جس کی نہ سدھ لیجے کبھو
اُجڑی اس بستی کو پھر تو نے بسایا ہوتا

عزت اسلام کی کچھ رکھ لی خدا نے ورنہ / زلف نے تیری تو زنار بندھایا ہوتا
گھر کے آگے سے ترے نعش گئی عاشق کی / اپنے دروازے تلک تو بھی تو آیا ہوتا
جو ہی سو بیخودِ رفتار ہی تیرا اے شوخ / اس روش سے نہ قدم تو نے اٹھایا ہوتا
اب تو صد چند ستم کرنے لگے تم اے کاش / عشق اپنا نہ تمھیں میں نے جتایا ہوتا
دل سے خوش طرح مکاں پھر بھی کہیں بنتے ہیں / اس عمارت کو ٹک اک دیکھ کے ڈھایا ہوتا
دل پہ رکھتا ہوں کبھو سر سے کبھو ہاردوں میں / ہاتھ پانوں کو نہ مین تیرے لگایا ہوتا
کم کم اٹھتا وہ نقاب آہ کہ طاقت رہتی / کاش یک بار ہمیں منہ نہ دکھایا ہوتا

میر اظہارِ محبت میں گیا جی نہ ترا
ہائے ناداں بہت تو نے چھپایا ہوتا

نکبتِ طالع دیکھ وہ ایدھر کو چل کر رہ گیا / رات جو تھی چاند سا گھر سے نکل کر رہ گیا
خواب میں کل پانوں اپنے دوست کے ملتا تھا میں / آنکھ دشمن کھل گئی سو ہاتھ مل کر رہ گیا
ہم تو تھے سرگرم پابوسی خدا نے خیر کی / نیمچہ کل خوش غلاف اس کا اگل کر رہ گیا
ہم بھی دنیا کی طلب میں سر کے بل ہوتے کھڑے / ہائے اپنا پانوں اس رہ میں پھسل کر رہ گیا
کیا کہوں بیتابیِ شب ہی کہ ناچار اس بغیر / دل مرے سینے میں دو دو ہاتھ اچھل کر رہ گیا
کیا ہمیں کو یار کے تیغے نے کھا کر دم لیا / ایسے بہتیروں کو یہ اژدر نگل کر رہ گیا
دو قدم ساتھ اس جفاجو کے چلا جاتا ہی جی / بلہوس عیار تھا دیکھا نہ ٹل کر رہ گیا
آنکھ کچھ اپنی ہی اس کے سامنے ہوتی نہیں / جن نے وہ خونخوار سج دیکھی دہل کر رہ گیا

ایک ڈھیری راکھ کی تھی صبح جائے میر پر
برسوں سے جلتا تھا شاید رات جل کر رہ گیا

طریق خوب ہی آپس میں آشنائی کا / نہ پیش آوے اگر مرحلہ جدائی کا
ہوا ہی کنج قفس ہی کی بے پری میں خوب / نسخے / کہ ہر کی سال تلک لطف تھا رہائی کا
یہیں ہیں دیر و حرم اب تو یہ حقیقت ہی / دماغ کس کو ہی ہر در کی جبہہ سائی کا
نہ پوچھ مہندی لگانے کی خوبیاں اپنی / جگر ہی خستہ ترے پنجۂ حنائی کا
نہیں جہان میں کس طرف[1] گفتگو دیسی / کسیدھر کو / یہ ایک قطرۂ خوں ہی طرف[1] خدائی کا
کسو پہاڑ میں جوں کوہکن سر اب ماریں / خیال ہم کو بھی ہی بخت آزمائی کا

[1] طرف ۔ مقابل ۱۲

بچا رہا نہ دلِ شیخ شورِ محشر سے ۔۔۔ جگر بھی چاہیے ہے کچھ تھا منا اوائی کا

رکھا ہی باز ہمیں دربدر کے پھرنے سے ۔۔۔ سروں پہ اپنی ہی احسان شکستہ پائی کا

ملا کہیں تو دکھاویں گے عشق کا جنگل ۔۔۔ بہت ہی خضر کو غرّہ ہی رہنمائی کا

نہ اُنس مجھ سے ہوا اُس کو میں ہزار کیا ۔۔۔ جگر میں داغ ہی اُس گل کی بیوفائی کا

جہاں سے میرؔ ہی کے ساتھ جانا تھا لیکن
کوئی شریک نہیں ہی کسو کی آئی کا

یہ رفتگی بھی ہوئی ہی جی ہی چلا گیا ۔۔۔ کل حال میرؔ دیکھ کے غش مجھ کو آگیا

کیا کہیے ایک عمر میں وے لب ملے تھے کچھ ۔۔۔ سو بات پان کھاتے ہوئے وہ چبا گیا

ثابت ہی اس کے پہلو سے پہنچے ہی ہم کو رنج ۔۔۔ دیکھا نہ دردِ دل کے کہے سر جھکا گیا

نالاں ہی عندلیب گل آشفتہ رفتہ سرو ۔۔۔ ٹک بیٹھ کر چمن میں وہ فتنہ اُٹھا گیا

پڑھتا تھا میں تو سبحہ لئے ہاتھ میں درود ۔۔۔ صلواتیں مجھ کو آکے وہ ناحق سُنا گیا

رکھنا نشان قبر کا میری نہ خوش کیا ۔۔۔ آیا سو اور خاک میں مجھکو ملا گیا

منصف ہو تو ہی شیخ کہ اس مستِ ناز بن ۔۔۔ ہم آپ سے بھلا گئے تجھ سے رہا گیا

ہرگز کبھی نہ سر سے لگی آہ عشق میں ۔۔۔ مانند شمع داغ ہی سب ہم کو کھا گیا

کیوں میں کہا کہ ہنس کے نمک زخم پر چھڑک ۔۔۔ بے لطف اس کے ہونے میں سارا مزا گیا

آنسو تو ڈر سے پی گئے لیکن وہ قطرہ آب ۔۔۔ اک آگ تن بدن میں ہمارے لگا گیا

وقتِ اخیر کیا یہ ادا تھی کہ غش سے میں ۔۔۔ جب آنکھ کھولی بالوں میں منہ کو چھپا گیا

کیا پوچھتے ہو داغ کیا مرگ میرؔ نے
مر کر وہ سینہ سوختہ چھاتی جلا گیا

سوزِ دروں سے آخر بھسمنت دل کو پایا ۔۔۔ اس آگ نے بھڑک کر دلبست گھر جلایا

جی دے کے لیتے ایسے معشوق بے بدل کو ۔۔۔ یوسف عزیز دلہا سستا بہت بکایا

زلفِ سیاہ اُس کی جاتی نہیں نظر سے ۔۔۔ اس چشم روسیہ نے روزِ سیہ دکھایا

نام اُس کا سُن کے آنسو گر ہی پڑے پلک سے ۔۔۔ دل کا لگاؤ یارو چھپتا نہیں چھپایا

تھا لطفِ زیست جن سے وے اب نہیں ہیں میرؔ ۔۔۔ مدت ہوئی کہ ہم نے جینے سے ہاتھ اُٹھایا

مہندی لگی تھی تیرے پانوں میں کیا پیارے ۔۔۔ ہنگام خون عاشق سر پر جو تو نہ آیا

یہ پیروی کسو سے کاہے کو ہو سکے ہے
رکھتا ہے داغ ہم کو قامت کا اس کی سایا

دیکھی نہ پیش جاتے ہرگز خردوری میں
دانستہ باؤلا ہم اپنے تئیں بنایا

کہتی تھی بیدماغی اک شور مادمن میں
آنکھوں کے مُند گئے پر آرام سا تو پایا

گل پھول سے بھی تو جو لیتا ہے منہ کو پھیرے
مکھڑے سے کس کے تو نے اے میر دل لگایا

نکتہ مشتاق و یار ہے اپنا
شاعری تو شعار ہے اپنا

بیخودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات
اب یہی روزگار ہے اپنا

دے کے دل ہم جو ہو گئے مجبور
اس میں کیا اختیار ہے اپنا

کچھ نہیں ہم مثال عنقا لیک
شہر شہر اشتہار ہے اپنا

جس کو تم آسمان کہتے ہو
سو دلوں کا غبار ہے اپنا

صرفہ آزار میر میں نہ کرو
خستہ اپنا ہے زار ہے اپنا

روکش ہوا جو شب وہ بالائے بام نکلا
ماہِ تمام یارو کیسا ناتمام نکلا

ہو گوشہ گیر شہرت مدنظر اگر ہے
عنقا کی طرح اپنا عزلت سے نام نکلا

تھا جن کو عاشقی میں دعوائے پختہ مغزی
سودا انھوں کا آخر دیکھا تو خام نکلا

نومید قیس پایا ناکام کوہکن کو
اس عشق فتنہ گر سے وہ کس کا کام نکلا

کیونکر نہ مر رہے جو بیتاب میر ہو
اک آدھ دن تو گھر سے دل تھام تھام نکلا

کیا کہیں کچھ کہا نہیں جاتا
اب تو چپ بھی رہا نہیں جاتا

غم میں جاتی ہے عمر دہ روزہ
اپنے ہاں سے دہا نہیں جاتا

طاقتِ دل تلک تعب کھینچے
اب ستم ٹک سہا نہیں جاتا

اس درِ تر کا حیرتی ہے بحر
تب تو اس سے بہا نہیں جاتا

کب تری رہ میں میر گرد آلود
لوہو میں آ نہا نہیں جاتا

کبھی اُس کی جو میں جتانے لگا
سب مجھے سیدھیاں وہ سنانے لگا

تحمل نہ تھا جس کو ٹک سو وہ میں
ستم کیسے کیسے اُٹھانے لگا

رُندھے عشق میں کوئی یوں کب تلک
جگر آہ مُنہ تک تو آنے لگا

پریشاں ہیں اس وقت میں نیک و بد
موا جو کوئی وہ ٹھکانے لگا

کروں یاد اُسے ہوں جو میں آپ میں
سو یھاں جی ہی اب بھول جانے لگا

پس از عمر اُودھر گئی تھی نگاہ
سو آنکھیں وہ مجھ کو دکھانے لگا

نہیں رہتے عاقل علاقے بغیر
کہیں میر دل کو دوانے لگا

اللہ رے غرور و ناز تیرا
مطلق نہیں ہم سے ساز تیرا

ہم سے کہ تجھی کو جانتے ہیں
جاتا نہیں احتراز تیرا

مل جن سے شراب تو پیے ہے
کہہ دیتے ہیں وہ ہی راز تیرا

کچھ عشق و ہوس میں فرق بھی کر
کیدھر ہے وہ امتیاز تیرا

کہتے نہ تھے میر مت کڑھا کر
دل ہو نہ گیا گداز تیرا

نظر میں آوے گا جب جی کا کھونا
ملے گا نیند بھر تب مجھ کو سونا

مرا خون تجھ پہ ثابت ہی کرے گا
کنارے بیٹھ کر ہاتھوں کو دھونا

وصیت میر نے مجھ کو یہی کی
کہ سب کچھ ہونا تو عاشق نہ ہونا

اُس آستان داغ سے میں زر لیا کیا
گل دستہ جس کو چراغی دیا کیا

کیا بعد مرگ یاد کرے گا وفا مجھے
سہتا رہا جفائیں میں جب تک جیا کیا

اب وہ جگر طپش سے تڑپتا ہے تشنہ لب
مدت تلک جو میر کا لوہو پیا کیا

آنسو مری آنکھوں میں ہر دم جو نہ آجاتا
تو کام مرا اچھا پردے میں چلا جاتا

اصلح ہے حجاب اُس کا ہم شوق کے ماروں سے
بے پردہ جو وہ ہوتا تو کس سے رہا جاتا

طفلی کی ادا تیری جاتی نہیں یہ جی سے
ہم دیکھتے تجھ کو تو تو منہ کو چھپا جاتا

صد شکر کہ داغِ دل افسردہ ہوا ورنہ
یہ شعلہ بھڑکتا تو گھر بار جلا جاتا

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

[1] ان آنکھوں سے ہم چشمی بر جا ہے جو بیں جل کر
بادام کو کل یار و مجلس ہی میں کھا جاتا

صحبت سگ و آہو کی یک عمر رہی باہم
وہ بھاگتا مجھ سے تو میں اس سے لگا جاتا

گر عشق نہیں ہے تو یہ کیا ہے بھلا مجھ کو
جی خود بخود اے ہمدم کاہے کو کھپا جاتا

جوں ابر نہ تھم سکتا آنکھوں کا مری جھمکا
جوں برق اگر وہ بھی جھمکی سے دکھا جاتا

تکلیف نہ کی ہم نے اس وحشی کو مرنے کی
تھا میر تو ایسا بھی دل جی سے اٹھا جاتا

بالقوہ ٹک دکھایئے چشمِ پُرآب کا
دامن پکڑ کے روئیے یک دم سحاب کا

جو کچھ نظر پڑے ہے حقیقت میں کچھ نہیں
عالم میں خوب دیکھو تو عالم ہے خواب کا

دریا دلی جنھیں ہے نہیں ہوتے کاسہ لیس
دیکھا ہے واژگوں ہی پیالہ حباب کا

شاید کہ قلب یار بھی ٹک اس طرف پھرے
میں منتظر زمانے سے ہوں انقلاب کا

بارے نقاب دن کو جو رکھتا ہے منہ پہ تو
پردہ سا رہ گیا ہے کچھ اک آفتاب کا

تلوار بن نکلتے نہیں گھر سے ایک دم
خوں کر رہو گے تم کسو خانہ خراب کا

[2] یہ ہوش دیکھ آگے مرے ساتھ غیر کے
رکھتا ہے پانوں مست ہو جیسے شراب کا

مجنوں میں اور مجھ میں کرے کیوں نہ فرق عشق
چھپنا نہیں ہنر تو جلے سے کباب کا

رو فرصتِ جوانی پہ جوں ابر بے خبر
انداز برق کا سا ہے عہدِ شباب کا

وھاں سے تو نامہ بر کو ہے کب کا جواب صاف
میں سادگی سے لاگو ہوں خط کے جواب کا

ٹپکا کرے ہے زہر ہی صرف اس نگاہ سے
وہ چشم گھر ہے غصہ و ناز و عتاب کا

لائق تھا یہ چھپنے ہی کے مصرعِ قدِ یار
میں معتقد ہوں میر ترے انتخاب کا

خندۂ دنداں نما کرتا جو وہ کافر گیا
گوہر تر جوں سرشک آنکھوں سے سب کی گر گیا

کیا گزر کوے محبت میں ہنسی ہے کھیل ہے
پانوں رکھا جس نے ٹک اودھر پھر اس کا سر گیا

کیا کوئی زیر فلک اونچا کرے فرق غرور
ایک پتھر حادثے کا آ لگا سر چر گیا

[1] گنا بیگم کا ایک شعر ہے: — مقابل ہو ترے لب کے اگر مصری چبا جاؤں ؛ تری آنکھوں کی ہم چشمی کرے بادام کھا جاؤں

[2] بر دوشِ غیر دست نہاد از رہِ کرم ـ مارا چو دید لغزش پا را بہانہ ساخت (قتیل)

نیزہ بازانِ مژہ میں دل کی حالت کیا کہوں
ایک ناکسبی سپاہی دکھنیوں میں گھر گیا

بعد مدت اس طرف لایا تھا اُس کو جذبِ عشق
بخت کی برگشتگی سے آتے آتے پھر گیا

تیز دست اتنا نہیں وہ ظلم میں اب فرق ہے
یعنی لوہا تھا کڑا تیغِ ستم کا گر گیا

سخت ہم کو میرؔ کے مرجانے کا افسوس ہے
تم نے دل پتھر کیا وہ جان سے آخر گیا

اس بد زباں نے حرفِ سخن آہ کب کیا
چپکے ہی چپکے اُن نے ہمیں جاں بلب کیا

طاقت سے میرے دل کی خبر تجھ کو کیا نہ تھی
ظالم نگاہ چشم ادھر کی غضب کیا

یکساں کیا نہیں یہی ہیں خاک رہ سے آج
ایسا ہی کچھ سلوک کیا اُن نے جب کیا

عمامہ لے کے شیخ کہیں میکدے سے جا
بس مغبچوں نے حد سے زیادہ ادب کیا

اس رخ سے دل اُٹھایا تو زلفوں میں جا پھنسا
القصہ اپنے روز کو ہم نے بھی شب کیا

ظاہر ہوا نہ مجھ پہ کچھ اس ظلم کا سبب
کیا جانوں خون اُن نے مرا کس سبب کیا

کچھ آگے آئے ہوتے جو منظور لطف تھا
ہم جی سے اپنے جا چکے تم قصد تب کیا

بچھڑے تمھارے اپنا عجب حال ہو گیا
جس کی نگاہ پڑ گئی اُن نے عجب کیا

برسوں سے اپنے دل کی ہے دل ہی میں کہ یار نے
اک دن جدا نہ غیر سے ہم کو طلب کیا

کی زندگی سو وہ کی موے اب سو اس طرح
جو کام میرؔ جی نے کیا سو کڈھب کیا

اب چھاتی کے جلنے نے کچھ طور بدل ڈالا
سب درد ہو شدت کا اس دل ہی کو دل ڈالا

ہم عاجزوں کا کھونا مشکل نہیں ہے ایسا
کچھ چونٹیوں کو لے کر پانوں تلے مل ڈالا

اٹکھیلی کی بھی اس کی دل تاب نہیں لاتا
کیا پگڑی کے پیچوں میں لے بالوں کو بل ڈالا

تشویش سے اب خالی کس دن ہی مزاج اپنا
اس دل کی خلش نے بھی کیا آہ خلل ڈالا

مجھ مست کو کیا نسبت اے میرؔ مسائل سے
منہ شیخ کا مسجد میں میں رک کے مسل ڈالا

طوفان میرے رونے سے آخر کو ہو رہا
یونان کی طرح بستی یہ سب میں ڈبو رہا

بہتوں نے چاہا کہیے پہ کوئی نہ کہہ سکا
احوالِ عاشقی کا مری گو مگو رہا

آخر موا ہی وہاں سے نکلتا سنا اُسے
کوچے میں اس کے جا کے ستم دیدہ جو رہا

آنسو تھما نہ جب سے گیا وہ نگاہ سے
پایان کار آنکھوں کو اپنی میں رو رہا

کیا بے شریک زندگی کی شیخ شہر نے
شاباش بھی وہی تھا وہی مردہ شو رہا

یاروں نے جل کے مرنے سے میر کیا خطاب
رہتے تھے ہم تو دل ہی کو تو جی بھی کھو رہا

جب رات سر پٹکنے نے تاثیر کچھ نہ کی
ناچار میر منہ کو لپیٹے ہی مار سو رہا

لعل پر کب دل مرا مائل ہوا
اس لب خاموش کا قائل ہوا

لڑ گئیں آنکھیں اٹھائی دل نے چوٹ
یہ تماشائی عبث گھائل ہوا

ناشکیبی سے گئی ناموس فقر
عاقبت بوسے کا میں سائل ہوا

ایک سے تھے ہم دے نہ ہوتے ہست اگر
اپنا ہونا بیچ میں حائل ہوا

میر ہم کس ذیل میں دیکھ اس کی آنکھ
ہوش اہل قدس کا زائل ہوا

کوئی فقیر یہ اے کاش کے دعا کرتا
کہ مجھ کو اس کی گلی کا خدا گدا کرتا

کبھو جو آن کے ہم سے بھی تو ملا کرتا
تو تیرے جی میں مخالف نہ اتنی جا کرتا

چمن میں پھول گل اب کے ہزار رنگ کھلے
دماغ کاش کہ اپنا بھی ٹک وفا کرتا

فقیر بستی میں تھا تو ترا زیاں کیا تھا
کبھو جو آن نکلتا کوئی صدا کرتا

علاج عشق نے ایسا کیا نہ تھا اس کا
جو کوئی اور بھی مجنوں کی کچھ دوا کرتا

قدم کے چھونے لئے استادگی تجھی سے ہوئی
کبھو وہ یہاں تو مرے ہاتھ بھی لگا کرتا

بدی نتیجہ ہے نیکی کا اس زمانے میں
بھلا کسو سے جو کرتا تو تو برا کرتا

تلاطم آنکھ کے صد رنگ ہتے تھے تجھ بن
کبھو کبھو جو یہ دریائے خوں چڑھا کرتا

کہاں سے نکلی یہ آتش نہ جانتا تھا میں
شروع ربط میں اس کے جو دل جلا کرتا

گلی سے یار کی ہم لے گئے سر پر شور
دگرنہ شام سے ہنگامہ ہی رہا کرتا

خراب مجھ کو کیا دل کی لاگ نے ورنہ
فقیر تکیے سے کاہیکو یوں اٹھا کرتا

گئے پہ تیرے نہ تھا ہمنفس کوئی اے گل
کبھو نسیم سے میں درد دل کہا کرتا

کہیں کی خاک کوئی منہ پہ کب تلک ملتا
خراب و خوار کہاں تک بھلا پھرا کرتا

موئے ہی رہنی تھی عزت مری محبت میں
ہلاک آپ کو کرتا نہیں تو کیا کرتا

ترے مزاج میں تاب تعب تھی میرؔ کہاں
کسو سے عشق نہ کرتا تو تو بھلا کرتا

بندھا رات آنسو کا کچھ تار سا
ہوا ابرِ رحمت گنہگار سا

کوئی سادہ ہی اُس کو سادہ کہے
لگے ہے ہمیں تو وہ عیّار سا

محبّت ہے یا کوئی جی کا ہے روگ
سدا میں تو رہتا ہوں بیمار سا

گل و سرو اچھے سبھی ہیں ولے
نہ نکلا چمن میں کوئی یار سا

جو ایسا ہی تم ہم کو سمجھو ہو سہل
ہمیں بھی یہ جینا ہے دشوار سا

فلک نے بہت کھینچے آزار لیک
نہ پہنچا بہم اُس دل آزار سا

مگر آنکھ تیری بھی چپکی کہیں
ٹپکتا ہے چتون سے کچھ پیار سا

چمن ہووے جو انجمن تجھ سے وھاں
لگے آنکھ میں سب کی گل خار سا

کھڑے منتظر ضعف[1] جو آ گیا
گرا اُس کے در پر میں دیوار سا

دکھاؤں متاعِ وفا کب اُسے
لگا وھاں تو رہتا ہے بازار سا

عجب کیا جو اس زلف کا سایہ دار
پھرے راتوں کو بھی پری دار[2] سا

نہیں میرؔ مستانہ صحبت کا باب
مصاحب کرو کوئی ہشیار سا

حیراں ہے لحظہ لحظہ طرزِ عجب عجب کا
جو رفتۂ محبت واقف ہے اس کے ڈھب کا

کہتے ہیں کوئی صورت بن معنی یہاں نہیں ہے
یہ وجہ ہے کہ عارف مُنہ دیکھتا ہے سب کا

نسبت درست جس کی اس رو و مو سے پائی
ہے درہم اور برہم حال اس کے روز و شب کا

افسوس ہے نہیں تو انصاف دوست ورنہ
شایان لطف دشمن شایستہ ہیں غضب کا

سودائی ایک عالم اس کا بنا پھرے ہے
ہر چند عزلتی ہے وہ خال کنجِ لب کا

مُنہ اس کے منہ کے اوپر شام و سحر رکھوں ہوں
اب ہاتھ سے دیا ہے سر رشتہ میں ادب کا

کیا آجکل سے اُس کی یہ بے توجہی ہے
مُنہ اُن نے اس طرف سے پھیرا ہے میرؔ کب کا

سیکڑوں بیکسوں کا جان گیا
پر یہ تیرا نہ امتحان گیا

وائے احوال اس جفاکش کا
عاشق اپنا جسے وہ جان گیا

[1] ضعف بمعنی غش ۱۲ [2] پریدار - آسیب زدہ ۱۲

داغِ حرماں ہی خاک میں بھی ساتھ — جی گیا پر نہ یہ نشان گیا
کل نہ آنے میں ایک یہاں تیرے — آج سو سو طرف گمان گیا
حرف نشنو کوئی اسے بھی ملا — تب تو میں نے کہا سو مان گیا
دل سے مت جا کہ پھر وہ پچھتایا — ہاتھ سے جس کے یہ مکان گیا
پھرتے پھرتے تلاش میں اُس کی — ایک میرا ہی یوں نہ جان گیا
اب جو عیسیٰ فلک پہ ہی وہ بھی — ق — شوق میں برسوں خاک چھان گیا

کون جی سے نجائے گا اے میرؔ
حیف[1] یہ ہی کہ تو جوان گیا

ہنگامِ شرحِ غمِ جگر خامہ شق ہوا — سوزِ دروں سے نامہ کباب ورق ہوا
بندہ خدا ہی پھر تو اگر گزرے آپ سے — مرتا ہی جو کوئی اسے کہتے ہیں حق ہوا
دل میں رہا نہ کچھ تو کیا ہم نے ضبطِ شوق — یہ شہر جب تمام لٹا تب نسق ہوا
وہ رنگ و وہ روش وہ طرح سب گئی بباد — آتے ہی تیرے باغ میں منہ گل کا فق ہوا
برسوں تری گلی میں چمن ساز جو رہا — سو دیدہ اب گداختہ ہو کر شفق ہوا
لے کر زمیں سے تا بفلک رک گیا ہی آہ — کس دردمندِ عشق کو یارب قلق ہوا

اس نو ورق میں میرؔ جو تھا شرح و بسط سے
بیٹھا جو درسے میں تو ترا اک سبق ہوا

کل میں کہا وہ طور کا شعلہ کہاں گرا — دل نے جگر کی اور اشارت کی یہاں گرا
منظر خراب ہونے کو ہی چشمِ تر کا حیف — پھر دید کی جگہ نہیں جو یہ مکاں گرا
روح القدس کو سہل کیا یار نے شکار — اک تیر میں وہ مرغِ بلند آشیاں گرا
پہنچا یا مجھ کو عجز نے مقصود دل کے تئیں — یعنی کہ اس کے در ہی پہ میں ناتواں گرا
شور اک مری نہاد سے تجھ بن اٹھا تھا رات — جس سے کیا خیال کہ یہ آسماں گرا
کیا کم تھا شعلہ شوق کا شعلے سے طور کے — پتھر بھی وہاں کے جل گئے جا کر جہاں گرا

ڈوبا خیالِ چاہ زنخداں میں اس کے میرؔ
دانستہ کیوں کوئیں میں بھلا یہ جواں گرا

آتے ہی آتے تیرے یہ ناکام ہو چکا — وہاں کام ہی رہا ہے تجھے یہاں کام ہو چکا

[1] این ماتم سخت است گویند جوان مرد ۱۲

موسم گیا وہ ترکِ محبت کا ناصحا
میں اب تو خاص و عام میں بدنام ہو چکا

یا خط چلے ہی آتے تھے یا حرف ہی نہیں
شاید کہ سادگی کا وہ ہنگام ہو چکا

نا آشنائے حرف تھا وہ شوخ جب تبھی
ہم سے تو ترکِ نامہ و پیغام ہو چکا

تڑپے ہے جب کہ سینے میں اچھلے ہے دو دو ہاتھ
گر دل یہی ہے میر تو آرام ہو چکا

سنبل تمھارے گیسوؤں کے غم میں لٹ گیا
ابرو کی تیغ دیکھ مہِ عید کٹ گیا

عالم میں جاں کے مجھ کو تنزہ تھا اتو نیں
آلودگی جسم سے ماٹی میں اٹ گیا

ظلم و جفا و جور پر اصرار اس قدر
ہمت دیکھ دیکھ تیری دل اپنا بھی ہٹ گیا

اب وہ سماں نہیں ہے کہ وہ کام جانِ خلق
مغموم ہم کو دیکھ کے دوڑا لپٹ گیا

دشوار سیتے ہیں گے جو بید سب پھٹی ہے جیب
بیطوریوں سے اس کی دل اپنا تو پھٹ گیا

داماں و جیب دونوں ہوئے ٹکڑے ایک جا
اب کی یہ کام ہاتھ سے تیرے سمٹ گیا

خاطر اگر ہو جمع پریشانی بھی سبھے
سو دل تو دو طرف تری لغوں سے بٹ گیا

ٹک رات اس کے منہ سے ہوا تھا مقابلہ
پھر ماہِ چار دہ کو جو دیکھا تو گھٹ گیا

کیا پوچھو ہو نصیب ہمارے الٹ گئے
چل کر ادھر کو یار پھر اودھر الٹ گیا

بلبل کی اور گل کی جو صحبت کی میر
دل اپنا دلبروں کی طرف سے اچٹ گیا

سینے میں شوق میر کے سب درد ہو گیا
دل پر رکھا تھا ہاتھ سو منہ زرد ہو گیا

نکلا تھا آج صبح بہت گرم ہو لے
خورشید اس کو دیکھتے ہی سرد ہو گیا

بے پردہ اس کی شوخی قیامت ہے دیکھیو
یہاں خاک سی اڑا دی فلک گرد ہو گیا

کشتی ہر اک فقیر کی بھر دی شراب سے
اس دور میں کلال عجب مرد ہو گیا

دفتر لکھے ہیں میر نے دل کے الم کے یہ
یہاں اپنے طور و طرز میں وہ فرد ہو گیا

کیا تو نمود کس کی کیسا کمال تیرا
ہے نقش وہم آیا کیدھر خیال تیرا

کیا ہے جو ہو زنخ زن مہ پاس کا ستارا
ہے داغ جانِ عالم ٹھوڑی کا خال تیرا

ہے گل مغل بچہ وہ مرزا ہے اس کے آگے
کچھ کبھی بھلا سے لگے ہے منہ لال لال تیرا

تجھ روئے خوں فشاں سے انجم ہی کیا خجل ہیں
ہے آفتاب کو بھی اے ماہ سال تیرا

اب صبح پاس گل کے ہو کر نہیں نکلتی
دیکھا نسیم نے بھی شاید جمال تیرا

پہلا قدم ہے انساں پامال مرگ ہونا
کیا جانے رفتہ رفتہ کیا ہو مآل تیرا

ہوگی جو چل سر مو پنہاں نہیں رہیگی
اک دن زبان ہوگا ایک ایک بال تیرا

تفصیل حال میری تھی باعثِ کدورت [۵۱]
سو جی کو خوش نہ آیا ہرگز ملال تیرا

کچھ زرد زرد چہرہ کچھ لاغری بدن میں
کیا عشق میں ہوا ہے اے میر حال تیرا

فرو آتا نہیں سنا نہ سے اب کے اسیروں کا
اگرچہ آسماں تک شور جاوے ہم فقیروں کا

تبسم سحر ہے جب پان سے لب سرخ ہوں اس کے
دلوں میں کام کرجاتا ہے یہاں جادو کے تیروں کا

سرکنا اس کے درباں پاس سے ہے شب کو بھی مشکل
سر زنجیر زیرِ سر رکھے ہے ہم اسیروں کا

گئے بہتوں کے سر لڑکوں نے جو یہ باندھنوں باندھے
شہید اک میں نہیں ان باندھنوں کے سرخ چیروں کا

قفس کے چاک سے دیکھوں ہوں میں تو تنگ آتا ہوں
چمن میں غنچہ ہو آنا گلوں پر ہم صفیروں کا

ہمارے دیکھتے زیرِ نگیں تھا ملک سب جن کے
کوئی اب نام بھی لیتا نہیں ان ملک گیروں کا

دل میرؔ کو تو ان پلکوں ہی نے سب چھان مارا تھا
کیا میرؔ ان نے خالی یوں ہی ترکش اپنے تیروں کا

ہوئیں رسوائیاں جس کیلئے چھوٹا دیار اپنا
ہوا وہ بے مروت بے وفا ہرگز نہ یار اپنا

خدا جانے ہمیں اس بیخودی نے کس طرف پھینکا
کہ مدت ہو گئی ہم کھینچتے ہیں انتظار اپنا

ذلیل اُس کی گلی میں ہوں تو ہوں آزردگی کیسی
کہ رنجش اس جگہ ہووے جہاں ہو اعتبار اپنا

اگرچہ خاک اُڑائی دیدۂ تر نے بیاباں کی
ولے نکلا نہ خاطر خواہ رونے سے غبار اپنا

کہا بد وضع لوگوں نے جو دیکھا رات کو ملتے
ہوا صحبت میں ان لڑکوں کی ضائع روزگار اپنا

کریں جو ترکِ عزلت واسطے مشہور ہونے کے
مگر شہروں میں کم ہے جیسے عنقا اشتہار اپنا

دلِ بے تاب و بے طاقت سے کچھ چلتا نہیں ورنہ
کھڑا بھی وہاں نہ جا کر ہوں اگر ہو اختیار اپنا

۵۱ حسرت موہانی سہ عشقِ بتاں کو جی کا جنجال کر لیا ہے ؛ حسرت یہ تو نے اپنا کیا حال کر لیا ہے۔
۵۲ میر تقی میر سہ بیخودی لے گئی کہاں ہم کو ؛ دیر سے انتظار ہے اپنا ۔
میر تقی میر سہ ہم آپ سے گئے سو آئی کہاں سے گئے ؛ مدت ہوئی کہ اپنا ہمیں انتظار ہے۔

عجب ہم بے بصیرت ہیں کہاں کھولا ہے بار آکر
جہاں سے لوگ سب رختِ سفر کرتے ہیں بار اپنا

نہ ہو یوں میکدہ مسجد سا پرواں ہوش جاتے ہیں
ہوا ہے دونوں جاگہ ایک دو باری گزار اپنا

سراپا آرزو ہم لوگ ہیں کاہیکو رندوں میں
رہے ہیں اب تلک جیتے ولے دل مار مار اپنا

گیا وہ بوجھ سب ہلکے ہوئے ہم میر آخر کو
مناسب تھا نہ جانا اس گلی میں بار بار اپنا

ربطِ دل زلف سے اس کی جو نہ چسپاں ہوتا
اس قدر حال ہمارا نہ پریشاں ہوتا

ہاتھ دامن میں ترے مارتے جھنجھلا کے نہ ہم
اپنے جامے میں اگر آج گریباں ہوتا

میری زنجیر کی جھنکار نہ کوئی سنتا
شور مجنوں نہ اگر سلسلہ جنباں ہوتا

ہر سحر آئینہ رہتا ہے ترا منہ تکتا
دل کی تقلید نہ کرتا تو نہ حیراں ہوتا

وصل کے دن سے بدل کیونکہ شبِ ہجراں ہو
شاید اس طور میں ایام کا نقصاں ہوتا

طور اپنے پہ جو ہم روتے تو پھر عالم میں
دیکھتے تم کہ وہی نوح کا طوفاں ہوتا

دل میں کیا کیا تھا ہمارے جو نہ ہو جاتی یاس
یہ نگر کاہیکو اس طرح سے ویراں ہوتا

خاک پا ہو کے ترے قد کا چمن میں رہتا
سرو اتنا نہ اکڑتا اگر انساں ہوتا

میر بھی دیر کے لوگوں ہی کی سی کہنے لگا
کچھ خدا لگتی بھی کہتا جو مسلماں ہوتا

جس پہ اس موج سی شمشیر کا اک وار کیا
کام اُس شوق کے ڈوبے ہوئے کا پار کیا

گیا عشق میں جو پیش نشیب اور فراز
ہو کے میں خاک برابر اُسے ہموار کیا

کیا کروں جنسِ وفا پھیرے لئے جاتا ہوں
بختِ بد نے نہ اُسے دل کا خریدار کیا

اتفاق ایسے پڑے ہم تو منافق ٹھہرے
چرخِ ناساز نے غیروں سے اُسے یار کیا

ایسے آزار اٹھانے کا ہمیں کب تھا دماغ
کوفت نے دل کی تو جینے سے بھی بیزار کیا

جی ہی جاتے سنے ہیں عشق کے مشہور ہوئے
کیا کیا ہم نے کہ اس راز کو اظہار کیا

دیکھیے اس ماہ کو جو کتنے مہینے گزرے
بڑھ گئی کاہشِ دل ایسی کہ بیمار کیا

طائرِ بلبلِ بیدل ہے پریشان بہت
موسمِ گل نے مگر رختِ سفر بار کیا

میر اے کاش زباں بند رکھا کرتے ہم
صبح کے بولنے نے ہم کو گرفتار کیا

شب رفتہ میں اس کے در پر گیا
سگ یار آدم گری کر گیا

شکستہ دلِ عشق کی جان گیا
نظر پھیری تو نے تو وہ مر گیا

ہوئے یار کیا کیا خراب اس بغیر
وہ کس خانہ آباد کے گھر گیا

کشندہ تھا لڑکا ہی ناکردہ خوں
مجھے دیکھ کر محتضر ڈر گیا

بہت رفتہ رہتے ہو تم اس کے اب
مزاج آپ کا میر کیدھر گیا

بے طاقتی میں تو تو اے میر مر رہے گا
ایسی طپش سے دل کی کوئی جگر رہے گا

کیا ہے جو راہ دل کی طے کرتے مر گئے ہم
جوں نقش پا ہمارا تا دیر اثر رہے گا

مت کر لٹکپن اتنا خوں ریزی میں ہماری
اس طور لوہو میں تو دامن کو بھر رہے گا

آگاہ پائی ہم نے کھوئے گئے سے یعنی
پہنچی خبر اُدھر کی دل بے خبر رہے گا

فردا کا سوچ تجھ کو کیا آج ہی پڑا ہے
کل کی سمجھیو کل ہی کل تو اگر رہے گا

لوگوں کا پاس ہم کو مارے رکھے ہے ورنہ
ماتم میں دل کے شیون دو دو پہر رہے گا

پایان کار دیکھیں کیا ہووے دل کی صورت
ایسا ہی جو وہ چہرہ پیش نظر رہے گا

اب رفتگی رویّہ اپنا کیا ہے میں نے
میرا یہ ڈھب دلوں میں کچھ راہ کر رہے گا

ہم کوئی بیت جا کر اس ہی کے منہ سنیں گے
وحشت زدہ کسو دن گر میر گھر رہے گا

پند گو مشفق عبث میرا نصیحت گر ہوا
سختیاں جو میں بہت کھینچیں سو دل پتھر ہوا

گاڑ کر مٹی میں روے عجز کیا ہم ہی موے
خون اس کے رہ گزر کی خاک پر اکثر ہوا

اب اٹھا جاتا نہیں مجھ پاس پھر ٹک بیٹھ کر
گرد اس کے جو پھرا سر کو مرے چکر ہوا

کب کھبا جاتا تھا یوں آنکھوں میں جیسا صبح تھا
پھول خوش رنگ اور اس کے فرش پر بچھکر ہوا

کیا سنی تم نے نہیں بد حالیِ فرہاد و قیس
کونسا بیمار دل کا آج تک بہتر ہوا

کون کرتا ہے طرف مجھ عاشقِ بیتاب کی
صورتِ خوش جن نے دیکھی اس کی ہو اودھر ہوا

جل گیا یاقوت اس کے لعلِ لب جب ہل گئے
گوہرِ خوش آب اندازِ سخن سے تر ہوا

کیا کہوں اب کی جنوں میں گھر کا بھی رہنا گیا
کام جو مجھ سے ہوا سو عقل سے باہر ہوا

شب نہ کرتا شور اس کوچے میں گر میں جانتا
اس کی بے خوابی سے ہنگامہ مرے سر پر ہوا

ہووے یارب ان سیہ رو آنکھوں کا خانہ خراب
یک نظر کرتے ہی میرے دل میں اس کا گھر

استخواں سب پوست سے سینے کے آتے ہیں نظر
عشق میں ان نوخطوں کے میر میں مسطر ہوا

ٹپکتی پلکوں سے رومال جب گھڑی بھر کا
طرف ہوا نہ کبھو ابر دیدۂ تر کا

کبھو تو دیر میں ہوں میں کبھو ہوں کعبہ میں
کہاں کہاں لئے پھرتا ہی شوق اس در کا

غمِ فراق سے پھر سوکھ کر ہوا کانٹا
بچھا جو پھول اُٹھا کوئی اُس کے بستر کا

اسیر جرگے میں ہو جاؤں میں تو ہو جاؤں
وگرنہ قصد ہو کس کو شکارِ لاغر کا

ہیں کہ جلنے سے خوگر ہیں آگ میں ہی عیش
محیط میں تو تلف ہوتا ہی سمندر کا

قریب خط کا نکلنا ہوا سو خط موقوف
غبار دور ہو کس طور میرے دلبر کا

بتا کے کعبہ کا رستہ اُسے بھلاؤں راہ
نشاں جو پوچھے کوئی مجھ سے یار کے گھر کا

کسو سے مل چلے ٹک وہ تو ہی بہت ورنہ
سلوک کاہیکو شیوہ ہی اُس ستمگر کا

شکستہ بالی و لب بستگی پر اب کی نہ جا
چمن میں شور مرا اب تلک بھی ہی پر کا

تلاشِ دل نہیں کام آتی اُس زنخ میں گئے
کہ چاہ بیں تو ہی مرنا بُرا شناور کا

پھرے ہی خاک ملے منہ پہ یا نمد پہنے
یہ آئنہ ہی نظر کردہ کس قلندر کا

نہ ترکِ عشق جو کرتا تو میر کیا کرتا
جفاکشی نہیں ہی کام نازپرور کا

حلقہ ہوئی وہ زلف کماں کو چھپا رکھا
طاق بلند پر اسے سب نے اُٹھا رکھا

اس مہ سے دل کی لاگ وہی متصل ہی
گو چرخ نے بصورت ظاہر جدا رکھا

گرڑوا دیا ہو مار کر اک دو کو تو کہوں
کب ان نے خون کر نہ کسو کا دبا رکھا

ٹک میں لگا تھا اس نمکی شوخ کے گلے
چھاتی کے میرے زخموں نے برسوں مزا رکھا

کاہیکو آئے چوٹ کوئی دل پہ شیخ کے
اس بُلہوس نے اپنے تئیں تو بچا رکھا

ہم مر ہی جاتے عشق میں اکثر سنا کیے
اس راہ خوفناک میں کیوں تم نے پا رکھا

آزارِ دل نہیں ہی کسو دین میں درست
کیا جانوں ان بتوں نے ستم کیوں روا رکھا

کیا میں ہی محو چشمک انجم ہوں خلق کو
اس مہ نے ایک جھمکی دکھا کر لگا رکھا

کیا زہر چشم یار کو کوئی بیاں کرے
جس کی طرف نگاہ کی اُس کو سلا رکھا

ہر چند شعر میرؔ کا دل معتقد نہ تھا
پر اس غزل کو ہم نے بھی سُن کر لکھا رکھا

میں جوانی میں مے پرست رہا / گردنِ شیشہ ہی میں دست رہا
در میخانہ میں مرے سر پر / حال ممدود دار بست رہا
سر پہ پتھر جنوں میں کب نہ پڑے / یہ سبو ثابت شکست رہا
ہاتھ کھینچا سو پیر ہو کر جب / تب گنہ کرنے کا نہ دست رہا
آنسو پی گیا جو برسوں میں / دل دروں میں آب خست رہا
جب کہو تب بلند کہئے اُسے / قد خوباں کا سرو بست رہا

میرؔ کے ہوش کے ہیں ہم عاشق
فصلِ گل جب تلک تھی مست رہا

چمن بھی ترا عاشقِ زار تھا / گلِ سرخ اک زرد رخسار تھا
گئی نیند شیون سے بلبل کی رات / کہیں دل ہمارا گرفتار تھا
قدِ یار کے آگے سروِ چمن / کھڑا دور جیسے گنہگار تھا
یہی جنس دل کی گراں قدر تھی / ولے جب تلک تو خریدار تھا
بہت روئے ہم شبنم و گل کو دیکھ / کہ جیساں ہمیں بھی کہیں پیار تھا
مجھے اے دل چاک کیا شانہ سا / کسو زلف سے کچھ سروکار تھا

گیا میرؔ یہاں سے کرو گے جو یاد
کہو گے کہ مسکین عجب یار تھا

دل گیا مفت اور دکھ پایا / ہو کے عاشق بہت میں پچھتایا
مر گیا تس پہ سنگسار کیا / نخلِ ماتم مرا یہ پھل لایا
یہ شبِ ہجر سر کرے ہی بری / ہو سفیدی کا جس جگہ سایا

صحن میں میرے اے گلِ مہتاب
کیوں شگوفہ تو کھلنے کا لایا

چاک کر سینہ دل میں پھینک دیا / کھینچے ایذا ہمیشہ کس کی بلا
تم کو جیتا رکھے خدا اے بتاں / مر گئے ہم تو کرتے کرتے وفا

سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں
دل سے اک داغ ہی جدا نہ ہوا

اٹھ گیا میرؔ وہ جو بالیں سے
پھر مری جان مجھ میں کچھ نہ رہا

اندوہ و غم کے جوش سے دل رک کے خوں ہوا
اب کے مجھے بہار سے آگے جنوں ہوا

اچھا نہیں ہے رفتنِ رنگیں بھی اس قدر
سنیو کہ ایسی چال پر اک آدھ خوں ہوا

جی میں تھا خوب جا کے خرابے میں روئیے
سیلاب آیا، آگے چلا، کیا شگوں ہوا

نخچیر گاہِ عشق میں افراطِ صید سے
روح الامیں کا نام شکاری پر زبوں ہوا

ہوں داغ نازکی کہ کیا تھا خیال بوس
گل برگ سا وہ ہونٹھ جو تھا نیلگوں ہوا

میں دور ہوں اگرچہ برابر ہوں خاک سے
اس رہ میں نقشِ پا ہی مرا رہنموں ہوا

میرؔ ان نے سرگزشت سنی ساری رات کو
افسانہ عاشقی کا ہماری فسوں ہوا

منہ پر اس آفتاب کے ہے یہ نقاب کیا
پردہ رہا ہے کون سا ہم سے حجاب کیا

اے ابرِ تر یہ گریہ ہمارا ہے دیدنی
برسے ہے آج صبح سے چشمِ پُر آب کیا

دم گنتے گنتے اپنی کوئی جان کیوں نہ دو
وہ پاس آن بیٹھے کسو کے حساب کیا

سو بار اس کے کوچے تلک جاتے ہیں چلے
دل ہے اگر بجا تو یہ ہے اضطراب کیا

بس اب نہ منہ کھلاؤ ہمارا ڈھکے رہو
محشر کو ہم سوال کریں تو جواب کیا

دوزخ سو عاشقوں کو تو دوزخ نہیں رہا
اب وہاں گئے پہ ٹھہرے دیکھیں عذاب کیا

ہم جل کر ایک راکھ کی ڈھیری بھی ہو گئے
ہے اب تکلف آگے جلے گا کباب کیا

ہستی ہے اپنے طور پہ جوں بحر جوش میں
گرداب کیسا، موج کہاں ہے حباب کیا

دیکھا پلک اٹھا کے تو پایا نہ کچھ اثر
اے عمر برق جلوہ گئی تو شتاب کیا

ہر چند میرؔ بستی کے لوگوں سے ہے نفور
پر ہائے آدمی ہے وہ خانہ خراب کیا

اے نکیلے یہ تھی کہاں کی ادا
کھب گئی جی میں تیری بانکی ادا

جادو کرتے ہیں اک نگاہ کے بیچ
ہائے رے چشمِ دلبراں کی ادا

بات کہنے میں گالیاں دے ہے
سنتے ہو میرے بدزباں کی ادا

دل چلے جائے ہیں خرام کے ساتھ
دیکھی چلنے میں ان بتاں کی ادا

خاک میں مل کے میرؔ ہم سمجھے
بے ادائی تھی آسماں کی ادا

رہا میں تو عزت کا اعزاز کرتا
چلا عشق خواری کو ممتاز کرتا

نہ ہوتا میں حسرت میں محتاجِ گریہ
جو کچھ آنسوؤں کو پس انداز کرتا

نہ ٹھہرا مرے پاس دل ورنہ اب تک
اسے ایسا ہی میں تو جانباز کرتا

جو جانوں کہ در پہ ہے ایسا وہ دشمن
تو کاہے کو الفت سے میں ساز کرتا

تو تمکین سے کچھ نہ بولا وگرنہ
مسیحا صنم ترک اعجاز کرتا

گلوگیر ہی ہو گئی یا وہ گولی
رہا میں خموشی کو آواز کرتا

زیارت گہِ کبک تو ہو بلا سے
تک آ میرؔ کی خاک پر ناز کرتا

عید آئندہ تک رہے گا گلا
ہو چکی عید تو گلے نہ ملا

ڈوبا لوہو میں دیکھنا سرِ خار
حیف کوئی بھی آبلہ نہ چھلا

میں تو افسردہ ہر چمن میں پھرا
غنچۂ دل مرا کہیں نہ کھلا

یہ چوٹ کھائی ایسی دل پر کہ جی گنوایا
یعنی جدائی کا ہم صدمہ بڑا اٹھایا

مدت میں وہ ہوا شب ہم بستر آ کے میرا
خوابیدہ طالعوں نے اک خواب سا دکھایا

الجھاؤ پڑ گیا سو سلجھی نہ اپنی اس کی
جھگڑے رہے بہت سے گزرے بہت قضایا

آئینہ رو ہمارا آیا نہ نزع میں بھی
وقتِ اخیر اُن نے کیا خوب منہ چھپایا

اس بے مروتی کو کیا کہتے ہیں بتاؤ
ہم مارے بھی گئے پر وہ نعش پر نہ آیا

وہ روئے خوب اب کی ہرگز گیا نہ دل سے
جب گل کھلا چمن میں تب داغ ہم نے کھایا

خلطہ ہمارا اس کا حیرت ہی کی جگہ ہے
ڈھونڈا جہاں ہم اُس کو وہاں آپ کو ہی پایا

طرزِ نگہ سے اُس کی بیہوش کیا ہوں میں ہی
ان مست انکھڑیوں نے بہتیروں کو سلایا

آنکھیں کھلیں تو دیکھا جو کچھ نہ دیکھنا تھا
خوابِ عدم سے ہم کو کاہے کے تئیں جگایا

باقی نہیں رہا کچھ گھٹتے ہی گھٹتے ہم میں
بیماریِ دلی نے چنگا بہت بنایا

تونے کہ پانوں سے دل باہر نہیں رکھا ہے | عیارپن یہ کن نے تیرے تئیں سکھایا

کس دن ملائمت کی اس بت نے میرؔ ہم سے
سختی کھنچے نہ کیونکر تجھ سے دل لگایا

سمندر کا میں کیوں احساں سہوں گا | مرے آنسو نہیں ان پر بہوں گا
نہ تو آوے نہ جاوے بے قراری | یوں ہی اک دن سنا ہیں مر رہوں گا
ترے غم کے ہیں خواہاں سب کھا غم | کمی کیا ہو گی جو اک میں نہ ہوں گا

اگر جیتا رہا میں میرؔ اے یار
تو شب کو مو بمو قصہ کہوں گا

رکھتا تھا ہاتھ میں سر رشتہ بہت سینے کا | رو گیا دیکھ رفو چاک مرے سینے کا
ای طپش لوہو پیے میرا جو تو جھوٹ کے | کس سے یہ قاعدہ سیکھا ہے لہو پینے کا
اس میں حیراں ہوں کس کس کا گلا تجھ سے کروں | بدگمانی کا تغافل کا ترے کینے کا

میرؔ کی نبض پہ رکھ ہاتھ لگا کہنے طبیب
آج کی رات یہ بیمار نہیں جینے کا

عشق سے دل پہ تازہ داغ جلا | اس سیہ خانہ میں چراغ جلا

میرؔ کی گرمی تم سے اچرج ہے
کس سے ملتا ہے یہ دماغ جلا

ردیف الباء

اندوہ سے ہوئی نہ رہائی تمام شب | مجھ دل زدہ کو نیند نہ آئی تمام شب
جب میں شروع قصہ کیا آنکھیں کھول دیں | یعنی تھی مجھ کو چشم نمائی تمام شب
چشمک چلی گئی تھی ستاروں کی صبح تک | کی آسماں نے دیدہ درائی تمام شب
بخت سیہ نے دیر میں کل یاوری سے کی | تھی دشمنوں سے اس کو لڑائی تمام شب
بیٹھے ہی گزری وعدے کی شب وہ نہ آپھرا | ایذا عجب طرح کی اٹھائی تمام شب
سناہٹے سے دل سے گزر جائیں سو کہاں | بلبل نے گو کی نالہ سرائی تمام شب
تارے سے میری پلکوں پہ قطرے سرشک کے | دیتے رہے ہیں میرؔ دکھائی تمام شب

داغ ہوں جلتا ہی دل بے طور اب
دیکھئے کیا گل کھلے ہی اور اب

زخمِ دل غائر ہو پہنچا تا جگر
تم لگے کرنے ہماری غور اب

شعر پڑھتے پھرتے ہیں سب میر کے
اس قلمرو میں ہی ان کا دور اب

وہ جو کشش تھی اس کی طرف سے کہاں ہی اب
تیر و کماں ہی ہاتھ میں سینہ نشاں ہی اب

اتنا بھی منہ چھپانا خط آئے پہ و جبر کیا
لڑکا نہیں ہی نامِ خدا تو جواں ہی اب

پھول اس چمن کے دیکھتے کیا کیا جھڑے ہیں ہائے
سیلِ بہار آنکھوں سے میری رواں ہی اب

جن و ملک زمین و فلک سب نکل گئے
بارِ گرانِ عشق و دلِ ناتواں ہی اب

نکلی تھی اُس کی تیغ ہوئے خوش نصیب لوگ
گردن جھکائے میں تو سُنا یہ اماں ہی اب

زردیِ رنگ ہی غمِ پوشیدہ پر دلیل
دل میں جو کچھ ہی منہ سے ہمارے عیاں ہی اب

پیش از دمِ سحر مرا رونا لہو کا دیکھ
پھولے ہی جیسے سانجھ وہی یہاں سماں ہی اب

نالاں ہوئے کہ یاد ہمیں سب کو دے گئے
گلشن میں عندلیب ہماری زباں ہی اب

برسوں ہوئے گئے اُسے پر بھولتا نہیں
یادش بخیر میر رہے خوش جہاں ہی اب

شبنم سے کچھ نہیں ہی گل و یاسمن میں آب
دیکھ اس کو بھر بھر آوے ہی سب کے دہن میں آب

لو سُدھ شتاب فاختہ گریہ ناک کی
آیا نہیں ہی دیر سے جوئے چمن میں آب

سوزش بہت ہو دل میں تو آنسو کو پی نہ جا
کرتا ہی کام آگ کا ایسی جلن میں آب

تھا گوش زد کہ گوروں میں لگ اُٹھے ہی آگ
یہاں دل بھرے ہوئے کے سبب ہی کفن میں آب

جی ڈوب جائے دیکھیں جہاں بھر نظر ادھر
تم کہتے ہو نہیں مرے چاہِ ذقن میں آب

لب تشنگانِ عشق کے ہیں کام کے وہ لعل
کیا آب کو جو ہو وے عقیق یمن میں آب

تب قیس جنگلوں کے تئیں آگ دے گیا
ہم بھر چلے ہیں رونے سے اب سارے بن میں آب

سُن سوزِ دل کو میرے بہت روئی رات شمع
بیرونِ بزم لائے ہیں بھر بھر لگن میں آب

دیکھو تو کس روانی سے کہتے ہیں شعر میر
دُر سے ہزار چند ہی ان کے سخن میں آب

جیسا مزاج آگے تھا میرا سو کب ہی اب
ہر روز دل کو سوز ہی ہر شب تعب ہی اب

سُدھ کچھ سنبھالتے ہی وہ مغرور ہوگیا
ہر آن بیدماغی و ہر دم غضب ہے اب

دُوری سے اس کی آہ عجب حال میں ہیں لوگ
کچھ بھی جو پاس وہ نہ کرے تو عجب ہے اب

طاقت کہ جس سے تابِ جفا تھی سو ہو چکی
تھوڑی سی کوفت میں بھی بہت سا تعب ہے اب

دریا چلا ہے آج تو بوس و کنار کا
گر جی چلاوے کوئی دِوانا تو ڈھب ہے اب

جاں بخشیاں جو پیشتر از خط کیا کیے
اُن ہی لبوں سے خلقِ خدا جاں بلب ہے اب

رنجش کی وجہ آگے تو ہوئی بھی تھی کوئی
رو پوش ہم سے یار جو ہے بے سبب ہے اب

لے چاہ وہ اُسے ہی نہ مجھ کو ہے وہ دماغ
جانا مرا ادھر کو بشرطِ طلب ہے اب

جاتا ہوں دن کو ملنے تو کہتا ہے دن کو میر
جو شب کو جائیے تو کہے ہے کہ شب ہے اب

عشاق کے تئیں ہے عجز و نیاز واجب
ہے فرضِ عین رونا دل کا گداز واجب

یوں سر فرو نہ لاوے ناداں کوئی وگرنہ
رہنا سجود میں ہے جیسے نماز واجب

ناسازیِ طبیعت ایسی پھر اُس کے اوپر
ہے ہر کسو سے مجھ کو ناچار ساز واجب

لڑکا نہیں رہا تو جو کم تمیز ہووے [1]
عشق و ہوس میں اب ہے کچھ امتیاز واجب

صرفہ نہیں ہے مطلق جانِ عزیز کا بھی
اے میر تجھ سے ظالم ہے احتراز واجب

تابوت پر بھی میرے نہ آیا وہ بے نقاب
میں اُٹھ گیا ولے نہ اُٹھا بیچ سے حجاب

اس آفتابِ حسن کے جلوے کی کس کو تاب
آنکھیں اُدھر کیے سے بھر آتا ہے وو ہیں آب

اس عمرِ برق جلوہ کی فرصت بہت ہے کم
جو کام پیش آوے تجھے اس میں ہو شتاب

غفلت سے ہے غرور تجھے ورنہ ہے بھی کچھ
یھاں وہ سماں ہے جیسے کہ دیکھے ہے کوئی خواب

اس موج خیز دہر نے کس کے اُٹھائے ناز
کج بھی ہوا نہ خوب کلہ گوشۂ حباب

یہ بستیاں اُجڑ کے کہیں بستیاں بھی ہیں
دل ہو گیا خراب جہاں پھر رہا خراب

بیتابیاں بھری ہیں مگر کوٹ کوٹ کر
خرقے میں جیسے برق ہمارے ہے اضطراب

ٹک دل کے نسخے ہی کو کیا کر مطالعہ
اس درس گہ میں حرف ہمارا ہے اک کتاب

[1] نظیری ؎ توبہ جو بستن چہ کردی کہ بہا کنی نظیری ۔ بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

مجنوں نے ریگ بادیہ سے دل کے غم گنے
ہم کیا کریں کہ غم ہیں ہمارے تو بے حساب

کاش اس کے روبرو نہ کریں مجھ کو حشر میں
کتنے مرے سوال ہیں جن کا نہیں جواب

شاید کہ ہم کو بوسہ بہ پیغام دست دے
پھرتا ہی بیچ میں تو بہت ساغرِ شراب

ہی ان بھوؤں میں خال کا نقطہ دلیلِ فہم
کی ہی سمجھ کے بیت کسو نے یہ انتخاب

گزرے ہی میر لوٹتے دن رات آگ میں
ہی سوزِ دل سے زندگی اپنی ہمیں عذاب

جو کہو تم سو ہی بجا صاحب
ہم برے ہی سہی بھلا صاحب

سادہ ذہنی میں نکتہ چیں تھے ہم
اب تو ہیں حرف آشنا صاحب

نہ دیا رحم ٹک بتوں کے تئیں
کیا کیا ہائے یہ خدا صاحب

بندگی ایک اپنی کیا کم ہی
اور کچھ تم سے کہیے کیا صاحب

مہر افزا ہی منہ تمھارا ہی
کچھ غضب تو نہیں ہوا صاحب

خط کے پھٹنے کا تم سے کیا شکوہ
اپنے طالع کا یہ لکھا صاحب

پھر گئیں آنکھیں تم نہ آن پھرے
دیکھا تم کو بھی واہ وا صاحب

شوقِ رخ، یادِ لب، غمِ دیدار
جی میں کیا کیا مرے رہا صاحب

بھول جانا نہیں غلام کا خوب
یاد خاطر رہے مرا صاحب

کس نے سن شعرِ میر یہ نہ کہا
کہیو پھر ہائے کیا کہا صاحب

عجب صحبت ہی کیونکر صبح اپنی شام کریے اب
جہاں ٹک آن بیٹھے ہم کہا آرام کریے اب

ہزاروں خواہشِ مردہ نے سرِ دل سے نکالا ہی
قیامت جی پہ ہی دیدار کو ٹک عام کریے اب

بلا آشوب تھا گو جان پر آغازِ الفت میں
ہوا سو تو ہوا اندیشۂ انجام کریے اب

بہت کی یا صنم گوئی ہوئے مشہور کافر ہم
وظیفہ کوئی دن اپنا خدا کا نام کریے اب

زباں خامہ کے ہلتے ہی ہزاروں اشک گرتے ہیں
حقیقت اپنے دل کی آہ کیا ارقام کریے اب

کہاں تک ہم ناکام اس جفا جو کے لئے مریے
اگر تلوار ہاتھ آوے تو اپنا کام کریے اب

فسانہ شاخ در شاخ اس نہالِ حسن کے غم کا
کہاں اے میر بے برگ و نوا اتمام کریے اب

بُرقع میں کیا چھپیں وے ہووین جنھوں کی یہ تاب
رُخسار تیرے پیارے ہیں آفتاب مہتاب

اٹکل ہمیں کو اُن نے آخر ہدف بنایا (اے ہمکو)
ہر چند ہم بلاکش تھے ایک تیر پرتاب

کچھ قدر میں نہ جانی غفلت سے رفتگاں کی
آنکھیں سی کھل گئیں اب جب تیں ہوئی خواب

اُن بن ہی کے سبب ہیں اس لالچی سے سارے
یہاں ہی فقیری محض وہاں چاہئے ہی اسباب

اس بحرِ حسن کے تئیں دیکھا ہی آب میں کیا
جاتا ہی صدقے اپنے جو لحظہ لحظہ گرداب

اچرج ہی یہ کہ مطلق کوئی نہیں ہی خواہاں
جنسِ وفا اگرچہ ہیگی بہت ہی کمیاب

تھی چشم یہ رُکے گا پلکوں سے گریہ لیکن
ہوتی ہی بند کوئی تنکوں سے راہ سیلاب

(ق) توبھی تو مختلط ہو سبزے میں ہم سے ساقی
لیکر بغل میں ظالم مینائے بادۂ ناب

نکلی ہیں ایکی کلیاں اس رنگ سے چمن میں
سر جوڑ جوڑ جیسے مل بیٹھتے ہیں احباب

کیا لعل لب کسو کے ای میر چت چڑھے ہیں
چہرے پہ تیرے ہر دم بہتا رہے ہی خونناب

ردیف التاء

دیر کچھ کھنچتی تو کہتے بھی ملاقات کی بات
ملنا اپنا جو ہوا اُس سے سو وہ بات کی بات

گفتگو شاہدوں سے ہی نہ غیبت نہ گلہ
خانقہ کی سی نہیں بات خرابات کی بات

سُن کے آوازِ سگِ یار ہوئے ہم خاموش
بولتے وہاں ہیں جہاں ہووے مساوات کی بات

مُنہ اودھر اور سخن زیرِ لبی غیر کے ساتھ
اس فریبندہ کی ناگفتنی ہی گھات کی بات

اس لئے شیخ ہی چپکا کہ پڑے شہر میں شور
ہم سمجھتے ہیں یہ شیادی و طامات کی بات

یہ کس آشفتہ کی جمعیتِ دل تھی منظور
بال بکھرے ترے منہ پر کہیں ہیں رات کی بات

گفتگو وصفوں سے اس ماہ کے کرلیے ای میر
کاہش افزا ہی کروں اُس کی اگر ذات کی بات

ہم تم سے چشم رکھتے تھے دلداریاں بہت
سو التفات کم ہی دل آزاریاں بہت

دیکھیں تو کیا دکھائے یہ افراطِ اشتیاق
لگتی ہیں تیری آنکھیں ہمیں پیاریاں بہت

جب تک ملے جلے سے جفائیں تھیں اُٹھ سکیں
کرنے لگے ہو اب تو ستمگاریاں بہت

آزار میں تو عشق کے جاتا ہی سبھول جی
یوں تو ہوئیں تھیں یاد ہیں بیماریاں بہت

شکوہ خراب ہونے کا کیا چاہیے ہیں میرؔ
ایسی تو ای عزیز ہیں یہاں خواریاں بہت

یاد ایامی کہ ہنگامہ رہا کرتا تھا رات
شور و شر سے میرے اک فتنہ رہا کرتا تھا رات

کام کیا تھا جیب و دامن سے مجھے پیش از جنوں
سینہ چاکی اپنی میں بیٹھا کیا کرتا تھا رات

جن دنوں کھینچا تھا سر اُس بادشاہِ حسن نے
ہر گلی میں اک فقیر اس کو دعا کرتا تھا رات

اب جہاں کچھ بات چھیڑی سوچ لایا پیش از یں
میں کہا کرتا غمِ دل وہ سُنا کرتا تھا رات

ہجر میں کیا کیا سمے دیکھے ہیں ان آنکھوں سے میں
زرد رُخ پر لالہ گوں آنسو بہا کرتا تھا رات

کیا کہوں پھر کیسے کیسے دن دکھاتا سا لہا
وہ سخن نشنو جو ٹک میرا کہا کرتا تھا رات

دیکھنے والے ترے دیکھے ہیں سب ای رشکِ شمع
جوں چراغ وقفِ دل کا سب جلا کرتا تھا رات

بعد میرے اس غزل پر بھی بہت رُوویں گے لوگ
میں بھی ہر ہر بیت پر اُس کے بکا کرتا تھا رات

دیکھ خالی جا کہیں گے برسوں اہلِ روزگار
میرؔ اکثر دل کا قصہ یہاں کہا کرتا تھا رات

کیا پوچھتے ہو آہ مرے جنگ جو کی بات
گویا وفا ہی عہد میں اُس کے کبھو کی بات

اس باغ میں نہ آئی نظر خرمی مری
گر سبز بھی ہوا ہوں تو جیسے کسو کی بات

آئینہ پانی پانی رہا اس کے سامنے
کہئے جہاں کہوں یہ تو ہے روبرو کی بات

سر گل نے پھر جھکا کر اٹھایا نہ شرم سے
گلزار میں چلی تھی کہیں اُس کے رو کی بات

حرمت میں مے کے کہنے سے واعظ کے ہی فتور
کیا اعتبار رکھتی ہی اس پوچ گو کی بات

ہم سوختوں میں آتشِ سرکش کا ذکر کیا
چل بھی پڑی ہی بات تو اس تند خو کی بات

کیا کوئی زلفِ یار سے حرف و سخن کرے
رکھتی ہی میرؔ طول بہت اُس کے مو کی بات

سنتا نہیں اگرچہ ہمارا نگار بات
پر منہ پہ آہی جاتی ہی بے اختیار بات

بلبل کے بولنے سے ہی کیوں بے دماغ گل
آپس میں یوں تو ہوتی ہی یارو ہزار بات

منہ تک رہو جو ہو وہ فریبندہ حرف زن
اس تھوڑے سن و سال میں یہ بیچدار بات

بوسہ ترے چپکے لب کا کہ تب کچھ نہیں مزا
پاوے گی سائے شہر میں جب اشتہار بات

ہی کس کی صوت انکر اصوات واعظا
کب آدمی کی جنس کرے ہی پکار بات

آہو کو اُس کی چشمِ سخن گو سے مت ملا
شہری سے کر سکے ہی کہیں بھی گنوار بات

یوں بارِ گل سے ابھی جھکے ہیں نہالِ باغ
جُھک جُھک کے جیسے کرتے ہیں دو چار یار بات

آزردہ دل کو حرف پہ لانے کا لطف کیا
کرتی جو خونچکاں مرے لب سے گزار بات

مرجاں کوئی کہے ہی کوئی ان لبوں کو لعل
کچھ رفتہ رفتہ پا ہی رہے گی قرار بات

یوں چپکے چپکے میر تلف ہو گا کب تلک
کچھ ہووے بھڑ کر اس سے کبھی کر ایک بار بات

ہوتی ہی گرچہ کہنے سے یارو پرائی بات
پر ہم سے تو تھمی نہ کبھو منہ پر آئی بات

جانے نہ مجھ کو جو یہ تصنع تو اُس سے کر
تس پر بھی تو چھپی نہیں رہتی بنائی بات

لگ کر تدرو رہ گئے دیوار باغ سے
رفتار کی جو تیری صبا نے چلائی بات

کہتے تھے اُس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے لیک
وہ آگیا تو سامنے اُس کے نہ آئی بات

اب تو ہوئے ہیں ہم بھی ترے ڈھب سے آشنا
وھاں تو نے کچھ کہا کہ اِدھر ہم نے پائی بات

بلبل کے بولنے میں سب انداز ہیں مرے
پوشیدہ کب رہی ہی کسی کی اُڑائی بات

بھڑ کا تھا رات دیکھ کے وہ شعلہ خو مجھے
کچھ روسیہ رقیب نے شاید لگائی بات

عالم سیاہ خانہ ہی کس کا کہ روز و شب
یہ شور ہی کہ دیتی نہیں کچھ سنائی بات

اک دن کہا تھا یہ کہ خموشی میں ہی وقار
سو مجھ سے ہی سخن نہیں میں جو بتائی بات

اب مجھ ضعیف و زار کو مت کچھ کہا کرو
جاتی نہیں ہی مجھ سے کسو کی اُٹھائی بات

خط لکھتے لکھتے میر نے دفتر کیے رواں
افراطِ اشتیاق نے آخر بڑھائی بات

ہی زباں زد جو سکندر ہو چکا لشکر سمیت
سر بھی اس کا کھپ گیا آخر کو یھاں افسر سمیت

چشمے آبِ شور کے نکلا کریں گے وھاں جہاں
رکھیں گے مجھ تلخ کامِ غم کو چشمِ تر سمیت

ہم اُٹھے روتے تو لی گردوں نے پھر راہِ گریز
بیٹھ جاوے گا یہ ماتم خانہ بام و در سمیت

مستی میں شرم گنہ سے میں جو رویا ڈاڑھ مار
گر پڑا بیخود ہو واعظ جمعہ کو منبر سمیت

بعث اپنا خاک سے ہو گا جو اس شورش کے ساتھ
عرش کو سر پر اُٹھا لیویں گے ہم محشر سمیت

کب تلک یوں لوہو پیتی ہاتھ اُٹھا کر جان سے
وہ کمر کولی میں بھر لی ہم نے کل خنجر سمیت

گنجِ قاروں کا سا یھاں کس کے گئے تھا سو تو میر
خاک میں ملتا ہی اب تک اپنے مال و زر سمیت

لہ کہتے تھے کہ یہ کہئے وہ کہتے جو یارا تھا سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا ۱۲

دیکھئے کب ہو وصال اب تو لگے ہی ڈر بہت
کوفت گزرے ہی فراق یار میں جی پر بہت

دل کی ویسی ہے خرابی کثرتِ اندوہ سے
جیسے رہ پڑتا ہی دشمن کا کہیں لشکر بہت

ہمنشیں جا بیٹھ، محنت کش کوئی دل چاہیئے
عشق تیرا کام ہی تو ہی بغل پرور بہت

بس نہیں مجھ ناتواں کا ہائے جو کچھ کر سکوں
مُدعی پُرچک سے اُس کی پڑ گیا ہی ور بہت

سخت کر جی کیونکہ یکباری کریں ہم ترکِ شہر
ان گلی کوچوں میں ہم نے کھائے ہیں پتھر بہت

دیکھ روئے زرد پر بھی میرے آنسو کی ڈھلک
ای کہ تو نے دیکھی ہی غلطانی گوہر بہت

ہمنفس کیا مجھ کو تو رویا کرے ہی روز و شب
رہ گئے ہیں مجھ سے کوئے یار میں مر کر بہت

کم مجھی سے بولنا، کم آنکھ مجھ پہ کھولنا
اب عنایت یار کی رہتی ہی کچھ ایدھر بہت

کیا سبب ہی اب مکاں پر جو کوئی پاتا نہیں
میرؔ صاحب آگے تو رہتے تھے اپنے گھر بہت

ملامت گر نہ مجھ کو کر ملامت
جلے کو اور تو اتنا جلا مت

گلے مل عیدِ قرباں کو سبھوں سے
ہمارا آہ تم کاٹو گلا مت

تری ناآشنائی کے ہیں بندے
نہ وہ اب ربط نے صاحب سلامت

بہت رونے نے رسوا کر دکھایا
نہ چاہت کی چھپی ہم سے علامت

کبھو تلوار وہ کھینچے ہی ای میرؔ
لڑی قسمت تو سر کو ٹک ہلا مت

ردیف جیم فارسی

آگ سا تو جو ہوا ای گلِ تر آن کے بیچ
صبح کی باد نے کیا پھونک دیا کان کے بیچ

ہم نہ کہتے تھے کہیں زلف کہیں رُخ نہ دکھا
اک خلاف آیا نہ ہندو و مسلمان کے بیچ

باوجود ملکیت نہ ملک میں پایا
وہ تقدس کہ جو ہی حضرت انسان کے بیچ

پاسباں سے ترے کیا دُور جو ہو ساز رقیب
ہی نہ اک طرح کی نسبت سگ و دربان کے بیچ

جیسی عزت مرے دیواں کی امیروں میں ہوئی
ویسی ہی اُن کی بھی ہوگی مرے دیوان کے بیچ

ساتھ ہی اس سر عریاں کی یہ وحشت کرنا
پگڑی الجھی ہی مری اب تو بیابان کے بیچ

ے پھر پیا پلکیں اگر کھب گئیں جی میں تو وہیں
رخنے پڑ جائیں گے واعظ ترے ایمان کے بیچ

کیا کہوں خوبی خط دیکھ ہوئی بند آواز ۔ سحر گویا کہ دیا اُن نے مجھے پان کے بیچ
گھر میں آئینہ کے کب تک تمہیں نازاں دیکھوں ۔ کبھو تو آؤ مرے دیدۂ حیران کے بیچ
میرزائی کا کب ای میرؔ چلا عشق میں کام ۔ کچھ تعب کھینچنے کو تاب تو ہو جان کے بیچ

عشق میں ای طبیب ہاں ٹک سوچ ۔ پائے جاں درمیاں ہی یہاں ٹک سوچ
بے تامل ادائے کیں مت کر ۔ قتل میں میرے مہرباں ٹک سوچ
سرسری مت جہاں سے جا غافل ۔ پانوں تیرا پڑے جہاں ٹک سوچ
پھیل اتنا پڑا ہی کیوں یہاں تو ۔ یار اگلے گئے کہاں ٹک سوچ
ہونٹھ اپنا ہلا نہ سمجھے بن ۔ یعنی جب کھولے تو زباں ٹک سوچ
گل و رنگ و بہار پردے ہیں ۔ ہر عیاں میں ہی وہ نہاں ٹک سوچ
فائدہ سر جھکے کا شیب میں میرؔ ۔ پیری سے آگے ای جواں ٹک سوچ

دل کھو گیا ہوں میں نہیں دیوانہ پن کے بیچ ۔ تم بھی تو دیکھیو زلفِ شکن در شکن کے بیچ
کیا جانئے دل میں چاؤ تجھے کیا کیا دمِ وصال ۔ مہجور اس کا تھا ہمہ حسرت کفن کے بیچ
کنعاں سے جا کے مصر میں یوسف ہوا عزیز ۔ عزت کسو کی ہوتی نہیں ہی وطن کے بیچ
بس ای جنوں کہ مجھ میں نہیں کچھ سوائے دم ۔ تار ایک رہ گیا ہی یہی پیرہن کے بیچ
سرسبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ ۔ ہی دھوم میرے شعر کی سارے دکھن کے بیچ
ستھرائی اور نازکی گلبرگ کی درست ۔ پر ویسی تو کہاں کہ جو ہی اس بدن کے بیچ
ق
بلبل خموش و لالۂ و گل دونوں سرخ و زرد ۔ شمشاد محو بیکلی اک نسترن کے بیچ
کل ہم بھی سیر باغ میں تھے ساتھ یار کے ۔ دیکھا تو اور رنگ ہی سارے چمن کے بیچ
ق
یا ساتھ غیر کے ہی تمہیں ویسی بات چیت ۔ سو سو طرح کے لطف ہیں اک اک سخن کے بیچ
یا پاس میرے لگتی ہی چپ ایسی آن کر ۔ گویا زباں نہیں ہی تمہارے دہن کے بیچ
فرہاد و قیس و میرؔ یہ آوارگانِ عشق ۔ یوں ہی گئے ہیں سب کی رہی من کی من کے بیچ

جھوٹ ہر چند نہیں یار کی گفتار کے بیچ ۔ دیر لیکن ہی قیامت ابھی دیدار کے بیچ

کس کی خوبی کے طلبگار ہیں عزت طلباں
خرقے بکنے کو چلے آتے ہیں بازار کے بیچ

خضر و عیسیٰ کے تئیں نام کو جیتا سن لو
جان ہے ورنہ کب اُس کے کسو بیمار کے بیچ

اگلے کیا پیچ تمہارے نہ تھے بس عاشق کو
بال جو اور گرنے لگے دستار کے بیچ

عشق ہے جس کو ترا اُس سے تو رکھ دل کو جمع
زندگی کی نہیں امید اس آزار کے بیچ

ہم بھی اب ترکِ وفا ہی کریں گے کیا کریے (کھپتی)
جنس یہ بکتی نہیں آپ کی سرکار کے بیچ

دیدنی دشتِ جنوں ہے کہ پھپھولے پا کے
میں نے موتی سے پروئے ہیں ہر خار کے بیچ

پردہ اُٹھتا ہے تو پھر جان پہ آ بنتی ہے
خوبی عاشق کی نہیں عشق کے اظہار کے بیچ

اس زمیں میں غزل اک اور بھی موزوں کر میرؔ
پاتے ہیں زور ہی لذت تری گفتار کے بیچ

آتی ہے خون کی بو دوستیٔ یار کے بیچ
جی لئے اُن نے ہزاروں کے یونہی پیار کے بیچ

حیف وہ کشتہ کہ سو رنج سے آوے تجھ تک
اور رہ جائے تری ایک ہی تلوار کے بیچ

گرچہ چھپتی نہیں ہے چاہ پہ رہ منکر پاک
جی ہی دینا پڑے ہے عشق کے اقرار کے بیچ

نالۂ شب آوے قفس سے تو گل آ پاس پہ نہ جا
یہی ہنکار سی ہے مرغِ گرفتار کے بیچ

اُنس کرتا تو ہے وہ مجھ کو خرد باختہ جان
جیت میں اپنی نکالی ہے اسی ہار کے بیچ

چال کیا کبک کی اک بات چلی آتی ہے
لطف نکلے ہیں ہزاروں تری رفتار کے بیچ

تو جو جاتا ہے چمن میں تو تماشے کے لئے
موسمِ رفتہ بھی پھر آوے ہے گلزار کے بیچ

داغ چیچک نہ اس افراط سے تھے مکھڑے پر
کن نے گاڑی ہیں نگاہیں ترے رخسار کے بیچ

گھٹے شمشیر زنی سے کفِ نازک میں ہیں
یہ جگر داری تھی کس خوں کے سزاوار کے بیچ

تو بہ صد بار کہ مستی میں پرو ڈالے ہیں
دانے تسبیح کے ہیں رشتۂ زنار کے بیچ

حلقۂ گیسوے خوباں پہ نہ کر چشم کو وا
میرؔ امرت نہیں ہوتا دہنِ مار کے بیچ

ردیف حاے حطی

آنے کی اپنے کیا کہیں اس گلستاں کی طرح
ہر گام پر تلف ہوئے میں رواں کی طرح

کیا میں ہی چھیڑ چھیڑ کے کھاتا ہوں گالیاں
اچھی لگے ہے سب کو مرے بدزباں کی طرح

آگے تو بے طرح نہ کبھو کہتے تھے ہمیں
اب تازہ یہ نکالی ہے تم نے کہاں کی طرح

یہ شورِ دل خراش کب اُٹھتا تھا باغ میں
سیکھی ہے عندلیب نے ہم سے فغاں کی طرح

کرتے تو ہو ستم پہ نہیں رہنے کے حواس
کچھ اور ہوگئے جو کسو خستہ جاں کی طرح

نقشہ الٰہی دل کا مرے کون لے گیا
کہتے ہیں ساری عرش میں ہے اس مکاں کی طرح

مرغِ چمن نے زور رُلایا سبھوں کے تئیں
میری غزل پڑھی تھی شب اک روضہ خواں کی طرح

لگ کر گلے سے اُس کے بہت میں بُکا کیا
ملتی تھی سروِ باغ میں کچھ اس جواں کی طرح

جو کچھ نہیں تو بجلی سے ہی پھول پڑ گیا
ڈالی چمن میں ہم نے اگر آشیاں کی طرح

یہ باتیں رنگ رنگ ہماری ہیں ورنہ میرؔ
آجاتی ہے کلی میں کبھو اس دہاں کی طرح

دور گردوں سے ہوئی کچھ اور میخانے کی طرح
پھر نہ آویں کیونکہ آنکھیں میری پیمانے کی طرح

آنکلتا ہے کبھو ہنستا تو ہے باغ و بہار
اُس کی آمد میں ہے ساری فصل گل آنے کی طرح

چشمکِ انجم میں اتنی دل کشی آگے نہ تھی
سیکھ لی تاروں نے اُس کی آنکھ جھمکانے کی طرح

ہم گرفتاروں سے وحشت ہی کرے ہے وہ غزال
کوئی تو بتلاؤ اُس کے دام میں لانے کی طرح

ایک دن دیکھا جو اُن نے بید کو تو کہہ اُٹھا
اس شجر میں کتنی ہے اس میرے دیوانے کی طرح

آج کچھ شہرِ وفا کی کیا خرابی ہے نئی
عشق نے مدت سے یہاں ڈالی ہے ویرانے کی طرح

پیچ سا کچھ ہے کہ زلف و خط سے ایسا ہے بناؤ
ہے دلِ صد چاک میں بھی ورنہ سب شانے کی طرح

کس طرح جی سے گزر جاتے ہیں آنکھیں موند کر
دیدنی ہے دردمندوں کی بھی مرجانے کی طرح

ہے اگر ذوقِ وصال اس کا تو جی کھو بیٹھئے
ڈھونڈ کر اک کاڑھئے اب اس کے بھی پانے کی طرح

[1] یوں بھی سر چڑھتا ہے ای ناصح کوئی مجھ سے کہ ہائے
ایسے دیوانے کو سمجھاتے ہیں سمجھانے کی طرح

جان کا صرفہ نہیں ہے کچھ تجھے کڑھنے میں میرؔ
غم کوئی کھاتا ہے میری جان غم کھانے کی طرح

ردیف خائے معجمہ

اگرچہ لعلِ بدخشاں بھی رنگ ڈھنگ ہے شوخ
یہ تیرے دونوں لبوں کا بھی کیا ہی رنگ ہے شوخ

[1] مولانا حالی سے کی نصیحت بُری طرح ناصح ؎ اور اک لِس ملا دیا لِس میں

کبھو تو نیو چلا کر ستم کھنچیں کب تک
کماں کے طور سے تو سخت خانہ جنگ ہے شوخ

سکھائیں کن نے تجھے آہ ایسی اچپلیاں
کہ برق پر تری شوخی سے کام تنگ ہے شوخ

بغیر بادہ تو یوں گرم آ کے کب ملتا
نشہ ہے زور تجھے اُس کی یہ ترنگ ہے شوخ

جگر ہیں کس کے ترے ہاتھ سے نہیں سوراخ
ملک تلک تو ترا زخمی خدنگ ہے شوخ

صنم فراق میں میں تیرے کچھ تو کر رہتا
پہ کیا کروں کہ مرا ہاتھ زیر سنگ ہے شوخ

خیال جاہ کے سر رشتے کا تجھے کب ہے
ترے تو ہاتھ میں شام و سحر پتنگ ہے شوخ

ابھی تو تم آنے میں عرصہ ہے کچھ قیامت کے
قد بلند کو کھینچ اپنے کیا درنگ ہے شوخ

برآ میر سے کس طرح تیری صحبت ہو
تجھے تو نام سے اُس خستہ جاں کی ننگ ہے شوخ

ردیف دال

رہئے بغیر تیرے اے رشک ماہ تا چند
آنکھوں میں یوں ہمارے عالم سیاہ تا چند

اب دیکھنے میں پیارے ٹک تو بڑھا عنایت
کوتاہ تر پلک سے ایدھر نگاہ تا چند

خط سے جو ہے گرفتہ وہ مہ نہیں نکلتا
مانند چشم اختر ہم دیکھیں راہ تا چند

عمر عزیز ساری منت ہی کرتے گزری
بے جرم آہ رہئے یوں عذر خواہ تا چند

یہاں ناز و سرکشی سے کیا دیکھتا نہیں ہے
کج اس چمن میں ٹھہری گل کی کلاہ تا چند

جب مہ ادھر سے نکلا جانا وہ گھر سے نکلا
رکھتا ہے داغ دیکھیں یہ اشتباہ تا چند

ایذا بھی کھینچ چکئے گر جو ہفتے عشرے کی ہو
اس طرح مرتے رہئے اے میر آہ تا چند

تجھ بن اے نو بہار کے مانند
چاک ہے دل انار کے مانند

پہنچی شاید جگر تک آتش عشق
اشک ہیں سب شرار کے مانند

کو دماغ اُس کی رہ سے اُٹھنے کا
بیٹھے اب ہم غبار کے مانند

کوئی نکلے کلی تو لالہ کی
اس دل داغ دار کے مانند

سرو کو دیکھ نعش کیا ہم نے
تھا چمن میں وہ یار کے مانند

ہار کر شب گلے پڑے اُس کے
ہم بھی پھولوں کے ہار کے مانند

برق تڑپی بہت ولے نہ ہوئی | اس دلِ بے قرار کے مانند

ق

اُن نے کھینچی تھی صیدگہ میں تیغ | برقِ ابرِ بہار کے مانند

اُس کے گھوڑے کے آگے سے ٹلے | ہم بھی دُبلے شکار کے مانند

زخم کھا بیٹھیو جگر پر مت | تو بھی مجھ دل فگار کے مانند

اُس کی سرتیز ہر پلک ہی میرؔ
خنجرِ آبدار کے مانند

آواز ہماری سے نہ رُک ہم ہیں دعا یاد | آوے گی بہت ہم بھی فقیروں کی صدا یاد

ہر آن وہ انداز ہے جس میں کہ سکے جی | اُس مخترعِ جور کو کیا کیا ہے ادا یاد

کیا صحبتیں اگلی گئیں خاطر سے ہماری | اپنی بھی وفا یاد ہے اُس کی بھی جفا یاد

کیفیتیں عطار کے لونڈے میں بہت تھیں[1] | اس نسخے کی کوئی نہ رہی حیف دوا یاد

کیا جانے کہی بوس لبِ یار کی لذت | جب تک جئیں گے ہم کو رہے گا وہ مزا یاد

جی بھول گیا دیکھ کے چہرہ وہ کتابی | ہم عصر کے علامہ تھے پر کچھ نہ رہا یاد

سب غلطی رہی بازیِ طفلانہ کی یکسو | وہ یاد فراموش تھے ہم کو نہ کیا یاد

کعبے تو گئے بھول کے ہم دیر کا رستہ | آتا تھا ولے راہ میں ہر گام خدا یاد

اک لطف کے شرمندہ نہیں میرؔ ہم اس سے
گو یہاں سے گئے[2] اُن نے بہت ہم کو کیا یاد

اسیر کرکے نہ لی تو نے تو خبر صیاد | اُڑا گئے مرے پرکالۂ جگر صیاد

پھریں گے لوٹتے صحنِ چمن میں باؤ کے ساتھ | موئے گئے بھی[3] مرے مشتِ بال و پر صیاد

رہے گی ایسی ہی گر بیکلی ہمیں اس سال | تو دیکھیو کہ رہے ہم قفس میں مر صیاد

چمن کی یاد کی آتے خبر نہ اتنی رہی | کہ میں کدھر ہوں کدھر ہے قفس کدھر صیاد

شکستہ بالی کو چاہے تو ہم سے ضامن لے | شکار موسمِ گل میں ہمیں نہ کر صیاد

ہوا نہ وا درِ گلزار اپنے ڈھب سے کبھو | کھلا سو مُنہ پہ ہمارے قفس کا در صیاد

سُنا ہے بھڑکی ہے ابکی بہت ہی آتشِ گل | چمن میں اپنے بھی ہیں خار و خس کے گھر صیاد

[1] میرؔ کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب / اُسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

[2] گو یہاں سے گئے یعنی یہاں سے چلے جانے پر ۱۲

[3] موئے گئے یعنی مرنے اور چلے جانے پر بھی ۱۲

لگی بہت رہیں چاکِ قفس سے آنکھیں لیک ۔۔۔ پڑا نہ ابھی کوئی پھول گل نظر صیاد

اسیر میرؔ[۱] نہ ہوتے اگر زباں رہتی ۔۔۔ ہوئی ہماری یہ خوش خوانیِ سحر صیاد

لڑکے پھر آئے ڈر گئے شاید ۔۔۔ بگڑے تھے کچھ سنور گئے شاید

سب پریشان دلی میں شب گزری ۔۔۔ بال اُس کے بکھر گئے شاید

کچھ خبر ہوتی تو نہ ہوتے خبر ۔۔۔ صوفیاں بے خبر گئے شاید

ہیں مکان و سرا و جا خالی ۔۔۔ یار سب کوچ کر گئے شاید

آنکھ آئینہ رو چھپاتے ہیں ۔۔۔ دل کو لے کر مکر گئے شاید

لوہو آنکھوں میں اب نہیں آتا ۔۔۔ زخم اب دل کے بھر گئے شاید

اب کہیں جنگلوں میں ملتے نہیں ۔۔۔ حضرتِ خضر مر گئے شاید

بیکلی بھی قفس میں ہے دشوار ۔۔۔ کام سے بال و پر گئے شاید

شور بازار سے نہیں اٹھتا ۔۔۔ رات کو میرؔ گھر گئے شاید

بنی تھی کچھ اک اُس سے مدت کے بعد ۔۔۔ سو پھر بگڑی پہلی ہی صحبت کے بعد

جُدائی کے حالات میں کیا کہوں ۔۔۔ قیامت تھی ایک ایک ساعت کے بعد

موا کوہکن بے ستوں کھود کر ۔۔۔ یہ راحت ہوئی ایسی محنت کے بعد

لگا آگ پانی کو دوڑے ہے تو ۔۔۔ یہ گرمی تری اس شرارت کے بعد

کہے کو ہمارے کب اُن نے سُنا ۔۔۔ کوئی بات مانی سو منت کے بعد

سخن کی نہ تکلیف ہم سے کرو ۔۔۔ لہو ٹپکے ہے اب شکایت کے بعد

نظر میرؔ نے کیسی حسرت سے کی ۔۔۔ بہت روئے ہم اُس کی رخصت کے بعد

ردیف رائے مہملہ

رفتار میں یہ شوخی رحم اے جواں زمیں پر ۔۔۔ لاتا ہے تازہ آفت تو ہر زماں زمیں پر

[۱] لا اعلم سے گل و گلچیں کا گلہ بلبل خوش لہجہ نہ کرے تو گرفتار ہوئی اپنی صدا کے باعث

آنکھیں لگی رہیں گی برسوں وہیں سبھوں کی ہوگا قدم کا تیرے جس جا نشاں زمیں پر
ہیں مشتِ خاک یارب بارِ گران غم تھا کیا کہیے آ پڑا ہے اک آسماں زمیں پر
آنکھیں ہیں بچھ رہی ہیں لوگوں کی تیری رہ میں ٹک دیکھ کر قدم رکھ اے کامِ جاں زمیں پر
خاکِ سیہ سے یکساں ہر ایک ہو گیے تو مارا اُٹھا فلک نے سارا جہاں زمیں پر
چشمے کہیں ہیں جوشاں جوئیں کہیں ہیں جاری جوں ابر ہم نہ روئے اُس بن کہاں زمیں پر
آتا نہ تھا فرو سر جن کا کُل آسماں سے ہیں ٹھوکروں میں اُن کی آج استخواں زمیں پر
جو کوئی یہاں سے گزرا کیا آپ سے نہ گزرا پانی رہا کب اتنا ہو کر رواں زمیں پر
پھر بھی اٹھا لی سر پہ تم نے زمیں سب آکر کیا کیا ہوا اٹھا تم سے کچھ لگے یہاں زمیں پر
کچھ بھی مناسبت ہے یہاں عجز سے وہاں تکبر وے آسماں پر ہیں ہم ناتواں زمیں پر
پست و بلند یہاں کا ہے اور ہی طرف سے اپنی نظر نہیں ہے کچھ آسماں زمیں پر
قصرِ جناں تو ہم نے دیکھا نہیں جو کہیے شاید نہ ہووے دل سا کوئی مکاں زمیں پر
یہاں خاک سے انھوں کی لوگوں نے گھر بنائے آثار ہیں جنھوں کے اب تک عیاں زمیں پر

کیا سر جھکا رہے ہو میرؔ اس غزل کو سن کر
بارے نظر کرو ٹک اے مہرباں زمیں پر

کیا کیا نہ ہم نے کھینچے آزار تیری خاطر اب ہو گئے ہیں آخر بیمار تیری خاطر
غیروں کی بے دماغی بیتابی چھاتی داغی یہ سب ستم اُٹھائے اے یار تیری خاطر
کیا جانیے کہ ہے تو کیا جنس بیش قیمت جاتے ہیں پگڑی جامے بازار تیری خاطر
اک بار تو نے آکر خاطر نہ رکھی میری میں جی سے اپنے گزرا سو بار تیری خاطر
میں کیا کہ آہ کافر دیں کے اکابروں نے قشقے لگائے پہنے زنار تیری خاطر
گو دل دھسک ہی جاوے آنکھیں اُبل ہی آویں سب اونچ نیچ کی ہے ہموار تیری خاطر
ایک آن تیری ابرو ایدھر جھکی نہ پائی سو سو ہمیں نے کھینچی تلوار تیری خاطر
کیا چیز ہے تو پیارے مفلس ہیں داغ تیرے پیسے لیے پھرے ہیں زردار تیری خاطر

تجھ سے دو چار ہونا پھر آہ بن نہ آیا
دی جان میرؔ جی نے ناچار تیری خاطر

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گزار کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حالِ زار

خاکِ دہلی سے جدا ہم کو کیا یکبارگی ۔ آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار
منصبِ بلبل غزلخوانی کا تھا سو تو ہے اسیر ۔ شاعری زاغ و زغن کا کیوں نہ ہووے اب شعار
طائرِ خوش زمزمہ کنجِ قفس میں ہے خموش ۔ چہچہے چڑیاں کریں ہیں صحنِ گلشن میں ہزار
چڑیاں
برگِ گل سے بھی گیا نہ ایک نے ٹک ہم کو یاد ۔ نامہ و پیغام پرسش بے مراتب درکنار
بے خلش کیونکر نہ ہو گرمِ سخن گلزار میں ۔ میں قفس میں ہوں کہ میرے اتحادوں میں خار خار
بلبلِ خوش لہجہ کے جانے پہ گو غوغائیاں ۔ طرح غوغا کی چمن میں ڈالیں پر کیا اعتبار
طائرانِ خوش لب و لہجہ نہیں رہتے چھپے ۔ شور سے ان کے بھرے ہیں قریہ و شہر و دیار
شہر کے کیا ایک دو کوچوں میں تھی شہرت رہی ۔ شہروں شہروں ملکوں ملکوں ہے انھوں کا اشتہار
کیا کہوں سوئے چمن ہوتا جو میں سرگرمِ گشت ۔ پھول گل جب کھلنے لگتے جوش زن ہوتی بہار
شور سن سن کر غزل خوانی کا میرے ہمصفیر ۔ غنچہ ہو آتے جو ہوتا آپ رنگِ شاخسار
خوشنوائی کا جنھیں دعویٰ تھا رہ جاتے خموش ۔ جن کو میں کرتا مخاطب اُن کو ہوتا افتخار
بعضوں کو رشکِ قبولِ خاطر و لطفِ سخن ۔ بعضوں کا سینہ فگار و بعضوں کا دل داغ دار
ایک کے ہونٹھوں کے اوپر آفریں اُستاد تھا ۔ ایک کہتے تھے رسوخِ دل ہے اپنا استوار
ربط کا دعویٰ تھا جن کو کہتے تھے مخلص ہیں ہم ۔ جانتے ہیں ذاتِ سامی ہی کو ہم سب خاکسار
نقل کرتے کیا یہ صحبت منعقد جب ہوتی بزم ۔ بیٹھ کر کہتے تھے منہ پر میرے بعضے بعضے یار
بندگی ہے خدمتِ عالی میں ہم کو دیر سے ۔ کر رکھی ہے جان اپنی ہم نے حضرت پر نثار
سو نہ خط اِن کا نہ کوئی پرچہ پہنچا مجھ تلک ۔ واہ واہی رابطہ رحمت ہے یہ اخلاق و پیار
رفتہ رفتہ ہو گئیں آنکھیں مری دونوں سفید ۔ بسکہ نامے کا کیا یاروں کے میں نے انتظار
لکھتے گر دو حرف لطف آمیز بعد از چند روز ۔ تو بھی ہوتا اس دلِ بیتاب و طاقت کو قرار
سو تو یک نہ نوشتہ کاغذ بھی نہ آیا میرے پاس ۔ اُن ہم آوازوں سے جن کا میں کیا ربط آشکار
خط کتابت سے یہ کہتے تھے نہ بھولیں گے تجھے ۔ آویں گے گھر بار کی تیرے خبر کو بار بار
جب گیا میں یاد سے تب کس کا گھر کاہے کا پاس ۔ آفریں صد آفریں اے مردمانِ روزگار
اب بیاباں در بیاباں ہے مرا شور و فغاں ۔ گو چمن میں خوش کی تم نے میری جائے نالہ زار
ہے مثل مشہور یہ عمرِ سفر کوتاہ ہے ۔ طالعِ برگشتہ بھی کرتے ہیں اب امداد کار
اک پر افشانی میں بھی ہے یہ وطن گلزار سا ۔ سامعوں کی چھاتیاں نالوں سے ہوویں گی فگار

ق

منہ پر آویں گے سخن آلودہ خون جگر
کیونکہ یاران زماں سے چاک ہے دل جوں انار

لب سے لے کرتا سخن ہیں خونچکاں شکوے بھرے
لیک ہے اظہار ہر ناکس سے اپنا ننگ و عار

چپ بھلی گو تلخکامی کھینچنی اس میں پڑے
بیت بحثی طبع نازک پر ہے اپنی ناگوار

آج سے کچھ بے حسابی جور کن مردم نہیں
ان سے اہل دل سدا کھینچے ہیں رنج بیشمار

بس قلم رکھ ہاتھ سے جانے بھی دے یہ حرف میر
کاہ کے چاہے نہیں کہسار ہوتے بیوقار

کام کے جو لوگ صاحب فن ہیں سو محسود ہیں
بے تہی کرتے رہیں گے حاسدان نابکار

آغشتہ خون دل سے سخن تھے زبان پر
رکھے نہ تم نے کان ٹک اس داستان پر

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

یہ دلبری کے فن فریب اتنی عمر میں
جھنجھلاہٹ اب تو آوے ہے اس کے سیان پر

محتاج کر خدا نہ نکالے کہ جوں ہلال
تشہیر کون شہر میں ہو پارہ نان پر

دیکھا نہ ہم نے چھوٹ میں یاقوت کی کبھو
تھا جو سماں لبوں کے ترے رنگ پان پر

کیا رہروان راہ محبت ہیں طرفہ لوگ
اغماض کرتے جاتے ہیں جی کے زیان پر

پہنچا نہ اس کی داد کو مجلس میں کوئی رات
مارا بہت پتنگ نے سر شمع دان پر

یہ چشم شوق طرفہ جگہ ہے دکھاؤ کی
ٹھہرو بقدر یک مژہ تم اس مکان پر

بزاز کے کو دیکھ کے خرقے بہت پھٹے
بیٹھا وہ اس قماش سے اگر دکان پر

موزوں کرو کچھ اور بھی شاید کہ میر جی
رہ جائے کوئی بات کسو کی زبان پر

کیا کیا نہ لوگ کھیلتے جاتے ہیں جان پر
اطفال شہر لائے ہیں آفت جہان پر

کچھ ان دنوں اشارہ ابرو ہیں تیز تیز
کیا تم نے پھر رکھی ہے یہ تلوار سان پر

تھوڑے میں دور کھینچے ہے کیا آدم آپ کو
اس مشت خاک کا ہے دماغ آسمان پر

کس پر تھے بیدماغ کہ ابرو بہت ہے خم
کچھ زور سا پڑا ہے کہیں اس کمان پر

کس رنگ راہ پائے نگاریں سے تو چلا
ہونے لگے ہیں خون قدم کے نشان پر

چرچا سا کر دیا ہے مرے شور عشق نے
مذکور اب بھی ہے یہ ہر اک کی زبان پر

پی پی کر اپنا لوہو رہیں گو کہ ہم ضعیف
جوں رینگتی نہیں ہے انھوں کے تو کان پر

یہ وہم ہے کہ اور کا ہے میرے تئیں خیال
تو مار ڈالیو نہ مجھے اس گمان پر

کیفیتیں ہزار ہیں اُس کام جاں کے بیچ
دیتے ہیں لوگ جان تو ایک ایک آن پر

دامن میں آج میرؔ کے داغِ شراب ہے
تھا اعتماد ہم کو بہت اس جوان پر

مت آنکھ ہمیں دیکھ کے یوں مار دیا کر
غمزے ہیں بلا ان کو نہ سنکار دیا کر

آئینے کی مشہور پریشاں نظری ہے
تو سادہ ہے ایسوں کو نہ دیدار دیا کر

سو بار کہا غیر سے صحبت نہیں اچھی
اس جیف کو مجلس میں نہ تو بار دیا کر

کیوں آنکھوں میں سرمے کا تو دنبالہ کھنچے ہے
مت ہاتھ میں ان مستوں کے تلوار دیا کر

کچھ خوب نہیں اتنا ستانا بھی کسو کا
ہے میرؔ فقیر اس کو نہ آزار دیا کر

طاقت نہیں ہے جان میں کڑھنا تعب ہے اور
بے لطفیاں کرو ہو یہ کس پر غضب ہے اور

ہر چند چپ ہوں لیک مرا حال ہے عجب
احوال پرسی تو نہ کرے تو عجب ہے اور

آنکھ اس کی اس طرح سے نہیں پڑتی ٹک ادھر
اب خوب دیکھتے ہیں تو چتون کا ڈھب ہے اور

کیا کہیے حال دل کا جدائی کی رات میں
گزری ہے کب کہانی کہے سے یہ شب ہے اور

دل لے چلے دکھا کے رُخ خوب کو تبھی
اب منہ چھپا جو بیٹھے یہ حسنِ طلب ہے اور

اس دل لگے کے روگ کو نسبت مرض سے کیا
اپنا یہ جلتے رہنا ہے کچھ اور تب ہے اور

طور اگلے تیرے ملتے نہیں اس طرح سے ٹک
وہ اور کچھ تھا ہم سے تو پیارے یہ اب ہے اور

کیا بات تیری اے ہمہ عیاری و فریب
آنکھیں کہیں ہیں اور سخن زیرِ لب ہے اور

اسبابِ مرگ کے تو مہیا ہیں سارے میرؔ
شاید کہ زندگانی کا اپنی سبب ہے اور

اے ہمنشیں کسو کے مت عشق کی ہوس کر
جاتی ہیں یوں ہی ناداں جانیں ترس ترس کر

فرصت ہے اس چمن کی کل رُک کے میں جو پوچھا[۱]
چشمک کی ایک گل نے میری طرف کو ہنس کر

ہم موسے ناتواں تھے سو ہو چکے ہیں کب کے
نکلے ہو تم پیارے کس پر کمر کو کس کر

۱۔ میر تقی میرؔ دہلوی سے کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات ؛ کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

جی رک گیا کہیں تو پھر ہوئیگا اندھیرا
مت چھیڑ ابر مجھ کو یوں ہی برس برس کر

کیا ایک تنگ میں ہی ہوں اُس زلفِ پُرشکن سے
اس دام میں موئے ہیں بہتیرے صید پھنس کر

اک جمع کے سرادپر روزِ سیاہ لایا
پگڑی ہیں بال لپٹے نکلا جو وہ گھرس[۱] کر

اس قافلہ میں کوئی دل آشنا نہیں ہے
ٹکڑے گلے کے اپنے ناحق نہ اے جرس کر

صیاد اگر اجازت گلگشت کی نہیں ٹک
دیوارِ باغ کو تو بارے درِ قفس کر

بے بس ہے میر تجھ بن رہتا نہیں دل اس کا
ٹک تو بھی اے ستمگر جو جور و ستم کو بس کر

آئی ہے اس کے کوچے سے ہوکر صبا کچھ اور
کیا سر میں خاک ڈالتی ہے اب ہوا کچھ اور

تدبیر دوستوں کی مجھے نفع کیا کرے
بیماری اور کچھ ہے کریں ہیں دوا کچھ اور

مستانِ عشق و اہلِ خرابات میں ہے فرق
میخوارگی کچھ اور ہے یہ نشہ تھا کچھ اور

کیا نسبت اُس کے قامتِ دلکش سے سرو کو
انداز اُس کا اور کچھ اس کی ادا کچھ اور

مانجا جو آرسی نے بہت آپ کو تو کیا
رخسار کے ہے سطح کے اس کے صفا کچھ اور

اُس کی زیادہ گوئی سے دل داغ ہو گیا
شکوہ کیا جب اس سے تب اُن نے کہا کچھ اور

اس طور سے تمھارے تو مرتے نہیں ہیں ہم
اب واسطے ہمارے نکالو جفا کچھ اور

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا
ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور

مرنے پہ جان دیتے ہیں وارفتگانِ عشق
ہے میر راہ و رسم دیارِ وفا کچھ اور

چمکی ہے جب سے برق سحر گلستاں کی اور
جی لگ رہا ہے خار و خسِ آشیاں کی اور

وہ کیا یہ دل لگی ہے فنا میں کہ رفتگاں
منہ کر کے بھی نہ سوئے کبھو پھر جہاں کی اور

[۱] گھرسنا۔ لکھنؤ میں بولتے ہیں۔ لیکن دہلی اور اکبرآباد میں اس کی بجائے اُرسنا برائے مہملہ اور میر بہ رائے ثقیلہ اب تک بولتے ہیں۔ میر کی زبان پر بھی اُرسنا ہوگا۔ غالباً یہ تحریف لکھنوی کاتب کی ہے۔ نظیر اکبرآبادی کا یہ شعر اس کی سند ہو سکتا ہے ؎

پہنے پھرے ہیں شوخ کڑے اور ہنسلیاں
پھولوں کی پگڑیوں میں ہیں شاخیں اُرس لیاں

در ذکرِ عیدگاہِ اکبرآباد (کلیاتِ نظیر شہباز) ایک اور جگہ بھی یہی لفظ اسی تحریف کے ساتھ آچکا ہے۔ آسی

رنگِ سخن تو دیکھ کہ حیرت سے باغ میں
رہجاتے ہیں گے دیکھکے گل اُس دہاں کی اور

آنکھیں سی کھل ہی جائیں گی جو مر گیا کوئی
دیکھا نہ کر غضب سے کسو خستہ جاں کی اور

کیا بے خبر ہے رفتنِ رنگینِ عمر سے
جُوئے چمن میں دیکھ ٹک آبِ رواں کی اور

یھاں تابِ سعی کس کو مگر جذب عشق کا
لاوے اسی کو کھینچ کسو ناتواں کی اور

یارب ہے کیا مزا سخنِ تلخِ یار میں
رہتے ہیں کان سب کے اُسی بدزباں کی اور

یا دل وہ دیدنی تھی جگہ یا کہ تجھ بغیر
اب دیکھتا نہیں ہے کوئی اس مکاں کی اور

آیا کسے تکدرِ خاطر ہے زیرِ خاک
جاتا ہے اکثر اب تو غبار آسماں کی اور

کیا حال ہو گیا ہے ترے غم میں میرؔ کا
دیکھا گیا نہ ہم سے تو ٹک اُس جواں کی اور

نئے طور سیکھے نکالے ڈھب اور
مگر اور تھے تب ہوئے ہو اب اور

ادا کچھ ہے انداز کچھ ناز کچھ
تہِ دل ہے کچھ اور زیرِ لب اور

لبِ سرخ کر ٹک دکھاتے نہیں
طرح پان کھانے کی تھی کچھ جب اور

نہ گرمی نہ جوشش نہ اب وہ تپاک
تکلف نہیں اس میں تھے تم تب اور

زمانہ مرا کیونکہ یکساں رہے
اٹھاویں گے تیرے ستم ہی کب اور

جدا اتفاقاً رہا ایک میرؔ
وگرنہ ملے یوں تو اُس سے سب اور

آخر دکھائی عشق نے چھاتی فگار کر
تصدیع کھینچی ہم نے یہ کام اختیار کر

اس باعثِ حیات سے کیا کیا ہیں چاہشیں
پر دم بخود ہی رہتے ہیں ہم جی کو مار کر

ٹک سامنے ہوا کہ نہ ایمان نہ دین و دل
کافر کو بھی نہ اس سے الٰہی دوچار کر

جا شوق پر نہ جا تنِ زار و نزار پر
ہے ترکِ صید پیشہ ہیں ہم بھی شکار کر

وہ سخت بازداؤں میں آتا نہیں ہے ہائے
کس طور جی کو ہم نہ لگا بیٹھیں ہار کر

ہم آپ سے گئے تو گئے پر بسانِ نقش
بیٹھا تو روزِ حشر تئیں انتظار کر

کن آنکھوں دیکھیں رنگ خزاں کے کہ باغ سے
گل سب چلے ہیں رختِ سفر اپنا بار کر

جل تھل بھریں نہ جب تئیں دم تب تئیں نہ لیں
ہم اور ابر آج اُٹھے ہیں قرار کر

اک صبح میری چھاتی کے داغوں کو دیکھ تو
یہ پھول گل بھی زور رہے ہیں بہار کر

مرتے ہیں میر سب پہ نہ اس بیکسی کے ساتھ
ماتم میں تیرے کوئی نہ رویا پکار کر

جنوں میں اب کی کام آئی نہ کچھ تدبیر بھی آخر
گئی کل ٹوٹ میرے پاؤں کی زنجیر بھی آخر

اگر ساکت ہیں ہم حیرت سے پر ہیں دیکھنے قابل
کہ اک عالم رکھے ہے عالمِ تصویر بھی آخر

یکایک یوں نہیں ہوتے ہیں پیارے جان سے لاگو
کبھو آدم ہی سے ہو جاتی ہے تقصیر بھی آخر

کلیجہ چھن گیا پر جان سختی کش بدن میں ہے
ہوئے اس شوخ کے ترکش کے سارے تیر بھی آخر

نہ دیکھی ایک واشد اپنے دل کی اس گلستاں میں
کھلے پائے ہزاروں غنچۂ دلگیر بھی آخر

سر و کار آہ کب تک خامہ و کاغذ سے یوں رکھیے
رکھے ہے انتہا احوال کی تحریر بھی آخر

پھرے ہے باؤلا سا پیچھے ان شہری غزالوں کے
بیاباں مرگ ہوگا اس چلن سے میر بھی آخر

رہ جاؤں چپ نہ کیونکہ برا جی میں مان کر
آؤ بھلا کبھو تو سو جاؤ زبان کر

کہتے ہیں چلتے وقت ملاقات ہے ضرور
جاتے ہیں ہم بھی جان سے ٹک دیکھو آن کر

کیا لطف تھا کہ میکدے کی پشت بام پر
سوتے تھے مست چادر مہتاب تان کر

آیا نہ چل کے یہاں تئیں وہ باعثِ حیات
مارا ہے ان نے جان سے ہم کو تو جان کر

ایسے ہی تیز دست ہو خوں ریزی میں تو پھر
رکھو گے تیغ جور کی یکچند میان کر

یہ بے مروتی کہ نگہ کا صفا لقا
اتنا تو میری جان نہ مجھ سے سیان کر

رنگین گور کرنی شہیدوں کی رسم ہے
تو بھی ہماری خاک پہ خوں کے نشان کر

رکھتا تھا وقت قتل مرا امتیاز ہاے
سو خاک میں ملایا مجھے سب میں سان کر

تم تیغ جور کھینچ کے کیا سوچ میں گئے
مرنا ہی اپنا جی میں ہم آئے ہیں ٹھان کر

وے دن گئے کہ طاقتِ دل کا تھا اعتماد
اب یوں کھڑے کھڑے نہ مرا امتحان کر

اس گوہر مراد کو پایا نہ ہم نے میر
پایان کار مر گئے یوں خاک چھان کر

مجھ کو قفس میں سنبل و ریحاں کی کیا خبر
کہہ اے نسیم صبح گلستاں کی کیا خبر

رہتا ہے ایک نشہ انھیں جن کو ہے شناخت
ہے زاہدوں کو مستی عرفاں کی کیا خبر

ٹک پوچھتے جو آن نکلتا کوئی ادھر
اب بعد مرگ قیس بیاباں کی کیا خبر

برباد جائے یہاں کوئی دولت تو کیا عجب
آئی ہے تم کو ملک سلیماں کی کیا بسر

آیا ہے ایک شہر غریباں سے تازہ تو
میر اُس جوان حالِ پریشاں کی کیا خبر

اب تنگ ہوں بہت ہیں مت اور دشمنی کر
لاگو ہو میرے جی کا اتنی ہی دوستی کر

جب تک شگاف تھے کچھ اتنا نہ جی رُکے تھا
پچھتائے ہم نہایت سینے کے چاک سی کر

قصہ نہیں سُنا کیا یوسف[۱] ہی کا جو تو نے
اب بھائیوں سے چھندے تو گرگ آشتی کر

ناسازی و خشونت جنگل ہی چاہتی ہے
شہروں میں ہم نہ دیکھا بالیدہ ہوتے کیکر[۵]

کچھ آج اشکِ خونیں میں نے نہیں چھپائے
رہ رہ گیا ہوں برسوں لوہو کو اپنے پی کر

کس مردنی کو اُس بن بھاتی ہے زندگانی
بس جی چکا بہت میں اب کیا کروں گا جی کر

حرفِ غلط کو سُن کر درپے نہ خوں کے ہونا
جو کچھ کیا ہے میں نے پہلے اُسے سہی[۱] کر

دن رات کڑھتے کڑھتے میں بھی بہت رُکا ہوں
جو تجھ سے ہو سکے سو اب تو بھی مت کمی کر

رہتی ہے سو نکوئی رہتا نہیں ہے کوئی
تو بھی جو یہاں رہے تو زنہار مت بدی کر

تھی جب تلک جوانی رنج و تعب اُٹھائے
اب کیا ہے میر جی میں ترکِ ستمگری کر

ردیف زائے معجمہ

اُس شوخ نے سُنا نہیں نامِ صبا ہنوز
غنچہ ہے وہ لگی نہیں اُس کو ہوا ہنوز

عاشق کے اُس کو گریۂ خونیں کا درد کیا
آنسو نہیں ہے آنکھ سے جس کی گرا ہنوز

کیا جانے وہ کہ گزری ہے یاروں کے جی پہ کیا
مطلق کسو سے اُس کا نہیں دل لگا ہنوز

برسوں میں نامہ بر سے مرا نام جو سُنا
کہنے لگا کہ زندہ ہے وہ تنگ کیا ہنوز

گھگھیاتے رات کے تئیں باچھیں تو پھٹ گئیں
ناواقفِ قبول ہے لیکن دعا ہنوز

کیا کیا کرے ہے حجتیں قاصد سے لیتے خط
حالانکہ وہ ہوا نہیں حرف آشنا ہنوز

---

[۱] یہ سہی، دراصل صحیح ہے۔ اس طرح کا استعمال اب درست نہیں۔ اسی قیاس پر تسبیح کی جگہ تسبی یا مسجد کی جگہ مسیت یا پلید کی جگہ پلیت درست نہیں۔ وغیرہ ۔ آسی

[۵] کیکر یعنی ببول اکثر جگہ بولا جاتا ہے ۱۲

سو بار ایک دم میں گیا ڈوب ڈوب جی
پر بحرِ غم کی پائی نہ کچھ انتہا ہنوز

خط سے ہے بے وفائی حسن اس کے آئینہ
ہم سادگی سے رکھتے ہیں چشمِ وفا ہنوز

سو عقدے فرطِ شوق سے پیش آئے دل کو یہاں
وہاں بند اس قبا کے نہیں ہوگئے وا ہنوز

یہاں میر ہم پہنچ ہی گئے مرگ کے قریب
وہاں دلبروں کو ہے وہی قصدِ جفا ہنوز

ہے میرے لوہو رونے کا آثار سا ہنوز
کوچہ کوئی کوئی ہے چمن زار سا ہنوز

کب تک کھنچے گی صبح قیامت کی شام کو
عرصے میں ہیں کھڑا ہوں گنہگار سا ہنوز

مدت ہوئی کہ خون جگر میں نہیں رہے
جاتا ہے آنسوؤں کا چلا تار سا ہنوز

سایہ سا آگیا تھا نظر اس کا ایک دن
مبہوت میں پھروں ہوں پری دار سا ہنوز

برسوں سے گل چمن میں نکلتے ہیں رنگ رنگ
نکلا نہیں ہے ایک رخِ یار سا ہنوز

دیکھا تھا خانہ باغ میں پھرتے اسے کہیں
گل حیرتی ہے صورتِ دیوار سا ہنوز

مدت سے ترکِ عشق کیا میر نے ولے
زار و زبوں و زرد ہے بیمار سا ہنوز

کب تک بھلا بتاؤ گے یوں صبح شام روز
آؤ کہیں کہ رہتی ہیں رفتہ تمام روز

وہ سرکشی سے گو متوجہ نہ ہو ادھر
ہم عاجزانہ کرتے ہیں اس کو سلام روز

گہ رنج کھینچنے کو گہے گہ ہلاک کو
پہنچے ہے ہم کو اس سے نیا اک پیام روز

منظور بندگی نہیں میری تو کیا کروں
حاضر ہے اپنی اور سے یوں تو غلام روز

برشغل ہوئے کہ رات کو ٹک بیٹھتے نہیں
رہتے ہیں تم کو میر جی کیا ایسے کام روز

ردیف سین

گئے جس دم سے ہم اس تندخو پاس
رہے خنجر ستم ہی کے گلو پاس

قیامت ہے نہ ہو اے سرمایۂ جان
نہ ہووے وقت مرنے کے بھی تو پاس

رلایا ہم نے پہروں رات اس کو
کہا یہ قصۂ غم جس کسو پاس

کہیں اک دور کی سی کچھ تھی نسبت
رکھا تھا آئینے کو اس کے رو پاس

دل او چشمِ مروّت کیوں نہ خوں ہو — تجھے ہم جب نہ تب دیکھیں عدو پاس
یہی گالی یہی جھڑکی یہی چھیڑ — نہ کچھ میرا کیا تو نے کبھو پاس

چل اب ای میرؔ بس اس سرو قد بن
بہت رویا چمن کے آب جو پاس

جب بٹھادیں مجھے جلّاد جفاکار کے پاس — تو بھی ٹک آن کھڑا ہو جو[۵] گنہگار کے پاس
دردمندوں سے تمھیں دور پھرا کرنے ہو کچھ — پوچھنے ورنہ سبھی آتے ہیں بیمار کے پاس
چشمِ مست اپنی سے صحبت نہ رکھا کر اتنی — بیٹھنے بھی تو بھلا مردمِ ہشیار کے پاس
خندۂ و چشمک و حرف و سخن زیر لبی — کہئے جو ایک دو افسون ہوں دلدار کے پاس
داغ ہونا نظر آتا ہی دلوں کا آخر — یہ جو اک خال پڑا ہی ترے رخسار کے پاس
خط نمودار ہوئے اور بھی دل ٹوٹ گئے — یہ بلا نکلی نئی زلفِ شکن دار کے پاس
درِ گلزار پہ جانے کے نصیب اپنے کہاں — یوں ہی مرلے گا قفس کی کبھو دیوار کے پاس
کیا رکھا کرتے ہو آئینے سے صحبت ہردم — ٹک کبھو بیٹھو کسو طالبِ دیدار کے پاس
دل کو یوں لیتے ہو کھٹکا نہیں ہونے پاتا — تربیت پائی ہی تم نے کسو عیار کے پاس
مورچہ جیسے لگے تنگ شکر کو آکر — خط نمودار ہے یوں لعل شکر بار کے پاس
جس طرح کفر بندھا ہی گلے اسلام کہاں — یوں تو تسبیح بھی ہم رکھتے ہیں زنار کے پاس
ہم نہ کہتے تھے نہ مل مغبچوں سے ای زاہد — ابھی تسبیح دھری تھی تری دستار کے پاس
نارسائی بھی نوشتے کی مرے دور کھنچی — اتنی مدت میں نہ پہنچا کوئی خط یار کے پاس

اختلاط ایک تمھیں میرؔ ہی غم کش سے نہیں
جب نہ تب یوں تو نظر آتے ہو دو چار کے پاس

عزت نہیں ہی دل کی کچھ اس دلربا کے پاس — رہتی ہی آرسی ہی دھری خود نما کے پاس
پہروں شیوں کو غم میں ترے جاگتے رہے — ہو آہ نہیں جگر سو کرے بے وفا کے پاس
راہ و روش رکھیں ہیں جدا دردمندِ عشق — زنہار یہ کھڑے نہیں ہوتے دوا کے پاس
کیا جانے قدرِ غنچۂ دل باغبان پسر — ہوتی گلابی ایسے کسو میرزا کے پاس
جو دیر سے حرم کو گئے سو وہیں موے — آتا نہیں ہی جا کے کوئی پھر خدا کے پاس
کیا جانئے کہ کہتے ہیں کس کو یگانگی — بیگانے ہی سے ہم رہے اس آشنا کے پاس

[۵] ہو جو یعنی ہو جیو۔ غالب کے عہد تک اس صورت کو بھی بولا جاتا تھا اب متروک ہے ۱۲

میرؔ اس دلِ گرفتہ کے یہاں تو ملی نہ داد
عقدہ یہ لیکے جاؤں گا مشکلکشا کے پاس

رہتے تھے ہم وے آٹھ پہر یا تو پاس پاس
یا اب پھٹک نہیں ہی کہیں اُن کے آس پاس

تا لوگ بدگماں نہ ہوں آئے نہ اس کی اُور
ہم تو کیا ہی عشق میں دور از قیاس پاس

گرہی پڑے جو دیکھے ہی تنکا بھی گر کہیں
مایہ نہیں ہی کچھ فلکِ بے سپاس پاس

شیخ ان لبوں کے بوسے کو اس ریش سے جھجک
رکھتا ہی کون آتش سوزندہ گھاس پاس

تم نے تو قدر کی ہی متاعِ دفا کی خوب
بیچیں گے اب یہ جنس کسو دل شناس پاس

آلودہ کر نہ مستی سے جامہ کو جسم کے
ہشیار رہ یہ عاریتی ہی لباس پاس

وحشی ہی میرؔ ربط ہی اُس سے خلافِ عقل
بیٹھے سو جاکے کیا کوئی ایسے اُداس پاس

ردیف شین

گل کو ہوتا صبا قرار اے کاش
رہتی ایک آدھ دن بہار اے کاش

یہ جو دو آنکھ مند گئیں میری
اس پہ وا ہوتیں ایک بار اے کاش

کن نے اپنی مصیبتیں نہ گنیں
رکھتے میرے بھی غم شمار اے کاش

جان آخر تو جانے والی تھی
اس پہ کی ہوتی میں نثار اے کاش

اس میں راہِ سخن نکلتی تھی
شعر ہوتا ترا شعار اے کاش

خاک[1] بھی وہ تو دیوے گا برباد
نہ بناویں مری مزار اے کاش

شش جہت اب تو تنگ ہی ہم پر
اس سے ہوتے نہ ہم دوچار اے کاش

مرتے بھی تو ترے ہی کوچے میں
ملتی یہاں جائے گور دار اے کاش

ان لبوں کی کلی سے دل ہی بھرا
چل پڑے بات پیش یار اے کاش

[1] یہ شعر ایک قلمی نسخے میں اس طرح لکھا ہوا ملتا ہی ؎

مرتے بھی تو ترے ہی کوچے میں
وہیں کرتے مری مزار اے کاش

اور مزار والے قافیہ کا دوسرا شعر قدیم قلمی نسخے میں نہیں ملتا ۔ آسی

بے اجل میرؔ اب پڑا مرنا
عشق کرتے نہ اختیار اے کاش

کیا کہئے کیا رکھیں ہیں ہم تجھ سے یار خواہش
یک جان و صد تمنا یک دل ہزار خواہش

لے ہاتھ میں قفس ٹک صیاد چل چمن تک
مدت سے ہے ہمیں بھی سیر بہار خواہش

نے کچھ گنہ ہے دل کا نے جرم چشم اس میں
رکھتی ہے ہم کو اتنا بے اختیار خواہش

حالانکہ عمر ساری مایوس گزری تس پر
کیا کیا رکھیں ہیں اس کے امیدوار خواہش

غیرت سے دوستی کی کس کس سے ہوجے دشمن
رکھتا ہے یار ہی کی سارا دیار خواہش

ہم مہرورز کیونکر خالی ہوں آرزو سے
شیوہ یہی تمنا فن و شعار خواہش

اٹھتی ہے موج ہر اک آغوش ہی کی صورت
دریا کو ہے یہ کس کا بوس و کنار خواہش

صد رنگ جلوہ گر ہے ہر جا وہ غیرت گل
عاشق کی ایک پاوے کیونکر قرار خواہش

یکبار بر نہ آئی اس سے امید دل کی
اظہار کرتے کب تک یوں بار بار خواہش

کرتے ہیں سب تمنا پر میرؔ جی نہ اتنی
رکھے گی مار تم کو پایان کار خواہش

مطلق نہیں ادھر ہے اس دلربا کی خواہش
کیا جانیے کہ کیا ہے یارو خدا کی خواہش

دیکھیں تو تیغ اس کی اب کس کے سر چڑھے ہے
رکھتے ہیں یار جی میں اس کی جفا کی خواہش

لعل خموش اپنے دیکھو ہو آرسی میں
پھر پوچھتے ہو ہنسکر مجھ بے نوا کی خواہش

اقلیم حسن سے ہم دل پھیر لے چلے ہیں
کیا کریے یاں نہیں ہے جنس وفا کی خواہش

خون جگر ہی کھانا آغاز عشق میں ہے
رہتی ہے اس مرض میں پھر کب غذا کی خواہش

وہ شوخ دشمن جاں اے دل تو اس کا خواہاں
کرتا ہے کوئی ظالم ایسی بلا کی خواہش

میرے بھی حق میں کر ٹک ہاتھوں کو میرؔ اونچا
رکھتا ہے اہل دل سے ہر اک دعا کی خواہش

ہم پر روا جو رکھتے ہو جور و جفا ہمیش
خوبی رہا کرے ہے مری جان کیا ہمیش

کس اعتبار دل کے تئیں گل کہیں ہیں لوگ
تجھ پاس تو مندی ہی کلی سا رہا ہمیش

کچھ عہد میں ہمارے محبت ہوئی ہے تنگ
آپس میں ورنہ رسم تھی مہر و وفا ہمیش

فرصت مرض سے دل کے ہمیں کب ہوئی تنک
تھوڑی بہت چلی ہی گئی ہے دوا ہمیش

اب عید بھی بغیر ملے اُس کے ہی دہا
رہتا تھا جو ہمارے گلے ہی لگا ہمیش

ہم تو جو رفتنی ہیں ملے ہی رہیں تو خوب
رہتا نہیں ہی کوئی بغیر از خدا ہمیش

واقف نہیں ہوں میر سے تو پر تمام شب
کرتا ہی شور آن کر اک بے نوا ہمیش

ردیف طائے مہملہ

عشق کی رہ نہ چل خبر ہی شرط
اوّل گام ترکِ سر ہی شرط

دعوئے عشق یوں نہیں صادق
زردیِ رنگ و چشمِ تر ہی شرط

خامی[1] جاتی ہی کوئی گھر بیٹھے
پختہ کاری کے تئیں سفر ہی شرط

قصدِ حج ہی تو شیخ کو لے چل
کعبہ جانے کو یہ بھی خر ہی شرط

قلب یعنی کہ دل عجب زر ہی
اُس کی نقادی کو نظر ہی شرط

حق کے دینے کو چاہیے ہی کیا
یھاں نہ اسباب نے ہنر ہی شرط

دل کا دینا ہی سہل کیا ای میر
عاشقی کرنے کو جگر ہی شرط

کرتے نہیں ہیں اُس سے نیا کچھ ہم اختلاط
ہوتا تھا اگلے لوگوں میں بھی باہم اختلاط

ٹک گرم میں ملوں تو مجھی سے ملے خنک
اوروں سے تو وہی ہی اُسے ہر دم اختلاط

ایسا نہ ہو کہ شیخ دغا دیوے ہمنشیں
ابلیس سے کرے ہی کوئی آدم اختلاط

بیگانگی مجھی سے چلی جاتی ہی خصوص
رکھتا ہی یوں تو یار سے اک عالم اختلاط

کس طور اتفاق پڑی صحبت اُس سے دیر
ہی میر بے دماغ و قیامت کم اختلاط

ردیف عین

تیرے ہوتے شام کو گر بزم میں آ جائے شمع
ہو خجل ایسی کہ منہ اپنا نہ پھر دکھلائے شمع

[1] سعدیؒ ؎ تا بہ دکان خانہ در گروی ؎ ہرگز ای خام آدمی نشوی

کیا جلے جاتے ہیں تجھ سے سب دیئے سے دیکھتے
گر یہی یہاں کا ہے ڈھب تو حیف مجلس وائے شمع

کس کے تئیں ہوتا ہے قطع زندگانی کا یہ شوق
سر کٹانے کو گلی میں جمع ہیں رگ ہائے شمع

کچھ نہیں مجھ میں دروں کی جلن سے اس طرح
کھا چلا ہے جیسے اک ہی داغ سرتاپائے شمع

داغ ہو کر جان دی اُن نے تمھارے واسطے
مشتِ خاکِ **میر** پر سو تم نہ لیکر آئے شمع

اُس کے ہوتے بزم میں فانوس میں آتی ہے شمع
یعنی اُس آتش کے پرکالے سے شرماتی ہے شمع

ہر زماں جاتی ہے گھٹتی سامنے تیرے کھڑی
جوشِ غم سے آپ ہی اپنے تئیں کھاتی ہے شمع

بیٹھے اُس مہ کے کسو کو دیکھتا ہے کب کوئی
رنگ رو کو بزم میں ہر چند جھمکاتی ہے شمع

باد سے جنبش میں کچھ رہتی نہیں ہے متصل
اس بھبھوکے سے جو گھٹتی ہے سو جھنجھلاتی ہے شمع

چھوڑتی ہے لطف کیا افسردگی خاطر کی **میر**
آگے اس کے چہرۂ روشن کے بجھ جاتی ہے شمع

عشق میں کچھ نہیں دوا سے نفع
کڑھیے کب تک نہ ہو بلا سے نفع

کب تلک ان بتوں سے چشم رہے
ہو رہیگا بس اب خدا سے نفع

میں تو غیر از ضرر نہ دیکھا کچھ
ڈھونڈو تم یار و آشنا سے نفع

مغتنم جاں گر کسو کے تئیں
پہنچے ہے تیرے دست و پا سے نفع

اب فقیروں سے کہہ حقیقتِ دل
میر شاید کہ ہو دعا سے نفع

ردیف غین

اب اس کے غم سے جو کوئی چاہے سو کھائے داغ
باقی نہیں ہے چھاتی میں اپنی تو جائے داغ

چشم و دل و دماغ و جگر سب کو رو رہے
اس عشقِ خانہ سوز نے کیا کیا دکھائے داغ

جی جل گیا تقربِ اغیار دیکھ کر
ہم اُس گلی میں جب گئے تب وہاں سے لائے داغ

کیا لالہ ایک داغ پہ پھولے ہے باغ میں
بہتیرے ایسے چھاتی پہ ہم نے جلائے داغ

کیا شیخ کے ورع میں تردد ہے ہم نے آپ
سو بار اُس کے کرتے سے مے کے دھلائے داغ

آخر کو روئے کار سے پردہ اُٹھے گا کیا
مقدور تک تو چھاتی کے ہم نے چھپائے داغ

دل کی گرہ میں غنچۂ لالہ کے رنگ میر
سوزِ دروں سے کچھ نہیں ہی اب سوائے داغ

ردیف فا

میلانِ دل ہی زلفِ سیہ فام کی طرف
جاتا ہی صید آپسے اس دام کی طرف

دل اپنا عدل داورِ محشر سے جمع ہی
کرتا ہی کون عاشقِ بدنام کی طرف

اس پہلوئے فگار کو بستر سے کام کیا
مدت ہوئی کہ چھوٹی ہی آرام کی طرف

یک شب نظر پڑا تھا کہیں تو سواب مدام
رہتی ہی چشمِ ماہ ترے بام کی طرف

آنکھیں جنھوں کی زلف و رخِ یار سے لگیں
وے دیکھتے نہیں سحر و شام کی طرف

جوں چشمِ یار بزم میں اُگلا پڑے ہی آج
ٹک دیکھ شیخ مے کے بھرے جام کی طرف

خارا شگاف و سینہ خراش ایک سے نہیں
لیکن نظر نہیں ہی تجھے کام کی طرف

دل پک رہے ہیں جن کے انھیں سے ہمیں ہی شوق
میلانِ طبع کب ہی کسو خام کی طرف

دیکھی ہی جب سے اس بتِ کافر کی شکل میر
جاتا نہیں ہی جی تنک اسلام کی طرف

ردیف قاف

ای رشکِ برق تجھ سے مشکل ہی کارِ عاشق
اک جھمکی میں کہاں پھر صبر و قرارِ عاشق

خاک سیہ سے یکساں تیرے لئے ہوا ہوں
تو بھی تو ایک شب ہو شمعِ مزارِ عاشق

ای بحرِ حسن ہووے یہ آگ سر و ٹک تب
جوں موج ہو لبالب تجھ سے کنارِ عاشق

دل خواہ کوئی دلبر ملتا تو دل کو دیتے
گر چاہئے ہیں ہوتا کچھ اختیارِ عاشق

پلکوں کی اُس کی کاوش ہر دم جب ایسی ہووے
مشکل کہ جی سے جاوے پھر خار خارِ عاشق

کیا جانے محو جو ہو اپنے ہی ردو مو کا
گزرے ہی کس طرح سے لیل و نہارِ عاشق

خواری کا اپنی موجب ہی اضطراب ہر دم
دل سمجھے تو رہے بھی کچھ اعتبارِ عاشق

آنکھوں تلے سے سرکی وہ چشمِ مست ٹک تو
جاتا دکھائی دیوے رنج و خمارِ عاشق

کیا بوجھ بھاری سے میں ناکام کاٹتا ہوں
دنیا سے ہی نرالا کچھ کاروبارِ عاشق

اس پردے میں غمِ دل کہتا ہے میر اپنا
کیا شعر و شاعری ہے یارو شعارِ عاشق

کیا کہوں تم سے میں کہ کیا ہے عشق
جان کا روگ ہے بلا ہے عشق

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

عشق معشوق عشق عاشق ہے
یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق

عشق ہے طرز و طور عشق کے تئیں
کہیں بندہ کہیں خدا ہے عشق

گر پرستش خدا کی ثابت کی
کسو صورت میں ہو بھلا ہے عشق

دلکش ایسا کہاں ہے دشمنِ جاں
مدعی ہے پہ مدعا ہے عشق

ہے ہمارے بھی طور کا عاشق
جس کسی کو کہیں ہوا ہے عشق

کوئی خواہاں نہیں محبت کا
تو کہے جنسِ ناروا ہے عشق

میر[۱] جی زرد ہوتے جاتے ہو
کیا کہیں تم نے بھی کیا ہے عشق

ردیف کاف (تازی)

دیکھی تھی تیرے کان کے موتی کی اک جھپک
جاتی نہیں ہے اشک کے رخسار کی ڈھلک

یارب اک اشتیاق نکلتا ہے چال سے
ملتے پھریں ہیں خاک میں کس کیلئے فلک

طاقت ہو جس کے دل میں وہ دو چار دن رہے
ہم ناتوانِ عشق تمھارے کہاں تلک

برسوں ہوئے کہ جان سے جاتی نہیں خلش
ٹک مل گئی تھی آگے مرے وہ بھری پلک

آئی نہ ہاتھ میر کی میت پہ کل نماز
تابوت پر تھی اس کے نپٹ کثرتِ ملک

عزت اپنی اب نہیں ہے یار کو منظور ٹک
پاس جاتا ہوں تو کہتا ہے کہ بیٹھو دور ٹک

حال میرا شہر میں کہتے رہیں گے لوگ دیر
اس فسانے کے تئیں ہونے تو دو مشہور ٹک

پشت پا مارے ہیں شاہی پر گدائے کوئے عشق
دیکھو تم یہاں کا خدا کے واسطے دستور ٹک

چاہنے کا مجھ سے بے قدرت کا کیا ہے اعتبار
عشق کرنے کو کسو کے چاہیئے مقدور ٹک

حق تو سب کچھ تھا ہی ناحق جان دی کس واسطے
حوصلے سے بات کرتا کاشکے منصور ٹک

[۱] ردیف کاف غزل دوم کا مقطع دیکھئے

مُنکرِ حُسنِ بتاں کیونکر نہ ہووے شیخ میرؔ
حق ہی اُس کی اُور دہ آنکھوں سے ہی معذور ٹک

پھر کہیں کیا دل لگایا میرؔ جو ہی زرد رو
مُنہ پر آیا تھا ترے دو چار دن سے نور ٹک

حال آنکہ کام پہنچ گیا لب کا جاں تلک
آتی نہیں ہی تو بھی شکایت زباں تلک

اس رشکِ مہ کے دل میں نہ مطلق کیا اثر
ہر چند پہنچی میری دُعا آسماں تلک

جو آرزو کی اُس سے سو دل ہی میں خوں ہوئی
نومید یوں بسر کرے کوئی کہاں تلک

کھینچا گئے وہ دور بہت آپ کو سدا
ہمسائے ہم موا کئے آئے نہ یہاں تلک

بلبل قفس میں اس لب ولہجہ پہ یہ فغاں
آواز ایک ہو رہی ہی گلستاں تلک

پچھتائے اُٹھ کے گھر سے کہ جوں نومید پر
جانا بنا نہ آپ کو پھر آشیاں تلک

ہم بھی تجھی یار کو ہی اعتبار شرط
اپنی پہنچ تو میرؔ نہیں پاسباں تلک

ہم بےکسوں کا کون ہی ہجراں میں غم شریک
تنہائی ایک ہی سو ہی اس کے ستم شریک

دم رک کے دو ہیں کسو اگر مر نہ جاے وہ
ہو میرے حال کا جو کوئی ایک دم شریک

خوں ہوتے ہوتے ہو چکے آخر کہاں تلک
اب دل جگر کہیں نہیں ہیں تیرے ہم شریک

دل تنگ ہو جیے تو نہ ملیے کسو کے ساتھ
ہوتے ہیں ایسے وقت میں یہ لوگ کم شریک

شاید کہ سرنوشت میں مرنا ہی گھٹ کے میرؔ
کاغذ نہ محرمِ غمِ دل نے قلم شریک

چلی ہی باغ کی صبا کیا خاک
دل جلا کوئی ہو گیا کیا خاک

ہی غبار اس کے خط سے دل میں بہت
باہم اب ہو یگی صفا کیا خاک

ہم گرے اس کے در ہی پر مر کر
اور کوئی کرے وفا کیا خاک

خاک ہی میں ملائے رکھتے ہو
ہو کوئی تم سے آشنا کیا خاک

سب موے ابتدائے عشق ہی میں
ہووے معلوم انتہا کیا خاک

خاک پر ہی سدا جبینِ نیاز
اور کوئی ہو جبہہ سا کیا خاک

تربتِ میرؔ پر چلے تم دیر
اتنی مدت میں وہاں رہا کیا خاک

آجکل سے کچھ نہ طوفاں زا ہی چشمِ گریہ ناک
موجزن برسوں سے ہی دریا ہی چشمِ گریہ ناک

یوں نہ رُوؤ تو نہ رُوؤ ورنہ رُوؤ پیار سے
ہر قدم اس دشت میں پیدا ہی چشمِ گریہ ناک

دل سے آگے ٹک قدم رکھو تو پھر بھی دلبرو
سیر قابل دیدنی اک جا ہی چشمِ گریہ ناک

بے گدازِ دل نہیں امکان رونا اس قدر
تہ کو پہنچو خوب تو پردا ہی چشمِ گریہ ناک

سوجھتا اپنا کرے کچھ ابر تو ہی مصلحت
جوشِ غم سے جیسے نابینا ہی چشمِ گریہ ناک

سبز ہی رونے سے میرے گوشہ گوشہ دشت کا
باعثِ آبادیِ صحرا ہی چشمِ گریہ ناک

دے حنائے پا مری آنکھوں ہی میں پھرتی ہے میر
یعنی ہر دم اُس کی زیرِ پا ہی چشمِ گریہ ناک

سو خونچکاں گلہ ہیں لب سے مری زباں تک
جی رندھ گیا ہی ظالم اب رحم کر کہاں تک

ملنے میں میرے گاہے ٹک تن دیا نہ اُس نے
حاضر رہا ہوں میں تو اپنی طرف سے جاں تک

ہر چند میں نے سر پر اس رہ کی خاک ڈالی
لیکن نہ پہنچیں آنکھیں اس پاؤں کے نشاں تک

ان ہڈیوں کا جلنا کوئی ہما سے پوچھو
لاتا نہیں ہی منہ وہ اب میری استخواں تک

اُس کی گلی کے سگ سے کی ہی موافقت میں
اس راہ سے بھی پہنچیں شاید کہ پاسباں تک

ابرِ بہار نے شب دل کو بہت جلایا
تھا برق کا چمکنا خاشاکِ آشیاں تک

اُس مہ کے گوش تک تو ہرگز نہیں پہنچتی
گو آہ بے سرایت جاتی ہی آسماں تک

قیدِ قفس میں مرنا کب شوق کا ہی مانع
پہنچیں گے مشت پر بھی اُڑ کر یہ گلستاں تک

ہونا جہاں کا اپنی آنکھوں میں ہی نہ ہونا
آتا نظر نہیں کچھ جاوے نظر جہاں تک

جاتی ہیں خط کے پیچھے جوں مہر آنکھیں میری
اب کارِ شوق میرا پہنچا ہی میر یہاں تک

لیا چہرہ دستی سے گر میں سر تک
نہ پہنچا کبھو ہاتھ اُس کی کمر تک

مجھے نیند کیسی کہ مانند انجم
کھلی رہتی ہیں میری آنکھیں سحر تک

اُٹھا پاس بے اختیاری سے سب کا
بکا بیٹھے کرتے ہیں دو دو پہر تک

دماغ اور دل ہیں سراسیمہ دونوں
سرِ زخم شاید کہ پہنچا جگر تک

بلا شور ہنگامہ ہی دل زدوں کا
قیامت کہیں جائے ہی اُس کے گھر تک

نہ دے ماریں چوکھٹ سے سر کو تو کیو
رسائی ہوا چاہیے اُس کے در تک

محبّت میں جی سے گئے میرؔ آخر
خبر گفتنی ہے یہ ہر بے خبر تک

ردیف کاف فارسی

غافل ہیں ایسے سوتے ہیں گویا جہاں کے لوگ
حالانکہ رفتنی ہیں سب اس کارواں کے لوگ

مجنون و کوہ کن نہ تلف عشق میں ہوئے
مرنے پہ جی ہی دیتے ہیں اس خانداں کے لوگ

کیونکر کہیں کہ شہرِ وفا میں جنوں نہیں
ان خصم جاں کے سارے دوانے ہیں یہاں کے لوگ

رونق تھی دل میں جب تئیں بستے تھے دلبراں
اب کیا رہا ہے اُٹھ گئے سب اس مکاں کے لوگ

تو ہم میں اور آپ میں مت دے کسی کو دخل
ہوتے ہیں فتنہ ساز یہی درمیاں کے لوگ

مرتے ہیں اس کے واسطے یوں تو بہت ولے
کم آشنا ہیں طور سے اس کام جاں کے لوگ

پتے کو اس چمن کے نہیں دیکھتے ہیں گرم
جو محرمِ روش ہیں کچھ اس بدگماں کے لوگ

بت چیز کیا کہ جس کو خدا مانتے ہیں سب
خوش اعتقاد کتنے ہیں ہندوستاں کے لوگ

فردوس کو بھی آنکھ اُٹھا دیکھتے نہیں
کس درجہ سیر چشم ہیں کوئے بتاں کے لوگ

کیا سہل جی سے ہاتھ اُٹھا بیٹھتے ہیں ہائے
یہ عشق پیشگاں ہیں الٰہی کہاں کے لوگ

مُنہ تکتے ہی رہے ہیں سدا مجلسوں کے بیچ
گویا کہ میرؔ محو ہیں میری زباں کے لوگ

کیا عشق خانہ سوز کے دل میں چھپی ہے آگ
اک سارے تن بدن میں مرے پھک رہی ہے آگ

گلشن بھرا ہے لالہ و گل سے اگرچہ سب
پر اُس بغیر اپنے تو بھائیں لگی ہے آگ

پاؤں میں پڑ گئے ہیں پھپھولے مرے تمام
ہر گام راہِ عشق میں گویا دبی ہے آگ

جل جل کے سب عمارتِ دل خاک ہو گئی
کیسے نگر کو آہ محبت نے دی ہے آگ

اب گرم و سردِ دہر سے یکساں نہیں ہے حال
پانی ہے دل ہمارا کبھو تو کبھی ہے آگ

کیونکر نہ طبع آتشیں اُس کی ہمیں جلائے
ہم مشت خس کا حکم رکھیں وہ پری ہے آگ

کب لگ سکے ہے عشق جہاں سوز کو ہوس
ماہی کی زیست آب سمندر کا جی ہے آگ

روزِ ازل سے آتے ہیں ہوتے جگر کباب
کیا آج کل سے عشق کی یارو جلی ہے آگ

بکارے سے نہ گرتے تھے آگے جگر کے لخت
جب تب ہماری گود میں اب تو بھری ہے آگ

یارب ہمیشہ جلتی ہی رہتی ہیں چھاتیاں
یہ کیسی عاشقوں کے دلوں میں رکھی ہے آگ

افسردگی سوختہ جاناں ہے قہر میر
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

ہے آگ کا سا نالۂ آتش فزا کا رنگ
کچھ اور صبحدم سے ہوا ہے ہوا کا رنگ

دیکھے ادھر تو مجھ سے نہ یوں آنکھ وہ چھپائے
ظاہر ہے میرے منہ سے مرے مدعا کا رنگ

کس بیگنہ کے خوں میں ترا پڑ گیا ہے پاؤں
ہوتا نہیں ہے سرخ تو ایسا حنا کا رنگ

ہے گو شکستہ رنگیِ خورشید کیا عجب
ہوتا ہے زرد بیشتر اہلِ فنا کا رنگ

گل پیرہن نہ چاک کریں کیونکہ رشک سے
کس مرتبے میں شوخ ہے اُسکی قبا کا رنگ

رہتا تھا ابتدائے محبّت میں منہ سفید
اب زرد سب ہوا ہوں یہ ہے انتہا کا رنگ

داروئے لعل گوں نہ پیو میرزا ہو تم
گرمی پہ ہے دلیل بہت اس دوا کا رنگ

خوبی ہے اس کی حیزِ تحریر سے بروں
کیا اُس کا طورِ حسن لکھوں کیا ادا کا رنگ

پوچھیں ہیں وجہ گریۂ خونیں جو مجھ سے لوگ
کیا دیکھتے نہیں ہیں سب اس بے وفا کا رنگ

مقدور تک نہ گزرے مرے خوں سے یار میر
غیروں سے کیا گلہ ہے یہ ہے آشنا کا رنگ

رہِ مرگ سے کیوں ڈراتے ہیں لوگ
بہت اُس طرف کو تو جاتے ہیں لوگ

مظاہر سب اُس کے ہیں ظاہر ہے وہ
تکلف ہے یہاں جو چھپاتے ہیں لوگ

عجب کی جگہ ہے کہ اُس کی جگہ
ہمارے تئیں ہی بتاتے ہیں لوگ

رہے ہم تو کھوئے گئے سے سدا
کبھو، آپ میں ہم کو پاتے ہیں لوگ

اس ابرو کماں پر جو قرباں ہیں ہم
ہمیں کو نشانہ بناتے ہیں لوگ

نہ سویا کوئی شورِ شب سے مرے
قیامت اذیت اٹھاتے ہیں لوگ

اُن آنکھوں کے بیمار ہیں میر ہم
بجا دیکھنے ہم کو آتے ہیں لوگ

ردیف لام

مار بھی آسان ہے دشنام سہل
یار اگر ہے اہل تو ہے کام سہل

ہوں نگہیں ہیں کی جگر کاوی بہت
کیا نکلتا ہی کسو کا نام سہل

جان دی یاروں نے تب آنکھیں لگیں
کن نے پایا آہ یہاں آرام سہل

مدعی ہو چشم شوخ یار کا
کیا نگاہوں میں ہوا بادام سہل

تم نے دیکھا ہوگا بچپن میر کا
ہم کو تو آیا نظر وہ خام سہل

پوشیدہ کیا ہے ہی قدرت نمائے دل
دیکھی نہ بے ستون میں زور آزمائے دل

ہی تیرہ یہ بیاباں گرد و غبار سے سب
وے راہ کب دکھائی بلے رہنمائے دل

اندوہ غم سے اکثر رہتا ہوں میں مکدر
کیا خاک میں ملی ہی میری صفائے دل

پیش آوے کوئی صورت منہ موڑتے نہیں وے
آئینہ ساں جنھیں ہی کچھ آشنائے دل

مر تو نہیں گیا میں پر جی ہی جانتا ہی
گزرے ہی شاق مجھ پر جیسی جدائے دل

اس دام گہ میں اس کی سارے فریب ہی ہیں
آتی نہیں نظر کچھ مجھ کو رہائے دل

گر رنگ ہی چلا ہی در رہ بھی تو ہوا سے
کہہ میر اس چمن میں کس سے لگائیے دل

مدت تو وا ہوا ہی نہیں غنچہ وار دل
اب جو کھلا سو جیسے گل بے بہار دل

ہی غم میں یاد کس کو فراموش کار دل
اب آ بنی ہی جی پہ رہا درکنار دل

دشوار ہی ثبات بہت ہجر یار میں
یہاں چاہیئے ہی دل سو کہاں میرے یار دل

وہ کونسی امید بر آئی ہی عشق میں
رہتا ہی کس امید پہ امیدوار دل

ظالم بہت ضرور ہی ان بیکسوں کا پاس
ناچار اپنے رہتے ہیں جو مار مار دل

تم پر تو صاف میری کدورت کھلی ہی آج
مدت سے ہی ملال کے زیر غبار دل

مائل ادھر کے ہونے میں مجبور ہیں سبھی
کھنچتا ہی اس کی اور کو بے اختیار دل

حد ہیگی دلبری کی بھی ای غیرت چمن
ہو آدمی صنوبر اگر لاوے بار دل

داخل یہ اضطراب تنک آبیوں میں ہی
رکھتی نہیں ہی برق ہی کچھ بے قرار دل

کیا گرسنہ ہیں چشم دل اب کے یہ دلبراں
تسکین ان کی ہو نہ جو لیویں ہزار دل

جوں سیب ہیں ذقن کے چمن زار حسن میں
یوں باغ حسن میں بھی ہیں رنگیں انار دل

ہم سے جو عشق کشتہ جئیں تو عجب ہے میر
چھالی ہی داغ ٹکڑے جگر کے فگار دل

بہت مدت گئی ہی اب ٹک آ مل
کہاں تک خاک میں میں تو گیا مل

ٹک[1] اس بیرنگ کے نیرنگ تو دیکھ
ہوا ہر رنگ میں جوں آب شامل

نہیں بھاتا ترا مجلس کا ملنا
ملے تو ہم سے تو سب سے جدا مل

غنیمت جان فرصت آج کے دن
سحر کیا جانے کیا ہو شب ہی جا مل

اگرچہ ہم نہیں ملنے کے لائق
کسو تو طرح ہم سے بھی بھلا مل

لیا زاہد نے جامِ بادہ کف پر
بحمد اللہ کھلا عقد انامل

وہی پہنچے تو پہنچے آپ ہم تک
نہ یہاں طالع رسا نے جذبِ کامل

ہوا دل عشق کی سختی سے ویراں
ملایم چاہیئے تھا یہاں کا عامل

پس از مدت سفر سے آئے ہیں میر
گئیں وہ اگلی باتیں تو ہی جا مل

بھی

ردیف میم

کچھ نہ پوچھو بہک رہے ہیں ہم
عشق کی مے سے چھک رہے ہیں ہم

سوکھ غم سے ہوئے ہیں کانٹا سے
پر دلوں میں کھٹک رہے ہیں ہم

وقفۂ مرگ اب ضروری ہے
عمر طے کرتے تھک رہے ہیں ہم

کیونکہ گرد علاقہ بیٹھ سکے
دامنِ دل جھٹک رہے ہیں ہم

کون پہنچے ہی بات کی تہ کو
ایک مدت سے بک رہے ہیں ہم

اُن نے دینے کہا تھا بوسۂ لب
اس سخن پر اٹک رہے ہیں ہم

نقش پا سے رہی ہیں کھل آنکھیں
کس کی یوں راہ تک رہے ہیں ہم

دست دیگی کب اُس کی پابوسی
دیر سے سر پٹک رہے ہیں ہم

بیڈھب اس پاس ایک شب تھے گئے
سو کئی دن سرک رہے ہیں ہم

خام دستی نے ہائے داغ کیا
پوچھتے کیا ہو پک رہے ہیں ہم

میر شاید لیں اس کی زلف سے کام
برسوں سے تو لٹک رہے ہیں ہم

ہی تہ دل بتوں کا کیا معلوم
نکلے پردے سے کیا خدا معلوم

[1] رنگ بے رنگی جدا تو ہی ولے / آپ سا ہر رنگ میں شامل ہی یہاں (میر)

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

علم سب کو ہی یہ کہ سب تو ہی
پھر ہی اللہ کیسا نا معلوم

گرچہ تو ہی ہی سب جگہ لیکن
ہم کو تیری نہیں ہی جا معلوم

عشق جانا تھا مار رکھے گا
ابتدا میں تھی انتہا معلوم

ان سیہ چشم دلبروں سے ہیں
تھی وفا چشم سو وفا معلوم

طرز کینے کی کوئی چھپتی ہی
مدعی سکا ہے مدعا معلوم

عشق ہی ای طبیب جی کا روگ
لطف کر ہی جو کچھ دوا معلوم

دل بجا ہو تو میرؔ کچھ کھاوے
کڑھنے پچنے میں اشتہا معلوم

مجھے تو درد سے اک انس ہی وفا کی قسم
یہی سبب ہی جو کھائی ہی میں دوا کی قسم

کل اُن نے تیغ رکھی درمیاں کہ قطع ہی اب
قسم جو بیچ میں آئی سو اُس ادا کی قسم

حنا لگی ترے ہاتھوں سے میں گیا پیسا
جگر تمام ہی خوں مجھ کو تیرے پا کی قسم

فقیر ہونے نے سب اعتبار کھویا ہی
قسم جو کھاؤں تو کہتے ہیں کیا گدا کی قسم

قدم تلے ہی رہا اُس کے یہ سر پر شور
جو کھایئے تو مرے طالع رسا کی قسم

سروں پہ ہاتھ کبھو تیغ پر کبھو اس کا
کچھ ایک قسم نہیں میرؔ آشنا کی قسم

جدال دیر کے رہباں سُنے کہاں تک میرؔ
اُٹھو حرم کو چلو اب تمھیں خدا کی قسم

اب سوکھی ہی جاتی ہی سب کشت ہوس ظالم
ای ابر تر آکر ٹک ایدھر بھی برس ظالم

صیاد بہار اب کی سب لوٹیں گا کیا میں ہی
ٹک باغ تلک لے چل میرا بھی قفس ظالم

کس طور کوئی تجھ سے مقصود کرے حاصل
نے رحم ترے جی میں نے دل میں ترس ظالم

کیوں[1] سر چڑھے ہی ناحق ہم بخت سیاہوں کے
مت پیچ میں پگڑی کے بالوں کو گھرس ظالم

جوں ابر میں روتا تھا جوں برق تو ہنستا تھا
صحبت نہ رہی یوں ہی ایک آدھ برس ظالم

[1] میر صاحب کے کئی شعر اس قسم کے گزر چکے ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک یہ شعر ہی ؎

اک جمع کے سر او پر روز سیاہ لایا ٭ پگڑی میں بال اپنے نکلا جو وہ گھرس کر

کیا کھولے ہوئے محمل یہاں گرم حکایت ہے
چل راہ میں کچھ کہنا مانندِ جرس ظالم

مطلق نہیں گنجایش اب حوصلے میں اپنے
آزار کوئی کھینچے یوں کب تئیں بس ظالم

سر رشتۂ ہستی کو ہم دے چکے ہاتھوں سے
کچھ ٹوٹے ہی جاتے ہیں اب تارِ نفس ظالم

تا چند رہے گا تو یوں داغِ غم اس مہ کا
چھاتی تو گئی تیری اے میر جھلس ظالم

محرم سے کسو روبرو ہوں کاشکے اب ہم
بے وجہ غضب رہنے کا پوچھیں جو سبب ہم

تدبیریں کریں اپنے تنِ زار و زبوں کی
افراط سے اندوہ کے ہوں آپ میں جب ہم

تو لاگو نہ ہو جی کا تو ناچار ہیں ورنہ
اس جنسِ گراں مایہ سے گزرے نہیں کب ہم

یک سلسلہ ہے قیس کا فرہاد کا اپنا
جوں حلقۂ زنجیر گرفتار ہیں سب ہم

کس دن نہ ملا غیر سے تو گرم علی الرغم
رہتے ہیں یوں ہی لوٹتے انگاروں پہ شب ہم

مجمع میں قیامت کے اک آشوب سا ہوگا
آ نکلے اگر عرصے میں یوں نالہ بلب ہم

کیا معرفت اس سے ہوئی یاروں کو نہ سمجھے
اب تک تو نہیں پاتے ہیں کچھ یار کے ڈھب ہم

گہ نوچ لیا منہ کو گہے کوٹ لی چھاتی
دل تنگیِ ہجراں سے ہیں مغلوب غضب ہم

آغازِ محبت میں تمامی ہوئی اپنی
اے واے ہوئے خاک بسر راہ طلب ہم

تربت[1] سے ہماری نہ اٹھی گرد بھی اے میر
جی سے گئے لیکن نہ کیا ترکِ ادب ہم

مشتاق ان لبوں کے ہیں سب مرد و زن تمام
دفتر لکھے گئے نہ ہوا پر سخن تمام

اب چھیڑیے جہاں وہیں گویا ہے درد سب
پھوڑا سا ہو گیا ہے ترے غم میں تن تمام

آیا تھا گرم صید وہ جید ھر سے دشت میں
دیکھا اُدھر ہی گرتے ہیں اب تک ہرن تمام

آوارہ گرد باد سے تھے ہم پہ شہر میں
کیا خاک میں ملا ہے یہ دیوانہ پن تمام

کیا لطف تن چھپا ہے مرے تنگ پوش کا
اگلا پڑے ہے جامے سے اُس کا بدن تمام

اس کارِ دست بستہ پہ رکھیا نہ مدعی
کیونکر نہ کام اپنا کرے کوہکن تمام

اک گل زمیں نہ وقفے کے قابل نظر پڑی
دیکھا برنگِ آبِ رواں یہ چمن تمام

[1] میر تقی میر ؎ دور بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

نکلے ہیں گل کے رنگ گلستاں میں خاک سے ۔ یہ وے ہیں اس کے عشق کے خونیں کفن تمام

تہ صاحبوں کی آئی نکل میکدے سے گئے ۔ گروی تھے اہلِ صومعہ کے پیرہن تمام

ہیں خاک میں ملا نہ کروں کس طرح سفر ۔ مجھ سے غبار رکھتے ہیں اہلِ وطن تمام

کچھ ہند ہی میں میرؔ نہیں لوگ جیب چاک

ہے میرے ریختوں کا دِوانہ دکن تمام

بخت سیہ کی نقل کریں کس سے چال ہم ۔ مہندی لگی قدم سے ہوئے پائمال ہم

کیونکر نہ اس چمن میں ہوں لٹتے نڈھال ہم ۔ بھاں پھول سونگھ سونگھ رہے ماہ و سال ہم

یا ہر گلی ہیں سیکڑوں جس جا ملیح تھے ۔ یا زلف و خط کو دیکھتے ہیں خال خال ہم

گزرے ہے جی میں گہ وہ دہن گاہ وہ کمر ۔ کیا جانیں لوگ رکھتے ہیں کیا کیا خیال ہم

جاتی نہیں اٹھائی یہ اب سرگرانیاں ۔ مقدور تک تو اپنے سے گئے ٹال ٹال ہم

لوہو کہاں ہے گریۂ خونیں سے تن کے بیچ ۔ کرتے ہیں منہ کو اپنے طمانچوں سے لال ہم

وہ تو ہی ہے کہ مرتے ہیں سب تیرے طور پر ۔ حور و پری کو جان کے کب ہیں دوال ہم

گزرے ہے بسکہ اس کی جدائی دلوں پہ شاق ۔ منہ نوچ نوچ لے ہیں علی الاتصال ہم

منظور سجدہ ہے ہمیں اس آفتاب کا ۔ ظاہر میں یوں کریں ہیں نمازِ زوال ہم

ظاہر ہوا انھیں بھی ہمارے دم اور ہوش ۔ آئے نہ پھر تمھارے گئے ٹک بحال ہم

مطلق جہاں میں رہنے کو جی چاہتا نہیں ۔ اب تم بغیر اتنے ہوئے ہیں وبال ہم

نقصان ہوگا اس میں نہ ظاہر کہاں تلک ۔ ہوویں گے جس زمانے کے صاحب کمال ہم

تھا کب گماں ملے گا وہ دامن سوار میرؔ

کل راہ جاتے مفت ہوئے پائمال ہم

کون کہتا ہے منہ کو کھولو تم ؟ ۔ کاشکے پردے ہی میں بولو تم

حکم آبِ رواں رکھے ہے حسن ۔ بہتے دریا میں ہاتھ دھو لو تم

کیا سرا ہیں ہم اپنی جنس کو لیک ۔ دل عجیب ہے متاع جو لو تم

جانا آیا ہے اب جہاں سے ہمیں ۔ تھوڑی تو دور ساتھ ہو لو تم

لہ نظیر اکبر آبادی سے ۵ بن تختۂ گل آخرش اس خاک چمن سے ؎ نکلا مرے قاتل کے شہیدوں کا رسالا

جب میسر ہو بوسہ اُس لب کا
چپکے ہی ہو رہو نہ بولو تم

پنجۂ مرجاں کا پھر دھرا ہی رہے
ہاتھ خوں میں مرے ڈبو لو تم

دست دے ہے کسے پلک سے میل
دل جہاں پاؤ اب پرو لو تم

آتے ہیں متصل چلے آنسو
آہ کب تک یہ موتی رو لو تم

رات گزری ہے سب تڑپتے میر
آنکھ لگ جائے ٹک تو سو لو تم

موئے جاتے تھے فرطِ الفت سے ہم
بچے ہیں خدا ہی کی قدرت سے ہم

ترش رو بہت ہے وہ زرگر پسر
پڑے ہیں کھٹائی میں مدت سے ہم

نہیں دیکھتے صبح اب آرسی
خفا رہتے ہیں اپنی صورت سے ہم

جو دیکھو وہ قامت تو معلوم ہو
کہ روکش ہوئے ہیں قیامت سے ہم

نہ ٹک لا سکا تاب جلوے کی دل
گلہ رکھتے ہیں صبر و طاقت سے ہم

نہ مانی کوئی اُن نے پھر روٹھ کر
مناتے رہے رات منت سے ہم

خدا سے بھی شب کو دعا مانگتے
نہ اُس کا لیا نام غیرت سے ہم

رکھا جس کو آنکھوں میں اک عمر اب
اُسے دیکھ رہتے ہیں حسرت سے ہم

بھریں آنکھیں لوہو سے رہنے لگیں
یہ رنگ اپنا دیکھا مروت سے ہم

نہ مل میر اب کے امیروں سے تو
ہوئے ہیں فقیر ان کی دولت سے ہم

کب تک رہیں گے پہلو لگائے زمیں سے ہم
یہ درد اب کہیں گے کسو شانہ بیں سے ہم

تلواریں کتنی کھائی ہیں سجدہ میں اس طرح
فریادی ہوں گے دل کے لہو کو جبیں سے ہم

فتراک تک یہ سر جو نہ پہنچا تو یا نصیب
مدت لگے رہے ترے دامانِ زیں سے ہم

ہوتا ہے شوق وصل کا انکار سے زیاد
کب تجھ سے دل اُٹھاتے ہیں تیری نہیں سے ہم

چھاجے جو بیند متی کرے نور ماہ پر
دیکھی عجب سفیدی تری آستیں سے ہم

یہ شوق صید ہونے کا دیکھو کہ آپ کو
دکھلایا صید گہ میں لیا رد یہیں سے ہم

تکلیف درد دل کی نکر تنگ ہوگئے لوگ
یہ بات روز کہتے رہے ہمنشیں سے ہم

اُڑتی ہے خاک شہر کی گلیوں میں اب جہاں
سونا لیا ہے گود میں بھر کر وہیں سے ہم

آوارہ گردی اپنی کھینچی میر طول پر
اب چاہیں گے دعا کسو عزلت نشیں سے ہم

ردیف نون

مدعی مجھ کو کھڑے صاف برا کہتے ہیں
چپکے تم سنتے ہو بیٹھے اسے کیا کہتے ہیں

دیکھے خوباں کے بجا دل نہیں رہتا ہرگز
لوگ جو کچھ انھیں کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

عشق کے شہر کی بھی رسم کے ہیں کشتے ہم
درد جاں کاہ جو ہو اس کو دوا کہتے ہیں

جی اگر زلفوں کے سودے میں ترے دل تو نہ بول
پہلی قیمت کے تئیں مشک بہا کہتے ہیں

حسن تو ہے ہی کرو لطف زباں بھی پیدا
میر کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں

کیا کیا جہاں اثر تھا سو اب وہاں عیاں نہیں
جن کے نشاں تھے فیلوں پر اُن کا نشاں نہیں

بہتر بنی کہانی بنی مثنوی ہوئی
کیا شرحِ سوزِ عشق کروں میں زباں نہیں

اپنا ہی ہاتھ سر پہ رہا اپنے ہاں سدا
مشفق کوئی نہیں ہے کوئی مہرباں نہیں

ہنگامہ و فساد کی باعث ہے وہ کمر
پھر آپ خوب دیکھیے تو درمیاں نہیں

جی ہی نکل گیا جو گیا یار پاس سے
جسمِ ضعیف و زار میں اب میرے جاں نہیں

ہے عشق ہی سے چار طرف بحث و گفتگو
شور اُس بلائے جاں کا جہاں میں کہاں نہیں

اس عہد کو نہ جانے اگلا سا عہد میر
وہ دَور اب نہیں وہ زمین آسماں نہیں

نہ نکلا دوسرا ویسا جہاں میں
وہی اک جنس ہے اس کارواں میں

کیا منہ بند سب کا بات کہتے
ملا کچھ سحر ہے اُس کی زباں میں

اگر وہ بت نہ جانے تو نہ جانے
اسے سب جانتے ہیں ہندوستاں میں

نیا آناً فآناً اُس کو دیکھے
جدا تھی شان اُس کی ہر زماں میں

کھنچی رہتی ہے اُس ابروئے خم سے
کوئی کیا شاخ نکلی ہے کماں میں

جبیں پر چین رہتی ہے ہمیشہ
بلا کینہ ہے اپنے مہرباں میں

نیا ہے کیا شگوفہ یہ کرشمہ
رہا ہے پھول پڑتا گلستاں میں

کوئی بجلی کا ٹکڑا اب تلک بھی
پڑا ہوگا ہمارے آشیاں میں

پھرے ہی چھانتا ہی خاک ای میر
ہوس کیا ہی مزاجِ آسماں میں

نہیں بن تجھ خیالِ لعلِ دلربا میں
گہر پہنچا بہم آبِ بقا میں

غریبانہ کوئی شب روز کر یہاں
ہمیشہ کون رہتا ہی سرا میں

اُٹھاتے ہاتھ کیوں نومید ہوکر
اگر پاتے اثر کچھ ہم دعا میں

کہے ہی ہر کوئی اللہ میرا
عجب نسبت ہی بندے میں خدا میں

کفن میں ہی نہ پہنا وہ بدن دیکھ
کھنچے تو ہویں بہتیرے جامیں[۱]

ادھر جانے کو آندھی تو ہی لیکن
سبکپائی سی ہی بادِ صبا میں

بلا تہ دار بحرِ عشق نکلا
نہ ہم نے انتہا لی[۲] ابتدا میں

ملے برسوں وہی بیگانہ ہی وہ
ہنر ہی یہ ہمارے آشنا میں

اگرچہ خشک ہیں جیسے پرِ کاہ
اڑے ہیں میر جی لیکن ہوا میں

مر مر گئے نظر کر اُس کے برہنہ تن میں
کپڑے اتارے اُن نے جب پہنچے ہم کفن میں

گل پھول سے کب اُس بن لگتی ہیں اپنی آنکھیں
لائی بہار ہم کو زور آوری چمن میں

اب لعل تو خط اُس کے کم بخشتے ہیں فرصت
قوت کہاں رہی ہی یاقوتِ کہن میں

یوسف عزیز دلہا جا مصر میں ہوا تھا
پاکیزہ گوہروں کی عزت نہیں وطن میں

دیر و حرم سے تو تو ٹک گرم ناز نکلا
ہنگامہ ہو رہا ہی اب شیخ و برہمن میں

[۱] جامہ کی جمع جامیں میر کے زمانے میں درست تھی اب جامے بولی جاتی ہی اور اس طرح اس کا صرف قافیہ میں درست نہیں۔ میر حسن کے یہاں بھی ایک شعر مثنوی میں ایسے ہی انداز سے قافیے کو استعمال کیا ہی ؎

لئے بیلچے ہاتھ میں مالنیں
لگیں باغ کو دیکھنے بھالنیں

[۲] انتہا نہ لی۔ یعنی تھاہ نہ لی۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہی کہ انتہا لینے سے بگڑ کر تھاہ لینا بنا ہی میر کے یہاں اور جگہ بھی اس محاورے کا اسی طرح استعمال ہوا ہی۔ ۱۲ آسی

آجاتے شہر میں تو جیسے کہ آندھی آئی
کیا وحشتیں اٹھائیں ہم نے دوانے پن میں

ہیں گھاؤ دل پر اپنے تیغ زباں سے سب کی
تب درد ہے ہمارے اے میر ہر سخن میں

کن نے لیے بال دکھلائے ترے مانی کے تئیں
اُن نے جو اس طول سے کھینچا پریشانی کے تئیں

کشتۂ انداز کس کا تھا نہ جانا وہ جواں
لے رہے تھے کچھ ملک اک نعش قربانی کے تئیں

چشم کم سے اشکِ خونیں کو نہ دیکھو زینہار
ڈھونڈتے ہیں مردم اس یاقوت سیلانی کے تئیں

طائران خوش معاش اس باغ کے ہم تھے کبھو
اب ترستے ہیں قفس میں اک پر افشانی کے تئیں

ہے جہان تنگ سے جانا بعینہ اس طرح
قتل کرنے لے چلیں ہیں جیسے زندانی کے تئیں

یہ کہاں بنت العنب سے اٹھتی ہیں کیفیتیں
ہونٹھوں سے کیا اُس کو نسبت ایسی مستانی کے تئیں

دل جو پانی ہو تو آئینہ ہے روئے یار کا
خانہ آبادی سمجھ اس خانہ ویرانی کے تئیں

فہم میں میرے نہ آیا پردہ در ہے طفل اشک
روؤں کیا اے ہمنشیں میں اپنی نادانی کے تئیں

کچھ نظر میں نے نہ کی جی کے زیاں پر اپنی ہائے
دوست میں رکھے گیا اُس دشمنِ جانی کے تئیں

جب جلی چھاتی بہت تب اشک افشاں ہو نہ میر
کیا جو چھڑکا اس دہکتی آگ پر پانی کے تئیں

جانا ادھر سے میرے ہے ویسا ادھر کے تئیں
بیماریوں میں جیسے بدلتے ہیں گھر کے تئیں

کب ناخنوں سے چہرہ بچے اس صفا سے ہوں
جھواڑ تم نہیں ہو جو دیکھو ہنر کے تئیں

خستے کو اس نگہ کے طبیبوں سے کام کیا
ہمدم مجھے دکھا کسو صاحب نظر کے تئیں

فردوس ہو نصیب پدر آدمی تھا خوب
دل کو دیا نہ اُن نے کسو خوش پسر کے تئیں

ٹک دل کی بے قراری میں جلتے ہیں جی جلے
ہر دم تپش سراہیے میرے جگر کے تئیں

تم دل سے جو گئے سو خرابی بہت رہی
پھر بھی بساؤ آ کر اس اجڑے نگر کے تئیں

اللہ ری نازکی نہیں آتی خیال میں
کس کس طرح سے باندھتے ہیں اس کمر کے تئیں

حالت یہ ہے کہ بیخبری دم بدم ہے یہاں
وے اب تلک کبھی آتے نہیں ٹک خبر کے تئیں

مدت ہوئی کہ اپنی خبر کچھ ہمیں نہیں
کیا جانیے کہ میر گئے ہم کدھر کے تئیں

کیا کہوں اول بخود تو دیر میں آتا ہوں میں
پھر جو یاد آتا ہے وہ چپکا سا رہ جاتا ہوں میں

داغ ہوں کیونکر نہ میں درویش یار و جب نہ تب
بوریا پوشوں ہی میں وہ شعلہ خو پاتا ہوں میں

ہجر میں اُس طفلِ بازی گوش کے رہتا ہوں جب
جا کے لڑکوں میں ٹک اپنے دل کو بہلاتا ہوں میں

ہوں گرسنہ چشم میں دیدارِ خوباں کا بہت
دیکھنے پر اُن کے تلواریں کھڑا کھاتا ہوں میں

آب سب ہوتا ہوں پا کر آپ کو جیسے حباب
یعنی اس ننگِ عدم ہستی سے شرماتا ہوں میں

ایک جا گہ کب ٹھہرنے دے ہے مجھ کو روزگار
کیوں تم اکتاتے ہو اتنا آج کل جاتا ہوں میں

ہے کمالِ عشق پر بے طاقتی دل کی دلیل
جلوۂ دیدار کی اب تاب کب لاتا ہوں میں

آسماں معلوم ہوتا ہے ورلے[1] کچھ آگیا
دور اس سے آہ کیسا کیسا گھبراتا ہوں میں

پس چلے تو راہ اُدھر کی میں نہ جاؤں لیک میرؔ
دل مرا رہتا نہیں ہر چند سمجھاتا ہوں میں

مدت ہوئی کہ بیچ میں پیغام بھی نہیں
نامے کا اُس کے مُہر سے اب نام بھی نہیں

ایامِ ہجر کریے بسر کس امید پر
ملنا انھوں کا صبح نہیں شام بھی نہیں

پروا اُسے ہو کا ہے کو ناکام گر مریں
اُس کامِ جاں کو مجھ سے تو کچھ کام بھی نہیں

رو دیں اس اضطرابِ دلی کو کہاں تلک
دن رات ہم کو ایک دم آرام بھی نہیں

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میرؔ کے
کچھ طرز ایسے بھی نہیں ایہام بھی نہیں

دم بدم اس ڈھب سے رونا دیر کر آیا ہمیں
کیا لہو اپنا پیا تب یہ ہنر آیا ہمیں

گرچہ عالم جلوہ گاہِ یار یوں بھی تھا و لے
آنکھیں جوں موندیں عجب عالم نظر آیا ہمیں

ہم تبھی سمجھے تھے اب اُس سادگی پر حرف ہے
خط نکلنے سے جو نامہ پیشتر آیا ہمیں

پاس آنا یک طرف مطلق نہیں اب اس کے پاس
کچھ گئے گزرے سے سمجھا وہ پسر آیا ہمیں

تجھ تک اس بے طاقتی میں کیا پہنچنا سہل تھا
غش ترے کوچے میں ہر ہر گام پر آیا ہمیں

صبح نکلا تھا بستر تلوار جوں خورشید لے
دیکھ کر خونخوار تیغ اس کی نظر آیا ہمیں

کر چلا بیخود غمِ زلفِ درازِ دلبراں
دُور کا اے میرؔ درپیش اب سفر آیا ہمیں

اشک کے جوش سے ہوں شام و سحر پانی میں
جیسے ماہی ہے مجھے سیر و سفر پانی میں

شب نہاتا تھا جو وہ رشکِ قمر پانی میں
گتھی مہتاب سے اٹھتی تھی لہر پانی میں

[1] ورے بمعنی قریب نزدیک - ادھر ۱۲

ساتھ اس حسن کے دیتا تھا دکھائی وہ بدن
جیسے جھمکے ہے پڑا گوہرِ تر پانی میں

رونے سے بھی نہ ہوا سبز درختِ خواہش
گرچہ مرجاں کی طرح تھا یہ شجر پانی میں

موجِ گریہ کی وہ شمشیر ہے جس کے ڈر سے
جوں کشف خصم چھپا زیرِ سپر پانی میں

بیٹھنے سے کسو دل صاف کے سرمت تو چڑھے
خوب سا کرلے تأمل تو اُتر پانی میں

آتشِ عشق نے راون کو جلا کر مارا
گرچہ لنکا سا تھا اس دیو کا گھر پانی میں

جوششِ اشک میں شب دل بھی گیا سینے سے
کچھ نہ معلوم ہوا ہائے اتر پانی میں

بردباری ہی میں کچھ قدر ہے گو جی ہو فنا
عود پھر لکڑی ہے ڈوبے نہ اگر پانی میں

چشمِ تر ہی میں رہے کاش وہ رُوئے خوش رنگ
پھول رہتا ہے بہت تازہ و تر پانی میں

روؤں تو آتشِ دل شمع نمط بجھتی نہیں
مجھ کو لیجا کے ڈبو دیویں مگر پانی میں

گریۂ زار میں بیتابیِ دل طرفہ نہیں
سیکڑوں کرتے ہیں پیراک ہنر پانی میں

برگِ گل جوں گزر آب سے آتے ہیں چلے
رونے سے ووں ہی مرے لختِ جگر پانی میں

محو کر آپ کو یوں ہستی میں اُس کی جیسے
بوند پانی کی نہیں آتی نظر پانی میں

وہ گہر آنکھ سے جاوے تو تھمے آنسو میرؔ
تنا رویا ہوں کہ ہوں تا بہ کمر پانی میں

جوششِ اشک سے ہوں آٹھ پہر پانی میں
گرچہ ہوتے ہیں بہت خوف و خطر پانی میں

ضبطِ گریہ نے جلایا ہے درونہ سارا
دل اچنبھا ہے کہ ہے سوختہ تر پانی میں

آبِ شمشیرِ قیامت ہے برندہ اس کی
یہ گوارائی نہیں پاتے ہیں ہر پانی میں

طبعِ دریا جو ہو آشفتہ تو پھر طوفاں ہے
آہ بالوں کو پراگندہ نہ کر پانی میں

غرقِ آبِ اشک سے ہوں لیک اُڑا جاتا ہوں
جوں سمک گو کہ مرے ڈوبے ہیں پر پانی میں

مردمِ دیدۂ تر مردمِ آبی ہیں ۔ مگر
رہتے ہیں روز و شب و شام و سحر پانی میں

ہیئت آنکھوں کی نہیں وہ رہی روتے روتے
اب تو گرداب سے آتے ہیں نظر پانی میں

گریۂ شب سے بہت آنکھ ڈرے ہے میری
پاؤں رکھتے ہی نہیں بارِ دگر پانی میں

فرطِ گریہ سے ہوا میرؔ تباہ اپنا جہاز
تختہ پارے گئے کیا جانوں کدھر پانی میں

کھاکر اشک افشاں چشم فرصت غیر فرصت میں
کہ مل جاتا ہے ان جوؤں کا پانی بحرِ رحمت میں

سبنھالے سدھ کہاں سرہی فرو لاتا نہیں ہرگز
وگرنہ مان جاتا تھا کہاں تھوڑی سی منت میں

گئے دن منفصل جانیکے اُسکی اور اُٹھ اُٹھ کر
تفاوت ہوگیا اب تو بہت پاؤں کی طاقت میں

تحمل ہوسکا جب تک بدن میں تاب و طاقت تھی
قیامت اب گزر جاتی ہی جی پر ایک ساعت میں

عجب کیا ہی جو یاران چمن کو ہم نہ پہچانیں
رہائی اتفاق اپنی پڑی ہی ایک مدت میں

سلاتا تیغ خوں میں گر نہ میرے تو قیامت تھی
اُٹھا تھا روز محشر کا جو فتنہ رات صحبت میں

کوئی عمامہ لے بھاگا کنھوں نے پیرہن پھاڑا
بہت گستاخیاں یاروں نے کیں واعظ کی خدمت میں

ملا تیوری چڑھائے تو لگا ابرو بھی خم کرنے
مؤثر کچھ ہوا سر مارنا محراب طاعت میں

قدم پر رکھ قدم اُس کے بہت مشکل ہی مرجانا
سرآمد ہوگیا ہی میرؔ فن ہر د الفت میں

کس کنے جاؤں الٰہی کیا دوا پیدا کروں
دل تو کچھ دھنسکا ہی جاتا ہی کروں سو کیا کروں

لوہو روتا ہوں میں ہر اک حرف خط پر پھر یہاں
اور اب رنگین جیسا تم کہو انشا کروں

چال اپنی چھوڑتا ہرگز نہیں وہ خوش خرام
شور سے کب تک قیامت ایک میں برپا کروں

مصلحت ہی میری خاموشی ہی میاں ای ہمنفس
لوہو ٹپکے بات سے جو ہونٹھ اپنے وا کروں

دل پریشانی مجھے دے ہی بکھرے گل کے رنگ
آپ کو جوں غنچہ کیونکر آہ میں یکجا کروں

ایک چشمک ہی چلی جاتی ہی گل کی میری اور
یعنی بازار جنوں میں جاؤں کچھ سودا کروں

خوار تو آخر کیا ہی گلیوں میں تو نے مجھے
تو بھی ای عشق جو تجھ کو بھی میں رسوا کروں

خاک اُڑاتا اشک افشاں آن نکلوں میں تو پھر
دشت کو دریا کروں بستی کے تئیں صحرا کروں

کعبے جانے سے نہیں کچھ شیخ مجھ کو اتنا شوق
چال وہ بتلا کہ میں دل میں کسو کے جا کروں

اب کی ہمت صرف کر جو اس سے جی اچٹے مرا
پھر دعا ای میرؔ مت کریو اگر ایسا کروں

کیا کوفتیں اُٹھائیں ہجراں کے درد و غم میں
تڑپا ہزار نوبت دل ایک ایک دم میں

گو قیس منہ کو نوچے فرہاد سر کو چیرے
یہ کیا عجب ہی ایسے ہوتے ہیں لوگ ہم میں

اہل نظر کسو کو ہوتی ہی محرمیت
آنکھوں کے اندھے ہم تو مدت رہے حرم میں

کلفت میں گزری ساری مدت تو زندگی کی
آسودگی کا منہ اب دیکھیں گے ہم عدم میں

کرتے ہیں میرؔ رل کر واعظ سے حبس دم کا
کیا یہ بھی آ گئے ہیں اس پوچ گو کے دم میں

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں
اس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں

بیکلی دل ہی کی تماشا تھی
برق میں ایسے اضطراب کہاں

خط کے آئے پہ کچھ کہے تو کہے
ابھی مکتوب کا جواب کہاں

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردا
ہم نہ ہو ویں تو پھر حجاب کہاں

گریۂ شب سے سرخ ہیں آنکھیں
مجھ بلا نوش کو شراب کہاں

عشق ہے عاشقوں کے جلنے کو
یہ جہنم میں ہے عذاب کہاں

داغ رہنا دل و جگر کا دیکھ
جلتے ہیں اس طرح کباب کہاں

محو ہیں اس کتابی چہرے کے
عاشقوں کو سر کتاب کہاں

عشق کا گھر ہے میرؔ سے آباد
ایسے پھر خانماں خراب کہاں

یار دب مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں
اب دو تو جام خالی ہی دو میں نشے میں ہوں

ایک ایک فرط دور میں یوں ہی مجھے بھی دو
جام شراب پُر نہ کرو میں نشے میں ہوں

مستی سے درہمی ہے مری گفتگو کے بیچ
جو چاہو تم بھی مجھ کو کہو میں نشے میں ہوں

یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانند جام مے
یا تھوڑی دور ساتھ چلو میں نشے میں ہوں

معذور ہوں جو پاؤں مرا بے طرح پڑے
تم سر گراں تو مجھ سے نہ ہو میں نشے میں ہوں

بھاگی نماز جمعہ تو جاتی نہیں ہے کچھ
چلتا ہوں میں بھی ٹک تو رہو میں نشے میں ہوں

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میرؔ جی
جوں شیشہ میرے منہ نہ لگو میں نشے میں ہوں

کاشکے دل دو دو تو ہوتے عشق میں
ایک رہتا ایک کھوتے عشق میں

پاس ظاہر ٹک نہ کرتے شب تو ہم
بھر رہے تھے خوب روتے عشق میں

خواب میں دیکھا اُسی کو ایک رات
برسوں کاٹے ہم نے سوتے عشق میں

کاش پی جایا ہی کرتے اشک کو
داغ دل پڑ کے تو دھوتے عشق میں

دیکھیں ہیں کیا کیا ڈھلکتے اشک میرؔ
بیٹھے موتی سے پرولے عشق میں

کرتے ہیں جو کہ جی میں ٹھانے ہیں
خوبرو کس کی بات مانتے ہیں

میں تو خوباں کو جانتا ہی ہوں
پر مجھے یہ بھی خوب جانے ہیں

جا ہمیں اُس گلی میں گر رہنا
ضعف و بے طاقتی بہانے ہیں

پوچھ اہلِ طرب سے شوق اپنا
وے ہی جانے جو خاک چھانے ہیں

اب تو افسردگی ہی ہے ہر آن
وے نہ ہم ہیں نہ وے زمانے ہیں

قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور
اب مرے عہد میں فسانے ہیں

دل پریشاں ہوں میں تو خوش وے لوگ
عشق میں جن کے جی ٹھکانے ہیں

مشک و سنبل کہاں وہ زلف کہاں
شاعروں کے یہ شاخسانے ہیں

عشق کرتے ہیں اُس پری رو سے
میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں

آپ اُس جنس کے ہیں ہم بھی خریداروں میں
پگڑی جامے بکے جس کے لئے بازاروں میں

باغِ فردوس کا ہے رشک وہ کوچہ لیکن
آدمی ایک نہیں اُس کے ہوا داروں میں

ایک کے بھی وہ بُرے حال میں آیا نہ کبھو
لوگ اچھے تھے بہت یار کے بیماروں میں

دوستی کس سے ہوئی آنکھ کہاں جا کے لڑی
دشمنی آئے جسے دیکھتے ہی یاروں میں

ہائے رے ہاتھ جہاں چوٹ پڑی دوہی کیا
الغرض ایک ہی وہ شوخ ستمگاروں میں

کشمکش جس کے لئے یہ ہے شمارِ دم یہ
اُن نے ہم کو نہ گنا اپنے گرفتاروں میں

کیسی کیسی ہے عناصر میں بھی صورت بازی
شعبدے لاکھوں طرح کے ہیں انھیں چاروں میں

مشفقو! ہاتھ مرے باندھو کہ ابکی ہر دم
جا الجھتے ہیں گریبان کے دو تاروں میں

حسبِ قسمت سبھوں نے کھائے ترے تیغ کے زخم
ناکس اک نکلے ہمیں خوں کے سزاواروں میں

اضطراب و قلق و ضعف ہیں گر میر یہی
زندگی ہو چکی تو اپنی ان آزاروں میں

اُمیدِ دل وہی تھی جن سے وے آزار[1] کرتے ہیں
بہت پرہیز کر ہم سے ہمیں بیمار کرتے ہیں

کوئی ہم سا بھی اپنی جان کا دشمن کہیں ہوگا
بھری مجلس میں بیٹھے عشق کا اقرار کرتے ہیں

نشاں دیں ہیں جہاں اس کا وہ ہرجائی نہیں ملتا
محلے کے ہمیں اب لوگ یوں ہی خوار کرتے ہیں

[1] آزار کرنا۔ یعنی ستانا۔ اب متروک ہے اور اس کی بجائے آزار دینا یا آزار پہنچانا بولتے ہیں۔ ۱۲ آسی

حجابِ ناکسی سے مرگئے روپوش کب تک ہوں
جنھوں سے عار تھی ہم کو سو ہم سے عار کرتے ہیں

چھپا لیتا ہے مجھ سے چاند سا منہ وہ خدا جانے
سخن ساز اُس کنے جا جاکے کیا اظہار کرتے ہیں

الف کی رمز اگر سمجھا اُٹھا دل بحث علمی سے
اسی اک حرف کو برسوں سے ہم تکرار کرتے ہیں

بہت ہی تیز آب جدول شمشیرِ خوباں کا
اُسے پھر پار کر دیں ہیں یہ جس پر وار کرتے ہیں

انوکھا تو کہ یہاں فکر اقامت تجھ کو ہے ورنہ
سب اس دلکش جگہ سے رخت اپنا بار کرتے ہیں

بلا آفت ہے کچھ دل پر کہ ایسا رنگ ہے اُن کا
کسو بے مہر کے تئیں میر شاید پیار کرتے ہیں

کرتا نہیں قصور ہمارے ہلاک میں
یارب یہ آسمان بھی مل جائے خاک میں

گرمی نہیں ہے ہم سے وہ اے رشکِ آفتاب
اب آ گیا ہے فرق بہت اس تپاک میں

اس ڈھنگ سے ہلا کہ بجا دل نہیں رہے
اس گوش کے گہر سے دم آئے ہیں ناک میں

اب کی جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

کہئے لطافت اُس تنِ نازک کی میر کیا
شاید یہ لطف ہوگا کسو جانِ پاک میں

محمل نشیں ہیں کتنے خدام یار میں یہاں
لیلیٰ کا ایک ناقہ سو کس قطار میں یہاں

سن شور گل قفس میں دل داغ سب ہوا ہے
کیا پھول گل کھلے ہیں اب کی بہار میں یہاں

کب دلکشی ہو میرے رونے میں ابر تجھ سے
دریا بھرے ہیں ایک اک دامن کے تار میں یہاں

تم تو گئے دکھا کر ٹک برق کے سے جھمکے
آیا بہت تفاوت صبر و قرار میں یہاں

ہم مر گئے ولیکن سوزِ دروں وہی ہے
اک آگ لگ اٹھی ہے کنج مزار میں یہاں

ہجراں کی گھڑی ہے سو سو برس تعب سے
روزِ شمار یارو ہے کس شمار میں یہاں

جن راتوں میر ہم کو رونے کا مشغلہ تھا
رہتا تھا بحرِ اعظم سو تو کنار میں یہاں

آج ہمارے گھر آیا تو کیا ہے یہاں جو نثار کریں
الا کھینچ بغل میں تجھ کو دیر تلک ہم پیار کریں

خاک ہوئے برباد ہوئے پامال ہوئے سب محو ہوئے
اور شدائد عشق کی رہ کے کیسے ہم ہموار کریں

زردی رخ رونا ہر دم کا شاہد دو جب ایسے ہوں
چاہت کا انصاف کرو تم کیونکر ہم انکار کریں

باغ میں اب آ جاتے ہیں تو صرفہ اپنا چپ میں ہے
خوبی بیاں کر تیری ہم کیا گل کو گلے کا ہار کریں

شیوہ اپنا بے پروائی نومیدی سے ٹھہرا ہے
کچھ بھی وہ مغرور دبے تو منت ہم سو بار کریں

ہم تو فقیر ہیں خاک برابر آ بیٹھے تو لطف کیا
ننگ جہاں لگتا ہو ان کو وہاں دی ایسے عار کریں

۵۱ پتا پتا گلشن کا تو حال ہمارا جانے ہے
اور کہے تو جس سے اے گل بے برگی اظہار کریں

کیا ان خوش ظاہر لوگوں سے ہم یہ توقع رکھتے تھے
غیر کو لیکر پاس بیٹھیں ہم کو گلیوں میں خوار کریں

میر جی ہیں گے ایک جوالے کیا ہم ان سے دردیں
کچھ بھی جو سن پاویں یہ تو مجلس میں لبستار کریں

۵۲ گر کوئی اعمی کہے کچھ پر کہاں وہ تو کہاں
لے گئے پیش فلک اس مہ کا ایسا رو کہاں

گل کو کیا نسبت ہے تجھ سے میں نہ مانوں زینہار
رنگ اگر بالفرض تیرا سا ہوا یہ بو کہاں

عشق لاتا ہے برے کار مجنوں سا کبھو
بید بہتیرے کھڑے ہیں وے پریشاں مو کہاں

دیکھیاں کجیاں کمانوں کی بھی خم محراب کے
پر دلوں کو کھینچتے ہیں جیسے وے ابرو کہاں

سنبل اچھی آپ پیچ و تاب یوں کھایا کرے
یار کی سی زلف کے وے حلقہ حلقہ مو کہاں

آگے یہ آنکھیں گلے کی ہار ہی رہتی تھیں روز
اب جگر میں خوں نہیں وے بہرے سے آنسو کہاں

میر سچ کہتا تھا جنت ہو نصیب اس کے تئیں
حور کا چہرہ کہاں اس کا رخ نیکو کہاں

بیگانہ وضع برسوں اس شہر میں رہا ہوں
بھاگوں ہوں دور سب سے میں کس کا آشنا ہوں

پوچھا کیے ہیں مجھ سے گل برگ لب کو تیرے
بلبل کے ہاتھ جب میں گلزار میں لگا ہوں

اب کار شوق دیکھوں پہنچے مرا کہاں تک
قاصد کے پیچھے میں بھی بیطاقت اٹھ چلا ہوں

تجھ سے متاع خوش کا کیونکر نہ ہوں معرّف
یوسف کے ہاتھ پیارے کچھ میں نہیں بکا ہوں

گل پھول کوئی کب تک جھڑ جھڑ کے گرتے دیکھے
اس باغ میں بہت اب جوں غنچہ میں رکا ہوں

کیا کیا کیا تامل اس فکر میں گیا گھل
سمجھا نہ آپ کو میں کیا جانیے کہ کیا ہوں

ہوتا ہے گرم کیا تو اے آفتاب خوبی
ایک آدھ دم میں میں تو شبنم نمط ہوا ہوں

۵۱ میر تقی میر سے ۵ پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے   جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
۵۲ نسخہ قدیم مطبوعہ کلکتہ میں بھی شعر اسی طرح ہے اور ایک قلمی نسخے میں پہلا مصرع اس طرح ہے۔ ع
گو کوئی اعمے کہے کچھ جو کہاں وہ تو کہاں

پیری سے جھلتے جھلتے پہنچا ہوں خاک تک میں　　وہ سرکشی کہاں ہی اب تو بہت دبا ہوں

مجھ کو بلا ہی وحشت ای میر دُور اس سے
جاگہ سے جب اُٹھا ہوں آشوب سا اُٹھا ہوں

کوچے میں تیرے میر کا مطلق اثر نہیں　　کیا جانئے کدھر کو گیا کچھ خبر نہیں
ہی عاشقی کے بیچ ستم دیکھنا ہی لطف　　مرجانا آنکھیں موندگے یہ کچھ ہنر نہیں
کب شب ہوئی زمانے میں جو پھر ہوا نہ روز　　کیا ای شبِ فراق تجھی کو سحر نہیں
ہرچند ہم کو مستوں سے صحبت رہے ہی لیک　　دامن ہمارا ابر کی مانند تر نہیں
گلگشت اپنے طور پہ ہی سو تو خوب یھاں　　شایستہ پریدن گلزار پر نہیں
کیا ہو جے حرف زن گزر دوستی سے آہ　　خط لیگیا کہ راہ میں پھر نامہ بر نہیں
آنکھیں تمام خلق کی رہتی ہیں اُس کی اُور　　مطلق کسو کو حال پہ میرے نظر نہیں
کہتے ہیں سب کہ خون ہی ہوتا ہی اشکِ چشم　　راتوں کو گریہ ہی ہی بکا تو جگر نہیں

جاکر شراب خانے میں رہتا نہیں تو پھر
یہ کیا کہ میر جمعہ ہی کی رات گھر نہیں

گو جان کر تجھے سب تعبیر کر رہے ہیں　　ہم لوگ تیرے اوپر سنوجی سے مر رہے ہیں
کھنچتا چلا ہی ابتو تصدیق کو تصوّر　　ہر لحظہ اُس کے جلوے پیش نظر رہے ہیں
نکلے ہوس جواب بھی ہو دار ہی قفس سے　　شایستۂ پریدن دو چار پر رہے ہیں
کل دیکھتے ہمارے بستے تھے گھر برابر　　اب یہ کہیں کہیں جو دیوار و در رہے ہیں
کیا آج ڈبڈبائی دیکھو ہو تم یہ آنکھیں　　جوں چشمہ یوں ہی برسوں ہم چشم تر رہے ہیں
ملنے غم ہی ہم کو یھاں کا نے فکر کچھ ہی وھاں کا　　صدقے جنوں کے کیا ہم بے دردسر رہے ہیں
پاس ایک دن بھی اپنا اُن نے نہیں کیا ہی　　ہم دور اس سے بیدم دو دو پہر رہے ہیں
کیا یہ سرائے فانی ہی جاے باش اپنی　　ہم یھاں مسافرانہ آکر اُتر رہے ہیں
ایسا نہ ہو کہ چھیڑے یکبار پھوٹ بہیے　　ہم بھی پھوڑے کے اب مانند بھر رہے ہیں
اس میکدہ میں جس جا ہشیار چاہیئے تھے　　رحمت ہی ہم کو ہم بھی کیا بیخبر رہے ہیں
گو راہ عشق میں ہو شمشیر کے دم اوپر　　وسواس کیا ہی ہم تو جی سے گزر رہے ہیں
ہیل ہمنشیں بنے تو ایک آدھ بیت سُنیئے　　کہتے ہیں بعدِ مدت میر اپنے گھر رہے ہیں

یوں قیدیوں سے کب تئیں ہم تنگ تر رہیں　　جی چاہتا ہے جا کے کسو اور مر رہیں

١ ای کاش ہم کو سکر کی حالت رہے مدام　　تا حال کی خرابی سے ہم بے خبر رہیں

رہتے ہیں یوں حواس پریشاں کہ جوں کہیں　　دو تین آ کے لوٹے مسافر اتر رہیں

وعدہ تو جب ہو صبح کا تب ہم بھی جاں بلب　　جیسے چراغ آخرِ شب تا سحر رہیں

آوارگی کی سب ہیں یہ خانہ خرابیاں　　لوگ آویں دیکھنے کو بہت ہم جو گھر رہیں

ہم نے بھی نذر کی ہے کہ پھریے چمن کے گرد　　یارب قفس کے چھوٹنے تک بال و پر رہیں

ان دلبروں کی آنکھ نہیں جائے اعتماد　　جب تک رہیں یہ چاہیے پیشِ نظر رہیں

٢ فردا کی فکر آج نہیں مقتضائے عقل　　کل کی بھی دیکھ لیویں گے کل ہم اگر رہیں

تیغ و تبر رکھا نہ کرو پاس میرؔ کے　　ایسا نہ ہو کہ آپ کو ضائع وے کر رہیں

دل کو لکھوں ہوں آہ وہ کیا مدعا لکھوں　　دیوانے کو جو خط لکھوں بتلاؤ کیا لکھوں

کیا کیا لقب ہیں شوق کے عالم میں یار کے　　کعبہ لکھوں کہ قبلہ اسے یا خدا لکھوں

حیراں ہو میرے حال میں کہنے لگا طبیب　　اس دردمندِ عشق کی میں کیا دوا لکھوں

وحشت زدوں کو نامہ لکھوں ہوش کس طرح　　مجنوں کو اس کے حاشیہ پر میں دعا لکھوں

کچھ روبرو ہوئے پہ جو سمجھے تو سمجھے میرؔ　　جی کے الجھنے کا اسے کیا ماجرا لکھوں

جب سے ہے اس کی ابروئے خمدار درمیاں　　رہتی ہے میرے خلق کے تلوار درمیاں

برپا ہوا ہجوم سے یک حشر تازہ وہاں　　آیا جہاں کہیں قدمِ یار درمیاں

(خلق)

١ حالتِ بیخودی و بیخبری کو غنیمت جانئے اور اسی میں عمر گزرنے کے اور شعر بھی دیکھئے ؎

مرزا غالب دہلوی رح ؎ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو ٭ اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

مولانا حالی پانی پتی ؎ لی ہوش میں آنے کی جو ساقی سے اجازت ٭ فرمایا خبردار کہ نازک ہے زمانہ

عمر خیام ؎ خواہم کہ بے خودی برآرم نفسی ٭ مے خوردن و مست بودنم زیں سبب است

٢ میر تقی میرؔ کا ایک اور شعر اسی مضمون کا گزر چکا ہے ؎

فردا کا سوچ تجھ کو کیا آج ہی پڑا ہے ٭ کل کی سمجھیو کل ہی کل تو اگر رہے گا

اس کام جاں میں ہم میں ہوا ہی حجاب چشم
یوں رہیے آہ کب تئیں دیوار درمیاں

سو بار اس سے فتنے جہاں میں اُٹھے ولے
دیکھی نہ ہم نے وہ کمر اک بار درمیاں

کیا کہئے آہ جی کو قیامت ہی انتظار
آتا نہ کاشکی وعدۂ دیدار درمیاں

رکھدی ہی کتنے روزوں سے تلوار یار نے
کوئی نہیں ہی خوں کا سزاوار درمیاں

ثابت ہی سارے خلق کے اوپر کہ تو ہی ایک
حاجت نہیں جو آوے یہ تکرار درمیاں

آیا [1] کئے دماغ کے اعضا میں یہ فتور
ٹھہرے قشون کیا نہیں سردار درمیاں

بازار میں دکھائی ہی کب اُن نے جنس حسن
جو بک نہیں گئے ہیں خریدار درمیاں

دیکھیں چمن جو سینۂ پُر داغ سے بڑھیں
بیداد ہی یہ قطعۂ گلزار درمیاں

کھنچنے نہ پائی اُس کی تو تلوار بھیڑ میں
مارا گیا عبث یہ گنہگار درمیاں

ابکی جنوں کے بیچ گریباں کا ذکر کیا
کہئے بھی جو رہا ہو کوئی تار درمیاں

کتنے دلوں سے میر کا نالہ نہیں سُنا
شاید نہیں ہی اب وہ گرفتار درمیاں

اتفاق ایسا ہی کرتے ہی سدا رہتے ہیں
ایک عالم میں ہیں ہم وے پہ جدا رہتے ہیں

برسی تلوار کہ حائل ہوئے ہیں سیلِ بلا
پیش کچھ آؤ ہم اس کوچہ میں جا رہتے ہیں

کام آتا ہی میسر کسے ان ہونٹھوں سے
بابتِ بوسہ ہیں پر سب کو چما رہتے ہیں

دشت میں گرد رہ اس کی اٹھی ہی جیدھر سے
وحش و طیر آنکھیں ادھر ہی کو لگا رہتے ہیں

کیا تری گرمیٔ بازار کہیں خوبی کی
سیکڑوں اُن کے یوسف سے بکا رہتے ہیں

بسترا خاکِ رہ اُس کی تو ہی اپنا لیکن
گریۂ خونیں سے لوہو میں نہا رہتے ہیں

کیوں اُڑاتے ہو بلایا ہمیں کب کب ہم آپ
جیسے گردان کبوتر یہیں آ رہتے ہیں

حق تلف کُن ہیں بتاں یاد دلاؤں کیتک
ہر سحر صحبتِ دوشیں کو بھلا رہتے ہیں

یاد میں اُس کی قد و قامتِ دلکش کے میر
اپنے سر ایک قیامت نئی لا رہتے ہیں

---

[1] میر تقی میر سہ
دل دماغ اور جگر یہ سب اک بار
کیوں نہ ہو فتح ضعف اعضا پر
کام آئے فراق میں ای یار !
مرگئے اس قشون کے سردار

باغ کو سبز ہوا اب سرِ گلزار کہاں
دل کہاں وقت کہاں عمر کہاں یار کہاں

تم تو اب آنے کو پھر کہہ چلے ہو کل لیکن
بیکل ایسا ہی رہا شب تو یہ بیمار کہاں

دل کی خواہش ہو کسو کو تو کمی دل کی نہیں
اب یہی جنس بہت ہی یہ خریدار کہاں

خاک یہاں چھانتے ہی کیوں نہ پھرو دل کیلئے
ایسا پہنچے ہی ہم پھر کوئی غم خوار کہاں

دم زدن مصلحتِ وقت نہیں ای ہمدم
جی میں کیا کیا ہی مرے پر لبِ اظہار کہاں

شیخ کے آنے ہی کی دیر ہی میخانہ میں پھر
سبحہ سجادہ کہاں جبہ و دستار کہاں

ہم سے ناکس تو بہت پھرتے ہیں جی دیتے ولی
زخمِ تیغ اُس کے اُٹھانیکا سزاوار کہاں

تو نے بھی گردِ رُخِ سرخ نکالا خطِ سبز
باغِ شاداب جہاں میں گلِ بے خار کہاں

خبط نے عقل کے سر رشتے کئے گم سارے
اب جو ڈھونڈو تو گریباں میں کوئی تار کہاں

گو کہ گردن تئیں یہاں کوئی لہو میں بیٹھے
ہاتھ اُٹھاتا ہی جفا سے وہ ستمگار کہاں

ڈوبا لوہو میں پڑا تھا ہمگی ہیکل میر
یہ نہ جانا کہ لگی ظلم کی تلوار کہاں

اے مجھ سے تجھ کو سو ملے تجھ سا نہ پایا ایک میں
اُشنو شنو کہیں تو نے مجھے منہ پر نہ لایا ایک میں

عالم کی میں نے سیر کی مجھ کو جو خوش آیا سو تو
سب سے رہا محفوظ تو تجھ کو نہ بھایا ایک میں

یہ جوش غم ہوتے بھی ہیں یوں ابرِ تر روتے بھی ہیں
چشمِ جہاں آشوب سے دریا بہایا ایک میں

تھا سب کو دعویٰ عشق کا لیکن نہ ٹھہرا کوئی بھی
دانستہ اپنی جان سے دل کو اُٹھایا ایک میں

ہیں طالبِ صورت سبھی مجھ پر ستم کیوں اس قدر
کیا مجرمِ عشقِ بتاں یہاں ہوں خدایا ایک میں

بجلی سی یوں چمکے بہت پر بات کہتے ہو چکے
جوں ابر ساری خلق پر ہو دل اتو چھایا ایک میں

سو رنگ وہ ظاہر ہوا کوئی نہ جاگہ سے گیا
دل کو جو میرے چوٹ تھی طاقت نہ لایا ایک میں

اس گلستاں سے منفعت یوں تو ہزاروں کو ہوئی
دیکھا نہ سرو و گل کا یہاں ٹک سر پہ سایا ایک میں

رسمِ کہن ہے دوستی ہوتی بھی ہی الفت بہم
میں کشتنی ٹھہرا جو ہوں کیا دل لگایا ایک میں

جن جن نے دیکھا تھا اُسے بیخود ہوا جیتا بھی پھر
پر میر جیتے جی بخود ہرگز نہ آیا ایک میں

اگرچہ اب کی ہم ای ابرِ خشک مژگاں ہیں
یہ جوش دل میں کبھو آ گیا تو طوفاں ہیں

صنم پرستی میں ای راہباں نہ کی تقصیر
تم اہلِ صومعہ سے پوچھو وے مسلماں ہیں

کریں انھوں پہ بھلا کس طرح نظر گستاخ
بتانِ شہر ہمارے تو دین و ایماں ہیں

چمن میں جا کے بھرو تم گلوں سے جیب و کنار
ہم اپنے دل ہی کے ٹکڑوں سے گل بداماں ہیں

رہیں ہیں دیکھ جو تصویر سے ترے منہ کو
ہماری آنکھ سے ظاہر ہے یہ کہ حیراں ہیں

رہا ہے کون سا پردہ ترے ستم کا شوخ
کہ زخم سینہ ہمارے سبھی نمایاں ہیں

شبیہ شکل سے ہی حالِ ضبطِ عشق کے بیچ
کہ رنگ روپ ہے سب کچھ ولیک بیجاں ہیں

بنے تو عزت عشاق میں نہ کر تقصیر
کہ ایسے لوگ پیارے عزیز مہماں ہیں

جو ابر دشت میں برسے تو ہم اُڑا دیں خاک
وہ میرؔ آپ ہی ہم یہاں کے میر ساماں ہیں

جور کیا کیا جفائیں کیا کیا ہیں
عاشقی میں بلائیں کیا کیا ہیں

خوبرو ہی فقط نہیں وہ شوخ
حسن کیا کیا ادائیں کیا کیا ہیں

فکرِ تعمیرِ دل کسو کو نہیں
ایسی ویسی بنائیں کیا کیا ہیں

گہ نسیمِ صبا ہے گاہ سموم
اس چمن میں ہوائیں کیا کیا ہیں

شور ہے ترکِ شیخ کا لیکن
چپکے چپکے دعائیں کیا کیا ہیں

منظرِ دیدہ قصرِ دل اے میرؔ
شہرِ تن میں بھی جائیں کیا کیا ہیں

فراق آنکھ لگنے کی جا ہی نہیں
پلک سے پلک آشنا ہی نہیں

گلہ عشق کا بدخلقت سے ہے
غمِ دل کو کچھ انتہا ہی نہیں

محبت جہاں کی تہاں ہو چکی
کچھ اس روگ کی بھی دوا ہی نہیں

دکھایا کئے یار اُس رخ کا سطح
کہیں آرسی کو حیا ہی نہیں

وہ کیا کچھ نہیں حسن کے شہر میں
نہیں ہے تو رسمِ وفا ہی نہیں

چمن محو اُس روئے خوش کا ہے سب
گلِ تر کی آب و ہوا ہی نہیں

نہیں دیر اگر میرؔ کعبہ تو ہے
ہمارے کوئی کیا خدا ہی نہیں

دل لیکے کیسے کیسے جھگڑے مجادلے ہیں
بدوضع یہاں کے لڑکے کیا خوش معاملے ہیں

گھبرانے لگتیاں ہیں رک رک کے تن میں جانیں
کرتے ہیں جو وفائیں اُن ہی کے حوصلے ہیں

کیا قدر تھی سخن کی جب یہاں بھی صحبتیں تھیں
ہر بات جائزہ ہے ہر بیت پر صلے ہیں

جب کچھ تھی جہت مجھ سے تب کس سے ملتے تھے تم
اطراف کے یہ بلے تہ اب تم سے آ ملے ہیں

تھا واجب الترحم مظلوم عشق تھا میں
اس کشتۂ ستم کو تم سے بہت گلے ہیں

سوزِ دروں سے کیونکر میں آگ میں نہ لوٹوں
جوں شیشۂ حبابی سب دل پر آبلے ہیں

میں جی سنبھالتا ہوں وہ ہنس کے ٹالتا ہے
یہاں مشکلیں ہیں ایسی وہاں یہ معاملے ہیں

اندیشہ زادِ رہ کا رکھیے تو ہے مناسب
چلنے کو یہاں سے اکثر تیار قافلے ہیں

پانچوں حواس گم ہیں ہر اک کے اس سمیں میں
کیا میر جی ہی تنہا ان روزوں وہ دلے ہیں

محبت نے کھویا کھپایا ہمیں
بہت اس نے ڈھونڈا نہ پایا ہمیں

پھرا کرتے ہیں دھوپ میں جلتے ہم
ہوا ہے کہے تو کہ سایا ہمیں

گہے تر رہیں گاہ خوں بستہ تھیں
ان آنکھوں نے کیا کیا دکھایا ہمیں

بٹھا اس کی خاطر میں نقشِ وفا
نہیں تو اٹھا لے خدایا ہمیں

ملے ڈالے ہے دل کوئی عشق میں
یہ کیا روگ یارب لگایا ہمیں

ہوئی اس گلی میں تو مٹی عزیز
ولے خواریوں سے اٹھایا ہمیں

جوانی دوانی سنا کیا نہیں
حسینوں کا ملنا ہے بھایا ہمیں

نہ سمجھی گئی دشمنی عشق کی
بہت دوستوں نے جتایا ہمیں

کوئی دم کل آئے تھے مجلس میں میر
بہت اس غزل پر رلایا ہمیں

جنوں نے تماشا بنایا ہمیں
رہا دیکھ اپنا پرایا ہمیں

سدا ہم تو کھوئے گئے سے رہے
کبھو آپ میں تم نے پایا ہمیں

یہی تا دمِ مرگ بیتاب تھے
نہ اس بن تنک صبر آیا ہمیں

شب آنکھوں سے دریا سا بہتا رہا
انھیں نے کنارے لگایا ہمیں

ہمارا نہیں تم کو کچھ پاس رنج
یہ کیا تم نے سمجھا ہے آیا ہمیں

لگی سر سے جوں شمع پا تک گئی
سب اس داغ نے آہ کھایا ہمیں

جلیں پیش و پس جیسے شمع و پتنگ
جلا وہ بھی جن نے جلایا ہمیں

ازل میں ملا کیا نہ عالم کے تئیں | قضانے یہی دل دلایا ہمیں

رہا تو تو اکثر الم ناک میر
ترا طور کچھ خوش نہ آیا ہمیں

کیا عبث مجنوں پئے محمل ہی میاں
یہ دوانا باؤلا عاقل ہی میاں

قند کا کون اس قدر مائل ہی میاں
جو ہی ان ہونٹھوں ہی کا قائل ہی میاں

ہم نے یہ مانا کہ واعظ ہی ملک[1]
آدمی ہونا بہت مشکل ہی میاں

چشم تر کی خیر جاری ہی سدا
سیل اس دروازے کا سائل ہی میاں

مرنے کے پیچھے تو راحت سچ ہی لیک
بیچ میں یہ واقعہ حائل ہی میاں

دل کی پامالی ستم ہی تہ کے
کوئی یوں دلتا ہی آخر دل ہی میاں

آج کیا فردائے محشر کا ہراس[2]
صبح دیکھیں کیا ہو شب حامل ہی میاں

دل تڑپتا ہی نہیں کیا جانئے
کس شکار انداز کا بسمل ہی میاں

چاہئے پیش از نماز آنکھیں کھلیں
حیف اس کا وقت جو غافل ہی میاں

رنگ بے رنگی جدا تو ہے ولے
آب سا ہر رنگ میں شامل ہی میاں

سامنے سے ٹک ٹلے تو دق نہ ہو
آسماں چھاتی پر اپنے سل ہی میاں

دل لگے اتنے جہاں میں کس لئے
رہ گزر ہی یہ تو کیا منزل ہی میاں

بے تہی دریائے ہستی کی نہ پوچھ
یہاں سے دھاں تک سو جگہ ساحل ہی میاں

چشم حق بیں سے کرو ٹک تم نظر
دیکھتے جو کچھ ہو سب باطل ہی میاں

دردمندی ہی تو ہی جو کچھ کہ ہے
حق میں عاشق کے دوا قاتل ہی میاں

برسوں ہم روتے پھرے ہیں ابر سے
زانو زانو اس گلی میں گل ہی میاں

کہنہ سالی میں ہی جیسے خرد سال
کیا فلک پیری میں بھی جاہل ہی میاں

کیا دل مجروح و محزوں کا گلہ
ایک غمگیں دوسرے گھائل ہی میاں

دیکھ کر سبزہ ہی خرم دل کو رکھ
مزرع دنیا کا یہ حاصل ہی میاں

مستعدوں پر سخن ہی آج کل
شعر اپنا فن ہو کس قابل ہی میاں

کی زیارت میر کی ہم نے بھی کل
لاابالی سا ہی پر کامل ہی میاں

[1] ای بیان سہل ہی ہمرنگ طالب ہونا ؛ آدمی بنتا ہی انسان بڑی مشکل سے (بیان یزدانی میرٹھی)
[2] غنیمت جان فرصت آج کے دن ؛ سحر کیا جانئے کیا ہو شب ہے حاملہ [illegible]

لذت سے درد کی جو کوئی آشنا نہیں — سو لطف کیوں نہ جمع ہو اس میں مزا نہیں
ہر آن کیا عوض ہے دعا کا بدی ڈلے — تم کیا کرو بھلے کا زمانہ رہا نہیں
روئے سخن جو ہے تو مرا چشمِ دل کی اور — تم سے خدا نخواستہ مجھ کو گلا نہیں
تلوار ہی کھنچا کی ترے ہوتے بزم میں — بیٹھا ہے کب تو آ کے کہ فتنہ اٹھا نہیں
دل دیکھے ایسے دلبرِ ہرجائی سے کوئی — بیجا نہیں ہے دل جو ہمارا بجا نہیں
ہو تم جو میرے حیرتیِ فرطِ شوقِ وصل — کیا جانو دل کسو سے تمھارا لگا نہیں
آئینے پر سے ٹک نہیں اٹھتی تری نظر — اس شوق کش کے منہ سے تجھے کچھ حیا نہیں
رنگ اور بو تو دلکش و دلچسپ ہیں کمال — لیکن ہزار حیف کہ گل میں وفا نہیں
تیرِ ستم کا تیرے ہدف کب تلک رہوں — آخر جگر ہے لوہے کا کوئی توا نہیں
ان نے تو آنکھیں موند لیاں ہیں ادھر سے وہاں — ایک آدھ دن میں دیکھیے یہاں کیا ہے کیا نہیں

اٹھتے ہو میر دیر سے تو کعبہ چل رہو[1]
مغموم کاہے کو ہو، تمھارے خدا نہیں؟

کیا کہیں آتشِ ہجراں سے گلے جاتے ہیں — چھاتیاں سلگیں ہیں ایسی کہ جلے جاتے ہیں
گوہرِ گوش کسو کا نہیں جی سے جاتا — آنسو موتی سے مرے منہ پہ ڈھلے جاتے ہیں
یہی مسدود ہے کچھ راہِ وفا ورنہ بہم — سب کہیں نامہ و پیغام چلے جاتے ہیں
بارِ حرماں و گل داغ نہیں اپنے ساتھ — شجرِ باغِ وفا پھولے پھلے جاتے ہیں
حیرتِ عشق میں تصویر سے رفتہ ہی رہے — ایسے جاتے ہیں جو ہم بھی تو بھلے جاتے ہیں
ہجر کی کوفت جو کھینچے ہیں انھیں سے پوچھو — دل دیے جاتے ہیں جی اپنے ملے جاتے ہیں
یادِ قد میں ترے آنکھوں سے بہیں ہیں جوئیں — گر کسو باغ میں ہم سرو تلے جاتے ہیں
دیکھیں پیش آوے ہے کیا عشق میں اب تو جوں سیل — ہم بھی اس راہ میں سر گاڑے چلے جاتے ہیں

پر غباری جہاں سے نہیں سدھ میر ہیں
گرد اتنی ہے کہ مٹی میں رلے جاتے ہیں

کیا کہیں پایا نہیں جاتا ہے کچھ تم کیا ہو میاں — ہم کھوئے گئے دُنیا سے تم ہو اور اب دُنیا ہو میاں

[1] نہیں دیر اگر میر کعبہ تو ہے — ہمارے کوئی کیا خدا ہی نہیں؟ (میر)

مت حنائی پانؤں سے چل کر کہیں جایا کرو
دلی ہی آخر نہ ہنگامہ کہیں برپا ہو میاں

دل جہاں کھویا گیا کھویا گیا، پھر دیکھئے
کون مرتا ہے جیئے ہی کون، ناپیدا ہو میاں

دل کو لے کر صاف یوں آنکھیں ملاتا ہی کوئی
تب تلک ہی لطف ہی جبتک کہ کچھ پردا ہو میاں

ایک جنبش میں ترے ابرو کی ٹل جاتی ہی بھیڑ
درمیاں آوے اگر تلوار تو پرچا ہو میاں

برسوں تک چھایا رہا ہی چشمِ تر پر ابر سا
پاٹ دامن کا نچوڑوں کوئی تو دریا ہو میاں

شہر میں تو موسمِ گل میں نہیں لگتا ہی جی
یا گریباں کوہ کا یا دامنِ صحرا ہو میاں

مدعیِ عشق تو ہیں عزلتی شہر لیک
جب گلی کوچوں میں کوئی اس طرح رسوا ہو میاں

گفتگو اتنی پریشاں حال کی یہ درہمی
میر کچھ دل تنگ ہی ایسا نہ ہو سودا ہو میاں

معلوم نہیں کیا ہی لبِ سرخ بتاں میں
اس آتشِ خاموش کا ہی شور جہاں میں

یوسف کے تئیں دیکھ نہ کیوں بند ہوں بازار
یہ جنس نکلتی نہیں ہر اک کی دکاں میں

یک پرچۂ اشعار سے منہ باندھے سبھوں کے
جادو تھا مرے خامے کی گویا کہ زباں میں

یہ دل جو شکستہ ہی سو بے لطف نہیں ہی
ٹھہرو کوئی دم آن کے اس ٹوٹے مکاں میں

میں لگ کے گلے خوب ہی رویا لبِ جو پر
ملتی تھی طرح اس کی بہت سرو رواں میں

کیا قہر ہوا دل جو دیا لڑکوں کو میں نے
چرچا ہی یہی شہر کے اب پیر و جواں میں

وے یاسمنِ تازہ شگفتہ ہیں کہاں میر
پائے گئے لطف اس کے جو پاؤں کے نشاں میں

ردیف واو

اتنا کہا نہ ہم سے تم نے کبھو کہ آؤ
کاہیکو یوں کھڑے ہو وحشی سے بیٹھ جاؤ

یہ چاند کے سے ٹکڑے چھپتے نہیں چھپائے
ہر چند اپنے منہ کو برقع میں تم چھپاؤ

دو چار تیر یارو اس سے بھلی ہی دوری
تم کھینچ کھینچ مجھ کو اس پلے پر نہ لاؤ

ہو شرم آنکھ میں تو بھاری جہاز سے ہی
مت کر کے شوخ چشمی آشوب سا اٹھاؤ

اب آتے ہو تو آؤ ہر لحظہ جی گھٹے ہی
پھر لطف کیا جو آ کر آدھا بھی تم نہ پاؤ

تھی سحر یا نگہ تھی ہم آپ کو تھے بھولے
اس جادوگر کو یارو پھر بھی ٹک سا دکھاؤ

مارے گئے سو گزرے جی پھر پھر آتے ہیں کیا
آئندہ **میر** صاحب دل مت کہیں لگاؤ

نہ مائل آرسی کارہ سراپا درد ہوگا تو — نہو گلچینِ باغِ حسن ظالم زرد ہوگا تو
یہ پیشہ عشق کا ہی خاک چھنوائیگا صحرا کی — ہزار ای بے وفا جوں گل چمن پر درد ہوگا تو
غبار اُٹھنے لگے گا تیری اس نازک طبیعت سے — بسان گرد باد آخر بیاباں گرد ہوگا تو
علاقہ دل کا لکھوائے گا دفتر ہاتھ سے تیرے — تجرد کے جریدوں میں قلم سا فرد ہوگا تو

نہ اک دم صبح تک بھی آنکھ لگنے دیگا دل جلنا
یہی پھر **میر** سرگرم آہِ سرد ہوگا تو

سب حال سے بے خبر ہیں یہاں تو — برہم زدہ شہر ہی جہاں تو
اس تن پہ نثار کرتے لیکن — اپنی بھی نظر میں ٹھہرے جاں تو
برباد نہ دے کہیں سراسر — رہتی نہیں شمع ساں زباں تو
کیا اُس کے گئے ہی ذکر دل کا — ویران پڑا ہی یہ مکاں تو
کیا کیا نہ عزیز خوار ہونگے — ہونے دو اسے ابھی جواں تو
غنچے سے لگے منہ تمھارے لیکن — صحبت کا اسے بھی ہو دہاں تو
کیا اس سے رکھیں اُمید بہبود — پھرتا ہی خراب آسماں تو
یہ طالعِ نارسا بھی جاگیں — سو جائے ٹک اُس کا پاسباں تو

مت تربت **میر** کو مٹاؤ
رہنے دو غریب کا نشاں تو

ملتفت ہوتا نہیں ہی گاہ تو — کس قدر مغرور ہی اللہ تو
مجھ سے کتنے جان سے جاتے رہے — کس کی میت کے گیا ہمراہ تو
بیخودی رہتی ہی اب اکثر تجھے — حال سے میرے نہیں آگاہ تو
اُس کے دل میں کام کرنا کام ہی — یوں فلک پر کیوں نہ جا ای آہ تو
فرش ہیں آنکھیں ہی تیری راہ میں — آہ ٹک تو دیکھ کر چل راہ تو
جی تلک تو منہ نہ موڑیں تجھ سے ہم — کر جفا و جور خاطر خواہ تو
کاہشِ دل بھی دو چنداں کیوں نہ ہو — آنکھ میں آوے نہ دُو دُو ماہ تو

دل دہی کیا کی ہی یوں ہی چاہئے ‌ ‌ ‌ ای زہے تو آفریں تو واہ تو

میرؔ تو تو عاشقی میں کھپ گیا
مت کسی کو چند روز اب چاہ تو

اب اسیری سے بچیں تو دیکھیں گے گلشن کبھو ‌ ‌ ‌ تھا ہمارا بھی چمن میں ای صبا مسکن کبھو
ہم بھی اک امید پر اس صیدگہ میں ہیں پڑے ‌ ‌ ‌ کہتے ہیں آتا ہی ایدھر وہ شکار افگن کبھو
بند پایا جیب میں یا سر مارا تنگ ہو ‌ ‌ ‌ دستِ کوتہ میں نہ آیا اپنے وہ دامن کبھو
یار کی برگشتہ مژگاں سے نہ دل کو جمع رکھ ‌ ‌ ‌ بدبلا ہی پھر کھڑی ہووے جو یہ پلٹن کبھو
جان کوئی کیوں نہ دو اُس بےمروت کے لئے ‌ ‌ ‌ آشنا ہوتا نہیں وہ دوستی دشمن کبھو
ہوں تو نالاں زیرِ دیوارِ چمن پر ضعف سے ‌ ‌ ‌ گوش زد گل کے نہیں ہوتا مرا شیون کبھو

دل مگر ان جامہ زیبوں کو دیا ہی میرؔ نے
اس طرح پھرتے نہ تھے دے چاک پیراہن کبھو

گل برگ سے ہی نازک خوبی پا تو دیکھو ‌ ‌ ‌ کیا ہی جھمک کفک کی رنگِ حنا تو دیکھو
ہر بات پر خشونت طرزِ جفا تو دیکھو ‌ ‌ ‌ ہر لمحہ بے ادائی اُس کی ادا تو دیکھو
سایہ میں ہر پلک کے خوابیدہ ہی قیامت ‌ ‌ ‌ اُس فتنۂ زماں کو کوئی جگا تو دیکھو
بلبل بھی گل گئے پر مر کر چمن سے نکلی ‌ ‌ ‌ اُس مرغِ شوق کش کی ٹک تم وفا تو دیکھو
طنزیں عبث کرو ہو نعش رہنے پر ہمارے ‌ ‌ ‌ دو چار دن کسو سے دل کو لگا تو دیکھو
ہونا پڑے ہی دشمن ہر گام اپنی جاں کا ‌ ‌ ‌ کوچے میں دوستی کے ہر کوئی آ تو دیکھو
پیری میں مول لیں ہیں منعم حویلیوں کو ‌ ‌ ‌ ڈھیتا پھرے ہی اُبھی اُس پر بنا تو دیکھو
ڈوبے ہی کشتی میری بحرِ عمیق غم میں ‌ ‌ ‌ بیگانے سے کھڑے ہو تم آشنا تو دیکھو
کے جو ہم تو اُن نے آنکھوں میں ہم کو رکھا ‌ ‌ ‌ اہلِ ہوس سے کوئی اُودھر کو جا تو دیکھو
ہی اس چمن میں وہ گل صد رنگ محوِ جلوہ ‌ ‌ ‌ دیکھو جہاں دہی ہی کچھ اُس سوا تو دیکھو

اشعار میرؔ پر ہی اب ہائے وائے ہر سو
کچھ سحر تو نہیں ہی لیکن ہوا تو دیکھو

بدزباں ہو جیسے خوش اسلوب ہو ‌ ‌ ‌ کیا کہیں جو کچھ کہ ہو تم خوب ہو
بے نقابی اُس کی ہی ہم پر ستم ‌ ‌ ‌ لائیے مُنہ پر تو وہ محجوب ہو

ایسا شہرِ حسن ہی ہی تازہ رسم
دوستی باہم جہاں معیوب ہو

مطلب عمدہ ہی دل لے تو رکھو
گاہ باشد تم کو بھی مطلوب ہو

چاہئیے ہی اور کچھ عاشق کو کیا
جان کا خواہاں اگر محبوب ہو

لوہو پینا جان کھانا دیکھئے
کیا مزاجِ عشق میں مرغوب ہو

جو کہو ہو سو مخالف عقل کے
میرؔ صاحب تم مگر مجذوب ہو

منعقد کاش مجلسِ مُل ہو
درمیاں تو ہو سامنے گُل ہو

گرمیاں متصل رہیں باہم
نے تساہل ہوئے تغافل ہو

اب دُھواں یوں جگر سے اُٹھتا ہی
جیسے پرپیچ کوئی کاکل ہو

نہ تو طالع نہ جذب پھر دل کو
کس بھروسے پہ ٹک تحمل ہو

لگ تہ چل ای نسیم باغ کہ میں
رہگیا ہوں چراغ سا گل ہو

ادھ جلا لالہ ساں رہا تو کیا
داغ بھی ہو تو کوئی بالکل ہو

طول رکھتا ہی دردِ دل میرا
لکھنے بیٹھوں تو خط ترسل ہو

ہو جو مجھ بادہ کش کے عرس میں تو
جبکہ قلقل سے شیشہ کی قل ہو

دیر رہنے کی جا نہیں یہ چمن
بوئے گل ہو صفیر بلبل ہو

مجھ دوانے کی مستدلا زنجیر
کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر غل ہو

متکشف ہو رہا ہی حال میرؔ
کاش ٹک یار کو تامل ہو

نہ میرے کر باعثِ شور و فغاں ہو
ابھی کیا جانیے یہاں کیا سماں ہو

یہی مشہور عالم ہیں دو عالم
خدا جانے ملا پاس سے کہاں ہو

جہاں سجدے میں ہم نے غش کیا تھا
وہیں شاید کہ اُس کا آستاں ہو

نہ ہووے وصف اُن باتوں کا مجھ سے
اگر ہر مو مرے تن پر زباں ہو

جگر تو چھن گیا تیروں کے مارے
تمھاری کس طرح خاطر نشاں ہو

نہ دل سے جا خدا کی تجھ کو سوگند
خدائی میں اگر ایسا مکاں ہو

تم ای نازک تناں ہو وہ کہ سب کے
تمنائے دل و آرامِ جاں ہو

له غالب دہلوی رح ـ جلتا ہی جی کہ کیوں نہ ہم اکبار جل گئے ؛ ای ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف

ہلے ٹک لب کہ اُس نے مار ڈالا — کہے کچھ کوئی گر جی کی اماں ہو
سُنا ہی چاہ کا دعویٰ تمھارا — کہو جو کچھ کہ چاہو مہرباں ہو
کنارہ یوں کیا جاتا نہیں پھر — اگر پائے محبّت درمیاں ہو ق

ہوئے ہم پیر سو ساکت ہیں اب میر
تمھاری بات کیا ہی تم جواں ہو

برسوں ہیں کبھو ایدھر تم ناز سے آتے ہو — پھر برسوں تئیں پیارے جی سے نہیں جاتے ہو
آتے ہو کبھو یھاں تو ہم لطف نہیں پاتے — سو آفتیں لاتے ہو سو فتنے اُٹھاتے ہو
رہتے ہو تم آنکھوں میں پھرتے ہو تمھیں دل میں — مدت سے اگرچہ یھاں آتے ہو نہ جاتے ہو
ایسی ہی زباں ہی تو کیا عہدہ برآ ہوں گے — ہم ایک نہیں کہتے، تم لاکھ سُناتے ہو
خوش کرنے سے ٹک ایسے ناخوش ہی رکھا کریے — ہنستے ہو گھڑی بھر تو پہروں ہی رُلاتے ہو
اک خلق تلاشی ہی تم ہاتھ نہیں لگتے — لڑکے تو ہو پر سب کو بالے ہی بتاتے ہو
مدت سے تمھارا اک ایدھر کو تو دل سے ہے — کاہے کو تصنع سے یہ باتیں بناتے ہو
کچھ عزت کفر آخر اے دیر کے باشندو — مجھ سہل سے کو کیوں تم زنّار بندھاتے ہو
آوارہ اُسے پھرتے پھر برسوں گزرتے ہیں — تم جس کسو کو اپنے ٹک پاس بُلاتے ہو

دل کھول کے مل چلیے جو میر سے ملنا ہی
آنکھیں بھی دکھاتے ہو پھر مُنہ بھی چھپاتے ہو

ہر صبح شام تو پیے ایذائے میر ہو — ایسا نہ ہو کہ کام ہی اس کا اخیر ہو
ہو کوئی بادشاہ کوئی یھاں وزیر ہو — اپنی بلا سے بیٹھ رہے جب فقیر ہو
جنّت کی منت ان کے دماغوں سے کب اُٹھے — خاکِ رہ اس کی جن کے کفن کا عبیر ہو
کیا یوں ہی آب و تاب سے ہو بیٹھیں کارِ عشق — سوکھے جگر کا خوں تو رواں جوے شیر ہو
چھاتی قفس میں داغ سے ہو کیوں نہ رشکِ باغ — جوشِ بہار تھا کہ ہم آئے اسیر ہو
یھاں برگ گل اُڑاتے ہیں پر کالۂ جگر — جا عندلیب تو نہ مری ہم صفیر ہو
اُس کے خیالِ خط میں کسے یھاں دماغِ حرف — کرتی ہی بے مزہ جو قلم کی صریر ہو
زنہار اپنی آنکھ میں آتا نہیں وہ صید — چھوٹا دو سار جس کے جگر میں نہ تیر ہو
ہوتے ہیں میکدہ کے جواں شیخ جی بُرے — پھر در گزر یہ کرتے نہیں گو کہ پیر ہو

لیٹے

کس طرح آہ خاک مذلت سے میں اٹھوں
افتادہ تر جو مجھ سے مرا دستگیر ہو

حد سے زیادہ جور و ستم خوشنما نہیں
ایسا سلوک کر کہ تدارک پذیر ہو

دم بھر نہ ٹھہرے دل میں نہ آنکھوں میں ایک پل
اتنے سے قد پہ تم بھی قیامت شریر ہو

ایسا ہی اس کے گھر کو بھی آباد دیکھیو
جس خانماں خراب کا یہ دل مشیر ہو

تسکین دل کے واسطے ہر کم بغل کے پاس
ق
انصاف کریے کب تئیں مخلص حقیر ہو

یک وقت خاص حق میں مرے کچھ دعا کرو
تم بھی تو میر صاحب و قبلہ فقیر ہو

ٹک لطف سے ملا کر گو پھر کبھو کبھو ہو
سو تب تلک کہ مجھ کو ہجراں سے تیرے خو ہو

کیا کیا جوان ہم نے دنیا سے جاتے دیکھے
ای عشق بے محابا دنیا ہو اور تو ہو

ایسے کہو گے کچھ تو ہم چپکے ہو رہیں گے
ہر بات پر کہاں تک آپس میں گفتگو ہو

ق
کیا ہی جواب ظالم پرسش کے روز کہیو
جور و سیاہ یہ بھی واں آکے روبرو ہو

پرخوں ہمارے دل سے کتنی ہی تو شابہ
شاید کلی تجھے بھی اس گل کی آرزو ہو

خط اس کے پشت لب کا ساکت کریگا مجھ کو
کہیو اگر تفاوت اس میں بقدر مو ہو

کھولے تھے بال کن نے ہنگام صبح اپنے
آئی ہے ای صبا تو ایسی جو مشکبو ہو

درویشی سے بھی اپنی نکلے ہی میرزائی
نقش حصیر تن پر ایسے ہیں جوں اتو ہو

مت التیام چاہے پھر دل شکستگاں سے
ممکن نہیں کہ شیشہ ٹوٹا ہوا رفو ہو

کہتے ہو کانپتا ہوں جوں بید عاشقی سے
تم بھی تو میر صاحب کتنے خلاف گو ہو

رکھئے گردن کو تری تیغ ستم پر ہو سو ہو
جی میں ہم نے یہ کیا ہے اب مقرر ہو سو ہو

قطرہ قطرہ اشکباری تا کجا پیش سحاب
ایک دن تو ٹوٹ پڑ ای دیدۂ تر ہو سو ہو

بند ہیں ناز و نعم ہی کے رہے کیونکر فقیر
یہ فضولی ہے فقیری میں میسر ہو سو ہو

آکے کوچے سے ترے جاتا ہوں کب جوں ابر شب
تیر باراں ہو کہ برسے تیغ یکسر ہو سو ہو

صاحبی کیسی جو تم کو بھی کوئی تم سا ملا
پھر تو خواری بیوقاری بندہ پرور ہو سو ہو

کب تلک فریاد کرتے یوں پھریں اب قصد ہے
داد لیجے اپنی اس ظالم سے اڑ کر ہو سو ہو

بال تیرے سر کے آگے تو جیوں کے ہیں وبال
سر منڈا کر ہم بھی ہوتے ہیں قلندر ہو سو ہو

۱؎ کاش اس کے روبرو نہ کریں مجھ کو حشر میں ٭ کتنے مرے سوال ہیں جنکا نہیں جواب (میر تقی میر)

سختیاں دیکھیں تو ہم سے چند کھچواتا ہی عشق
دل کو ہم نے بھی کیا ہی اب تو پتھر ہو سو ہو

کہتے ہیں ٹھہرا ہی تیرا اور غیروں کا بگاڑ
ہیں شریک اے میر ہم بھی تیرے بہتر ہو سو ہو

ظالم ہو میری جان پہ نا آشنا نہ ہو
بے رحمی اتنی عیب نہیں بے وفا نہ ہو

کرتی ہی عشق بازی کو بے مایگی وبال
کیا کھیلے وہ جوا جسے کچھ آسرا نہ ہو

ہجر بتاں میں طبع پراگندہ ہی رہی
کافر کبھی اپنے یار سے یارب جدا نہ ہو

آزار کھینچنے کے مزے عاشقوں سے پوچھ
کیا جانے وہ کہ جس کا کہیں دل لگا نہ ہو

کھینچا ہی آدمی نے بہت دور آپ کو
اس پردے میں خیال تو کر ٹک خدا نہ ہو

رکجائے دم گر آہ نہ کرے جہاں کے بیچ
اس تنگنائے میں کریں کیا جو ہوا نہ ہو

طرز سخن تو دیکھ ٹک اس بدمعاش کی
دل داغ کس طرح سے ہمارا بھلا نہ ہو

شکوہ سیاہ چشمی کا سن ہم سے یہ کہا
سرمہ نہیں لگانے کا میں تم خفا نہ ہو

جی میں تو ہی کہ دیکھئے ادارہ میر کو
لیکن خدا ہی جانے وہ گھر میں ہو یا نہ ہو

خدا کرے کہ بتوں سے نہ آشنائی ہو
کہ پھر موئے ہی بنے ہی اگر جدائی ہو

بدن نما ہی ہر آئینہ لوح تربت کا
نظر جسے ہو اُسے خاک خود نمائی ہو

بدی نوشتے کی تحریر کیا کروں اپنے
کہ نامہ پہنچے تو پھر کاغذِ ہوائی ہو

فرو نہ آوے سر اُس کا طواف کعبے سے
نصیب جس کو ترے در کی جبہ سائی ہو

ہماری چاہ نہ یوسف ہی پر ہی کچھ موقوف
نہیں ہی وہ تو کوئی اور اُس کا بھائی ہو

گلی میں اُس کی رہا جا کے جو کوئی سو رہا
وہی تو جاوے ہی وھاں جس کسو کی آئی ہو

لب سوال نہ اک بوسے کیلئے کھولوں
ہزار مہر و محبت میں بے نوائی ہو

رہا نہ یار نہیں اپنے بخت سے اتنا
کہ مدعی سے اُسے ایک دن لڑائی ہو

جفا و جور و ستم اُس کے آپ ہی سہیے
جو اپنے حوصلہ میں کچھ بھی اب سمائی ہو

ہزار موسم گل تو گئے اسیری میں
دکھائی دے ہی موئے ہی پہ اب رہائی ہو

پتنگے واتوں سے اُس کے ہولی ہی روش میر
عجب نہیں ہی کہ بجلی کی جگ ہنسائی ہو

تا چند انتظار قیامت شتاب ہو
وہ چاند سا جو نکلے تو رفعِ حجاب ہو

احوال کی خرابی مری پہنچی اس سرے
اس پر بھی وہ کہے ہو ابھی ٹک خراب ہو

یھاں آنکھیں مندتے دیر نہیں لگتی بیحجاب
میں کان کھولے رکھتا ہوں تیرے شتاب ہو

پھولوں کے عکس سے نہیں جوئے چمن میں رنگ
گل بہ چلے ہیں شرم سے اُس مہ کی آب ہو

یھاں جرم گنتے انگلیوں کے خط بھی مٹ گئے
وھاں کس طرح سے دیکھیں ہمارا حساب ہو

غفلت ہی اپنی عمر سے تم کو ہزار حیف
یہ کاروان جاتے ہیں تم مستِ خواب ہو

شانِ تغافل اُس کی لکھی ہم سے کب گئی
جب نامہ بر ہلاک ہو تب کچھ جواب ہو

لطفِ شراب ابر سے ہی سو نصیب کو
جب لبوں جام ہاتھ میں تب آفتاب ہو

ہستی پر ایک دم کی تمھیں جوش اس قدر
اس بحرِ موج خیز میں تم تو حباب ہو

جی چاہتا ہی عیش کریں ایک رات ہم
تو ہووے چاندنی ہو گلابی شراب ہو

پر پیچ و تاب دودِ دل اپنا ہی جیسے زلف
جب اس طرح سے جل کے دروں کباب ہو

آگے زبانِ یار کے خط کھینچے سب نے میر
پہلی جو بات اس کی کہیں تو کتاب ہو

سب سرگزشت سُن چکے اب چپکے ہو رہو
آخر ہوئی کہانی مری تم بھی سو رہو

جوشِ محیطِ عشق میں کیا جی سے گفتگو
اس گوہر گرامی سے اب ہاتھ دھو رہو

فندق تو ہی پہ یہ بھی تماشے کا رنگ ہی
ٹک انگلیوں کو خون میں میرے ڈبو رہو

اتنا سیاہ خانۂ عاشق سے ننگ کیا
کتنے دنوں میں آئے ہو یھاں رات تو رہو

ٹھہراؤ تم کو شوخی سے جوں برق ٹک نہیں
ٹھہرے تو ٹھہرے دل بھی مرا نکلے جو رہو

ہمخواب تجھ سے ہو کے رہا جاوے کس طرح
ہلتے ہوئے سمجھ کے کہا کر رہو رہو

خطرہ بہت ہی میر رہِ صعبِ عشق میں
ایسا نہ ہو کہیں کہ دل و دیں کو کھو رہو

لایق نہیں تمھیں کہ ہمیں ناسزا کہو
پر ہی یہی ہمارے کیے کی سزا کہو

چپکے رہے بھی چین نہیں تب کہے ہی یوں
لب بستہ بیٹھے رہتے جو ہو مدعا کہو

پیغام بر تو یار و تمھیں ہیں کروں ولے
کیا جانوں جاکے حق میں مرے اُس سے کیا کہو

اب نیک و بد یہ عشق میں مجھ کو نظر نہیں
اس میں مجھے بُرا کہو کوئی بھلا کہو

سر خاک آستاں پہ تمھارے رہا مدام
اس پر بھی یا نصیب جو تم بے وفا کہو

برسوں تلک تو گھر میں بلا گالیاں دیاں
اب در پہ سن کے کہنے لگے ہیں دعا کہو

صحبت ہماری اس کی جو ہے گفتنی نہیں
کیا کہیے گر کہے کوئی یہ ماجرا کہو

یار و خصوصیت تو ہے اپنی اسکے ساتھ
میرا کہو جو حال تو اس سے جدا کہو

آشفتہ مو حواس پریشاں خراب حال
دیکھو مجھے تو خبطی دوانہ برا کہو

کب شرح شوق ہو سکے پر تو بھی میر جی
خط تم نے جو لکھا اسے کیا کیا لکھا کہو

مت سگِ یار سے دعوائے سادات کرو
اس کنے بیٹھنے پاؤ تو مباہات کرو

صحبت آخر ہے ہماری نہ کرو پھر افسوس
متصل ہو سکے تو ہم سے ملاقات کرو

دیدنی ہے یہ ہوا شیخ جی سے کوئی کے
کہ چلو میکدے ٹک تم تو کرامات کرو

تم تو تصویر ہوئے دیکھ کے کچھ آئینہ
اتنی چپ بھی نہیں ہے خوب کوئی بات کرو

بس بہت وقت کیا شعر کے فن میں ضائع
میر اب پیر ہوئے ترکِ خیالات کرو

جوں غنچہ میر اتنے نہ بیٹھے رہا کرو
گل پھول دیکھنے کو بھی ٹک اٹھ چلا کرو

جوں نے نہ زار و نالہ سے ہم ایک دم رہیں
تم بند بند کیوں نہ ہمارا جدا کرو

سوتے کے سوتے یوں ہی نہ رہ جائیں ہم کبھو
آنکھیں ادھر سے موند نہ اپنی لیا کرو

سودے میں اس کے بک گئے ایسے کئی ہزار
یوسف کا شور دور ہی سے تم سنا کرو

ہوتے ہو بیدماغ تو دیکھو ہو ٹک ادھر
غصہ ہی ہم پہ کاشکے اکثر رہا کرو

یہ اضطراب دیکھ کہ اب دشمنوں سے بھی
کہتا ہوں اس کے ملنے کی کچھ تم دعا کرو

دم رکتے ہیں سیاہی مژگاں ہی دیکھ کر
سرمہ لگا کے اور ہمیں مت خفا کرو

پورا کریں ہیں وعدہ کو اپنے ہم آجکل
وعدہ کے تئیں وصال کے تم بھی وفا کرو

دشمن ہیں اپنے جی کے تمھارے لیے ہوئے
تم بھی حقوق دوستی کے کچھ ادا کرو

اپنا چلے تو آپھی ستم سب اٹھائیے
تم کون چاہتا ہے کسو پر جفا کرو

ہر چند ساتھ جان کے ہے عشق میر لیک
اس دردِ لا علاج کی کچھ تو دوا کرو

لا میری اور یارب آج ایک خوش کمر کو
قدرت سے اس کے دل کی کل پھیر دے ادھر کو

بے طاقتی میں شب کی پوچھو نہ ضبط میرا
ہاتھوں میں دل کو رکھا دانتوں تلے جگر کو

پھولا پھلا نہ ابتک ہرگز درختِ خواہش
برسوں ہوے کہ دوں ہوں خون دل اس شجر کو

ہی روزگار میرا ایسا سیہ کہ یارو
مشکل ہی فرق کرنا ٹک شام سے سحر کو

ہر چند ہی سخن کو تشبیہ دُر سے لیکن
باتیں مری سنو تو تم پھینک دو گہر کو

نزدیک ہی کہ جاویں ہم آپ سے اب آ کر
ملتے ہیں دوستوں سے جاتے ہوئے سفر کو

کب میر ابر ویسا برساوے کر اندھیری
جیسا کہ روتے ہم نے دیکھا ہی چشم تر کو

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میر کی شب کو
مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو

پھرتے ہیں چنانچہ لئے خدام سلاتے
درویشوں کے پیراہن صدچاک قصب کو

کیا وجہ کہیں خوں شدنِ دل کی پیارے
دیکھو تو ہو آئینہ میں تم جنبش لب کو

برسوں تئیں جب ہم نے تردد کئے ہیں تب
پہنچایا ہے آدم تئیں واعظ کے نسب کو

ہی رحم کو بھی راہِ دلِ یار میں بارے
جاگہ نہیں یہاں ورنہ کہیں اس کے غضب کو

کیا ہم سے گنہگار ہیں یہ سب جو موئے ہیں
کچھ پوچھو نہ اُس شوخ کی رنجش کے سبب کو

دل دینے سے اس طرح کے جی کا شکے دیتے
یوں کھینچے کوئی کب تئیں اس رنج و تعب کو

حیرت ہی کہ ہی مدعی معرفت اک خلق
کچھ ہم نے تو پایا نہیں ابتک ترے ڈھب کو

ہوگا کسو دیوار کے سایہ میں پڑا میر
کیا ربط محبت سے اُس آرام طلب کو

ملا یارب کہیں اس صید افگن سر بسر کیں کو
کہ افشاں کیجے خون اپنے سے اُس کے دامنِ زیں کو

گئے وے سابقے سارے خصوصیت رہی پیارے
کبھو در تک تو آ بارے ہمارے دل کی تسکیں کو

پیئے جاتے نہیں بس اب لہو کے گھونٹ یہ مجھ سے
بہت پی پی گیا ڈر سے ترے میں اشکِ خونیں کو

نہ لکھیں یار کو محضر ہمارے خونِ ناحق کا
دکھا دیویں گے ہم محشر میں اُسکے دستِ رنگیں کو

بجز حیرت نہ بن آوے گی کوئی شکل پھر اس سے
دکھایا ہم نے گر چہرہ ترا صورت گر چیں کو

اُبھر کر سنگ کے تختے سے پھر دیکھا کیا اُودھر
محبت ہو گئی تھی کوہکن سے نقشِ شیریں کو

ہم اُس کے چاند سے منہ کے ہیں عاشق مہ نے کیا ہم کو
سر اپنا کیک ہی مارا کرے اس خشتِ سیمیں کو

ہوئے کیا کیا مقدس لوگ آوارہ ترے غم میں
سبک پا کر دکھایا شوخ تو نے اہلِ تمکیں کو

بہت مدت ہوئی صحرا سے مجنوں کی خبر آئے
نہیں معلوم پیش آیا ہے کیا اس یارِ دیریں کو

لئے تسبیح ہاتھوں میں جو تو باتیں بناتا ہے
نہیں دیکھا ہے واعظ تو نے اس غارتگرِ دیں کو

گیا کوچے سے تیرے اٹھ کے میرؔ آشفتہ سر شاید
پڑا دیکھا تھا میں نے رہ میں اس گم کردہ بالیں کو

کیا چہرے خدا نے دیے ان خوش پسروں کو
دینا تھا تنک رحم بھی بیداد گروں کو

آنکھوں سے ہوئی خانہ خرابی دل اے کاش
کر لیتے تبھی بند ہم ان دونوں دروں کو

پروازِ گلستاں کے تو شائستہ نہ نکلے
پروانہ نمط آگ ہم اب دیں گے پروں کو

سب طائرِ قدسی ہیں یہ جو زیرِ فلک ہیں
موندا[1] ہے کہاں عشق نے ان جانوروں کو

زنہار ترے دل کی توجہ نہ ہوا یدھر
آگے ترے ہم کاڑھ رکھیں گو جگروں کو

پیراہنِ صد چاک سلاتے ہیں مرا لوگ
تر سے نہیں مطلق خبر ان بے خبروں کو

جوں اشک جہاں جاتے رہیں گے تو گئے پھر
دیکھا کرو ٹک آن کے ہم دیدہ تروں کو

اس باغ کے ہر گل سے چپک جاتی ہیں آنکھیں
مشکل بنی ہے آن کے صاحب نظروں کو

آدابِ جنوں چاہیے ہم سے کوئی سیکھے
دیکھا ہے بہت یاروں نے آشفتہ سروں کو

اندیشہ کی جاگہ ہے بہت میرؔ جی مرنا
درپیش عجب راہ ہے ہم نوسفروں کو

عنایت ازلی سے جو دل ملا مجھ کو
محلِ شکر ہے آتا نہیں گلا مجھ کو

تنک شراب ضعیف الدماغ ہوں ساقی
دمِ سحر جے پر زور مت پلا مجھ کو

پڑا ہے کوئی مردہ سا کب تلک خاموش
ہلا کہیں لبِ جاں بخش کو جلا مجھ کو

جنوں میں سخت ہے اس زلف سے علاقۂ دل
خوش آگیا ہے نہایت یہ سلسلا مجھ کو

فلک کی چرخ زنی برسوں ہو تو مجھ سا ہو
سمجھ سمجھ کے تنک خاک میں ملا مجھ کو

رہا تھا خوں تئیں ہمرہ سو آج بھی خوں ہے حیف
رفیق تجھ سا ملے گا کہاں دلا مجھ کو

درستی جیب کی اتنی نہیں ہے اے ناصح
سیے تو سینۂ صد چاک وے سلا مجھ کو

ہوا ہوں خاک پہ دل کی رہی ہے ناصافی
ابھی اس آئینہ کی کرنی ہے جلا مجھ کو

[1] موندا ہے یعنی بند کیا ہے۔

مگر کہ مردنِ دشوار میرؔ سہل ہو۔ شوخ!
ہلاک کرتا ہو تیرا مساہلا مجھ کو

ہوتی کچھ عشق کی غیرت بھی اگر بلبل کو
ٹک صبح کی باد سے لگنے نہ دیتی گل کو

میں نے سر اپنا دُھنا تھا تبھی اس شوخ نے جب
پگڑی کے پیچ سے باندھا تھا اُٹھا کاکل کو

مستی اُن آنکھوں سے نکلے ہو اگر دیکھو خوب
خلق بدنام عبث کرتی ہو جامِ مُل کو

جیسے ہوتی ہو کتاب ایک ورق بن ناقص
نسبت تام اسی طور ہو جز سے کل کو

ایک لحظہ ہی میں بل سارے نکل جاتے میرؔ
پیچ اُس زلف کے دینے تھے دکھا سنبل کو

یوں کب ہوا ہو پیارے پاس اپنے تم بلالو
دو باتیں گر لکھوں میں دل کو ٹک اک لگالو

اب جو نصیب میں ہو سو دیکھ لوں گا میں بھی
تم دستِ لطف اپنا سر پر مرے اُٹھالو

جنبش بھی اُس کے آگے ہونٹھوں کو ہو تو کہیو
یوں اپنے طور پر تم باتیں بہت بنالو

دو نعروں ہی میں شب کے ہوگا مکان ہو کا
سُن رکھو کان رکھ کر یہ بات بستی والو

نامِ خدا ستم میں تم نامور تو ہو ہی
پر ایک دو کو یوں ہی للہ مار ڈالو

زلف اور خال و خط کا سودا نہیں ہو اچھا
یارو بنے تو سر سے جلد اس بلا کو ٹالو

یارانِ رفتہ ایسے کیا دُور تر گئے ہیں
ٹک کر کے تیز گامی اس قافلے کو جالو

بازاری سارے وے ہی کہتے ہیں راز بیٹھے
جن کو ہمیں کہا ہو تم منہ سے مت نکالو

یوں رفتہ اور بیخود کب تک رہا کروگے
تم اب بھی میرؔ صاحب اپنے تئیں سنبھالو

ردیف ہائے ہوز

یاد جب آتی ہو وہ زلفِ سیاہ
سانپ سا چھاتی پہ پھر جاتا ہو آہ

کھل گیا منہ اب تو اس محجوب کا
کچھ سخن کی بھی نکل آوے گی راہ

شرم کرنی تھی مرا سر کاٹ کر
سو تو اُن نے اور ٹیڑھی کی کلاہ

یار کا وہ ناز اپنا یہ نیاز
دیکھیے ہوتا ہو کیونکر یوں نباہ

دین میں اس کافرِ بے رحم کے
اجر اک رکھتا ہو خونِ بے گناہ

پتھروں سے سینہ کوبی میں نے کی　　دل کے ماتم میں مری چھاتی سراہ
مول لے چک مجھ کو آنکھیں موند کر　　دیکھ تو قیمت ہی میری اک نگاہ
لذت دُنیا سے کیا بہرہ ہمیں　　پاس ہی رنڈی ولے ہی ضعف باہ
روٹھ کر کیا آپ سے ملنے میں لطف　　ہووے وہ بھی تو کبھو ٹک عذر خواہ
ضبط بہتیرا ہی کرتے ہیں ولے　　آہ اک منہ سے نکل جاتی ہی گاہ
اُس کے رو کے رفتہ ہی آئے ہیں یہاں　　آج سے تو کچھ نہیں یہ جی کی چاہ
دیکھ رہتے دھوتے اُس رخسار کے　　دایہ منہ دھوتے جو کہتی ماہ ماہ

شیخ تو نے خوب سمجھا میر کو
واہ وا ای بے حقیقت واہ واہ

ظالم یہ کیا نکالی رفتار رفتہ رفتہ　　اس چال پر چلے گی تلوار رفتہ رفتہ
ہر آن ہم کو تجھ بن ایک اک برس ہوئی ہی　　کیا آگیا زمانہ اے یار رفتہ رفتہ
کہا گئے کیونکہ جانیں بے پرا جاتیاں ہیں　　اس معنی کا بھی ہوگا اظہار رفتہ رفتہ
یہ ہی سلوک اُس کے اکثر چلے گئے تو　　بیٹھیں گے اپنے گھر ہم ناچار رفتہ رفتہ
پامال ہوں کہ اس میں ہوں خاک سے برابر　　اب ہو گیا ہی سب کچھ ہموار رفتہ رفتہ
چاہت میں دخل مت دے زنہار آرزو کو　　کروے ہی دل کی خواہش بیمار رفتہ رفتہ
خاطر نہ جمع رکھو ان پلکوں کی خلش سے　　سر دل سے کاڑھتے ہیں یہاں خار رفتہ رفتہ
تھے ایک ہم تے دونوں سو اتحاد کیسا　　ہر بات پر اب آئی تکرار رفتہ رفتہ

گر بتکدے میں جانا ایسا ہی میر جی کا
تو تارِ سبحہ ہوگا زنار رفتہ رفتہ

پیدا نہیں جہاں میں قیدِ جہاں سے رستہ　　مانندِ برق ہیں یہاں وے لوگ جستہ جستہ
ظالم بھلی نہیں ہی برہم زنیِ مژگاں　　مر جائے گا کسو دن یوں کوئی سینہ خستہ
پائے حنائی اُس کے ہاتھوں ہی پر رکھے ہیں　　پر اُس کو خوش نہ آیا یہ کار دست بستہ
شہرِ چمن سے کچھ کم دشتِ جنوں نہیں ہی　　یہاں گل ہیں رستہ رستہ وہاں داغ دستہ دستہ

معمار کا وہ لڑکا پتھر ہی اس کی خاطر
کیوں خاک میں ملا تو ای میر دل شکستہ

ٹک پاس آکے کیسے صرفے سے ہیں کشیدہ
گویا کہ ہیں یہ لڑکے پیرِ زمانہ دیدہ

اب خاک تو ہماری سب سبز ہو چلی ہے
کب منہ ادھر کرے گا وہ آہوِ رمیدہ

یوسف سے کوئی کیونکر اس ماہ کو ملاوے
ہے فرق رات دن کا از دیدہ تا شنیدہ

بندے کے دردِ دل کو کوئی نہیں پہنچتا
ہر ایک بے حقیقت یہاں ہے خدا رسیدہ

کیا وسوسہ ہے مجھ کو عزت سے جینے کا یہاں
نکلا نہ میرے دل سے یہ خار تا خلیدہ

ہم کاڑھ کر جگر بھی آگے تمھارے رکھا
پھر یا نصیب اس پر تم جو ہوئے کبیدہ

سایہ سے اپنے وحشت ہم کو رہی ہمیشہ
جوں آفتاب ہم بھی کیسے رہے جریدہ

منصور کی نظر تھی جو دار کی طرف سو
پھل وہ درخت لایا آخر سرِ بریدہ

ذوقِ سخن ہوا ہے اب تو بہت ہمیں بھی
لکھ لیں گے میر جی کے کچھ شعر چیدہ چیدہ

پھرتی ہیں اس کی آنکھیں آنکھوں تلے ہمیشہ
رہتا ہے آبِ دیدہ یہاں تا گلے ہمیشہ

تصدیع ایک دو دن ہووے تو کوئی کھینچے
تڑپے جگر ہمیشہ چھاتی جلے ہمیشہ

اک اس مغل بچے کو وعدہ وفا نہ کرنا
کچھ جا کہیں تو کرتا آرے بلے ہمیشہ

کب تک وفا کرے گا یہ حوصلہ ہمارا
دل پیسے درد اکثر غم جی ملے ہمیشہ

اس جسمِ خاکی سے ہم مٹی میں اٹ رہے ہیں
یوں خاک میں کہاں تک کوئی رلے ہمیشہ

آئندہ و روندہ بادِ سحر کبوتر
قاصد نیا ادھر کو کب تک چلے ہمیشہ

مسجد میں چل کے ملیے جمعہ کے دن بنے تو
ہوتے ہیں میر صاحب واں دن ڈھلے ہمیشہ

لطف کیا ہر کسو کی چاہ کے ساتھ
چاہ وہ ہے جو ہو نباہ کے ساتھ

وقت کڑھنے کے ہاتھ دل پر رکھ
جان جاتی رہے نہ آہ کے ساتھ

عشق میں ترکِ سر کیے ہی بنے
مشورت تو بھی کر کلاہ کے ساتھ

ہو اگر چند آسماں پہ ولے
نسبت اس مہ کو کیا ہے ماہ کے ساتھ

سفری وہ جو مہ ہوا تا دیر
چشم اپنی تھی گردِ راہ کے ساتھ

جاذبہ تو ان آنکھوں کا دیکھا
جی کھنچے جاتے ہیں نگاہ کے ساتھ

میر سے تم برے ہی رہتے ہو
کیا شرارت ہے خیر خواہ کے ساتھ

ہم سے کیوں الجھا کرے ہے آ سمجھ اے ناسمجھ
کج طبیعت جو مخالف ہیں انھوں سے جا سمجھ

یار کی ان بھولی باتوں پر نہ جا اے ہمنشیں
ایک فتنہ ہے وہ اس کو آہ مت لڑکا سمجھ

خوبرو عشاق سے بد پیش آتے ہیں سبھی
گرچہ خوش ظاہر ہیں یہ پر ان کو مت اچھا سمجھ

باغباں بے رحم، گل بے دید، موسم بیوفا
آشیاں اس باغ میں بلبل نے باندھا کیا سمجھ

میں جو نرمی کی تو دونا سر چڑھا وہ بدمعاش
کھانے ہی کو دوڑتا ہے اب مجھے حلوا سمجھ

دور سے دیکھی جو بدحالی وہیں سے ٹل گیا
دو قدم آگے نہ آیا مجھ کو وہ مرتا سمجھ

میر کی عیاریاں معلوم لڑکوں کو نہیں
کرتے ہیں کیا کیا ادائیں اس کو سادا سا سمجھ

کھینچتا ہے دلوں کو صحرا کچھ
ہے مزاجوں میں اپنے سودا کچھ

دل نہیں جمع چشم تر سے اب
پھیلتا سا چلا یہ دریا کچھ

شہر میں حشر کیوں نہ برپا ہو
شور ہے میرے سر میں کیسا کچھ

ویسے ظاہر کا لطف ہے چھپنا
کم تماشا نہیں یہ پردا کچھ

خلق کی کیا سمجھ میں وہ آیا
آپ سے تو گیا نہ سمجھا کچھ

یاس سے مجھ کو بھی ہے استغنا
گو نہ ہو اُس کو میری پروا کچھ

کچھ نہ دیکھا تھا ہم نے پر تو بھی
آنکھ میں آئی یہ نہ دنیا کچھ

اب تو بگڑے ہی جاتے ہیں خوباں
رنگ صحبت نہیں ہے اچھا کچھ

کچھ کہو دور ہے بہت وہ شوخ
اپنے نزدیک تو نہ ٹھہرا کچھ

وصل اُس کا خدا نصیب کرے
میر دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ

بود نقش و نگار سا ہے کچھ
صورت اک اعتبار سا ہے کچھ

یہ جو مہلت جسے کہیں ہیں عمر
دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ

منہ نہ ہم جبریوں کا کھلواؤ
کہنے کو اختیار سا ہے کچھ

منتظر اُس کی گرد راہ کے تھے
آنکھوں میں سو غبار سا ہے کچھ

ضعفِ پیری میں زندگانی بھی
دوش پر اپنے بار سا ہے کچھ

کیا ہے دیکھو ہو جو ادھر ہر دم
اور چتون میں پیار سا ہے کچھ

اُس کی برہم زنیِ مژگاں سے
دل میں اب خار خار سا ہی کچھ

جیسے عنقا کہاں ہیں ہم ای میرؔ
شہروں میں اشتہار سا ہی کچھ

آوے کہنے میں، رہا ہو غم سے گر احوال کچھ
جان بلب رہتے ہیں پر کہتے نہیں ہیں حال کچھ

بے زری سے داغ ہیں لیکن لبوں پر مہر ہی
کہیے حاجت اپنی لوگوں سے جوڑے ہوں مال کچھ

کام کو مشکل دلِ پُر آرزو نے کر دیا
یاسِ کلی ہو چکی تو پھر نہیں اشکال کچھ

دل ترا آیا کسو کے پیچ میں جو سدھ گئی
متصل بکھرے رہا کرتے ہیں منہ پر بال کچھ

ماہ سے ماہی تلک اس داغ میں ہیں مبتلا
کیا بلائے جان ہی میرا تمھارا حال کچھ

ایک دن کنجِ قفس میں ہم کہیں رہ جائیں گے
بیکلی گل بن بہت رہتی ہی ابکی سال کچھ

کیا اس آتش باز کے لونڈے کا اتنا شوق میرؔ
بہ چلی ہی دیکھکر اُس کو تمھاری رال کچھ

اب تو صبا چمن سے آتی نہیں ادھر کچھ
ہم تک نہیں پہنچتی گل کی خبر عطر کچھ

ذوقِ خبر میں ہم تو بیہوش ہو گئے تھے
کیا جانے کب وہ آیا ہم کو نہیں خبر کچھ

یہ طشت و تیغ ہی اب یہ میں ہوں اور یہ تو
ہی ساتھ میرے ظالم دعوی تجھے اگر کچھ

وے دن گئے کہ بے غم کوئی گھڑی کٹے تھی
تھمتے نہیں ہیں آنسو اب تو پہر پہر کچھ

ان اُجڑی بستیوں میں دیوار و در ہیں کیا کیا
آثار جن کے ہیں یہ اُن کا نہیں اثر کچھ

واعظ نہ ہو معارض نیک و بدِ جہاں میں
جو ہو سکے تو غافل اپنا ہی فکر کر کچھ

آنکھوں میں میری عالم سارا سیاہ ہی اب
مجھ کو بغیر اُس کے آتا نہیں نظر کچھ

ہم نے تو ناخنوں سے منہ سارا نوچ ڈالا
اب کوہکن دکھاوے رکھتا ہی گر ہنر کچھ

تلوار کے تلے ہی کاٹی ہی عمر ساری
ابروئے خم سے اُس کے ہم کو نہیں ہی ڈر کچھ

گہ شیفتہ ہیں ہو کے گہ باؤلے ہیں رو کے
احوال میرؔ جی کا ہی شام کچھ سحر کچھ

ردیف الیاء

ہم سے دیکھا کہ محبت نے ادا کیا کیا کی
ایک دل قطرۂ خوں تس پہ جفا کیا کیا کی

کس کو لاگی کہ نہ لوہو میں ڈبایا اس کو — اُس کی شمشیر کی جدول بھی بہا کیا کیا کی
جان کے ساتھ ہی آخر مرضِ عشق گیا — جی بھلا ٹک نہ ہوا ہم نے دوا کیا کیا کی
اُس نے چھوڑی نہ طرف جور وجفا کی ہر گز — ہم نے یوں اپنی طرف سے تو وفا کیا کیا کی
سجدہ اک صبح ترے در کا کروں اس خاطر — میں نے محراب میں راتوں کو دُعا کیا کیا کی
آگ سی جھکتی ہی دن رات رہا کی تن میں — جانِ غمناک ترے غم میں جلا کیا کیا کی

میر نے ہونٹھوں سے اُس کے نہ اُٹھایا جی کو
خلق اُس کے تئیں یہ سُن کے کہا کیا کیا کی

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی — دھوم ہے پھر بہار آنے کی
دل کا اُس کنج لب سے دے ہیں نشاں — بات لگتی تو ہے ٹھکانے کی
وہ جو پھرتا ہے مجھ سے دور ہی دور — ہے یہ تقریب جی کے جانے کی
تیز یوں ہی نہ تھی شبِ آتشِ شوق — تھی خبر گرم اُس کے آنے کی
خضر اُس خطِ سبز پر تو مُوا — دُھن ہے اب اپنے زہر کھانے کی
دلِ صد چاک باب زلف ہے لیک — باد سی بندھ رہی ہے شانے کی
ق
کسو کم ظرف نے لگائی آہ — تجھ سے میخانے کے جلانے کی
ورنہ اے شیخ شہر واجب تھی — جام داری شراب خانے کی

جو ہے سو پائمال غم ہے میر
چال بے ڈول ہے زمانے کی

میر دریا ہے سُنے شعر زبانی اُس کی — اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اُس کی
خاطر بادیہ سے دیر میں جاوے گی کہیں — خاک مانند بگولے کے اُڑانی اُس کی
ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج — اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اُس کی
منہ تو بوچھار کا دیکھا ہے برستے تم نے — اسی انداز سے تھی اشک فشانی اُس کی
بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا — پر ملی خاک میں کیا سحر بیانی اُس کی
کرکے تعویذ رکھیں اُسکو بہت بھاتی ہے — وہ نظر پانوں پہ وہ بات دِوانی اُس کی
اُس کا وہ عجز تمھارا یہ غرورِ خوبی — منتیں اُس نے بہت کیں پہ نہ مانی اُس کی
کچھ لکھا ہے تجھے ہر برگ پہ اے رشکِ بہار — رقعہ واریں ہیں یہ اوراق خزانی اُس کی

سرگزشت اپنی کس اندوہ سے شب کہتا تھا
سو گئے تم نہ سُنی آہ کہانی اُس کی

مرثیے دل کے کئی کہہ کے دئیے لوگوں کو
شہرِ دلّی میں ہے سب پاس نشانی اُس کی

میان سے نکلی ہی پڑتی تھی تمھاری تلوار
کیا عوض چاہ کا تھا خصمی جانی اُس کی

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہی
دردمندی میں گئی ساری جوانی اُس کی

اب گئے اُس کے جُز افسوس نہیں کچھ حاصل
حیف صد حیف کہ کچھ قدر نہ جانی اس کی

کی سیر ہم نے سینۂ یکسر فگار کی
اس تختے نے ہے اب کی قیامت بہار کی

دریائے حسنِ یار تلاطم کرے کہیں
خواہش ہے اپنے جی میں بھی بوس وکنار کی

اپنا بھی جی اسیر تھا آواز عندلیب
دل میں چبھا کی رات کو جوں نوک خار کی

آنکھیں غبار لائیں مری انتظار میں
دیکھوں تو گرد کب اٹھے اُس رہ گزار کی

مقدور تک تو ضبط کروں ہوں پہ کیا کروں
منہ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی

اب گرد سر پھروں ترے ہوں میں فقیرِ محض
رکھتا تھا ایک جان سو تجھ پر نثار کی

کیا صید کی تڑپ کو اُٹھائے دماغِ یار
نازک بہت ہے طبع مرے دل شکار کی

رکھتا نہیں طریقِ وفا میں کبھو قدم
ہم کچھ نہ سمجھے راہ وروش اپنے یار کی

کیا جانوں چشم ترسے اُدھر دل پہ کیا ہوا
کس کو خبر ہے میر سمندر کے پار کی

پٹہ بازی[۵۱] سے چرخِ گرداں کی
سر ہمارے ہیں گوے میداں کی

جی کیا اُس کے تیر کے ہمراہ
تھی تواضع ضرور مہماں کی

ہیں لئے آبروے خنجر و تیغ
ترچھی پلکیں تری بھویں بانکی

پھوڑ ڈالیں گے سر ہی اُس در پر
منت اُٹھتی نہیں ہے درباں کی

سرِ دامن سے گفتگو کر لے
بات بگڑی لبِ گریباں کی

اُس بتِ شوخ کی ہے طینت میں
دشمنی میر سے دین و ایماں کی

آدمی سے ملک کو کیا نسبت
شان ارفع ہے میر انساں کی

[۵۱] پٹہ بازی چرخ - پٹہ بازی فن معروف کا نام ہے -

رکھا گنہ وفا کا تقصیر کیا نکالی / مارا خراب کر کر تعذیر کیا نکالی
رہتی ہی چپت چڑھی ہی دن رات تیری صورت / صفحے پہ دل کے میں نے تصویر کیا نکالی
چپ بھی مری جتائی اس سے مخالفوں نے / بات اور بھی بنائی تقریر کیا نکالی
بس تھی ہمیں تو تیری ابرو کی ایک جنبش / خوں ریزی کو ہماری شمشیر کیا نکالی
کی اس طبیبِ جاں نے تجویز مرگِ عاشق / آزار کے مناسب تدبیر کیا نکالی
دل بند ہی ہمارا موجِ ہوائے گل سے / اب کی جنوں میں ہم نے زنجیر کیا نکالی

نامہ پہ لوہو رو رو خط کھینچ ڈالے سارے
یہ میر بیٹھے بیٹھے تحریر کیا نکالی

جی رشک سے گئے جو ادھر کو صبا چلی / کیا کہیے آج صبح عجب کچھ ہوا چلی
کیا رنگ و بو و بادِ سحر سب ہیں گرم راہ / کیا ہی جو اس چمن میں ہی ایسی چلا چلی
تو دو قدم جو راہ چلا گرم اے نگار / مہندی کفک کی آگ دلوں میں لگا چلی
فتنہ ہی اس سے شہر میں برپا ہزار جا / تلوار اس کی چال پہ کیا ایک جا چلی

یہ جور و جور کش تھے کہاں لگے عشق میں
تجھ سے جفا و میر سے رسمِ وفا چلی

آج کچھ بے حجاب ہی وہ بھی / کیا ہی مستِ شراب ہی وہ بھی
میں بھی جلتا نہیں جدا دل سے / دور مجھ سے کباب ہی وہ بھی
سائلِ بوسہ سب گئے محروم / ایک حاضر جواب ہی وہ بھی
وہم جس کو محیط سمجھا ہی / دیکھیے تو سراب ہی وہ بھی
کم نہیں کچھ صبا سے اشکِ گرم / قاصدِ پُر شتاب ہی وہ بھی
حسن سے دودِ دل نہیں خالی / زلفِ پر پیچ و تاب ہی وہ بھی

خانہ آباد کعبے میں تھا میر
کیا خدائی خراب ہی وہ بھی

دزدیدہ نگہ کرنا پھر آنکھ ملانا بھی / اس لوٹتے دامن کو پاس آکے اٹھانا بھی
پامالی عاشق کو منظور رکھے جانا / پھر چال کڈھب چلنا ٹھوکر نہ لگانا بھی
برقع کو اٹھا دینا پر آدھے ہی چہرے سے / کیا منہ کو چھپانا بھی کچھ جھمکی دکھانا بھی

دیکھ آنکھیں مری نیچی اک مارنا پتھر بھی
ظاہر میں ستانا بھی پردے میں جتانا بھی

صحبت ہے یہ ویسی ہی اے جان کی آسایش
ساتھ آن کے سونا بھی پھر منہ کو چھپانا بھی

یار بن تلخ زندگانی تھی
دوستی مدعی جانی تھی

سر سے اُس کے ہوا گئی نہ کبھو
عمر برباد یوں ہی جانی تھی

لطف پر اُس کے ہمنشیں مت جا
کبھو ہم پر بھی مہربانی تھی

ہاتھ آتا جو تو تو کیا ہوتا
برسوں تک ہم نے خاک چھانی تھی

شیب میں فائدہ تامل کا
سوچنا تب تھا جب جوانی تھی

میرے قصے سے سب کی گئیں نیندیں
کچھ عجب طور کی کہانی تھی

عاشقی جی ہی لے گئی آخر
یہ بلا کوئی ناگہانی تھی

اُس رُخ آتشیں کی شرم سے رات
شمع مجلس میں پانی پانی تھی

پھر سخن نشنوی ہے ویسی ہی
رات اک اَدھ بات مانی تھی

کوئے قاتل سے بچ کے نکلا خضر
اسی میں اُس کی زندگانی تھی

فقر پر بھی تھا میر کے اک رنگ
کفنی پہنی سو زعفرانی تھی

وہ رابطہ نہیں وہ محبت نہیں رہی
اُس بے وفا کو ہم سے کچھ الفت نہیں رہی

دیکھا تو مثلِ اشک نظر سے گرا دیا
اب میری اُس کی آنکھ میں عزت نہیں رہی

رندھنے سے جی کے کس کو رہا ہے دماغ حرف
دم لینے کی بھی ہم کو تو فرصت نہیں رہی

تھی تاب جی میں جب تئیں رنج و تعب کھنچے
وہ جسم اب نہیں ہے وہ قدرت نہیں رہی

منعم اَمل کا طول یہ کس جینے کے لئے
جتنی گئی اب اتنی تو مدت نہیں رہی

دیوانگی سے اپنی ہے اب ساری بات خبط
افراط اشتیاق سے وہ مت نہیں رہی

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

عشق میں ذلت ہوئی خفت ہوئی تہمت ہوئی زحمت
آخر آخر جان دی یاروں نے یہ صحبت ہوئی

عکس اس بے دید کا تو متصل پڑتا تھا صبح
دن چڑھے کیا جانوں آئینے کی کیا صورت ہوئی

لوحِ سینہ پر مرے سو نیزہ خطی لگے
خستگی اس دل شکستہ کی اسی بابت ہوئی

کھولتے ہی آنکھیں پھر یہاں موندنی ہم کو پڑیں
دید کیا کوئی کرے وہ کس قدر مہلت ہوئی

پاؤں میرا کلبۂ احزاں میں اب رہتا نہیں
رفتہ رفتہ اس طرف جانے کی مجھ کو لت ہوئی

مر گیا آوارہ ہو کر میں تو جیسے گرد باد
پر جسے یہ واقعہ پہنچا اُسے وحشت ہوئی

شاد و خوش طالع کوئی ہوگا کسو کو چاہ کر
میں تو کلفت میں رہا جب سے مجھے اُلفت ہوئی

دل کا جانا آجکل تازہ ہوا ہو تو کہاں
گزرے اس بھی سانحے کو ہمنشیں مدت ہوئی

شوقِ دل ہم ناتوانوں کا لکھا جاتا ہے کب
اُس تلک آہی پہنچنے کی اگر طاقت ہوئی

کیا کفِ دست ایک میداں تھا بیاباں عشق کا
جان سے جب اس میں گزرے تب نہیں راحت ہوئی

یوں تو ہم عاجز ترینِ خلقِ عالم ہیں ولے
دیکھیو قدرت خدا کی گر ہمیں قدرت ہوئی

گوش زد چٹ پٹ ہی مرنا عشق میں اپنا ہوا
کس کو اس بیماریِ جانکاہ سے فرصت ہوئی

بے زباں جو کہتے ہیں مجھ کو سو چپ رہ جائیں گے
معرکہ میں حشر کے گر بات کی رخصت ہوئی

ہم نہ کہتے تھے کہ نقش اس کا نہیں نقاش سہل
چاند سارا لگ گیا تب نیم رُخ صورت ہوئی

اس غزل پر شام سے تو صوفیوں کو وجد تھا
پھر نہیں معلوم کچھ مجلس کی کیا حالت ہوئی

کم کسو کو میر کی میت کی ہاتھ آئی نماز
نعش پر اُس بے سر و پا کی بلا کثرت ہوئی

قوت کو پیرانہ سر دلی میں حیرانی ہوئی
ہجی جو آئے سفر سے خوب مہمانی ہوئی

باؤلے سے جب تلک بکتے تھے سب کرتے تھے پیار
عقل کی باتیں کیاں کیا ہم سے نادانی ہوئی

لوہو پانی ایک دونوں نے کیا میرا ندان
یعنی دل لوہو ہوا سب چشم سب پانی ہوئی

کیا چھپا کچھ رہ گیا ہے مدعائے خطِ شوق
رقعہ وار اب اشکِ خونیں سے تو افشانی ہوئی

آنکھ اُٹھا کر ٹک جو دیکھا گھر کے گھر بٹھلا دئے
اک نگہ میں سیکڑوں کی خانہ ویرانی ہوئی

مرتبہ واجب کا سمجھے آدمی ممکن نہیں
فہم سودائی ہوا یہاں عقل دیوانی ہوئی

چاہ کر اس بے وفا کو آخر اپنی جان دی
دوستی اُس کی ہماری دشمنِ جانی ہوئی

بلبل اس خوبی سے گل ہے سیتا سیمائی یار
تو عبث اے بے حقیقت غنچہ پیشانی ہوئی

فیضِ مت یاد بتاں کو رات کا سا ذکر جان
یہ صنم گوئی ہماری کیا خدا خوانی ہوئی

غنچۂ گل ہے گلابی پھول ہے جامِ شراب
توڑنے تو توڑی توبہ اب پشیمانی ہوئی

چشم ہوتے ہوتے تر کچھ سب بھری رہنے لگی | اب ہوئی خطرے کی جاگہ کشتی طوفانی ہوئی
دل تڑپتا تھا نہایت جان دے تسکیں کی | بارے اپنی ایسی مشکل کی بھی آسانی ہوئی

جب سے دیکھا اس کو ہم نے جی ڈہا جاتا ہے میر
اس خرابی کی یہ چشم روسیہ بانی ہوئی

بتوں سے آنکھ کیوں میں نے لڑائی | طرف ہی مجھ سے اب ساری خدائی
نرا دھوکا ہی ہے دریائے ہستی | نہیں کچھ تہ سے تجھ کو آشنائی
بگڑتی ہی گئی صورت ہماری | گئے پر دل کے پھر کچھ بن نہ آئی
نہ نکلا ایک شب اس راہ وہ ماہ | بہت کی ہم نے طالع آزمائی
کہا تھا میں نہ دیکھوں غیر کی اور | سو تم نے آنکھ مجھ سے ہی چھپائی
نہ ملئے خاک میں کہ کیونکہ پیارے | گزرتی ہے کڑی تیری جدائی
جفا اُس کی نہ پہنچی انتہا کو | دریغا عمر نے کی بے وفائی
گلے اُس مہ نے لگ کر ایک دو رات | مہینوں تک مری چھاتی جلائی
نہ تھا جب درمیاں آئینہ تب تک | تھی اک صورت کہ ہو جائے صفائی
نظر اُس کی پڑی چہرہ پر اپنے | نمد پوشوں سے آنکھ اب کب ملائی

بڑھائی کس قدر بات اُس کے قد کی
قیامت میر صاحب ہیں جوائی[1]

مطرب سے[2] غزل میر کی کل میں نے پڑھائی | ق اللہ رے اثر سب کے تئیں رفتگی آئی
اس مطلع جاں سوز نے آ اُس کے لبوں پر | کیا کہیے کہ کیا صوفیوں کی چھاتی جلائی
خاطر کے علاقہ کے سبب جان کھپائی | اس دل کے دھڑکنے سے عجب کوفت اُٹھائی
گو اُس رخِ مہتابی سے وھاں چاندنی چھٹکی | یھاں رنگ شکستہ سے بھی چھٹتی ہے ہوائی
ہر بحر میں اشعار کے عمر کو کھویا | اس گوہرِ نایاب کی کچھ بات نہ پائی
بھیڑیں تلیں اس ابروئے خمدار کے ہلتے | لاکھوں میں اُس اوباش نے تلوار چلائی
دل اور جگر جل کے مرے دونوں ہوئے خاک | کیا پوچھتے ہو عشق نے کیا آگ لگائی

۱؎ جوائی۔ باہمت۔ دلیر، جیالا ۲؎ میر تقی میر دہلوی: مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میر کی شب کو، مجلس میں بہت وجد کا عالم رہا سب کو

قاصد کے تصنع نے کیا دل کے تئیں داغ
بیتاب مجھے دیکھ کے کچھ بات بنائی

جھپکی ہے مری آنکھ لبِ لعل بتاں سے
اس بات کے تئیں جانتی ہے ساری خدائی

ہیں دیر پہنچ کے نہ کیا قصدِ حرم پھر
اپنی سی جرس نے کی بہت ہرزہ درائی

فریاد انھیں رنگوں ہے گلزار میں ہر صبح
بلبل نے مری طرزِ سخن صاف اڑائی

مجلس میں مرے ہوتے رہا کرتے ہو چپکے
یہ بات مری ضد سے تمھیں کن نے بتائی

گردش میں جو ہیں میرؔ مہ و مہر ستارے
دن رات ہمیں رہتی ہے یہ چشم نمائی

تجھ کنے بیٹھے گھٹا جاتا ہے جی
کاہشیں کیا کیا اٹھا جاتا ہے جی

یوں تو مردے سے پڑے رہتے ہیں ہم
پر وہ آتا ہے تو آ جاتا ہے جی

ہائے اس کے شربتی لب سے جدا
کچھ بتاسا سا گھلا جاتا ہے جی

اب کی اس کی راہ میں جو ہو سو ہو
یاد بھی آتا ہے یا جاتا ہے جی

کیا کہیں تم سے کہ اس شعلے بغیر
جی ہمارا پھر چلا جاتا ہے جی

عشق آدم میں نہیں کچھ چھوڑتا
ہولے ہولے کوئی کھا جاتا ہے جی

اٹھ چلے پر اس کے غش کرتے ہیں ہم
یعنی ساتھ اس کے چلا جاتا ہے جی

نہیں پھرتا وہ مرتے وقت بھی
حیف ہے اس میں رہا جاتا ہے جی

رکھتے تھے کیا کیا بنائیں پیشتر
سو تو اب آپھی ڈہا جاتا ہے جی

آسماں شاید درے کچھ آگیا
رات سے کیا کیا رکا جاتا ہے جی

کاشکے برقع رہے اس رخ پہ میرؔ
منہ کھلے اس کے چھپا جاتا ہے جی

متاعِ دل اس عشق نے سب جلا دی
کوئی دن ہی میں خاک سی سب اڑا دی

دلیل اس بیاباں میں دل ہی ہے اپنا
نہ خضر و بلد یہاں نہ رہبر نہ ہادی

مزاجوں میں یاس آ گئی ہے ہمارے
نہ مرنے کا غم ہے نہ جینے کی شادی

نہ پوچھو کہ چھاتی کے جلنے نے آخر
عجب آگ دل میں جگر میں لگا دی

وفا لوگ آپس میں کرتے تھے آگے
یہ رسمِ کہن آہ تم نے اٹھا دی

جدا ان غزالانِ شہری سے ہو کر
پھرے ہم بگولے سے وادی بہ وادی

[1] زندگی نے جی کے خاک میں بگولا دیا [2] گویا کہ آسمان بہت آگیا درے۔ (میر)

صبا اس طرف کو چلی جل گئے ہم — ہوا یہ سبب اپنے مرنے کا بادی
وہ نسخہ جو دیکھا بڑھا روگ دل کا — طبیبِ محبت نے کیسی دوا دی
ملے قصرِ جنت میں پیرِ مغاں کو — ہمیں زیرِ دیوارِ مے خانہ جا دی
نہ ہو عشق کا شور تا میر ہرگز
چلے بس تو شہروں میں کریے منادی

صبح ہے کوئی آہ کریجے — آسماں کو سیاہ کر لیجے
چشمِ گل باغ میں مندی جا ہے — جو بنے اک نگاہ کر لیجے
ابرِ رحمت ہے جوش میں مے دے
یعنی ساقی گناہ کر لیجے

یک مژہ اے دمِ آخر مجھے فرصت دیجے — چشمِ بیمار کے دیکھ آنے کی رخصت دیجے
تو گرفتار ہوں اس باغ کا رحم اے صیاد — موسمِ گل ہے جب تک مجھے مہلت دیجے
اپنے ہی دل کا گنہ ہے جو جلاتا ہے مجھے — کس کو لے مریے میاں اور کسے تہمت دیجے
چھوٹے ہیں قیدِ قفس سے تو چمن تک پہنچے — اتنی اے ضعفِ محبت ہمیں طاقت دیجے
مر گیا میر نہ آیا ترے جی میں اے شوخ
اپنے محنت زدہ کو بھی کبھی راحت دیجے

گر ناز سے وہ سر پر لے تیغ آ نہ پہنچے — منزل کو عاشق اپنے مقصد کی جا نہ پہنچے
جیتے رہیں گے کیونکر ہم اے طبیبِ ناداں — بیمار ایسے لب پر مطلق دوا نہ پہنچے
لایق ترے نہیں ہے خصلی غیر لیکن — وہ باز کیونکر آوے جب تک سزا نہ پہنچے
ہر چند بہرِ خوباں سر مسجدوں میں مارے — پر اُن کے دامنوں تک دستِ دعا نہ پہنچے
بن آہ دل کا رکنا بیجا نہیں ہمارا — کیا حال ہووے اُس کا جس کو ہوا نہ پہنچے
اپنے سخن کی اُس سے کس طور راہ نکلے — خط اس طرف نہ جاوے قاصد کو کیا نہ پہنچے
وہ میر شاہِ خوبی پھر قدر دور اس کی
درویش بے نوا کی اُس تک صدا نہ پہنچے

اک شور ہو رہا ہے خونریزی میں ہمارے — حیرت نے ہم تو چپ ہیں کچھ تم بھی بولو پیارے
زخم اُس کے ہاتھ کے جو سینہ پہ ہیں نمایاں — چھاتی لگے رہیں گے زیرِ زمیں بھی تارے

ہیں بد مزاج خوباں پر کس قدر ہیں دلکش
پائے کہاں گلوں نے یہ گھڑے پیارے پیارے

بیٹھیں ہیں پر رونے کو تو دریا ہی رو اٹھیں ہیں
جوش و خروش یہ تھے تب ہم لگے کنارے

لاتے نہیں ہو مطلق سر تم فرو خدا سے
یہ ناز خوبرویاں بندے ہیں ہم تمھارے

کوئی تو ماہ پارہ اس بھی رواق میں ہی
چشمک زنی ہیں شب کو یوں ہی نہیں ہیں تارے

لگ کر گلے نہ سوئے اس منہ پہ منہ نہ رکھا
جی سے گئے ہم آخر ان حسرتوں کے مارے

بیتابی ہی دلوں کو بیخوابی ہی شبوں کو
آرام و صبر دونوں مدت ہوئی سدھارے

آفاق میں جو ہوتے اہلِ کرم تو سنتے
ہم برسوں رعد آسا بیتاب ہو پکارے

جل بجھیے اب تو بہتر مانندِ برقِ خاطف
جوں ابر کس کے آگے دامن کوئی پسارے

ہم نے تو عاشقی میں کھویا ہی جان کو بھی
صدقے ہیں میر جی کے دے ڈھونڈتے ہیں وارے

میر ایک دم نہ اُس بن تو تو جیا پیارے
کیا کہہ کے تجھ کو روویں یہ کیا کیا پیارے

رنگیں ہم تو تجھ کو ایسا نہ جانتے تھے
تو نے تو عاشقوں کا لوہو پیا پیارے

دل کے تو زخم کا کچھ ہوتا نہیں تدارک
گو چاک سینہ تو نے میرا سیا پیارے

اس دام گاہ میں ہم جوں صید نیم بسمل
تڑپے بہت پہ تو نے کب دل لیا پیارے

ہو داغ میر تجھ بن مر بھی گیا و لے تو
آیا نہ گور پر ٹک سے کر دیا پیارے

سیر کی ہم نے ہر کہیں پیارے
پھر جو دیکھا تو کچھ نہیں پیارے

خشک سال وفا میں اک مدت
پلکیں لوہو میں تر رہیں پیارے

یک نظر دیکھنے کی حسرت میں
آنکھیں تو پانی ہو بہیں پیارے

پہنچی ہی ضعف سے یہ اب حالت
جہاں پہنچا رہا وہیں پیارے

تجھ گلی میں رہے ہی میر مگر
دیکھیں ہیں جب نہ تب نہیں پیارے

اسیرِ زلف کرے قیدی کمند کرے
پسند اُس کی ہی وہ جس طرح پسند کرے

ہمیشہ چشم ہی نمناک ہاتھ دل پر ہی
خدا کسو کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے

بڑوں بڑوں کو جھکاتے ہی سر نے اس دم
پکڑ کے تیغ وہ اپنی اگر بلند کرے

ابیان دل کے بھی جلنے کو کرے مجلس میں
اُچھلنے کودنے کو ترک اگر پسند کرے

نہ مجھ کو راہ سے لے جائے مکرِ دُنیا کا
ہزار رنگ یہ فرتوت گو چھچھند کرے

سوائے اس کے بڑی ڈاڑھی میں ہی کیا ای شیخ
کہ جو کوئی تجھے دیکھے سو ریشخند کرے

دکھاوے آنکھ کبھو زلف کھولے منہ پہ کبھو
کبھو خرام سے رستے کے رستے بند کرے

اگرچہ سادہ ہی لیکن ربودن دل کو
ہزار پیچ کرے لاکھ لاکھ فند کرے

سخن یہی ہی جو کہتے ہیں شعر میرؔ ہی سحر
زبانِ خلق کو کس طور کوئی بند کرے

آہ روکوں جانے والے کس طرح گھر کے ترے
گاڑ دیویں کاش مجھ کو بیچ میں در کے ترے

لالۂ و گل کیوں نہ پھیکے اپنی آنکھوں میں لگیں
دیکھنے والے ہیں ہم تو رنگِ احمر کے ترے

بے پر و بالی سے ابکی تو کہ بلبل تو ہی چپ
یاد ہیں سب کے تئیں وے چہچہے پر کے ترے

آج کا آیا تجھے کیا پاوے ہم حیران ہیں
ڈھونڈنے والے جو ہیں ای شوخ اکثر کے ترے

دیکھ اس کو حیف کھاکر سب بجھے کہنے لگے
ولے تو گر ہیں یہی اطوار دلبر کے ترے

تازہ تر ہوتے ہیں تو گل سے بھی ای نازک نہال
صبح اُٹھتے ہیں بچھے جو پھول بستر کے ترے

مشکِ عنبر طبلہ طبلہ کیوں نہ ہو کیا کام ہی
ہم دماغ آشفتہ ہیں زلفِ معنبر کے ترے

جی میں وہ طاقت کہاں جو ہجر میں سنبھلے رہیں
اب ٹھہرتے ہی نہیں ہیں پاؤں تک سر کے ترے

داغ پیسے سے جو ہیں بلبل کے دل پر کس کے ہیں
یوں تو ای گل ہیں ہزاروں آشنا در کے ترے

کوئی آبِ زندگی پیتا ہی یہ زہراب چھوڑ
خضر کو ہنستے ہیں سب مجروح خنجر کے ترے

نوحؔ کا طوفاں ہماری کب نظر چڑھتا ہی میرؔ
جوش ہم دیکھے ہیں کیا کیا دیدۂ تر کے ترے

مت سہل سمجھو ایسے ہیں ہم کیا ورے دھرے
ظاہر تو پاس بیٹھے ہیں پر ہیں بہت پرے

سختی بہت ہی پاس و مراعاتِ عشق میں
پتھر کے دل جگر ہوں تو کوئی وفا کرے

خالی کروں ہوں رو رو کے راتوں کو دل کے تئیں
انصاف کر کہ یوں کوئی دن کب تلک بھرے

رندھنے نے جی کے خاک میں ہم کو ملا دیا
گویا کہ آسمان بہت آ گیا ورے

داڑھی کو تیری دیکھ کے ہنستے ہیں لڑکے شیخ
اس ریشخند کو بھی سمجھ ٹک تو مسخرے

جل تھل فقط نہیں مرے رونے سے بھر گئے
جنگل پڑے تھے سوکھے سو وہ بھی ہوئے ہرے

جی کو بچا رکھیں گے تو جانیں گے عشق میں
ہر چند میر صاحب قبلہ ہیں منگرے

بو کئے کھلائے جاتے ہو نزاکت ہائے رے
ہاتھ لگتے میلے ہوتے ہو لطافت ہائے رے

یار بے پروا و مفتر اور میں بے اختیار
پیش کچھ جاتی نہیں منت سماجت ہائے رے

سختی کھینچی کوہکن نے قیس نے رنج و تعب
کیا گئی برباد ان یاروں کی محنت ہائے رے

شور اٹھتا ہی جو ہوتے جلوہ گر ہو ناز سے
پینچنا (کھینچنا) قد کا بلا آفت قیامت ہائے رے

نافہ والے ہی کچھ تنہا نہیں الفت میں خوار
کیسے کیسوں کی گئی ہی مفت عزت ہائے رے

عشق میں افسوس سا افسوس اپنا کر چلے
زیر لب کہتے رہے ہم ایک مدت ہائے رے

دیکھنے ہی کے ہی قابل یار کی ترکیب میر
واہ وا رے چشم و ابرو قد و قامت ہائے رے

وہی شورش ہوے پر بھی ہی اک ساتھ یہاں میرے
ہما کے آشیانے میں جلیں ہیں استخواں میرے

عزیزان غم میں اپنے یوسف گم گشتہ کے ہر دم
چلے جاتے ہیں آنسو کارواں در کارواں میرے

تمھاری دشمنی ہم دوستوں سے لانہایت ہی
وگرنہ انتہا کینے کو بھی ہے مہرباں میرے

لب و لہجہ غزلخوانی کا کس کو آج کل ایسا
گھڑی بھر کو ہوئے مرغ چمن ہم داستاں میرے

نظر ہست بے پڑی پر گرکہ آنسوئے جہاں پھر ہوں
ہوئے پرواز کے قابل یہ ٹوٹے پر جہاں میرے

کہاں تک سر کو دیواروں سے یوں مارا کرے کوئی
رکھوں اس در پہ پیشانی نصیب اپنے کہاں میرے

مجھے پامال کر یکساں کیا ہی خاک سے تو بھی
وہی رہتا ہی صبح و شام درپے آسماں میرے

خزاں کی باؤ سے حضرت میں گلشن کے تطاول تھا
تبرک ہو گئے یک دست خار آشیاں میرے

کہاں ہیں شوق میں طفلان تہ بازار کے کیا کیا
سخن مشتاق ہیں اب شہر کے پیر و جواں میرے

زمیں سر پہ اٹھالی کبک نے رفتار رنگیں سے
خراماں ناز سے ہو تو بھی ای سرو رواں میرے

سخن کیا میر کریے حسرت و اندوہ حرماں سے
بیاں حاجت نہیں حالات ہیں سارے عیاں میرے

بہار آئی ہی غنچے گل کے نکلے ہیں گلابی سے
نہال سبز جھومے ہیں گلستاں میں شرابی سے

گراں ہوں ہر قدم پر میں ڈہا جاتا ہی جی ہر دم
پہنچتا ہوں کبھو در پر ترے سو اس خرابی سے

نہ ٹھہری ایک بھی چشمک بسان برق آنکھوں میں
کلیجہ جل گیا ای عمر تیری تو شتابی سے

نکل آتے ہو گھر سے چاند سے یہ کیا طرح پکڑی
قیامت ہو رہے گی ایک دن اس بے حجابی سے

یہ جھگڑا تنگ آکر میں رکھا روزِ شمار پر
کروں کیا تم تو لڑنے لگتے ہو حرف شتابی سے

بہت رویا نوشتے پر میں اپنے دیکھ قاصد کو
کہ سر ڈالے غریب آتا تھا خط کی بے جوابی سے

مبادا کارواں جاتا ہے تو صبح سوتا ہے
بہت ڈرتا ہوں میں اے میرؔ تیری دیر خوابی سے

کعبے میں جاں بلب تھے ہم دوریِ بتاں سے
آئے ہیں پھر کے یارو اب کے خدا کے ہاں سے

تصویر کے سے طایر خاموش رہتے ہیں ہم
جی کچھ اچٹ گیا ہے اب نالہ و فغاں سے

جب کوندتی ہے بجلی تب جانبِ گلستاں
رکھتی ہے چھیڑ میری خاشاکِ آشیاں سے

کیا خوبی اس کے منہ کی اے غنچہ نقل کریے
تو تو نہ بول ظالم بو آتی ہے دہاں سے

آنکھوں ہی میں رہے ہو دل سے نہیں گئے ہو
حیران ہوں یہ شوخی آئی تمھیں کہاں سے

سبزانِ باغ سارے دیکھے ہوئے ہیں اپنے
دلچسپ کاہے کو ہیں اس بیوفا جواں سے

کی شست و شو بدن کی جس دن بہت سی ان نے
دھوئے تھے ہاتھ میں نے اس دن ہی اپنی جاں سے

خاموشی ہی میں ہم نے دیکھی ہے مصلحت اب
ہر اک سے حال دل کا مدت کہا زباں سے

اتنی بھی بدمزاجی ہر لحظہ میرؔ تم کو
الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

کرتا ہے کب سلوک وہ اہلِ نیاز سے
گفتار اس کی کبر سے رفتار ناز سے

یوں کب ہمارے آنسو پچھیں ہیں کہ تو نے شوخ
دیکھا کبھو ادھر مژۂ نیم باز سے

خاموش رہ سکے نہ تو بڑھ کر بھی کچھ نہ کہہ
سر شمع کا کٹے ہے زبانِ دراز سے

اب جا کسو درخت کے سایے میں بیٹھیے
اس طور پھر لیے کب تئیں برگ و ساز سے

یہ کیا کہ دشمنوں میں مجھے سانتنے لگے
کرتے کسو کو ذبح بھی تو امتیاز سے

مانند شمع ٹپکے ہی پڑتے ہیں اب تو اشک
کچھ جلتے جلتے ہو گئے ہیں ہم گداز سے

شاید کہ آج رات کو تھے میکدے میں میرؔ
کھیلے تھا ایک مغبچہ مہرِ نماز سے

تابوت مرا دیر اٹھا اس کی گلی سے
اثبات ہوا جرم محبت کا اسی سے

تم چھیڑتے ہو بزم میں مجھ کو تو ہنسی سے
پر مجھ پہ جو ہو جائے ہے پوچھو مرے جی سے

[۱] آتش بجگر اس دُرِ نایاب سے سب ہیں | دریا بھی نظر آئے اُسی خشک لبی سے

گر ٹھہرے ملک آگے انھوں کے تو عجب ہے | پھرتے ہیں پڑے دلّی کے لونڈے جو پری سے

نکلا جو کوئی واں سے تو پھر مر ہی کے نکلا | اس کوچے سے جاتے ہوئے دیکھا کسے جی سے

ہمسائے بے مجھے رات کو رویا ہی کرے ہیں | سوتے نہیں بیچارے مری نالہ کشی سے

تم نے تو ادھر دیکھنے کی کھائی ہے سوگند | اب ہم بھی لڑا بیٹھتے ہیں آنکھ کسی سے

چھاتی کہیں پھٹ جائے کہ ٹک دل بھی ہوا کھائے | اب دم تو لگے رکنے ہماری خفگی سے

اس شوخ کا تمکین سے آنا ہے قیامت | اُکتانے لگے ہمنفساں تم تو ابھی سے

نالاں مجھے دیکھے ہیں بتاں تسپہ ہیں خاموش | فریاد ہے اس قوم کی فریاد رسی سے

تالو سے زباں رات کو مطلق نہیں لگتی | عالم ہے سیہ خانہ مری نوحہ گری سے

بے رحم وہ تجھ پاس لگا بیٹھنے جب دیر
ہم میر سے دل اپنے اٹھائے تبھی سے

کیا خور ہو طرف یار کے روشن گہری سے | مانا ہے حضور اس کے چراغ سحری سے

سبزانِ چمن ہوویں برابر ترے کیونکر | لگتا ہے ترے سایہ کو بھی ننگ پری سے

ہشیار کہ ہے راہ محبت کی خطرناک | مارے گئے ہیں لوگ بہت بے خبری سے

یک آن میں رعنائیاں تیری تو ہیں سو سو | کب عہدہ برآئی ہوئی اس عشوہ گری سے

زنجیر تو پاؤں میں لگی رہنے ہمارے | کیا اور ہو رسوا کوئی آشفتہ سری سے

جب لب ترے یاد آتے ہیں آنکھوں سے ہماری | تب ٹکڑے نکلتے ہیں عقیقِ جگری سے

عشق آنکھوں کے نیچے کئے کیا میر چھپے ہے
پیدا ہے محبت تری مژگاں کی تری سے

[۱] برسوں ہوئے گئے ہوئے اس مہ کو بام سے | کاہش مجھے جو ہے وہی ہوتی ہے شام سے

تڑپے اسیر ہوتے جو ہم اک اٹھا غبار | سوجھا نہ ہم کو دیر تلک چشم دام سے

دنبال ہر نگاہ ہے صد کاروانِ اشک | برسے ہے چشم ابر بڑی دھوم دھام سے

محو اس دہانِ تنگ کے ہیں کوئی کچھ کہو | رہتا ہے ہم کو عشق میں کام اپنے کام سے

۱ میر تقی میر دہلوی ۔ کار دل اس مہ تمام سے ہے ۔ کاہش اک روز مجھ کو شام سے ہے

یوسف کے پیچھے خوار زلیخا عبث ہوئی
کب صاحبی رہے ہے دل ایسے غلام سے

لڑکے ہزار جھولی میں پتھر لئے ہیں ساتھ
مجنوں پھرا ہے کاہیکو اس ازدحام سے

وہ ناز سے چلا کہیں تو حشر ہو چکی
پھر بحث آ پڑے گی اسی کے خرام سے

جھک جھک سلام کرنے سے سرکش ہوا وہ اور
ہو بیٹھے ناامید جوابِ سلام سے

وے دن گئے کہ رات کو یک جا معاش تھی
آتا ہے اب تو ننگ اسے میرے نام سے

سرگرم جلوہ بدر ہو ہر چند شب کو لیک
کب جی لگیں ہیں اپنے کسو ناتمام سے

دل اور عرش دونوں پہ گویا ہے اُن کی سیر
کرتے ہیں باتیں میرؔ جی کس کس مقام سے

وہ کہاں دھوم جو دیکھی گئی چشم تر سے
ابر کیا کیا اُٹھے ہنگامے سے کیا کیا برسے

ہو برافروختہ وہ بت جو مئے احمر سے
آگ نکلے ہے تماشہ کے تئیں پتھر سے

ڈھب کچھ اچھا نہیں برہم زدنِ مژگاں کا
کاٹ ڈالے گا گلا اپنا کوئی خنجر سے

تھا نوشتے میں کہ یوں سوکھ کے مریے اُس بن
استخواں تن پہ نمودار ہیں سب مسطر سے

یوں تو دس گز کی زباں ہم بھی تباں رکھتے ہیں
بات کو طول نہیں دیتے خدا کے ڈر سے

سیر کرنے جو چلے ہے کبھو وہ فتنہ خرام
شہر میں شور قیامت اٹھے ہے ہر گھر سے

عشق کے کوچہ میں پھر پاؤں نہیں رکھنے کے ہم
ابکی ٹل جاتی ہے کل وُل پہ اگر سر پر سے

مہر کی اُس سے توقع غلطی اپنی تھی
کہیں دلداری ہوئی بھی ہے کسو دلبر سے

کوچۂ یار ہے کیا طرفہ بلاخیز مقام
آتے ہیں فتنہ و آشوب چلے اودھر سے

ساتھ سونا جو گیا اُس کا بہت دل تڑپا
برسوں پھر میرؔ یہ پہلو نہ لگے بستر سے

مرا دل پیر مرشد ہے مجھے ہے اعتقاد اس سے
فراموش آپ کو کرنا محبت میں ہے یاد اس سے

بلا انداز ہے اُس کا قیامت ناز ہے اُس کا
اُٹھے فتنے ہزار اس سے ہوئے لاکھوں فساد اس سے

نزاکت جیسی ہے ویسا ہی دل بھی سخت ہے اُس کا
اگر یہ شیشۂ جاں ہے پہ بہتر ہے جماد اس سے

کسے ہیں بند اُن نے کیسے کس درویش سے ملیے
جو ایسے سخت عقدوں کی طلب کریے کشاد اس سے

بھلا یوں گھٹ کے مریے کب تلک دل خوں ہوا سارا
جو کوئی دادگر ہووے تو کریے جا کے داد اس سے

لگے ہی ایک و رہتے ہیں جہلت بات کی کیسی
ہوا ہے دشمنوں کو کچھ قیامت اتحاد اس سے

پہنچکر تہ کو ہم تو محض محرومی ہی پاتے ہیں
مُرادِ دل کو پہنچا ہوگا کوئی نامراد اس سے

لئے ہی میاں سے رہتا ہے کوئی یہ نہیں کہتا
نکالا ہے کہاں کا تونے اے ظالم عناد اس سے

ادھر تو بہ کریب ہے میر اُدھر لگتا ہے می پینے
کہاں تک ابتو اپنا اُٹھ گیا ہے اعتماد اس سے

بُرا کیا مانئے اب چھیڑے یا اُس کی گالی سے
یہی ہے طور اس کا ساتھ لینے خُرد سالی سے

کلی بیرنگ مرجھائی نظر آتی ہے ظاہر ہے
ہماری بیکلی گلہائے تصویرِ نہالی سے

بھری آنکھیں کسو کی پونچھتے جو آستیں رکھتے
ہوئی شرمندگی کیا کیا ہمیں اِس دستِ خالی سے

جو مر رہیے بھی تنگ آکر تو پروا کچھ نہ ہو اس کو
پڑا ہے کام مجھ ناکام کو کس لاابالی سے

جہاں رونے لگے ٹک بے دماغی وہ لگا کرنے
قیامت ضد ہے اُس کو عاشقی کی زار و نالی سے

دماغ حرفِ لعلِ نابِ برگِ گل سے ہے تم کو
ہمیں جب گفتگو ہے تب کسو کے لب کی لالی سے

ریاضاتِ محبت نے رکھا ہے ہم میں کیا باقی
نمود اک کرتے ہیں ہم یوں ہی اب شکلِ مثالی سے

ہم اس راہِ حوادث میں بسانِ سبزہ واقع ہیں
کہ فرصت سر اُٹھانے کی نہیں ٹک پائمالی سے

سرھانے رکھ کے پتھر خاک پر ہم بے نوا سوئے
پڑے سر ماریں طالع مند اپنا سنگ قالی سے

کبھو میں عین رونے میں جگر سے آہ کرتا ہوں
کہ دل اُٹھ جائیں یاروں کے ہوئے بر شکالی سے

کہے غم اس دہن کا ہے گئے فکر اس کمر کی ہے
کہے سو کیا کوئی ہیں میر صاحب کچھ خیالی سے

کھینچے جہاں تو تیغ جلادت کے واسطے
وہاں میں بھی ہوں مُدام شہادت کے واسطے

سجدہ کوئی کرے تو درِ یار پر کرے
ہے جائے پاک شرطِ عبادت کے واسطے

آئے نہ تم تو در پسِ دیوار تجھ تلک
کھینچے ہیں لوگ رنج عیادت کے واسطے

خوش طالعی صبح تو اُس منہ پہ ہے سفید
پھرتا ہے مہ بھی اس ہی سعادت کے واسطے

ہے میر پیر لیک سوئے میکدہ مدام
جاتا ہے مغبچوں کی ارادت کے واسطے

دیوانگی میں گاہ ہنسے گاہ رو چکے
وحشت بہت تھی طاقتِ دل ہائے کھو چکے

افراطِ اشتیاق میں سمجھے نہ اپنا حال
دیکھے ہیں سوچ کر کے تو اب ہم بھی ہو چکے

کہتا ہے میر سانجھ ہی سے آج دردِ دل
ایسی کہانی گرچہ شندھی ہے تو سو چکے

بیخودی جو یہ ہی تو ہم آپ میں اب آچکے
کیا تمھیں یہاں سے چلے جاتے ہو ہم بھی جا چکے

تم یہی کہتے رہے یہ اور گل تازہ کھلا
زخم بھی ہم نے اُٹھائے داغ بھی ہم کھا چکے

ایک بوسہ دے نہ منہ برسوں لگایا واہ وا
اب تو ٹک بولو جزا ہم اس عمل کی پا چکے

یہاں تلک آئے ہیں جتنا مکث کرتے ہو کرو
اب تو جانا جان سے ناچار ہم ٹھہرا چکے

اب چمن میں جا نکلتے ہیں تو جی لگتا نہیں
پھول گل سے میر اُس بن دل بہت بہلا چکے

خوبی کی اپنی جنت کیسی ہی ڈینگیں ہانکے
اُس کی گلی کا ساکن ہرگز ادھر نہ جھانکے

یک ایک بات اوپر ہیں پیچ و تاب سو سو
رہتے نہیں ہیں سیدھے یہ لونڈے ٹیڑھے بانکے

سر کو اُس آستاں پر رکھے رہیں تو بہتر
اُٹھئے جو اُس کے در سے تو ہوجیے کہاں کے

گردش سے روسیہ کی کیا کیا بلائیں آئیں
جانے ہی گئے ہیں کچھن سارے اس آسماں کے

مشتاق ہم جو ایسے سو ہم ہی سے ہے پردا
جب اس طرف سے نکلے تب منہ کو اپنے ڈھانکے

ہے پُر غبار عالم جانا ہی یہاں سے اچھا
اس خاکداں میں رہ کر کیا کوئی خاک پھانکے

کل باغ میں گئے تھے روئے چمن چمن ہم
کچھ سرو میں جو پائے انداز اس جواں کے

جاناں کی رہ سے آنکھیں جس تس کی لگ رہی ہیں
رفتہ ہیں لوگ سارے ان پاؤں کے نشاں کے

خمیازہ کش رہے ہے اے میر شوق سے تو
سینے کے زخم کے کہہ کیونکر رہیں گے ٹانکے

دل خوں ہوا ہمارا ٹکڑے ہوئے جگر کے
دیکھا نہ تم نے ایدھر صرفے سے اک نظر کے

چشمے کہیں ہیں جوشاں جوئیں کہیں ہیں جاری
آثار اب تلک ہیں یاروں کی چشم تر کے

رہنے کی اپنا جا تو نے دیر ہے نہ کعبہ
اُٹھئے جو اُس کے در سے تو ہوجیے کدھر کے

اس شعر و شاعری پر اچھی بندھی نہ ہم سے
محو خیال شاعروں ہی ہیں اُس کمر کے

دُنیا میں ہے بسیرا یا رو سرائے کا سا
یہ رہروان ہستی عازم ہیں سب سفر کے

وے یہ ہی چھاتیاں ہیں زخموں سے جو بھری ہیں
کیا ہے جو بلہوس نے دو چار کھائے چھر کے

تہ بیخودی کی اپنی کیا کچھ وے دھری ہے
ہم بے خبر ہوئے ہیں پہنچے کسو خبر کے

اس آستاں کی دوری اس دل کی ناصبوری
کیا کہیے آہ تم سے گھر کے ہوئے نہ در کے

خاک ایسی عاشقی میں ٹھکرائے بھی گئے کل
پاؤں لگنے سے اُس کے پر میر جی نہ سر کے

کتنے روزوں سے نہ سونے کے ہیں نے کھانے کے
دل جو یہ ہی تو ہم آرام نہیں پانے کے

ہائے کس خوبی سے آوارہ رہا ہی مجنوں
ہم بھی دیوانے ہیں اس طور کے دیوانے کے

عزم ہی جزم کہ اب کی حرکت شہر سے کر
ہو جے دل کھول کے ساکن کسو ویرانے کے

آہ کیا سہل گزر جاتے ہیں جی سے عاشق
ڈھب کوئی سیکھ لے ان لوگوں سے مر جانے کے

جمع کرتے ہو جو گیسوئے پریشاں کو مگر
ہو تردد میں کوئی تازہ بلا لانے کے

کاہے کو آنکھ چھپاتے ہو یہی ہی گر چال
ایک دو دن میں نہیں ہم بھی نظر آنے کے

ہاتھ چڑھ جائیو ای شیخ کسو کے نہ کبھو
لونڈے سب تیرے خریدار ہیں میخانے کے

خاک سے چرخ تلک اب تو رُکا جاتا ہے
ڈول اچھے نہیں کچھ جان کے گھبرانے کے

لے بھی ای غیرتِ خورشید کہیں منہ پہ نقاب
مقتضی دن نہیں اب منہ کے یہ دکھلانے کے

لالہ و گل ہی کے مصروف رہو تم شب و روز
تم مگر میر جی سید ہو گلستانے کے

ن سید ہی

اس باغِ بے ثبات میں کیا دل صبا لگے
کیا کیا نہال دیکھتے یہاں پاؤں آ لگے

حرص و ہوس سے باز رہے دل تو خوب ہی
ہی قہر اس کلی کے تئیں گر ہوا لگے

تلخ اب تو اپنے جی کو بھی لگتی ہی بات وُں
جیسے کسو کے زخم پہ تیر اک دوا لگے

کس کو خبر ہی کشتی تباہوں کے حال کی
تختہ مگر کنارے کوئی بہ کے جا لگے

ایسے لگے پھرے ہیں بہت سایہ کی روش
جانے دے ایسی حور پری سے بلا لگے

وہ بھی چمن فروز تو بلبل ہی سامنے
گل ایسے منہ کے آگے بھلا کیا بھلا لگے

سلہ پس جائیں یار آنکھ تری سرمہ پر پڑے
دل خوں ہو تیرے پاؤں میں پھر کر حنا لگے

بن ہڈیوں ہماری ہما کچھ نہ کھائے گا
ٹک چاشنی عشق کا اس کو مزا لگے

خط مت رکھو کہ اس میں بہت ہیں قباحتیں
کہیے تمھارے منہ پہ تو تم کو برا لگے

مقصود کے خیال میں بہتوں نے چھانی خاک
عالم تمام وہم ہی یہاں ہاتھ کیا لگے

سب چاہتے ہیں دیر رہے میر دل زدہ
یارب کسو تو دوست کی اس کو دعا لگے

سلہ لا علم سے خون ہو دل اور حنا کو بھاگ لگے ۂ ای تری منصفی کو آگ لگے

غیر کو دیکھے ہی گرمی سے نہ کچھ لاگ سے لگے
اس لئے دیکھ رہے ہی کہ مجھے آگ لگے

آنکھ ہر ایک کی دوڑے ہی کفک پر تیرے
پاؤں سے لگ کے ترے مہندی کو کچھ بھاگ لگے

ہو نہ دیوانہ جو اُس گوہرِ خوش آب کا تو
لبِ دریا کے تئیں کیوں رہیں یوں جھاگ لگے

اب تو اُن گیسوؤں کی یاد میں ہیں محو ہوا
گو قیامت کو مرے منہ سے ہوں [2]دو ناگ لگے

لڑکے دلّی کے ترے ہاتھ میں کب آئے میر
پیچھے ایک ایک کے سو سو پھریں ہیں ڈاگ لگے

کب[1] تلک احوال یہ جب کوئی تیرا نام لے
عاشقِ بے حال دونوں ہاتھ سے دل تھام لے

ناتوانی سے اگر مجھ میں نہیں ہی جی تو کیا
عشق جو چاہے تو مردے سے بھی اپنا کام لے

پہلوئے عاشق نہ بستر سے لگے تو ہی بجا
دل سی آفت ہو بغل میں جس کے کیا آرام لے

اب دلِ نالاں پھر اُس زلفِ سیہ میں جا چکا
آج یہ بیمار دیکھیں کس طرح سے شام لے

شاخِ گل تیری طرف جھکتی جو ہی اے مستِ ناز
چاہتی ہی تو بھی میرے ہاتھ سے اک جام لے

دل کی آسایش نہیں امکان زلفِ یار میں
یہ شکارِ مضطرب ہی دم نہ زیرِ دام لے

عزت اے پیرِ مغاں کچھ حاجیوں کی ہی ضرور
آئے ہیں تیرے کنے ہم جامۂ احرام لے

کیا بلا مفتی کا لونڈا سر چڑھا ہی ان دنوں
آوے ہی گویا کہ مجھ پر قاضی کا اعلام لے

ہمنشیں کہہ مت بتوں کی میر کو تسبیح ہی
کام کیا اس ذکر سے اُن کو خدا کا نام لے

سختیاں کھینچیں سو کھینچیں پھر بھی جو اُٹھ کر چلے
چلتے اُس کوچے سے ہم پر سینکڑوں پتھر چلے

مار گیری سے زمانے کی نہ دل کو جمع رکھ
چال دھیمی اُس کی ایسی ہی کہ جوں اجگر چلے

کیونکہ اُن کا کوئی وارفتہ بھلا ٹھہرا رہے
جنبش اُن پلکوں کو ہوتی ہی کہ جوں خنجر چلے

اب جو وہ سرمایۂ جاں یہاں تلک آیا تو کیا
راہ تکتے تکتے اُس کی ہم تو آخر مر چلے

میں نہ کہتا تھا دمِ بسمل مرے مت آئیو
لوٹتے دامن کی اپنی زہ لہو میں بھر چلے

چھوڑ جانا جاں بلب ہم کو کہاں کا ہی سلوک
گھر کے گھر یہاں بیٹھے جاتے ہیں تم اُٹھ کر گھر چلے

صاف سارا شہر اُس انبوہِ خط میں لٹ گیا
کچھ نہیں رہتا ہی وہاں جس راہ ہو لشکر چلے

[1] میر تقی میر دہلوی سے ؎ ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا ٭ دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

پاؤں میں مارا ہے تیشہ میں نے راہِ عشق میں — ہو سو ہو اب گو کہ اُر ابھی مرے سر پہ چلے

لائے تھے جا کر ابھی تو اس گلی میں سے پکار[۵۱]
چپکے چپکے میر جی تم اُٹھ کے پھر کیدھر چلے

یا پہلے وے نگاہیں جن سے کہ چاہ نکلے — یا اب کی وے ادائیں جو دل سے آہ نکلے
کیونکر نہ چپکے چپکے یوں جان سے گزریے — کہیے بتا جو اُس سے باتوں کی راہ نکلے
زردی رنگ و رونا دونوں دلیلِ کشتن — خوش طالعی سے میرے کیا کیا گواہ نکلے
اے کامِ جاں ہے تو بھی کیا ریجھ کا بچاؤ — [واہ] مرجائیے تو منہ سے تیرے نہ آہ نکلے
خوبی و دل کشی میں صد چند ہے تو اس سے — تیرے مقابلے کو کس منہ سے ماہ نکلے
یہاں مہر تھی وفا تھی وہاں جور تھے ستم تھے — پھر نکلے بھی تو میرے یہ ہی گناہ نکلے
غیروں سے تو کہے ہے اچھی بری سب اپنی — اے یار کب کے تیرے یہ خیر خواہ نکلے
رکھتے تو ہو مکدر پر اُس گھڑی سے ڈریو — جب خاک منہ پہ مل کر یہ روسیاہ نکلے

اک خلق میر کے اب ہوتی ہے آستاں پر
درویش نکلے ہے کیوں جو بادشاہ نکلے

جیسے اندوہِ محرم عشق کب تک دل ملے — عید سی ہو جائے اپنے ہاں لگے جو تو گلے
دین[۵۲] و مذہب عاشقوں کا قابلِ پرسش نہیں — یہ اُدھر سجدہ کریں ابرو جدھر اُس کے ہلے
یہ نہیں میں جانتا نسبت ہے کیا آپس میں لیک — آنکھیں ہو جاتی ہیں ٹھنڈی اُس کے تلووں سے ملے
ہائے کس حسرت سے شبنم نے سحر رو کر کہا — خوش رہو اے ساکنانِ باغ اب تو ہم چلے
مردمانِ شہر خوبی پر کریں کیا دل کو عرض — ایسی جنس ناروا کو مفت کوئی جہاں تے لے
کل جو ہم کو یاد آیا باغ میں قد یار کا — خوب روئے ہر نہالِ سبز کے سایے تلے
جمع کر خاطر مری جینے سے مجھ کو خوب ہے — جی بچا تب جانیے جب سر سے یہ کلول ٹلے
گرچہ سب ہیں گے تہیاے طریقِ نیستی — [ق] طی بہت دشوار کی یہ رہگزر ہم نے ولے
ہر قدم پر جی سے جانا ہر دم اوپر بے دمی — لمحہ لمحہ آگے تھے کیا کیا قیامت مرحلے

---

۵۱ میر تقی میر دہلوی ـــ ۵ چلا نہ اُٹھ کے وہیں پھر تو چپکے چپکے میر ؛ ابھی تو اُس کی گلی سے پکار لایا ہوں
۵۲ خواجہ میر درد ـــ ۵ ہم جانتے نہیں ہیں اے دردؔ کیا ہے کعبہ ؛ جدھر ملے وہ ابرو اودھر نماز کرنا

جلنے کو جلتے ہیں سب کے اندرونے لیک میر
جب کسو کی اس وتیرہ سے کہیں چھاتی جلے

بے مہر و وفا ہے وہ کیا رسم وفا جانے
الفت سے محبت سے مل بیٹھنا کیا جانے

دل دھڑکے ہے جاتے کچھ بتخانے سے کعبہ کو
اس راہ میں پیش آوے کیا ہم کو خدا جانے

ہے محو رخ اپنا تو آئینہ میں ہر ساعت
صورت ہے جو کچھ دل کی سو تیری بلا جانے

کچھ اس کی بندھی مٹھی اس باغ میں گزرے ہے
جو زخم جگر اپنے جوں غنچہ چھپا جانے

کیا سینے کے جلنے کو ہنس ہنس کے اڑاتا ہے
جب آگ کوئی گھر کو اس طور لگا جانے

میں مٹی بھی لیجاؤں دروازہ کی اس کے تو
اس درد محبت کی جو کوئی دوا جانے

اپنے تئیں بھی کھانا خالی نہیں لذت سے
کیا جانے ہوس پیشہ چکھے تو مزا جانے

یوں شہر میں بہتیرے آزار دہندے ہیں
تب جانیے جب کوئی اس ڈھب سے ستا جانے

کیا جانو رکھو روزے یا دارو پیو شب کو
کردار وہی اچھا تو جس کو بھلا جانے

آگاہ نہیں انساں ہے میر فرشتے سے
کیا چاہیئے ہے پھر جو طالع کا لکھا جانے

الٰہی کہاں منہ چھپایا ہے تو نے
ہمیں کھو دیا ہے تری جستجو نے

جو خواہش نہ ہوتی تو کاہش نہ ہوتی
ہمیں جی سے مارا تری آرزو نے

نہ بھائیں تجھے میری باتیں وگرنہ
رکھی دھوم شہروں میں اس گفتگو نے

رقیبوں سے سر جوڑ بیٹھو ہو کیونکر
ہمیں تو نہیں دیتے ٹک پاؤں چھونے

پھر اس سال سے پھول سونگھا نہیں ہے
دوانہ کیا تھا مجھے تیری بو نے

مداوا نہ کرنا تھا مشفق ہمارا
جراحت جگر کے لگے دکھنے دونے

کڑھایا کسو کو کھپایا کسو کو
برائی ہی کی سب سے اس خوبرو نے

وہ کسبی کہ ہے شور جس کا جہاں میں
پڑے ہیں لگے اس کے محل آج سونے

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی
تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

ویسا ہے یہ جو یوسف شب تیرہ ہوتے آوے
جیسے چراغ کوئی مہتاب میں جلاوے

کیا رفتگی سے میری تم گفتگو کرو ہو
کھویا گیا نہیں میں ایسا جو کوئی پاوے

چھاتی کے داغ یکسر آنکھوں سے کھل رہے ہیں / دیکھیں ابھی محبت کیا کیا ہمیں دکھاوے
ہیں پاؤں اس کے نازک گل برگ سے بجا ہے / عاشق جو رہ گزر میں آنکھوں کے تئیں بچھاوے
یوں خاک منہ پہ مل کر کب تک پھرا کروں میں / یارب زمیں پھٹے تو یہ روسیہ سماوے
اے کاش قصہ میرا ہر فرد کو سنا دیں / تا دل کسو سے اپنا کوئی نہ یہاں لگاوے
ترک بتاں کا مجھ سے لیتے ہیں قول یوں ہی / کیا ان سے ہاتھ اٹھاؤں گو اس میں جان جاوے
عاشق کو مر گئے ہی بنتی ہے عاشقی میں / کیا جان جس کی خاطر شرمندگی اٹھاوے

جی ہیں بگڑ رہا ہے تب میر چپ ہی بیٹھا / چھیڑو ابھی تو کیا کیا باتیں بنا کے لاوے

یا بادۂ گلگوں کی خاطر سے ہوس جاوے / یا ابر کوئی آوے اور آ کے برس جاوے
شورش کدۂ عالم کہنے ہی کی جاگہ تھی / دل کیا کرے جو اپنے ہنگامہ میں پھنس جاوے
دل تو ہی عبث نالاں یاران گزشتہ بن / ممکن نہیں اب اُن تک آواز جرس جاوے
اُس زلف سے لگ چلنا اک سانپ کھلانا ہے / یہ مار سیہ یارو ناگاہ نہ ڈس جاوے
میخانے میں آوے تو معلوم ہو کیفیت / یوں آگے ہو مسجد کے ہر روز عبث جاوے
چولی جہاں سے مسکی پھر آنکھیں وہیں چپکیں / جب پیرہن گل بھی اس تنگی سے چس جاوے

ہے میر عجب کوئی درویش برشتہ دل / بات اُس کی سنو تم تو چھاتی بھی جھلس جاوے

درونے کو کوئی آہوں سے یوں کب تک ہوا دیوے / مبادا عشق کی گرمی جگر میرا جلا دیوے
کہاں تک یوں پڑے بستر پہ رہیے دور جاناں سے / کوئی کاش اس گلی میں ہم کو اک تکیہ بنا دیوے
ہوئے برسوں کہ وہ ظالم رہے ہے مجھ پہ کچھ ٹیڑھا / کوئی اس تیغ بر کف کو گلے میرے ملا دیوے
وفا کی مزد میں ہم پر جفا و جور کیا کہیے / کسو سے دل لگے اس کا تو وہ اس کی جزا دیوے
کہیں کچھ تو برا مانو بھلا انصاف تو کریے / بدی کو بھی نہایت ہے کہیں نیکی خدا دیوے
صنوبر آدمی ہو تو سراپا یار دل لاوے / کہاں سے کوئی تازہ دل اسے ہر روز لا دیوے
بہت گمراہ ہے وہ شوخ لگتا ہے کہے کس کے / کوئی کیا راہ کی بات اس جفا جو کو بتا دیوے
جگر سب جل گیا لیکن زباں ہلتی نہیں اپنی / مبادا اس آتشیں خو کو مخالف کچھ لگا دیوے
کوئی بھی میر سے دل ریش سے یوں دور پھرتا ہے / ٹک اس درویش سے مل چل کہ تجھ کو کچھ دعا دیوے

اُس شوخ ستمگر کو کیا کوئی بھلا چاہے — جو چاہنے والے کا ہر طور بُرا چاہے
کعبے گئے کیا کوئی مقصد کو پہنچتا ہے — کیا سعی سے ہوتا ہے جب تک نہ خدا چاہے
سو رنگ کی جب خوبی پاتے ہو اسی گل میں — پھر اُس سے کوئی اُس بن کچھ چاہے تو کیا چاہے
ہم عجز سے پہنچے ہیں مقصود کی منزل کو — گہ خاک میں ملجاوے جو اُس سے ملا چاہے
ہو سکتی ہیں سد رہ پلکیں کہیں رونے کی — تنکوں سے رُکے ہے کب دریا جو بہا چاہے
جب تو نے زباں چھوڑی تب کا ہی کا صرفہ ہے — بے صرفہ کہے کیوں نہ جو کچھ کہ کہا چاہے
دل جائے ہے جوں رو کے شبنم نے کہا گل سے — اب ہم تو چلے یہاں سے رہ تو جو رہا چاہے
خط رسم زمانہ تھی ہم نے بھی لکھا اس کو — تہ دل کی لکھے کیونکر عاشق جو لکھا چاہے
رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں — کیا قافلہ جاتا ہے جو تو بھی چلا چاہے

ہم میر ترا مرنا کیا چاہتے تھے لیکن
رہتا ہے ہوئے بن کب جو کچھ کہ ہوا چاہے

دوری میں اُس کی گور کنارے ہم آرہے — جی رات دن جنھوں کے کھپیں ان میں کیا رہے
اُس آفتاب حسن کے ہم داغِ شرم ہیں — ایسے ظہور پر بھی وہ مُنہ کو چھپا رہے
اب جس کے حسن خلق پہ بھولے پھریں ہیں لوگ — اس بے وفا سے ہم بھی بہت آشنا رہے
مجروح ہم ہوئے تو نمک پاشیاں رہیں — ایسی معاش ہووے جہاں کیا مزا رہے
مرغانِ باغ سے نہ ہوئی میری دم کشی — نالہ کو سُن کے وقت سحر دم ہی کھا رہے
چھاتی رُکی رہے ہے جو کرتے نہیں ہیں آہ — یہاں لطف تب تلک ہی ہے جبتک ہوا رہے
کشتے ہیں ہم تو ذوقِ شہیدانِ عشق کے — تیغِ ستم کو دیر گلے سے لگا رہے
گاہے کراہتا ہے گہے چپ ہے گاہ سست — ممکن نہیں مریضِ محبت بھلا رہے

آتے کبھو جو وہاں سے تو یہاں رہتے تھے اُداس
آخر کو میر اُس کی گلی ہی میں جا رہے

یک عمر دیدہ ہائے ستم دیدہ تر رہے — آخر کو پھوٹ پھوٹ بہے قہر کر رہے
ہم نے بھی نذر کی ہے پھریں گے چمن کے گرد — آنے تئیں بہار کے گر بال و پر رہے
کیا کہئے تیرے واسطے اے مایۂ حیات — کیا کیا عزیز اپنے تئیں مار مر رہے
مرتے بھی اپنے ہائے وہ حاضر نہ ہو سکا — ہم اشتیاق کش تو بہت محتضر رہے

عـہ زبان چھوڑی یعنی زبان درازی شروع کی ۱۲

مرغانِ باغ رہتے ہیں اب گھیرے یوں مجھے
ماتم زدوں کے حلقے میں جوں نوحہ گر رہے

آغوش اُس سے خالی رہی شب تو تا سحر
جیب و کنار گریۂ خونیں سے بھر رہے

نقشِ قدم کے طور ترے ہم ہیں پائمال
غالب ہے یہ کہ دیر ہمارا اثر رہے

اب صبر و ہوش و عقل کی میرے یہی معاش
جوں قافلہ لٹا کہیں آ کر اتر رہے

لاکھوں ہمارے دیکھتے گھر بار سے گئے
کس خانماں خراب کے ڈیرے جا کے گھر رہے

آتا کبھو تو ناز سے دکھلائی دے بھی جا
دروازے ہی کی اور کہاں تک نظر رہے

رکھنا تمھارے پاؤں کا کھوتا ہے سر سے ہوش
یہ چال ہے تو اپنی کسے پھر خبر رہے

کیا بد بلا ہے لاگ بھی دل کی کہ میرؔ جی
دامن سوار لڑکوں کے ہو کر نفر[۵۱] رہے

یہاں ہم برائے بیت جو بے خانماں رہے
سو یوں رہے کہ جیسے کوئی میہماں رہے

تھا ملک جن کے زیرِ نگیں صاف مٹ گئے
تم اس خیال میں ہو کہ نام و نشاں رہے

آنسو چلے ہی آنے لگے منہ پہ متصل
کیا کیجے اب کہ رازِ محبت نہاں رہے

ہم جب نظر پڑیں تو وہ ابرو کو خم کرے
تیغ اپنے اُس کے کب تئیں یوں درمیاں رہے

کوئی بھی اپنے سر کو کٹاتا ہے یوں و لے
جوں شمع کیا کروں جو نہ میری زباں[۵۲] رہے

یہ دونوں چشمے خون سے بھر دوں تو خوب ہے
سیلاب میری آنکھوں سے کب تک رواں رہے

دیکھیں تو مصرِ حسن میں کیا خواریاں کھنچیں
اب تک تو ہم عزیز رہے ہیں جہاں رہے

مقصود گم کیا ہے تب ایسا ہے اضطراب
چلتے ہیں ورنہ کاہے کو یوں آسماں رہے

کیا اپنی اُن کی تم سے بیاں کیجے معاش
کیں مدتوں رکھا جو تنک مہرباں رہے

گہ شام اُس کے مو سے ہے گہ رو سے اُس کے صبح
تم چاہو ہو کہ ایک سا ہی یہاں سماں رہے

کیا نذرِ تیغِ عشق کو ہے سر زمیں کیا
اس معرکہ میں کھیت بہت خستہ جاں رہے

اس تنگنائے دہر میں تنگی نفس نے کی
جوں صبح ایک دم ہی رہے ہم جو یہاں رہے

اک قافلے سے گرد ہماری نہ ٹک اٹھی
حیرت ہے میرؔ اپنے تئیں ہم کہاں رہے

ایک سے تم ہم فقرا سے اکثر صحبت رکھتے تھے
اور نہ تھی توفیق تمھیں تو بوسے کی ہمت رکھتے تھے

[۵۱] غلام ـ نوکر ـ خدمتگار ۱۲ [۵۲] زباں رہے ـ یعنی کیا کروں اگر زبان نہ رُکے ۱۲

آگے خط سے دماغ تمھارا عرش پہ تھا سوئے ہی تم
پاؤں زمیں پر رکھتے تھے تو خدا پہ منت رکھتے تھے
اب تو ہم ہو چکتے ہیں ٹک تیرے ابرو خم ہوتے
کیا کیا رنج اُٹھاتے تھے جب جی میں طاقت رکھتے تھے
چاہ کے سارے دیوانے پر آپسے اکثر بیگانے
عاشق اُس کے سیر کئے ہم سب سے جُدی مت رکھتے تھے
ہم تو سزائے تیغ ہی تھے پر ظلمِ بے حد کیا معنی
اور بھی تجھ سے آگے ظالم اچھی صورت رکھتے تھے
آج غزال اک رہبر ہو کر لایا تربتِ مجنوں پر
قصد زیارت رکھتے تھے ہم جب سے وحشت رکھتے تھے
کس دن ہم نے سر نہ چڑھا کر ساغرِ مے کو نوش کیا
دَور میں اپنے دخترِ رز کی ہم اک حرمت رکھتے تھے
کوہکن و مجنون و وامق کس کس کے لیں نام غرض
جی ہی سے جاتے آگے سُنے وے لوگ جو اُلفت رکھتے تھے
چشم جہاں تک جاتی تھی گل دیکھتے تھے ہم سرخ و زرد
پھول چمن کے کسی کے منہ سے ایسی خجلت رکھتے تھے
کام کرے کیا سعی و کوشش مطلب یہاں نے پیدا تھا
دست و پا بہتیرے مارے جب تک قدرت رکھتے تھے
چتون کے کب ڈھب تھے ایسے، چشمک کے تھے کب یہ ڈول
ہائے وے دن جن روزوں تم کچھ بھی مروت رکھتے تھے
لعل سے جب دل تھے یہ ہمارے مرجاں سے تھے اشکِ چشم
کیا کیا کچھ پاس اپنے ہم بھی عشق کی دولت رکھتے تھے

کل کہتے ہیں اس بستی میں میر جی مشتاقانہ موئے
تجھ سے کیا ہی جان کے دشمن وے بھی محبت رکھتے تھے

مجنوں و کوہکن کو آزار ایسے ہی تھے ۔ یہ جان سے گئے سب بیمار ایسے ہی تھے

سلہ یعنی خط نکلنے سے پہلے ۔ سلہ اسکے عاشق اسکے سیر کئے۔ یعنی اُسکے عاشقوں کو دیکھا

شمس و قمر کے دیکھے جی اُس میں جا رہے ہیں
اس دلفروز کے بھی رخسار ایسے ہی تھے

دامن کے پاٹ سارے تختے ہوئے چمن کے
بس اے سرشکِ گونیں درکار ایسے ہی تھے

تو ہو نہ کیوں رُلائے اُن کا گداز ہونا
یہ دل جگر ہمارے غمخوار ایسے ہی تھے

ہر دم جراحت آسا کب رہتے تھے ٹپکتے
یہ دیدۂ نمیں کیا خونبار ایسے ہی تھے

آزردہ دلوں کا جیسا کہ تو ہے ظالم
اگلے زمانہ میں بھی کیا یار ایسے ہی تھے

ہو جائے کیوں نہ دو زخ باغِ زمانہ ہم پر
ہم بے حقیقتوں کے کردار ایسے ہی تھے

دیوار سے پٹک سر ہیں جو موا تو بولا
کچھ اس ستم زدہ کے آثار ایسے ہی تھے

اک حرف کا بھی اُن کو دفتر ہی کر دکھانا
کیا کہیے میرؔ جی کے بستار ایسے ہی تھے

اب ہم فقیر جی سے دل کو اٹھا کے بیٹھے
اس خصمِ جاں کے در پر تکیہ بنا کے بیٹھے

مرتے ہوئے بھی ہم کو صورت نہ آ دکھائی
وقتِ اخیر اچھا منہ کو چھپا کے بیٹھے

عزلت نشیں ہوئے جب دل داغ ہو گیا تب
یعنی کہ عاشقی میں ہم گھر جلا کے بیٹھے

جو کفر جانتے تھے عشقِ بتاں کو وہ ہی
مسجد کے آگے آخر قشقہ لگا کے بیٹھے

شورِ متاعِ خوبی اس شوخ کا بلا تھا
بازاری سب دکانیں اپنی بڑھا کے بیٹھے

کیا اپنی اور اُس کی اب نقل کریے صحبت
مجلس سے اُٹھ گیا وہ ٹک ہم جو آ کے بیٹھے

کیا جانے تیغ اُس کی کب ہو بلند عاشق
یوں چاہیئے کہ سر کو ہر دم جھکا کے بیٹھے

پھولوں کی سیج پر سے جو بے دماغ اُٹھے
مسند پہ ناز کی جو تیوری چڑھا کے بیٹھے ق

کیا غم اُسے زمیں پر بے برگ ساز کوئی
خار و خسک ہی کیوں نہ برسوں بچھا کے بیٹھے

وادیِ قیس سے پھر آئے نہ میرؔ صاحب
مرشد کے ڈھیر پر وے شاید کہ جا کے بیٹھے

ہے جنبشِ لبِ مشکل جب اُن کے وہ بیٹھے
جو چاہیں سو یوں کہہ لیں لوگ اپنی جگہ بیٹھے

جی ڈوب گئے اپنے اندوہ کے دریا میں
وے جوش کہاں اب ہم مدت ہوئی دہ بیٹھے

کیا[۱] رنگ میں شوخی ہے اُس کے تنِ نازک کی
پیراہن اگر پہنے تو اُس پہ بھی تہ بیٹھے

سر گل نے اُٹھایا تھا اس باغ میں مو دیکھا
کیا ناز سے یھاں کوئی کج کر کے کلہ بیٹھے

مرنے موئے پر چاہت ظاہر نہ کی اگلوں نے
بیحوصلہ تھے ہم جو اس راز کو کہہ بیٹھے

[۱] میر تقی میر دہلوی ؎ کیا تنِ نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے ؛ کیا بدن کا رنگ ہے تہ جس کی پیراہن پہ ہے

کیا جانے کہ ایدھر کا کب قصد کرے گا وہ
پامال ہوئے ہم تو اس سے سرِ رہ بیٹھے

جو ہاتھ چڑھا اُس کے دل خوں ہی کیا اس کا
اُس پنجۂ رنگیں کی ای میرؔ نہ کہہ بیٹھے

اب سمجھ آئی مرتبا سمجھے
گم کیا خود کے تئیں خدا سمجھے

اس قدر جی میں ہی دغا اس کے
کہ دُعا کریے تو دغا سمجھے

کچھ سمجھتے نہیں ہمارا حال
تم سے بھی ای بتاں خدا سمجھے

غلط اپنا کہ اُس جفا جو کو
سادگی سے ہم آشنا سمجھے

نکتہ داں بھی خدا نے تم کو کیا
پر ہمارا نہ مدعا سمجھے

لکھے دفتر کتابیں کیں تصنیف
پر نہ طالع کا ہم لکھا سمجھے

میرؔ صاحب کا ہر سخن ہی رمز
بے حقیقت ہی شیخ کیا سمجھے

اب اپنے قدِ راست کو خم دیکھتے ہیں ہائے
ہستی کے تئیں ہوتے عدم دیکھتے ہیں ہائے

سنتے تھے کہ جاتی ہی ترے دیکھنے سے جاں
اب جان چلی جاتی ہی ہم دیکھتے ہیں ہائے

کیا روتے ہیں یارانِ گزشتہ کے لئے ہم
جب راہ میں کچھ نقشِ قدم دیکھتے ہیں ہائے

کچھ عشق کی آتش کی لپیٹ پہنچی ہمیں زور
سب تن بدن اپنے کو بھسم دیکھتے ہیں ہائے

دل چاک ہی جاں داغ جگر خوں ہی ہمارا
ان آنکھوں سے انواعِ ستم دیکھتے ہیں ہائے

مایوس نہ کس طور جہاں سے رہیں ہم میرؔ
اب تاب بہت جان میں کم دیکھتے ہیں ہائے

جاگنا تھا ہم کو سو بیدار ہوتے رہ گئے
کارواں جاتا رہا ہم ہائے سوتے رہ گئے

بوئے گل پیش از سحر گلزار سے رخصت ہوئی
ہم ستم کش روبرو اس کے یوں روتے رہ گئے

جی دیے بن وہ درِ مقصود کب پایا گیا
بے جگر تھے میرؔ صاحب جان کھوتے رہ گئے

گل گئے بوٹے گئے گلشن ہوئے برہم گئے
کیسے کیسے ہائے اپنے دیکھتے موسم گئے

ہنستے رہتے تھے جو اس گلزار میں شام و سحر
دیدہ تر ساتھ لے وے لوگ جوں شبنم گئے

گر ہوا اس باغ کی ہی یہ تو ای بلبل نہ بھول
کوئی دن میں دیکھیو واں وے گئے یہاں ہم گئے

کیا کم اُس خورشید رو کی جستجو یاروں نے کی
لوہو روتے جوں شفق پورب گئے پچھم گئے

جی گیا یہاں بے دماغی سے انھوں کی اور وہاں
نے جبیں سے چیں گئی نے ابرؤوں سے خم گئے

شاید اب ٹکڑوں نے دل کے قصد آنکھوں کا کیا
کچھ سبب تو ہے جو آنسو آتے آتے تھم گئے

گرچہ ہستی سے عدم تک اک مسافت تھی بعید
پر اُٹھے جو ہم یہاں سے وہاں تلک یکدم گئے

کیا معاش اس غمکدہ میں ہم نے دس دن کی بہم
اُٹھ کے جس کنے ہاں گئے دل کا لئے ماتم گئے

سبزہ و گل خوش نشینی اس چمن کی جن کو تھی
سو بھی تو دیکھا گریباں چاک و مژگاں نم گئے

مردمِ دنیا بھی ہوتے ہیں سمجھ کس مرتبہ
آن بیٹھے ناؤں کو تو یہاں نگیں سے جم گئے

ربط صاحب خانہ سے مطلق بہم پہنچا نہ میرؔ
مدتوں سے ہم حرم میں تھے پہ نامحرم گئے

ہم نہ کہتے تھے رہے گا ہم میں کیا یہاں سے گئے
سو ہی بات آئی اُٹھے اُس پاس سے جاں سے گئے

کیا بخود رہنا ہمارا کچھ رکھے ہے اعتبار
آپ میں آئے کبھو اب ہم تو مہماں سے گئے

جب تلک یہ ہنا بنا دل تنگ غنچے سے رہے
دیکھئے کیا گل کہے گا اب گلستاں سے گئے

کیا غزالوں ہی کو ہم بن وحشت بسیار ہے
کوہ بھی نالاں رہے جب ہم بیاباں سے گئے

لائی آفت خانقاہ و مسجد اوپر وہ نگاہ
صوفیاں دیں سے گئے سب شیخ ایماں سے گئے

دور کر خط کو کیا چہرہ کتابی ان نے صاف
اب قیامت ہے کہ سارے حرف قرآں سے گئے

جی تو اُس کی زلف میں دل کاکلِ پیچاں میں میرؔ
جا بھی نکلے اس کنے تو ہم پریشاں سے گئے

دل شتاب اُس بزمِ عشرت سے اُٹھایا چاہیے
ایک دن تہ کر بساطِ ناز جایا چاہیے

یہ قیامت اور جی پر کل گئی پائیز میں
دل خس و خاشاک گلشن سے لگایا چاہیے

خانہ سازِ دیں جو ہے واعظ سو یہ خانہ خراب
اینٹ کی خاطر جسے مسجد کو ڈھایا چاہیے

کام کیا بالِ ہما سے چتر شہ سے کیا غرض[1]
سر پر اک دیوار ہی کا اُسکی سایا چاہیے

اتقا پر خانقہ والے بہت مغرور ہیں
مستِ ناز ایدھر اُسے یکبار لایا چاہیے

کیا یوں ہی میں پڑے رہئے گا سایہ کی روش
اپنے ہوتے ابھی موسم گل کا آیا چاہیے

[1] مولانا جامی ؎ حدیث چتر مرصع بمیر قافلہ گوے ؛ کہ سایہ دار غریباں ہمیں مغیلان است

یہ ستم تازہ کہ اپنی ناکسی پر کر نظر
جن سے بگڑا چاہیے اُن سے بنایا چاہیے

جی نہیں رہتا ہے ٹک ناچار ہم کو اس کی اور
گرتے پڑتے ضعف میں بھی روز جایا چاہیے

گاہ برقع پوش ہو کہ مو پراگندہ کرو
تم کو ہم سے منہ بہر صورت چھپایا چاہیے

وہ بھی تو ٹک دست و تیغ اپنے کی جانے قدر میر
زخم سارے ایک دن اس کو دکھایا چاہیے

انکھڑیوں کو اس کی خاطر خواہ کیونکر دیکھیے
سو طرف جب دیکھ لیجے تب ٹک ایدھر دیکھیے

گرچہ زردی رنگ کی بھی ہجر ہی سے ہے ولے
منہ مرا دیکھو ہو کیا یہ کوفت جی پر دیکھیے

اب کی گل ہم بے پروں کے اور چشمک زن ہے زور
اور دل اپنا بھی جلتا ہے بہت پر دیکھیے

آتے ہو جب جان یہاں آنکھوں میں آ رہتی ہو آہ
دیکھیے ہم کو تو یوں بیمار و مضطر دیکھیے

اشک پر سرخی ابھی سے ہے تو آگے ہمنشیں
رنگ لاوے کیسے کیسے دیدۂ تر دیکھیے

دیر و کعبہ سے بھی ٹک جھپکی نہ چشمِ شوخِ یار
شوق کے افراط سے تا چند گھر گھر دیکھیے

مر رہے یوں صید گہ کی کنج میں تو حسن کیا
عشق جب ہے تب گلے کو زیرِ خنجر دیکھیے

برسوں گزرے خاک ملتے منہ پر آئینہ کے طور
کیا غضب ہے آنکھ اُٹھا کر ٹک تو ایدھر دیکھیے

دیدنی ہے وجد کرنا میر کا بازار میں
یہاں تماشا بھی کسو دن تو مقرر دیکھیے

گرداب وار یار ترے صدقہ جائیے
دریا کا پھیر پائیے تیرا نہ پائیے

سر مار مار بیٹھے تلف جی ہو کب تلک
ٹک اُٹھ کے اب نصیبوں کو بھی آزمائیے

سو مشکل سے ہم آئے گئے تیری بزم میں
طرز آگہا نہ تو نے کبھو یوں کہ آئیے

آئے ہیں تنگ جان سے قیدِ حیات میں
اس بند سے ہمارے تئیں اب چھڑائیے

کہنے لگا کہ ٹیڑھے بہت ہو رہے ہو تم
دو چار سیدھی سیدھی تمھیں بھی سنائیے

ہے عزم جزم ترک و تجرد کا گر بنے
ق کیا اس جہانِ سفلہ سے دل کو لگائیے

تاثیر ہے دُعا کو فقیروں کی میر جی
ٹک آپ بھی ہمارے لئے ہاتھ اُٹھائیے

ٹک ٹھہرنے دے تجھے شوخی تو کچھ ٹھہرائیے
پیکرِ نازک کو تیرے کیونکہ بر میں لائیے

ساکنِ دیر و حرم دونوں تلاشی ہیں ترے
تو خدا جانے کہاں ہے کیونکہ تجھ کو پائیے

ط؎ یک وقت خاص ہی میں مری کچھ دعا کرو تم بھی تو میر صاحب قبلہ فقیر ہو میر تقی میر ۱۲

دور ہی سے ہوش کھو دیتی ہے اُس کی بوئے خوش
آپ میں رہیے تو اُس کے پاس بھی ٹک جائیے

اِن دِنوں رنگ اور کچھ ہے اس دلِ پُر خون کا
حق میں میرے آپ ہی کچھ سوچ کر فرمائیے

جی ہی کھپ جاتا ہے طنز آمیز ایسے لطف سے
ہنس کے جب کہتا ہے سب میں آئیے جی آئیے

دل کے ویراں کرنے میں بیداد کی ہے تونے ہائے
خوش عمارت ایسے گھر کو اس طرح سے ڈھائیے

رات دن رخسار اُس کے چت چڑھے رہتے ہیں میر
آفتاب و ماہ سے دل کب تلک بہلائیے

پر نہیں جو اُٹھ کے اُس در جائیے
زندگانی حیف ہے مر جائیے

کچھ نہیں تو شعر ہی کی سن کر
آئے ہیں جو یہاں تو کچھ کر جائیے

قصد ہے کعبہ کا لیکن سوچ ہے
کیا ہے سند جو اُس کے در پر جائیے

خانماں آباد جو ہے سو خراب
کس کے اُٹھ کر شہر میں گھر جائیے

بیم مردن اس قدر یہ کیا ہے میر
عشق کر لیے اور پھر ڈر جائیے

ان دلبروں کو دیکھ لیا بے وفا ہیں یے
بے دید و بے مروت و نا آشنا ہیں یے[۵۱]

حالانکہ خصم جان ہیں پر دیکھیے جو خوب
ہیں آرزو دلوں کی بھی یہ مُدعا ہیں یے

اب حوصلہ کرے ہے ہمارا بھی تنگ یہاں
جانے بھی دو بتوں کے تئیں کیا خدا ہیں یے

گل پھول اس چمن کے چلو صبح دیکھ لیں
شبنم کے رنگ پھر کوئی دم میں ہوا ہیں یے

کس دل میں خوبرویوں کی خالی نہیں جگہ
مغرور اپنی خوبی کے اوپر بجا ہیں یے

ہر چند ان سے برسوں چھپا ہم ملا کئے
ظاہر ہوئے نہ ہم پہ ہوا یہ کہ کیا ہیں یے

کیا جانو میر صاحب و قبلہ کے ڈھب کو تم
خوبیِ مسلّم ان کی و لے بد بلا ہیں یے

[۵۱] میر تقی میر کے زمانے میں (یہ) کی کتابت دو یا کے ساتھ ہوتی تھی (یے) مگر اب رسم الخط بدل گئی اور (یہ) بہ یا دو ہار لکھتے ہیں۔ ہم نے قریب قریب بہت سی جگہ زمانۂ حال کے رسم الخط کو ملحوظ رکھا ہے اور قدیم طرز کتابت کی تقلید نہیں کی مگر چونکہ یہ غزل ردیف یار میں لائی گئی ہے، اس لئے قدیم رسم الخط کو مجبوراً قائم رکھا گیا۔

شوق ہم کو کھپائے جاتا ہے
جان کو کوئی کھائے جاتا ہے

ہر کوئی اس مقام میں دس روز
اپنی نوبت بجائے جاتا ہے

کھل گئی بات تھی سو ایک پر
تو وہی منہ چھپائے جاتا ہے

یہاں پلیتھن نکل گیا وہاں غیر
اپنی ٹٹی لگائے جاتا ہے

روئیے کیا دل و جگر کے تئیں
جی بھی یہاں پر تو ہائے جاتا ہے

کیا کیا ہے فلک کا میں کہ مجھے
خاک ہی میں ملائے جاتا ہے

تہ جنھیں کچھ ہے اُن کے تئیں ہر گام
عرقِ شرم آئے جاتا ہے

جائے غیرت ہے خاکدانِ جہاں
تو کہاں منہ اُٹھائے جاتا ہے ق

دیکھ سیلاب اس بیاباں کا
کیسا سر کو جھکائے جاتا ہے

وہ تو بگڑے ہی میرؔ سے ہر دم
اپنی سی یہ بنائے جاتا ہے

کبھو میرؔ اُس طرف آ کر جو چھاتی کوٹ جاتا ہے
خدا شاہد ہے اپنا تو کلیجہ ٹوٹ جاتا ہے

خرابی دل کی کیا انبوہِ درد و غم سے پوچھو ہو
وہی حالت ہے جیسے شہر لشکر لوٹ جاتا ہے

شکست اُس رنگ آئی بیخودی عشق میں دل پر
نشے میں مست سے جیسے کہ شیشہ پھوٹ جاتا ہے

نہ یوں ہووے کہ اُٹھ جاؤں کہ ہے افسوس کی جاگہ
جب ایسا طائرِ خوش لہجہ پنجرے سے چھوٹ جاتا ہے

نہیں کچھ عقل میں آتا کہ دیوانہ سا میرؔ ادھر
کبھو آتا جو ہے کیدھر کو مارے روٹ جاتا ہے

چمن کو یاد کر مرغِ قفس فریاد کرتا ہے
کوئی ایسا ستم دنیا میں اے صیاد کرتا ہے

ہوا خانہ خراب آنکھوں کا اشکوں سے تو برجا ہے
رہِ سیلاب میں کوئی بھی گھر بنیاد کرتا ہے

اُبھر اے نقشِ شیریں بے ستوں اوپر تماشا کر
کہ کارستانیاں تیرے لئے فرہاد کرتا ہے

جب نسیمِ سحر ادھر جا ہے
ایک سناہٹا گزر جا ہے

کیا اس آئینہ رو سے کہئے ہائے
وہ زبان کرکے پھر مکر جا ہے

جب سے سمجھا کہ ہم چلاؤ ہیں
حال پرسی ٹک آ کے کر جا ہے

وہ کھلے بال سووے ہے شاید
رات کو جی مرا بکھر جا ہے

دُور اگرچہ گیا ہوں میں جی سے
کب وطن میرے یہ خبر جا ہی
وہ اگرچہ چڑھا رہا ایسا
آجکل جی سے مہ اُتر جا ہی

جی نہیں میرؔ میں نہ بو نہ تند
بات کہتے ابھی وہ مر جا ہی

کچھ بات ہی کہ گل ترے رنگیں دہاں سا ہی
یا رنگِ لالہ شوخ ترے رنگِ پاں سا ہی
آیا ہی زیرِ زلف جو رخسار کا وہ سطح
یہاں سانجھ کے تئیں بھی سحر کا سماں سا ہی
ہی جی کی لاگ اور کچھ اِی فاختہ وُلے
دیکھے نہ کوئی سروِ چمن اُس جواں سا ہی
کیا جانیے کہ چھاتی جلے ہی کہ داغِ دل
ایک آگ سی لگی ہی کہیں کچھ دھواں سا ہی
اُس کی گلی کی اور تو ہم تیر سے گئے
گو قامتِ خمیدہ ہمارا کماں سا ہی
جو ہی سو اپنے فکر خر و بار میں ہی یہاں
سارا جہان راہ میں اک کارواں سا ہی
کعبہ کی یہ بزرگی شرف سب بجا ہی لیک
دلکش جو پوچھیے تو کب اس آستاں سا ہی
عاشق کی گور پر بھی کبھو تو چلا کرو
کیا خاک واں رہا ہی بھی کچھ نشاں سا ہی

زورِ طبیعت اس کا سنیں اشتیاق تھا
آیا نظر جو میرؔ تو کچھ ناتواں سا ہی

طپش سے رات کی جوں توں کی جی سنبھالا ہی
نہیں ہی دل کوئی دشمن بغل میں پالا ہی
حنا سے یار کا پنجہ نہیں ہی گل کے رنگ
ہمارے اُن نے کلیجوں میں ہاتھ ڈالا ہی
گیا ہی پیش لے اعجازِ عشق سے فرہاد
وگرنہ خس نے کہیں بھی پہاڑ ٹالا ہی
سُنا ہی گریۂ خونیں پہ یہ نہیں دیکھا
لہو کا ہر گھڑی آنکھوں کے آگے نالا ہی
رہے خیال نہ کیوں ایسے ماہ طلعت کا
اندھیرے گھر کا ہمارے وہی اُجالا ہی
دلوں کو کہتے ہیں ہوتی ہی راہ آپس میں
طریقِ عشق بھی عالم سے کچھ نرالا ہی

ہزار بار گھڑی بھر میں میرؔ مرتے ہیں
اُنھوں نے زندگی کا ڈھب نیا نکالا ہی

چھاتی جلا کرے ہی سوزِ دروں بلا ہی
اک آگ سی رہے ہی کیا جانیے کہ کیا ہی (لگ رہی)
میں اور تو ہیں دونوں مجبور طور اپنے
پیشہ ترا جفا ہے شیوہ مرا وفا ہی
روئے سخن ہی کیدھر اہلِ جہاں کا یارب
سب متفق ہیں اس پر ہر ایک کا خدا ہی

کچھ بے سبب نہیں ہے خاطر مری پریشاں
دل کا الم جدا ہے غم جان کا جدا ہے

حسن اُن بھی معنیوں کا تھا آپھی صورتوں میں
اس مرتبے سے آگے کوئی چلے تو کیا ہے

شادی سے غم جہاں میں دہ چند ہم نے پایا
ہے عید ایک دن تو دس روز یہاں دہا ہے

ہے خصم جان عاشق وہ محوِ ناز لیکن
ہر لمحہ بے ادائی یہ بھی تو اک ادا ہے

ہو جائے یاس جس میں سو عاشقی ہے ورنہ
ہر رنج کو شفا ہے ہر درد کو دوا ہے

نایاب اس گہر کی کیا ہے تلاش آساں
جی ڈوبتا ہے اُس کا جو تہ سے آشنا ہے

مشفق ملاذ و قبلہ کعبہ خدا پیمبر
جس خط میں شوق سے میں کیا کیا اسے لکھا ہے

ہے گرچہ طفلِ مکتب وہ شوخ ابھی تو لیکن
جس سے ملا ہے اُس کا اُستاد ہو ملا ہے

تاثیر عشق دیکھو وہ نامہ وہاں پہنچ کر
جوں کاغذ ہوائی ہر سو اُڑا پھرا ہے

پھرتے ہو میرؔ صاحب سب سے جُدے جُدے تم
شاید کہیں تمھارا دل ان دنوں لگا ہے

دلِ بیتاب آفت ہے بلا ہے
جگر سب کھا گیا اب کیا رہا ہے

ہمارا تو ہے اصل مدعا تو
خدا جانے ترا کیا مدعا ہے

محبت کشتہ ہیں ہم یاں کسو پاس
ہمارے درد کی بھی کچھ دوا ہے

حرم سے دیر اُٹھ جانا نہیں عیب
اگر یاں ہے خدا واں بھی خدا ہے

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے
ہماری گفتگو کا ڈھب جدا ہے

کوئی ہے دل کھنچے جاتے ہیں اودھر
فضولی ہے تجسس یہ کہ کیا ہے

مروں میں اُس میں یا رہ جاؤں جیتا
یہی شیوہ مرا مہر و وفا ہے

صبا اودھر گل اودھر سرو اودھر
اُنھی کی باغ میں اب تو ہوا ہے

تماشا کردنی ہے داغِ سینہ
یہ پھول اس تختہ میں تازہ کھلا ہے

ہزاروں اُن نے ایسی کی ادائیں
قیامت جیسے اک اس کی ادا ہے

جگہ افسوس کی ہے بعد چندے
ابھی تو دل ہمارا بھی بجا ہے

ق
جو چپکے ہوں کہے چپکے ہو کیوں تم
کہو جو کچھ تمھارا مدعا ہے

سخن کریے تو ہووے حرف زن یوں
بس اب منہ موندلے میں نے سنا ہے

ق
کب اُس بیگانہ خو کو سمجھے عالم
اگرچہ یار عالم آشنا ہے

نہ عالم میں ہے نے عالم سے باہر　　یہ سب عالم سے عالم ہی جدا ہے

لگا میں گردِ سر پھرنے تو بولا
تمہارا میرؔ صاحب سر پھرا ہے

شور میرے جنوں کا جس جا ہے　　دخل عقل اس مقام میں کیا ہے
دل میں پھرتے ہیں خال و خط و زلف　　مجھ کو یک سر ہزار سودا ہے
شور بازار میں ہے یوسف کا　　وہ بھی آ نکلے تو تماشا ہے
برچھیوں میں کہیں نہ بٹ جاوے　　دل صفوفِ مژہ میں تنہا ہے
نظر آئے تھے وے حنائی پا　　آج تک فتنہ ایک برپا ہے
دل کھنچے جاتے ہیں اسی کی اور　　سارے عالم کی وہ تمنا ہے
برسوں رکھا ہے دیدۂ تر پر　　پاٹ دامن کا اپنے دریا ہے
ٹک گریباں میں سر کو ڈال کے دیکھ　　دل بھی دامن وسیع صحرا ہے
دل کشی اس کے قد کی ہی معلوم　　سرو بھی یوں جوانِ رعنا ہے

دست و پا گم کیے ہیں تو نے میرؔ
تیری بے طاقتی سے پیدا ہے

کئی برسوں جگر کا ہی لہو اپنا پیا ہے　　تب دل کے تئیں خوگرِ اندوہ کیا ہے
ڈر کیوں نہ محلے میں رہے رونے سے میرے　　سیلاب نے اس کوچے میں گھر مول لیا ہے
افسوس ہے نشمردہ قدم تم جو رکھو یاں　　اس راہ میں سر یاروں نے ہر گام دیا ہے
کاہش ہے عبث تم کو مرے جینے کی خاطر　　بیمار بھلا ایسا کوئی آگے جیا ہے

پلکوں سے رفو اُن نے کیا چاکِ دلِ میرؔ
کس زخم کو کس نازکی کے ساتھ سیا ہے

کس غم میں مجھ کو یارب یہ مبتلا کیا ہے　　دل ساری رات جیسے کوئی ملا کیا ہے
ان چار دن سے ہوں میں افسردہ کچھ وگرنہ　　پھوڑا سا دل بغل میں برسوں جلا کیا ہے
اُس گل کی اور اپنا تب منہ کیا ہے میں نے　　جب آشنا لبوں سے صلِ علا کیا ہے
دل داغ کب نہ دیکھا جی بار کب نہ پایا　　کیا کیا نہالِ خواہش پھولا پھلا کیا ہے
تڑپا ہے ایسا ایسا جو غش رہا ہے مجھ کو　　دل اک بغل میں جی کا دشمن پلا کیا ہے

کیا خاک میں ہمیں کو اُن نے نیا ملایا ٹیڑھی ہی چال گردوں اکثر چلا کیا ہی
چلتا نہیں ہی دل پر کچھ اس کے بس وگرنہ عرش آہ عاجزاں سے اکثر ہلا کیا ہی
ہم گو نہ ہوں جہاں میں آخر جہاں تو ہوگا تو نے بدی تو کی ہی ظالم بھلا کیا ہی

ہی مُنہ پہ میر کے کیا گردِ ملال تازہ
یہ خاک میں ہمیشہ یوں ہی رلا کیا ہی

باریک وہ کمر ہی ایسی کہ بال کیا ہی دل ہاتھ جو نہ آدے اُس کا خیال کیا ہی
جو بیکلی ہی ایسی چاہت گلوں کی اتنی کیا جانے ہمصفیر و لواب کی سال کیا ہی
پہنچا بہم علاقہ ای عزلتی کسو سے کرنا معاش اکیلے اتنا کمال کیا ہی
آغاز تو یہ ہی کچھ روتے ہیں خون ہر دم کیا جانے عاشقی کا یاروماٰل کیا ہی
پامال راہ اس کے کیا کیا عزیز دیکھے آئی نہ جب سمجھ میں گردوں کی چال کیا ہی
وہ سیم تن ہو ننگا تو لطفِ تن پر اس کے تنوجی کیے تھے صدقے اک جان و مال کیا ہی
سرگرمِ جلوہ اُس کو دیکھے کوئی سو جانے طرزِ خرام کیا ہی، حسن و جمال کیا ہی
میں بے نوا اڑا تھا بوسے کو اُن لبوں کے ق ہر دم صدا یہی تھی دے گذروٹال کیا ہی
پر چپ ہی لگ گئی جب اُن نے کہا کہ کوئی پوچھو تو شاہ جی سے ان کا سوال کیا ہی

گہ آپ میں نہیں ہو گہ منتظر کہیں ہو
کچھ میر جی تمھارا ان روزوں حال کیا ہی

دل مرا مضطرب نہایت ہی رنج و حرماں کی یہ بدایت ہی
منہ ادھر کر کبھو نہ وہ سویا کیا دُعا شب کی بے سرایت ہی
اب وہ مہ اور ایک مہ سے ملا چند درچند یہ حکایت ہی
ہر طرف بحث تجھ سے ہی ای عشق شکر تیرا تری شکایت ہی
ایسے رنج و عنا میں اودھر سے پرسشِ حال بھی عنایت ہی
دہر کا ہو گلہ کہ شکوۂ چرخ اُس ستمگر ہی سے کنایت ہی
مت مراعاتِ غیر رکھ منظور میرے حق میں یہی رعایت ہی
عاشق اب بڑھ گئے ہمیں چھانٹو اس میں سرکار کی کفایت ہی
کب ملے میر ملک داروں سے وہ گدائے شہرِ ولایت ہی

گرمی سے ابر کا اگر ہنگامہ سرد ہے[۵۱] — آنکھیں اگر یہی ہیں تو دریا بھی گرد ہے

مجنوں کو مجھ سے کیا ہے جنوں میں مناسبت — میں شہر بند ہوں وہ بیاباں نورد ہے

کیا جانیے کہ عشق میں خوں ہو گیا کہ داغ — چھاتی میں اب تو دل کی جگہ ایک درد ہے

واصل بحق ہوئے نہ جو ہم جانتے مر گئے — غیرت ہو کچھ مزاج میں جس کی وہ مرد ہے

ممکن نہیں کہ وصفِ علی کوئی کر سکے — تفرید کی جریدہ میں وہ پہلی فرد ہے

ٹھہرے نہ چرخِ نیلی پہ انجم کی چشمِ شوخ — اس قصر میں لگا جو ہے کیا لاجورد ہے

کس سے جدا ہوئے ہیں کہ ایسے ہیں دردمند
منہ میرؔ جی کا آج نہایت ہی زرد ہے

جانے میں قتل گہ سے ترا اختیار ہے — پر جائیں جو گئے ہیں سو رہ پُر غبار ہے

ہم آپ سے گئے سو الٰہی کہاں گئے[۵۲] — مدت ہوئی کہ اپنا ہمیں انتظار ہے

بس وعدۂ وصال سے کم دے مجھے فریب — آگے ہی مجھ کو تیرا بہت اعتبار ہے

بےتابی اُس سے طائر قدسی نہ کر سکے — اُس ترک صید بند کا وہ تو شکار ہے

مائل نہیں ہے سرو ہی تنہا تری طرف — گل کو بھی تیرے دیکھنے کا خار خار ہے

پیوند ہیں زمیں کا ہوا اُس گلی میں لیک — یوں بھی کہا نہ اُن نے یہ کس کا مزار ہے

کل سرو ناز باغ میں آیا نظر مجھے — میں نے فریب شوق سے جانا کہ یار ہے

اب دیکھ کر قرار کیا گر وصال کا — دل کو بغیر تیرے تنک بھی قرار ہے

سب فکر خانہ سازی میں منعم ہلاک ہیں[۵۳] — بنیاد زندگانی کی ناپائدار ہے

کب تک ستم کبھو تو دلاسا بھی دیجیے
بالفرض میرؔ ایسا ہی تقصیر وار ہے

جنوں کا عبث میرے مذکور ہے — جوانی دِوانی ہے مشہور ہے

کہو چشمِ خونبار کو چشم تم — خدا جانے کب کا یہ ناسور ہے

فلک پر جو مہ ہے تو روشن ہے یہ — کہ منہ سے ترے نسبت دور ہے

گدا شاہ دونوں ہیں دل باختہ — عجب عشق بازی کا دستور ہے

---

۵۱ مطابق اصل ۱۲

۵۲ بیخودی لےگئی کہاں ہم کو ٭ دیر سے انتظار ہے اپنا (میر)

۵۳ پیری میں مول لیں ہیں منعم حویلیوں کو ٭ ڈھیتا پھرے ہے آپہی اس پر بنا تو دیکھو

قیامت ہی ہوگا جو رفع حجاب　　نہ بے مصلحت یار مستور ہی
ہم اب ناتوانوں کو مرنا ہی صرف　　نہیں وہ کہ جینا بھی منظور ہی
ستم ہیں ہمارے قسم ہی تمھیں　　کرو صرف جتنا کہ مقدور ہی
نیاز اپنا جس مرتبے میں ہی یہاں　　اُسی مرتبے میں وہ مغرور ہی
ہوا حال بندہ کا گو کچھ خراب　　خدائی ابھی اُس کی معمور ہی

[illegible] شاید اُس شمع رو کا خیال
[illegible] اب میرؔ کے منہ پہ کچھ نور ہی

زلف ہی درہم نہیں ابرو بھی پُر خم اور ہی　　یہاں تلف ہوتا ہی عالم وہاں سو عالم اور ہی
پیٹ لینا سر لئے دل کے شروعِ عشق تھا　　سینہ کوبی متصل ہی اب یہ ماتم اور ہی
جوں کفِ دریا کو دریا سے ہی نسبت دور کی　　ابر بھی ووں اور کچھ ہی دیدۂ نم اور ہی
رہتے رہتے منتظر آنکھوں میں جی آیا ندان　　دم غنیمت جان اب مہلت کوئی دم اور ہی

جی تو جانے کا نہیں اندوہ ہی ہی ایک میرؔ
حشر کو اُٹھنا پڑے گا پھر یہ اک غم اور ہی

رشتہ کیا ٹھہرے گا یہ جیسے کہ مو نازک ہی　　چاک دل پلکوں سے مت سی کہ رفو نازک ہی
شاخِ گل کاہے کو اس لطف سے لچکے ہی کہیں　　لاگ والا کوئی دیکھے سمجھے، تو نازک ہی
چشمِ انصاف سے برقع کو اُٹھا دیکھو لسے　　گل کے منہ سے تو کہیں پردہ وہ رو نازک ہی
لطف کیا دیوے تمھیں نقشِ حصیرِ درویش　　بوریا پوشوں سے پوچھو یہ اُتو نازک ہی
بٹرے کھاتا ہی تو آتا ہی نظر پان کا رنگ　　کس قدر ہائے رے وہ جلد گلو نازک ہی
گل سمجھ کر نہ کہیں بیکلی کرنے لگیو　　بلبل اُس لالۂ خوش رنگ کی خو نازک ہی

رکھے تا چند خیال اس سرِ پرشور کا میرؔ
دل تو کانپا ہی کرے ہی کہ سبو نازک ہی

مستی میں جا و بیجا مدِ نظر کہاں ہی　　بے خود ہیں اُس کی آنکھیں اس کو خبر کہاں ہی
شب چند روز سے میں دیکھا نہیں وہ چہرہ　　کچھ سوچ کر منجم بارے قمر کہاں ہی
سیمیں تنوں کا ملنا چاہے ہی کچھ تمول　　شاہد پرستیوں کو ہم پاس زر کہاں ہی
جوں آرسی کرے ہی منہ دیکھنے کی باتیں　　دل کی توجہ اُس کی ہمدم ادھر کہاں ہی

پانی ہو بہ گئے سب اجزا بدن کے لیکن
یوں بھی کہا نہ اُن نے وہ چشمِ تر کہاں ہے

خضر و مسیح سب کو جیتے ہی موت آئی
اور اس مرض کا کوئی اب چارہ گر کہاں ہے

لے اس سرے سے یارو اُجڑی ہے اس سرے تک
اقلیمِ عاشقی میں آباد گھر کہاں ہے

اُٹھنے کی اک ہوس ہے ہم کو قفس سے ورنہ
شایستۂ پریدن بازو میں پر کہاں ہے

پیرانہ سر چلے ہیں اُٹھ کر گلی سے اُس کے
کیا پیش آوے دیکھیں وقتِ سفر کہاں ہے

۵۱ جاتا نہیں اگر وہ مسجد سے میکدے کو
پھر میر جمعہ کی شب دو دو پہر کہاں ہے

کیا کہیے کلی سا وہ دہن ہے
اس میں بھی جو سوچیے سخن ہے

اُس گل کو لگے ہے شاخِ گل کب
یہ شاخچہ بندیِ چمن ہے

وابستگی مجھ سے شیشۂ جاں کی
اس سنگ سے ہے کہ دل شکن ہے

کیا سہل گزرتی ہے جنوں سے
تحفہ ہم لوگوں کا چلن ہے

لطف اُس کے بدن کا کچھ نہ پوچھو
کیا جانیے جان ہے کہ تن ہے

وے بندِ قبا کھُلے تھے شاید
صد چاک گلوں کا پیرہن ہے

گہ دیر میں ہیں گہے حرم میں
اپنا تو یہی دوانہ پن ہے

ہم کشتۂ عشق ہیں ہمارا
میدان کی خاک ہی کفن ہے

کر میر کے حال پر ترحم
وہ شہر غریب و بے وطن ہے

ہم مست بھی ہو دیکھا آخر مزا نہیں ہے
ہشیاری کے برابر کوئی نشا نہیں ہے

شوقِ وصال ہی میں جی کھپ گیا ہمارا
یا آنکہ ایک دم وہ ہم سے جدا نہیں ہے

ہر صبح اُٹھ کے تجھ سے مانگوں ہوں میں تجھی کو
تیرے سوائے میرا کچھ مدعا نہیں ہے

زیرِ فلک رُکا ہے اب جی بہت ہمارا
اس بے فضا قفس میں مطلق ہوا نہیں ہے

آنکھیں ہماری دیکھیں لوگوں نے اشک افشاں
اب چاہ کا کسو کے پردا رہا نہیں ہے

منہ جن نے میرا دیکھا ایک آہ دل سے کھینچی
اس دردِ عاشقی کی آیا دوا نہیں ہے

۵۱ جا کر شراب خانے میں رہتا نہیں تو پھر - یہ کیا کہ میر جمعہ ہی کی رات گھر نہیں (میر)

تھیں پیش از آشنائی کیا آشنا نگاہیں
اب آشنا ہوئے پر آنکھ آشنا نہیں ہے
کریے جو ابتدا تو تا حشر حال کہیے
عاشق کی گفتگو کو کچھ انتہا نہیں ہے
پردا ہی ہم نے دیکھا چہرہ پہ گاہ و بیگاہ
اتنا بھی منہ چھپانا کچھ خوشنما نہیں ہے

میں روؤں تم ہنسو ہو کیا جانو میر صاحب
دل آپ کا کسو سے شاید لگا نہیں ہے

کیا تنِ نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے
کیا بدن کا رنگ ہے تہ جس کی پیراہن پہ ہے
گرد جب اٹھتی ہے اک حسرت سے ہم جاتے ہیں دیکھ
وحشیانِ دشت کی آنکھ اس شکار افگن پہ ہے
کثرتِ پیکاں سے [illegible]
اب شرف دل کو ہمارے پارۂ آہن پہ ہے
کون یوں ہی ترک رعنا زینتِ فتراک تھا
خوں سے گلکاری [illegible] دامن پہ ہے
سر اٹھانے کی نہیں ہے ہم کو فرصت عشق میں
ہر دم اک تیغ جفائے تازہ یاں گردن پہ ہے
نوحہ گر کر مجھ کو دکھلایا غمِ دل نے ندان
شیون اب موقوف یاروں کا مرے شیون پہ ہے
ہو چکا رہنا مرا بستی میں آخر کب تلک
نالۂ شب سے قیامت روز مرد و زن پہ ہے
خرمنِ گل سے لگیں ہیں دور سے کوڑوں کے ڈھیر
تو ہو رونے سے ہمارے رنگ اک گلخن پہ ہے
وے بھری پلکیں الٹ دیتی ہیں صف اک آن میں
اب لڑائی ہند میں سب اس سیہ پلٹن پہ ہے

تو تو کہتا ہے کہ میں نے اس طرف دیکھا نہیں
خونِ ناحق میر کا یہ کس کی پھر چتون پہ ہے

یہ رات ہجر کی یہاں تک تو دکھ دکھاتی ہے
کہ شکل صبح مری سب کو بھول جاتی ہے
تپش کے دم ہی تئیں مجھ سے ہے یہ خونگرمی
وگرنہ تیغ تری کب گلے لگاتی ہے
ہنسے ہے چاک قفس کھلکھلا کے مجھ اوپر
چمن کی یادیں جب بیکلی رلاتی ہے

ہوا ہے میر سے روشن کہ لجھی ہے شمع
زباں ہلانے میں پروانہ کو جلاتی ہے

نہ گلشن میں چمن پر اُن نے بلبل تجھ کو جا دی ہے
سپاس ایزد کے کر جن نے کہ یہ ڈالی نوا دی ہے
نہیں ٹک بیٹھنے دیتے تم اپنی بزم میں ہم کو
مروت رسم تھی مدت کی سو تم نے اُٹھا دی ہے
رہائی چنگل باز فلک سے مجھ کو مشکل تھی
مری یہ بند چڑیا کی سی مولے نے چھڑا دی ہے
گلی میں اپنی قدغن کر رکھو آنے نہ پاؤں میں
کہیں کیا اور بھی دل کے لگانے کی منادی ہے

تپش سے رنگ اُڑ جاوے قلق سے جان گھبراوے
دیا ہے دل الٰہی ہم کو یا کوئی بلا دی ہے

در گلزار بیش از صبح وا ای باغباں مت کر
اُڑا لیتی ہے مٹی بھی صبا اک جو پر با دی ہے

کوئی صورت نہیں اس گھر سے اب تیرے نکلنے کی
قیامت کی ہے جن نے آرسی تجھ کو دکھا دی ہے

مجھے منظور کیا ہے زلف و خال و خطِ خوباں سے
خدا نے دیکھنے کی لت ہی آنکھوں کو لگا دی ہے

کجی ذہن اس وادی میں گمراہی کی ہے باعث
سلیم الطبع کو تو پاؤں کا ہر نقش ہادی ہے

لگا رہتا ہے سینے ہی سے بیٹھا ہوں کہ سوتا ہوں
غرض چھاتی مری داغ جدائی نے جلا دی ہے

نہ چھوٹا دل میں کچھ اس کے گئے پر غارتِ غم سے
ہزار افسوس کیا بستی محبت نے لٹا دی ہے

نہ کٹتی تاکش ہوتی گر فقیری ساتھ الفت کے
ہمیں جب اُن نے گالی دی ہے تب ہم نے دعا دی ہے

ہوئی ہے دل کی محویت سے یکساں یہاں غم و فرحت
نہ ماتم مرنے کا ہے میر نے جینے کی شادی ہے

کیا حال بیاں کریے عجب طرح پڑی ہے
وہ طبع تو نازک ہے کہانی یہ بڑی ہے

کیا فکر کروں میں کہ ٹلے آگے سے گردوں
یہ گاڑی مری راہ میں بے ڈول اڑی ہے

ہے چشمک انجم طرف اس مہ کے اشارہ
دیکھو تو مری آنکھ کہاں جا کے لڑی ہے

کیا اپنی شرر ریزی کہیں پلکوں کی صف کی
ہم جانتے ہیں ہم پہ جو یہ باڑھ جھڑی ہے

وے دن گئے جو پہروں لگی رہتی تھیں آنکھیں
اب یاں نہیں مہلت کوئی پل کوئی گھڑی ہے

ایسا نہ ہوا ہوگا کوئی واقعہ آگے
اک خواہش دل ساتھ مرے جیتی گڑی ہے

کیا نقش میں مجنوں ہی کے تھی رفتگیِ عشق
لیلیٰ کی بھی تصویر تو حیران کھڑی ہے

جاتے ہیں چلے متصل آنسو جو ہمارے
ہر تارِ نگہ آنکھوں میں موتی کی لڑی ہے

کھنچتا ہی نہیں ہم سے قدم خم شدہ ہرگز
پے سست کماں ہاتھ پر اب کتنی کڑی ہے

گل کھائے ہیں افراط سے ہیں عشق میں اس کے
اب ہاتھ مرا دیکھو تو پھولوں کی چھڑی ہے

وہ زلف نہیں منعکس دیدۂ تر میر
اس بحر میں اشعار سے زنجیر پڑی ہے

کس فتنہ قد کی ایسی دھوم آنے کی پڑی ہے
ہر شاخ گل چمن میں بھبھک ہوئی کھڑی ہے

وا شد ہوئی نہ بلبل اپنی بہاریں بھی
کیا جانیے کہ جی میں یہ کیسی گل جھڑی ہے

نا دیدنی دکھاوے کیونکر نہ عشق ہم کو
کس فتنۂ زماں سے آنکھ اپنی جا لڑی ہے

وے دن گئے کہ پھروں کرتے نہ ذکر اُس کا
آتش سی پھک رہی ہے سارے بدن میں میرے
کیا کچھ ہمیں کو اُس کی تلوار کھا گئی ہے

اب نام یار اپنے لب پر گھڑی گھڑی ہے
دل میں عجب طرح کی چنگاری آ پڑی ہے
ایسی ہی اک جڑی ہے اُس نے جہاں جڑی ہے

کیا میر سر جھکاویں ہر کم بغل کے آگے
نام خدا آنکھوں کی عزت بہت بڑی ہے

آنکھیں نہیں یہاں کھلتیں ایدھر کو نظر بھی ہے
گو شکل ہوائی کی سر چرخ نہیں کھینچا
اس منزل دلکش کو منزل نہ سمجھئے گا
مجھ حال شکستہ کی تا چند یہ بے وقری

مُنہ اپنا نہیں ہم کو کچھ تم کو خبر بھی ہے
ای آہ شرر افشاں کچھ تجھ میں اثر بھی ہے
خاطر میں رہے یہاں سے درپیش سفر بھی ہے
کچھ کسر ہیں اب میرے ای شوخ کسر بھی ہے

یہ کیا ہے کہ مُنہ نوچے لے چاک کرے سینہ
کر عرض جو کچھ تجھ میں ای میر ہنر بھی ہے

کوفت سے جان لب پہ آئی ہے
ہم نے کیا چوٹ دل پہ کھائی ہے

لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر
شوق نے بات کیا بڑھائی ہے

آرزو اُس بلند و بالا کی
کیا بلا میرے سر پہ لائی ہے

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

ہے تصنع کہ لعل ہیں وے لب
یعنی اک بات سی بنائی ہے

دل سے نزدیک اور اتنا دور
کس سے اُس کو کچھ آشنائی ہے

بیستوں کیا ہے کوہ کن کیسا
عشق کی زور آزمائی ہے

جس مرض میں کہ جان جاتی ہے
دلبروں ہی کی وہ جدائی ہے

یہاں ہوئے خاک سے برابر ہم
وھاں وہی ناز خودنمائی ہے

ایسا موتی ہے زندہ جاوید
رفتۂ یار تھا جب آئی ہے

مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میر
کیا دوانے نے موت پائی ہے

اس شوخ سے ہمیں بھی اب یاری ہو گئی ہے
شرم انکھڑیوں میں جس کی عیاری ہو گئی ہے

روتا پھرا ہوں برسوں لوہو چمن چمن میں
کوچے میں اُس کے یکسر گلکاری ہوگئی ہے

یک جا اٹک کے رہنا ہے ناتمامی ورنہ
سب میں وہی حقیقت یہاں ساری ہوگئی ہے

جب خاک کے برابر ہم کو کیا فلک نے
طبع خشن میں تب کچھ ہمواری ہوگئی ہے

مطلق اثر نہ دیکھا [illegible] کی آہ و زاری
اب نالہ و فغاں سے بیزاری ہوگئی ہے

اُس سے رو چھپانا [illegible] نہیں میسر
مرنے میں اس سے ہم کو ناچاری ہوگئی ہے

ہر بار ذکر محشر کیا یار کے در اوپر
ایسی تو یہاں قیامت سو باری ہوگئی ہے

اندازِ شوخی اُس کے آتے نہیں سمجھ میں
کچھ اپنی بھی طبیعت یہاں عاری ہوگئی ہے

شاہی سے کم نہیں ہے درویشی اپنے ہاں تو
اب عیب کچھ جہاں میں ناداری ہوگئی ہے

ہم کو تو دردِ دل ہے، تم زرد کیوں ہو ایسے ؟
کیا میر جی تمھیں کچھ بیماری ہوگئی ہے

کہاں یار وقلیں اب جو دنیا کرے ہے
کبھو قدرداں عشق پیدا کرے ہے

یہ طفلانِ بازار جی کے ہیں گاہک
وہی جانتا ہے جو سودا کرے ہے

چھپائیں ہوں آنکھیں ہی ان نے تو کہیے
وہ ہر بات کا ہم سے پردا کرے ہے

جو رونا ہے راتوں کو اپنا یہی تو
کنارہ کوئی دن میں دریا کرے ہے

ٹھسک[۵۱] اُس کے چلنے کی دیکھو تو جانو
قیامت ہی ہر گام برپا کرے ہے

۵۱ فتنہ در سر بتانِ حشر خرام ؎ ہائے رے کس ٹھسک سے چلتے ہیں میر

مرے شوقِ پروازِ گلشن میں کیوں نا — اسیروں کی یہاں کون پروا کرے ہے
بنی صورتیں کیسی کیسی بگاڑیں — سمجھتے نہیں ہم فلک کیا کرے ہے
خط افشاں کیا خونِ دل سے تو بولا — بہت اب تو رنگین انشا کرے ہے

ہلاک آپ کو میر مت کر دوانے
کوئی ذی شعور آہ ایسا کرے ہے

کیا پوچھتے ہو عاشق راتوں کو کیا کرے ہے — گاہے بکا کرے ہے گاہے دعا کرے ہے
دانستہ اپنے جی پر کیوں تو جفا کرے ہے — اتنا بھی میرے پیارے کوئی کڑھا کرے ہے
فتنے سپہر کیا کیا برپا کیا کرے ہے — سو خواب میں کبھو تو مجھ سے ملا کرے ہے
کس ایسے سادہ رو کا حیران حسن ہے یہ — مرآت گاہ و بیگہ بھبھک رہا کرے ہے
ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن — سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے
کیا کہیے داغ دل ہے ٹکڑے جگر ہے سارا — جانے وہی جو کوئی ظالم وفا کرے ہے
اس بت کی کیا شکایت راہ و روش کی کریے — پردے میں بد سلوکی ہم سے خدا کرے ہے
گرم آ کر ایک دن وہ سینے سے لگ گیا تھا — تب سے ہماری چھاتی ہر شب جلا کرے ہے
کیا چال یہ نکالی ہو کر جوان تم نے — اب جب چلو ہو دل کو ٹھوکر لگا کرے ہے
دشمن ہو یار جیسا درپے ہے خوں کے میرے — ہے دوستی جہاں وہاں یوں ہی ہوا کرے ہے
سمجھا ہے یہ کہ مجھ کو خواہش ہے زندگی کی — کس ناز سے معالج میری دوا کرے ہے
حالت میں غش کے کس کو خط لکھنے کی ہے فرصت — اب جب تب ادھر کو جی ہی چلا کرے ہے
سرکا ہے جب وہ برقع تب آپ سے گئے ہیں — منہ کھولنے سے اس کے اب جی چھپا کرے ہے
بیٹھے ہے یار آ کر جس جا پہ ایک ساعت — ہنگامۂ قیامت واں سے اٹھا کرے ہے
سوراخ سینہ میرے رکھ ہاتھ بند مت کر — ان روزنوں سے دل تک کسب ہوا کرے ہے
کیا جانے کیا تمنا رکھتے ہیں یار سے ہم — اندوہ ایک جی کو اکثر رہا کرے ہے
گل ہی کی اور ہم بھی آنکھیں لگا رکھیں گے — ایک آدھ دن جو موسم اب کی وفا کرے ہے
گہ سرگزشت ان نے فرہاد کی نکالی — مجنوں کا گاہے قصہ بیٹھا کہا کرے ہے

ایک آفتِ زماں ہے یہ میر عشق پیشہ
پردے میں سارے مطلب اپنے ادا کرے ہے

ربط دل کو اُس بتِ بے مہر کینہ ور سے ہے
کیا کہوں میں آہ مجھ کو کام کس پتھر سے ہے

کس کو کہتے ہیں نہیں میں جانتا اسلام و کفر[1]
دیر ہو یا کعبہ مطلب مجھ کو تیرے در سے ہے

کیوں نہ اے سیّد پسر دل کھینچے یہ موئے دراز
اصل زلفوں کی تیرے گیسوئے پیغمبر سے ہے

[illegible]
[illegible]

کیا کہیں دل کچھ کھچے جاتے ہیں اودھر ہر طرف
کام ہم بے طاقتوں کو عشق زور آور سے ہے

رحم بھی دینا تھا تھوڑا ہائے اس خوبی کے ساتھ
تجھ سے کیا کل گفتگو یہ داور محشر سے ہے

کیا کروں گا اب میں بے پر ہوس گلزار کی
لطف گلگشت اے نسیمِ صبح بال و پر سے ہے

مرنے کے اسباب پڑتے ہیں بہت عالم میں لیک
رشک اُس پر ہے کہ جس کی موت اس خنجر سے ہے

ناز و خشم و بے دماغی اس طرف سب ہیں و لے
کچھ کسو بھی طور کی رنجش بھلا ادھر سے ہے

دیکھ گل کو ٹک کہ ہر یک سر چڑھا لیتا ہے یہاں
اس سے پیدا ہے کہ عزت اس چمن میں زر سے ہے

کانپتا ہوں میں تو تیرے ابرؤوں کے خم ہوئے
قشقریہ[2] کیا مجھے تلوار کے کچھ ڈر سے ہے

---

[1] عاشق ہم از اسلام خرابات ہم از کفر ؎ پروانہ چراغ حرم و دیر نہ داند۔ عرفی

[2] قشقریہ۔ جھرجھری۔ پھریری۔

اشک پے در پے چلے آتے تھے چشم زار سے
ہر نگہ کا تار مانا رشتۂ گوہر سے ہے

باد دیے ہی میں پڑا پاتے ہیں جب تب تجھ کو میر
کیا خفا اے خانماں برباد کچھ تو گھر سے ہے

کارِ دل اُس مہ تمام سے ہے
کاہش اک روز مجھ کو شام سے ہے

تم نہیں فتنہ ساز سچ صاحب
شہر پر شور اس غلام سے ہے

بوسہ لے کر سرک گیا کل میں
کچھ کہو کام اپنے کام سے ہے

کوئی تجھ سا بھی کاش تجھ کو ملے
مدعا ہم کو انتقام سے ہے

کب وہ مغرور ہم سے مل بیٹھا
ننگ جس کو ہمارے نام سے ہے

خوش سرانجام وے ہی ہیں جن کو
اقتدا اولیں امام سے ہے

شعر میرے ہیں سب خواص پسند[۵۱]
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

شیطنت سے نہیں ہے خالی شیخ
اُس کی پیدائش احتلام سے ہے

سر جھکاؤں تو اور ٹیڑھے ہو
کیا تمھیں چڑھ مرے سلام سے ہے

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا
ہر سخن اُس کا اک مقام سے ہے

جل گیا دل مگر ایسی جو بلا نکلے ہے
جیسے لُو جلتی مرے منہ سے ہوا نکلے ہے

لخت دل قطرۂ خوں ٹکڑے جگر ہو ہو کر
کیا کہوں میں کہ مری آنکھوں سے کیا نکلے ہے

میں جو ہر سو نگراں ہوں دیکھنے ہو کے مضطر
آنسو ہر میری نگہ ساتھ گیا نکلے ہے

پارسائی دھری رہ جائے گی مسجد میں شیخ
جو وہ اس راہ کبھو مستی میں آ نکلے ہے

گو کہ پردا کرے جوں ماہِ شب ابر وہ شوخ
کب چھپا رہتا ہے ہر چند چھپا نکلے ہے

بھیڑیں[۵۲] ٹلجاتی ہیں آگے سے اُس ابرو کے ہلے
سیکڑوں میں سے وہ تلوار چلا نکلے ہے

بنتی ہے سامنے اس کے گئے سجدہ ہی ولے
جی سمجھتا ہے جو اس بُت میں ادا نکلے ہے

بد کہیں نالہ کشاں ہم ہیں کہ ہم سے ہر روز
شور و ہنگامہ کا اک طور نیا نکلے ہے

[۵۱] حدیث مطلب با مدعائے زیرلبی است ؛ کہ اہل بزم عوام اند و گفتگو عربی است (فیضی)
[۵۲] بھیڑیں ٹلیں اس ابروئے خمدار کے ہلتے ؛ لاکھوں میں اس اوباش نے تلوار چلائی (میر تقی)

اجڑے سے خالی نہیں عشق میں مارے جانا
دے ہی جو سر کوئی کچھ یہاں سے بھی پا نکلے ہے

لگ چلے ہی مگر اس گیسوئے عنبر بو سے
ناز کرتی ہوئی اس راہ صبا نکلے ہے

کیا ہے اقبال کہ اس دشمن جاں کے آگے
منہ سے ہر ایک کے سو بار دعا نکلے ہے

سوز سینے کا بھی دل چسپ بلا ہے اپنا
داغ جو نکلے ہے چھاتی سے لگا نکلے ہے

سارے دیکھے ہوئے ہیں دلی کے عطار و طبیب
دل کی بیماری کی کس پاس دوا نکلے ہے

کیا فریبندہ ہے رفتار ہے کینہ کی جدا
اور گفتار سے کچھ پیار جدا نکلے ہے

دلسا بیچارا نہیں دل میر کا جو رہ نہ سکے
چلنا پھرتا [illegible] پاس بھی جا نکلے ہے

عبرت سے دیکھ جس جا یہاں کوئی گھر بنے ہے
پڑتے ہیں جسم ڈھ کر دیوار و در

ہیں دل گداز جن کے کچھ چیز مال وے ہیں
ہوتے ہیں ملتفت تو پھر خاک زر بنے ہے

شب جوش غم سے جس دم لگتا ہے دل تڑپنے
ہر زخم سینہ اس دم یک چشم تر بنے ہے

یہاں ہر گھڑی ہماری صورت بگڑتی ہی گی
چہرہ ہی وہاں انھوں کا دو دو پہر بنے ہے

ٹک رک کے صاف طینت نکلے ہے اور کچھ ہو
پانی گرہ جو ہووے تو پھر گہر بنے ہے

ہے شعبدہ کے فن میں کیا دست میکشوں کا
زاہد انھوں کا جا کر آدم سے خر بنے ہے

نکلے ہے صبح بھی یہاں صندل ملے جبیں کو
عالم میں کام کس کا بے درد سر بنے ہے

سارے دکھوں کی اے دل ہو جائے گی تلافی
صحبت ہماری اس کی ٹک بھی اگر بنے ہے

ہر اک سے ڈھب جدا ہے سارے زمانہ کا بھی
بنتی ہے جب کسو کی یک طور پر بنے ہے

برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہمسا صاحب صاحب نظر بنے ہے

یاران دیر و کعبہ دونوں بلا رہے ہیں
اب دیکھیں میر اپنا جانا کدھر بنے ہے

تمام شد دیوان دوم میر تقی میر

دیوانِ سوم

میر تقی میر دہلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میرے مالک نے مرے حق میں یہ احسان کیا
خاکِ ناچیز تھا میں سو مجھے انسان کیا

کس مرے دل کی خرابی ہوئی اے عشق دریغ
تو نے کس خانۂ مطبوع کو ویران کیا

ضبط تھا جب تئیں چاہت نہ ہوئی تھی ظاہر
اشک نے بہ کے مرے چہرے پہ طوفان کیا

انتہا شوق کی دل کے جو صبا سے پوچھی
اک کفِ خاک کی اُن نے پریشان کیا

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

دین و دل کے غم کو آساں ناتواں میں لے گیا
یا محبت کہہ کے یہ بارِ گراں میں لے گیا

خاک و خوں میں لوٹ کر رہ جانے ہی کا لطف ہے
جان کو کیا جو سلامت نیم جاں میں لے گیا

سرگزشتِ عشق کی تہ کو نہ پہونچا یاں کوئی
گرچہ پیشِ دردمنداں یہ داستاں میں لے گیا

عرصۂ دشتِ قیامت باغ ہو جائیگا سب
اس طرح سے جو یہ چشمِ خونفشاں میں لے گیا

ذکر دل جانے کا وہ پرکینۂ حسن کہنے لگا
یہ سناتے ہو کسے کیا مہرباں میں لے گیا

ایک جہاں مہر و وفا کی جنس تھی میرے کنے
لیکن اسکو پھیر ہی لایا جہاں میں لے گیا

ریختہ کا ہے کو تھا اس رتبۂ اعلیٰ میں میر
جو زمیں نکلی اُسے تا آسماں میں لے گیا

میرا ہی معلّمِ عمل تھا
مجنوں کے دماغ میں خلل تھا

دل ٹوٹ گیا تو خون نہ نکلا
شیشہ یہ بہت ہی کم بغل تھا

تھیں سب کی نظر میں اُسکی کھوئیں
افسوس یہ شعر مبتذل تھا

کیا قدر ہے ریختے کی گو میں / اس فن میں نظیری کا بدل تھا

تھا نزع میں دستِ میر دل پر
شاید غم کا بھی محل تھا

کرتا جنوں جہان میں بے نام و ننگ آیا / اک جمع لڑکوں کا بھی لے لے کے سنگ آیا
شب شمع کو بھی چشمک مجلس میں لگ گئی تھی / سرگرمِ شوقِ مردن جس دم پتنگ آیا
فتنے فساد اُٹھینگے گھر گھر میں خون ہونگے / گر شہر میں خراماں وہ خانہ جنگ آیا
ہر سر نہیں ہے شایاں شورِ قلندری کا / گو شیخ شہر باندھے زنجیرِ و زنگ آیا
چسپاں ہے اُس بدن سے پیراہنِ حریری / اتنی بھی تنگ پوشی جی اب تو تنگ آیا
باتیں ہماری ساری بے ڈھنگیاں ہیں یعنی / بوڑھے ہوئے پہ ہمکو اتنا تک نہ ڈھنگ آیا

بشرے کی اپنے رونق اے میر عارضی ہے
جب دل تو خوں کیا تو چہرے پہ رنگ آیا

دل اگر کہتا ہوں تو کہتا ہے وہ یہ دل ہے کیا / ایسے ناداں دلربا کے ملنے کا حاصل ہے کیا
جاننا باطل کسو کو یہ قصورِ فہم ہے / حق اگر سمجھے تو سب کچھ حق ہی یاں باطل ہے کیا
یاں کوئی دن رات وقفہ کرکے قصد آگے کا کر / کارواں گاہِ جہانِ رفتنی منزل ہے کیا
تک رہے ہیں مر سکے سو ہم تک رہے ہیں ایک سے / دیدۂ حیراں ہمارا دیدۂ بسمل ہے کیا
وہ حقیقت ایک ہی ساری نہیں ہے سب میں تو / آپ سا ہر رنگ میں یہ اور کچھ شامل ہے کیا
چوٹ میرے دل میں ایسی ہے کہ ہوں میں دم بخود / وہ کشندہ یوں نہیں کہتا ہے کہ تو گھائل ہے کیا
کہتے ہیں ظاہر ہے ایک ہی لیلیٰ ہفت اقلیم میں / اس عبارت کا نہیں معلوم کچھ محمل ہے کیا
ہم تو سو سو بار مر رہتے ہیں ایک ایک آن میں / عشق میں اُسکے گزرنا جان سے مشکل ہے کیا
شاخ پر گل یا نہال اُودھر جھکے جاتے ہیں سب / قامتِ دلکش کا اسکے سرو بھی مائل ہے کیا

مرثیہ میرے بھی دل کا رقت آور ہے بلا
محتشم[۱] سو میر میں کیا جانوں اور مقبل ہے کیا

ان دلبروں سے رابطہ کرنا ہے کام کیا / کر اک سلام پوچھنا صاحب کا نام کیا

۱؎ ملا محتشم کاشی ایران کا ایک مشہور مرثیہ گو تھا جس کا ہفت بند نہایت مقبول و مشہور ہے۔ دسویں صدی ہجری میں انتقال کیا۔ ملا مقبل بھی ایران کا ایک مشہور مرثیہ گو تھا۔ جس کے مراثی چھپ چکے ہیں۔ ۱۲

حیرت ہے کھولیں چشم تماشا کہاں کہاں
حسن و جمال ویسا ہی اس کا خرام کیا

بس اک نگاہ گرم جہاں اُن سے مل گئے
عاشق کو دلبروں سے سلام و پیام کیا

شکر خدا کہ سر نہ فرو لائے ہم کہیں
کیا جانیں سجدہ کہتے ہیں کسکو سلام کیا

اس کنج لب پہ چپکے ہوئے منھ کو رکھے ہم
دلچسپ اس مقام میں حرف و کلام کیا

بس جائے اُسکے چہرے سے کرتے ہیں گفتگو
مرآت و ماہ و گل کا ہے اس جا مقام کیا

کہتا ہے کون بدر میں نقصان کچھ رہا
پر منھ کھلے پہ اُسکے ہے ماہِ تمام کیا

پر جانوں ہوں کہ دل کو ہے اس رو سے لاگ
کیا جانوں پیش آوے ہے اب صبح و شام کیا

تسبیح تک تو میر نے رکھا کلال کے
وقت نماز اب بھی ہوئے تھے امام کیا

چال یہ کیا تھی کہ ادھر کو گزارا نہ کیا
دور ہی دور پھرے پاس ہمارا نہ کیا

اس کو منظور نہ تھی ہم سے محبت کرنی
ایک چشمک بھی نہ کی ایک اشارا نہ کیا

بعد دشنام تھی بوسے کی توقع بھی ولے
تلخ سننے کے تئیں ہم نے گوارا نہ کیا

مر کے بے حوصلہ لوگوں میں کہایا فرہاد
چند سے پتھر ہی سے سر اور بھی مارا نہ کیا

جی رہے ڈوبتے دریائے غم عشق میں لیک
بلہوس کی سی طرح ہم نے کنارا نہ کیا

ہم جاں صدقے کی اُسپر نہ زیاں دیکھا نہ سود
ہم تو کچھ دوستی میں وارے کا سارا نہ کیا

لے گیا مٹی بھی دروازے کی اُسکے میں میر
پر اطبا نے مرے درد کا چارا نہ کیا

وہ دل نہیں رہا ہے تعب جو اُٹھائے گا
یا لوہو اشک خونی سے منھ پر بہائے گا

اب یہ نظر پڑے ہے کہ برگشتہ وہ مژہ
کاوش کرے گی ٹک بھی تو سنبھلا نہ جائے گا

کھینچا جو میں وہ ساعد سیمیں تو کہہ اُٹھا
بس بس کہیں چھپا بھی صاحب غش آئے گا

رکھتے تو اُس کے طور پہ مجلس میں شیخ کے
پھر بھی ملا تو خوب سا اُن کو رجھائے گا

جلوے سے اُسکے جل کے ہوئے خاک سنگ و خشت
کیا اب دل بہت ہے یہ کیا تاب لائے گا

ہم رہ چکے جو ایسے ہی غم میں کھپا کئے
معلوم جی کی چال سے ہوتا ہے جائے گا

اٹک کر لگی ہے پانوں میں زلف اُسکی پیچدار
بازی نہیں یہ سانپ جو کوئی کھلائے گا

اُڑتی رہے گی خاک جنوں گرتی دشت دشت
کچھ دست اگر یہ بے سر و ساماں بھی پائے گا

در پے ہے اب وہ سادہ قراول پسر بہت
دیکھیں تو میر کے تئیں کوئی بچائیگا

وہ جو گلشن میں جلوہ ناک ہوا
پھول غیرت سے جل کے خاک ہوا

اُسکے دامن تلک نہ پہونچا ہاتھ
تھا سر دست جیب چاک ہوا

کس قدر تھا خبیث شیخ شہر
اُسکے مرنے سے شہر پاک ہوا

ڈریے اُس رشک خور کی گرمی سے
کچھ تو ہے ہم سے جو تپاک ہوا

میر ہلکان ہو گیا تھا بہت
سو طلب ہی میں پھر ہلاک ہوا

کیا رو دیے ہمیں کو یوں آن کر کے مارا
پھر بہت دگر سے طوفان کر کے مارا

تربت کا میری لوحہ آئینے سے کیے ہے
یعنی کہ اُن نے مجکو حیران کر کے مارا

بیگانہ جان اُن نے کیا چوٹ رات کو کی
منہ دیکھ دیکھ میرا پہچان کر کے مارا

پہلے گلے لگایا پھر دست جور اُٹھایا
آتو اُن نے لیکن احسان کر کے مارا

اُس سست عہد نے کیا کی تھی قسم مجھی سے
بہتوں کو اُن نے عہد و پیمان کر کے مارا

حاضر یراق ہونا کاہے کو چاہیے تھا
مجھ بینوا کو کیا سامان کر کے مارا

کہنے لگا کہ شب کو میرے تئیں نشا تھا
مستانہ میر کو میں کیا جان کر کے مارا

گیا حسن خوبان بدراہ کا
ہمیشہ رہے نام اللہ کا

پشیماں ہوا دوستی کر کے میں
بہت مجکو ارمان تھا چاہ کا

جگر کی سپر پھوٹ جانے لگی
بلا توڑ ہے ناوک آہ کا

اسیری کا دیتا ہے مژدہ مجھے
مرا زمزمہ گاہ و بیگاہ کا

رہوں جا کے مر حضرت یار میں
یہی قصد ہے بندہ درگاہ کا

کہا ہو دم قتل کچھ تو کہے
جواب اسکو کیا میرے خونخواہ کا

عدم کو نہیں مل کے جاتے ہیں لوگ
غم اس راہ میں کیا ہے ہمراہ کا

نظر خواب میں اس کے منہ پر پڑی
بہت خوب ہے دیکھنا ماہ کا

نگو نہیں اگر آنکھ تیری ہو میر
تماشا کر اُس کی نظر گاہ کا

چشم سے خون ہزار نکلے گا — کوئی دل کا بخار نکلے گا
اُس کی مچھیرگہ سے روح الامیں — ہو کے آخر شکار نکلے گا
آندھیوں سے سیاہ ہوگا چرخ — دل کا تب کچھ غبار نکلے گا
ہوئے رہے لاگ تیر مژگاں کی — کسکے سینے کے پار نکلے گا
ناز خورشید کب تلک کھینچیں — گھر سے کب اپنے یار نکلے گا
خون ہی آئے گا تو آنکھوں سے — ایک سیل بہار نکلے گا
عزلتِ میر عشق میں کب تک — ہو کے بے اختیار نکلے گا

اعجاز منھ تکے ہے ترے لب کے کام کا — کیا ذکر یاں مسیح علیہ السّلام کا
رقعہ ہمیں جو آوے ہے سو تیر میں بندھا — کیا دیجیے جواب اجل کے پیام کا
کچھ سدھ سنبھالتے ہی رکھی اُن نے پگڑی پھیر — ممنون میں نہیں ہوں جواب سلام کا
منھ دیکھو بدر کا کہ تری روکشی کرے — تو یوں ہی نام لے ہے کسو ناتمام کا
نوبت ہی اپنی جب سے ہی کوچ کا ہی شور — بجنا سُنا نہیں ہے کبھو یاں مقام کا
کنج لب اسکا دیکھ کے خاموش رہ گئے — یعنی کہ تھا مقام یہ ختم کلام کا
اُس رو و مو کے محو کو کیا روزگار سے — جلوہ ہی کچھ جدا ہے مرے صبح و شام کا
صاحب ہو مار ڈالو مجھے تم وگرنہ کچھ — جز عاشقی گناہ نہیں ہے غلام کا
کب اقتدا ہو مجھ سے کسو کی سوائے میر — بندہ ہوں دل سے میں اُسی سیّد امام کا

ہوں نشاں کیوں نہ تیر خوباں کا — مجھ پہ تودا ہوا ہے طوفاں کا
ہاتھ زنجیر ہو جنوں میں رہا — اپنی زنجیرۂ گریباں کا
چپکے دیکھو جھمکتے وے لب سرخ — ذکر یاں کیا ہی لعل و مرجاں کا
ایک رہزن ہے اُسکی کافر زلف — غم ہی رہتا ہے دین و ایماں کا
عمر آوارگی میں سب گزری — کچھ ٹھکانا نہیں دل و جاں کا
کافرستاں ہے خال و خط و زلف — ذکر کیا ہے دل مسلماں کا
مرگیا میر نالہ کش بیکس — نے نے ماتم میں اُسکے منھ ڈھاکا

جس خشم سے وہ شوخ چلا آج شب آیا
آیا کبھو یاں دن کو بھی یوں تو غضب آیا

اُس نرگس مستانہ کو کر یاد کڑھوں ہوں
کیا گریۂ سرشار مجھے بے سبب آیا

راہ اس سے ہوئی خلق کو کس طور سے یارب
ہمکو کبھی ملنے کا تو اُس کے نہ ڈھب آیا

کیا پوچھتے ہو دب کے سخن مُنھ سے نہ نکلا
کچھ دیکھتے اُس کو مجھے ایسا ادب آیا

کہتے تو ہیں میلانِ طبیعت ہے اسے بھی
یہ باتیں ہیں ایدھر کو مزاج اُس کا کب آیا

خوں ہوتی رہی دل ہی میں آزردگی میری
کس روز گلہ اس کا مرے تا بلب آیا

جی آنکھوں میں آیا ہے جگر مُنھ تئیں میرے
کیا فائدہ یاں چل کر اگر یار اب آیا

آتے ہوئے اُسکے تو ہوئی بیخودی طاری
وہ یاں سے گیا اُٹھ کے مجھے ہوش جب آیا

جاتا تھا چلا راہ عجب چال سے کل میر
دیکھا اُسے جس شخص نے اُسکو عجب آیا

کیا کام کیا ہم نے دل یوں نہ لگاتا تھا
اس جان کی جوکھوں کو اسوقت نہ جانا تھا

تھا جسم کا ترک اولی ایام میں پیری کے
جاتا تھا چلا ہر دم جامہ بھی پُرانا تھا

ہر آن تھی سرگوشی یا بات نہیں گاہے
اوقات ہے اک یہ بھی اک وہ بھی زمانا تھا

پامالی عزیزوں کی رکھتی تھی نظر میں ٹک
اتنا بھی تمھیں آکر یاں سر نہ اُٹھانا تھا

اک محو تماشا ہیں اک گرم ہیں قصہ کے
یاں آج جو کچھ دیکھا سو کل وہ فسانا تھا

کیونکر گلی سے اُسکی میں اُٹھ کے چلا جاتا
یاں خاک میں ملنا تھا لوہو میں نہانا تھا

جو تیر چلا اُس کا سو میری طرف آیا
اس عشق کے میدان میں میں ہی تو نشانا تھا

جب تو نے نظر پھیری تب جان گئی اُسکی
مرنا ترے عاشق کا مرنا کہ بہانا تھا

کب اور غزل کہتا میں اس زمیں میں لیکن
پردے میں مجھے اپنا احوال سُنانا تھا

کہتا تھا کسو سے کچھ تکتا تھا کسو کا مُنھ
کل میر کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانا تھا

سہل ایسا نہ تھا آخر جی سے مرا جانا تھا
ٹک رنجہ قدم کر کر مجھ تک اُسے آنا تھا

کیا موکی پریشانی کیا پردے میں پنہانی
مُنھ یار کو ہر صورت عاشق سے چھپانا تھا

لذت سے نہ تھا خالی جانا تہِ تیغ اُس کے
اے صید حرم تجکو اک زخم تو کھانا تھا

کیا صورتیں بگڑی ہیں مشتاقوں کی ہجر انکیں
اس چہرے کو لے خالق ایسا نہ بنانا تھا

مت سہل ہمیں سمجھو پہونچے تھے بہم تب ہم
برسوں تئیں گردوں نے جب خاک کو چھانا تھا

کیا ظلم کیا بیجا مارا جیون سے اُن نے
کچھ ٹھور بھی تھی اسکی کچھ اس کا ٹھکانا تھا

اے شورِ قیامت اب وعدہ سے قیامت ہی
خوابیدہ مرے خوں کو ظالم نہ جگانا تھا

ہو باغ و بہار آیا گل پھول کہیں پایا
جلوہ اسے یاں اپنا صد رنگ دکھانا تھا

کہتے نہ تھے ہم واں سے پھر آ چکے جیتے تم
میر اس گلی میں تم کو زنہار نہ جانا تھا

تدُاس بہشتی رو سے یہ خلطہ بہم کیا
جد برسوں ہمنے سورۂ یوسف کو دم کیا

چہرے کو نوچ نوچ لیا چھاتی کوٹ لی
جانے کا دل کے ہمنے بہت غم الم کیا

مربوط اور لوگوں سے شاید کہ وے ہوئے
وہ ربط و رابطہ جو بہت ہمنے کم کیا

کیا کیا سخن زباں پہ مرے آئے ہوکے قتل
مانند خامہ گو کہ مرا سر قلم کیا

کی ہمنے تب دروننے کی سوزش سے عافیت
سب تن بدن اس آگ نے اپنا بھسم کیا

یاں اپنے جسم زار پہ تلوار سی لگی
اُن نے جو بید ماغی سے ابرو کو خم کیا

اس زندگی سے مارے ہی جانا بھلا تھا میر
رحم اُن نے میرے حق میں کیا کیا ستم کیا

اگلی جو گل کی فصل میں ہم کو جنوں ہوا
وہ دل کہ جس پہ اپنا بھروسا تھا خوں ہوا

ٹھہرا گیا ہو ٹک بھی تو تم سے بیاں ہوں
آتے ہی اُس کے رفتن صبر و سکوں ہوا

تھا شوق طوفِ تربتِ مجنوں مجھے بہت
اک گردباد دشت مرا رہنموں ہوا

سیلاب آ گے آیا چلا جاتے دشت میں
بے اختیار رونے کا میرے شگوں ہوا

جان اُس کی تیغ تیز سے رکھ کر ورتغ میر
صید حرم ندان سشکار زبوں ہوا

رات سے آنسو مری آنکھوں میں پھر آنے لگا
یک رتی جی تھا بدن میں سو بھی گھبرانے لگا

وہ لڑکپن سے نکل کر تیغ چمکانے لگا
خون کرنے کا خیال اب کچھ اُسے آنے لگا

لعل جاں بخش اُسکے تھے پوشیدہ جوں آب حیات
اب تو کوئی کوئی اُن ہونٹھوں پہ مرجانے لگا

حیف میں اُسکے سخن پر ٹک نہ رکھا گوش کو
یوں تو ناصح نے کہا تھا دل نہ دیوانے لگا

جلس درم کے معتقد تم ہو گئے شیخ شہر کے
یہ تو البتہ کہ سُن کر لعن رم کھانے لگا

گرم ملنا اُس گلِ نازک طبیعت سے نہ ہو
چاندنی میں رات بیٹھا تھا سو مرجھانے لگا

عاشقوں کی پائمالی میں اسے اصرار ہے
یعنی وہ محشر خرام اب پانوس پھیلانے لگا

چشمک اس مہ کی سی دلکش دیدنی آئی نہیں
گو ستارہ صبح کا بھی آنکھ جھپکانے لگا

کیونکر اس آئینہ رو سے میر ملیے بیحجاب
وہ تو اپنے عکس سے بھی دیکھ شرمانے لگا

ضبط کرتے کرتے اب جو لب کو میں نے وا کیا
سو بھی رہتا ہوں یہ کہتا ہائے دل تے کیا کیا

آنکھ پڑتی تھی تمھارے منھ پہ جبتک چین تھا
کیا کیا تمنے کہ مجھ بیتاب سے پردا کیا

گو رہی اُسکو جھنکائی عشق جسکے ہاں گیا
اس طبیب بدشگوں نے کسکے تئیں اچھا کیا

دیکھ خبطی مجکو رستے بند ہو جاتے ہیں اب
عشق نے کیا کوچہ و بازار میں رسوا کیا

لوگ دل دیتے سنے تھے میر دے گزرا ہے جی
لیک اپنے طور پہ ان نے بھی اک سودا کیا

سینہ کوبی ہے طپش سے غم ہوا
دل کے جانے کا بڑا ماتم ہوا

آنکھیں دوڑیں خلق جا اودھر گری
اُٹھ گیا پردہ کہاں اودھم ہوا

کیا لکھوں رو یا جو لکھتے جوں قلم
سب مرے نامے کا کاغذ نم ہوا

ہم جو اُس بن خوار ہیں حد سے زیاد
یاریاں تک آن کر کیا کم ہوا

آ گیا یوں ہی خراماں وہ تو پھر
حشر کا ہنگامہ ہی برہم ہوا

درہمی سے برہمی سے دیکھیو
دونوں عالم کا عجب عالم ہوا

جسمِ خاکی کا جہاں پردہ اُٹھا
ہم ہوئے وہ میر وہ سب ہم ہوا

ہجر کی ایک آن میں دل کا ٹھکانا ہو گیا
ہر زماں ملتے تھے باہم سو زمانا ہو گیا

واں تعلل ہی تجھے کرتے گئے شام و سحر
یاں ترے مشتاق کا مرنا بہانا ہو گیا

شیب میں بھی ہے لباسِ جسم کا ظاہر قماش
پر اسے اب چھوڑیے جامہ پُرانا ہو گیا

کہنے تو کہہ بیٹھے مہ بہتر ہے روئے یار سے
شہر میں پھر ہم کو مشکل منھ دکھانا ہو گیا

صد سخن آئے تھے لب تک پر نہ کہنے پائے ایک
ناگہاں اُس کی گلی سے اپنا جانا ہو گیا

رہنے کے قابل تو ہرگز تھی نہ یہ عبرت سرائے
اتفاقاً اس طرف اپنا بھی آنا ہو گیا

سیکڑوں افسوں دنوں کو پڑھتے تھے تسپر بھی میر
بیٹھنا راتوں کو باہم اب فسانا ہو گیا

یاد خط میں اُس کے جی پھر آ کے گھبراتا رہا
رات کا بھی کیا ہی مُنھ آیا تھا پر جاتا رہا

کیا قیامت ہوتی بے پردہ ہوئے کیا جانیے
مصلحت ہی ہو گی ہمسے وہ جو شرماتا رہا

قد موزوں یار کا خاطر سے جاتا ہی نہیں
میں اسی مصرع کو ساری عمر ڈولاتا رہا

کل مکل بنیاد بل سے آج کل کی کچھ نہیں
میں تو اس غمکش کو بیکل ہی سدا پاتا رہا

اک کھا جاتی ہے خشک تر جو اسکے مُنھ پڑے
میں تو جیسے شمع اپنے ہی تئیں کھاتا رہا

میری تیری چاہ مُنھ دیکھے کی ہے جوں آرسی
آنکھ پھیری جس گھڑی پھر کاہے کا ناتا رہا

ہو گئے ہم محتسب کی بے شعوری سے اسیر
شیخ میں کچھ ہوش تھا میخانے سے جاتا رہا

لوگ ہی اُس کارواں کے حرف نشنو تھے تمام
راہ چلتے تو جرس ہر گام چلاتا رہا

میر دیوانہ ہے اچھا بات سمجھے کیا مری
یوں تو مجھ سے جب ملا میں اسکو سمجھاتا رہا

میں گلستاں میں آ کے عبث آشیاں کیا
بلبل نے بھی نہ طور گلوں کا بیاں کیا

پھر اُسکے ابرواں کا خم و تاب ہے وہی
تلوار کے تلے بھی مرا امتحاں کیا

دوں کس کو دوس دشمنی جانی تھی دوستی
اس سعی میں صریح میں نقصانِ جاں کیا

کالی ہے حرف یار قلم نے قضا کی ہائے
صورت نکالی خوب ولے بدزباں کیا

اس جنس خوش کے پیچھے کھپا میں جو اُو کیا
میں نے کسو کا کیا کیا اپنا زیاں کیا

لڑکے جہاں آباد کے یک شہر کرتے ناز
آ جاتے ہیں بغل میں اشارہ جہاں کیا

میں منتظر جواب کا نامے کے مر گیا
ناچار میر جان کو اودھر رواں کیا

وفا تھی مہر تھی اخلاص تھا تلطف تھا
کبھو مزاج میں اسکے ہمیں تصرف تھا

جو خوب دیکھو تو ساری وہی حقیقت ہے
چھپانا چہرے کا عشاق سے تکلف تھا

اسیر عشق نہیں باز خواہ خوں رکھتے
ہمارے قتل میں اسکو عبث توقف تھا

نہ پوچھو خوب ہے بدعہدیوں کی مشق اُسکو
ہزاروں عہد کئے پر وہی تخلف تھا

جہاں میں میر سے کاہے کو ہوتے ہیں پیدا
سُنا یہ واقعہ جن نے اُسے تاسف تھا

جنوں میں ساتھ تھا کل لڑکوں کا لشکر جہاں میں تھا
چلے آتے تھے چاروں اور سے پتھر جہاں میں تھا

تجلی جلوہ اس رشک قمر کا قرب تھا مجکو
چلے جاتے تھے واں جائے ملک کے پر جہاں میں تھا

گلی میں اُسکے میری رات کیا آرام سے گزری
یہی تھا سنگ بالیں خاک تھی بستر جہاں میں تھا

غضب کچھ شور تھا سر میں بلا بے طاقتی جی میں
قیامت لحظہ لحظہ تھی مرے دل پر جہاں میں تھا

چبھیں تھیں جی میں وے پلکیں لگیں تھیں لکو وے بھویں
یہی شمشیر چلتی تھی یہی خنجر جہاں میں تھا

خیالِ چشم و روئے یار کا بھی طرفہ عالم ہے
نظر آیا ہے واں اک عالم دیگر جہاں میں تھا

عجب دن میر تھے دیوانگی میں دشت گردی کے
سر اوپر سایہ گستر ہوتے تھے کیکر جہاں میں تھا

گل بھی ہے معشوق لیکن کب ہے اُس محبوب سا
آ گئے اُس قد کے ہو سرو باغ بے اسلوب سا

اُسکے وعدے کی وفا تک وہ کوئی ہووے گا جو
ہو معمّر نوح سا صابر ہو پھر ایوب سا

عشق سے کن نے مرے آگہ کیا اُس شوخ کو
اب مرے آنے سے ہو جاتا ہے وہ محجوب سا

بعد مردن یہ غزل مطرب سے جن نے گوش کی
گور کے میری گلے جا لگ کے رویا خوب سا

عاقلانہ حرف زن ہو میر تو کریے بیاں
زیر لب کیا جانیے کہتا ہے کیا مجذوب سا

کبھو وہ توجّہ ادھر کر رہے گا
ہمیں عشق ہے تو اثر کر رہے گا

ہمارا ہے احوال حیرت کی جاگہ
جو دیکھے گا وہ بھی نظر کر رہے گا

نہیں اس طرف میر جانے سے رہتا
رہے گا تو اودھر ہی مر کر رہے گا

میر کا صحبت میں اُسکے حرف سر کر رہ گیا
پیش جاتے کچھ نہ دیکھی چشم تر کر رہ گیا

خوبی اپنے طالع بد کی کہ شب وہ رشک ماہ
گھر مرے آنے کو تھا سو مُنھ ادھر کر رہ گیا

طنز و تعریضِ بتانِ بیوفا کے در جواب
میں بھی کچھ کہتا خدا سے اپنے ڈر کر رہ گیا

سرگزشت اپنی سبب ہے حیرتِ احباب کی
جس سے دل خالی کیا وہ آہ بھر کر رہ گیا

میر کو کتنے دنوں سے رہتی تھی سب بے طاقتی
رات دل تڑپا بہت شاید کہ مر کر رہ گیا

[1] گوش کردن فارسی کا محاورہ ہے۔ اسی کا یہ ترجمہ ہے۔ ورنہ گوش کرنا اُردو میں نہیں بولتے۔

۲۱

مجھ زار نے کیا گرمی بازار سے پایا
کبریت نمط جن نے لیا مجھکو جلایا

بیتاب تہِ تیغِ ستم دیر رہا میں
جبتک نہ گئی جان مجھے صبر نہ آیا

جانا فلکِ دوں نے کہ سرسبز ہوا میں
گر خاک سے سبزہ کوئی پژمردہ اگایا

اس رخ نے بہت صورتیں لوگوں کی بگاڑیں
اس قد نے قیامت کا سا ہنگامہ اٹھایا

مت راہ سخن دے کہ پھر آپ ہی تو کہے گا
کیوں میں نے محبت کی عبث منھ کو کھلایا

ہرچند کہ تھی رنجھنے کی جاے ترے لب
پر گالیاں دیں اتنی انھوں سے کہ رجھایا

گردش میں رہا کرتے ہیں ہم دید میں انکے
آنکھوں نے تری خوب سماں ہمکو دکھایا

کس روز یہ اندوہ جگر سوز تھا آگے
کب شب لب و یارب تھی مری یونہیں خدایا

دن جی کے الجھنے کی ہی جھگڑے میں کٹے ہیں
رات اسکے خیالات سے رہتے ہیں قضایا

کیا کہیے دماغ اس کا کہ گلگشت میں کل میر
گل شاخوں سے جھک آئے تھے پر منھ نہ لگایا

جب گل کہے ہے اپنے تئیں یار کے رو سا
تب آنکھوں تلے میری اترتا ہے لہو سا

تحقیق کروں کس سے حقیقت کے نشے کو
خضر آب اسے کہتا ہے آتش کہے موسا

کیا دور ہے شربت پہ اگر قند کے تھوکے
ٹک جن نے ترے شربتی ان ہونٹھوں کو چوسا

دم لابہ کریں شیخ رکھیں شملے تو کیا ہے
ہونا مگر آسان ہے اسکے سگِ کو سا
نہیں

تعبیر جسے کرتے ہیں ہنگامۂ محشر
وہ یار کے کوچے کا ہے کچھ شور غلو سا

آرایش درویشی بھی اپنی نہیں بے لطف
ہے بوریے کا نقش مرے تن پہ اتو سا

اب کی ہے حدیث اس سے سخن کرنے کی میں نے
کیا میر سے بولے کوئی ہے بیہدہ گو سا

اگر وہ ماہ نکل گھر سے ٹک ادھر آتا
تو رک کے منھ تئیں کا ہیکو شب جگر آتا

مرید پیرِ مغاں صدق سے نہ ہم ہوتے
جو حق شناس کوئی اور بھی نظر آتا

جو خوبیوں سے جو سر کو دو بارہ میں کرتا
زمانہ غم کا مرے کس طرح بسر آتا

اسیر عشق ہے تو ملتے تھے باہم اگلے لوگ
ہمیں بھی کاشکے ایسا کوئی ہنر آتا

نہ پوچھو خوب ہے
شراب خانے میں شب مست ہو رہا شاید
جہاں میں میر بسر ہوش میں ہوتا تو اپنے گھر آتا

وہ کم نما و دل ہے شائق کمال اُسکا
جو کوئی اُس کو چاہے ظاہر ہے حال اُسکا

ہم کیا کریں علاقہ جس کو بہت ہو اس سے
رکھ دیتے ہیں گلے پر خنجر نکال اُسکا

بس ہو تو وام کر بھی اُس پر نثار کریے
یک نقد دل رکھے ہیں سو تو ہے مال اُسکا

یہ جانتا تو اس سے ہمخواب میں نہ ہوتا
یکا خیال جی کا ایسا خیال اُسکا

اُن زلفوں سے نہ لگ کر چل اے نسیم ظالم
تاریک ہے جہاں پھر بکھا جو بال اُسکا

جس داغ سے کہ عالم ہے مبتلا بلا میں
سو داغ جان عاشق منہ پر ہے خال اُسکا

مستانہ ساتھ میرے روتی پھرے ہے بلبل
گل سے جو دل لگا ہے ابتر ہے حال اُسکا

میری طرح جھکے ہیں بیخود ہو سرو گل بھی
دیکھا کہیں چمن میں شاید جمال اُسکا

کیا تم کو پیار سے وہ اے میر منہ لگاوے
پہلے ہی چومے تم تو کاٹو ہو گال اُس کا

زار رکھا بیحال رکھا بیتاب رکھا بیمار رکھا
حال رکھا تھا کچھ بھی ہم میں عشق نے آخر مار رکھا

میلان اُس کا تھا کاہیکو جانب اُلفت کیشوں کے
اپنی طرف سے ہم نے ابتک اُس ظالم سے پیار رکھا

عشق بھی ہم میں ہائے تصرف کیسے کیسے کرتا ہے
دل کو چاک جگر کو زخمی آنکھوں کو خونبار رکھا

کیا پوچھو ہو دیں کے اکابر فاضل کامل صابر رنج
عزت والے کیا لوگوں کو گلیوں میں اُن نے خوار رکھا

کام اس سے اک طور پہ لیتے بیطور اسکو ہم نے نہ دیتے
حیف ہے میر سپہر دوں نے ہمسے نہ اسکو یار رکھا

دل رات دن رہے ہے سینے میں عشق ملتا
ہر چند چاہتا ہوں پر جی نہیں سنبھلتا

اب تو بدن میں سارے اک پھنک رہی ہے آتش
وہ مہ گلے سے لگتا تو یوں جگر نہ جلتا

شب ماہ چار وہ تھا کس حسن سے نمایاں
ہوتا بڑا تماشا جو یار بھی نکلتا

اے رشک شمع گویا تو موم کا بنا ہے
مہتاب میں تجھی کو دیکھا ہے یوں پگھلتا

تکلیف باغ ہمکو یاروں نے کی وگرنہ
گل پھول سے کوئی دم اپنا ہی دل بہلتا

رونے کا جوش ویسا آنکھوں کو ہے بعینہ
جیسے ہو رود کوئی برسات میں اُبلتا

کرتا ہے وے سلوک اب جس سے کہ جان جاوے
ہم میر یوں نہ مرتے اس پر جو دل نہ جلتا

بوسہ اُس بت کا لے کے منہ موڑا
بھاری پتھر تھا چوم کر چھوڑا

ہو کے دیوانے ہم ہوئے زنجیر
دیکھ کر اُس کے پانوں کا توڑا

دل نے کیا کیا نہ رات درد دیے
جیسے یکتار ہے کوئی پھوڑا

گرمِ رفتن ہے کیا سمندِ عمر
نہ لگے جس کو باؤ کا گھوڑا

کیا کرے بخت مدّعی تھے بلند
کوہکن نے تو سر بہت پھوڑا

دل ہی مرغِ چمن کا ٹوٹ گیا
پھول گلچیں نے ہائے کیوں توڑا

ہے لبِ بام آفتابِ عمر
کر لے سو کیا ہے میر دن تھوڑا

ہے عشق میں صبر ناگوارا
پھر صبر بن اور کیا ہے چارا

ان بالوں سے مشک مت خجل ہو
عنبر تو عرق عرق ہے سارا

یوں بات کرے ہے میرے خوں سے
گویا نہیں اُن نے مجھ کو مارا

دیکھو ہو تو دور بھاگتے ہو
کچھ پاس نہیں تمھیں ہمارا

تھا کس کو دماغ باغ اس بن
بلبل نے بہت مجھے پکارا

رخسار کے پاس وہ دُرِ گوش
ہے پہلوئے ماہ میں ستارا

ہوتے ہیں فرشتے صید آکر
آہوئے حرم ہیں یاں چکارا

پھولے مجھے دیکھ کر گلوں میں
بلبل کا ہے باغ میں اجارا

جب جی سے گزر گئے ہم اے میر
اُس کوچے میں تب ہوا گزارا

دل عجب چرچے کی جا گر تھی سو ویرانہ ہوا
جوشِ غم سے جی جو بولا سو یہ دیوانہ ہوا

بزمِ عشرت پر جہاں کے گوش وا کر جائیے چشم
آج یاں دیکھا گیا جو کچھ سو کل افسانہ ہوا

دیر میں جو میں گدایانہ گیا اودھر کہا
شاہ جی کہیے کدھر سے آپ کا آنا ہوا

کیا کہیں حسرت لیے جیسے جہاں سے کوئی جائے
یار کے کوچے سے اپنا اس طرح جانا ہوا

میر تیر ان جور کیشوں کے جو کھائے بے شمار
چھاتی اب چھلنی ہے میری ہے جگر چھانا ہوا

کیا کہے حال کہیں دل زدہ جا کر اپنا
دل نہ اپنا ہے محبت میں نہ دلبر اپنا

دوریِ یار میں ہے حال دل ابتر اپنا
ہم کو سو کوس سے آتا ہے نظر گھر اپنا

حالی سے ہو عزم دیر شاد کعبہ سے ہو کر [illegible]

یک گھڑی صاف نہیں ہمسے ہوا یار کبھی / دل بھی جوں شیشۂ ساعت ہے مکدر اپنا
ہر طرف آئینہ داری میں ہے اسکے رو کے / شوق سے دیکھیے منہ ہووے ہے کیدھر اپنا
لب بلب رکھ کے تہ اس گل کے کبھو ہم سوئے / یہ بساط خسک و خار ہے بستر اپنا
کس طرح حرف ہو ناصح کا مؤثر ہم میں / سختیاں کھینچتے ہی دل ہوا پتھر اپنا
کیسی رسوائی ہوئی عشق میں کیا نقل کریں / شہر و قصبات میں مذکور ہے گھر گھر اپنا
اس گل تر کی قبا کے کہیں کھولے تھے بند / رنگوں گلبرگ کے ناخن ہے معطر اپنا
تجھسے ہم رکے لگ لگنے نہ دیتے ہرگز / زور چلتا کچھ اگر چاہ میں دل پر اپنا
پیش کچھ آؤ نہیں ہم تو ہیں ہر صورت سے / مثل آئینہ نہیں چھوڑتے ہم گھر اپنا
دل بہت کھینچتی ہے یار کے کوچے کی زمین / لوہو اس خاک پہ گرنا ہے مقرر اپنا

میر خط بھیجے پر اب رنگ اڑا جاتا ہے
کہ کہاں بیٹھے کدھر جاوے کبوتر اپنا

کیا میر دل شکستہ بھی وحشی مثال تھا / دنبالہ گرد چشم سیاہ غزال تھا
آخر کو خواب مرگ ہمیں جا سے لے گئی / جی دیتے تک بھی سر میں اسی کا خیال تھا
میں جو کہا کہ دل کو تو تم نے ہرا دیا / بولا کہ ذوق اپنا ہمارا ہی مال تھا
سرو اس طرف کو جیسے گنہگار تھا کھڑا / اودھر جو آب جو کے وہ نازک نہال تھا
کیا میرے روزگار کے اہل سخن کی بات / ہر ناقص اپنے زعم میں ملا بکمال تھا
کیا کیا ہوائیں دیدۂ تر سے نظر پڑیں / جب رونے بیٹھ جاتے تھے تب برشکال تھا

کہتے تھے ہم تباہ ہے اب حال میر کا
دیکھا نہ تم نے اس میں بھلا کچھ بھی حال تھا

ان نے کھینچا ہے مرے ہاتھ سے داماں اپنا / کیا کروں گر نہ کروں چاک گریباں اپنا
بار ہا جاں لب جاں بخش سے دی جن نے ہمیں / دشمن جانی ہوا اب وہی جاناں اپنا
خلطے یاد آتے ہیں تے جبکہ بدلتے کپڑے / مجھ کو پہناتے تھے رعنائی کا ساماں اپنا
کیا ہوئی یک جہتی وہ کہ طرف تھے میرے / اب یہ طرفہ ہے کہ منہ کرتے ہیں پنہاں اپنا
جسطرح شاخ پراگندہ نظر آتے ہیں بید / تھا جنوں میں بھی سر موسے پریشاں اپنا
مشکلیں سیکڑوں چاہت میں ہمیں آئیں پیش / کام ہو دیکھیے کس طور سے آساں اپنا
دل فقیری سے نہیں میر کسو کا ناساز / خوش ہوا کتنا ہی یہ خانۂ ویراں اپنا

دل عجب شہر تھا خیالوں کا ۔ لوٹا مارا ہے حسن والوں کا
جی کو جنجال دل کو ہے الجھاؤ ۔ یار کے حلقہ حلقہ بالوں کا
موے دلبر سے مشکبو ہے نسیم ۔ حال خوش اُسکے خستہ حالوں کا
نہ کہا کچھ نہ آ پھرا نہ ملا ۔ کیا جواب ان مرے سوالوں کا

دم نہ لے اُس کی زلفوں کا مارا
میر کاٹا جیے نہ کالوں کا

احوال نہ پوچھو کچھ ہم ظلم رسیدوں کا ۔ کیا حال محبت کے آزار کشیدوں کا
دیوانگی عاشق کی سمجھو نہ لباسی ہے ۔ صد پارہ جگر بھی ہے ہم جامہ دریدوں کا
عاشق ہے دل اپنا تو گلگشت گلستاں ہیں ۔ جدول کے کنارے کی نو بادہ دمیدوں کا
ناچار گئے مارے نسیدان محبت میں ۔ پایا نہ گیا چارہ کچھ اُس کے شہیدوں کا
ہیتے کے کھڑکنے سے ہوتی ہے ہمیں وحشت ۔ کیا طور رہے ہم اپنے سایہ سے رمیدوں کا
کیا کیا نہ گیا اُس بن صبر او روماغ و دل ۔ رونق گئی بستر سے پھر نور بھی دیدوں کا

کرتے ہیں پس از سالے دل شاد گلے لگ کر
سو میر وہ ملنا بھی اب ترک ہے عیدوں کا

سطح جو ہاتھ نہیں تھا اُسکے رخ گلفام کا ۔ ہاتھ ملنا کام ہے اب عاشق بدنام کا
کچھ نہیں عنقا صفت پر شہرۂ آفاق ہوں ۔ سیر کے قابل ہے ہونا ہین میرے نام کا
ہجر کی راتیں بڑی چھوٹی جو ٹک ہوتیں کہیں ۔ اس میں کچھ نقصان ہوتا تھا مگر ایام کا
سوؤں یاد زلف میں اسکے تو پھر روتا رہوں ۔ صبح تک جاتا نہیں ہے بیٹھ آیا شام کا

تا بگیسو اپنا کچا سوت کچھ الجھا ہے میر
گم ہے سر رشتہ ہمارے خواب اور آرام کا

کل رات رو کے صبح تلک میں رہا گرا ۔ خونبار میری آنکھوں سے کیا جانوں کیا گرا
اب شہر خوش عمارت دل کا ہے کیا خیال ۔ ناگاہ آ کے عشق نے مارا جلا گرا
کیا طے ہو راہ عشق کی عاشق غریب ہے ۔ مشکل گزر طریق ہے یاں رہ گرا گرا
لازم پڑی ہے کسل دل کو فتادگی ۔ بیمار عشق رہتا ہے اکثر پڑا گرا
ٹھہرے نہ اُسکی عشق کا سر گشتہ و ضعیف ۔ ٹھوکر کہیں لگی کہ رہا سر پھرا گرا

وے مارنے کو تکیہ سے سر ٹک اٹھا تو کیا
بستر سے کب اُٹھے ہے غم عشق کا گرا

پھرتا تھا میر غمزدہ یک عمر سے خراب
اب شکر ہے کہ بارے کسی در پہ جا گرا

چاہت کی طرح کش ہو کچھ بھی اثر نہ دیکھا
طرحیں بدل گئیں پہ اُن نے ادھر نہ دیکھا

خالی بدن جیون سے یاں ہو گئے و لیکن
اُس شوخ نے ادھر کو بھر کر نظر نہ دیکھا

کس دن سر شک خونی مُنھ پر نہ بہ کر آئے
کس شب پلک کے اوپر لخت جگر نہ دیکھا

یاں شہر شہر بستی اوجڑ ہی ہوتے پائے
اقلیم عاشقی میں بستا نگر نہ دیکھا

اب کیا کریں کہ آیا آنکھوں میں جی ہمارا
افسوس پہلے ہمنے ٹک سوچ کر نہ دیکھا

لاتے نہیں فرو سر ہرگز بتاں خدا سے
آنکھوں سے اپنے تم نے ان کا گھر نہ دیکھا

سوجھا نہ چاہ میں کچھ برباد کر چکے دل
میر اندھے ہو رہے تھے اپنا بھی گھر نہ دیکھا

کیا ہے عشق جب سے میں نے اُس ترک سپاہی کا
پھروں ہوں چور زخمی اسکے تیغ کم نگاہی کا

اگر ہم قطعۂ شب سا لیے چہرہ چلے آئے
قیامت شور ہوگا حشر کے دن روسیاہی کا

ہوا ہے عارفان شہر کو عرفان بھی اوندھا
کہ ہر درویش ہے مارا ہوا شوق الٰہی کا

ہمیشہ التفات اسکی کسو کے بخت سے ہوگی
نہیں شرمندہ میں تو اسکی لطف گاہ گاہی کا

بہ رنگ کہربائی شمع اس کا رنگ جھمکے ہے
دماغ سیر اسکو کب ہے میرے رنگ کاہی کا

بڑھینگے عہد کے درویش اس سے اور کیا یارو
کیا ہے لڑکوں نے دینا انھونکو تاج شاہی کا

خراب احوال کچھ بکتا پھرے ہے دیر و کعبے میں
سخن کیا معتبر ہے میر سے واہی تباہی کا

دکھیوں میں اپنی رات کو خون ناب تھا سو تھا
جی دل کے اضطراب سے بیتاب تھا سو تھا

آکر کھڑا ہوا تھا بصد حسن جلوہ ناک
اپنی نظر میں وہ در نایاب تھا سو تھا

ساون ہرے نہ بھادو نہیں ہم سوکھے اہل درد
سبزہ ہماری پلکوں کا سیراب تھا سو تھا

درویش کچھ گھٹا نہ بڑھا ملک شاہ سے
خرقہ کلاہ پاس جو اسباب تھا سو تھا

کیا بھاری بھاری قافلے یاں سے چلے گئے
تجکو وہی خیال گراں خواب تھا سو تھا

برسوں سے ہے تلاوت و سجادۂ و نماز
پر میل دل جو سو گئے مے ناب تھا سو تھا

ہم خشک لب جو روتے رہے جوئیں بہ چلیں
پر میرؔ دشت عشق کا بے آب تھا سو تھا

ردیف بائے موحدہ

ماہِ صیام آیا ہے قصدِ اعتکاف اب
جا بیٹھیں میکدے میں مسجد سے اُٹھ کے صاف اب

مسلم ہیں رفتہ رو کے کافر ہیں خستہ مو کے
یہ بیچ سے اُٹھے گا کس طور اختلاف اب

جو حرف ہیں سو ٹیڑھے خط میں لکھے ہیں شاید
اُسکے مزاج میں ہے کچھ ہم سے انحراف اب

مجرم ٹھہر گئے ہم پھرنے سے ساتھ تیرے
بہتر ہے جو رکھے تو اس سے ہمیں معاف اب

گو لاگ کیا گلے میں مت کھینچ تیغ مجھ پر
اپنے گنہ کا میں تو کرتا ہوں اعتراف اب

کیا خاک میں ملا کر اپنے تئیں موا ہے
پیدا ہو گورِ مجنوں تو کیجے طواف اب

کھنچتے ہیں جامے خونیں کن کن کے میرؔ دیکھیں
لگتی ہے سُرخ اُسکے دامن سے تئیں سنجاف اب

طاقت تعب کی غم میں تمھارے نہیں ہے اب
گویا کہ جان جسم میں سارے نہیں ہے اب

کل کچھ صبا ہوئی تھی گل افشاں قفس میں بھی
وہ بیکلی تو جان کو بارے نہیں ہے اب

جیتے تو لاگ پلکوں کی اس سے کہیں گے ہم
کچھ مژہ ہم کو چھڑیوں کے مارے نہیں ہے اب

زردی چہرہ اب تو سفیدی کو کھنچ گئی
وہ رنگ آگئے کا سا پیارے نہیں ہے اب

مسکن جہاں تھا دل زدہ مسکیں کا ہم تو وہاں
کل دیر میرؔ میر پکارے نہیں ہے اب

بولا جو مو پریشاں آنکلے میرؔ صاحب
آنا ہوا کہاں سے کہیئے فقیر صاحب

ہر لحظہ اک شرارت ہر دم ہے یک اشارت
اس عمر میں قیامت تم ہو شریر صاحب

بندے پہ اب نوازش کیجے تو کیجے ورنہ
کیا لطف ہے جو آئے وقت اخیر صاحب

دل کا اُلجھنا اپنے ایسا نہیں کہ سلجھے
ہیں دام زلف میں ہم اسکے اسیر صاحب

فکر جگر رہے ہے اس دم غلام کو بھی
جسدم لگو ہو کرنے تم مشق تیر صاحب

دل پر تو چوٹ تھی ہی زخمی ہوا جگر سب
ہر دم بھری رہے ہے لوہو سے چشم تر سب

حیف اُس سے حال میرا کہتا نہیں ہے کوئی
نالوں سے شب کے میرے رکھتے تو ہیں خبر سب

بجلی سی اک تجلی آئی تھی آسماں سے
آنکھیں لگا رہے ہیں اہل نظر ادھر سب

اس ماہ بن تو اپنی دکھ میں بسر ہوئی تھی
کل رات آگیا تو وہ دکھ گیا بسر سب

قطعہ

کیا فہم کیا فراست ذوق و بصر سماعت
تاب و توان و طاقت یہ کر گئے سفر سب

منزل کو مرگ کی تھا آخر مجھے پہونچنا
بھیجا ہے میں نے اپنا اسباب پیشتر سب

دنیا میں حسن و خوبی میر ایک عجیب شے ہے
رندان و پارسایاں جس پر رکھیں نظر سب

شیون میں شب کے ٹوٹی زنجیر میر صاحب
اب کیا مرے جنوں کی تدبیر میر صاحب

ہم سر نہ کھینچتے تو وہ تیغ کھنچ نہ سکتی
اپنا گناہ اپنی تقصیر میر صاحب

کھنچتی نہیں کماں اب ہم سے ہوا گل کی
بادِ سحر لگے ہے جوں تیر میر صاحب

کب ہیں جوانی کے سے اشعار شور آور
شاید کہ کچھ ہوئے ہیں اب پیر میر صاحب

تم کس خیال میں ہو تصویر سے جو چپ ہو
کرتے ہیں لوگ کیا کیا تقریر میر صاحب

سب آتش سوزندہ دل سے ہے جگر آب
بے صرفہ کرے صرف نہ کیوں دیدۂ تر آب

پھرتی ہے اڑی خاک بھی مشتاق کسو کی
سر مار کے کرتا ہے پہاڑوں میں بسر آب

کیا کریے اسے آگ سا بھڑکا یا ہے جن نے
نزدیک تر اب اسکو کرے غرق مگر آب

دل میں تو لگی دوں سی بھریں چشمے سی آنکھیں
کیا اپنے تئیں روؤں ادھر آگ ادھر آب

کس طور سے بھر آنکھ کوئی یار کو دیکھے
اس آتشیں رخسار سے ہوتی ہے نظر آب

ہم ڈرتے شکر رنجی سے کہتے نہیں یہ بھی
خجلت سے تری ہونٹھوں کی ہیں شہد و شکر آب

کس شکل سے اک رنگ پہ رہنا ہو جہاں کا
رہتی ہیں کوئی صورتیں یہ نقش ہیں بر آب

شعلے جو مرے دل سے اٹھیں ہیں سو نہ سمجھیں
برسوں تئیں چھڑکا کرو تم ان پہ اگر آب

استادہ ہو دریا تو خطرناکی بہت ہے
آ اپنے کھلے بالوں سے زنجیر نہ کر آب

شب روؤں ہوں ایسا کہ جدھر یار کا گھر تھا
جاتا ہوں گلے چھاتی تک اودھر کو اتر آب

اس دشت سے ہو میر ترا کیونکہ گزارا
تا زانو ترے گل ہے تہی تا بہ کمر آب

پڑا ہے فرق خور و خواب میں اب — رہا ہے کیا دلِ بیتاب میں اب
جنوں میں اک نئے دامن ہی نے جیب — کمی آئی بہت اسباب میں اب
ہوا ہے خواب ملنا اُس شے شب کا — کبھو آتا ہے وہ نہ خواب میں اب
گدائی لی ہے میں نے اُس کے در کی — کہے کیا دیکھوں میرے باب میں اب
گلے لگنے بن اُسکے اتنا روئے — کہ ہم ہینگے گلے تک آب میں اب
کہاں بل کھائے بال اُسکے کہاں یہ — عبث سنبل ہی پیچ و تاب میں اب

بلا چرچا ہے میرے عشق کا میر
یہی ہے ذکر شیخ و شاب میں اب

ردیف تائے فوقانی

شعر کے پردے میں میں نے غم سنایا ہے بہت — مرثیے نے دل کے میرے بھی رُلایا ہے بہت
بے سبب آتا نہیں اب دمبدم عاشق کو غش — درد کھینچا ہے نہایت رنج اُٹھایا ہے بہت
وادی و کہسار میں روتا ہوں ڈاڑھیں مار مار — دلبرانِ شہر نے مجکو ستایا ہے بہت
وا نہیں ہوتا کسو سے دل گرفتہ عشق کا — ظاہرا غمگیں اسے رہنا خوش آیا ہے بہت

میر گم گشتہ کا ملنا اتفاقی امر ہے
جب کبھو پایا ہے خواہشمند پایا ہے بہت

عجب نہیں ہے نجانے جو میر چاہ کی ریت — سُنا نہیں ہے مگر یہ کہ جوگی کس کے میت
مت ان نمازیوں کو خانہ ساز دیں جانو — کہ ایک اینٹ کی خاطر یہ ڈھاتے ہینگے مسیت
غمِ زمانہ سے فارغ ہیں مایہ باختگاں — قمار خانۂ آفاق میں ہے ہار ہی جیت
ہزار شانہ و مسواک و غسل شیخ کرے — ہمارے عندیے میں تو ہے وہ خبیث پلیت
کسو کے بستر و سنجاب و قصر سے کیا کام — ہماری گور کی بھی ڈھیر میں مکاں ہے میت
ہوئے ہیں سوکھ کے عاشق طنبورے کے سے تار — رقیب دیکھو تو گاتے ہیں بیٹھے اور ہی گیت
شفق سے ہیں در و دیوار زرد شام و سحر — ہوا ہے لکھنؤ اس رہگذر میں پیلی بھیت
کہا تھا ہمنے بہت بولنا نہیں ہے خوب — ہمارے یار کو سو اب ہمیں سے بات نہ چیت

ملے تھے میر سے ہم کل کنارِ دریا پر
فتیلہ مو وہ جگر سوختہ ہے جیسے اتیت

جب سے چلی چمن میں ترے رنگ بانکی بات
سنتا نہیں ہے کوئی گلی کے دہاں کی بات

یاں شہر حسن میں تو کہیں ذکر بھی نہیں
کیا جانیے کہ مہر و وفا ہے کہاں کی بات

اختر شناس کو بھی خلل ہے دماغ کا
پوچھو اگر زمیں سے کہیں آسماں کی بات

ایسا خدا ہی جانے کہ ہو عرش یا نہ ہو
دل بولنے کی جا نہیں کیا اس مکاں کی بات

کیا لطف جو سنو اسے کہتے پھرا کرو
یوں چاہیے کہ بھول رہیں ہو جہاں کی بات

لے شام سے جہاں میں ہے تا صبح ایک شور
اپنی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتی یاں کی بات

اوباش کس کو پوچھتے ہیں التفات سے
سیدھی کبھی سنی نہیں اس بدزباں کی بات

ہر حرف میں ہے ایک کجی ہر سخن میں پیچ
پنہاں رہے ہے کب کسو کی ٹیڑھی بانکی بات

کینے سے کچھ کہا ہی کیا زیر لب مجھے
کیا پوچھتے ہو **میر** مرے مہرباں کی بات

مانند مرغ دوست نگہ بار بار دوست
ٹک سوچ ہی ہزار ہیں دشمن ہزار دوست

کھڑکے ہے پات بھی تو لگا بیٹھتا ہو چوٹ
رم خوردہ وہ غزال بہت ہی شکار دوست

سبکو ہے رشک مجھ میں جو تجھ میں ہے اختلاط
دشمن ہوئے ہیں دوستی سے تیری یار دوست

تجھسے ہزار ان نے بنا کر دیے بگاڑ
مت جان سادگی سے کہ ہے روزگار دوست

یہ تو کچھ آگے دشمن جانی سے ہے چلا
میں جانتا تھا ہوگا دل بیقرار دوست

بیگانگی خلق بھی جہاں جاے خوف ہے
سو دشمنوں میں کیا ہی جو نکلے بھی چار دوست

مجھ بینوا کی یاد رہے **میر** یہ صدا
اس میکدے میں رہیئے بہت ہوشیار دوست

سیر کی ہم نے اٹھ کے تا سورت
ویسی دیکھی نہ ایک جا صورت

منھ لگاتا تو در کنار ان نے
نہ کہا ہے یہ آشنا صورت

منھ دکھاتی ہے آرسی ہر صبح
تو بھی اپنی تو ٹک دکھا صورت

خوب ہے چہرۂ پری لیکن
آگے اس کے ہے کیا بلا صورت

قطعہ

کب تلک کوئی جیسے صورت ناز
آوے پیاری بنا بنا صورت

ایک دن تو یہ کہ کہ ملنے کی
تو بھی ٹھہراے لا کوئی صورت

حلقے آنکھوں میں پڑ گئے منہ زرد
ہو گئی میر تیری کیا صورت

وصل دلبر نہ ٹک ہوا قسمت
مر چلے ہجر میں ہی یا قسمت

ایک بوسے پہ بھی نہ صلح ہوئی
ہم نے دیکھی بہت لڑا قسمت

شیخ جنت تجھے مجھے دیدار
واں بھی ہر اک کی ہے جدا قسمت

پھول چن ہاتھوں سے سجھونکو دیے
زخم تیغ اُن سے اپنی تھا قسمت

کیا ازل میں ملا نہ لوگوں کو
تھی ہماری بھی میر کیا قسمت

زخم جھیلے داغ بھی کھائے بہت
دل لگا کر ہم تو پچھتائے بہت

جب نہ تب جاگہ سے تم جایا کیے
ہم تو اپنی اور سے آئے بہت

دیر سے سوئے حرم آیا نہ ٹک
ہم مزاج اپنا ادھر لائے بہت

پھول گل شمس و قمر سارے ہی تھے
پر ہمیں ان میں تمھیں بھائے بہت

گر بکا اس شور سے شب کو ہے تو
روویں گے سونے کو ہمسائے بہت

وہ جو نکلا صبح جیسے آفتاب
رشک سے گل پھول مرجھائے بہت

میر سے پوچھا جو میں عاشق ہو تم
ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

کوشش اپنی تھی عبث پر کی بہت
کیا کریں ہم چاہتا تھا جی بہت

کعبۂ مقصود کو پہونچے نہ ہائے
سعی کی اے شیخ ہمنے بھی بہت

سب ترے محو دعائے جان ہیں
آرزو اپنی بھی ہے تو جی بہت

رک رہا ہے دیر سے تڑپا نہیں
عشق نے کیوں دلکو مہلت دی بہت

کیوں نہ ہس دور ہیں ہم نزدیک مرگ
دلکو اُسکے ساتھ اُلفت تھی بہت

وہ بجا ہے جب تئیں ہوتا ہے کیا
جہد کی ملنے کی اپنی سی بہت

کب سُنا حرف شگون وصل یار
یوں تو فال گوش ہمنے لی بہت

تھا قوی آخر ملے ہم خاک میں
آسماں سے یوں رہی کشتی بہت

آج درہم کرتے تھے کچھ گفتگو
میر نے شاید کہ دارو پی بہت

ردیف تائے ہندی

کیا لڑکے دلّی کے ہیں عیّار اور نٹ کھٹ
دل لیں ہیں یوں کہ ہرگز ہوتی نہیں ہے آہٹ

ہم عاشقوں کو مرتے کیا دیر کچھ لگے ہے
چُٹ جن نے دل پہ کھائی وہ ہو گیا ہے چٹ پٹ

دل ہے جدھر کو اودھر کچھ آگ سی لگی تھی
اُس پہلو ہم جو لیٹے جل جل گئی ہے کروٹ

کلیوں[۱] کو تو نے چٹ چٹ اے باغباں جو توڑا
بلبل کے دل جگر کو ظالم لگی ہے کیا چٹ

جی ہی ہٹے نہ میرا تو اس کو کیا کروں میں
ہر چند بیٹھتا ہوں مجلس میں اس سے ہٹ ہٹ

دیتی ہے طول بلبل کیا نالہ و فغاں کو
دل غنچے کے اُلجھنے سے ہے یہ عاشقوں کی پھٹ پٹ

مرتے نہ تھے ہم ایسے دریا پہ جب تھا تکیہ
اس گھاٹ گاہ و بیگہ رہنے لگا ہے جمگھٹ

رک رک کے دل ہمارا بیتاب کیوں نہ ہووے
کثرت سے درد و غم کی رہتا ہے اس پہ جھرمٹ

شب میر سے ملے ہم ایک وہم رہ گیا ہے
اس کے خیال مو میں اب تو گیا بہت لٹ

خدا جانیے ہو و گی کیا نہایت
اجل تو ہے دل کے مرض کی بدایت

سخن غم سے آغشتہ خوں ہے ولیکن
نہیں لب مرے آشنائے شکایت

نہیں یہ گنہگار ملنے کے قابل
کرم کریے تو مہربانی عنایت

گیا آسماں پہ جو نالہ تو کیا ہے
نہیں یار کے دل میں کرتا سرایت

ہمیں عشق میں میر چپ لگ گئی ہے
نہ شکر و شکایت نہ حرف و حکایت

ردیف تائے مثلثہ

تری جستجو یار کی ہے عبث
یہ کوشش گنہگار کی ہے عبث

تو پیدا ہے لیکن ہویدا نہیں
یہ تصدیع ہموار کی ہے عبث

نہ ہاتھ آئی اے میر کچھ وجہ مے
گرو میں نے دستار کی ہے عبث

ردیف جیم فارسی

حال کہنے کی کسے تاب اس آزار کے بیچ
حال رہتا ہی نہیں عشق کے آزار کے بیچ

۱ میر تقی ~ چوٹیں لگتی ہیں دل پہ بلبلوں کے باغباں تو جو ؛ چمن میں توڑتا ہے ہر سحر کلیوں کے تئیں چٹ چٹ +

آرزومند ہے خورشید میسر ہے کہاں
کہ تنک ٹھہرے ترے سایۂ دیوار کے بیچ

کیا کہیں ہم کہ گلے ڈالے پھریں مستی میں
دانے سبحے کے پرو رشتۂ زنار کے بیچ

رشک خوبی کا اسی کے جگر میں ہے داغ
یہ جو اک خال پڑا ہے ترے رخسار کے بیچ

مل گیا پھولوں میں اس رنگ سے کرتے ہوئے سیر
کہ تامل کیے پایا اُسے گلزار کے بیچ

قدر تم گو نہ کرو میرے متاعِ دل کی
جنس لگ جاویگی یہ بھی کسو سرکار کے بیچ

گرد سر رفتہ ہیں اے میر ہم اُس کشتے کے
رہ گیا یار کے جو ایک ہی تلوار کے بیچ

گل لے گئے تھے یار ہمیں بھی چمن کے بیچ
اُسکی سی بو نہ آئی گل و یاسمن کے بیچ

کشتہ ہوں میں تو شیریں زبانی یار کا
اے کاش وہ زبان ہو میرے دہن کے بیچ

اس بحر میں رہا مجھے چکر بھنور کے طور
سرگشتگی میں عمر گئی سب وطن کے بیچ

گر دل جلا بجھا ہی ہم ساتھ لے گئے
تو آگ لگ اُٹھے گی ہمارے کفن کے بیچ

تنگی جامہ ظلم ہے اے باعث حیات
پاتے ہیں لطف جان کا ہم تیرے تن کے بیچ

نازک بہت ہیں تو کہیں افسردگی نہ آئے
چسپانی لباس سے پیارے بدن کے بیچ

ہے قہر وہ جو دیکھے نظر بھر کے جن نے میر
برہم کیا جہاں مژہ برہم زدن کے بیچ

جانا نہ دل کو تھا ترے زلف رسا کے بیچ
وابستہ جا پڑے ہے کوئی بھی بلا کے بیچ

فرہاد و قیس جس سے مجھے چاہو پوچھ لو
مشہور ہے فقیر بھی اہلِ وفا کے بیچ

آخر تو میں نے طول دیا بحث عشق کو
کوتاہی تم بھی مت کرو جور و جفا کے بیچ

آئی جو لب پہ آہ تو میں اُٹھ کھڑا ہوا
بیٹھا گیا نہ مجھ سے تو ایسی ہوا کے بیچ

اقبال دیکھ اُس ستم و ظلم و جور کا
دیکھوں ہوں جسکو ہے وہ اُسی کی دعا کے بیچ

دل اس چمن میں بہتوں سے میر لگا ولے
بوئے وفا نہ پائی کسو آشنا کے بیچ

جوش و خروش میر کے جاتے رہے نہ سب
ہوتا ہے شور چاہنے کی ابتدا کے بیچ

ردیف حائے حطی

یاد آگیا تو بہنے لگیں آنکھیں جو کی طرح
کچھ آگئی تھی سرو چمن میں کسو کی طرح

چسپاں قبا وہ شوخ سدا غصے ہی رہا
چین جبیں سے اسکی اٹھائی اتو کی طرح

گالی لڑائی آگئے تو تم جانتے نہ تھے
اب یہ نکالی تمنے نئی گفتگو کی طرح

ہم جانتے تھے تازہ بنائے جہانکو لیک
یہ منزل خراب ہوئی ہے کبھو کی طرح

سرسبز ہم ہوئے نہ تھے جو زرد ہو چلے
اس کشت میں پڑی یہ ہماری نمو کی طرح

وے دن کہاں کہ مست سر انداز خم میں تھے
سر اب تو جھو جھرا ہے شکستہ سبو کی طرح

تسکین دل کی کب ہوئی سیر چمن کیے
گو پھول دل میں آگئے کچھ اسکے رو کی طرح

آخر کو اس کی راہ میں ہم آپ گم ہوئے
مدت میں پائی یار کی یہ جستجو کی طرح

کیا لوگ یوں ہی آتش سوزاں میں جا پڑے
کچھ ہوگی جلتی آگ میں اس تندخو کی طرح

ڈرتا ہوں چاک دلکو مرے پلکوں سے سیے
نازک نظر پڑی ہے بہت اس رفو کی طرح

دھوتے ہیں اشک خونی سے دست دہن کو میر
طور نماز کیا ہے جو یہ ہے وضو کی طرح

ردیف دال مہملہ

زمیں پر میں جو پھینکا خط کو کر بند
بہت تڑپا گیا جوں مرغ پربند

گرفت دل سے ناچاری ہے یعنی
رہا ہوں بیٹھ میں بھی کر کے گھر بند

پھنسا دل زلف و کاکل میں نہ پوچھو
پڑا ہے ناگہ آ کر بند بر بند

سب اسکی چشم پر نیرنگ کے محو
نگہ کی اُن نے عالم کی نظر بند

چمن میں کیونکہ ہم پیوستہ جاویں
بلند از بسکہ ہے دیوار و در بند

بہت پیکان تیر یار ٹوٹے
تمام آہن ہے میر اب جگر بند

ہوئیں رونے کی مانع میری پلکیں
بندھا خاشاک سے سیلاب پر بند

کہا کیا جائے ان ہونٹھوں کے آگے
ہماری لب گزی ہے یہ شکر بند

کھلے بندوں نہ آیا یاں وہ اوباش
پھرا مونڈھے پہ ڈالے بستر بند

یہی اوقات ہیںگے دید کے میاں
رکھ اپنی چشم کو شام و سحر بند

سجا رہتا تھا چہرہ جس سے سواب
گریباں میں ہے وہ دست ہنر بند

فن اشعار میں ہوں پہلوان میر
مجھے ہے یاد اس کشتی کا ہر بند

ہماری بات کو اے شمع بزم کر تو یاد
زبانِ سُرخ سرِ سبز دیتی ہے برباد

ہمیں اسیر تو ہونا ہے اپنا اچھا یاد
کشش نہ دام کی دیکھی کشش صیاد

نہ دردمندی سے یہ راہ تم چلے ورنہ
قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ و فریاد

ہزار فاختہ گردن میں طوق پہنے پھرے
اسے خیال نہیں کچھ وہ سرو ہے آزاد

جہاں میں اتنے ہی آشوب کیا رہینگے بس
ابھی پڑیگا مرے خون بیگنہ سے زیاد

چمن میں اُٹھتے ہیں سنا ہٹے سے ای بلبل
جگر خراش یہ نالے ہیں تیرے منہ سے زیاد

ثبات قصر و در و بام و خشت و گل کتنا
عمارت دل درویش کی رکھو بنیاد

چمن میں یار ہمیں لے گئے تھے وا ہوئے
ہمارے ساتھ یہی غم ہی دل ناشاد

ہمیں تو مرنے کا طور اُسکے خوش بہت آیا
طواف کریے جو ہیں نخل ماتم فرہاد

نظر نہ کرتے طرف صید کے دم بسمل
یہ ظلم تازہ ہوا اُس کشندے سے ایجاد

چلے نہ تیغ اگر ہم نگاہ تند کریں
ہماری اور نہ دیکھے خدا کرے جلاّد

کب اُن نے دل میں کر انصاف یہ لطف کیا
وہی ہے خشم وہی یاں سے جا وہی بیداد

تمام رکھ بچاؤ ہیں اب تو پھر بس مرگ
کہا کنھوں نے تو کیا عز اسمہٗ استاد

اگرچہ گنج بھی ہے یہ خرابے یاں ہیں بہت
نہ پھر خرابے میں اے میر خانماں برباد

عشق لوہو پی گیا سب تن میں ہے سو درد درد
پھول میری خاک سے نکلیں گے بھی سو زرد زرد

کب مری شب کو سحر ہے ایک مدحالی کے بیچ
جانتا ہوں صبح ہو تا ہوں میں جب سرد سرد

کاروان در کاروان یاں سے چلے جاتے ہیں لوگ
ہر طرف اس خاکداں میں دیکھتے ہیں گرد گرد

مرد و زن سب ہیں نہ پیر و دیر و دختِ تاک سے
یہ غلط فہمی ہے ہر زن زن ہے یا ہر مرد مرد

دفتر اعمال میرا بھول جاویں میر کاش
ہے قیامت اس جریدے کو جو دیکھیں فرد فرد

بہت ہے تن درد پہ درد درد
اُٹھے گی مری خاک سے زرد گرد

وہ بیمار گو تو نہ جانے مجھے
مرا نامہ لکھنے کو ہو فرد زرد

گزرتی ہے کیا میر دل پہ ترے
تو ہوتا ہے ہر لحظہ کچھ زرد زرد

ردیف رائے مہملہ

گرمی سے گفتگو کی کرلے قیاس جاں پر
شعلہ ہے شمع ساں یاں ہر یک سخن زباں پر

دیکھ اُسکے خط کی خوبی لگ جاتی ہے چپ ایسی
گویا کہ مہر کی ہے اُن نے مرے دہاں پر

ہوں خاک مجکو اُنسے نسبت حساب کیا ہے
میں گنتی میں نہیں ہوں وے تو ہیں آسماں پر

گھر باغ میں بنایا پر ہم نے یہ نہ جانا
بجلی سے بھی پڑے گا پھول اُسکے آشیاں پر

روتے ہیں دوست اکثر سن سرگزشت عاشق
تو بھی تو گوش وا کر ٹک میری داستاں پر

کیا بات میں تب اُسکی جاوے کسو سے بولا
ہونے لگے ہوں خوں جب ہونٹھوں کے رنگ پاں پر

تڑپے ہے دل گھڑی بھر تو پہروں غش رہے ہے
کیا جانوں آفت آئی کیا طاقت و تواں پر

سودا اپنے جو اس سے تو میر منفعت ہے
اپنی نظر نہیں ہے پھر جان کی زیاں پر

پیس مارا دل غموں نے کوٹ کر
کیا اُجاڑا اس نگر کو لوٹ کر

ابر سے آشوب ایسا کب اُٹھا
خوب روئے دیدۂ تر پھوٹ کر

کیوں گریباں کو پھروں پھاڑے نہ میر
دامن اُس کا تو گیا ہے چھوٹ کر

اے مرغ چمن صبح ہوئی زمزمہ سر کر
دم کھینچ تہ دل سے کوئی ٹکڑے جگر کر

وہ آئینہ رو باغ کی پھولوں میں جو دیکھا
ہم رہ گئے حیران اسی منھ پہ نظر کر

ہے بیخبری مجکو ترے دیکھے سے ساقی
ہر لحظہ مری جان مجھے میری خبر کر

جس[1] جائے سراپا میں نظر جاتی ہے اُسکے
آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر کر

فرہاد سے پتھر پہ ہوئیں صنعتیں کیا کیا
دل جا کے جگر کاوی میں کچھ تو بھی ہنر کر

پڑتے نگہ اُس شوخ کی ہوتا ہے وہ احوال
رہ جاوے ہے جیسے کوئی بجلی سے ڈر کر

معشوق کا کیا وصل ورے ایسا دھرا ہے
تا شمع پتنگا بھی جو پہونچے ہے تو مر کر

کیا شب طرف اس چہرۂ تاباں سے ہوا تھا
پھر چاند نظر ہی نہ چڑھا جی سے اُتر کر

کسب اور کیا ہوتا عوض ریختے کے کاش
پچھتائے بہت میر ہم اس کام کو کر کر

---

[1] ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم ؛ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست ۱۲ شعر مشہور

جب ہمکلام ہمسے ہوتا ہے پان کھا کر
کس رنگ سے کرے ہے باتیں چبا چبا کر

تھی جملہ تن لطافت عالم میں جاں کے ہم تو
مٹی میں اٹ گئے ہیں اس خاکداں میں آکر

سعی و طلب بہت کی مطلب کے تئیں نہ پہونچے
ناچار اب جہاں سے بیٹھے ہیں ہاتھ اُٹھا کر

غیرت یہ تھی کہ آیا اُس سے جو میں خفا ہو
مرتے موا پہ ہرگز اُودھر پھرا نہ جا کر

قدرت خدا کی سب میں خلع العذار آ کر
بیٹھو جو مجھ کنے تو پردے میں مُنہ چھپا کر

ارمان ہے جنھوں کو وے اب کریں محبت[لہ]
ہم تو ہوئے پشیماں دل کے تئیں لگا کر

میں میر ترک لیکر دُنیا سے ہاتھ اُٹھایا
درویش تو بھی تو ہے حق میں مرے دعا کر

پڑتی ہے آنکھ ہر دم جا کر صفائے تن پر
سو جی گئے تھے صدقے اس شوخ کے بدن پر

نام خدا نکالے کیا پانوں رفتہ رفتہ
تلواریں چلتیاں ہیں اُسکے تو اب چلن پر

تو بھی تو ایک دن چل گلشن میں ساتھ میرے
کرتی ہے کیا تبختر بلبل گل چمن پر

دل جو بجا نہیں ہے وحشی سا میں پھروں ہوں
تم جائیو نہ ہرگز میرے دوانے پن پر

در کار عاشقوں کو کیا ہے جواب نامہ
یک نام یار بس ہے لکھنا مرے کفن پر

تب ہی بھلے تھے جبتک حرف آشنا نہ تھے ہم
لینے لگے لڑائی اب تو سخن سخن پر

گرد رخ اُسکے پیدا خط کا غبار یوں ہے
گرد اک تنک سی بیٹھے جس رنگ یاسمن پر

کس طرح میر جی کا ہم توبہ کرنا مانیں
کل تک تھے داغ مے کے سب اُنکے پیرہن پر

سحر گوش گل میں کہا میں نے جا کر
کھلے بند مرغ چمن سے ملا کر

لگا کہنے فرصت ہے یاں یک تبسم
سو وہ بھی گریباں میں منہ کو چھپا کر

تناسب پہ اعضا کے اتنا تبختر
بگاڑا تجھے خوب صورت بنا کر

قیامت رہا اضطراب اُسکے غم میں
جگر پھر گیا رات ہونٹھوں پہ آ کر

اسی آرزو میں گئے ہم جہاں سے
نہ پوچھا کبھو لطف سے ٹک بلا کر

کھنچی تیغ اُسکی تو یاں نیم جاں تھے
خجالت سے ہم رہ گئے سر جھکا کر

مبارک تمھیں میر ہو عشق کرنا
بہت ہم تو پچھتائے دل کو لگا کر

لہ مومن ؎ ایک ہم ہیں جو ہوئے ایسے پشیمان کہ بس + ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہونگے

صاف غلطاں خوں میں ہے نخچیر یار — لے گیا رنگ اُسکے دل سے تیر یار

سو تہی کی میرے طول عمر نے — جور میں تو کچھ نہ تھی تقصیر یار

آ گڑوں کی پانوؤں میں پڑی ہوئی — ہاتھ میں سونے کی وہ زنجیر یار

ہے کشیدہ جیسے تیغ آفتاب — میان میں رہتی نہیں شمشیر یار

میر ہم تو ناز ہی کھینچا کیے
کیونکہ کوئی کھینچے ہے تصویر یار

مذہب سے میرے کیا تجھے تیرا دیار اور — میں اور یار اور مرا کاروبار اور

چلتا ہے کام مرگ کا خوب اُسکے دور میں — ہوتی ہے گرد شہر کے روز اک مزار اور

بندے کو ان فقیروں میں گنیے نہ شہر کے — صاحب نے میرے مجکو دیا اعتبار اور

دل کو تو لاگ ہی ہے تکوں راہ کب تلک — اس پر ہے یک عذاب شدید انتظار اور

بسمل پسند کر کے تڑپنا نہ دیکھنا — ہے میرے صید پیشہ کا طور شکار اور

میں اس کے گرد رہ کا رہا منتظر بہت — سو آنکھیں دونوں لائیں مری اک غبار اور

درد سر اب جو عشق کا ہے گور تک ہے ساتھ — کچھ یہ نشہ ہی اور ہے اس کا خمار اور

کاہیکو اس قرار سے تھا اضطراب خلق — ہوتا ہے ہاتھ رکھنے سے دل بیقرار اور

اضطراب دل

کسکو فقیری میں سر و دل حرف کا ہے میر
کرتے ہیں اس دماغ پہ ہم انکسار اور

دعوے ہے یونہی اسکا ترے حسن گوش پر — یاں کون تھوکے ہے صدف ہرزہ کوش پر

شاید کسو میں اس میں بہت ہو گیا ہے بعد — تم بھی تو گوش رکھو جرس کے خروش پر

جیب و کنار سے تو بڑھا پانی دیکھیے — چشمہ ہماری چشم کا رہتا ہے جوش پر

اک شور ہے جو عالم کون و فساد میں — ہنگامہ ہے اُسی کے یہ لعل خموش پر

ہے بار دوش جسکے لیے زندگی سو وہ — رکھ ہاتھ راہ ٹک نہ چلا میرے دوش پر

جو ہے سو مست بادۂ وہم و خیال ہے — کسکو ہے یاں نگاہ کسو دُرد نوش پر

مرغ چمن نے کیا حق صحبت ادا کیا — لا لا کے گل بکھیرے مرے قبر پوش پر

جب تک بہار رہتی ہے رہتا ہو مست تو
عاشق ہیں میر ہم تو ترے عقل و ہوش پر

کیا جانیں گے کہ ہم بھی عاشق ہوئے کسو پر
غصّے سے تیغ اکثر اپنے رہی گلو پر

ہر کوئی چاہتا ہے سرمہ کرے نظر کا
ہونے لگے ہیں اب تو خون اسکی خاک کو پر

کر باغباں حیا ٹک گل کو نہ ہاتھ میں مل
دیتی ہے جان بلبل پھولوں کے رنگ بو پر

حسرت سے دیکھتے ہیں پرواز ہمصفیراں
شایستہ بھی ہمارے ایسے ہی تھے کبھو پر

حرف و سخن کرے ہے کس لطف سے برابر
سلک گہر بھی صدقے کیئے اُسکی گفتگو پر

گو شوق سے ہو دل خوں مجکو ادب وہی ہے
میں رو کبھو نہ رکھا گستاخ اُسکے رو پر

تن راکھ سے ملا سب آنکھیں ہے سی جلتی
ٹھہری نظر نہ جوکی میر اُس فتیلہ مو پر

ردیف زائے معجمہ

ہے تند و تیز اُسکی نگاہ اس طرف ہنوز
مارا ہے بیگناہ و گناہ اس طرف ہنوز

سرکاٹ کر ہم اُسکے قدم کے تلے رکھا
ٹیڑھی ہے اُسکی طرف کلاہ اس طرف ہنوز

مدت سے مثل شب ہے مرا تیرہ روزگار
آتا نہیں وہ غیرتِ ماہ اس طرف ہنوز

پتھرا گئیں ہیں آنکھیں مری نقش پا کے طور
پڑتی نہیں ہے یار کی راہ اس طرف ہنوز

جسکی جہت سے مرنے کے نزدیک پہونچے ہم
پھرتا نہیں وہ آنکے واہ اس طرف ہنوز

آنکھیں ہماری مند چلیں ہیں جس بغیر یاں
وہ دیکھتا بھی ٹک نہیں آہ اس طرف ہنوز

برسوں سے میر ماتم مجنوں ہے دشت میں
روتا ہے آکے ابر سیاہ اس طرف ہنوز

ردیف سین مہملہ

گلا مت توڑ دینا اے جرس بس
نہیں اس راہ میں فریاد رس بس

کبھو دل کی نہ کہنے پائے اُس سے
جہاں بولے لگا کہنے کہ بس بس

گل و گلزار سے کیا قیدیوں کو
ہمیں داغ دل و کنج قفس بس

نہ ترساؤ یکایک مار ڈالو
کروگے کب تلک ہم پر ترس بس

بہت کم دیتے تھے با دل دکھائی
رہے ہم ہی تو روتے اس برس بس

کسو محبوب کے ہو گو رپہ گل
ہمارے خاک کو ہے خار و خس بس

چمن کے غم میں سینہ داغ ہے میر
بہت نکلی ہماری بھی ہوس بس

عشق میں غم نہ چشم تر ہے بس
نہ ہے خوں دل و جگر ہے بس

رہ گئے منہ نہوں سے نوچ کے ہم
گر ہوس ہو اسی قدر ہے بس

اب سے جا کر کے پھر نہ آئے ہم
بس ہمیں تو یہی سفر ہے بس

چاہ میں ہم نہیں زیادہ طلب
کبھو پوچھو جو تم خبر ہے بس

چشم پوشی نہ کر فقیر ہے میر
مہر کی اسکو اک نظر ہے بس

اسیروں تک رسائی ہو چکی بس
مری بخت آزمائی ہو چکی بس

بہار اب کی بھی جو گزری قفس میں
تو پھر اپنی رہائی ہو چکی بس

کہاں تک اس سے قصہ قضیہ ہر شب
بہت باہم لڑائی ہو چکی بس

نہ آیا وہ مرے جاتے جہاں سے
یہیں تک آشنائی ہو چکی بس

لگا ہے حوصلہ بھی کرنے تنگی
غموں کی اب سمائی ہو چکی بس

برابر خاک کے تو کر دکھایا
فلک بس بے ادائی ہو چکی بس

دنی کے پاس کچھ رہتی ہے دولت
ہمارے ہاتھ آئی ہو چکی بس

دکھا اس بت کو پھر بھی یا خدایا
تری قدرت نمائی ہو چکی بس

شرر کی سی ہے چشمک فرصت عمر
جہاں دے ٹک دکھائی ہو چکی بس

گلے میں گیروی کفنی ہے اب میر
تمھاری میرزائی ہو چکی بس

ردیف شین معجمہ

اس کے در پر شب نہ کر اے دل خروش
کہتے ہیں دیوار بھی رکھے ہے گوش

پانوں پڑتا ہے کہیں آنکھیں کہیں
اس کی مستی دیکھ کر جاتا ہے ہوش

کتنے یہ فتنے ہیں موجب شور کے
قد و خد و گیسو و لعل خموش

مرگیا اس ماہ بن میں کیا عجب
چاندنی سے ہو جو میرا قبر پوش

صافی سے چادر اپنی میں نے کی
اور کیا کرتے ہیں مفلس دردنوش

دوستوں کا درد دل ٹک گوش کر
گر نصیب دشمناں ہے درد گوش

جنس تب ملتا ہے بازاروں میں میر
ایک لوطی ہو وہ ظالم سر فروش

طرحِ خوش نازِ خوش اس کی ادا خوش
خوشا ہم جو نہ رکھے ہم کو ناخوش

نہیں ناساز فقر اپنا کسو کا
خرابی کی ہماری ہے ہوا خوش

بتوں کے غم میں نالاں جب نہ تب ہوں
نہ راضی خلق مجھ سے نے خدا خوش

کلی رکتی ہے گل سے ہے دل پریشاں
کسو کی اس چمن میں گزرے کیا خوش

جہانِ تنگ کڑھنے ہی کی جا تھی
کوئی دن میں تکلف سے رہا خوش

رہا پھولوں میں کرتا زمزمہ میں
مری اس باغ میں گزری سدا خوش

گیا اس شہر ہی سے میر آخر
تمھاری طرز بد سے کچھ نہ تھا خوش

فکر میں مرگ کے ہوں سر درپیش
ہے عجب طور کا سفر درپیش

کسکی آنکھیں پھریں ہیں آنکھوں میں
دمبدم ہے مری نظر درپیش

مستی بھی اہل ہوش کی ہے جنھیں
آوے ہے عالم دگر درپیش

کیا کروں نقل راہ ہستی میں
مرحلے آئے کس قدر درپیش

کیا پتنگے کو شمع روئے میر
اس کی شب کو بھی ہے سحر درپیش

ہوں تو دریا پہ کیا ترکِ خروش
دل کی دل ہی میں کھپائے اپنے جوش

مست رہتے ہیں ہم اپنے حال میں
عرض کریے حال پر ہے کسکے گوش

عاقبت تجھ کو لباس راہ راہ
لے گیا ہے راہ سے لے تنگ پوش

ہو نہ آگے میرے جوں سوسن زباں
ہو سکے تو گل کے رنگوں رہیے گوش

میر تو طفلانِ تہ بازار میں
دیکھو شاید ہو وہیں وہ دلفروش

ردیف صاد مہملہ

ہے نہ دل بیتاب کا بھی ویسا رقص
رقص بسمل تم سنو ہو جیسا رقص

ردیف ضاد معجمہ

آج رکھ آیا کمر میں پیش قبض
سو ہی کھینچی مجھ پہ گھر میں پیش قبض

ردیف طائے مہملہ

شاید اُس سادہ نے رکھا ہے خط / کہ ہمیں متصل لکھا ہے خط
شوق سے بات بڑھ گئی تھی بہت / دفتر اُسکو لکھیں ہیں کیا ہے خط
نامہ کب یار نے پڑھا سارا / نہ کہا یہ بھی آشنا ہے خط
ساتھ ہم بھی گئے ہیں دو تہ تلک / جب ادھر کے تئیں چلا ہے خط

کچھ خلل راہ میں ہوا اے میر
نامہ بر کب سے لے گیا ہے خط

ہم نہ سمجھے رابطہ ان نوخطوں سے تھا غلط / ہوتے ہیں بر خود غلط یہ ہو گیا یہ کیا غلط

کہتے ہو کیا کیا لکھا ہے خط میں مجکو میر نے
کب کہا اُن نے یہ سب جھوٹھ افترا ہے یا غلط

ردیف ظائے معجمہ

جو وہ ہے تو ہے زندگانی سے حظ / مزا عمر کا ہے جوانی سے حظ
نہیں وہ تو سب کچھ یہ بے لطف ہے / نہ کھانے میں لذت نہ پانی سے حظ

کہا درد دل رات کیا میر نے
اُٹھایا بہت اس کہانی سے حظ

ردیف عین مہملہ

آ گئے جب اس آتشیں رخسار کے آگے ہی شمع / پانی پانی شرم مفرط سے ہوئی جاتی ہے شمع

ہے مری ہر اک غزل پر اجتماع / خانقہ میں کرتے ہیں صوفی سماع
وجد میں رکھتا ہے اہل فہم کو / میرے شعر و شاعری کا استماع
نیم بسمل چھوڑ دینا رسم کر / اس شکار افگن کا ہے گا اختراع
کچھ ضرر عاید ہوا میرے ہی اور / ورنہ اس سے سب کو پہنچا انتفاع
یار دشمن ہو گیا اس کے سبب / ہے متاع دوستی بھی کیا متاع
دل جگر خوں ہو کے رخصت ہو گئے / حسرت آلودہ ہی کیا اشک وداع

میر درد دل نہ کہہ ظالم بس اب
ہو گیا ہے سامعوں کو تو صداع

ردیف غین معجمہ

اب نہیں سینے میں میرے جائے داغ / سوز دل سے داغ ہے بالائے داغ

دل جلا آنکھیں جلیں جی جل گیا / عشق نے کیا کیا ہمیں دکھلائے داغ

دل جگر جلکر ہوئے ہیں دونوں ایک / درمیان آیا ہے جب سے پائے داغ

منفعل ہیں لالہ و شمع و چراغ / ہمنے بھی کیا عاشقی میں کھائے داغ

وہ نہیں اب میر جو چھاتی جلے
کھا گیا سارے جگر کو ہائے داغ

صحبت کسو سے رکھنے کا اسکو نہ تھا دماغ / تھا میر بے دماغ کو بھی کیا بلا دماغ

باتیں کرے برشتگی دل کی یہ کہاں / کرتا ہے اس دماغ جلے کا وفا دماغ

و حرف زیر لب کہے پھر ہو گیا خموش / یعنی کہ بات کرنے کا کس کو رہا دماغ

کر فکر اپنی طاقت فکری جو ہو ضعیف / اب شعر شاعری کی طرف کب لگا دماغ

آتش زبانی شمع نمط میر کی بہت
اب چاہیئے معاف رکھیں جل گیا دماغ

ردیف فائے

کیا پیام و سلام ہے موقوف / رسم ظاہر تمام ہے موقوف

حیرت حسن یار سے چپ ہیں / سب سے حرف و کلام ہے موقوف

روز وعدہ ہے ملنے کا لیکن / صبح موقوف شام ہے موقوف

وہ نہیں ہے کہ داد لے چھوڑیں / اب تو رحم پہ کام ہے موقوف

پیش مژگاں دھرے رہے خنجر / آگے زلفوں کے دام ہے موقوف

کہتے صاحب کبھو بلاتے تھے / سو وقار غلام ہے موقوف

اقتدا میر ہم سے کس کی ہوئی
بیئے اب ہاں امام ہے موقوف

ردیف قاف

کیا حقیقت کہوں کہ کیا ہے عشق / حق شناسوں کا ہاں خدا ہے عشق

دل لگا ہو تو جی جہاں سے اٹھا / موت کا نام پیار کا ہے عشق

اور تدبیر کو نہیں کچھ دخل
عشق کے درد کی دوا ہے عشق

کیا دبایا محیط میں غم کے
ہمنے جانا تھا آشنا ہے عشق

عشق سے جا نہیں کوئی خالی
دل سے لے عرش تک بھرا ہے عشق

کوہکن کیا پہاڑ کاٹے گا
پردے میں زور آزما ہے عشق

عشق ہے عشق کرنے والوں کو
کیسا کیسا بہم کیا ہے عشق

کون مقصد کو عشق بن پہونچا
آرزو عشق مدعا ہے عشق

میر مرنا پڑے ہے خوباں پر
عشق مت کر کہ بد بلا ہے عشق

گر بادیے میں تجکو صبا لے کے جائے شوق
مجنوں کو میری اور سے کہیو دعائے شوق

وصل و جدائی سے ہے مبرّا وہ کام جاں
معلوم کچھ ہوا نہ ہمیں یاں سوائے شوق

ہر چار اور اُڑتی پھرے ہے ہماری خاک
سر سے گئی نہ جی بھی گئے پر ہوائے شوق

دیر و حرم میں ہمکو پھر آنا ہے دیر تک
پھر بھی ہمارے ساتھ وہی ہے ادائے شوق

افسوس ایسے کوچے سے تم آشنا نہیں
کیا دردناک ہے بھی کوئی ہے نوائے شوق

درد اور آہ و نالہ کرے ہے دم سحر
یکمشت پر ہے مرغ گلستاں پہ ہائے شوق

کیا پوچھتے ہو شوق کہاں تک ہے ہمکو میر
مرنا ہی اہل درد کا ہے انتہائے شوق

ردیف کاف تازی

ہر چند صرف غم ہیں یہ دل جگر سے جاں تک
لیکن کبھو شکایت آئی نہیں زباں تک

کیا کوئی اُس کے رنگوں گل باغ میں کھلا ہو
شور آج بلبلوں کا جاتا ہے آسماں تک

دو چار دن جو ہوں تو رک رک کے کوئی کاٹے
ناچار صبر کرنا عاشق سے ہو کہاں تک

ان جلتی ہڈیوں کو شاید ہما نہ کھاوے
تب عشق کی ہماری پہونچی ہے استخواں تک

روئے جہاں جہاں ہم جوں ابر میر اُس بن
اب آب ہے سراسر جاوے نظر جہاں تک

ردیف کاف فارسی

قتل گہ میں دست بوس اسکا کریں فی الفور لوگ
ہم کھڑے تلوار کھاویں نقش ماریں اور لوگ

پھر وہی ہم عاشقوں سے اسکی بس اب جا چکی
ایک تو ناساز پھر اُس سے ملے بیطور لوگ

زخم تیغ یار غایر ہو کے پہونچا دل تلک
حیف میرے حال پر کرتے نہیں ٹک غور لوگ

جاکے دنیا سے تجھے یاد آؤں گا میں بھی بہت
بعد میرے کب اُٹھاوینگے ترے یہ جور لوگ

رسم و عادت ہے کہ ہر یک وقت کا ہوتا ہے ذکر
میر بارے یاد کر روونگے کیا یہ دور لوگ

چاک دل ہے انار کے سے رنگ
چشم پر خوں نگار کے سے رنگ

کام میں ہے ہوائے گل کی موج
تیغ خونریز یار کے سے رنگ

تاب ہی میں رہے ہے اسکی زلف
افعی پیچدار کے سے رنگ

کیا جو افسردگی کے ساتھ کھلا
دل گل بے بہار کے سے رنگ

برق ابر بہار نے بھی لیے
اب دل بیقرار کے سے رنگ

کنج نخچیر گہ میں ہیں مامون
ہم بھی لاغر شکار کے سے رنگ

عمر کا بھی سُرنگ جاتا ہے
ابلق روزگار کے سے رنگ

برگ گل میں نہ دلکشی ہو گی
کف پائے نگار کے سے رنگ

اس بیاباں میں **میر** محو ہوئے
ناتواں اک غبار کے سے رنگ

ردیف لام

اب کی ہزار رنگ گلستاں میں آئے گل
پر اُس بغیر اپنے تو جی کو نہ بھائے گل

بلبل کو ناز کیوں نہ خیابان گل پہ ہو
کیا جانئے جی نے چھاتی پہ پھر کر نہ کھائے گل

کب تک حنائی پاؤں بن اُسکے یہ بیکلی
لگ جائے ٹک چمن میں کہیں آنکھ پائے گل

ناچار ہو چمن میں نہ رہیئے کہوں ہو جب
بلبل کہے ہے اور کوئی دن برائے گل

چلیے بغل میں لے کے گلابی کسو طرف
دامان دلکو کھینچے ہے ساقی ہوائے گل

پگڑی میں پھول رکھتے ہیں رعنا جوان شہر
داغ جنوں ہی سر پہ رہا یاں بجائے گل

بلبل کو کیا سنے کوئی اُڑ جاتے ہیں حواس
جب درد مند کہتی ہے دم بھر کے ہائے گل

سویا نہ ہو بدن کی نزاکت سے ساری رات
بستر پہ اسکے خواب کی کن نے بچھائے گل

مصروف یار چاہیئے مرغ چمن سا ہو
دل نذر و دیدہ پیشکش و جاں فدائے گل

ہم طرح آشیاں کی نہ گلشن میں ڈالتے / معلوم ہوتی آگے جو ہم کو وفائے گل
چسپاں لباس ہوتے ہیں لیکن نہ اسقدر / ہے چاک رشک جامہ سے اسکے قبائے گل
کیا نہ سمجھے لطف چہروں کے رنگ و بہار کا / بلبل نے اور کچھ نہیں دیکھا سوائے گل

تھا وصف اُن لبونکا زبان قلم پہ میر
یا مُنہ میں عندلیب کے تھے برگہائے گل

نہ ٹک واشد ہوئی جب سے لگا دل / الٰہی غنچہ ہے پژمردہ یا دل
نہ اس سے یاں تئیں آیا گیا حیف / رہے ہم جب تلک اسمیں رہا دل
اُٹھایا داغ لالہ نے چمن سے / کروں کیا دیکھتے ہی جل گیا دل
نہیں کم رایتِ اقبال شہ سے / علم اپنا یہ دُنیا سے اٹھا دل
ہمارا خاص مشربِ عشق اُس میں / پیمبر دل ہے قبلہ دل خدا دل
ہمارے مُنھ پہ طفل اشک دوڑا / کیا ہے اس بھی لڑکے نے بڑا دل

سبھوں سے میر بیگانے سے رہتے
جو ہوتا اس سے کچھ بھی آشنا دل

نہ خوشہ یاں نہ دانہ یاں جلانا گھاس کیا حاصل / ترا ہے برق خاطف اسطرف گرنا ہی لاحاصل
سکندر ہوکے مالک سات اقلیموں کا آخر کو / گیا دست تہی ہے یاں سے یہ کچھ کر گیا حاصل
بلا قحط مروت ہے کہ ہے محصول غلّے پر / کہیں سے چار دانے لا دلیویں جابجا حاصل
نہ کھینچیں کیونکہ نقصاں ہم تو قیدی ہیں تعیّن کے / خودی سے کوئی نکلے تو اُسے ہووے خدا حاصل
عبارت خوب لکھی شاعری انشا طرازی کی / وے مطلب ہیں گم دیکھیں تو کب ہو مدعا حاصل
بہت مصروف کشت و کار تھے مزرع میں دُنیا کے / اُٹھا حسرت سے ہاتھ آخر نہیں یہ کچھ ہوا حاصل

پھرا مت میر سر اپنا گراں گوشوں کی مجلس میں
سُنے کوئی تو کچھ کہیئے بھی اس کہنے کا کیا حاصل

ردیف میم

جی کے تئیں چھپاتے نہیں یوں تو غم سے ہم / پر تنگ آگئے ہیں تمھارے ستم سے ہم
اپنے خیال ہی میں گزرتی ہے اپنی عُمر / پر کچھ نہ پوچھو سمجھے نہیں جاتے ہم سے ہم
زانو پہ سر ہے قامت خم گشتہ کے سبب / پیری میں اپنی آن لگے ہیں قدم سے ہم

جوں حلقہ میر حاج کا ہے خوار جانماز
بتخانے میں جو آئے ہیں چل کر حرم سے ہم

روتے بھی اُن نے دیکھ کے ہمکو کیا نہ رحم
اک چشم داشت رکھتے تھے مژگان نم سے ہم

بدعہدیاں ہی کرتے گئے اُسکو سال و ماہ
اب کیا تسلی ہوتے ہیں قول و قسم سے ہم

زُنّار سا بندھا ہے گلے اپنے اب تو کفر
بدنام ہیں جہان میں عشق صنم سے ہم

لوگوں کو وصف کرنیسے بالیدگی ہوئی
جوں شیشہ پھیل پھوٹ پڑے اُنکے دم سے ہم

طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میر
کیا کیا کہا کریں ہیں زبان قلم سے ہم

سرزیر پر ہیں دیر سے اسپے ہم صفیر ہم
واقف نہیں ہوائے چمن سے اسیر ہم

کیا ظلم تھے لباس میں اس تنگ پوش کے
دلتنگی سے نکل گئے ہو کر فقیر ہم

دیکھ اُس کو راہ جاتے تو بیحال ہوگئے
اب دیکھیے بحال کب آتے ہیں میر ہم

جو رہے یوں ہیں غم کے مارے ہم
تو بھی آج کل سدھارے ہم

مرتے رہتے تھے اسپہ یوں پر اب
جا لگے گور کے کنارے ہم

دن گزرتا ہے دم شماری میں
شب کو رہتے ہیں گنتے تارے ہم

ہے مروت سے اپنی وحشت دور
انس رکھتے ہیں تمسے پیارے ہم

زندگی بار دوش آج ہے یاں
دیکھیں گے کل جو ہونگے بارے ہم

جاچکی بازی یعنی مرتے ہیں
جیتے تم یہ قمار ہارے ہم

میر آؤگے آپ میں بھی کبھو
سخت مشتاق ہیں تمھارے ہم

گئے عشق کی راہ سر کر قدم
بلا پر چلے آئے ہر ہر قدم

عجب راہ پر خوف و مشکل گزر
اُٹھایا گیا ہم سے مر مر قدم

بہت مستی عشق پا لغز تھی
خدا جانے پڑتا تھا کیدھر قدم

ہوا ہوگا خالی بدن جاں سے جب
چلے ہوں گے یہ راہ جو بھر قدم

وہ عیار یوں چشم تر سے گیا
کہ ہرگز نہ اُسکا ہوا تر قدم

سہو
مصروف ہم کو ہے ان سر سے گزروں کے عشق
گئے ہو ہمارے قدم پر قدم

جو کچھ آوے سالک کے آگے ہے خیر
رکھا ہم نے اب گھر سے باہر قدم

ہمیں سرکشی سربلندی سے کیا
رہے ضعف میں ہم تو سر در قدم

کہیں کیا کف پا میں میر آبلے
چلیں ہم سروں پر مگر دھر قدم

میر آج وہ بدمست ہے ہشیار رہو تم
ہے بیخبری اُس کو خبردار رہو تم

جی جائے کسی کا کہ رہے تمکو قسم ہے
مقدور تلک درپے آزار رہو تم

وہ محو جمال اپنے ہے پروا نہیں اسکو
خواہاں رہو تم اب کہ طلبگار رہو تم

اس معنی کے ادراک سے حیرت ہی ہے حاصل
آئینہ نمط صورت دیوار رہو تم

یکبار ہوا دل کی تسلی کا وہ باعث
یہ کیا کہ اسی طور سے ہر بار رہو تم

ہو لطف اسی کا تو کوئی کام کو پہونچے
تسبیح گلے ڈال کے زنار رہو تم

کیا میر پرے چال سے جینے کے چلے ہے
بہتر ہے کہ اپنے تئیں اب مار رہو تم

ٹک شتاب جاتے ہیں ورنہ جہاں سے ہم
کچھ ہو رہے ہیں غم میں ترے نیم جاں سے ہم

ہر بات کے جواب میں گالی کہاں تلک
اب جاں بلب ہوئے ہیں تمھاری زباں سے ہم

وعدہ کرو تو سوچ لو مدت کو دل میں بھی
یہ حال ہے تو دیر رہیں گے کہاں سے ہم

الجھاؤ دل کا جس سے ہے جھنجھلا کے اس بغیر
جھگڑا کیا کریں ہیں زمین آسماں سے ہم

لاویں ہماری خاک پر اس کینہ ور کو بھی
یہ کہہ مریں گے اپنے ہر اک مہرباں سے ہم

دربان سنگدل نے خبر واں تلک نہ کی
سر مار مار صبح کی اس آستاں سے ہم

جب اُس کی تیغ رکھنے لگا اپنے پاس میر
اُمید قطع کی تھی تبھی اس جواں سے ہم

بیماری دلی سے زار و نزار ہیں ہم
اک مشت اُستخواں ہیں پر اپنے بار ہیں ہم

مارا تڑپتے چھوڑا فتراک سے نہ باندھا
بے چشم و رو کسو کے شاید شکار ہیں ہم

ہر دم جبیں خراشی ہر آن سینہ کاوی
حیران عشق تو ہیں پر گرم کار ہیں ہم

حور و قصور و غلماں نہر و نعیم جنت
یہ کلہم جہنم مشتاق یار ہیں ہم

بیحد و حصر گردش اپنی ہے عاشقی میں
رسوائے شہر و دیہ و دشت و دیار ہیں ہم

اب سیل سیل آنسو آتے ہیں چشم تر سے / دیوار و در سے کہدو بے اختیار ہیں ہم

روتے ہیں یوں کہ جیسے شدت سے ابر برسے / کیا جانیے کہ کیسے دل کے بخار ہیں ہم

اب تو گلے بندھا ہے زنجیر و طوق ہونا / عشق و جنوں کے اپنے ناموس دار ہیں ہم

لیتا ہے **میر** عبرت کوئی جو دیکھتا ہے / کیا یار کی گلی میں بے اعتبار ہیں ہم

ہر ہر سخن پہ اب تو کرتے ہو گفتگو تم / ان بد مزاجیوں کو چھوڑو گے بھی کبھو تم

یاں آپ ہی آپ آکر گم آپ میں ہوئے ہم / پیدا نہیں کہ کس کی کرتے ہو جستجو تم

چاہیں تو تم کو چاہیں دیکھیں تو تم کو دیکھیں / خواہش دلوں کی تم ہو آنکھوں کی آرزو تم

حیرت زدہ کسو کی یہ آنکھ ہی لگے ہے / مت بیٹھو آرسی کے ہر لحظہ روبرو تم

تھے تم بھبھوکے سے تو پر اب جلا ہی دو ہو / سوزندہ آگ کی کیا سیکھے ہو ساری خو تم

نسبت تو ہمدگر ہے گو دور کی ہو نسبت / ہم ہیں نوائے بلبل ہو گل کی رنگ و بو تم

دیکھ اشک سرخ بولا یہ رنگ اور لائے / ہیں **میر** منھ پہ آنسو یا روتے ہو لہو تم

ردیف نون

ٹھنڈی سانسیں بھریں ہیں جلتے ہیں کیا تاب میں ہیں / دل کے پہلو سے ہم آتش میں ہیں اور آب میں ہیں

ساتھ اپنے نہیں اسباب مساعد مطلق / ہم بھی کہنے کے تئیں عالم اسباب میں ہیں

غفلت دل سے ستم گزریں ہیں سو مت پوچھو / قافلے چلنے کو تیار ہیں ہم خواب میں ہیں

عشق کے ہیں گے جو سرگشتہ پڑے ہیں ڈوبے / کشتیاں نکلیں سو کیا آن کے گرداب میں ہیں

دور[1] کیا اس سے جو بیٹھے ہے غبار اپنا دور / پاس اس طور کے بھی عشق کے آداب میں ہیں

ہے فروغ مہ تاباں سے فراغ کلی / دل جلے پر تو رخ سے ترے مہتاب میں ہیں

ہم بھی اس شہر میں ان لوگوں سے ہیں خانہ خراب / **میر** گھر بار جنھوں کے رہ سیلاب میں ہیں

کہے تو ہمنشیں رنگ تصرف کچھ دکھاؤں میں / الگ بیٹھا حنا بندوں کو آنکھوں میں جاؤں میں

نہیں ہوں بے ادب اتنا کہ گل سے منھ لگاؤں میں / جگر ہو ٹکڑے ٹکڑے گر چمن کی اور جاؤں میں

[1] میر تقی میر — دور بیٹھا غبار میر اس سے : عشق بن یہ ادب نہیں آتا ۱۲

کیا ہے اضطراب دل نے کیا مجکو سبک آخر
کہاں تک یار کے کوچے سے جا جا کر پھر آؤں میں

وفا صد کاروان رکھتا ہوں لیکن شہر خوبی میں
خریداری نہیں مطلق کہاں جا کر بکاؤں میں

مجھے سرو رگر بیاں رہنے دو میں بے توقع ہوں
کسو تیھر سے ٹپکوں ہوں ابھی جو سر اٹھاؤں میں

بلا حسرت ہے یارب کام دل کیونکر کروں حاصل
مگر لبہائے شیریں پر کسو کے زہر کھاؤں میں

نہ روؤں حال پر کیونکر بلا نا آشنا ہے وہ
کہیں آنکھ اُسکو ملتی ہے جو آنکھیں ٹک ملاؤں میں

نہ اے رشک بہار آنکھیں اُٹھا و پشت پا سے تو
ہتھیلی پر اگر سرسوں ترے آگے جماؤں میں

کہوں کیا صحبت اس سے ہر گھڑی بگڑی ہی جاتی ہے
جو ٹک راہ سخن نکلے تو سو باتیں بناؤں میں

نگاہ حسرت بت دیر سے جانے کی مانع ہے
مزاج اپنا بہت چاہا کہ سوئے کعبہ لاؤں میں

اسیر زلف کو اس بت کے کیا قید مسلمانی
تمنا ہے گلا زنار سے اپنا بندھاؤں میں

کہوں ہوں میرؔ سے دل دے کہیں ناحق لگے تیرا
جو ہو نقصان جان اُسکا تو کیونکر پھر مناؤں میں

روچکا خون جگر سب اب جگر میں خوں کہاں
غم سے پانی ہوگئے کب کا گیا میں ہوں کہاں

دست و دامن جیب و آغوش اپنے اس لائق نہ تھے
پھول میں اس باغ خوبی سے جو لوں تو لوں کہاں

عاشق و معشوق یاں آخر فسانے ہوگئے
جائے گریہ ہے جہاں لیلے کہاں مجنوں کہاں

آگ برسی تیرہ عالم ہوگیا جادو سے پر
اُسکی چشم پر فسوں کے سامنے افسوں کہاں

سیر کی رنگیں بیاض باغ کی ہم نے بہت
سرو کا مصرع کہاں وہ قامت موزوں کہاں

کوچہ ہر یک جائے دلکش عالم خاکی میں ہے
پر کہیں لگتا نہیں جی ہائے میں دل دوں کہاں

ایک دم سے قیس کے جنگل بھرا رہتا تھا کیا
اب گئے پر اُس کے ویسی رونق ہاموں کہاں

ناصح مشفق تو کہتا تھا کہ اس سے مت ملے[سلہ]
پر سمجھتا ہے ہمارا یہ دل محزوں کہاں

باد کے گھوڑے پہ تھے اس باغ کے ساکن سوار
اب کہاں فرہاد و شیریں خسرو و گلگوں کہاں

کھا گیا اندوہ مجکو دوستان رفتہ کا
ڈھونڈھتا ہے جی بہت پر اب انھیں پاؤں کہاں

تھا وہ فتنہ ملنے کے گوں کب کسی درویش کے
کیا کہیں ہم میرؔ صاحب سے ہوئے مفتوں کہاں

عشق نے خوار و ذلیل کیا ہم سر کو بکھیرے پھرتے ہیں
سوز و درد و داغ و الم سب جی کو گھیرے پھرتے ہیں

سلہ اس سے مت ملے یعنی اس سے نہ مل اسطرح سے بولنا اب متروک ہے مگر نواح دہلی وغیرہ میں اب بھی اسی طرح بولتے ہیں ۱۲ اسی

ہر شب ہوں سرگشتہ و نالاں اس بن کوچہ و برزن میں
پاس نہیں ہے اب بھی دیکھو کن دن میرے پھرتے ہیں

دل لشکر میں ایک سپاہی زادے نے ہمسے چھین لیا
ہم درویش طلب میں اسکے ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں

بیخود اسکی زلف و رخ کے کاہے کو آپ میں پھر آئے
ہم کہتے ہیں تسلی دل کو سانجھ سویرے پھرتے ہیں

نقش کسو کا درون سینہ گرم طلب ہیں ایسے رنگ
جیسے خیالی پاس لیے تصویر چتیرے پھرتے ہیں

ایسے اگر شمشیر سروں پر منھ موڑیں زنہار نہیں
سیدھے جانیوالے ادھر کے کس کے پھیرے پھرتے ہیں

پائے نگار آلودہ کہیں سانجھ کو میر نے دیکھے تھے
صبح تلک اب بھی آنکھوں میں اسکی پانوں تیرے پھرتے ہیں

جمع ہوتے نہیں حواس کہیں
جائیں یاں سے جو ہم اداس کہیں

دل کی دو اشک سے نہ نکلی بھڑاس
سو بجھتی نہیں ہے پیاس کہیں

یاد خوشبو بھی آئے ہے واں سے
کوئی چھپتی ہے گل کی باس کہیں

اس جنوں میں کہیں ہے سر پر خاک
ٹکڑے ہو کر گیا لباس کہیں

گرد سر یار کے پھریں بہروں
ہم جو ہوں اسکے آس پاس کہیں

سب جگہ لوگ حق و ناحق پر
نہ ملا حیف حق شناس کہیں

ہر طرف ہیں امیدوار یار
اس سے کوئی نہیں نراس کہیں

عشق کا محو دست شیریں ہوں
جان کا بھی نہیں ہراس کہیں

عرش تک تو خیال پہونچے میر
وہم پھرے ہے کہیں قیاس کہیں

جائیں تو جائیں کہاں جو گھر رہیں کیا گھر رہیں
یاں رہن لگتا نہیں جی کاشکے ہم مر رہیں

دل جو اکتاتا ہے یارب رہ نہیں سکتے کہیں
کیا کریں جاویں کہاں گھر میں رہیں باہر رہیں

وہ نہیں جو تیغ سے اُس کے گلا کٹوائیے
تنگ آئے ہیں بہت اب آپ ہی ہو کر رہیں

بیدماغی بیقراری بیکسی بے طاقتی
کیا جیے وہ جسکے جی کو روگ یہ اکثر رہیں

مضطرب ہو ایکسا دو دم تو تدارک بھی ہو کچھ
متصل تڑپے ہے کب تک ہاتھ یہ دل پر رہیں

زندگی دردسر ہوئی ہے میر آخر تا کجا
دل جگر جلتے رہیں آنکھیں ہماری تر رہیں

کہاں کے لوگ ہیں خوباں محبت انکو نہیں
مریں بھی ہم تو نہ دیکھیں مروت انکو نہیں

خراب و خوار ہیں سلطاں شکستہ حال امیر
ہمارے دیدہ و دل سے ہی ہم پہ کام ہے تنگ
پری و سرو کو دعوی ہے اس رخ و قد سے

کسو فقیر سے شاید کہ صحبت انکو نہیں
کہ رونے کڑھنے سے یک لحظہ فرصت انکو نہیں
شکایت ایسی نہیں آدمیت انکو نہیں

چلا ہے تیغ بکف یار غیر کی جانب
ہوئے ہیں میر تماشائی غیرت انکو نہیں

ظلم و ستم کیا جور و جفا کیا جو کچھ کہیے اٹھاتا ہوں
خفت کھینچ کے جاتا ہوں رہتا نہیں دل پھر آتا ہوں

گھر سے اُٹھ کر کونے میں بیٹھا بیت پڑھے دو باتیں کیں
کس کس طور سے اپنے دل کو اُس بن میں بہلاتا ہوں

ہاے سبک ہونا یہ میر افراطِ شوق سے مجلس میں
وہ تو نہیں سنتا دل دے کر میں ہی باتیں بناتا ہوں

قتل ہیں میرے یہ صحبت ہے غم غصے سے محبت کے
لوہو اپنا پیتا ہوں تلواریں اُس کی کھاتا ہوں

آنے کی میری فرصت کتنی دو دم دو پل ایک گھڑی
رنجش کیوں کا ہے کو خشونت غصہ کیا میں جاتا ہوں

سر مارو ہوں ایدھر اودھر دور تلک جاتا ہوں نکل
پاس نہیں پاتا جو اُس کو کیا کیا میں گھبراتا ہوں

پھاڑ کے خط کو گلے میں ڈالا شہر میں سب تشہیر کیا
سامنے ہوں قاصد کے کیونکر اس سے میں شرماتا ہوں

پہلے فریب لطف سے اُسکے کچھ نہ ہوا معلوم مجھے
اب جو جاہ نے بدلیں طرحیں سر دھنتا ہوں پچھتاتا ہوں

مجرم اس خاطر ہوتا ہوں بعضے بعضے شوخی کر
عذر گناہ میں جاکر اُس کے پاؤں کو ہاتھ لگاتا ہوں

دیکھے ان پلکوں کے اکثر میر ہوں بیخود و تنگ
آپ کو پاتا ہوں تو چھری اُس وقت نہد

کبھو ملے ہے سو وہ یوں کہ پھر ملا نہ کریں
کرے ہے آپ ہی شکایت کہ ہم گلا نہ کریں

ہوئے یہ چاہ میں مشکل کہ جی گیا ہوتا
نہ رہتے جیتے اگر ہم مساہلا نہ کریں

ہمارے حرف پریشاں ہی لطف رکھتے ہیں
جنوں ہے بحث جو وحشت میں عاقلانہ کریں

صفائے دل جو ہوئے ٹک تو دیکھیں ہیں کیا کیا
ہم ایسے آئینہ کو اپنے کیوں جلا نہ کریں

وبال ہیں نہ گرفتار ہوں کہیں مہ و مہر
خدا کرے ترے رخ سے مقابلہ نہ کریں

دل اب تو ہم سے ہے بدبار اگر رہے جیتے
کسو سے ہم بھی دلی پھر معاملہ نہ کریں

سخن کے ملک کا میں مستقل امیر ہوں میر
ہزار مدعی بھی مجھ کو دہ ولا نہ کریں

شعر میں نے کچھ کہے بالوں کے اسکی یاد میں
سو غزل پڑھتے پھرے ہیں لوگ فیض آباد میں

سرخ آنکھیں خشم سے کیں ان نے مجھ پر صبح کو
دیکھی یہ تاثیر شب کی خونچکاں فریاد میں

یہ تصرف عشق کا ہے سب وگرنہ ظرف کیا
ایک عالم غم سمایا خاطر ناشاد میں

عشق کی دیوانگی لائی ہمیں جنگل کی اور
ورنہ ہم پھرتے بگولے سے نہ خاک و باد میں

دیر لگتا ہے گلے تلوار سے وہ رکھ کے ہاتھ
خوبیاں بھی تو بہت ہیں اس ستم ایجاد میں

یہ بنا ہستی سی آتی ہے نظریاں کچھ مجھے
اچھی ہے تعمیر دل کی اس خراب آباد میں

میر ہم جبہہ خراشوں سے کسو کا ذکر کیا
وے ہنر ہم میں ہیں جو تھے تیشۂ فرہاد میں

درویشوں سے تو ان نے ضدیں نکالیاں ہیں
ایدھر سے ہیں دعائیں ادھر سے گالیاں ہیں

جبہے سے سینہ تک ہیں کیا کیا خراش ناخن
گویا کہ ہم نے منھ پر تلواریں کھالیاں ہیں

جب لگ گئے جھمکنے رخسار یار دونوں
تب مہر و مہ نے اپنی آنکھیں چھپالیاں ہیں

صبح چمن کا جلوہ ہندی بتوں میں دیکھا
صندل بھری جبیں ہے ہونٹھوں کی لالیاں ہیں

درد و الم ہی میں سب جاتے ہیں روز و شب یاں
دن اشک ریزیاں ہیں شب زار نالیاں ہیں

خیروں نے ریختہ کو د[illegible]ں ریختہ بنایا
جوں ان دنوں میں پالے لڑکوں کی بالیاں ہیں

ا[illegible] سلھو[illegible] ٹھ رکھ لیا ہے آگے
مت جان ایسی بھیڑیں جی دینے والیاں ہیں

[illegible] لہکے ہے یوں ہوا ہیں
جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں

[illegible] تکھتے ہی مجھکو
پلکیں جھکالیاں ہیں آنکھیں چرالیاں ہیں

اُس آفتاب بن یاں اندھیر ہو رہا ہے
دن بھی سیاہ اپنے جوں راتیں کالیاں ہیں

چلتے ہیں یہ تو ٹھوکر لگتی ہے میرؔ دل کو
چالیں ہی دلبروں کی سب سے نرالیاں ہیں

رفتگاں میں جہاں کے ہم بھی ہیں
ساتھ اس کارواں کے ہم بھی ہیں

شمع ہی سر نہ دے گئی برباد
کشتہ اپنی زباں کے ہم بھی ہیں

ہم کو مجنوں کے عشق میں مت دیکھ
ننگ اس خانداں کے ہم بھی ہیں

جس چمن زار کا ہے تو گلِ تر
بلبل اُس گلستاں کے ہم بھی ہیں

نہیں مجنوں سے دل قوی لیکن
یار اُس ناتواں کے ہم بھی ہیں

بوسہ مت دے کسو کے در پہ نسیم
خاک اس آستاں کے ہم بھی ہیں

گوش اس در سے دور پھروں پھریں
پاس تو پاسباں کے ہم بھی ہیں

وجہ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

مر گئے مر گئے نہیں تو نہیں
خاک سے منہ کو ڈھانکے ہم بھی ہیں

اپنا شیوہ نہیں کجی یوں تو
یار جی ٹیڑھے بانکے ہم بھی ہیں

اس سرے کی ہے پارسائی میرؔ
معتقد اس جواں کے ہم بھی ہیں

نئی گردش ہے اُس کی ہر زماں میں
خلل سا ہے دماغِ آسماں میں

ہوا تن ضعف سے ایسا کہے تو
کہ اب جی ہی نہیں اس ناتواں میں

کہا میں دردِ دل یا آگ اُگلی
پھپھولے پڑ گئے میری زباں میں

متاعِ حُسن یوسف سی کہاں اب
تجسّس کرتے ہیں ہر کارواں میں

بلائے جاں ہے وہ لڑکا پری زاد
اسی کا شور ہے پیر و جواں میں

بہت ناآشنا تھے لوگ یاں کے
چلے ہم چار دن رہ کر جہاں میں

تری شورش بھی بیکل ہے مگر میرؔ
ملا دی پیس کر بجلی فغاں میں

تیغ کی نوبت کب پہونچے ہے اپنے جی کے غارت میں
عاشقِ زار کو مار رکھے ہے ایک ابرو کی اشارت میں

گزر لیے گر دل میں ہو کر تو ایک نگاہ ضروری ہے
کچھ کچھ تیرے غم نے لکھا ہے آگر واں کی عمارت میں

۱۸ فقرہ ... تا ... حشہ خرام ... جلتے ہیں ۱۲ میر

سوکھ گئے ہیں تو عشق کے غم میں خس کی مثال حقیر ہوا — وہ تقصیر نہیں کرتا ہے اب تک میری حقارت میں
ایک بگولا ساتھ مجھے بھی تربت قیس پہ سے لے آیا — کتنے غزال نظر واں آئے تھے مشغول زیارت میں
دل کو آگ اکدم میں دی اشک ہوئے نے چنگاری سے — کیا ہی شریر ہے شوخی برق ملائی اُن نے شرارت میں
شیخ جو تھا دیدارِ بتاں کا منکر ایسا تھا معذور — دل کو بصیرت بھی نہ اُسکے بے نوری تھی بصارت میں

خط و کتابت ایک طرف ہے دفتر لکھ لکھ بھیجے میر
کہیے کچھ جو صریرِ قلم کی کوتاہی ہو سفارت میں

تڑپھی پلکیں چبھتی نظر میں بھی ہیں — یہ کانٹے کھٹکتے جگر میں بھی ہیں
رہے پھرتے دریا میں گرداب سے — وطن میں بھی ہیں ہم سفر میں بھی ہیں
کہاں سے کہ مجنوں بھی ہم سا ہی تھا — غلط کے شوائب نظر میں بھی ہیں
نہ بھولو نزاکت لچک ہی نہیں — چھری خنجر اسکی کمر میں بھی ہیں
جھمک سطحِ رُخ کی سی اسکی کہاں — صفا و ضیا تو گہر میں بھی ہیں
دلی و دلی دونوں اگر ہیں خراب[1] — پہ کچھ لطف اس اجڑے گھر میں بھی ہیں

چلو میر کے تو تجسّس کے بعد
کہ وے وحشی تو اپنے گھر میں بھی ہیں

نہ کر شوق کشتوں سے جانے کی باتیں — نہیں آتیں کیا تجکو آنے کی باتیں
سماجت جو کی بوس لب پہ تو بولا — نہیں خوب یہ مار کھانے کی باتیں
زبانیں بدلتے ہیں ہر آن خوباں — یہ سب کچھ ہیں بگڑے زمانے کی باتیں
نظر جب کرو زیرِ لب کچھ کہے ہے — کہو یار کے آستانے کی باتیں
سہی جائے گالی اگر دوستی ہو — بُری بھی بھلی ہیں لگانے کی باتیں
ہمیں دیر و کعبے سے کیا گفتگو ہے — چلی جاتی ہیں یہ سنانے کی باتیں
بگڑ بھی چلے یار سے ہم تو یارو — کرو کچھ اب اس سے بنانے کی باتیں
کیا سیر کل ہیں نے دیوان مجنوں — خوش آئیں بہت اس دوانے کی باتیں

بہت ہرزہ گوئی کی یاں میر صاحب
کرو واں کے کچھ منہ دکھانے کی باتیں

[1] داغ سے لوگ کہتے ہیں بنا دلی اُجڑ کر لکھنؤ + پر کہاں اے داغ اس اُجڑے ہوئے گھر کا جواب

کیا کروں سودائی اُسکی زلف کی تدبیر میں
ظلِ ممدود چمن میں ہوں مگر زنجیر میں

گل تو مجھ حیران کی خاطر بہت کرتا ہے لیک
وا نہیں ہوتا یہ تنگ غنچۂ تصویر میں

روبرو اُسکے گئے خاموش ہو جاتا ہوں کچھ
کس سے اپنے چپکے رہنے کی کروں تقریر میں

تن بدن میں دل کی گرمی نے لگا رکھی ہے آگ
عشق کی تو ہے جوانی ہو گیا گو پیر میں

ہو اگر خونریز کا اپنے سبب تو کچھ کہو
وہ ستمگر ہے مقرر اور بے تقصیر میں

بیدماغی شورِ شب سے یار کو دونی ہوئی
دیکھی بس اس بے سرایت نالے کی تاثیر میں

کچھ نہیں پوچھا ہے مجھ سے جز حدیثِ روئے یار
ہاتھ بلبل کے لگا ہوں باغ میں جب میر میں

کہتے ہیں بہار آئی گل پھول نکلتے ہیں
ہم کنج قفس میں ہیں دل سینوں میں جلتے ہیں

اب ایک سی بیہوشی رہتی نہیں ہے ہمکو
کچھ دل بھی سنبھلتے ہیں پر دیر سنبھلتے ہیں

وہ تو نہیں اک چھینٹا رونے کا ہوا اگلے
اب دیدۂ تر اکثر دریا سے اُبلتے ہیں

ان پاؤں کو آنکھوں سے ہم ملتے رہے جیسا
افسوس سے ہاتھ انکو اب ویسا ہی ملتے ہیں

کیا کہیے کہ اعضا سب پانی ہوئے ہیں اپنے
ہم آتش ہجر انکی تو نہیں پڑے گلتے ہیں

کرتے ہیں صفت جب ہم لعل لب جاناں کی
تب کوئی ہمیں دیکھے کیا لعل اُگلتے ہیں

گل پھول سے بھی اپنے دل تو نہیں لگتے ٹک
جی لوگوں کے بے جاناں کس طور بہلتے ہیں

ہیں نرم صنم گو نہ کہنے کے تئیں ورنہ
پتھر ہیں اُنھوں کے دل کاہیکو پگھلتے ہیں

اے گرم سفر یاراں جو ہے سو سرِ رہ ہے
جو رہ سکو رہ جاؤ اب میر بھی چلتے ہیں

دل عجب جنس گراں قدر ہے بازار نہیں
دے بہا سہل جو دیتے ہیں خریدار نہیں

کچھ تمھیں ملنے سے بیزار ہو میرے ورنہ
دوستی ننگ نہیں عیب نہیں عار نہیں

ایک دو بات کبھو ہم سے کہو یا نہ کہو
قدر کیا اپنی ہمیں اس لیے تکرار نہیں

ناز و انداز و ادا عشوہ و اغماض و حیا
آب و گل میں ترے سب کچھ ہے ہی پیار نہیں

صورت آئینہ میں ٹک دیکھ تو کیا صورت ہے
بد زبانی تجھے اس منھ پہ سزاوار نہیں

دل کے اُلجھاؤ کو کیا تجھ سے کہوں اے ناصح
تو کسی زلف کے پھندے میں گرفتار نہیں

اُسکے کاکل کی پہیلی کہو تم بوجھے میر
کیا ہے زنجیر نہیں دام نہیں مار نہیں

چمکنا برق کا کرتا ہے کار تیغ ہجراں میں
برستا مینھ کا داخل ہے اُس بن تیر باراں میں

بھرے رہتے ہیں سارے پھول ہی جیسے گریباں میں
وہ کیا جانے کہ ٹکڑے ہیں جگر کے میرے داماں میں

کہیں شام و سحر رویا تھا مجنوں عشق لیلے میں
ہنوز آشوب دونوں وقت رہتا ہے بیاباں میں

خیال یار میں آگے ہے یک مہ پارہ یاں ہر دم
اگر ہجراں میں زندانی ہوں یہ ہوں یوسفستاں میں

رکھا عرصہ جنوں پر تنگ مشتاقوں کی دوری سے
کسے مارا ہے اُس کھتیے نے سنمکھ ہو کے میداں میں

جہاں سے دیکھیے اک شعر شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں

جو دیکھو تو نہیں یہ حال اپنا حُسن سے خالی
ونک الماس کی سی ہے ہماری چشم حیراں میں

خرابی آ گئی دیں میں گئی ملت اُسے دیکھے
ملے سے اُسکے رخنے پڑ گئے لوگوں کے ایماں میں

نکل آتا ہے گھر سے ہر گھڑی ننگے بدن باہر
بُرا یہ آپڑا ہے عیب اس آسائش جاں میں

ستم کے تیر اسکے میرے سینے میں بہت ٹوٹے
کیا جاتا ہے مشکل فرق اب دل اور پیکاں میں

ہوائے ابر میں کیا میر سنستا باغ میں وہ تھا
گری پڑتی ہے بجلی آج کچھ صحن گلستاں میں

تھا شوق مجھے طالب دیدار ہوا میں
سو آئینہ سا صورت دیوار ہوا میں

جب دور گیا قافلہ تب چشم ہوئی باز
کیا پوچھتے ہو دیر خبردار ہوا میں

اب پست و بلند ایک ہے جوں نقش قدم یاں
پامال ہوا خوب تو ہموار ہوا میں

کب ناز سے شمشیر ستم اُن نے نہ کھینچی
کب ذوق سے مرنے کو نہ تیار ہوا میں

بازار وفا میں سر سودا تھا سبھوں کو
پر ہیچ کے جی ایک خریدار ہوا میں

ہشیار تھے سب دام میں آئے نہ ہم آواز
تھی رفتگی سی مجکو گرفتار ہوا میں

کیا جیتنے کا فائدہ جو شیب میں چیتا
سونے کا سماں آیا تو بیدار ہوا میں

تم اپنی کہو عشق میں کیا پوچھو ہو میری
عزت گئی رسوائی ہوئی خوار ہوا میں

اُس نرگس مستانہ کو دیکھے ہوئے برسوں
افراط سے اندوہ کی بیمار ہوا میں

رہتا ہوں سدا مرنے کے نزدیک ہی اب میر
اس جان کے دشمن سے بھلا یار ہوا میں

جلا از بس تمھارے طور سے اے جان زیباں ہوں
بھروسہ کیا ہے میرا میں چراغ زیر داماں ہوں

سر حرف سخن کس کو خیال زلف میں اُس کے
تنک میں جو بکھر جاتا ہوں میں خاطر پریشاں ہوں

کہن سالی میں شاہد بازیاں کاہیکو زیبا تھیں / دیا لڑکوں کو دل میں نے قیامت میں بھی ناداں ہوں

کبھو خورشید و مہ کو دیکھ رہتا ہوں کبھو گل کو / مرے انداز سے ظاہر ہے میں اس رو کا حیراں ہوں

کسو کی یاد رو میں اشک آنکھوں سے نہیں تھمتے / برنگ ابر قبلہ آج میں شدت سے گریاں ہوں

بکا جبتک نہیں کرتا ہوں تب تک خیر ہے ورنہ / بلا ہوں فتنہ ہوں آشوب ہوں آفت ہوں طوفاں ہوں

بحال سگ پھر اک تک کروں یوں آسکے کوچہ میں / خجالت کھینچتا ہوں میر آخر میں بھی انساں ہوں

عشق وہ خان و ماں خراب ہی میاں / جس سے دل آگ چشم آب ہی میاں

تن میں جب تک ہی جاں تکلف ہے / ہم میں اُس میں ابھی حجاب ہی میاں

گو نہیں میں کسو شمار میں یاں / عاقبت ایک دن حساب ہی میاں

گو دماغ و جگر کہاں وہ قلب / یاں عجب ایک انقلاب ہی میاں

زلف بل کھا رہی ہی گو اُس کی / دل کو اپنے تو پیچ و تاب ہی میاں

لطف و مہر و وفا وہ کیا جانے / ناز ہی خشم ہے عتاب ہی میاں

لوہو اپنا پیوں ہوں جیتا ہوں / کسکو اس بن سر شراب ہی میاں

چشم وا یاں کہ چشم بسمل ہے / جاگنا یہ نہیں ہے خواب ہی میاں

منھ سے کچھ بولتا نہیں قاصد / شاید اودھر سے اب جواب ہی میاں

دل ہی اپنا نہیں فقط بے چین / جی کو بھی روز اضطراب ہی میاں

چاہیئے وہ کہے سو لکھ رکھیں / ہر سخن میر کا کتاب ہی میاں

گرفتہ دل ہوں سر ارتباط مجکو نہیں / کسو سے شہر میں کچھ اختلاط مجکو نہیں

جہاں ہو تیغ بکف کوئی سادہ جا لگنا / اب اپنی جان کا کچھ احتیاط مجکو نہیں

کرے گا کون قیامت کو ریسماں بازی / دل و دماغ گذر از صراط مجکو نہیں

جسے ہو مرگ سا پیش استحالہ کیوں نہ کڑھے / اس اپنے جینے سے کچھ انبساط مجکو نہیں

ہوا ہوں فرط اذیت سے میں تو سُن اے میر / تمیز رنج و خیال نشاط مجکو نہیں

جوش غم اُٹھنے سے اک آندھی چلی آتی ہی میاں / خاک سی مُنھ پہ مرے اسوقت اُڑ جاتی ہی میاں

پڑ گئے سوراخ دل کے غم میں سینے کوٹتے
سل تو پتھر کی نہیں آخر مری چھاتی ہے میاں

میں حیا والا ہوا رسوائے عالم عشق میں
آنکھ میری اس سبب لوگوں سے شرماتی ہے میاں

رشک اُسکے چہرۂ پر نور کا ہے جاں گداز
شمع مجلس میں کھڑی اپنے تئیں کھاتی ہے میاں

آگ غیرت سے قفس کو دوں ہوں جا پر واسے
ایک دو گلبرگ جب بادِ سحر لاتی ہے میاں

ہے حزیں نالیدن اس کا نغمۂ طنبور سا
خوش نوا مرغ گلستاں رند باغاتی ہے میاں

کیا کہوں منہ تک جگر آتا ہے جب رکتا ہے دل
جان میری تن میں کیسی کیسی گھبراتی ہے میاں

اسکی ابرو ہے کشیدہ خم ہی رہتی ہیں سدا
یہ کجی اس تیغ کی تو جوہر ذاتی ہے میاں

گات اُس اوباش کی لیں کیونکہ بر میں میر ہم
ایک جھرمٹ شال کا اک شال کی گاتی ہے میاں

چنگاریاں گرے ہیں جب پلکیں ہلتیاں ہیں
رونے سے تب تو میرے آنکھیں جلتیاں ہیں

آنکھیں ملا کے اُس سے ٹک دیکھ حال دل کا
وے انکھڑیاں جیوں کو اپنی تو ملتیاں ہیں

ہم تو بھی فصل گل میں چل ٹک تو پاس بیٹھیں
سر جوڑ جوڑ کیسے کلیاں نکلتیاں ہیں

ناز کو دخترِ رز کا کیا شیخ رہ گزر ہیں
اس سے ابھی ہماری باتیں ہی چلتیاں ہیں

آنکھیں تو میر کیا ہو بیطاقتی سے حالت
اب تو بدیر جائیں اپنی سنبھلتیاں ہیں

بہار آئی کھلے گل پھول شاید باغ صحرا میں
جھلک سی مارتی ہے کچھ سیاہی داغ صحرا میں

نفاقِ مرداں عاجز سے ہے زعم تکبر پر
کہوں کیا اتفاق ایسا بھی ہو جاتا ہے دنیا میں

نمود اری ہماری سب کلی سے ایک چشمک ہے
ٹھہرنا برق سا اپنا ہے ہو چکنا ہی اس جا میں

سخن دیں پانچ یاں ہیں جمع کس حسن لطافت سے
تفاوت ہے مرے مجموعۂ و عقدِ ثریا میں

کنواں دیکھا نہ کوئی غار میں نے شوق کے مارے
بعینہ راہ اندھا سا چلا اس کی تمنا میں

بہت تھا شور وحشت سر میں میرے شوق نے میرے
لکھی تصویر تو زنجیر پہلے کھینچ لی پا میں

جدائی کے تعب کھینچے نہیں میں میر راضی ہوں
جلا دیں آگ میں یا مجھ کو پھینکیں قعر دریا میں

شہروں ملکوں میں جو یہ میر کہاتا ہے میاں
دیدنی ہے پہ بہت کم نظر آتا ہے میاں

عالم آئینہ ہے جس کا وہ مصور بے مثل
ہائے کیا صورتیں پردے میں بناتا ہے میاں

قسمت اس بزم میں لائی کہ جہاں کا ساقی
دے ہے مے سب کو ہمیں زہر پلاتا ہے میاں

ہو کے عاشق ترے جان و دل و دیں کھو بیٹھے
جیسا کرتا ہے کوئی ویسا ہی پاتا ہے میاں

حسن اک چیز ہے ہو دین کہ تو ہو ناصح
ایسی شے سے کوئی بھی ہاتھ اٹھاتا ہے میاں

جھگڑا اس حادثے کا کوہ گراں سنگ کو بھی
جوں پرکاہ اُڑائے لیے جاتا ہے میاں

کیا پری خواں ہے جو راتوں کو جگا دے ہے میر
شام سے دل جگر و جان جلاتا ہے میاں

جائے ہے جی نجات کے غم میں
ایسی جنت گئی جہنم میں

نزع میں میری ایک دم ٹھہرو
دم ابھی ہیں یہ زار اک دم میں

مل ہم چھاتیوں پہ جڑ کے پھرے
ہیں خوں گشتہ دل کے ماتم میں

ہے بہت جیب چاک ہی جوں صبح
کیا کیا جائے فرصت کم میں

پر کے تھی بیکلی قفس میں بہت
دیکھیے اب کے گل کے موسم میں

آپ میں ہم نہیں تو کیا ہے عجب
دور اُس سے رہا ہے کیا ہم میں

بیخودی پر نہ میر کی جاؤ
تم نے دیکھا ہے اور عالم میں

جس کا خوباں خیال لیتے ہیں
دل کلیجہ نکال لیتے ہیں

کیا نظر گاہ ہے کہ شرم سے گل
سر گریباں میں ڈال لیتے ہیں

دیکھ اسے ہو ملک سے بھی لغزش
ہم تو دل کو سنبھال لیتے ہیں

کھول کر بال سادہ رو لڑکے
خلق کا کیوں وبال لیتے ہیں

تیغ کھینچے ہیں جب یہ خوش ظاہر
ماہ و خور منھ پہ ڈھال لیتے ہیں

دلبراں نقد دل کو عاشق کے
جان کر اپنا مال لیتے ہیں

ہیں گدا میر بھی ولے دو جہاں
کر کے ایک ہی سوال لیتے ہیں

دور اس سے جی چکے ہیں ہم اس روزگار میں
دن آج کا بھی سانجھ ہوا انتظار میں

داغوں سے بھر گیا ہے مرا سینۂ فگار
گل پھول زور زور کھلے اس بہار میں

کیا اعتبار طائر دل کی تڑپ کا اب
ذبوحی سے ہے کچھ حرکت اس شکار میں

بوسہ لبوں کا مانگتے ہی تم بگڑ گئے
بہتیری باتیں ہوتی ہیں اخلاص پیار میں

دل پھیرے ہم سے خانۂ زنجیر کے قریب
ٹک پہونچتا ہی ہے شکن زلف یار میں

اس بحر حسن پاس نہ خنجر تھا کل نہ تیغ
ہیں جان دی ہے حسرت بوس و کنار میں

چلتا ہے[لہ] ٹک تو دیکھ کے چل پاؤں سے نفس
آنکھیں ہی بجھ گئی ہیں تری رہگزار میں

کس کس ادا سے ریختے میں نے کہے ولیک
سمجھا نہ کوئی میری زبان اس دیار میں

تڑپے ہے متصل وہ کہاں ایسے روز و شب
ہے فرق میر برق و دل بیقرار میں

کیسی وفا و الفت کھاتے عبث ہو قسمیں
مدت ہوئی اٹھا دیں تم نے یہ ساری رسمیں

ساون تو ابکی ایسا برسا نہیں جو کہیے
روتا رہا ہوں میں ہی دن رات اس برس میں

گھبرا کے یوں لگے ہے سینے میں دل تڑپنے
جیسے اسیر تازہ بیتاب ہو قفس میں

جانکاہ ایسے نالے لوہے سے تو نہ ہووین
بیتاب دل کسو کا رکھا ہے کیا جرس میں

اب لاغری سے دیں ہیں ساری رگیں دکھائی
پر عشق بھر رہا ہے ایک ایک میری نس میں

اے ابر ہم بھی برسوں روتے پھرا کیے ہیں
دریا بندھے پڑے ہیں وادی کے خار و خس میں

کیا میر بس کرے ہے اب زاری آہ شب کی
دل آگیا ہے اس کا ظالم کسو کے بس میں

روتے ہیں نالہ کش ہیں یا رات دن جلے ہیں
ہجراں میں اس کی ہم کو بہتیرے مشغلے ہیں

جوں دود عمر گزری سب پیچ و تاب ہی میں
اتنا ستا نہ ظالم ہم بھی جلے بلے ہیں

مرنا ہے خاک ہونا ہو خاک اڑتے پھرنا
اس راہ میں ابھی تو درپیش مرحلے ہیں

کس دن چمن میں یارب ہوگی صبا گل افشاں
کتنے شکستہ پر ہم دیوار کے تلے ہیں

جب یاد آگئے ہیں پائے حنائی اس کے
افسوس سے تب اپنے ہم ہاتھ ہی ملے ہیں

تھا جو مزاج اپنا سو تو کہاں رہا ہے
یہ نسبت اگلی تو بھی ہم ان دنوں بھلے ہیں

کچھ وہ جو کھنچ رہا ہے ہم کانپتے ہیں ڈر سے
یاں جوں کمان گھر میں ہر وقت زلزلے ہیں

اک شور ہی رہا ہے دیوانے پن میں اپنے
زنجیر سے ہلے ہیں گر کچھ بھی ہم ہلے ہیں

پست و بلند دیکھیں کیا میر پیش آوے
اس دشت میں ہم اب تو سیلاب سے چلے ہیں

لہ لا اعلم ــه آہستہ خرام بلکہ مخرام ٭ زیر قدمت ہزار جان ست

شرر سے اشک ہیں اب چشم تر میں
لگی ہے آگ اک میرے جگر میں

نگین عاشق و معشوق کے رنگ
جُدا رہتے ہیں ہم وے ایک گھر میں

بلا ہنگامہ تھا کل اُسکے در پر
قیامت گم ہوئی اس شور و شر میں

بگولے کی روش وحشت زدہ ہم
رہے بے چادر و دامن اس سفر میں

سماں یاں سانجھ کا سا ہو نہ جاتا
اثر ہوتا اگر آہِ سحر میں

لچکنے ہی نے ہم کو مار رکھا
کٹاری تو نہ تھی اُس کی کمر میں

رہا تھا دیکھ اودھر میر چلتے
عجب اک نا اُمیدی تھی نظر میں

اثر ہوتا ہماری گر دعا میں
لگا اُٹھتی آگ سب ارض و سما میں

نہ اٹکا ہائے ٹک یوسف کا مالک
وگرنہ مصر سب ملتا بہا میں

قصور اپنی ہی طول عمر کا تھا
نہ کی تقصیر اُن نے تو جفا میں

سخن مشتاق ہیں بندے کے سب لوگ
سر و دل کسکو ہے عشق خدا میں

کفن[1] کیا عشق میں میں نے ہی پہنا
کھنچے لوہو میں بہتیرے کے جا میں

پیام اُس گل کو اُسکے ہاتھ دیتے
سبک پائی نہ ہوتی گر صبا میں

جیو خوش یا کوئی ناخوش ہمیں کیا
ہم اپنے محو ہیں ذوقِ فنا میں

ہمیں فرہاد و مجنوں جس سے چاہو
تم آکر پوچھ لو شہرِ وفا میں

سراپا ہی ادا و ناز ہے یار
قیامت آتی ہے اُسکی ادا میں

بلا زلف سیاہ اُسکی ہے پرپیچ
وطن دل میں کیا ہے کس بلا میں

ضعیف و زار تنگی سے ہیں ہر چند
ولیکن میر اُڑتے ہیں ہوا میں

بچیں جب عاشق اگر دست پائیں
چھکنے لگا خوں تو جائے سرِ شک

خدا نہ دے انکو جو سر کھجائیں
ابھی دیکھیں آنکھیں ہمیں کیا دکھائیں

[1] یہ شعر اسی بحر اور اسی ردیف و قافیہ کی غزل میں دیوان دوم میں اس طرح دیکھا گیا ہے ؎ کفن میں بھی نہ پہنا وہ بدن دیکھ ✽ کھنچے لوہو میں بہتیروں کے جا میں + اسی طرح مطلع کا پہلا مصرع اُس غزل میں دوسرا مصرع ہے اور شعر اسطرح ہے ؎ اُٹھاتے ہاتھ کیوں نومید ہو کر + اگر پاتے اثر کچھ ہم دعا میں + ۱۲

رہیں کس کو سانسیں کہ اب ضعف سے
مزاجی ہی کرنے لگا سائیں سائیں
خدا ساز تھا آذرِ بت تراش
ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں
جلا یار کی اور جاتا ہے جی
جو ہو اختیاری تو اودھر نہ جائیں
جگر سوز ہیں اس کے لعلِ خموش
طلب کریے بوسہ تو باتیں بنائیں
ہمیں بے نیازی نے بٹھلا دیا
کہاں اتنی طاقت کہ منت اٹھائیں
کہیں دیکھیے وہ بید مجنوں کہ ہم
فراموش کار اپنے کو تا دکھائیں

کہیں **میر** عشق مجازی ہے بد
حقیقت ہو معلوم گر دل لگائیں

ابکی ماہ رمضاں دیکھا تھا پیمانے میں
بارے سب روزے تو گزرے مجھے میخانے میں
جیسے بجلی کے چمکنے سے کسو کی سدھ جائے
بیخودی آئی اچانک ترے آجانے میں
وہ تو بالیں تئیں آیا تھا ہمارے لیکن
سدھ بھی کچھ ہم کو نہ تھی جانے کے گھبرانے میں
آج سنتے ہیں کہ فردا وہ قد آرا ہوگا
دیر کچھ اتنی قیامت کے نہیں آنے میں

حق جو چاہے تو بندھی مٹھی چلا جاؤں گا
مصلحت دیکھی نہ میں ہاتھ کے پھیلانے میں

میں نالہ کش تھا صبح کو یادِ حبیب میں
سوراخ پڑ گئے جگرِ عندلیب میں
سر مارتے ہیں سنگ سے فرہاد کے سے تنگ
دیکھیں تو ہم بھی کیا ہے ہمارے نصیب میں
جانے کو سوئے دوست مسافر ہوئے ہیں ہم
ڈر ہر قدم ہے عشق کی راہِ غریب میں
کیا رفتگاں کے ہاتھ سے ہو کتنے اُنکے پائیں
اکثر جنھوں کا ہاتھ ہو دستِ طبیب میں

دل خستہ چشم بستہ و روز رد و سیہ گرد
حیرت ہے ہم کو میر کے حالِ عجیب میں

افیوں ہی کے تو دل شدہ ہم رو سیاہ ہیں
ہو تخت کچھ دماغ تو پھر بادشاہ ہیں
یاں جیسے شمعِ بزم اقامت نہ کر خیال
ہم دل کباب پردے میں سرگرمِ راہ ہیں
کہنا نہ کچھ کبھو کھڑے حسرت سے دیکھنا
ہم کشتنی ہیں واقعی گر بے گناہ ہیں
گر مہرباں ہو دور سے گہ آنکھیں پھیر لیں
معشوق آفتاب ہیں عشاق ماہ ہیں
آنکھیں ہمارے پاؤں تلے کیوں نہ وہ ملیں
ہم بھی تو میر کشتۂ طرزِ نگاہ ہیں

مجھکو دماغ وصف گل و یاسمن نہیں / میں جوں نسیم باد فروش چمن نہیں

کہنے لگا کہ لب سے ترے لعل خوب ہے / اس تنگ ڈھنگ سے تو ہمارا سخن نہیں

پہونچا نہ ہوگا منزل مقصود کے تئیں / خاک رہ اسکا جس کا عبیر کفن نہیں

ہمکو خرام ناز سے مت خاک میں ملا / دل سے ہے جنکو راہ یہ انکا چلن نہیں

گل کام آوے ہے ترے منھ کے نثار کے / صحبت رکھے جو تجھ سے یہ اسکا دہن نہیں

کل جاکے ہمنے میر کے ہاں یہ سنا جواب
مدت ہوئی کہ یاں تو وہ غربت وطن نہیں

ہجر تا چند ہم اب وصل طلب کرتے ہیں / لگ گیا ڈھب تو اسی شوخ سے ڈھب کرتے ہیں

روز اک ظلم نیا کرتے ہیں یہ ولیکن اور / روز کہتے ہیں ستم ترک ہم اب کرتے ہیں

لاگ ہے جی کے تئیں اپنے اسی یار سے ایک / اور سب یاروں کا ہم لوگ تو سب کرتے ہیں

تم کبھو میر کو چاہو سو کہ چاہیں ہیں تمھیں / اور ہم لوگ تو سب اُن کا ادب کرتے ہیں

ہوں جو بیحال اس اعجوبۂ عالم کے لیے / حال سُن سُن کے مرا لوگ عجب کرتے ہیں

میر سے بحث یہ تھی کچھ جو نہ تھے حرف شناس
اب سخن کرتے ہیں کوئی تو غضب کرتے ہیں

مدت ہوئی کہ کوئی نہ آیا اُدھر سے یاں / جاتی رہے گی جان سی رہ گذر سے یاں

وہ آپ چلکے آوے تو شاید کہ جی رہے / ہوتی نہیں تسلی دل اب خبر سے یاں

پوچھے کوئی تو سینہ خراشی دکھائیے / سو تو نہیں ہے حرف شکایت ہنر سے یاں

آگے تو اشک پانی سے آجاتے تھے کبھو / اب آگ ہی نکلنے لگی ہے جگر سے یاں

ٹپکا کریں ہیں پلکوں سے بیفاصلہ سرشک / برسات کی ہوا ہے سدا چشم تر سے یاں

اے بُت گرسنہ چشم ہیں مردم نہ انسے مل / دیکھیں ہیں ہمنے پھوٹتے پتھر نظر سے یاں

راہ روش کا ہووے ٹھکانا تو کچھ کہیں
کیا جانے میر آگئے تھے کل کدھر سے یاں

مصرع کوئی کوئی کبھو موزوں کروں ہوں میں / کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

بات اپنے ڈھب کی کوئی کرے وہ تو کچھ کہوں / بیٹھا خموش سامنے ہوں ہوں کروں ہوں میں

اس بن نظر زمین سے سبی دنی ہے تو... کہے / کاہیکو چشم جانب گردوں کروں ہوں میں

سلہ بعض قدیم قلمی دیوانوں (۱۳۰/۴۰) میں یہ شعر نہیں ہے ۱۲

اُٹھتا ہے بیدماغ ہی ہر چند رات کو
افسانہ کہتے سیکڑوں افسوں کروں ہوں میں

کب بیدماغی شہر سے دیتی ہے اُٹھنے میر
یوں تو خیال وادیٔ مجنوں کروں ہوں میں

تاچند وہ ستم کرے ہم درگزر کریں
اب جی میں ہے کہ شہر سے اُسکے سفر کریں

بے رو سے ایسی بات سُنے کرنیکا لطف کیا
وہ منھ کو پھیر پھیر لے ہم حرف سر کریں

کبتک ہم انتظار رہیں ہر لحظہ بیقرار
گھر سے نکل نکل کے گلی میں نظر کریں

فرہاد و قیس کوہکن و دشت گرد تھے
منھ نوچیں چھاتی کوٹیں یہی ہم ہنر کریں

سختیٔ مسلم اُس سے جدا رہتے ہیں ولے
سر سنگ سے نہ ماریں تو کیونکر بسر کریں

وہ تو نہیں کہ دیکھیں اُس آئینہ رو کو صبح
ہم کس اُمید پر شبِ غم کو سحر کریں

لاویں کہاں سے خون دل اتنا کہ میر ہم
جس وقت بات کرنے لگیں چشم تر کریں

تکیے میں اپنے دل کا ہم غم کیا کریں ہیں
درویش کتنے ماتم باہم کیا کریں ہیں

جب نام دل کا کوئی لے بیٹھتا ہے ناگہ
منھ دیکھ ہمدگر کا ماتم کیا کریں ہیں

مستوں کی بات کیا ہے جو کوئی اسپہ جاوے
ہم گفتگو نشے میں درہم کیا کریں ہیں

حکم فسانہ سازی پیدا کریں ہیں شب کو
افسوں ہم اُسکے اوپر جو دم کیا کریں ہیں

کچھ حال میر جی کے آتے نہیں سمجھ میں
ہم بھی سلوک اُن سے اب کم کیا کریں ہیں

ردیف واو

قتل کیے پر غصہ کیا ہے لاش مری اُٹھوانے دو
جان سے ہم بھی جاتے رہے ہیں تم بھی آؤ جانے دو

جان سلامت لیکر جاوے کعبہ میں تو سلام کریں
ایک جراحت ان ہاتھوں کا صید حرم کو کھانے دو

اُسکی گلی کی خاک سبھوں کے دامن دل کو کھینچے ہے
ایک اگر جی لے بھی گیا تو آتے ہیں مر جانے دو

کرتے ہو تم نیچی نظریں یہ بھی کوئی مروت ہے
برسوں سے پھرتے ہیں جدا ہم آنکھ سے آنکھ ملانے دو

کیا کیا اپنے لوہو پئیں گے دم میں مرینگے دم میں جئیں گے
دل جو بغل میں رہ نہیں سکتا اسکو کسو سے لگانے دو

ابکی بہت ہی شور بہاراں ہم کو مت زنجیر کرو
دل کی ہوس کچھ ہم بھی نکالیں دھومیں ہم کو مچانے دو

عرصہ کتنا سارے جہاں کا وحشت پر جو آجاویں
پاؤں تو ہم پھیلاویں گے پر فرصت ہم کو پانے دو

کیا جاتا ہے اس میں ہمارا چپکے ہم تو بیٹھے ہیں
دل جو سمجھتا تھا سو سمجھا ناصح کو سمجھانے دو

ضعف بہت ہے میر تمہیں کچھ اس کی گلی میں مت جاؤ
صبر کرو کچھ اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو

بات بنانا مشکل سا ہے شعر سبھی یاں کہتے ہیں
فکر بلند سے یاروں کو ایک ایسی غزل کہہ لانے دو

گردش میں وے مست آنکھیں ہیں جیسے بھرے پیمانے دو
دانت سنا ہے جھمکیں ہیں اس کے موتی کے سے دانے دو

خوب نہیں اے شمع کی غیرت ساتھ رہیں بیگانے دو
کب فرمان پہ تیرے ہوئے یہ بازو کے پر وا نے دو

ایسے بہانہ طلب سے ہم بھی روزگزاری کرتے ہیں
کب وعدہ کی شب آئی جو اُن نے کیے نہ بہانے دو

تیر ستم اُس دشمن جاں کا تا دو گماں پر ہو نہ کہیں
دل سے اور جگر سے اپنے ہمیں ٹھہریں ہیں نشانے دو

کسکو دماغ رہا ہے یاں اب ضدیں اسکی اُٹھانے کا
چار پہر جب منت کریے تب وہ باتیں مانے دو

غم کھاویں یا غصہ کھاویں یوں اوقات گزرتی ہے
قسمت میں کیا خستہ دلوں کے یہی لکھے تھے کھانے دو

خال سیاہ خط سیاہ ایمان و دل کے رہزن تھے
ایک مدت میں ہم نے بارے چہرے پہ پہچانے دو

عشق کی صنعت مت پوچھو جوں نیچے بھوؤں کے چشم تباں
دیکھیں جہاں محرابیں ان نے طرح کیے بتخانے دو

رونے سے تو کچھ دیں آنکھیں دل کو غموں نے خراب کیا
دیکھنے قابل اسکے ہوئے ہیں اب تو یہ ویرانے دو

دشت و کوہ میں میر پھرو تم لیکن ایک ادب کے ساتھ
کوہکن و مجنوں بھی تھے اس ناحیے میں دیوانے دو

دوست رکھتا ہوں بہت اپنے دل بیمار کو
خوں کیا ہے مدتوں اس میں غم بسیار کو

جز عزیز از جاں نہیں یوسف کو لکھتا یہ کبھو
کیا غرور میرزائی ہے ہمارے یار کو

جب کبھو ادھر سے نکلے ہے تو اک حسرت کے ساتھ
دیکھے ہے خورشید اسکے سایۂ دیوار کو

بوجھ تو اچھا تھا پر آخر گرو رکھتے ہوئے
وجہ جام مے نہ پایا خرقہ و دستار کو

خونچکاں شکوے ہیں دل سے تا زباں میری ہے
سی لیا ہے تو کہے میں نے لب اظہار کو

تصفیے سے دل میں میر سے منہ نظر آتا ہے لیک
کیا کروں آئینہ ساں میں حسرت دیدار کو

عاشقی وہ روگ ہے سمجھیں کہ ہو جاتی ہے یاس
اچھے ہوتے کم سنا ہے میر اس آزار کو

تم بن چمن کے گل نہیں چڑھتے نظر کبھو
یہ کیا روش ہے آؤ تم تو قدم کا ہے کو

دریا سی آنکھیں بہتی ہی رہتی تھیں سو کہاں
ہوتی ہے کوئی کوئی پلک سست

بی سے قسم کا ہے کو

جی جانے ہے جو اپنے پہ ہوتی ہے بار بار
جاتے ہیں اُس گلی میں کہاں ہم مگر کبھو

آنکھیں سفید ہو چلی ہیں راہ دیکھتے
یارب اُنھوں کا ہوگا ادھر بھی گزر کبھو

مدّت ہوئی ہے نامہ کبوتر کو لے گئے
آجاتی ہے کچھ اُڑتی سی ہم تک خبر کبھو

ہم جستجو میں اُنکی کیے دست و پا بھی گم
افسوس ہے کہ آئے نہ وہ راہ پر کبھو

غم کو تمھارے دل کے نہایت نہیں ہے میر
اس قصّے کو کروگے بھی تم مختصر کبھو

یہ سرا سونے کی جاگہ نہیں بیدار رہو
ہم نے کر دی ہے خبر تم کو خبردار رہو

آپ تو ایسے بنے اب کہ جلے جی سب کا
ہم کو کہتے ہیں کہ تم جی کے تئیں مار رہو

لاگ اگر دل کو نہیں لطف نہیں جینے کا
اُلجھے سلجھے کسو کاکل کے گرفتار رہو

گرچہ وہ گوہرِ تر ہاتھ نہیں لگتا لیک
دم میں دم جب تئیں ہے اسکے طلبگار رہو

سارے بازارِ جہاں کا ہے یہی مول لے میر
جان کو بیچ کے بھی دل کے خریدار رہو

کرنا شعار خوب ہے عجز و نیاز کو
بے وقر جانتے ہیں دل بے گداز کو

ہجراں کی سرگزشت مری گفتنی نہیں
کیا کہیے تم سے قصّۂ دور و دراز کو

جوں شمع سر کٹے ہے بیاں حال کا کیے
لانا زباں پہ خوب نہیں دل کے راز کو

حیران ہو رہوگے جو ہم ہو چکے کبھی
دیکھا نہیں ہے مرتے کسو عشقباز کو

جانکاہ و دلخراش ہیں سارے ترے سلوک
دل ہمتو دیتے کاش کسی دلنواز کو

صوفی کی پارسائی کی ہے خانقہ میں دھوم
لے چلیے گا کبھو اُدھر اُس مستِ ناز کو

ہے دور ادب سے تم کھڑے ہیں پاکشیدہ ہوں
مت آئیو جنازے کی میرے نماز کو

اس ... جان سلامت
اسکی گلی کی خاک سمجھوں ٹ لوا دیے انداز تو دیکھو
پامال ہے سب خلقِ جہاں ناز تو دیکھو

کرتے ہو تم نیچی نظریں یہ بھی کوئی تمھیں بے خبری سے
ٹک ہوش کی آنکھوں کو کرو باز تو دیکھو

کیا کیا اپنے تو ہوئیں گے دم میں جب تئیں صحبت تو نہیں ہے
یہ ڈول جو ہوتا ہے خدا ساز تو دیکھو

ابھی بہت ہی شورِ بہاراں ہم کو نہیں دیتی ہے بلبل
اس مرغ کی بیتابی آواز تو دیکھو

عرصہ کتنا سارے جہاں کا وحشت ... پرے عرش کے پایا
اس طائرِ بے بال کی پرواز تو دیکھو

اُسکی زلف و خط و خال نے ایک اور قیامت — تصویر سے چہرے پہ یہ پرواز تو دیکھو

سب میر کو دیتے ہیں جگہ آنکھوں پہ اپنی
اس خاک رہِ عشق کا اعزاز تو دیکھو

آرسی اُس کے سامنے دھر لو — کب ہے ویسی مواجہہ کر لو
اُس کی تیغ ستم بلند ہوئی — جی ہے مرنے کو تو چلو مر لو
درپئے خوں ہیں میرے خورد و کلاں — یہ وبال اپنے کوئی سر پر لو
کچھ طرح ہو کہ یہ طرح ہو حال — عمر کے دن کسی طرح بھر لو

کیا بلا خیز جا ہے کوچۂ عشق
تم بھی یاں میر ہو اک گھر لو

کھینچنا رنج و تعب کا دوستاں عادت کرو — تب کسی ناآشنائے مہر سے الفت کرو
روٹھ کر منتا نہیں وہ شوخ یوں کیوں نہ کوئی — عذر چاہو دیر تک مدت تلک منت کرو
کب تک اے صورتگراں حیراں پھرو بے روئے یار — نقش اُسکا کھینچ رکھنے کی کوئی صورت کرو
اُنس اگر ان نوخطانِ شہر سے منظور ہے (خاک) — اپنی پرچھائیں سے بھی جوں خامہ تم وحشت کرو
کچھ نہ پوچھو صحبتِ دیروزہ کی کم فرصتی — جوں ہی جا بیٹھے لگا کہنے انھیں رخصت کرو
عشق میں کیا دخل ہے نازک مزاجی کے تئیں — کوہکن کے طور سے جی توڑ کر محنت کرو

پہلے دیوانے ہوئے پھر میر آخر ہو گئے
ہم نہ کہتے تھے کہ صاحب عاشقی تم مت کرو

بہر فردوس ہو آدم کو الم کاہے کو[1] — وقف اولاد ہے وہ باغ تو غم کاہے کو
کہتے ہیں آویگا ادھر وہ قیامت رفتار — چلتے پھرتے رہینگے تب تئیں ہم کاہے کو
یہ بھی اک ڈھب ہے نہ ایذا نہ کسو کو راحت — رحم موقوف کیا ہے تو ستم کاہے کو
نرگس ان آنکھوں کو جو لکھ گئے نابینا تھے — اپنے نزدیک ہیں وے دست قلم کاہے کو
اُسکی تلوار سے گر جان کو رکھتے نہ عزیز — مرتے اس خواری سے تو صید حرم کاہے کو
چشم پوشی کا مری جان تمھیں لپکا ہے — کھاتے ہو دیدہ در آئی سے قسم کاہے کو
میری آنکھوں پہ رکھو پائوں تو آؤ لیکن — رکھتے ہو ایسی جگہ تم تو قدم کاہے کو

[1] غالب ۔ ساقی بیار بادہ کہ از دودۂ جمم ۔ زاں پس رسد بہشت کہ میراث آدم ست

دلکو کہتے ہیں کہ اس گنج رواں کا گھر ہے
اس خرابے میں کہ رہے ہے وہ کرم کا ہے کو

شور نے نام خدا ان کی بلا سر کھینچا
میر سا ہے کوئی عالم میں علم کا ہے کو

غریب شہر خوباں ہوں مرا کچھ حال مت پوچھو
ہوا جی زلف و کاکل کے لیے جنجال مت پوچھو

دل صد پارہ کو پیوند کرتا ہوں جدائی میں
کرے ہے کہنہ نسخہ وصل جوں وصال مت پوچھو

جگر جل کے ہوا ہے کوئلہ بیتاب تو بھی ہوں
طپش سے دل کی میرے سر پہ ہے جو حال مت پوچھو

تعجب ہے کہ دل اس گنج سرگشتہ میں رہتا ہے
خرابے جس سے یہ پاتے ہیں مالامال مت پوچھو

لگا جی اسکی زلفوں سے بہت ہم میر پچھتائے
ہوا ہے مدعی ایک ایک اپنا بال مت پوچھو

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

عشق پیچے کی طرح حسن گرفتاری ہے
لطف کیا سرو کے مانند اگر آزاد رہو

ہمکو دیوانگی شہروں ہی میں خوش آتی ہے
دشت میں قیس رہو کوہ میں فرہاد رہو

وہ گراں خواب جو ہے ناز کا اپنے سو ہے
داد بیداد رہو شب کو کہ فریاد رہو

میر مل کے بہت خوش ہوئے تمسے پیارے
اس خرابے میں مری جان تم آباد رہو

زلفوں کو میں چھوا سو غصے ہوئے کھڑے ہو
یہ بات ایسی کیا ہے جس پر الجھ پڑے ہو

منھ پھیر پھیر لو ہو ہر بات میں ادھر سے
یاں کس ستم زدہ سے آزردہ ہو لڑے ہو

نرمی مخالفوں سے سختی موافقوں سے
واں موم سے بنے ہو یاں لوہے سے کڑے ہو

ملجاؤ مغبچوں سے تو داڑھی ہو تبرک
ہر چند شیخ صاحب تم بوڑھے یا بڑے ہو

ہوتے ہیں خاک رہ بھی لیکن نہ میر ایسے
رستے میں آدھے دھڑ تک مٹی میں تم گڑے ہو

زخموں پہ اپنے نون چھڑکتے رہا کرو
دل کو مزے سے بھی تو نمک آشنا کرو

کیا آنکھ بند کرکے مراقب ہوئے ہو تم
جاتے ہیں کیسے کیسے سمیں چشم وا کرو

موقوف ہرزہ گردی نہیں کچھ قلندری
زنجیر سر اتار کے زنجیر پا کرو

ہر چند اس متاع کی اب قدر کچھ نہیں
پر جس کسو کے ساتھ رہو تم وفا کرو

تدبیر کو مزاج محبت میں دخل کیا
جان کاہ اس مرض کی نہ کوئی دوا کرو

طفلی سے تم نے لطف و غضب مختلط کیے
ٹک میر کو جدا کرو غصہ جدا کرو

بیٹھے ہو میر ہو کے در کعبہ پر فقیر
اس روسیہ کے باب میں بھی کچھ دعا کرو

سر پہ عاشق کے نہ یہ روز سیہ لایا کرو
جی الجھتا ہے بہت مت بال سلجھایا کرو

تاب مہ کی تاب کب ہے نازکی سے یار کو
چاندنی میں آفتابی کا مگر سایا کرو

گرچہ شان کفر ارفع ہے ولے اے راہباں
ایک دو ہم سوں کو بھی زنار بندھوایا کرو

شوق سے دیدار کے بھی آنکھوں میں کھنچ آیا جی
اس سمیں میں دیکھنے ہمکو بہت آیا کرو

کوہکن کی ہے قدم گاہ آخر اے اہل وفاق
طوف کرنے بے ستوں کا بھی کبھی جایا کرو

فرق یار و غیر میں بھی اے بتاں کچھ چاہیے
اتنی ہٹ دھرمی بھی کیا انصاف فرمایا کرو

کب میسر اُس کے منھ کا دیکھنا آتا ہے میر
پھول گل سے اپنے دل کو تم بھی بہلایا کرو

کہتا ہے کون میر کہ بے اختیار رو
ایسا تو رو کہ رونے پہ تیرے ہنسی نہ ہو

پایا گیا وہ گوہر نایاب سہل کب
نکلا ہے اسکو ڈھونڈھنے تو پہلے جان کھو

کام اُسکے لب سے ہے مجھے بنت العنب سے کیا
ہے آب زندگی بھی تو لیجا کے مردہ شو

سنتے نہیں کہے جو نہ کہیے تو دم رکے
کچھ پوچھیے نہ قصہ ہمارا ہے گو مگو

مشعر ہے بے دماغی پہ مطلق نہ بولنا
ہم دیں تمھیں دعا ہمیں تم گالیاں تو دو

کرنا جگر ضرور ہے دلدادگاں کو بھی
وہ بولتا نہیں تو تم آپ ہی سے چھیڑ لو

اے غافلان شہر یہ کچھ راہ کی ہے بات
چلنے کو قافلے ہیں یہاں تم رہے ہو سو

گردش میں جو کوئی ہو رکھے اس سے کیا امید
دن رات آپ ہی چرخ میں ہے آسمان تو

جب دیکھتے ہیں پاؤں ہی دابو ہو اسکے میر
کیوں ہوتے ہو ذلیل تم اتنا تو مت دبو

رکھو مت سر چڑھائے دلبری کے گوندھے بالوں کو
کھلا نا کھیلنا مشکل بہت ہے ایسے کالوں کو

۱؎ میر تقی سے یہ میں میر ترک لے کر دنیا سے ہاتھ اٹھایا :: درویش تو بھی تو ہے حق میں مرے دعا کر
" " " اک وقت خاص حق میں مرے کچھ دعا کرو :: تم بھی تو میر صاحب و قبلہ فقیر ہو

اُڑایا غم نے اب کے سوکھے پتوں کی روش ہم کو
الٰہی سبز رکھیو باغ خوبی کے نہالوں کو

جہاں دیکھو کہا کرتے ہیں اُسکے عشق کے غم میں
نہ ہم وے جا نہ بیٹھے دل شکستے اپنے خالوں کو

نہ چشم کم سے مجھ درویش کی آوارگی دیکھو
تبرک کرتے ہیں کانٹے مرے پاؤں کے چھالوں کو

کرے ہے جیسے بلبل غش سو یاس جنس کی قیمت
نہیں افسوس آنکھیں بے حقیقت پھول والوں کو

دل عاشق کو رد کیا جانوں خوباں کیوں نہیں دیتے
بہت آئینہ سے تو ربط ہی صاحب جمالوں کو

یہی کچھ وہم سے ہی سہل کب آئے قیاسوں میں
تفکر اس کمر کا کھا گیا نازک خیالوں کو

نہ ایسی طرز دیدن ہو نہ ہرنوں کی یہ چتون ہے
کبھو جنگل میں لے چلیے گا ان شہری غزالوں کو

کوئی بھی اس طرح سے اپنے جی پر کھیل جاتا ہی
مگر بازیچہ سمجھے **میر** عشق خوردسالوں کو

رہتا ہے پیش دیدۂ تر آہ کا سبھاؤ
جیسے مصاحب ابر کی ہوتی ہے کوئی باؤ

برسے گی برف عرصۂ محشر میں دشت دشت
گر میری سرد آہوں کا واں ہو گیا جماؤ

حاصل کوئی اُمید ہوئی ہو تو میں کہوں
خوں ہی ہوا کیے ہیں مرے دل میں سارے چاؤ

آنکھوں کے آگے رونے سے میرے محیط ہو
ابروں سے جا کہے کوئی پانی پیو تو آؤ

رہتی تھی اشک خونی میں ڈوبی سب آستین
اس چشم بحر خوں کے کبھو دیکھے ہیں چڑھاؤ

اظہار درد اگرچہ بہت بے نمک ہے پر
ٹک بیٹھو تو دکھاویں تمھیں چھاتیوں کے گھاؤ

آ عاشقوں کی آنکھوں میں ٹک لے بدل رقیب
ان منظروں سے بھی ہے بہت دور تک دکھاؤ

صحبت جو اُس سے رہتی ہے کیا نقل کریے ہائے
جب آگئے ہیں ہم تو کہا اُن نے یاں سے جاؤ

صد چاک اپنے دل سے تو بگڑا ہی کی وہ زلف
افسوں کیا ہے شانے نے جو اس سے ہے بناؤ

اس ہی زمیں میں **میر** غزل اور ایک کہہ
گو خوش نہ آوے سامعوں کو بات کا بڑھاؤ

سب کھا گئی جگر تری پلکوں کی کاؤ کاؤ
ہم سینہ خستہ لوگوں سے بس آنکھ مت لگاؤ

آنکھوں کا جھڑ برسنے سے تھمتا کم نہیں
پل مارتے ہی پیش نظر ہاتھی کا ڈباؤ

کشتی چشم ڈوبی سی ہے بحر اشک میں
آئی نہ پار ہوتی نظر عاشقوں کی ناؤ

سینے کے اپنے زخم سے خاطر ہو جمع کیا
دل ہی کے اور جاتے ہیں سب لوہو کا بہاؤ

بیتابی دل اپنی خامہ نے کیا لکھی
کاغذ کو شکل مار سراسر ہے پیچ تاؤ

ہر چند جانیں جاتی ہیں پر تیغ جور سے
تم کو ہمارے سر کی سوں تم ہاتھ مت اٹھاؤ

سر نیچے ہو تو پانوں ترا دابیں ہم کبھی
دبتا وہی ہے جسکے تئیں کچھ بھی ہو دباؤ

چاک قفس سے آنکھیں لگیں کب تلک رہیں
اک برگ گل نسیم ہماری طرف بھی لاؤ

غیرت کا عشق کی ہے طریقہ ہی کچھ جدا
اسکی گلی کے خضر کو بھی راہ مت بتاؤ

ظاہر ہے دیکھنے سے کہ گنہ کیونکہ تیرے سب
چھپتے ہیں میر کوئی دلوں کے کہیں لگاؤ

گر قصد ترک سر ہے کہو شرم مت کرو
کہتے ہیں اپنی ٹوپی سے بھی مشورت کرو

اچھی ہے اسکی تیغ تو باندھو گلے سے میر
مرتا ہوں میں تو آگے مرے مت صفت کرو

دل کہے بس ہوں تو کاہے کو کوئی بیتاب ہو
آنکھ کا لگنا نہ ہو تو اشک کیوں خوناب ہو

وہ نہیں چھڑکاؤ سا میں اشک ریزی سے کروں
اب جو رونے بیٹھ جاؤں جھیل یا تالاب ہو

جلد کھینچے تیغ بیتابی کریں جو ہم تو پھر
مارنا مشکل ہمارا تم کو جوں سیماب ہو

شہر میں زیر درختاں کیا رہوں میں برگ بند
ہو نہ صحرا نے مری گنجائش اسباب ہو

بے تصرف عشق کے ہوتا ہے ایسا حال کب
دل ہمارا خون ہو سب چشم یکسر آب ہو

لطف سے اے ابر رحمت ایک دو بارش ادھر
کشت زرد ناامیداں بھی تو ٹک سیراب ہو

بخت خفتہ سو دیں پر ٹک چونکتے سوویں کہ میر
ایک شب ہم دل زدوں سے وہ پری ہمخواب ہو

آج ہمارا جی بیکل ہے تم بھی غفلت مت کر لو
دل نہ رہے جو ہاتھ رکھے تو سماجت ات گت مت کر لو

ڈھیری رہے اک خاک کی تو کیا ایسے خاک آبر کی
مجھکو زمیں میں گاڑو گے تو نشان تربت مت کر لو

ایسی جان کہاں ہے ہم میں رنج نہ دینا ہاتھوں کو
ایک ہی وار میں ہو چکیے گا دوسری ضربت مت کر لو

ہمکو تو مارا عشق نے آخر پر یہ وصیت یارو ہے
زیر جہاں میں تم جو رہو تو کسو سے الفت مت کر لو

میری طرف کی یارو اس سے بات کوئی کہتے ہو کہو
مانے نہ مانے وہ جانے پھر تم بھی منت مت کر لو

کہیے سو کیا اب چپکے دیکھو گو میں اس میں مر جاؤں
تمکو قسم ہے حرف و سخن کی مجھ سے مروت مت کر لو

ہوش نہیں اپنا تو ہمیں ٹک میر آئے ہیں پرسش کو
جانے سے آگے اُن کو ہمارے پیارے رخصت مت کر لو

ردیف ہائے ہوز

میں کیا کہوں جگر میں لہو میرے کم ہے کچھ / کچھ تو الم ہے دل کی جگہ اور غم ہے کچھ

پوشیدہ تو نہیں ہے کہ ہم ناتواں نہیں / کڑھنوں میں یوں ہی ہمکو ہمارا بھرم ہے کچھ

کیا اپنے دل دھڑکنے سے ہو نہیں ہی دم بخود / جو دیکھتا ہے میرے تئیں سو وہم ہے کچھ

جب سے کھلی ہے نرگس مست اُسکی ظلم ہے / کیا آج کل سے یار کو میل ستم ہے کچھ

بلبل ہیں گل ہیں کیا خفگی آگئی ہے میر / آمد شد نسیم سحر دمبدم ہے کچھ

کہتے تو ہیں کہ ہم کو اُس کی طلب نہیں کچھ / پر جی اسکو اپنا ڈھونڈھے ہے ڈھب نہیں کچھ

اخلاص و ربط اُس سے ہوتا تو شور اُٹھاتے / لب تشنہ اپنے تب ہیں دلبر سے جب نہیں کچھ

یاں اعتبار کیجیے جو کچھ وہی ہے ظاہر / یہ کائنات اپنی آنکھوں میں سب نہیں کچھ

رکھ منہ کو گل کے منہ پر کیا غنچہ ہو کے سوئے / ہے شوخ تبسم شبنم اس کو ادب نہیں کچھ

دل خوں نہ ہووے کیونکر یکسر ورائے اُلفت / یا سابقے بہت تھے یا اُس سے اب نہیں کچھ

یہ حال بے سبب تو ہوتا نہیں ہے لیکن / رونے کا لمحہ لمحہ ظاہر سبب نہیں کچھ

گر عشق میر اسکا مارے کہیں نہ جاویں / جلدی مزاج میں ہے اس سے عجب نہیں کچھ

رستے سے چاک دل کے ہو آگاہ / یار تنک پھر تو کسقدر ہے راہ

رہتی ہے خلق آہ شب سے تنگ / وے نہیں سنتے میری بات اللہ

آنکھ اُس منہ پہ کس طرح کھولوں / جوں پلک جل رہی ہے میری نگاہ

خط مرا دیکھ دیکھ کہنے لگا / ہائے کیا کیا لکھے ہے نامہ سیاہ

ہیں مسلمان اُن بتوں سے ہمیں / عشق ہے لا الٰہ الا اللہ

پلکیں اس طرح روتے روتے گئیں / سبزہ ہوتا ہے جسطرح لب چاہ

میر کعبے سے قصد دیر کیا / جاؤ پیارے بھلا خدا ہمراہ

ہے تمنائے وصال اُس کی مری جان کے ساتھ / جان ہی جائے گی آخر کو اس ارمان کے ساتھ

کیا فقط توڑ کے چھاتی ہی گیا تیر اُس کا / لے گیا صاف مرے دل کو بھی پیکان کے ساتھ

دین و دل ہی کے رہا پیرے وہ کافر در پے
خصمی قاطبہ اس کو ہے مسلمان کے ساتھ

بحر پر نہر پہ برسے ہے برابر ہی ابر
پیش ہر اک سے کریم آتے ہیں احسان کے ساتھ

سطر زلف آئی ہے اس روے مخطط پہ نظر
یہ عبارت نئی لاحق ہوئی قرآن کے ساتھ

تیر اُس کا جو گزر دل سے چلا جی بھی چلا
رسم تعظیم سے ہو لیتے ہیں مہمان کے ساتھ

میں تو لڑکا نہیں جو باسلے تباؤ مجھکو
یہ فریبندگی کریے کسو نادان کے ساتھ

خون مسلم کو تو واجب یہ بتاں جانے ہیں
ہو جے کافر کہ اماں یاں نہیں ایمان کے ساتھ

آدمیت سے تمھیں میر ہو کیونکر بہرہ
تمنے صحبت نہیں رکھی کسو انسان کے ساتھ

جانے دے مت اسقدر اب لف خط و خال دیکھ
حال کچھ بھی تجھ میں ہے لے میر اپنا حال دیکھ

کیا مرے طول پریشانی کی حیرت ہمنفس
آنکھیں تو دی ہیں خدا نے اُسکے لٹکے بال دیکھ

دامن صحرا میں کیا وسعت ہے جو دل میں نہیں
موند کر آنکھیں گریباں میں بھی ٹک سر ڈال دیکھ

چشم و دل کا اس سے لگ جانا تو تھا جس تس طرح
جی بھی ان باتوں میں اُلجھا اور یہ جنجال دیکھ

گرچہ اُس مہ کی جدائی میں مجھے برسوں ہوئے
لیکن اے اختر شناس اب کا ہے کیسا سال دیکھ

کب نظر میری پڑے گی اُسکے روے خوب پر
ہمنشیں ٹک تو بھی مصحف کھول کر تو فال دیکھ

ٹھوکریں دل کو لگی ہیں جب چلے ہے راہ تو
یہ خرام ناز ہے ظالم ٹک اپنی چال دیکھ

آنکھیں جو ہوں تو عین ہے مقصود ہر جگہ
بالذات ہے جہاں میں وہ موجود ہر جگہ

واقف ہو شان بندگی سے قید قبلہ کیا
سر ہر کہیں جھکا کہ ہے مسجود ہر جگہ

ہو تن پہ ہم نہ سوختہ جانوں کی ہے نمود
ہے سوزش دروں سے بروں دود ہر جگہ

ہیں دلّی لکھنؤ کے تو شل نام خوب لیک
راہ وفا و مہر ہے مسدود ہر جگہ

پھرتی ہے اپنے ساتھ لگی متصل قضا
آب رواں سے ہم ہوے نابود ہر جگہ

شہرہ رکھے ہے تیری خریت جہاں میں شیخ
مجلس ہو یا کہ دشت اچھل کود ہر جگہ

سودا سے عاشقی میں تو جی کا زیان ہے
پھرتے ہیں میر ڈھونڈتے ہی سود ہر جگہ

وے دن اب ملتے ہیں جنہیں پھرے یار کے ساتھ
لطف سے حرف و سخن تھے نگہ پیار کے ساتھ

رو بہ پس یار کے کوچہ سے جو خورشید گیا
عشق تھا اُس کے مگر سایۂ دیوار کے ساتھ

دستے نرگس کے رکھیں گور پہ میری دن رات
تا یہ جانیں کہ گیا میں غم دیدار کے ساتھ

واں کھنچی میان سے یاں سر کو جھکایا میں نے
گردن اپنی ہے بندھی یار کی تلوار کے ساتھ

عشق کے زار سے بولا نہ خشونت سے کرو
لطف سے بات کوئی کرتے ہیں بیمار کے ساتھ

تہمت عشق سے آبادی بھی وادی ہے ہمیں
کون صحبت رکھے ہے خوں کے سزاوار کے ساتھ

اب خوشامد انھیں کی آٹھ پہر کرتے ہیں
گفتگو میر کو جن لوگوں سے تھی عار کے ساتھ

نہ باتیں کرو سرگرانی کے ساتھ
مری زیست ہے مہربانی کے ساتھ

نہ اُٹھ کر در یار سے جا سکے
یہ کم لطف سے ہے ناتوانی کے ساتھ

فرو ورد آنسو پیے کچھ ہوا
دوا جیسے پیتے ہیں پانی کے ساتھ

کہے میں نے اشعار سرسبز ہیں
ولیکن قیامت روانی کے ساتھ

شتابی گئی اس روش فصل گل
کہ جوں رفتگی ہو جوانی کے ساتھ

بکھیرے ہے جوں لخت دل آہ صبح
ہوا کب ہے اس گل فشانی کے ساتھ

جلا جی بہت قصۂ میر سن
بلا سوز تھا اُس کہانی کے ساتھ

کب تک رہینگے یا رب ہر دم ہم آب دیدہ
ضایع ہے جیب و دامن جوں جنس آب دیدہ

اس جور سے شبوں کا ملنا گیا سو چپ ہوں
جاتا نہیں کہا کچھ جوں گنگ خواب دیدہ

راز محبت اپنا رسوا نہ اس قدر ہو
گھر ہو نہ اشک افشاں خانہ خراب دیدہ

جب دیکھو لگ رہا ہے در کی طرف اُسی کے
ہے جیسے کہیے ویسے ذلت کا باب دیدہ

دوزخ میں میر ہوں میں یا رب بہشت رو بن
جاں ہے ستم رسیدہ دل ہے عذاب دیدہ

ادھر مت کر نگاہ تیز جا بیٹھ
نہ تیر ردے ترکش یوں چلا بیٹھ

اثر ہوتا تو کب کا ہو بھی چکتا
دعاے صبح سے اب ہاتھ اُٹھا بیٹھ

پھرے گا ہم سے کب تک دور ظالم
کبھو تو گھر سے اُٹھ کر پاس آ بیٹھ

نہ کر دیوار کا مجلس میں تکیہ
ہمارے مونڈھے سے مونڈھا لگا بیٹھ

۵ مطابق اصل ۱۲۰

بہت پھرتے ہیں ٹیڑھے ٹیڑھے دشمن
انھیں دو سیدھیاں تو بھی سنا بیٹھ

تلاش اپنی نہ کم تھی جو وہ ملتا
بہت ہیں دیکھ کر آخر رہا بیٹھ

مخالف سے نہ مل بیٹھا کر اتنا
کہیں لے میرؔ صاحب کو جدا بیٹھ

کیا کریں نیچی نظر کرنے سے غصہ کھائے وہ
اور مجلس میں جو رہیے دیکھ تو شرمائے وہ

کسطرح تڑپے ہے کیا کیا جی گھٹا جاتا ہے ہائے
ساتھ اسکے دل لگا ہو جس کسو کا وائے وہ

کیا سلوک اُس بیوفا کے نقل کریے ہمنشیں
منتیں کریے تو یاں تک گھر سے چلکر آئے وہ

لطف سے لبریز ہے اُس کام جاں کا سب بدن
مختلط ہو جائے ہمسے جو کبھو تو ہائے وہ

بیخودی ہے جی چلا جاتا ہے یوں صاحب فراش
بیخبر اسے کاش بالیں پر مرے آجائے وہ

ہم نہیں ملتے وگرنہ یار ہے تا قتل ساتھ
تو ہوئی جاوے ہمارا ہم کو اب جو پائے وہ

میرؔ کو واشد نہیں ہے مقصد اُس کا اور ہے
عشق سے لڑکوں کے دلکو کبتلک بہلائے وہ

ردیف یائے تحتانی

تدبیر غم دل کی بستی میں نہ ٹھہرائی
جنگل میں نکل آئے کچھ واں بھی نہ بن آئی

خواہش ہو جسے دل کی دو دل اُسے سر کھجی
میں نے تو اسی دل سے تصدیع بہت پائی

بے پردہ نہ ہوتا تھا اسرار محبت کو
عاشق کشی ہے جب سے ہے عشق کی رسوائی

گھر دل کا بہت چھوٹا یہ جائے تعجب ہے
عالم کو تمام اس میں کس طرح ہے گنجائی

گھر بار لٹایا جب تب وہ نہی قد آیا
مفلوک ہوئے اب ہم کر خرچ یہ بالائی

خوبی سے ندان اُس کی سب صحتیں یاں بگڑیں
وہ زلف بنی دیکھی سب بن گئے سودائی

کیا عہدہ بر آئی ہو اُس گل کی دورنگی سے
ہر لحظہ ہے خودرائی ہر آن ہے رعنائی

عاشق کی جسے ہووے کچھ قدر نہیں پیدا
جیتا نہ رہا ابتک مجنوں ہی کو موت آئی

آزار بہت کھینچے اب میرؔ توکل ہے
کھینچی نہ گئی ہم سے ہر ایک کی مرزائی

شور کیا جو اُسکی گلی میں رات کو ہیں سب جان گئے
آہ و فغاں کے طور سے میرے لوگ مجھے پہچان گئے

عہد میں اُسکی یاری کے خوش دل میں تھے ہیں کیا کیا چاؤ
خاک میں آخر ساتھ ہی میرے سب میرے ارمان گئے

موت جو آئے سر پر انساں دست و پا گم کرتا ہے
مہلت عمر دو روزہ کتنی کر لیے فضولی کا ہے پر
ہاتھ لگا وہ گوہر مقصد جیسا ہے معلوم ہمیں
کہیئے سلوک اُنھوں کے کیا کیا چھیڑ تجاہل کی ہے نئی

دیکھتے ہی شمشیر بکف کچھ آج اُسے اوسان گئے
آئے جو ہیں دنیا میں ہم تو جیسے کہیں مہمان گئے
محو طلب وے اہل طلب سب خاک بھی یاں کی چھان گئے
نکلے تھے اس رستے سو وے جان کے بھی انجان گئے

میر نظر کی دل کی طرف کی عرش کی جانب فکر بہت
یعنی جو طلب مطلوب کی ہم کو کیدھر کیدھر دھیان گئے

سوز دروں سے آگ لگی ہے سارے بدن میں تب سی ہے
طاقت دل کی تمام ہوئی ہے جس کی چال کڈھب سی ہے
سینے کے زخم نمایاں رہتے چاک کئے سو پردۂ در
مدت سے یہ رخنے پڑے تھے چھاتی پھٹی میں اب سی ہے
پرسش حال کبھو کرتے ہیں ناز و چشم اشارت سے
اُن کی عنایت حال پہ میرے کیا پوچھو ہو غضب سی ہے
گود میں میرے رکھ دیتا ہے پاؤں حنائی دبنے کو
یوں پامال جو میں ہوتا ہوں مجھکو بھی تو دب سی ہے
لطف کہاں وہ بات کیے پر پھول سے جھڑنے لگجاویں
سرخ کلی بھی گل کی اگرچہ یار کے لعل لب سی ہے
خانہ خراب ہوں خواہش دل کا آہ نہایت اُس کو نہیں
جان لبوں پر آئی ہے پر تو بھی گرم طلب سی ہے

تم کہتے ہو بوسہ طلب تھے شاید شوخی کرتے ہوں
میر تو چپ تصویر سے تھے یہ بات اُنھوں سے عجب سی ہے

کیسے محسن ونو نہیں یا رب میں نے اُس سے محبت کی
دھوم رہی ہے سر پر میرے رنج و عتاب و کلفت کی
میں تو سرو و شاخ گل کی قطع ہی کا دیوانہ تھا
یار نے قد و قامت دکھلا کر سر پر میرے قیامت کی
قسمت میں جو کچھ کہ بدا ہو دیتے ہیں وہی انساں کو

غم و غصّہ ہی ہم کو ملا ہے خوبی اپنی قسمت کی
خلوت یار ہے عالم عالم ایک نہیں ہے ہم کو بار
در پر جاکر پھر آتے ہیں خوب ہماری عزّت کی
اک گردن سے سوحق باندھے کیا کیا کرتے ہوں جو ادا
مدت اس پر ایک نفس جوں صبح ہماری فرصت کی
شیوہ اُس کا مہر و غضب ہے ناز و خشم و ستم وے سب
کوئی نگاہ لطف اگر کی اُن نے ہم سے مروّت کی
بے پروائی درویشی کی تھوڑی تب آئی
جبکہ فقیری کے اوپر میں خرچ بڑی سی دولت کی
ناز و خشم کا رتبہ کیسا ہٹ کس اعلیٰ درجہ میں
بات ہماری ایک نہ مانی برسوں ہم نے منت کی
دکھن پورب پچھم سے لوگ آکر مجھ کو دیکھیں ہیں
حیف کہ پروا تم کو نہیں ہے مطلق میری صحبت کی
دوستی یاری الفت باہم عہد میں اس کے رسم نہیں
یہ جانے ہیں مہر و وفا اک بات ہے گویا مدّت کی

اب حسرت آنکھوں میں اُس کی نومیدانہ پھرتا تھا
میر نے شاید خواہش دل کی آج کوئی پھر رخصت کی

کیسے ناز و تبختر سے ہم اپنے یار کو دیکھا ہے
نو گل جیسے جلوہ کرے اس رشک بہار کو دیکھا ہے
چال زمانے کی ہے نظر میں شام و سحر کس کو ہے قیام
نو وارد ہم یاں کے نہیں پر لیل و نہار کو دیکھا ہے
ایک نہ آیا دید میں اپنے دلکش دلچسپ اُس کے رنگ
ان آنکھوں سے اس گلشن میں یوں تو ہزار کو دیکھا ہے
قدر کفر اسلام سے زاہد جانی سبحہ فروشی سے
بکتے کہیں بازار میں تو نے گہ زنّار کو دیکھا ہے

قلب و دماغ و جگر کے گئے پر ضعف ہے جی کے غارت میں
کیا جانے یہ قلقچی ان نے کس سردار کو دیکھا ہے

پاؤں سے بھی گر پتّا کھڑکے چوٹ چلے ہے ظالم کی
ہم نے دام گہوں میں اُس کے ذوق شکار کو دیکھا ہے

جمع کرو دل میر سے تم بھی بیتابی تھی دل کو بہت
اچھے کچھ آثار نہ تھے ہیں اُس بیمار کو دیکھا ہے

ناز و ادا کے ساتھ وہ دلبر شکیل ہے
تصویر چیں کی رو برو اسکے ذلیل ہے

ہم خاک مُنھ کو مل کے نہ جو آرسی پھرے
یاں پاس قطرہ آب اگر ہے سبیل ہے

جنگل میں خضر و کعبے کا ہونا مری طرح
دونوں کی نارسائی کے اوپر دلیل ہے

آگے جنوں سے چھانوں میں تھے سرو گل کی ہم
سر پہ ہمارے سایہ فگن اب کریل ہے

کچھ چیز و مال ہو تو خریدار ہو کوئی
دنیا کی قدر کیا کہ متاع قلیل ہے

کیا رووں اشک آتے ہیں آنکھوں سے سیل سیل
پل مارنے میں پیش نظر ایک جھیل ہے

آتے نہیں نظر ہیں مرے ہاتھی کے سوار
کانوں میں جو فسانۂ اصحاب فیل ہے

ہو صبر اس جو یوسف ثانی کے بے جمال
تو مصحف مجید میں صبر جمیل ہے

شکر و گلہ سے عشق کے لبریز ہے جہان
کریے جہاں نگاہ یہی قال و قیل ہے

ہم دیر سے ہیں منتظر قدکشی یار
کچھ شامت عمل سے قیامت میں ڈھیل ہے

جب و تکھتے ہیں میر تمھیں بدماغ ہو
کاہے کو ناز عشق میں صاحب دخیل ہے

برسوں گذرے ہیں ملے کب تئیں یوں پیار رہے
دور سے دیکھ لیا اسکو تو جی مار رہے

وہ مودت کہ جو قلبی ہوا سے سو معلوم
چار دن کہنے کو اس شوخ سے ہم یار رہے

مرگ کے حال جدائی میں جئیں یوں کبتک
جان بیتاب رہے دل کو اک آزار رہے

وجہ یہ تھی کہ ترے ساتھ لڑی آنکھ اسکی
ہم جو صورت سے تھے آئینے کی بیزار رہے

دین و دنیا کا زیاں کار کہو ہمکو میر
دو جہاں داؤ نخستیں ہی میں ہم ہار رہے

اب تک تو بھی اچھی اب دیکھیے پیری ہے
سب لوگوں میں ہیں لاگیں یاں محض فقیری ہے

کیا دھیر بندھے اُسکی جو عشق کا رسوا ہو
نکلے تو کہیں لڑکے دھیری ہے یلے دھیری ہے

خون عشق کی گرمی سے سوکھا جگر و دل میں
اک بوند تھی لوہو کی اب چھاتی جو چھیری ہے

ہم طائر بے پر ہیں وے جنکو بہاراں ہیں
گلگشت گلستاں کا ہے شوق اسیری ہے

اس دلبر بدظن سے خوش گزرے ہے عاشق کی
نے رحم ہے خاطر میں نے عذر پذیری ہے

ہم مرثیہ دل ہی کا اکثر کہا کرتے ہیں
اب کرئیے تخلص تو شایستہ ضمیری ہے

کیا اہل دول سے ہے اے میر تجھے نسبت
یاں عجز و فقیری ہے واں نازامیری ہے

سوز دروں نے آخر جی ہی کھپا دیا ہے
ٹھنڈا دل اب ہے ایسا جیسے بجھا دیا ہے

اب نیند کیونکہ آوے گرمی نے عاشقی کی
دل ہے جدھر وہ پہلو سارا جلا دیا ہے

حرف غلط تھے کیا ہم صفحے پہ زندگی کے
جو صاف یوں قضا نے ہم کو مٹا دیا ہے

کڑھتے ہمیشہ رہنا ہم کو بغیر اُسکے
کیا روگ دوستی نے جی کو لگا دیا ہے

اچرج ہے یہ کہ ہے وہ میرا چراغ تربت
کتنوں کا در تہ خوں کر اُن نے دبا دیا ہے

آنکھوں کی کچھ حیا تھی سو موندلیں ودھر سے
پردہ جو رہ گیا تھا وہ بھی اٹھا دیا ہے

ہم دل زدہ رہے ہیں انواع تلخ سنتے
اُن شکریں لبوں نے ہم کو رجھا دیا ہے

جب طول میں دیا ہے نامہ کو شوق کے تب
جوں کاغذ ہوائی اُن نے اُڑا دیا ہے

مرنے ہی کا مہیا اپنے رہا کیا ہوں
واں تیغ اُٹھائی اُن نے یاں سر جھکا دیا ہے

کیا بے نمک ہوا ہے پروانہ راکھ جل کر
رہ رہ گئے ہم جلے تو ہمکو مزا دیا ہے

تھے جوں چراغ مفلس مضطر نہ ترک تھا جب
یارے فقیری نے تو آرام سا دیا ہے

شہروں کے تنگ کوچے کاہیکو ہوں میں لینے
ہم وحشیوں کے قابل رہنے کو بادیا ہے

نادردمند بلبل نالاں ہے بے تہی سے
دل ہم کو بھی خدا نے دردآشنا دیا ہے

کیا نامہ بر ہمارا ہے صاف بے مروت
خط نانوشتہ ہمکو ودھر سے لا دیا ہے

عالم شکار ہے وہ اس سن میں میر اُسکو
ڈھب جانے مارنے کا کن نے بتا دیا ہے

ہم چمن میں گئے تھے وا نہ ہوئے
نکہت گل سے آشنا نہ ہوئے

سر کسو سے فرو نہیں آتا
حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

خوار و زار و ذلیل وے رہت
کیسا کیسا قفس سے سر مارا

عاشق اُسکے ہوئے سو کیا نہ ہوئے
موسم گل میں ہم رہا نہ ہوئے

میں[1] نہ گردن کٹائی جب تک میر
عشق کے مجھ سے حق ادا نہ ہوئے

دیکھیے کیا ہو سانجھ تلک احوال ہمارا ابتر ہے
خاطر اپنی اتنی پریشاں آنکھیں بھر بھر ہیں اس بن حیراں
تاب تواں کا حال وہی ہے آج تلک ہم جیتے ہیں
اُس بے مہر صنم کی خاطر سختی سی سختی کھینچے ہم
سر نہ بڑے کے چڑھیے اسمیں ہرگز زیاں ہے سر ہی کا

دل اپنا تو بجھا سا دیا ہے جان چراغ مضطر ہے
تمنے کہا دل چاہے تو ڈھونڈوں کیا جانے کیدھر ہے
تم پوچھو تو اور کہیں کیا نسبت کل کی بہتر ہے
جی پگھلے کیا اُسکا ہم پر رحم کہاں وہ پتھر ہے
سمجھے نہ سمجھے کوئی اسے یہ پہاڑ کی آخر ٹکر ہے

جیسے ملا اُس آئینہ رو سے خوش کی اُن نے نمد پوشی
پانی بھی وے ہی پھینک سبھوں کو میر فقیر قلندر ہے

آشوب چشم چشمہ زا اب کوہ و صحرا پر بھی ہے
گو چشم بندی شیخ کی ہو آخرت کے واسطے
نے دست مزد بندگی نے قدر سر افگندگی
تنگ آن کر گم ہو گئے مقصود جو مقصود تھا

طوفاں سا شہروں میں ہے اک شور دریا پر بھی ہے
لیکن نظر اعمیٰ نمط پردے میں دنیا پر بھی ہے
جو مکرمت ہم پر ہوئی اب جلف و ادنیٰ پر بھی ہے
ہم خرج رہ کیونکر نہوں پیدا ہی پیدا پر بھی ہے

ہیں خوبیاں ہی خوبیاں وحشی طبیعت میر میں
پر انس کم ہم سے دلیل اب کی یہ سودا پر بھی ہے

آنکھوں سے راہ عشق کی ہم جوں نگہ گئے
اس عرصہ سے گیا ہو کہیں کوئی تو کہیں
کیا کیا ہوئے ہیں اہل زباں ڈھیر خاک کے
ان دلبروں سے کیا کہیں مظلوم عشق ہم

آخر کو روتے روتے پریشاں ہو بہہ گئے
چل پھر کے لوگ یاں کے یہیں سارے رہ گئے
کیا کیا مکان دیکھتے ناگاہ ڈھہ گئے
ناچار ظلم و جور و ستم اُن کے سہہ گئے

تسبیحیں ٹوٹیں خرقے مصلے پھٹے جلے
کیا جانے خانقاہ میں کیا میر کہہ گئے

میر کیوں رہتے ہیں اکثر ان سے
کم نہیں بنتی کسو سے جو بنے

لے میں نہ گردن کٹائی۔ اب اسطرح نہیں بولتے بلکہ میں نے گردن نہ کٹائی بولیں گے ۱۲

خون ہو کر بہ گیا مدت ہوئی
دل کو جو ڈھونڈا ہو سو کیا کس کنے

ہے توکل جی سے ہم درویش ہیں
گر ہی چلتے ہیں جو کچھ دل ہیں بھنے

عالم خاکی بھی بسمل گاہ ہے
ہو رہے ہیں ڈھیریاں سو سو چھنے

اُس شکار افگن کے ہم بھی صید ہیں
خاک و خوں میں لوٹتے چھاتی بھنے

ہم پہ رہتے ہو گیا کمر کستے
اچھے ہوتے نہیں جگر خستے

سنتے کھینچا نہ سمجھے تلوار
ہم نہ مر جائیں ہنستے ہی ہنستے

شوق لکھتے قلم جو ہاتھ آتی
لکھتے کاغذ کے دستے کے دستے

سیر قابل ہیں تنگ پوش اب کے
کہنیاں پھنستی چولیاں چستے

رنگ لیتی ہے سب ہوا اُس کا
اس سے باغ و بہار ہیں رستے

اک نگہ کر کے اُن نے مول لیا
بک گئے آہ ہم بھی کیا سستے

میر جنگل پڑے ہیں آج جہاں
لوگ کیا کیا نہیں تھے کل بستے

سب شرم جبین یار سے پانی ہے
ہر چند کہ گل شگفتہ پیشانی ہے

سمجھے نہ کہ بازیچۂ اطفال ہوئے
لڑکوں سے ملاقات ہی نادانی ہے

جوں آئینہ سامنے کھڑا ہوں یعنی
خوبی سے ترے چہرے کی حیرانی ہے

خط لکھتے جو خونفشاں تھے ہم اُن نے کہا
کاغذ جو لکھے ہے اب سو افشانی ہے

دوزخ میں ہوں جلتی جو رہے ہے چھاتی
دل سوختگی، عذاب روحانی ہے

منت کی بہت تو اُن نے دو حرف کہے
سو برسوں میں اک بات مری مانی ہے

کل سیل سا جوشاں جو ادھر آیا میر
سب بولے کہ یہ فقیر سیلانی ہے

جی کے لگنے کی میر کچھ کہ بھی
ہے وہ ہی بات جس میں ہو یہ بھی

حسن اے رشک مہ نہیں رہتا
چار دن کی ہے چاندنی یہ بھی

شور شیریں تو ہے جہاں میں ولے
ہے حلاوت زمانے کی وہ بھی

سکے نیچے سے دل نکل نہ سکا
زور بیٹھی ہی یار کی گہ بھی

اس زمیں گرد میرے مہ سا نہیں
آسماں پر اگرچہ ہے مہ بھی

کیا کہوں اُس کی زلف بن رو رو
میں پراگندہ دل گیا یہ بھی

مضطرب ہو جو ہمرہی کے میر
پھر کے بولا کہ بس کہیں رہ بھی

کہیں آگ آہ سوزندہ نہ چھاتی میں لگا دیوے
خبر ہوتے ہی ہوتے دل جگر دونوں جلا دیوے

بہت روئے ہمارے دیدۂ تر اب نہیں کھلتے
متاع آب دیدہ ہو کوئی اس کو ہوا دیوے

تمہارے پاؤں گھر جانے کو عاشق کے نہیں اٹھتے
تم آؤ تو تمہیں آنکھوں پہ سر پر اپنے جا دیوے

وسیلہ گمرہی ہے خضر جو ملتا ہے جنگل میں
پھرے ہے آپھی بھولا کیا ہمیں رستا بتا دیوے

گئے ہی جی کے فیصل ہو نیاز و ناز کا جھگڑا
کہیں وہ تیغ کھینچے بھی کہ بندہ سر جھکا دیوے

لڑائی ہی رہی روزوں میں باہم بد دماغی سے
گلے سے اُسکی ہم کو عید اب شاید ملا دیوے

ہوا میں میر جو اس بت سے سائل بوسۂ لب کا
لگا کہنے ظرافت سے کہ شہ صاحب خدا دیوے

تیرے جوڑے وہ ماہ آتا ہے
ہم کو یہ تیسرا ماہ جاتا ہے

گل کو سر پر رکھیں سبھی لیکن
اب دماغ اپنا کب اٹھاتا ہے

اپنا اپنا ہے ذائقہ ہم کو
بوسۂ کنج لب ہی بھاتا ہے

آتش عشق جس کے دل کو لگی
شمع ساں آپ ہی کو کھاتا ہے

دیکھنا ہے تو ہے بہم پردہ
ہم سے آنکھوں کو کب ملاتا ہے

میری تو ہے پلک سے چھوٹی نگاہ
اور وہ اُس پہ منہ چھپاتا ہے

میر صناع ہے ملو اُس سے
دیکھو باتیں تو کیا بناتا ہے

شائستۂ غم و ستم یار ہم ہوئے
عاشق کہاں ہوئے کہ گنہگار ہم ہوئے

کی عرض جو متاع امانت ازل کے بیچ
جب اور لے سکے نہ خریدار ہم ہوئے [۱]

جی کھنچ گیا اسیر قفس کی فغاں کی اور
تھی چوٹ اپنے دل کو گرفتار ہم ہوئے

پامال یوں کیا کہ برابر ہیں خاک کے
کیا ظلم ہو گیا جو طلبگار ہم ہوئے

[۱] حافظ ۔ آسماں بار امانت نتوانست کشید ؛ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند ۱۲

ہوتا نہیں ہے بیخبری کا مآل خوب
افسوس ہے کہ دیر خبردار ہم ہوئے

وصل اُس طبیب زادیکا جی چاہتا رہا
آخر اس آرزو ہی میں بیمار ہم ہوئے

پھل ہے یہ میر عشق کا اس نو بہار کے
آخر جو کشت و خوں کے سزاوار ہم ہوئے

کہی میں اُن لبوں کی جانفزائی
یہ بات اک بیخودی میں مُنھ پہ آئی

تعارف کیا رہا اہل چمن سے
ہوئی اک عُمر میں اپنی رہائی

کہاں کا بیستوں فرہاد کیسا
یہ تھی سب عشق کی زور آزمائی

جفا اُٹھتی وفا جو عمر کرتی
سو کی اُس زندگی نے بیوفائی

کہیں سو کیا کہیں سر پہ ہمارے
قیامت شامتِ اعمال لائی

گیا اُس ترک کی آمد کو سُن جی
تھمی ہم سے نہ اک دم بھی ادائی

موافق ٹک ہو تو پھر جہاں میں
مثل ہو میری تیری آشنائی

بغیر از چہرۂ مہتابیِ یار
ہمارے مُنھ پہ چھوٹے ہے ہوائی

گئی ٹکڑے ہو دل کی آرسی تو
ہوئی صد چند اُس کی خود نمائی

فراق یار کو آساں نہ سمجھو
کہ جان و تن کی مشکل ہے جدائی

پھر آنا کعبے سے اپنا نہ ہوگا
اب اسکے گھر کی ہم نے راہ پائی

ہوئے ہیں درد دل سے میر کے تنگ
پھر اس جوگی نے یاں دھونی لگائی

ہوں خاک پا جو اُس کی ہر کوئی سر چڑھاوے
مُنھ پھیرے وہ تو ہمکو پھر کون مُنھ لگاوے

ان دو ہی صورتوں میں مشکل اب نباہ کی ہے
یا صبر ہم کو آوے یا رحم اُس کو آوے

اُس مہ بغیر عالم آنکھوں میں سب سیہ ہے
دیکھیں تو عشق کیا کیا ہمکو سمیں دکھاوے

کچھ زخم کھل چلے ہیں کچھ داغ کھل رہے ہیں
اگلی بہار دیکھیں کیا کیا شگوفے لاوے

جوں لیلی اور مجنوں تا نقش کچھ رہے یاں
اُس کی مری بھی صورت یکجا کوئی بناوے

یہ طرح وار لڑکے دیں بیٹھنے تب اُس کو
جب جی سے کوئی اپنے سر طرح دل اُٹھاوے

ہم جس زمیں پہ آئے واں آسماں ہی تھا
یارب جو کوئی جاوے تو کس طرف کو جاوے

شب شکے حال میر الیتا ہے موند آنکھیں
پچھلے سے میں کہوں کیا سوتا ہو تو جگاوے

طاعت کا محو تب ہے جب ڈھب نہیں بتوں سے
چھوڑے نماز واجب گر میر وقت پاوے

بہار آئی نکالو مت مجھے اب کے گلستاں سے
مرا دامن سے بنتے تو باندھ دو گل کے گریباں سے

نہ ٹک وا شد ہوئی دل کو نہ جی کی لاگ کچھ پائی
رہے دس دن جو اپنی عمر کے یاں ہم سو مہماں سے

غم ہجراں نے شاید آگ دی اس آہ بن دل کو
شرارے تب تو نکلے ہیں ہماری چشم گریاں سے

سبب آشفتہ طبعی کا ہماری رہتے ہیں دونوں
نہ الجھی ہے اسکے خط سے نے زلف پریشاں سے

ادھر زنجیر کا غل ہے ادھر ہنگامہ لڑکوں کا
جنوں اس دشت میں ہمنے کیا ہے کیسے ساماں سے

محبت میں کسو کی رنج و محنت سے گئے دونوں
رہی شرمندگی ہی عمر بھر مجکو دل و جاں سے

خدا جانے کہ دل کس خانہ آباداں کو دے بیٹھے
کھڑے تھے میر صاحب گھر کے دروازے پہ حیراں سے

برسوں تک جی کو مار مار رہے
رات دن ہم امیدوار رہے

موسم گل تلک رہے گا کون
چبھتے ہی دل کو خار خار رہے

وصل یا ہجر کچھ ٹھہر جاوے
دل کو اپنے اگر قرار رہے

خوشنوا کیسے کیسے طائر قدس
اس جفا پیشہ کے شکار رہے

اسکی آنکھوں کی مستی سے عاشق
چاہیئے یوں کہ ہوشیار رہے

دل لگے پر رہا نہیں جاتا
رہے اپنا جو اختیار رہے

کم ہے کیا لذت ہم آغوشی
سب مزے میر در کنار رہے

یوں جنوں کر گئے جو ہم یاں سے گئے
تو میاں مجنوں بیاباں سے گئے

مر گئے دم کب تلک رکتے رہیں
ہارے جی کے ساتھ سب یاں سے گئے

کیا بدن دیکھا جبیں چولی سے ہائے
ہارے حسرت کے ہی ہم جاں سے گئے

جانب مسجد تھی وہ کافر نگاہ
شیخ صاحب دین و ایماں سے گئے

پیچ میں آئے کسو کی زلف کے
میر اس رستے پریشاں سے گئے

اے تو خط ایک دن ہے جھگڑا ہمارے تیرے
سبزی بہت لگی ہے منھ سے پیارے تیرے

حیران حال عاشق ہو گی اجل پہونچکر
کیا حال یاں رہا ہے ظلموں کے مارے تیرے

ہر بار دیکھے ہے تو ادھر ہی آہِ شب نے
کچھ تو اثر کیا ہے جی میں بھی بارے تیرے

باغ و بہار و نکہت گل پھول سب ہی تو ہے
یاروں کی ہیں نظر میں یہ رنگ سارے تیرے

الماس میر تجھ کو کیا عشق نے دیا ہے
لخت جگر گرے ہیں جوں لعل پارے تیرے

وو دیدۂ تر اپنے جو یار کو ہیں تکتے
اک ایک کو نہیں پھر غیرت سے دیکھ سکتے

حرکت دلوں کی اپنے ند بوحی سی رہے ہے
اب وہ نہیں کہ دھڑ دھڑ رہتے ہیں دل دھڑکتے

پلکوں کی اُسکی جنبش جاتی نہیں نظر سے
کانٹے سے اپنے دل میں رہتے ہیں کچھ کھٹکتے

ہوتا تھا گاہ گاہ ہے محسوس درد آگے
اب دل جگر ہمارے پھوڑے سے ہیں لپکتے

پڑتی ہیں ادھر ادھر وے شوخ آنکھیں ایسی
وو ترک مست جیسے ہوں راہ میں بھٹکتے

شعلوں کی ڈانک گویا لعلوں تلے دھرے ہیں
چہروں کے رنگ ہمنے دیکھے ہیں کیا جھمکتے

یوں بات راہ کی تو سنتا نہیں ہے کوئی
جاتے ہیں ہم جرس سے اس قافلہ میں بکتے

جاگہ سے لے گئے ہیں نازاں جب آگئے ہیں
نوبادگانِ خوبی جوں شاخ گل لچکتے

اس حسن سے کہاں ہے غلطانی موتیوں کی
جس خوبصورتی سے میر اشک ہیں ڈھلکتے

غم مرگ سے دل جگر ریش ہے
عجب مرحلہ ہمکو درپیش ہے

بلا ہے اُسے شوق تیر و کماں
نہیں سے یہ پیدا ستم کیش ہے

ولا اُس کے ظاہر پہ مت جائیو
وہ خوشرو تو ہے پر بد اندیش ہے

بہت خوب ہے لعل نوشین یار
ولیکن خط پشت لب نیش ہے

ہمیں کیا جو ہے میر بیہوش سا
خدا جانے یہ کیا ہے درویش ہے

گوش ہر اک کا اُسی کی اور ہے
کیا قیامت کا قیامت شور ہے

پوچھنا اس ناتواں کا خوب تھا
پر نہ پوچھا ان نے وہ بھی زور ہے

صندل درد سر مہر و وفا
عاقبت دیکھا تو خاک گور ہے

رشتۂ اُلفت تو نازک ہے بہت
کیا سمجھ کر خلق اسیر ڈور ہے

ناکسی سے میر اس کوچے کے بیچ
اسطرح نکلے ہے جیسے چور ہے

شب اگر دلخواہ اپنی بیقراری کیجیے
لے زمیں سے تا فلک فریاد و زاری کیجیے

ایک دن ہو تو کریں احوال گیری دلکی آہ
مر گئے ہم کب تلک تیمار داری کیجیے

نوچیے ناخن سے منہ یا چاک کریے سب جگر
جی میں ہے آگے ترے کچھ دستکاری کیجیے

جائیے اس شہر ہی سے اب گریباں پھاڑ کر
کیجیے کیا غم سے یوں ماتم گزاری کیجیے

یوں بہے کبتک کہ بے لعل لب اس سے ہر گھڑی
چشمہ چشمہ خون دل آنکھوں سے جاری کیجیے

کنج لب اس شوخ کا بھی رہنے کی جائے ہے
صرف کیجے عمر تو اس جائے ساری کیجیے

کوہ غم سر پر اٹھا لیجے نہ کہیئے منہ سے کچھ
عشق میں جوں کوہکن کچھ بردباری کیجیے

گرچہ جی کب چاہتا ہے آپ کا آنے کو یاں
پر کبھو تو آئیے خاطر ہماری کیجیے

آشنا ہو اس سے ہم مر مر گئے آئندہ میر
جیتے رہیئے تو کسو سے اب نہ یاری کیجیے

صد گونہ عاشقی میں ہم نے جفا سہی ہے
پر یہ کہا نہ ظالم اس کی نہیں سہی ہے

کرتی پھری ہے رسوا سارے چمن میں مجھ کو
گر کوئی بات دل کی بلبل سے میں کہی ہے

ہے صبح کا سا عرصہ پیری کا اسمیں کیا ہے
باقی ہے وقت کتنا فرصت کہاں رہی ہے

درویش جب ہوئے ہم تب ہے ہمیں برابر
کشکول بازگوں ہے یا افسر شہی ہے

جیتے رہے بہت ہم جو یہ ستم اٹھائے
عمر دراز کی سب تقصیر و کوتہی ہے

رونے میں متصل ہے ہونٹھوں پہ آہ میری
جاتا نہیں ہے سمجھا یہ باؤ کیا بہی ہے

آزار عاشقی میں کاہیکی ٹھہر توقع
ہو جائے یاس جس سے سو رنج یہ وہی ہے

روتا ہمیں نظر کر رہنا کیے کنارا
چڑھنا ہمارے منہ پہ دریا کی بے تہی ہے

چلاہٹ اس طرح کی جز میر کس سے ہوئے
باور نہ ہو تو دیکھو یہ ہو نہ ہو وہی ہے

کل جوش غم میں آنسو ٹپکے نہ چشم تر سے
افسوس ہے کہ آ کر یوں مینھ ٹک نہ برسے

کیا ہے نمود مردم جو سے کہیئے دیکھیو تم
مژگاں بہم زدن میں جاتی رہی نظر سے

ہم سا شکستہ خاطر اس بستی میں نہ ہو گا
برسے ہے عشق اپنے دیوار اور در سے

معلوم اگلی سی تو جرأت الم کشی میں — کیا کام نکلے گا اب ٹکڑے ہوئے جگر سے
آئینہ دار اُسی کے پاتے ہیں شش جہت کو — دیکھیں تو منھ دکھاوے وہ کام جاں کدھر سے
مت رنج کھینچ مل کر ہشیار مرد ماں سے — اُس کی خبر ملے گی اک آدھ بے خبر سے
جب گوش زد ہوا اُسکے تب بید مانع ہو وہ — بس ہو چکی توقع اب نالۂ سحر سے
اے رشک مہ کبھو تو آ چاند سا نکل کر — منھ دیکھنے کو ترا تا چند کوئی ترسے

چاہت بری بلا ہے کل میر نالہ کش بھی
ہمراہ نے سواراں دوڑے پھرے نفر سے

برق و شرار و شعلہ و پروانہ سب ہیں یے — جوں ہم جلا کریں ہیں بھلا جلتے کب ہیں یے
لے موئے سر سے ناخن پا تک بھری ہے آگ — جلتے ہیں دردمند یہ جلتے کڈھب ہیں یے
ہوتا ہے دل کا حال عجب غم سے اس گھڑی — کہتا ہے جب وہ طنز سے ہمکو عجب ہیں یے
آتی ہے گرم باد صبا اُس کی اور سے — اپنے جگر کے جلنے کے بارے سبب ہیں یے
غربت پہ مہرباں ہوئے میری سو یہ کہا — ان کو غریب کوئی نہ سمجھے غضب ہیں یے
فرہاد و قیس لے گئے کہتے ہیں اب یہ لوگ — رکھے خدا سلامت اُنھوں کو کہ اب ہیں یے

سید ہیں میر صاحب و درویش و دردمند
سر رکھیے اُن کے پانوں پہ جائے ادب ہیں یے

خوش طرح مکاں دل کے ڈھانے میں شتابی کی — اس عشق و محبت نے کیا خانہ خرابی کی
سسکے ہے دل ادھر کو بہتا ہے جگر اودھر — چھاتی ہوئی ہے میری دوکان کبابی کی
وہ نرگس مستانہ باتیں کرے ہے درہم — تم دیکھو نہ کچھ بولو کیا بات شرابی کی
بے سدھ ہوئے ہم آئی اک بو جو گلستاں سے — پر زور تھی نے کتنی غنچہ کی گلابی کی

رونے سے دل شب کے تر میر کے کپڑے ہیں
پر قدر نہیں اس کو اس جامۂ آبی کی

کوئی ساحر اُس کو کچھ جادو کرے — وہ جو بے رو اسطرف ٹک رو کرے
دور سے ٹک ملتفت ہوتے رہو — جب تلک دوری سے کوئی خو کرے
ہم میں ہو آئینۂ عالم سیاہ — ایک اگر عاشق قلندر ہو کرے
کس سے تیری چاہیئے داد ستم — کاش انصاف اپنے دلمیں تو کرے

غنچہ پیشانی چمن میں میں رہا
بیدماغ عشق گل کیا بو کرے

لوہو پانی ایک کر دیتا ہے عشق
پانی کر دے چشم دل لوہو کرے

اب جنوں میں میر سوئے دشت جا
کار وحشت کے تئیں یکسو کرے

حدیث زلف دراز اُن کی مُنھ کی بات بڑی
کبھو کے دن میں پڑے یاں کبھو کی رات بڑی

کبھو جو گالی ہمیں دیتے ہو کرو موقوف
تمھاری بس میں یہی ہم پہ التفات بڑی

ذلیل ذات نہیں عشق میں کہ میر کو دیکھ
ذلیل کیسے ہیں اُن کی ہے گو کہ ذات بڑی

ہے تماشا حسن و خط حیرت بھی ہے
یعنی خط تو خوب ہے صورت بھی ہے

تا دم آخر نہیں بولے ہیں ہم
کچھ کہیں گے بارے اب رخصت بھی ہے

ہے وہ فتنہ ہم حریف و ہم ظریف
مار ہے گالی ہے پھر منت بھی ہے

تیغ نے اُس کی ہمیں قسمت کیا
خوش نصیبی ہے تو یہ قسمت بھی ہے

وا نسیم صبح سے ہوتا ہے گل
تجکو اے مرغ چمن غیرت بھی ہے

جی ہی دینے کا نہیں کڑھنا فقط
اسکے در سے جانے کی حسرت بھی ہے

دور سے باتیں کرے ہے یوں ہی یار
میر صاحب سے انھیں صحبت بھی ہے

چلے ہم اگر تم کو اکراہ ہے
فقیروں کی اللہ اللہ ہے

نہ افسر ہے نے دردسر نے کُلہ
کہ یاں جیسا سر ویسا سرواہ ہے

جہاں لگ چلے گل سے ہم داغ ہیں
اگرچہ صبا بھی ہوا خواہ ہے

غم عشق ہے ناگہانی بلا
جہاں دل لگا کڑھنا جانکاہ ہے

چراغان گل سے ہے کیا روشنی
گلستاں کسو کی قدمگاہ ہے

محبت ہے دریا میں جا ڈوبنا
کوئیں میں بھی گرنا یہی چاہ ہے

کلی سا ہے کہتے ہیں مُنھ یار کا
نہیں معتبر کچھ یہ افواہ ہے

کسو کو تھی بت پرستی میں کچھ
خدا اس عقیدے سے آگاہ ہے

گیا میر کے جی کی سنکر وہ شوخ
لگا کہنے سب کو یہی راہ ہے

یار کا جور و ستم کام ہی کر جاتا ہے
کتنا جی عاشق بیتاب کا مر جاتا ہے

جیسے گرداب ہے گردش مری ہر چار طرف
شوق کیا جانیے مجھکو کدھر جاتا ہے

جوشش اشک میں ٹک ٹھہرے رہو پیش نظر
اب کوئی پل میں یہ سیلاب اتر جاتا ہے

زرد رخسار پہ کیوں اشک نہ آوے گلرنگ
آگے سے آنکھوں کے وہ باغ نظر جاتا ہے

رہ گریباں کی ہی خونناب سے تر ہوتی نہیں
سارا زنجیرۂ دامن بھی تو بھر جاتا ہے

واعظ شہر تنک آب ہے مانند حباب
ٹک ہوا لگتی ہے اُس کو تو ابھر جاتا ہے

کیا لکھوں بخت کی برگشتگی نالوں سے مرے
نامہ بر مجھ سے کبوتر بھی پھر جاتا ہے

آن اُس دلبر شیریں کی چھری شہد کی ہے
عاشق اک آن ہی میں جی سے گزر جاتا ہے

ہر سحر پیچھے اُس اوباش کے خورشید ای میر
ڈھال تلوار لیے جیسے نفر جاتا ہے

ٹھوکر لگا کے چلنا اس رشک ماہ کو بھی
یہ چوٹ ہی رہے ہے اس روسیاہ کو بھی

اُس شاہ حُسن کے کچھ مژگاں پھرے ہوئے ہیں
غمزہ نے ورغلایا شاید سپاہ کو بھی

کی عمر صرف ساری پر گم ہے مطلب اپنا
منزل نہ پہونچے ہم تو طے کر کے راہ کو بھی

سر پھوڑنا ہمارا اُس لڑکے پر نہ دیکھو
ٹک دیکھو اس شکست طرف کلاہ کو بھی

کرتی نہیں خلش ہے مژگان یار دل میں
کاوش رہے ہے جی سے اسکی نگاہ کو بھی

خونریزی کے تو لاگو ہوتے نہیں یکایک
پہلے تو پوچھتے ہیں ظالم گناہ کو بھی

جوں خاک سے ہے یکساں میر انہاں قامت
پامال یوں نہ ہوتے دیکھا گیاہ کو بھی

ہر لحظہ پھیر لینا آنکھوں کا ہم سے کیا ہے
منظور رکھیے کچھ تو بارے نباہ کو بھی

خواہش بہت جو ہو تو کاہش ہے جان دل کی
کچھ کم کر ان دنوں میں اے میر چاہ کو بھی

سُنا جاتا ہے اے گھتیے ترے مجلس نشینوں سے
کہ تو دارو پیے ہے رات کو ملکر کمینوں سے

گئی گرم اختلاطی کب کی ان سحر آفرینوں سے
لگے رہتے ہیں داغ ہجر ہی اب اپنے سینوں سے

گلے لگ کر نہ یک شب کاش وہ مہ سو گیا ہوتا
مری چھاتی جلا کرتی ہے اب کتنے مہینوں سے

خدا جانے ہے اپنا تو جگر کانیا ہی کرتا ہے
چڑھی تیوری ہے محبوبوں کی ابرو کی چینوں سے

بہت کوتاہ دامن خرقے شیخوں کے پھٹے پاسے
نہیں نکلے تھے گورے ہاتھ اُسکے آستینوں سے

رہے ہے محو خیال اُسکے تو یک نت سے ہاتھ آئے — نزاکت اس کمر کی پوچھیے ہم باریک بینوں سے
برنگ برگ گل ساتھ ایک شادابی کے ہوتا ہے — عرق چیں بھیگتا ہے دلبروں کے جب پسینوں سے
بہت میں لخت دل رویا مجھے اک خلق نے جانا — ہوا ہے یمن میرا نام ان رنگیں نگینوں سے

غزل ہی کی ردیف و قافیہ کا رفتہ رہتا ہے
نکلنا میر اب مشکل ہے میر ان زمینوں سے

بیتابی جو دل ہر گھڑی اظہار کرے ہے — اب دیکھوں مجھے کس کا گرفتار کرے ہے
کچھ میں بھی عجب جنس ہوں بازار جہاں میں — سو ناز مجھے لیتے خریدار کرے ہے
ہے اشک سے بلبل کے بھرا غنچوں میں پانی — گل باغ سے کیا رخت سفر بار کرے ہے
اس چاہ نے دل ہی کو تو بیمار کیے ہیں — یہ دوستی ہی ہے جو گرفتار کرے ہے
آگے تو جو کچھ ہم نے کہا مان لیا اب — ایک ایک سخن پر بھی وہ تکرار کرے ہے
زنہار نہ جا پرورش دور زماں پر — مرنے کے لیے لوگوں کو تیار کرے ہے
کیا عشق میں ہم اس کے ہوئے خاک برابر — کب اپنے تئیں یوں کوئی ہموار کرے ہے
تصویر سے دروازے پہ ہم اُسکے کھڑے ہیں — انسان کو حیرانی بھی دیوار کرے ہے

کیونکر نہ ہو تم میر کے آزار کے درپے
یہ جرم ہے اس کا کہ تمھیں پیار کرے ہے

دشمنوں کے روبرو دشنام ہے — یہ بھی کوئی لطف بے ہنگام ہے
محو زلف یار ہے عالم تمام — حُسن کا بھی شہرہ جوش شام ہے
عشق کی ہے راہ کیا مشکل گزر — سر کا جانا جس میں ہر اک گام ہے
گر کہا ناکام ملئے سو کبھی — تو یہ کہتا ہے کہ مجھ کو کام ہے
روز و شب پھرتا ہوں اس کوچے کے گرد — کیا کہوں کیا گردش ایام ہے
چین دن کو ہے نہ شب کو نیند ٹک — اُس کی دوری میں کسے آرام ہے

بزم میں یوں بھا تو یوں انجان ہو
میر ان لوگوں میں کس کا نام ہے

دل عجب نسخہ تصوف ہے — ہم نہ سمجھے بڑا تاسف ہے

ں سے مکن تکیہ بر ملک دنیا و پشت ؛ کہ بسیار کس چو تو پرورد و کشت ۱۲

آپ ہی صرف عشق ہو جانا
یہ بھی درویش کا تصرف ہے

منھ ادھر کر کے وہ نہیں سوتا
خواب میں آوے تو تلطف ہے

یاں تو تکلیف سی کھنچی تکلیف
واں وہی اب تلک تکلف ہے

چھیڑ اس شوخ نے رکھی ہم سے
عہد پر عہد ہے تخلف ہے

مرگ کیا منزل مراد ہے میر
یہ بھی اک راہ کا توقف ہے

تسکین دردمندوں کو یارب شتاب دے
دل کو ہمارے چین دے آنکھوں کو خواب دے

اسکا غضب سے نامہ نہ لکھنا تو سہل ہے
لوگوں کے پوچھنے کا کوئی کیا جواب دے

گل ہے بہار تب ہی جو آنکھوں میں ہو نشہ
جاتی ہے فصل گل کہیں ساقی شراب دے

وہ تیغ میری تشنۂ خوں ہو گئی ہے کند
کر رحم مجھ پہ کاشکے یار اسکو آب دے

دو چار الم جو ہو ویں تو ہیں یا بتا بتاں
کیا درد بیشمار کا کوئی حساب دے

تار نگہ کا سوت نہیں بند تھا ضعف سے
بیجا پن ہے یہ رشتہ ولا اس کو تاب دے

مژگان تر کو یار کے چہرے پہ کھول میر
اس آب خستہ سبزے کو ٹک آفتاب دے

نہ جرأت ہے نہ جذبہ ہے نہ یاری بخت بد سے ہے
یہی بے طاقتی خوں گشتہ دل کو میر کے کد سے ہے

جہاں شطرنج بازندہ فلک ہم تم ہیں سب مہرے
بسان شاطر نوذوق اسے مہروں کی زد سے ہے

سخن کرنے میں نستعلیق گوئی ہی نہیں کرتا
پڑھے ہیں شعر کوئی ہم سو وہ بھی شد و مد سے ہے

ہوا سرسبز آگے یار کے سرو گلستاں کب
کہ نسبت دور کی طوبےٰ کو اس کے نخل قد سے ہے

لکھا کب تک کریں اس سرزمیں سے آپ ہی اب جاویں
ہمیں ملنے کا شوق اس کے زیادہ اے میر حد سے ہے

ل؎ بہتر ہے مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے ؛ یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

کٹ کر گرینگے راہ میں مشتاق علف سے
مٹھ بھیڑ اگر ہو گئی اُس تیغ بکف سے

جاتا ہے کوئی دشت عرب کو جو بگولا
کہہ دوں ہوں دعا مجنوں کو میں اپنی طرف سے

دریا تھا مگر آگ کا دریا ہے غم عشق
سب آبلے ہیں میرے دُر نہیں صدف سے

دل اور جگر یہ تو جلے آتش غم میں
جی کیونکہ بچاؤں کہو اس آگ کی تف سے

شب اُسکے سگ کو نے ہمیں پاس بٹھایا
ہم اپنے تئیں دور نہ کیوں کھینچیں شرف سے

چھاتی میں بھری آگ ہے کیا جس سے شب و روز
چنگاریاں گرتی ہیں مری پلکوں کی صف سے

اے میر گدائی کر دل دروازے کی اُسکے
مانگوں ہوں یہی آٹھ پہر شاہ نجف سے

کہو کچھ میر کی وحشت سے ان گلیوں میں آنکی
خبر کیوں پوچھتے ہیں مجھسے لڑکے اس دوانے کی

جہاں سے دل کو دیکھو منھ نظر جوں طاق آوے
نہ کی کچھ قدر اُن نے حیف اس آئینہ خانے کی

ہمیں لیتے ہو آنکھیں موند کر لو تم کہ جنس اپنی
وفا مہر ہے سو وہ نہیں بابت دکھانے کی

کہو ہو زیر لب کیا دیکھ کر ہم ناتوانوں کو
ہماری جان میں طاقت نہیں باتیں اُٹھانے کی

برنگ طائر نو پر ہوئے آوارہ ہم اُٹھ کر
کہ پھر پائی نہ ہم نے راہ اپنے آشیانے کی

عجب چوپڑ بچھی ہے ہر زماں اُڑتا ہے رنگ اپنا
سمجھ میں چال کچھ آتی نہیں اپنے زمانے کی

اگر طالع کرے یاری تو مر لیے کربلا جا کر
عبیر اپنے کفن کی خاک ہو اُس آستانے کی

غزل اک اور بھی اس گل زمیں میں قصد ہے کہیے
ہوئی ہے اب تو خو آخر ہمیں باتیں بنانے کی

تک ان پلکوں کو ہی ٹھوکر سے فتنے کو جگا سکی
طرح آئی ہے اس قد کو قیامت سر پہ لانے کی

کسو سے آنکھ کے ملتے ہی اپنی جان دے بیٹھے
نئی یہ رسم ہم جاتے ہیں چھوڑے دل لگانے کی

جہاں ہم آئے چہرے پہ بکھیرے بال جا سوئے
ادا کرتے ہو تم کیا خوب ہم سے منھ چھپانے کی

مسیں بھیگی ہیں اُس کی سبزۂ خط کی ہدایت سے
مسیح و خضر کو پہونچی بشارت زہر کھانے کی

جہاں اُسکے لیے غربال کر نومید ہو بیٹھے
یہی اُجرت ملی ہے کیا ہمارے خاک چھانے کی

کہوں کیا ایک بوسہ لب کا دیکر خوب رگڑایا
رکھی برسوں تلک منت کبھو کی بات مانے کی

بگولا کوئی اُٹھتا ہے کہ آندھی کوئی آتی ہے
نشان یادگاری ہے ہماری خاک اُڑانے کی

کرے ہے داغ اُس کا عید کو سب سے گلے ملنا
اکٹ لی ہے نئی یہ میری چھاتی کے جلانے کی

لڑا کر آنکھیں اس اوباش سے اک پل میں مر گزرا
حکایت بوالعجب ہی میر جی کے مارے جانے کی

کر یہ الشکل ہیئت آن کر ایسی نہیں دیکھی
کہ صورت آسماں کی دیکھ کر میں نے زمیں دیکھی

کبھو دیکھو گے تم جو وہ طرحدار اسطرف آیا
طرح ترکیب ایسی ہمنے ابتک تو نہیں دیکھی

مہ یکیفتہ دلکش اس قدر کاہیکو ہوتا ہے
کروں ہوں شکر کے سجدے کہ میں نے وہ جبیں دیکھی

کہاں وہ طرز کیں اسکی کہاں چین جبیں اسکی
لگا کر بارہا اس شوخ سے تصویر چیں دیکھی

گریباں پھاڑ ڈالیں دیکھ کر دامن کشاں اسکو
پھٹے خرقے بہت جو چاک کی وہ آستیں دیکھی

ترے بیمار کے بالیں پہ جا کر ہم بہت روئے
بلا حسرت کے ساتھ اُس کی نگاہ واپسیں دیکھی

نظر اس کی حیا سے میر پشت پا پر اکثر ہے
کنھوں نے کاہیکو اُسکی سی چشم شرمگیں دیکھی

دن فصل گل کے اگلے بھی جاتے ہیں باؤ سے
دل داغ ہو رہا ہے چمن کے سبھاؤ سے

پہونچے نہ باس گل کی ہمارے مشام میں
یاں کھل رہے ہیں دیدۂ خونبار گھاؤ سے

نامہ مرے عمل کا بھی اے کاش ساتھ جائے
جب آسمان لپیٹیگے کاغذ کے تاؤ سے

دارفتگان عشق بھی کیا طرفہ لوگ ہیں
دل کے گئے پہ دیتے ہیں جی کیسے چاؤ سے

کہنے تو کہیے بات کوئی دل کی میر سے
پر جی بہت ڈرے ہے انھوں کے جداؤ سے

کیا چال نکالی ہے کہ جو دیکھے سو مرجائے
بھیچک کوئی رہ جائے کوئی جی سے گزر جائے

تاچند یہ خمیازہ کشی تنگ ہوں یارب
آغوش مری ایک شب اس شوخ سے بھر جائے

بیطاقتی دل سے مری جان ہے لب پر
تم ٹھہرو کوئی دم تو مرا جی بھی ٹھہر جائے

پڑتے نگہ یار مرا حال ہے ویسا
بجلی کے تڑپنے سے کوئی جیسے کہ ڈر جائے

اس آئینہ رو شوخ مفتن سے کہیں کیا
عاشق کو برا کہہ کے منھ ہی منھ میں مکر جائے

تاکس کی تلافی ستم کون کرے ہے
ڈرتا ہوں کہ وہ اور بھی آزردہ نہ کر جائے

جاتا ہے جدھر منزل مقصود نہیں وہ
آوارہ جو ہو عشق کا بیچارہ کدھر جائے

رونے میں مرے سر نہ چڑھو صبر کرو ٹک
یہ سیل جو اک زور سے آتا ہے اتر جائے

کیا ذکر مرا ہیں تو کہیں اُس سے ملول ہوں
ان خانہ خرابوں کی کہو جن کے وہ گھر جائے

اس زلف کا ہر بال رگ جان ہے اپنی
یاں جی ہی بکھرتا ہے صبا وہ جو بکھر جائے

گردش میں جو دے آنکھ نشہ کی بھری دیکھیں
ہشیار رہ سروں کے تئیں سدھ اپنی بسر جائے

آنکھیں ہی لگی جاتی ہیں اس جاذبہ کو میر
آتی ہے بہت دیر جو اس منھ پہ نظر جائے

بتوں کے جرم والفت پر ہمیں زجر و ملامت ہے
مسلماں بھی خدا لگتی نہیں کہتے قیامت ہے

کھڑا ہوتا نہیں وہ رہزن دل پاس عاشق کے
موافق رسم کے اک دور کی صاحب سلامت ہے

جھکی ہے شاخ پر گل ناز سے کیا صحن گلشن میں
نہال قد کی اس کے مدعی تھی سو ندامت ہے

نکلتا ہے سحر خورشید ہر روز اسکے گھر پر سے
مقابل ہو گیا اس سے تو اس سادہ کی شامت ہے

پھرے وارد پھرتے تھے کل تک میر کوچوں میں
انھیں کو مسجد جامع کی دیکھی آج امامت ہے

خدا کرے مرے دل کو ٹک اک قرار آوے
کہ زندگی تو کروں جب تلک کہ یار آوے

کماں اس کی بھووں کی چڑھی ہی رہتی ہیں
نہ جب تلک مرے سینے ستم شکار آوے

ہمیں تو ایک گھڑی گل بغیر دو بھر ہے
خدا ہی جانے کہ اب کب تلک بہار آوے

اٹھی بھی گرد رہ اس کی کہیں تو لطف ہی کیا
جب انتظار میں آنکھوں ہی پر غبار آوے

ہر ایک شئے کا ہے موسم نہ جانے تھا منصور
کہ نخل دار میں حلق بریدہ بار آوے

تمھارے جوروں سے اب حال جائے عبرت ہے
کسو سے کہیے تو اسکو نہ اعتبار آوے

نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر میر
کہ اب جو دیکھوں اسے میں بہت نہ پیار آوے

نکلے ہے جی کا رستہ آواز کے رکن سے
آزردہ ہو نہ بلبل جاتے ہیں ہم چمن سے

جی غش کرے ہے اب تو رفتار دیکھ اسکی
دیکھیں نبھے ہے اپنی کسطور اس چلن سے

گرد اس کے اور کوئی گرمی سے دیکھتا ہے
اک آگ لگ اٹھی ہے اپنے تو تن بدن سے

رنگیں خرامی کیا کیا لیتی ہے کھینچ دل کو
کیا نقش پا کو اسکے نسبت گل و سمن سے

نزارت گاہ دیکھیں جب دیکھو ہیں سفر میں
ہم کس گھڑی وداعی یارب ہوے وطن سے

دل سوختہ ہوں مجھکو تکلیف حرف مت کر
اک آگ کی لپٹ سی نکلے ہے ہر سخن سے

دل کا اسیر ہونا جی میر جانتا ہے
کیا پیچ پاتیج دیکھے اس زلف پر شکن نے

کعبے کے در پہ تھے ہم یا دیر میں در آئے
آوارگی تو دیکھو کیدھر سے کیدھر آئے

دیوانگی ہے میری اب کسکی کوئی تماشا
رہتے ہیں گھیرے مجکو کیا اپنے کیا پرائے

پاک اب ہوئی ہے کشتی ہمکو جو عشق سے تھی
عہدے سے اس بلا کے کب ناتواں بر آئے

وسعت بیاں کروں کیا دامان چشم تر کی
رونے میں میرے کیا کیا ابر سیہ تر آئے

آ ہمنشیں سنے تو آج آں کنے بھی چلیے
کہتے ہیں میر صاحب مدت میں کل گھر آئے

قصر و مکان و منزل ایکوں کو سب جگہ ہے
ایکوں کو جا نہیں ہے دنیا عجب جگہ ہے

اُس کے بدن میں ہر جا دلکش ہے یوں دلنشین
یا سطح رُخ جگہ ہے یا کنج لب جگہ ہے

پست و بلندیاں ہیں ارض و سما سے ظاہر
دیکھا جہاں کو ہم نے کتنی کڈھب جگہ ہے

دروازے سے لگے ہم تصویر سے کھڑے ہیں
وارفتگاں کو اسکے مجلس میں کب جگہ ہے

بارے ادھر کیا ہے منھ اُن نے میر اپنا
ہو حرف زن سخن کی تیری بھی اب جگہ ہے

دل کی بیماری سے طاقت طاق ہے
زندگانی اب تو کرنا شاق ہے

دم شماری ہی ہے رنج قلب سے
اب حساب زندگی بیباق ہے

اپنی عزلت رکھتی ہے عالم ہی اور
یہ سیہ رو شہرۂ آفاق ہے

فرط خجلت سے گرا جاتا ہے سرو
قد دلکش اس کا بالا چاق ہے

دل زدہ کو اُسکے دیکھا نزع میں
تھا نمودار آنکھ سے مشتاق ہے

رنگ میں اُسکے چمک ہے برق کی
سطح کیا رخسار کا برّاق ہے

گو خط اُس کے پشت لب کا زہر ہو
بوسۂ کنج دہن تریاق ہے

خشک کر دیتی ہے گرمی عشق کی
بید صحرائی سا مجنوں تاق ہے

مت پڑا رہ دیر کے ٹکڑوں پہ میر
اُٹھ کے کعبے چل خدا رزّاق ہے

بات کیا آدمی کی بن آئی
آسماں سے زمین نپوائی

چرخ زن اُسکے واسطے ہے مدام
ہو گیا دن تمام رات آئی

ماہ و خورشید و ابر و باد سبھی
اُسکے خاطر ہوئے ہیں سودائی

کیسے کیسے کیے تردد جب
رنگ رنگ اسکو چیز پہونچائی

اسکو ترجیح سب کے اوپر دے
لطف حق نے کی عزت افزائی

حیرت آتی ہے اسکی باتیں دیکھ
خودسری خودستائی خودرائی

شکر کے سجدوں میں یہ واجب تھا
یہ بھی کرتا سدا جبین سائی

سو تو اس کی طبیعت سرکش
سر نہ لائے فرو کہ ٹک لائی

میر ناچیز مشت خاک اللہ
ان نے یہ کبریا کہاں پائی

دست بستہ کام ناخن کر گئے
سب خراشوں ہی سے جبہے بھر گئے

بتکدے سے تو چلے کعبے ولے
دس قدم ہم دل کو کر پتھر گئے

کیا جو اڑتی سی سنی آئے ہیں گل
ہم اسیروں کے تو بال و پر گئے

مجلسوں کی مجلسیں برہم ہوئیں
لوگ وے پل مارتے کیدھر گئے

تھے لب جو پر جو گرم دید یار
سبزے کے سے رنگ مژگاں تر گئے

خانوادے ہو گئے کیا کیا خراب
خانہ ساز دین کیسے مر گئے

دست افشاں پالے کو یاں شوق میں
صومعے سے میر بھی باہر گئے

تمام شد

دیوان چہارم

میر تقی میر دہلویؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ردیف الف

کرتا ہوں اللہ اللہ درویش ہوں سدا کا
سرمایۂ توکل یاں نام ہے خدا کا

میں نے نکل جنوں سے مشق قلندری کی
زنجیر سر ہوا ہے تھا سلسلہ جو پا کا

یارب ہماری جانب یہ سنگ کیوں ہے عائد
جی ہی سے مارتے ہیں جو نام لے وفا کا

کیا فقر میں گذر ہو چشم طمع سیے بن
ہے راہ تنگ ایسی جیسے سوئی کا ناکا

ابر اور جوش گل ہے چل خانقہ سے صوفی
ہے لطف میکدے میں وہ چند اس ہوا کا

ہم وحشیوں سے مدت مانوس جو رہے ہیں
مجنوں کو شوخ لڑکے کہنے لگے ہیں کاکا

آلودہ خوں سے ناخن ہیں شیر کے سے ہر سو
جنگل میں چل بنے تو پھولا ہے زور ڈھاکا

یہ دو ہی صورتیں ہیں یا منعکس ہے عالم
یا عالم آئینہ ہے اُس یار خود نما کا

کیا میں ہی جاں بلب ہوں بیماری دلی سے
مارا ہوا ہے عالم اس درد بے دوا کا

زلفِ سیاہ اُس کی رہتی ہے چت چڑھی ہی
میں مبتلا ہوا ہوں اے وائے کس بلا کا

غیرت سے تنگ آئے غیروں سے لڑ مرینگے
آگے بھی **میر** سیّد کرتے گئے ہیں ساکا

واجب کا ہو نہ ممکن مصدر صفت ثنا کا
قدرت سے اُسکے لب پر نام آوے ہے خدا کا

سب روم روم تن میں زردی غم بھری ہے
خاکِ جسد ہے میری کس کانِ زر کا خاکا

بند اُس قبا کا کھولیں کیا ناخنِ فقیراں
وابستہ ہے یہ عقدہ شاید کسو دعا کا

ناسازیِ طبیعت کیا ہے جوان ہوئے پر
اوباش وہ ستمگر لڑکا ہی تھا لڑاکا

گل پھول فصلِ گل میں صد رنگ ہیں شگفتہ
میں دل زدہ ہوں اکی رنگینی ہوا کا
عاشق کی چشمِ تر میں گو دبتے آویں لیکن
پانوں کا دلبروں کے چھپتا نہیں جھپاکا

زوریں کش اُن جواں کی کس سے کماں کھنچے ہے
تھا یکہ و جنازہ میر اُن نے جسکو تاکا

قصہ کہیں تو کیا کہیں ملنے کی رات کا
پہروں جواؤ اُن نے رکھا بات بات کا
جرأت سے گرچہ زرد ہوں پر جانتا ہے کون
منھ لال جب تلک کروں پانچ سات کا
کیونکر بسر کرے غم و غصہ میں ہجر کے
خوگر جو ہو کسو کے کوئی التفات کا
جاگہ سے لے گیا ہمیں اُس کا خرامِ ناز
ٹھہراؤ ہو سکا نہ قرار و ثبات کا
ڈرتا ہوں مالکانِ جزا چھاتی دیکھ کر
کہنے لگیں نہ واہ رے زخم اُسکے ہاتھ کا
واعظ کہے سو سچ ہے و لے میفروش سے
ہم ذکر بھی سُنا نہیں صوم و صلوٰت کا
بھونکا کریں رقیب پڑے کوے یار میں
کسکے تئیں دماغِ عفف ہے سگات[1] کا
ان ہونٹھوں کا حریف ہو ظلمات میں گیا
پردے میں روسیاہ ہے آبِ حیات کا
عالم کسو حکیم کا باندھا طلسم ہے
کچھ ہو تو اعتبار بھی ہو کائنات کا

گر یار میر اہل ہے تو کام سہل ہے
اندیشہ تجکو یہ نہیں ہے اپنی نجات کا

تجاہل تغافل تساہل کیا
ہوا کام مشکل توکّل کیا
نہیں تاب لاتا دلِ زار اب
بہت ہم نے صبر و تحمّل کیا
زمینِ غزل ملک سی ہو گئی
یہ قطعہ تصرّف میں بالکل کیا
جنوں تھا نہ مجکو نہ چپ رہ سکا
کہ زنجیر ٹوٹی تو میں غل کیا
نہ سوزِ دروں فصلِ گل میں چھپا
سر و سینہ سے داغ نے گل کیا
ہمیں شوق نے صاحبو کھو دیا
غلاموں سے اُس کے توسّل کیا

حقیقت نہ میر اپنی سمجھی گئی
شب و روز ہم نے تأمل کیا

رفتۂ عشق کیا ہوں میں اب کا
جا چکا … دل جہان سے کب کا

[1] سگات غالباً سگ کی جمع ہے جو میر نے خود ایجاد کی … ہے ۱۲

لوگ جب ذکر یار کرتے ہیں — دیکھ رہتا ہوں دیر منہ سب کا

مست رہتا ہوں جب سے ہوش آیا — میں بھی عاشق ہوں اپنے مشرب کا

ہم تو ناکام ہی چلے یاں سے — تم کو ہوگا وصول مطلب کا

درس کہیے جنوں کا تو مجنوں — اپنے آگے ہے طفل مکتب کا

لعل کی بات کون سنتا ہے — شور ہے زور یار کے لب کا

زلف سا پیچدار ہے ہر شعر
ہے سخن میر کا عجب ڈھب کا

میں جو نظر سے اُسکی گیا تو وہ سرگرم کار اپنا — کہنے لگا چپکا سا ہو کر ہائے دریغ شکار اپنا

کیا یاری کر دور پھر ادہ کیا کیا اُن نے فریب کیسے — جسکے لیے آوارہ ہوئے ہم چھوڑا شہر و دیار اپنا

ہاتھ گلے میں اُن نے نہ ڈالا میں یہ گلا جا کاٹونگا — غم و غصہ سے دیکھیو ہونگا آپ ہی گلے کا ہار اپنا

چھاتی پہ سانپ سا پھر جاتا ہے یاد میں اُسکے بالوں کی — جی میں لہر آوے ہے لیکن رہتا ہوں من مار اپنا

بات کہے تلوار نکالے آنکھ لڑائے جی مارے — کیونکہ جتا دے اس سے کوئی ربط محبت پیار اپنا

ہم نے یار وفاداری میں کوتاہی تقصیر نہ کی — گیا رو دیں چاہت کے اثر کو وہ نہ ہوا ٹک یار اپنا

رحم کیا کر لطف کیا کر پوچھ لیا کر آخر ہے
میر اپنا غمخوار اپنا پھر زار اپنا بیمار اپنا

اے کاش مرے سر پر اکبار وہ آ جاتا — ٹھہراؤ سا ہو جاتا یوں جی نہ چلا جاتا

تب تک ہی تحمل ہے جبتک نہیں آتا وہ — اس رستے نکلتا تو ہم سے نہ رہا جاتا

اک آگ لگا دی ہے چھاتی میں جدائی نے — وہ مہ گلے لگتا تو یوں دل نہ جلا جاتا

بالاک کی وے باتیں یا ایسی ہی بیزاری — وہ جو نہ لگا لیتا تو میں نہ لگا جاتا

آئینہ کو ورکا لگا ہے چہرہ کہ شب مہ میں — منھ کھولے جو سوتا تو ماہ چھپا جاتا

اس شوق نے لکھنے کے بھی کیا بات بڑھائی تھی — رقعہ اسے لکھتے تو طومار لکھا جاتا

یہ ہمدمی کا دعویٰ اُسکے لب خنداں سے — بس کچھ نہ چلا ورنہ پستے کو چبا جاتا

اب تو نہ رہا وہ بھی طاقت گئی سب دل کی — جو حال کبھو اپنا میں تم کو سنا جاتا

وسواس نہ کرتا تھا مر جانے سے ہجراں میں
تھا میر کو ایسا بھی دل جیسے اٹھا جاتا

مستانہ اگرچہ میں طاعت کو لگا جاتا — پر بعد نماز اٹھ کر میخانہ چلا جاتا
بازار میں ہو جاتا اس مہ کا تماشا تھا — یوسف بھی جو واں ہوتا تو اس پہ بکا جاتا
دیکھا نہ ادھر ورنہ آتا نہ نظر پھر میں — جی مفت مرا جاتا اس شوخ کا کیا جاتا
شب آہ شرر افشاں ہونٹھوں سے پھری میرے — سر کھینچتا یہ شعلہ تو مجھکو جلا جاتا
کیا شوق کی باتوں کی تحریر ہوئی مشکل — تھے جمع قلم کاغذ پر کچھ نہ لکھا جاتا
آنکھیں مری کھلتیں تو اس چہرہی پر پڑتیں — کیا ہوتا یکایک وہ سر پر مرے آجاتا
سبزے کا ہوا روکش خط رخ جاناں کے — جو ہاتھ مرے چڑھتا تو پان کو کھا جاتا
ہے شوق سیہ رو سے بدنامی و رسوائی — کیوں کام بگڑ جاتا جو صبر کیا جاتا

تھا میر بھی دیوانہ پر ساتھ ظرافت کے
ہم سلسلہ داروں کی زنجیر ہلا جاتا

یہ دل نے کیا کیا کہ اسیر بلا کیا — اس زلف پر شکن نے مجھے مبتلا کیا
گو بیکسی سے عشق کی آتش میں جل بجھا — میں جوں چراغ گور اکیلا جلا کیا
آیا نہ اس طرف سے جواب ایک حرف کا — ہر روز خط شوق ادھر سے چلا کیا
ڈرتا ہی میں رہا کہ پلک کوئی گڑ نہ جائے — آنکھوں سے اسکی رات جو تلوے ملا کیا

بدحال ٹھنڈی سانسیں بھرا کب تلک کرے
سرگرم مرگ میر ہوا تو بھلا کیا

در پر سے ترے اب کے جاؤں گا تو جاؤں گا — یاں پھر اگر آؤں گا سید نہ کہاؤں گا
یہ نذر بدی ہے میں کعبے سے جو اٹھا ہو — بتخانہ نہیں جاؤں گا زنار بندھاؤں گا
آزار بہت کھینچے یہ عہد کیا ہے اب — آئندہ کسو سے میں دل کو نہ لگاؤں گا
سرگرم طلب ہو کر کھویا سا گیا آپ ہی — کیا جانیے پاؤں گا یا اس کو نہ پاؤں گا

گر میر ہوں چپکا سا پر طرفہ ہنرور ہوں
بگڑے گا وہ ٹک تو سو باتیں سناؤں گا

دیوانگی میں مجنوں میرے حضور کیا تھا — لڑکا سا ان دنوں تھا اسکو شعور کیا تھا
گردن کشی سے اپنی مارے گئے ہم آخر — عاشق اگر ہوئے تھے ناز و غرور کیا تھا
غم قرب بعد کا تھا جبتک نہ ہم نے جانا — اب مرتبہ جو سمجھے وہ اتنا دور کیا تھا

اے واے یہ نہ سمجھے مارے پڑینگے ہمیں
اظہار عشق کرنا ہم کو ضرور کیا تھا

مرتا تھا جسکی خاطر اُس کی طرف نہ دیکھا
میر ستم رسیدہ ظالم غیور کیا تھا

دل کو گل کہتے تھے درد و غم سے مرجھایا گیا
جی کو مہماں سنتے تھے مہمان سا آیا گیا

عشق سے ہو حال جی میں کچھ تو کہیئے دیکھیو
ایک دن باتیں ہی کرتے کرتے سنایا گیا

جستجو میں یہ تعب کھینچی کہ آخر ہو گئے
ہم تو کھوئے بھی گئے لیکن نہ تو پایا گیا

اک نگہ کرنے میں غارت کر دیا اے وائے ہم
دل جو ساری عمر کا اپنا تھا سرمایا گیا

کیا تعجب ہے جو کوئی دل زدہ ناگہ مرے
اضطراب عشق میں جی تن سے گھبرایا گیا

ماہ کہنے تو کہا اُس رخ کو خوش کلے ہے حریف
شہر میں پھر ہمسے اپنا مُنھ نہ دکھلایا گیا

جیسے پرچھائیں دکھائی دے کے ہو جاتی ہے محو
میر بھی اُس کام جاں کا وہیں تھا سایا گیا

ہم مستِ عشق جسکے تھے وہ روٹھ کر گیا
دیکھ اُسکو بید ماغ نشہ سب اُتر گیا

جاں بخشی اُسکے ہونٹھوں کی سُن آب زندگی
ایسا چھپا کہیں کہ کہا جانے مر گیا

کہتے ہیں میر کعبہ گیا ترکِ عشق کر
راہِ دل شکستہ کدھر وہ کدھر گیا

شاید جگر حرارتِ عشقی سے جل گیا
کل دردِ دل کہا سو مرا منھ اُبل گیا

بے یار حیف باغ میں دل ٹک بہل گیا
وے گل کو آگ چار طرف میں نہ جل گیا

اس آہو رمیدہ کی شوخی کہیں سو کیا
دکھلائی دے گیا تو چھلاوا سا چھل گیا

دن رات خوں کیا ہی کیے ہم جگر کو پھر
گر پھول گل سے کوئی گھڑی جی بہل گیا

تیور بدلنے سے تو نہیں اُسکے بے حواس
اندیشہ یہ ہے طور ہی اس کا بدل گیا

ہر چند میں نے شوق کو پنہاں کیا ولے
اک آدھ حرف پیار کا مُنھ سے نکل گیا

کرتے ہیں نذر ہم کہ نہ الفت کریں کہیں
گر دل ضعیف اب کے ہمارا سنبھل گیا

چلنے لگے تھے راہ طلب پر ہزار شکر
پہلے قدم ہی پاؤں ہمارا بچل گیا

میں وہ دلا تو آگے ہی تھا فرطِ شوق سے
طور اس کا دیکھ اور بھی کچھ دل دہل گیا

سر اب لگے جھکانے بہت خاک کی طرف
شاید کہ میر جی کا دماغی خلل گیا

عشق رسوائی طلب نے مجکو سرگرداں کیا
کیا خرابی سر پہ لایا صومعہ ویراں کیا

ہم سے تو جز مرگ کچھ تدبیر بن آتی نہیں
تم کہو کیا تم نے دردِ عشق کا درماں کیا

داخلِ دیوانگی ہی تھی ہماری عاشقی
یعنی اُس سودے میں ہمنے جان کا نقصاں کیا

شکر کیا اُس کی کریمی کا ادا بندے سے ہو
ایسی اک ناچیز مشتِ خاک کو انساں کیا

تیغ سی بھوویں جھکائیں برچھیاں سی وے مژہ
خون کا مجھ بے سروپا کے بلا ساماں کیا

ایک ہی انداز نے اُس کافرِ بے مہر کے
ساکنانِ کعبہ کو بے دین و بے ایماں کیا

لکھنؤ دلّی سے آیا یاں بھی رہتا ہے اُداس
میر کو سرگشتگی نے بے دل و حیراں کیا

دل سنبھالے کہیں ہیں کل جو چلا جاتا تھا
ضعف اتنا تھا کہے بات ڈھلا جاتا تھا

بیدماغی کا سماں دیکھنے کی کس کو تاب
آنکھیں ملتا تھا جو وہ جی ہی ملا جاتا تھا

سوزشِ دل کے سبب مرگ نہ تھی عاشق کی
اپنی غیرت میں وہ کچھ آپ ہی جلا جاتا تھا

ہلہلاوے ہے حقیری سے مجھے اب وہ بھی
جس کے کشتے سے نہ جاگہ سے ہلا جاتا تھا

میر کو واقعہ کیا جانیے کیا تھا درپیش
کہ طرف دشت کے جوں سیل چلا جاتا تھا

ترک لباس سے میرے اُسے کیا وہ رفتہ رعنائی کا
جامہ کا دامن پاؤں میں اُلجھا ہاتھ آنچل کلائی کا

پاس سے اُٹھ چلتا ہے وہ تو آپ میں رہتا ہی نہیں
لیجاتا ہے جا سے مجکو جانا اُس ہرجائی کا

حال نہ میرا دیکھے ہے نہ کہے سے تامل ہے اسکو
محو ہے وہ خودآرائی کا یا بیخود ہے خودرائی کا

ظاہر ہیں خورشید ہوا وہ نور اپنے پنہاں ہے
خالی نہیں ہے حسن سے چھپنا ایسے بھی پیدائی کا

یاد میں اُسکی قامت کی میں لوہو رو رو سوکھ گیا
آخر یہ خمیازہ کھینچا اُس خرچ بالائی کا

بعدِ مرگ چراغ نہ لادے گور پہ وہ عاشق کی آہ
جینے جی بھی داغ ہی تھا میں اُسکی بے پروائی کا

چشم وفا خوبانِ زماں سے سادہ ہو سو رکھے میر
قصہ ہے مشہور زمانہ پہلے دونوں بھائی کا

پھرے ہے وحشی سا گم گشتہ عشق کا تیرا
سبھوں سے پاتے ہیں بیگانہ آشنا تیرا

دریغ و درد تجھے کیوں ہے یاں تو جی ہی گئے
ہوا ہے ایک نگہ میں زیاں کیا تیرا

جہاں بھرا ہے ترے شورِ حسن و خوبی سے
لبوں پہ لوگوں کی ہے ذکر جابجا تیرا

نگاہ ایک ادھر ایک تیغ تیز کی اودھر
ہمارا خون ہی کرتا ہے مدّعا تیرا

نظر کنھوں نے نہ کی حال میرؔ پر افسوس
غریب شہر وفا تھا وہ خاکپا تیرا

صورت شیریں کے آگے کام اپنا کر گیا
عشق میں کس حسن سے فرہاد ظالم مر گیا

خانہ آبادی ہمیں بھی دل کی یوں ہے آرزو
جیسے جلوے سے ترے گھر آرسی کا بھر گیا

میرؔ سختی کش تھا غافل پر خدا نے خیر کی
حادثے کا کیسا اُسکے سر پہ سے پتھر گیا

گیا عشق سو پھر مجھے غم رہا
مژہ نم رہیں حال درہم رہا

ضعیف و قوی دونوں رہتے نہیں
نہ یاں زال ٹھہرا نہ رستم رہا

سحر جلوہ کیوں کر رہے گل ہو گیا
یہ اندیشہ ہر رات ہر دم رہا

ہوا غم مجھے خوں جگر میں نہیں
اگر آنسو آتے کوئی تھم رہا

رہی آئی آندھی سی سینے میں میرؔ
بہت دن تڑپنے کا اودھم رہا

مکّے گیا مدینے گیا کربلا گیا
جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آ گیا

دیکھا ہو کچھ اس آمد و شد میں تو میں کہوں
خود گم ہوا ہوں بات کی تہ اب جو پا گیا

کپڑے گلے کے میرے نہ ہوں آبدیدہ کیوں
مانند ابر دیدۂ تر اب تو چھا گیا

جاں سوز آہ و نالہ سمجھتا نہیں ہوں میں
یک شعلہ میرے دل سے اُٹھا تھا جلا گیا

وہ مجھ سے بھاگتا ہی پھرا کبر و ناز سے
جوں جوں نیاز کر کے میں اس سے لگا گیا

جور سپہر دوں سے برا حال تھا بہت
میں شرم ناکسی سے زمیں میں سما گیا

دیکھا جو راہ جاتے تبختر کے ساتھ اُسے
پھر مجھ شکستہ پا سے نہ اک دم رہا گیا

بیٹھا تو بوریے کے تئیں سر پہ رکھ کے میرؔ
صف کس ادب سے ہم فقرا کی اُٹھا گیا

عشق کی ہے بیماری ہم کو دل اپنا سب درد ہوا
رنگ بدن میت کے رنگوں جیتے جی ہی یہ زرد ہوا

تب بھی نہ سر کھینچا تھا ہم نے آخر مر کر خاک ہوئے
اب جو غبار ضعیف اُٹھا تھا پامالی میں گرد ہوا

عشق کیا کیا آفتیں لاتا رہا
آخر اب دوری ہی میں جی جاتا رہا

مہر و مہ گل پھول سب تھے پر ہمیں
چہرئی چہرہ ہی وہ بھاتا رہا

دل ہوا کب عشق کی رہ کا دلیل
میں تو خود گم ہی اُسے پاتا رہا

مُنھ دکھاتا برسوں وہ خوش رو نہیں
چاہ کا یوں کب تلک ناتا رہا

کچھ نہ میں سمجھا جنون و عشق میں
دیر ناصح مجھ کو سمجھاتا رہا

داغ تھا جو سر پہ میرے شمع ساں
پاؤں تک مجکو وہی کھاتا رہا

کیسے کیسے رُک گئے ہیں میر ہم
مدتوں منھ تک جگر آتا رہا

اوصافِ موے شعر سے الجھاؤ پڑ گیا
دانتوں کو سلکِ در جو کہا میں سو لڑ گیا

جیتے جی یہ ملا نہ رہا سو رہا غریب
جو دل شکستہ ساتھ سے اس کے بچھڑ گیا

کیا اُس کے دل جلے کی تمامی میں دیر ہو
جیسے چراغِ صبح شتابی نبڑ گیا

فرہاد پہلوان محبت پہاڑ تھا
بیطاقتی جو دل نے بہت کی پچھڑ گیا

گل رنگ رنگ شاخ پہ نکلا بہار میں
آنکھیں سی کھل گئی ہیں جو مرجھا کے جھڑ گیا

یاں حادثے کی باؤ سے ہر اک شجر حجر
کیسا ہی پائدار تھا آخر اُکھڑ گیا

شرماوے سرو ہووے اگر آدمی روش
وصف اُسکے قد کا میر سے سنکر اکڑ گیا

جان اپنا جو ہم نے مارا تھا
کچھ ہمارا اسی میں وارا تھا

کون لیتا تھا نام مجنوں کا
جب کہ عہدِ جنوں ہمارا تھا

کوہِ فرہاد سے کہیں آگے
سر مرا اور سنگِ خارا تھا

ہم تو تھے محو دوستی اُس کے
گو کہ دشمن جہان سارا تھا

لطف سے پوچھتا تھا ہر کوئی
جب تلک لطف کچھ تمہارا تھا

آستاں کی کسو کی خاک ہوا
آسماں کا بھی کیا ستارا تھا

پانوں چھاتی پہ میرے رکھ چلتا
یاں کبھو اسکا یوں گزارا تھا

موسم گل میں ہم نہ چھوٹے حیف
گشت تھا دید تھا نظارا تھا

اُسکی ابرو جو ٹک جھکی ادھر
قتل کا تیغ سے اشارا تھا

عشقبازی میں کیا موئے ہیں میر
آگے ہی جی اُنھوں نے ہارا تھا

خوب کیا جو اہلِ کرم کے جود کا کچھ نہ خیال کیا
روندے جور سے اُن نے ہمکو پاؤں حنائی اپنے کیے
نکلے ہے گر گھاس جلی بھی خاک سے الفت کشتوں کی
دل جو ہمارا خون ہوا تھا رنج و الم میں گزری ہمیں

ہم جو فقیر ہوئے تو ہم نے پہلے ہی ترک سوال کیا
خون ہمارا بسمل گہ میں کن رنگوں پامال کیا
یہ بالیدہ سپہر پھرے ہے گویا اُن نے نہال کیا
یعنی ماتم اس رفتہ کا ہم نے ماہ و سال کیا

میر سدا بیحال رہو ہو مہر و وفا سب کرتے ہیں
تم نے عشق کیا سو صاحب کیا یہ اپنا حال کیا

ہم کوئے مغاں میں تھے ماہ رمضاں آیا
گو قدرِ محبت میں تھی سہل مری لیکن
رسم اُٹھ گئی دنیا سے اکبار مروت کی
یہ نفع ہوا نقصاں چاہت میں کیا جی کا
بلبل بھی تو نالاں تھی پر سارے گلستاں میں
طائر کی بھی رہتی ہے پھر جان چمن ہی میں

صد شکر کہ مستی میں جانا نہ کہاں آیا
سنتا جو بکا میں تو مجکو بھی گراں آیا
کیا لوگ زمیں پر ہیں کیسا یہ سماں آیا
کی ایک نگہ اُن نے سو جی کا زیاں آیا
اک آگ بھڑکی میں جب سرگرم فغاں آیا
گل آئے جہاں وہ بھی جوں آبِ رواں آیا

خلوت ہی رہا کی ہے مجلس میں تو یوں اُس کی
ہوتا ہے جہاں یکجا میں میر جہاں آیا

خوں نہ ہوا دل چاہیے جیسا گو اب کام سے جا دے گا
کام اپنے وہ کیا آیا جو کام ہمارے آوے گا
آنکھیں لگی رہتی ہیں اکثر چاکِ قفس سے اسیروں کی
جھونکا بادِ بہاری کا گلبرگ کوئی یاں لاوے گا
فتنے کتنے جمع ہوئے ہیں زلف و خال و خد و قد
کوئی نہ کوئی عہد میں میرے سر ان میں سے اُٹھاویگا
عشق میں تیرے کیا کیا شکر یار گئے گر جاتے ہیں
یعنی غم کھاتے ہیں بہت ہم غم بھی ہمکو کھا دے گا
ایک نگہ کی اُمید بھی اُسکی چشمِ شوخ سے ہمکو نہیں

ایدھر اودھر دیکھے گا پر ہم سے آنکھ چھپاوے گا
اب تو جوانی کا یہ نشہ ہے بیخود تجکو رکھے گا
ہوش گیا پھر آوے گا تو دیر تلک پچھتاوے گا

دیر سے اس اندیشہ نے ناکام رکھا ہے میر ہمیں
پانوں چھوئیں گے اس کے ہم تو وہ بھی ہاتھ لگاویگا

بہار آئی چلو چمن میں ہوا کے اوپر بھی رنگ آیا
کہاں تلک گل نہ ہووے غنچہ رہا مندے منہ سو تنگ آیا
چلے ہیں مونڈھے پھٹی ہے کہنی جیبی ہے چولی بھنسی ہے مہری
قیامت اس کی ہے تنگ پوشی ہمارا جی تو بہ تنگ آیا

وہی ہے رونا وہی ہے کڑھنا وہی ہے سوزش جوانی کی سی
بڑھاپا آیا ہے عشق ہی میں پہ میر ہمکو نہ ڈھنگ آیا

دل کو کہیں لگنے دو میرے کیا کیا رنگ دکھاؤں گا
چہرے سے خون ناب ملوں گا پھولوں سے گل کھاؤنگا
عہد کیے جاؤں ہوں ابکی آخر مجکو غیرت ہے
تو بھی منانے آوے گا تو ساتھ نہ تیرے آؤنگا
گرچہ نصیحت سب ضایع ہے لیکن خاطر ناصح کی
دل دیوانہ کیا سمجھے گا اور بھی میں سمجھاؤنگا
جھکے سلام کسو کو کرنا سجدہ ہی ہو جاتا ہے
سر جاوے گو اس میں میرا سر نہ فرو میں لاؤں گا
سر ہی سے سر واہ یہ سب ہے ہجر کی اسکی کلفت میں
سر کو کاٹ کے ہاتھ پہ رکھ کے آپ ہی ملنے جاؤنگا
خاک ملا منہ خون آنکھوں میں چاک گریباں تا دامن
صورت حال اب اپنی اس کے خاطر خواہ بناؤنگا

دل کے تئیں اس راہ میں کھو افسوس کناں اب پھرتا ہوں
یعنی رفیق و شفیق پھر ایسے میر کہاں میں پاؤں گا

اگرچہ جہاں میں نے سب چھان مارا ولے اسکی نایابی نے جان مارا
قیامت کو جرمانہ شاعری پر مرے سر سے میرا ہی دیوان مارا
رہائی ہے اس صید افگن سے مشکل گیا سانجھ تو صبح پھر آن مارا
لگا آتشیں نالہ شب اپنے دل کو اس انداز سے جیسے اک بان مارا

قیامت کا عرصہ ہوا اے میر درہم
مرے شور و زاری نے میدان مارا

جگر خوں کیا چشم نم کر گیا گیا دل سو ہم پر ستم کر گیا
ان آنکھوں کو نرگس لکھا تھا کہیں مرے ہاتھ دونوں قلم کر گیا
شب اِک شعلہ دل سے ہوا تھا بلند تنِ زار میرا بھسم کر گیا
مرے مزرعِ زرد پر شکر ہے کل اک ابر آیا کرم کر گیا
نہ اک یار وعدہ وفا کر سکا بہت بار قول و قسم کر گیا
فقیری میں تھا شیب بارِ گراں قدِ راست کو اپنے خم کر گیا

بکائے شب و روز اب چھوڑ میر
نواحِ آنکھوں کا تو ورم کر گیا

یاری کیے کسو کا ہمکو نام نکلا ناکام عشق تب تو عاشق کا نام نکلا
ہنگامے سے جہاں میں ہمنے جنوں کیا ہے ہم جسطرف سے نکلے ساتھ اژدحام نکلا
پامالی خطر سے نکلا نہ کبک اودھر جیدھر سے ناز کرتا وہ خوش خرام نکلا
جنگِ زمانہ میں تو مبحث ہی عشق ہی کا بیجا ہوا دل اپنا جب وہ مقام نکلا

جانا تھا ہمنے تو پختہ مغز ہوگا
دیکھا تو میر تیرا سودا بھی خام نکلا

لے ہمسے کچھ نہ اس ستم ایجاد سے ہوا ظلم صریح عشق کی امداد سے ہوا
شیریں کا حسن ایسا تھا جو خستہ جان ہیں جو کچھ ہوا سو خواہش فرہاد سے ہوا

خوش زمزمہ طیور ہی ہوتے ہیں میر اسیر
ہم پر ستم یہ صبح کی فریاد سے ہوا

زار کیا بیمار کیا اس دل نے کیا آزار کیا داغ سے تن گلزار کیا سب آنکھوں کو خونبار کیا

جرم ہے ہم الفت کشتوں کا لگ پڑنے سے شوخ ہوا
چاہا ہمنے کیا کیا تھا پر اپنا چاہا کچھ نہ ہوا
بیٹھ گئی کب بیٹھ زمانہ طبع خشن پر کس کس کے
اب کہتے ہیں دل میں اپنے ہمنے اسے کیوں پیار کیا
عزت کھوئی ذلت کھینچی عشق نے خوار و زار کیا
اک گردش میں سپہر نے جیسے سطح زمیں ہموار کیا

سادگی میری نے آہ نہ جانا جی ہی اس میں جاتا ہے
عشق کا اُس پُرکار کے میں نے لوگوں میں اصرار کیا

سینے کا سوز بہت بھڑکا جلا تن مارا
صورت اُسکی مری کھینچی تھی گلے لگتے ہوئے
جامہ زیبوں نے غضب آگ پہ دامن مارا
سو جفا کار نے نقاش کو گردن مارا

دل ہی میں خون ہوئی وصل کی خواہش اے میر
ہم نے آزادگی ہجر سے کیا من مارا

پیری میں بے دنداں ہو بیٹھے پر افسوس یہ ہمکو رہا
کیا روداد کہیں ہم اپنی گریہ و زار محبت کی
دانت تمہارے منہ میں کے ہیں اس مغرور نے یوں نہ کہا
رونا سا کوئی روئے ہیں آنکھوں سے اک رود بہا

صبر مرا سا ہجر میں پر ہو نہ سکے گا انساں سے
جور و جفا و ستم جو گزرے سب کچھ میں نے میر سہا

چاہت کیا اظہار کیا سو اپنا کام خراب ہوا
ساری ساری راتیں جاگے عجز و نیاز و زاری کی
کیا کہیے مہتاب میں شب کی وہ بھی ٹک آ بیٹھا تھا
شمع جو آگے شام کو آئی رشک سے جل کر خاک ہوئی
اس پردے کے اُٹھ جانے سے اُسکو ہمسے حجاب ہوا
تب جا کر ملنے کا اُسکے صبح کے ہوتے جواب ہوا
تاب رخ اس مہ نے دیکھی سو درجے بیتاب ہوا
صبح گل تر سامنے ہو کر جوشش شرم سے آب ہوا

مرتے نہ تھے ہم عشق کے رفتہ بے کفنی سے یعنی میر
دیر میسر اس عالم میں مرنے کا اسباب ہوا

تھا محبت سے کبھو ہم میں کبھو یہ غم میں تھا
کیا ہوا پہلو سے دل کیا جانوں کیا جانوں ہو نہیں
دل کا ہنگامہ قیامت خاک کے عالم میں تھا
ایک قطرہ خوں چھلکتا صبح چشم نم میں تھا

میر گزرے دونوں یاں عید و محرم ایک سے
یعنی دس دن جینے کے بیں بینے ہی ماتم میں تھا

وفاداری نے جی مارا ہمارا
چڑھی تیوری کبھو اُسکی نہ اُتری
اسی میں ہو گا کچھ وارا ہمارا
غضب ہے قہر ہے پیارا ہمارا

رہا افسوس آنکھیں تر ہوئیں تو — کہ آنسو تھا جگر پارا ہمارا
نہ بارے یاوری طالع نے کچھ کی — گیا بے یار سے یارا ہمارا

گلہ لب تک نہ آیا میر ہرگز
کھپا جی ہی میں غم سارا ہمارا

ردیف بائے موحّدہ

ہوا جو دل خوں خرابی آئی ہر ایک اعضا میں ہے فتور اب
حواس گم ہیں دماغ گم ہے رہا سہا بھی گیا شعور اب
مریں گے غائب ہزاریوں تو نظر میں ہرگز نہ لاوے گا تو
کرینگے ضایع ہم آپ ہی کو تبنگ ہو کر ترے حضور اب

وجوب و امکاں میں کیا ہے نسبت کہ میر بندے کا بیش صاحب
نہیں ہے ہونا ضرور کچھ تو مجھے بھی ہونا ہے کیا ضرور اب

کیا گئی جان و دل سے تاب شتاب — آنسو آتے ہیں اب شتاب شتاب
ہلنگی وے پلکیں اور کبھو رخنے — حال دل ہو گیا خراب شتاب
یوں صبا بھی سبک نہیں جاتی — جوں گیا موسم شباب شتاب
پیر ہو کر ہوا ہوں یوں غافل — جیسے لڑکوں کو آوے خواب شتاب
مرتے ہیں ہو جواب نامہ وہی — آوے خط کا اگر جواب شتاب
مہربانی تو دیر میں ہے کبھو — ہے دل آزاری و عتاب شتاب

یاں قدم چاہیئے رکھیں گن کر
میر لے ہے کوئی حساب شتاب

بیگار بھی درکار ہیں سرکار میں صاحب — آتے ہیں تجھے ہم کبھی بیگار میں صاحب
محروم نہ رہ جائیں کہیں بعد فنا بھی — شبہہ ہے ہمیں یار کے دیدار میں صاحب
لیتی ہے ہوا رنگ سراپا سے تمہارے — معلوم نہیں ہوتے ہو گلزار میں صاحب
رہتا تھا سر زلف بھی زیر گلہ آگے — سو بال اگر سن نکلے ہیں دستار میں صاحب
ہے چار طرف شور مری بے خبری کا — کیا کیا خبریں آتی ہیں اخبار میں صاحب

گو فہم نہ ہو کفر کی اسلام کی نسبت
رشتہ ہے عجب سبحۂ و زنّار میں صاحب

یا گفتگو کا میری نہ کرتے تھے کبھو ذکر
یا ہر سخن اب آوے ہے تکرار میں صاحب

طالع سے زلیخا نے لیا مصر میں یوسف
کب ایسا غلام آوے ہے بازار میں صاحب

رکھتی ہے لکھا ساتھ مٹا دینے کا میرے
جوہر نہیں ہے آپکی تلوار میں صاحب

یہ عرض مری یاد رہے بندگی میں میر
جی بچتے نہیں عشق کے اظہار میں صاحب

درد سر کا پہر پہر ہے اب
زندگانی ہے درد سر ہے اب

وہ دماغِ ضعیف ہی نہ رہا
بیدماغی ہی بیشتر ہے اب

کیا ہمیں ہم تو ہو چلے ٹھنڈے
گرم گو یار کی خبر ہے اب

کیا کہیں حال خاطرِ آشفتہ
دل خدا جانیے کدھر ہے اب

عزلتی میر جوں صبا اُس بن
خاک بر سر ہے دربدر ہے اب

جوش رونے کا مجھے آیا ہے اب
دیدۂ تر ابر سا چھایا ہے اب

ٹیڑھے بانکے سیدھے سب ہو جائینگے
اُس کے بالوں بھی بل کھایا ہے اب

ہوں بیخود تو کوئی پہونچے مجھ تلک
بیخودی نے حال پہونچایا ہے اب

کاشکے ہو جائے سینہ چاک چاک
رُکتے رُکتے جی بھی گھبرایا ہے اب

راہ پر وہ کیونکہ آوے مستِ ناز
دشمنوں نے اُسکو بہکایا ہے اب

کیا جییں گے داغ ہو کر خوں ہوا
زندگی کا دل جو سرمایا ہے اب

میر شاید کعبے ہی میں رہ پڑے
دیر سے تو یاں خدا لایا ہے اب

کیا کریں تدبیر دل مقدور سے باہر ہے اب
نا اُمید اس زندگانی کرنے سے اکثر ہے اب

جن دنوں ہم کافروں سے ربط تھا وے کیو چلے
وہ بتِ بیمہر اپنی اور سے پتھر ہے اب

دور تک رسوا ہوا ہوں شہروں شہروں ملک ملک
میرے شعر و شاعری کا تذکرہ گھر گھر ہے اب

وہ طبیعت ہی نہیں ہے میری اے مشفق طبیب
کر دوا جو طبع میں آوے ترے بہتر ہے اب

بیخود اُس مست ادا و ناز بن رہتے ہیں ہم
عالم اپنا دیکھیے تو عالمِ دیگر ہے اب

وہ سپاہی پیشہ لوگوں ہی میں رہتا ہے کھڑا
گرد پیش اُس دشمن احباب کے لشکر ہے اب

گفتگو انسان سے محشر میں ہے یعنی کہ میر
سارا ہنگامہ قیامت کا مرے سر پر ہے اب

خلاف وعدہ بہت ہوئے ہو کوئی تو وعدہ وفا کرو اب
ملا کے آنکھیں دروغ کہنا کہاں تلک کچھ حیا کرو اب

خیال رکھیے نہ سرکشی کا سُنو ہو صاحب کہ پیری آئی
خمیدہ قامت بہت ہوا ہے جھکائے ہی سر رہا کرو اب

کہاں ہے طاقت جو میر کا دل سب ان بلاؤں کی تاب لاوے
کرشمے غمزے کو ناز سے ٹک ہمارے خاطر جدا کرو اب

یار میرا بہت ہے یار فریب
مکر ہے عہد سب قرار فریب

راہ رکھتے ہیں اُس کے دام سے صید
ہے بلا کوئی وہ شکار فریب

عہدے سے نکلیں کس طرح عاشق
اِک ادا اُس کی ہے ہزار فریب

التفات زمانہ پر مت جا
میر دیتا ہے روزگار فریب

کوئی اپنا نہ یار ہے نہ حبیب
اس ستمگر کے ہم ہیں شہر غریب

سر رگڑتے اس آستاں پر میر
یاری کرتے اگر ہمارے نصیب

ردیف تائے فوقانی

جب سے آنکھیں لگی ہیں ہماری نیند نہیں آتی ہے رات
تکتے راہ رہے ہیں دن کو آنکھوں میں جاتی ہے رات

سخت ہیں کیا ایام جدائی دشواری سے کٹتے ہیں
دن دیواروں سے سر ماروں ہوں پتھر ہے چھاتی ہے رات

جوں دن ہجر کے غم میں اُس کے شام و سحر ہم کرتے ہیں
ورنہ کسے دن خوش آتا ہے کسکے تئیں بھاتی ہے رات

رات کو جس میں چین سے سوویں سو تو اُس کی جدائی میں
شمع نمط جلتے رہتے ہیں اور ہمیں کھاتی ہے رات

روز و شب کی اپنی معیشت نقل کریں کیا تم سے میر
دن کو قیامت جی پہ رہے ہے سر پہ بلا لاتی ہے رات

دیر کب رہنا ملے ہے یاں نہیں مہلت بہت
دے کسے فرصت سپہرِ دوں ہے کم فرصت بہت

کم نہیں دیوانہ ہوتا بھی ہمارا دفعتہً
ڈر ہے ٹک ہو جاوے خردور کی جو بیٹھے مست بہت

گریۂ وزاری سے روز و شب کے شکوے کچھ نہیں
مجکو رونا ہے یہ جی کو اس سے ہے اُلفت بہت

کیا وداع اس یار کے کوچہ سے ہم مشکل ہوئے
زار یاراں لوگ روتے تھے دمِ رخصت بہت

بعد مرگ آنکھیں کھلی رہنے سے یہ جانا گیا
دیکھنے کی میرے اُسکے جی میں تھی حسرت بہت

سُنکے ضایع روزگاری اُسکی جی لایا نہ تاب
آپ کو کر بیٹھے ضایع ہمکو تھی حسرت بہت

آنکھیں جاتی ہیں مندی ضعفِ دلی سے دمبدم
اندنوں ان کو بھی ادھر ہی سے ہے غفلت بہت

دل گئے پر آجکل سے چپ نہیں مجھکو لگی
گذری اس بھی بات کو اے ہمنفس مدت بہت

دل میں جا کرتا ہے طور میر شاید دوستاں
اُن نے صاحبدل کسو سے رکھی ہے صحبت بہت

چشم رہنے لگی پُر آب بہت
شاید آوے گا خونِ ناب بہت

دیر و کعبے میں اُس کے خواہشمند
ہوتے پھرتے ہیں ہم خراب بہت

دل کے دل ہی میں رہ گئے ارمان
کم رہا موسمِ شباب بہت

مارنا عاشقوں کا گر ہے ثواب
تو ہوا ہے تمھیں ثواب بہت

کہیے بے پردہ کیونکہ عاشق ہیں
ہمکو لوگوں سے ہے حجاب بہت

میر بیخود ہیں اس جناب سے اب
چاہیئے سب کو اجتناب بہت

دل نے کام کیے ہیں ضایع دلبر ہے دلخواہ بہت
قدر بہت ہی کم ہے دل کی پر دل میں ہے چاہ بہت

راہ کی بات سُنی بھی ہے تو جانا حرفِ غریب اُس کو
خوبی پر اپنی حُسن پر اپنے پھرتا ہے گمراہ بہت

حیرانی ہے کیونکر ہووے نسبت اپنی اُس سے درست
بندہ تو ہے عاجز عاجز اُس کو غرور اللہ بہت

شوق کا خط طومار ہوا تھا ہاتھ میں لے کر کھولا جب
کہنے لگا کیا کریے لکھے ہے اب تو نامہ سیاہ بہت

سب کہتے ہیں ردِ توجہ ایدھر کرنے کہتا تھا
شاید یوں بھی ظاہر ہووے ہے تو سہی افواہ بہت

اب تو ہے پیری حضرت ہو کر ایک کنارے بیٹھے ہیں
جب تھی جوانی تب تو ہم بھی جاتے تھے درگاہ بہت

کیا گزری ہے جی پہ تمھارے ہم سے تو کچھ میر کہو
آنے لگی ہے دردوالم سے صاحب لب پہ آہ بہت

کرتا ہے گرچہ یاروں سے وہ ٹیڑھی بانکی بات
پر کیا ہی دل کو لگتی ہے اُس بدزباں کی بات

تھی ہجر کی سی لہر کہ آئی چلی گئی
پہونچی ہے اس سرے تئیں طبع رواں کی بات

اب تو وفا و مہر کا مذکور ہی نہیں
تم کس سمیں کی کہتے ہو یہ ہے کہاں کی بات

مرغِ اسیر کہتے تھے کس حسرتوں سے ہائے
ہم بھی کبھی سنیں گے گلوں کے دہاں کی بات

شب باش اُن نے کہتے ہیں آنے کہا ہے میر
دن اچھے ہوں تو یہ بھی ہو اس مہرباں کی بات

ردیف ثائے مثلثہ

نہیں گر چوٹ دل پر گریہ و زاری کا کیا باعث
رگیں کا ہیکو چشمِ تر کی خونباری کا کیا باعث

ہوئے تختے چمن کے چھاتیاں سے عشق داغوں سے
بہار آنے سے آگے ایسی گلکاری کا کیا باعث

تماشہ ہے کہ اکثر نرگسی زن رہتے ہو ہم پر
ہمیں سے پوچھو تو پھر میر بیماری کا کیا باعث

عہد اُس کا غلط قرار عبث
دل ہمارا ہے بیقرار عبث

ہم گلا کاٹتے ہی تھے اپنا
تو گلے کا ہوا ہے ہار عبث

لوہو رونے سے سب نچوڑ لیا
اب پیے خون روزگار عبث

آہ وہ کس قدر ہے مستغنی
لوگ مر چکے ہوئے شکار عبث

ہم تو آگے ہی مر رہے ہیں میر
تیغ کھینچے پھرے ہے یار عبث

ردیف جیم عربی

حال بُرا ہے تمکو ہم سے اتنی غفلت کیا ہے آج
کوئی گھڑی تو پاس ہو یاں پھر فرصت کیا ہے آج

سامنے ہے وہ آئینہ پر آنکھ نہیں کھل سکتی ہے
دلتگی سے رُک کے ہے دم کیا کہیے صورت کیا ہے آج

فرق و تیغ جٹے رہتے ہیں جیسے دل کی لاگ لگی
اُس ظالم بیرحم کی میری ایسی صحبت کیا ہے آج

شیشہ صراحی ساغر و مینا سب کل تک بھی حاضر تھے
کوئے بادہ فروشاں میں میری حرمت کیا ہے آج

میر کھڑے اک ساعت ہی میں غش تم کرنے لگتے ہو
تاب نہیں کیا ضعف ہے دل میں جی بیطاقت کیا ہے آج

ہم تو لب خوش رنگ کو اُس کے مانا لعل احمر آج
اور غرور سے اُن نے ہم کو جانا کنکر پتھر آج

عشق کے جو سرگشتہ ہوئے ہم رفتہ رفتہ دوا رہوا
پانوں میں چکر ہوتا ہے یاں سر کو بھی ہے چکر آج

عرش پہ دھونی لگانے کو تھے دو دو دل سے کب تک ہم
خاک پہ یاں کی درویشانہ ہم نے بچھایا بستر آج

جینے سے ہم غم کشتوں کی خاطر تم بھی جمع کرو
کل تک کام نہیں کھنچنے کا غش آتا ہے اکثر آج

ملکوں ملکوں شہروں شہروں قریہ قصبہ دیہہ و دیار
شعر و بیت و غزل پر اپنے ہنگامہ ہے گھر گھر آج

خط سے آگے مہر و وفا کا دعوی سب کچھ صادق تھا
جامۂ مصحف گو پہنے وہ کون کرے ہے باور آج

دیدہ و دل بھی اُس کے جانب میلِ کلّی رکھتے ہیں
عشق میں ہم بیکس ہیں واقع یار نہیں ہے یاور آج

عشق کیا ہو ہم نے کہیں تو عشق ہمارا جی مارے
یوں نہیں نکو رو دلبر اپنا ہم سے ہوا ہے بدتر آج

رحم کی جا گہ کی ہے پیدا شاید اُس کے دل میں بھی
دیکھ رہا ہے مُنھ کو ہمارے حال ہمارا سُن کر آج

کل کہتے ہیں ہو گی قیامت کل کی کل ہیں لینگے دیکھ
یاں تو قیامت عشق میں اس کے ہو گئی اپنے سر پر آج

کرتی ہے بو زلف معنبر آئے ہو بیخود سے پھر
بارے مزاج شریف تمھارا میر گیا کیدھر ہے آج

ردیف جیم فارسی

آ گئے تو رسم دوستی کی تھی جہاں کے بیچ
اب کیسے لوگ آئے زمین آسماں کے بیچ

میں بیدماغ عشق اُٹھا سو چلا گیا
بلبل پکارتی ہی رہی گلستاں کے بیچ

تحریک چلنے کی ہے جو دیکھو نگاہ کر
ہیئت کسو اپنی موجوں میں آبِ رواں کے بیچ

کیا میل ہو ہما کو پس از مرگ میری اور
ہے جائے گیر عشق کی تب اُستخواں کے بیچ

کیا جانوں لوگ کہتے ہیں کس کو سرورِ قلب
آیا نہیں یہ لفظ تو ہندی زباں کے بیچ

طالع سے بنگئی کہ ہم اس مہ کنے گئے
بگڑی ہی تھی رات اُس کے سگِ پاسباں کے بیچ

اتنی جبین رگڑی کہ سنگ آئینہ ہوا
آنے لگا ہے مُنھ نظر اس آستاں کے بیچ

خوگر ہوئے ہیں عشق کی گرمی سے خار و خس
بجلی پڑی رہے ہے مرے آشیاں کے بیچ

اُس رو سے برفروختہ ہی سے ڈرے ہے میر
یہ آگ جا لگے گی کسی دودماں کے بیچ

صورت پھرے نہ یار کی کیوں چشمِ تر کے بیچ
تاثیر ہے گی اہلِ وفا کی ہنر کے بیچ

خوش سیرتی ہے جس سے کہ ہوتا ہے اعتبار
ہے چوبِ خشک بو جو نہ ہو وے اگر کے بیچ

اُس کے سمندِ ناز کا پامال تو رہوں
اے کاش میری گور کریں رہگذر کے بیچ

مُنھ اُس کا دیکھ رہیے کہ رفتارِ ناز کو
سر تا قدم ہے لطف ہی اُس خوش پسر کے بیچ

ہر دانہ سرشک میں تارِ نگاہ ہے
اس رشتہ کی روش کہ جو ہو وے گہر کے بیچ

کیا دل کو خوں کیا کہ تڑپنے لگا جگر
یکتائے روزگار ہیں ہم اس ہنر کے بیچ

ایسا ہوا ہے قیمہ کہ اب ہے حساب پاک
کہیے جو کچھ بھی باقی ہو اپنے جگر کے بیچ

ہے اپنے خانوادے میں اپنا ہی شور میر
بلبل بھی ایک ہی بولنا ہوتا ہے گھر کے بیچ

رنج کیا کیا ہم نے کھینچے دوستی یاری کے بیچ
کیا ہوئی تقصیر اسکی نازبرداری کے بیچ

دوش و آغوش و گریباں دامنِ گلچیں ہوئے
گلفشانی کر رہی ہے چشم خونباری کے بیچ

ایک کو اندیشۂ کار ایک کو ہے فکرِ یار
لگ رہے ہیں لوگ سب چلنے کی تیاری کے بیچ

منتظر تو رہتے رہتے پھر گئیں آنکھیں نہاں
وہ نہ آیا دیکھنے ہم کو تو بیماری کے بیچ

جان کو قید عناصر سے نہیں ہے وارہی
تنگ آئے ہیں بہت اس چاردیواری کے بیچ

روتے ہی گزری ہمیں ہے شب نشینی باغ کی
اوس سی پڑتی رہی ہے رات ہر کیاری کے بیچ

یاد پڑتا ہے جوانی تھی کہ آئی رفتگی
ہو گیا ہوں میں تو مستِ عشق ہشیاری کے بیچ

ایک ہو ویں جو زبان و دل تو کچھ نکلے بھی کام
یوں اثر اے میر کیا ہو گریہ و زاری کے بیچ

گل منفعل ہوئے ہیں بہت آبجو کے بیچ
جائے شراب پانی بھریں گے سبو کے بیچ

ستھراؤ کر دیا ہے تمنائے وصل نے
کیا کیا عزیز مر گئے اس آرزو کے بیچ

بحث آپڑی جو لب سے تمھارے تو چپ رہو
کچھ بولنا نہیں تمھیں اس گفتگو کے بیچ

ہم ہیں قلندر آکر اگر دل سے دم بھریں
عالم کا آئینہ ہے سیہ ایک ہو کے بیچ

گل کی تو بو سے غش نہیں آتا کسو کے تئیں
ہے فرق میر پھول کے اور اسکی بو کے بیچ

ردیف حائے حطی

کیا ہم بیاں کسو سے کریں اپنی بانکی طرح
کی عشق نے خرابی سے اس خانداں کی طرح

جوں سبزہ چل چمن میں لبِ جو پہ سیر کر
عمرِ عزیز جاتی ہے آبِ رواں کی طرح

ہو سقف بے عمد ہو نہیں اس کا اعتماد
کس خانماں خراب نے کی آسماں کی طرح

اثباتِ بے ثباتی ہوا ہوتا آگے تو
کیوں اس چمن میں ڈالتے ہم آشیاں کی طرح

اب کہتے ہیں بلا ہے کشاکش تیر گی
قد جو ہوا ہمارا خمیدہ کماں کی طرح

نقصانِ جاں صریح تھا سودے میں عشق کے
ہم جان کر نکالی ہے جی کے زیاں کی طرح

دل کو جو خوب دیکھا تو ہوگا مکان بھی
ہے اس مکاں میں ساری ہی لا مکاں کی طرح

کل دیکھ آفتاب کو رویا ہوں دیر تک
غصے میں ایسی ہی تھی مرے مہرباں کی طرح

جاوے گا اپنی بھول طرحداری میر وہ
کچھ اور ہو گئی جو کسو ناتواں کی طرح

مر گیا فرہاد جیسے مرتے یارے اس طرح
سر کوئی پتھر سے مارے بھی تو مارے اسطرح

ٹکڑے ٹکڑے کر دکھایا میں نے انکو اسلیے
یعنی جی مارا کرو آئندہ پیارے اسطرح

مست و بیخود ہر طرف پھروں پھرا کرتے ہو کم
حیف ہے آتے نہیں ٹک گھر ہمارے اسطرح

عشق کی کہیئے طرح کیا وامق و فرہاد و قیس
بیکسانہ مر گئے وے لوگ سارے اسطرح

جو عرق تحریک میں اُس رشک مہ کے منہ پہ ہو
میر کب ہووے ہیں گرم جلوہ تارے اسطرح

پہونچے ہے ہم کو عشق میں آزار ہر طرح
ہوتے ہیں ہم ستم زدہ بیمار ہر طرح

ترکیب و طرح ناز و ادا سب سے دل لگے
اُس طرحدار کے ہیں گرفتار ہر طرح

یوسف کی اس نظیر سے دل کو نہ جمع رکھ
ایسی متاع جاتی ہے بازار ہر طرح

جسطرح میں دکھائی دیا اُس سے لگ پڑے
ہم کشتنی و خوں کے ہیں سزاوار ہر طرح

چھپ لگ کے بام و در سے گلی کوچے میں سے میر
میں دیکھ لوں ہوں یار کو اک بار ہر طرح

ردیف خائے معجمہ

ہے میرے جو سرشکِ دمادم کا رنگ سُرخ
ریزش کا اُس کے تختہ ہے سینے کا سنگ سُرخ

ردیف دال مہملہ

زردی عشق سے ہے تنِ زار بد نمود
اب میں ہوں جیسے دیر کا بیمار بد نمود

بے برگی بے نوائی سے ہیں عشق میں نزار
پائیز دیدہ جیسے ہوں اشجار بد نمود

ہر چند خوب تجھکو بنایا خدا نے لیک
اے ناز پیشہ کبر ہے بسیار بد نمود

ہیں خوشنما جو سہل مریں ہم و لے ترا
خونریزی میں ہماری ہے اصرار بد نمود

پوشیدہ رکھنا عشق کا اچھا تھا حیف میر
سمجھا نہ میں کہ اس کا ہے اظہار بد نمود

کب سے ہے باغ کے پس دیوار باش و بود
مشکل کریں ہیں جیسے گرفتار باش و بود

دنیا میں اپنے رہنے کا کیا طور ہم کہیں
زنداں میں جیسے کریں ہیں گنہگار باش و بود

بے یار کس کا جینے کو جی چاہتا ہے میر
کرتے ہیں ہم ستمزدہ ناچار باش و بود

جاوے جدائی کا یہ آزار گاہ باشد
اچھا بھی ہووے دل کا آزار گاہ باشد

امیدوار اسکے ملنے کے جیسے ہم ہیں
آ نکلے ناز کرتا یاں یار گاہ باشد

گو قدر دل کی کم ہے پر چیز کام کی ہے
لے تو رکھیں تجھیں ہو در کار گاہ باشد

کہتا ہوں سو کرے ہے لیکن نہ ہوں ہوں تڑتا
آوے کسو سخن پر تکرار گاہ باشد

کہتے تو ہیں گئے سو کب آئے کیا کریں تب
جو خواب مرگ سے ہوں بیدار گاہ باشد

غصے سے اپنے ابرو جو خم کرے ہے ہر دم
وہ اک لگا بھی بیٹھے تلوار گاہ باشد

غیرت سے عشق کے ڈر کیا شیخ و گبر دینی
تسبیح کا ہو رشتہ زنار گاہ باشد

وحشت پہ میری مت جا غیرت بہت ہے تجکو
ہو بیٹھوں مرنے کو بھی تیار گا

ہے ضبط عشق مشکل ہوتا نہیں کسو سوں ہیں آیا درد و غم سے رو رو کر
ڈر میر بھی ہوا اس کا اظہار گو صحراؤں میں یوں ہی وقت کو اب کھو کر

تن کو جس جاگہ سے چھیڑوں ہوں ہاں ہی درد درد
ہاتھ لگتے داز کناں دامن کو لگا کر تم ٹھو کر

اب تو وہ حسرت سے آہ و نالہ کرتا ہے تیغ ستم کی جلد لگا کر تو دو کر
کوئی دم ہونٹھوں تک آجاتا ہے گا ہے پیچھے سے

اسکی دوری میں کڑھا کرتے ہیں ہم سب سے زیادہ
جی گیا آخر ہے سو کر

چھاتی پھٹ جاتی جو یوں رک کر نہ کرتا ترک حشم
گزرے اسے تجھ کہیں ہم تجکو عتاب کر کر

خوف کر عاشق کے سر کٹنے کی قطعی ہے دلیل
ہو جہاں شمشیر [illegible] نامہ بر کا کھایا کباب کر کر

کچھ بھی نزدیک اسکے ٹھہرا ہو تو دیکھے بھر نظر
قدر ہے عاشق [illegible] دیکھو ان نے مار خراب کر کر

پاس اسکے دم بخود پھروں تھے سو طاقت کہاں
بات کہتے میر اب کرتے ہیں رم حد سے زیاد

شعر دیواں کے میرے کر کر یاد — مجنوں کہنے لگا کہ ہاں استاد
خود کو عشق بتاں میں بھول نہ جا — متوکل ہو کر خدا کو یاد
سب طرف کرتے ہیں نکویاں کی — کس سے جا کر کوئی کرے فریاد
وحشی اب گرد باد سے ہم ہیں — عمر افسوس کیا گئی برباد

چار دیواری عناصر میر
خوب جاگہ ہے پر ہے بے بنیاد

ردیف ذال معجمہ

درویشی کی جو سوختگی ہے سو بھی ہے لذیذ — نان و نمک ہے داغ کا بھی ایک شئے لذیذ

ردیف رائے مہملہ

مت اس چمن میں غنچہ روش بود و باش کر — مانند گل شگفتہ جبیں یاں معاش کر
دل رکھ قوی فلک کی زبردستی پر نہ جا — گر کشتی لگ گئی ہے تو تو بھی تلاش کر
ہے کیا تو جیسے [illegible] ہے مٹھی کہ جا چلا — مت گل کے رنگ منہ کو کھلا راز فاش کر
یہ نہیں ہے سینہ کوبی اگر جا ہے دل کی داد — پیشانی کو سلیقے سے دکھلا خراش کر

پھرتا ہے کیا تو میر گلستاں میں غم زدہ
کچھ دل خراش لکھ بھی قلم اک تراش کر

مرتے ہیں ہم تو آدم خاکی کی شان پر — اللہ رے دماغ کہ ہے آسمان پر
حیرکت تھا دل میں لالہ رخوں کے خیال سے — کیا کیا بہاریں دیکھی گئیں اس مکان پر
عرصہ ہے تنگ صدر نشینوں پہ شکر ہے — بیٹھے اگر تو جا کے کسو آستان پر
آفات میں ہے مرغ چمن گل کے شوق سے — جوکھوں ہزار رنگ کی رہتی ہے جان پر
اس کام جاں کے جلووں کا میں ہی نہیں ہلاک — آفت عجب طرح کی ہے سارے جہان پر
جاتے تو ہیں پہ خواہش دل ہوتی ہے نہ ہی — پھر بھی ہمیں نظر نہیں جی کے زبان پر

تقدیس دل تو دیکھ ہوئی جسکو اُس سے راہ
سر دیں ہیں لوگ اُس کے قدم کے نشان پر
انداز و ناز اتنے اُس اوباش کے ہیں قہر
سو سو جوان مرتے ہیں ایک ایک آن پر

شوخی تو دیکھو آپ ہی کہا آؤ بیٹھو میر
پوچھا کہاں تو بولے کہ میری زبان پر

کیا صبر ہم نے جو اُسکے ستم پر
ستم سا ستم ہوگیا اس میں ہم پر
لکھا جو گیا اُسکو کیا نقل کر لے
سخن خونچکاں تھے زبانِ قلم پر
جھکے ٹک جدھر جھک گئے لوگ اودھر
رہے درمیاں تیغ و ابرو کے خم پر
سخن زن ہوں ہر چند دستِ نشستِ آنکھیں
نہیں اعتماد اُن کے قول و قسم پر

جگر کو سرا میر اس رنج کش کے
گیا دو قدم جو ہمارے قدم پر

تجکو ہے سوگند خدا کی میری اور نگاہ نہ کر
چشمِ سیاہ ملا کر یوں نہیں مجکو خاک سیاہ نہ کر
عشق و محبت یاری ہیں کیا لطف رکھے ہے کر تو ضبط
چھاتی پہ ہو جو کوہ الم کا تو بھی نالہ و آہ نہ کر
مانگ پناہ خدا سے بندے دل لگنا اک آفت ہے
عشق نہ کر زنہار نہ کر واللہ نہ کر باللہ نہ کر
گھاس ہے میخانے کی بہتر ان شیخوں کے مصلے سے
پانوں نہ رکھ سجادے پہ انکے اس جادے سے راہ نہ کر

میر نہ ہم کہتے تھے تجھسے حال نہیں کچھ رہنے کا
چاہ بلا ہے جان و دل سے آ جانے دے چاہ نہ کر

کل سے دل کی کل بگڑی ہے جی مارا ہے کل ہو کر
آج لہو آنکھوں میں آیا درد و غم سے رو رو کر
ایک سجود خلوصِ دل سے آہ کیا نہ جوانی میں
سر مارے ہیں محرابوں میں یوں ہی وقت کو اب کھو کر
جیب دریدہ خاک ملوں کے حال سے کیا آگاہی تمھیں
راہ چلو ہو نازکناں دامن کو لگا کر تم ٹھوکر
ایک تو ہم تو ہوتے نہیں ہیں سر بہتیرا مار چکے
اب بہتر ہے تیغ ستم کی جلد لگا کر تو دو کر

جی ہی ملا جاتا ہے اپنا میر سماں یہ دیکھے سے
آنکھیں ملتے اٹھتے ہیں بستر سے دلبر جب سو کر

یہ لطف اور پوچھا مجھ سے خطاب کر کر
کاٹے میر کچھ کہیں ہم تجکو عتاب کر کر
چھاتی جلی ہے کیسی اُڑتی جو یہ سُنی ہے
واں مرغ نامہ بر کا کھایا کباب کر کر
خونریزی سے کچھ آگے تشہیر کر لیا تھا
اس دل زدہ کو اُن نے مارا خراب کر کر

گنتی میں تو نہ تھا میں پر کل خجل ہوا وہ
کچھ دوستی کا میری دل میں حساب کر کر

مستی و بیخودی میں آسودگی بہت تھی
پایا نہ چین میں نے ترک شراب کر کر

روپوش ہی رہا وہ مرنے تلک اپنے لیکن
منھ پر نہ رکھا اُسکے کچھ میں حجاب کر کر

کیا جانیے کہ دل پر گزرے ہے میر کیا کیا
کرتا ہے بات کوئی آنکھیں پرآب کر کر

جدائی تا جدائی فرق ہے ملتے بھی ہیں آ کر
فراق ایسا نہیں ہوتا کہ پھر آتے نہیں جاکر

اگرچہ چپ لگی ہے عاشقی سے مجکو حیرت ہے
کبھو احوال پرسی تو کرو دل ہاتھ میں لاکر

جو جانوں تجھ میں بلبل تہ نہیں تو کیوں زباں تھا
زباں بکر بند سارے باغ میں مجھکو نہ رسوا کر

فلک نے باغ سے جوں غنچۂ نرگس نکالا ہے
کہیں کیا جانوں کیا دیکھوں گا چشم بستہ کو وا کر

سبد پھولوں بھرے بازار میں آئے ہیں سو کھیں یا
نکلکر گوشۂ مسجد سے تو بھی میر سودا کر

اُس رفتہ پاس اُسکو لائے تھے لوگ جاکر
پر حیف میں نہ دیکھا بالیں سے سر اُٹھا کر

سُن سُن کے دردِ دل کو بولا کہ جانتے ہیں ہم
تو اپنی یہ کہانی بیٹھا ہوا کہا کر

آگے زمیں کی تہ میں ہمسے بہت تھے تو بھی
سر پر زمیں اُٹھائی ہم سب تہوں نے آکر

میرے ہی خوں میں اُن نے تیغہ نہیں سلایا
سویا ہے اژدہا یہ بہتیرے تجھسے کھا کر

دل ہاتھ سے گیا ہے لطف قضا سے میر
افسوس کھو چلا ہوں ایسے گہر کو پاکر

جو وجہ کوئی ہو تو کہنے میں بھی کچھ آوے
باتیں کرو ہو بگڑی منھ کو بنا بنا کر

اب تو پھرو ہو بے غم تب میر جانیئے ہم
اچھے رہو گے جب تم دل کو کہیں لگا کر

بزم میں منھ اُدھر کریں کیونکر
اور نیچی نظر کریں کیونکر

یوں بھی مشکل ہے وہوں بھی مشکل ہے
سر جھکائے گزر کریں کیونکر

رازپوشی عشق سے ہے منظور
آنکھیں رو رو کے تر کریں کیونکر

مست و بیخود ہم اُسکے در پہ گئے
لوگ اُسکو خبر کریں کیونکر

سو رہا بال منھ پہ کھول کے وہ
ہم شب اپنی سحر کریں کیونکر

مہ فلک پر ہے وہ زمیں پر آہ
ان کو زیر و زبر کریں کیونکر

دل نہیں دردمند اپنا میر
آہ نالے اثر کریں کیونکر

ردیف زائے معجمہ

ہے زیر خاک لاشۂ عاشق طپاں ہنوز
پیدا ہے عشق کشتے کا اُسکے نشاں ہنوز

گردش سے اُسکی خاک برابر ہوئی ہے خلق
استادہ روئے خاک پہ ہے آسماں ہنوز

اُس تک پہونچنے کا نہیں ہے حال کچھ وسلے
جاتے ہیں گرتے پڑتے بھی ہم ناتواں ہنوز

پروانہ جل کے خاک ہوا پھر اُڑا گیا
اے شمع تیری رہتی نہیں ہے زباں ہنوز

چندیں ہزار جانیں گئیں اس کی راہ میں
ایک آدھ تو بھی مر رہے ہے نیمجاں ہنوز

مدت ہوئی کہ خوار ہو گلیوں میں مر گئے
قصہ ہمارے عشق کا ہے داستاں ہنوز

لخت جگر کے غم میں کہ تھا لعل پارہ میر
رخسار زرد پہ ہے مرے خوں رواں ہنوز

دیوانگی کی ہے وہی زور آوری ہنوز
ہر دم نئی ہے میری گریباں دری ہنوز

سر سے گیا ہے سایۂ لطف اُس کا دیر سے
آنکھوں ہی میں پھرے ہے مری وہ پری ہنوز

شوخی سے زار گریہ کے خوں چشم میں نہیں
ویسی ہی ہے مژہ کی بعینہ تری ہنوز

کب سے نگاہ گاڑے ہے یاں روز آفتاب
ہم دیکھتے ہیں جہاں کے تئیں سرسری ہنوز

مبہوت ہو گیا ہے جہاں اک نظر گئی
جاتی نہیں ان آنکھوں سے جادوگری ہنوز

ابر کرم نے سعی بہت کی پہ کیا حصول
ہوتی نہیں ہماری زراعت ہری ہنوز

مدت سے میر بیدل و دیں دلبروں میں ہے
کرتا نہیں ہے اسکی کوئی دلبری ہنوز

گرچہ آتے ہیں گل ہزار ہنوز
نہ گیا دل سے روے یار ہنوز

بے قراری میں ساری عمر گئی
دل کو آتا نہیں قرار ہنوز

خاکِ مجنوں جہاں ہے صحرا میں
واں سے اُٹھتا ہے اک غبار ہنوز

کب سے ہے وہ خلاف وعدہ کے
دل کو اسکا ہے اعتبار ہنوز

قیس و فرہاد پہ نہیں موقوف
عشق لاتا ہے مرد کار ہنوز

برسوں گزرے ہیں اس سے ملتے ولے
صحبت اس سے نہیں برآئی ہنوز

عشق کرتے ہوئے تھے بیخود میر
اپنا اُن کو ہے انتظار ہنوز

وہ مخطط سے محو ناز ہنوز
کچھ پذیرا نہیں نیاز ہنوز

کیا ہوا خوں ہوا کہ داغ ہوا
دل ہمارا نہیں گداز ہنوز

سادگی دیکھ اُس جفاجو سے
ہم نہیں کرتے احتراز ہنوز

ایک دن وا ہوئی تھی اُس منھ پر
آرسی کی ہے چشم باز ہنوز

معتبر کیا ہے میر کی طاعت
رہن بادہ ہے جانماز ہنوز

خاک ہو کر اڑیں ہیں یار ہنوز
دل کا بیٹھا نہیں غبار ہنوز

نہ جگر میں ہے خوں نہ دل میں جان
درپے خوں ہے روزگار ہنوز

دست بردل ہوں مدتوں سے میر
دل ہے ویسا ہی بیقرار ہنوز

دوستاں حسن و خوبی ہے کیا چیز
ٹھہری ہے جان سی بھی ٹکے کیا چیز

ردیف سین مہملہ

مدت ہجر میں کیا کریے بیاں یار کے پاس
حال پرسی بھی نہ کی آن کے بیمار کے پاس

حق یہ ہے خواہش دل ہے تو مری آ جانا
جبکہ خونریزی کو بٹھلائیں مجھے دار کے پاس

در اسیری کا کھلا منھ پہ ہمارے کیا تنگ
مر ہی رہیے گا قفس کے در و دیوار کے پاس

آنا اس کا تو دم قتل ضروری ہے ولے
کون آتا ہے کسو خوں کے سزاوار کے پاس

پائیے یار اکیلا تو غم دل کہیے
سو تو بیٹھا ہی اُسے پاتے ہیں دو چار کے پاس

منھ پہ ناخن کے خراشوں سے لگا دل بہنے
چشمے نکلے ہیں نئے چشم جگر بار کے پاس

میں تو تلوار تلے اُسکے لیے بیٹھا میر
وہ کھڑا بھی نہ ہوا آکے گنہگار کے پاس

کل ہاتھ جا رہا تھا دل بیقرار پاس
گویا کہ جا رہا کسو سوزندہ نار پاس

کس جدوکد سے حیف ہے مجکو کیا شکار
ٹھہرا نہ پھر وہ صید فگن اس شکار یاس

اُس گل بغیر پھروں ہیں بلبل سے نالہ کش
کرتے ہیں اپنی اور سے تو ہم ہزار یاس

خوشحال وے جو حال کہیں دلبروں سے دیر
رویا نہ میں تو ایک گھڑی اپنے یار پاس

دوری میں جس کی مرگئے کڑھ کڑھ کے میر ہم
نکلا نہ وہ سو ہوگے ہمارے مزار پاس

اب نہیں ہوتی چشم تر افسوس
بہ گیا خون ہو جگر افسوس

دیدنی ہے یہ خستہ حالی لیک
ایدھر اُس کی نہیں نظر افسوس

عیب ہی عیب میرے ظاہر ہیں
مجکو آیا نہ کچھ ہنر افسوس

میر ابتر بہت ہے دل کا حال
یعنی ویراں پڑا ہے گھر افسوس

ردیف شین معجمہ

نکلے پردے سے روئے یار اے کاش
منہ کرے ٹک ادھر بہار اے کاش

کچھ وسیلہ نہیں جو اُس سے ملوں
شعر ہو یار کا شعار اے کاش

کہیں اُس بحر حسن سے بھر جائے
موج ساں میری بھی کنار اے کاش

برق ساں ہو چکوں تڑپ کر میں
یوں ہی آوے مجھے قرار اے کاش

اعتمادی نہیں ہے یاری غیر
یار سے ہم ہوئے بیار اے کاش

آوے سررشتۂ جنوں کچھ ہاتھ
ہوں گریباں تار تار اے کاش

میر جنگل تمام بس جاوے
بن پڑے ہے روزگار اے کاش

اُس کا خیال آوے عیار کی روش
کچھ اُس کی ہم نے پائی نہ رفتار کی روش

کیا چال ہے گی زہر بھری روزگار کی
سب اس گزندگی ہے سیہ مار کی روش

وہ رفت و خیز گرم تو مدت سے ہے چکی
رستے ہیں اب گرے پڑے بیمار کی روش

جاتے ہیں رنگ و بوئے گل وا کیے چلے
آئی نہ خوش ہمیں تو یہ گلزار کی روش

مائل ہوا ہے سرو گلستاں کا دل بہت
کچھ آگئی تھی اس میں قد یار کی روش

زندان میں جہان کی بہت ہیں خراب حال
کرتے ہیں ہم معاش گنہگار کی روش

یوں سر بکھیرے عشق میں پھرتے نہیں ہیں ہم
اظہار بھی کریں ہیں تو اظہار کی روش

رہتے ہیں بہت دل کے ہم آزار سے ناخوش
بستر پہ گرے رہتے ہیں بیمار سے ناخوش

جاتا جو مقرر ہے مرا دار فنا سے
اس بستی کی میں ہوں در و دیوار سے ناخوش

ہمواری سے ہیں نرم و خشن ایک سے دونوں
خوش ہیں نہ گل تر سے نہ ہم خار سے ناخوش

سر رشتۂ دل بند نہیں زلف و کمر میں
کیا جانیے ہم کس لیے ہیں یار سے ناخوش

ہے عشق میں صحبت مرے خوباں سے عجب کچھ
اقرار سے بیزار ہیں انکار سے ناخوش

خوش رہتے ہیں احباب سبھی ربط کیے سے
رہتے ہو تمھیں ایک مرے پیار سے ناخوش

اک بات کا بھی لوگوں میں چپٹ اسے کرنا
ہم سنتے بہت میر کے بستار سے ناخوش

ردیف صاد مہملہ

طائر دل کی طپش سینے میں جانو تم لبسمل کا رقص
ان ہی رنگوں ہوتا ہے اس صید طرفہ دل کا رقص

ردیف ضاد معجمہ

کیا کہوں کیسا ہے دلبر خود غرض
خودنما خودرائے و خودسر خود غرض

ردیف طائے مہملہ

دل لگے کے تئیں جگر ہے شرط
بے خبر مت رہو خبر ہے شرط

عشق کے دو گواہ ہیں یعنی
زردی رنگ و چشم تر ہے شرط

دل کا لگانا جی کھوتا ہے اسکو جگر ہی بہا ہے شرط
سو تو بہا تھا جو ان ہو آگے پہلے راہ میں ہارے شرط

ردیف ظائے معجمہ

عشق ہمارا جی مارے ہے ہم نادان ہیں کیا محظوظ
ایسی شئے کا زیاں کھینچے تو دانا ہو کے کیا محظوظ

پانی منھ میں بھر آتا ہے اُسکے عقیق لب دیکھے
اب ہی تشنہ کام جدائی میر دگرنہ تھا محظوظ

ردیفِ عینِ مہملہ

ایک ہی گل کا صرف کیا ہے میں نے سراپا جیسے شمع
تلووں تک وہ داغ گیا ہے سب مجکو لکھا جیسے شمع

ردیفِ غینِ معجمہ

ہمارے آگے چمن سے گئی بہار دریغ
دریغ درد و صد افسوس صد ہزار دریغ

دل جگر دونوں پر جلائے داغ
عشق نے کیا ہمیں کھائے داغ

دل جلے ہم نہیں رہے بیکار
زخم کاری اُٹھائے کھائے داغ

جل گئے دیکھ گرمی اغیار
آگئے اس کوچے سے تو آئے داغ

احتیاط صراحی مے سے
ہم نے سجادہ کے دُھلائے داغ

دیکھے دامن کے نیچے کے سے دیے
میر نے گرتے چھپائے داغ

ردیفِ فاء

آج ہمارا سر پھرتا ہے باتیں جتنی سب موقوف
حرف و سخن جو باہمدگر رہتے تھے سو اب موقوف

کس کو دماغ اب اُس سے رہا یاں آٹھ پہر کی منت کا
ربط اخلاص سے دن گزرے ہیں خلطہ اس سے سب موقوف

اُس کی گلی میں آمد و شد کی گھات ہی میں ہم رہتے تھے
اب جو شکستہ پا ہو بیٹھے ڈھب کرنے کے ڈھب موقوف

وہ جو مانع ہو تو کیا ہے شوق کمال کو پہنچا ہے
وقفہ ہو گا تب ملنے میں ہم بھی کریں یا جب موقوف

حلقے پڑے ہیں چشم تر میں سوکھے ایسے نم نہ رہے
رونا کڑھنا عشق میں اُسکے میر کرو گے کب موقوف

ہیں آگے نہ تھا دیدۂ پرآب سے واقف
پلکیں ہوئی تھیں مری خونناب سے واقف

پتھر تو بہت لڑکوں کے کھائے ہیں ولیکن
ہم اب بھی جنوں کے نہیں آداب سے واقف

ہم تنگ خلائق یہ عجب ہے کہ نہیں ہیں
اس عالم اسباب میں اسباب سے واقف

شب آنکھیں کھلی رہتی ہیں ہم منتظروں کی
جوں دیدۂ انجم نہیں ہیں خواب سے واقف

بل کھائے انھیں بالوں کے ہم جانیں ہیں یا میر
ہیں پیچ و غم و رنج و تب و تاب سے واقف

نظر کیا کروں اُسکے گھر کی طرف
نگاہیں ہیں میری نظر کی طرف

چھپاتے ہیں منھ اپنا کامل سے سب
نہیں کوئی کرتا ہنر کی طرف

بڑی دھوم سے ابر آئے گئے
نہ کوئی ہوا چشم تر کی طرف

اندھا دھند روتے ہیں آنکھوں سے خون
نہیں دیکھتے ہم جگر کی طرف

رہا بیخبر گرچہ ہجراں میں میر
رہے گوش اُسکے خبر کی طرف

ردیف قاف

لوگ بہت پوچھا کرتے ہیں کیا کہیے میاں کیا ہے عشق
کچھ کہتے ہیں سر الٰہی کچھ کہتے ہیں خدا ہے عشق

عشق کی شان اکثر ہے ارفع لیکن شانیں عجائب ہیں
گہ ساری ہے دماغ و دل میں گاہے سب سے جدا ہے عشق

کام ہے مشکل الفت کرنا اس گلشن کے نہالوں سے
بوکش ہو کر سیب ذقن کا عشق نہ کرے تو مزا ہے عشق

الفت سے پرہیز کیا کر کلفت اس میں قیامت ہے
یعنی درد و رنج و تعب ہے آفت جان و بلا ہے عشق

میر خلاف مزاج محبت موجب تلخی کشیدن ہے
یار موافق مل جاوے تو لطف ہے چاہ مزا ہے عشق

دل کا مطالعہ کر اسے آگہ حقائق
ہیں فن عشق کے بھی مشکل بہت دقائق

چھاتی جلوں سے آگے کھنچا ہے بیشتر دل
الک آشنا ہے مجھسے اس باغ میں شقائق

ہے راستی کہ انساں مشتق ہے انس ہی سے
بیماری دوستی کی ہے دشمن خلایق

جی سارے تن کا کھنچ کر آنکھوں میں آرہا ہے
کس مرتبہ میں ہم بھی ہیں دیکھنے کے شایق

کل میر جی نے ضایع اپنے تئیں کیا ہے
یہ کام تھا نہ اُن کی شایستگی کے لائق

نزدیک عاشقوں کے زمیں ہے قرار عشق
اور آسماں غبار سرِ رہگزار عشق

مقبول شہر ہی نہیں مجنوں ضعیف زار
ہے وحشیان دشت میں بھی اعتبار عشق

گھر کیسے کیسے دیں کے بزرگوں کے ہیں خراب
القصہ ہے خرابۂ کہنہ دیار عشق

گو ضبط کرتے ہوویں جراحت جگر کے زخم
روتا نہیں ہے کھول کے دل رازدار عشق

مارا پڑا ہے اُنس ہی کرنے میں ورنہ میر
ہے دور گرد وادیِ وحشت شکار عشق

ردیف کاف تازی

وحشت تھی ہمیں بھی وہی گھر بار سے اب تک
سر مارے ہیں اپنے در و دیوار سے اب تک

مرتے ہی سنا اُن کو جنھیں دل لگی کچھ تھی
اچھا بھی ہوا کوئی اس آزار سے اب تک

جب سے لگی ہیں آنکھیں کھلی راہ تکے ہیں
سوئے نہیں ساتھ اُسکے کبھو پیار سے اب تک

آیا تھا کبھو یار سو معمول ہم اس کے
بستر پہ گرے رہتے ہیں بیمار سے اب تک

بد عہدیوں میں وقت وفات آن بھی پہونچا
وعدہ نہ ہوا ایک وفا یار سے اب تک

ہے قہر و غضب دیکھ طرف کشتے کے ظالم
کرتا ہے اشارت بھی تو تلوار سے اب تک

کچھ رنج دلی میر جوانی میں کھنچا تھا
زردی نہیں جاتی مرے رخسار سے اب تک

رہا پھول سا یار نزہت سے اب تک
نہ ایسا کھلا گل نزاکت سے اب تک

لبالب ہے وہ حسن معنی سے سارا
نہ دیکھا کوئی ایسی صورت سے اب تک

سلیماں سکندر کہ شاہان دیگر
نہ رونق گئی کس کی دولت سے اب تک

کرم کیا صفت سے نہ ہوں گر کریماں
سخن کرتے ہیں ان کی ہمت سے اب تک

سبب مرگ فرہاد کا ہو گیا تھا
نگوں ہے سر تیشہ خجلت سے اب تک

لاتو بھی لب کو کہ عیسیٰ کے دم کی
چلی جائے ہے بات مدت سے ابتک

عقیق لب اسکے کبھو دیکھے تھے میں
بھرا ہے دہن آب حسرت سے ابتک

گئی عمر ساری مجھے عجز کرتے
نہ مانی کوئی ان نے منت سے ابتک

نہ ہو گو جنوں میر جی کو پر ان کی
طبیعت ہے آشفتہ وحشت سے ابتک

ردیف کاف فارسی

اس رنگ سے جو زرد زبوں زار ہیں ہم لوگ
دل کے مرض عشق سے بیمار ہیں ہم لوگ

کیا اپنے تئیں پستی بلندی سے جہاں کی
اک خاک برابر ہو سے ہموار ہیں ہم لوگ

مقصود تو حاصل ہے طلب شرط پڑی ہے
وہ مطلب عمدہ ہے طلبگار ہیں ہم لوگ

خونریزی لڑکوں سے لڑا رہتے ہیں آنکھیں
گر قتل کریں ہمکو سزاوار ہیں ہم لوگ

دل پھنس رہے ہیں دام میں زلفوں کے کسو کی
تنگ اپنے جنوں سے ہیں گرفتار ہیں ہم لوگ

بازار کی بھی جنس پہ جی دیتے ہیں عاشق
سر بیچتے پھرتے ہیں گرفتار ہیں ہم لوگ

ان پریوں سے لڑکوں کے چھپتے ہیں لئے
حیرت زدۂ عشق ہیں دیوار ہیں ہم لوگ

جاتے ہیں چلے قافلے در قافلے اس راہ
چلنے میں تردد نہیں تیار ہیں ہم لوگ

مارے ہی پڑیں کچھ کہیں عشاق تو شاید
حیرت سے ہیں چپ تسپہ گنہگار ہیں ہم لوگ

گرچہ نظر میر کی ہو آنکھیں تو ٹک دیکھ
کیا ذل زدگاں سادہ ہیں پرکار ہیں ہم لوگ

کیا چلے جاتے ہیں جہاں سے لوگ
مگر آئے تھے میہمان سے لوگ

تھر ہے بات بات پہ گالی
جاں بلب ہیں تری زبان سے لوگ

شہر میں گھر خراب ہے اپنا
آتے ہیں یاں اس نشان سے لوگ

ایک گردش میں ہیں برابر خاک
کیا جھگڑتے ہیں آسمان سے لوگ

درد دل ان نے کب سنا میرا
لگے رہتے ہیں اسکے کان سے لوگ

باد سے بھی لچک لہک ہے انھیں
ہیں یہی سبزے دھان پان سے لوگ

شوق میں تیر سے چلے ادھر
ہم خمیدہ قداں کمان سے لوگ

آدمی اب نہیں جہاں میں میر
اُٹھ گئے اس بھی کارواں سے لوگ

ردیف لام

بلبل نے کل کہا کہ بہت ہم نے کھائے گل
لیکن ہزار حیف نہ ٹھہری ہوائے گل

رعنا جوان شہر کے رہتے ہیں گل بسر
سر پر ہمارے داغ جنوں کے ہیں جائے گل

دل لوٹنے پہ مرغ چمن کے نہ کی نظر
بیدرد گل فروش سبد بھر کے لائے گل

حیف آفتاب میں ہیں پس دیوار باغ ہیں
جوں سایہ واکشیدہ ہوئے کہ ہم نہ پائے گل

بوئے گل و نوائے خوش عندلیب میر
آئی چلی گئی ہی کچھ بھی وفائے گل

عشق کی چوٹیں پے درپے جو اُٹھائی گئیں گھائل ہے دل
یوں بیدم ہے اب پہلو میں جوں صید بسمل ہے دل

خون ہوا ہے چاک ہوا ہے جلتے جلتے داغ ہوا
خواہش اس کو کیا ہے بارے کس کے لیے بیدل ہے دل

عشق کی بجلی آکے گری سو داغ ہوا ہے سرتاسر
کیا رووے جوں ابر کوئی اس مزرع کا حاصل ہے دل

یوں تو گرہ سینے میں ہمارے درد و غم کی ہو کے رہا
کس سے ظاہر کرتے جا کر کام بہت مشکل ہے دل

آنکھوں کی دیکھا دیکھی ہرگز دل کو اُس سے نہ لگنا تھا
جیسی سزا پہونچا دے کوئی اب اُس کے قابل ہے دل

عمر انساں راہ تو ہے تشویش سے طے ہوتی ہے ولے
دل کے تئیں پہونچے جو کوئی چین کی پھر منزل ہے دل

شہد لب سے اُس کے چپکا جی کا صرفہ کچھ نہ کیا
میر جو دیکھا اپنے حق میں کیا زہر قاتل ہے دل

غم مضموں تا خاطر میں نہ دل میں درد کیا حاصل
ہوا کاغذ نمط گو رنگ تیرا زرد کیا حاصل

ہوئے صید زبوں ہم منتظر ہی خاک جی دیکھ
سواری سے کسو کے گو اُٹھے اب گرد کیا حاصل

جلتا ہے سوز سینہ **میر** یوں ہو جائیگی جلکر
اگر دل سے اُٹھے تیرے یہ آہ سرد کیا حاصل

دل تو گداز سب ہے کسکو کوئی کہے دل
نزدیک ہے کہ کہیئے اب ہائے ہائے اے دل

اس عشق میں نکالے میں نے بھی نام کیا کیا
خانہ خراب و رسوا بیدین اور بیدل

جوں ابر روئیے کیا دل برق سا ہے بیکل
رکھے ہی رہتے اکثر ہاتھ آسپہ جو رہے دل

دل گو کہ داغ و خوں ہے رہتی ہے لاگ تجھسے
انصاف کر کہ جاکر دکھلاویں پھر کسے دل

دل کے ثبات سے ہم نومید ہو رہے ہیں
اب وہ سماں ہے جوں ہو رخسار پر ہے دل

عاشق کہاں ہوئے ہم پانچوں حواس کھوئے
اس مخمصے میں از بس حیران ہے کیا کرے دل

جاتا ہے کیا کھنچا دل دیکھ اسکو ناز کرتا
آتا نہیں ہمیں ہیں خوش انداز بے تہے دل

ہم دردمند اپنا سوز دروں ہے بیحد
یارب ہمارے اور کس مرتبہ جلے دل

اے میر اسے ہے نسبت کن حلقہ حلقہ مو سے
بیتاب کچھ ہے گا ہے پر پیچ ہے کہے دل

حال تو حال زار ہے تاحال
دل وہی بیقرار ہے تاحال

بڑھتی ہے حال کی خرابی روز
گرچہ کچھ روزگار ہے تاحال

خستہ جانی نے تنگ خلق کیا
پر اُسے مجھ سے عار ہے تاحال

حال تکیہ سخن میں کچھ نہ رہا
شعر میر اشعار ہے تاحال

حال مستی جوانی تھی سو گئی
میر اس کا خمار ہے تاحال

آنکھیں بدحالی سے ٹھہرتی نہیں
شوق دیدار یار ہے تاحال

غم سے حال آنکہ خون دل سوکھا
چشم تر اشکبار ہے تاحال

کھنچتا ہے اُس طرف ہی کو بے اختیار دل
دیوانہ دل بلا زدہ دل بیقرار دل

سمجھا بھی تو یہ دل کسے کہتے ہیں دل ہے کیا
آتا ہے جو زباں پہ تری بار بار دل

آزردہ خاطری کا ہماری نہ کر عجب
اک عمر ہم رہا کیے ہیں مار مار دل

واشد فسردگی سے تری اس چمن میں ہے
دل جو کھلا تو جیسے گل بے بہار دل

میر اسکے اشتیاق ہم آغوشی میں نہ پوچھ
جاتا ہے اب تو جی ہی رہا در کنار دل

مت کرو شور و فغاں سے طائر آزار دل
اب دماغ اُڑتا سا ہے یا تو نہیں کہ ہوں بیمار دل

رنج و غم بھی کھینچنے کے دن تو یارو ہو چکے
اب نہیں جاتی اُٹھائی کلفت بسیار دل

ردیف میم

شور سے طائر گلزار کے بیزار ہیں ہم
دل اُٹھاتا نہیں اپنا کہ گرفتار ہیں ہم

بن میں چمن میں جی نہیں لگتا یار کدھر کو جاویں ہم
راہ خرابے سے نکلی گھر کی بستی میں کیونکر جاویں ہم
کیسی کیسی خرابی کھینچی دشت و در میں سر مارا
خانہ خراب کہاں تک پھریے ایسا ہو گھر جاویں ہم
عشق میں گام اول اپنے جی سے گزرنا پیش آیا
اس میدان میں رکھ کے قدم کیا مرنے سے ڈر جاویں ہم
خواہ نماز خضوع سے ہووے خواہ نیاز اک سوئے دل
وقت رہا ہے بہت کم اب تو یارب کچھ کر جاویں ہم
کب تک میر فراق میں اُسکے لوہو پی پی جیتے رہیں
بس چلتا نہیں آہ کچھ اپنا ورنہ ابھی مر جاویں ہم

شاید ہم سے ضد رکھتے ہو آتے نہیں ٹک ایدھر تم
سب سے گلی کوچوں میں ملو ہو پھرتے رہو ہو گھر گھر تم
کیا رکھیں یہ تم سے توقع خاک سے ہم کو اُٹھاؤ گے
راہ میں دیکھو افتادہ تو اور لگاؤ ٹھوکر تم
اس سے زیادہ ہوتا نہ ہوگا دنیا میں بھی نچلا پن
سون سے بیٹھے رہتے ہو حال ہمارا سُن کر تم
لطف و مہر و خشم و غضب ہم ہر صورت میں راضی ہیں
حق میں ہمارے کر گزرو بھی جو کچھ جانو بہتر تم
رنگ ہمارا جیسا اب ہے کاہے کو آگے ایسا تھا

پانوں میں مہندی اپنے لگا کر آفت لائے سر پر تم
لوگ صنم کہتے تھے تم کو ان سمجھے تھے ہم محفوظ
سختی سے کھینچی گئی یعنی نکلے پتھر تم

چھپکے سے کچھ آجاتے ہو آنکھیں بھر بھر لاتے ہو
میر گزرتی کیا ہے دل پر کڑھا کرو ہو اکثر تم

پوشاک تنگ پہنے بارے کہاں چلے تم
ہے آج عید صاحب میرے گلے لگو تم

اس نازکی سے گزرے کسکے خیال میں شب
مرجھائے پھول سے ہو جو کچھ ملے دلے تم

کیا ظلم ہے کہ کھینچے شمشیر وہ کھڑے ہے
آزردہ ہونگا پھر میں جاگہ سے جو ہلے تم

سم پائی اس قدر ہے منزل ہے دور اتنی
طے کس طرح کروگے یارو یہ مرحلے تم

اکثر نڈھال ہیں ہم پر یوں نہیں وہ کہتا
کیا ہے کہ جاتے ہو گے کچھ اتنے ہی ڈھلے تم

یہ جانتے نہ تھے ہم ایسے برے ہوئے ہو
ہونٹھوں پہ جان آئی تم بن گئے بھلے تم

قربانی اُس کی ٹھہری پر یہ طرح نہ چھوڑی
تکتے ہو میر ادھر تلوار کے تلے تم

یارب اُس محبوب کو پھر اک نظر دیکھیں گے ہم
اپنی آنکھوں سے اُسے یاں جلوہ گر دیکھینگے ہم

میں کہا دیکھو ادھر ٹک تم تو میں بھی جان دوں
ہنسکے بولے یہ تری باتیں ہیں پر دیکھینگے ہم

پاس ظاہر سے اُسے تو دیکھنا دشوار ہے
جائینگے مجلس میں تو ایدھر اودھر دیکھینگے ہم

یوں نہ دینگے دل کسو سیمیں بدن زردوست کو
ابتدائے عشق میں اپنا بھی گھر دیکھینگے ہم

کام کہتے ہیں سماجت سے کبھو لیتے ہیں لوگ
ایک دن اس کے کنے جاکر بھی تر دیکھینگے ہم

راہ تکتے تکتے اپنی آنکھیں بھی پتھرا چلیں
یہ نہ جانا تھا کہ سختی اس قدر دیکھینگے ہم

شورش دیوانگی اسکی نہیں جائے گی لیک
ایک دو دن میر کو زنجیر کر دیکھینگے ہم

صبر کیا جاتا نہیں ہم سے رہ کے جدا نہ ستاؤ تم
پانوں کا رکھنا گرچہ ادھر کو عار سی ہے پر آؤ تم
جسکے تئیں پروا ہو کسی کی آنا جانا اُس کا ہے
نیک ہو یا بد حال ہمارا تم کو کیا ہے جاؤ تم

چپ ہیں کچھ جو نہیں کہتے ہم کارِ عشق کے حیراں ہیں
سوچو حال ہمارا ٹک تو بات کی تہ کو پاؤ تم

میر کو وحشت ہے گی قیامت واہی تباہی بکتے ہیں
حرف و حکایت کیا مجنوں کی دل میں کچھ مت لاؤ تم

ظلم ہوئے ہیں کیا کیا ہم پر صبر کیا ہے کیا کیا ہم
آن لگے ہیں گور کنارے اُس کی گلی میں جا جا ہم

ہاہا ہی ہی کر ٹالے گا اس کا غرور و چنداں ہے
گھگھیانے کا اب کیا حاصل یونہیں کرے ہیں ہاہا ہم

اب حیرت ہے کس کس جاگہ پنبہ و مرہم رکھنے کی
قد تو کیا ہے سرو چراغاں داغ بدن پہ کھا کھا ہم

سیر خیال جنوں کا کریے صرف کریں تا ہم پر سب
پتھر آپ گلی کوچوں میں ڈھیر کیے ہیں لا لا ہم

میر فقیر ہوئے تو اک دن کیا کہتے ہیں بیٹے سے
عمر رہی ہے تھوڑی اسے اب کیونکر کاٹیں بابا ہم

ایک دھوم دن سنو گے سنا کے رہ گئے ہم
کانپا کرے ہے جی سو کھڑا کے رہ گئے ہم

واشد ہوئی سو اپنی پژمردگی سے بدتر
موسم گئے کہ گل سے مرجھا کے رہ گئے ہم

یہ داغ دل کو لیکر آخر گیا کنارا
اس باغ سے گلی میں جا جا کے رہ گئے ہم

سوزِ دروں نے ہمکو پردے میں مار رکھا
جوں شمع آپ ہی کو کھا کھا کے رہ گئے ہم

حیرت سے عاشقی کی پوچھا تھا دوستوں نے
کہہ سکتے کچھ تو کہتے شرما کے رہ گئے ہم

اے وائے دل گئے پر جی بھی گیا ہمارا
یعنی کہ میر برسوں پچھتا کے رہ گئے ہم

حال زخم جگر سے ہے درہم
کاش رکھتے کسو طرف مرہم

دلبروں کو جو بر میں کھینچا ٹک
اس ادا سے بہت ہوئے برہم

آپ کو اب کہیں نہیں پاتے
بیخودی سے گئے ہیں کیدھر ہم

دیر و کعبہ گئے ہیں ہم اکثر
یعنی ڈھونڈھا ہے اسکو گھر گھر ہم

کہہ سکے کون ہم کو ناہموار
اب تو ہیں خاک سے برابر ہم

کوفت سی کوفت اپنے دل پر ہے
چھاتی کوٹا کیے ہیں اکثر ہم

ابر گریاں ہے اب کمی سی میر
دیکھیں ہیں سوئے دیدۂ تر ہم

تجا ہے حیرت عشق سے گفتگو کو ہم
خموش دیکھتے رہتے ہیں اسکے رو کو ہم

اگرچہ وصل ہے پر ہیں طلب میں سرگرداں
یہ وہم کار ہی جاتے ہیں جستجو کو ہم

اب اپنی جان سے ہیں تنگ دم رکا ہے بہت
ملا ہی دیں گے تری تیغ سے گلو کو ہم

جلا کے خاک کرے وہ کہ رکھے داغ کرے
لگا دیں آگ سے کیا اپنی گرم خو کو ہم

مرید پیر خرابات یوں نہ ہوتے میر
سمجھتے عارف اگر اور بھی کسو کو ہم

عشق بتوں سے اب نہ کریں گے عہد کیا ہے خدا سے ہم
آجاویں جو یہ ہرجائی تو بھی نہ جاویں جا سے ہم

گریۂ خونیں ٹک بھی رہے تو خاک سی منھ پر اڑتی ہے
شام و سحر رہتے ہیں یعنی اپنے لہو کے پیاسے ہم

اس کی نہ پوچھو دوری میں اُن نے پرسش حال ہماری کی
ہم کو دیکھو مارے گئے ہیں آکر پاس وفا سے ہم

جھیلی کیا انواع اذیت عشق میں کھینچی جاتی ہے
دل تو بھرا ہے اپنا تو بھی کچھ نہیں کہتے حیا سے ہم

کیا کیا عجز کریں ہیں لیکن پیش نہیں کچھ جاتا میر
سر رگڑے ہیں آنکھیں ملے ہیں اُس کے حنائی پا سے ہم

چاہیے یوں تھا بگڑی صحبت آپ ہی آکے بناتے تم
رحلت کرنے سے آگے مجھکو دیکھتے آتے جاتے تم

چلتے کہا تا جاؤ سفر کو آؤ گے تو ملیے گا
وعدۂ وصل نہ ہوتا تو پھر کس کو جیتا پاتے تم

کیا دن تھے وے دیکھتے تم کو نیچی نظر میں کر لیتا

شرما شرما لوگوں سے جب آنکھیں مجھ کو دکھاتے تم
بستر پر میں مردہ سا تھا جان سی مجھ میں آ جاتی
کیا ہوتا جو رنجہ قدم کر میرے سرہانے آتے تم
دل کے اوپر ہاتھ رکھے ہی شام سحریاں گزرے ہے
حال یہ تھا تو دل عاشق کا ہاتھ میں ٹک تو لاتے تم
خاک ہے اصل طینت آدم چاہیے اسکو عجز کرے
بات کی تہ کو کچھ پاتے تو اتنا سر نہ اٹھاتے تم

چہرہ زرد بجا ہے سارا عشق میں غم کا مارا ہوں
رنگ یہ دیکھا ہوتا تو دل میر کہیں نہ لگاتے تم

صبر بہت تھا ایک سمیں میں جا سے اپنی نہ جاتے ہم
کس کس ناز سے وے آتے پر آنکھ نہ اُن سے ملاتے ہم
کعبہ سے کر نذر اُٹھے سو خرچ راہ اے وائے ہوئے
ورنہ صنم خانے میں جا جُز زنار گلے سے بندھاتے ہم
ہاتھی مست بھی آوے چلا تو اُس سے منھ کو پھیر نہ لیں
پھرتے ہیں سرمست محبت مے ناخوردہ ماتے ہم
ہائے جوانی وہ نہ گلے لگتا تو خشم عشق سے
نعل جڑے جاتے چھاتی پہ گل ہاتھوں پر کھاتے ہم

عشق تو کار خوب ہے لیکن میر کھنچے ہے رنج بہت
کاشکے عالم ہستی میں بے عشق و محبت آتے ہم

ردیف نون

ضعف دماغ سے کیا پوچھو ہو اب تو ہم میں حال نہیں
اتنا ہے کہ طپش سے دل کی سر پر وہ دھمال نہیں
گاہے گاہے اس میں ہم نے مُنھ اس مہ کا دیکھا تھا
جیسا سال کہ پر کا گزرا ویسا بھی یہ سال نہیں
بالوں میں اُس کے دل اُلجھا تھا خوب ہوا جو تمام ہوا

یعنی گیا جب بیچ سے جی ہی تب پھر کچھ جنجال نہیں

ایسی متاع قلیل کے اوپر چشم نہ کھولیں اہل نظر
آنکھ میں آوے جو کچھ ہووے دنیا اتنی مال نہیں

سروِ چماں کو سیر کیا تھا کبکِ خراماں دیکھ لیا
اُس کا سا انداز نہ پایا اُس کی سی یہ چال نہیں

دل تو ان میں پھنس جاتا ہے جی ڈوبے ہے دیکھ اُدھر
چاہ زنخ گو چاہ نہیں ہے بال اس کے گو جال نہیں

کب تک دل کے ٹکڑے جوڑوں میر جگر کے لختوں سے
کسب نہیں ہے پارہ دوزی میں کوئی وصّال نہیں

ہے وضع کشیدہ کا جو شور اسکی جہاں میں — نکلی ہے مگر تازہ کوئی شاخ کماں میں
ہر طور میں ہم حرف و سخن لاگ سے دل کی — کیا کیا کہیں ہیں مرغ چمن اپنی زباں میں
کیا باد نے بھی دستِ تطاول کو دیا طول — پھیلے پڑے ہیں پھول ہی نہ بالکی خزاں میں
خوش رنگ ہے کس مرتبہ انہار کا پانی — خونناب مرے چشم کا بہتا ہے آبِ رواں میں

روؤ مرے احوال پہ جوں ابر بہت میر
بیطاقتی بجلی کی سی ہے آہ و فغاں میں

دل کے گئے بیدل کہلائے آگے دیکھیے کیا کیا ہوں
محزوں ہوویں مفتوں ہوویں مجنوں ہوویں رسوا ہوں

عشق کی رہ میں پاؤں رکھا سو رہنے لگے کچھ رفتہ سے
آگے چل کر دیکھیں ہم اب گم ہوویں یا پیدا ہوں

خار و خس اُلجھے ہیں آپ ہی بحث انھوں سے کیا رکھیں
موج زن اپنی طبع رواں سے جب ہم جیسے دریا ہوں

ہم بھی گئے جاگہ سے اپنی شوق میں اُس ہرجائی کے
عشق کا جذبہ کام کرے تو پھر ہم دونوں یکجا ہوں

کوئی طرف یاں ایسی نہیں جو خالی ہووے اس سے میر
یہ طرفہ ہے شور حرم سے چار طرف ہم تنہا ہوں

کچھ قدر عافیت کی معلوم کی نہ گھر میں
اب ہجر یار میں ہیں کیا دل زدہ سفر میں

ہر لحظہ بیقراری ہر لحظہ آہ و زاری
ہر دم ہے اشکباری نومیدی ہے نظر میں

روتے ہی رہنا اکثر یہ چاہتا ہے سو تو
تاب اب نہیں ہے دل میں نے خون ہے جگر میں

یہ بخت دیکھ گاہے آتا ہے آنکھوں میں بھی
ہے نقش اس کے پا کا بیٹھا نہ چشم تر میں

کیا راہ چلنے سے ہے اے میر دل مکدر
تو ہی نہیں مسافر ہے عمر بھی گزر میں

خوبی رو و چشم سے آنکھیں اٹک گئیں
پلکوں کی صف کو دیکھ کے بھیڑیں سرک گئیں

چلتے سمند ناز کی شوخی کو اس کی دیکھ
گھوڑوں کی باگیں دست سپہ سے اچک گئیں

ترچھی نگاہیں پلکیں پھریں اسکی پھر پھریں
سو فوجیں جو دو رستہ کھڑی تھیں ٹھٹھک گئیں

بجلی سا مرکب اس کا کڑک کر چمک گیا
لوگوں کے سینے پھٹ گئے جانیں دھڑک گئیں

محبوب کا وصال نہ ہم کو ہوا نصیب
دل سے ہزار خواہشیں سر کو پٹک گئیں

موقوف طور نور کا جھمکا ترا نہیں
چمکا جہاں تو برق سا آنکھیں جھپک گئیں

وحشت سے بھر رہی تھی نگہ تیر جان کے
جانیں بسان طائر بسمل پھڑک گئیں

گرد رہ اسکی دیکھتے اپنے اٹھی نہ حیف
اب منتظر ہو آنکھیں مندیں یعنی تھک گئیں

بھر دی تھی چشم ساقی میں یا رب کہاں کی مے
مجلس کی مجلسیں نظر اک کرتے چھک گئیں

کیا میر اس کی نوک پلک سے سخن کرے
سر تیز چھریاں گڑتی جگر دل تلک گئیں

ہم سے اسے نفاق ہوا ہے وفاق میں
کم اتفاق پڑتے ہیں یہ اتفاق میں

شاید کہ جان و تن کی جدائی بھی ہے قریب
جی کو ہے اضطراب بہت اب فراق میں

عازم پہونچنے کے تھے دل و عرش تک سو لے
آیا قصور اپنے ہی کچھ اشتیاق میں

احراق اپنے قلب کا رونے سے کب گیا
پانی کی چار بوندیں ہیں کیا احتراق میں

تحصیل علم کرنے سے دیکھا نہ کچھ حصول
میں نے کتابیں رکھیں اٹھا گھر کے طاق میں

دم ناک میں ہے بقول زناں عاشقوں کے ہی
ہلنا بلا ہے موتی کا اسکے بلاق میں

اک نور گرم جلوہ فلک پر ہے ہر سحر
کوئی تو ماہ پارہ ہے میر اس رواق میں

صبح ہوئی گلزار کے طائر دل کو اپنے ٹٹولیں ہیں
یاد میں اُس خودرو گل تر کے کیسے کیسے بولیں ہیں

باغ میں جو ہم دیوانے سے جا نکلیں ہیں نالہ کناں
غنچے ہو ہو مرغ چمن کے ساتھ ہمارے ہولیں ہیں

یار ہمارا آساں کیا کچھ سینہ کشادہ ہم سے بلا
خون کریں ہیں جب دل کو وے بند قبا کے کھولیں ہیں

مینھ جو برسے ہے شدت سے دیکھ اندھیری کیا ہے یہ
یعنی تنگ جو ہم آتے ہیں دل کو کھول کے رولیں ہیں

وہ دھوبی کا کم ملتا ہے میل دل اودھر ہے بہت
کوئی کہے اس سے ملنے میں تجھ کو کیا ہم دھولیں ہیں

سرو تو ہے سنجیدہ لیکن پیش مصرع قد یار
ناموزوں ہی نکلے ہے جب دل میں اپنے تولیں ہیں

مرگ[1] کا وقفہ اس رستے میں کیا ہے میر سمجھتے ہو
ہارے ماندے راہ کے ہیں ہم لوگ کوئی دم سولیں ہیں

غزل میر کی کب پڑھائی نہیں
کہ حالت مجھے غش کی آئی نہیں

زباں سے ہماری ہے صیاد خوش
ہمیں اب اُمید رہائی نہیں

کتابت گئی کب کہ اُس شوخ نے
بنا اُس کی گڈی اڑائی نہیں

نسیم آئی میرے قفس میں عبث
گلستاں سے وہ بھول لائی نہیں

مری دل لگی اُس کے رو ہی سے ہے
گل تر سے کچھ آشنائی نہیں

نوشتے کی خوبی لکھی کب گئی
کتابت بھی ایک اب تک آئی نہیں

جُدا رہتے برسوں ہوئے کیونکہ یہ
کنایہ نہیں بے ادائی نہیں

گلہ ہجر کا سُن کے کہنے لگا (ق)
ہماری تمہاری جدائی نہیں

سیہ طالعی میری ظاہر ہے اب
نہیں شب کہ اُس سے لڑائی نہیں

[1] میر تقی سے مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے : یعنی آگے چلیں گے دم لیکر ۱۲

دل کی لاگ بری ہے ہوتی چنگے بھلے مر جاتے ہیں
آپ ہیں ہم سے بیخود و رفتہ پھر پھر بھی کیا آتے ہیں

رنگ نہ بدلے چہرہ کا کیونکر آنکھیں بیٹھی جائیں نہ کیوں
کیسے کیسے غم کھاتے ہیں کیا کیا رنج اٹھاتے ہیں

جی ہی جائے ہے میر جو اپنا دیر کی جانب کیا کریے
یوں تو مزاج طرف کعبہ کے بہتیرا ہم لاتے ہیں

دل کی کچھ تقصیر نہیں ہے آنکھیں اس سے لگ پڑیاں
مار رکھا سو ان نے مجھکو کس ظالم سے جا لڑیاں

ایک نگہ میں مر جاتا ہے عاشق کو چک دل اس کا
زہر بھری کیا کام آتی ہیں گو وے آنکھیں ہوں بڑیاں

عقدے داغ دل کے شاید دست قدرت کھولے گا
ناخن سے تدبیر کے میرے کھلتی نہیں یہ گلجھڑیاں

نحس تھے کیا دے وقت و ساعت جن میں لگا تھا دل اپنا
سال پہر ہے اب تو ہم کو ماہ برابر ہیں گھڑیاں

میر بلائے جان رہے ہیں دونوں فراق و وصل اس کے
ہجر کی راتیں وہ بھاری تھیں ملنے کے دن کی یہ کڑیاں

بھلا ہوا کہ دل مضطرب میں تاب نہیں
بہت ہی حال برا ہے اب اضطراب نہیں

جگر کا لوہو جو پانی ہو بہ نکلتا ہے
سو ہو چکا کہ مری چشم اب پر آب نہیں

دیار حسن میں دل کی نہیں خریداری
وفا متاع ہے اچھی پہ یاں کے باب نہیں

حساب پاک ہو روز شمار میں تو عجب
گناہ اتنے ہیں میرے کہ کچھ حساب نہیں

گزر ہے عشق کی بیطاقتی سے مشکل آہ
دنوں کو چین نہیں ہے شبوں کو خواب نہیں

جہاں کے باغ کا یہ عیش ہے کہ گل کے رنگ
ہمارے جام میں لوہو ہے سب شراب نہیں

تلاش میر کی اب میکدوں میں کاش کریں
کہ مسجدوں میں تو وہ خانماں خراب نہیں

لہ غالب ؎ جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد ؛ پر طبیعت ادھر نہیں آتی +

ہم کو کہنے کے تئیں بزم میں جا دیتے ہیں
بیٹھنے پاتے نہیں ہم کہ اُٹھا دیتے ہیں

ان طیوروں سے ہوں میں بھی اگر آتی ہے صبا
باغ کے چار طرف آگ لگا دیتے ہیں

گرچہ ملتے ہیں خنک غیرت مہ یہ لڑکے
دل جگر دونوں کو یک لخت جلا دیتے ہیں

دیر رہتا ہے ہما لاش پہ غم کشتوں کے
استخواں اُنکے جلے کچھ تو مزا دیتے ہیں

اس شہ حسن کا اقبال کہ ظالم کے تئیں
ہر طرف سیکڑوں درویش دعا دیتے ہیں

دل جگر ہو گئے بیتاب غم عشق جہاں
جی بھی ہم شوق کے ماروں کو دغا دیتے ہیں

کیونکہ اس راہ میں پا رکھیے کہ صاحب نظراں
پاں رکھنے کو انھیں آنکھیں ہی بچھا دیتے ہیں

ملتے ہی آنکھ ملی اُسکی تو ہم بے تہ
خاک میں آپکو فی الفور ملا دیتے ہیں

طرفہ صناع ہیں اے میر یہ موزوں طبعاں
بات جاتی ہے بگڑ بھی تو بنا دیتے ہیں

جی بار بیتابی دل نے اب کچھ اچھا ڈھنگ نہیں
رنگ طپیدن کی شوخی سے منھ پر میرے رنگ نہیں

وہ جو خرام ناز کرے ہے ٹھوکر دل کو لگتی ہے
چوٹ کے اوپر چوٹ پڑے ہے دل ہی میرا سنگ نہیں

ہم بھی عالم فقر میں ہیں پر ہم سے جو مانگے کوئی فقیر
ایک سوال میں دو عالم دیں ہم ہیں دل کے تنگ نہیں

ہاتھ پہ ہاتھ دھرے ہو گئے کیا میر سے طور شتابی ہو
بیٹھا ہو کھڑے پانوں ہیں تو کچھ چلنے ہیں درنگ نہیں

شعر میر بھی پڑھتا ہے تو اور کسو کا لیکر نام
کیونکر کہیے اُس ناداں کو نام سے میرے ننگ نہیں

وہ نہیں اب کہ فریبوں سے لگا لیتے ہیں
ہم جو دیکھیں ہیں تو وہ آنکھ چھپا لیتے ہیں

کچھ تفاوت نہیں ہستی و عدم میں ہم بھی
اُٹھ کے اب قافلۂ رفتہ کو جا لیتے ہیں

نازکی ہائے رے طالع کی نکوئی سے کبھو
پھول سا ہاتھوں میں ہم اُسکو اُٹھا لیتے ہیں

صحبت آخر کو بگڑتی ہے سخن سازی سے
کیا دراندازی بھی اک بات بنا لیتے ہیں

ہم فقیروں کو کچھ آزار تمھیں دیتے ہو
یوں تو اس فرقے سے سب لوگ دعا لیتے ہیں

چاک سینے کے ہمارے نہیں سینے اچھے
انھیں رخنوں سے دل و جان ہوا لیتے ہیں

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

تھکے چارہ جوئی سے اب کیا کریں
کہو تم سو دل کا مداوا کریں

گلستاں میں ہم غنچہ ہیں دیر سے
کہاں ہم کو پروا کہ پروا کریں

نہیں چاہتا جی کچھ اب سیر ہیں
ہوس دل کو ہو تو تمنا کریں

بخود جستجو میں نہ اُسکے رہے
ہم آپ ہی ہیں گم کسکو پیدا کریں

غضب ہے یہ اندازِ رفتارِ عشق
چلے جائیں جی ہم تماشا کریں

بلا شور ہے سر میں ہم کب تلک
قیامت کا ہنگامہ برپا کریں

کہیں دل کی مرغانِ گلشن سے کیا
یہ بے حوصلہ ہم کو رسوا کریں

کھپا عشق کا جوش دل ہی میں بھلا
کہ بدنام ہوویں جو سودا کریں

برے حال اُسکی گلی میں ہیں میر
جو اُٹھ جائیں واں سے تو اچھا کریں

ہجر میں روتا ہوں ہر شب میں تو اس صورت سے یاں
ٹپے اندھیری مینھ برسے جو کبھو شدت سے یا

کسقدر بیگانہ خو ہیں مردمانِ شہرِ حسن
بات کرنا رسم و عادت ہی نہیں الفت سے یا

اٹھ گئے ہیں جب سے ہم سونا پڑا ہے باغ سب
شورِ ہنگامِ سحر کا بند ہے مدت سے یا

سر کوئی پھوڑے محبت میں تو بارے اسطرح
مر گیا ہے عشق میں فرہاد جس قدرت سے یا

دلکشی اس بزم کی ظاہر ہے تم دیکھو تو ہو
لوگ جی دیتے چلے جاتے ہیں کس حیرت سے

صورتوں سے خاکداں یہ عالمِ تصویر ہے
بولیں کیا اہلِ نظر خاموش ہیں حسرت سے یا

فہم حرفوں کے تناقض کا بھی یاروں کو نہیں
اسپہ رکھتے ہیں تنفر سب مری صحبت سے یا

پنج روزہ عمر کر لیے عاشقی یا زاہدی
کام کچھ چلتا نہیں اس تھوڑی ہی مہلت سے یا

کیا سرِ جنگ و جدل ہو بیدماغِ عشق کو
صلح کی ہے میر نے ہفتاد و دو ملت سے یاں

داغِ فراق سے کیا پوچھو ہو آگ لگائی سینے میں
چھاتی سے وہ مہ نہ لگا ٹک اگر اس بھی مہینے میں

چاک ہوا دل ٹکڑے جگر ہے لوہو روئے آنکھوں سے
عشق نے کیا کیا ظلم دکھائے دس دن کے اس جینے میں

گوندھ کے گویا پتی گل کی وہ ترکیب بنائی ہے
رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں

ہ صورت کا ناز نہ تھا کچھ دب چلتا تھا ہم سے بھی
جب تک دیکھا اُن نے نہ تھا منھ خوب اپنا آئینے میں

ں میں اسلام کے ہوتا شہرت اس رسوائی کی
شیخ کو پھیر گدھے چڑھا کر گئے اور مدینے میں

ہ نہ ٹٹولیں کا ننگے اُس کا سردی مہر تو ظاہر ہے
پاویں اس کو گرم مبادا یار ہمارے کینے میں

میر نے کیا کیا ضبط کیا ہے شوق میں اشک خونیں کو
کھینچئے جو تقصیر ہوئی ہو اپنا لوہو پینے میں

ب ہو سنا کہ ہی مردم ہیں ترے یاروں میں
ہم جو عاشق ہیں سو ٹھہرے ہیں گنہگاروں میں

چہ یار تو ہے غیرت فردوس و لے
آدمی ایک نہیں اس کے ہواداروں میں

ے بد حال محبت میں کھنچے آخر کار
لوگ اچھے تھے بہت یار کے بیماروں میں

گیا ایک دم سرد ہی کے ساتھ اپنا
ہم جو خوش زمزمہ تھے اُسکے گرفتاروں میں

اب در باز بیاباں میں قدم رکھیے میر
کب تلک تنگ رہیں شہر کی دیواروں میں

لم علم میں ایک تھے ہم و لے حیف ہے اُن کو گیان نہیں
اب کہتے ہیں خلطہ کیسا جان نہیں پہچان نہیں

س امید پر ساکن ہووے کوئی غریب شہر اس کا
لطف نہیں اکرام نہیں انعام نہیں احسان نہیں

ے لطافت جسم کی اُس کے مر ہی گیا ہوں پوچھو مت
جب سے تن نازک وہ دیکھا تب سے مجھ میں جان نہیں

باتوں سے تسلّی ہو دل مشکل عشقی میری سب
یار سے کہنے کہتے ہیں پر کہنا کچھ آسان نہیں

شام و سحر ہم سر زدہ دامن سر بگریباں رہتے ہیں
ہم کو خیال اُدھر ہی کا ہے اُن کو ادھر کا دھیان نہیں

ن کے میں تو آپ بنا ہوں اُن لڑکوں میں دیوانہ

عقل سے بھی بہرہ ہے مجھ کو اتنا میں نادان نہیں
پاؤں کو دامنِ محشر میں ناچاری سے ہم کھینچیں گے
لائق اپنی وحشت کے اُس عرصہ کا میدان نہیں
چاہت میں اس مایۂ جاں کے مرنے کے شایستہ ہوئے
جا بھی چکی ہے دل کی ہوس اب جینے کا ارمان نہیں

شور نہیں یاں سنتا کوئی میر قفس کے اسیروں کا
گوش نہیں دیوارِ چمن کے گل کے شاید کان نہیں

یوں ناکام رہیں گے کب تک جی میں ہے اک کام کریں
رسوا ہو کر مارے جاویں اُس کو بھی بدنام کریں
جس کو خدا دیتا ہے سب کچھ ویسے ہی سب کچھ دیتے ہیں
ٹوپی لنگوٹی پاس اپنے ہم اس پر کیا انعام کریں
مُنھ کھولے تو روزِ روشن زلف بکھیرے رات ہے پھر
ان طوروں سے عاشق کیونکر صبح کو اپنی شام کریں
خط و کتابت حرف و حکایت صفحہ ورق میں آجاوے
دستے کے دستے کاغذ ہو جو دل کا حال ارقام کریں
شیخ پڑے محراب حرم میں پہروں دوگانہ پڑھتے ہو
سجدہ ایک اس تیغ تلے کا ان سے ہو تو سلام کریں
دل آسودہ ہو تو رہے ٹک در پہ ہم سو بار گئے
وہ سو یہی کہہ بھیجے ہے باہر جاویں اب آرام کریں

میل گدائی طبع کو اپنے کچھ بھی نہیں ہے ورنہ میر
دو عالم کو مانگ کے لاویں ہم جو تنک ابرام کریں

پھرا میں صورت احوال ہر یک کو دکھاتا یہاں
خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا

مروت قحط ہے آنکھیں نہیں کوئی ملاتا یہاں
وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یہاں

محبت دشمن جاں ہے جو میں معلوم یہ کرتا
تو کاہیکو کسو سے میر اپنا دل لگاتا یہاں

کس سے مشابہ کیجے اُس کو ماہ میں ویسا نور نہیں
کیونکر کہیے بہشتی رو ہے اس خوبی سے حور نہیں

شعر ہمارے عالم کے ہر چار طرف کیا دوڑے ہیں
کس وادی آبادی میں یہ حرف و سخن مشہور نہیں

ہم دیکھیں تو دیکھیں اسے پھر پردہ بہتر ہے یعنی
اور کریں نظارہ اُس کا ہم کو یہ منظور نہیں

عزت اپنی تہیدستی میں رکھ لی خدا نے ہزاروں شکر
قدر ہے دستِ قدرت سے یاں حیف ہمیں مقدور نہیں

راہ دور عدم سے آئے بستی جان کے دنیا میں
سو یاں گھر اوجڑ ہیں سارے اک منزل معمور نہیں

عشق و جنوں سے اگرچہ تن پر ضعف نحافت ہے لیکن
وحشت گو ہو عرصۂ محشر مجنوں سے رنجور نہیں

ہجراں میں بھی برسوں ہم نے میر کیا ہے پاس وفا
اب جو کبھو ٹک پاس بلا لے ہمکو وہ تو دور نہیں

ردیف واو

دیتی ہے طول بلبل کیا سوزش فغاں کو
اک نالہ حوصلے سے بس ہے وداع جاں کو

میں تو نہیں پر اب تک مستانہ غنچے ہو کر
کہتے ہیں مرغ گلشن سب میری داستاں کو

نالاں تو ہیں تجھی سے پر وہ اثر کہاں ہے
گو طائر گلستاں سیکھے مری زباں کو

کیا جانیے کہ کیا کچھ پردے سے ہووے ظاہر
رہتے ہیں دیکھتے ہم ہر صبح آسماں کو

اس چشم سرخ پر ہے وہ ابروئے کشیدہ
جوں ترک مست رکھ لے سر کے تلے کماں کو

میری نگاہ میں تو معدوم سب ہیں شے ہی
موجود بھی نہ جانا اس راہ سے جہاں کو

بعد از نماز بھے کل میخانے کے در او پر
کیا جانے میر اٹھکر واں سے گئے کہاں کو

نہیں ہے تاب تنک تم بھی مت عتاب کرو
نہ گرم ہو کے بہت آگ ہو کے آب کرو

تمھارے عکس سے بھی عکس مجکو رشک سے ہے
نہ دیکھو آئینہ منھ سے مرے حجاب کرو

خراب عشق تو سرگشتہ ہوں ہی ہیں تم بھی
پھرا پھرا کے مجھے گلیوں میں خراب کرو

کہا تھا تم نے کہ ہر حرف پر ہے بوسۂ لب
جو باتیں کیں ہیں تو اب قرض کا حساب کرو

ق
ہوا ہے اہل مساجد پہ کام از بس تنگ
نہ شب کو جاگتے رہنے کا اضطراب کرو

خدا کریم ہے اُسکے کرم سے رکھکر چشم
دراز کھینچو کسو میکدے میں خواب کرو

جہاں میں دیر نہیں لگتی آنکھیں مندتے میر
تمھیں تو چاہیے ہر کام میں شتاب کرو

وہ گل سا رو سراہوں یا پیچدار مو کو
نرمی بھی کاش دیتا خالق ٹک اُسکی خو کو

ان گیسوؤں کے حلقے ہیں چشم شوق عاشق
وے آنکھیں دیکھتی ہیں حسرت سے اُسکے رو کو

دم کی کشش سے کوشش معلوم تو ہے لیکن
پاتے نہیں ہم اُسکی کچھ طرز جستجو کو

آلودہ خون دل سے صد حرف مُنھ پر آئے
مرغ چمن نہ سمجھا انداز گفتگو کو

دل میر دلبروں سے چاہا کرے ہے کیا کیا
کچھ انتہا نہیں ہے عاشق کی آرزو کو

عجب گر تیری صورت کا نہ کوئی یار عاشق ہو
جو صحن خانہ میں تو ہو در و دیوار عاشق ہو

تجھے اکبار اگر دیکھے کوئی بیجا ہو دل اُس کا
خرام ناز پر تیرے لٹا گھر بار عاشق ہو

تری چھاتی سے لگنا ہار کا اچھا نہیں لگتا
مبادا اس وجہ سے گل رو گلے کا ہار عاشق ہو

ہوا ہے مخترع بیرحم خونریزی بھی کرتے ہیں
نہ مارے جان سے جبتک نہ منت دار عاشق ہو

سزا ہے عشق میں زرد و زبون و زار ہی ہونا
نہ عاشق کہیے ان رنگوں نہ جو بیمار عاشق ہو

پڑے سایہ کسو کا تیرے بستر پر تو تو چونکے
وہی ہے کام تجھسے جو کوئی پُرکار عاشق ہو

نہیں بازار گرمی ایک دو خواہندہ پر اُسکے
اگر وہ رشک یوسف آوے تو بازار عاشق ہو

غریبوں کی تو پگڑی جامے تک لیتے ہے اُتروا تو
تجھے اے سیمبر لے بر میں جو زردار عاشق ہو

لگو ہو زار باراں رونے چلتے بات چاہت کی
کہیں ان روزوں تم بھی میر صاحب زار عاشق ہو

تو وہ نہیں کسو کا تہ دل سے یار ہو
یا تجکو دلشکستوں سے اخلاص پیار ہو

کیا فکر میں ہو اپنی طرحداری ہی کی تم
ہم دردمند لوگوں کے بیماردار ہو

مصروف احتیاط رہا کریے رات دن
دینے میں دل کے اپنے جو کچھ اختیار ہو

دل میں کدر سے آندھی سی اُٹھنے لگی ہے اب
نکلے گلے کی راہ تو رنج غبار ہو
کھا زہر مر رہیں کہیں کیا زندگی ہے یہ
زلفیں تنک چھوئیں تو ہمیں مار مار ہو
اے آہوانِ کعبہ نہ اینڈو حرم کے گرد
کھاؤ کسو کی تیغ کسو کے شکار ہو
مُنھ سے لگے گلابی ہوا کچھ شگفتہ تو
تھوڑی شراب اور بھی پی جو بہار ہو
بہتی ہے تیز جدول تیغ جفائے یار
یعنی کہ اک ہی وار گلے کام یار ہو

چھڑیوں سے کر قرار مدار اُسکو لائیے
جو میر پھر لڑا نہ کریں بے قرار ہو

دل اُس کے مو سے لگ کے پریشاں ہوا نہ تو
اس رو کا مثل آئینہ حیراں ہوا نہ تو
صد رنگ بحث رہتی ہے یاں ذی شعور سے
اے عقلمند وائے کہ ناداں ہوا نہ تو
نزدیک حق کے دین تو اسلام بن ہے کفر
اے برہمن دریغ مسلماں ہوا نہ تو
کتنے دنوں کہا تھا دلا ضبط نالہ کر
پھر شب کو ناشکیبی سے نالاں ہوا نہ تو

ہوتا ہے میر روئے سخن آدمی کے اور
افسوس اے ستمزدہ انساں ہوا نہ تو

کیا کروں میں صبر کم کو اور رنج بیش کو
زہر دیویں کاشکے احباب اس درویش کو
کھول آنکھیں صبح سے آگے کہ شیر اللہ کے
دیکھتے رہتے ہیں غافل وقت گرگ و میش کو
عشق کے بیتاب کی آزار میں مت کر شتاب
جان دیتے دیر لگتی ہی نہیں دلریش کو
دشمن اپنا میں تو نکلا دوستی ہی میں رہا
اب رکھوں کیونکر سلامت جانِ عشق اندیش کو

مختلط ترسا بچوں سے شیرہ خانے میں رہا
کن نے دیکھا مسجدوں میں میر کافر کیش کو

نازکی کوئی یہ بھی ٹھسک ہے جی کا ہمکو کڑھاتے ہو
آتے ہو تمکین سے ایسے جیسے کہیں کو جاتے ہو
غیر کی ہمراہی کی عزت جی مارے ہے عاشق کا
پاس کبھو جو آتے ہو تو ساتھ اک تحفہ لاتے ہو
مست نہیں ہو بال ہیں بکھرے پیچ گلے میں پگڑی کے
ساختہ ایسے بگڑے رہے ہو تم جیسے مدماتے ہو

پردہ ہم سے کر لیتے ہو جب آتے ہو مجلس میں
آنکھیں سب سے ملاتے ہو کچھ ہم ہی سے شرماتے ہو

سوچ نہیں یہ فقیر ہے اپنا جیب دریدہ دیوانا
ٹھوکر لگتے دامن کو کس ناز سے تم یاں آتے ہو

رفتۂ عشق کسو کا یار و راہ چلے ہے کس کے کہے
کون رہا ہے آپ میں یاں تم کس کے تئیں سمجھاتے ہو

صبر بلا پر کرتے صاحب بیتابی کا حاصل کیا
کوئی مقلب قلبوں کا ہے میرؔ عبث گھبراتے ہو

آج ہمارا سر و کہتا ہے صندل کا بھی نام نہ لو
رنگ اُس کا کہیں یاد نہ دے زنہار اُس سے کچھ کام نہ لو

یاد آئے وہ کیا تڑپے ہے کیا بیتابی کرتا ہے
کوئی تسلی پھر ہوتا ہے جب تک دل کو تھام نہ لو

میرؔ کہاں تک بیخوابی وہ میں ہوں ٹک جو سلاتا ہوں
بس جو تمہارا کچھ بھی چلے تو ایک گھڑی آرام نہ لو

کیا کیا جھمک گئے ہیں رخسار یار دونوں
رہ رہ گئے مہ و خور آئینہ وار دونوں

تصویر قیس و لیلیٰ ٹک ہاتھ لے کے دیکھو
کیسے ہیں عاشقی کے حیرانِ کار دونوں

دستِ جنوں نے اب کے کپڑوں کی دھجیاں کیں
دامان و جیب میرے ہیں تار تار دونوں

پرسال کی سی بارش برسوں ہیں پھر ہوئی تھی
ابر اور دیدۂ تر روتے ہیں زار دونوں

دن ہیں بڑے کبھو کے راتیں بڑی کبھو کی
رہتے نہیں ہیں یکساں لیل و نہار دونوں

دل اور برق ابر و فصلِ گل ایک سے ہیں
لینے کہ بیکلی سے ہیں بیقرار دونوں

خوش رنگ اشک خونیں گرتے رہے برابر
باغ و بہار ہیں اب جیب و کنار دونوں

اس شاخِ گل سے قد کی کیا چوٹ لگ گئی ہے
جو دل جگر ہوئے ہیں خون ایکبار دونوں

چلتے جو اُس کو دیکھا جی اپنے کھنچ گئے ہیں
ہم اور میرؔ یاں ہیں بے اختیار دونوں

کام گئے ہیں شوق سے ضائع صبر نہ آیا یاروں کو
مار رکھا بیتابیِ دل نے ہم سب غم کے ماروں کو

جی تو جلا احباب کا مجھ پر عشق میں اُس شعلے کے پر
رو ہی نہیں ہے بات کا ہرگز اب نے جانے دو رونکو

آوے ہیں در بستر یعنی منھ پر آس سے پارے کے
صبح تلک دیکھا کرتے ہیں منھ خوبیش شا رونکو

گردش چشم سیہ کاسہ سے جمع نہ رکھو خاطر تم
بھو کا پیاسا مار رکھا ہے تم سے ان نے ہزاروں کو

کوہ کن و مجنون و وامق میر گئے تھے صحبت میں
منھ نہ لگایا ہم میں کنھوں نے ایسے ہرزہ کارونکو

جی رکا رکنے سے پرے کچھ تو
آسماں آگیا ورے کچھ تو

جو نہ ہووے نماز کریے نیاز
آدمی چاہیئے کرے کچھ تو

طالع و جذب و زاری و زر و زور
عشق میں چاہیئے ارے کچھ تو

جینا کیا ہے جہانِ فانی کا
مرتے جاتے ہیں کچھ مرے کچھ تو

سہمے سہمے نظر پڑے ہیں میر
اسکے اطوار سے ڈرے کچھ تو

رفتن رنگین گلرویاں سے کیا ٹھہراؤ ہو
ساتھ اُن کے چل تماشا کرنے جسکو چاؤ ہو

قد جو خم پیری سے ہو تو سر کا دھننا ہیچ ہے
ہو چکا ہونا جو کچھ تھا اب عبث پچتاؤ ہو

خون کے سیلاب میں ڈوبے ہوؤں کا کیا شمار
ٹک بہے وہ جدول شمشیر تو ستھراؤ ہو

تھی وفا و مہر تو بابت دیارِ عشق کے
دیکھیں شہر حسن میں اس جنس کا کیا بھاؤ ہو

گریۂ خونیں سے ہیں رخسار میرے لعل تر
دیدۂ خونباریوں ہیں جیسے منھ پر گھاؤ ہو

جی کی لاگ بلا ہے کوئی دل جینے سے اٹھا بیٹھو
ہو کے فقیر گلی میں کسو کی رنج اٹھاؤ جا بیٹھو

کیا دیکھو ہو آگا پیچھا عشق اگر فی الواقع ہے
ایک دم اس بے چشم درو کی تیغ تلے بھی جا بیٹھو

ایک سماں تھا وصل کا اس کے سیج پہ سوئے پھولوں کی
اب ہے زمانِ فراق بچھونے خار و خسک کے بچھا بیٹھو

کام کی صورت اپنی پیارے کیا بگڑی ہے کیا کہیے
آؤ کبھو مدت میں یاں تو اچھے منھ کو بنا بیٹھو

ٹیڑھی چال سے اُس کی خائف چپکے کھڑے کیا پھرتے ہو
سیدھی سیدھی دو چار اُس کو جرأت کرکے سنا بیٹھو
ٹیڑھی بھویں دشمن پہ کرو ہو عشق و ہوس میں تمیز کرو
یعنی تیغ ستم اک اُس کو چلتے پھرتے لگا بیٹھو

نکلا خط پشت لب اُس کا خضر و مسیحا مرنے لگے
سوچتے کیا ہو میر عبث اب زہر منگا کر کھا بیٹھو

صبر کہاں جو تم کو کہیے لگ کے گلے سے سو جاؤ
بولو نہ بولو بیٹھو نہ بیٹھو کھڑے کھڑے ٹک ہو جاؤ
برسے ہے غربت سی غربت گور کے اوپر عاشق کی
ابر نمط جو آؤ ادھر تو دیکھ کے تم بھی رو جاؤ

میر جہاں ہے مقامر خانہ پیدا یہاں کا نہ پیدا ہے
آؤ یہاں تو داؤ نخستیں اپنے تئیں بھی کھو جاؤ

ردیف ہائے ہوز

یار صد حیف کہ بیگانہ رہا اپنے ساتھ
اتحاد اتنا ہے اُس سے کہ ہمیشہ ہے وصال
عہد یہ تھا کہ نہ بے وصل بدن سے جاوے
رنج نے رنج بہت کھینچے پہونچکر ہم تک
دس گنا دکھنے لگا زخم رکھے مرہم کے

آشنایانہ نہ کی کوئی ادا اپنے ساتھ
اپنے مطلوب کو ہے ربط سدا اپنے ساتھ
سو جدا ہوتا ہے کی جی نے دغا اپنے ساتھ
اک بلا میں ہے گرفتار بلا اپنے ساتھ
درد کا کام رہی کرتی دوا اپنے ساتھ

وارد شہر ہیں یا دشت میں ہم شوق طلب
ہر زماں پھرتا ہے اسے میر لگا اپنے ساتھ

گرمی سے عاشقی کی آخر کو ہو رہا کچھ
آزردہ دل ہزاروں مرتے ہی ہم سنے ہیں
وارفتہ ہے گلستاں اس روئے چمپئی کا
وہ آرسی کے آگے پہروں ہے بے تکلف

بانی ہوا ہے کچھ تو میرا جگر جلا کچھ
بیماری دلی کی شاید نہیں دوا کچھ
ہے فصل گل پہ گل کا اب وہ نہیں مزا کچھ
منھ سے ہمارے اُسکو آتی نہیں حیا کچھ

دل ہی کے غم میں گزرے دن جو کہ عمر کے تھے
اب رہتا ہے اس نگر سے جاتا نہیں رہا کچھ

منھ کر کبھی میری جانب سوتا نہیں کبھو وہ
کیا جانوں اُس کے جی میں ہے اس طرف سے کیا کچھ

دل لے فقیر کا بھی ہاتھوں میں دل دہی کر
آجائے ہے جہاں میں آگے لیا دیا کچھ

یاروں کی آہ و زاری ہووے قبول کیونکر
اُن کی زباں میں کچھ ہے دل میں ہے کچھ دعا کچھ

ساری وہی حقیقت محفوظ سب میں رکھئے
کہیئے نمود ہووے جو اس کے ماسوا کچھ

حرف و سخن کی اُس سے اپنی مجال کیا ہے
اُن نے کہا ہے کیا کیا میں نے اگر کہا کچھ

کب تک یہ بد شرابی پیری تو میر آئی
جانے کے ہو مہیا اب کر چلو بھلا کچھ

حیرت طلب کو کام نہیں ہے کسو کے ساتھ
جانِ عزیز ابھی ہے مری آبرو کے ساتھ

یکرنگ آشنا ہیں خرابات ہی کے لوگ
سر شیشیوں کے پھوٹتے دیکھے سبو کے ساتھ

قمری کا لوہو پانی ہوا ایک عشق میں
آتا ہے اُس کا خونِ جگر آبجو کے ساتھ

خالی نہیں ہے خواہش دل سے کوئی بشر
جاتے ہیں سب جہاں سے اک آرزو کے ساتھ

دم میں ہے دم جہاں تئیں گرمِ تلاش ہوں
سو پیچ و تاب رہتے ہیں ہر ایک مو کے ساتھ

کیا اضطراب عشق سے ہیں حرف زن ہوں میر
منھ تک جگر تو آنے لگا گفتگو کے ساتھ

سر تو بہت پٹکیا پہ فائدہ کیا نہ
اُلجھاؤ تھا جو اُسکی زلفوں سے سو گیا نہ

وے زلفیں عقدہ عقدہ ہیں آفتِ زمانہ
عقدہ ہمارے دل کا اُن سے بھی کچھ کھلا نہ

غنچے کے دل کی کچھ تھی وا شد بہار آئی
افسوس ہے کہ موسم گل کا بہت رہا نہ

مرنا ہمارا اُس سے کہہ دیکھیں یار جا کر
حال اُس کا یہ خبر بھی درہم کرے ہے یا نہ

کن رس بھی حیف اسکو تھا نہ کہا تو کیا کیا
قطعہ لطیفہ بذلہ شعر و غزل ترانہ

بیمارِ عشق بیکس جیتا رہے گا کیونکر
احوال گیر کم ہو پہونچی بہم دوانہ

یوں درمیاں چمن کے لینے تو گئے تھے ہمکو
پر فرطِ بیخودی سے ہم تھے نہ درمیانہ

چھو سکتے بھی نہیں ہیں ہم سے لپٹے بال اُنکے
ہیں شانہ گیر سے جو یہ ربط کے نرم شانہ

وحشت چمن میں ہمکو کل صبح بیشتر تھی
بے اُسکے پھول و گل سے جی ایکدم لگا نہ

صحبت برآر اپنی لوگوں سے کیونکہ ہوئے
معقول گو ہم اتنے وے ایسے ہرزہ جانہ

رگڑے گئے ہیں جبے ازبسکہ آستاں کے — آئینہ ہو رہا ہے وہ سنگِ آستانہ

ہے عینہ اُبلتا سیلاب رود کا سا
اے میرؔ چشمِ تر ہے یا کوئی رودخانہ

غمِ فوت سے بندے آزادہ رہ — خدا ہے تو کیا غم ہے دل شاد رہ

چاہ میں دل پر ظلم ستم ہے جور و جفا ہے کیا کیا کچھ — درد و الم ہے کلفت و غم ہے رنج و بلا ہے کیا کیا کچھ
عاشق کے مر جانے کے اسباب بہت رسوائی ہیں — دل بھی لگا ہے شرم و حیا ہے مہر و وفا ہے کیا کیا کچھ
عشق نے دیکر آگ یکایک شہرِ تن کو پھونک دیا — دل تو جلا ہے دماغ جلا ہے اور جلا ہے کیا کیا کچھ
دل لینے کو فریفتہ کے بہتیرا کچھ ہے یار کنے — غمزہ عشوہ چشمک چتون ناز و ادا ہے کیا کیا کچھ
کیا کیا دیدہ درائی سی ہم کرتے رہے اس عالم میں — تمسے آگے سنو ہو صاحب نہیں ہوا ہے کیا کیا کچھ
حسرتِ وصل اندوہِ جدائی خواہش کاوش ذوق و شوق — یوں تو چلا ہوں اکیلا لیکن ساتھ چلا ہے کیا کیا کچھ

کیا کہیے جب میں نے کہا ہے میرؔ ہے مغرور اسیر تو
اپنی زباں مت کھول تو اُن نے اور کہا ہے کیا کیا کچھ

ردیف یائے تحتانی

میں تو تنک صبری سے رہ نہیں سکتا اک دم بھی — ناز و غرور بہت ہے اُسکا لطف نہیں ہے کم کم بھی
جامۂ احرام آخر تہ کر دل کی اور توجہ کی — در پہ حرم کے اسلیے تھے ہم کوئی ملے گا محرم بھی
دیکھ ہوا کو طائرِ گلشن کس حسرت سے کہتے تھے — گل ہی چلے جاتے نہیں یاں چلنے کو بیٹھے ہیں ہم بھی
کیا کیا میں بیتاب رہا ہوں رنج و الم سے محبت کے — ہے عالم کچھ اور ہی میرے دل کے مرض کا عالم بھی
پنبہ و داغ کیا ہے کیا کیا اچھے ہونے والے نہ تھے — زخموں پر چھاتی کے میرے رکھ دیکھو نہ مرہم بھی
گرم ہوا ہی ہوگا جو ہر سیرِ چمن کی کر لیجے — پھول بکھرتے جاتے ہیں کچھ آخر ہے اب موسم بھی

نعل جڑے سینے کو کوٹا چہرے پہ خاک ملی
میرؔ کیا ہے میں نے نہایت دل جانے کا ماتم بھی

نقدِ دل غفلت سے کھویا راہ کھوٹی کر گئے — کارواں جاتا رہا ہم خواب ہی میں مر گئے
کیا کہیں اُن نے جو پھیرا اپنے در پر سے ہمیں — مر گئے غیرت سے ہم بھی پر نہ اُسکے گھر گئے
واعظِ ناکس کی باتوں پر کوئی جاتا ہے میرؔ — آؤ میخانے چلو تم کس کے کہنے پر گئے

اے کاش کوئی جاکر کہہ آوے یار سے بھی
یاں کام جا چکا ہے اب اختیار سے بھی

تا چند بیدماغی کبتک سخن خشن ہو
کوئی تو بات کریے اخلاص و پیار سے بھی

یک معنی شگفتہ سو رنگ بندھ گئے ہیں
الوان گل ہیں ہر سو انکی بہار سے بھی

کیا جیب آستیں ہی سیلاب خیز ہے یاں
دریا بہا کریں ہیں میرے کنار سے بھی

باغ وفا سے ہمنے پایا سو پھل یہ پایا
سینے میں چاک تر ہے اب اُن انار سے بھی

راہ اُسکی برسوں دیکھی آنکھیں غبار لائیں
نکلا نہ کام اپنا اس انتظار سے بھی

جان و جہاں سے گزرا ہیں میر جنکی خاطر
بچکر نکلتے ہیں وے میرے مزار سے بھی

خوار پھرایا گلیوں گلیوں سر مارے دیواروں سے
کیا کیا اُن نے سلوک کیے ہیں شہر کے عزت داروں سے

دور اُس سے تو اپنے بھائیں آگ لگی ہے گلستاں میں
آنکھیں نہیں پڑتی ہیں گل پر سینکتی ہیں انگاروں سے

شور کیا جو میں نے شبانگہ بیتابی سے دل کی بہت
کہنے لگا جی تنگ آیا ان مہر و وفا کے ماروں سے

وہ جو ماہ زمیں گرد اپنا دو پہری ہے ان روزوں
شوق میں ہر شب حرف و سخن ہے ہمکو فلک کے تاروں سے

حرف شنو ساتھ اپنے نہیں ہیں ورنہ ورآتے قافلہ ساں
راہ میں باتیں کس کس ڈھب کی کرتے ہیں ہم یاروں سے

خستہ ہوا اپنا کیسا ہی کوئی پھر بھی گلے سے لگاتے ہیں
وحشت ایک تمھیں کو دیکھی اپنے سینہ فگاروں سے

داغ جگرواری ہیں اپنی کشتے ثبات دل کی ہیں
ہم نہ گئے جاگہ سے ہرگز قیمہ ہوئے تلواروں سے

حرف کی پہچان اُسکو نہ تھی تو سادہ ہی کچھ اچھا تھا
بات اگر مانے ہے کوئی سو سو اب تکراروں سے

کوہکن و مجنوں یہ دونوں دشت و کوہ میں سر ماریں

شوق نہیں ملنے کا ہم کو میر ایسے آواروں سے

زور کش ہیں گے عشق کے ہم بھی
ہم نے کھینچی کمانِ رستم بھی

ہے بلا دھوم دل تڑپنے کی
ایسا ہوتا نہیں ہے اودھم بھی

کچھ نہیں اور دیکھیں ہیں کیا کیا
خواب کا سا ہے یاں کا عالم بھی

حیف دل جاتے پڑ گئی جی کی
ورنہ غم کرتے لیتے ماتم بھی

حرمِ کعبہ کا نہ پایا بھید
نہ ملا واں کا ایک محرم بھی

خشک تنے سا تھا شیخ حیف ہوا
یاں تو یار اسکو دیتے تھے دم بھی

کھپ ہی جاتا ہے آدمی اے میر
آفتِ جاں ہے عشق کا غم بھی

لطف ہے کیا انواع ستم جو اُس سے کوئی بیان کرے
گوش زد اک دن ہو ویں کہیں تو بے لطفی سے زبان کرے

ہم تو چاہ کر اس پتھر کو سخت ندامت کھینچی ہے
چاہ کرے اب وہ کوئی جو چاہت کا ارمان کرے

سودے میں دل کے نفع جو چاہے خام طمع سودائی ہے
وار اسرار عشق میں کیسا جی کا بھی نقصان کرے

حشر کے ہنگامے میں چاہیں داد عشق تو حسن نہیں
کاشکے یاں وہ ظالم اپنے دل ہی میں دیوان کرے

آتش خو مغرور سے ویسے عہدہ بر آ کیا عاشق ہو
دل کو جلاوے منت رکھے جی مارے احسان کرے

چمنِ عشقِ غم افزا سے کام نہایت مشکل ہے
اب بھی نہیں نومیدی دل کو شاید عشق آسان کرے

کہنے میں یہ بات آتی نہیں ہو سیر خدا کی قدرت کی
موند کر آنکھیں میر اگر تو دل کی طرف ٹک دھیان کرے

بیدل ہوئے بیدیں ہوئے بے وقر ہم ات گت ہوئے
بے کس ہوئے بے بس ہوئے بے کل ہوئے بے گت ہوئے

ہم عشق میں کیا کیا ہوئے اب آخر آخر ہو چکے
بے مت ہوئے بے ست ہوئے بیخود ہوئے میّت ہوئے

اُلفت جو کی کہتا ہے جی حالت نہیں عزت نہیں
ہم بابت ذلت ہوئے شائستۂ کلفت ہوئے

گر کوہ غم ایسا گراں ہم سے اُٹھے پس دوستاں
سوکھے سے ہم دینت ہوئے تنکے سے ہم پربت ہوئے

کیا روئیے قیدی ہیں اب رویت بھی بن اگل کچھ نہیں
بے پر ہوئے بے گھر ہوئے بے زر ہوئے بے پت ہوئے

آنکھیں بھر آئیں جی رندھا کہیئے سو کیا چپکے سے تھے
جی چاہتا مطلق نہ تھا ناچار ہم رخصت ہوئے

یا مست درگاہوں میں شب کرتے تھے شاہد بازیاں
تسبیح لے کر ہاتھ میں یا میر اب حضرت ہوئے

باغ میں سیر کبھو ہم بھی کیا کرتے تھے
روش آب رواں پھیلے پھرا کرتے تھے

غیرت عشق کسو وقت بلا تھی ہمکو
تھوڑی ہی آزردگی میں ترک وفا کرتے تھے

دل کی بیماری سے خاطر تو ہماری تھی جمع
لوگ کچھ یوں ہی محبت سے دوا کرتے تھے

جب تلک شرم رہی مانع شوخی اُس کی
تب تلک ہم بھی ستمدیدہ حیا کرتے تھے

مائل کفر جوانی میں بہت تھے ہم لوگ
دیر میں مسجدوں میں دیر رہا کرتے تھے

آتش عشق جہاں سوز کی لپٹیں تھیں قہر
دل جگر جان ورثے میں جلا کرتے تھے

اب تو بیتابی دل نے ہمیں بٹھلا ہی دیا
آگے رنج و تعب عشق اُٹھا کرتے تھے

اُٹھ گئے میر مرے تکیے کو کہیں گے یاں میر
درد دل بیٹھے کہانی سی کہا کرتے تھے

حال نہیں ہے دل میں مطلق شور و فغاں رسوائی ہے
یار گیا مجلس سے دیکھیں کس کس کی اب آئی ہے

سلہ میّت بکسر دوم صحیح ہے۔ اور اس کا قافیہ ات گت کے ساتھ اب نہ کرنا چاہیئے۔ میر کے زمانہ میں اس طرح قافیہ کرنا جائز سمجھتے ہونگے ۱۲

آنکھیں مل کر کھولیں اُن نے عالم میں آشوب اُٹھا
بال کھلے دکھلائی دیا سو ہر کوئی سودائی ہے

ڈول بیاں کیا کوئی کرے اس وعدہ خلاف کی دیہی کا
ڈھال کے سانچے میں صانع نے وہ ترکیب بنائی ہے

نسبت کیا ان لوگوں سے ہم کو شہری ہیں دیوانے ہم
ہے فرہاد اک آدم کوہی مجنوں اک صحرائی ہے

ہے پتھر سا چھاتی میں میری کثرت غم کی حیرت سے
کیا کہیئے پہلو سے دل کے سخت اذیت پائی ہے

باغ میں جاکر ہم جو رہے سو اور دماغ آشفتہ ہوا
کیا کیا سر پہ ہمارے آکر بلبل شب چلّائی ہے

کیسا کیسا عجز ہے اپنا کیسے خاک میں ملتے ہیں
کیا کیا ناز و غرور اُس کو ہے کیا کیا بے پروائی ہے

قصہ ہم غربت زدگاں کا کہنے کے شایستہ نہیں
بے صبری کم پائی نہ ہے پھر دو دو اُس سے تنہائی ہے

چشمک چتوں نیچی نگاہیں چاہ کے تیری نشتر ہیں
میر عبث بگڑے ہے ہم سے آنکھ کہیں تو لگائی ہے

دنیا کی قدر کیا جو طلب گار ہو کوئی
کچھ چیز مال ہو تو خریدار ہو کوئی

کیا ابر رحمت ان کی برستا ہے لطف سے
طاعت گزیں جو ہو سو گنہگار ہو کوئی

کیا ضعف تن میں ہے جگر و دل دماغ بن
پوچھے جو اس قشون میں سردار ہو کوئی

ہم عاشقان زرد و زبون و نزار سے
مت کر ادائیں ایسی کہ بیزار ہو کوئی

چپکے ہیں ہم تو حیرت حالات عشق سے
کرے بیاں جو واقف اسرار ہو کوئی

یکساں ہوئے ہیں خاک سے پامال ہو کے ہم
کیا اور اُس کی راہ میں ہموار ہو کوئی

وہ رہ سکے ہے دل زدہ کچھ منتظر کھڑا
حیرت سے اُسکے در پہ جو دیوار ہو کوئی

ایک نسخہ عجیب ہے لڑکا طبیب کا
کچھ غم نہیں ہے اسکو جو بیمار ہو کوئی

کیا اضطراب دل سے کہے میر سر عشق
یہ حال سمجھے وہ جو گرفتار ہو کوئی

اللہ رے کیا نمک ہے آدم کے حسن میں بھی
اچھی لگی نہ ہم کو خوش صورتی پری کی
ہے اپنی مہرورزی جانکاہ و دل گدازاں
اس رنج میں نہیں ہے امید بہتری کی
رفتار ناز کا ہے پامال ایک عالم
اس خود نمائی کیسی خود رائی خودسری کی
اے کاش اب نہ چھوڑے صیاد قیدیوں کو
جی ہی سے مارتی ہے آزادی بے پری کی
اس رشک مہ سے ہر شب ہے غیر سے لڑائی
بخت سیہ نے بارے ان روزوں یاوری کی
کھٹ پٹیاں ہی کی ہیں صراف کے نے ہم سے
پیسے دیے بیروئی کی پھیرے گئے کھری کی

گزرے لبان صرصر عالم سے بے تامل
افسوس میر تم نے کیا سیر سرسری کی

اکثر کی بیدماغی ہر دم کی سرگرانی
اب کب گئی اٹھائی ہے زور ناتوانی
تم دل کو دیتے ہو تو بیدل سمجھ کے ہو جو
ہم نے تو قدر دل کی افسوس کچھ نہ جانی
عہد شباب کی تو فرصت تھی ایک چشمک
مژگاں بہم زدن میں جاتی رہی جوانی
حسرت سے دیکھ رہیو اے نامہ بر منہ اس کا
بس اور کچھ نہ کہیو ہرگز مری زبانی
اس غیرت قمر کی خجلت سے تاب رخ کی
آئینہ تو سراسر ہوتا ہے پانی پانی
مرزائی فقر میں بھی دل سے گئی نہ میرے
چہرے کے رنگ اپنی چادر کی زعفرانی

یوں میر تو تم اپنا برسوں کہا کرینگے
اب رات کم ہے سو تو بس ہو چکی کہانی

چلو چمن میں جو دل کھلے ٹک بہم غم دل کہا کریں گے
طیور ہی سے بکا کریں گے گلوں کے آگے بکا کریں گے
قرار دل سے گیا ہے اب کی کہ رک کے گھر میں نہ مر گیا ہوں
بہار آئی جو اپنے جیتے تو سیر کرنے چلا کریں گے
ہلاک ہونا مقرری ہے مرض سے دل کے پہ تم کڑھو ہو
مزاج صاحب اگر ادھر ہے تو ہم بھی اپنی دوا کریں گے
برا ہے دل کا ہمارے لگنا لگا نہ غصے سے عاشقی کے
کبھی جبیں سے گلی میں اس کی خراب و خستہ پھرا کریں گے
وصال خوباں ہے کر تمنا کہ زہر شیریں یہی ہے ان کی

خراب و رسوا جدا کریں گے ہلاک دل کر جدا کریں گے
اگر وہ رشک بہار سمجھے کہ رنگ اپنا بھی ہے اب ایسا
ورق خزاں میں جو زرد ہونگے غم دل اُس پر لکھا کریں گے

غم محبت میں میر ہم کو ہمیشہ جلنا ہمیشہ مرنا
صعوبت ایسی دماغ رفتہ کہاں تلک ہم وفا کریں گے

سنو سرگزشت اب ہماری زبانی — کہی گرچہ جاتی نہیں یہ کہانی
بہت نذریں مانیں کہ مانیگا کہنا — ولیکن مری بات ہرگز نہ مانی
بہت ہو پریشاں کھنچا اسکے غم میں — خدا جانے ہے بیکسی کی نشانی
گیا بھول جی شیب میں جو ہمارا — بہت یاد آئی رنگینی وہ جوانی
توقع نہیں یاں تلک آنے کی اب سے — اگر لطف مجھ پر کریں مہربانی
کریں ضبط گریہ سے دل کی عمارت — ہوئی چشم تر اس خرابے کی بانی
ملا دیتی ہے خاک میں آدمی کو — محبت ہے کوئی بلا آسمانی

گرامی گہر میر جی تھا ہمارا
ولے عشق میں قدر ہمنے نہ جانی

جو چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے — پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے
رنگ ہوا یوں ٹپکے ہے جیسے شراب چواتے ہیں — آگے ہو میخانے کے نکلو عہد بادہ گساراں ہے
عشق کے میداں داروں میں بھی مرنے کا ہے وصف بہت — یعنی مصیبت ایسی اٹھانا کار کار گزاراں ہے
دل ہے داغ جگر ہے ٹکڑے آنسو سارے خون ہوئے — لوہو پانی ایک کرے یہ عشق لالہ عذاراں ہے

کوہکن و مجنوں کی خاطر دشت و کوہ میں ہم نہ گئے
عشق میں ہمکو میر نہایت پاس عزت داراں ہے

ہم اس مرتبہ پھر بھی لشکر گئے — تعب ایسی گزری کہ مر مر گئے
نظر اک سپاہی پسر سے لڑی — قریب اسکے تلوار کر کر گئے
ہم ہمرہی کے سرگرم تھے — خدا جانے وہ لوگ کیدھر گئے
لہو میری آنکھوں میں آتا نہیں — جگر کے مگر زخم سب بھر گئے
رابطہ کس میں نہیں میر جی — ہوا جو کوئی وے بھی باہر گئے

کب وعدہ کی رات وہ آئی جو اُس میں نہ لڑائی ہوئی
آخر اس اوباش نے مارا رہتی نہیں ہے آئی ہوئی

چاہ میں اُس بے اُلفت کے گھبراہٹ دل ہی کو تو نہیں
سارے حواسوں میں ہے تشتت جان بھی ہے گھبرائی ہوئی

گرچہ نظر ہے پشت پا پر لیکن قہر قیامت ہے
گڑ جاتی ہے دل میں ہمارے آنکھ اُسکی شرمائی ہوئی

جنگل جنگل شوق کے مارے ناقہ سوار پھرا کی ہے
مجنوں جو صحرائی ہوا تو لیلیٰ بھی سودائی ہوئی

دردِ دل سوزانِ محبت محو جو ہو تو عرش پہ ہو
یعنی دور نہ پہنچے گی جا کر عشق کی آگ لگائی ہوئی

چتون کی آغاز سے ظالم ترکِ مروّت پیدا ہے
اہلِ نظر سے چھپتی نہیں ہے آنکھ کسو کی چھپائی ہوئی

میر کا حال نہ پوچھو کچھ تم کہنہ رباط سے پیری میں
رقص کناں بازار تک آئے عالم میں رسوائی ہوئی

موسم ہے نکلے شاخوں سے پتے ہرے ہرے
آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
کیا سمجھے اس کے رتبۂ عالی کو اہلِ خاک
مرتا تھا میں تو باز رکھا مرنے سے مجھے

پودھے چمن میں پھولوں سے دیکھے بھرے بھرے
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرھانے دھرے دھرے
پھرتے ہیں جوں سپہر بہت ہم ورے ورے
یہ کہہ کے کوئی ایسا کرے ہے ارے ارے

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگِ گل سے میر
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

ہماری تیری مودت ہے دوستداری ہے
گئی وہ نوبتِ مجنوں کہ نام باجے تھا
کریں تو جا کے گدایانہ اس طرف آواز
مسافرانِ رہِ عشق ہیں شکیب سے چپ
خرابی حال کی دلخواہ جو تمھارے تھی

ہزار سابقوں سے سابق ایک یاری ہے
ہمارا شورِ جنوں اب ہے اپنی باری ہے
اگر صدا کوئی پہچانے شرمساری ہے
دگرنہ حال ہمارا تو اضطراری ہے
سو خطرے میں نہیں خاطر ہمیں تمھاری ہے

ہمیں ہی عشق میں جینے کا کچھ خیال نہیں
وگرنہ سب کے تئیں جان اپنی پیاری ہے

نگاہ غور سے کر میر سارے عالم میں
کہ ہووے عین حقیقت وہی تو ساری ہے

نہ خاطر پر الم تیرے نہ دل پر کچھ ستم تیرے
محل رحم ہو ویں کس طرح مظلوم ہم تیرے

چو ٹک بھی سایہ گستر ہوگا تو اس خشک مزرع پر
بہت ہم ہوںگے احسانمند اے ابر کرم تیرے

قہر

انھیں کی طبع جاں اے میر مائل ہوگی سنبل سے
نہیں دیکھے جنھوں نے گیسوئے پرپیچ و خم تیرے

عشق میں کھوئے جاؤگے تو بات کی تہ بھی پاؤ گے
قدر ہماری کچھ جانوگے دل کو کہیں جو لگاؤ گے

صبر کہاں بیتابی دل سے چین کہاں بیخوابی سے
سو سو بار گلی میں تکتے گھر سے باہر آؤ گے

شوق کمال کو پہونچا تو نہیں خط و کتابت حرف و سخن
قاصد کے محتاج نہ ہوگے آپ ہی دوڑے جاؤ گے

صنعت گریاں صاحب بندہ دل کی لگی کب بیٹھ گئیں
ایک نہیں وہ سننے کا تم باتیں بہت بناؤگے

چاہ گئے درویش ہوئے تو آب و خورش کی فکر نہیں
لوہو پیوگے اپنا ہر دم غم غصہ ہی کھاؤ گے

رنگ محبت کے ہیں کتنے کوئی تمہیں خوش آویگا
خون کروگے یا دل کو یا داغ جگر پہ جلاؤ گے

رہتے ہیں مبہوت الفت ہیں گم گشتہ کلفت میں
بھولے بھولے آپ ہی پھروگے کس کو راہ بتاؤگے

اشک تو پانی سے ہیں لیکن جلتے جلتے آویں گے
دل کی لگی حیران ہیں صاحب کس ڈھب لگے بجھاؤگے

چاہت میر سبھی کرتے ہیں رنج و تعب میں رہتے ہیں
تم جو ابھی بیتاب ہو ایسے جی سے ہاتھ اٹھاؤگے

ابھی سفر کو ہم سے وہ مہ جدا گیا ہے
رخصت میں لگ گلے سے چھاتی جلا گیا ہے

فرہاد و قیس گزرے اب شور ہے ہمارا
ہر کوئی اپنی نوبت دو دن بجا گیا ہے

ضعف دماغ سے میں پھر کر نظر نہ دیکھا
کیا دیر میں پلک سے میری اٹھا گیا ہے

بیجا ہوئے بہت دل رفتار دیکھ اس کی
عزلت گزینوں سے بھی کم ہی رہا گیا ہے

رسوا خراب و غمکش دل باختہ محبت
عاشق کو تیرے غم میں کیا کیا کہا گیا ہے

اے میر شعر کہنا کیا ہے کمال انساں
یہ بھی خیال سا کچھ خاطر میں آگیا ہے

ق

شاعر نہیں جو دیکھا تو تو ہے کوئی ساحر
دو چار شعر پڑھ کر سب کو رجھا گیا ہے

کہو سو کریے فراق اس کا تو جی کو میرے کھپا گیا ہے
درون دل میں آگ اک لگا گیا ہے بروں کو یکسر جلا گیا ہے

اگرچہ مارا گیرڈ کے مجکو ولیک لطف و کرم سے پھر بھی
نشان میرے مزار کا وہ سر رہ اپنی بنا گیا ہے

خرام شوخی کے ہمرہ اس کے ہزار جانیں چلی گئیں ہیں
رکھا ہے رہ میں قدم جو ان نے تو میر کس سے رہا گیا ہے

صبر کر رہ جو وہ عتاب کرے
ورنہ کیا جانے کیا خطاب کرے

عشق میں دل بہت ہے بے آرام
چین دیوے تو کوئی خواب کرے

وقت یاں کم ہے چاہیے آدم
کرنا جو کچھ ہو سو شتاب کرے

پھاڑ کر خط کو ان نے پھینکدیا
نامہ بر اس کا کیا جواب کرے

ہے برافروختہ جو خشم سے وہ
آتش شعلہ زن کو آب کرے

ہے تو یک قطرہ خون ہی لیکن
قہر ہے دل جو اضطراب کرے

میر اٹھ بتکدے سے کعبے گیا
کیا کرے جو خدا خراب کرے

افسانہ خواں کا لڑکا کیا کہیے دیدنی ہے
قصہ ہمارا اس کا یارو شنیدنی ہے

اپنا تو دست کوتہ زہ تک کبھی نہ پہونچا
نقاش سے کہیں وہ دامن کشیدنی ہے

پروانہ مرمٹا ہے جل کر نہ کچھ کہا تو
اے شمع یہ زباں تو ظالم بریدنی ہے

حسرت سے عاشقی کی پیری میں کیا کہیں ہم
دنداں نہیں ہیں منہ میں وہ لب گزیدنی ہے

ہے راست میر صاحب کس کس کا عیب کریے
سر ہے فگندنی ہے قد ہے خمیدنی ہے

حال رہا ہو ہم میں کچھ تو حال کسو سے کہا جاوے
آن رہی ہے آج دموں پر کل تک کیونکہ رہا جاوے

اُس کی گلی وہ ظلم کدہ ہے آ نکلے جو کوئی واں
گرد رہ عشق آلودہ تو لوہو میں اپنے نہا جاوے

آنکھوں کی خوننابہ فشانی دیکھیں میر کہاں تک یہ
زرد ہمارے رخساروں پر ہردم خون بہا جاوے

عشق چھپا کر پچھتائے ہم سوکھ گئے رنجور ہوئے
یعنی آنسو پی پی گئے سوزش سے جگر ناسور ہوئے

ہم جو گئے سرمستِ محبت اُس اوباش کے کوچے میں
کھائیں کھڑی تلواریں اُس کی زخمی نشہ میں چور ہوئے

کوئی نہ ہم کو جانے تھا ہم ایسے تھے گمنام آ گئے
یمنِ عشق سے رسوا ہو کر شہروں میں مشہور ہوئے

کیا باطل نا چیز یہ لونڈے قدر پر اپنی نازاں ہیں
قدرت حق سے کھیل تو دیکھو عاشق بمقدور ہوئے

سر عاشق کا کاٹ کے اُن کو سر بگریباں رہنا تھا
سو تو پگڑی پھیر رکھی ہے اور بھی وے مغرور ہوئے

زرد و زبون و زار ہوئے ہیں لطف ہے کیا اس جینے کا
مردے سے بھی برسوں کے ہم ہجراں میں بے نور ہوئے

پاس ہی رہنا اکثر اس کے میر سبب تھا جینے کا
پہونچ گئے مرنے کے نزدیک اُس سے جو ٹک دور ہوئے

جو بحث جی سے وفا میں ہے سو تو حاضر ہے
بہ فرطِ شوق سے مجکو ملالِ خاطر ہے

وصال ہووے تو قدرت نما ہے قدرت کی
نہ ہم کو قدر نہ قدرت خدا ہی قادر ہے

مسافرانہ ملے تو کہا شرارت سے / غریب کہتے ہیں لوگ ان کو بھی یہ نادر ہے

کسو سیاق سے تحریر طول شوق نہ ہو / زبان خامۂ لسّان اس میں قاصر ہے

بہم رکھا کرو شطرنج کی ہی بازی کاش
نہ میر بار ہے خاطر کا یار شاطر ہے

ہوتی نہیں تسلّیِ دل گلستاں سے بھی / تسکیں نہیں ہے جان کو آبِ رواں سے بھی

تا یہ گرفتہ وا ہو کہاں لے کے جائیے / آئے ہیں اس کی غنچگی میں تنگ جاں سے بھی

آگے تھی شوخی ہم سے کنایوں میں جب تھے ہم / مشکل ہے اب تُبرا لگے کہنے زباں سے بھی

ہر چند دست ہیچ جواناں ہوں میں و لے / اک اعتقاد رکھتا ہوں پیرِ مغاں سے بھی

جھنجھلاہٹ اور غصے میں ہجرانِ یار کے / جھگڑا ہمیں رہے ہے زمین آسماں سے بھی

ق

دنیا سے درگزر کہ گزرگہ عجب ہے یہ / در پیش یعنی میر ہے جانا جہاں سے بھی

لشکر میں ہے نقیب اسی بات کے لیے
کہتے ہیں لوگ کوچ ہے کل صبح یاں سے بھی

عشق کیا ہے جب سے ہم نے دل کو کوئی ملتا ہے / اشک کی سرخی زردی چہرہ کیا کیا رنگ بدلتا ہے

روز وداع لگا چھاتی سے وہ جو خوش پرکار گیا / دل تڑپے ہے جان کھپے ہے سینہ سارا جلتا ہے

گور بغیر آرامگہ اسکو دنیا میں پھر کوئی نہیں / عشق کا مارا آوارہ جو گھر سے اپنے نکلتا ہے

ضعف دماغی جسکو ہووے عشق کے رنج و محنت سے / جی بھی سنبھلتا ہی اسکا پر بعد از دیر سنبھلتا ہے

شورِ جرس شبگیر کا غافل تیاری کا تکیہ ہے / یعنی آنکھ نہ لگنے پاوے قافلہ صبح کو چلتا ہے

بال نہیں عاشق کے بدن پر سر بن مو سے نکلا دود / بل کر اسکو جلاتے کیا ہو آپ ہی جلتا بلتا ہے

میر ستم کشتہ کی سماجت ہے مشہور زمانہ کی
جان دیے بن آگے سے اسکے کب وہ ظالم ٹلتا ہے

جب سے ستارہ صبح کا نکلا تب سے آنسو جھمکا ہے / دل تڑپا جو اس مہ رو بن سر کو ہمارے دھمکا ہے

آمد و رفتِ دم کے اوپر ہم نے بنائے زیست رکھی / دم سو ہوا ہے آتے نہ آتے کسکو بھروسا دم کا ہے

کہہ صوفی چل میخانے میں لطف نہیں اب مسجد میں / ابر ہے باراں باد نرمک رنگ بدن میں جھمکا ہے

کیا امید رہائی رکھے ہم سا رفتہ وارفتہ / دل اپنا تو زنجیری اُس زلفِ خم در خم کا ہے

دل کی نہیں بیماری ایسی جس میں ہو امید بہی / کیا سنبھلیگا میر ستمکش وہ تو مارا غم کا ہے

خواہش دل کی کس سے کہیے محرم تو ناپیدا ہے
چپ ہیں کچھ کہہ سکتے نہیں پر جی میں ہمارے کیا کیا ہے
ہیں متوقع پرسش اُس کے ہم جو گرے ہیں بستر پر
رہنا اس بد حالی ہی سے اپنے حق میں اچھا ہے

میر جی کی بیماری دل کو کب سے ہم سب سنتے ہیں
پوچھے کوئی مزاج کو اس کے ان روزوں میں کیسا ہے

صبر کیا جاتا نہیں ہم سے ضعف بھی ہے بیتابی ہے
سہل نہیں ہے جی کا ڈہنا کیسی خانہ خرابی ہے
آگے ایسا نکھرا اکھڑا سے کو میں پھرتا تھا
جب سے آنکھ لگی اُس مہ سے رنگ مرا مہتابی ہے
کس سے سبب میں پوچھوں یارب اپنی سوزش سینہ کا
چھاتی جو جلتی رہتی ہے ات گت آگ گریاں تابی ہے
رنج و محن نے عشق کے مجکو راحت سے مایوس کیا
دل کے تئیں بیتابی ہے مری آنکھوں کو بیخوابی ہے
ابر کوئی رویا ہے شاید برسوں وادی لیلےٰ میں
سیر کیا وہ قطعہ زمیں کا ابتک بھی سیرابی ہے
شہر حسن عجب بستی ہے ڈھونڈھے پیدا مہر نہیں
ہے تو متاع گراں قیمت پر اس کی بلا نایابی ہے

در بدر و رسوا و عاشق شاعر شاغل کامل میر
گہہ کعبے میں دیر میں گاہے کیا کافر محرابی ہے

دل کی بات کہی نہیں جاتی چپکے رہنا ٹھانا ہے
حال اگر ہے ایسا ہی تو جی سے جانا جانا ہے
اُس کی نگاہ تیز ہے میرے دوش دیہ ان روزوں
یعنی دل پہلو میں میرے تیر ستم کا نشانا ہے
دل جو رہے تو پانوں کو بھی دامن میں ہم کھینچ رکھیں

صبح سے لے کر سانجھ تلک اودھر ہی آنا جانا ہے
سُرخ کبھو آنسو ہیں ہوتے زرد کبھو ہے مُنہ میرا
کیا کیا رنگ محبت کے ہیں یہ بھی ایک زمانا ہے
اس نومیدی بغایت پر کس مقدار کڑھا کریے
دو دم جیتے رہنا ہے تو قیامت تک مرجانا ہے
فرصت ہے یاں کم رہنے کی بات نہیں کچھ کہنے کی
آنکھیں کھول کے کان جو کھولو بزم جہاں افسانا ہے
فائدہ ہوگا کیا مترتب ناصح ہرزہ درائی سے
کس کی نصیحت کون سُنے ہے عاشق تو دیوانا ہے
تیغ تلے ہی اُس کے کیوں نہ گردن ڈال کے جا بیٹھیں
سر تو آخر کار ہمیں بھی خاک کی اور جھکانا ہے

آنکھوں کی یہ مردم داری دل کو کسو دلبر سے ہے
طرز نگہ طراری ساری میر تمھیں پہچانا ہے

کلید بیچ اگر رقعہ یار کا آوے
ہماری جان لبوں پر ہے سوئے گوش کہو

تو دل کہ قفل سا بستہ ہے کیا کھلا جاوے
کہ اُسکے آنے کی سُن گُن کچھ اب بھی تا پاوے

بہار لوٹے ہیں میر اب کی طائر آزاد
نسیم کیا ہے دو گلبرگ اگر ادھر لاوے

میں اُس کی جدائی میں تصدیع بہت پائی
اس رفتہ کی جاں بخشی ٹک آتے ہوئے اُسکے
تھا صبر و سکوں جبتک ہتا تھا مجھے غش سا
اس میرے جراحت پر کل داور محشر بھی

درویشی و کم پائی بے صبری و تنہائی
رکھتے ہی قدم مجھ میں پھر جان گئی آئی
بیتابی دل سر پر اک اور بلا لائی
ڈرتا ہوں کہے ریجھا کیا تیغ ستم کھائی

اے میر کسے دیں ہیں جبتک نہ نصیبہ ہو
کر شکر ملی ہے جو اس در کی جبیں سائی

کیا کیا ہم نے رنج اُٹھائے کیا کیا ہم بھی شکیبا تھے
دو دن جوں توں جیتے رہے سو مرنے ہی کے مہیا تھے

عشق کیا سو باتیں بنائیں یعنی شعر شعار رہا
بیتیں جو وے مشہور ہوئیں تو شہروں شہروں سوا تھے
کیا پگڑی کو پھیر کے رکھتے کیا سر نیچے نہ ہوتا تھا
لطف نہیں اب کیا کہیے کچھ آگے ہم بھی کیا کیا تھے
اب کی وصال قرار دیا ہے ہجر ہی کی سی حالت میں
ایک سمیں میں دل بیجا تھا تو بھی ہم وے یکجا تھے
کیا ہوتا جو پاس اپنے اے میر کبھو وے آ جاتے
عاشق تھے درویش تھے آخر بیکس بھی تھے تنہا تھے

رنج کی اس کے جو خبر گزرے
رفتہ وارفتہ اس کا مر گزرے
ایک پل بھی نہ اس سے آنسو پچھے
روتے مجکو پہر پہر گزرے
جوئے خوں آنکھوں سے بہے شاید
خون سے میرے بھی وے در گزرے
راہ جاناں سے ہے گزر مشکل
جان ہی سے کوئی مگر گزرے
مارے غیروں کو یا مرے عاشق
کچھ نہ کچھ چاہیے کہ کر گزرے
غنچہ ہو شرم سے ان آنکھوں کے
گل نرگس اگر نظر گزرے
سر کا جانا ہی ہر قدم ہے میر
کیا کوئی اس کی راہ پر گزرے

جب سے آنکھیں کھلی ہیں اپنی درد و رنج و غم دیکھے
ان ہی دیدۂ نمدیدوں سے کیا کیا ہم نے ستم دیکھے
سر جانے کی اور اپنے زنہار نگاہ نہ کی ہم نے
اٹھ کے اندھا دھند آئے چلے ہی اس ظالم کے قدم دیکھے
عالم ہیئت مجموعی سے ایک عجیب مرقع ہے
ہر صفحہ میں ورق ہیں اس کے دیکھے تو عالم دیکھے
زخم نہ ہو دیں کیونکر غائر چھاتی میں دل خستوں کے
تیر نگاہ یار جگر پر لگتے ہوئے بہم دیکھے
یار کے در پر ذکر ہے کیا ہنگامۂ روز محشر کا

اس کوچے میں قیامت سے تو میر بہت اودھم دیکھے

خواہش دل سے جی کی تاب گئی
آنکھیں اس سے لگیں سو خواب گئی

پھول سے بھی تھی خوب دختر تاک
غنچوں میں رہی خراب گئی

گر کر اسکی گلی کی خاک میں مفت
اشک کی موتی کی سی آب گئی

بوئے گل یا نوائے بلبل تھی
عمر افسوس کیا شتاب گئی

نمک حسن سبز سے اے میر
ساری کیفیت شراب گئی

یارب اس کا ستم سہا بھی جائے
پنجہ خورشید کا گہا بھی جائے

دیکھ رہیے خرام ناز اس کا
پر کسو پاسے گر رہا بھی جائے

درد دل طول سے کہے عاشق
روبرو اس کے جو کہا بھی جائے

حیرت گل سے آبجو ٹھٹھکا
ہے بہتیرا یہ بہا بھی جائے

کیا کوئی اس گلی میں آوے میر
آوے تو لوہو میں نہا بھی جائے

اب ترک کر لباس توکل ہی کر رہے
جب سے کلاہ سر پہ رکھی در بدر رہے

اس دشت سے غبار ہمارا نہ ٹک اٹھا
ہم خانماں خراب نہ جانا کدھر رہے

آئے سے اسطرف کے ترے میں نے غش کیا
شکوہ بھی اس سے کیجیے جسکو خبر رہے

دونوں طرف سے دیدہ درائی نہیں ہے خوب
اس چاہ کا ہے لطف جو آپس میں ڈر رہے

جبتک ہو خون دل میں جگر میں مژہ ہوں نم
تہ کچھ بھی جو نہ ہووے تو کیا چشم تر رہے

رہنا گلی میں اسکی نہ جیتے جی ہو سکا
ناچار ہو کے واں جو گئے اب سو مر رہے

عاشق خراب حال ترے ہیں گرے پڑے
جوں لشکر شکستہ پریشاں اتر رہے

عیب آدمی کا ہے جو رہے اس دیار میں
مطلق جہاں نہ میر رواج ہنر رہے

پھر اب چلو چمن میں کھلے غنچے رک گئے
شاخوں سمیت پھول نہالوں کے جھک گئے

چندیں ہزار دیدۂ گل رہ گئے کھلے
افسوس ہے چمن کی طرف تم نہ ٹک گئے

بھڑکی تھی جبکہ آتش گل پھول پڑ گیا
بال و پر طیور چمن میر پھک گئے

آج ہمیں بیتابی سے ہی صبر کی دل سے رخصت تھی
چاروں اور نگہ کرنے میں عالم عالم حسرت تھی

کس محنت سے محبت کی تھی کس خواری سے یاری کی
رنج ہی ساری عمر اُٹھایا کلفت تھی یا اُلفت تھی

بدنامی کیا عشق کی کہیے رسوائی سی رسوائی ہے
صحرا صحرا وحشت بھی تھی دُنیا دُنیا تہمت تھی

راہ کی کوئی سنتا نہ تھا یاں رستے میں مانند جرس
شور سا کرتے جاتے تھے ہم بات کی کسکو طاقت تھی

عہد ہمارا تیرا ہے یہ جس میں گم ہے مہر و وفا
اگلے زمانے میں تو یہی لوگوں کی رسم و عادت تھی

خالی ہاتھ سیہ رو ایسے کاہے کو تھے گریہ کناں
جن روزوں درویش ہوئے تھے پاس ہمارے دولت تھی

جو اُٹھتا ہے یاں سے بگولا ہم سا ہے آوارہ کوئی
اس وادی میں میرؔ مگر سرگشتہ کسو کی تربت تھی

دیوان پنجم

از میر تقی میر دہلوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دل رفتۂ جمال ہے اس ذوالجلال کا
مستجمع جمیع صفات و کمال کا

ادراک کو ہے ذات مقدس میں دخل کیا
اودھر نہیں گزار گمان و خیال کا

حیرت سے عارفوں کو نہیں راہ معرفت
حال اور کچھ ہے یاں انھوں کی حال و قال کا

ہے قسمتِ زمین و فلک سے غرض نمود
جلوہ وگرنہ سب میں ہے اُسکے جمال کا

مرنے کا بھی خیال رہے میر اگر تجھے
ہے اشتیاق جانِ جہاں کے وصال کا

ہے حرفِ خامہ دل زدہ حسنِ قبول کا
یعنی خیال سر میں ہے نعتِ رسول کا

رہ پیروی میں اسکی کہ گامِ نخست میں
ظاہر اثر ہے مقصدِ دل کے وصول کا

وہ مقتدائے خلق جہاں اب نہیں ہوا
پہلے ہی تھا امام نفوس و عقول کا

سرمہ کیا ہے وضع پے چشم اہلِ قدس
احمدؐ کی رہ گزار کی خاک و دھول کا

ہے متحد نبی و علیِ وصی کی ذات
یاں حرف معتبر نہیں ہے بوالفضول کا

دھو منھ ہزار پانی سے سو بار پڑھ درود
تب نام لے تو اس چمنستاں کے پھول کا

حاصل ہے میر دوستیِ اہلِ بیتؑ اگر
تو غم ہے کیا نجات کے اپنی حصول کا

عشق تو بن رسوائی عالم باعث ہو رسوائی کا
میل دلی اس خودسر سے ہے جو پایا ہے خدائی کا

ہے جو سیاہی جرم قمر میں اسکے سوا کچھ اور نہیں
داغ ہے مہ کا آئینہ اس سطحِ رخ کی صفائی کا

نزع میں میر سے حاضر تھا آنکھ نہ ادھر اُسکی پڑی
داغ چلا ہوں یہیں جہاں سے یار کی بے پروائی کا

کوشش میں سر مارا لیکن در پہ کسی کے جا نہ سکا
تن ہمہ زبان شکر ہے ہر مو اپنی شکستہ پائی کا

رنگ سراپا اس کا ہوا ہے آگے دل خوں گشتی تھی
اب ہے جگر یک لخت افسردہ اسکے رنگ حنائی کا

آنا مُشکل ناداری سے ہم نے جی دینا ٹھہرایا ہے
کیا کہیے اندیشہ بڑا تھا اس کی مُنھ دکھلائی کا

فرقت میں ہے ہر عضو اسکا جوں عضو از جا رفتہ میر
جو کشتہ ہے ظلم رسیدہ اسکے درد جدائی کا

عہد محبت بھاگو ہو ہمسے سیکھے طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کیا اچھی آنکھوں والوں کا

صورت گر کی پریشانی نے طول نہایت کھینچا ہے
ہم نے کیوں بستار کیا تھا اُسکے لمبے بالوں کا

بہت کیا تھا پتھر میں سوراخ کیے ہیں درفشوں نے
چھید جگر میں کر دینا یہ کام ہے محزوں نالوں کا

سرو لب جو لالہ و گل نسرین و سمن ہیں شگوفہ ہے
دیکھو جدھر اک باغ لگا ہے اپنے رنگیں خیالوں کا

غنچہ ہوا ہے خار بیاباں بعد زیارت کرنے کے
پانی تبرک کرتے ہیں سب پانوں کے میرے چھالوں کا

پہلے تدارک کچھ ہوتا تو نفع بھی ہوتا سو تو میر
کام ہے آخر عشق میں اسکے بیماروں بدحالوں کا

اگر ہنستا اُسے سیر چمن میں اب کی پاؤں گا
تو بلبل آشیاں تیرا بھی میں پھولوں سے چھاؤنگا

مجھے گل اسکے آگے خوش نہیں آتا کچھ اسیر بھی
جو تو آزردہ ہوتی ہے گلستاں میں نہ آؤنگا

بشارت اے صبا دیجو اسیران قفس کو بھی
تسلی کو تمھاری سر پہ رکھ دو پھول لاؤنگا

دماغ ناز برداری نہیں ہے کم دماغی سے
کہاں تک ہر گھڑی کے روٹھے کو پھروں مناؤنگا

خشونت بدسلوکی خشمگینی کس لیے اتنی
نہ منھ کو پھیر لیے پھر یاں نہ آؤنگا نہ جاؤنگا

ابھی ہوں منتظر جاتی ہے چشم شوق ہر جانب
بلند اس تیغ کو ہونے تو دو سر بھی جھکاؤنگا

بلائیں زیر سر ہوں کاش افتادہ رہوں یوں ہیں
اُٹھا سر خاک سے تو میر ہنگامے اُٹھاؤنگا

رسوائے شہر ہے یاں حرف و سخن ہمارا
کیا خاک میں ملا ہے افسوس فن ہمارا

دل خون ہو گیا تھا غم سے لکھتے سو رہے ہے
شنگرف کے قلم سا پر خوں دہن ہمارا

ظل ریاض میں شب مہتاب کے نہیں گل
انگاروں سے بھرا ہے اس بن چمن ہمارا

میدان عشق میں تو قیمہ بدن ہوا ہے
تہ کر کے خاک ہی میں رکھ دیں کفن ہمارا

میر اُس کی آنکھیں دیکھیں ہمنے سفر کو جاتے
قیس بلا ہوا ہے سواب وطن ہمارا

منھ اپنا کبھو وہ اُدھر کرے گا
ہمیں عشق ہے تو اثر کرے گا

جو دلبر ہے ایسا تو دل جا چکا ہے
کسو روز آنکھوں میں گھر کرے گا

ہر اک کام موقوف ہے وقت پر ہی
دل خوں شدہ بھی جگر کرے گا

نہوں گو خبر مر و ہاں حال بد سے
مرا نالہ سب کو خبر کرے گا

فن شعر میں میر صناع ہو وہ
دل اُس کا کوئی تو ہنر کرے گا

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا
غنیمت ہے جہاں میں دم ہمارا

رہے ہم عالم مستی میں اکثر
رہا کچھ اور ہی عالم ہمارا

بہت ہی دور ہم سے بھاگتے ہو
کرو ہو پاس کچھ تو کم ہمارا

بکھر جاتے ہیں کچھ گیسو تمھارے
ہوا ہے کام دل برہم ہمارا

رکھے رہتے ہیں دل پر ہاتھ کہ میر
یہیں شاید کہ ہے سب غم ہمارا

کیا پوچھو ہو کیا کہیے میاں دل نے بھی کیا کام کیا
عشق کیا ناکام رہا آخر کو کام تمام کیا

عجز کیا سو اس مفسد نے قدر ہماری یہ کچھ کی
تیوری چڑھائی غصہ کیا جب ہم نے جھک کے سلام کیا

کہنے کی بھی لکھنے کی بھی ہم تو قسم کھا بیٹھے تھے
آخر دل کی بیتابی سے خط بھیجا پیغام کیا

عشق کی تہمت جب نہ ہوئی تھی کاہیکو ایسی شہرت تھی
شہر میں اب رسوا ہیں یعنے بدنامی سے کام کیا

ریگستاں میں جاکے رہیں یا سنگستاں میں ہم جوگی
رات ہوئی جس جاگہ ہم کو ہم نے وہیں بسرام کیا

خط و کتابت لکھنا اُس کو ترک کیا تھا اسی لیے

حرف و سخن سے ٹپکا لوہو اب جو کچھ ارقام کیا
تلخ اس کا تو شہد و شکر ہے ذوق میں ہم ناکاموں کے

لوگوں میں لیکن پوچ کہا یہ لطف بے ہنگام کیا
جیسے کوئی جہاں سے جاوے رخصت اس حسرت سے ہوئے

اس کوچے سے نکل کر ہم نے رو بہ قفا ہر گام کیا

میر جو اُن نے منھ کو ادھر کر ہم سے کوئی بات کہی
لطف کیا احسان کیا انعام کیا اکرام کیا

عشق ہو حیوان کا یا انس ہو انسان کا
لاگ جی کی جس سے ہو دشمن ہے اپنی جان کا

عاشق و معشوق کی میں طرفہ صحبت میر کی
ایک جی مارے ہے پھر ہون ایک ہے احسان کا

میں خرد گم عشق میں اس لڑکے کے آخر ہوا
یہ ثمر لایا نہ دیکھا چاہنا نادان کا

مرنا اسکے عشق میں خالی نہیں ہے حسن سے
رشک کے قابل ہے جو کشتہ ہے اس میدان کا

گر پڑینگے ڈٹ کر اکثر ستارے چرخ سے
ہل گیا جو صبح کو گوہر کسی کے کان کا

ہر ورق ہر صفحہ میں ایک شعر شور انگیز ہے
عرصۂ محشر ہے عرصہ میرے بھی دیوان کا

کیا ملا دے آنکھ نرگس اسکی چشم سرخ سے
زرد اس غمدیدہ کو آزار ہے یرقان کا

بات کرتے جائے ہے منھ تک مخاطب کے جھلک
اس کا لعل لب نہیں محتاج رنگ پان کا

کیا کہوں سارا زمانہ کشتہ و مردہ ہے میر
اس کے اک انداز کا اک ناز کا اک آن کا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
جی کا جانا ٹھہر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا

عشق کیا سو دین گیا ایمان گیا اسلام گیا
دل نے ایسا کام کیا کچھ جس سے میں ناکام گیا

کس کس اپنی کل کو رووے ہجراں میں بیکل اسکا
خواب گئی ہے تاب گئی ہے چین گیا آرام گیا

آیا یاں سے جانا ہے تو جی کا چھپانا کیا حاصل
آج گیا یا کل جاوے گا صبح گیا یا شام گیا

ہائے جوانی کیا کہیے شور سروں میں رکھتے تھے
اب کیا ہے وہ عہد گیا وہ موسم وہ ہنگام گیا

گالی جھڑکی خشم و خشونت یہ تو سر دست اکثر ہیں
لطف گیا احسان گیا انعام گیا اکرام گیا

لکھنا کہنا ترک ہوا تھا آپس میں تو مدت سے
اب جو قرار کیا ہے دل سے خط بھی گیا پیغام گیا

نالۂ میر سواد میں ہم تک دوشیں شب سے نہیں آیا
شاید شہر سے ظالم کے عاشق وہ بدنام گیا

طوفِ مشہد کو کل جو جاؤں گا
تیغ قاتل کو سر چڑھاؤں گا

وصل میں رنگ اُڑ گیا میرا
کیا جدائی کو مُنھ دکھاؤں گا

چھانتا ہوں کسی گلی کی خاک
دل کو اپنے کبھو تو پاؤں گا

اسکے در پر گئی ہے تاب و تواں
گھر تلک اپنے کیوں کہ جاؤں گا

لوٹتا ہے بہار منھ کی خط
میر میں اس پہ زہر کھاؤں گا

خیال چھوڑ دے واعظ تو بیگناہی کا
رکھے ہے شوق اگر رحمتِ الٰہی کا

سیاہ بخت ہی میرے مجھے کفایت تھے
لیا ہے داغ نے دامن عیش سیاہی کا

کسو کے حسن کے شعلہ کے آگے اڑ ناہی
سلوک میر سُنو میرے رنگ کاہی کا

ہر جا پھرا غبار ہمارا اُڑا ہوا
تیری گلی میں لائی صبا تو بجا ہوا

آہ سحر نے دل کی نہ کھولی گرہ کبھی
آخر نسیم سے بھی یہ غنچہ نہ وا ہوا

دے میر اثر جو سوزشِ دل میں تھے ہیں کہاں
نالے کیے جرس نے بہت سے تو کیا ہوا

پہلو سے اُٹھ گیا ہے وہ نازنیں ہمارا
جز درد اب نہیں ہے پہلونشیں ہمارا

ہوں کیوں نہ سبز اپنے حرفِ غزل کہ ہے یہ
دے زرع سیر حاصل قطعِ زمیں ہمارا

کیسا کیا جگر خوں آزار کیسے کھینچے
آساں نہیں ہوا دل اندوہگیں ہمارا

حرف و سخن تھے اپنے یا داستاں جہاں میں
مذکور بھی نہیں ہے یا اب کہیں ہمارا

کیا رائگاں بتوں کو دیکر ہوئے ہیں کافر
ارثِ پدر جواب تھا یہ کہنہ دیں ہمارا

لختِ جگر بھی اپنا یاقوتِ ناب سا ہے
قطرہ سرشک کا ہے دُرِ ثمیں ہمارا

کیا خاک میں ملایا ہم کو سپہر دوں نے
ڈھونڈھا نشانِ تربت پاتے نہیں ہمارا

حالت ہے نزع کی یاں آ دکہ جاتے ہیں ہم
آنکھوں میں منتظر ہے دم واپسیں ہمارا

اک عمر مہر ورزی جنکے سبب سے کی تھی
پاتے ہیں میر ان کو سرگرم کیں ہمارا

آج ہمارا دل تڑپے ہے کوئی اُدھر سے آویگا
یا کہ نوشتہ اُن ہاتھوں کا قاصد ہم تک لاویگا

ہم نہیں لکھتے اسلیے اسکو شوخ بہت ہے وہ لڑکا
خط کا کاغذ بادی کریگا باد کا رخ بتلاوے گا

رنج بہت کھینچے تھے ہم نے طاقت جی کی تمام ہوئی
اپنے کیے پر یاد ہے یہ بھی بہت پچتاوے گا

اندھے سے ہم چاہ میں گرے نکلی گو اے ناصح پھرتے ہیں
سوجھتا بھی کچھ سر آنکھیں کیا تو ہم کو سمجھاوے گا

عاشق ہوئے وہ بھی یارب تا کچھ اس سے کہا جاوے
یعنی حال سنے گا دل سے دل جس سے لگاوے گا

عاشق کی دلجوئی کی بھی راہ و رسم سے واقف ہو
ہو جو ایسا گم شدہ اپنا اسکو نہ تو پھر پاوے گا

آنکھیں موندے یہ دلبر جو سوتے رہیں سو بہتر ہے
چشمک کرنا اک آنکھوں کا سو فتنے جگاوے گا

کیا صورت ہے کیا قامت ہے دست و پا کیا نازک ہیں
ایسے پتلے منہ دیکھو جو کوئی کلال بناوے گا

چتون بے ڈھب آنکھیں پھری ہیں پلکوں سے بھی نظر چھوٹی
عشق ابھی کیا جانیے ہم کو کیا کیا میر دکھاوے گا

اے ہٹیلے یہ تھی کہاں کی ادا
کھپ گئی جی میں تیری بانکی ادا

بات کہنے میں گالیاں دے ہے
دیکھو اس میرے بدزباں کی ادا

خاک میں مل کے میر ہم سمجھے
بے ادائی تھی آسماں کی ادا

رہا میں تو عزت کا اعزاز کرتا
چلا عشق خواری کو ممتاز کرتا

نہ ٹھہرا مرے پاس دل دو زماں تک
اُسے آپ سا ہی میں جانباز کرتا

تو تمکین سے کچھ نہ بولا وگرنہ
تو کاہے کو الفت سے میں ساز کرتا

گلوگیر ہی ہو گئی یا وہ گوئی
رہا میں خموشی کو آواز کرتا

نہ حیرت میں محتاج رونے کا ہوتا
جو کچھ آنسو آگے پس انداز کرتا

زیارت گہ کبک تو ہو بلا سے
تنک آ میر کی خاک پر ناز کرتا

شیخ حرم سے لڑکے چلا ہوں اب کعبہ میں نہ آؤں گا
تا بتخانہ ہر قدم اوپر سجدہ کرتا جاؤں گا

مہر پرستش پیش صنم ہاتھوں سے قسیس رہبان کے
رشتۂ سبحہ تڑاؤں گا زنار گلے سے بندھاؤں گا

رو و دیر کے پانی سے یا آب چاہ سے اُس جا کے

واسطے طاعت کفر کے میں دونوں وقت نہاؤں گا

طائف رستہ کعبہ کا جو کوئی مجھ سے پوچھے گا
جانب دیر اشارت کرکے راہ ادھر کی بھلاؤں گا

بیدین اب جو ہوا سو ہوا ہوں طوف حرم سے مجکو کیا
غیر از سوئے صنم خانہ میں رو نہ ادھر کو لاؤں گا

آ کے مسافر میر عرب میں اور عجم میں کہتے ہیں
اب شہروں میں ہندوستاں کے کافر میر کہاؤں گا

کیسی سعی حوادث نے کی آخر کار ہلاک کیا
ایسا پلید آلودۂ دنیا خلق نہ آگے ہوا ہو گا
قدرت حق میں کیا قدرت جو دخل کسو کی فضولی کرے
آہ سے تھے رخنے چھاتی میں چھلنا انکا یہ سہل تو تھا

کیا کیا چرخ نے چکر مارے پیس کے مجکو خاک کیا
شیخ شہر موا کہتے ہیں شہر خدا نے پاک کیا
اسکو کیا پرکالۂ آتش مجھکو خس و خاشاک کیا
دو دو ہاتھ تڑپ کر دل نے سینۂ عاشق چاک کیا

ہو گر ہونا حزن و بکا سے میر ہمارا یونہیں نہیں
برسوں روتے کڑھتے رہے تب ہم دل کو غمناک کیا

بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہووے گا
چشم تماشا وا ہووے تو دیکھا بھالی غنیمت ہے

درد آگیں انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ رو دیگا
مت موندے آنکھوں کو غافل دیر تلک پھر سو دیگا

جست و جو بھی اُس کی کرے جسکا نشاں کچھ پیدا ہو
پانا اُس کا میر ہے مشکل جی تو یونہیں کھو دیگا

رکھے تھا ہاتھ میں سر رشتہ جہت سینے کا
اے طپش لوہو پیے میرا جو تو چھوٹ گئے

رہ گیا دیکھ رفو چاک مرے سینے کا
کس سے یہ قاعدہ سیکھا ہے لہو پینے کا

میر کی نبض پہ رکھ ہاتھ لگا کہنے طبیب
آج کی رات یہ بیمار نہیں جینے کا

عید آئندہ تک رہے گا گلا
ڈوبے لوہو میں دیکھتے سرخار

ہو گئی عید تو گلے نہ ملا
حیف کوئی بھی آبلہ نہ پھلا

میر افسردہ دل چمن میں پھرا
غنچۂ دل کہیں نہ اسکا کھلا

ناگاہ جس کو عشق کا آزار ہوگیا
سہل آگے اُسکے مردنِ دشوار ہوگیا

ہے حُسن کیا متاع کہ جسکو نظر پڑے ہی
وہ جان بیچکر ہی خریدار ہوگیا

برسوں تئیں جہان میں کیونکر رہا ہے خضر
میں چار دن ہیں جینے سے بیزار ہوگیا

ہم بستری بن اُسکی میں صاحب فراش ہوں
ہجران میں کڑھتے کڑھتے ہی بیمار ہوگیا

ہم دام تھے سو چھٹ گئے سب دام سے اُٹھے
تھی دل کو میرے چوٹ گرفتار ہوگیا

اُس کی نگاہِ مست کا کھایا ہی تھا فریب
یہ شیخ طرز دیکھ کے ہشیار ہوگیا

کیا متقی تھا میر پہ آئینِ عشق میں
مجرم سا کشتنی و خوں کا سزاوار ہوگیا

سمندر کا میں کیوں احساں سہوں گا
نہیں کیا سیلِ اشک اس پر بہوں گا

ترے غم کے ہیں خواہاں سب کھائم
کمی کیا ہوگی جو اک میں نہ ہوں گا

نہ وہ آوے نہ جاوے بیقراری
کسو دن میر یونہیں مر رہوں گا

پھرتے پھرتے اُس کے لیے میں آخر دشت نورد ہوا
دیکھ آنکھیں وہ سرمہ آگیں پھر دنبالہ گرد ہوا

جیتے جی میت کے رنگوں لوگ مجھے اب پاتے ہیں
جوشِ بہارِ عشق میں یعنی سرتاپا میں زرد ہوا

گرم مزاج رہا نہیں اپنا دیسے اس کی ہجراں میں
ہوتے ہوتے افسردہ دیکھو گے اک دن سرد ہوا

میر نہ اپنے دردِ دل کو مجھ سے کہا کر روز و شب
صبح جو گوشِ دل سے سُنا تھا دل میں میرے درد ہوا

عشقِ صمد میں جان چلی وہ چاہت کا ارمان گیا
تازہ کیا پیمان صنم سے دین گیا ایمان گیا

میں جو گدا آیا نہ چلّایا در پہ اُسکے نصفِ شب
گوش زد آخر تھے نالے سو شور گیا پہچان گیا

آگے عالم عین تھا اسکا اب عینِ عالم ہے وہ
اُس حدت سے یہ کثرت ہے یاں میرا سب گیان گیا

مطلب کا سر رشتہ گم ہے کوشش کی کوتاہی نہیں
جو طالب اس راہ سے آیا خاک بھی یاں کی چھان گیا

خاک سے آدم کر دکھلایا یہ منت کیا تھوڑی ہے
اب سر خاک بھی ہوجاوے تو سر سے کیا احسان گیا

ترک بچہ سے عشق کیا تھا ریختے کیا کیا میں نے کہے
رفتہ رفتہ ہندستاں سے شعر مرا ایران گیا

کیونکہ جہت ہو دل کو اُس سے میرؔ مقام حیرت ہے
چاروں اور نہیں ہے کوئی یاں ایدھر ان نے دھیان گیا

دل تڑپے ہے جان کھپے ہے حال جگر کا کیا ہوگا
مجنوں مجنوں لوگ کہے ہیں مجنوں کیا ہم سا ہوگا

دیدۂ تر کو سمجھ کر اپنا ہم نے کیا کیا حفاظت کی
آہ نہ جانا روتے روتے یہ چشمہ دریا ہوگا

کیا جانیں آشفتہ دلاں کچھ ان سے ہم کو بحث نہیں
وہ جانے گا حال ہمارا جس کا دل بیجا ہوگا

پاؤں حنائی اُس کے لیے آنکھوں پر اپنے ہم نے رکھے
یہ دیکھا نہ رنگ کفک پہ ہنگامہ کیا برپا ہوگا

جاگہ سے بے تہ جاتے ہیں دعوی وے ہی کرتے ہیں
اُن کو غرور و ناز نہ ہوگا جن کو کچھ آتا ہوگا

روبہ بہی اب لا ہی چکے ہیں ہم سے قطع اُمید کرو
روگ لگا ہے عشق کا جس کو وہ اب کیا اچھا ہوگا

دل کی لاگ کہیں جو ہو تو میرؔ چھپائے اُس کو رکھ
یعنی عشق ہوا ظاہر تو لوگوں میں رسوا ہوگا

جاذبہ میرا تھا کامل سو بندے کے وہ گھر آیا
شکر خدا کا کریے کہاں تک عہدِ فراق بسر آیا

بجلی سا وہ چمک گیا آنکھوں سے بھویں تڑنے لگیں
ابر نمط خفگی سے اس بن جی بھی رندھا دل بھر آیا

گل تھے سو سو رنگ پر ایسا شورِ طیور بلند نہ تھا
اس کے رنگ چمن میں کوئی شاید پھول نظر آیا

سیلِ بلا جوشاں تھا لیکن پانی پانی شرم سے تھا
ساحلِ دریا خشک لبی دیکھے سے میرے تر آیا

کیا ہی خوش پرکار ہے دلبر تو چہ کشتی گیر اپنا
کوئی زبردست اس سے لڑکر عہدہ سے کب بر آیا

صنعتگریاں بہتیری کیں لیک دریغ ہزار دریغ
جس سے یار بھی ملتا ہم سے ایسا وہ نہ ہنر آیا

میر پریشاں خاطر آکر رات رہا بتخانے میں
راہ رہی کعبہ کی اودھر یہ سودائی کدھر آیا

اب یاں سے ہم اُٹھ جائینگے خلقِ خدا ملکِ خدا
ہرگز نہ ایدھر آئیں گے خلقِ خدا ملکِ خدا

مطلب اگر یاں گم ہوا اندیشہ کی جا کچھ نہیں
جا کر کہیں کچھ پائیں گے خلقِ خدا ملکِ خدا

دل میں نہ جانے یہ کوئی ہم کھانیکو دیں ہیں کہیں
جو ہے مقدر کھائیں گے خلقِ خدا ملکِ خدا

گو لکھنؤ ویراں ہوا ہم اور آبادی میں جا
مقسوم اپنا لائیں گے خلقِ خدا ملکِ خدا

اب دی۔ پری گزری گئی ہم آجکل بے خانماں
کیا غیر ازیں ٹھہرائیں گے خلقِ خدا ملکِ خدا

اس بستی سے اُٹھ جائینگے درویشوں کی کیا شورش
وہ بھی یہی فرمائیں گے خلقِ خدا ملکِ خدا

تو میر ہو دیگا جہاں امرِ قضا کے تابعاں
روزی تجھے پہونچائیں گے خلقِ خدا ملکِ خدا

اُسکی سی جو چلے ہے راہ تو کیا
آسماں پر گیا ہے ماہ تو کیا

لڑکے ملنا ہے آپ سے بے لطف
یار ہووے نہ عذر خواہ تو کیا

کب رخ بدر روشن ایسا ہے
ایک شب کا ہے اشتباہ تو کیا

بیخرد خانقہ میں ہیں گو مست
وہ کرے مست یک نگاہ تو کیا

اُسکے پرپیچ گیسو کے آگے
ہووے کالا کوئی سیاہ تو کیا

حُسن والے ہیں کجروش سارے
ہوئے دو چار رو براہ تو کیا

دل رہے وصل جو مدام رہے
مل گئے اُس سے گاہ گاہ تو کیا

ایک اللہ کا بہت ہے نام
جمع باطل ہوں سو الٰہ تو کیا

میر کیا ہے فقیر مستغنی
آوے اُس پاس بادشاہ تو کیا

بیتابیوں کے جور سے میں جبکہ مر گیا
ہو کر فقیر صبر مری گور پر گیا

اے آہ سرد عرصۂ محشر میں تخ جما — جلتا ہوں میں سنوں کہ جہنم ٹھٹھر گیا
مفلس سو مر گیا نہ ہوا وصل یار کا — ہجراں میں اُسکے جی بھی گیا اور زر گیا

تیری ہی رہ گزر میں یہ جی جا رہا ہے شوخ
سنیو کہ میر آج ہی کل میں گزر گیا

دل گیا مفت اور دُکھ پایا — ہو کے عاشق بہت میں پچھتایا
مر گئے پر بھی سنگسار کیا — نخل ماتم مرا یہ پھل لایا
صحن میں میرے اے گل مہتاب — کیوں شگوفہ لے کھلنے کا آیا
یہ شب ہجر ہے کھڑی نہ رہے — ہو سفیدی کا جس جگہ سایا

جب سے بیخود ہوا ہے اُسکو دیکھ
آپ میں میر پھر نہیں آیا

بات کہتے جی کا جانا ہو گیا — مرنا عاشق کا بہانا ہو گیا
جائے بود ن تو نہ تھی دنیائے دوں — اتفاقاً اپنا آنا ہو گیا
ماہ اسکو کہہ کے سارے شہر میں — مجھ کو مشکل منھ دکھانا ہو گیا
کر رکھا تعویذ طفلی میں جسے — اب سو وہ لڑکا سیانا ہو گیا
اس بلا سے آہ میں غافل رہا — یک بیک دل کا لگانا ہو گیا
کنج لب سے یار کے اُٹھا نہ ٹک — الغرض دل کا ٹھکانا ہو گیا

رفتہ رفتہ اُس پری کے عشق میں
میر سادا نادوانا ہو گیا

عشق بلا پرشور و شر نے جب میداں میں خم مارا — پاک ہوئی کشتی عالم کی آگے کن نے دم مارا
بود و نبود کی اپنی حقیقت لکھنے کے شایاں نہ تھی — باطل صفحۂ ہستی پہ میں خط کھینچا جو قلم مارا
غیر کے میرے مر جانے میں تفاوت ارض و سما کا ہے — مار اُن نے دونوں کو لیکن مجھکو کرکے ستم مارا
ان بالوں سے طلسم جہاں کا دربستہ تھا گویا سب — زانوں پہ درہم اُن نے کیا سو عالم کو برہم مارا
دور اُس قبلہ رو سے مجھکو جلد رقیب نے مار رکھا — قہر کیا اس کتے نے کیا دور کے صید حرم مارا
کاٹ کے سر عاجز کا اُن نے اور بھی پگڑی پھیر رکھی — فخر کی کون سی جاگہ تھی یاں ایسا کیا رستم مارا
جس مضمار میں رستم کی بھی راہ نہ نکلی میر کبھی — اُس میداں کی خاک پہ ہمنے جرأت کرکے قدم مارا

جاہ میں جور ہم پہ کم نہ ہوا — عاشقی کی تو کچھ ستم نہ ہوا
فائدہ کیا نماز مسجد کا — قد ہی محراب سا جو خم نہ ہوا
یار ہمراہ نعش جس دم تھا — وائے مرنے میں میرے دم نہ ہوا
نہ گیا اس طرف کا خط لکھا — ہاتھ جب تک مرا قلم نہ ہوا

بیدلی میں ہے میر خوش اس سے
دل کے جانے کا حیف غم نہ ہوا

کل تلک داغوں سے خوں کے دامن رنگیں پاک تھا — آج تو کرتے کوئی کیا زینت فتراک تھا
کیا جنوں کو روؤں تردستی سے اسکی گل نمط — لے گریباں سے تہ دامن تلک ایک ہی چاک تھا
رو جو آئی رونے کی مژگاں نہ ٹھہری ایک پل — راہ میں اس رود کے گویا خس و خاشاک تھا
ایک ہی شمع شعلہ خو کے لاگے میں جل بجھا — جبتلک پہونچے کوئی پروانہ عاشق خاک تھا
بادشاہ وقت تھا میں تخت تھا میرا دماغ — جی کے چاروں اور اک جوش گل تریاک تھا
ڈھال تلوار اس جواں کے ساتھ اب رہتی نہیں — وہ جفا آئین شلا میں لڑکا ہی بیباک تھا
تنگ پوشی تنگ درزی اسکی جی میں کھب گئی — کیا ہی وہ محبوب خوش ترکیب خوش پوشاک تھا
بات ہے جی مارنا بازیچہ قتل عام ہے — اب تو ہے صد چند اگر وہ چند وہ سفاک تھا
غنچۂ دل وا ہوا نہ باغوں باغوں میں پھرا — اب بھی ہے ویسا ہی جیسا پیشتر غمناک تھا

درک کیا اس درس گہ میں میر عقل و فہم کو
کس کے تئیں ان صورتوں میں معنی کا ادراک تھا

جدا اس سیمتن سے کیسا سونا — کہ مٹی کوڑے کا اب ہے بچھونا
بہت کی جستجو اس کی نہ پایا — ہمیں درپیش ہے اب جی کا کھونا
تماشا دیکھنے ہنستا چلا آ — کرے ہے شیشہ بازی میر رونا
جگر کے زخم شاید ہیں نمک بند — مزہ کچھ آنسوؤں کا ہے سلونا

وصیت میر نے مجکو یہی کی
کہ سب کچھ ہونا تو عاشق نہ ہونا

سر مارنا پتھر سے یا ٹکڑے جگر کرنا — اس عشق کی وادی میں ہر نوع بسر کرنا
کہتے ہیں ادھر منھ کر وہ رات کو سوتا ہے — اے آہ سحرگاہی ٹک تو بھی اثر کرنا

دیواروں سے ہے سر مارا تب رات سحر کی ہے
اے صاحب تمکیں دل اب میری خبر کرنا

دل کے خوں ہونے کا غم کیا اب سے تھا
سینہ کوبی سخت ماتم کب سے تھا
اسکی مقتولی کا ہم کو رشک ہے
دو قدم جو کشتہ آگے سب سے تھا
کون مل سکتا ہے اس اوباش سے
اختلاط اس سے ہمیں اک ڈھب سے تھا
گرم ملنے والے دیکھے یار کے
ایک ٹھنڈا ہو گیا اُس تب سے تھا

چپ سی مجھ کو لگ گئی تھی تب سے میر
شور اُن شیریں لبوں کا جب سے تھا

عشق کیے پچھتائے ہم تو دل نہ کسو سے لگانا تھا
جیدھر ہو وہ مہ نکلا اُس راہ نہ ہمکو جانا تھا

غیرت کی اُس کی شکایت یار عبث اب کرتے ہیں
طور اس شوخ ستم پیشہ کا طفلی سے بیگانہ تھا

بزم[1] کی عیش شب کا یاں دن ہوتے ہی یہ رنگ ہو
شمع کی جاگہ دود تنک تھا خاکستر پروانا تھا

دخل مروت عشق میں تھا تو دروازے سے تھوڑی دور
ہمرہ نعش عاشق کی اُس ظالم کو بھی آنا تھا

طرفہ خیال کیا کرتا تھا عشق و جنوں میں روز و شب
روتے روتے ہنسنے لگا یہ میر عجب دیوانا تھا

ناخن[2] سے بلہوس کا گلا یوں ہی چھل گیا
لوہو لگا کے وہ بھی شہیدوں میں مل گیا
دل جمع تھا جو غنچہ کی رنگوں خزاں میں تھا
اے کیا کہوں بہار گل زخم کھل گیا
بیدل ہوئے یہ کرتے تدارک جو تھا ہوش
ہم آپ ہی میں آئے نہیں جب سے دل گیا

[1] غالب سے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے
لطفِ خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

[2] ذوق سے
گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

دیکھا نہیں پہاڑ گراں سنگ یا سبک
زوروں چڑھا تھا عشق میں فرہاد ٹل گیا

شبنم کی سی نمود سے تھا میں عرق عرق
یعنی کہ ہستی ننگ عدم تھی خجل گیا

غم کھینچتے ہلا نہیں جاگہ سے کیا کروں
دل جا لگے ہے دم بدم اودھر ہی ہل گیا

صورت نہ دیکھی ویسی کشادہ جبیں کہیں
میں میر اس تلاش میں چین و چگل گیا

اک خواہش بر آئی تا جی کا غبار نکل جاتا
کاش کے آہو چشم اپنا آنکھوں کو پاؤں سے مل جاتا

آتش دل کی لپٹوں کا ہے یارا نہ کچھ عالم ہی جدا
لائحہ کوئی کھینچتا سر تو عالم سارا جل جاتا

نعرہ کرنا عاشق کا ہے ساتھ اک ہیبت کے یعنی
سن آواز اس شیر نر کی سیل بلا سے دہل جاتا

اہل زمیں تو کیا ہیں انکا سہل تھا راہ سے لیجانا
چرخ پہ ہوتا وہ جو چھلاوہ خیل ملک کو چھل جاتا

کشتی زبردستوں کی اس سے پاک ہوئی تو کیا ہے عجب
رستم سامنے ہو جاتا تو راہ بچا کر ٹل جاتا

غم سے ہوکر زرد سراسر صورت ساری خزاں کی ہے
آن نکلتے سوئے چمن تو رنگ ہوا کا بدل جاتا

ڈھلتے ڈھلتے ضعف سے آئے میر سو ان نے منھ پھیرا
یا قوتی سے بوسہ لب کی جی شاید کہ سنبھل جاتا

کیا کیا عشق میں رنج اٹھائے دل اپنا سب خون ہوا
کیسے رکتے تھے خفگی سے آخر کار جنون ہوا

تڑپا ہے پہلو میں اب جب طاقت دل میں کچھ نہ رہی
جسم غم فرسودہ ہمارا زرد و زار و زبون ہوا

جنگل میں میں رونے چلا تھا دل جو بھرا تھا میر بہت
آیا سیل آگے سے چلا کیا بخت سے مجھ کو شگون ہوا

آیا سو آب تیغ ہی مجھکو چٹا گیا
تھا وہ بریدہ زخموں پہ میں زخم کھا گیا

کیا شہر خوش عمارت دل سے ہی گفتگو
لشکر نے غم کے آن کے مارا چلا گیا

موقوف یار غیر جلانا مرا نہیں
جو کوئی اسکے کان لگا کچھ لگا گیا

تنہائی بیکسی مری یکدست تھی کہ میں
جیسے جرس کا نالہ جرس سے جدا گیا

کیا تم سے اپنے دل کی پریشانی میں کہوں
دریائے گریہ جوش زناں تھا بہا گیا

روز نہ اب تو اپنے تئیں سوجھتا نہیں
آخر کو رونا راتوں کا ہی دن دکھا گیا

سر زدگی بدی مری نوشتنی ہے میر
قاصد جو لے کے نامہ گیا سو بھلا گیا

کچھ اندیشہ ہمکو نہیں ہے اپنے حال درہم کا
آٹھ پہر رہتا ہے رونا اسکے دوری کے غم کا

روتے کڑھتے خاک میں ملتے جیتے رہے ہم دنیا میں
دس دن اپنی عمر کے گویا عشرہ تھا یہ محرم کا

کشتی ہماری عشق میں کیا تھی ہاتھ ملاتے پاک ہوئی
پائے ثبات نہ ٹھہرا دم بھر اس میدان میں رستم کا

عالم ہستی کیا عالم تھا غم دنیا و دیں کا نہ تھا
ہوش آیا ہے جب سے سر میں شوق ہوا اس عالم کا

یاں واجب ہے ہمکو تمکو دم لیویں تو شمردہ لیں
دینا ہوگا حساب کسو کو یکدم ہی میں دم دم کا

چھاتی کوٹی منھ نوچا سر سے دے مارا پتھر پہ
دل کے خون ہوئے ہیں ہمارے یہی طریق ہے ماتم کا

لڑکے شوخ بہت ہیں لیکن ویسا میر نہیں کوئی
دھوم قیامت کی سی ہے ہنگامہ اسکے ادھم کا

گلچیں نہیں جو کوئی بھی اس تازہ چمن کا
کیوں رنگ پھرا سا ہے ترے سیب ذقن کا

غربت ہے وہاں دیر بہت مہر کی اسکے
آیا نہ کبھو ہم کو خیال اپنے وطن کا

جب زمزمہ کرتی ہے صدا چھتی ہے دل میں
بلبل سے کوئی سیکھ لے انداز سخن کا

کب منت نمک سے ہوئی تسکین جراحت
لب خشک پہ ہے نمک سار مرے زخم کہن کا

جو چاک گریبان کہ دامن کی ہوزہ تک
قربان کیا میر سے چاک کفن کا

یہ تو جدائی جوں توں کٹتی ہے ملنے کی تو کہیے گا
پاس ہمارا گو نہ کرو تم پاس ہی اب سے رہیے گا

ردیف بائے موحدہ

کب سے صحبت بگڑی ہی ہے کیونکر کوئی بناوے اب
ناز و نیاز کا جھگڑا ایسا کس کے کہنے لیجاوے اب

سوچتے آتے ہیں جی میں پر بگڑی پر گل رکھے ہے
کس کو دماغ رہا ہے اس کے جو حرف خشن اٹھاوے اب

تیغ بلند ہوئی ہے اس کی قسمت ہوں گے زخم رسا
مرد اگر ہے صید حرم تو کوئی جراحت کھاوے اب

داغ سرو سینے کے میرے حسرت آگیں چشم ہوئے
دیکھیں کیا کیا عشق ستم کش ہم لوگوں کو دکھاوے اب

دم و دم گھبراہٹ ہو تو ہو سکتا ہے تدارک بھی
جی کی چال سے پیدا ہے سو تین گھڑی میں جاوے اب

دل کے داغ بھی گل ہیں لیکن دل کی تسلی ہوتی نہیں
کاشکے وہ گلبرگ ادھر سے باد اُڑا کر لاوے اب

اُس کی کفک کی پامالی میں دل جو گیا تھا شاید میر
یار ادھر ہو مائل ٹک تو وہ رفتہ ہاتھ آوے اب

دل خوں ہوا تھا یکسر پانی ہوا جگر سب
خوں بستہ رہتیاں تھیں پلکیں سو اب ہیں تر سب

یارب کدھر گئے وے جو آدمی روش تھے
اُجڑے دکھائی دے ہیں شہر و دہ و نگر سب

حرف و سخن سے مطلق یاں گفتگو نہیں ہے
بیٹھے ہیں چپ سو ہم کو آئے ہیں در نظر سب

عالم کے لوگوں کا ہے تصویر کا سا عالم
ظاہر کھلی ہیں آنکھیں لیکن ہیں بے خبر سب

میر اس خرابے میں کیا آباد ہووے کوئی
دیوار و در گرے ہیں ویراں پڑے ہیں گھر سب

عشق و جنوں کی کیا اب تدبیر ہے مناسب
زنجیر ہے مناسب شمشیر ہے مناسب

دوری شعلہ خویاں آخر جلا رکھے گی
صحبت جو ایسی ہووے درگیر ہے مناسب

جلدی نہ قتل میں کر پچھتاویگا بہت تو
خونریزی میں ہماری تاخیر ہے مناسب

رسوائے شہر ہونا عزت ہے عاشقی میں
احوال کی ہمارے تشہیر ہے مناسب

دل کی خرابی کے تو درپے ہے اے صنم تو
اس خانۂ خدا کی تعمیر ہے مناسب

شب اُسکو میں نے دیکھا سوتے بغل میں اپنے
اس خواب کی نہ کرنی تعبیر ہے مناسب

رحم آشنا کسو کو اس بستی میں نہ پایا
اسلامیوں کی یاں کے تکفیر ہے مناسب

ہے سرگزشت اپنی نہ نوشتنی ہی بہتر
گزری سو گزری کیا اب تحریر ہے مناسب

دنیا میں کوئی پھر پھر آیا نہیں ہے صاحب
اکبار تم کو مرنا ہی میر ہے مناسب

تاب عشق نہیں ہے دل کو جی بھی بے طاقت ہے اب
یعنی سفر ہے دور کا آگے اور اپنی رخصت ہے اب

وصل میں کیا کیا صحبتیں رنگیں کس کس عیش میں دن گزرے

تنہا بیٹھ رہے ہیں یک سو ہجر میں یہ صحبت ہے اب

جب سے بنائے صبحِ ہستی دو دم پر یاں ٹھہرا ہے
کیا کیا کریے اس مہلت میں کچھ بھی ہمیں فرصت ہے اب

چور اُچکے سکھ مرہٹے شاہ و گدا زر خواہاں ہیں
چین میں ہیں جو کچھ نہیں رکھتے فقر ہی اک دولت ہے اب

زانوں پہ سر رکھنے کی مجکو رخصت دی تھی میر اُن نے
کیا پوچھو ہو سر پر میرے منت سی منت ہے اب

سادے جتنے نظر آتے ہیں دیکھو تو عیار ہیں سب
زرد و زار و زبوں جو ہم ہیں چاہت کے بیمار ہیں سب

سیل سے نکلے عاشق ہوویں تو جوش و خروش بھر آویں
تہ پائی نہیں جاتی ان کی دریا سے تہ دار ہیں سب

ایک پریشاں طرفہ جماعت دیکھی چاہنے والوں کی
جینے کے خواہاں نہیں ہیں مرنے کو تیار ہیں سب

کیا کیا خواہشیں بیکس بے بس مشتاق اُس سے رکھتے ہیں
لیکن دیکھ کے رہجاتے ہیں چپکے سے ناچار ہیں سب

عشق جنھوں کا پیشہ ہووے سیکڑوں ہوں تو ایک ہی ہیں
کوہکن و مجنون و وامق میر ہمارے یار ہیں سب

کاوش سے ان پلکوں کی رہتی ہے خلش جگر میں اب
سیدھی نظر جو اُس کی نہیں ہے یاس ہے اپنی نظر میں اب

موسم گل کا شاید آیا داغ جنوں کے سیاہ ہوئے
دل کھنچتا ہے جانب صحرا جی نہیں لگتا گھر میں اب

نقش نہیں پانی میں اُبھرتا یہ تو کوئی اچنبھا ہے
صورت خوب اُس کی ہے پھرتی اکثر چشم تر میں اب

ایک جگہ پر جیسے بھونر ہیں لیکن چکر رہتا ہے
یعنی وطن دریا ہے اس میں چار طرف ہیں سفر میں اب

حسرت نے ملنے کی آیا میر تمہارا خون پیا
تیغ و تبر اس ترک بچے ظالم کے نہیں ہیں کمر میں اب

ہم ہوئی ہے ترک ملاقات کیا سبب
اب کم بہت ہے ہم پہ عنایات کیا سبب

ہم تو تمہارے حسن کی حیرت سے ہیں خموش
تم ہم سے کوئی کرتے نہیں بات کیا سبب

ہم تیرہ روز آپ سے تم بن سحر گئے
آئے نہ تم ہمارے کنے رات کیا سبب

اسکی نگاہ مست تو ادھر نہیں پڑی
مسجد جو ہو گئی ہے خرابات کیا سبب

تھا مرتبہ ہمیشہ سگ یار کا بلند
ہے میر سے سلوک مساوات کیا سبب

دل کے گئے بیکس کہلائے ایسا کہاں ہمدم ہے اب
کون ایسے محروم غمیں کا ہمراز و محرم ہے اب

سینہ زنی سے غمزدگی ہے سر دھنتا ہے رونا ہے
دل جو ہمارا خون ہوا ہے اس سے بلا ماتم ہے اب

اُن کے حال کسو کے دل کا رونا ہی مجھ کو آتا تھا
یعنی کبھو جو کڑھتا تھا میں وہ رونا ہردم ہے اب

زردی چہرہ تن کی نزاری بیماری پھر چاہت ہے
دل میں غم ہے مژگاں نم ہیں حال بہت درہم ہے اب

دیکھیں دن کٹتے ہیں کیونکر راتیں کیونکر گزرتی ہیں
بیتابی ہے زیادہ زیادہ صبر بہت کم کم ہے اب

عشق ہمارا آہ نہ پوچھو کیا کیا رنگ بدلتا ہے
خون ہوا دل داغ ہوا پھر درد ہوا پھر غم ہے اب

ملنے والو پھر ملیے گا ہے وہ عالم دیگر میں
میر فقیر کو سُکر ہے یعنی مستی کا عالم ہے اب

ردیف تائے فوقانی

دل کی تہ کی کہی نہیں جاتی نازک ہیں اسرار بہت
اچھر ہیں تو عشق کے دو ہی لیکن ہے بستار بہت

کافر مسلم دونوں ہوئے پر نسبت اس سے کچھ نہ ہوئی
بہت لیے تسبیح پھرے ہم پہنا ہے زنار بہت

ہجر نے جی ہی مارا ہمارا کیا کہیے کیا مشکل ہے
اس سے جدا رہنا ہوتا ہے جس سے ہمیں ہے پیار بہت

منہ کی زردی تن کی نزاری چشمِ تر پر چھائی ہے
عشق میں اس کے یعنی ہم نے کھینچے ہیں آزار بہت

کہہ کے تغافل اُن نے کیا تھا لیکن تقصیر اپنی ہے
کام کھنچا جو تیغ تک اُس کی ہم نے کیا اصرار بہت

حرف و سخن اب تنگ ہوا ہے ان لوگوں کے ساتھ اپنے
منھ کرنے سے جن کی طرف آتی تھی ہم کو عار بہت

رات سے شہرت اس بستی میں میرؔ کے اُٹھ جانے کی ہے
جنگل میں جو جلد بسا جا شاید تھا بیمار بہت

بادِ صبا نے اہلِ چمن میں اس چہرے کی چلائی بات
اس لب و لہجے پر بلبل کو کم سکے آگے نہ آئی بات

دور تلک قاصد کے پیچھے کچھ کہتا میں جاتا تھا
شوقِ کشمکش ظالم نے کیا رفتہ رفتہ بڑھائی بات

آگ ہو آتے ہی میرے لال آنکھیں کر گھور رہا
کیا جانوں سرگوشی میں کیا غیر نے اُس سے لگائی بات

لعل کو نسبت ان ہونٹوں سے دینا سب کا تصنع تھا
کچھ بن آئی جب نہ کسو سے تب یہ ایک بنائی بات

غیر سے کچھ کچھ کہتا تھا سو سامنے سے میرؔ آیا میں
پھیر لیا منھ میری طرف سے یعنی مجھ سے چھپائی بات

زرد ہیں چہرے سوکھ گئے ہیں یعنی ہیں بیمار بہت
عشق کی گرمی دل کو پہونچی کہتے ہی آزار بہت

نالہ و زاری سے عاشق کے کیا ابرِ بہاری طرف ہوگا

دل ہے نالاں حد سے زیادہ آنکھیں ہیں خونبار بہت

برسوں ہوئے اب ہم لوگوں سے آنکھ آنکھوں ٹک نہیں ملتی
برسوں تک آپس میں رہا ہے اپنے جھوں کے پیار بہت

ارض و سما کی پستی بلندی اب تو ہم کو برابر ہے
یعنی نشیب و فراز جو دیکھے طبع ہوئی ہموار بہت

سو غیروں میں ہو عاشق تو ایک اسی سے ستر ما دیں
اس بستی میں آنکھیں اُس کی رہتی ہیں ہشیار بہت

کم ہے ہمیں امید بھی کی اتنی نزاری پر اس کے
پچھلے دنوں دیکھا تھا ہم نے عاشق تھے بیمار بہت

میرؔ نہ ایسا ہووے کہیں پردے ہی پردہ مار مرے
ڈر لگتا ہے اس سے ہم کو ہے وہ ظاہردار بہت

چپکے گھر اکثر ڈرے ہوتا ہوں ساری ہے الفت کی بات
تیغ نے اُس کی کیا ہے قسمت یہ بھی ہے قسمت کی بات

جان مسافر ہو جاوے گی لب پر ہے موقوف آہ
سب کچھ کہیو جاتے ہوئے تم مت کہیو رخصت کی بات

کہہ کے فسانہ عشق و وفا کا لوگ محبت کرتے تھے
اب وہ ناز کہانی اُن کی گویا ہے مدت کی بات

درد و غم کی گرفتاری سے مہلت ہو تو کچھ کہیے
حرف زدن اشعار شعاری یہ سب ہے فرصت کی بات

کس کو دماغ جواب رہا ہے ضعف سے اب خاموش ہیں ہم
پھروں بکتا نصیحت اگر سے میرؔ یہ ہے طاقت کی بات

چشم رہتی ہے اب پر آب بہت
دل کو میرے ہے اضطراب بہت

دیکھیے رفتہ رفتہ کیا ہووے
تاب دل کم ہے پیچ و تاب بہت

دیر افسوس کرتے رہیے گا
عمر جاتی رہی شتاب بہت

مہر و لطف و کرم عنایت کم
ناز و خشم و جفا عتاب بہت

بے تفاوت ہی فرق آپس میں	وے مقدس ہیں پیں خراب بہت
پشتِ پا پر ہے چشم شوخ اُسکی	ہائے رے ہم سے ہے حجاب بہت
دخترِ رز سے رہتے ہیں محشور	شیخ صاحب ہیں کچھ کباب بہت
آویں محشر میں کیوں نہ پائے حساب	ہم بھی کرتے ہیں حساب بہت
واں تلک اپنی دعا ہو نحتی نہیں	عالی رتبہ ہے وہ جناب بہت

گل نے دیکھے کا غش گیا ہی نہ میر
منھ پہ چھڑکا مرے گلاب بہت

اُچٹتی سی لگی اپنے تو وہ تلوار یا قسمت	ہوئی جس کے لگی کار آمدہ بیکار یا قسمت
ہوئے جب سو جواں یکجا توقع سی ہوئی ہمکو	نگہ تیز اُن نے سوا یدھر نہ کی دو بار یا قسمت
پڑا سایہ نہ اُس کی تیغ خوں آلودہ کا سر پر	کیے ہیں یوں تو قسمت اُن نے کیا کیا وار یا قسمت
رہا تھا زیرِ دیوار اُسکے میں برسات میں جاکر	گری اس مینھ میں سر پر وہی دیوار یا قسمت
موئے ہم تشنہ لب دیدار کے حالانکہ گریاں سے	نصیب اپنے کہ سوکھی چشم دریا بار یا قسمت
در مسجد پہ ہو کر بینوا بیٹھے ہیں یا ھادی	ہمیں تھے ورنہ میخانے کے تکیہ دار یا قسمت

نصیبوں میں ہے جنکے عیش وہ بھی میر جیتے ہیں
جیے ہیں ہم بھی جو مرنے کو تھے تیار یا قسمت

ردیف ثائے مثلثہ

دل کو اُس بے مہر سے ہم نے لگایا ہی عبث	مہر کی رکھ کر توقع جی کھپایا ہے عبث
دیکھ کر اُس کو کھڑے سوچی سے ہم عاشق ہوے	بیٹھے بیٹھے ناگہاں یہ رنج اُٹھایا ہے عبث
اپنی تو بگڑی ہے کوئی کام کی صورت نہیں	اُن نے بے لطفی سے منھ اچھا بنایا ہے عبث
جی کے جاتے وہ جو نو خط آتا تو بابت بھی تھی	لطف کر مردہ پہ عاشق کے اب آیا ہے عبث
تب تو خانہ باغ سے اپنے نہ پوچھی بات بھی	کیا جو تربت پر مری اب پھول لایا ہے عبث
راتدن سنتا ہے نالے یوں نہیں کہتا کبھو	میر دل آزردہ کو کس نے ستایا ہی عبث

ردیف جیم عربی

کس تازہ مقتل پہ کشندے تیرے ہوا ہے گزار آج
زہ دامن کی بھری ہے لہو سے کس کو تو نے مارا آج

کل تک ہم نے تم کو رکھا تھا سو پردے میں کلی کے رنگ
صبح شگفتہ گل جو ہوئے تم سب نے کیا نظارا آج

کوئی نہیں شاہانِ سلف میں خالی پڑے ہیں دونوں عراق
یعنی خود گم اسکندر ہے ناپیدا ہے دارا آج

چشمِ مشتاق اس لب و رخ سے لمحہ لمحہ اٹھتی نہیں
کیا ہی لگے ہے اچھا اس کا مکھڑا پیارا پیارا آج

اب جو نسیم معطر آئی شاید بال کھلے اس کے
شہر کی ساری گلیاں ہو گئیں گویا عنبر سارا آج

کل ہی جوش و خروش ہمارے دریا کے سے تلاطم تھے
دیکھ ترے آشوبِ زباں کے کر بیٹھے ہیں کنارا آج

چشم چرائی دور سے کر وا مجھ کو لگا یہ کہتے گیا
صید کریں گے کل ہم آکر ڈال چلے ہیں چارا آج

کل ہی زیان جیوں کے کیے ہیں عشق میں کیا کیا لوگوں نے
سادگی میری چاہ ہیں دیکھو میں ڈھونڈھوں ہوں دارا آج

میر ہوئے ہو بیخود کب کے آپ میں بھی تو ٹک آؤ
ہے دروازے پر انبوہ اک رفتہ شوق تمھارا آج

شہر سے یار سوار ہوا جو سواد میں خوب غبار ہے آج
دشتی وحش و طیر اس کی سر تیزی ہی میں شکار ہے آج

برافروختہ رخ ہے اس کا کس خوبی سے مستی میں
پی کے شراب شگفتہ ہوا ہے اس نوگل پہ بہار ہے آج

اس کا بحرِ حسن سراسر اوج و موج و تلاطم ہے
شوق کی اپنے نگاہ جہاں تک جاوے بوس و کنار ہے آج

آنکھیں اس کی لال ہوئی ہیں اور چلے جاتے ہیں سر
رات کو دارو پی سویا تھا اس کا صبح خمار ہے آج

گھر آئے ہو فقیروں کے تو آؤ بیٹھو لطف کرو

کیا ہے جان بن اپنے گئے سو ان قدموں پہ نثار ہے آج

کیا پوچھو ہو سانجھ تلک پہلو میں کیا کیا تڑپا ہے
کل کی نسبت دل کو ہمارے بارے کچھ تو قرار ہے آج

مت چو کو اس جنس گراں کو دل کی وہیں لیجاؤ تم
ہندستاں کے ہندو بچوں کی بہت بڑی سرکار ہے آج

خوب جو آنکھیں کھول کے دیکھا شاخِ گل پہ نظر آیا
ان رنگوں پھولوں میں ملا کچھ محوِ جلوۂ یار ہے آج

جذبِ عشق جدھر چاہے ہے لے جائے ہے محمل لیلی کا
یعنی ہاتھ میں مجنوں کے ناقے کی اُس کے مہار ہے آج

رات کا پہنا ہار جو اب تک دن کو اُتارا اُن نے نہیں
شاید میر جمالِ گل بھی اُسکے گلے کا ہار ہے آج

رنگ یہ ہے دیدۂ گریاں سے آج
لوہو ٹپکتا ہے گریباں سے آج

سر بفلک ہونے کو ہے کس کی خاک
گرد یک اُٹھتی ہے بیاباں سے آج

کہوں سو کیا کہوں نے صبر و نے قرار ہے آج
جو اس چمن میں یہ اک طرفہ انتشار ہے آج

سر اپنا عشق میں ہم نے بھی یوں تو پھوڑا تھا
پر اسکو کیا کریں اوروں کا اعتبار ہے آج

گیا ہے جانبِ وادی سوار ہو کر یار
غبار گرد پھرے ہی بہت شکار ہے آج

جہاں کے لوگوں میں جسکی تھی کل تئیں عزت
اُسی عزیز کو دیکھا ذلیل و خوار ہے آج

سحر سواد میں چل زور پھولی ہے سرسوں
ہوا ہے عشق سے کل زرد کیا بہار ہے آج

سواری اُسکی ہے سرگرمِ گشتِ دشت مگر
کہ خیرہ تیرہ نمودار یک غبار ہے آج

سپہر چھڑیوں میں کل تک پھرے تھا ساتھ اپنے
عجب ہے سب کا اسی سفلے پر مدار ہے آج

بخارِ دل کا نکالا تھا دردِ دل کہہ کر
سو درد سر ہے بدن گرم پر بخار ہے آج

کسو کے آنے سے کیا اب کہ غش ہی کل دن سے
ہمیں تو اپنا ہی اے میر انتظار ہے آج

ردیف جیم فارسی

آج ہمیں بدحالی سی ہے حال نہیں ہے جان کے بیچ
کیا عاشق ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے جہان کے بیچ
پایہ اس کی شہادت کا ہے عرشِ عظیم سے بالاتر
جو مظلومِ عشق موا ہے بڑھکر ٹک میدان کے بیچ
یونہیں نظر چڑھ رہتی نہیں کچھ حسرت ہیں تو چشم سفید
دیکھے ہے ہیرے کی ونک میں اس چشم حیران کے بیچ
وہ پرکالہ آتش کا ہے صبح تلک بھڑکا بھی نہ تھا
کیا جانوں کیا پھونک دیا لوگوں نے اُسکے کان کے بیچ
وعدے کرو ہو برسوں کے تم دم کا بھروسا ہمکو نہیں
کچھ کچھ ہو جاتا ہے یاں اک پل میں ایک اک آن کے بیچ
تبعیت سے جو فارسی کی کچھ میں نے ہندی شعر کہے
سارے ترک بچے ظالم اب پڑھتے ہیں ایران کے بیچ

بندے خدائے پاک کے ہم جو میر نہیں تو زیر فلک
پھر یہ تقدّس آیا کہاں سے مشتِ خاک انسان کے بیچ

فصلِ گل میں اسیر ہوئے تھے من ہی کی رہی من کے بیچ
اب یہ ستم تازہ ہے ہم پر قید کیا ہے چمن کے بیچ
یہ اُلجھاؤ سلجھتا ہمکو دے ہے دکھائی مشکل سا
یعنی دل اٹکا ہے جاکر ان بالوں کی شکن کے بیچ
وہ کرتا ہے زبان درازی حسرت سے ہم چپکے ہیں
کچھ بولا نہیں جاتا یعنے اُس کے حرف و سخن کے بیچ
دشتِ بلا میں جاکر مریے اپنے نصیب جو سید ہے ہوں
واں کی خاک عبیر کی جاگہ رکھدیں لوگ کفن کے بیچ
کبک کی جان مسافر ہووے دیکھے خرام ناز اس کا
نام نہیں لیتا ہے کوئی اُس کا میر وطن کے بیچ
کیا شیریں ہے حرف و حکایت حسرت ہم کو آتی ہے

ہائے زبان اپنی بھی ہووے یکدم اُسکے دہن کے بیچ

غم و اندوہِ عشق سے ہر لحظہ نکلتی رہتی ہے
جان غلط کر میر آئی ہے گویا تیرے بدن کے بیچ

اس کے رنگ کھلا ہے شاید کوئی پھول بہار کے بیچ
شور پڑا ہے قیامت کا سا چار طرف گلزار کے بیچ

رحم کرے وہ ذرہ ذرہ تو دیکھنے آوے دم بھریاں
اب تو دم بھی باقی نہیں ہے اُسکے کسو بیمار کے بیچ

چین نہ دے گا خاک کے نیچے ہرگز عشق کے ماروں کو
دل تو ساتھ اسے کاش نہ گاڑیں اُن لوگوں کے مزار کے بیچ

چشمِ شوخ سے اُسکے یارو کیا نسبت ہے غزالوں کو
دیکھتے ہیں ہم بڑا تفاوت شہری اور گنوار کے بیچ

کون شکارِ رم خوردہ سے جا کے کہے ٹک پھر کر دیکھ
کوئی سوار ہے تیرے پیچھے گرد و خاک و غبار کے بیچ

رونے سے جو رود بہا تو اس کا کیا ہے یار عجب
جذب ہوئے ہیں کیا کیا دریا اپنے جیب و کنار کے بیچ

چشمک غمزہ عشوہ کرشمہ آن انداز و ناز و ادا
حسن سوائے حسنِ ظاہر میر بہت ہیں یار کے بیچ

اے بوئے گل سمجھ کے مہکیو پون کے بیچ — زخمی پڑے ہیں مرغ ہزاروں چمن کے بیچ
دیکھے ہے کیا میں اندر ہی اندر گداز ہوں — دھوکا ہے جوں حباب مرے پیرہن کے بیچ

ردیف حائے حطی

گھر سے سپے نکلتا ہے تلوار سے طرح — اب اُن نے بیچ بنائی ہے خونخوار سیطرح
جی نیچے کی طرح نظر آتی نہیں کوئی — کرتا ہے میرے خون پہ اصرار سیطرح
چہرہ تو اُن نے اپنا بنایا ہے خوب لیک — بگڑا پھرے ہے اب وہ طرحدار سیطرح
کسطرح جائے بگڑی زبان اُسکی خشم میں — کہتا ہے بیٹھا متصل اب یار سیطرح

لوہو میں ڈوبے دیکھیو دامان و جیب میر
بھرا ہے آج دیدۂ خونبار بے طرح

وہ نوبادۂ گلشن خوبی سب سے رکھے ہے نرالی طرح
شاخ گل سا جائے ہے لہکا اُن نے نئی یہ ڈالی طرح

مونڈھے چلے ہیں چولی چپی ہے مہری پھنسی ہے بند کسے
اس اوباش نے پہناوے کی ایسی نرالی نکالی طرح

جبہہ نوچا مُنھ نوچا سب سینہ نوچا ناخن سے
میر نے کی ہے غم غصّے میں اپنے یہ بدحالی طرح

ردیف خائے معجمہ

جھمک سے اُسکے بدن میں ہر ایک جا ہے شوخ
پڑے ہے سیکڑوں جا راہ چلنے میں اُس پر

برنگ برق سراپا وہ خودنما ہے شوخ
کسو کی آنکھ تو دیکھے کوئی بلا ہے شوخ

نظر پڑی ہیں کیا اسکی شوخ چشمی میر
حضور یار کی چشم غزال کیا ہے شوخ

گلبن چمن کے اُس کو جو دیکھتے ہیں گستاخ
کیا تازہ کوئی ابکی نکلی بہار میں شاخ

ردیف دال مہملہ

اُس سے نہ اُلفت ہو مجکو تو ہووے میرا چہرہ زرد
ہاتھ نہ رکھوں کیوں میں دل پر رنج و بلا ہے قیامت درد

ملنے میں خنکی ہی کرتا وہ کاشکے پہلے چاہ کے دن
گرمی نہ ہوتی آپس میں تو کھنچتی نہ ہر دم آہِ سرد

برسوں میں اقلیم جنوں سے دو دیوانے نکلے تھے
میر آوارۂ شہر ہوا ہے قیس ہوا ہے بیاباں گرد

کہتے ہو تم کہ کیسر مجھ میں وفا ہے شاید
کم ناز سے ہے کس کے بندے کی بے نیازی

متروک رسم جور و ظلم و جفا ہے شاید
قالب میں خاک کے یاں پنہاں خدا ہے شاید

یاں کچھ نہیں ہے باقی اُسکے حساب لیکن
مجھ میں شمار دم ہے اب کچھ رہا ہے شاید

قید فراق سے تو چھوٹیں جو مر رہیں ہم
اس دردِ بے دوا کی مرنا دوا ہے شاید

یہ عشق ہے یقینی حال ایسا کم سنا ہے
اے میر دل کسو سے تیرا لگا ہے شاید

رکھتا ہے دل کنار میں صد پارہ دردمند
ہر پارہ اُس کا پاتے ہیں آوارہ دردمند

تسکین اپنے دل کی جو پاتا نہیں کہیں
جز صبر اور کیا کرے بے چارہ دردمند

اسلامی کفری کوئی ہو ہے شرط دردِ عشق
دونوں طریق میں نہیں ناکارہ دردمند

قایل ہوئے ہیں سیر کے چشمانِ خونفشاں
دیکھیں ہیں آنکھوں تو ہو کا فوارہ دردمند

کیا کام اُس کو یاں کے نشیب و فراز سے
رکھتا ہے پانوں دیکھ کے ہموارہ دردمند

اس کارواں سرائے کے ہیں لوگ رفتنی
حسرت سے اُنکا کرتے ہیں نظارہ دردمند

سو بار حوصلہ سے اگر رنج کش ہو میر
پھر فرطِ غم سے مر رہے یکبارہ دردمند

ہے عشق کا فسانہ میرا نہ یاں زباں زد
ہر شہر میں ہوئی ہے یہ داستاں زباں زد

حسرت سے حُسنِ گل کی چپکا ہوا ہوں ورنہ
طیرانِ باغ میں ہوں میں خوش زباں زباں زد

مذکور عاشقی کا ہر جا رہا سو ہے یا ہم
یعنی نہیں کہانی میری کہاں زباں زد

فرہاد و قیس دو اِس سرک سے پوچھ لو تم
شہروں میں عشق کے ہوں میں ناتواں زباں زد

کیا جانے میر کس کے غم سے ہے چپ وگرنہ
حرف و سخن میں کیا ہی ہے یہ جواں زباں زد

کیا کہیے ہوئے مملکتِ ہستی میں وارد
بے یار و دیار اب تو ہیں اس بستی میں وارد

کچھ ہوش نہ تھا منبر و محراب کا ہم کو
صد شکر کہ مسجد میں ہوئے مستی میں وارد

کچھ تدبیر بتاؤ ہم کو دل اپنا ہے زنگ آلود
خاک اُڑاتے کہاں تک پھریے چہرہ سب ہے گرد آلود

ردیف رائے مہملہ

سپے موئے بھی رنج و بلا ہے ہمسایوں کی جانوں پر
کیا کیا سینہ زنی رہتی ہے درد و غم کے فسانوں پر

میں تو کیا کیا حرف و سخن تھے میرے جہاں سے جاتے رہے
باتیں درد آگیں ہیں اب تک کیسی کیسی زبانوں پر

تو بھی رباطِ کہن سے صوفی سیر کو چل ٹک سبزے کی
ابرِ سیہ قبلہ سے آ کر جھوم پڑا میخانوں پر

آمد و رفتِ نسیم سے ظاہر رنجشِ بلبل ہے لیکن
باؤ بھی اب تک ہی نہیں گلہائے چمن کے کانوں پر

جیغہ جیغہ اُس کی سی ابرو دلکش نکلی نہ کوئی یاں
زور کیے لوگوں نے اگرچہ نقش و نگار کمانوں پر

جان تو یاں ہے گرمِ رفتن لیت و لعل اُن ویسی ہے
کیا کیا مجھ کو جنون آتا ہے اس لڑکے کے بہانوں پر

بعد مرے سبحے کو میرے ہاتھوں ہاتھ ملک لیں گے
سو سو بار لیا ہے میں نے نام اُس کا ان دانوں پر

دل کی حقیقت عرش کی عظمت سب کچھ ہے معلوم ہمیں
سیر رہی ہے اکثر اپنی ان پاکیزہ مکانوں پر

راہ چلو تم اپنی اپنی میرؔ طریق سے کیا تم کو
آنکھوں سے پروا میں نے کیا ہے واں پاؤں کے نشانوں پر

عشق عجائب زور آور ہے کُشتی سب کی پاک ہوئی
ذکرِ میرؔ ہے کیا پیری میں حرف و سخن ہے جوانوں پر

کئی داغ ایسے چلائے جگر پر
گیا میری وادی سے سیلاب بچ کر
سرہ سے اُس کے موئے ہی کھینگے
سر اس آستاں پر رگڑتے گئے ہیں
ہم آتا اُسے سن کے جیتوں میں آئے
اُسے لطف اسکا ہی لاوے تو لاوے
سر کتے نہیں شوق کشتوں کے سر پر

کہ وے نرگسی زن بھے گلہائے تر پر
نظریاں جو کی عشق کے شیرِ نر پر
یہ جی جا رہا ہے اُسی رہ گزر پر
ہوئے خون یاروں کے اس خاکِ در پر
بنا زندگانی کی ہے اب خبر پر
نہیں وصل موقوف کچھ زور و زر پر
قیامت کا ہنگامہ ہے اُس کے در پر

اُتر جو گیا دل سے روکش ہوا اُس کا
چڑھا پھر نہ خورشید میری نظر پر

بھری تھی مگر آگ دل میں دروں میں
ہوئے اشک سوزش سے اُس کی شرر پر

گیا پی جو ان آنسوؤں کے تئیں میں
سراسر ہیں اب داغ سطحِ جگر پر

سرِ عجز ہر شام تھا خاک پر ہی
تہِ دل تھے کیسے ہی آہِ سحر پر

پلک اُٹھتے آثار اچھے نہ دیکھے
پڑی آنکھ ہرگز نہ رہ سے اثر پر

طرف شاخِ گل کی لچک کے نہ دیکھا
نظر میر کی تھی کسو کی کمر پر

غزل در غزل صاحبو یہ بھی دیکھو
نہیں عیب کرنا نظر اک ہنر پر

بھروسا اسیری میں تھا بال و پر پر
سو پرواز ہوئی نہ قفس کی بھی در پر

سوارانِ شایستہ کشتے ہیں تیرے
نہ تیغِ ستم کر علم ہر نفر پر

کھلا پیشِ دنداں نہ اُس کا گہر بچہ
کنھوں نے بھی تھوکا نہ سنگِ گہر پر

جلے کیوں نہ چھاتی کہ اپنی نظر ہے
کسو شوخ پرکار رعنا پسر پر

نہ محشر میں چونکا مرا خونِ خفتہ
وہی تھا یہ خوابیدہ اس شور و شر پر

کئی زخم کھا کر تڑپتا رہا دل
تسلی تھی موقوف زخمِ دگر پر

سنا تھا اسے پاس لیکن نہ پایا
چلے دور تک ہم گئے اس خبر پر

سرِ شب کبھے تھا بہانہ طلب وہ
گھڑی ایک رات آئی ہوگی پہر پر

کہو پاس بیٹھا رہے کب تلک یوں
کہو ہوگی رخصت گئے اب سحر پر

جہاں میں نہ کی میر اقامت کی نیت
کہ مشعر تھا آنا مرا یاں سفر پر

عشق خدائی خراب ہے ایسا جس سے گئے ہیں گھر کے گھر
کعبہ و دیر کے ایوانوں کے گرے پڑے ہیں در کے در

حج سے کوئی آدمی ہو تو سارا عالم حج ہی کرے
مکے سے آئے شیخ جی لیکن دے تو وہی ہیں خر کے خر

رنج و تعب میں مرتے دیکھے ہم نے ممسک دولتمند
جی کے جی بھی عبث جاتے ہیں ان لوگوں کے زر کے زر

مسلم و کافر کے جھگڑے میں جنگ و جدل سے رہائی ہیں
لوتھوں پہ لوتھیں گرتی رہیں گی کٹتے رہیں گے سر کے سر

سخت مصیبت عشق میں یہ ہے جائیں چلی جاتی ہیں لیک
ہاتھ سروں پر ماریں گے تو بند رہیں گے گھر کے گھر

کب سے گرمی عشق نے میرے چشمۂ چشم کو خشک کیا
کپڑے گلے سب تن کے لیکن ڈوبے ہیں اب تک تر کے تر

نکلے اک کے قفس میں شاید کوئی کلی تو نکلے میر
سارے طیر شگفتہ چمن کے ٹوٹ گئے و سے بیچ کے پر

بات کہو کیا چپکے چپکے بیٹھ رہو ہو یاں آکر
ایسے گونگے بیٹھو ہو تم بیٹھے اپنے گھر جاکر

دل کا راز کیا میں ظاہر بلبل سے گلزار میں لیک
اس بے تہ نے صحن چمن میں جان دی چلا چلا کر

جیسا پیچ و تاب پڑا ہے اپنے بالیدہ تھا ویسا ہی
مار سیہ کو رشک سے مارا ان بالوں نے بل کھا کر

ڈھونڈھتے ہیں اطفال پھریں ہیں اک جنوں کی ضیافت میں
بھر رکھی ہیں شہر کی گلیاں پتھر ہم نے لا لا کر

ہا ہا ہے نے شوخ کی میرے تنگ کیا خوشہرا ہو
شرح و بسط ہوئے خجالت سے چھوٹے ہا ہا ہا کر

چاہ کا جو اظہار کیا تو فرط شرم سے جان گئی
عشق شہرت دوست نے آخر مارا مجھ کو رسوا کر

میر کیا رونا ہے جس سے آنکھوں پر رو مال رہا
دامن کے ہر پاٹ کو اپنے گریہ زاری سے دریا کر

ترچھی نگاہیں کیا کرتے ہو دم بھر کے یاں آنے پر
ادھر دیکھو ہم نے نہیں کی خم ابرو سر جانے پر

زور ہوا ہے چل صوفی ٹک تو بھی رباط کہنہ سے
ابر قبلہ بڑھتا بڑھتا آیا ہے میخانے پر

گل کھائے بے تہ بلبل نے شور قیامت کا سا کیا
دیکھو چمن میں اس بن میرے جیسے جی بہلانے پر

سر نیچے کر لیتا تھا تلوار چلاتے ہم پر وے
رہ گئے خونریزی میں اپنی اسکے پھر شرمانے پر

لہ تو بھی رباط کہن سے صوفی سیر کو چل ٹک سبزے کی ٭ ابر سیہ قبلہ سے آکر جھوم پڑا میخانوں پر ۔ میر

گالی مار کے غم پر میں نے صبر کیا خاموش رہا
رحم نہ آیا ٹک ظالم کو اس میرے غم کھانے پر

نادیدہ ہیں نام خدا کے ایسے جیسے قحط زدہ
دوڑتی ہیں کیا آنکھیں اپنی سبھی کے دانے دانے پر

حال پریشاں سن مجنوں کا کیا جلتا ہے جی اپنا
عاشق تم بھی میر رہے ہیں اس ڈھب کے دیوانے پر

روزوں میں رہ سکیں گے ہم بے شراب کیونکر
گذرے گا اتقا میں عہد شباب کیونکر

تھوڑے سے پانی میں بھی چل نکلے ہے ابھرتا
سیدھے تہ ہے سر نہ کھینچے اک دم حباب کیونکر

چشمے بھرے اشک ہیں یادگار اس کے
وہ سوکھ سب گئی ہے چشم پر آب کیونکر

دل کی طرف کا پہلو سب متصل جلے ہے
مخمل ہو فرش کیوں نہ آوے گی خواب کیونکر

اول سحر کھانا آخر صبوحی کرنا
آوے نہ اس عمل سے سر میں حجاب کیونکر

اجڑے نگر کو دل کے دیکھوں ہوں جب کہوں ہوں
اب پھر بسے گی ایسی بستی خراب کیونکر

جرم و ذنوب تو ہیں بے حد و حصر یارب
روز حساب لیں گے مجھ سے حساب کیونکر

پیش از سحر اٹھے ہے آج اس کے منھ کا پردا
نکلے گا اس طرف سے اب آفتاب کیونکر

خط میر آوے جاوے جو نکلے راہ ادھر کی
کوئی نہیں ہے قاصد لاوے جواب کیونکر

تڑپے ہے غمزدہ دل لاوے گا تاب کیونکر
خوں بستہ ہیں گی آنکھیں آوے گی خواب کیونکر

پر ناتواں ہوں مجھ پر بھاری ہے جی ہی اپنا
مجھ سے اٹھیں گے اس کے ناز و عتاب کیونکر

اس بحر میں ہے مٹنا شکل حباب ہر دم
ابھرا رہے ہمیشہ نقش بر آب کیونکر

پانی کے دھوکے پیاسے کیا کیا عزیز مارے
سر پر نہ خاک ڈالے اپنے سراب کیونکر

آب رواں نہ تھا کچھ وہ لطف زندگانی
جاتی رہی جوانی اپنی شتاب کیونکر

سینہ میں میرے کب سے اک سینک سی رہے ہے
قلب کبد نہ ہوویں دونوں کباب کیونکر

شلاق خواری کی تھی خجلت جو کچھ نہ بولا
منھ کیا ہے نامہ بر کا نکلے جواب کیونکر

سوز دل و جگر سے جلتا ہے تن بدن سب
ہیں کیا کوئی ہو کھینچے ایسے عذاب کیونکر

چہرہ کتابی اس کا مجموعہ میر کا ہے
اک حرف اس دہن کا ہو تو کتاب کیونکر

لاوے جھمکتے رخ کی آئینہ تاب کیونکر
ہو چہرہ اُسکے لب سے یاقوت تاب کیونکر

ہے شعر و شاعری گو کب سے شعار اپنا
حرف و سخن سے کریے اب اجتناب کیونکر

جوں ابر اگر نہ روویں وادی و کوہ پر ہم
تو شہروں شہروں آوے نہروں میں آب کیونکر

اب بھی نہیں ہے ہمکو لے عشق ناامیدی
دیکھیں خراب ہووے حال خراب کیونکر

اُڑ اُڑ کے جا لگے ہے وہ تیر مار کاکل
کھاتا رہے نہ انھی پھر پیچ و تاب کیونکر

چشم محیط سے جو ہووے نہ چشم تر کے
تو سیر ہو ہوا پر پھیلے سحاب کیونکر

اب تو طپش نے دل کی اودھم مچا رکھا ہے
تسکین پا دے دیکھوں یہ اضطراب کیونکر

رو چاہیے ہے اُس کے در پہ کبھی بیٹھنے کو
ہم تو ذلیل اُس کے ہوں میر باب کیونکر

سنا تم نے جو گزرا سانحہ ہجراں میں یاروں پر
قیامت غم سے ہر ساعت رہی الفت کے ماروں پر

کیا ہے عشق عالم کش نے کیا ستھراؤ لوگوں کا
نکل چل شہر سے باہر نظر کر ٹک مزاروں پر

تڑپ کر گرم ٹک جوں برق ٹھنڈے ہوتے جاتے ہیں
بسان ابر رحمت رو بہت ہم بیقراروں پر

بڑی دولت ہے درویشی جو بہرہ ہو قناعت سے
کہ عرصہ تنگ ہے حرص ہو لتے تاجداروں پر

سیاحت خوب مجکو یاد ہے یکی کبھی وحشت کی
پڑا اپنا پاؤں پھیلے دشت کے سر تیز خاروں پر

گئے فرہاد و مجنوں ہو کوئی تو بات بھی پوچھیں
یکایک کیا بلا آئی ہمارے غمگساروں پر

گئی اس ناتوان عشق کے آگے سے پیری ٹل
سبکروحی مری اے میر بھاری ہے ہزاروں پر

اک آدھ دن نکل مت سے ابر ادھر سے ہو کر
بیٹھا ہوں میں ابھی ٹک سارا جہاں ڈبو کر

اب کل نہیں ہے تجکو بے قتل غم کشتوں کے
کہتے تو تھے کہ ظالم خونریزی سے نہ خو کر

کہتے ہیں راہ پائی زاہد نے اس گلی کی
روتا کہیں نہ آوے ایمان و دیں کو کھو کر

ہے نظم کا سلیقہ ہر چند سب کو لیکن
جب جانیں کوئی لاوے یوں موتی سے پرو کر

کیا خوب زندگی کی دنیا میں شیخ جی نے
تعبیر کرتے ہیں سب اب اُنکو مردہ شو کر

گو تیرے منھ ظالم آب حیات ہوں اب
کیا ہم کو جی کی بیٹھے ہم جی سے ہاتھ دھو کر

کس کس ادا سے قتلے کرتے ہیں قصد اُدھر کا
جب بید ماغ سے تم اُٹھ بیٹھتے ہو سو کر

ٹکڑے جگر کے میرے مت چشم کم سے دیکھو
کاڑھے ہیں یہ جواہر دریا کو میں بلو کر

احوال میر جی کا مطلق گیا نہ سمجھا
کچھ زیر لب کہا بھی سو دیدہ ور دہ کر

عشق ہمارا خون کرے ہے جی نہیں رہتا یار بغیر
وہ گھر سے نہیں اپنے نکلتا دم بھر بھی تلوار بغیر

جان عزیز کی جاں بھی گئے پر آنکھیں کھلی رہجائینگی
یعنی کشتۂ حسرت تھا میں آئینہ سا دیدار بغیر

گوندھے گئے سو تازہ رہے ہے جو سبد میں تھے سو ملامت سے
سوکھ کے کانٹا پھول ہوئے وے اسکے گلے کے ہار بغیر

پھولوں کا موسم کاشکے ہو پردے سے ہوا کے چشمک زن
گل کھائے ہیں ہزار خزاں میں مرغ چمن نے بہار بغیر

وحشی و طیر سے دشت بھرے تھے صیادی تھی یار کی جب
خالی پڑے ہیں دام کہیں میر اسکے ذوق شکار بغیر

چندے بجا ہے گریۂ و اندوہ و آہ کر
ماتم کدے کو دہر کے تو عیش گاہ کر

کیا دیکھتا ہے ہر گھڑی اپنی ہی سج کو شوخ
آنکھوں میں جان آئی ہے ایدھر نگاہ کر

رحمت اگر یقینی ہے تو کیا ہے زہد شیخ
اے بیوقوف جائے عبادت گناہ کر

چھوڑ اب طریق جور کو اے بیوفا سمجھ
نبھتی نہیں یہ چال کسو دل میں راہ کر

چسپیدگی داغ سے مت منھ کو اپنے موڑ
اے زخم کہنہ دل سے ہمارے نباہ کر

اس وقت ہے دعا و اجابت کا وصل میر
یک نعرہ تو بھی پیش کش صبح گاہ کر

شوریدہ سر رکھا ہے جبھی اس آستاں پر
میرا دماغ تب سے ہے ہفتم آسماں پر

گھائل گرا رہا ہے فتراک سے بندھا نے
کیا کیا ستم ہوئے ہیں اس صید ناتواں پر

لطف بدن کو اسکے ہرگز پہونچ سکے نہ
جا پڑتی تھی ہمیشہ اپنی نگاہ جاں پر

خاشاک و خار و خس کو کر ایک جا جلایا
کیا خشم شور برق خاطف تھی آشیاں پر

وہ باغباں پسر کچھ گل گل شگفتہ ہے اب
یہ اور گل کھلا ہے اک پھول تھی دکاں پر

پرکالے آگ کے تھے کیا نالہائے بلبل
شبنم سے آبلے ہیں گلبرگ سی زباں پر

دل کیا مکان پھر اس کا کیا صحن میرؔ لیکن
غالب ہے سعی میں تو میدانِ لامکاں پر

آیا نہ پھر ادھر وہ مست شراب ہو کر — کیا پھول مرگئے ہیں اُس بن خراب ہو کر
صید زبوں میں میرے یک قطرہ خوں نہ نکلا — خنجر تلے بہا میں خجلت سے آب ہو کر
وعدہ وصال کا ہے کہتے ہیں حشر کے دن — جانا ہوا و لیکن واں سے شتاب ہو کر
وارد ہیے نہ ساتھ آخیروں کے بیشتر یاں — غیرت سے رہ گئے ہیں عاشق کباب ہو کر

یک قطرہ آب اُس بن میں نے اگر پیا ہے
نکلا ہے میرؔ پانی وہ خونِ ناب ہو کر

ابر سیہ قبلہ سے اُٹھکر آیا ہے میخانے پر — بادہ کشوں کا جھرمٹ ہے کچھ شیشہ پر پیمانے پر
رنگ ہوا سے ٹپکنے لگا ہے سبزے میں کچھ ہی پھول کھلا — یعنی چشمک گل کرتا ہے فصلِ بہار کے آنے پر
شور جنوں ہے جوانوں کے سر میں پاؤں میں زنجیریں ہیں — سنگ زناں لڑکے پھرتے ہیں ہر سر سودانے پر
بیتابانہ شمع پر آیا گرد پھرا پھر جل ہی گیا — اپنا جی بھی حد سے زیادہ رات جلا پروانے پر

قدرِ جان جو کچھ ہووے تو صرفہ بھی ہم میرؔ کریں
منھ موڑیں کیا آنے سے اُسکے اپنی جان کے جانے پر

سعی سے اس کی ہوا مائل گریباں چاک پر — آفریں کر اے جنوں میرے کفِ چالاک پر
کیوں نہ ہوں طرفہ گلیں خوش طرح ہیں بعضے کلال — خاک کن کن صورتوں کی صرف کی ہے خاک پر

ہمکو مٹی کر دیا پامالی گردوں نے میرؔ
وہ نہ آیا ناز کرتا ٹک ہماری خاک پر

ردیف زائے معجمہ

اس بستر افسردہ کے گل خوشبو ہیں مرجھائے ہنوز
اس نکہت سے موسم گل ہیں پھول نہیں یاں آئے ہنوز

اُس زلف و کاکل کو گوندھے دیر ہوئی مشاطہ کو
سانپ سے لہراتے ہی ہیں پر بال اُسکے بل کھائے ہنوز

آنکھ لگے کا مدت گزری پائے عشق جو بیچ میں ہے
ملتے ہیں معشوق اگر تو ملتے ہیں شرمائے ہنوز

تہ داری کیا کہیے اپنی سختی ہے اُس کی جیتے ہوئے
حرف و سخن کچھ کہیے لیکن ہرگز منھ پہ نہیں لائے ہنوز

ایسی جلینت کر لوگوں سے جیسے غم کش میر نے کی
برسوں ہوئے ہیں اٹھ گئے اُن کو روتے ہیں ہمسائے ہنوز

کب سے گیا ہے آیا نہیں نامہ بر ہنوز
راہی بھی کچھ سنا نہیں جاتے خبر ہنوز

خونِ جگر کو سوکھے ہوئے برسوں ہو گئے
رہتی ہیں میری آنکھیں شب و روز تر ہنوز

ہرچند آسماں پہ ہماری دعا گئی
اُس مہ کے دل میں کرتی نہیں کچھ اثر ہنوز

مدت سے لگ رہی ہیں مری آنکھیں اُسکی اور
وہ دیکھتا نہیں ہے غلط کر ادھر ہنوز

برسوں سے لکھنؤ میں اقامت ہے مجکو لیک
یاں کے چلن سے رکھتا ہوں عزم سفر ہنوز

تیشہ سے کوہکن کے دلِ کوہ جل گیا
نکلے ہے سنگ سنگ سے اکثر شرر ہنوز

جل جل کے ہو گیا ہے کبد تو کباب میر
جوں غنچہ ناشگفتہ ہے داغِ جگر ہنوز

کب سے آئے کہتے ہیں تشریف نہیں لاتے ہیں ہنوز
آنکھیں مندی اب جا چکے ہم وے دیکھو تو آتے ہیں ہنوز

کہتا ہے برسوں سے ہمیں تم دور ہو یاں سے دفع بھی ہو
شوق و سماجت سیر کرو ہم پاس اُسکے جاتے ہیں ہنوز

راتوں پاس گلے لگ سوتے ننگے ہو کر ہے یہ عجب
دن کو بے پردہ نہیں ملتے ہم سے شرماتے ہیں ہنوز

ساتھ کے پڑھنے والے فارغ تحصیلِ علمی سے ہو گئے
جہل سے مکتب کے لڑکوں میں ہم دل بہلاتے ہیں ہنوز

گل صد رنگ چمن میں آئے باد خزاں سے بکھر ہی گئے
عشق و جنوں کی بہار کے عاشق میر جی گل کھاتے ہیں ہنوز

کب سے قیدی ہیں یہ ہے نالش بسیار ہنوز
دل بہاران چمن کا ہے گرفتار ہنوز

وہ مہ چاردہ اس شہر سے کب کا نکلا
ہر گلی جھانکتے پھرتے ہیں طلبگار ہنوز

بالا بالا ہی بہت عشق میں مارے گئے یار
وہ تہ دل سے کسو کا نہ ہوا یار ہنوز

سال میں ابر بہاری کہیں آ کر برسا
لوہو برسا رہے ہیں دیدۂ خونبار ہنوز

ابکی بالیدنِ گلہا تھا بہت دیکھو نہ میر
ہمسر لالہ ہے خار سر دیوار ہنوز

سرکش ہے تندخو ہے عجب ہے زباں دراز
آتش کا ایسا لایحہ کب ہے زباں دراز

پروانہ تیری چرب لساں سے ہوا ہلاک
ہے شمع تو تو کوئی غضب ہی زباں دراز

ردیفِ سینِ مہملہ

یار ہم سے جدا ہوا افسوس
نہ جدا ہو کے پھر ملا افسوس

جبتلک آن کر رہے مجھ پاس
مجھ میں تب تک کچھ رہا افسوس

دل میں حسرت گرہ ہی رخصت کی
چلتے اُن نے نہ کچھ کہا افسوس

کیا تدارک ہے عشق میں دل کا
میں بلا میں ہوں مبتلا افسوس

سبب بیگانگی کی جس کے لیے
وہ نہیں ہم سے آشنا افسوس

رات دن ہاتھ ملتے رہتے ہیں
دل کے جانے کا ہے بڑا افسوس

باچھیں پھٹ پھٹ گئیں ہیں گھگھیاتے
بے اثر ہو گئی دعا افسوس

مجھ کو کرنا تھا احتراز اُس سے
ہائے افسوس کیا کیا افسوس

نوش دارو ہے نیش دارو میر
متاثر نہیں دوا افسوس

کوئی دن کریے معیشت جا کسو کامل کے پاس
ناقصوں میں رہیے کیا رہیے تو صاحبدل کے پاس

بوئے خوں بھک بھک دماغوں میں چلی آتی ہی کچھ
نکلی ہے ہو کر صبا شاید کسو گھائل کے پاس

شور و ہنگامہ بہت دعوی ضروری ہے بہت
کاش لے مجکو بلاویں حشر میں قاتل کے پاس

گرد سے ہے ناقۂ سلمیٰ کو مشکل رہروی
خاک کس کی ہو کہ مشتاق آتی ہے محمل کے پاس

دل سے تیرے منھ کے دل تھا داغ ای بے رحم جب
خال یہ اک اور نکلا ظالم اس گلے تل کے پاس

دل گداز عشق سے سب آب ہو کر بہ گیا
مر گئے پر گور میری کریے تو بیدل کے پاس

ملیے کیونکر نہ کفِ افسوس بھی جاتا ہے میر
ڈوبتی ہے کشتی ورطہ سے نکل ساحل کے پاس

صد پارہ گلا تیر سے ہے کر ضبطِ نفس بس
سنتا نہیں اس قافلے میں کوئی جرس بس

دنیا طلبی نفس نہ کر شومی سے جوں سگ
تھک کر کہیں ٹک بیٹھ رہ اے ہرزہ مرس بس

خنداں نہ مرے قتل میں رکھ تیغ کو پھر سان
جوں گل یہ ہنسی کیا ہے اسیروں پہ نہ ہنس بس

اس زار نے ہاتھ ان کا جو کھینچا لگے کہنے
غش کرنے نہ لگ جاؤ کہیں چھوڑیے بس بس

کیا میر اسیروں کو در باغ جو وا ہو
بے رنگ ہوا دیکھنے کو چاک قفس بس

آنکھ کھلتے گئی بہار افسوس
گل کو دیکھا بھی نہ ہزار افسوس

جسکی خاطر ہوئے کنارہ گزیں
نہ ہوئے اُس سے ہمکنار افسوس

نہ معرّف نہ آشنا کوئی
ہم ہیں بے یار و بے دیار افسوس

بیقراری نے یوں نہیں جی مارا
اس سے نے عہد نے قرار افسوس

خوں ہوئی دل ہی میں اُمید وصال
مر رہے جی کو مار مار افسوس

چارۂ اشتیاق کچھ نہ ہوا
وہ نہ ہم سے ہوا دوچار افسوس

اک ہی گردش میں اُسکی آنکھوں کی
پھر گیا ہم سے روزگار افسوس

گور اپنی رہی گزرگہ میں
نہ ہوا یار کا گزار افسوس

منتظر ہی ہم اُسکے میر گئے
یاں تک آیا کبھو نہ یار افسوس

کیا کیا تم نے ہم سے کہا تھا کچھ نہ کیا افسوس افسوس
کیا کیا کڑھایا جی سے مارا تو ہو بیا افسوس افسوس

نور چراغ جہاں میں تھا کچھ یوں نہیں نہ آیا لیکن وہ
گل ہو ہی گیا آخر کو یہ بجھتا سا دیا افسوس افسوس

رخصت میں پابوس کی سب کی جی جاتا تھا سو ان نے
ہاتھ میں عاشق وارفتہ کا دل نہ لیا افسوس افسوس

میر کی آنکھیں مندنے پر دہ دیکھنے آیا تھا ظالم
اور بھی یہ بیمار محبت ٹک نہ جیا افسوس افسوس

ردیف شین معجمہ

رکھتے رہے بتوں سے مہر و وفا کی خواہش
اس آرزو نے مارا یہ بھی خدا کی خواہش

بیماری دلی پر میں صبر کر رہا ہوں
جی کو نہیں ہے میرے مطلق دوا کی خواہش

شبِ وصل کی میسر آئی نہ ایک دن بھی
دل کو بھی ہمارے اکثر رہا کی خواہش

چاہت بہت کسو کی اے ہمنشیں بُری ہے
سو جان کی ہے کاہش اک اس ادا کی خواہش

مشتاق عاشقی کا عاقل کوئی نہ ہوگا
ابلہ کسو کو ہوگی اس بد بلا کی خواہش

عجز و انابت اپنی یونہیں تھی صبح گہ کی
درویشوں سے کریں گے اب ہم دعا کی خواہش

حیران کارِ الفت اے میر چپ ہوں میں تو
پوچھا کرو ہو ہر دم کیا بیخودا کی خواہش

رنج و غم آئے بیشتر در پیش
راہِ رفتن ہے اب مگر در پیش

مرگِ فرہاد سے ہوا بدنام
ہے خجالت سے تیشہ سر در پیش

یار آنکھوں تلے ہی پھرتا ہے
میری مدت سے ہے نظر در پیش

خانہ روشن پتنگوں نے نہ کیا
ہے چراغوں کو بھی سحر در پیش

غم سے نزدیک مرنے کے پہونچے
دور کا میر ہے سفر در پیش

کر رکریں ہیں لجوں لطموں کے ڈر پڑے سب کے گوش
بیکراں دریائے غم کے ہیں بلا جوش و خروش

صومعے کو اس ہوائے ابر میں دیتے ہیں آگ
میکدے سے باہر آتے ہی نہیں دی عقل و ہوش

تنگ چولی سو جگہ سے کسمساتے ہی چلی
تنگ ورزی سے کبھی ملتا نہیں وہ تنگ پوش

وا رہے پروانہ کیسا چپکے جل کر رہ گیا
گرمی پہونچے کیا اچھلتا ہے سپندِ ہرزہ کوش

کیسا خود گم سر بکھیرے میر ہے بازار میں
ایسا اب پیدا نہیں ہنگامہ آرا دلفروش

ادھر آتا بھی وہ سوار اے کاش
اس کا ہوجاتا دل شکار اے کاش

زیر دیوار خانہ باغ اس کے
ہم کو جا ملتی خانہ دار اے کاش

کہتے تک بے قرار رہیے گا
کچھ تو ملنے کا ہو قرار اے کاش

راہ تکتے تو پھٹ گئیں آنکھیں
اس کا کرتے نہ انتظار اے کاش

اس کی پامالی سرفرازی ہے
راہ میں ہو مری مزار اے کاش

پھول گل کچھ نہ تھے کھلی جب چشم — اور بھی رہتی اب بہار اے کاش

اب وہی میر جی کھپاتا ہے
ہم کو ہوتا نہ اس سے پیار اے کاش

غصے میں ناخنوں نے مرے کی ہے کیا تلاش — تلوار کا سا گھاؤ ہے جبہے کا ہر خراش
صحبت میں اُسکی کیونکہ رہے مرد آدمی — وہ شوخ و شنگ بے تہ و اوباش و بدمعاش
بیرحم تجکو ایک نظر کرنی تھی ادھر — کشتے کے تیرے ٹکڑے ہوئے نے گئے بھی لاش
آباد اجڑا لکھنؤ چغدوں سے اب ہوا — مشکل ہے اس خرابے میں آدم کی بود و باش

عمرِ عزیز یاس ہی میں جاتی ہے چلی
اُمیدوار اُس کے نہ ہم ہوتے میر کاش

ردیف صاد مہملہ

شاعری شیوہ ہے شعار اخلاص — دین و مذہب مرا ہے پیار اخلاص
اب کہاں وہ مودّتِ قلبی — ہووے ظاہر میں یوں ہزار اخلاص

سورۂ اخلاص کی پڑھی برسوں
میر رکھتا نہیں ہے یار اخلاص

ردیف ضاد معجمہ

عالم علم سے اس عالم میں ہر لحظہ طاری ہے فیض
ہے معلوم کہ عالم عالم پھیریاں وہ جاری ہے فیض
سنگ و شجر میں باتے یوں نہیں غنچہ و گل ہیں بار و بر
عالم ہر دہ ہزار جو ہیں یہ سب ہیں وہ ساری ہے فیض

ردیف طائے مہملہ

جس کو ہوا ہے اس صنم بے وفا سے ربط — اُسکو خدا ہی ہووے تو ہو کچھ خدا سے ربط
گل ہو کے برگ برگ ہوئے پھر ہوا ہوئے — رکھتے ہیں اس چمن کے جو غنچے صبا سے ربط

زنہار پشت پا سے نہیں اٹھتی اسکی آنکھ
شاید اسی کے ہاتھ میں دامن ہے یار کا

اس چشم سرمگیں کو بہت ہے حیا سے ربط
ہو جس ستم رسیدہ سے دست دعا سے ربط

کرتی ہے آدمی کو دنی صحبت فقیر
اچھا نہیں ہے میر سے بے تہ گدا سے ربط

عشق کو جرأت و جگر ہے شرط
زردی رنگ و چشم تر ہے شرط

بے خبر حال سے نہ رہ میرے
میں کہے رکھتا ہوں خبر ہے شرط

حج کو جاوے تو شیخ کو لیجا
کعبہ جانے کو یہ بھی خر ہے شرط

پیسوں پر رتجھتے ہیں یہ لڑکے
عشق سیمیں تناں کو زر ہے شرط

خام رہتا ہے آدمی گھر میں
پختہ کاری کے تئیں سفر ہے شرط

خبث یاروں کا کر فسانوں میں
عیب کرنے کو بھی ہنر ہے شرط

لعل پارے ہیں میر لخت جگر
دیکھ کر خون رو نظر ہے شرط

رکھتا ہے میرے دل سے تمہارا غم اختلاط
ہر لحظہ لحظہ آن و زماں ہر دم اختلاط

ہم وے ملے ہی رہتے ہیں مردم کی شکل کیا
ان صورتوں میں ہوتا نہیں باہم اختلاط

شیریں لباں جہاں کے نہیں چھوٹ جانتے
ہوں گو کہ میر صاحب قبلہ کم اختلاط

ردیف ظائے معجمہ

لطف جوانی کے ساتھ گئے پیری نے کیا ہے کیا محظوظ
کیونکہ جئیں یارب حیرت ہے بے مزہ ایسے نامحظوظ

رونے کڑھنے کو عیش کہو ہو ہم تو تمہارے دعا گو ہیں
یوں نہیں ہمیشہ عشق میں اسکے رکھے ایسا خدا محظوظ

زردی منھ کی اشک کی سرخی دونوں انکو رنگ یہ ہیں
شاید میر بہت رہتے ہو اس سے ہو کے جدا محظوظ

ردیف عین مہملہ

لیے داغ سر پر جو آئی تھی شمع
سحر تک شب ان نے گھلائی تھی شمع

پتنگے کے حق میں تو بہتر ہوئی
اگر موم کی بھی بنائی تھی شمع

نہ اس مہ سے روشن تھی شب بزم میں
نکالا تھا اسکو چھپائی تھی شمع

وہی ساتھ تھا میرے شب گیر میں
کہ تاب اُسکے رخ کی نہ لائی تھی شمع

پتنگ اور وہ کیوں نہ باہم جلیں
کہیں سے مگر اک لگ آئی تھی شمع

فروغ اُسکے چہرے کا تھا پردہ در
ہوا کیا جو ہم نے بجھائی تھی شمع

تف دل سے میر اک کف خاک ہے
مری خاک پر کیوں جلائی تھی شمع

کیا جھمکا فانوس میں اپنا دکھلاتی ہے دور سے شمع
وہ منھ تک اودھر نہیں کرتا داغ ہے اُسکے غرور سے شمع

وہ بیٹھا ہے جیسے نکلے چودھویں رات کا چاند کہیں
روشن ہے کیا ہو گی طرف اسطرح رخ پر نور سے شمع

آگے اُسکے فروغ نہ تھا جلتی تھی بجھی سی مجلس میں
تب تو لوگ اُٹھا لیتے تھے شتابی اُسکے حضور سے شمع

جلنے کو جو آتی ہیں ستیاں میر سنبھل کر جلتی ہیں
کیا بے صرفہ رات جلی بے بہرہ اپنی شعور سے شمع

آتی ہے مجلس میں تو فانوس میں آتی ہے شمع
وہ سراپا دیکھ کر پردے میں جلجاتی ہے شمع

ردیف غین معجمہ

عمر کھینچا رائگاں دریغ دریغ
ہم ہوئے خستہ جاں دریغ دریغ

عشق میں جی بھی ہم گنوا بیٹھے
ہو گیا کیا زیاں دریغ دریغ

سب سے کی دشمنی جنھوں کے لیے
وے ہیں نامہرباں دریغ دریغ

قطع اُمید ہے قریب اُس سے
تیغ ہے درمیاں دریغ دریغ

دل گئے پر نہ درد نہ تسبیح
کھینچتے ہیں سر زباں دریغ دریغ

اُٹھنے دیتا نہیں شکستہ دل
ڈھ گیا کیا مکاں دریغ دریغ

تب کھلی آنکھ میر اپنی جب
جا چکا کارواں دریغ دریغ

ہم کو شہر سے اس بہ کہے ہے عزم راہ دروغ دروغ
یہ حرکت تو ہم نہ کریں گے خانہ سیاہ دروغ دروغ

الفت کلفت کون کہے ہے چاہ گناہ لکھا کن نے
بیدردی سے دے رکھتے ہیں یہی گناہ دروغ دروغ

شیخ کو وہ تو جھوٹھ کہے ہے جھوٹھ کو کیو نکر جھوٹھ کہیں
اہل درو جو کوئی ہو تو کہیئے آہ دروغ دروغ

عشق کے مارے غمزدگاں سے اُنس کرے بہتان کذب
اس بیمہر کی ہم لوگوں سے اُلفت چاہ دروغ دروغ

کس دلبر کو شوق سے دیکھا میر غلط ہے تہمت ہے
مُنھ پہ کسو کے پڑی نہیں ہے گاہ نگاہ دروغ دروغ

کیا کہیئے میاں اگلی جنوں میں سینہ اپنا یکسر داغ
ہاتھ گلوں سے گلدستے ہیں شمع نمط ہے سر پر داغ

داغ جلائے فلک نے بدن پر سر و چراغاں ہم کو کیا
کہاں کہاں اب مرہم رکھیں جسم ہوا ہے سرسر داغ

صحبت درگیر آتے اُسکی پھر گھڑی ساعت نہ ہوئی
جب آئے ہیں گھر سے اُسکے تب آئے ہیں اکثر داغ

غیر کو دیکھ کے اس مجلس میں غیرت عشق سے آگ لگی
اچھلے کودے سپند نمط ہم ہو گئے آخر جلکر داغ

جلتی چھاتی پہ سنگ زنی کی سختی ایام سے میر
گرمی سے میری آتش دل کی سارے ہوئے ہیں پتھر داغ

ردیف فاے

دیکھ نہ ہر دم اے عاشق قاتل کی تیغ جفا کی طرف
کوئی نظر کر عبرت آگیں اُس کی ناز و ادا کی طرف

چار طرف سے نزولِ حوادث جاؤں کدھر تنگ آیا ہوں
غالب ہے کیا عہد میں میرے اے دل رنج عنا کی طرف

آوے زمانہ جب ایسا تو ترک عشق بتاں کا کر
چاہیئے بندہ قصد کرے جانے کا اپنے خدا کی طرف

قحط مروت اب جو ہوا ہے کس کو دماغ بادہ کشی
ابر آیا سبزہ بھی ہوا کرتا نہیں کوئی ہوا کی طرف

ظلم و ستم سے جور و جفا سے کیا کیا عاشق مارے گئے
شہر حسن کے لوگوں میں کرتا نہیں کوئی وفا کی طرف

شام و سحر ہے عکس سے اپنے حرف و سخن اس گلرو کو
پشت پا سے نگاہ اٹھائی چھوڑی اسنے حیا کی طرف

ہاتھ کسی کا دیکھتے رہیے گا ہے ہم سے ہو نہ سکا
اپنی نظر اے میر رہے ہے اکثر دست دعا کی طرف

عشق میں ہم کو نگاہ نہیں کچھ ہائے زیان جاں کی طرف
ورنہ یہی دیکھا کرتے ہیں اپنے سود و زیاں کی طرف

از بس مکروہات سے یاں کا مزبلہ زار لبالب ہے
اس سے گئے پر پھیر کے منھ دیکھا نہ کنھوں نے جہاں کی طرف

صورت کی شیرینی ایسی تلخی زباں کی ایسی کچھ
منھ دیکھے اس کا جو کوئی پھر دیکھے ہے زباں کی طرف

وہ محبوب تو راہ گیا ہے اپنی لیکن دیر تلک
آنکھیں اہل نظر کی رہیں گی اسکے قدم کے نشاں کی طرف

کس سے کہوں جو سیر طرف کر اس سے داد دلا دیوے
چھوٹے بڑے ہر ایک نے کی ہے اس اوباش جواں کی طرف

کیا نیچی آنکھوں دیکھو ہو تلوار کی طرف
دیکھو کن انکھیوں ہی سے گنہگار کی طرف

آوارگی کے محو ہیں ہم خانماں خراب
مطلق نہیں نظر ہمیں گھر بار کی طرف

مانا ہے قبلہ کعبہ خدا فرط شوق سے
جاتے ہیں سر بگرتے ہوئے یار کی طرف

شاید متاعِ حسن کھلی ہے کسو کی آج — ہنگامہ حشر کا سا ہے بازار کی طرف
عاشق کی اور ناز کناں جاوے ہے کبھو — جیسے طبیب جاوے ہے بیمار کی طرف
ہرگز طرف نہ ہو سکی رخسارِ یار کے — پھیکی ہے اُسکے سامنے گلزار کی طرف

کچھ گل صبا کا لاگو نہیں اس چمن میں میر
کرتے ہیں سب ہی اپنے طرفدار کی طرف

نظر کیوں گئی روِ دو مو کی طرف — کھنچا جاتے ہے دل کسو کی طرف
نہ دیکھو کبھی موتیوں کی لڑی — جو دیکھو مری گفتگو کی طرف
اگر آرسی میں صفائی ہے لیک — نہیں کرتی منھ اسکے رو کی طرف
پڑے نہ کہیں کو دہیہ مغز میں — نہ کر شانہ تو گل کی بو کی طرف

اسے ڈھونڈتے میر کھوئے گئے
کوئی دیکھے اس جستجو کی طرف

ہنستے ہی ہنستے مار رکھا تھے جو ہم ظریف — ہے یار بھی ہمارا قیامت ستم ظریف
بہارِ باغ و گل و لالہ دلربا بن حیف — بھرے ہیں پھولوں سے جیب و کنار لیکن حیف
اسے بجھ بغیر لالہ و باغ و بہار حیف — گل سے چمن بھرے ہوں نہ ہو تو ہزار حیف

ردیف قاف

مہر قیامت چاہت آفت فتنہ فساد بلا ہے عشق
عشق اللہ صیاد انھیں کہیو جن لوگوں نے کیا ہے عشق

عشق سے نظم کل ہے یعنی عشق کوئی ناظم ہے خوب
ہر شے یاں پیدا جو ہوئی ہے موزوں کر لایا ہے عشق

عشق سے باطن اس ظاہر کا ظاہر باطن عشق ہے سب
اودھر عشق ہے عالم بالا ایدھر کو دنیا ہے عشق

دائر سائر ہے یہ جہاں میں جہاں تہاں متصرف ہے
عشق کہیں ہے دل میں پنہاں اور کہیں پیدا ہے عشق

موج زنی ہے میر فلک تک ہر لجّہ ہے طوفاں زا
سر تا سر ہے تلاطم جس کا وہ اعظم دریا ہے عشق

ارض و سما میں عشق ہے ساری چاروں اور بھرا ہے عشق
ہم ہیں جناب عشق کے بندے نزدیک اپنے خدا ہے عشق

ظاہر و باطن اول و آخر پائیں بالا عشق ہے سب
نور و ظلمت معنی و صورت سب کچھ آپ ہی ہوا ہے عشق

ایک طرف جبریل آتا ہے ایک طرف لاتا ہے کتاب
ایک طرف پنہاں ہے دلوں میں ایک طرف پیدا ہے عشق

خاک و باد و آب و آتش سب ہے موافق اپنے تئیں
جو کچھ ہے سو عشق بتاں ہے کیا کہیے اب کیا ہے عشق

میر کہیں ہنگامہ آرا میں تو نہیں ہوں چاہت کا
صبر نہ مجھ سے کیا جاوے تو معاف رکھو کہ نیا ہے عشق

بیتاب ہے دل غم سے نپٹ زار ہے عاشق
کیا جانے کہ دو چار اس سے ہونا چار ہے عاشق

دہ دیکھنے کو جاوے تو بہتر ہے دگر نہ
بد حال و ستمدیدہ و بیمار ہے عاشق

رہتا ہے کھڑا دھوپ میں دو دو پہر آکے
بیجرم سدا اس کا گنہگار ہے عاشق

اٹھتا نہیں تلوار کے سایہ کے تلے سے
یعنی ہمہ دم مرنے کو تیار ہے عاشق

چپ ہی ہو رہے میر خریدار ہے تنہا
کیا جنس ہے معشوق کہ بازار ہے عاشق

ردیف کاف تازی

اب رنج و درد و غم کا پہونچا ہے کام جاں تک
یہ حوصلے سے شکوہ آیا نہیں زباں تک

آواز کی ہمارے تم حزن پر نہ جاؤ
یہ نالہ حزیں تو جاتے ہیں آسماں تک

رونا جہاں جہاں تو عین آرزو ہے لیکن
روتا ہوں رو دیا جاوے میرے کنے جہاں تک

اکثر صداع مجبور رہتا ہے عاشقی میں
قصد لیے درد و غم سے پہنچے کوئی کہاں تک

آوارہ ہی ہوئے ہم سر مار مار یعنی
نو بہ نکل گئے ہیں اپنے سب آشیاں تک

اے وائے بے نصیبی حسرت ہی گزرے لیکن
پیشانی تک نہ پہنچی اس خاک آستاں تک

نفع کثیر اٹھایا کر عشق کی تجارت
راضی ہیں ایسے میر اتنو ہم جاں کے زیاں تک

دل کی تڑپ نے ہلاک کیا ہے دھڑکے نے اُسکی اُڑائی خاک
خشک ہوا خون اشک کے بدلے ریگ رواں سے آئی خاک

صورت کے ہم آئینہ کی سے ظاہر فقر نہیں سالک
ہوتے ساتے روتے پاتے اُن نے منھ کو لگائی خاک

پیچ و تاب سے خاک بھی میری جیسے بگولا پھرنے لگی
سر میں ہوا ہی اُسکے بہت تھی تب تو ہوئی یہ ہوائی خاک

در غبار کسو کے دل کا کس انداز بیب و کنار الگ
روئے فلک پر بدلی سی تو ساری ہماری فزار الگ

ہمت رنگارنگ حق سے بہرہ بختِ سیہ کو نہیں
سانپ رہا گو گنج کے اوپر کھانے کو تو کھائی خاک

اپنے تئیں گم جیسا کیا تھا یاں سر کھینچ کے لوگوں نے
عالم خاک میں ویسی ہی اب ڈھونڈھے اُن کی نہ پائی خاک

انس نہیں انسان سے اچھا عشق و جنوں اک آفت ہو
فرق ہوئے کیا چھوڑے سہے آدم میں اُسکی جدائی خاک

ہو کے فقیر گلی میں اس کی چین بہت سا پایا ہم
لے کے سرھانے پتھر رکھا جائے فرش بچھائی خاک

قلب گداز ہیں جنکے وے بھی مٹی سونا کرتے ہیں
میر اکسیر بنائی اُنھوں نے جن کی جہاں سے اٹھائی خاک

کیا ہم میں رہا گردش افلاک سے ابتک
پھرتے ہیں کمہاروں کے پڑے چاک سے ابتک

تھے نو خطوں کی خاک سے اجزا جو برابر
ہو سبزہ نکلتے ہیں تہِ خاک سے اب تک

تا مدِ نظر چھا رہے ہیں لالۂ صد برگ
جنگل بھرے ہیں سب گل تریاک سے ابتک

دشمن ہوئی ہے جسکے لیے ساری خدائی
مربوط ہیں ہم اس بت بیباک سے ابتک

ہر چند کہ دامن تئیں ہے چاک گریباں
ہم ہیں متوقع کفِ چالاک سے اب تک

گو خاک سی اُڑتی ہے مرے منھ پہ جنوں میں
ٹپکے ہے لہو دیدۂ نمناک سے اب تک

وے کپڑے تو بدلے ہوئے میر اسکو کئی دن
تن پر ہے شکن تنگیٔ پوشاک سے ابتک

شاد انیونیوں کا دل غمناک
دشت دشت ایکے اک گلِ تر پاک

تین دن گور میں بھی بھاری ہیں
یعنی آسودگی نہیں تہِ خاک

ہاتھ پہونچا نہ اُس کے دامن تک
میں گریباں کروں نہ کیونکر چاک

تیز جاتا ہوں میں تو جوں سیلاب
میرے مانع ہوں کیا خس و خاشاک

عشق سے ہاتھ کیا ملا دے کوئی
یاں زبردستوں کی ہے کشتی پاک

بندگی کیشوں پر ستم مت کر
ڈر خدا سے تو اے بت بیباک

عشق مرد آزما لے آخر کار
کیے فرہاد و قیس میر ہلاک

اے عشق کیا جو تجھ سا ہوا ناتواں ہلاک
گر ہاتھ ٹک ملا کے کوئی پہلواں ہلاک

میں جا رہا تو شہر ہی ویران سب ہوا
اس نیم جاں کے بدلے ہوا اک جہاں ہلاک

مقصود گم ہے پھرتا جو رہتا ہے رات دن
ہلکان ہو کے ہوگا کبھو آسماں ہلاک

اس ظلم کیش کی ہے طرز نگاہ ہر کہیں
عاشق خدا ہی جانے ہوا ہے کہاں ہلاک

جی میر نے دیا نہ ہوا لیک وصل یار
افسوس ہے کہ مفت ہوا یہ جواں ہلاک

جب رکھی نوبت تم نے تو گوشِ ہوش نہ کھولے ٹک
چپکے چپکے کسو کو چاہا پوچھنے آئے نہ بولے ٹک

اب جو چھاتی جلی فی الواقع لطف نہیں ہے شکایت کا
صبر کرو کیا ہوتا ہے یوں پھوڑیں دل کے پھپھولے ٹک

آنکھیں کھولیں حال کے کہتے دیر ہوئی ہے بس یعنی
ساری رات کہانی کہی ہے میر اب چل کر سو لے ٹک

ردیف کاف فارسی

رات کی بات کہیں ہم کس سے سب یہ تہ یاں اکثر ہیں لوگ
سرگرم بے راہ روی ہیں خود گم سب بے رہبر ہیں لوگ

بدتر آپ سے پاؤں کسو کو تو میں اس کا عیب کہوں
خوب تامل کرتا ہوں تو سب مجھ سے بہتر ہیں لوگ

دیوانے ہیں شہرِ وفا کی راہ و رسم رکھے ہم تو میر
دل کے سکھئے جی دینے والے قاطبۃً گھر گھر ہیں لوگ

رہتے ہیں اس سے لاگ پہ ہم بیقرار الگ — کرتے ہیں دوڑ نت ہی تماشائی یار الگ
تھا گرد بیٹھے گل سے بھی دامن ہوا کا پاک — کیا ابکی اس چمن سے گئی ہے بہار الگ
پاس اس کا بعد مرگ ہے آداب عشق سے — بیٹھا ہے میری خاک سے اٹھ کر غبار الگ
ناگاہ اس نگاہ سے میں بھی ہوا نہاں — جاتا ہے جوں نکل کے کسو کا شکار الگ
خونباری سے نہیں پڑی لوہو کی چھینٹ بھی — اب تک تو بارے اپنے ہیں جیب و کنار الگ
تا جانیں لوگ کشتۂ ہجراں ہیں یہ غریب — کریو تمام گوروں سے میری مزار الگ

بچتے نہیں ہیں لوزدگی سے گلوں کی میر
گو طائرانِ خستہ جگر ہوں ہزار الگ

وہ نہیں ملتا ایک کسو سے مرتے ہیں اودھر جا جا لوگ
یعنی ضایع اپنے تئیں کرتے ہیں اُس بن کیا کیا لوگ

جیسے رنجِ ہجراں میں اس کے عاشق جی کو بیٹھے ہیں
برسوں مارے چرخ فلک تو ایسے ہووئیں پیدا لوگ

زلف و خال و خط سے اُسکے جہاں تہاں اب مبحث ہے
عقل ہوئی ہے گم خلقت کی یا سکتے ہیں سودا لوگ

چار قدم چلنے میں اُس کے دیکھے جاتے ہیں جو کفک
سے فتنے سر کھینچا ہی کریں ہیں ایک قیامت برپا لوگ

دنیا جائے نہیں رہنے کی میر غرور نہیں اچھا
جو جاگہ سے جاتے ہیں اپنی وے کرتے ہیں بیجا لوگ

ردیف لام

دل دل لوگ کہا کرتے ہیں ہم نے جانا کیا ہے دل
چشم بصیرت وا ہووے تو عجائب دید کی جا ہے دل

اوج و موج کا آشوب اُس کے لیکے زمیں سے فلک تک ہے
صورت میں تو قطرۂ خوں ہے معنی میں دریا ہے دل

صحرا کو جیسے کشادہ دامن ہم تم سنتے آتے ہیں
بند کر آنکھیں ٹک دیکھو تو ویسا ہی صحرا ہے دل

کوہکن و مجنوں و وامق جس سے پوچھو بتا دیوے
عشق و جنوں کے شہروں میں ہر چار طرف رسوا ہے دل

ہائے صبوری دل کی اپنے داغ کیا ہے خودسر نے
جی ہی جس کے لیے جاتا ہے اس سے بے پروا ہے دل

مت پوچھو کیوں زیست کرو ہو مردے سے افسردہ تم
ہجر میں اس کے ہم لوگوں نے برسوں تک مارا ہے دل

میر پریشاں دل کے غم میں کیا کیا خاطرداری کی
خاک میں ملتے کیوں نہ پھریں اب خون ہو بہہ بھی گیا ہے دل

آئی بہار نکلے چمن میں ہزار گل
دل جو کھلا فسردہ تو جوں بے بہار گل

بستر سے اسکے پھول تر و تازہ رکھ کے دور
سوکھے ہے دیر رہ کے تو ہوتا ہے خار گل

دیکھا کبھو نہ ہم نے سنا ہے فگندہ میر
داغ جنوں ہے سر پہ ہمیشہ بہار گل

صد ہزار افسوس آ کر خالی ہاتھ جائے گل
ہے خزاں میں دل سے لب تک ہائے گل ہائے گل

بے نصیبی سے ہوئے ہم موسم گل میں اسیر
تھے نہ پیشانی میں اپنے سجدہ ہائے پائے گل

دعوی حسن سراپا تھا یہ نازاں تجھکو دیکھ
شاخیں پر گل جھک گئیں یعنی بہت شرمائے گل

کیا گل مہتاب و شبو کیا سمن کیا نسترن
اس حدیقے میں نہ نقش پا سے اسکے پائے گل

جیتے جی تو داغ ہی رکھا ہوئے پر کیا حصول
گور پر دلسوزی سے جوں شمع سر رکھ لائے گل

بیدلی بلبل نہ کر تاثیر میں گو تو ہے داغ
خوش زبانے عشق کے جب سینے بھر کے کھائے گل

اس چمن میں جلوہ گر جس حسن سے خوباں ہیں میر
موسم گل میں کہاں اس خوبی سے کب آئے ہے گل

رنگا رنگ چمن میں سب کے موسم گل میں آئے گل
ہم تو اس بن داغ ہی تھے سو اور بھی جا کر کھائے گل

بار گلے کے ہو کر جیسے یاد رکھا اب عرصے میں
طرفہ تو یہ ہے اب منت سے گور پہ میرے لائے گل

کل کی شب گل میر کہیں کیا صبح بہار سے کیا حاصل
داغ جنوں ہے سر پہ ہمارے شمع کے رنگوں چھائے گل

ہر لحظہ ہے کدورتِ خاطر سی بارِ دل
آندھی سی آوے نکلے کبھو جو غبارِ دل

تر بندی خشک بندی تک بندی ہو چکی
بیڈول پھیلتا سا چلا ہے نگارِ دل

جوں رنگ لالے کے سبب ذقن باغ حسن میں
دوں ہیں ریاضِ عشق میں صد چاک انارِ دل

باہر ہیں حد و حصر سے کھینچے جو غم الم
کیا ہو سکے حسابِ غمِ بے شمارِ دل

لاکھوں جتن سکیے نہ نبھی دل سے یار کے
اسکا جفا شعار وفا ہے شعارِ دل

اسکی گلی میں صبح دلوں کا شکار تھا
نکلا ہزار ناز سے بھر شکارِ دل

کیا میر پھر ثبات سے رو سوئے دل کریں
ایسے نہیں گئے ہیں سکون و قرارِ دل

رکھتا نہیں ہے مطلق تاب عتاب اب دل
جاتا ہے کچھ ڈہا ہی خانہ خراب اب دل

دردِ فراق دلبر دے ہے فشار بیڈھب
ہو جائے جلگی خول شیشہ شتاب اب دل

بے پردہ اسکی آنکھیں شوخی جو کرتیاں ہیں
کرتا ہے یہ بھی ترک شرم و حجاب اب دل

آتش جو عشق کی سب چھائی ہے تن بدن میں
پہلو میں رہ گیا ہے ہو کر کباب اب دل

غم سے گداز پاکر اشک بن جو بہ نہ نکلا
شرمندگی سے ہوگا اے میر آب اب دل

مدت سے اب وہی ہے مرا ہمکنار دل
آزردہ دل ستمزدہ و بیقرار دل

جو کچھ ہے سو ہے فسردہ و مردہ ضعیف و زار
ناچار دیر ہم رہے ہیں مار مار دل

دو چار دل سے راضی نہیں ہوتے دلبراں
شاید تسلی ان کی ہو جو ہوں ہزار دل

خود گم ہے ناشکیب مکدر ہے مضطرب
کب تک رکھوں گا ہاتھ تلے پر غبار دل

ہے میر عشق حسن کے بھی جاذبے کے تئیں
کھینچتا ہے سوئے یار جو بے اختیار دل

ردیف میم

عشق ہمارے در پئے جاں ہے آئے گھر سے نکل کر ہم
سر پر دیکھا یہی ذالک سے جاویں کیدھر چل کر ہم

بل کھائے ان بالوں سے کب عہدہ بر آ ہوسکے ہیں ہزار
تنکے کا سا بل نکلا ہے ٹک جو چلے تھے بل کر ہم

مت پوچھو کچھ پچھتاتے ہیں کیا کہیے گھبراتے ہیں
جی تو لیا ہے پاس بغل میں دل بیٹھے ہیں ڈال کر ہم

بے تنگ دو کیا سیری ہو دیدار کے ہم سے تشنوں کو
پانی بھی پی سکتے نہیں ٹک اپنی جگہ سے ہل کر ہم

عشق جو ہوتا واقع میں تو سیدھے جاتے تیغ تلے
راہ ہوس کی پھیر لی ہم نے یعنی چلے ہیں ٹل کر ہم

ہائے جوانی شور کناں پابوس کو اسکے پھرتے تھے
اب چپ بیٹھ رہے ہیں یکسو ہاتھ بہت سے مل کر ہم

آگے تو کچھ آتش کے آہیں گرم شعلہ فشانی تھیں
راکھ تو ہوئے ہیں میر اک ڈھیری خاکستر کی جل کر ہم

ڈول لگائے بہتیرے پر ڈھب پہ کبھو نہیں آتے تم
آنا کبھو کب دیکھو ہو ادھر آتے جاتے تم

صورت کو دیکھ رہو ہو ہر کوچے کو جھانکو ہو
آگے عشق کیا ہوتا تو پھر سنتے جی نہ کھپاتے تم

چاہت آفت الفت کلفت مہر و وفا و رنج و بلا
عشق ہی کے سب نام ہیں یہ دل کاش کہیں نہ لگاتے تم

شائق ہو مرغان قفس کے آئے گھر صیادوں کے
پھول اک دو تسکین کو ان کی کاش چمن سے لاتے تم

دونوں طرف کشش رہتی تھی تیا بنا تھا عشق اپنا
دھوپ میں آتے داغ ہوئے تو گرمی سے گل کھاتے تم

کیدھر اب وہ بگڑ گئی جو دیکھ نہ سکتے تنگی
رکتے پاتے ٹک جو ہمیں تو دیر تلک گھبراتے تم

کیا کیا شکلیں محبوبوں کی پردۂ غیب سے نکلی ہیں
منصف ہو ٹک اے نقاشاں ایسے چہرے بناتے تم

شاید شب مستی میں تمہاری گرم ہوئی تھیں آنکھیں کہیں

پیش از صبح جو آئے ہو تو آئے راتے ماتے تم

کب تک یہ دزدیدہ نگاہیں عمداً آنکھیں جھکا لینا
دلبر ہوتے فی الواقع تو آنکھیں یوں نہ چھپاتے تم

بعد نماز دعائیں کیں سو میر فقیر ہوئے تم تو
ایسی مناجاتوں سے آگے کاشکے ہاتھ اٹھاتے تم

چاہ چھپی بے پردہ ہوئی اب یارب کیدھر جاویں ہم
کاش اجل بیوقت ہی پہونچے ایک طرف مر جاویں ہم

اُسکی نگہ کی اچپلیوں سے غش کرتے ہیں جگر واراں
کیا ٹھہریگا دل اپنا جو بجلی سے ڈر جاویں ہم

صبر و قرار جو ٹک ہوئے تو بہتر ہیں بیطاقت بھی
ہاتھ رکھے دل ہی پر کبتک اودھر اکثر جاویں ہم

خاک برابر عاشق ہیں اس کوچے میں ناچاری سے
گر ہوں خانہ خراب ایسے تو اپنے بھی گھر جاویں ہم

میر اپنی سب عمر گئی ہے سب کی بُرائی ہی کرتے
سر پر آیا جانے کا موسم اب تو بھلا کر جاویں ہم

ہم تو یہی کہتے تھے ہمیشہ دل کو کہیں لگاؤ تم
کیا کہیے نہ ہماری سنی اب بیٹھے رنج اُٹھاؤ تم

جھوٹ کہا کیا ہم نے ایسے طور جو اس کے ظاہر ہیں
ہاتھ چلے تو عاشق زار کو خاک و خوں میں لٹاؤ تم

صبر کرو بیتاب رہو خاموش پھرو یا شور کرو
کس کو یاں پروا ہے کسو کی ٹھہرو آؤ جاؤ تم

ناز و غرور و تبختر سارا پھولوں پر ہی چمن کا سو
کیا ہرزائی لالہ و گل کی کچھ خاطر میں نہ لاؤ تم

ڈالے کہ اس ہجراں کشتے نے باغ سے جاتے ٹک نہ سنا
گل نے کہا جو خوبی سے اپنی کچھ تو یہاں فرماؤ تم

دست و پا بہتیرے مارے سر بھی پھوڑے حسرت سے
کیا کریے جو بیدست و پا ہوں کے ہاتھ آؤ تم

غم میں ہمارے صورت خوش کی سیکڑوں شکلیں تو بگڑیں
بیٹھے ناز و غرور سے بکھرے بال اپنے بناؤ تم

در پہ حرم کے کشود نہیں تو دیر میں جا کر کافر ہو
قشقے کھینچو پوتھی پڑھو زنار گلے سے بندھاؤ تم

بود و نبود و ثبات رکھے تو یہ بھی اک بابت ہے میر
اس صفحہ میں حرف غلط ہیں کاشکے ہم کو مٹاؤ تم

کیا کریں بیکس ہیں ہم بے بس ہیں ہم بے گھر ہیں ہم
کیونکر اُڑ کر پہونچیں اُس تک طائر بے پر ہیں ہم

سر نہ بالیں سے اٹھا دیں کاشکے بیمار عشق
ہوگا یک ہنگامہ بپا فتنہ زیر سر ہیں ہم

سو طرف لے جاتی ہے ہم کو پریشاں خاطری
یاں کسے ڈھونڈھو ہو تم کیا جانیے کیدھر ہیں ہم

گر نہ روئیں کیا کریں ہر چار سو ہے بیکسی
بیدل و بیطاقت و بیدین و بے دلبر ہیں ہم

وہ جور تک نہ کبھی اس راہ سے نکلا نہ میر
ہم نہ رکھتے تھے ستارہ یعنی بداختر ہیں ہم

کہا سنتے تو کاہے کو کسو سے دل لگاتے تم
نہ جاتے اُس طرف کو ہاتھ سے اپنے نہ جاتے تم

شکیبائی کہاں جواب رہے جاتی ہوئی عزت
کدھر وہ ناز جس سے سر فرو ہرگز نہ لاتے تم

یہ حسن خلق تم میں عشق سے پیدا ہوا ورنہ
گھڑی کے روٹھے کو دو دو پہر تک کب مناتے تم

نظر دزدیدہ رکھتے ہو جھکی رکھتے ہو پلکوں کو
لگیں ہوتیں نہ آنکھیں تو نہ آنکھوں کو چھپاتے تم

یہ ساری خوبیاں دل لگنے کی ہیں مت برا مانو
کسو کا بار منت بے علاقہ کب اٹھاتے تم

پھر اکڑتے تھے جب مغرور اپنے حسن پر آگے
کسو سے دل لگا جو پوچھتے ہو آتے جاتے تم

جو ہوتے میر سو سر کے بگڑتے اک سخن آن سے
بہت تو پان کھاکے ہونٹھ غصے سے چباتے تم

اس کی گلی میں غش جو کیا آ سکے نہ ہم
پھر ہو چکے وہیں کہیں گھر جا سکے نہ ہم

سو کے تو غنچہ ہو کسو گلخن کے آس پاس
اس تنگنا میں پانوں بھی پھیلا سکے نہ ہم

حال آنکہ ظاہر اُسکے نشاں شش جہت تھے میر
خود گم رہے جو پھرتے بہت پا سکے نہ ہم

ہم نہ کہا کرتے تھے تم سے دل نہ کسو سے لگاؤ تم
جی دینا پڑتا ہے اس میں ایسا نہ ہو پچھتاؤ تم

سو نہ سنی تم نے تو ہماری آنکھیں لگو ہیں لگ پڑیاں
رو رو کر سر دھنتے ہو اب بیٹھے رنج اٹھاؤ تم

صبر کہاں جو تسکین ہووے بیتابی سے چین کہاں
ایک گھڑی میں سو سو بار ادھر سے ادھر جاؤ تم

خواہش دل ہے چاہ کسو کی یہی سبب ہے کاہش کا

ناحق ناحق کیوں کہتے ہو حق کی طرف دل لاؤ تم

ہر کوچے میں گھر سے رہ رہ کر ادھر اودھر دیکھو ہو
ہائے خیال یہ کیا ہے تم کو جانے بھی دو اب آؤ تم

فاش نہ کریے راز محبت جانیں اس میں جاتی ہیں
درد دل آنکھوں سے ہر ایک کے تا مقدور چھپاؤ تم

قدر و قیمت اس سے زیادہ میر تمھاری کیا ہوگی
جسکے خواہاں دونوں جہاں ہیں اُسکے ہاتھ بکاؤ تم

تظلم کہ کھینچے الم پر الم
ترحم کہ مت کر ستم پر ستم

علم بازی آہ جانکاہ سے
رہے ٹوٹتے ہی علم پر علم

جو سو سر کے ہوا اُونانوں میں
عبث کھاتے ہو تم قسم پر قسم

نئی یار آیا اودھر لطف سے
عطا پر عطا ہے کرم پر کرم

خطرناک تھی وادی عشق میر
گئے اس پہ بھی ہم قدم بر قدم

ردیف نون

تاروں کی جیسے دیکھی ہیں آنکھیں لڑائیاں
اُس بے نشاں کی ایسی ہیں چندیں نشانیاں

پیری ہے اب تو کہیے سو کیا کہیے ہمنشیں
کس رنج و غم میں گزری ہیں اپنی جوانیاں

ظلم و ستم سے خون کیا پھر دیا بباد
برباد کیا گئی ہیں مری جانفشانیاں

میں ایک چھیڑ چھاڑ کے کھاتا ہوں گالیاں
خوش آ گئیں ہیں اُسکی مجھے بدزبانیاں

سنتا نہیں ہے شعر بھی وہ حرف ناشنو
دل ہی میں خوں ہوا کیں مری نکتہ دانیاں

باتیں کدعب رقیب کی ساری ہوئیں قبول
تجکو جو اُن سے عشق تھا میری زبانیاں

مجلس میں تو خفیف ہوئے اُسکے واسطے
پھر اور رہیے اُٹھتی نہیں سرگرانیاں

عالم کے ساتھ جائیں چلے کس طرح نہ ہم
عالم تو کاروان سے ہے ہم کاروانیاں

سررفتہ شق نہ میر کا گر قصد خواب ہے
نیندیں اچٹتیاں ہیں سنے یہ کہانیاں

رساتے ہو آتے ہو اہلِ ہوس میں — مزا رس میں سب ہو گئے کیا تم کرس میں
درا میں کہاں شور ایسا دھرا تھا — کسو کا مگر دل رکھا تھا جرس میں
ہمیں عشق میں بے بسی بے کسی ہے — نہ دشمن بھی ہو دوستی کے تو بس میں
نہ رہ مطمئن تسمہ بازِ فلک سے — دغا سے یہ بہتوں کی کھینچے ہے نسیں
بہت روئے پردے میں جب دیدۂ تر — ہوئی اچھی برسات تب اس برس میں
تنِ زار لاغر میں ظاہر رگیں ہیں — بھرا ہے مگر عشق اک ایک نس میں
محبت وفا مہر کرتے تھے باہم — اُٹھا دی ہیں سب تم نے اب یہ رسمیں
تمھیں ربط لوگوں سے ہر قسم کی ہے — نہ کھایا کرو جھوٹی جھوٹی تو قسمیں

ہوا ہی کو دیکھے ہیں اے میر اسیراں
لگا دیں مگر آنکھیں چاکِ قفس میں

غمِ ہجراں میں گھبرا کر اُٹھا میں — طرف گلزار کے آیا چلا میں
شگفتہ خاطری اُس بن کہاں تھی — چمن میں غنچہ پیشانی رہا میں
کسو سے دل نہیں ملتا ہے یارب — ہوا تھا کس گھڑی اُن سے جدا میں
تعارف ہم صفیروں سے نہیں کچھ — ہوا ہوں ایک مدت میں رہا میں
گیا صبر آخر آزارِ دلی پر — بہت کرتا رہا دارو دوا میں
نہ عنقا کا کہیں نام و نشاں تھا — ہوا تھا شہرہ جب نامِ خدا میں

ہوا تھا میر مشکل عشق میں کام
کیا پتھر جگر تب کی دوا میں

فریاد سے کیا لوگ ہیں دن ہی کو عجب میں — رہتی ہے خلش نالوں سے میرے دلِ شب میں
حسرت کی جگہ ہے نہ کہ سبزانِ گل اندام — جاتے ہیں چلے آگے سے آتے نہیں ڈھب میں
افتادگی میر بھی نہ چھوا دامن اُنھوں کا — کوتاہی نہ کی دلبروں کے ہم نے ادب میں
سر خوت گل خشت کی جو سرخ ہر آنکھیں — جلتے ہیں تر و خشک بھی مسکیں کے غضب میں

پایا نہ کنھوں نے اسے کوشش کی بہت میر
سب سالک و مجذوب گئے گم اسکی طلب میں

اُس کو دل سا مکان دیتے ہیں
اہل اس گھر پہ جان دیتے ہیں

کیونکہ خوشخوان ہو ویں اہل چمن
ہم انھوں کو زبان دیتے ہیں

نوخطاں پھیر لیں ہیں منھ یعنی
ملتے رخصت کے پان دیتے ہیں

جان کیا گوہر گرامی ہے
بدلے اُسکے جہان دیتے ہیں

ہندو بچوں سے کیا معیشت ہو
یہ کبھو انگ دان دیتے ہیں

یہ عجب گم ہوئے ہیں جسکے لیے
نہیں اس کا نشان دیتے ہیں

گل خوباں میں میر مہر نہیں
ہم کو غیروں میں سان دیتے ہیں

پلکیں چھری ہیں کھنچی بھویں ہیں ترچھی تیکھی نگاہیں ہیں
اس اوباش کی سادگی دیکھو شوخی سے ہم چاہیں ہیں

کیا پہناوا خوش آتا ہے ان لڑکے جیسیاں پوشوں کا
مونڈھے چسپے ہیں چولی پھنسی ہے ٹیڑھی ٹیڑھی کلاہیں ہیں

ضبط گریہ دل سے ہو تو کوزے میں دریا کرنا ہے
حوصلہ داری جلکی ہو ایسی عشق میں انکو سراہیں ہیں

جب سے جدا ہیں اُن سے ہوا ہوں حال عجب ہے روز و شب
چشم تر ہے پلکیں ہیں آنسو خشک لبوں پر آہیں ہیں

دل ہے داغ جگر ہے ٹکڑے رہ جاتے ہیں چپکے سے
چھاتی سراہیے اُن لوگوں کی جو چاہت کو نباہے ہیں

دل اُلجھے ان بالوں میں تو آخر سودا ہوتا ہے
کوچے کو زنجیر کے یعنی زلفوں سے دو راہیں ہیں

یہ بھی سماں خوش ترکیبوں کا میر نہ اپنے دل سے گیا
سوتے سے اُٹھکر آنکھیں ملی ہیں لے انگڑائی جماہیں ہیں

صبر کیا ہے برسوں ہم نے رات سے بے طاقت سے ہیں
اور گزارا کب تک ہوگا کچھ اب ہم رخصت سے ہیں

رسم لطف نہیں ہے مطلق شہر خوش محبوباں میں

دیکھے کم جو کرتے کسو پہ عاشق ہم مدت سے ہیں

عشق کے دین اور مذہب میں مرجانا واجب آیا ہے
کوہکن و مجنوں موے اب ہم بھی اُسی ملت سے ہیں

ملنا لفروں سے اُن کا چھوٹا آ کر میری صحبت میں
پھر تنفر بھی یہ سیکھے ہیں مجھ سے کی صحبت سے ہیں

فرصت اُن کو کم ہے اگرچہ پر ملتے ہیں قابو پر
برسوں میر سے مل دیکھا ہے کچھ وے کم فرصت سے ہیں

ہر چند میرے حق میں کچھ اسکا ستم نہیں
پر اس ستم سے بامزہ لطف و کرم نہیں

درویش جو موئے تو کیا اعتبار سب
اب قابل اعتماد کے قول و قسم نہیں

حیرت میں سکتے سے بھی مرا حال ہے پرے
آئینہ رکھ کے سامنے دیکھا تو دم نہیں

مستغنی کس قدر ہیں فقیروں کے حال سے
یاں بارِ غم سے خم ہوا واں بھوؤں خم نہیں

شاید جگر کا کام تمامی کو کھنچ گیا
یا لوہو روتے رہتے تھے یا چشم نم نہیں

غم اُس کا کچھ نہیں ہے گو لوگ کچھ کہیں
یہ التفات اُن نے جو کی ہے سو کم نہیں

کہنے لگا کہ میر تمھیں بیچوں گا کہیں
تم دیکھیو نہ کہیو غلام اُسکے ہم نہیں

دل جلتے کچھ بن نہیں آتی حال بگڑتے جاتے ہیں
جیسے چراغ آخر شب ہم لوگ نبڑتے جاتے ہیں

رنگ ثبات چمن کا اُڑایا بادِ تندِ خزاں نے سب
برگ و بار و نورس گل کے غنچے جھڑتے جاتے ہیں

طینت میں ہے نیاز جنھوں کے سجود اُن کی سب ہے زمیں
خاک جو پامال ہے اُس سے سر کو رگڑتے جاتے ہیں

راہ عجب درپیش ہے ہم کو یاں سے تنہا جانے کی
یار و ہمدم و ہمراہی ہر گام بچھڑتے جاتے ہیں

ضعف دماغ سے اُفتاں خیزاں چلتے ہیں ہم راہ ہوس
دیکھیں پیش آوے اب تو گرتے پڑتے جاتے ہیں

قد کو اپنے حشر خرام کے ایک نہیں لگ سکتا ہے
سرو روان باغ جہاں ہر چند اکڑتے جاتے ہیں

میر بلا ناساز طبیعت لڑکے ہیں خوش ظاہر بھی
ساتھ ہمارے راہ میں ہیں پھر ہیسے لڑتے جاتے ہیں

عشق نے ہم کو مار رکھا ہے جی میں اپنے تاب نہیں
دل کو خیال صبر نہیں آنکھوں کو میل خواب نہیں

کوئی سبب ایسا ہو یا رب جس سے عزت رہجاوے
عالم میں اسباب کے ہیں پر پاس اپنے اسباب نہیں

قحط نہیں ہے دل کا اب من مارے تم کیوں پھرتے ہو
لینے والا چاہیئے اس کا ایسا تو کمیاب نہیں

خط کے جواب نہ لکھنے کی کچھ وجہ نہ ظاہر ہم پہ ہوئی
دیر تلک قاصد سے پوچھا منھ میں اُسکے جواب نہیں

رونا روز شمار کا مجکو آٹھ پہر اب رہتا ہے
یعنی میر گناہوں کو کچھ حصر و حد و حساب نہیں

رنگ شکستہ دل ہے شکستہ سر ہے شکستہ مستی میں
حال کسو کا اپنا سا اس میخانے میں خراب نہیں

ٹھہریں میر کسو جاگہ ہم دلکو قرار جو ٹک آوے
ہو کے فقیر اس در پہ بیٹھیں اُسکے بھی ہم باب نہیں

آنکھیں سفید دل بھی جلا انتظار میں
کیا کچھ نہ ہم بھی دیکھ چکے ہجر یار میں

دنیا میں ایک دو نہیں کرتا کوئی مقام
جو ہے رواروی ہی میں ہے اس دیار میں

دیکھی تھیں ایک روز تری مست انکھڑیاں
انگڑائیاں ہی لیتے ہیں اب تک خمار میں

اخگر تھا دل نہ تھا مرا جس سے تہ زمیں
لگ لگ اٹھی ہے آگ کفن کو مزار میں

بیدم ہیں دامگاہ میں اکدم تو چلکے دیکھ
سنتے ہیں دم نہیں کسی تیرے شکار میں

محمل کے تیرے گرد ہیں محمل کئی ہزار
ناقہ ہے ایک لیلیٰ کا سو کس قطار میں

شور اب چمن میں میری غزلخوانی کا ہے میر
اک عندلیب کیا ہے کہوں میں ہزار میں

طلب ہے کام دل کی اسکے بالوں کی اسیری میں | گدائی شب کروں ہوں میں نجابت ہے فقیری میں
نگہ غزلت میں اس ابرو کماں کی ہے ادھر یعنی | لگا تیر اسکا چھاتی میں ہماری گوشہ گیری میں
نظیر اسکی نظر آئی نہ سیاحانِ عالم کو | سیاحت دور تک کی ایک ہے وہ بے نظیری میں
حزیں آواز ہے مرغِ چمن کی کیا جنوں آور | نہیں خوش زمزمہ ویسا ہماری ہم صفیری میں

جوانی میں نہ رسوائی ہوئی تا میر ہم کہتے
ہوئے اطفال تہ بازار گاہک جی کے پیری میں

دل کی تہ کی کہی نہیں جاتی کہیے تو جی ماریں ہیں
رک کر پھوٹ بہیں جو آنکھیں رود کی سی دو دھاریں ہیں

حرف شناس نہ تھے جب تم تو بے پرسش تھا بوسہ لب
ایک اک بات کی مشتاقوں سے سو سو اب تکراریں ہیں

عشق کے دیوانے کی سلاسل ملتی ہے تو ڈریں ہیں ہم
بگڑے پیل مست کی سی زنجیروں کی جھنکاریں ہیں

دے بھوویں جیدھر ہوں خمیدہ اودھر کا ہے خدا حافظ
یعنی جوہردار جھکی خونریزی کی دو تلواریں ہیں

دے وے جن لوگوں کو پھرتے آنکھوں ہمنے دیکھا ہے
مد نظر تک آج انھوں کی گرد شہر مزاریں ہیں

پیچ و تاب میں بل کھا کھا کر کوئی مرے یاں ان کو کیا
ڈال وے لیے مشاطہ کو یکسو بال ہی اپنے سنواریں ہیں

بڑے بڑے تھے گھر جن کے یاں آثار انکے ہیں اب
میر شکستہ دروازے ہیں گری پڑی دیواریں ہیں

حسن کیا جنس ہے جی اسپہ لگا بیٹھے ہیں | عزلتی شہر کے بازار میں آ بیٹھے ہیں
ہم وے ہر چند کہ ہمخانہ ہیں دونوں لیکن | روشِ عاشق و معشوق جدا بیٹھے ہیں
ان ستم کشتوں کو ہے عشق کہ اٹھکر یکبار | تیغ خونخوار تلے یار کے جا بیٹھے ہیں
کیونکہ یاں اس کا خیال آئے کہ آگے ہی ہم | دل سا گھر آتشِ آہوں سے جلا بیٹھے ہیں
بیش از دست دعا ہے و تماشائے خواہش ہے | اور سب چیز سے ہم ہاتھ اٹھا بیٹھے ہیں

ساری رات آنکھوں کے آگے ہی مرے رہتا ہے
گو کہ وے چاند سے مکھڑے کو چھپا بیٹھے ہیں

باغ میں آئے ہیں پر اُس گل تر بن یکسو
غنچہ پیشانی و دل تنگ و خفا بیٹھے ہیں

کیا کہوں آئے کھڑے گھر سے تو اک شوخی سے
پاؤں کے نیچے مرے ہاتھ دبا بیٹھے ہیں

قافلہ قافلہ جاتے ہیں چلے کیا کیا لوگ
میر غفلت زدہ حیران سے کیا بیٹھے ہیں

منہ کیے ادھر زرد ہوئے جاتے ہیں ڈر سے سبکساراں
کیونکہ پہنچینگے اس رستے میں ہم سے آہ گرانباراں

جی تو پھٹا دیکھ آئینہ ہر لوح مزار کا جامہ سا
کیا پھاڑے گریباں تنگدلی سے ترکِ لباس کیا یاراں

کی ہے عمارت دل کی جنھوں نے اُنکی بنا کچھ رکھی رہی
اور تو خانہ خراب ہی دیکھے اس بستی کے معماراں

میخانے میں اس عالم کے لغزش پر مستوں کی نہ جا
سکر میں اکثر دیکھے ہم نے بڑے بڑے یاں ہشیاراں

کیا ٹھہراؤ شفاخانے میں عشق کے جا کر دیکھیں ہیں
ایدھر اودھر سیکڑوں ہی بر پشتِ بام تھے بیماراں

بعد صبوحی گھگیاتے باچھیں پھٹ بھی گئیں
یارب ہوگی قبول کبھو بھی دعائے صبح گنہگاراں

عشق میں ہم سے تم سے کہیں تو کھپ جاویں غم کسکو ہے
مارے گئے ہیں اس میداں میں کیا دل والے جگر داراں

حاکم شہر حسن کے ظالم کیونکہ ستم ایجاد نہیں
خون کسو کا کوئی کرے واں داد نہیں فریاد نہیں

یاری ہماری یکباری خاطر سے فراموش اُن نے کی
ذکر ہمارا اُس سے کیا سو کہنے لگا کچھ یاد نہیں

کیا کیا مردم خوش ظاہر ہیں عالم حسن میں نام خدا
عالم عشق خرابہ ہے واں کوئی گھر آباد نہیں

عشق کوئی ہمدرد کہیں مدت میں پیدا کرتا ہے
کوہ رہیں گو نالاں برسوں لیکن اب فرہاد نہیں

لڑنا کاوا کی سے فلک کا پیش پا افتادہ ہے
میر طلسم غبار جو یہ ہے کچھ اُس کی بنیاد نہیں

تدبیر کوئی بتاوے جو آپ کو سنبھالیں
جینے کی اپنے ہم بھی کوئی طرح نکالیں

تا لب میں جی نہیں ہے اُس بن ہمارے گویا
حیران کار یارب ہم کیسا ڈول ڈالیں

محشر میں داد خوباں چاہیں تو کس سے چاہیں
واں تک چلے ملک تو اسکو بھی یہ لگالیں

طالع نہ ذائقے کے اپنے کھلے کہ ہم بھی
ان شکریں لبوں کے ہونٹھوں کا کچھ مزا لیں

خوش چشم خوبرویاں دیدہ دراں ہیں کتنے
وزدیدہ دیکھنے میں دل دیکھتے چرالیں

عشق و جنوں سے جی تو تنگ آ گیا ہے کاش اب
دست تلطف اپنے سر سے مرے اٹھالیں

خونریزی سے ہماری اچھا ہے ہاتھ اٹھانا
یوں چاہیے کہ دلبر درویشوں سے دعا لیں

چلتے ہیں ناز سے جب ٹھوکر لگے ہے دل کو
آتی نہیں سمجھ میں ان دلبروں کی چالیں

منت ہزار کریے مانے منے نہ ہرگز
میر ایسے درد کو ہم کس طرح سے منالیں

میکشی صبح و شام کرتا ہوں
فاقہ مستی مدام کرتا ہوں

کوئی ناکام یوں رہے کب تک
میں بھی اب ایک کام کرتا ہوں

یا تو لیتا ہوں داد دل یا اب
کام اپنا تمام کرتا ہوں

ملنے کے دن جب یاد آتے ہیں سُدھ بُدھ بھولے جاتے ہیں
بیخود ہو جاتے ہیں ہم تو دیر بخود پھر آتے ہیں

ردیف واو

دل کھنچتا ہے وہاں صحبت رندانہ جہاں ہو
میں خوش ہوں اسی شہر سے میخانہ جہاں ہو

ان بکھرے ہوئے بالوں سے خاطر ہو پریشاں
وسے جمع ہوئے پھر ہیں بلا شانہ جہاں ہو

رہنے سے مرے پاس کے بدنام ہوئے تم
اب جا کے رہو واں کہیں رسوا نہ جہاں ہو

کچھ حال کہیں اپنا نہیں بیخودی تب تک
غش آتا ہے لوگوں کو یہ افسانہ جہاں ہو

کیوں جلتا ہے ہر جمع میں مانند دیے کے
اس بزم میں جا شمع سا پروانہ جہاں ہو

ان اجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا
ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو

وحشت ہے خردمندوں کی صحبت سے مجھے میر
اب جا رہوں گا واں کوئی دیوانہ جہاں ہو

اپنے حسن عارضی پر آج مت مغرور رہو
پاس تو ہے جیسکے وے ہی کل کہیں گے دور رہو

دیکھ کر وہ راہ چلتا ہی نہیں ٹک ورنہ ہم
پانوں اُسکے آنکھوں پر رکھ لیویں جو منظور ہو

شہر دل کی کیا خرابی کا بیاں باہم کریں
اسکو ویرانہ نہ کہیئے جو کبھو معمور ہو

ہم بغل اس سنگدل سے کاشکے اسدم ہوں جب
شیشۂ مے پاس ہووے اور وہ مخمور ہو

عشق و نکش ذبح ہی یہ کھیل قدرت کا ہی میر
صرف کریئے اس میں اپنا جسقدر مقدور رہو

عاشق ہو تو اپنے تئیں دیوانہ سب میں بناتے رہو
چکّر مارو جیسے بگولا خاک اُڑاتے آتے رہو

دوستی جس کو لوگ کہیں ہیں جان سے اُسکو خصومت ہی
ہو جاوے جو تم کو کسی سے تامقدور چھپاتے رہو

دل لگنے کی چوٹ بری ہے اس صدمے سے خدا حافظ
بارے سعی و کوشش سے جی کو اپنے بچاتے رہو

آئی بہار جنوں ہو مبارک عشق اللہ ہمارے لیے
نعل جڑے سینوں پہ پھر و تم داغ سروں پہ جلاتے رہو

شاعر ہو مت چپکے رہو اب چپ میں جانیں جاتی ہیں
بات کرو ابیات پڑھو کچھ بیتیں ہم کو بتاتے رہو

ابرکعبہ قبلے سے آیا تم بھی شیخو پاس کرو
تحقیقی ٹک لٹ پٹی باندھو ساختہ ہی مدھ ماتے رہو

کیا جانے وہ مائل ہووے کب ملنے کا تم سے میر
قبلۂ و کعبہ اُس کی جانب اکثر آتے جاتے رہو

کیا فرض ہستی کی رخصت ہے مجکو
پھروں ہوں ترے عشق میں کوچہ کوچہ
کہاں زندگی مدت العمر ظالم
نہ کر شور ناصح بہت ناتواں ہوں
ہیں اسباب مرنے کے سب تیرے غم میں

کہیں اپنے رونے سے فرصت ہے مجکو
مگر کوچہ گردی سے الفت ہے مجکو
ترے عشق میں دم غنیمت ہے مجکو
کہاں بات اُٹھانے کی طاقت ہے مجکو
جیا اب تلک کیونکہ حیرت ہے مجکو

دل اتنا ہے آشفتہ خورشید رو کا
کہ اپنے بھی سائے سے وحشت ہے مجکو

کڑھوں ہوں گا من اتنا میر صاحب
غم یار میں کیا فراغت ہے مجکو

کیا غیرت سے دل پر تنگ رنج و غم نے دنیا کو
بس اب تو کھل گئیں ہیں آنکھیں کیا ہم نے دنیا کو

رہا ہر ایک عالم اور دنیا داروں میں اُس کا
کیا ہے بیوفا معلوم سب عالم نے دنیا کو

ہمیشہ رونا کڑھنا سینہ کوبی ہر زماں کرنا
عزا خانہ کیا دل کے مرے ماتم نے دنیا کو

سنا ہیں نے کہ آخر ہاتھ اُٹھایا اُس نے دنیا سے
اگر پایا بھی محنت کر کسو ہمدم نے دنیا کو

زمیں سے آسماں تک میر ہے شور جنوں میرا
تہ و بالا کیا دونوں میں اس ودھم نے دنیا کو

کیا کچھ ہم سے ضد ہے تم کو بات ہماری اُڑا دو ہو
لگ پڑتے ہیں ہم تم سے تو تم اوروں کو لگا دو ہو

کیا رو دیں قدر و قیمت کو ہمیں سے ہے معلوم ہمیں
کام ہمارا پاس تمہارے جو آتا ہے بہا دو ہو

اتنی تو جا خالی رہی ہے بزم خوش میں تمہارے سوا
جن کو کہیں جاگہ نہیں ملتی پہلو میں اُن کو جا دو ہو

زنگ تو جاوے دل سے ہمارے غیر سیہ رو بدگو کے
کھینچکے تا ایسی ایک لگاؤ تیغ ستم کی جا دو ہو

صحبت گرم ہماری تمہاری شمع پتنگے کی سی ہے
یعنی ہو دلسوز جو کوئی اُس کو تم تو جلا دو ہو

رنگ صحبت کسکو دکھاویں خوبی اپنی قسمت کی
ساغر مے دشمن کو دو ہو ہم کو زہر منگا دو ہو

بند نہیں جو کرتے ہو تم سینے کے سوراخوں کو
جی کے رکیں ہیں ان زخموں سے شاید دل کو ہوا دو ہو

آنکھ جھپک جاتی نہیں تنہا آگے چہرۂ روشن کے
ماہ بھی بیٹھا جاتا ہے جب مُنہ سے نقاب اُٹھا دو ہو

غیر سے غیرت ہے آساں لیکن تہ کچھ ہم کو نہیں
بات بتادیں کیا ہم تم کو تم تو ہم کو بتادو ہو

میر حقارت سے ہم اپنی چپ رہ جاتے ہیں جان چلی
طول ہمارے گھٹنے کو دے کر جیسے چراغ بڑھا دو ہو

کہتے نہ تھے ہم تم سے دل ہاتھ سے مت دیجو
مت کھائیو غم اتنا اپنا نہ لہو پیجو
اُن پلکوں کی کاوش سے زخمی ہی جگر سارا
سلے تار نگاہوں کے نازک سا رفو کیجو
کیا جان لیے جسکے جانا سے چھپا تا منھ
جینا تو کوئی دن ہے تم میر بہت جیجو
دل خستہ شکستہ دل دل بستہ گرفتہ دل
ہو ان میں کوئی اسکا دل ہاتھ میں ٹک لیجو

اس راہ سے کرتا ہے دل کسب ہوا گاہے
میرے پھٹے سینے کو زنہار نہ تم سیجو

بات کہوں کیا چپکے چپکے دیکھو ہو آئینے کو
دیکھتے ہو تو دیکھو ہمارے جلتے توے سے سینے کو

کیا جانو تم قدر ہماری مہر و وفا کی لڑکے ہو
لوہو اپنا دیں ہیں تمھارے گرتے دیکھ پسینے کو

پھیر ایام نحس کا مجکو بہت کڑھب آتا ہے نظر
تم بھی غنیمت جانو میاں دس دن کے میرے جینے کو

وہ جو غیرتِ مہ ملتا ہے غیر سے ہم ہیں غیرت کش
شال ہمارے جی کا ہوگا ظاہر کوئی مہینے کو

لختِ دل آنکھوں سے گرا سو ٹکڑا لعل کا تھا گویا
نصب کروں گا میر جگر پر خوش رنگ ایسے نگینے کو

صوفیاں تم وا ہوئے ہیں ہائے آنکھیں وا کرو
ابر آیا زور غیرت تم بھی ٹک پیدا کرو
مستی و دیوانگی کا عہد ہے بازار میں
پائے کوباں دست افشاں آن کر سودا کرو
ہر جگہ دلکش ہے اُسکی برگِ گل سے جسم میں
ایک جا تو جی لگاؤ دل کے تئیں بیجا کرو
ہے تکلف سے تعین اس قصب پوشی کی قید
خرقۂ صد چاک پہنو آپ کو رسوا کرو
گرچہ ہم پر بستہ طائر ہیں پر اے گلہائے تر
کچھ ہمیں پروا نہیں ہے تم اگر پروا کرو

موسم گل آیا ہے یارو کچھ میری تدبیر کرو
یعنی سایۂ سرو و گل میں اب مجھکو زنجیر کرو

پیش سعایت کیا جائے ہے حق ہے میری طرف سو ہے
میں تو چپ بیٹھا ہوں یکسو گر کوئی تقریر کرو

کان لگا رہتا ہے غیر اس شوخ کماں ابرو کے بہت
اس تو گناہ عظیم پہ یارو ناک میں اُس کے تیر کرو

پھیر دیے ہیں دل لوگوں کے مالک نے کچھ میری طرف
تم بھی ٹک اے آہ و نالہ قلبوں میں تاثیر کرو

آگے ہی آزردہ ہیں ہم دل ہیں شکستہ ہمارے سب
حرف رنجش بیچ میں لاکر اور نہ اب دلگیر کرو

کیا ہو محو عمارت منعم اے معمار خرابی ہے
بن آوے تو گھر ویراں درویشوں کے تعمیر کرو

عاشق ہو ترسا بچگاں پر تا کیفیت حاصل ہو
اور کشود کار جو چاہو پیر مغاں کو پیر کرو

شعر کیے موزوں تو ایسے جن سے خوش ہیں صاحبدل
روویں کڑھیں جو یاد کریں اب ایسا تم کچھ میر کرو

کیونکر مجھکو نامہ نمط ہر حرف پہ پیچ و تاب نہ ہو
سو سو قاصد جان سے جاویں ایک کو اُدھر سے جواب نہ ہو

گل کو دیکھ کے گلشن کے دروازے ہی سے پھر آیا
کیا دل بیٹھے اُس سے بھلا جو صحبت ہی کا باب نہ ہو

مستی[1] خرابی سر پر لائی کعبے سے اٹھ دیر گیا
جسکو خدا نے خراب کیا ہو پھر وہ کیونکہ خراب نہ ہو

خلع بدن کرنے سے عاشق خوش رہتے ہیں اس خاطر
جان و جاناں ایک ہیں یعنی بیچ میں تن جو حجاب نہ ہو

[1] میر تقی میر ؎ میر اُٹھ بت کدے سے کعبے گیا ۔ کیا کرے جو خدا خراب کرے +

خشم و خطاب و چیں بہ جبیں تو حسن ہے گلعذاروں کا
وہ محبوب خنک ہوتا ہے جس میں ناز و عتاب نہ ہو

ہم نے جو کچھ کہا کیا ہے حد و حساب سے افزوں ہے
روزِ شمار میں یارب میرے کہے کیے کا حساب نہ ہو

صبر بلاہائے عشقی پر جو حوصلہ والے کرتے ہیں
رحمت ہے اُس خستہ جگر کو دل جس کا بیتاب نہ ہو

جس شب گل دیکھا ہے ہم نے صبح کو اُسکا منھ دیکھا
خواب ہمارا ہوا ہوا ہے لوگوں کا سا خواب نہ ہو

نہریں چمن کی بھر رکھیں ہیں گویا بادۂ لعلیں سے
بے عکسِ گل و لالہ الٰہی ان جویوں میں آب نہ ہو

اُس دن میں تو مستانہ ہوتا ہوں کوئی کوچہ گدا
جسدن کاسۂ چوبیں میں میرے یک جرعہ بھی شراب نہ ہو

تہ داری کچھ دیدۂ تر کی **میر** نہیں کم دریا سے
جوشاں شورکناں آجاوے یہ شعلہ سیلاب نہ ہو

تم کو ہم سے آگ لگی ہے روتے ہیں تو ہنستے ہو
ہم نے کمر کو کھول رکھا ہے اپنی کمر تم کستے ہو

درجِ گوہر مال نہیں کچھ دیں دُرِ بستہ مصر اگر
تو بھی ایسی قیمت پر تم آگے ہمارے سستے ہو

رستے راہ میں دیکھ لیا ہے بستی میں سے نکلے تھیں
کیا جانیں ہم روز و شب تم کیدھر رستے بستے ہو

ابرِ کرم کی راہ تکو اب رحمتِ حق پہ نظر رکھو
گو کہ تم اے مستاں مجرم اس غم سے دل خستے ہو

پیری میں بھی جوان رکھا ہے دخترِ تاک کی صحبت نے
یعنی پی پی مۓ انگوری **میر** ہوئے کٹ مستے ہو

راہیں رُکے پر اُس سے ملاقات ہو تو ہو
خاموش ان لبوں سے کوئی بات ہو تو ہو

رنج و عنا کہ دشمنِ جانِ عزیز ہیں
ان سے بچاؤ اس کی عنایات ہو تو ہو

نومیدِ وصل دل نہیں شبہائے ہجر میں
ان راتوں ہی میں ملنے کی بھی رات ہو تو ہو

اُمید ہے کہ اُس سے قیامت کو پھر ملوں
حسنِ عمل کی واں بھی مکافات ہو تو ہو

تحقیق سمجھے پیرہن و کنگھی اور کلاہ
شیخوں کی گالیوں میں کرامات ہو تو ہو

ساقی کو چشمِ مست سے اودھر ہے دیکھنا
مسجد ہو یا کہ کعبہ خرابات ہو تو ہو

منکر نہیں ہے کوئی سیادت کا میر کی
ذاتِ مقدس اُن کی بھی ذات ہو تو ہو

مژہ واکرو تمھیں غش ہے کیا کبھو حال پر بھی نظر کرو
یہی حال ہمیشہ رہا کیا تو مآل پر بھی نظر کرو

کہیں دل بھی ان کے اٹکتے ہیں جنھیں شعق میں ہے کمال کچھ
ہوئے ہو جو رفتہ خرام کے تو جمال پر بھی نظر کرو

نہ بنے جو دلبر سادہ تو نہ بھلا لگے مری آنکھوں میں
نہیں سادگی ہی میں لطف کچھ خط و خال پر بھی نظر کرو

ردیف ہائے ہوز

ہائے ستم ناچار معیشت کرنی پڑی ہر خار کے ساتھ
جان عزیز گئی ہوتی کاش ابھی سال بہار کے ساتھ

کس آوارۂ عشق و جنوں کی اک مٹھی اب خاک اڑی
اڑتی پھرے ہے پس محمل جدرہ کی گرد و غبار کے ساتھ

وہ لحظہ نہیں جاتا جی سے آنکھ لڑی تھی جب اس سے
چاہ نکلتی تھی باتوں سے چتون بھی تھی پیار کے ساتھ

جی مارے شب مہ میں ہمارے قہر کیا مشاطہ نے
بل کھائے بالوں کو دیا بل اسکے گلے کے ہار کے ساتھ

کیا دن تھے جو ہمکو تنہا کہیں کہیں مل جاتا تھا
اب تو لگے ہی رہتے ہیں اغیار ہمارے یار کے ساتھ

ہم ہیں مریض عشق و جنوں سختی سے دل کو مت توڑ دو
نرم کرے ہیں حرف و حکایت اہل خرد بیمار کے ساتھ

دیدۂ تر سے چشمہ جو شاں ہے جو قریب اپنے واقع
تو ہی رود چلے جاتے ہیں لگ کر جیب و کنار کے ساتھ

دیر سے ہیں بیمار محبت ہم سے قطع اُمید کرو
جانیں ہی جاتی دیکھیں ہیں ہم نے آخر اس آزار کے ساتھ

رونے سے سب سر بر آئی خاک ہمارے سر پر میر
مدت میں ہم ٹک لگ بیٹھے تھے اُس کی دیوار کے ساتھ

اب کچھ مزے پر آیا شاید وہ شوخ دیدہ
آب اُسکے پوست میں ہے جوں میوۂ رسیدہ

آنکھیں ملا کبھو تو کب تک کیا کروں میں
دنبالہ گردی تیری اسے آہوئے رمیدہ

پانی بھر آیا منھ میں دیکھے جنھوں کے یارب
وے کس مزے کے ہونگے لبہائے ناگزیدہ

سائے کو اس پری کے لگتا نہ تھا چمن میں
مغرور کاہے پر ہے شمشاد قد کشیدہ

آنکھیں ہی بچھ رہی ہیں اہل نظر کی یکسر
چلتے ہوئے زمیں پر رکھ پاؤں دیدہ دیدہ

چل سیر کرنے تو بھی تا صبح آنکھیں کھولیں
مُنھ پر ترے چمن میں کمھلائے نو دمیدہ

محراب میں رہو نہ سجدہ کیا کرو تم
بیوقت کیا ہے طاعت قد اب ہوا خمیدہ

پروانہ گرد پھر کر جل بھی بجھا ولیکن
خاموش رات کو تھی شمع زباں بریدہ

دیکھا مجھے شب گل بلبل نے جو چمن میں
بولا کہ میرے مُنھ پر کیا کیا دہن دریدہ

قلب و کبد تو دونوں تیروں سے چھن رہے ہیں
وہ اس ستم کشی پر ہم سے ہوئے کبیدہ

اشعار میر سب نے چن چن کے لکھ لیے ہیں
رکھیں گے یاد ہم بھی کچھ بیتیں چیدہ چیدہ

ہم جانتے تو عشق نہ کرتے کسو کے ساتھ
لے جاتے دل کو خاک میں اس آرزو کے ساتھ

مستی میں شیخ شہر سے صحبت عجب رہی
سر پھوڑتے رہا کیے اکثر سبو کے ساتھ

تھا عکس اُس کے قامتِ دلکش کا باغ میں
آنکھیں چلی گئیں ہیں لگی آبجو کے ساتھ

نازاں ہو اُس کے سامنے کیا گل کھلا ہوا
رکھتا ہے لطفِ ناز بھی روئے نکو کے ساتھ

ہم زرد کاہ خشک سے نکلے ہیں خاک سے
بالیدگی نہ خلق ہوئی اس نمو کے ساتھ

گردن بلند کرتے ہی ضربت اُٹھا گئے
خنجر رکھے ہے اُس کا علاقہ گلو کے ساتھ

ہنگامے جیسے رہتے ہیں اُس کوچے میں سدا
ظاہر ہے حشر ہوگی نہ ایسے غلو کے ساتھ

مجروح اپنی چھاتی کو بخیہ کیا بہت
سینہ گتھا ہے میر ہمارا رفو کے ساتھ

جان چلی جاتی ہے ہماری اسکی اور نظر کے ساتھ
یعنی چشم شوق لگی رہتی ہے شگاف در کے ساتھ

شاہد عاشق کے دل دونوں پاس ہی حاضر ہیں یعنی
پہروں پہروں خشک ہی رہتی ہے چشم تر کے ساتھ

آنا اُسکا ظاہر ہے پژمردہ لالا یاں نہ کرو
جی ہی نکل جاویگا اپنا یونہیں ذوق خبر کے ساتھ

کیا رو ماہ و خور کو لیکن جھمکا اُسکا دکھا دوں ہوں
روز و شب کچھ ضد سی ہولی ہے مجکو شمس و قمر کے ساتھ

سینہ خالی آج پڑا ہے میر طرف سے پہلو کے
دل بھی شاید نکل گیا ہے روتے خون جگر کے ساتھ

گل گل شگفتہ مے سے ہوا ہے نگار دیکھ
یک جرعہ ہمدم اور پلا پھر بہار دیکھ

اب وہ نہیں کرم کہ بھرن پڑنے لگ گئی
جوں ابر آگئے لوگوں کے دامن پسار دیکھ

آنکھوں کو تیری عین کیا سب نے دیدنی
تو سب سے ٹک تو پھیرلے آنکھوں کو یار دیکھ

محتاج گل نہیں ہے گریبان غم کشاں
گلزار اشک خونیں سے جیب و کنار دیکھ

آنکھیں اُدھر سے موندلیں ہیں اب تو شرط ہے
پھر دیکھیو نہ میری طرف ایک بار دیکھ

خالی پڑا ہے خانۂ دولت وزیر کا
باور نہیں تو آصف آصف پکار دیکھ

خواہش نہ ہوئے دل کی جو حاصل تو موت ہے
احوال میر دیکھ نہیں جی تو مار دیکھ

پیدا ہے یا خدا نہیں اس دلربا کے ساتھ
دیر و حرم میں ہو کہیں ہو ہے خدا کے ساتھ

ملتا رہا کشادہ جبیں خوب و زشت سے
کیا آئینہ کرے ہے بسر یاں حیا کے ساتھ

گو دست لطف سر سے اُٹھائے کوئی شفیق
دل کا لگاؤ اپنا ہے دست دعا کے ساتھ

تدبیر دوستاں سے ہے بالعکس فائدہ
ہے درد عاشقی کو خصومت دوا کے ساتھ

کی کشتی اُسکی پاک زبردست عشق نے
جن نے ملائے ہاتھ ٹک ایک اس بلا کے ساتھ

وباش لڑکوں سے تو بہت کر چکے معاش
اب عمر کاٹیے گا کسو میرزا کے ساتھ

کیا جانوں میں چمن کو ولیکن قفس پہ میر
آتا ہے برگ گل کبھو کوئی صبا کے ساتھ

عزو وقار کیا ہے کسو خود نما کے ہاتھ
ٹھلا دیا فلک نے ہمیں نقش پا کے رنگ
ہے آبرو فقیر کی شاہِ ولا کے ہاتھ
اٹھنا ہمارا خاک سے ہے اب خدا کے ہاتھ
آنکھوں میں آشنا تھا مگر دیکھا تھا کہیں
دیکھ اُسکو مجکو یاروں نے حیران ہو کہا
تو گل کل ایک دیکھا ہے میں نے صبا کے ہاتھ
کس ڈھب سے لگ گیا ہے یہ گوہر گدا کے ہاتھ
دل کی گرہ نہ ناخن تدبیر سے کھلی
عقدہ کھلے گا میر یہ مشکل کشا کے ہاتھ

ردیف یائے تحتانی

رات کو تھا کعبے میں بھی شیخ حرم سے لڑائی ہوئی
سخت کدورت بیچ میں آئی صبح تلک نہ صفائی ہوئی
تہمت رکھ مستی کی مجھ پر شیخ شہر کنے لایا
وہ بھی بگڑا حد سے زیادہ سُن کر بات بنائی ہوئی
شیشہ اُن نے گلے میں ڈلوا شہر میں سب تشہیر کیا
ہائے سیہ رو عاشق کی عالم میں کیا رسوائی ہوئی
کیسی شکلیں سامنے آویں مژگاں وا او دھر نہ کر دل
حور پری پر آنکھ نہیں پڑتی ہے کسو کی لگائی ہوئی
حوصلہ داری کیا ہے اتنی قدرت کچھ ہے خدا ہی کی
عالم عالم جہان جہاں جو غم کی ہم میں سمائی ہوئی
دیکھ کے دست و پائے نگاریں چپکے سے رہجاویں کیوں
مُنھ لے رہے یارو گویا منھدی اس کی رچائی ہوئی
دل میں درد جگر میں طپیدن سر میں شور آشفتہ دماغ
کیا کیا رنج اُٹھائے گئے ہیں جب سے ان سے جدائی ہوئی
ہفتم چرخ سے ادھر ہو کر عرش کو پہونچی میری دعا
اور رسائی کیا ہوتی ہے گو کہ کہیں نہ رسائی ہوئی
دود دل سوزان محبت مو جہ ہو تو عرش پہ ہو

دوزخ بجھے گی یعنی جا کر عشق کی آگ لگائی ہوئی

یہ یہ بلائیں سر پہ ہیں تو آج موئے کل دوسرا دن
یاری ہوئی بیماری ہوئی درویشی ہوئی تنہائی ہوئی

اتنے لوگوں میں چشم کسو کی قہر قیامت آفت ہے
تم نے دیکھی نہیں ہے صاحب آنکھ کوئی شرمائی ہوئی

جب موسم تھا وا ہونے کا تب تو شگفتہ ٹک نہ ہوا
اب جو بہت افسردہ ہوا ہے دل ہے کلی مرجھائی ہوئی

اُسکی طرف جو لی ہم نے ہے اپنی طرف سے پھرا عالم
یعنی دوستی سے اُس بت کی دشمن ساری خدائی ہوئی

ہم قیدی بھی موسم گل کی کب سے توقع رکھتے تھے
دیر بہار آئی ابکی پہ اسیروں کی نہ رہائی ہوئی

کہنا جو کچھ جس سے ہوگا سامنے میر کہا ہوگا
بات نہ دل میں پھر گئی ہوگی منھ پہ میرے آئی ہوئی

مجھکو مارا بھلا کیا تو نے
بے وفا کا بُرا کیا تو نے

حسرتیں اسکی سر پٹکتی ہیں
مرگ فرہاد کیا کیا تو نے

وہ جو کہتا تھا تو ہی کریو قتل
میر کا سو کہا کیا تو نے

آنکھوں کی طرف گوش کی درپردہ نظر ہے
کچھ یار کے آنے کی مگر گرم خبر ہے

یہ راہ و روش سرو گلستاں میں نہ ہوگی
اُس قامتِ دلچسپ کا انداز دگر ہے

یہ بادیۂ عشق ہے اللہ ادھر سے
بچکر نکل اے سیل کہ یاں شیر کا ڈر ہے

وہ ناوکِ دل دوز ہے لاگو مرے جی کا
تو سامنے ہو ہمدم اگر تجھکو جگر ہے

کیا پھیل پڑی مدتِ ہجراں کہ نہ پوچھو
مہ سال ہوا ایک گھڑی ہمکو پہر ہے

کیا جان کہ جسکے لیے منھ موڑتے تم سے
تم آؤ چلے داعیہ کچھ تم کو اگر ہے

تجھسا تو سوار ایک بھی محبوب نہ نکلا
جس دلبر خود کام کو دیکھا سو نفر ہے

شب شور و فغاں کرتے گئی تجھکو تو اب تو
دم کش ہو ٹک اے مرغِ چمن وقتِ سحر ہے

سوچے تھے کہ سودا محبت میں ہی کچھ سود
اب دیکھتے ہیں اس میں تو جی ہی کا ضرر ہے

شانے پہ رکھا ہار جو پھولوں کا تو لچکے
کیا ساتھ نزاکت کے رگِ گل سی کمر ہے

گر کام کسو دل میں گئی عرش پہ تو کیا
اے آہِ سحرگاہ اگر تجھ میں اثر ہے

پیغام بھی کیا کریے کہ اوباش ہے ظالم
ہر حرف میاں داریہ شمشیر و سپر ہے

ہر بیت میں کیا میر تری باتیں گتھی ہیں
کچھ اور سخن گر کہ غزل سلکِ گہر ہے

کیا خانہ خرابی کا ہمیں خوف و خطر ہے
گھر ہے کسو گوشے میں تو مکڑی کا سا گھر ہے

میلان نہ آئینہ کا اسکو ہے نہ گل کا
کیا جانیے اب اڑ کے دلِ یار کدھر ہے

اے شمع اقامت کدہ اس بزم کو مت جان
روشن ہے ترے چہرے سے تو گرم سفر ہے

اس عاشق دیوانہ کی مت پوچھ معیشت
دنداں بجگر دست بدل داغ بسر ہے

کیا آگ کی چنگاریاں سینے میں بھری ہیں
جو آنسو مری آنکھ سے گرتا ہے شرر ہے

ڈر جان کا جس جا ہے وہیں گھر بھی ہے اپنا
ہم خانہ خرابوں کو تو یاں گھر ہی نہ در ہے

کیا پرسش احوال کیا کرتے ہو اکثر
ظاہر ہے کہ بیمار اجل رو بسفر ہے

رہتی ہیں الم ناک ہی وے آنکھیں جو اچھی
بد چشم کسو شخص کی شاید کہ نظر ہے

دیدار کے مشتاق ہیں سب جیسے اب اسکی
کچھ شورش ہنگامۂ محشر میں خبر ہے

سب چاہتے ہیں رشد مرا یوں تو برے میر
شاید یہی اک عیب ہے مانع کہ ہنر ہے

کیا کہیے کچھ بن نہیں آتی جنگل جنگل ہو آئے
چھانہ میں جا کے پھولوں کی ہم عشق و جنوں کو رو آئے

دل کی تلاش میں اٹھ کے گئے تھے شاید یاں پیدا ہو سو
جان کا اپنے گرامی گوہر اس کی گلی میں کھو آئے

آہوئے عرفاں صید انھوں کا گر نہ ہوا نقصان کیا
اس عالم سے اس عالم میں کسب کمال کو جو آئے

کچھ کہنے کا مقام نہ تھا وہ وا ہوتا تو کہتے کچھ
آنا نہ آنا یکساں تھا واں ہوتے ادھر ہم گو آئے

سب کہتے تھے چین کرے گا کچھ بھی نہ دیکھا جز سختی
پتھر رکھ کے سرہانے ہم ٹک اُسکی گلی میں سو آئے

کیا ہی دامنگیر تھی یارب خاک بسملگاہ وفا
اُس ظالم کی تیغ تلے سے ایک گیا تو دو آئے

سر دینا ٹھہرا کر ہم نے پانوں کو باہر رکھا تھا
ہر سو ہو دشوار ہے پھرنا میر ادھر اب تو آئے

جوں ابر بیکسانہ روتے اُٹھے ہیں گھر سے
برسے ہے عشق اپنے دیوار اور در سے

جمہور راہ اُس کی دیکھا کرے ہے اکثر
محفوظ رکھ الٰہی اسکو نظر گزر سے

وحش اور طیر آنکھیں ہر سو لگا رہے ہیں
گزرہ اُسکی دیکھیں اُٹھ چلتی ہے کدھر سے

شاید کہ وصل اُسکا ہووے تو جی بھی ٹھہرے
ہوتی نہیں ہے اب تو تسکین دل خبر سے

مدت سے چشم بستہ بیٹھا رہا ہوں لیکن
وہ روے خوب ہرگز جاتا نہیں نظر سے

گو ہاتھ وہ نہ آوے دل غم سے خون کرنا
ہے لاگ میرے جی کو اُس شوخ کی کمر سے

یہ گل نیا کھلا ہے بے بال تو قفس میں
کوئی کلی نہ نکلی مرغ چمن کے پر سے

دیکھو نہ چشم کم سے یہ آنکھ ڈبڈبائی
سیراب ابر ہوتے دیکھے ہیں چشم تر سے

گلشن سے لے قفس تک آواز ایک سی ہے
کیا طائر گلستاں میں نالہ کش اثر سے

ہر ایک خراش ناخن جبہے سے صدر تک ہے
رجھوار ہو تو پوچھے کوئی ہمیں ہنر سے

یہ عاشقی ہے کیسی ایسے جیوگے کب تک
ترک وفا کرو ہو مرنے کے میر ڈر سے

بسکہ ہے گردون دوں پروردنی
ہووے پیوند زمیں یہ رفتنی

بزم میں سے اب تو چل اے رشک صبح
شمع کے اوپر پھری ہے مردنی

میں چراغ صبحگاہی ہوں نسیم
مجھسے اک دم کے لیے کیا دشمنی

مجھسا محنت کش محبت میں نہیں
ہر زماں کرتا رہا ہوں جاں کنی

کچھ گدا شاعر نہیں ہوں میر میں
تھا مرا سر مشق دیوان غنی[1]

[1] مرزا محمد طاہر غنی خطۂ کشمیر کا عدیم المثال باکمال فارسی زبان کا شاعر جس نے عالم جوانی میں بحالت شوریدہ سری ۱۰۷۹ھ میں انتقال کیا - ۱۲

بسان برق وہ جھمکے دکھاوے
لے دل شرط ہی جو تاب لاوے
اُڑاتا گرد ہی وہ باہر نہ آوے
مبادا مجھکو بھی گرد ا بناوے
صبا سے بیں جو لگ چلکر گیا واں
ہوا کھاوے کہا آنے نہ پاوے
نزاکت سے بہت ہے کم دماغی
کھنچے یکمڑی تو گل تیوری چڑھاوے
بہ نگاہ اُس کنشدے کی گلی ہے
وہی جاوے جو لوہو میں نہاوے
نہ پوچھو فرش رہ کیا ہوئے اُسکا
جو اہلِ دل ہو تو آنکھیں بچھاوے
بلا مغرور ہے وہ آتشیں خو
بہت منت کرو تو بھی جلاوے
پڑا اتڑ پا کیا میں دو پہر دن
عجب کیا ہی جو پاس اپنے بلاوے
بتانِ دیر سے ایسی نہیں لاگ
خدا ہی ہو تو کعبے میر جاوے

کیا خط لکھوں میں رونے سے فرصت نہیں رہی
لکھتا ہوں تو پھرے ہے کتابت بہی بہی
میدانِ غم میں قتل ہوئی آرزوے وصل
تھی اپنے خانمانِ تمنا میں اک یہی
اپنا لکھا ہے یاد مجھے میری بات بھول
قاصد نے جا کے یار سے کچھ اور ہی کہی
شب شور کرنے میں جو سماجت کی تنگ ہو
کہنے لگا کہ مار دے یہ تو سہے وہی
مت یہ گہرام تو داغوں سے ساز کر
اے زخمِ کہنہ میر کی خاطر ہی یوں سہی

نہ یک شیخ اتنا بھی ویا ہی تباہی
کہاں رحمتِ حق کہاں بیگناہی
ملوں کیونکہ ہمرنگ ہو تجھسے اے گل
ترا رنگ شعلہ مرا رنگ کاہی
مجھے میر تا گور کاندھا دیا تھا
تمنائے دل نے تو یاں تک نباہی

ادھر مطرب کا عودی رنگ کب طناز آتا ہے
عجب ہیں لوگ جو کہتے ہیں وہ ناساز آتا ہے
خبر ہے شرط آتنا مت برس اے ابرِ بارندہ
ہمیں بھی آج رونا دردِ دل پرداز آتا ہے
اُٹھے ہے گرد معشوقانہ اس تربت سے عاشق کی
کبھو ٹک جھکے ادپر وہ سرا پا ناز آتا ہے
عجب رنگِ حنا طائر ہے دستِ آموزِ خوبان کا
اُڑے ہے تو بھی ہاتھوں ہی میں شہپر پرواز آتا ہے
وہی نازاں خراماں کبک سا آیا مری جانب
کوئی مغرور وہ شوخی سے اپنی باز آتا ہے

رہائی اپنی ہے دشوار کب صیاد چھوڑے ہے
اسیر دام ہو طائر جو خوش آواز آتا ہے

اگر مسجد سے آویں میر تو بھی لوگ کہتے ہیں
کہ میخانے سے پھر دیکھو وہ شاہد باز آتا ہے

اُس کے رنگ چمن میں شاید اور کھلا ہے پھول کوئی
شور طیور اُٹھتا ہے ایسا جیسے اُٹھے ہے بول کوئی

یوں پھرتا ہوں دشت و در میں دور اس سے میں سرگشتہ
غم کا مارا آوارہ جوں راہ گیا ہو بھول کوئی

ایک کہیں سر کھینچے ہے ایسا جسکی کریں سب پابوسی
ہو ہر اک کو قبول دلہا یہ نہ کرے گا قبول کوئی

کس اُمید کا تجکو اے دل چاہ میں اُسکی حصول ہوا
شوخ و شلائیں خوش ردیاں سے رہتا ہے مامول کوئی

لینے اس کے بالوں کا میں وصف لکھا ہے دور تلک
طرف مار تو طولانی تھا پھر بھی دے ہے طول کوئی

ستی حُسن پرستی رندی یہی عمل ہے مدّت سے
پیر کبیر ہوئے تو کیا ہے چھوٹے ہے معمول کوئی

حرف و حکایت شکر و شکایت تھی تو اک وضع و تیرہ پہ
میر کو جاکر دیکھا ہم نے ہے مرد معقول کوئی

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

لگنے نہ دے بس ہو تو اُس کے گوہر گوش کو بالے تک
اُسکو فلک چشم مہ و خور کی پتلی کا تارا جانے ہے

آگے اُس متکبّر کے ہم خدا خدا کیا کرتے ہیں
کب موجود خدا کو وہ مغرور خود آرا جانے ہے

عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اُس کے اپنا وارا جانے ہے

چارہ گری بیماریِ دل کی رسمِ شہرِ حُسن نہیں
ورنہ دلبرِ ناداں بھی اس درد کا چارا جانے ہے

کیا ہی شکار فریبی پر مغرور ہے وہ صیاد بچہ
طائر اُڑتے ہوا میں سارے اپنی اسارا جانے ہے

مہر و وفا و لطف و عنایت ایک سے واقف اِن میں نہیں
اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارا جانے ہے

عاشق تو مردہ ہے ہمیشہ جی اُٹھتا ہے دیکھے اُسے
یار کے آجانے کو یکایک عمر دوبارا جانے ہے

کیا کیا فتنے سر پر اس کے لاتا ہے معشوق اپنا
جس بیدل بیتاب و تواں کو عشق کا مارا جانے ہے

رخنوں سے دیوار چمن کے مُنھ کو لے ہے چھپا یعنی
ان سوراخوں کے ٹک رہنے کو سو کا نظارا جانے ہے

تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا میر بھی ناداں تلخی کش
دمدار آب تیغ کو اُس کے آبِ گوارا جانے ہے

جب جل گئے تب اُن نے کینے کی ادا کی ہے
چال ایسی چلا جس پر تلوار چلا کی ہے

خلقت مگر اُلفت سے ہے شورشِ سینہ کی
چھیاں مری چھاتی سے دن رات رہا کی ہے

ہم لوگوں کے لوہو[1] میں ڈوبی ہی رہی اکثر
اس تیغ کی جدول بھی کیا تیز بہا کی ہے

عشاق موئے پر بھی ہجراں میں معذب ہیں
مدفن میں مرے ہر دم اک آگ لگا کی ہے

صد رنگ بہاراں میں اب کی جو کھلے ہیں گل
یہ لطف نہ ہوا کیسی رنگینی ہوا کی ہے

مرنے کو رہے حاضر سو مار رہے گئے آخر
گو اُن نے جفا کی ہے ہم نے تو وفا کی ہے

مایوس ہی رہتے ہیں بیمار محبّت کے
اس درد کی مدّت تک ہمنے بھی دوا کی ہے

آتا اودھر اُس بت کا کیا میری کشش سے ہے
ہو موم جو پتھر تو تائید خدا کی ہے

داماں دراز اس کا جوں صبح نہیں کھینچا
اے میر یہ کوتاہی شب دستِ دعا کی ہے

[1] میرے کسکو لاگی کہ نہ لوہو میں ڈبویا اُسکو ؎ اُسکی شمشیر کی جدول بھی بہا کیا کیا کی +

ہوا ان دنوں ہم سے اک رات جانی — کہاں ہم کہاں تم کہاں پھر جوانی
شکایت کروں ہوں تو سونے لگے ہے — مری سرگزشت اب ہوئی ہے کہانی
ادا کھینچ سکتا ہے بہزاد اس کی — کھنچے صورت ایسی تو یہ ہم نے مانی
ملاقات ہوتی ہے تو کشمکش سے — یہی ہم سے ہے جب نہ تب اینچا تانی

بسنتی قبا پر ترے مر گیا ہے
کفن میر کو دیجیو زعفرانی

بے اس کے تیرے حق میں کوئی کیا دعا کرے — عاشق کہیں شتاب تو ہووے خدا کرے
اے سرو مہر کوئی مرے رہ تو گرم ناز — پرسش کسو سے حال کی تیری بلا کرے
دامن بہت وسیع ہے آنکھوں کا اے سحاب — لازم ہے تجھ کو ان ہی کا پانی بھرا کرے
آکر بکھیرے پھول مری مشت خاک پر — مرغ چمن اگر حق صحبت ادا کرے

پتھر کی چھاتی چاہیے ہے میر عشق میں
یہی جانتا ہے اس کا جو کوئی وفا کرے

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے — دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے
ہم تو کشتۂ ناکس ٹھہرے کوئی نہ ادھر دیکھے گا — آنکھ اٹھا کر وہ دیکھے تو یہ بھی اس کی مروت ہے
ہائے غیوری جیسے دیکھے جی ہی نکلتا ہے اپنا — دیکھیں اس کو اور نہ دیکھیں پھر عشق کی یہ بھی غیرت ہے
کوئی دم رونق مجلس کی اور بھی ہے اس دم کے ساتھ — یعنی چراغ صبح سے ہیں ہم دم بھی اپنا غنیمت ہے
خط آئے ظاہر ہے میر بگڑی بھی اچھی صورت تھی — بارے کسو کا کام سی بگڑا کام کسی بھی کچھ صورت ہے
ایک ورق پر تصویریں میں دیکھی ہیں لیلیٰ مجنوں کی — ایسی صورت حال کی اس کی اپنے ان دونوں کو حیرت ہے
خاک کو آدم کر کے اٹھایا جس کے دست قدرت نے — قدر نہیں کچھ اس بندے کی یہ بھی خدا کی قدرت ہے
سیج سے آنسو نومیدانہ جیسے وداعی آتا تھا — آج کسو خواہش کی شاید دل سے ہمارے رخصت ہے
کیا دلکش ہے بزم جہاں کی جاتے یہاں سے جسے دیکھو — وہ غم دیدہ رنج کشیدہ آہ سراپا حسرت ہے

جب کچھ اپنے کنے رکھتے تھے تب بھی اشرف تھا لڑکوں کا
اب جو فقیر ہوئے پھرتے ہیں میر انھیں کی دولت ہے

عشق کیا سو جان چلی ہے الفت تھی یا کلفت تھی
کوٹے گئے ہیں سب اعضا یہ محبت تھی یا محنت تھی

اب تو نڈھال پڑے رہتے ہیں ضعف ہی اکثر رہتا ہے
آئے گئے اُس کے کوچے میں جب تک جی میں طاقت تھی

آبِ حیات وہی نہ جس پر خضر و سکندر مرتے رہے
خاک سے ہمنے بھرا وہ چشمہ یہ بھی ہماری ہمت تھی

آنسو ہو کر خونِ جگر کا بیتابانہ آیا تھا
شاید رات شکیبائی کی جلد بہت کچھ رخصت تھی

جب سے عشق کیا ہے میں نے سر پر میرے قیامت ہے،
ساعت دل لگنے کی شاید نحس ترین ساعت تھی

یاری کرے جو چاہے کسو سے غم ہی یاری میں ہے
بے موقع یاں آہ و فغاں ہے بے اثری زاری میں ہے

ہاتھ لیے آئینہ تجھ کو حیرت ہے رعنائی کی
ہے بھی زمانہ ہی ایسا ہر کوئی گرفتاری میں ہے

باغ میں شب جو روتا پھرتا ہوں اُس بن میں سو صبح تلک
دانہ اشک روش شبنم کے گل پر ہر کیاری میں ہے

صورتیں بگڑیں کتنی کیوں نہ اُسکو توجہ کب ہے وہ
سامنے رکھے آئینہ مصروف طرحداری میں ہے

میر کوئی اس صورت میں اُمید بہی کی کیا رکھے
ایک جراحت سینے کی میرے ہر زخم کاری میں ہے

دل بھی بھرا رہتا ہے میرا جی بھی رندھا کچھ جاتا ہے
کیا جانوں میں رنگ ڈھنگا کیسا دریا چڑھتا آتا ہے

بیچ ہے وہ جو کہا کرتا ہے کون ہے تو کیا سمجھے ہیں
بیگانے تو ہیں ہی ہم سے ناؤ کا چاہ کا ناتا ہے

تو بلبل آزردہ نہ ہو گل پھول سے باغ بہاراں ہیں
رنج کشِ اُلفت ہے عاشق جی اپنا بہلاتا ہے

عشق و محبت کیا جانوں میں لیکن اتنا جانوں ہوں
اندر ہی اندر سینے میں میرے دل کو کوئی کھاتا ہے

عاشق اپنا جان لیا ہے اُن نے شاید میر ہمیں
دیکھ بھری مجلس میں اپنی ہم ہی سے شرماتا ہے

اُس مغرور کو کیا ہوتا ہے حال شکستہ دکھائے سے
جسکو شبہ ہووے نہ ہرگز جی کے ہمارے جانے سے

کیسا کیسا ہو کے جدا پہلو سے اُس بن تڑپا ہے
کیا پوچھو ہو آئی قیامت سر پر دل کے لگائے سے

یمن تجرد سے میں اپنے روز جہاں سے گزرتا ہوں
وحشت ہی خورشید نمط اپنے بھی مجکو سائے سے

ہر کوئے و ہر برزن میں یا پھیرہ پھیرہ جو یاں تھا
یا اب ننگ آتے آتا ہی پاس ہمارے آئے سے

ایک جراحت کیا تسکیں دے موت گئے بھو کے صید تئیں
شاید دل ہو تسلی اسکا زخم دگر کے کھائے سے

رنج و عنا پر درد و بلا پر صبر کیے ہم بیٹھے ہیں
کلفت اُلفت جاتی رہی کیا جور و ستم کے اُٹھائے سے

اول تو آتے ہی نہیں ہو اور کبھو جو آتے ہو
نیچی آنکھیں کیے پھرتے ہو مجلس میں شرمائے سے

جھگڑا ناز و نیاز کا سن کر بے مزہ ہم سے تم تو ہوئے
میر سخن کو طول نہ دو بس بات بڑھے ہے بڑھائے سے

گردش دلوں کی کم نہ ہوئی کچھ کڑے ہوئے
روزے رکھے غریبوں نے تو دن بڑے ہوئے

نرمی سے کوئے یار میں جاوے تو جا نسیم
ایسا نہ ہو کہ اُکھڑیں کہیں گل گڑے ہوئے

آہن دلوں نے مارا ہے جی غم میں اُنکے ہم
پھرتے ہیں نعل سینوں پر اپنے جڑے ہوئے

آئے ہو بعد صلح کبھو ناز سے تو یاں
منھ پھیر ادھر سے بیٹھو ہو جیسے لڑے ہوئے

بیمار امیدوار سے بستر پہ اپنے ہم
دروازے ہی کی اور تکیں ہیں پڑے ہوئے

بار اُس کی بزم میں نہیں ناچار در پہ ہم
رہتے ہیں جیسے صورت دیوار اڑے ہوئے

ہم زیر تیغ بیٹھے تھے بر وقت قتل میر
وے ٹک ہمارے پاس نہ آکر کھڑے ہوئے

عہد جنوں ہے موسم گل کا ابر شگوفہ لایا ہے
ابر بہاری وادی سے اُٹھکر آبادی پر آیا ہے

سنکر میرے شور شب کو جھنجھلا کر وہ کہنے لگا
نالے اسکے فلک تک پہونچے کن نے اسکو ستایا ہے

دھوم اُتر پورب پچھم ہنگامہ ہے سب جاگہ
اور علم میرے حرف و سخن نے چار دانگ مچایا ہے

بے چشم درد ہو بیٹھے ہو وجہ نہیں ہے ظاہر کچھ
کام کی صورت بگڑی ہی ہماری منھ کیوں تمنے بنایا ہے

ظلم و ستم سب سہل ہیں اسکے ہمسے اُٹھتے ہیں کہ نہیں
لوگ جو پرسش حال کریں ہیں جی تو انھوں نے کھایا ہے

ہوئے فقیر تو واں بیٹھے ہیں رہتے ہیں اشراف جہاں
ہمنے توکل بحث کیا ہے نام خدا سرایا ہے

برسوں ہم درویش رہے ہیں پردے میں دنیاداری کے
ناموس اسکی کیونکہ رہے ہے پردا جن نے اُٹھایا ہے

ڈھونڈھ نکالا تھا جو اُسے سو آنکو بھی ہم کھو بیٹھے
جیسا نہال لگایا ہمنے ویسا ہی پھل پایا ہے

سلہ این مدعیاں در طلبش بیخبرانند ∴ آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد ۱۲

میر غریب سے کیا ہے معارض گوشے میں اس واہی کے
ایک دیا سا بجھتا اُن نے داغ جگر پہ جلایا ہے

دل کی لاگ بری ہوتی ہے رہ نہ سکے ٹک جائے بھی
آئے بیٹھے اُٹھ بھی گئے بیتاب ہوئے پھر آئے بھی

آنکھ نہ ٹک میلی ہوئی اپنی مطلق دل بیجا نہ ہوا
دل کی مصیبت کیسی کیسی کیا کیا رنج اُٹھائے بھی

ٹھنڈے ہوتے نہ دیکھے ہرگز ویسے ہی جلتے رہتے ہیں
تلوے حنائی ہم نے اُس کے آنکھوں سے سہلائے بھی

رنگ نہیں ہے منھ پہ کسی کے باد خزاں سے گلستاں میں
برگ و بار گرے بکھرے ہیں گل غنچے مرجھائے بھی

نفع کبھو دیکھا نہیں ہم نے ایسے خرچ اُٹھانے پر
دل کے گداز سے لوہو روئے داغ جگر پہ جلائے بھی

عشق میں اُس کے جان مری مشتاق پھرے گی بھٹکی ہوئی
شوق اگر ہے ایسا ہی تو چین کہاں مر جائے بھی

تا جبر ترک فقیر ہوئے اب شاعر عالم کامل ہیں
پیش گئی کچھ **میر** نہ اپنے سوانگ بہت سے لائے بھی

کوئی نام اس کا نہ لو جبر ہے
کہ بیتاب دل کی بنا صبر ہے

نہ سوز جگر خاک میں بھی گڑا
ہوئے پر پڑا آتش مری قبر ہے

گلستاں کے ہیں دونوں پلے بھرے
بہار اس طرف اُس طرف ابر ہے

جو درویش پہنے ہے سبز لباس
تو پھر عینہ شیر ہے ببر ہے

وہ کعبہ پر کفر بکتا ہے **میر**
مسلماں نہیں وہ کہن گبر ہے

ظلم سہے ہیں داغ ہوئے ہیں رنج اُٹھے ہیں درد کھنچے
اب وہ دل میں تاب نہیں جو لب تک آہ سرد کھنچے

جیتے جی میت کے رنگوں عشق میں اُس کے ہو بیٹھا

بعد مرے نقاش سے شاید صورت میری زرد کھنچے

خاک ہوئی تھی سرکشی اپنی جوں کی توں اپنی طبیعت میں
میر عجب کیا ہے اس کا تا گردوں جو یہ گرد کھنچے

عشق اگر ہے مرد میداں مرد کوئی عرصے میں لائے
یکسر ان نامردوں کو جو ایک ہی تنگ نائی میں اٹھائے

کارِ عدالت شہر کا ہمکو اک دن دو دن ہووے تو پھر
چاروں درِ شادی کریے کوئی کسی سے دل نہ لگائے

پر کے اسیرِ دام ہوئے تھے نکلے ٹوٹی شکن کی راہ
ابھی دیکھیں موسم گل کا کیسے کیسے شگوفے لائے

بھوکے مرتے منہ میں تلخی صفرا پھیل گئی
بے ذوقی میں ذوق کہاں جو کھانا پینا مجکو بھائے

گھر سے نکل کر ٹکڑے ٹکڑے پھر جاتا ہوں میں یعنی میر
عشق و جنوں کا آوارہ حیران و پریشاں کیدھر جائے

ہم پہ خشم و عتاب ہے سو ہے
وہ ہی ناز و عتاب ہے سو ہے

گرچہ گھبرا کے لب پہ آئی وے لے
جان کو اضطراب ہے سو ہے

بس گئی جان خراب مدت کی
حال اپنا خراب ہے سو ہے

خشکیِ لب کی ہے تری کیسی
چشم لیکن پرآب ہے سو ہے

خاک جل کر بدن ہوا ہے سب
دل جلا سا کباب ہے سو ہے

کر گئے کاروانیاں شبگیر
وہ گراں مجکو خواب ہے سو ہے

یاں تو رسوا ہیں کیسا پردۂ شرم
اسکو ہم سے حجاب ہے سو ہے

دشمنِ جاں تو ہے دلوں میں ہم
دوستی کا حساب ہے سو ہے

زلفیں اسکی ہوا کریں برہم
ہمکو بھی پیچ و تاب ہے سو ہے

خاک میں مل کے پست ہیں ہم تو
اُن کی عالی جناب ہے سو ہے

شہر میں دربدر پھرے ہیں عزیز
میر ذلت مآب ہے سو ہے

چلتے ہوئے تسلی کو کچھ یار کہہ گئے
اس قافلے میں ہم بھی تھے افسوس رہ گئے

کیا کیا مکان شاہ نشیں تھے وزیر کے
وہ اُٹھ گیا تو یہ بھی گھر سے بیٹھے ڈھ گئے

اس گردش سے ملنا خرابات میں نہ تھا
بے طور ہم بھی جا کے ملے بے جگہ گئے

وے زور ور جوان جنھیں کہیئے پہاڑ تھے
جب آئی موجِ حادثہ تنکے سے بہہ گئے

وہ یار تو نہ تھا تہہ دل سے کسو کا میر
ناچار اُس کے جور و ستم ہم بھی سہہ گئے

ہائے جوانی وصل میں اُس کے کیا کیا لذت پاتے تھے
بوسۂ کنج لب سے پھر بھی ذائقے اپنے بناتے تھے

کیا کیا تم نے فریب کیے ہیں سادگی میں دل لینے کو
ٹیڑھی کر کے کلاہ آتے تھے مے ناخوردہ ماتے تھے

ہائے جدائی ایک ہی جا گہ مار کے ہم کو توڑ رکھا
وے دن یاد آتے ہیں اب جب اُن کے آتے جاتے تھے

غیروں کی تم سُنتے رہے سو غیرت ہم سہتے رہے
وے تو تم کو لگا جاتے تھے تم آ ہم کو جلاتے تھے

رنج و الم غم عشق ہی کے اعجاز سے کھنچتے تھے ورنہ
حوصلہ کتنا اپنا جس میں یہ آزار سماتے تھے

وے دن کیسے ساتے ہیں جو آ کر سوتے پاتے کبھو
آنکھوں سے ہم سہلا سہلا تلوے اُسکو جگاتے تھے

چاہت روگ بُرا ہے جی کا میر اس سے پرہیز بھلا
اگلے لوگ سُنا ہے ہم نے دل نہ کسو سے لگاتے تھے

بات ہماری یاد رہے جی بھولا بھولا جاتا ہے
تھوڑے سے پانی میں ہیں سر کھینچے کی ہے جیسے حباب

وحشت پر جب آتا ہے تو جیسے بگولا جاتا ہے
کہتے ہیں سب یہ تجھکو کیا اُبھرا بھولا جاتا ہے

گام کی صورت کیا ہے اُسکی راہ چلے ہے میر اگر
دیکھنے والے کہتے ہیں یہ کوئی ہیولا جاتا ہے

اس تنگ کشش سے بھی نہ ہونچے جہاں آخر سارے گئے
اُسکی روئے خوے کردہ پر نقاب لئے وہ صورت ہے
ایسے قماری سے دل کو لگا کر جیتے رہنا ہو نہ سکا
چارہ گر اس شہر کے ہوں تو فکر کریں آدمی کا
مشکل میر نظر آتا تھا اُٹھنا بار امانت کا

عاشق اُسکے قامت کے بالا بالا مارے گئے
جیسے یکایک سطح ہوا پر بدلی آئی تارے گئے
رفتہ شاہد بازی اُسکے جی بھی اپنا ہارے گئے
یارب بستے تھے جو یاں سے لوگ کہاں بیچارے گئے
آئے ہم تو سہولت سے وہ بوجھ اُٹھا کر بارے گئے

عیدیں آئیں بارہا لیکن نہ دے آکر ملے
رہتے ہیں اُنکے گلے لگنے کے برسوں سے گلے

اس زمانے کی تری سے ابر بحر اگلی کہاں
بے تہی کرنے لگے دریا دلوں کے حوصلے

غنچگی میں دیکھے ہیں صد رنگ جورِ آسماں
اب جو گل سا بکھرا ہوں دیکھوں کہ کیا گل کھلے

سارے عالم کے حواس خمسہ میں ہے انتشار
ایک ہم تم ہی نہیں معلوم ہوتے دہ دلے

میر طے ہوگا بیابانِ محبت کس طرح
راہ ہے پرخار میرے پانوؤں میں ہیں آبلے

کیسی سعی و کشش کوشش سے کعبے گئے بتخانے سے
اس گھر میں کوئی بھی نہ تھا شرمندہ ہوئے ہم جانے سے

دامن پر فانوس کے تھا کچھ یوں ہی نشاں خاکستر کا
شوق کی میں جو نہایت پوچھی جان جلی پروانے سے

لگتے سامنے آتے تھے تو کیا کیا زجر اُٹھاتے تھے
تنگ لگا ہے لگنے انھیں اب بات ہماری ماننے سے

پاس غیرت تمکو نہیں کچھ دریا پر سن غیر کو تم
گھر سے اُٹھ کے چلے جاتے ہو نہانے کے بھی بہانے سے

تم نے کہا مر رہ بھی جاکر بندہ جاکر مر ہی رہا
کس دن میں نے عدول کیا ہے صاحب کے فرمانے سے

سوکھ کے ہوں لکڑی سے کیونکہ زرد و زبوں ہم عاشق زار
کچھ نہیں رہتا انساں میں ہر لحظے کے غم کھانے سے

جب دیکھو تب تربت عاشق جھکڑ سے ہے تزلزل میں
عشق ہے بادِ صرصر گویا اُس کی خاک اُڑانے سے

برسوں میں پہچان ہوئی تھی سو تم صورت بھول گئے
یہ بھی شرارت یاد رہے گی ہمکو نہ جانا جانے سے

سنی سنائی بات سنے اس کی کب جیتے ہیں ہم غافل
دونوں کان بھرے ہیں اپنے بے تہ یاں کے فسانے سے

میر کی تیزی کیا سلجھے گی حرف و سخن میں گنجلک ہے
کوئی بھی عاقل الجھ پڑے ہے ناصح ایسے دیوانے سے

گئے روزے اب دید وادید ہے
گلے سے ہمارے لگو عید ہے

گریزاں ہوں سائے سے خورشید ساں
جہاں جب سے ہے مجکو تجرید ہے

تصوف میں جب ڈال دیتے ہیں بات
خدا ہر کہیں ہیں یہ توحید ہے

جو آویں بتاں جذب سے یاں تو یہ
خدا کی طرف ہی کی تائید ہے

لپیٹا ہے میں بوریائے نماز
یہی میر جانے کی تمہید ہے

ہجر میں خوں ہوا تھا سب تم سے
دل نے پہلو تہی کیا ہم سے

عالم حسن ہے عجب عالم
چاہیے عشق اس بھی عالم سے

طرح چھریوں کی پلکوں سے ڈالی — نکلی تلوار ابرو کے خم سے

نسبت اُن بالوں کی درست ہوئی — دیر میں میرے حال درہم سے

درپئے خون میر کے نہ رہو

ہو بھی جاتا ہے جرم آدم سے

اٹھکھیلیوں سے چلتے طفلی میں جان مارے — نام خدا ہوا ہے اب وہ جوان بارے

اپنی نیاز تم سے اب تک بتاں وہی ہے — تم ہو خدائے باطل ہم بندے ہیں تمھارے

ٹھہرے[ل] ہیں ہم تو مجرم ٹک پیار کر کے تم کو — تم سے بھی کوئی پوچھے تم کیوں ہوئے پیارے

گل میں جو سیر کیں تھا کیا پھول پھول بیٹھے — بلبل سے لئے ہیں گویا گلزار سب اجارے

کرتا ہے ابر نیساں پر دُر دہن صدف کا — منھ جو کوئی پسارے ایسے کئے پسارے

اے کاش غور سے وہ دیکھے کبھو ٹک آکر — سینے کے زخم اب تو غائر ہوئے ہیں سارے

چپکا چلا گیا میں آزردہ دل چمن سے — کس کو دماغ اتنا بلبل کو جو پکارے

میدان عشق میں سے چڑھ گھوڑے کون نکلا — مارے گئے سپاہی جتنے ہوئے اُتارے

جو مر رہے ہیں اُس پر اُنکا نہیں ٹھکانا — کیا جانیے کہاں وے پھرتے ہیں مارے مارے

کیا برچھیاں چلائیں آہوں نے نیم شب کی — رخنے ہیں آسماں میں سارے نہیں ستارے

ہوتی ہے صبح جو یاں ہے شام سے بھی بدتر

کیا کہیے میر خوبی ایام کی ہمارے

کیا کہیے ویسی صورت کا ہے نظر نہ آئی — ایسے گئے کہ اُن کی پھر کچھ خبر نہ آئی

روٹھے جو تھے سو ہم سے روٹھے ہوئے وداعی — کیا روئیے ہمیں تو منت بھی کر نہ آئی

طالع کا مکث دیکھو آئی صبا جو واں سے — چاروں طرف پھر آئی لیکن ادھر نہ آئی

جی میں جو کچھ کسو کے آوے سو باندھ جاوے — اپنے خیال میں تو اُس کی کمر نہ آئی

کیا رات دن کٹے ہیں ہجراں کی بیخودی میں

سدھ اتنی میر اُس بن دو دو پہر نہ آئی

داد فریاد جا بجا کر لے — شاید اُسکے بھی دل میں جا کر لے

اب سلگنے لگی ہے چھاتی بھی — یعنی مدت پڑے جلا کر لے

ل میر تقی سے پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ ؛ اُن سے یہ پوچھے کوئی تم اتنے کیوں پیارے ہوگئے

چشم و دل جان مائل خوباں — پری یاروں کی کیا کیا کرئیے
دیکھیں کب تک رہے ہے یہ صحبت — گالیاں کھائیے دعا کرئیے
کچھ کہیں گر تو وہ کہے نہ کہو — کیونکر اظہار مدعا کرئیے
اتفاق ان کا نا روا سے ہے — ناز و انداز کو جدا کرئیے
عید ہی کاش کے رہے ہر روز — صبح اُسکے گلے لگا کرئیے
راہ تکنے کو بھی نہایت ہے — منتظر کب تلک رہا کرئیے
ہستی موہوم و یک سر و گردن — سیکڑوں کیونکر حق ادا کرئیے
وہ نہیں سرگزشت سنتا **میر** — یوں کہانی سی کیا کہا کرئیے
مترتب ہو نفع جو کچھ بھی — دل کی بیماری کی دوا کرئیے

سو تو ہر روز ہے بُرا احوال
متحیر ہیں آہ کیا کرئیے

دو چار روز آگے چھاتی گئی تھی کوٹی — ہجراں کا غم تھا تس میں سختی سے جان ٹوٹی
کلیاں جھڑی ہیں کچی بکھرے ہیں پھول سارے — پائیز کی چمن میں کیا کیا بہار لوٹی

سیر چمن میں کچھ تو جی سے ہوس نکلتی
موسم میں گل کے بلبل افسوس ہے نہ چھوٹی

کب وعدے کی رات یہ آئی جو اُس میں نہ لڑائی ہوئی
آخر اُس اوباش نے مارا کب رہتی ہے آئی ہوئی

چاہت میں اُس بے الفت کی گھبراہٹ دل ہی کو نہیں
سارے حواسوں میں ہے تشتت جان بھی ہے گھبرائی ہوئی

گرچہ نظر ہے پشت پا پر لیکن قہر قیامت ہے
گڑ جاتی ہے دل میں ہمارے آنکھ اسکی شرمائی ہوئی

جنگل جنگل شوق کے مارے ناقہ سوار پھرا کی ہے
مجنوں جو صحرائی ہوا تو لیلیٰ بھی سودائی ہوئی

چتون کے انداز سے ظالم ترک مروت پیدا ہے
اہل نظر سے چھپتی نہیں ہے آنکھ کسو کی چھپائی ہوئی

دودِ دلِ سوزانِ محبت محو جو ہو تو عرش نہ ہو
دور نہ بجھے گی یعنی جا کر عشق کی آگ لگائی ہوئی

میر کا حال نہ پوچھو کچھ تم کہنہ رباطِ پیری سے
رقص کناں بازار میں آئے عالم میں رسوائی ہوئی

کیا کہیے اپنے عہد میں جتنے امیر تھے
ٹکڑے سے پہ جان دیتے تھے سارے فقیر تھے

دل میں گرہ ہوس رہی پرواز باغ کی
موسم گلوں کا جب تئیں تھا ہم اسیر تھے

برنائی ہی میں تم سے شرارت نہیں گئی
لڑکے سے بھی تھے تم تو قیامت شریر تھے

آرائش بدن نہ ہوئی فقر میں بھی کم
جاگہ اتو کی جامے پہ نقشِ حصیر تھے

آنکھوں میں ہم کسو کی نہ آئے جہان میں
ازبسکہ میر عشق سے خشک و حقیر تھے

جو کوئی خستہ جگر عشق کا آزاری ہے
جی چکا وہ کہ یہ بے طرح کی بیماری ہے

کارواں گاہ جہاں میں نہیں رہتا کوئی
جسکے ہاں دیکھتے ہیں چلنے کی تیاری ہے

چیز و ناچیز کا آگاہ کو رہتا ہے لحاظ
سارے عالم میں حقیقت تو وہی ساری ہے

آئینہ روبرو رکھنے کو بھی اب جائے نہیں
صورتوں سے اُسے ہم لوگوں کی بیزاری ہے

مر گئے عشق میں نازک بدنوں کے آخر
جان کا دینا محبت کی گنہگاری ہے

پلکیں وے اُسکی بھری جی میں کھبی جاتی ہیں
آنکھ وہ دیکھے کوئی شوخی میں کیا پیاری ہے

بیقراری میں نہ دلبر سے اُٹھا ہرگز ہاتھ
عشق کرنے کے تئیں شرط جگرداری ہے

واے وہ طائرِ بے بال ہوسناک جسے
شوقِ گلگشتِ گلستاں میں گرفتاری ہے

ظلم سے کھینچے نہیں رہتی ہے جسکی شمشیر
اس ستمگار جفا جو سے ہمیں یاری ہے

آنکھ مستی میں کسو پر نہیں پڑتی اُسکی
یہ بھی اُس سادہ و پُرکار کی ہشیاری ہے

واں سے غمزہ ناز و تبختر نہیں کچھ یاں سے میر
عجز ہے دوستی ہے عشق ہے غمخواری ہے

درد و غم سے دل کبھو فرصت نہ پائے
یہ صعوبت کب تلک کوئی اُٹھائے

طفل ہے بازار کا عاشق ہوں میں
دل فروشی کوئی مجھ سے سیکھ جائے

زار رونا چشم کا کب دیکھیے
دیکھیں ہیں لیکن خدا جو کچھ دکھائے

کب تلک چاک قفس سے جھانکیے / برگ گل یہاں بھی صبا کوئی تو لائے
کب سے ہمکو ہے تلاش دست غیب / تا کمر پیچ اس کا اپنے ہاتھ آئے
اس کی اپنی بنتی ہی ہرگز نہیں / بگڑی صحبت ایسی کیا کوئی بنائے
جو لکھی قسمت میں ذلت ہو سو ہو / خط پیشانی کوئی کیونکر مٹائے
داغ ہے مرغ چمن پائیز سے / دل نہ ہو جلت جو سنا گل کھلائے
زخم سینہ میر اُس کے ہاتھ کا / ہو کوئی رفوگر تو اُس کو دکھائے

میر اکثر عمر کے افسوس میں
زیر لب بالائے لب ہے ہائے وائے

نہ نوشتہ نامہ آیا یہ کچھ ہمیں لکھا ہے / اس سادہ رو کے جی میں کیا جانیے کہ کیا ہے
کافر کا بھی رویہ ہوتا نہیں ہے ایسا / ٹھوکر لگا کے چلنا کس دین میں روا ہے
دنیا میں دیر رہنا ہوتا نہیں کسو کا / یہ تو سرائے فانی اک کاروان سرا ہے
بندے کا دل بجا ہے جاتا ہوں شاد ہر جا / جب سے سنا ہے میں نے کیا غم ہی جو خدا ہے
پائے ثبات کس کا ٹھہرا ہے اسکے دیکھے / ہے ناز اک قیامت انداز اک بلا ہے
ہر جا بدن میں اسکے افراط سے ہے دلکش / ہیں کیا دل لک بھی اسکے اگر بجا ہے
مرنا تو ایک دم ہے عاشق مرے ہے ہر دم / وہ جانتا ہے جس کو پاس دل وفا ہے
خط اسکو لکھ کے غم سے بیخود ہوا ہوں یعنی / قاصد کے بدلے یاں سے جی ہی مرا چلا ہے
شوخی سے اُس کی درہم برہم جہان ہے سارا / ہنگامہ قیامت اُس کی کوئی ادا ہے
عمر عزیز گزری سب سے برائی کرتے / اب کر چلو بھلا کچھ شاید یہی بھلا ہے

جو ہے سو میر اُس کو میرا خدا کہے ہے
کیا خاص نسبت اس سے ہر فرد کو جدا ہے

دل پہلو میں ناتواں بہت ہے / بیمار مرا گراں بہت ہے
ہر آن شکیب میں کمی ہے / بیتابی زماں زماں بہت ہے
مقصود کو دیکھیں پہنچیں کب تک / گردش میں تو آسماں بہت ہے
جی کو نہیں لاگ لامکاں سے / ہمکو کوئی دل مکاں بہت ہے
گو خاک سے گور ہوئے یکساں / گم گشتگی کا نشاں بہت ہے

جاں بخشی غیر ہی کیا کر | مجکو بھی نیم جاں بہت ہے

اکثر پوچھے ہے جیتے ہیں میر
ابتو کچھ مہرباں بہت ہے

صاحب ہو تم ہمارے بندے ہیں ہم تمہارے | موقوف رحم پر ہیں دشوار کام سارے
ہو التفات کہ ہم بھی جیتوں میں آویں چندے | یہ عشق بے محابا تا چند جان مارے
آشوب بحر ہستی کیا جانیے ہے کب سے | موج و حباب اٹھکر لگ جاتے ہیں کنارے
کوئی تو تھا طرف پر آواز دی نہ ہم کو | ہم بیقرار ہوکر چاروں طرف پکارے
بیطاقتی سے کیونکر سر مارتے رہیں نہ | صبر و قرار دونوں یکبارگی سدھارے
کوئی تو ماہ پارہ اس بھی رواق میں ہے | چشمک کریاں ہیں ہر شب اسکی طرف ستارے

دنیا میں میر آکر کھولا ہے بار ہم نے
اس رہگزر میں دیکھیں کیا پیش آوے بارے

عشق ہمارا در پئے جاں ہے کیسی خصومت کرتا ہے | چین نہیں دیتا ہے ظالم جبتک عاشق مرتا ہے
شاید لمبے بال اس مہ کے بکھر گئے تھے باؤ چلے | دل تو پریشاں تھا ہی میرا رات جی بھی بکھرتا ہے
صورت اسکی دیدۂ تر میں پھرتی ہے ہر روز و شب | ہے نہ اچنبھا یہ بھی کہیں پانی میں نقش ابھرتا ہے
کیا دشوار گزر ہے طریق عشق مسافر کش یارو | جی سے لیے گزر جاتا ہے جو اس راہ گزرتا ہے
حال کسو بے تہ کا یاں مانا ہے حباب دریا سے | ٹک جو ہوا دنیا کی لگی تو یہ کم ظرف ابھرتا ہے
یاد خدا کو کرکے کہو ٹک پاس ہمارے ہو جاتے | صد سالہ غم دیکھے اس خوش چشم مدد کی بسترا ہے
دامن دیدۂ تر کی وسعت دیکھے ہی بن آوے گی | ابر سیاہ سفید جو ہو سو پانی ان کا بھرتا ہے
دل کی لاگ نہیں چھپتی ہے کوئی چھپائے بہتیرا | زردی عشق سے بے الفت یہ رنگ کسو کا نکھرتا ہے

کھینچے تیغہ اپنا ہر دم کیا لوگوں کو ڈراتے ہو
میر جگر دار آدمی ہے وہ کب مرنے سے ڈرتا ہے

نالہ جب گرم کار ہوتا ہے | دل کلیجے کے پار ہوتا ہے
مار رہتا ہے اُس کو آخر کار | عشق کو جس سے پیار ہوتا ہے
سب مزے در کنار عالم کے | یار جب ہمکنار ہوتا ہے
وا نگہ کا ہے اُسکے عالم اور | ایک عالم شکار ہوتا ہے

بیقراری ہو کیوں نہ چاہت میں
ہم اگر کچھ قرار ہوتا ہے

جبر ہے قہر ہے قیامت ہے
دل جو بے اختیار ہوتا ہے

راہ تکتے ہی منتظیں ہیں آنکھیں
اس کا جب انتظار ہوتا ہے

شاخ گل لچکے ہے تو جانوں ہوں
جلوہ گر یوں ہی یار ہوتا ہے

کسکو پوچھے ہے کوئی دنیا میں
دیر یاں اعتبار ہوتا ہے

آہ کس جائے یار کھولا میر
یاں تو جینا بھی بار ہوتا ہے

سخت بے رحم آہ قاتل ہے
میری خونریزی ہی کا مائل ہے

دور مجنوں کا ہو گیا آخر
یاں جنوں کا ابھی اوائل ہے

نکلے اس راہ کس طرح وہ ماہ
نہ تو طالع نہ جذب کامل ہے

مثل صورت ہیں جلوہ کے حیران
ہائے کیا شکل کیا شمائل ہے

ہاتھ رکھ یوسے تو کہے کہ بس اب
کیا جیے گا بہت یہ گھائل ہے

حق میں اس بت کے کیا کہیں کیونکر
وہ ہمارا خدائے باطل ہے

سچ ہے راحت تو بعد مرنے کے
پر بڑا واقعہ میہ مائل ہے

تیغ گر درمیاں رہے تو رہے
یار میرا جوان جاہل ہے

رو نہیں چشم تر سے اب رکیے
سیل اسی در کا کب سائل ہے

حال ہم ڈوبتوں کا کیا جانے
جسکو دریا یہ سیل ساحل ہے

میر کب تک بحال مرگ جئیں
کچھ بھی اس زندگی کا حاصل ہے

بیکسان عشق تھے ہم غم میں کھپ سارے گئے
بازخواہ خوں نہ تھا مارے گئے مارے گئے

بار کل تک ناتوانوں کو نہ تھا اس بزم میں
گرتے پڑتے ہم بھی عاجز آج واں بارے گئے

چھاتی میری سرد آہوں سے ہوئی تھی سب کرخت
استخواں اب گلے اشک گرم سے دھارے گئے

سخت جانی ہے نہ تک جو ہو خبر گھر میں اسے
صبح تک ہم رات دیواروں سے سر مارے گئے

میر قیس و کوہکن ناچار گزرے جان سے
دو جہاں حسرت لیے ہمراہ بیچارے گئے

بے یار ہوں بیکس ہوں آگاہ نہیں کوئی
بیغم کرو خونریزی خونخواہ نہیں کوئی

کیا تنگ مخوف ہے اس بستی کا رستا
تنہا پڑا ہے جانا ہمراہ نہیں کوئی

موہوم ہے ہستی تو کیا معتبری اس کی
ہے گاہ اگر کوئی تو گاہ نہیں کوئی

فرہاد کو مجنوں کو موت آگئی ہے آگے
کس سے کہیں درد دل اب آہ نہیں کوئی

میر اتنی سماجت جو بندوں سے تو کرتا ہے
دنیا میں مگر تیرا اللہ نہیں کوئی

دیدۂ گریاں ہمارا نہر ہے
دل خرابہ جیسے دلی شہر ہے

آندھی آئی ہوگیا عالم سیاہ
شور نالوں کا بلائے دہر ہے

دل جو لگتا ہے تڑپنے ہر زمان
اک قیامت ہی غضب ہی قہر ہے

یہ نہیں ہوتا ہے زخم اسکا لگا
آب تیغ یار یکسر زہر ہے

یادِ زلفِ یار جی مارے ہے میر
سانپ کے کاٹے کی سی یہ لہر ہے

عشق بلا انگیز مفتن یہ تو کوئی قیامت ہے
جس سے پیار رکھے ہی کچھ یہ اُسکے سر پہ شامت ہے

موسمِ گل میں توبہ کی بھی واعظ کے میں کہنے سے
اب جو رنگ بہار کے دیکھے شرمندہ ہیں ندامت ہے

شیخ کی دنی حرکت بھی ہیں خرقِ عادت جانوں ہوں
مسجد سے میخانے آیا یہ بھی اس کی کرامت ہے

ایکطرف میں عشق کیا تھا رسوائی یہ کہاں سے ہوئی
اب گھر سے نکل آتا ہوں چاروں طرف سے ملامت ہے

تو ہی کر انصاف صبا تک باغوں باغوں پھرے ہو تو
رنگِ گل اسکا سا رو ہی سرو کا ایسا قامت ہے

صبح کو خورشید اُسکے گھر پر طالع ہو کر آتا ہے
دیکھ لیا جو اُن نے کبھو تو اس سادہ کی شامت ہے

چھوڑو اس اوباش کا ملنا ورنہ سر کٹواؤ گے
جاہ رہو گے بہتروں کو سر جو میر سلامت ہے

اے پریشاں ربط دیکھیں کب تلک یہ دور ہے
ہر گلی کوچے میں تیرا اک دعاگو اور ہے

بال بل کھائے ہوئے پیچوں سے پگڑی کے گتھے
طرز کیں چتون کی بانکی سر میں شور جور ہے

ہم سے یہ انداز اوباشانہ کرنا کیا ضرور
آنکھ ٹیڑھی خم ہے ابرو طور کچھ بیطور ہے

طبع درہم وضع برہم زخم غائر چشم تر
حال بد میں بیکسوں کی کچھ تمھیں بھی غور ہے

کیا شکایت کریے اُس خورشید چہرہ یار کی
مدہ بد سوں نہیں کرتا ستم فی الفور ہے

وصل کی دولت گئی ہوں تنگ فقر جبر میں
یا الٰہی فضل کر یہ میر بعد الکور ہے

اسکے دیوانے کے سر پر داغ سودا ہے جو میر
وہ مخبط عاشقوں کا اس سبب سر دور ہے

گردن کشِ زمانہ تو تیرا اسیر ہے
سلطانِ عصر تیری گلی کا فقیر ہے

چشمک کرے ہے میری طرف تو نگاہ کر
وہ طفلِ شوخ چشم قیامت شریر ہے

تنکا سا ہو رہا ہے تن آگے ہی سوکھ کر
اب تنگ کیا فقیر جو سب میں حقیر ہے

جھڑ باندھ دے ہے رونے جو لگتا ہے صبح کو
ہے چشمِ تر کہ غیرتِ ابرِ مطیر ہے

اک دو اجل رسیدہ جو صید آئے کب کھنچا
پر پیچ جال گیسوؤں کا جگر گیر ہے

جوں جوں بڑھاپا آتا ہے جاتے ہیں بیٹھتے
کس مٹی کا نہ جانیئے اپنا خمیر ہے

اس خوبصورتی سے نہ صورت نظر پڑی
سو رت تلک تو سیر کی وہ بے نظیر ہے

پر جوہر اسکی تیغ ہے نامہ برائے قتل
پیغامِ مرگ عاشقوں کو اس کا تیر ہے

پوچھو اسی سے مضطرب الحال دل کی کچھ
آہ آفتاب چہرۂ روشن ضمیر ہے

جوں طفلِ شوخ و شنگ وجوان بلند طبع
شائستۂ فلک ہے اگر چرخِ پیر ہے

فریاد شب کی سن کے کہا بیدماغ ہو
دیکھو تو اس بلا کو یہ شاید کہ میر ہے

ان بلاؤں سے کب رہائی ہے
عشق ہے فقر ہے جدائی ہے

دیکھیے رفتہ رفتہ کیا ہووے
ہم بھی چلنے کو ہیں کہ آئی ہے

استخواں کانپ کانپ جلتے ہیں
عشق نے آگ یہ لگائی ہے

دل کو کھینچے ہے چشمکِ انجم
آنکھ ہم نے کہاں لڑائی ہے

اس صنایع کا اس بدایع کا
کچھ تعجب نہیں خدائی ہے

نہ تو جذبِ رسا نہ بختِ رسا
کیونکہ کہیئے کہ واں رسائی ہے

ہے تصنع کہ اسکے لب ہیں لعل
سب نے اک بات یہ بنائی ہے

کیا کہوں خشمِ عشق سے جو مجھے
کبھو جھنجھلاہٹ آہ آئی ہے

ایسا چہرے پہ ہے نہوں کا خراش
جیسے تلوار منھ پہ کھائی ہے

میں نہ آتا تھا باغ میں اُس بن
مجکو بلبل پکار آئی ہے

آئی اُس جنگ جو کی گر شبِ وصل
شام سے صبح تک لڑائی ہے

اور کچھ مشغلہ نہیں ہے ہمیں
گاہ ہے گہ غزل سرائی ہے

[illegible]

توڑ کر آئینہ نہ حیا نا یہہ — کہ یہاں صورت آشنائی ہے
گل قفس تک نسیم لائی ہے — بو کہ پھر کر بہار آئی ہے
عشق دریا ہے ایک لنگر دار — تہ کسو نے نہ اُس کی پائی ہے
وہ نہ شرمائے کب تلک آخر — دوستی یاری آشنائی ہے
وے نہیں تو اُنھوں کا بھائی اور — عشق کرنے کی کیا منائی ہے
بیستوں کو ہکن نے کیا توڑا — عشق کی زور آزمائی ہے
بھیڑیں ٹلتی ہیں اُسکے ابرو سے — چلی تلوار تو صفائی ہے
لڑکا عطار کا ہے کیا معجون — ہمکو ترکیب اُسکی بھائی ہے
کچھ دی یار کی نہیں جاتی — یہی بے طور بے ادائی ہے
آنے کہتا ہے پھر نہیں آتا — یہی بدعہدی بے وفائی ہے
کر چلو نیکی ابتو جس تس سے — شاید اس ہی میں کچھ بھلائی ہے

برسوں میں میر سے ملے تو کہا
اس سے پوچھو کہ یہ کجائی ہے

یارب کوئی دیوانہ بے ڈھنگ سا آجاوے — اغلال و سلاسل ٹک اپنی کبھی ہلا جاوے
خاموش رہیں کبتک زندان جہاں میں ہم — ہنگامہ قیامت کا شورش سے اُٹھا جاوے
کب عشق کی وادی ہے سر کھینچنے کی جاگہ — ہو سیل بھلا سا تو منھ موڑ چلا جاوے
عاشق میں ہے اور اس میں نسبت سگ آہو کی — جوں جوں ہو رمیدہ وہ توں توں یہ لگا جاوے
افسوس کی جاگہ ہے یاں باز پسیں دم میں — ہو روبرو آئینہ وہ منھ کو چھپا جاوے
ان نو خطوں سے میری قسمت میں تو تھی خواری — کس طرح لکھا میرا کوئی آکے مٹا جاوے
دیکھ اُسکو ٹھہر رہنا ثابت قدموں سے ہو — اس راہ سے آوے تو ہم سے نہ رہا جاوے
کھینچے جہاں کرتا ہو تا شیر سخن کچھ بھی — وہ بات نہیں سنتا کیا اس سے کہا جاوے
یہ رنگ رہے دیکھیں تا چند کہ وہ گھر سے — کھاتا ہوا پان آکر باتوں کو چبا جاوے
ہم دیر کے جنگل میں بھولے پڑے ہیں کب کے — کعبے کا نہیں رستا خضر آکے بتا جاوے
ہاتھوں گئے خوباں کی کچھ نہیں پھر ملتی — کیونکر کوئی اب ان سے دل میرا دلا جاوے
یہ ذہن وذکا اُسکا تائید اُدھر کی ہے — ٹک ہونٹھ ہلے تو وہ تہ بات کی پا جاوے

[illegible]

یوں خط کی سیاہی ہے گرد اُس رخِ روشن کے
ہر جا طرف گل ہے جوں بدر گہنا جاوے

کیا اُسکی گلی میں ہے عاشق کسو کی رویت
آلودۂ خاک آوے تو لہو میں نہا جاوے

ہے حوصلہ تیرا ہی جو تنگ نہیں آتا
کس سے یہ ستم ورنہ اے میر سہا جاوے

تیرے بندے ہم ہیں خدا جانتا ہے
خدا جانے تو ہم کو کیا جانتا ہے

نہیں عشق کا درد لذت سے خالی
جسے ذوق ہے وہ مزا جانتا ہے

ہمیشہ دل اپنا جو بیجا ہے اس بن
مرے قتل کو وہ بجا جانتا ہے

گئے زیرِ برقع گئے گیسوؤں میں
غرض خوب وہ منھ چھپا جانتا ہے

مجھے جانتا ہے آپ سا ہی فریبی
دغا کو بھی میری دغا جانتا ہے

جفا اُس پہ کرتا ہے حد سے زیادہ
جنھیں یار اہلِ وفا جانتا ہے

لگاوے ہے جھمکے دکھا کر اُسی کو
جسے منفعجہ پارسا جانتا ہے

اُسے جب نہ تب ہنسے بگڑا ہی پایا
یہی اچھے مُنھ کو بنا جانتا ہے

بلا شور انگیز ہے چال اُس کی
اسی طرز کو خوش نما جانتا ہے

نہ گرمی جلاتی تھی ایسی نہ سردی
مجھے یار جیسا جلا جانتا ہے

یہی ہے سزا چاہنے کی ہمارے
ہمیں کشتہ خوں کی سزا جانتا ہے

مرے دل میں رہتا ہے تو ہی تو ہی تو
جو کچھ دل کا ہے مدعا جانتا ہے

پری اُسکے سایہ کو بھی لگ سکے نہ
وہ اس جنس کو کیا بلا جانتا ہے

جہاں میر عاشق ہوا خوار ہی تھا
یہ سودائی کب دل لگا جانتا ہے

یہی عشق ہے جی کھپا جانتا ہے
کہ جاناں سنتے جی بھی ملا جانتا ہے

بدی میں بھی کچھ خوبی ہووے گی تب تو
بُرا کرنے کو وہ بھلا جانتا ہے

مرا شعر اچھا بھی دانستہ ضد سے
کسو اور ہی کا کہا جانتا ہے

زمانے کے اکثر ستمگار دیکھے
وہی خوب طرزِ جفا جانتا ہے

نہیں جانتا حرفِ خط کیا ہیں سیکھے
لکھے کو ہمارے مٹا جانتا ہے

نہ جانے جو بیگانہ تو بات پوچھے
سو مغرور کب آشنا جانتا ہے

نہیں اتحادِ تن و جاں سے واقف
ہمیں یار سے جو جدا جانتا ہے

دیوان ششم

میر تقی میر دہلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فلک نے پیس کر سرمہ بنایا
نظر میں اس کی میں تو بھی نہ آیا

زمانے میں مرے شورِ جنوں نے
قیامت کا سا ہنگامہ اٹھایا

بلا تھی کوفت کچھ سوزِ جگر سے
ہمیں تو کوٹ کوٹ ان نے جلایا

تمامی عمر جس کی جستجو کی
اسے پاس اپنے اکدم بھی نہ پایا

نہ تھی بیگانگی معلوم اس کی
نہ سمجھے ہم اسی سے دل لگایا

قریبِ دیر خضر آیا تھا لیکن
ہمیں رستہ نہ کعبے کا بتایا

حقِ صحبت نہ طیروں کو رہا یاد
کوئی دو پھول اسیروں تک نہ لایا

غرورِ حسن اس کا دشمنا ہے
ہمارا عشق اسے کن نے جتایا

عجب نقشہ ہے نقاشِ ازل نے
کوئی ایسا نہ چہرہ پھر بنایا

علاقہ میرؔ تھا خنجر سے اس کے
نداں اپنا گلا ہم نے کٹایا

اپنے ہوتے تو با عتاب رہا
بے دماغی سے با خطاب رہا

ہو گئے بے پردہ ملتفت بھی ہوا
ناکسی سے ہمیں حجاب رہا

نہ اٹھا لطف کچھ جوانی کا
کم بہت موسمِ شباب رہا

کارواں ہائے صبح ہوتے گیا
میں ستم دیدہ محوِ خواب رہا

ہجر میں جی ڈہا گرے ہی رہے
ضعف سے حالِ دل خراب رہا

گھر سے آئے گلی میں سو بار سے
یار بن دیر اضطراب رہا

ہم سے سلجھے نہ اُسکے اُلجھے بال ‌ — جان کو اپنی پیچ و تاب رہا

پردے میں کام یاں ہوا آخر — واں سدا چہرے پر نقاب رہا

سوزشِ سینہ اپنے ساتھ گئی — خاک میں بھی ہمیں عذاب رہا

حیف ہے میر کی جناب سے میاں
ہم کو ان سمجھے اجتناب رہا

بیطاقتی نے دل کی گرفتار کردیا — اندوہِ دردِ عشق نے بیمار کردیا

دروازے پر کھڑا ہوں کئی دن سے یار کے — حیرت نے عشق کی مجھے دیوار کردیا

سائے کو اُسکے دیکھ کے وحشت بلا ہوئی — دیوانہ مجھکو جیسے پریدار کردیا

نسبت ہوئی گناہوں کی زیں بیطرف — بیجرم اُن نے مجھکو گنہگار کردیا

دن رات اُسکو ڈھونڈھے ہے دل شوق نے مجھے — نایاب کس گہر کا طلبگار کردیا

دور اُس سے زار زار جو روتا رہا ہوں میں — لوگوں کو میری زاری نے بیزار کردیا

خوبی سے بخت بد کی اُسے عشق سے مرے — یاروں نے رفتہ رفتہ خبردار کردیا

جھمکے لگائی جی میں نہ اُس کی ہوس رہی — یعنی کہ ایک وار ہی میں پار کردیا

پہلو میں دل نے لوٹئے آتش سے شوق کی — پایانِ کار آنکھوں کو خونبار کردیا

کیا جانوں عشق جان سے کیا چاہتا ہے میر
خونریزی کا مجھے تو سزاوار کردیا

سوئے ہم حسن کی خاطر بیوفا تھا — نہ جانا اُن نے تو یوں بھی کہ کیا تھا

معالج کی نہیں تقصیر ہرگز — مرض ہی عاشقی کا لا دوا تھا

نہ خود سر کیوں کہ ہم ہوں یار اپنا — خود آرا خود پسند و خود ستا تھا

رکھا تھا منھ کبھو اس کنج لب پر — ہمارے ذوق میں اب تک مزا تھا

نہ لیو چاہنے والے سے اپنے — نہ جانا تجھسے یہ کن نے کہا تھا

پریشاں کر گئی فریادِ بلبل — کسو سے دل ہمارا پھر لگا تھا

ملے برسوں وہی بیگانگی تھی — ہمارے زعم میں وہ آشنا تھا

نہ دیوانے تھے ہم سے قیس و فرہاد — ہمارا طورِ عشق اُن سے جدا تھا

بدن میں صبح سے تھی سنسناہٹ — کہیں سناہٹوں میں جی چلا تھا

صنم خانے سے اٹھ کعبے گئے ہم ... کوئی آخر ہمارا بھی خدا تھا
بدن میں اسکے ہے ہر جائے دلکش ... جہاں آنکا کسو کا دل بجا تھا
کوئی عنقا سے پوچھے نام تیرا ... کہاں تھا جبکہ میں رسوا ہوا تھا

چڑھی تیوری چمن میں میر آیا
گل حسن آج شاید کچھ خفا تھا

سوز دروں سے مجھ پہ ستم برملا ہوا ... ٹکڑا جگر کا آنکھوں سے نکلا جلا ہوا
بدحال ہو کے چاہ میں مرنے کا لطف کیا ... دن کٹتے جو موا کوئی عاشق بھلا ہوا
نکلا گیا نہ دام سے پرپیچ زلف کے ... اے وائے یہ بلا زدہ دل مبتلا ہوا
کیا اور لکھیے کیسی خجالت مجھے ہوئی ... سر کو جھکائے آیا جو قاصد چلا ہوا

رہتا نہیں تڑپنے سے ٹک ہاتھ کے تلے
کیا جانوں میر دل کو مرے کیا بلا ہوا

جمع اس کے نکلے عالم ہو گیا ... جب تلک ہم جائیں ادھم ہو گیا
گو پریشاں ہو گئے گیسوئے یار ... حال ہی اپنا تو درہم ہو گیا
کیا کہوں کیا طرح بدلی یار نے ... چاؤ تھا دل میں سو اب غم ہو گیا
کیا کہوں مشکل ہوئی تحریر حال ... خط کا کاغذ رونے سے نم ہو گیا
دم دیئے بہتیرے یاروں نے دلے ... خشک نے سا شیخ بے دم ہو گیا
کیوں نہ دیکھیں ہم برہم اپنا ہو مزاج ... بات کہتے یار برہم ہو گیا
باغ جیسے زاغ وحشت گاہ ہے ... یاں سے شاید گل کا موسم ہو گیا

کیا نماز اے میر اس اوقات کی
جب کہ قد محراب سا خم ہو گیا

وہ دیکھنے ہمیں ٹک بیماری میں نہ آیا ... سو بار آنکھیں کھولیں بالیں سے سر اٹھایا
گلشن کے طائروں نے کیا بیمروتی کی ... یک برگ گل قفس میں ہم تک نہ کوئی لایا
سب پیچ اس کا خفتہ یار و بلائے جاں ہے ... ہرگز منا نہ ہم سے بہتیرا ہی منایا
قد بلند اگر چہ بے لطف بھی نہیں ہے ... سرو چمن میں لیکن انداز وہ نہ پایا

۵۱ میر تقی سے حق صحبت نہ خیروں کو رہا یاد ÷ کوئی دو پھول اسیروں تک نہ لایا +

انگڑاتے خوبرویاں حسرت سے پیش و پس ہیں
ایذا بھرے ہے ہر سو جب اس پری کا سایا

نقشہ عجب ہے اس کا نقاش نے ازل کے
مطبوع ایسا چہرہ کوئی نہ پھر بنایا

شب کو نشے میں باہم تھی گفتگو سے درہم
اس مست نے جھنکایا یعنی بہت جھکایا

دل بستگی میں کھلنا اس کا نہ اس سے دیکھا
بخت نگوں کو ہم نے سو بار آزمایا

عاشق جہاں ہوا ہے بے ڈھنگیاں ہی کی ہیں
اس میر بیخرد نے کب ڈھب سے دل لگایا

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
پڑھتے کسو کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

سعی و تلاش بہت سی رہے گی اس انداز کے کہنے کی
صحبت میں علما فضلا کی جا کر پڑھیے گنیے گا

دل کی تسلی جبکہ ہوگی گفت و شنود سے لوگوں کی
آگ پھنکے گی غم کی بدن میں اس میں جلیے بھنیے گا

گرم اشعار میر درونہ داغوں سے یہ بھر دیں گے
زرد رو شہر میں پھریے گا گلیوں میں نے گل چنیے گا

تھا اندوہ گرہ مدت سے دل میں خوں ہو درد ہوا
چاہ نے بدلے رنگ کئی اب جسم سراسر زرد ہوا

وعدہ خلافی اس ظالم کی کھا گئی میری جان غمیں
گرمی کرے وہ مجھ سے جب تک تب تک میں ہی سرد ہوا

گرد و غبار دشت و وادی گریے سے میرے یکسو ہیں
رونے کے آگے ان کے تو دریا بھی میر اب گرد ہوا

میں رنج عشق کھینچے بہت ناتواں ہوا
مرتا تمام ہو نہ سکا نیم جاں ہوا

بستر سے اپنے اٹھ نہ سکا شب ہزار حیف
بیمار عشق چار ہی دن میں گراں ہوا

شاید کہ دل تڑپنے سے زخم دروں پھٹا
خوناب میری آنکھوں سے منھ پر رواں ہوا

غیر از خدا کی ذات مرے گھر میں کچھ نہیں
سینے کہ اب مکان مرا لا مکاں ہوا

مستوں میں اس کی کیسی تعیں سے ہے نشست
شیشہ ہوا نہ کیف کا پیر مغاں ہوا

سائے میں تاک کے مجھے رکھا اسیر کر
صیاد کے کرم سے قفس آشیاں ہوا

ہم نے نہ دیکھا اس کو سو نقصان جاں کیا
ان نے جو اک نگاہ کی اس کا زیاں ہوا

تک رکھیے ہاتھ تن میں نہیں ورنہ جائے زخم
بس میرے دل کا یار جی اب امتحاں ہوا

۔ ا میر تقی میر ۔ ۲ عجب نقشہ ہے نقاش ۔ ۔ ۔ کوئی ایسا نہ چہرہ پھر بنایا ۱۲

دے تو ٹکڑے ٹکڑے مرے گھر آ کے پھر گئے
ہیں بے دیار و بیدل و بے خانماں ہوا

گردش نے آسماں کے عجائب کیا سلوک
پیر کبیر جب میں ہوا وہ جواں ہوا

مرغ چمن کی نالہ کشی کچھ خنک سی تھی
میں آگ دے چمن کو جو گرم فغاں ہوا

وہ پھول لا کے پھینک دیے میری گور پر
یوں خاک میں ملا کے مجھے مہرباں ہوا

سر کھینچا دود دل نے جہاں تیرہ ہو گیا
دم بھر میں صبح زیر فلک کیا سماں ہوا

کہتے ہیں میر سے کہیں اوباش لڑ گئے
ہنگامہ ان سے ایسا الٰہی کہاں ہوا

جس رفتنی کو عشق کا آزار ہو گیا
دو چار دن میں برسوں کا بیمار ہو گیا

نسبت بہت گناہوں کی میری طرف ہوئی
ناکردہ جرم میں تو گنہگار ہو گیا

حیرت زدہ میں عشق کے کاموں کا ہو رہے
دروازے پر کھڑے کھڑے دیوار ہو گیا

پھیلے شگاف سینے کے اطراف در دے
کوچہ ہر ایک زخم کا بازار ہو گیا

بازار میں جہاں کے نہ حسن کیا متاع
سو جی سے جس نے دیکھا خریدار ہو گیا

دل لے کے میری جان کا دشمن ہوا ان
جس بیوفا سے اپنے تئیں پیار ہو گیا

عاشق کو اسکی تیغ سے بے لاگ کھینچتے ہی
یہ کشتنی بھی مرنے کو تیار ہو گیا

مرتے موا رہا نہ ہوا تنگ ہی رہا
پھندے میں عشق کے جو گرفتار ہو گیا

کیا جرم تھا کسو پہ نہ معلوم کچھ ہوا
جو میر کشتۂ خوں کا سزاوار ہو گیا

دشمن ہو جی کا گاہک ہوتا ہے جس کو چاہا
کی دوستی کہ درد اک روگ میں بسایا

جی ہے جہاں قیامت درد و الم رہا واں
بیمار عاشقی میں شب صبح تک کراہا

تازہ جھلک تھی شب کو تاروں میں آسماں کے
جس آسیا کو شاید پھر سر کسو نے راہا

خمیازہ کش ہوں اسکی مدت سے اس ادا کا
تک کر گئے ہے میرے انگڑائی لے جاہا

جانا کہ منھ کھلا ہے آتشکدے کا اب یہ
سینے کے زخم کا جو سر کا ہے ٹک بھی پھاہا

آنکھیں مری لگو ہیں بیجا نہیں گئیں ہیں
دیکھا ہے جن نے اسکو اسنے مجھے سراہا

ہیں راہ عشق میں تو آگے ہی درد لا تھا
پیچ پیچ پیش آیا ان زلفوں کا دوراہا

کرنا وفا نہیں ہے آسان عاشقی میں
پھنس کر گیا جگر کو تب چاہ کو نباہا

کہتے تو تھے نہ دیکھو اُس سے لگے نہ جاؤ
سمجھے نہ دیدہ و دل اب کیا کروں الٰہا

یا مرتضیٰ علیؑ ہے تیرا گدائے در یہ
کر حال میر پر بھی ٹک التفات شاہا

بلبل کا شور سن کے نہ مجھ سے رہا گیا
میں بے دماغ باغ سے اُٹھ کر چلا گیا

لوگوں نے پائی راکھ کی ڈھیری مری جگہ
اک شعلہ میرے دل سے اُٹھا تھا جلا گیا

چہرے پہ بال بکھرے رہے سب شب وصال
یعنی کہ بے مروتی سے منھ چھپا گیا

چلتا ہوا تو قافلۂ روزگار سے
میں جوں صدا جرس کی اکیلا جدا گیا

کیا بات رہ گئی ہے مرے اشتیاق سے
رقعہ کے لکھتے لکھتے ترسّل لکھا گیا

سب زخم صدر اُن نے نمک بند خود کیے
صحبت جو بگڑی اپنے میں سارا مزا گیا

سارے حواس میرے پریشاں ہیں عشق میں
اس راہ میں یہ قافلہ سارا لٹا گیا

بادل گرج گرج کے سناتا ہے یعنی یاں
نوبت سے ہر کوئی نئی نوبت بجا گیا

وے محو ناز ہی رہے آئے نہ اس طرف
میں منتظر تو جی سے گیا ان کا کیا گیا

دل دے کے جان میر نے پایان کار دی
یہ سادہ لوح طرح نئی دل لگا گیا

میں ہوں خاک افتادہ جس آزار کا
عشق بھی اُس کا ہے نام اک پیار کا

بیچتا سر کیوں نہ گلیوں میں پھروں
میں ہوں خواہاں لطف تہ بازار کا

خون کر کے ٹک نہ دل اُن نے لیا
کشتۂ دم مردہ ہوں اس اسرار کا

گھر سے وہ معمار کا جو اُٹھ گیا
حال ابتر ہو گیا گھر بار کا

نقل اس کی بیوفائی کی ہے اصل
کب وفاداری ہے شیوہ یار کا

سر جو دے دے مارتے گھر میں پھرے
رنگ دیگر ہے در و دیوار کا

اک گدائے در ہے سیلاب بہار
غم کشوں کے دیدۂ خونبار کا

دلبراں دل جنس ہے گنجائشی
اس میں کچھ نقصاں نہیں سرکار کا

عشق کا مارا ہے کیا بچے گا میر
حال ہے بدحال اس بیمار کا

جو تو ہی صنم ہم سے بیزار ہوگا
تو جینا ہمیں اپنا دشوار ہوگا

الم ہجر رکھے گا بیتاب دل کو
ہمیں کڑھتے کڑھتے کچھ آزار ہوگا

جو افراطِ الفت ہے ایسا تو عاشق
کوئی دن میں برسوں کا بیمار ہوگا

اچٹتی ملاقات کب تک رہے گی
کبھو تو تہِ دل سے بھی یار ہوگا

تجھے دیکھ کر لگ گیا دل نہ جانا
کہ اس سنگدل سے ہمیں پیار ہوگا

لگا کرنے ہجران سختی سے سختی
خدا جانے کیا آخر کار ہوگا

یہی ہوگا کیا ہوگا میر ہی نہ ہونگے
جو تو ہوگا بے یار غمخوار ہوگا

دیر بد عہد وہ جو یار آیا
دور سے دیکھتے ہی پیار آیا

بے قراری نے مار رکھا ہمیں
اٹھو اسکے تئیں قرار آیا

گرد رہ اُسکی اب اُٹھو نہ اُٹھو
میری آنکھوں ہی پر غبار آیا

اک خزاں میں نہ طیر بھی بولا
بل چمن میں بہت پکار آیا

بار کرنیں تو کا تما نقش نکلا
وہ قماری کے گلے کا ہار آیا

طائر عمر کو نظر میں رکھ
غیب سے ہاتھ یہ شکار آیا

موسم آیا تو نخل دار میں میر
سرِ منصور ہی کا بار آیا

زمانہ ہجر کا آسان کیا بسر آیا
ہزار مرتبہ منہ تک مرے جگر آیا

رہیں جو منتظر آنکھیں غبار لائیں وے
وہ انتظار کشوں کو نہ ٹک نظر آیا

ہزار طرح سے آوے گھڑی جدائی میں
ملاپ جس سے ہوا ایسا نہ یک ہنر آیا

ملا جو عشق کے جنگل میں خضر میں نے کہا
کہ خوفِ شیر ہے مخدوم یاں کدھر آیا

سیہ لہر آئی گئی زور کالے پانی تک
محیط اس مرے رونے کو دیکھ تر آیا

نثار کیا کریں ہم خانماں خراب اسیر
کہ گھر لٹا چکے جب یار اپنے گھر آیا

نہ روؤں کیونکہ علی الاتصال اس بن میں
کہ جی کے رندھنے سے جوں ابر جی بھر آیا

جوان مارے ہیں ڈھنگی ہی سے ان نے بہت
ستم کی مشق کی پہ خون اُسے نہ کر آیا

لچک کمر کی جو یاد آوے اُسکی بر آوے
کہ پانی میر کے اشکوں کا تا کمر آیا

ہو کوئی اُس بیوفا دلدار سے کیا آشنا
آشنا رہ برسوں جو اک دم میں ہو نا آشنا

قدر جانو کچھ ہماری ورنہ پچھتاؤ گے تم
پھر نہیں ملنے کا تم کو کوئی ہم سا آشنا

باغ[1] کو بے لالہ و گل دیکھ کہتے تھے طیور
جھڑ گئے پت جھڑ میں اک ہی ہائے کیا کیا آشنا

اب جو تو لڑکا نہیں عشق و ہوس میں کر تمیز
آشنا سے فرق ہوتا ہے بہت نا آشنا

ملتے ملتے منہ چھپانا بھی لطیفہ ہے نیا
آشنائی یا نہ کریے ہوجیے یا آشنا

تھا[2] جنوں کا لطف مجنوں سے سو دنیا سے گیا
مغفرت ہو اُسکو وحشی ہم سے بھی تھا آشنا

اب جو ہاتھ آئے ہیں ہم مت مفت کھو دیجو ہمیں
پھر نہ ہوگا تمکو ایسا کوئی پیدا آشنا

کیسا ہی بانی ہو اُس کو پیری میں جاتا ہے بیر
تھا جوانی میں مگر تو میر دانا آشنا

دریا

گئے تھے سیر چمن کو اُٹھ کر گلوں میں ٹک جی لگا نہ اپنا
تلاش جوشش بہاریں کی نگار گلشن میں تھا نہ اپنا

ملا تو تھا وہ بخواہش دل مزہ بھی ملنے سے لیکن
پھریں جو مستی میں اُس کی آنکھیں سو ہوش ہمکو رہا نہ اپنا

جہاں کا دریائے بیکراں تو سراب پایان کار نکلا
جو لوگ تہ سے کچھ آشنا تھے اُنھوں نے لب تر کیا نہ اپنا

نکالی سرکش نے چال ایسی کہ دیکھ حیرت سے رہ گئے ہم
دلوں میں کیا کیا ہمارے آیا کریں سو کیا بس چلا نہ اپنا

کہے بھی کوئی تو اس سے جس میں سخن کسو کا اثر کرے کچھ
بکا کیے ہم ہمیشہ مانا کسو دن اُن نے کہا نہ اپنا

نہ ہوش ہم کو نہ صبر دل کو نہ شور سر میں نہ زور پا میں
جو روویں کس کس کو رو ویں اب ہم وفا میں کیا کیا گیا نہ اپنا

جہاں میں رہنے کو جی بہت تھا نہ کر سکے میر کچھ توقف
بنا تھی ناپائدار اس کی اسی سے رہنا بنا نہ اپنا

[1] صائب سہ تا بجاں ما ہمدمیم و تا بمنزل دیگراں ؛ فرق باشد جان ما از آشنا تا آشنا ؛
[2] میر تقی سہ داغ ہے تاباں علیہ الرحمہ کا چھاتی پہ میر ؛ ہو نجات اُسکو بچارا ہم سے بھی تھا آشنا ؛

پڑا تھا شور جیسا ہر طرف اُس لاابالی کا
رہا ویسا ہی ہنگامہ مری بھی زار نالی کا

رہے بدحال صوفی حال کرتے دیر مجلس میں
مغنی سے سُنا مصرع جو میرے شعر حالی کا

نظر بھر دیکھتا کوئی تو تم آنکھیں چھپا لیتے
سماں اب یاد ہوگا کب تمھیں وہ خورد سالی کا

چمک یاقوت کی چلتی ہے اتنی دور کا ہے کو
اچنبھا ہے تر بازوں کو ان ہونٹوں کی لالی کا

پھرے بستی میں رویت کچھ نہیں افلاس سے اپنی
الٰہی ہووے منھ کالا شتاب اس دست خالی کا

دماغ اپنا تو اپنی فکر میں ہی ہو چکا یکسر
خیال اب کس کو ہے اے ہمنشیں نازک خیالی کا

ذلیل و خوار ہیں ہم آگے خوباں کے ہمیشہ سے
پرکھا کچھ نہیں ہے ہم کو ان کی جھڑکی گالی کا

ڈرو جو تم کو چسپاں اختلاطی تم سے ہو مجھ کو
تشتت کیا ہے میری دور کی منھ دیکھا بھالی کا

نہ پہنچے جو دعا اے میر واں تک کیا عجب کیا ہے
علوِّ مرتبہ ہے بسکہ اس درگاہ عالی کا

دل جو ناگاہ بے قرار ہوا
اس سے کیا جانوں کیا قرار ہوا

شب کا پہنا جو دن تلک ہے گُہر
یار اُسکے گلے کا ہار ہوا

گرد سر اس کے جو پھرا میں بہت
رفتہ رفتہ مجھے دوار ہوا

بستر خواب سے جو اُسکے اُٹھا
گل تر سوکھ سوکھ خار ہوا

مجھسے لینے لگے ہیں عبرت لوگ
عاشقی میں یہ اعتبار ہوا

روز و شب روتے کڑھتے گزرے ہے
اب یہی اپنا روزگار ہوا

روؤں کیا اپنی سادگی پہ میر
میں نے جانا کہ مجھ سے یار ہوا

جس ستمدیدہ کو اس عشق کا آزار ہوا
ایک دو دن ہی میں وہ زار و زبوں خوار ہوا

روز بازار میں عالم کے عجب شئے ہے حسن
بک گیا آپ ہی جو اس کا خریدار ہوا

دھوپ میں آگے کہ ٹک اُسکے جدا کرتا ہوں
چاہ کر اُسکے تئیں میں تو گنہگار ہوا

ہوش کچھ ٹکسے سروں میں تھا شتابی چیتے
حیف صد حیف[1] کہ میں دیر خبردار ہوا

ہو نجود تو کسو کو ڈھونڈ نکالے کوئی
وہی خود گم ہوا جو اُس کا طلبگار ہوا

مرغ دل کی ہو رہائی سے مراد اس سمجھ
پُرشکن بالوں میں وہ اُسکے گرفتار ہوا

پیار کی دیکھی جو چتون کسو کی میں جانا
کہ یہ اب سادہ و پرکار مرا یار ہوا

[1] حیف صد حیف کہ دیر خبردار شدیم ۱۲

تکیہ اس پہ جو کیا تھا سو گرا بستر پہ
یعنی میں شوق کی افراط سے بیمار ہوا

کیونکہ شب عمر صعوبت میں کٹی تیری میر
اپنا جینا تو کوئی دن ہمیں دشوار ہوا

آج اُس خوش پرکار جواں مطلوب حسیں نے لطف کیا
پیر فقیر اس بے دنداں کو اُس نے دنداں مُزد دیا

آنسو کی بوند آنکھوں سے دونوں اب تو نکلتی ایک نہیں
دل کی طپیدن روز و شب نے خوب جگر کا لوہو پیا

مرتے جیسے صبر کیا تھا ویسی ہی بے صبری کی
ہائے دریغ افسوس کوئی دن اور نہ یہ بیمار جیا

ہاتھ رکھے رہتا ہوں دل پہ برسوں گزرے ہجراں میں
ایک دن اُن نے گلے سے مل کر ہاتھ میں میرا دل نہ لیا

اب یار وہ بہر کو کھڑ اٹک جویاں رہا
حیرت سے آفتاب جہاں کا تہاں رہا

جو قافلے گئے تھے اُنھوں کی اُٹھی بھی گرد
کیا جانیے غبار ہمارا کہاں رہا

سوکھی پڑی ہیں آنکھیں مری دیر سے جواب
سیلاب ان ہی رخنوں سے مدت رواں رہا

اعضا گداز عشق سے ایک ایک بہ گئے
اب کیا رہا ہے مجھ میں جو میں نیم جاں رہا

منعم کا گھر تمادی ایام میں بنا
سو آپ ایک رات ہی واں میہماں رہا

اُسکے فریب لطف پہ مت جا کہ ہمنشیں
وہ دیر میر سے حال پہ بھی مہرباں رہا

اب در پہ اُس کے گھر کے گرا ہوں گر نہ میں
مدت خرابہ گرد ہی بے خانماں رہا

ہے جان تو جہاں ہے مشہور ہے مثل
کیا ہے گئے یہ جان کے گو پھر جہاں رہا

ترکِ شراب خانہ ہے پیری میں ورنہ میر
ترسا بچوں ہی میں رہا جب تک جواں رہا

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا
بہت عالم کرے گا غم ہمارا

پڑھینگے شعر رو رو لوگ بیٹھے
رہے گا دیر تک ماتم ہمارا

نہیں ہے مرجع آدم اگر خاک
کدھر جاتا ہے قدِ خم ہمارا

زمین و آسماں زیر و زبر ہے
نہیں کم حشر سے اودھم ہمارا

[illegible]

ا؎ زندہ در عشق چناں بود نصیبی مجنوں ؛ پیش ازیں عشق مگر اینہمہ دشوار نبود ؛ (نصیبی) ۲ ا؎ دنداں ۰

کسو کے بال درہم دیکھتے میر
ہوا ہے کام دل برہم ہمارا

ردیف بائے موحدہ

ہے عشق میں جو حال ترا تو ہے کیا عجب
مرجائے کوئی خستہ جگر تو ہے کیا عجب

لیجا کے نامے کتنے کبوتر ہوئے ہیں ذبح
اڑتی سی ہمکو آوے خبر تو ہے کیا عجب

شبہائے تار و تیرہ زمانے میں دن ہوئیں
شب ہجر کی بھی ہووے سحر تو ہے کیا عجب

جیسے ہے رخنہ رخنہ یہ چرخ اثیر سب
اس آہ کا ہو اس میں اثر تو ہے کیا عجب

جاتی ہے چشم شوق کسو کی ہزار جا
آوے ادھر بھی اسکی نظر تو ہے کیا عجب

نقش ملک سنے ہووے لچک اس کمر کی دیکھ
عاشق سے جو بندھے نہ کمر تو ہے کیا عجب

ترک وطن کیا ہے عزیزوں نے چاہ میں
گرجائے کوئی رفتہ سفر تو ہے کیا عجب

برسوں سے ہاتھ مارتے ہیں سر پہ اس بغیر
ہووے بھی ہمسے دست بسر تو ہے کیا عجب

معلوم سودمندی عشاق عشق میں
پہونچے ہے اس سے ہمکو ضرر تو ہے کیا عجب

گھر بار میں لٹا کے گیا گھر سے بھی نکل
اب آوے وہ کبھو مرے گھر تو ہے کیا عجب

ملتی نہیں ہے آنکھ اس آئینہ رو کی میر
وہ دل جو سنے کے جاوے مکر تو ہے کیا عجب

آیا ہے شیب سر پہ گیا ہے شباب اب
کرنا جو کچھ ہو تم کو سو کر لو شتاب اب

بگڑا بنا ہوں[1] عشق سے سو بار عاقبت
پایا قرار یہ کہ رہوں میں خراب اب

خونریزی عاشقوں کی ہے ظالم اگر ثواب
تو تو ہوا ہے تجھکو بہت سا ثواب اب

بھڑکی درون میں آتش سوزندہ عشق کی
دل رہ گیا ہے پہلو میں ہو کر کباب اب

ہوں اس بہشتی رو سے جدا میں جحیم میں
رہتا ہے میری خاک کو ہر دم عذاب اب

قاصد جو آیا جیب سے نشاں خط کا کچھ نہیں
دیکھیں جو لاوے یار کوئی کیا جواب اب

کیا رنج و غم کو آگے ترے میں کروں شمار
یاں خود حسابی میری تو ہے بے حساب اب

جھپکی ہیں آنکھیں اور جھپکی آتی ہیں بہت
نزدیک شاید آیا ہے ہنگام خواب اب

آرام کریئے میری کہانی بھی ہو چکی
کرنے لگو گے ورنہ عتاب و خطاب اب

[1] شعر دل کی بستی اجڑا بسا تھمون میں
آخر اجاڑ دینا اس کا قرار پایا

جاناسبھوں نے یہ کہ تو معشوق میر ہے
خلع العذار سے یہ کیا ہے حجاب اب

منھ دھوتے[1] اُسکے آتا ہے اکثر آفتاب
دکھاوے گا آفتابہ کوئی خود سر آفتاب

سر صدقے تیرے ہونے کی خاطر بہت ہے گرم
وارا کرے ہے شام و سحر چکر آفتاب

ہر خانہ کیوں نہ صبح جہاں میں ہو پر فروغ
پھرتا ہی جھانکتا اُسی کو گھر گھر آفتاب

تجرید کا فراغ ہے اک دولت عظیم
بھاگے جو اپنے سائے سے بھی خوشتر آفتاب

نازک مزاج ہے تو کہیں گھر سے مت نکل
ہوتا ہے دوپہر کے تئیں سر پر آفتاب

پیدا ہے زور مشرق نو کی نمود سے
نکلے ہے کوئے یار سے بیچ بچکر آفتاب

ہو پست اُس کے نور کا زیر زمیں گیا
ہر چند سب ستاروں سے تھا برتر آفتاب

اُس رخ کی روشنی میں نہ معلوم کچھ ہوا
ہم گم کدھر ہوا ہے گیا کیدھر آفتاب

کس زور کش کی قوس قزح سی کمان ایک
جسکی اُٹھا سکا نہ کبھو سپر آفتاب

روشن ہے یہ کہ خوف ہے اُس غصہ ور کا میر
نکلے ہے صبح کانپتا تھر تھر آفتاب

آئینہ سا جو کوئی یاں آشنا صورت ہے اب
بے مروت اس زمانے میں ہمہ حیرت ہے اب

کیا کوئی یاری کسو سے کرکے ہووے شاد کام
دوستی ہے دشمنی الفت نہیں کلفت ہے اب

چاہتا ہے درد دل کرنا کسوں سے دل دماغ
سو دماغ اپنا ضعیف و قلب بے طاقت ہے اب

کیونکہ دنیا و دنیا رسوائی مری موقوف ہو
عالم عالم مجھ پہ اُسکے عشق کی تہمت ہے اب

اشک نومیدانہ پھرتے ہیں مری آنکھوں کے بیچ
میر یہ دسے ہے دکھائی جان کی رخصت ہے اب

مارے ہی ڈالے ہے جسکا زندگی میں اضطراب
ساتھ میرے دل گڑا تو آچکا مرنے کا خواب

ٹک ٹھہرتا بھی تو کہتے تھا کسو بجلی کی تاب
یا کہ نکہت گل کی تھا آیا گیا عہد شباب

کی نماز صبح کو کھو کر نماز اشراق کی
ہو گیا مجھ پر ستم اُچٹا نہ ٹک مستی میں خواب

دیکھنا منھ یار کا اس وجہ سے ہوتا نہیں
یا الٰہی دے زمانے سے اُٹھا رسم نقاب

ضعف ہی اُسکے مرض اور اُسکے غم سے الغرض
دل بدن میں آدمی کے ایک ہے خانہ خراب

یار میں ہم میں پڑا پردہ جو ہے ہستی ہے یہ
بیچ سے اُٹھ جائے تو ہووے ابھی رفع حجاب

[1] منھ دھوتے وقت اُسکے اکثر دکھائی دے ہے — خورشید لے رہا ہے ایک روز آفتابہ [illegible]

صورتِ دیوار سے مدت کھڑے در پر رہے
پر کبھو صحبت میں اُسکی ہم ہوئے نہ باریاب

مے سے توبہ کرنی ہی معقول اگر ہم جانتے
ہم پہ شیخ شہر برسوں سے کرے ہے احتساب

جمع تھے خوباں بہت لیکن پسند اس کو کیا
کیا غلط میں نے کیا اے میرؔ وقت انتخاب

اس مغل زادے نبھی ہر بات کی تکرار خوب
بد زبانی بھی کی اُن نے تو کہا بسیار خوب

لگ نہیں پڑتے ہیں لیکر ہاتھ میں شمشیر تیز
بیکسوں کے قتل میں اتنا نہیں اصرار خوب

آخر اِن خوباں نے عاشق جان کر مارا مجھے
چاہ کا اپنی نہ کرنا ان سے تھا اظہار خوب

آج کل سے مجھ کو بیتابی و بدحالی ہے کیا
کچھ مریضِ عشق کے کب سے نہ تھے آثار خوب

کیا کریمی اُسکی کہیے جنتِ دربستہ دی
ورنہ مفلس غم زدوں کے کچھ نہ تھے کردار خوب

مخترعِ جور و ستم میں بھی ہوا وہ نوجواں
ظلم تب کرتا ہے جب ہو کوئی منت دار خوب

دہر میں پستی بلندی برسوں تک دیکھی ہے میں
جب لٹا پامال سے میں تب ہوا ہموار خوب

کیا کسو سے آشنائی کی رکھے کوئی اُمید
کم ہو پہنچا ہے ہم دُنیا میں یارو یار خوب

کہتے تھے کس کے سے لے میرؔ مت کھا پیچ و تاب
آخر اس کوچے میں جا کھائی نہ تو نے مار خوب

ردیف تائے فوقانی

جو کوئی اس بیوفا سے دل لگاتا ہے بہت
وہ ستمگر اس ستمکش کو ستاتا ہے بہت

اُسکے سونے سے بدن سے کس قدر چسپاں ہے ہائے
جامہ کبرتی کسو کا جی جلاتا ہے بہت

کیا پس از چندے مری آوارگی منظور ہے
ہو پریشاں تب جو شب مجھ پاس آتا ہے بہت

چاہ میں بھی بیشتر جینے سے کم ہوتا ہے وقر
اٹھکے جاتا ہوں تب جب وہ بلاتا ہے بہت

گرچہ کم جاتا ہوں پر دل پر نہیں کچھ اختیار
وہ گلی سے سیدھیاں مجکو سناتا ہے بہت

بھول جاویگا سخن پردازی اُسکے سامنے
شاعری سے جو کوئی باتیں بناتا ہے بہت

با مزہ معشوق کیا کم ہیں پر اسکو کیا کروں
ناز و انداز اس ہی کا جو مجکو بھاتا ہے بہت

وہ نہیں پھر اس ہیں بن خوابِ خوش دے مجھے
اب خیال اُسکی طرف بیخبر جاتا ہے بہت

کیا کروں کہنے لگا یہ حضرت آئے پاس وہ
یا کہیں ہنگامہ آرا میرؔ آتا ہے بہت

منھ پہ رکھتا ہے وہ نقاب بہت ہمسے کرتا ہے وہ حجاب بہت
چشمک گل کا لطف بھی نہ اٹھا کم رہا موسم شباب بہت
دیر بھی کچھ لگی نہ مرتے ہمیں عمر جاتی رہی شتاب بہت
ڈھونڈھتے اسکو چپے کوچے پھرے دل نے ہمکو کیا خراب بہت
چلنا اپنا قریب ہے شاید جاں کنے ہے ہوا اضطراب بہت
توبہ مے سے بہار میں نہ کروں گو کرے شیخ احتساب بہت
اس غصیلے سے کیا کسو کی بنے مہربانی ہے کم عتاب بہت
کشتن[1] مرداں اگر ہے ثواب تو ہوا ہے اسے ثواب بہت

دیر تک کعبے میں تھے شب بیہوش
پی گئے میر جی شراب بہت

کیا کہیں ہے حال دل درہم بہت کڑھتے ہیں دن رات اس پر ہم بہت
رہتا ہے ہجراں میں غم غصہ سے کام اور وے بھی سنتے ہیں برہم بہت
اضطراب اس کا نہیں ہوتا ہے کم ہاتھ بھی رکھتے ہیں دل پر ہم بہت
اس گلی سے جی اچٹتا ٹک نہیں دل جگر کرتے ہیں پتھر ہم بہت

میر کی بدحالی شب مذکور تھی
کڑھ گئے یہ حال سن کر ہم بہت

چلنے میں باہر آبادی سے کر نہ تغافل یار بہت دشتی وحشی طیر اٹکے ہیں ہونے تیرے شکار بہت
دعوی عاشق بیچارے کا کون سنے گا محشر میں خیل ملائک ان کی ہونگے اسکے خاطر دار بہت
خشکی لب کی زردی رخ کی نمناکی دو آنکھوں کی جو دیکھے ہے کہے ہے اون نے کھینچا ہے آزار بہت
جسم کی حالت جی کی طاقت نبض سے کر معلوم طبیب کہنے لگا جا میر کیا ہوگا یہ تو ہے بیمار بہت
چار طرف ابرو کے اشارے اس ظالم کے زور نہیں ٹھہرے کیا عاشق سکیں یاں چلتی ہے تلوار بہت
پیش گئی نہیں کچھ چاہت میں کا قہر و ظلم دلوں کی سیکڑوں سینے پھینکے گئے اور ٹوٹے ہیں زنار بہت
جی کے لگاؤ سنتے ہیں یہ جی ہی جلنے دیتے ہیں اس پہ نہ جاتا آہ برا ہے الفت کا آزار بہت
کسکو دماغ سیر چمن ہے کیا ہجراں میں اشد ہو کم گلشن میں اس بن جاکر آتا ہوں بیزار بہت

[1] میرے خونریزی عاشقوں کی ہے ظالم اگر ثواب ÷ تو تو ہوا ہے تجھ کو بہت سا ثواب اب +

میر دعا کر حق میں میرے تو بھی فقیر ہے مدت سے
اب جو کبھو دیکھوں اُسکو تو مجکو نہ آوے پیار بہت

ردیف جیم فارسی

لطف جیسے ہیں سگی چاہ کے بیچ / رنج ویسے ہی ہیں نباہ کے بیچ
ذوقِ صید اُسکو تھا تو خیلِ ملک / دھوم رکھتے تھے دامگاہ کے بیچ
کب مزہ ہے نمازِ صبح میں وہ / جو صبوحی کے ہے گناہ کے بیچ
اُس غصیلے کی سُرخ آنکھیں دیکھ / اُٹھے آشوب خانقاہ کے بیچ
جان و دل دونوں کر گئے تھے عشق / دیکھ اُس رشکِ مہ کو راہ کے بیچ
اُسکی چشم سیہ ہے وہ جس نے / کتنے جی لے لیے اک نگاہ کے بیچ
سانجھ ہی رہتی پھر اگر ہوتا / کچھ اثر نالۂ پگاہ کے بیچ
کیا رہیں جور سے بتوں کے ہم / رہیے اپنی خدا پناہ کے بیچ
مُنھ کی دو چھائیوں سے مت شرما / چھائیں ہوتی ہے ہر ماہ کے بیچ

میر بیمار ہے کہ فرق نہیں
متصل اُسکے آہ آہ کے بیچ

وامق و فرہاد و مجنوں کون ہے یاروں کے بیچ / جو کہوں میں کوئی ہو میرے بھی غمخواروں کے بیچ
جمع خوباں میں مرا محبوب اُس مانند ہے / جوں مہِ تابندہ آتا ہے کبھو تاروں کے بیچ
جو جفا عاشق پہ ہے سو اور لوگوں پر نہیں / اس سے پیدا ہے کہ میں ہی ہوں گنہگاروں کے بیچ
مر گئے بہتیرے صاحبدل ہوس کس کو ہوئی / ایسے مرنے جینے کی اُن عشق کے ماروں کے بیچ
رونا کڑھنا عشق میں دیکھا مرا جن نے کہا / کیا جیے گا یہ ستمدیدہ ان آزاروں کے بیچ
منتظر برسوں رہے افسوس آخر مر گئے / دیدنی تھے لوگ اس ظالم کے بیماروں کے بیچ
خاک تربت کیوں نہ اپنی دلبرانہ اُٹھ چلے / ہم بھی تھے اس نازنیں کے نازبرداروں کے بیچ
صاف میداں لامکاں سا ہو تو میرا دل کھلے / تنگ ہوں معمورہ دنیا کی دیواروں کے بیچ

باغ میں تھے شب گلِ مہتاب میرے آس پاس
یار بن یعنی رہا میں میر انگاروں کے بیچ

دل ہی نہ جسکو دل کہتے ہیں اس عالم کے بیچ
کاش یہ آفت نہ ہوتی قالب آدم کے بیچ

چھاتی کٹتی سنگ ہی سے دل کے جانے میں نہیں
نعل سینوں پر جڑے جاتے ہیں اس ماتم کے بیچ

نقشہ اسکا مردم دیدہ میں میرے نقش ہے
یعنی صورت اس ہی کی پھرتی ہے چشم نم کے بیچ

شاد وے جو اب جوان تازہ ہوئے ہیں شہر میں
دل زدہ ہم شیب میں رہتے ہیں اپنے غم کے بیچ

دل نہ ایسا کر کہ پشت چشم وہ نازک کرے
سو بلائیں ہیں یہاں اُن ابروؤں کے خم کے بیچ

حد سے افزوں اس گلی میں شور ہے عشاق کا
کون سنتا ہے کسو کی بات اُس اودھم کے بیچ

رونق و آبادی ملک سخن ہے اس تلک
ہوں ہزاروں دم آئی میر کے اکدم کے بیچ

ردیف رائے مہملہ

دل گئے آفت آئی جانوں پر
یہ فسانہ رہا زبانوں پر

عشق میں ہوش و صبر سُنتے تھے
رکھ گئے ہاتھ سو تو کانوں پر

گرچہ[1] انسان ہیں زمیں سے ولے
ہیں دماغ اُن کے آسمانوں پر

شہر کے شوخ سادہ رو لڑکے
ظلم کرتے ہیں کیا جوانوں پر

عرش و دل دونوں کا ہے پایہ بلند
سیر رہتی ہے ان مکانوں پر

جب سے بازار میں ہے تجھ سی متاع
بھیڑ ہی رہتی ہے دکانوں پر

لوگ سر دینے جاتے ہیں کب سے
یار کے پاؤں کے نشانوں پر

کبھی اوباش کی ہو دہ دربند
ڈالے پھرتا ہے بند شانوں پر

کوئی بولا نہ قتل میں میرے
مہر کی تھی مگر دہانوں پر

یاد میں اُسکے ساق سیمیں کے
دے دے ماروں ہوں ہاتھ رانوں پر

تھے زمانے میں خرچی جنکی روپے
پھانسا کرتے ہیں انکو آنوں پر

غم و غصہ ہے حصے میں میرے
اب معیشت ہے ان ہی کھانوں پر

قصے دنیا میں میر بہت سے
نہ رکھو گوش ان فسانوں پر

ناتمام

[1] میر تقی میر سہ تھوڑے میں دور کھینچے ہو کیا آدم آپکو ۔ اس مشت خاک کا ہے دماغ آسمان پر

آئے ہو گھر سے اُٹھ کر میرے مکاں کے اوپر
کی تم نے مہربانی بے خانماں کے اوپر

پھولوں سے اُٹھ نگاہیں گھڑے پہ اسکے ٹھہریں
وہ گلفروش کا جو آیا دکاں کے اوپر

برسات اگلی گزری خوف و خطر میں ساری
چشمک زناں رہی ہے برق آشیاں کے اوپر

رخسار سا کسو کے کاہیکو ہے فروزاں
ہر چند ماہِ تاباں ہے آسماں کے اوپر

بے سدھ پڑا رہوں ہوں بستر پہ رات دن میں
کیا آفت آ گئی ہے اس نیم جاں کے اوپر

عشق و ہوس میں کچھ تو آخر تمیز ہو گی
آئی طبیعت اس کی گر امتحاں کے اوپر

الفت کی کلفتوں میں معلوم ہے ہوئی وہ
تھا اعتماد کلی تاب و تواں کے اوپر

محو دعا تھا اکثر غیرت سے لیک گاہے
آیا نہ نام اُس کا میری زباں کے اوپر

وہ جان دل کی خواہش آیا نہیں جہاں میں
آئی ہے اک قیامت اہل جہاں کے اوپر

کیا لوگ ہیں محباں سودائے عاشقی میں
اغماض کرتے ہیں سب جی کے زیاں کے اوپر

حیرت سے اُسکے رو کی چپ لگ گئی ہے ایسی
گویا کہ مہر کی ہے میرے دہاں کے اوپر

جو راہِ دوستی میں اے میر مر گئے ہیں
سر دیں گے لوگ انکے پا کے نشاں کے اوپر

آیا جو اپنے گھر سے وہ شوخ پان کھا کر
کی بات اُن نے کوئی سو کیا چبا چبا کر

شاید کہ منہ پھرا ہے بندوں سے کچھ خدا کا
نکلے ہے کام اپنا کوئی خدا خدا کر

کان اُسطرف نہ رکھے اُس حرف ناشنو نے
کہتے رہے بہت ہم اُس کو سنا سنا کر

کہتے تھے ہم کہ اُسکو دیکھا کرو نہ اتنا
دل خوں کیا نہ اپنا آنکھیں لڑا لڑا کر

آگے ہی مر رہے ہیں ہم عشق میں بتاں کے
تلوار کھینچتے ہو ہمکو دکھا دکھا کر

وہ بیوفا نہ آیا بالیں پہ وقت رفتن
سو بار ہم نے دیکھا سر کو اُٹھا اُٹھا کر

جلتے تھے ہوسے ہوسے ہم یوں عاشقی میں
پر اُن نے جی ہی مارا آخر جلا جلا کر

سوتے نہ لگ چل اس سے اے باد تو نے ظالم
بہتیروں کو سلایا اُس کو جگا جگا کر

مدت ہوئی نہیں ہے واں سے جواب مطلق
دفتر گئے روانہ لکھ لکھ لکھا لکھا کر

کیا دور میر منزل مقصود کی ہے اپنے
اب تھک گئے ہیں اودھر قاصد چلا چلا کر

ف میر تقی سے کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

آیا ہے ابر قبلہ چلا خانقاہ پر / صوفی ہوا کو دیکھ سکے کاش آوے راہ پر

وہ آنکھ اٹھا کے شرم سے کب دیکھے ہو ولے / ہوتے ہیں خون نیچی بھی اس کی نگاہ پر

بالغرض چاہتا ہے گنہ لیک میری جاں / واجب ہے خون کرنا کہاں اس گناہ پر

کیا بحث میرے فقر سے میں ہوں فقیر محض / ہے اس گلی میں حرف سخن عزّشاہ پر

تہ سے سخن کے لوگ نہ تھے آشنا عبث / جاگہ سے تم گئے انھوں کی واہ واہ پر

ڈر چشم شور چرخ سے گل پھول یکطرف / آنکھ اس دلی کی دوڑے ہے اک برگِ کاہ پر

دیکھی ہے جن نے یار کے رخسار کی جھمک / اس کی نظر گئی نہ شب مہ میں ماہ پر

ہم جاں بلب پتنگوں کی سدھ لیجو شتاب / موقوف اپنا جانا ہے اب ایک آہ پر

کہتے تو ہیں کہ ہم بھی تمھیں چاہتے ہیں میر / پر اعتماد کس کو ہے خوباں کے چاہ پر

میلانِ دلبراں ہو کیونکر وفا کے اوپر / دیتا ہے جانِ عالم اس کی جفا کے اوپر

کشتہ ہوں اس حیا کا کنوڈالے بہتوں کے سر / پر آنکھیں اسکی وہ ہیں پشتِ پا کے اوپر

مہندی لگا کے ہرگز گھر سے تو مت نکلیو / ہوتے ہیں خون تیرے رنگِ حنا کے اوپر

ہوں کو بکو صبا سا پر کچھ نہیں ہے حاصل / شاید برات اپنی لکھی ہوا کے اوپر

بندوں سے کام تیرا اے میر کچھ نہ نکلا / موقوف مطلب اپنا اب رکھ خدا کے اوپر

زانو پہ سر ہے اکثر مت فکر اسقدر کر / دل کوئی لے گیا ہے تو میر ٹک جگر کر

خورشید و ماہ دونوں آخر نہ دل سے نکلے / آنکھوں میں پھر نہ آئی جی سے مرے اتر کر

یوسف عزیز دلہا جا مصر میں ہوا تھا / ذلت جو ہو وطن میں تو کوئی دن سفر کر

اے ہمنشیں غشی ہے میں ہوش میں نہیں ہوں / مجھ کو مری زبانی سو بار اب خبر کر

کیا حال زار عاشق کر لیے بیاں نہ پوچھو / کرتا ہے بات کوئی دل کی تو چشم تر کر

دیتے نہیں ہیں سونے ٹک آہ نالے اٹھکے / یارب شبِ جدائی عاشق کی بھی سحر کر

آتا ہے منھ چھپایا شوخ اسکے محرموں نے / جو بچھ گئی ہیں زلفیں اس چہرے پر بکھر کر

کیا پھیر پھیر گردن باتیں کری ہیں سب میں / جاتے ہیں غش کیے ہم مشتاق منھ ادھر کر

بن دیکھے تیرے میں تو بیمار ہو گیا ہوں / حالِ تبہ میں میرے تو بھی تو ٹک نظر کر

رخنے کیے جو تو نے پتھر کی سل میں تو کیا
اے آہ اس صنم کے دل میں بھی ٹک اثر کر

آرے سے قتل کیے سے جاتا نہیں ہے ہرگز
نکلے گا اس گلی سے شاید کہ میر مرکر

باندھے کمر سحرگہ آیا ہے میرے کیں پر
جو حادثہ فلک سے نازل ہوا زمیں پر

اقرار میں کہاں ہے انکار کی سی خوبی
ہوتا ہے شوق غالب اس کی نہیں نہیں پر

کنج قفس میں جوں توں کاٹیں گے ہم اسیراں
سیر چمن کے شایاں اپنے رہے نہیں پر

جوں آبگیری کردہ شمشیر کی جراحت
ہے ہر خراش ناخن رخسارہ و جبیں پر

آخر کو ہے خدا بھی تو اے میاں جہاں میں
بندے کے کام کچھ کیا موقوف ہیں ہمیں پر

غصے میں عالم اُس کا کیا کیا نظر پڑا ہے
تلوار کھینچتا تھی اُس کی جبیں کی چیں پر

تھے چشم خوں فشاں پر شاید کہ دست و دامن
ہیں میر داغ خوں کے پیراہن آستیں پر

گل کیا جسے کہیں کہ گلے کا تو ہار کر
ہم پھینک دیں اُسے ترے منھ پر نثار کر

آغوش ہیں جیسے موجیں اٹھی کشادہ ہیں
دریائے حسن اس کا کہیں ہم کنار کر

یاں چلتے دیر کچھ نہیں لگتی ہے میری جاں
رخت سفر کو اپنے شتابی سے بار کر

مختار رونے ہنسنے میں تجھ کو اگر کریں
تو اختیار گریۂ بے اختیار کر

مشق ستم ہوئی ہے بہت صاف یار کی
بیٹھے لگائے اُن نے جوانوں کو مار کر

صیادی میں علوِ تقدس تو اس کا دیکھ
روح القدس کو مار رکھا ہے شکار کر

بہنے لگی ہے تیغ کی جدول تو تیری تیز[۱]
دشمن کا کام وار میں پہلی ہی یار کر

میں بے قرار خاک میں کب تک ملا کروں
کچھ ملنے کا نہ ملنے کا تو بھی قرار کر

ہیں رفتہ میر مجلس تصویر کا گیا
تو بیٹھا میر حشر تک اب انتظار کر

ردیف کاف تازی

جب کہتے تھے تب تم نے تو گوش ہوش نہ کھولے ٹک
چپکے چپکے کسو کو چاہا پوچھا بھی تو نہ بولے ٹک

[۱] ایسے کئی شعر میر کے آ چکے ہیں جس میں جدول تیغ کی روانی کا ذکر ہے ۱۲

ب جو چھاتی جلی فی الواقع لطف نہیں ہے شکایت کا
صبر کرو کیا ہوتا ہے یوں پھوڑے دل کے پھپھولے ٹک

نالہ کشی میں مرغِ چمن بکتا ہے پر ہم جانیں تب
نعرہ زناں جب صبح سے آکے ساتھ ہمارے بولے ٹک

اُس کے قامتِ موزوں سے کیا سرو برابر ہوویگا
ناموزوں ہی نکلے گا سنجیدہ کوئی جو بولے ٹک

آنکھیں جو کھولیں سوتے سے تو حال کے کہتے مجھکو کہا
ساری رات کہانی کہی ہے تو بھی اُٹھ کر سولے ٹک

مشکل ہے دلداری عاشق وہ برسوں بیتاب رہے
بے طاقت اس دل کو میرے ہاتھ میں اپنے تولے ٹک

ایسے درد دل کرنے کو میر کہاں سے جگر آوے
گرم سخن لوگوں میں ہو کوئی بات کرے تو رولے ٹک

رہے ہے غش و درد دو دو پہر تک
سرِ زخم پہنچا ہے شاید جگر تک

ہوئے ہیں حواس اور ہوش و خرد گم
خبر کچھ تو آئی ہے اس بیخبر تک

زمیں گرد اس مہ کی پھرتے ہیں عاشق
ستارے فلک کے رہے ہیں ادھر تک

قیامت ہے مشتاق لوگوں کی کثرت
پہنچنا ہے مشکل ہیں اُس کے گھر تک

کہاں تک اُسے سر سے مارا کروں میں
نہ پہنچا مرا ہاتھ اُس کی کمر تک

بہار آئی پر ایک پتی بھی گل کی
نہ آئی اسیرانِ بے بال و پر تک

بہت میر پھر ہم جہاں میں رہیں گے
اگر رہ گئے آج شب کی سحر تک

وہ تو نہیں کہ اودھم رہتا تھا آشیاں تک
آشوب نالہ اب تو پہنچا ہے آسماں تک

ہر چیز جلوہ اُس کا سارا جہاں ہے یعنی
ساری ہے وہ حقیقت جاوے نظر جہاں تک

ہجراں کی سختیوں سے پتھر دل و جگر ہیں
صبر اُس کی عاشقی میں کوئی کرے کہاں تک

سودائے عاشقی میں نقصاں ہے جی کا لیکن
ہم راضی ہو رہے ہیں اپنی زیانِ جاں تک

واماندہ نقشِ پا سے یک دست ہم ہیں بیکس
دشوار ہے پہنچنا اب اپنا کارواں تک

جی مارتے ہیں وے بسر عاشق کا اس خطر سے	حرف وفا نہ آیا اپنے کبھو زباں تک
دل دھڑکے ہے جو بجلی چمکے ہے سوئے گلشن	پہونچے مبادا میرے خاشاک آشیاں تک
دیواروں سے بھی مارا پتھروں سے پھوڑ ڈالا	پہونچا نہ سر ہمارا حیف اُسکے آستاں تک
یہ تنگی و نزاکت اس رنگ سے کہاں ہے	گلبرگ و غنچے پہونچیں کب اُن لب و دہاں تک

ان جلتی ہڈیوں پر ہرگز ہما نہ بیٹھے
پہونچی ہے عشق کی تب اے میر استخواں تک

اُسکی رہے گی گرمی بازار کب تلک	وہ بیچتا رہے گا خریدار کب تلک
عہد و عید و حشر قیامت سے ہے دیکھیے	جیتے رہینگے طالب دیدار کب تلک
دل کا جگر کا لوہو تو غم نے سکھا دیا	آنکھیں رہینگی دیکھیے خونبار کب تلک
نسبت بہت گناہوں کی کرتا ہے اُس طرف	بیجرم ہم رہیں گے گنہگار کب تلک
اُسکی نگاہِ مست سے اکثر سوئے رباط	صوفی رہینگے حال سے ہشیار کب تلک
دیوار و در پڑے تھے جہاں اُن نشاں نہیں	یاں خانوادوں کے رہیں آثار کب تلک
مہمان کوئی دم کا ہے وارفتہ عشق کا	ظاہر ہے حال سے کہ یہ بیمار کب تلک
ترسا کے مارنے میں عذاب شدید ہے	اک کھینچ کر نہ مار وگے تلوار کب تلک

صیاد اسیر کر کے جسے اُٹھ گیا ہو میر
وہ دام کی شکن میں گرفتار کب تلک

ردیف لام

چپ رہ اب نالوں سے اے بلبل نگر آزار دل	کم دماغی ہے بہت مجکو کہ ہوں بیمار دل
ابتدائے خبط میں ہوتا تدارک کچھ تو تھا	اب کوئی سنبھلے ہی گی ہے وحشت بسیار دل
یک توجہ میں رہی ہے سیر اُس کی عرش پر	عقل میں آتے نہیں ہیں طرفہ طرفہ کار دل
باغ سے لے دشت تک رکھتے ہیں یک شور عجب	ہم اسیرانِ قفس کے نالہائے زار دل
اس سکر دحی پہ جوں باد سحر در در پھرے	زندگی اب یار بن اپنی ہوئی ہے بار دل

تنگی و دست سے اسکی ہے عبارت ساز فہم
میر کچھ سمجھے گئے نہ معنی اسرار دل

زنہار گلستاں میں نہ کر مُنھ کو سوئے گل	چڑھ جائے مغز میں نہ کہیں گرد بوئے گل

موسم گئے نشاں بھی کہیں پتّے کا نہ تھا / کی شوق کشتگاں نے عبث جستجوئے گل

تڑپے خزاں میں اتنے کہ مر مر گئے طیور / جاوے گی ساتھ جی کے مگر آرزوئے گل

آئے نظر بہار میں پائیز میں گئے / سے ہے بیوفائی کرنے کی ہر سال خوئے گل

مدت ہوئی کہ دیکھا تھا سیر چمن میں میر / پھرتا ہے اب تلک مری آنکھوں میں روئے گل

طریق عشق میں ہے رہنما دل / پیمبر دل ہے قبلہ دل خدا دل

قیامت تھا مروت آشنا دل / موئے پر بھی مرا اس میں رہا دل

رُکا اتنا خفا اتنا ہوا تھا / کہ آخر خون ہو ہو کر بہا دل

جسے مارا اُسے پھر کر نہ دیکھا / ہمارا طرفہ ظالم سے لگا دل

نہ تھی سہل استقامت اسکی لیکن / خرام ناز دلبر لے گیا دل

بدن میں اُس کے ہی ہر جا ہے دلکش / بجا بیجا ہوا ہے جا بجا دل

گئے وحشت سے باغ و راغ میں بھی / کہیں ٹھہرا نہ دنیا سے اُٹھا دل

اسیری میں تو کچھ واشد کبھو تھی / رہا غمگیں ہوا جب سے رہا دل

ہمہ تن میں الم تھا سو نہ جانا / گرہ یہ درد ہے پہلو میں یا دل

خموشی مجھ کو حیرت سے ہے ورنہ / بھرے ہیں لب سے لیکر شکوے تا دل

نہ پوچھا اُن نے جس بن خوں ہوا سب / نہ سمجھا اُسکے کینے کی ادا دل

ہوا پژمردہ و بے صبر و بے تاب / کریگا اسطرح کبتک وفا دل

ہوئے پروانہ واں دلبر گویاں میر / اُٹھا کر ہو چکا جور و جفا دل

ردیف میم

کھا گئے یہاں کے فکر سو موہوم / واں گئے کیا ہو کچھ نہیں معلوم

وصل کیونکر ہو اس خوش اختر کا / جذب ناقص ہے اور طالع شوم

نہ ہوئے تھے ابھی جوان افسوس / صبر مغفور و طاقت مرحوم

جب غبار اپنے دل کا نکلے ہے / دیر رہتی ہے آندھی کی سی دھوم

بھیگی اسکی مسوں کی خوبی سے / بیچ اسی سے ہے ہمکو جوں مسموم

ہے عبث یہ تردد و تشویش
ہاتھ سے وہ گئی جو ہیں ساقی

پہونچے ہے وقت پر جو ہے مقسوم
ہم رہے سر بزانوے مغموم

صاحب اپنا ہے بندہ پرور میر
ہم جہاں سے نہ جائینگے محروم

عشق کیا ہے اُس گل کا یا آفت لائے سر پر ہم
جھانکتے اُس کو ساتھ صبا کے صبح پھروں ہیں گھر گھر ہم

روز و شب کو اپنی یارب کیونکہ کریں گے روز و شب
ہاتھ رکھے رہتے ہیں دل پر بیتابی میں اکثر ہم

پوچھتے راہ شکستہ دل کی جا نکلے تھے کعبے میں
سوچ وہاں تو گزراجی ہیں آئے کدھر سے کیدھر ہم

شام سے کرتا منزل آکر گھر کو ہمارے صدر نشیں
رکھتے ستارہ اُس مہوش کی چاہ میں گر بدختر ہم

برسوں خس و خاشاک پہ سوئے مدت گلخن تابی کی
بخت نہ جاگے جو اُس سے ہوں ایک بھی شب ہمبستر ہم

روز بتر ہے حالتِ عشقی جیسے ہوں بیمار اجل
ہے نہ دوا نے کوئی معالج کیونکر ہوں گے بہتر ہم

اُس کی جناب سے رحمت ہو تو جی بچتا ہے دنیا میں
اُس جانب سے تو بیٹھے ہیں مرنا کرکے مقرر ہم

اب تو ہماری طرف سے اتنا دل کو بھی مت کر
سختی سے ایام کی اب تک جیتے رہے ہیں مر مر ہم

آہ معیشت روز و شب کی ساتھ اندوہ کے ٹھہری ہے
روتے کڑھتے رہا کرتے ہیں غم سے ہوئے ہیں خوگر ہم

شعلہ اک اٹھا تھا دل سے آہ عالم سوز کا میر
ڈھیری ہوئی ہے خاکستر کی جسکی لپٹ ہیں جل کر ہم

کڑھتے جو رہے ہجر میں بیمار ہوئے ہم
بستر پہ گرے رہتے ہیں ناچار ہوئے ہم

بہلانے کو دل باغ میں آئے تھے سو بلبل
چلّانے لگی ایسی کہ بیزار ہوئے ہم

جلتے ہیں کھڑے دھوپ میں جب جاتے ہیں اودھر
عاشق نہ ہوئے اُسکے گنہگار ہوئے ہم

اک عمر دعا کرتے رہے یار کو دن رات
دشنام کی اب اُسکے سزاوار ہوئے ہم

ہمدام بہت وحشی طبیعت تھے اُٹھے سب
تھی چوٹ جو دل پر سو گرفتار ہوئے ہم

جیتے ہوئے لوگوں کی بھلی یا بُری گزری
افسوس بہت دیر خبردار ہوئے ہم

کیا کیا متموّل گئے بک دیکھتے اُس پر
بیعانگی میں اُس کے خریدار ہوئے ہم

کچھ پاس نہیں یاری کا ان خوش پسروں کو
اُس دشمن جانی سے عبث یار ہوئے ہم

گھٹ گھٹ کے جہاں میں رہے جب میر سے مُئے
تب جاکے یہاں واقف اسرار ہوئے ہم

وے ہم ہیں جن کو کہیے آزار دیدہ مردم
اُلفت گزیدہ مردم کلفت کشیدہ مردم

ہے اپنا جی ہی درہم تسپر ہے عشق کا غم
رہتے ہیں دم بخود ہم آفت رسیدہ مردم

وہ دیکھیے ہمکو آکر جن نے نہ دیکھے ہوویں
آزردہ دل شکستہ خاطر کبیدہ مردم

جو ہے سو کہو مائل بے طور اور بے جا ہے
اہل جہاں ہیں سارے صحبت ندیدہ مردم

جاتے ہیں اُسکی جانب مانند تیر سیدھے
مثل کمان حلقہ قامت خمیدہ مردم

اوباش بھی ہمارا کتنا ہے ٹیڑھا بانکا
دیکھ اُسکو ہو گئے ہیں کیا کیا کشیدہ مردم

مت خاک عاشقاں پر پھیر آب زندگی سا
جاگیں کہیں نہ سوتے یہ آرمیدہ مردم

لے لے کے مُنھ میں تنکا ملتے ہیں عاجزانہ
مغرور ہیں ہمارے بر خویش چیدہ مردم

تھے دست بستہ حاضر خدمت میں میر گویا
سیمیں تنوں کے عاشق ہیں زر خریدہ مردم

کیا زمانہ تھا کہ تھے دلدار کے یاروں میں ہم
شہرۂ عالم تھے اُسکے ناز برداروں میں ہم

اُجڑی اُجڑی بستی میں دُنیا کی جی لگتا نہیں
تنگ آئے ہیں بہت ان چار دیواروں میں ہم

جو بھی ہے غم الم رنج و قلق ہجراں کا تو
زندگی سے بے توقع ہیں ان آزاروں میں ہم

شاید آوے حال پرسی کرنے اس اُمید پر
کب سے ہیں دارالشفا میں اُسکے بیماروں میں ہم

دھوپ میں جلتے ہیں پھروں آگے اُسکے میر جی
رفتگی سے دل کی ٹھہرے ہیں گنہگاروں میں ہم

ردیف نون

سر سے ایسی لگی ہے اب کہ جلے جاتے ہیں / مشعل شمع سے روتے ہیں گلے جاتے ہیں

اس گلستاں میں نمود اپنی ہے جوں آب رواں / دم بدم مرتبے سے اپنے چلے جاتے ہیں

تن بدن ہجر میں کیا کہیے کہ کیسا سوکھا / ہلکی بھی باؤ میں تنکے سے ہلے جاتے ہیں

رہتے دکھلائی نہیں دیتے بلاکش اس کے / جی کھپے جاتے ہیں دل اپنے دبے جاتے ہیں

پھر بخود آئے نہ بدحالی میں بیخود جو ہوئے / آپ سے جاتے ہیں ہم بھی تو بھلے جاتے ہیں

خاک پا اُسکی ہے شاید کسو کا سرمۂ چشم / خاک میں اہل نظر اس سے رلے جاتے ہیں

گرم ہیں اُسکی طرف جانے کو ہم لیکن میر / ہر قدم ضعف نخبت سے ڈھلے جاتے ہیں

ایسے دیکھے ہیں اندھے لوگ کہیں / پھوٹے سنتے ہیں کبھی سوتے نہیں

مر گئے ناامید ہم مہجور / خواہشیں جی کی اپنی جی میں رہیں

دیر دریا کنار گرتا رہا / عشق میں آنکھیں اپنی زور بہیں

مرتے تھے اس گلی میں لاکھوں جہاں / ہم بھی مارے گئے ندان وہیں

دیر سے میر اٹھ کے کعبے گئے / کہیے کیا نکلے جا کہیں سے کہیں

رابطہ[1] باہم ہے کوئی دن کا یاں / پھر زمانے میں کہاں تم ہم کہاں

گم ہوا ہوں یاں سے جا کر میں جہاں / کچھ نہیں پیدا کہاں میرا نشاں

پیری میں ہے طفل مکتب سا جھول / ہے فلک کرنے کی قابل آسماں

تو کہے واں تا کہاں تجلی گری / وہ نگاہ و تند کرتا ہے جہاں

بھولے بھی میں یک نظر دیکھا نہیں / اس سے ہے وہ بیدماغ و بدگماں

عشق نے تکلیف کی مالایطاق / بار امانت کا گراں میں ناتواں

کام کچھ آئی نہ دل کی بھی کشش / کھنچ رہا ہے ہم سے وہ ابرو کماں

کیا چھپی ہیں باتیں میرے عشق کی / داستاں در داستاں ہے داستاں

عشق میں کیونکر بسر کریے گا عمر / دل لگا ہے جس سے سو نامہرباں

[1] نسخہ کلکتہ میں یہ شعر اسی طرح ہے لیکن ایک نسخہ قلمی میں مطلع یہ ہے ؎ ربط باہم ہے زمانے میں کہاں ؛ کوئی دم کے میہماں ہیں ہم یہاں

جو زمیں پا لغز ہے شاید کہ میر
ہو وہیں مسجود اُس کا آستاں

اُس سے گھبراکے جو کچھ کہنے کو آجاتا ہوں
دل کی پھر دل ہی میں لیے چپکے چلا جاتا ہوں

سعی دشمن کو نہیں دخل مری ایذا میں
رنج سے عشق کے میں آپ ہی کھپا جاتا ہوں

گرچہ کھویا سا گیا ہوں پہ تہ حرف و سخن
اس فریبندۂ عشاق کی پا جاتا ہوں

خشم کیوں بیہزگی کا ہے سو بے لطفی کیا
بد برا اتنا بھی نہ ہو مجھ سے بھلا جاتا ہوں

استقامت سے ہوں جوں کوہ قوی دل لیکن
ضعف سے عشق کے ڈہتا ہوں گرا جاتا ہوں

مجلس یار میں تو بار نہیں پاتا ہوں
در و دیوار کو احوال سنا جاتا ہوں

گاہ باشد کہ سمجھ جائے مجھے زخمۂ عشق
دور سے رنگ شکستہ کو دکھا جاتا ہوں

یک بیاباں ہے مری بیکسی و تنہائی
مثل آواز جرس سب سے جدا جاتا ہوں

تنگ آوے گا کہاں تک نہ مرا قلب سلیم
بگڑے ہی صحبت کے تئیں روز بنا جاتا ہوں

گرمیِ عشق سے ہے ہلکی بھی جو ہمدم دل میں
روز و شب شام و سحر میں تو جلا جاتا ہوں

تری راہ میں گرچہ بے راہ ہوں
پہ بیغم ہی میں بھی سر راہ ہوں

مرے درپئے خون ناحق ہے تو
نہ خوندار ہوں میں خونخواہ ہوں

تری دوستی سے جو دشمن ہیں سب
انھوں کے بھی تحمل میں ہمراہ ہوں

نہ سمجھو مجھے بے خبر اسقدر
تہ دل سے لوگوں کے آگاہ ہوں

مری کجروی سادگی سے ہے میر
بہت اس روئیے پہ گمراہ ہوں

بہار آئی مزاجوں کی سبھی تدبیر کرتے ہیں
جوانوں کو انھیں ایام میں زنجیر کرتے ہیں

برہمن زادگان ہند کیا پرکار سادے ہیں
مسلمانوں کی یارانے ہی میں تکفیر کرتے ہیں

موئے پر اور بھی کچھ بڑھ گئی رسوائی عاشق کی
کہ اسکی نعش کو اب شہر میں تشہیر کرتے ہیں

ہماری حیرت عشقی سے چپ جانے کی اس سے
مخالف مدعی کس کس طرح تقریر کرتے ہیں

تماشا دیکھنا منظور ہو تو مل فقیروں سے
کہ چٹکی خاک کو لے ہاتھ میں اکسیر کرتے ہیں

نہ لکھتے تھے کبھو کچھ حرف اسکو ہاتھ سے اپنے
سو کاغذ دستے کے دستے ہم اب تحریر کرتے ہیں

در و دیوار افتادہ کو بھی کاش اک نظر دیکھیں
عمارت ساز مردم گھر جواب تعمیر کرتے ہیں

خدا نا کردہ رک جاؤں جہاں مرگ جائیگا سارا
غلط کرتے ہیں لڑکے جو مجھے دلگیر کرتے ہیں

اُسے اصرار خونریزی پہ ہم ناچار ہیں اس میں
وگرنہ عجز نالی تو بہت سی میر کرتے ہیں

طلب ہے کام دل کی اسکے بالوں کی اسیری میں
گدائی اس رات کو کرتا ہوں خجلت سے فقیری میں

نگہ عزلت میں اس ابرو کماں کی تھی ادھر تینی
لگا تیر اسکا چھاتی میں ہماری گوشہ گیری میں

نظیر اُسکی نظر آئی نہ سیاحانِ عالم کو
سیاحت دور تک کی ایک ہر دہ بے نظیری میں

حزیں آواز ہے مرغِ چمن کی کیا جنوں در
نہیں خوش زمزمہ ویسا ہماری ہمصفیری میں

جوانی میں نہ رسوائی ہوئی آ میر غم کھینچا
ہوئے اطفال تہ بازار گا یک جی کے پیری میں

اب دیکھیں آہ کیا ہو ہم وے جدا ہوئے ہیں
بے یار و بے دیار و بے آشنا ہوئے ہیں

غیرت سے نام اُس کا آیا نہیں زباں پر
آگے خدا کے جب ہم محو دعا ہوئے ہیں

اہلِ چمن سے کیونکر اپنی ہو روشناسی
برسوں اسیر رہ کر اب ہم رہا ہوئے ہیں

بے عشق خوبرویاں اپنی نہیں گزرتی
اے وائے کس بلا میں ہم مبتلا ہوئے ہیں

جانا کہ تن میں ہر جا نازک ہے اور دلکش
ہم رفتہ سراپا اُس کے بجا ہوئے ہیں

تھے غنچے جتنے زیرِ دیوارِ باغ طائر
شب باشی چمن سے شاید خفا ہوئے ہیں

خرقہ قمیص کیا ہے کیا دقر اس گلی میں
ترکِ لباس کر واں شاہاں گدا ہوئے ہیں

خاموش اُس کے در پر ہو کر فقیر بیٹھے
یعنی کہ عاشقی میں ہم بے نوا ہوئے ہیں

عہدِ شباب گزرا شربِ مدام ہی میں
ہم کہنہ سال ہو کر اب پارسا ہوئے ہیں

اظہار کم فراغی ہر دم کی سے بے دماغی
ان روزوں میر صاحب کچھ میرزا ہوئے ہیں

بیکار مجھ کو مت کہہ میں کار آمدہ ہوں
بیگانہ وضع تو ہوں پر آشنا زدہ ہوں

میں مُنھ نہیں لگا یا بنت العنب کو گاہے
تب تھا جوان صالح اب پیر میکدہ ہوں

اسرار دل کے کہتے ہیں پیر و جوان میں
مطلق نہیں ہے بند ہماری زبان میں

رنگینیِ زمانہ سے خاطر نہ جمع رکھ
سو رنگ بٹے جاتے ہیں یاں ایک آن میں

شاید بہار آئی ہے دیوانہ ہے جوان
زنجیر کی سی آتی ہے جھنکار کان میں

بے وقفہ اس ضعیف پہ جور و ستم نہ کر
طاقت تعب کی کم ہے بہت میری جان میں

اس کے لبوں کے آگے کنھوں نے نبات کی
آئی ہے کسر شہد مصفا کی شان میں

چہرہ ہی یار کا رہے ہے جیت چڑھا سدا
خورشید و ماہ آتے ہیں کب تیرے دھیان میں

اب میرے اسکے عہد میں شاید کہ اٹھ گئی
آگے جو رسم دوستی کی تھی جہان میں

تارے تو یہ نہیں مری آہوں سے رات کی
سوراخ پڑ گئے ہیں تمام آسمان میں

ابرو کی طرح اسکی چڑھی ہی رہے ہے میر
نکلی ہے شاخ کیا کوئی تازہ کمان میں

آئے ہیں میر کافر ہو کر خدا کے گھر میں
پیشانی پر ہے قشقہ زنار ہے کمر میں

نازک بدن ہے کتنا وہ شوخ چشم دلبر
جان اُس کے تن کے آگے آتی نہیں نظر میں

سینے میں تیر اسکے ٹوٹے ہیں بے نہایت
سوراخ پڑ گئے ہیں سارے مرے جگر میں

آئندہ شام کو ہم رویا کڑھا کریں گے
مطلق اثر نہ دیکھا نالیدن سحر میں

بے سُدھ پڑا رہوں ہوں اس مست ناز بن میں
آتا ہے ہوش مجھکو اب تو پہر پہر میں

سیرت سے گفتگو ہے کیا معتبر ہے صورت
ہے ایک سوکھی لکڑی جو بو نہ ہو اگر میں

ہمسائۂ مغاں میں مدت سے ہوں چنانچہ
اک شیرہ خانے کی ہے دیوار میرے گھر میں

اب صبح و شام شاید گریہ پہ رنگ آوے
رہتا ہے کچھ جھمکتا خوناب چشم تر میں

عالم میں آب و گل کے کیونکر نباہ ہوگا
اسباب گر پڑا ہے سارا مرا سفر میں

آنکھ لگی ہے جب سے اُس سے آنکھ لگی زنہار نہیں[۱]
نیند آتی ہے دل جمعی میں سو تو دل کو قرار نہیں

وصل میں اُسکے روز و شب کیا خوب گزرتی تھی اپنی
ہجراں کا کچھ اور ہے ساماں اب وہ لیل و نہار نہیں

خالی پڑے ہیں دام کہیں یا صیدِ دشتی صید ہوئے
یا جس صید افگن کے لیے تھے اُسکو ذوقِ شکار نہیں

[۱] ہائے کس بیوفا سے آنکھ لگی ÷ نہ لگی آنکھ جب سے آنکھ لگی ۱۲ لا اعلم

سبزۂ خط کا گرد گل رو بڑھ کانوں کے پار ہوا
دل کی لاگ اب اپنی ہو کیونکر وہ اس منھ پہ بہار نہیں

لطف عمیم اس کا ہے ہمدم کیوں نہ غنیمت جانیں ہم
ربط خاص کسو سے اس سے ہو یہ تو طور یار نہیں

عشق میں اس بے چشم و رو کے طرفہ روئت پیدا کی
کس دن ادھر سے اب ہم پر گالی جھڑکی مار نہیں

مشتاق اسکے راہ گزر پر برسوں کیوں نہ رہیں میر
ان نے راہ اب اور نکالی ادھر اسکا گزار نہیں

طرفہ خوش رو دم جو تیز ادا کرتے ہیں
وار جب کرتے ہیں منھ پھیر لیا کرتے ہیں

عشق کرتا نہیں آسان بہت مشکل ہے
چھاتی پتھر کی ہے انکی جو وفا کرتے ہیں

شوخ چشمی تری پردے میں ہے جبتک تب تک
ہم نظرباز بھی آنکھوں کی حیا کرتے ہیں

نفع بیماری عشقی کو کرے سو معلوم
پر مقدور تلک اپنی دوا کرتے ہیں

آگ کا لائحہ ظاہر نہیں کچھ لیکن ہم
شمع تصویر سے دن رات جلا کرتے ہیں

اسکے قربانیوں کی سب سے جدا ہے رہ و رسم
اول وعدہ دل و جان فدا کرتے ہیں

رشک ایک آدھ کا جی مارتا ہی عاشق کا
ہر طرف اسکو تو دو چار دعا کرتے ہیں

بندبند ان کے جدا دیکھوں الٰہی میں بھی
میرے صاحب کو جو بندے سے جدا کرتے ہیں

دل کو جانا تھا گیا رہ گیا ہے افسانہ
روز و شب ہم بھی کہانی سی کہا کرتے ہیں

واں سے یک حرف و حکایت بھی نہیں لایا کوئی
یاں سے طومار کے طومار چلا کرتے ہیں

بود و باش ایسے زمانے میں کوئی کیونکہ کرے
اپنی بدخو ہی جو کرتے ہیں بھلا کرتے ہیں

حوصلہ چاہیے جو عشق کے آزار کھنچیں
ہر ستم ظلم پہ ہم صبر کیا کرتے ہیں

میر کیا جانئے کسے کہتے ہیں وا شدوے تو
غنچۂ خاطر ہی گلستاں میں رہا کرتے ہیں

ناآشنا کے اپنے جیسے ہم آشنا ہیں
اس طور اس طرح کے ایسے کم آشنا ہیں

باہم جو یاریاں ہیں اور آشنائیاں ہیں
سب ہیں نظر میں اپنی ہم عالم آشنا ہیں

ماتم کدہ ہے تکیہ کیا تازہ کچھ ہمارا
یکجا فقیر کب سے ہم سب غم آشنا ہیں

تحریر راز دل کی مشکل ہے کیونکہ کریے
کاغذ قلم ہمارے کب محرم آشنا ہیں

یاری جہانیوں کی کیا میرؔ معتبر ہے
ناآشنا ہیں یکدم یہ الدم آشنا ہیں

دم ہی مہلت شیب میں جائیگا اب یہ غم کہاں
تم ہوئے رعنا جواں بالفرض لیکن ہم کہاں

عالم عالم جمع تھے خوباں جہاں صافا ہوا
گرچہ عالم اور ہے اب واں پہ وہ عالم کہاں

تھی بلا شوخی شرارت یار کی ہنگامہ ساز
شورتیوں تو اوروں کا بھی ہے پہ وہ اودھم کہاں

کیا جنوں ہے تمکو جو تم طالب ویرانہ ہو
جسکو فردوس بریں کہتے ہیں واں آدم کہاں

حبس دم میں شیخ جو کرتا نہیں حرف و سخن
حق طرف ہے اُسکے اُن بہودگوں میں دم کہاں

ہو سو ہو میں میرؔ اب تو دم بخود ہوں ہجر میں
کیا لکھوں تہ دل کی باتیں کاغذ محرم کہاں

گر روزگار ہے یہی ہجران یار میں
تو کیا رہیں گے جیتے ہم اس روزگار میں

کچھ ڈر نہیں جو داغ جنوں ہو گئے سیاہ
ڈر دل کے اضطراب کا ہے اس بہار میں

کیا بیقرار دل کی تسلی کرے کوئی
کچھ بھی ثبات ہے ترے عہد و قرار میں

بیتاب دل نہ دفن ہوا ہے کاش میرے ساتھ
رہنے نہ دیگا لاش کوئی دن مزار میں

وہ سنگدل نہ آیا بہت دیکھی اُس کی راہ
پتھرا چلی ہیں آنکھیں مری انتظار میں

تھمتا نہیں ہے رونا علی الاتصال کا
کیا اختیار گریۂ بے اختیار میں

مربوط[1] کیسے کیسے کہے ریختے ولے
سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

تھی بزم شعر رات کو شاعر بہت تھے جمع
دو باتیں ہم نے ایسی نہ کیں چار چار میں

دنبالہ گردی قیس نے جتیری کی ولے
آیا نظر نہ محمل لیلیٰ غبار میں

اب ذوق صید اُسکو نہیں ورنہ پیش ازیں
اودھم تھا وحش و طیر سے اُسکے شکار میں

مُنھ چاہیے جو کوئی کسو سے حساب لے
ناکس کی گنتی کیا نہیں روز شمار میں

گنتی کے لوگوں کی وہاں صف ہو دیگی کھڑی
تو میرؔ کس شمار میں ہے کس قطار میں

[1] یہی شعر دوسری غزل میں میر صاحب نے اس طرح کہا ہے ؎ کس کس ادا سے ریختے میں نے کہے ولے
سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں ۔ ۱۲ آسی

گوکہ تنہانے جا رہا ہوں میں — بخدا با خدا رہا ہوں میں
سب گئے دل دماغ تاب و تواں — میں رہا ہوں سو کیا رہا ہوں میں
برق تو میں نہ تھا کہ جل بجھتا — ابر تر ہوں کہ چھا رہا ہوں میں
اسکی بیگانہ وضعی ہے معلوم — برسوں تک آشنا رہا ہوں میں
دیکھو کب تیغ اُسکی آ بیٹھے — دیر سے سر اُٹھا رہا ہوں میں
اُس کے گرد سمند کا مشتاق — آنکھیں ہر سو لگا رہا ہوں میں
دور کے لوگ جن نے مارے قریب — اُسکے ہمسائے آ رہا ہوں میں
مجھکو بدحال رہنے دیں اکاش — بے دوا کچھ بھلا رہا ہوں میں
دل جلوں کو خدا جہاں میں رکھے — یا شتاق سے یار رہا ہوں میں

کچھ رہا ہی نہیں ہے مجھ میں میر
جب سے اُس سے جدا رہا ہوں میں

ردیف واؤ

زمانے نے دشمن کیا یار کو — سلایا مرے خوں میں تلوار کو
کھلی رہتی ہے چشم آئینہ ساں — کہاں خواب مشتاقِ دیدار کو
مجھے عشق اُس پاس یوں لے گیا — کوئی جیسے لا دے گنہگار کو
محبت میں دشوار جینی ہے جان — نجانے شنا سہل آزار کو
کوئی دن کرے زندگی عشق میں — جو دم لینے دیں دل کے بیمار کو
بکا میں تو بازار خوبی میں جا — کہ واں بیچتے تھے خریدار کو
مرے شخنہ پہ رکھا ہے رنگ اب تلک — ہزار آفریں چشم خونبار کو
تب اک جرعہ ہی دیں مجھے مغبچے — گرو جیب کروں رخت و دستار کو

کرو مت درنگ اُٹھتے اس بیچ میں
چلو مول لو میر بازار کو

کن نے کہا کہ مجھ سے بہت کم ملا کرو — منت بھی میں کروں تو نہ ہرگز منا کرو
بندے سے کی ہے جن نے خصمی خدا کرے — اس سے بھی تم خصوصیت جانی رکھا کرو
عنقا سا شہرہ ہوں پہ حقیقت میں کچھ نہیں — تم دور ہی سے نام کو میرے سنا کرو

بیماری جگر کی شفا سے تو دل ہے جمع
اب دوستی سے مصلحتاً کچھ دوا کرو

ہم بیخودانِ مجلسِ تصویر اب گئے
تم بیٹھے انتظار ہمارا کیا کرو

جی مارتے ہیں ناز و کرشمہ بالاتفاق
جینا جو میرا چاہو تو اُن کو جدا کرو

میں نے کہا کہ پھنک رہی ہے تن بدن میں آگ
بولا کہ عشق ہی میں پڑے اب جلا کرو

دل جانے کا فسانہ زبانوں پہ رہ گیا
اب بیٹھے دور سے یہ کہانی کہا کرو

اب[1] دیکھوں اُسکو میں تو مرا جی نہ چل پڑے
تم ہو فقیر میر کبھو یہ دعا کرو

کیونکہ نیچے ہاتھ کے رکھا دلِ بیتاب کو
وہ جو تڑپا لے گیا آسودگی و خواب کو

کم نہیں ہے سحر سے یہ بھی تصرف عشق کا
پانی کر آنکھوں میں لایا دل کے خونِ ناب کو

تھا یہی سرمایۂ بحرِ بلا پھیلے دو نوں
چشم کم سے دیکھو مت اس دیدۂ پُرآب کو

تو کہے تھی برقِ خاطف ناگہاں آ کر گری
کس نگہ سے مار رکھا اُن نے شیخ و شاب کو

کیا سفیدی تھی مُنہ اُسکی آستیں کے چاک سے
جسکے آگے رو نہ تھا کچھ پرتوِ مہتاب کو

چاہتا ہے جب مسبب آپ ہی ہوتا ہے سبب
دخل اس عالم میں کیا ہے عالمِ اسباب کو

دم بخود رہتا ہوں اکثر سر رکھے زانو پہ میر
حال کہکر کیا کروں آزردہ اور احباب کو

چھوڑا جنوں کے دور میں رسم و رہِ اسلام کو
لے کر صنم خانہ چلا ہوں جامۂ احرام کو

مرتا مرو جیتا جیو آؤ کوئی جاؤ کوئی
ہے کام ہم لوگوں سے کیا اس دلبرِ خودکام کو

جس خودنما تک جاؤں ہوں اس سے سنوں ہوں دور دور
کیا منہ لگاوے اب کوئی اس روسیہ بدنام کو

بے چین بستر پر رہا بیخواب خاکستر پہ ہوں
صبر و سکوں جب سے گئے پاتا نہیں آرام کو

آسائش و راحت سے جو پوچھے کوئی تو کیا کہوں
اس عمر بھر کھینچا کیا رنج و غم و آلام کو

میر اب بھلا کیا ابتدائے عشق کو روتا ہے تو
کر فکر جو پاوے بھی اس آغاز کے انجام کو

اگلے سب چاہتے تھے ہم سے وفاداروں کو
کچھ کہیں پیار نہیں کرتے جفا کاروں کو

شہر تو عشق میں ہے اُسکے شفاخانہ تمام
وہ نہیں آتا کبھو دیکھنے بیماروں کو

[1] میر تقی ۵ میرؔ دعا کر حق میں میرے تو بھی فقیر ہے مدت سے ÷ اب جو کبھو دیکھوں اسکو تو مجھ کو نہ آوے پیار بہت

مستی میں خوب گزرتی ہے کہ غفلت ہی ہمیں — مشکل اس مصطبہ میں کام ہے ہشیاروں کو

فکر سے اپنے گزرتا ہے زمیں کاوی میں دن — رات جاتی ہے ہمیں گنتے ہوئے تاروں کو

خوب کرتے ہیں جو خوباں نہیں رد دیتے ہمیں — منھ لگاتا ہے کوئی خون کے سزاواروں کو

حسن بازار جہاں میں ہے متاع دلکش — صاحب اسکا ٹھگے جاتا ہے خریداروں کو

وامق و کوہکن و قیس نہیں ہے کوئی — پھنک ڈس گیا عشق کا اژدرہے غمخواروں کو

زندگی کرتے ہیں مرنے کے لئے اہل جہاں
واقعہ میرؔ ہے درپیش عجب یاروں کو

ہاتھ سے سبحہ تک رہا نہ کبھو — دل کا منکا دسلے پھرا نہ کبھو

کیونکہ عرفان ہوگیا سب کو — اپنے ڈھب پر تو وہ چڑھا نہ کبھو

روز دفتر لکھے گئے یاں سے — اُن نے یک حرف بھی لکھا نہ کبھو

گو شگفتہ چمن چمن تھے گل — غنچۂ دل تو وا ہوا نہ کبھو

طور کی سی تھی صحبت اُسکی مری — جھمکی دکھلا کے پھر ملا نہ کبھو

غیرت[1] اپنی تھی یہ کہ بعد نماز — اس کا لے نام کی دعا نہ کبھو

ابتدا ہی میں مرگئے سب یار — عشق کی پائی انتہا نہ کبھو

وہ سخن گو فریبی چشم یار
ہم سے گویا ہی آشنا نہ کبھو

ٹک نقاب الٹو مت عتاب کرو — تھوتو منھ کو نہ پھر خطاب کرو

آنکھیں غصے میں ہوگئی ہیں لال — سر کو چھاتی پہ رکھکے خواب کرو

فرصتِ بود و باش یاں کم ہے — کام جو کچھ کرو شتاب کرو

محو صورت نہ آرسی میں رہو — اہلِ معنی سے ٹک حجاب کرو

ڈھونڈھ اُسکا نشاں نہ دو یارو — ہم خرابوں کو مت خراب کرو

منھ کھلے اُسکے چاندنی چھٹکی — دوستو سیرِ ماہتاب کرو

میر جی راز عشق ہوگا فاش
چشم ہر لحظہ مت پرآب کرو

[1] میر تقی میرؔ: غیرت سے نام اُسکا آیا نہیں زباں پر ۞ آگے خدا کے جب ہم محو دعا ہوئے ہیں +

بس اب بن چکے روبرو موئے سمن بو ۔ گری ہو کے بیہوش مشاطہ یکسو
نہ سمجھا گیا کھیل قدرت کا ہم سے ۔ کیا اُس کو بد خو بنا کر نکو رو
نہ درگیر کیونکر ہو آپس میں صحبت ۔ کہ میں بوریا پوش وہ آتشیں خو
ہوا ابر و سبزے میں چشمک ہے گل کی ۔ کریں ساز ہم برگ عیش لب جو
بہار آئی گل پھول سر جوڑے نکلے ۔ رہیں باغ میں کاش اس رنگ ہم تو

رہے ہے آبرو میر تو ہے غنیمت
کہ غارت میں دل کی ہے ایمائے ابرو

لکھے ہے کچھ تو کج کر چشم و ابرو ۔ برات عاشقاں بر شاخ آہو
گیا وہ ساتھ سوتے سے کے کروٹ ۔ لگا بستر سے پھر اپنا نہ پہلو
اُڑی ہے خاک سی سارے چمن میں ۔ پھرا ہے آہ جس کا واں سے گل رو
جدھر پھرتے تھے چلتے پھول ہنستے ۔ اُدھر ٹپکے ہیں اب تک میرے آنسو

جدا ہوتے ہی گل خنداں ہوا میر
کیا تھا اُس کا گل تکیہ جو بازو

چاہت میں خوبرویوں کے کیا جانے کیا نہ ہو ۔ بیتاب دل کا مرگ کہیں مدعا نہ ہو
بے لاگ عشقبازی میں مفلس کا ہے ضرر ۔ کیا کھیلے وہ جوا جسے کچھ آسرا نہ ہو
کرتے دعا مجھے وہ دغا باز دیکھ کر ۔ بولا کہ اُس فقیر کے دل میں دغا نہ ہو
آزاد پر شکستہ کو صد رنگ قید ہے ۔ یارب اسیر ایسا قفس سے رہا نہ ہو
دوری میں سے کبک ہیں کہسار میں خراب ۔ دلبر سے اپنے کوئی الٰہی جدا نہ ہو
کھووے ہے آنکھ اُسکی گل رو پہ ہر سحر ۔ غالب کہ میری آئینے کی اب صفا نہ ہو
آہوں کے میری دود سے گھبرا گیا ہی سب ۔ سُدھ ہمنشیں لے دل کی کہیں وہ جلا نہ ہو
ہم گر جگر نکال رکھیں اُس کے زیر پا ۔ بے دید کی ادھر سے نظر آشنا نہ ہو

رہتے ہیں میر بے خود و ارفتہ ان دنوں
پوچھو کنایۃً کسو سے دل لگا نہ ہو

ردیف ہائے ہوز

ہر چند جذب عشق سے تشریف یاں بھی لائے وہ ۔ پر خود گم ایسا میں نہیں جو سہل مجھکو پائے وہ

خوبی و رعنائی اُدھر بدحالی و خواری اِدھر
ایوائے ہم ایوائے ہم ہائے ہائے وہ ہائے ہائے وہ

مارا ہوا چاہت کا جو آوارہ گم گشتہ جیسے اپنے ہو
حیران پریشاں پھر کے پھر کیا جانے کیدھر جائے وہ

جی کتنا محو و رفتہ کا جو ہو طرف دیکھے تجھے
تو کج کرے ابرو اگر پل مارتے مرجائے وہ

اُلفت نہیں مجھسے اُسے کلفت کا میری غم نہیں
پائے غرض ہو درمیاں تو چل کے یاں بھی آئے وہ

عاشق کا کتنا حوصلہ یہ معجزہ ہے عشق کا
جو خستہ جاں پارہ جگر سو داغ دل پر کھائے وہ

مشکل تجانب میر ہے دیدار جوئی یار کی
دیکھے کوئی کیا اسکو جو آنکھیں لڑے شرمائے وہ

اب دل خزاں میں رہتا ہے جی کی رکن کے ساتھ
جانا ہی تھا ہمیں بھی بہار چمن کے ساتھ

کب تک خراب شہر میں اُس کے پھرا کریں
اب جاویں یاں سے کوئی غریب وطن کے ساتھ

ہم باغ سے خزاں میں گئے پر ہزار حیف
جانا بنا نہ اپنا گل و یاسمن کے ساتھ

لکنت سے کیا نکلتی نہیں اُسکے منہ سے بات
چپکا ہے حرف یار کے شیریں دہن کے ساتھ

جی خواب مرگ لے گئے حسرت ہی میں نداں
اک شب نہ سوئے ہم کسو گل پیرہن کے ساتھ

جی پھٹ گیا ہے رشک سے چسپاں لباس کے
کیا تنگ جامہ لپٹا ہے اُس کے بدن کے ساتھ

کیا جانیں لوگ عشق کا راز و نیاز میر
اک بات اُس سے ہو گئی دو دو بچن کے ساتھ

مرتے ہیں ہم تو اُس صنم خود نما کے ساتھ
جیتے ہیں وے ہی لوگ جو تھے کچھ خدا کے ساتھ

دیکھیں تو کار بستہ کی کب تک کھلے گرہ
دل لگ گیا ہے یار کے بند قبا کے ساتھ

اے کاش فصل گل میں گئی ہوتی اپنی جان
مل جاتی یہ ہوا کوئی دن اُس ہوا کے ساتھ

مدت ہوئی گئے ہوئے ہمکو پر اب تلک
اُڑتی پھرے ہے خاک ہماری صبا کے ساتھ

ہم رہتے اُسکے محو وہ کرتا ہے ہم کو سہو
ہرگز وفا نہ کرنی تھی اُس بیوفا کے ساتھ

کیفیت آشنا نہیں اُس مست ناز کے
معشوق ورنہ کون ہے اب اس ادا کے ساتھ

منہ اپنا اُن نے عکس سے اپنے چھپا لیا
دیکھا نہ کوئی آئینہ رو اُس حیا کے ساتھ

ٹھہرا ہے رونا آٹھ پہر کا مرا علاج
تسکین دل ہے یعنی کچھ اب اس دوا کے ساتھ

تھا جذب آگے عشق سے جو ہر نفس میں میر
اب وہ کشش نہیں ہے سحر کی دعا کے ساتھ

نظر آیا تھا صبح دور سے وہ
پھر چھپا خور سا اپنے نور سے وہ

جز برادر عزیز یوسف کو
نہیں تکتا کبھو غرور سے وہ

دیکھیں عاشق کا جی بھی ہے کہ نہیں
تنگ ہے جانِ ناصبور سے وہ

کیا تصور میں پھیرے ہے صورت
کہ سرکتا نہیں حضور سے وہ

خوبی اس خوبی سی بشر میں کہاں
خوب تر ہے پری و حور سے وہ

دل لیا جس عمیں کا تونے شوخ
دے گیا جی ہی اک سرور سے وہ

خوش ہیں دیوانگی میر سے سب
کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

آزار کش کو اس کے آزار ہے ہمیشہ
آزردہ دل کسو کا بیمار ہے ہمیشہ

مختار عشق اسکا مجبور رہی ہے یعنی
یکرو دوچار ہو کر ناچار ہے ہمیشہ

کب سہل عاشقی میں اوقات گزرے ہے یاں
کام اپنا اس پری بن دشوار ہے ہمیشہ

عالم کا عین اسی کو معلوم کر چکے ہیں
اس وجہ سے اب اسکا دیدار ہے ہمیشہ

اس سے حصول مطلب اپنا ہوا نہ ہوگا
یا آنکہ کام دل کا اظہار ہے ہمیشہ

پروائے نفع و نقصاں مطلق نہیں ہے اسکو
اُس کی تو لاابالی سرکار ہے ہمیشہ

ملنا نہ ملنا ٹھہرے تو دل بھی اپنا ٹھہرے
اقرار ہے ہمیشہ انکار ہے ہمیشہ

آمادۂ فنا کچھ کیا میر اب ہوا ہے
جی مفت دینے کو وہ تیار ہے ہمیشہ

دل ہی میری بغل میں صد پارہ
اور ہر پارہ اُس کا آوارہ

عرق شرم رو سے دلبر کے
رفتہ ثابت گزشتہ سیارہ

خواری عشق اپنی عزت ہے
کی ہے ہموار ہم نے ہموارہ

کام اس سے پکڑ کمر نہ لیا
ہیچ کارہ بھی ہے وہ ناکارہ

ٹوٹتیں پھوٹتیں نہ کاش آنکھیں
کرتے ان زخموں ہی سے نظارہ

گو مسیحا مزاج آوے طبیب
عشق میں مرگ بن نہیں چارہ

کیا بنے اس سے میر میں مسکین
وہ جفا پیشۂ و ستم کارہ

مکتوب دیر بھیجا ہر دو طرف سے سادہ / کیا شوخ طبع ہے وہ پرکار سادہ سادہ
جب میکدے گئے ہیں پابوس ہی کیا ہے / ہے منجھ ہمارا گویا کہ پیرزادہ
سائے میں تاک کے ہم خوش بیٹھے ہیں بت اپنا / اس سلسلے میں بیعت کرنے کا ہے ارادہ
دل اس قدر نہ رکتا گھبرا آتا جی نہ اپنا / چھاتی لگا جو رہتا وہ سینۂ گشادہ
شیشہ کنار جو ہے پنبہ دہان و ربعت / مینائے مے چمن میں اک سرو ہے پیادہ
پڑتی ہیں اس کی آنکھیں چار و نطرف نشے میں / جوں راہ میں بہکتے ہوں ترک مست بادہ
جو شہرہ نامور تھے یارب کہاں گئے وے / آباد کم رہا ہے یاں کوئی خانوادہ
مت دم کشی کر اتنی ہنگام صبح بلبل / فریاد خونچکاں ہے منھ سے ترے زیادہ
کیا خاک سے اٹھوں میں نقش قدم سا بیٹھا / اب مٹ ہی جانا میرا ہے پیش پا فتادہ

حالات عشق رنج و دردو بلا مصیبت
دل دادہ میر جانے کیا جانے دل نہ دادہ

ردیف یائے تحتانی

کہتے ہیں مرنے والے یاں سے گئے / سب یہیں رہ گئے کہاں سے گئے
دم میں دم جب تلک تھا سوچ رہا / سانس کے ساتھ سارے سانسے گئے
بہ نگہ کھلتے ہی گھر گئے وے تو / ہم ستمدیدہ خانماں سے گئے
واں گئے کرتے وے خرم ناز / یاں جواں کیسے کیسے جاں سے گئے

[illegible] گلی سے جو اٹھ گئے بے صبر
میر گویا کہ وے جہاں سے گئے

کچھ نہ کی ان نے جس کو چاہا ہے / جوں جوں اپنا کیا نباہا ہے
سدھ نہیں سینے تفرقے کی نے / صبح تک رات کو کراہا ہے

عشق ہے [illegible] میر بے تقصیر
سب سزا و [illegible] شفقت شاہا ہے

عشق میں ہم نے یاں کنی کی ہے / کیا محبت نے دشمنی کی ہے
کیسی سرخ و سفید نکلی تھی / مے گر دختر ارمنی کی ہے

بید ساکیوں نہ سوکھ جاؤں میں
دیر مجنوں سے ہم فنی کی ہے

اس پریشان کو نشانہ کر
یار نے جمع افگنی کی ہے

کر دیا خاک آسماں نے ہمیں
یہ بھی ہمت اسی دنی کی ہے

تکیہ ویراں فقیر کا بھی نہ ہو
یاں خرابی بہت غنی کی ہے

قافلہ لٹ گیا جو آنسو کا
عشق نے میر رہزنی کی ہے

میں ہوں تو ہے درمیاں شمشیر ہے
سفک دم میں میرے اب کیا دیر ہے

خضر[1] دشتِ عشق میں مت جا کہ واں
ہر قدم مخدوم خوفِ شیر ہے

راہ تک تک کر ہوئے ہیں جاں بلب
پر وہی اب تک بھی یاں اوسیر ہے

جو گرسنہ دل تھا اس دیدار کا
اپنے جینے ہی سے وہ اب سیر ہے

کچھ نہیں جان اُن کی پیش تارمو
گھر میں شمعی رنگوں کے اندھیر ہے

پاک ہی ہوتی رہی کشتی خلق
ہر زبردست اُس جواں کا زیر ہے

طائروں نے گل فشاں کی میری گور[2]
سامنے پھولوں کا گویا ڈھیر ہے

آشنا ڈوبے بہت اس دور میں
گرچہ جامہ یار کا کم گھیر ہے

آنچل اس دامن کا ہاتھ آتا نہیں
میر دریا کا سا اُسکا پھیر ہے

جو جنون و عشق کی تدبیر ہے
سو نہ یاں شمشیر نے زنجیر ہے

وصف اُس کا باغ میں کرنا نہ تھا
گل ہمارا اب گریباں گیر ہے

دیکھ رہتا ہے جو دیکھے ہے اُسے
دلربا آئینہ رو تصویر ہے

پائے گیر اُسکے نہ ہوں کیوں دردمند
حلقہ حلقہ زلف وہ زنجیر ہے

صید کے تن پر ہیں سب گہرے زخم
کس قدر خوشکار اس کا تیر ہے

مدتِ ہجراں نے کی ہے کچھ کمی
میر سے طولِ عمر کی تقصیر ہے

خط نہ لکھتے تھے سو تاب دل گئی
دفتروں کی اکثر اب تحریر ہے

[1] میر تقی میر سے ملا جو عشق کے جنگل میں خضر ہیں نے کہا ؛ کہ خوف شیر ہے مخدوم یاں کدھر آیا +
[2] " " " سے بلبلوں نے کیا گل افشاں میر کا مرقد کیا ؛ دور سے آیا نظر تو پھولوں کا اک ڈھیر تھا +

رکھ نظر میں بھی خراب آبادیاں
اے کہ تجھکو کچھ غم تعمیر ہے

سخت کافر ہیں برہمن زادگاں
مسلموں کی اُن کے ہاں تکفیر ہے

گفتگو میں رہتے تھے آگے خموش
ہر سخن کی اب مرے تقریر ہے

نظم محسن[1] کی رہی سرمشق دیر
اس مرے بھی شعر میں تاثیر ہے

مرگئے پر بھی نہ رسوائی گئی
شہر میں اب نعش بھی تشہیر ہے

کیا ستم ہے یہ کہ کھنچے تیغ وحشت
ذبح کرنے میں مرے تاخیر ہے

میرؔ کو ہے کیا جوانی میں صلاح
اب تو سارے میکدے کا پیر ہے

دل غم سے خوں ہوا تو بس اب زندگی ہوئی
جان امیدوار سے شرمندگی ہوئی

خدمت میں اس صنم کے گئی عمر پر ہمیں
گویا کہ روز اس سے نئی بندگی ہوئی

گریے کا میرے جوش جو دیکھا تو شرم سے
سیلاب کو بھی دیر سرافگندگی ہوئی

تھا دور دور وصال میں بھی ہیں کہ ہجر میں
پانچوں حواس کی تو پراگندگی ہوئی

اب صبر میرؔ ہو نہیں سکتا فراق پر
یک عمر جان و دل کی فریبندگی ہوئی

یار نے ہم سے بے ادائی کی
وصل کی رات میں لڑائی کی

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ
اب توقع نہیں رہائی کی

کلفت رنج عشق کم نہ ہوئی
میں دوا کی بہت شفائی کی

طرفہ رفتار کے ہیں رفتہ سب
دھوم ہے اُس کی رہگرائی کی

خندۂ یار سے طرف ہوکر
برق نے اپنی جگ ہنسائی کی

کچھ طراوت نہ تھی اُن آنکھوں میں
دیکھ کر کب یہ آشنائی کی

وصل کے دن کو کار جاں نہ کھنچی
شب نہ آخر ہوئی جدائی کی

منھ لگایا نہ دختر رز کو
میں جوانی میں پارسائی کی

جور اُس سنگدل کے سب کھنچے
عمر نے سخت بیوفائی کی

کوہکن کیا پہاڑ توڑے گا
عشق نے زور آزمائی کی

[1] محسن تاثیر فارسی کے ایک مشہور شاعر گزرے ہیں تذکروں میں انکا مفصل حال درج ہے من شاء فلیرجع

چپکے اُس کی گلی میں پھرتے رہے
دیر داں ہم نے بینوائی کی

اک نگہ میں ہزاروں مارے
ساحری کی کہ دلربائی کی

نسبت اُس آستاں سے کچھ نہ ہوئی
برسوں تک ہم نے جبہہ سائی کی

میر کی بندگی میں جا بارے
سیر سی ہو گئی خدائی کی

زمیں اور ہے آسماں اور ہے
تب آناً فاناً سماں اور ہے

نہ وے لوگ ہیں اب نہ اجماع وہ
جہاں وہ نہیں یہ جہاں اور ہے

نہ ان لوگوں کی بات سمجھی گئی
یہ خلق اور انکی زباں اور ہے

تجھے گو کہ صد رنگ ہو مجھسے کیں
مری اور اک مہرباں اور ہے

ہوا رنگ بدلے ہے ہر آن میر
زمین و زماں ہر زماں اور ہے

کہو تو کب تئیں یوں ساتھ تیرے پیار رہے
کہ دیکھا جب تجھے تب جی کو مار مار رہے

ادا و ناز سے دل لے چلا تو ہنس کے کہا
کہ میرے پاس تمھارا بھی یادگار رہے

ہم آپ سے جو گئے ہیں گئے ہیں مدت سے
الٰہی اپنا ہمیں کب تک انتظار رہے

ہوس اسیروں کے ٹک دل کی نکلے کچھ شاید
کوئی دن اور اگر موسم بہار رہے

اُٹھا جو باغ سے میں بیدماغ تو نہ پھرا
ہزار مرغ گلستاں مجھے پکار رہے

لیا تو جاوے بھلا نام منھ سے یاری کا
جو ہم ستم زدوں سے یار کچھ بھی یار رہے

وصال ہجر ٹھہر جاوے کچھ نہ کچھ آخر
جو بیقرار مرے دل کو بھی قرار رہے

کرینگے چھاتی کو گلزار ہم جلا کر داغ
جو گل کے سینے میں ایسا ہی خار خار رہے

تکوں ہوں ایک سا میں گرد راہ کو اُس کی
نہ کیونکہ دونوں مری آنکھوں میں غبار رہے

نہ کرلے گریۂ بے اختیار ہرگز میر
جو عشق کرنے میں دل پہ کچھ اختیار رہے

بے لطف یار ہم کو کچھ آسرا نہیں ہے
سو تو کوئی دن جو ہے تو پھر سالہا نہیں ہے

سن عشق جو اطبا کرتے ہیں چشم پوشی
جانکاہ اس مرض کی شاید دوا نہیں ہے

جس آنکھ سے دیا تھا اُن نے فریب دل کو
اُس آنکھ کو جو دیکھو اب آشنا نہیں ہے

جب دیکھو آئینے کو تب روبرو ہے اُسکے
بے چشم و رو ہوا اُس سے شرم و حیا نہیں ہے

میں برگ بند اگرچہ زیر شجر رہا ہوں
فقر کمب سے لیکن برگ و نوا نہیں ہے

شیریں نمک لبوں میں اسکی نہیں حلاوت
اس تلخ زندگی میں اب کچھ مزا نہیں ہے

اعضا گداز ہو کر سب بہ گئے ہیں میرے
ہجراں میں اسکے مجھ میں اب کچھ رہا نہیں ہے

سن سانحات عشقی ہنس کیوں نہ دو بیائے
کیا جانو تم کسو سے دل ٹک لگا نہیں ہے

دل خوں جگر کے ٹکڑے جب میر دیکھتا ہوں
اب تک زباں سے اپنی میں کچھ کہا نہیں ہے

لاکھوں فلک کی آنکھیں سب مند گئیں ادھر سے
نکلے نہ نا امیدی کیونکر مری نظر سے

برسے ہے عشق یاں تو دیوار اور در سے
روتا گیا ہے ہر اک جوں ابر میرے گھر سے

جو لوگ چلتے پھرتے یاں چھوڑ کر گئے تھے
دیکھا نہ اُن کو اب کے آئے جو ہم سفر سے

قاصد کسو نے مارا خط راہ میں سے پایا
جب سے سنا ہے ہمنے وحشت ہے اس خبر سے

سو بار ہم تو تم بن گھر چھوڑ چھوڑ نکلے
تم ایکبار یاں تک آئے نہ اپنے گھر سے

چھاتی کے جلنے سے ہی شاید نہ آگ سلگی
اٹھنے لگا دھواں اب میرے دل و جگر سے

نکلا ہے سو چلا ہے نومید ہی چلا ہے
اپنا تہاں خواہش برگ و گل و ثمر سے

چھڑ باندھنے کا ہم بھی دیں گے دکھا تماشا
ٹک ابر قبلہ آکر آگے ہمارے برسے

سو نامہ بر کبوتر کر ذبح اُن نے کھائے
خط چاک اُڑتے پھریں ہیں سکی گلی میں پر سے

آخر گرسنہ چشم نظارہ ہو گئے ہم
ٹک دیکھنے کو اسکے برسوں مہینوں ترسے

اپنا وصول مطلب اور ہی کسو سے ہوگا
منزل پہونچ رہیں گے ہم ایسی رہگذر سے

سر دے دے مارتے ہیں ہجراں میں میر صاحب
یارب چھڑا تو اُن کو چاہت کے درد سر سے

کافر بتوں سے مل کے مسلمان کیا رہے
ہو مختلط جواں سے تو ایمان کیا رہے

شمشیر اُس کی حصہ برابر کرے ہے دو
بیسی لگی ہے ایک تو ارمان کیا رہے

ہے سر کے ساتھ ماں دستاں آدمی کا سب
جاتا رہے جو سر ہی تو سامان کیا رہے

ویرانی جن سے مرا جی بھی ہے اداس
منزل خراب ہو وے تو مہمان کیا رہے

اہل چمن میں میں نے نہ جانا کسو کے تئیں
مدت میں ہو ملاپ تو پہچان کیا رہے

حال خراب جسم ہے جی جانے کی دلیل
جب تن میں حال کچھ نہ رہے جان کیا رہے

جب سے جہاں ہے تب سے خرابی یہی ہے میر
تم دیکھکر زمانے کو حیران کیا رہے

وہ اب ہوا ہے اتنا کہ جور و جفا کرے
افسوس ہے جو عمر نہ میری وفا کرے

ہجرانِ یار ایک مصیبت ہے ہمنشین
مرنے کے حال سے کوئی کبتک جیا کرے

صورت ہوا یسی کوئی تو کچھ میری قدر ہو
مشتاق یار کو بھی کسو کا خدا کرے

مرنا قبول ہے نہیں زنہار یہ قبول
منت سے آن کر جو معالج دوا کرے

مستی شراب کی ہی سی ہے آمد شباب
ایسا نہ ہو کہ تم کو جوانی نشا کرے

یارب نسیم لطف سے تیرے کہیں کھلے
دل اس چمن میں غنچہ سا کب تک رکا کرے

میں نے کہا کہ آتشِ غم میں جلے ہے دل
وہ سرد مہر گرم ہو بولا جلا کرے

رکنے سے میرے رات کے سارے جہان کا
آئے نسیم صبح کہ اک دم ہوا کرے

برسوں کیا کرے مری تربت کو گلفشاں
مرغِ چمن اگر حقِ صحبت ادا کرے

عارف ہے میر اُس سے ملا بیشتر کرو
شاید کہ وقتِ خاص میں تم کو دعا کرے

مدت سے تو دلوں کی ملاقات بھی گئی
ظاہر کا پاس تھا سو مدارات بھی گئی

کتنے دنوں میں آئی تھی اُسکی شب وصال
باہم رہی لڑائی سو وہ رات بھی گئی

کچھ کہتے آ کے ہم تو سنا کرتے وے خموش
اب ہر سخن پہ بحث ہے وہ بات بھی گئی

نکلی جو تھی تو بنت عنب عاصمہ ہی تھی
اب تو خراب ہو کے خرابات بھی گئی

عمامہ جانماز گئے لے کے شیخ جی
واعظ کی اب لباسی کرامات بھی گئی

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزّتِ سادات بھی گئی

گل نے بہت کہا کہ چمن سے نہ جائیے
گلگشت کو جو آئیے آنکھوں پہ آئیے

میں بید ماغ کر کے تغافل چلا گیا
وہ دل کہاں کہ ناز کسو کے اُٹھائیے

صحبت عجب طرح کی پڑی اتفاق ہائے
کھو بیٹھیے جو آپ کو تو اُس کو پائیے

رنجیدگی ہماری تو پر سہل ہے و لے
آزردہ دل کسو کو نہ اتنا ستائیے

خاطر ہی کے علاقے کی سب ہیں خرابیاں
اپنا ہو بس تو دل نہ کسو سے لگائیے
اے ہمدم ابتدا سے ہے آدم کشی میں عشق
طبع شریف اپنی نہ ایدھر کو لائیے
اتنی بھی کیا ہے دیدہ درائی کہ غیر سے
آنکھیں لڑائیے ہمیں آنکھیں دکھائیے
مچلا ہے وہ تو دیکھ کے لیتا ہے آنکھیں موند
سوتا پڑا ہو کوئی تو اس کو جگائیے
جانِ غیور پر ہے ستم سا ستم کہ میر
بگڑا جنھوں سے چاہیے اُن سے بنائیے

لے عشق میں گئے دل پُر اپنی جان سے
خالی ہوا جہاں جو گئے ہم جہان سے
دل میں مسوّدے تھے بہت پہ حضور یار
نکلا نہ ایک حرف بھی میری زبان سے
ٹک دل سے آ د آنکھوں میں ہر دید کی جگہ
بہتر نہیں مکان کوئی اس مکان سے
اوّل زمینیوں[۱] میں ہو مائل مری طرف
جو حادثہ نزول کرے آسمان سے
یہ وہم ہے کہ آنکھیں مری لگ گئیں کہیں
تم مار ڈالیو نہ مجھے اس گمان سے
کھل جاویں گی تب آنکھیں جو مر جاویگا کوئی
تم باز نہیں ہوتے مرے امتحان سے
نامہربانی نے تو تمھاری کیا ہلاک
اب لگ چلینگے اور کسی مہربان سے
زنبور خانہ چھاتی غم دوری سے ہوئی
وے ہم تلک نہ آئے کبھو کس نشان سے
تاثیر کیا کرے سخن میر یار میں
جب دیکھو لگ رہا ہے کوئی اسکے کان سے

کہو سو کریے علاج اپنا طپیدنِ دل بلائے جاں ہے
نہ شب کو مہلت نہ دن کو فرصت دمادم آنکھوں سے خوں رواں ہے
تلاش دل کی جو دلبری سے ہمارے پاس آنکھیں رہے ہے
ستم رسیدہ شکستہ وہ دل گیا بھی خوں ہو کے یاں کہاں ہے
کڑھا کریں ہیں ہوا ہے مورد جہان اہتمام جب سے اپنا
غم جدائی جہاں جاں کا ہمارے دل میں نہاں جہاں ہے
نہیں جو دیکھا ہے ہم نے اُسکو ہوا ہے نقصانِ جان اپنا
ادھر نہ دیکھے ہے وہ کبھو تو نگہ کا اسکی مگر زیاں ہے

۱ ہر بلائے کز آسمان آید • گرچہ بر دیگراں قضا باشد • بر زمیں نارسیدہ می پرسد • خانۂ انوری کجا باشد (انوری)

بجا بھی ہے جو نہ ہووے مائل نگارِ سیرِ چمن کا ہرگز
گلوں میں ہمدم ہو کوئی اُس کا سو کس کا ایسا لب و دہاں ہے

گئے ہے رنج و غم و الم سے دماغ سر کے اُٹھانے کا اب
مصیبت اُسکی زمانے میں تو ہمارے اوپر زماں زماں ہے

نہیں ہے اب میر پیر اتنا جو ذکرِ حق سے تو مُنہ چھپا دے
نگاہ نعرہ زنی کیا کر ابھی تو نام خدا جواں ہے

سرِ راہ چند انتظاری رہے
بھلا کب تلک بیقراری رہے

رہا ہی کیے آنسو پلکوں پہ شب
کہاں تک ستارہ شماری رہے

کہا بوسہ دے کر سفر جب چلا
کہ میری بھی یہ یادگاری رہے

کہیں خشک ہو چشمۂ چشم بھی
لہو مُنہ پہ تا چند جاری رہے

بس اب رہ چکی جانِ غمناک بھی
ہوا ایسی ہی تن کی نزاری رہے

تسلی نہ ہو دل اگر یار سے
ہمیں سالہا ہمکناری رہے

ترسے ہیں وہ اگو سُنا خوب ہی
فقیروں کی گر گوش داری رہے

شبِ وصل تھی یا شبِ تیغ تھی
کہ لڑتے ہی وہ رات ساری رہے

کریں خواب ہمسائے کیونکر کہ یاں
بلا شور و فریاد و زاری رہے

پھرا کرتے ہیں خوار گلیوں میں ہم
کہاں تک تبہ بے اعتباری رہے

کج ابروانِ اطفال میں ہے عجب
جو میر آبرو بھی تمھاری رہے

کیا مُنہ لگے گلوں کے شگفتہ دماغ ہے
پھولا پھرے ہے مرغِ چمن باغ باغ ہے

وہ دل نہیں رہا ہے نہ اب وہ دماغ ہے
جی تن میں اپنے بجھتا سا کوئی چراغ ہے

قامت سے اُس کی سرنگوں رہتے ہیں سرو و گل
خوبی سے اُسکی لالہ صد برگ داغ ہے

یارب[1] رکھیں گے پنبۂ مرہم کہاں کہاں
سو زوروں سے ہائے بدن داغ داغ ہے

مدّت ہوئی کہ زانو سے اُٹھتا نہیں ہے سر
کڑھنے سے رات دن کے ہمیں کب فراغ ہے

گھر گھر پھرے ہیں جھانکتے ہم صبح جوں نسیم
پردے میں کوئی ہو کہ یہ اُس کا سُراغ ہے

[1] تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم +

صعوبت فقیری کی نہ گئی مر گئے پہ بھی — اب چشم شیر گور کا میری چراغ ہے

گُل کٹ نکلی ہے کسو کی مگر بکھری زلف سے — آنے میں باد صبح کو یاں اک دماغ ہے

با تجردی سے مرغ دل ناتواں پہ میر — اُس شوخ رنگ سے تجھے باہم جناغ ہے

طبیعت نے عجب کل یہ ادا کی — کہ ساری رات وحشت ہی رہا کی

نمائش داغ سودا کی ہے سر سے — بہار اب ہے جنوں کی ابتدا کی

نہ ہو گلشن ہمارا کیونکہ بلبل — ہمیں گلزار میں قدرت نما کی

مجھی کو ملنے کا ڈھب کچھ نہ آیا — نہیں تقصیر اُس نا آشنا کی

گئے جل حسرت تشنگی سے جگر دل — رہی تھی جان سو برسوں جلا کی

انھیں نے پردے میں کی شوخ چشمی — بہت ہم نے تو آنکھوں کی حیا کی

ہوا طالع جہاں خورشید رو سے — تردد کیا ہے ہستی میں خدا کی

ق

پیام اُس گل کو پہنچا پھر نہ آئی — نہ خوش آئی سیاق گیری صبا کی

سبب حیرت کا ہے اُس کا توقف — سکا یا واں پہ اب تک کیا کیا کی

جفائیں سہیے گا کہتے تھے اکثر — ہماری عمر نے پھر کر وفا کی

جواں ہونے کی اُس کے آرزو تھی — سو اب بارے ہمیں سے یہ جفا کی

ق

لگا تھا رات دروازے پہ اُس کے — فقیرانہ دعا کر جو صدا کی

لگا کہنے کہ یہ تو ہمنشیناں — صدا ہے دلخراش اس ہی گدا کی

رہا تھا دیکھ پہلے جو گنہ کر — ہمارے میر دل میں اُن نے جا کی

غرض اب تو نہ وہ ملتا تھا اُس کا — نہ ہم سے دیر آنکھ اُس کی ملا کی

ہم رو رو کے دردِ دلِ دیوانہ کہیں گے — جی میں ہے کہو حالِ غریبانہ کہیں گے

سودائی و رسوا و شکستہ دل و خستہ — اب لوگ ہمیں عشق میں کیا کیا نہ کہیں گے

دیکھے سو کہے کوئی نہیں جرم کسو کا — کہتے ہیں بجا لوگ بھی بیجا نہ کہیں گے

ہوں در بدر و خاک بسر چاک گریباں — اسطور سے کیونکر مجھے رسوا نہ کہیں گے

لہ شاید اُس زلف سے گئی ہے میر ÷ اُڑتے اک داغ دیکھے ہے ÷ ۲ہ اسی سے بگڑ کر زناخ بنا ہے۔ زناخی ہو ÷ ہم بہنا یا ہونا اور میر کی مراد یہاں اسی قسم کی ہے ۱۲ ۳ہ میاں گیری ÷ الٹی تو صدی ۱۲ ۴ہ سے میں جو بولا تو بولے یہ آواز ÷ اُسی خانہ خراب کی سی ہے + میر۔

ویرانے کو مدت کے کوئی کیا کرے تعمیر
اجڑی ہوئی آبادی کو ویرانہ کہیں گے

میں رویا کڑھا کرتا ہوں دن رات جو درویش
من بعد مرے تکیے کو غم خانہ کہیں گے

موقوف غم میر کہ شب ہو چکی ہمدم
کل رات کو پھر باقی یہ افسانہ کہیں گے

مدت سے پائے چنار رہے ہیں مدت گلخن تابی کی
برسوں ہوئے ہیں گھر سے نکلے عشق نے خانہ خرابی کی

مشق نوشتن جن کی رسا ہے وے بھی چپ ہیں حیرت سے
نقل کروں میں خوبی خط کیا اس کے چہرے کتابی کی

وہ نہیں سنتا سچی بھی میری تین میں ہوں نہ تیرہ میں
گنتی میں کچھ ہوں تو میری قدر ہو حرف حسابی کی

دیر جوانی کچھ رہتی تو اس کی جفا کا اٹھتا مزا
عمر نے میر سے گزر جانے میں ہائے دریغ شتابی کی

جام گلوں کے خزاں میں نگوں ہیں نکہت خوش بھی چمن سے گئی
مے شاید کہ تمام ہوئی ہے ہر غنچہ کی گلابی کی

جیتے جاگتے اب تک تو ہیں لیکن جیسے مردہ ہیں
یعنی بیدم سست بہت ہیں حسرت سے بیخوابی کی

اچھی ہی ہے یہ جنس وفا یاں لیک نہ پائی ہمنے کہیں
داغ ہوئی ہے جان ہماری اس شئے کی نایابی کی

جیب و دامن تر رہتے ہیں آٹھ پہر کے رونے سے
قدر نہیں ہے ہمکو ہرگز اپنے جامۂ آبی کی

تنگ خلق کیا ہے ہم کو آخر دستِ خالی نے
عالم میں اسباب کے ہے کیا شورش بے اسبابی کی

عشق میر کسو سے اتنا اب تک ظاہر ہم پہ نہ تھا
عزتِ یار جو منھ سے نکلا ان نے بلا بے تابی کی

خم ہوا قد کماں سا پیر ہوئے
سو ہم اس کے نشانِ تیر ہوئے

اب نہ حسرت رہے گی مرنے تک / موسم گل میں ہم اسیر ہوئے
میں ہی درویش خوار و زار نہیں / عشق میں بادشہ فقیر ہوئے
ہے شرارت کا وقت عہدِ شباب / تم لڑکپن ہی سے شریر ہوئے
گھر کو اس کے خراب ہی دیکھا / جنکے یہ چشم و دل مشیر ہوئے
شور جنکے سروں میں عشق کا تھا / وے جواں سارے پائے گیر ہوئے
یاں کی خلقت کی ہے زباں کٹی / کہتے ہیں اندھوں کو بصیر ہوئے
نہوئے ہم نظیری[1] سے یوں تو / شعر کے فن میں بے نظیر ہوئے
بات کا ہم سے انکو کب ہے دماغ / میر درویشی میں امیر ہوئے

آؤ کبھو تو پاس ہمارے بھی ناز سے / کرنا سلوک خوب ہے اہلِ نیاز سے
پھرتے ہو کیا درختوں کے سائے میں دور دور / کر لو موافقت کسو بے برگ و ساز سے
ہجراں میں اس کے زندگی کرنا بھلا نہ تھا / کوتاہی جو نہ ہووے یہ عمرِ دراز سے
مانند سبحہ عقدے نہ دل کے کبھو کھلے / جی اپنا کیونکہ اچٹے نہ روزے نماز سے
کرتا ہے چھید چھید ہمارا جگر تمام / وہ دیکھنا ترا مژۂ نیم باز سے
دل پر ہوا اختیار تو ہرگز نہ کریے عشق / پرہیز کریے اس مرض جانگداز سے
آگے بچھا کے نطع کو لاتے تھے تیغ و طشت / کرتے تھے یعنی خون تو اک امتیاز سے
مانع ہوں کیونکہ گریۂ خونیں کے عشق میں / ہے ربط خاص چشم کو افشائے راز سے
شاید شراب خانے میں شب کو رہے تھے میر / کھیلے تھا ایک مغبچہ مہر نماز سے

رشکِ شمشیر ابرو کا خم ہے / تیرِ دشنہ سے کیا پلک کم ہے
تم کرو شاد زندگی کہ مجھے / دل کے خوں ہونے کا بہت غم ہے
جب سے عالم میں جلوہ گر ہے تو / جھلکے میں تمام عالم ہے
حبس دم پہ نہ جائیو ان کے / شیخ صاحب کا یہ بھی اک دم ہے
زالِ دنیا کو جس نے چھوڑ دیا / وہی نزدیک اپنے رستم ہے

[1] نظیری تخلص محمد حسین نام ۔ فارسی کا مسلم الثبوت شاعر ۔ نیشاپور سے ہندوستان چلا آیا تھا عبدالرحیم خانخاناں اسکو بہت عزیز رکھتا تھا ۔ [illegible]ھ میں انتقال کیا ۔

سرو و طوبیٰ کا ناز ہے بیجا
اُس کے قد کا سا کب خم و چم ہے

کچھ تو نسبت ہے اُسکے بالوں سے
یوں ہی کیا حال **میر** درہم ہے

جو لوگ آسمان نے یاں خاک کر اُڑائے
لے عبرتوں نے لے کر خاک اُن کی گھر بنائے

رہنے کی کوئی جاگہ شاید نہ تھی اُنھوں کی
جو یاں سے اُٹھ گئے ہیں وے پھر کبھو نہ آئے

مرڈکے برہمنوں کے صندل بھری جبینیں
ہندوستاں میں دیکھے سو ان سے دل لگائے

ہر اک صنم کدے کی کافر جگہ ہے ہم نے
قشقے بھی یاں کھنچائے زنار بھی بندھائے

پامال لوگ کیا کیا آگے ہوئے ہیں تم سے
سیر بھی تم جو آئے یاں تم نے سر اُٹھائے

کیا گھورتے ہو ہر دم ڈرتے نہیں ہیں کچھ ہم
جن آنکھوں پر ہیں عاشق اُن آنکھوں کے دکھائے

وہ شرر فشاں جو نکلے ہے منھ سے ہر دم
روشن ہے **میر** غم نے قلب و کبد جلائے

ہم کبھو غم سے آہ کرتے تھے
آسماں تک سیاہ کرتے تھے

ے خوشا حال اسکا جسکا دے
حال عمداً تباہ کرتے تھے

برسوں رہتے تھے راہ میں اُسکے
تب کہیں اک اس سے راہ کرتے تھے

کبھی آنکھیں ہم اسکو دکھا کیے
کبھو اودھر بھی نگاہ کرتے تھے

ہے جوانی کہ موسمِ گل میں
جائے طاعت گناہ کرتے تھے

کیا زمانہ تھا وہ جو گزرا **میر**
ہم سحر لوگ جاہ کرتے تھے

وے سیہ موئی دگر فتاری
دزد غمزوں کی ویسی عیاری

ابکی دل اُن سے بچ گیا تو کیا
چور جاتے رہے کہ اندھیاری

اچھا ہوتا نہیں مریض عشق
ساتھ جی کے ہے دل کی بیماری

کیوں نہ ابرِ بہار یہ ہو رنگ
برسوں دیکھی ہے میری خونباری

شور و فریاد و زاری شب سے
شہریوں کو ہے مجھ سے بیزاری

چلے جاتے ہیں رات دن آنسو
دیدۂ تر کی نہر ہے جاری

مر رہیں اس میں یار ہیں جیتے
شیوہ اپنا تو ہے وفاداری

کیونکہ راہ فنا میں بیٹھیے گا
جرم بیحد سے ہے گرانباری

واں سے خشم و خطاب ناز و عتاب
یاں سے اخلاص و دوستی یاری

میر چلنے سے کیوں ہو غافل تم
سب کے ہاں ہو رہی ہے تیاری

جمع انگلی سے اُن نے ترکش کیے ہیں خالی
کس مرتبے میں ہو گی سینوں کی خستہ حالی

درگیر کیونکہ ہو گی اس سفلہ خو سے صحبت
دیوانگی یہ اتنی وہ اتنا لاابالی

بے اختیار شاید اُس سے کھنچ گئی ہو
جب صورت ایسی تیری نقاش نے نکالی

اتنی سڈول دیکھی نہ ہم سُنی ہے
ترکیب اُس کی گویا سانچے میں گئی ہے ڈھالی

وصل و فراق دونوں بیجا ہی ہیں گزرے
اب تک مزاج کی میں پاتا نہیں بحالی

میں خاکسار اُن تک پہونچی دعا نہ میری
دے ہے ہم آسماں پر اُن کا دماغ عالی

آنکھیں فلک کی لاکھوں تب جھپتیاں سی دیکھیں
مانند برق خاطف تیغ اُن نے جب نکالی

کل فتنے زیر سر تھے جو لوگ کٹ گئے سب
پھر بھی زمین سر پر یاروں نے آج اٹھالی

طفلی میں ٹیڑھی سیدھی ٹوپی کا ہوش کب تھا
پگڑی ہی پھیر رکھی اُن نے جو سُدھ سنبھالی

معقول اگر سمجھتے تو میر بھی نہ کرتے
لڑکوں سے عشقبازی ہنگام کہنہ سالی

دوستی نے تو ہماری جانگدازی خوب کی
آہ اُس دشمن نے یہ عاشق نوازی خوب کی

گور پر آیا سمند ناز کو جولاں کیے
اس سپاہی زادے نے کیا ترکتازی خوب کی

عاشقوں کی خستگی بدحالی کی پروا نہیں
اے سراپا ناز تو نے بے نیازی خوب کی

تنگ چولی نے تو مارا تنگ ورزی سے ہمیں
خاک بھی برباد کی دامن درازی خوب کی

سان مارا اور کشتوں میں مرے کشتے کو بھی
اس کشندے لڑکے نے بے امتیازی خوب کی

چھوڑ کر معمورۂ دنیا کو جنگل جا بسے
ہم جہانِ آب و گل میں خانہ سازی خوب کی

کھیل لڑکوں کا سمجھ کر چاہ کو آخر گئے
میر پیری میں تو تم نے عشقبازی خوب کی

اے عشق بے محابا تو نے تو جان مارے
تک حسن کی طرف ہو کیا کیا جوان مارے

طائر فریب کتنا ہے وہ شکار پیشہ
مرغان باغ سارے گویا ہیں اُسکے مارے

اُس سخن رس سے اگر شب کی ملاقات رہے
بات رہ جائے تو یہ دن رہیں نے رات رہے

فخر سے ہم تو کلہ اپنی فلک پر پھینکیں
اُسکے سگ سے جو ملاقات مساوات رہے

بیچے لے گئے سجادۂ و عمامہ اُچک
شیخ کی میکدے میں کیونکہ کرامات رہے

دھجیاں جامہ کی کر دوں نگا جنوں میں اب کے
گر گریباں دری کا کام مرے ہاتھ رہے

خاک کا پتلا ہے آدم جو کوئی اچھی سے کہے
عالمِ خاک میں برسوں تئیں وہ بات رہے

بات واعظ کی مؤثر ہو دلوں میں کیونکہ
دن کو طامات رہے شب کو مناجات رہے

تنگ ہوں میر جی بیطاقتی دل سے بہت
کیونکہ یہ ہاتھ تلے قبلۂ حاجات رہے

کیا عشق بے محابا ستھراؤ کر رہا ہے
میداں بزن گہوں کے کشتوں سے بھر رہا ہے

غیرت سے دلبری کے ڈر چاندنی نہ دیکھے
مہتابی ہی رخ اس کا پیشِ نظر رہا ہے

خونریز ناتواں ہیں اتنا نہ کوئی بولا
کیا مارتا ہے اس کو یہ آپ ہی مر رہا ہے

پائیز کب کرے ہے افسردہ خستہ اتنا
تو بھی جدا کسو سے اے گل مگر رہا ہے

خجلت سے آجکل کیا اُن نے کیا کنارا
دریا ہمیشہ میری گریے سے تر رہا ہے

میں اک نگاہ گا ہے خوش رو کوئی نہ دیکھا
اُلفت رہی ہے جس سے اُس ہی کا ڈر رہا ہے

رہتا نہیں ہے رکھے تھمتا نہیں تھمائے
دل اب تڑپ تڑپ کر اک طلسم کر رہا ہے

یہ کارواں سرا تو رہنے کی گوں نہ نکلی
ہر صبح یاں سے ہم کو عزمِ سفر رہا ہے

بعد از نماز سجدہ اس شکر کا کروں ہوں
روزوں کا چاند پیدا سب بیخبر رہا ہے

کیا پھر نظر چڑھا ہے اے میر کوئی خوش رو
یہ زرد زرد چہرہ تیرا اُتر رہا ہے

کیا طرح ہے یاں جو آئے ہو تو شرمائے ہوئے
بات مخفی کہتے ہو غصے سے جھنجھلائے ہوئے

اس مرے تو بادۂ گلزار خوبی کے حضور
اور خوبانِ چمن خزاں کے گل ہیں مرجھائے ہوئے

چھپکے دیکھا ہم ہاں نے اسکو سو عشق آگیا
حیف بیخود ہو گئے ہم پھر بخود آئے ہوئے

ہر زماں لے لے اُٹھو ہو تیغ بیجا مجھکو دیکھ
آئے ہو مستانہ کس دشمن کے بہکائے ہوئے

گھر میں جی لگتا نہیں اُس بن تو ہم ہو کر اداس
دور جاتے ہیں نکل بحراں سے گھبرائے ہوئے

ایک دن موئے دراز اُسکے نہیں دیکھے تھے یں
ہیں گلے کے ہار اُسکے بال بل کھائے ہوئے

دشمنی سے سایۂ عاشق کو جو مارے ہے تیر
اُس کماں ابرو کے جا کر میر ہمسائے ہوئے

چرخ پر اپنا مدار دیکھیے کب تک رہے
ایسی طرح روزگار دیکھیے کب تک رہے

سہرے کہاں تک پڑیں آنسوؤں کے چہرے پر
گریہ گلے ہی کا ہار دیکھیے کب تک رہے

ضعف سے آنکھیں مندی ہل نہ گئیں پھر شتاب
غش یہ ہمیں ایکی بار دیکھیے کب تک رہے

لب پہ مرے آنکر بارہا پھر پھر گئی
جان کو یہ استقرار دیکھیے کب تک رہے

اُس سے تو عہد و قرار کچھ بھی نہیں درمیان
دل ہے مرا بیقرار دیکھیے کب تک رہے

اس تیر سے اس مرے داغ ہی ہیں صدر میں
ان بھی گلوں کی بہار دیکھیے کب تک رہے

آنکھیں تو پتھرا گئیں تکتے ہوئے اس کی راہ
شام و سحر انتظار دیکھیے کب تک رہے

آنکھ ملاتا نہیں ان دنوں وہ شوخ شنگ
ہمزہ ہے ہم سے یار دیکھیے کب تک رہے

روئے سخن سب کا ہے میری غزل کی طرف
شعر ہے میر اشعار دیکھیے کب تک رہے

گیسو و رخسار یار آنکھوں ہی میں پھرتے ہیں
میر یہ لیل و نہار دیکھیے کب تک رہے

فلک گرنے کے قابل آسماں ہے
کہ یہ پیرانہ سر جاہل جواں ہے

گئے ان قافلوں سے بھی اٹھی گرد
ہماری خاک کیا جانیں کہاں ہے

بہت نامہرباں رہتا ہے یعنے
ہمارے حال پر کچھ مہرباں ہے

ہمیں جس جائے کل غش آ گیا تھا
وہیں شاید کہ اُس کا آستاں ہے

مژہ ہر اک ہے اُسکی تیر ناوک
خمیدہ بھوں جو ہے زوریں کماں ہے

اسے جبتک ہے تیراندازی کا شوق
زبونی پر مری خاطر نشاں ہے

چلی جاتی ہے دھڑکوں ہی میں جاں بھی
یہیں سے کہتے ہیں جاں کو رواں ہے

اسی کا دم بھرا کرتے رہیں گے
بدن میں اپنے جبتک نیم جاں ہے

پڑا ہے پھول گھر میں کا سیکو میر
جھمک ہے گل کی برق آشیاں ہے

ہم رہن بادہ جامہ احرام کر چکے
مستی کی دیر میں قسم اقسام کر چکے

جامہ کی وجہ سے میں ہمارا نہیں گیا
دستار رہن رحمت سب گرو جام کر چکے

زنّار پہنا سبحہ کے رشتے کے تار توڑ
ترکِ نماز و روزہ و اسلام کر چکے

جب کرنے بیٹھے مالا لیے پیش روے بت
کفر اختیار کرنے میں ابرام کر چکے

صندل کے قشقے دیکھ برہمن بچوں کے بیچ
عاشق ہوئے سو آپ کو بدنام کر چکے

واسوختہ ہو دیر سے کعبے کو پھر گئے
سو بار اضطراب سے پیغام کر چکے

شکر و گلہ صنمکدے کا حرف حرف میر
کعبے کے رہنے والوں کو ارقام کر چکے

عشق کیا کوئی اختیار کرے
وہی جی مارے جسکو پیار کرے

غنچہ سے ہے سر پہ داغ سودا کا
دیکھیں کبتک یہ گل بہار کرے

آنکھیں پتھرائیں چھاتی پتھر ہے
وہی جانے جو انتظار کرے

سہل وہ آشنا نہیں ہوتا
دیر میں اُس کو کوئی یار کرے

کنج میں واگہہ کے ہوں شاید
صید لاغر کو بھی شکار کرے

کبھو سچّے بھی ہو کوئی کب تک
جھوٹے وعدوں کو اعتبار کرے

پھول کیا میر جس کو وہ محبوب
سر چڑھاوے گلے کا ہار کرے

سب کام سونپ اس کو جو کچھ کام بھی چلے
جب نام اُس کا صبح کو تا شام بھی چلے

گل بکھرے لال میرے قفس پر خزاں کے بعد
شاید کہ اب بہار کے ایام بھی چلے

خط نکلے پر بھی یار نہ لکھتا تھا کوئی حرف
سو اُسکو اب تو لوگوں کے پیغام بھی چلے

سایہ سی اُسکے پیچھے لگی پھرتی ہے پری
وہ کیا جو آگے یار کے دو گام بھی چلے

پھر صعوہ کے خرام کی بے لطفی دیکھیو
جب راہ دو قدم وہ گل اندام بھی چلے

اب وہ نہیں کہ تھانبے تھمے اضطرار سے
اک عمر ہم تو ہاتھ سے دل تھام بھی چلے

یہ راہ دور عشق نہیں ہوتی میر طے
ہم صبح بھی چلے گئے ہیں شام بھی چلے

اب دشت عشق میں ہیں یہ تنگ آئے جان سے
آنکھیں ہماری لگ رہی ہیں آسمان سے

پڑتا ہے پھول برق سے گلزار کی طرف
دھڑکے ہے جی قفس میں غم آشیان سے

یکدست جوں صدائے جرس بیکسی کے ساتھ
میں ہر طرف گیا ہوں جدا کاروان سے

تم کو تو التفات نہیں حال زار پر
اب ہم ملیں گے اور کسو مہربان سے

تم ہم سے صرفہ ایک نگہ کا کیا کیے
اغماض ہم کو اپنے ہے جی کے زیان سے

جاتے ہیں اسکی اور تو عشاق تیر سے
قامت خمیدہ ان کی اگر ہیں کمان سے

دلکش قد اسکا آنکھوں تلے ہی پھرا کیا
صورت گئی نہ اسکی ہمارے دھیان سے

آتا نہیں خیال میں خوش رو کوئی کبھو
تو مار ڈالیو نہ مجھے اس گمان سے

آنکھوں میں آکے دل سے نہ ٹھہرا تو ایکدم
جاتا ہے کوئی دیدہ کے ایسے مکان سے

دیں گالیاں انھیں نے وہی بیدماغ ہیں
میں میر کچھ کہا نہیں اپنی زبان سے

گلبرگ سی زباں سے بلبل نے کیا فغاں کی
سب جیسے اڑ گئی ہے رنگینی گلستاں کی

مطلوب گم کیا ہے تب اور بھی پھرے ہے
بیوجہ کچھ نہیں ہے یہ گردش آسماں کی

مائل ستم کے ہونا جور و جفا بھی کرنا
انصاف سے یہ کہنا یہ رسم ہے کہاں کی

ہے سبزہ لب جو اس لطف سے چمن میں
جوں بھیگتی مسیں ہوں کوئی سرو نوجواں کی

ہیں گھر جہاں میں اپنے لڑکوں کے سے بنائے
جب چاہا تب مٹایا بنیاد کیا جہاں کی

صوم و صلوٰۃ کیسو میخانے میں جو تھے ہم
آواز بھی نہ آئی کانوں میں یاں اذاں کی

جب سامنے گئے ہم ہم نے اسے دعا دی
شکل ان نے دیکھتے ہی غصہ کیا زباں کی

دیکھیں تو میر کیونکر ہجراں میں ہم جیے ہیں
ہے اضطراب دل کا بیطاقتی ہے جاں کی

فردیات

میر تقی میر دہلوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فردیات

کیا کہیے عشق حسن کی آپہی طرف ہوا
دل نام قطرہ خون یہ ناحق تلف ہوا

مے گلگوں کی بو سے بسکہ میخانہ مہکتا تھا
لب ساغر پہ منہ رکھ رکھ کے شیشہ بہکتا تھا

جب کہ تابوت مرا جائے شہادت سے اٹھا
شعلۂ آہ دل گرم محبت سے اٹھا

گرچہ امید اسیری پہ یہ ناشاد آیا
رام صیاد کا ہوتے ہی خدا یاد آیا

کیا رہ جیب کا بھی بجا میں نہیں سیا
وحشت میں جو سیا سو کہیں کا کہیں سیا

اٹھو تو خاک سے کشتہ ہیں کم نگاہی کا
داغ ہے اسکو جو محشر کی دادخواہی کا

دل گیا رسوا ہوئے آخر کو سودا ہو گیا
اس دو روزہ زیست میں ہم پر بھی کیا کیا ہو گیا

ہے لب نمکیں علاج میرا
پر بے مزہ ہے مزاج میر

کس طور تو نے باغ میں آنکھوں کے تیئں ملا
نرگس کا جس سے رنگ شکستہ بھی اڑ چلا

آنے کے وقت تم تو کہیں کے کہیں رہے
اب آئے تم تو فائدہ ہم ہی نہیں رہے

ناچار ہم تو تجھ بن جی مار کر رہیں گے
پر اس روش کو تیری یہ لوگ کیا کہیں گے

وعدے ہر روز رہے اور تم آتے ہی رہے
ہمکو دیکھو کہ گئے چلنے تو جاتے ہی رہے

مہیا جس کنے اسباب ملکی اور مالی تھے
وہ اسکندر گیا یاں سے تو دونوں ہاتھ خالی تھے

کلاہ کج سے ہر غنچہ کی پیدا ہے گلستاں میں
کہ کیا کیا اس چمن میں دلبروں کے لاابالی تھے

کھا کے دانہ یہ دام بچھوایا
ہوئے آدم کو بھی بہشت نصیب

تری زلفِ سیہ کی یاد میں آنسو جھمکتے ہیں
اندھیری رات ہے برسات ہے جگنو چمکتے ہیں

جیسے نسیم ہر سحر تیری کروں ہوں جستجو
خانہ بخانہ در بدر شہر بہ شہر کو بہ کو
نورِ نظر کو کھو کے میں سو ہو نگا دیکھیو
دل بھر رہا ہے خوب ہی رو ہو نگا دیکھیو

نہ رہ دنیا میں دل جمعی سے جو انسان جانا ہے
سفر کا بھی رہے خطرہ کہ اس منزل سے جانا ہے

مدت ہوئی کہ تاب و تواں جی چھپا گئے
بیتاب کر کے خاک میں ہم کو ملا گئے

وے دن گئے کہ آٹھ پہر اس کے پاس تھے
اب آ گئے تو دور سے کچھ غم سنا گئے

طبیب سے بن علاج وہ خوش ہے
تیرا بیمار آج تو خوش ہے
کیا کہوں اُس سے کچھ بھی چھوٹا ہے
ملکِ دل اُن نے صاف لوٹا ہے

خاک سے میر کیوں نہ یکساں ہوں
مجھ پہ تو آسمان ٹوٹا ہے

سوائے سنگدلی اور کچھ ہنر بھی ہے
بتاں دلوں میں تمہارے خدا کا ڈر بھی ہے

ترے فراق میں کچھ کھا کے سو رہونگا میں
تو کس خیال میں ہے تجھ کو کچھ خبر بھی ہے

ہنس وے ہے دیکھتے ہی کیا خوب آدمی ہے
معشوق بھی ہمارا کیا خوب آدمی ہے

انسان ہو جو کچھ ہے ادراک ہے لولاک
تا واں زمیں زماں سے مطلوب آدمی ہے

لہ یہ شعر قدیم نسخے میں بھی ایسا ہی ہے۔ اگرچہ اس کے قافیے صحیح نہیں ہیں کیونکہ جاتا جانا دونوں میں ایطائے جلی پیدا کرتا ہے ۱۲ ۔ سلہ اس شعر کے قافیے سے بھی ایطا پیدا ہوتا ہے۔ معلوم نہ ہو سکا کہ اصل میں کیا تھا۔ نسخہ ہائے قدیم میں یونہی ہے ۱۲

نسبت مہ ہے دور اُس گل سے
وہ شگفتہ ہے یہ گرفتہ ہے

کس رو سے اُس کے ہوگا تو نقطے سے مقابل
اے آفتاب تیرا منھ تو طباق سا ہے

مصرعۂ زلف کا نہ پایا پیچ
شاعروں نے بھی فکر کر دیکھے

کوچۂ یار سے نہ جاویں گے
کیسے ہی ہونگے ہم گئے گزرے

ترے لعلِ جانبخش کو ہم نے بتلا
کیا آبِ حیواں کو پانی سے پتلا

ایک عالم ہے کشتہ اُس لب کا
الغرض اس پہ دانت ہے سب کا

دل سمجھتا نہیں ہمارا آہ
زلف اُسکی ہے ایک مارِ سیاہ

پیرِ کنعاں سے گیا جب دردِ عشق
گو مثل ہو آنکھ پھوٹی پیر گئی

وابستہ دلبروں کے خاموش ہیں ہمیشہ
ان ساحروں نے ایسے منھ عاشقوں کے باندھے

نہ سنے گا مری فغاں پھر تو
میں ترے کان کھول رکھتا ہوں

آرسی آرسی وہ ہے وہ ہے
یہ نہ منھ دیکھے کی سی میں نے کہی

بخت دشمن بلند تھے ورنہ
کوہکن نے بھی سر کو پھوڑا تھا

جو ترے لب سے کام رکھتے ہیں
نینی کو وے نام رکھتے ہیں

دل تاب ٹک بھی لاتا تو کہنے میں کچھ آتا
اُس تشنہ کام نے تو پانی بھی پھر نہ مانگا

لائق نہیں تمھارے مژگانِ خوش نگاہاں
مجروح دل کو میرے کانٹوں میں مت گھسیٹو

گم ہیں دل صبر و ہوش اے پیارے
ہاتھ کانوں پہ رکھ گئے سارے

لٹ گئی اُسکو دیکھ گل کی فصل
سارے گلبن تھے تو کہے بے اصل

کر نظر اک دور سے مجھ داغ میں
آنکھیں نیچی کر گیا گل باغ میں

اُن نے دیکھا جو اُٹھ کے سوتے سے
اُڑ گئے آئینے کے توتے سے

کیسۂ پُر زر ہو تو جھنا جویاں
تم سے کتنے ہماری جیب میں ہیں

دیکھتا ہوں تو کام میرا میر
دل عشق ہی میں آخر ہے

پائے پُر آبلہ سے مجھ کو بنی گئی ہے
صحرا میں رفتہ رفتہ کانٹوں نے سر اٹھایا

بس نہ لگ چل نسیم مجھ سے کہ میں
رہ گیا ہوں چراغ سا بجھ کر

چشم ہر گل پہ اُس کے جا دیکھی
اُسی کی باغ میں ہوا دیکھی

عشق میں مرگ ابتدائے تو
جو نما نو تو انتہا سے تو

تری ہچشم نرگس کیا صنم ہے
لکھا ہے گر کہیں سہو القلم ہے

تجھ بن چمن میں جو تھا دل کو ٹٹولتا تھا
گل منھ نہ کھولتا تھا بلبل نہ بولتا تھا

نقد دل چھوڑتے نہیں خوباں
اس پہ گویا کہ قرض کھایا ہے

مایوس وصل اس کا جیتوں میں مت کہو تم
جو ہو شمار دم میں اس کی امید کیا ہے

خضر رہ عشق میں نہ ڈھونڈھ کہ یاں
راہ کی بات کھوئے دیتی ہے

غالب ہے کوئی دن کو ڈھونڈھو تو پھر نہ پاؤ
دل رفتہ رفتہ غم میں آدھا نہیں رہا ہے

فاتحہ کو نہ آیا بعد از مرگ
میر کے یار کی طرح دیکھو

گر حسرت دید عمر بھر ہے تو یاں کہاں
ہے سیر مفت میر تجھے پھر جہاں کہاں

راہ آنسو کی کب تلک تکیے
خون دل ہی کا اب مزا چکھیے

بید سا کانپتا تھا مرتے وقت
میر کو دیکھو مجنوں کے تکیے

چلی جاتی ہے جاں ہی اب بھلا تدبیر کیا کریے
تداوی سے مرض گزرا کہو اب میر کیا کریے

تضمین

میر تقی میر دہلوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تضمین مطلع خود با مطلع اُستاد

نہ اسکندر نہ دارا ہے نہ کسریٰ ہے نہ قیصر ہے
جہان کہنہ خلقے را بداغ ہوس ماندہ
یہ بیت الحزن ملک ہو گیا ہے وارثِ گھر ہے
بیا ساقی کہ ایں ویرانہ از بسیار کس ماندہ

خود بخود کھو گیا ہے کتنے روزوں سے فقیر
دوستاں غلطی مجال نامرادم رفتہ است
وہ نہیں ہے ب جو تم نے پیشِ زیں دیکھا تھا میر
ز شتم چیزے کہ من بودم زیادم رفتہ است

نہ اپنے در سے مجھے دور کر شتابی سے
ز ضعف دست بدیوار دادہ آمدہ ام
نگاہ یہاں تئیں پہونچا ہوں کس خرابی سے
بہر دو گام زمانے ستادہ آمدہ ام

مشہور ہیں عالم میں تو کیا ہیں بھی کہیں ہم
عنقا سرو برگیم سپہری ز فقرا ہیچ
القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم
عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ

میں رہ گیا تھا لاجرم شکوے سے جب لے منہ تئے
اکنوں کہ تہ دہدست لطف از تہ آزارتے بکن
تب کی بھلا تب ہی گئی ہنگامہ تھا ہم ترے
تیغے بکو شکے بزن تیغے بہش کارے بکن

چمن میں دھر کے ہنستے نہ رہ برنگ گل
دریں حدیقہ بہار و خزاں ہم آغوش است
کہ صبح شاخ پہ یہ بیت پڑھتی تھی بلبل
زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش است

ہے ہم تشنگاں سے ذمے منت یار کی کیسی
بامیدے نگذاشت بیدادش دلے مارا
کہ پھر باقی نہ تھا نگہ کہ نگاہی یک ہی ایسی
خدا اجرے دہد در کشتن ما قاتل مارا

دوری ہی میں طاقت نہ رہی بات کی آخر
روزی نہ ہوئی رات ملاقات کی آخر
زہرِ غمِ ہجرِ تو بجاں کار گر افتاد
اُمیدِ وصالِ تو بجبرِ دگر افتاد

آشنائے کفر و دیں عاشق نہیں ہوتے ہیں میر
جانتے ہیں طور میرے سب چنانچہ خور دپیر
کعبہ و بتخانہ را بیگانہ میدانیم ما
یا درِ دل یا درِ میخانہ میدانیم ما

ہے خوش وہ کہ یاں سر بگریباں ہی رہا ہے
اس باغ میں وا ہونے کو بدبین کہا ہے
بسیار زدلتنگی خود غنچہ غمین است
غافل کہ شگفتن نفسِ بازپسین است

متاعِ دل نہ لیجاؤں جو واپس کیا کروں جاناں
خریداری نہ کی تو نے رہا میں دیر سرگرداں
بسودائے ہوس عمرے دریں بازار گردیدم
کنوں گرد سرم گرداں کہ من بسیار گردیدم

حواس و ہوش و خرد جان و دل شکیب و تواں
چلے ہیں عزم سفر کرنے سے ترے سب یاں
زرفتنِ تو کسے بازپس نمی ماند
تو میروی و دریں شہر کس نمی ماند

کہاں کرتے ہیں خوں تیزی نہیں کی
نہیں کچھ اُن نے خونریزی نہیں کی
سرش گردم کہ ہر جا جلوہ گر بود
سرِ بازار او بازار سر بود

اُس آستانے کے سگ کے نہیں برابر ہم
کہیں زیادہ سخن اپنے منھ سے کیونکر ہم
میانِ ما و سگِ یار فرق بسیار است
چراکہ ما سگ اوئیم و او سگِ یار ست

محرماں کیا کہوں میں اپنے نوشتے کی بدی
بخت نے آہ مری بات تنک کہنے نہ دی
دل کہ طومار وفا بود من محزوں را
پارہ کردند ندانستہ بتاں مضموں را

کہتے نہیں خلوت میں تو بار دے عالم کو
یا آئینہ سا ہووے دیدار ترا ہم کو
تا چند نہاں باشی جاناں نفسے بنما
دیوانہ شدے تنہا خود را بکسے بنما

نہ لاگے وہم حس جا کچھ وہاں ہو قادر اندازی
ہدف ہو نا خدنگ جور کا تیرے نہیں باری
زشستِ صاف اے ابروکماں از بس خطر دارم
تو می بینی بسوئے تیر و من فکر دگر دارم

مثلث

تک یہ بھی رکھو سُن تم اے ارباب تعلق | اوقات خوش آں بود کز اسباب تعلق
آزردہ دلے داشتم آنہم دگرے داشت

کیا کہوں میں عاشق و معشوق کا راز و نیاز | ناقہ را میراند لیلے سوئے خلوتگاہ ناز
ساربان در رہ حدی میخواند و مجنوں میگریست

مر ہی جاؤں کسی گلخن میں جو میں غم سے بھرا | نخلبندی مجھے کن سرتابوت مرا
کہ بدوران تو از گلشن عالم چیدم

کل تک تو فریبندہ ملاقات تھی ہلی | امروز تغافل شد کہ نداری سر ابلی
بیچارہ ز لطف تو بدل داشت تمنا

اے وفائے گل کے عاشق سب میں ہیں نیزہ زنان | چوں صبا بیہودہ سرگردان این گلشن مباش
من چہ گل چیدم کہ عمرے باغبانی کردہ ام

میر اس وادی سے بیدردانہ گزرا تو بذوق | گر دلت میداشت شورے چوں جرس در راہ شوق
ہر کف خاک کہ سطے میگشت جائے نالہ بود

اب ذلت رہوں کہاں تک میر | بنجا سر منہم کہ چوں زنجیر
ہر در سے حلقۂ در دگرست

نالہ بلبل غنچہ غم سے کشادہ آہ دلفگار | باغباں جاروب دگل خمیازہ و من انتظار
ہر کسے چیزے بیادت در گلستاں میکشد

آئی تھی ملاقات کی راہ اسکے وصلے سود | تا چشم کنم باز شب وصل سحر سود
عمر گذران بر سر انصاف نیامد

جہاں سے اے کہ تمنا ہے تجکو مجھ سے سُن | نکے بگور غریبان شہر سیرے کن
ببیں کہ نقش بلا باچہ باطل افتادہ است

اگرچہ آب دم آخر ہے لیکن اے غمخوار | بہجر زندہ ام آئینہ پیش من مگزار
جدا ز یار بخود روبرو شدن ستم ست

ہے بھی جو کوئی یاں سو نہیں کے ہے وہ مانند | نیک و بد عالم ہمہ عنقا صفتانند
یعنی خبر از ہر کہ گرفتم خبرے بود

مخمس

یہ بات جھوٹ نہیں صدق کی صفا کی قسم
ترے ہی لطف کا وابستہ ہوں وفا کی قسم
عبث جو قسمیں ہے دیوے تو مصطفیٰ کی قسم
جناب پاک بتول و شہ ولا کی قسم
قسم حسن کی حسین ابن مرتضیٰ کی قسم

ترا ہوں خوار تری شان کی مجھے سوگند
مروں ہوں تجھ پہ تری جان کی مجھے سوگند
تجھی کو جیتا ہوں ایمان کی مجھے سوگند
یہی وظیفہ ہے قرآن کی مجھے سوگند
تجھی سی بندگی رکھتا ہوں میں خدا کی قسم

رہے ہے مد نظر تری زلف و کاکل و خال
پھرا کرے ہے مری آنکھوں میں تری ہی چال
شبوں کو تیرا تصور دنوں کو تیرا خیال
مریض دل ہوں مرا عابدیں ہے شاہد حال
اسی ستم زدہ بیمار بے دوا کی قسم

تجھے میں دیکھ تماشے کا کیا مہیا ہوں
خدا نے دی ہیں مجھے آنکھیں کیا میں اندھا ہوں
نصیب لطف نہ باقر کا ہو جو جھوٹا ہوں
دو چار حشر میں آفت سے ہوں جو ایسا ہوں
امام پنجتن اُس اپنے پیشوا کی قسم

جو رو و مہ ہو نظر میں تو صبح و شام کی سوں
پڑا ہو پاؤں کہیں تو ترے خرام کی سوں
کلام ہو کسی سے تو مجھے کلام کی سوں
جو سات پانچ ہو جی میں چھٹے امام کی سوں
غبار رہ ہوں ترا اُس کے خاک پا کی قسم

کرے ہے لطف جو ٹک تو بحال آتا ہوں
وگرنہ آپ سے میں لحظہ لحظہ جاتا ہوں
ترے ہی واسطے یہ غم یہ غصہ کھاتا ہوں
گواہ دعوی کا کاظم کو اپنے لاتا ہوں
سچ اس کو مان تجھے اُسکی ہی ولا کی قسم

جو تجھکو خوش نہیں پاتے تو جان کھوتے ہیں
ہلاک ہونے پہ تجھ ہی سے راضی ہوتے ہیں
کبھو ہی آٹھ پہر میں ٹک ایک سوتے ہیں
ہمیشہ راتوں کو آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں
امام ضامن ثامن علی رضا کی قسم

گدائے در ہوں تقی کا نقی کا ہوں مملوک
رکھوں ہوں عسکری کے لطف سے امید سلوک
طریق مہدی ہادی کا رکھتا ہوں مسلوک
جہاں کے لوگ ہیں مفلوک سارے یہ ہیں ملوک
قسم جو کھائیے ان چار بادشا کی قسم

نوا پہ تیری بنی ہر زباں بگڑتے رہے
گمانِ بد سے سدا روٹھتے ہی لڑتے رہے
سرشک آنکھوں سے جیسے ستارے جھڑتے رہے
شبوں کو عذر میں نت آ کے پاؤں پڑتے رہے
ملے جو دن کو یہی بیچ میں رہا کی قسم

گناہ ہو بھی جو اثبات کو تو رکھیے معاف
کدورت اپنی عبث ایک بار کر چک صاف
ہر ایک رات کہاں تک بسانِ روزِ مصاف
نکال تیغ شتابی نہیں یہ حرف گزاف
درنگ کیا ہے مگر کھائی ہے جفا کی قسم

چمن میں ملیں جو پھرا ہوں تو سوکھوں جیسے پات
زبان کاٹ جو سوسن کے رنگ کی ہو بات
سیاہ روز ہوں میں گر کہیں رہا ہوں رات
گیا ہوں چلکے تو رکھتا ہوں تیرے ہاتھ پہ ہات
جو کچھ خیال ہو سر میں تو تیرے پا کی قسم

جفاؤ جور ہزاروں طرح کے سہتا ہوں
گداز غم سے ہو سب آنسوؤں میں بہتا ہوں
ہوئے ہیں برسوں کہ چپکا ہی بیٹھا رہتا ہوں
کہو ہو یہ جو کبھو خواہش اپنی کہتا ہوں
ابھی تو کھائی تھی اظہار مدعا کی قسم

جلوں ہوں شمع کے مانند تجھ کو پروانہ
خبر تجھے مری حالت سے کچھ بھی ہے یا نہ
فقط ہوں سلسلۂ موکا تیرے دیوانہ
کہے تو تیل میں میں ہاتھ ڈالوں جوں شانہ
جو بیچ ہو تو ترے کاکلِ دوتا کی قسم

سرشک میر ہیں جس جائے تھم تجھ جاوے
تمام پانی ہو دل کاش اُس کا بہ جائے
تو محو آئینہ ہو وہ جفائیں سہ جاوے
کہاں تلک ترا منھ دیکھ دیکھ رہ جائے
کچھ اُسکے منھ سے حیا کر تجھے حیا کی قسم

تضمین و مخمس دیگر

کیا کہوں مجھ پہ جو گزرے ہے جفا کاریٔ دل
در پئے دشمنی جاں ہے یہی یاریٔ دل
ایک شب ہو تو کروں شرح غم و زاریٔ دل
دوستاں چند کنم نالہ ز بیماریٔ دل
کس اگر گرفتار مبادا بگرفتاریٔ دل

آتی ہے ایک نہایت ہی جگر سوز صدا
یعنی بھر رات سے چھاتی میں مری درد اٹھا
مہر خاموشی جو لب پر ہے مرے اس پہ نجا
اے کہ بر زاریٔ دل می کنی انکار بیا

گوش بر سینۂ من نہ بشنو زاری دل

آہ مت پوچھ کہ کیوں ٹپکے ہے ان آنکھوں سے خوں | ایسے قضیے سے چکوں کاش کہیں میں بھی چکوں
میں مصیبت زدہ حیران ہوں کیا فکر کروں | صبر و آرام سکے نیست ازیں ہر دو کنوں
کہ دریں واقعۂ صعب کند یاری دل

سیل سی پار گزر جاتی تھی آہ سحری | اسلیے جان پہ میں کی ہے یہ بیدادگری
ہو سو ہو اُس کو ہنر جانیے یا بے ہنری | گر ہمہ نیزہ ببارد کہ من از بے سپری
دادم اکنوں جگرے را بسپرداری دل

نکلے من لیلے و مجنوں سے جو ہیں مثنویاں | ایک مدت [illegible] رہی ہیں میرے تیئں نوک زباں
خود بخود رکی یہ جگر خواری و بیتابی کہاں | خواندہ ام قصۂ عشاق بسے بیت دراں
جز جفاکاری دلدار و وفاداری دل

یاں چلے گر کوئی آنکھوں سے بھی باما چہ رسد | مذہب عشق میں لازم ہے اسے کرنا حسد
جی سے جی ہیں تو نہ جاؤنگا عبث مت کر کد | کوئے تو منزل دلہاست کسے چوں گزرد
کہ نیاید بزمیں پائے ز بسیاری دل

میر اس دل سے ستم لوگوں پہ کیا کیا نہ ہوا | کوئی آوارہ کوئی خستہ کوئی جی سے گیا
آؤ خاموش ہو کوئی نہیں ہمدرد ترا | عمر باشد کہ نشاں نیست ز جائے پیدا
کہ کند با تو دمے شرح دل آزاری دل

مخمس دیگر

بیخود انہ ہیں کئی حرف زباں پر کر گوش | آج کہتا ہوں کہ ہے خمکدۂ دل میں جوش
پائے رفتن تو نہ تھے لیک مجھے تھا کچھ ہوش | سرخوش از کوئے خرابات گزر کردم دوش
بہ طلبگاری ترسابچۂ بادہ فروش

ہوش و صبر و خرد و دین گئے سب سارے | میں تھا سو مجھ میں تو کچھ تھا نہ ستم کے مارے
بعد یک چشم زدن پھر جو میں دیکھا بارے | پیشم آمد بہ سر کوچہ پری رخسارے
کافرے عشوہ گرے زلف چو زنار بدوش

ایک ساعت تو رہا محو نشست و برخاست | بارے پھر ٹھہر گیا دل بھی مرا بے کم و کاست

درمیاں جس گھڑی آئے سخن راست برست | گفتم این کوچہ چہ کوچیست و ترا خانہ کجاست

اے مہ نو خم ابروئے ترا حلقہ بگوش

تار اس دشمن ایمان کی زلفوں کی کمند | نارسائی کو ہیں صد جان سے واں پابند
آنکھیں سختی سے دکھا مجھ کو بآواز بلند | گفت تسبیح بخاک افگن و زنار بہ بند

سنگ بر سینۂ تقوی زن و پیمانہ بنوش

رہیو ہشیار کہ ہے ضعف سے بیگانہ طلب | قوت پا ہی تنک رکھتی ہے [illegible] طلب
جاکے کر پیر مغاں سے کوئی خمخانہ طلب | تو بہ گیسو بنہ و ساغر مستانہ طلب

خرقہ بیروں فگن و کسوت رندانہ بپوش

بسکہ نقاد ہیں یاں کھوٹے ہیں سب تیرے کھرے | قابل خدمت مستاں نہیں تو رہیو پرے
پہلے یہ باتیں ہیں ان پر تو عمل کر لے ارے | بعد ازاں سوئے من آ تا بتو گویم خبرے

راہ ہمت پیم اگر بر سخنم داری گوش

مجھکو بھڑکا کے چلا واں سے وہ پر سرکش | پاؤں سے بیٹھے گئی سر تئیں جلتی آتش
ہاتھ سے جاتا ہی تھا گو تھی مجھے تاب غش | دیں برافتادہ بیہودہ دویدم بہ تپش

تا رسیدم بمقامے کہ نہ دیں ماند و نہ ہوش

جا ہے سب خدشۂ غیر کہ نہ تھا غیر نمود | نقش باطل سے کہیں دیکھا ہے واں صفحۂ بود
تو بھی واں ہو تو یہی منھ سے نکل آئے زود | محو گشت از دو تن کون و مکاں حرف وجود

نہ پری ماند نہ آدم نہ طیور و نہ وحوش

تھے وہ بے تمیز و مست مے ذات الست | آتش مے سے بر افروختہ کچھ بادہ پرست
کیا کہوں پاؤں کی لغزش کے سبب پست بہت | دیدم از دور گروہے ہمہ دیوانہ و مست

از تف بادۂ شوق آمدہ در جوش و خروش

گرچہ ظاہر تھا خراب آنکھ وے سب معمور | ہونہ سر ہوتے پھرتے تھے سارے مخمور
سب لباس طرب و جامۂ اندوہ سے دور | بے دف و مطرب و ساقی ہمہ در عیش و سرور

بے مے و جام و صراحی ہمہ در نوشا نوش

ننگ و ناموس کا دفتر تھا سب ان کا برہم | دیکھ کر جیسے گیا میں نے تامل یک دم
پھر جو دیکھا تو مجھے بدگیا کیا غم | چوں سر رشتۂ ناموس برفت از دستم

خواستم تا خبرے پرسم ازو گفت خموش

عقل رکھتا ہے تو ٹک رہیو ادب کا پابند
یہ وہ جا ہے کہ نہ فردوس ہو اسکے مانند
یاں فراغت ہے دو عالم کی ہر اک جام میں بند
ایں خراباتِ مغان است درو مستانند

ازدمِ صبحِ ازل تا بہ قیامت مدہوش

میر ان مستوں میں کوئی نہیں پابستہ زیست
جتنے یے مست نظر آتے ہیں اب سب ہیں نیست
کیونکہ یہ زیست بہت ہووے تو وہ روز کہ بیست
گر ترا نیز بایں فرقہ سرِ یکرنگی ست

دین و دنیا بہ یکے جرعۂ عصمت بفروش

مخمس دیگر بر غزل خود

واں اُن نے دل کیا ہے مانندِ سنگِ خارا
کیا پوچھتا ہے ہمدم احوال تو ہمارا
یاں تن ہوا ہے پانی ہو کر گداز سارا
سنے رمز نے کنایہ ایما ہے نے اشارا

اسکے تغافلوں نے ان روزوں ہمکو مارا

ہو شہر یا کہ صحرا بارے مکان تو ہو
حالت تغیر ہو کر منھ میں زبان تو ہو
غم میں نہ ہووے کچھ تو اک تن میں جان تو ہو
سو بار دیکھ صورت ہو مہربان تو ہو

اپنے تئیں نہیں ہے اب گفتگو کا یارا

یہ چشم تھی کہ تیرکاں اکثر سوار ہونگے
یہ جانتے نہ تھے ہم اسطور خوار ہونگے
ہم لوگ اُن کے رہ کے گرد و غبار ہونگے
اب کہتے ہیں کہ یارب کیونکر دوچار ہونگے

اس بھی طرف کو ہوگا ان کا کبھی گزارا

ہجراں میں ٹک نہ برسے کوہ اور راغ میں ہم
مدت رہے اگرچہ گلگشت باغ میں ہم
بوئے وفا نہ پائی دل میں دماغ میں ہم
پر لطف کچھ جو دیکھا سینے کے داغ میں ہم

اُس بن جو گل جنے تھے اُنکا کیا نظارا

تشتے ہیں اپنے خوں کے لے ہمدمو نہ آؤ
اب ٹھانی ہم سو ٹھانی گو اس میں جان جاؤ
ہووے طبیب گر خضر اُسکو بھی یاں نہ لاؤ
آبِ برندہ اُس کی شمشیر کا پلاؤ

آبِ حیات اپنے جی کو نہیں گوارا

تنک اس قدر نہیں ہیں اس زندگی سے ہم اب
جو آرزو کریں پھر اُٹھنے کی حشر کو تب

ہونٹوں پہ یہ دعا ہے ہر روز اور ہر شب — یکحرف کاش کے ہو روز جزا بھی یارب
کس کو دماغ اتنا جو پھر جیے دوبارا

ہوش و دل اور ایماں یہ تو گئے تھے سارے — موجب تو زندگی کا اپنا نہ تھا پیارے
تجھ سے کہیں سو کیا اب کہ ہم ستم کے مارے — آنسو سے پونچھتا تھا کچھ جو کبھو ہمارے
سو صبر ظلم دیدہ کل رات سے سدھارا

اب دل اٹھا تو منعم تعمیر خانماں سے — کیا فائدہ رہا ہے گر کچھ نشاں مکاں سے
رہنے کبھی کو دینگے جانا گیا کہاں سے — آواز بھی نہ آئی اک در جواب واں سے
کس کس کے در پہ جا کر کل میں بہت پکارا

موت اسکے ہاتھ سے ہو اس سے تو کیا ہے بہتر — پر جی میں حسرتیں ہیں تب آئے ہے یہ جی پر
غیروں سے ٹک کہو یہ کا سے مدعیو اکثر — تلوار اس کو دیکر بھیجا کرو نہ ادھر
جی جائے ہے ہمارا کیا جائے ہے تمہارا

اب وہ نہیں کہ ہر سو طوفاں کا خطر ہے — یا میر سیل آیا ابر سیاہ تر ہے
مت پوچھ رود کوئی آتا جو یاں نظر ہے — اس گریہ ہی کا اب تک کچھ کچھ کہیں اثر ہے
دریا نے تو جہاں سے کب کا کیا کنارا

رباعیات

میر تقی میر دہلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رباعیات

دامن عزلت کا اب لیا ہے میں نے
دل مرگ سے آشنا کیا ہے میں نے
تھا چشمۂ آب زندگانی نزدیک
پر خاک سے اسکو بھر دیا ہے میں نے

رباعی

اے تازہ نہال عاشق پامالی
یہ تو نے طرح ناز کی کیسی ڈالی
سب تجھ سے جہاں بھرا ہے تس پہ ویسے
دیکھیں ہیں کہ جا ہے گی تیری خالی

ایضاً

افسوس ہے عمر ہم نے یوں ہی کھو دی
دل جس کو دیا ان نے نہ کی دلجوئی
جھنجھلا کے گلا چھری سے کاٹا آخر
جھل میں بھی عشق میں کرے ہے کوئی

ایضاً

طاعت میں جواں ہوتے تو کرتے تقصیر
وہ سر میں نشہ نہیں ہوئے ہیں اب پیر
اب کی روزوں میں یہ سنا ہے ہم نے
میخانے میں بیٹھے معتکف ہو کر میر

ایضاً

پردہ نہ اٹھے تو بے حجابی نہ کرو
ہووے گی قیامت اک شتابی نہ کرو
عالم عالم بسے ہے خلق عالم
برباد نہ دو ابھی خرابی نہ کرو

رباعی

رووے کوئی کیا گئی جوانی یوں کر
جاتی ہے نسیم و گل کی نکہت جوں کر
پیری آندھی سی میر ناگہ آئی
ہم برگِ خزاں سے اسمیں ٹھہریں کیونکر

ایضاً

کیسا احسان ہے خلق عالم کرنا
پھر عالم ہستی میں مکرّم کرنا
تھا کار کرم ہی اے کریم مطلق
ناچیز کفِ خاک کو آدم کرنا

ایضاً

اللہ کو زاہد جو طلب کرتے ہیں
ظاہر تقوے کو کس سبب کرتے ہیں
دکھلانے کو لوگوں کے دنوں کی ہے صلوٰۃ
پیشِ انجم نماز شب کرتے ہیں

ایضاً

اُترا تھا غریبانہ کنارے آکر
لب خشک موا سو نورِ چشم حیدر
تر حلق دم آب سے م سکا نہ ہوا
اے آبِ فرات خاک تیرے سر پر

ایضاً

بتخانے سے دل اپنے اُٹھائے نہ گئے
کعبے کی طرف مزاج لائے نہ گئے
طورِ مسجد کو برہمن کیا جانے
یاں مدّتِ عمر میں ہم آئے نہ گئے

ایضاً

لو یار ستمگر نے لڑائی کی ہے
ایک ہی تلوار میں صفائی کی ہے
اس کوچے کی راہ نعش میری جاوے
واں میر بہت میں نے گدائی کی ہے

ایضاً

ملتا دلخواہ اب خیال اپنا ہے
جی تن میں رہا ہے سو وبال اپنا ہے
آزار بہت کھینچے ہیں اس بن دل نے
ہجراں ہی شاید کہ وصال اپنا ہے

ایضاً

دل جان جگر آہ جلائے کیا کیا
درد و غم و آزار کھنچائے کیا کیا
ان آنکھوں نے کی ہے ترک دم داری
دیکھیں تو ہمیں عشق دکھائے کیا کیا

ایضاً

چپکا چپکا پھرا نہ کر تو غم سے
کیا حرف و سخن عیب ہے کچھ محرم سے
آخر کو مرے رہتے جنوں ہوتا ہے
اے میر کوئی بات کیا کر ہم سے

رباعی

کیا کہیے ادا بتوں سے کیا ہوتی ہے
جو دل زدگاں پہ یہ جفا ہوتی ہے
یہ کیا کہ سجود میں نہ دیکھا بگڑے
اک وقت نماز بھی قضا ہوتی ہے

ایضاً

اب وقت عزیز کو تو یوں کھوؤ گے
یہ سوچ کے غفلت کے تئیں روؤ گے
کیا خواب گراں یہ میل روز و شب ہے
جاگو ٹک میر پھر بہت سوؤ گے

ایضاً

ہر پیچ بہت ہے شکن زلف سیاہ
وارفتہ نہ رہ اُس کا دلا بیگہ و گاہ
دیوانگی کرنے کی جگہ بھی ٹک دیکھ
جاتی ہے یہ کوچۂ زنجیر میں راہ

ایضاً

جاناں نے ہمیں کچھو نہ جانا افسوس
جو ہم نے کہا سو وہ نہ مانا افسوس
تب آنے میں دیر کی قیامت اب کہ
آیا نزدیک جی کا جانا افسوس

ایضاً

ہر لحظہ رلاتا ہے کڑھاتا ہے مجھے
ہر آن ستاتا ہے کھپاتا ہے مجھے
کل میں جو کہا رنج سے حاصل میرے
بولا ترا آزار خوش آتا ہے مجھے

ایضاً

اے میر کہاں دل کو لگایا تونے
شکل اپنی بگاڑ کر کڑھایا تونے
جی میں نہ ترے حال منھ پر کچھ رنگ
اپنا یہ خیال کیا بنایا تونے

ایضاً

گو میر کا احوال نہایت ہے سقیم
کہتے ہیں اُسے شافی و کافی و حکیم
وہ غیر کرم بندے کے حق میں نہ کرے
یہ بات مکرمت سے ہے اللہ کریم

ایضاً

دل جن کے بجا ہیں انکو آتی ہے خواب
آرام خوش آتا ہے سہاتی ہے خواب

ہیں غمزدہ کیا اپنے دنوں کو روؤں
میری تو جہاں شب ہوئی جاتی ہے خراب

رباعی

دنیا میں بڑا روگ جو ہے الفت ہے
ورق آگئے ہیں جی سے بھی یہ زحمت ہے
کہتے تھے کہ میر بیوفا ہم کو جان
کی خوب وفا تم نے تمھیں رحمت ہے

ایضاً

ان تنگ دہن میں اُسکے جاتا ہے نہیں
کب آپ میں آکے کوئی پاتا ہے ہمیں
ہرگز وہ کمر وہم میں آتی ہی نہیں
رہ رہ کے یہی خیال آتا ہے ہمیں

ایضاً

ندوہ کچھے عشق کے سارے دل میں
اب درد لگا رہنے ہمارے دل میں
کچھ حال نہیں رہا ہے دل میں اپنے
کیا جانیے وہ کیا ہے تمھارے دل میں

ایضاً

سن سوز دروں کو اُسکے جلنے بجھنے
ہر حرف پہ افسوس سے سر کو دھنے
کیا کیا اب سانجھ سے کہے گا عالم
آدھ کٹک میر کی کہانی سن نے

ایضاً

کیا کیا ہیں سلوک بد فقط غم ہی نہیں
پھر ہم سے جنوں میں ضعف سے دم ہی نہیں
اک عمر چلی گئی جفائے شب و روز
اب وہ تو نہیں شام سحر ہم ہی نہیں

ایضاً

کیا کہیے خراب ہوتے ہم کیسے پھرے
دیکھا یہ بھی گو کہ سب کی نظروں سے گرے
چپ ایسے ہیں گویا کہ نہیں منھ میں زباں
جب نام ترا لیں تو زباں اپنی پھرے

ایضاً

شب ابر کہ پیش رو ہو دریا جس کا
آیا دل داغ کر گیا جس تس کا
اس سے ناگاہ ایک بجلی چمکی
کیا جانیے اُس نے گھر جلایا کس کا

ایضاً

ہم میر سے کہتے ہیں نہ تو رویا کر
ہنس کھیل کے ٹک چین سے بھی سویا کر
پایا نہیں جانے کا وہ در نایاب
کڑھ کڑھ کے عبث جان کو مت کھویا کر

رباعی

ابرو سے مہِ نو نے کہاں خم مارا
ہونٹھوں سے ترے لعل نے کب دم مارا
زلفوں کو تری ہم بھی پریشاں دیکھیں
اک پیچ کو ان دونوں نے برہم مارا

ایضاً

جاں سے ہے بدن لطیف درد ہے نازک
پاکیزہ ہے تیری طبع و خو ہے نازک
بلبل نے سمجھ کے کیا تجھے نسبت دی
گل سے تو ہزار پردہ تو ہے نازک

ایضاً

پوچھو نہ کچھ اس بے سروپا کی خواہش
رکھتی نہیں حد اہلِ وفا کی خواہش
جاتے ہیں چلے جی ہی بتوں کی خاطر
معلوم نہیں کیا ہے خدا کی خواہش

ایضاً

دل غم سے ہوا گداز سارا اللہ
غیرت نے ہمیں عشق کی مارا اللہ
ہے نسبتِ خاص تجھ سے ہر اک کے تئیں
کہتے ہیں پہ تجھے سب ہمارا اللہ

ایضاً

وصف اپنے دلوں کے کس سے کہیے سارے
اس شوخ کی تمکیں نے تو جی ہی مارے
باتوں میں چھپا منھ نہ کبھو یوں پوچھے
کہہ میر گئی ہے رات کیونکر بارے

ایضاً

آبِ حیواں نہیں گوارا ہم کو
اس خط [illegible] محبت نے [illegible]ارا ہم کو
دریا دریا تھا شوقِ بوسہ لیکن
جاں بخش لبِ یار نے مارا ہم کو

ایضاً

ہر چند کہ طاعت میں ہوا ہے تو پیر
[illegible] بات مری سن کہ نہیں بے تاثیر
تسبیح بکف پھرنے سے کیا کام چلے
منکے کی طرح دل نہ پھرے جب تک میر

ایضاً

کیا میر تجھے جان ہوئی تھی بھاری
جو اس بتِ سنگدل سے کی تھی یاری
بیمار بھلا کیا کوئی ہووے اس کا
پرہیز کرے جس سے خدائی ساری

ایضاً

در پیش ہے میر راہ تجھ کو پیارے / غفلت سے نہیں نگاہ تجھ کو پیارے
آتے ہیں نظر جاتے یہ سارے اسباب / سوجھے گی کبھو بھی آہ تجھ کو پیارے

رباعی

کچھ میر تکلف تو نہیں اپنے تئیں / ان روزوں نہیں پاتے کہیں اپنے تئیں
اب جی تو بہت ہی تنگ آیا اے کاش / جاویں ہم چھوڑ کر کہیں اپنے تئیں

ایضاً

راضی ٹک آپ کو رضا پر رکھیے / مائل دل کو تنک قضا پر رکھیے
بندوں سے تو کچھ کام نہ نکلا اے میر / سب کچھ موقوف اب خدا پر رکھیے

ایضاً

حیرت ہے کہ ہو رقیب محرم تیرا / ہر روز وائیں وقت و ہمدم تیرا
یوں عکس ترے سامنے اکثر وہ ہو / جوں آئینہ منھ تکا کریں ہم تیرا

ایضاً

ہم سے تو بتوں کی وہ حیا کی باتیں / وہ طرز کلام اس ادا کی باتیں
دیکھیں قرآں ہیں فال غیروں کے لیے / کیا ان سے کہیں یہ ہیں خدا کی باتیں

ایضاً

دل خوں ہے جگر داغ ہے رخسار ہے زرد / حسرت سے گلے لگنے کی چھاتی میں ہے درد
تنہائی و بیکسی و صحرا گردی / آنکھوں میں تمام آب منھ پر سب گرد

ایضاً

کچھ خواب سی ہے میر یہ صحبت داری / اٹھ جائیں گے یہ بیٹھے ہوئے یکباری
کیا آنکھوں کو کھولا ہے تنک گوش کو کھول / افسانہ ہے پل مارتے مجلس ساری

ایضاً

دل خون ہوا ضبط ہی کرتے کرتے / ہم ہو ہی چکے دکھوں کے بھرتے بھرتے
اے مایۂ زندگی ستم ہے یہ اگر / بھر آنکھ تجھے دیکھیں نہ مرتے مرتے

ایضاً

مستی نہ کر اے میر اگر ہے ادراک / داماں بلند ابر نمط رکھ تو پاک

ہے عاریتی حبابۂ ہستی تیرا
ہشیار کہ اس پر نہ پڑے گرد و خاک

رباعی

کیا تم سے کہوں میر کہاں تک رووں
رووں تو زمیں سے آسماں تک رووں
جوں ابر جہاں جہاں بھرا ہوں غم سے
شایستہ ہوں رونے کا جہاں تک رووں

ایضاً

میر اس سے ملے کہ جو ملا بھی نہ کبھو
جی یوں ہی گیا وہ آ پھرا بھی نہ کبھو
چپ چپکے لیے لگ گئی ایسی ان کو
ان نے کچھ زیر لب کہا بھی نہ کبھو

ایضاً

کیا کوفت ہے تحت دل کے کوٹے نکلے
ٹکڑے جو ہوئے جگر کے کوٹے نکلے
چھاتی جو ٹھنی نداں جلتے جلتے
اس میں کے پھپھولے سارے پھوٹے نکلے

ایضاً

تم تو اے مہرباں انوٹھے نکلے
جب آن کے پاس بیٹھے روٹھے نکلے
کیا کہیے وفا ایک بھی وعدہ نہ کیا
سچ یہ ہے کہ تم بہت ہی جھوٹے نکلے

ایضاً

کیا کیا اے عاشقی ستایا تو نے
کیسا کیسا ہمیں کھپایا تو نے
اول تھے سلوک میں کہیں کا نہ رکھا
آخر کو ٹھکانے ہی لگایا تو نے

ایضاً

کیا میر کا ذکر کریں سب سے جہل
پایا ہم نے اسے نہایت ہی سہل
ایسوں سے نہیں مزاج اپنا مانوس
وحشی بھی بدزبان و نا اہل

ایضاً

حیرت کی یہ مرکے کی جا ہے بارے
کیا پوچھتے ہو مرتے ہیں عاشق سارے
مشہور ہے عشق نے لڑائی ماری
بس پڑ کے گئے لوگ سب اس کے مارے

ایضاً

ملیے اس شخص سے جو آدم ہووے
ناز اس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرم سخن تو گرد آوے یک خلق
خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

رباعی

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے
خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلت کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر
مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

ایضاً

مدت کے جو بعد جی بحال آتا ہے
خاطر پہ جہاں جہاں ملال آتا ہے
وے دن گئے جان یوں چلی جاتی ہے آہ
رہ رہ کے ہمیں یہی خیال آتا ہے

ایضاً

ہے تجھ سے محال جی اٹھانا مجھکو
پھر جیتے جی کہے کوئی سیانا مجھکو
سر میرا لگا ہے نقش پا سے تیرے
سجدہ کو خدا کے بھی بچانا مجھکو

ایضاً

ہیں گو کہ سبھی تمھاری پیاری باتیں
پر جی سے نہ جائیں گی تمھاری باتیں
آنکھیں ہیں ادھر روئے سخن اور طرف
یاروں کی نظر میں ہیں یہ ساری باتیں

ایضاً

ایسا نہ ہوا کہ ہم نے شادی کی ہو
یا سیر بہار و باغ و وادی کی ہو
پژمردہ کلی کے رنگ اس گلشن میں
غالب ہے یہی کہ نامرادی کی ہو

ایضاً

اتنے بھی نہ ہم خراب ہوتے رہتے
کاہے کو غم و الم سے روتے رہتے
سب خواب عدم سے چونکنے کے ہیں وبال
بہتر تھا یہی کہ وہیں سوتے رہتے

ایضاً

ہم میر برے اتنے ہیں وہ اتنا خوب
متروک جہاں ہم ہیں وہ سب کا محبوب
ہم ممکن اسے وجوب کا ہے رتبہ
ہے کچھ بھی مناسبت کا باہم اسلوب

ایضاً

گو روکش کیقباد و دولت ہم ہیں
مرآت بدن نمائے وحدت ہم ہیں
بے اپنے نمود اسکی اتنی معلوم
معنی محبوب ہے تو صورت ہم ہیں

ایضاً

محشر میں اگر یہ آتشیں دم ہو گا — ہنگامہ سب اک لپٹ میں برہم ہو گا
تکلیف بہشت کاش مجکو نہ کریں — ورنہ وہ باغ بھی جہنم ہو گا

رباعی

ہر صبح مرے سر پہ قیامت گزری — ہر شام نئی ایک مصیبت گزری
پامال کدورت ہی رہا یاں دن رات — یوں خاک میں ملتے ہمکو مدت گزری

ایضاً

اب شہر کی گلیوں میں جو ہم ہوتے ہیں — منھ خون جگر سے دم بدم دھوتے ہیں
یعنی کہ ہر ایک جاے پہ جوں ابر بہار — عالم عالم جہاں جہاں روتے ہیں

ایضاً

اندیشۂ مرگ سے ہے سینہ سب ریش — ٹکڑے ہے جگر جیسے لباس درویش
ہاتھوں سے جو آج ہو سکے کر لیجے — پھر کل تو ہمیں ہے اک قیامت درپیش

ایضاً

تسبیح کو مدتوں سنبھالا ہم نے — خرقہ برسوں گلے میں ڈالا ہم نے
اب آخر عمر میر مے کی خاطر — سجادہ گرو رکھنے نکالا ہم نے

ایضاً

اب صوم و صلوۃ سے بھی جی ہے بیزار — اب ورد و وظائف سے کیا استغفار
عقدے نہ کھلے دل کے بسان تسبیح — اسماے الٰہی بھی پڑھے سو سو بار

ایضاً

ہر روز نیا ایک تماشا دیکھا — ہر کوچے میں سو جوان رعنا دیکھا
دلی تھی طلسمات کہ ہر جاگہ میر — ان آنکھوں سے ہمنے آہ کیا کیا دیکھا

ایضاً

آئی نہ کبھو رسم تلطف تم کو — کرتے نہ سنا ہمیشہ تاسف تم کو
مرتے ہیں ہم اور منھ چھپاتے ہو تم — ہم سے اب تک بھی ہے تکلف تم کو

ایضاً

ہجراں میں کیا سب نے کنارا آخر — اسباب گیا جینے کا سارا آخر

نے تاب رہی نہ صبر دیار آخر — آخر کو ہوا کام ہمارا آخر

رباعی

میر اُس کے ہوئے تھے ہم جو یار خاطر — سو یاری بخت سے ہیں یار خاطر
وہ خاک میں آپ کو ملا کر اوّل — آخر کو ہوئے ہیں یوں غبار خاطر

ایضاً

بس حرص و ہوا سے میر اب تم بھاگو — غفلت کتنک کیے ہمارے لاگو
چلنے کی خبر دے ہے سفیدی مو کی — ہونے آئی ہے صبح اب تو جاگو

ایضاً

حاصل نہیں دنیا سے بجز دل ریشی — رکھتی نہیں اعتبار یاری خویشی
توفیق رفیق ہو تو سب کر کے ترک — ہے جی میں کہ یکچند کریں درویشی

ایضاً

ہر چند کہ اے مہ اب تمامی ہے گی — پر ہم جو گلہ کریں تو خامی ہے گی
بندے ہیں ترے کیونکہ کریں سرتابی — خدمت تیری ہمیں غلامی ہے گی

ایضاً

زانو پہ قدم خم شدہ سر کو لایا — جائے دنداں کو ہم نے خالی پایا
آنکھوں کی بصارت میں تفاوت آیا — پیری نے عجب سماں ہمیں دکھلایا

ایضاً

اوقات جوانی کے گئے عشرت میں — ایام لڑکپن کے کٹے غفلت میں
پیری میں جز افسوس کیا کیا جائے — یکبارہ کمی ہی آگئی طاقت میں

ایضاً

تا چند تلطف میر حیا سے ہوگا — شائستۂ صد ستم وفا سے ہوگا
کر ترک ملاقات بتاں کعبے چل — ان سے ہوگا سواب خدا سے ہوگا

ایضاً

وہ عہد گیا کہ جور اُس کے سہیے — وہ بات نہیں رہی کہ چپکے رہیے
جب جی ہی چلا گیا تو صرفہ کیا ہے — بیصرفہ جو کچھ کہ منھ میں آئے کہیے

رباعی

حُسنِ ظاہر بھی ہے ہمارا دلخواہ — محو صورت بھی ہوں ہیں معنی آگاہ
باغِ عالم کو چشمِ کم سے مت دیکھ — کیا کیا ہیں رنگ یہاں بھی اللہ اللہ

ایضاً

جس وقت شروع یہ حکایت ہوگی — رنجیدگی یکدگر نہایت ہوگی
احوال وفا کا اپنے ہرگز مجھ سے — مت پوچھ کہ کہنے میں شکایت ہوگی

ایضاً

گزرا یہ کہ شکوہ و شکایت کیجے — یا آگے سخن اور حکایت کیجے
خوب اتنی تو اب مجھ پہ رعایت کیجے — دل میر مرے تئیں عنایت کیجے

ایضاً

مسجد میں تو شیخ کو خروشاں دیکھا — میخانے میں جوشِ بادہ نوشاں دیکھا
اک گوشۂ عافیت جہاں میں ہم نے — دیکھا تو محلۂ خموشاں دیکھا

ایضاً

کاہے کو کوئی خراب خواری ہوتا — کاہے کو ہمیں یہ جان بھاری ہوتا
دلخواہ طلب ہوتا تو تو سنتے — ہے کاشکے عشق اختیاری ہوتا

ایضاً

اک مرتبہ دل پہ اضطرابی آئی — یعنی کہ اجل مری شتابی آئی
گھبراتا ہے ناتوانی سے جی — عاشق نہ ہوئے کہ اک خرابی آئی

ایضاً

اک وقت تھے ہم بھی خوش معاشی کرتے — ہر نالہ سے سینے دل خراشی کرتے
آتے جو کبھو اُدھر کو سنتے اُس کو — ہم گریہ سے اپنے آبپاشی کرتے

ایضاً

مت مال کسی کا یار تل کر رکھنا — تو داؤ نہ یاں بہت سنبھلکر رکھنا
آیا تو قمار خانۂ عشق میں تو — سربازی ہے یاں قدم سنبھلکر رکھنا

ایضاً

اغلب ہے وہ غم کا بار کھینچے گا میر
منھ دیکھو کہ شکل یار کھینچے گا میر
بیٹھا ہے بنانے اسکی چشم میگوں
نقاش بہت خمار کھینچے گا میر

رباعی

یکسو یہ کہ عیش و کامرانی کرلیے
یا خوب طرح سے زندگانی کرلیے
سگ کا نہ ہوا ہمیں تو رتبہ حاصل
تا کوچے کی اس کے پاسبانی کرلیے

ایضاً

کیا کرلیے بیاں مصیبت اپنی پیارے
دن عمر کے میر غم میں گزرے سارے
رنج و ضعف و بلا اذیت محنت
پنپا ہی نہیں تو ان دکھوں کے مارے

ایضاً

پھر عشق میں میر پانوں دھرتا ہے گا
جی اور منغّص اپنا کرتا ہے گا
سب ملکے چلو بلا سے سمجھا آویں
افسوس کہ وہ جوان مرتا ہے گا

ایضاً

دل تجھ پہ چلے نہ کیونکہ میر ابتیاب
یاں تجھکو توقع ہے کہ لاتا ہے جواب
واں ان نے شراب پی کے مستی میں میر
کر کھائے بھی نامہ بر کبوتر کے کباب

ایضاً

کہتا ہے یہ اپنی آنکھوں دیکھیں گے فقیر
بینش نہیں رکھتے کیا جواں ہوں کیا پیر
اندھے ہیں جہاں کے لوگ سارے اے میر
سوجھے نہ جسے اسے یہ کہتے ہیں بصیر

ایضاً

پیغمبر حق کہ حق دکھایا اس کا
معراج ہے کمترین پایا اس کا
سایہ جو اسے نہ تھا یہ باعث ہے گا
کل حشر کو سب پہ ہوگا سایا اس کا

ایضاً

چپکے رہنا نہ میر دل میں ٹھانو
بولو چالو کہا ہمارا مانو
اک حرف نہ کہہ سکوگے وقت رفتن
چلنے کو زبان کے غنیمت جانو

ایضاً

کی حسن نے تجھ سے بیوفائی آخر
خوبی نہ رہی نہ میرزائی آخر

اس سبز قدم نے خاک اڑا دی آخر	رونق نہ رہی غبار خط سے منھ پر

رباعی

یاروں کو کدورتیں ہیں اب تو ہم سے — جس روز کہ ہم جائیں گے اس عالم سے
اس روز کھلے گی صاف سب پر یہ بات — اس بزم کی رونق تھی ہمارے دم سے

ایضاً

کوچے میں ترے آن کے اڑ بھی نہ بیٹھے — بے پیچ ہر اک بات پہ لڑ بھی بیٹھے
حاصل کہ ہمارے تیرے ہرگز نہ بنی — سو سو طرحوں سے ہم بگڑ بھی بیٹھے

ایضاً

تیرا اے دل یہ غم فرو بھی ہوگا — اندیشۂ رزق کم کبھو بھی ہوگا
کھانے کو دیا ہے آج حق نے تجھ کو — کل بھی دیوے گا کل جو تو بھی ہوگا

ایضاً

کچھ عمر کہ اب فکر امیری کریے — بن آوے تو اندیشۂ پیری کریے
آگے مرنے کے خاک ہو جیے ہے میر — یعنی کہ کوئی روز فقیری کریے

ایضاً

ہیں قید قفس میں تنگ یوں تو کب کے — رہتے تھے گلے نہ رنجیدے سب کے
اس موسم گل میں میر دیکھیں کیا ہو — بے جان کو بے کلی نہایت اب کے

ایضاً

رنجش کی کوئی اس کی روایت نہ سنی — بے مہر فقط کسو وقت حکایت نہ سنی
تھا میر عجب فقیر صابر شاکر — ہم نے اس سے کچھو شکایت نہ سنی

رباعیات مستزاد

دلی میں بہت سخت کی اب کی گزران — دل کو کر سنگ
غیرت نہ رہی عاقبت کا نہ نشان — کھینچا ننگ
یاروں میں نہ تھا کوئی مروت جو کرے — جیتے تھے گھر
تا مد نظر صاف پڑے تھے میدان — عرصہ تھا تنگ

رباعیات مستزاد

ٹک میر زمانے سے نہ کر قال مقال — بس اب چپ رہ
ہر چند خموشی ہے سخن گو کو وبال — ایذا ہی سہہ
ایسا نہیں یہ قصۂ کاہش افزا — جو ہوا خسر
اٹھ سوئیے ہو چکا ہے پچھلوں کا حال — آگے مت کہہ

ایضاً

ہستی کا یہ ہنگامہ تمام اس کا ہے — اب تو ہے وبال
شہرت کہ جواب جہاں جہاں برجا ہے — سو وہم و خیال
جھونکے ہیں اڑے باد فنا کے جب اب — تب ہیچ ہے سب
پھر نام سوا جہاں میں رہتا کیا ہے — عنقا کے مثال

ایضاً

منعم جو نبھے ترے بناتے گھر در — تھا عہد شباب
پیری میں بنا وہم پہ رکھنا اکثر — ہے کچھ بھی حساب
اب جی ہی لگا ضعف سے ڈھنے تیرا — یہ کیا ہے خیال
طاقت صرف عمارت دل ہی کر — اے خانہ خراب

ایضاً

تا چند غم دل سے حکایت کریے — ہو ہو کے ترنگ
کس کس سے شب و روز شکایت کریے — آتا ہے ننگ
سختی کوئی اے صنم کہاں تک کھینچے — ہے جی میں کہ اب
ہو نالہ ترے دل میں سرایت کریے — پر تو ہے سنگ

ایضاً

کیا کیا آتی ہے اپنے جی میں لیکن — کیا کہیے کہ آہ
محراب میں سر ماریے کب تک بجھ بن — غم ہے جانکاہ
تو مست گزارہ ہووے غیروں کی جا — چھپ چھپ کر رات
ہم پھیرتے تسبیح پھریں سارے دن — سبحان اللہ

قطعات

اللہ کیا جگر تھا جفا میں حسینؑ کا — جی ہی گیا ندان رضا میں حسینؑ کا
اُس تشنہ لب کا عرش سے برتر ہے مرتبہ — خوں تھا سبیل راہ خدا میں حسینؑ کا

قطعہ

جو لے قاصد وہ پوچھے میر بھی ادھر کو چلتا تھا — تو کہیو جب چلا ہوں میں تب سکا جی نکلتا تھا
سماں افسوس بیتابی سے تھا کل قتل میں میرے — تڑپتا تھا ادھر میں یار ادھر ہاتھوں کو ملتا تھا

قطعہ

قصہ تمام میر کا شب کو سنا کیا — بے درد سر بھی صبح تلک سر دھنا کیا
ل چشم بھی نگہ نے دھتورا دیا مجھے — جس پر نہ چھوڑا دل کو میں تنکے چنا کیا

ترکیب بند

میر تقی میر دہلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترکیب بند

میری تو بساط چشم تر ہے
سو نذر ہے اس پہ گر نظر ہے
اس دشت میں زندہ ہوں عجب میں
ہر گام پہ جان کا خطر ہے
گرمی تو کر اے صنم کہ آخر
پتھر کے جگر میں بھی شرر ہے
پیری میں بھی بوجھ ٹک نہ پکڑا
زاہد تو تو مستوز خر ہے
مرتا ہوں جو میں تو عیب مت کر
عاشق میں تو ایک یہ ہنر ہے
کیا ہوتا ہے قتل گہ میں دیکھیں
تیری شمشیر میرا سر ہے
کہہ تو ہی کہاں تلک کریں صبر
ہم ہیں دشنہ ہے اور جگر ہے
آنے سے ترے نہ دل میں میرے
خوباں یہ تو تمھارا گھر ہے
لبریز گلہ ہوں گرچہ لیکن
ہونٹھوں پہ نہ حرف کا اثر ہے

چپ ہوں گویا ہوں بے زباں میں
رکھتا ہوں عجب لب و دہاں میں

تقصیر ہے بوالہوس کی اور مفت
مارا جاتا ہوں درمیاں میں
اُکسا بھی نہ تیغ تھا کے بارے
فارغ ہوا دے کے امتحاں میں
ے شغل کرے گا بعد میرے
مارا گا ہے کو یہ جواں میں
ہوں میں تو چراغ آخر شب کا
کوئی دم کا ہوں میہماں میں

دلسوزی مری کرے صبا ٹک — ہونے تئیں صبح کے کہاں ہیں
رونے ہی کو روتا ہے گا ناصح — پھرتا ہوں ڈبائے خانماں میں
کوئی نہیں شہر غم میں میرا — بیچارہ غریب ہونگا یاں میں
غم کہہ کے رلاتا ہوں میں سب کو — تجھ غم میں ہوا ہوں قصہ خواں میں
پائی نہ وفا کسی میں دیکھا — عمر بال تمام کر جہاں میں

بارے میں یہ سب دیار دیکھا
ہر کوچہ کو بار بار دیکھا

سب ہی عالم میں ہو گئی تھی — اپنے دل کا غبار دیکھا
آنکھیں گئیں روتے روتے لیکن — تو نے نہ ادھر کو یار دیکھا
اب وعدہ مگر زیادہ بس ہم — جاناں ترا اعتبار دیکھا
کہتے تھے یہ ہم نہ کر تمنا — اے جان امیدوار دیکھا
دامن میں گرا ہو ٹکڑے ٹکڑے — ہم نے جی کو فگار دیکھا
آنکھوں سے اٹھایا آبلوں کے — صحرا میں جدھر کو خار دیکھا
پوچھا نہ ہمارے بعد ہمکو — یارو یہ جہاں کا پیار دیکھا
مدت تئیں دید کر جہاں کا — طرز و وضع و شعار دیکھا

دیکھا تو ملا نہ کوئی ہم فن
دیکھے یہاں شیخ اور برہمن

عقل اول کو اک سنا تھا — نکلا سو معارضے میں کودن
آنکھوں میں ٹھہر رہے ہیں آنسو — ہونٹھوں پہ دھرا رہے ہی شیون
شیوہ ہے ہمارا نالہ کرنا — یاں سے کچھ سیکھ مرغ گلشن
تجھ بن نہیں سانس اور کچھ ہے — چبھتا ہے جگر میں ہو کے سوزن
اے برق ادھر نہ آ ہمارے — ہر خوشے میں شعلوں کے ہیں خرمن
ہم وے ہیں کہ باغ کر دکھائیں — اشک گلگوں سے طرف دامن
سختی ایام کی جو کہئے — ہوویں ایسی موم سنگ و آہن
کیا تجھ سے سپہ گری جتا دیں — گر خود و زرہ نہ ہو نہ جوشن

مجروح یہ ہینگے ہم جو اُڑ جائیں
بھاگے ابھی جان سے تہمتن

ایسے تو ہیں پر وفا میں ویسے
خوباں تم ہو جفا میں جیسے

پھر جاتے ہیں غیر اس سے ملنے
آتے نہیں باز ایسے تیسے

ہم رستم عشق ہینگے کیونکر
منھ موڑیں ہزاروں پاپیے سے

سرکش نہ ہو زیر چرخ ان نے
پامال کیے ہیں کیسے کیسے

ہے بندہ نواز ظلم مجھ پر
ہم نالہ نہ کر تو مجھ کو نے سے

گو موسم تر سے خنک ہو مجھ سے
دل گرمی ہے مجھ کو زور مے سے

ٹک دیکھ فلک نے شاہ خوباں
کیا کچھ کیے خاندان کیسے

سر دیجے سو عشق میں رکھے پا
واقف نہیں دل تواں کی پیسے

ہاتھوں میں مرے ہیں تیغ خوباں
کہتے ہیں کہ اس کنے ہیں پیسے

کیا تجھ سے کہوں معاش اپنی
بارے گزرے ہے جیسے تیسے

رہتا ہے غمِ عشق ہمیشہ سودا
کوچہ کوچہ ہوا ہوں رسوا

وہ تشنہ دہن ہوں دل جلا ہوں
لب جس کا نہ ہووے دریا

سمجھے ہو جسے فلک ہوا ہے
میرے ہی غبار دل سے پیدا

کھلتا تو سہی کبھی بلا سے
دل میرا ہی کاش غنچہ ہوتا

اب جان سے جاتا آ رہا ہے
موقوف اشارۂ تقاضا

ہو جس کی خراب عاقبت بھی
وہ میں ہوں کہ دین ہے نہ دنیا

میں ہوں کہ سر آمد جنوں ہوں
مجنوں کو خلیفہ[1] میں کیا تھا

وہ خستہ ہوں میں ہی جس کو کہیے
رونق افزائے کوہ و صحرا

یہ کچھ جو ہیں کہ گیا بتاں میں
خاطر میں تمھاری بھی کچھ آیا

پایو نہیں بجا میں کچھ تو بولو
خواہاں ہو تو خامشی ہے یہ کیا

سودا نہیں کچھ دگر نہ مجھ کو
کرتا ہے کوئی زیان جی کا

[1] خلیفہ۔ جانشین۔ نائب ۱۲

گر اتنے پہ دل برا ہے میرا
موقوف کرو خدا سے میرا

تم کو تو ہے کیا مرے ملے سے
پر اس میں بتاں بھلا ہے میرا

مرنے سے ڈراتے مجکو قاتل
جی دینا تو مدعا ہے میرا

زنہار رہنا کہ اُس کے پا پر
مدت سے یہ سر لگا ہے میرا

سودا بڑھا ہے مل ہر اک سے
لگتا صنم اس میں کیا ہے میرا

یک نیم نگہ سے مول لے چک
ٹک دیکھ کہ یہ بہا ہے میرا

میں ہوں کہ ہلاہلِ الم سے
کٹ کٹ کے جگر گرا ہے میرا

جاؤ کہ رہو یہ جی جفا سے
کچھ ہو شیوہ وفا ہے میرا

کاکل کو نہ کھول اُلجھنے کو
دل زور ہی من چلا ہے میرا

جوں توں کر کے طپش نے شب کو
مژگاں پہ جگر رہا ہے میرا

کل تک تو مرا یہ دل بجا تھا
اپنا دلخواہ مدعا تھا

تھے جن و ملک جلو میں میری
اقبال مرا کوئی بلا تھا

تھا روئے زمیں پہ شاد و خرم
کیا جانوں فلک کے جی میں کیا تھا

ایسا ہی نہ تھا بتو میں آ گئے
آخر کوئی میرا بھی خدا تھا

ہوتے جو شہیدِ یک تمنا
سو سو طرفوں نے خوں بہا تھا

اک روز چنانچہ ہولِ دل سے
اندوہ تنک سے مجھے ہوا تھا

لوہو دیا اپنا دوستوں نے
جس جاگہ مرا عرق گرا تھا

ہوں اب جو بلا میں مبتلا میں
بیگانہ ہے جو کہ آشنا تھا

یہ رنج و بلا و درد و محنت
اے وائے حواس و صبر و طاقت

ایدھر بھی کبھو ٹک ایک چشمک
ہم سے بھی ضرور ہے مروت

مت فرصتِ وقت سے ہو غافل
آخر کو نہ کھینچے تا خجالت

ہر آن میں اپنی تربیت کر
دیتا ہے زمانہ کس کو فرصت

غیروں کے رہو گے دیر تک تم
ہم کو تو سویرے کریے رخصت
کیا تم سے کہیں سلوک ہجراں
دل میں نہ رکھی ہمارے حسرت
قطرہ تو ہے پر نہ ہاتھ اٹھاؤ
دریا کو کرے ہے یہ کفایت
خالی دل میر کو ہم بھی کرتے
افسوس نہ دی اجل نے فرصت
بس میرا ہو تو کروں منادی
کوئی نہ کرے کہیں محبت

گردن ماریں شتابی اس کو
رکھے جو کسی سے میر الفت

ترکیب بند دیگر

عمر گزری ہو چکا آسودگی کا روزگار
رنج و محنت کے تئیں آرام سے ہے ننگ و عار
معرکہ ہے یکطرف دونوں ہوئے ہیں سامنے
زخم دل کی یہ ہنسی وہ گریۂ بے اختیار
حملہ ہے گھر رہے یکطرف ہیں کتنے جو یہ
صبر سے بے طاقتی دل اور درد بے شمار
عاشقی جب کی تھی میں نے تب نہیں یہ خواریاں
کیا کہوں کیا کچھ دکھاتا ہے مجھے اب ہجر یار
سینہ دیکھو چاک منہ ناخن سے سب نوچا ہوا
آنکھیں دیکھو دل خونیں جی کو دیکھو بیقرار

آنکہ گفتی عشق را درماں بہ ہجراں کردہ اند
کاش بشنو کہ ہجراں را چہ درماں کردہ اند

اک کنارے وے تو جو ہیں لگے زمیں کے زیریاں
خاک پر بسمل پڑے ہیں کیسے کیسے شیریاں
دو قدم پر ہے یہ ہنگامہ ترے کوچے کے بیچ
آشنائی کچھ نہیں لگنے کی تجھ کو دیریاں
منہ پہ کھانے والے تلواروں کے بھوکے موت کے
سیکڑوں ایسے ہیں وے جینے سے جو چھوٹے سیریاں
دھڑ نہیں سر ہی پڑے ہے سر نہیں تو دھڑ ہی د
ہیں زیارت کردنی صد کشتۂ شمشیریاں
غم زدے بے خانماں ہو رہتے ہیں بےکس غریب
زخموں کے دامن کے منہ پر ہو رہے ہیں تقریریاں

گر تو ہم آئی بے طوف شہیداں دور نیست
گریہ می آید در ہنجار و چنداں دور نیست

لے لپیٹ اک آن میں وحشت سے یہ سارا جہاں
خاک اوڑا مرا ایک دم میں کارواں در کارواں
تیرہ کر عالم کو رہ سر رہ یہ گرد و غبار
چشم ار روشن تو ہو آوارۂ کون و مکاں

یُمن بخشے طے کیا کرنا زمیں کا تیرے تئیں
کھینچنا سر کا مبارک ہو تجھے تا آسماں
لیکن اتنا ہی بر آشفتہ نہ ہو جانا کہیں
پیشرو رکھتے ہیں سارے خاطرِ واماندگاں
سو خدا ناکردہ ہم کہتے نہیں اس راہ سے
کوئی دم وقفہ کرے یا دیر ہووے تجکو یاں

یکقدم اے گرد باد دامنِ صحرا بایست
در قفا ماندہ است مشتِ خاکِ تنہا بایست

گرچہ ہجراں میں ترے جاناں تھا جی میرا چلا
پر یہ تھا دل میں کہ شاید دیوے تو دادِ وفا
وصلِ خاطر خواہ تو معلوم تھا میرے تئیں
اُس دل کو لگ رہی تھی جبتلک تھا میں جدا
گاہ باشد رحم کو بھی رحم فرماوے وہ شوخ
دیکھ مجھ ناکام کو یکدم کرے ترکِ جفا
ایک ساعت پاس بیٹھے دردِ دل میرا سُنے
کرکے غمخواری کرے یہ تیرے تئیں کیا ہو گیا
سو تو یہ سب ہو چکا ہے کاشکے ملتا نہ تو
ایسے آجانے کا تیرے کون یاں مشتاق تھا

آمدی و حسرتِ وصل از دلم برداشتی
حسرتے بود از وصال آں ہم بمن نگذاشتی

ہیں خرابے آج جتنے کل یہ تھے لوگوں کے گھر
مت بنائے خانہ میں منعم رہا کر اس قدر
طاقِ کسریٰ تو سُنا ہوگا کہ کیسا تھا محل
اب کہیں اس طاق کا کسریٰ کے پیدا ہے اثر
گھر کا صاحب تو اُڑایا کرکے یکساں خاک سے
اینٹ ماریں اینٹ سے یہ کچھ ہوا اس گھر اوپر
خطِ باطل سے لکھا ہے صفحۂ کون و مکاں
کیوں دماغ اتنا جلاتا ہی رہے ہو تو کدھر
کیسے کیسے خانوادے خاک میں یاں مل گئے
جائے عبرت ہے یہ معمورہ جہاں کا بے خبر

ہر ب [illegible] ہ بینی خشت در ویرانۂ
ہست فردِ دفترِ احوالِ صاحب خانۂ

کم بہت سُننے میں آتا ہے کوئی رنجور ہے
یا کسی مجروح کا زخمِ جگر ناسور ہے
روشنی آنکھوں کی ہے منظور ساری خلق کو
قوتِ دل کا جدھر دیکھو تدھر مذکور ہے
ہم کنے بھی تھے یہ دو آتش کے پرکالے کبھو
ان سے ہم ایذا جو کھینچی ہے کسے مقدور ہے
ایک نے مارا چھڑک کر جی سے ہم کو آب داغ
ایک نے جیسا جلایا اب تلک مشہور ہے
ہمکو حیرانی ہے اس میں جسکو سُنتے ہیں اُسے
ان ہی دونوں آفتوں کی پرورش منظور ہے

ہر شکِ گرم و آہِ آتشیں دیدیم و بس
بہرہ گر ز چشم و دل دیدیم این دیدیم و بس

دل نہیں مجھ کو ملا یہ کوئی جی کا ہے وبال
گفتنی ہو تو کہوں لے میر میں کچھ اسکا حال

خود بخود جاتا ہے کہتا آرزو کیا ہے اسے
چاہتا ہے سیم و زر یا کوئی دلبر خوش جمال

یاد میں میری ہوا ہو کچھ سبب تو ہے عجب
عشقبازی مفلسی آزردگی رنج و ملال

نے کسو کے گیسو و کاکل کا وابستہ ہوں میں
نے کسی کے چاند سے مکھڑے کا مجھکو ہے خیال

کیا کروں ایذا سے بے موجب غرض مجھ سے بیاں
نے غم درد جدائی ہے نہ اندوہ وصال

نیستم عاشق بظاہر لیک میکاہد دلم
عمر بگذشت و ندانم چہ می خواہد دلم

میر تقی میر دہلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسدس در نعت سرور کائنات صلعم

جرم کی کچھو شرمگینی یا رسول — اور خاطر کی حزینی یا رسول
کھینچوں ہوں نقصانِ دینی یا رسول — تیری رحمت ہے یقینی یا رسول

رحمۃ للعالمینی یا رسول
ہم شفیع المذنبینی یا رسول

لطف تیرا عام ہے کر مرحمت — ہے کرم سے تیرے چشم مکرمت
مجرم عاجز ہوں کر ٹک تقویت — تو ہے صاحب تجھ سے ہے یہ مسئلت

رحمۃ للعالمینی یا رسول
ہم شفیع المذنبینی یا رسول

کیا سیہ کاری نے منھ کالا کیا — بات کرنے کا نہیں کچھ منھ رہا
رحم کر خاکِ مذلت سے اٹھا — میرے عفو جرم کی تخصیص کیا

رحمۃ للعالمینی یا رسول
ہم شفیع المذنبینی یا رسول

اب ٹھہر ٹک نہیں پائے ثبات — دستگیری کر کر پاؤں میں نجات
جرم کیا ہیں میری کتنی مشکلات — ہے کفایت ایک تیری التفات

رحمۃ للعالمینی یا رسول
ہم شفیع المذنبینی یا رسول

دہر زیر سایۂ لطفِ عمیم ——— خلق سب وابستۂ خُلقِ عظیم
تجھ سے جو یائے کرم عاصم اثیم ——— سخت حاجتمند ہیں ہم تو کریم

رحمۃ للعالمینی یارسول
ہم شفیع المذنبینی یارسول

ہو رہے ہیں ہم جو دوزخ کے حطب ——— سر پہ یہ اعمال لائے ہیں غضب
رکھتے ہیں چشمِ عنایت تجھ سے سب ——— تجھ سوا کس سے کہیں احوال اب

رحمۃ للعالمینی یارسول
ہم شفیع المذنبینی یارسول

نیک و بد تیرے ثنا خوان ہیں ہم ——— لطف تیرا آرزو و بخشش امم
ملتفت ہو تو تو کاہے کا غم ——— تو رحیم اور مستحقِ رحم ہم

رحمۃ للعالمینی یارسول
ہم شفیع المذنبینی یارسول

روؤں ہوں شرمِ گنہ سے زار زار ——— بے عنایت کچھ نہیں اسلوبِ کار
دل کو جب ہوتا ہے آ کر اضطرار ——— زیرِ لب کہتا ہوں یہ میں بار بار

رحمۃ للعالمینی یارسول
ہم شفیع المذنبینی یارسول

سبز برپا ہوگا جب تیرا نشاں ——— آفتابِ حشر میں بہرِ اماں
ہووے گی انواعِ خلقت جمع واں ——— کیوں نہ ہو سایے میں اس کے دو جہاں

رحمۃ للعالمینی یارسول
ہم شفیع المذنبینی یارسول

رو سیاہی جرم سے ہے بیشتر ——— رو سفیدوں میں تخجل مجکو نہ کر
ایک کیا آنکھیں ہیں میری ہی ادھر ——— تجھ سے راجی ہے بصر اہلِ نظر

ن راجی

رحمۃ للعالمینی یارسول
ہم شفیع المذنبینی یارسول

کچھ بھی جو ہیں واقفِ راز و نیاز ——— عام تجھ انعام پر کر چشم باز

جنس دل مفت ہے سینے میں عجب کیا ہی جو لے
غمزے وے دزد ہیں آنکھوں سے چرالیں کاجل

شیخ کے قد کی درازی کے تئیں حال میں دیکھ
یاد آتا ہے جوانوں کے تئیں رقص جمل

کودنے کو جو اُٹھا سر پہ اٹھالی مجلس
دیکھیے بیٹھے جو پھر اونٹ تو بیٹھے کس کل

پردے میں دوستی کے میر کا جی تک تولیا
مدعی کتنے تھے اُس کے یہ محبت بیتل

کیا ہیں اندھیر فلک کے کہ نہیں ملتی داد
روز خورشید نکلتا ہے جلا کر مشعل

جو ہے سو دست بدل خاک بسر ہے اس سے
میں بھی نکلوں ہوں سدا منھ پہ کف خاک کو مل

موئے سر تک تو عدو دیدۂ شور اُس کا ہے
آج دیکھے کسو سر پہ تو اُسے چاہے کل

پنجۂ خور کو زراندود کیا اُن نے جسے
مرتعش باندھے ہیں اکثر شعرا بعضے شل

سُرخ رہتی ہے مژہ خط شعاعی سے ہنوز
چشم خورشید سے کھوئی نہ کبھو اُن نے سبل

درد سر میں ہے جو موجود ہے دور اسکے میں
صبح نکلے ہے سدا ماتھے کو ملکر صندل

وقت ہے اپنے نصیری کی مدد کا یا شاہ
روز و شب رہتی ہی اُس موذی ہی سے جنگ و جدل

مطلع ثالث

اے کہ اک تو ہی ہوا عالم اسرار ازل
اے کہ سو جان سے عاشق ہی ترا حسن عمل

تیری وہ ذات مقدس ہے کہ لیتے ہوئے نام
منھ سے ناخواستہ بھی صلّ علیٰ جائے نکل

تیری درگاہ میں جبریل کے پر کیوں نہ جلیں
یہیں ہے نور جلالی خدا عز و جل

دور از بسکہ کھنچا عرش سے رتبہ تیرا
حرف تیرا ہے ترے شیعوں کو وحی منزل

مرحبا شاہی تری صل علیٰ جاہ ترا
کہ ہوا تخت ترا دوش نبی مرسل

فرش ہونا ترے زائر کا سعادت تھی ولے
کیا کرے چادر مہتاب کہ تھی مستعمل

وہ نہ تھیں خسروا اے عالم اسرار آلہ
مانتے جسکو گئے دہر کے کامل اکمل

آخر اب آکے ترے درس میں نکتہ یہ کھلا
ناقص محض چلا جائے تھا عقل اوّل

جی میں گذرے بھی تو نکلے ہے ترے درس کے بیچ
معنیِ تازہ سے بدلا ہوا لفظ مہمل

رفع بدعت پہ جب آوے تری طبع اقدس
کیا عجب شعلہ آواز سے جل جا نرسل

لقمۂ ظلم نہیں بچتا عدالت میں تری
باز نگلی ہوئی چڑیا کے تئیں دے ہی اُگل

حالت نزع میں گر نام زباں پہ ہو ترا
یک رمق جان حیات ابدی سے ہو بدل

بسکہ غالب ہے ترا سعد ستارا ہے عجب
پہونچے گر حشر تلک نوبت شاہی زحل

کیا ترے کشف بیاں کرنے کی کہیے تاثیر
طبع گوینده پہ یاں حال ہوا مستقبل

تو غضب ہوئے مبادا کسو اوپر کہ شہا
مرگ ٹلتی بھی ہے پر ٹلتی نہیں یکدل

تب ہوا دین محمدؐ کا بزور شمشیر
تو نے برہم کیے جب کتنے ہی ادیان و ملل

حبذا حق سے یہ نسبت کہ رہی بھی موقوف
تجھی پر مصلحت کار خداوند اجل

سن کے یہ نظم و نسق دہر میں جو تو نے کیا
جمع ہو جاتے ہیں شاعر کے حواس مختل

کوئی یوں سرکشی سے اپنی کہے کچھ لیکن
سجدہ ہی کیجے تجھے یہ ہے ترا قدر و محل

جی میں ہے اور بھی مطلع کے تئیں کریے نمود
دل کو تسکین نہیں بخشتا وصف مجمل

مطلع رابع

اے کہ طاقت سے زمانے میں تری ضرب مثل
تجھ زور کے آگے ترے یہ چرخ بجل

یکطرف میں نے کیا فرض ترے بندے کو
دوسری سمت کیا جمع عدو کا دنگل

کشتنی مدعی کی اور کئی میں کیسے کہوں
ہر جواں برج سا ہر کوہ کے مانند اچل

میان سے جبکہ گھسیٹی اُدھر اُن نے تلوار
باعث تیرگی چشم تھی وہ برق اجل

در بھی آگئی یک بار صف اعدا میں
ایک دو ہاتھ کے چلنے میں پڑی یہ ہلچل

تیرگی بخش جہاں بسکہ ہوا سرمہ گرد
چشم خورشید فلک پر تھی مثال مکحل

رستم و سام جسے فرض کرے تو دل میں
نعرہ کر سامنے آواز کیا جب آنکل

کھل گیا دوش سے لے تا کمر اللہ اللہ
ایک ہی زخم ہے دشمن کے گلے کی ہیکل

برہمی کارگہ رزم کی مت پوچھ کہ تھا
کوہ پر کوہ فلک پر تھی زمیں دل پر دل

جمع ہو آیا تھا اس یک پر اک جم غفیر
اکثر اس میں سے گئے مارے کچھ اک بھاگے دہل

کر کے سرگوشی جسے پوچھتے ہیں بھاگے ہوئے
آتی ہے غیب سے آواز ہوا وہ فیصل

یہ ہے یا خالی ہے میدان مگر اسکی تیغ
اژدہا تھی کہ گئی خلق کو یکدم میں نگل

کیا بیاں کیجیے اب لشکر اعدا کی معاش
مخرج خوں ہے وہاں زخم کو بھیگا مدخل

چھوٹے ہے زخم سے ہر ایک کے فوارہ خوں
ہر طرف دشت میں جاری ہے لہو کی جدول

سرخ تر چشم شجاعاں میں نظر آتی ہے
خون سے مسلخ قصاب سی خاک مقتل

قطعہ

کیا لکھوں اسپ سبکسیر کی اُسکے تعریف
دہم خامہ بھی لکھتے ہوئے جاتا ہے اچھل

جب عناں اسکی اُچک لیتا ہے اسکا رکاب
جلدی پویہ میں دکھلاوے ہے کیا کیا چھل بل

اس فلک سیر کا میدان مقرر رہیگا
تگ و پو کے لیے اثنائے ابد اور ازل

آگیا اس میں نظر جانا کسو شخص کو تو
مارتے پل کے گیا اُس کو چھلاوا سا چھل

قابو پانے کے لیے اسکے سوار اُس پہ سدا
کہتے ہیں مدعی اس اسپ کے تئیں ہارے چل

راکب اُس کا کرے ہے سنکے تبسم یہ بات
یعنی ان گیدیوں کے کچھ ہے دماغوں میں خلل

جان یہ ہے ترے گھوڑے میں کہ تا روز جزا
گرد کو اسکے نہ پہونچے گی کبھو اُس کی اجل

اک مصور نے اسے دیکھ کے دوڑایا خیال
دیکھوں اس باد کی مجھسے بھی سکے شکل نکل

سرو سینہ کو کمر تک تو بنایا رکھ ہاتھ
اُڑ گیا صفحۂ کاغذ پہ سے چھوتے ہی کفل

آبلے جیسے ستارے ہیں مرے دل کے بیچ
بس کہ اس چرخ سیہ رو سے رہا ہوں میں جل

آج تجھ نیرِ اعظم کی خلافت کا ہے روز
داد دے میری کہ دیکھوں ہیں اسے مستاصل

صاف ہو زنگ دل میر کہ احباب میں ہے
واسطے تیرے مخالف کے ہیں تیغیں صیقل

قصیدہ در مدح حضرت علی مرتضیٰ کرّم اللّٰہ وجہہٗ

اک شب کیا تھا یار تری زلف کا خیال
اب تک ہے دشمنی میں مری میرا بال بال

میں مر گیا فراق میں پر اب یہ کیا ہے ظلم
جیتی گڑی ہے ساتھ مرے حسرت وصال

جنبش ہوئی مژہ کو ادھر گر گئی سناں
ابرو ہلے ترے کہ ادھر کٹ گیا ھلال

آیا ہے یاد قیس بہت اب کہ ہوں تبنگ
اسکے بھلاوے مجکو نہیں چھوڑتے غزال

خوشوقت ٹک تو ہوں یہ کہیں کا نہیں ہوں پھر
آزردہ ہوئے مجھ سے اگر خاطر ملال

رنگ اُڑ گیا تبھی کہ ہوا تجھ سے چہرہ گل
رکھے ہے اب نسیم کی سیلی سے منھ کو لال

دوزخ ہی میرے شرم گنہ کی عرق میں غرق
لیکن نہیں ہنوز مجھے ٹک بھی انفعال

خوش قامتی کو آہ کے کب پہونچتا ہے سرو
ہے یہ تو باغ رنگ شکستہ کا نونہال

حیرت بسا ہی جان کو اپنی تمام عمر
ٹک چشم آئینہ نے ترا دیکھ کر جمال

یک روز بے نقاب ہوا تھا تو صبح کو
ابتک ہے آفتاب جہاں تاب پر زوال

تھی سیر ترے کوچہ میں عشاق کی معاش
کتنے شکستہ دل تھے بہت تھے خراب حال

جینے غرض تھے سب کو یقیں تھا کہ مرچکے / کوئی نہ تھا کہ جسکو ہو جینے کا احتمال
کبتک صفت بتوں کی خدا سے تو خوف کر / اے طبع رہ نہ اتنی بھی پابند خط و خال
پڑھ منقبت یہ شاہ کی جس سے نجات ہو / وہ شاہ جسکے ایک گدا کو ہے یہ کمال
بخشش سے جسکی حرف طلب محو ہو گیا / کم اُسکے وقت میں ہے بہت نوبت سوال
ہے معن اُس کے مطبخ عالی کا کاسہ لیس / دستارخوان کا اُسکے ہے حاتم اک اشتمال
آوے اگر عطا و کرم پر وہ ایک دم / خسرو کی ہفت گنج تو پھر کیا ہیں چیز مال
کہتا ہوں اب میں مطلع ثانی کہ ہوں تنگ / وسعت رکھے ہے بسکہ یہ میدان قیل و قال

مطلع ثانی

اے نائب مصاحب داور بیہمال / دے شوکت شریک خداوند لایزال
تو ہے کہ تیرے عدل کی نظم و نسق کو سُن / اُٹھ جائے دفعۃً ہی مزاجوں سے اختلال

قطعہ

چاہے خدا نخواستہ اس کا اگر تو رغم / تو منحرف مقام سے ہو خطِ اعتدال
شاہا ترا غلام ہو ایک اور یک طرف / سنگیں ہو فوج دشمن اگر کوہ کی مثال
تیر و کماں کو ہاتھ میں لے جب ہو سامنے / ہے اُسکو اپنے زور شجاعت سے یہ کمال
جسدم کہ زور بازو سے آکر لگا وے تیر / بھوئیں دو سار ہو دیں اگر انہیں جبال
چٹکی سے اُسکی ہو کے جدا تیر یہ لگا نے / جو اُسکے سامنے ہو اُسے اُسکے لاگے بھال
اُس کی کہ جسکے سینے میں مارے ہو تیر بخش / منھ دیکھو مدعی جو رکھے اپنے تئیں سنبھال
پشت عدو کی ادھر ہو پیکان یوں نمود / جیسے کہ سانپ بیٹھے ہے بانبی سے سر نکال

قطعہ

بالفرض اس پہ چوٹ کرے آکے مدعی / خالی دے اُسکے وار کو دیوے زمیں پہ ڈال
اس جھوک ہی میں ہاتھ مع تیغ ٹوٹ جائے / گردن کٹا دے مفت گرے سکہ ہو نڈھال
سنتے تھے وہ مثل سو نہیں ہوتی ہے درست / دست شکستہ اپنی ہی گردن کا ہے وبال

قطعہ

جو کوئی آہنی ہوں ترے مدعی سے شہا / تنہا ترا غلام ہے تلوار اور ڈھال
[illegible] ہاتھ جیسے گرکے گرے سبکو دے اٹھا / [illegible]ے زمیں پہ جسکو پکڑ کر کمر دوال

ٹھہرے ورے پرے تو نہایت غریب ہے
تحت الثرےٰ سے گر نہ پرے جائے بدسگال

یوں دیکھ ایک دو کو کنارا کرے شتاب
میدان کارزار سے رستم برنگ زال

شیر فلک کو راہ بھلا دیوے وہ دھمک
اس زلزلے میں گاوِ زمیں سیکھ جائے چال

قطعہ

مَن بعد اور باقی رہیں جتنے گشتنی
گر جمع ان کو زور شجاعت سے پیل بال

تلوار سے پھرے وہ تو پھر جائے روزگار
نعرہ کرے تو تن سے کرے روح انتقال

اہل سلاح ترس سے گر گر پڑیں بہت
جتنوں کے ہو گلے میں زرہ انکا ہو یہ حال

نعرے سے اسکے یوں ہی بہت یوں رہ گریز
بھاگیں ہیں جیسے شیر کی آواز سے شغال

حصہ رسد کو لئے ہو وہ رکھ جائے ایک تیغ
گزرے نہ ایک دم بھی کہ قضیہ ہو انفصال

زخم اسکے ہاتھ کا جو لگے یہ نہ ہو کبھی
مٹ جائے کائنات مگر تب ہو اندمال

قطعہ

تر ہو گئی ہے بسکہ لہو میں گِل زمیں
گر خشک ہووے خاک کہیں بعد ماہ و سال

ہو پھر گزار باد صبا سے یہ واں کا رنگ
اڑتا ہے جیسے ہولی کے ایام میں گلال

میلان طبع مطلع ثالث کی اور ہے
تاخیر پر قصیدۂ غرا کا ہو مآل

مطلع ثالث

لائق تری صفت کے صفت میری ہے محال
آشفتہ طبع شاعر خستہ کی کیا مجال

ق

تو وہ درِ مدینۂ علم علیم ہے
جس شخص کو نہ آوے الف بے تے ذال ڈال

آوے تری جناب مقدس میں ایک دم
کرتے ہیں واں تو دقت سبھی طرز کے مقال

عالم ہوا اسقدر کہ بیاں کیا کرے کوئی
پھر بحث اُس سے عقل فلاطون پہ ہے دال

لیتے ہیں تیرے گھر سے گدا پوست تخت فقر
پاتے ہیں تیرے در سے شہا مکنت و جلال

جبتک جیوں ہیں دل میں مرے آرزو ہے یہ
ہوں سر سے تیرے زائرِ درگہ کا پائمال

پھر بعد مرگ حوض پہ کوثر کے یا علی
جاگہ مری ہو حشر کی تیری صفت نعال

جب ہوں میں گرم راہ ترے سائیں شہا
ہو جائے سرد آتش دوزخ کی اشتعال

جبتک جیے گا محو ثنا ہی رہے گا میر
ہے تیری منقبت سے نپٹ اسکو اشتغال

ہو لے حرام تیرے محبوں کو درد و غم
شمشیر دوستاں پہ ہو خونِ عدو حلال

قصیدہ در مدح حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ

غنچے ہو دل پر آتے ہیں آزردہ اب مدام
پہونچے ہے مجکو داغ گل جبتک صبح و شام

اے کجروش تو نامہ نہ لکھ بھیج مت پیام
قاصد کا میرے سیدھی طرح سے تو لے سلام

دل میں نہیں ہے قطرۂ خوں آنکھیں ہیں گی تر
خالی پڑا ہے شیشہ مے بھر رہے ہیں جام

ناکامیوں سے کام رکھا میں تمام عمر
گو کام دل حصول نہ ہو مجکو کیا ہے کام

اے رشک ماہ عید نہ کر انتظار کش
مکھڑا دکھا دے چاند سا ٹک کے پشت بام

زنجیر پا ہے اُس کی تری زلف غالباً
مدت ہوئی نسیم نہیں کرتی ابتسام

چلتا ہے تو تو جاتے ہیں کتنوں کے جی چلے
آ اب کسو کی مان لے موقوف کر خرام

آوارگی سے دل ہی کی آسودگی کو چھوڑ
ناموس عافیت کو اڑا کیا ننگ و نام

گر جانتا مژہ کو تری تیغ کیں تو میں
دو چار جانیں اور بھی کر لاتا قرض و دام

رونے کا تار باندھ تفرج نہیں ہے خوب
ہے آنسوؤں کا سلک گہر کا سا انتظام

اکدم تری گلی میں گیا تھا میں سیر کو
لبریز بوئے خوں سے ہے اب تک مرا مشام

صیاد نے اسیر کیا مجکو یہ عبث
میں ٹک جیا نہ فرط تپیدن سے زیر دام

آنکھوں سے اُسکی چشم وفا میرؔ ہے غلط
وحشی ہیں یہ غزال نہ ہونگے کسی سے رام

چشم طمع کو سی لے کہا تو کہ جیتے جی
سُرمہ ہوئے ہیں پسکے الم سے مرے عظام

اے شیخ تنی ہرزہ درائی جرس کی طرز
اس گفتگو کا فائدہ کہ حاصل کلام

یعنی امیر شاہ نجف کی صفت پہ آ
وہ شاہ جس پہ سارے کمالات ہیں تمام

وہ شاہ ہے کہ بعد نبی کے وہی ہے پھر
وہ شاہ ہے کہ حق سے وہی ولیں نام

گر جاتے دل گرفتہ جہاں میں ہو کوئی
کر دے یہ ننگ غنچۂ پیکاں کو ابتسام

ورنہ شگفتگی یہ بلائے عظیم ہے
پھوڑے نہ زخم سینۂ عاشق بہک التیام

مطلع ثانی

شاہا ترے گدا کو ہے مشہور احتشام
شاہان سرفراز ہیں سب اُسکے پائے نام

قطعہ

ہو اسپ پر سوار کرے عزم جنگ اگر
میدان کارزار میں ادنےٰ ترا غلام

جولاں کرے جدھر کو رہے اُسطرف نہ خاک — اُڑ جائے خاک اُدھر کی جدھر کو پھرے لگام
پامال اسقدر ہوں کہ معلوم بھی نہ ہوں — افراسیاب کون ہے رستم ہے یاں کدام

قطعہ

شمشیر اُس کے خرمن اعدا کی ہے جو برق — آوے گر اسکے ہاتھ میں یک لحظہ بے نیام
ہل جائے اور ٹک صف اعدا کی اور کو — بے سر ہیں پھر تو مد نظر تک بدن تمام
یہ بات میں کہوں ہوں نظر کر کے مایؤل — گر آسماں پہ جائے تہ خاک ہے مدام
شاہا ترے غلام کے حملے کی کس کو تاب — گو پہلواں ہزاروں لیے آئے اس پہ سام
وہ سام بن نریماں کہ اب تک جہاں کے بیچ — افسانے اُسکے زور کے کرتے ہیں دھوم دھام
اک ایک کو زمیں میں دے گاڑ اُس سمیت — تحت الثرےٰ کو جائے مع اپنے اژدحام
طبقہ زمیں کا جائے اُکھڑ اُسکے زور سے — چنداں عجب نہیں کہ ہوا ہووے تیرہ فام
ازبس اُڑے ہے خاک جدھر دیکھو تس طرف — جاتے ہیں کور چشم تماشائی ہو عوام
مطلع کروں ہوں اور بھی موزوں میں اس جگہ — تا ہو بخیر خوبی قصیدے کا اختتام

مطلع ثالث

اے بعد فوت ختم رسل صاحب اہتمام — وے اوّلیں امام و سزاوار احترام
ازبسکہ تیرے نقش سے گم ہیں محرّمات — رسام کھینچے خفت اگر چاہے ارتسام
عصفور کس شمار میں پر تیرے عدل سے — گنتی نہیں ہے باز شکاری کی اعتصام
تو ہے کہ تجھ کو ذات خدا سے ہے ربط خاص — تو ہے کہ ساری خلق پہ تیرا ہے فیض عام
تو ہے کہ تیرے مہر کے سائے میں روز حشر — محفوظ آفتاب قیامت سے ہوں انام
ہیں سہل تیرے چشم کے آگے خرابیاں — مشکل یہ ہے کہ ہووے فلک کا نہ انہدام
چاہے تو اعتدال زمانہ ٹک ایک اگر — ایک ہی ہوا ہے پھر تو جہاں میں علی الدوام
چاہے اگر تو یہ کہ نہ رو پوش ہووے روز — تہ کر کے شب اُٹھا ہی رکھے پردۂ ظلام

قطعہ

گرمی کرے تنک بھی اعانت تری تو پھر — آجائے پختگی پہ مرا یہ خیال خام
یعنی کہ دیکھوں حضرت دہلی کی جا نواح — معلوم ہے سوائے ترے حاصل کلام
ہرگز نہ ہو حلال عدو پر ترے خوشی — ہووے تمام تیرے محبوں پہ غم حرام

قصیدہ در مدح حضرت امام حسین علیہ السلام

فلک کے جور و جفا نے کیا ہے مجکو شکار
ہزار کوس پہ ہے جائے اک تپیدن وار

خراب کوہ و بیابان بیکسی ہوں میں
برنگ صوت جرس ہر طرف سے میرا گزار

بغیر خوردن خوں کب نہار توڑتے ہے
سوائے گریۂ صبح اب کہاں ہے آب خمار

نگیں نہ داغ سو کیوں چھپکے میرے سینے پہ
نمک نہیں نظر آتا بجز رخ دلدار

سو وہ بھی دیکھنا ملتا نہیں ہے گھر بیٹھے
مگر ہوں ہند میں رسوائے کوچہ و بازار

سوائے نالۂ جانسوز کون ہے دلسوز
بغیر آہ سحرگاہ کون ہے غمخوار

جنوں میں جب سے خوش یا لباس عریانی
نہیں ہے دامن صحرا میں تب سے مجکو قرار

ہمیشہ ساتھ ہے دامن سوار لڑکوں کے
مگر کہ خاک وفا سے بنا ہے میرا غبار

عجب ہے مجکو جو تو دیکھنے نہیں آتا
رہا ہوں ایک تری انکھڑیوں کا میں بیمار

ہوا ہوں جور فلک سے بہت ہی زار و نزار
پہونچیو یا خلف الصدق حیدر کرار

شہا غلام کو تیرے ہے زور بازو سے
کہ وقت جنگ جو لیکر کماں کو ہوئے سوار

اگر پہاڑ ہو دشمن تو اسکے سینے میں
کماں سے چھوٹتے ہی تیر بند ہو سوفار

لگا دے چھروں میں دو چار ایسی پے در پے
کہ ایک کا ہو نشاں دوسرے کی جائے قرار

کرے ہے فخر بہت اوج پر فلک شاہا
رضا جو ہو تو کروں تیرے روضے کا بستار

کہ انفعال ہو لاف و گزاف سے اس کو
زمیں ہے صحن کی جسکے یہ گنبد دوّار

کرے ہے جوہر اول نگاہ جس ساعت
تو ایک ہاتھ سے تھامے ہے سر دبر دستار

امام ہر دو جہاں جس کی آستاں کی خاک
رکھے ہے رتبۂ کحل جواہر الابصار

زہے دو روضہ جہاں دیدۂ ملک ہیں فرش
قدم کو رکھتے ہوئے آنیہ آتے ہیں زوّار

اگر طلوع ہو خورشید سامنے اس کے
ہر ایک ذرّے کو واں کے ہے یہ لب گفتار

کوئی کہے کہ یہ کیا شوخ چشم شیر ہے
کوئی کہے کہ یہ ہے ہوش کو رنا ہموار

لیا ہے روز سیہ نے بہت سے ڈھیہ
چلی ہے چھوڑ کے حیراں ہو رخنۂ دیوار

شعاع روضے کے قبّے کی ہے گی عالمگیر
پھر اکا سایۂ شب جہاں میں ہوتا نوار

بصائے گرد یہ نقاشیاں زیں سب اس کی
زمیں ہو یا ہو فلک یا حجر ہوں یا اشجار

باحمدے کہ نبوت ہوئی ہے اُس پر ختم
بمرتضےٰ کہ ولایت مسخر اُن نے کی
بآں امام کہ کشتہ ہے زہر قاتل کا
بآں شہید کہ تشنہ لب و شکستہ دل
کہ جب ہلال محرم نمود ہوتا ہے
بسینہ سوزی داغ و بآتشِ ہجراں
بسرد مہری شیریں بکینۂ خسرو
بعشق دیر بطوف حرم بسعیِ تمام
بآب و رنگِ گلستاں بہ بیکسی اسیر
بساغرِ مے گلگوں بہ توبۂ سنگیں
بدستگیری چاک و بہ بےقراری جیب
بحیرتِ رخِ جاناں بچشمِ وا ماندہ
بہ قلقل و بہ سبو و بلغزشِ ہردم
بہ پوچ گوئی بیتابی و بہ بےخوابی
بہ دیر و برہمن و کفر و یا صنم گوئی
بسیل خانہ خراب و بوادی مجنوں
بخوشہ خوشہ سرشک و بدار بست مژہ
بضعفِ جسمِ نزار و بہ طاقت سرکش
بخاک عاشقِ بے خانماں کہ بادِ صبا
باضطرابِ چراغ و بدشمنی نسیم
بدربدری رنگِ قبول و یاسِ دعا
بخیل خیل خرابی بگوشۂ صحرا
بشوقِ وصل نگار و بجانِ مایوسی
بسینہ کوبی زخمِ جگر بماتمِ مستر
قسم ہے میرے تئیں ان تمام قسموں کی

بفاطمہ کہ وہ ہے بنتِ سیّد مختار
بہادری ہے غلاموں کی جسکے فنّ و شعار
گرے ہیں لختِ دل اُسکے زمیں پہ کتنے ہزار
ہوا ہے دشتِ بلا میں ہیں اب تلک آثار
جہاں میں کرتے قیامت ہیں اُسکے ماتم دار
بآہِ سردِ سحرگاہی و بنالۂ زار
بگرم جوشی فرہاد و سختیِ کہسار
بلوحِ مشہدِ عاشق بسوزِ شمعِ مزار
کہ اسکو کنج قفس میں رہے ہے یادِ بہار
بدلنوازی ساقی با برِ دریا بار
بسینہ کاوی دشنہ بزخمِ دامن دار
بسعیِ باطلِ ناخن بعقدۂ دلِ کار
بہ مستیِ مےِ ناب و بخاطرِ ہشیار
بکم زبانی صبر و بدیدۂ بیدار
بشیخ و مسجد و تسبیح و رشتۂ زنار
بجگر کہ جگر غزالاں بدیدۂ خونبار
بقطرہ قطرہ شراب و بجامِ دستِ یار
بجانِ عاشقِ مسکیں کہ یار پر ہے نثار
نہیں دکھاتی اسے بعد مرگ کوچۂ یار
بخاطرِ دمِ آخر کہ اس سے ہے بیزار
باعتزاز اجابت بحلقۂ اذکار
بخوش سوادی شہر و بقریہ و بدیار
بآرزوئے ہم آغوشی و بہ بخت کنار
بجاں کنی گلوگیر و حسرتِ دیدار
کہ تجھکو علم ہے ان سب کا کیا کروں میں شمار

یہ آرزو ہے مرے دل میں مدتوں سے شہا	رہے نہ بعد مرے ہند میں یہ مشت غبار
اڑا دے اسکو صبا یا تنک کرے پہونچے	تجھ آستان کے آگے کہ ہے فلک کردار
رہے ہمیشہ ترے دوستوں کے ساتھ اقبال	عدو کو تیرے نہ دے فرصت یکدم ادبار

مسدس در منقبت

چیدہ خواروں میں شہ روم ترے صبح و شام	ریزہ چینی سے تری بادشہ چیں کا قیام
حبشی ہندی صفاہانی بخارائی تمام	ہیں ترے دست نگر لیجیے کس کس کا نام

یا علی کیست کہ شرمندۂ احسانِ تو نیست
بر سر خوانِ کرم کیست کہ مہمانِ تو نیست

گرسنہ چشم ترا آدم و سب اُس کے خلف	تو جو دعوت کرے تو آویں فرشتے صف صف
دہر کا راتبہ ہے بحر ترا کشتی بہ کف	مہ و مہر دیکھتے ہیں تیرے ہی ہاتھوں کی طرف

یا علی کیست کہ شرمندۂ احسانِ تو نیست
بر سر خوانِ کرم کیست کہ مہمانِ تو نیست

سایہ گستر دو جہاں کا ہے ترا لطف عمیم	دے تو جنت کی نعیم اور تو ہی نور عظیم
تجھ سے ماموں عطا سب تو کریم ابن کریم	ہووے یعقوب کہ اسحاق کہ ہو ابراہیم

یا علی کیست کہ شرمندۂ احسانِ تو نیست
بر سر خوانِ کرم کیست کہ مہمانِ تو نیست

مردمی کا ترے دریا نہیں رکھتا ہے کنار	ایک موجے میں ترے سیکڑوں بیڑے ہوئے پار
کاڑھے طوفان بلا سے تری ہمت نے بدر	نوح ممنون ہے یونس ہے ترا شکر گزار

یا علی کیست کہ شرمندۂ احسانِ تو نیست
بر سر خوانِ کرم کیست کہ مہمانِ تو نیست

بنی عالم متمتع رہے ہیں تجھ سے مدام	مائدہ طور پہ جو بھیجا تھا ترے ہاں سے طعام
من و سلویٰ تھا فرستادہ کبھو مہر امام	قوت عیسیٰ بھی یہی تھا یہی موسیٰ کا کلام

یا علی کیست کہ شرمندۂ احسانِ تو نیست
بر سر خوانِ کرم کیست کہ مہمانِ تو نیست

ہے بچھا شرق سے تا غرب ترا دستر خوان
آسماں یاں کی گدائی سے بھرے ہے انبان
جس کے مہمان ہے ہر شام و سحر خلق جہان
ماہ و خورشید کو ملتی ہیں یہاں سے دو نان

یا علی کیست کہ شرمندۂ احسانِ تو نیست
بر سرِ خوانِ کرم کیست کہ مہمانِ تو نیست

سرِ شاہانِ زمانہ ترے خاکِ درگاہ
منہ ترا تکتے رہیں عارف و کامل آگاہ
کج رکھیں تیرے بھروسے پہ فقیر اپنی کلاہ
تجھ سے سب پہونچے ہیں مقصود کو قصہ کوتاہ

یا علی کیست کہ شرمندۂ احسانِ تو نیست
بر سرِ خوانِ کرم کیست کہ مہمانِ تو نیست

نام حاتم کا خنک جیسے لطیفہ مشہور
رنگ رنگ اطعمہ ہیں بذل پھر اس درجہ وفور
معن زائد کا ترے بزم میں زائد مشہور
کیا خداوندی ہے اللہ خدائی مشکور

یا علی کیست کہ شرمندۂ احسانِ تو نیست
بر سرِ خوانِ کرم کیست کہ مہمانِ تو نیست

لطف ہے عام ترا سب تجھی سے پاتے ہیں
شکرِ نعمت یہ نہیں تیرا بجا لاتے ہیں
تیری دولت ہے جو یہ شاہ و گدا کھاتے ہیں
اس جہاں سے بھی یہی کہتے ہوئے جاتے ہیں

یا علی کیست کہ شرمندۂ احسانِ تو نیست
بر سرِ خوانِ کرم کیست کہ مہمانِ تو نیست

ارض میں اور سمٰوٰت میں سب تیرا مال
روز بہبود کا تجھ سے سرِ گردوں میں خیال
جس کا گھر چاہے تو کر دیوے اُسے مالا مال
اپنی خوبی کو زمیں رات کرے تجھ سے سوال

یا علی کیست کہ شرمندۂ احسانِ تو نیست
بر سرِ خوانِ کرم کیست کہ مہمانِ تو نیست

فی الحقیقت تری مہمان خلائق ہے سب
رت تجھے ہی کی ہے گوں تیری مروت کا ہی ڈھب
تیرے دروازے سے محروم کوئی آوے ہے کب
جاؤں ناکام اگر میں تو نہایت ہے عجب

یا علی کیست کہ شرمندۂ احسانِ تو نیست
بر سرِ خوانِ کرم کیست کہ مہمانِ تو نیست

کاسہ کیسی ترے مطبخ کی کریں خورد و کبیر
ہاتھ پھیلائے رہے آگے ترے جم غفیر

ظرف ہیں جن کے بڑے سب یہیں کے ہیں فقیر | آدم و جن و ملک شاہ و گدا میر و وزیر

یا علی کیست کہ شرمندۂ احسانِ تو نیست
بر سرِ خوانِ کرم کیست کہ مہمانِ تو نیست

مسدّس در منقبت

درویش جو ہیں مقصدِ دلخواہ کہیں ہیں
اک واقفِ اسرار دل آگاہ کہیں ہیں
سالک جو ہیں وے رہبرِ راہ کہیں ہیں
اک چرخ حقیقت کا تجھے ماہ کہیں ہیں
کیا مدح ہے یہ جو تجھے ہم شاہ کہیں ہیں
سچے ہیں وہی لوگ جو اللہ کہیں ہیں

مذکور کہیں نام ترا کام روا ہے
ہر ایک نے کچھ حسبِ خرد اپنی کہا ہے
مشہور لقب ایک جگہ راہنما ہے
سمجھا نہ کوئی یہ کہ حقیقت میں تو کیا ہے
کیا مدح ہے یہ جو تجھے ہم شاہ کہیں ہیں
سچے ہیں وہی لوگ جو اللہ کہیں ہیں

من بعد نبی باعثِ بہبود تو ہی ہے
کچھ کوئی کہو خلق سے مقصود تو ہی ہے
نزدیک خرد مندوں کے مسجود تو ہی ہے
پہنچیں جو حقیقت کو تو معبود تو ہی ہے
کیا مدح ہے یہ جو تجھے ہم شاہ کہیں ہیں
سچے ہیں وہی لوگ جو اللہ کہیں ہیں

جس روز سے تو تھا نہ کوئی غرفے میں آیا
بالفرض فلک سے بھی اگر ماہ تھا آیا
فتنے کو ترے شور نے تا حشر سلایا
اک روز میں کر خاک بہ سر آپ دکھایا
کیا مدح ہے یہ جو تجھے ہم شاہ کہیں ہیں
سچے ہیں وہی لوگ جو اللہ کہیں ہیں

اس بات کو جانیں ہیں سب آگاہ ہنرکار
قدرت نے کیا حق کی ترے پردے میں اظہار
یوسف نے جب ناز کیا کھینچ کے آزار
صورت سے شفا کی تو جو آکے نمودار
کیا مدح ہے یہ جو تجھے ہم شاہ کہیں ہیں
سچے ہیں وہی لوگ جو اللہ کہیں ہیں

آدم کی انابت تھی شب و روز تری اور
قایل ہیں ترے لے کے سلیمان سے تا مور

جیتے ہیں ملک نام ترا چرخ پہ کر شور
اللہ ری تری شوکت و احسنت ترا زور

کیا مدح ہے یہ جو تجھے ہم شاہ کہیں ہیں
سچے ہیں وہی لوگ جو اللہ کہیں ہیں

ہستی ترا جلوہ ہے ترا شور عدم میں
ہوتا نہ ترا دست حمایت کا جو ہم میں

تیرا ہی تصرف ہے حدوث اور قدم میں
یونس کی توقع نہ تھی ماہی کے شکم میں

کیا مدح ہے یہ جو تجھے ہم شاہ کہیں ہیں
سچے ہیں وہی لوگ جو اللہ کہیں ہیں

پردے میں صدا تھی ترے داؤد کا الحان
جاں بخش دم عیسوی میں تو ہی تھا پنہان

شمہ تھا تری حشمت کا اک نوح کا طوفان
تھا ہاتھ ترا معجزۂ موسیِ عمران

کیا مدح ہے یہ جو تجھے ہم شاہ کہیں ہیں
سچے ہیں وہی لوگ جو اللہ کہیں ہیں

یعقوب کا تھا کلبۂ احزاں میں تو غمخوار
رحمت کا فرشتہ ہو ترے لطف نے پر مار

یوسف کا ملک ہو کے ہوا چہ میں مددگار
کی آتش نمرود براہیم پہ گلزار

کیا مدح ہے یہ جو تجھے ہم شاہ کہیں ہیں
سچے ہیں وہی لوگ جو اللہ کہیں ہیں

الٹا ہے دو انگشت سے دروازۂ خیبر
کیا ہاتھ تھا جس سے کہ گیا جان سے عنتر

چیرا ہے کس انداز سے گہوارے میں اژدر
ظاہر ہے کہ یاں تھا وہی ظاہر وہی مظہر

کیا مدح ہے یہ جو تجھے ہم شاہ کہیں ہیں
سچے ہیں وہی لوگ جو اللہ کہیں ہیں

ثانی ترا پاتے نہیں تسلیم و رضا میں
مشہور سخاوت ہے تری شاہ و گدا میں

ایوب سے ہو صبر ترا سا نہ بلا میں
تیں خود کے تئیں بخش دیا راہ خدا میں

کیا مدح ہے یہ جو تجھے ہم شاہ کہیں ہیں
سچے ہیں وہی لوگ جو اللہ کہیں ہیں

اے وہ کہ تو ہے جان و جہاں سارا ہے قالب
در پہ ترے اکٹھے ہیں ترے سیکڑوں طالب

اک پل میں رد اگر دے تو ان سب کے مطالب | ہم عاجز و عاجز ہیں تو ہے غالب و غالب

کیا مدح ہے یہ جو تجھے ہم شاہ کہیں ہیں
سمجھے ہیں وہی لوگ جو اللہ کہیں ہیں

ہے میر پریشاں دل و آوارہ و مضطر | کیا تیری صفت کر سکے یا حیدر صفدر
ہے وصف ترا حیز امکان سے باہر | کہتے ہیں خرد ور تری قدرت کو نظر کر

کیا مدح ہے یہ جو تجھے ہم شاہ کہیں ہیں
سمجھے ہیں وہی لوگ جو اللہ کہیں ہیں

مسدس در منقبت

جاتی ہے شتابی سے گنتے دن کو پھرتا ہوں خراب | کب تلک اس خاکداں میں جوں بگولا پیچ و تاب
دل تڑپتا ہے جدا جی کو جدا ہے اضطراب | ہر گھڑی تازہ تعب ہر دم نیا ہے اک عذاب

یا علی یا ایلیا یا بوالحسن یا بوتراب
حل مشکل سرور دیں شافع یوم الحساب

اب گرا جاتا ہوں چشم خلق سے ٹک لے سنبھال | دیکھ مت اس سے زیادہ مجھ کو زار و خستہ حال
مرحمت کر مکرمت کر رنج سے مجھکو نکال | کب تلک محزون رہوں میں تا کجا کھینچوں ملال

یا علی یا ایلیا یا بوالحسن یا بوتراب
حل مشکل سرور دیں شافع یوم الحساب

کیا لکھے اعجاز تیرے خامۂ جادو شعار | تو وہی ہے ایک لیکن نام تیرے ہیں ہزار
وقت جب ہوتا ہے تنگ سے قدرت پروردگار | دم لے کر تیرے کہتا ہے ہر اک یوں پکار

یا علی یا ایلیا یا بوالحسن یا بوتراب
حل مشکل سرور دیں شافع یوم الحساب

حاجت اہل جہاں وابستہ تجھ سے ہے مدام | سہل تیرے پاس مشکلیں آسان ہیں دشوار کام
عارف و عامی سبھوں کا ہے وظیفہ ترا نام | زیر لب ہر اک کے رہتا ہے یہی ہر صبح و شام

یا علی یا ایلیا یا بوالحسن یا بوتراب
حل مشکل سرور دیں شافع یوم الحساب

تنگ ہے عرصہ نہایت دم رکا جاتا ہے آہ
لیتے ہیں آنکھیں چھپائے جن پہ جاتی ہے نگاہ
یاں سے جانا بھی نہیں آتا ہے بن لے خضرِ راہ
آستاں بن تیرے دکھلائی نہیں دیتا نباہ

یا علی یا ایلیا یا بوالحسن یا بوتراب
حلِ مشکل سرورِ دیں شافعِ یوم الحساب

حرف زن ہوتا ہوں جب میں تنگیِ احوال سے
لطف بن تیرے چھڑاوے کون اس جنجال سے
صفحہ صفحہ درد کرتا ہے تراوش قال سے
آئی ہے سر پر قیامت شامتِ اعمال سے

یا علی یا ایلیا یا بوالحسن یا بوتراب
حلِ مشکل سرورِ دیں شافعِ یوم الحساب

آسمانِ بے تمیز و بے تہ و دشمن کمال
یعنی سر سہلا کے بھیجا کھا گیا کیسر نکال
دوستی کے پردے میں کرتا ہے مجھکو پائمال
اب تلک جیتے تو ہیں پر زندگانی ہے وبال

یا علی یا ایلیا یا بوالحسن یا بوتراب
حلِ مشکل سرورِ دیں شافعِ یوم الحساب

خاک سے یکساں ہوا ہوں ہو کرم سے دستیار
دل کو میرے جس گھڑی ہوتا ہے شہا اضطرار
ہوں گدا اس آستاں کا کر ٹک اک امداد کار
بار بار آوے ہے منہ پر اس گھڑی بے اختیار

یا علی یا ایلیا یا بوالحسن یا بوتراب
حلِ مشکل سرورِ دیں شافعِ یوم الحساب

سارے عالم سے کرے ہے کجروی چرخِ ترند
غم فردکن کچھ نہیں میرا ہے یہ شعرِ بلند
قافیہ سے تنگ آ کر بس امن کی راہیں ہیں بند
پڑھتے ہیں سب شیخ و شاب ناتوان و دردمند

یا علی یا ایلیا یا بوالحسن یا بوتراب
حلِ مشکل سرورِ دیں شافعِ یوم الحساب

غالباً پہونچے بہم اب میر کو بھی برگِ ساز
شام کہتا ہے یہی رکھ خاک پر روئے نیاز
آبلہ یک بن گیا ہے جملہ تن ہو کر گداز
صبح پڑھتا ہے یہی جائے دعا بعد از نماز

یا علی یا ایلیا یا بوالحسن یا بوتراب
حلِ مشکل سرورِ دیں شافعِ یوم الحساب

مخمس در منقبت

ہادی علیؑ رفیق علیؑ رہنما علیؑ
یاور علیؑ ممد علیؑ آشنا علیؑ
مرشد علیؑ کفیل علیؑ پیشوا علیؑ
مقصد علیؑ مراد علیؑ مدعا علیؑ
جو کچھ کہو سو ہے تو ہاں مرتضیٰ علیؑ

نور یقیں علیؑ سے ہمیں اقتباس ہے
ایمان کی علیؑ کی ولا پر اساس ہے
یوم التناد میں بھی علی ہی کی آس ہے
بیگاہ و گاہ نادعلی اپنے پاس ہے
قبلہ علیؑ امام علیؑ مقتدا علیؑ

دیوانگان شوق کا مت پوچھو معتقد
فہم اس کا تب ہو روح قدس جب کرے مدد
ظاہر اس ایک شان سے شانیں ہیں لاتعد
گہ احمد اس کو کہتے ہیں گاہے اسے احد
شایان حمد و قابل فضل علی علیؑ

نے شہ سے کچھ غرض ہے ہمیں نے وزیر سے
نے اعتقاد شیخ سے نے کچھ فقیر سے
رکھتے نہیں ہیں کام صغیر و کبیر سے
ہے لاگ اپنے جی کو اسی اک امیر سے
مولا علیؑ وکیل علیؑ بادشا علیؑ

پہونچے ہے تیرے ہاتھ تلک کب کسو کا دست
کیا سمجھے شیخ حال کو فطرت ہے اس کی پست
ہوں جوں نصیری ساقی کوثر کا محو دست
مسکن علیؑ نگر ہے مرا میں علی پرست
پیغمبر اس جگہ کا علیؑ ہے خدا علیؑ

شیوہ اگرچہ اپنا نہ [illegible] و غلو و پند ہے
پر اس کو سن رکھا ہے کہ تو کچھ دردمند ہے
کیا ہے جو عرصہ تنگ ہو کام بند ہے
دل جمع کر کہ ہمت مولا بلند ہے
یعنی کرم شعار ہے مشکل کشا علیؑ

اپنی بساط تو ہے علی ہے وہی علیم
کس طور جیتے رہتے نہ ہوتا جو وہ کریم
دیکھیں ہیں سگے او جو بیم ہوتے ہیں سقیم
ہاں کہ وہی ہے شافی و کافی وہی حکیم
عارض ہو کوئی درد ہمیں ہے دوا علیؑ

ہے دوستی علیؑ کی تمنائے کائنات
بے لطف اس کے خیر ہے کیا موت کیا حیات
یعنی کہ ذات پاک ہے اس کی خدا کی ذات
کیا ان مومنوں کے تئیں ہے غم نجات

مرتے ہوئے جنھوں کے دلوں میں رہا علیؑ

یہ کس طرح سے راز کہوں میں زبان سے
یک شب نبی جو نکلے زماں لامکان سے
حالات اس روش کے پرے ہیں بیان سے
ذاتِ مبارک آئی نظر اور نشان سے

تھا بزمِ لامکاں میں بھی رونق فزا علیؑ

خواہش مدد کی غیر سے یہ ہے خیالِ خام
کافی ہے دو جہان میں مولےٰ کا میرے نام
کرتا ہے کب قبول اُسے عاقل تمام
لاریب اُس پہ آتشِ دوزخ ہوئی حرام

اک بار بھی زبان سے جن نے کہا علیؑ

سر تا قدم ثبات دل و جنگی ادب
ظاہر ہوئے ظہور جہاں میں عجب عجب
صورت پکڑ کے سامنے آیا تھا لطفِ رب
محراب میں نہ گرم ہوا تھا کدام شب

سنستا رہا نہ کون سے روزِ غزا علیؑ

عنتر کو نارِ خشم نے اُس کی جلا دیا
خورشید کو نکال دوبارہ دکھا دیا
اژدر کو چیر ایک ہی دم میں کھپا دیا
ہنگامہ کفر و شرک کا آکر مٹا دیا

تھا جانشین ختمِ رسل کا بجا علیؑ

گو چشمِ دل کھلے نہ کسی روسیاہ کی
اللہ رے بلندی تری قدر و جاہ کی
اُس تک مجال کب ہے کسو کی نگاہ کی
مر مر کے جبرئیل نے دربان سے راہ کی

شاہا ملک سپاہ جہانِ صفا علیؑ

دشمن کو آگہی ہے کہ کمک پہنچی کہاں
زور آوری مزاج میں آوے تو الاماں
قدرت سے اُسکی قدرتِ حق ہوتی ہے عیاں
کچھ بھی نہیں ہے پھر یہ جو سب کچھ ہے درمیاں

ارض و سما کے دیوے تلا سے ملا علیؑ

دی تیغ ایسی کس کو کہ جیسی ہو ذوالفقار
گزرے ہیں گرچہ مردم خوب آگے بھی ہزار
مرکب کہاں ہے اُس کے سے ویسے کہاں سوار
پر یہ شرف خدا کی طرف سے ہے یہ وقار

خلقت تو دیکھ کعبے میں پیدا ہوا علیؑ

تھی حق کے ہاں سے احمدِ مرسلؐ کو سروری
نسبت بغیر ہوتے ہیں بے اتحاد بھی
کہتی تھی ساری خلق خدا کی اُسے ولی
لطف و سخا و ہمت و حلم و حیا نبیؐ

جود و عطا و جرأت و مہر و وفا علیؑ

نزدیک سب کے اُسکو ہے درجہ قبول کا | ایک عقیدہ ہے سید و شیخ و مغول کا
کب معتبر ہے حرف کسو بوالفضول کا | باطن علیؑ ہے ظاہر خوب رسول کا
خاک اُس کے فرق پر جو کہے تھا جدا علیؑ

ہر فرد کی زباں پہ علیؑ کی ہے گفتگو | ہر شخص کے تئیں ہے علیؑ ہی کی جستجو
عالم کو ہے علیؑ کی تولا سے آرزو | اپنا ہی کچھ علیؑ کی طرف کو نہیں ہے رو
مقصود خلق و مطلب ارض و سما علیؑ

اک شوق ہے علیؑ کا مرے قلب میں نہاں | شاید یہی نجات کا باعث بھی ہو وہاں
اب زیر لب ہے زیست میں جو میر ہر زماں | اُس وقت میں کہ جان ہو یکدم کی میہماں
اُمید ہے کہ یو نہیں لبوں پر ہو یا علیؑ

منقبت

ہراس روز محشر کیا محمدؐ مصطفےٰ بس ہے | کرم خصلت وفا سیرت علیؑ مرتضیٰ بس ہے
شفیع جرم سوز سینہ خیر النسا بس ہے | نہ نکلے گرچہ دل کے زہر مسموم امام مجتبیٰ بس ہے
ہو منت رو شہید تشنہ کام کربلا بس ہے

رکھے کوئی توقع تو رکھے آل پیمبرؐ سے | طلب ہووے کسی کو کچھ تو ہو اولاد حیدرؑ سے
امانت چاہنا پھر مصطفےٰ ہے یاران دیگر سے | دل اپنا جمع کر رو در قرب شہزادہ و شبر سے
بہت سے گرچہ ہنگامہ ہوے زین العبا بس ہے

ولا باقرؑ کی فرض عین ہے حیدر پرستی میں | جیا کر نام کو اُسکے تو ہشیاری و مستی میں
غرض رہ محو اس کا دشت میں ہو یا کہ بستی میں | عجب ہے تو نہاں کے سایۂ رحمت خدا ہستی میں
کرم اُسکا پے ہر شخص بے برگ و نوا بس ہے

محبت جو ہے صادق جناب پاک جعفرؑ میں | اسی کا شوق دل میں ہو اسی کا شور ہو سر میں
وہ ہر دین نبیؐ نشاں ہی تھا جو کچھ ساقی کوثر میں | عنایت کی اسی سے چشم رکھ آشوب محشر میں
باصد رنگ ہووے کیوں تیک سگی دعا بس ہے

رکھے کاظم کو جو سر پر غم و غصہ سے کیا اُس کو | نہ رکھئے یہ امام دیں بلا میں مبتلا اُس کو
بیک چشمک زدن حاصل ہوا یہ مرتبہ اُسکو | کہ رکھئے نقش جس کے سر پہ دیکھو بادشا اُسکو
توجہ گر نہ ہووے پے بہ سرمدعا بس ہے

جسے اسے مجلس آرایانِ دیں بہرہ ہی ایماں سے
نگہ سال چشم سے آتی ہے خلق ایران و توراں سے
اسے اک بندگی خاص ہے شاہِ خراساں سے
گزر جاتے ہیں اسکے نام پر جنس خوش جاں سے
جو سودا اس سے بنجائے تو ہو راضی رضا بس ہے

جو وہ دن ہو کہ نکلے آفتاب اس روز پچھم سے
کریں پرسش بد و نیک عمل کی خلق عالم سے
موکل درمیاں لاویں سخن جنت جہنم سے
مخاطب ہم کسو سے ہوں نہ یارب نے کوئی ہم سے
تقی متقی ہم کو امام اتقیا بس ہے

تقی پاک کا آکر علم جس وقت برپا ہو
وہ حامی لطف سے ہو تو کچھ اپنا کام اچھا ہو
الٰہی ہم سیہ کاروں کی اسکے سلئے میں جا ہو
وگرنہ زشتی اعمال سے کیا جانیے کیا ہو
دو ہیں ہووے تو بس کیا اور یوں ہووے تو کیا بس ہے

نہو شکر کشی سے غم کی اے دل اس قدر درہم
عدو مجروح ہے اس کا احیا کا ہے وہ مرہم
کریگا عسکری انبوہ اس اندوہ کا برہم
رہیں گے نا امید رستگاری اس سے کیونکر ہم
وسیلہ ہم گنہگاروں کا وہ روز جزا بس ہے

اگرچہ اشک آنکھوں میں لبوں پر آہ رہتے ہیں
کبھو ہیں شہر میں جاکر کبھو درگاہ رہتے ہیں
ولے مستغنیانہ ہرگہ و بیگاہ رہتے ہیں
کرم پر مہدی ہادی کے ہم گمراہ رہتے ہیں
ہمیں اس وادی پرخوف میں وہ رہنما بس ہے

کہاں تک بت پرستی میں جفا و جور کا سہنا
کہن سالی میں کس کا چاہیئے ہے ہمکو کچھ کہنا
کہاں تک آنکھ سے رخسار پر ہردم لہو بہنا
دیئے قشقہ صنمخانے میں کب تک روز و شب رہنا
گیا وقت ہوس کعبہ کو چلیے اب خدا بس ہے

نہیں مشتاق ہم کچھ مال کے اسباب کے زر کے
تجھے درویش سب کہتے ہیں لوگ ایدھر کے اودھر کے
نہ اچھے فرش کے طالب نہ پاکیزہ کسو گھر کے
ہمارا حشر ہووے مر گئے پر ساتھ حیدر کے
یہی کہہ میر تو بھی حق میں اپنے یہ دعا بس ہے

مخمّس در منقبت علی ابن ابی طالبؑ

زور و ثبات و تاب و توان مرتضیٰ علیؑ
مقصود خلق و خواہش جاں مرتضیٰ علیؑ
امیدگاہ خورد و کلاں مرتضیٰ علیؑ
ذکر روان و وردِ زباں مرتضیٰ علیؑ

جو کچھ کہو سو اپنے ہیں ہاں مرتضیٰ علیؑ

اس کی ولا ہے باعثِ بہبود کائنات — اسکی ولا ہی شرط بڑی ہے پئے نجات
کیا کیا نمود کرتے ہیں اسکے عجائبات — راہو جو چشمِ دل تو تماشا ہے اسکی ذات
یکتا ہے عرصۂ دو جہاں مرتضیٰ علیؑ

ہر چند کام ایسی جگہ کیا کرے سمجھ — اس راز کو سمجھ جو سکے تو ارے سمجھ
یعنی نہ ذات پاک سے آشنا رہے سمجھ — عقل غنست سے بھی اسے کچھ پرے سمجھ
ہے آں سوئے خیال و گماں مرتضیٰ علیؑ

موجود اُسکے ہونے سے روشن جہاں ہوا — اس پردے میں جو تھا بس پردہ عیاں ہوا
فرمانِ شاہ بحر و بر اُن پر رواں ہوا — پیرِ زمانہ دیدۂ عالم جواں ہوا
چشم و چراغ کون و مکاں مرتضیٰ علیؑ

شخصیت ایسی کسکی تھی کسکو تھا یہ شرف — اسقدر سا تھا کون بغیر از شہ نجف
اللہ رے نہ در کوئی نہ اُسکا ہوا طرف — دریائے موج خیز تھا اُسکے کرم کا کف
ابن عم رسول زماں مرتضیٰ علیؑ

ہر چند ہے یہ عرصہ ہمیشہ سے پُر غبار — یاران رفتہ کے بھی تردد ہیں یادگار
لیکن کہاں یہ حرب کہاں ایسے مرد کار — نکلی نہ ویسی تیغ کہ جیسی تھی ذوالفقار
دیکھا نہ تھا وہ جیسا جواں مرتضیٰ علیؑ

پامال راہ اُسکے ہیں سرہائے پُر غرور — نزدیک اہل عقل کے رتبہ ہے اسکا دور
شائستہ سجود سمجھتے ہیں ذی شعور — ہے جلوۂ حق منزّہ و سر تا قدم ہے نور
اس بے نشاں سے دے ہے نشاں مرتضیٰ علیؑ

آیا ہے یہ جو شانِ نبیؐ شہود میں — لایا ہے اسکو شوق ہی اس کا وجود میں
انداز کیسے کیسے ہیں اس کی نمود میں — کہ سر فرو نہ لادے کسے ہو سجود میں
ہے خوب تر راز نہاں مرتضیٰ علیؑ

کب گفتگو انھوں سے نبیؐ سے بھی تھی — کاہیکو اس طریق پہ ہیں محو گمرہی
ختم رسل کو قدر ہے اس کی آگہی — قربان اُسکے در کے گدا پر ہے کی شہی
خورشید چرخ عزت و شاں مرتضیٰ علیؑ

بارے چھپا ہو کوئی تو اُس کو جتائیے
خورشید کو اشاروں سے کبتک بتائیے
جو بے بصر ہیں اُن کے تئیں کچھ سجھائیے
روشن ہے سب یہ باتیں عبث کیا بنائیے
حاجت نہیں بیاں ہے عیاں مرتضیٰ علیؑ

وہ جانے جسکو اور کسو سے کچھ ہووے کام
میلان دل ہے میرؔ غرض اُسطرف تمام
شام و سحر یہاں تو وظیفہ اُسی کا نام
سرمایہ دو جہاں کا ہے اپنا یہی امام
یاں مرتضیٰ علی ہے وہاں مرتضیٰ علیؑ

مخمّس در منقبت حضرت علیؑ

یا علی شاہِ اولیا ہے تو
زور بازوئے مصطفےٰ ہے تو
محرمِ رازِ انما ہے تو
مظہرِ قدرتِ خدا ہے تو
علم کس کو ہے یہ کہ کیا ہے تو

گرچہ آخر کیا ہے تو نے ظہور
ہے تو اللہ کا مجسم نور
پر ترے قرب کا ہے رتبہ دور
جانتے ہیں جن کو کچھ ہے عقل و شعور
اگلے پچھلوں کا پیشوا ہے تو

تیرے پردے میں حق ہوا موجود
جانتے ہیں تجھی کو سب معبود
تجھ سے کیا کیا عجب ہوئے مشہود
تھا زمین و زماں سے تو مقصود
آرزو تو ہے مدعا ہے تو

اس زمانہ میں آہ دکھ ہے عظیم
مستحق کرم ہوں میں تو کریم
ہے مری جان پر عذاب الیم
ملتفت ہو بہت ہے حال سقیم
میرے ہر درد کی دوا ہے تو

فرصتِ وقت جوں حباب ہے کم
ڈوب جاتا ہے جی مرا ہر دم
حال مانند موج ہے درہم
جوش زن گو کہ ہو محیطِ غم
غم نہیں مجھ جو آشنا ہے تو

تجھ سے ظاہر ہوئے چھپے سب بھید
ذرّے ذرّے کو تجھ سے ہے اُمید
جلوہ تیرے ظہور کا جاوید
دن ہے طالع ہوا جہاں خورشید

سب پہ روشن ہے کیا چھپا ہے تو

میر کو کب تلک یہ رنج و غم | اس کبھی اندوہگیں کو کر خرم
منبسط ہے ترا سحاب کرم | یعنی سایے میں ہے ترے عالم
سارے عالم میں چھا رہا ہے تو

مخمس در منقبت

ہے حقیقت سے تو اگر آگہ | یاد میں روز و شب علی کی رہ
کعبہ اس کا ہی در ہے لے بہ | میرے مولا کی ذات پاک ہے وہ
جسکو کہتے ہیں لا شریک لہ

اک لطف میں خاک ساری زر | اک توجہ میں قطرہ آب گہر
اک نظر میں نہال خشک ہو تر | اک سخن میں تمام یہ بہتر
اعرج و اعمی ابرص و اکمہ

ہاتھ پکڑے دم مصائب یہ | یار ہو دے گہ نوائب یہ
ہے غرض مظہر عجائب یہ | مستقل ہے نبی کا نائب یہ
جو کہے یہ سو کچھ کرے سو یہ

ہر نفس لب پہ گفتگو اس کی | ہر زباں جی کو جستجو اس کی
پوچھ مت کچھ ولا ہے تو اس کی | خواہش اس کی ہے آرزو اس کی
مطلب و مدعا و مقصد وہ

شان ارفع تری فلک کردار | ایک ہے تو برابر دو ہزار
اللہ اللہ ترا ثبات و قرار | حلم سے تیرے کٹتے تھے کہسار
ٹھٹکے کبک دری تھے قہقہہ

دیکھے سب لوگ پھر کے چاروں دانگ | مردمی یاں کی ہیں عجائب سوانگ
شخص ہمت کی آگے ہاتھ نہ ٹانگ | مانگے ہے تو جو کچھ خدا سے مانگ
جو کہے ہے سو تو علی سے کہہ

شاد اس نام سے جو خوگر ہے | اسم اعظم یہی مقرر ہے

انس کرنا اسی سے بہتر ہے — یہی جنت یہی تو کوثر ہے

اس میں تو پھر بگاہ یا بیگہ

خلق سب دیکھے اُسکے ہاتھ کی اور — بے سلیماں سے مفتقر تا مور
کف ہمت کی اُسکے دھوم ہے زور — ظرف ہوتا تو یوں نہ کرتے شور

بحر و عماں نکل گئے بے تہ

ہے وہ اُمید گاہ خلق خدا — روز محشر اُسی سے سب کو رجا
وہ مروت شعار و جملہ حیا — بحر ذخار جود و کان عطا

اُس سے نفع گدا تمتع شہ

مرتبہ کچھ نہ پوچھو اس گھر کا — بندگی یاں کی فخر قیصر کا
شاہ چیں پیش دست قنبر کا — آسماں ہے گدا اسی در کا

دیکھتے ہیں ادھر ہی مہر و مہ

اُسکی ہمت اُسی کو بن آوے — دولت اُسکی جہاں سے سب کھاوے
بار اُس در پہ جو گدا پاوے — ایک آواز کرکے لے جاوے

مال و اسباب و ملک و تاج و کلہ

میر عازم ہوئے ہو کیدھر کے — جو تلاشی ہو یار و یاور کے
رنگرا دوستی حیدر کے — نہیں محتاج ہوتے رہبر کے

ہے اسی راہ میں خدا ہمرہ

مخمس در منقبت

قدر کو میری بہت ہے برتری — کب مری خورشید سے ہو ہمسری
حکم بز رکھے ہے یاں شیر نری — گر مخالف سوچ کر ٹک اژدری

حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

منقبت خوانی سے میری سب ہیں سُن — اس سوا مجھ میں نہیں ہے کوئی گُن
ساتھ سر کے ہے علی گوئی کی دُھن — مدعی اس کان یا اُس کان سُن

حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

شوق کامل سے تعجب ہے یہ کیا ۔ جو بدن ہو خاک سب بعد فنا
اور اُس سے نے اُگے سبزے کی جا ۔ برگ برگ اُسکا کرے پھر یہ صدا

حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

تھا کبھو عاقل مخبط تھا کبھو ۔ گاہ کرتا گفتگو گہ جستجو
اب اخیر عمر ہے یہ آرزو ۔ ایک دو دن ترک کر میں اور تو

حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

کل منافق ہو کے آیا بھبھا ۔ پھاڑے اپنے منھ کو جیسے اژدہا
غار سا منھ کھولے بھیچک رہا ۔ معرکہ میں میں نے جو آکر کہا

حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

دل میں میرے ہے تمنائے کہن ۔ ہو میسر اے خدائے ذوالمنن
جگھڑی ہو دیں جدا جان اور تن ۔ ہو مرے ہونٹھوں کے اوپر یہ سخن

حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

ہے ولائے اہلبیت اپنا شعار ۔ جانے ہے اِسکے تئیں سارا دیار
زیر لب کہتا ہوں میں پر اکبی بار ۔ تو نے جو میں کہوں سب میں پکار

حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

رخت ہستی جائے رستم بار کر ۔ مار دوں اک دم میں اگر تیار کر
چپ رہیں موذی دلوں کو مار کر ۔ روز میدان گر کہوں للکار کر

حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

اے مخالف بحث مت کرنا بکار ۔ بات ایسی سے ہے مجکو ننگ و عار
بس کہا اس آستاں کا ہوں غبار ۔ کیا کہا تجھ سے کروں میں بزر پا

حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

شیخ کو نسبت نہیں تجرید سے ۔ ہے یہ خرخشا ہوا تقلید سے
بے عقائد ہوتے ہیں تائید سے ۔ گو کہا اُن نے مری تعلید سے

حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

اس عقیدے ہی پہ اپنے میں رہوں ۔ گو خوارج کے ستم اس میں سہوں

بے ولا حیدر کے ہوں میں تو نہ ہوں
لب ہلیں جب تک یہی تب تک کہوں
حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

اب ہوا پیری سے ٹک میں مضمحل
ورنہ تھا یہ شور تا بسین و چگل
شوق میرا کچھ نہ تھا بے صدق دل
رات دن رہتا تھا کہتا متصل
حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

اے مرے سرمایۂ ہر دو جہاں
عشق تیرا ہے مرے ہمراہ جاں
ہو اگر تن پر مرے ہر مو زباں
بیگماں سرزد ہو اس سے ہر زماں
حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

ہوں اگر یار گدا و شاہ میں
پر ہوں سرکار سے آگاہ میں
دل وہیں ہے گو چلوں سو راہ میں
میر جی باور کرو واللہ میں
حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

مخمس در منقبت

عقل ہے تو مرا کہا کر تو
محو یاد علی رہا کر تو
اک طرح یہ بھی ہے رہا کر تو
اشک رخسار پر بہا کر تو
یا علی یا علی کہا کر تو

نہیں ورد و وظیفہ کچھ درکار
سبحہ گردانی سے کر استغفار
اسکو جپنا ہے عاقلوں کا شعار
چپکے چپکے ہو یا پکار پکار
یا علی یا علی کہا کر تو

متفق اس پہ ہیں خواص و عوام
کہ ولا اسکی معرفت ہے تمام
ہو نماز سحر کہ طاعت شام
سر فرو کر بس از درود و سلام
یا علی یا علی کہا کر تو

لحظہ لحظہ جدا ہے اسکی شان
اسکی عادت مروت و احسان
دوستی اسکی عین ہے ایمان
چلے جب تک زباں غنیمت جان
یا علی یا علی کہا کر تو

ایسے مظہر کا فہم ہے دشوار ہے یہ وہ ایک جسکے نام ہزار
گرم تسبیح اُس کے ہیں ابرار اللہ اللہ کی جا بھی سو سو بار

یا علی یا علی کہا کر تو

وہی احیِ کن عظام رمیم وہی رحماں وہی رؤف رحیم
دم بخشش وہی رسول کریم گہ جرأت وہی علی عظیم

یا علی یا علی کہا کر تو

جور انواع دشمنوں کے سہہ پر نہ کر یار گفتگو بے تہ
دوستی میں علی کی بیخود رہ بات یہ ہے کہ اور کچھ مت کہہ

یا علی یا علی کہا کر تو

اہم یہ ایک جو کرم سے ہے سب کے نزدیک سہم غم ہے
یہ سب اوراد پر مقدم ہے غرض اس سے تعیّں جو دم ہے

یا علی یا علی کہا کر تو

رہ ولائے علی کا خواہشمند ہے یہ شیوہ خدا رسول پسند
دب کے ہرگز نہ رکھ زبان بند پست کرنے کو مدعی کے بلند

یا علی یا علی کہا کر تو

بدر سا علی تمام ہے نور ذات پاک اسکی ہے منیر صدور
بھول مت اُسکو گر تجھے ہے شعور یاد خاطر رہے نزد و دور

یا علی یا علی کہا کر تو

سونپ رکھ اُسکو اپنی موت و حیات رحمت صرف ہے علی کی ذات
بس ہے اُسکی ولا برائے نجات باتیں یوں سو ہیں یہ ہی ہے بات

یا علی یا علی کہا کر تو

شوق تیرے تئیں نہیں ہے ہنوز ورنہ سینہ رہا کرے پرسوز
اسطرح جیسے طفل نوآموز سیکھے جو حرف وہ کہے شب و روز

یا علی یا علی کہا کر تو

ورد اوراد کر نہ لے تو نام شغل و اشغال چھوڑ بیٹھے تمام

ذکر اذکار سے تجھے کیا کام — ایک دو دم ہمیشہ صبح و شام
یا علی یا علی کہا کر تو

خوف محشر سے میر حال ہے کیا — یہ حواسوں کا اختلال ہے کیا
اُس سے محشور رہ ملال ہے کیا — ہے علی تو یہ پھر خیال ہے کیا
یا علی یا علی کہا کر تو

مخمّس در منقبت

اے نائب مصاحبِ ذی القوۃ المتیں — دے دست زور خلوتی قدرت آستیں
چاہے تو ایک کر دے ابھی آسمان زمیں — ٹھوکر لگے تری تو اُڑے کوہِ آہنیں
پایا نہ جائے جیسے پرِ کاہ پھر کہیں

تو ہے کہ تیری قدر نہ آئے بیان میں — قدرت تری نہ گزرے کسو کے گمان میں
شانیں ہزار قسم ہیں اک تیری شان میں — شہرت ہے تیرے زور کی دونوں جہان میں
نکلا نہ شہر بند عدم سے ترا قریں

غیب و شہود دونوں میں مشہود ہے تو تو — ہستی ہماری وہم ہے موجود ہے تو تو
حاصل کہ دوجہان کا مقصود ہے تو تو — مسجود تجھ کو جانتے ہیں معبود ہے تو تو
ناجی ہیں وے ہی لوگ جنھوں کا ہے یہ یقیں

احوال خوش اُنھوں کا جنھیں تجھ سے ہے ولا — اعدا تو آسماں نے دیے خاک میں ملا
آئینہ ہے کہ دین کو تجھ سے ہوئی جلا — برپا یہی رہے گا جو تجھ تک ہے سلسلا
یاروں نے جتنی رسمیں بٹھائیں تھیں اُٹھ چلیں

فتنے کو تیرے عہد میں سوتے گزر گئی — آشوب کی خطر سے تری سدھ بسر گئی
آفت کہاں کہ کب کی کنارہ بھی کر گئی — آوازہ تیرا سنکے بلا جیسے مر گئی
یوں مٹ گئے فساد کہ مذکور بھی نہیں

واہ واہ ہوا جو تو تو ملی بیکسوں کی داد — تلوار مارنے سے ترے مٹ گئے فساد
اُٹھے نہ گرد زندقہ و کفر پر عناد — زنار ٹوٹے مہرے جلے بت گئے بباد
برہم ہوئے گھڑی میں ہزاروں برس کے دیں

ہنگامے گرم یاروں کے سب سرد ہو گئے
چہرے منافقوں کے وے ہیں زرد ہو گئے
سر در نقاب خاک بڑے مرد ہو گئے
جن سے تھا پر غبار جہاں گرد ہو گئے
گلوں میں بکریوں کے چھٹے شیر خشمگیں

بھاگے پھرے پلنگ نمر ہانپنے لگے
روکش جو ہونے کو تھے سو منھ ڈھانپنے لگے
رستم ہو بیجو اس زمیں ناپنے لگے
ہلنے لگے پہاڑ فلک کانپنے لگے
رکھا گیا ہے پیٹھ پہ مرکب کے تیرے زیں

تلوار تیری برق تھی آنکھیں جھپک گئیں
گھوڑوں کی باگیں ہاتھ سے سب کے جھٹک گئیں
بھاگیں جو اضطراب سے فوجیں بہک گئیں
لاشوں کی سیر کرتے ہوئے آنکھیں تھک گئیں
لوہو کی سر جہاں طرف نہ یاں نہیں

نعرہ کیا ہے تو جو کبھو ہاتھ جھاڑ کر
نکلا ہے پردہ گوش فلک کا بھی پھاڑ کر
قوت جو تو نے کی ہے کبھو پاؤں گاڑ کر
کوہ گراں کو پھینک دیا ہے اکھاڑ کر
پہونچا ہے ملک قدس تلک شور آفریں

رکھا ہے پائمال حوادث یہ آسماں
جا اب نہیں رہی کہ کریں داد جاکے ہاں
ہو دستگیر لطف ترا تو ملے اماں
تیری طرف نہ آویں تو پھر جاویں ہم کہاں
اے عرش تخت داد گر لامکاں مکیں

تو ہے کہ تجھ کو کہتے ہیں حلال مشکلات
تو ہے کہ حلقہ زن ہے ترے در پہ کائنات
تو ہے کہ تجھ سے دید میں آئے عجائبات
اسنت تیری قدرت و رحمت ترا ثبات
آگے سے تیرے سیکڑوں بھیڑیں سرک گئیں

قدغن ہوا جو رفع کا بدعت کی ایک بار
پردوں میں مطربوں نے رکھی دف طنبور تار
نغمہ یہ حسن کے یاروں نے چھیڑا کبھو نہ تار
نالہ ہوا نہ قلقل طنبور سے دو چار
آواز نے کی بند ہوئی ہو گئی حزیں

تر دامنوں کے دیکھے تو لب خشک ہو گئے
احوال میکدے پہ یہ تہمت پر درد گئے
معتادے جنھوں کی تھی سب جان کھو گئے
مخمور کھینچ کھینچ کے خمیازہ سو گئے
کیا کیجے خرابیاں نہ خرابات پھر رہیں

لا شکل اس کی دل میں دبی مصطفیٰ کو دیکھ
اس رخ کا کر تصور نور خدا کو دیکھ

رنگینی عدالت شاہ ولا کو دیکھ
نرگس نے غش کیا تھا کہیں اس ادا کو دیکھ
گلشن میں دلبروں نے نہ پھیرا انکھڑیاں ملیں

عاجز نوازی تیری سے ہو مشت خاک زر
برسے گدا پہ ابر کرم سے ترے گہر
جور فلک نے زار کیا جی سے رحم کر
مہماں تری سماط پہ ہے خلق ہر سحر
حاتم یک آشمال ہے یاں معن ریزہ چیں

جس دل کو ہو نہ شوق ترا ہو جیو گداز
جس چشم کو نہ میل ہو تیرا نہ ہو جیو باز
جو سر ترا خیال رکھے رہیو بے نیاز
سجدے سے تیرے در کے جو ہوتی ہو سرفراز
مسجود ہو جو صبح سعادت کی وہ جبیں

اہل نظر سے دیکھنا اودھر کا ہے عجب
آنکھوں سے تیری رہ نہ چلے واقف ادب
کس کو بھی یہ بزرگی و کس کا تھا یہ حسب
یہ قدر تھی تری مرے مولیٰ ہوا تو جب
رونق فزائے کعبہ محمدؐ کا جانشیں

کیا کہیئے تیرے قرب سے لے سایۂ الٰہ
بیدانشی سے کچھ کہے کوئی دروں سیاہ
اپنی توجہ یہ پڑتی ہے جا کر دہیں نگاہ
فہم و گمان و وہم کو جس جا نہیں ہے راہ
ہے چشم شوق عینک شفاف دوربیں

جسکو نہیں ہے تیری محبت کا کچھ خیال
افسوس اسکی زندگی و وائے اسکا حال
یاں اسکے سروبال ہے واں رنج پائمال
تجھسے نہ رکھے بندگی ہے کفر اور ضلال
تیری ولا ہے داخل ایمان مومنیں

میرؔ شکستہ حال نہایت ہے تنگ اب
شوریدہ سر سے مارے ہے لے لے کے سنگ اب
ہر آن اسکو آپ سے رہتی ہے جنگ اب
دست تہی سے خلق جہاں کا ہے تنگ اب
خورش مت کر آہ اس سے زیادہ نہ کر غمیں

افسوس ہے مدیح ترا اتنا خستہ حال
ہر لحظہ اک عذاب نیا ہر دم اک وبال
تھے اس چمن تئیں جو روش سبزہ پائمال
یکدم میں تیرے ابر کرم نے کیے نہال
برسے آنکھوں پہ اوس کی جاگہ در ثمیں

مخمس در منقبت

پارسا ہیں جو جواں پیرِ ہدیٰ کہتے ہیں — جو ولایت رکھے ہیں شاہِ ولا کہتے ہیں
سالکِ مسلکِ دل راہنما کہتے ہیں — آپ مولا کہیں ہیں ایک خدا کہتے ہیں
یا علی جو تجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

آفتابِ فلکِ عز و علا تو ہی تھا — چہرہ آرائے زمین و سما تو ہی تھا
جانشینیِ پیمبر کے سزا تو ہی تھا — قالبِ خاکی کے پردے میں خدا تو ہی تھا
یا علی جو تجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

ہے تری قدر سے بے خیر رسل کون آگاہ — حبذا شان تری حق علی تیری جاہ
زور سے تیرے اڑے کوہ بسانِ پرِ کاہ — وہ ثبات اس قد و قامت پہ یہ قدرت ہے واہ
یا علی جو تجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

تجھکو وہ خلوتیِ رازِ نہاں پاتے ہیں — جسکو اب خلق میں سر جائے عیاں پاتے ہیں
افسر و تخت ترے در سے شہاں پاتے ہیں — سر ترے سجدے کا شائستہ کہاں پاتے ہیں
یا علی جو تجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

دلشکستوں کی ہوئی کام روائی تجھ سے — بستہ کاروں کی ہوئی عقدہ کشائی تجھ سے
گلشنِ آئیں کی گئی ٹک نہ صفائی تجھ سے — بڑھ گئی دینِ محمد کی بڑائی تجھ سے
یا علی جو تجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

خشمگینی تری دشمن کے سر آفت لائی — عمر و عنتر نے سنبھلنے کی نہ فرصت پائی
روکشی حسد میں اژدر سے نہ ٹک بن آئی — زور و قدرت نے تری قدرتِ حق دکھلائی
یا علی جو تجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

شور و ہنگامہ تھا کیسا ہی مٹایا تو نے — تیغ خونخوار سے فتنے کو سلایا تو نے
درِ خیبر کو دو انگشت سے اٹھایا تو نے — کہ ز رد خورشید کو دوبارہ دکھایا تو نے
یا علی جو تجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

عالمِ کون و فساد آکے کیا تو نے پاک — دہر گلزار ہوا جھڑ گئے خار و خاشاک
دیو سرکش ہوئے آوازہ ترے سے ہلاک — پردۂ قاف تلک پہونچی تھی ترے زور کی دھاک

یا علی جو تجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

تھے تو ہی پنجہ ترے زور شجاعت سے شیر
بھیڑ بکری کی طرح خوف سے رہتے تھے دلیر
ہر زبردست زمانے کا رہا تیرا زیر
تو نے سلماں کے لیے توڑ دیا پنجۂ شیر
یا علی جو تجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

تجھ سے پایا نہ گیا بعد نبی فاضل تر
ہے فضیلت تری قرآن سے ثابت سب پر
قرب کیا تیرا بیاں کیجیے اے فخر بشر
جس جگہ تو ہے تو وہاں جلتے ہیں جبریل کے پر
یا علی جو تجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

دوش پر رحمت عالم کے رکھا تو نے پا
خانۂ حق سے دیا شرک کی صورت کو مٹا
عالم خاکی میں تھا مصلحتاً جلوہ نما
عرش اعظم سے بھی تھی ورنہ پرے تیری جا
یا علی جو تجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

اے ترا مرتبہ بالا تر فہم و ادراک
ایک رتبے کے تئیں پہونچی ترے جلوے سے خاک
ہیں ترے شوق میں سرگشتہ شب و روز افلاک
پر کہاں عالم خاک اور کہاں عالم پاک
یا علی جو تجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

اپنے اسرار کا تو آپ ہی کچھ دانا ہے
ورنہ کن نے تجھے جوں چاہیے پہچانا ہے
ایک فرقے نے تجھے روح خدا مانا ہے
ایک نے ذات مقدس تجھی کو جانا ہے
یا علی جو تجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

شان و شوکت تری کیا کر سکے عاجز تقریر
یعنی مداح ترا کیونکہ ہو الکن ہے میر
زیب دیتی ہے تجھی کو شہی کل امیر
تین فقیروں کے تئیں بخش دیے تاج و سریر
یا علی جو تجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

مخمس دیگر

اے مرتفع نشین علی العرش استوا
ذی عز ما سوائے خدا خویش مصطفےٰ
تو تھا کہ تو نے دوش نبی پر قدم رکھا
بُت توڑ توڑ شرک کی صورت دیے مٹا
لایا بزور عرصے میں یکتائی خدا

رکھتے ہیں تجھ سے چشم کرم صاحب نظر
افضل ہوئی سبب سے ترے خلقت بشر

تو مجمع کمال ہے تو مصدر ہنر — ہے مورد قبول دعا تیرے گھر کا در
ہے مولد شریف ترا خانۂ خدا

ہر مو زبان ہو تو کریں وصف ہم ترا — کرتا رہا ہمیشہ مسیحائی دم ترا
رونق ہوئی جہان میں آیا قدم ترا — برپا نہ ہووے روز جزا گر علم ترا
خورشید حشر سایے میں سر کے ہو پھر کھڑا

تو وہ ہے نام لیتے ترا بھیجتے درود — گزرے اگر تو دل میں تو کر بیٹھیے سجود
شخص کرم کے وقت دہش تیرے کیا نمود — تو گرم جود ہووے تو پھر کیا بلا ہے جود
تیری سخا کے روبرو کیا چیز ہے سخا

آگہ ہیں تیری قدر سے کاسے کو بے تہاں — جا بیٹھیں ہیں فقیروں کی گدائی کے تئیں شہاں
تجھ سا کریم عرصہ میں آفاق کے کہاں — ہے در ترا وہ کان عطا و کرم جہاں
ہوتی ہے سیر اُن کے حرص شہ و گدا

مقدور والے عہد کی گھٹتی سب گئے — افسانے تیری جود کے ہر دم کہا کیے
دریا گہر کے ہاتھ سے تیرے بہ گئے — احساں پہ تیرے سیکڑوں احساں رہا کیے
ہمت نے تیری ہمت عالی سے کچھ کیا

دکھلاوے چند چرخ نشیب و فراز کو — پیوند کر زمیں کا غم جاں گداز کو
گر ناز ایک لطف سے میرے نیاز کو — تو وہ امام ہے کہ جب آوے نماز کو
پیشینیاں تمام کریں تجھ سے اقتدا

ہر اک کو اس تقدس ذاتی سے کیا خبر — پہچانیں تجھ کو کیونکہ عزیزان بے خبر
نہ تصفیہ دلوں کو نہ یاری کرے نظر — پر ظلم ہو رہے گا کہ تھا حق ہی جلوہ گر
پردہ یہ بیچ سے بشریت کا جب اٹھا

جا گہ ہر ایک دل میں تری ہی ولا کی تھی — تیرے ظہور آرزو ارض و سما کی تھی
تجھ سے شہان عہد کو نسبت گدا کی تھی — قدرت جو دیکھی تیری سو قدرت خدا کی تھی
گر آسماں حریف ہو خاک میں ملا

زور آوری جہاں میں تری داستاں ہوئی — عرصے کے پہلوانوں کی قدرت عیاں ہوئی
تنوں کی جان سامنے تیرے رواں ہوئی — کشتوں کی دور بیٹھے ہی خاطر نشاں ہوئی

سیسر تری کماں کی نہ کوئی اُٹھا سکا

فرضاً ہوا غلام سے تیرے اگر بگاڑ
دشمن سب آئے سامنے ہر ایک جوں پہاڑ
مارا نہ ایک مدد ہی کو میدان میں پچھاڑ
جس کی کمر میں ہاتھ چلایا لیا اُکھاڑ
جس کی طرف کو آن جھکا پھر جھکا دیا

آیا ڈپٹ کے گھوڑے کو جس وقت بھیڑ چیر
خرگوش تھے بہیر کے گویا جوان دبیر
سرگرم رزم جب کہ ہوا کہہ کے گیر گیر
اُسکی کماں کے ساتھ تھا پیغام مرگ تیر
تلوار اُسکے ہاتھ میں تھا نامۂ فنا

بہتیرے کوہ و دشت کو بھاگے کڑھب گئے
بہتیرے زخم تن پہ اُٹھا جان بلب گئے
تھے برج سے جوان سو آہٹ سے دب گئے
جوڑا ادھر سے تیر اُدھر سہم سب گئے
چمکی ادھر سے تیغ اُدھر سر جدا ہوا

ہے کون دادرس جو کہوں اس سے اپنا بھید
جور فلک سے چھاتی میں سب پڑگئے ہیں چھید
اُمید ہے کہ پہونچے ترے لطف کی نوید
کم بخت بھی پھرا نہ ترے در سے نا اُمید
از بسکہ وقف کرتے ہیں دن طالع رسا

ہر شب یہ دل خفا ہے یونہیں عمر ہوگئی
ہر روز اک جفا ہے یونہیں عمر ہوگئی
جی پر غرض بلا ہے یونہیں عمر ہوگئی
ہر شام غم غذا ہے یونہیں عمر ہوگئی
ہر صبح خون دل ہے مجھے آب و ناشتا

آشفتہ کوہ و دشت میں مدت پھرا ہوں میں
آوارہ گرد بادیۂ ابتلا ہوں میں
چوں گرد باد خاک میں یکسر ملا ہوں میں
یعنی برہنگی سے تو ٹک بچ رہا ہوں میں
ہے گرد کی جو بیٹھے ہے تن پر سو ہے قبا

اس شہر میں ہوں دیر سے آوارہ بے وطن
مرنا بتا نہ اُس سے کہ پیدا نہ تھا کفن
القصہ حال بد سے کروں تا کجا سخن
احوال میرا تجھ پہ ہویدا ہے من وعن
اظہار اس پہ پھر ہے طبیعت کا مقتضا

ہوں مبتلائے رنج و بلا سینہ چاک ہوں
تھوڑا سا یک رہا ہوں سبھی دردناک ہوں
دور آستاں سے تیرے کہاں تک ہلاک ہوں
یہ جی میں آرزو ہے کہ جب مر کے خاک ہوں
لاوے نجف کی اور اڑاتی ہوئی صبا

امداد کر کہ پہونچوں ترے آستاں تلک
لے جا رہے اشتیاق مجھے کھینچ واں تلک
ہر در پہ اضطراب پھرا دے کہاں تلک
یوں اتفاق پیدا کروں صرف جاں تلک
مقصد یہی ہے دل کا یہی جی کا مدعا

یوں گشتۂ چند مرتبہ و جاہ کا رہوں
کب تک ہلاک مطلب دلخواہ کا رہوں
جی چاہتا ہے خاک ہو اس راہ کا رہوں
پامال تیرے زائر درگاہ کا رہوں
تاج شرف ہو سر پہ مرے عاقبت کو تا

بے اختیار روؤں ہوں ہر صبح اور شام
یعنی کہ شوق در کا ترے دل کو ہے تمام
مقصد اسی کو جانوں ہوں سمجھا یہی ہوں کام
اے جدِ پاک حضرت موسیٰ رضا امام
اپنی تو آرزو ہے یہ آگے تری رضا

ہفت بند

السّلام اے رازدار داورِ جان آفریں
السّلام اے لامکاں کے حاکم مسند نشیں
ذات تیری جوں خدا کی ذات ہے والا صفات
بے شریک و بے عدیل و بے نظیر و بے قریں
یہ شرافت یہ سیادت یہ تقدس یہ کمال
یہ تنزہ یہ تعشق یہ تفوق ہے کہیں
تو ولی ہے تو وصی ہے تو علی ہے تو وہ ہے
جس سے بالاتر تصور کیجیے تو کچھ نہیں
کیا تعقل کیا تحمل کیا تبختر کیا وقار
طفل مکتب درس گہ کا تیرے عقل ذکیں
سید برحق شریف النفس فخر روزگار
باعث عز سپہر و موجب فخر زمیں
پیشوائے پیشوایاں سجدہ گاہ مومناں
زینت بخش و زیب رونق اسلام و دیں
مظہرِ سعد باعث مصدرِ لطف و کرم
زیب منبر جانشین رحمۃ للعالمیں
مقصدِ دل آشنایاں مدعائے عاشقاں
آرزوئے اہل عرفاں مطلب اہل یقیں
وارث دیں دادرِ عادل شفیع روز حشر
حافظ عرش بریں و جامع شرع متیں
مالک ملک ولایت حاکم عالم پسند
بادشاہ صاحب استقلال امیر المومنیں
عہد تیرا عدل سے سب ملک تیرا ہے سرور
مجرم و اندوگیں ہوں ملتفت ہونا ضرور

بند دوم

اے مرے سرمایۂ دنیا و عقبیٰ لطف کر
اے مرے مولےٰ مرے صاحب ادھر بھی کر نظر

لطف تیرا مس سے میری کیمیا سازی کرے
مکرمت یک گونہ کر یہ خاک ہو جاتی ہے زر

رحم پر موقوف ہیں سب کام اس ناکام کے
نے مجھے کچھ مکر آوے ہے نہ مجھ میں کچھ ہنر

سر فرو لانے کو جی کب چاہتا ہے سب کے پاس
ہے دماغ بے دماغانِ محبّت عرش پر

وقت جب ہوتا ہے خاص اے خاصِ رب العلمین
میل کلی دل کا ہوتا ہے تری جانب مگر

[illegible] تجھے داد کو تو ہائے کیا بیداد ہے
گوش زد تیرے نہو فریاد تو ہے بے اثر

وقت جوش [illegible] مروت بخش کتنا خلق کا
دیکھنے کو بھی نہ آتی تھی میسر چشم تر

شاہد عدل آنکھ [illegible] گر کرے تو خوبرو
اپنی پلکوں سے سئیں عشاق کے زخم جگر

کیا بیاں اب کریے شرم آتی ہے عرض حال سے
قدر تیری ایسی والا حاجت اپنی کس قدر

اب تو وحشت ہے طبیعت میں بسانِ گرد باد
خاک بر سر زندگانی کب تلک کریے بسر

آبیاری تیری ہے اور باغ سب سرسبز ہے
ایک شاخِ آرزو اپنی نہیں لاتی ثمر

بار بے برگی گراں ہے اور میں ہوں ناتواں
بے نسیم فیض تیرے اس چمن میں میں کہاں

بند سوم

اے شہ خوبی نسب والا حسب عالی تبار
جملہ تن عزت سراپا وقر و تکبیر اعتبار

اللہ اللہ زور باز و قدر و قدرت دیدنی
رتبہ کھنے کی جائے حشمت سیر قابل اقتدار

قدس کے باشندگاں کا ناز تیری ذات پر
نوع انساں کا تمامی تیرے اوپر افتخار

قلعِ خیبر مگر اژدر کھینچا خورشید کا
ہیں فسانے زور کے تیرے جہاں میں یادگار

جھک گئے گردن کشوں کے سر جہاں میں نے کہا
لَا فَتٰی اِلَّا عَلِی لَا سَیْفَ اِلَّا ذوالفقار

تو کہے جاروب تھی میدان کیں کی تیری تیغ
جسکے نکلے نے خس و خاشاک نے گرد و غبار

تو نے چھیڑا ہے اگر مرکب کو اپنے کہکے ہاں
تو ہوا ہے اُس روش اس باد پیما کا گزار

جوں کوئی بجلی چمک جاتی ہے گا ہے پیش چشم
پھر کھلے پر آنکھ کے رہجاتے ہیں حیران کار

گوشۂ محراب میں راتوں کے تئیں رونے سے کام
روزِ میداں سایۂ شمشیر میں ہنسنا شعار

کیا چھپی ہے کچھ یہ شخصیت جو میں ظاہر کروں
پُر ترے اوصاف سے ہیں قریۂ و شہر و دیار

ہے گہر بخشی سے تیری ابر نیساں یک طرف
ہے کف ہمت کے آگے تیرے دریا یک کنار

مہرباں ہو یک نظر اس چشم خم کی اور دیکھ
دیکھ مت میری طرف اپنے کرم کی اور دیکھ

بند چہارم

کیا گدا کیا شاہ دونوں تیرے در سے کامیاب
سجدہ گاہ خلق و عالم ہے تری عالی جناب

کوئی بیگانہ تری تقلید کیونکر کر سکے
تھا تو ایسا جب پیمبر کی ہوا خویشی کا باب

حیف وہ بے تہ نہ رکھے جو کہ تیری دوستی
اک ولا کے ضمن میں تیری ہزاروں ہیں ثواب

عقل کا معقول تو ہے خلق کا مقبول تو
ذات تیری فرد اعلیٰ بات تیری یک کتاب

تجھ سے رو سے بحث کس کو غیر علام الغیوب
اس جگہ جبریل ساکت عقل اول لاجواب

جب کوئی ساقی کہیں تجھ سا بہشتی رو ملے
جن کو ہے کچھ ہوش تیرے نہیں مست خراب

عنبریں گیسو ترے واہوں تو کھلتا ہے جی
مدعی کھاتے ہیں آپ ہی آپ یونہی پیچ و تاب

تو توقع کی جگہ سب کی تجھی سے چشم داشت
تو پناہ دہر و تو مسجود گاہ شیخ و شاب

لطف بے پایاں ہے تیرا سایہ گستر خلق کا
ایک تابش اپنے ذرے پر بھی کر اے آفتاب

ہے جہاں تیری سخا داں بحر و بر کا کیا شمار
جب برسنے تو لگے گنتی میں کب ہے سحاب

شرح وسعت دامن دولت کی تیرے کیا کروں
بخش دے گر جوہر تو سنگ سے ہے لعل ناب

تیری ہمت تیری جرأت تیری طاقت تیرا زور
تو ہی رکھے تو ہی بوجھے تو ہی دیکھے ہی اور

بند پنجم

اے بسان کعبہ تیرے طوف میں روحانیاں
زمزمہ تیرا بہ اذن عرش کا ورد زباں

جوش مارے فیض کا چشمہ ترا تو بحر ہے
زمزم و تسنیم جس میں ایک دو حقیر کہاں

آب شرم رشک سے تیرے ستارہ صبح کا
خاک تیرے آستانے کی جبین راستاں

کیا بلندی قدر کی اللہ کیا شان رفیع
جس جگہ تو ہے نہیں ہرگز رہ وہم و گماں

زور لیاقت ہے کہ بالقوۃ انسان ہے
بے مزہ ہو تو خدا ہووے زمین آسماں

گرچہ عالم دیدہ حضرت خضر بھی ہیں آدمی
پر نہیں ہے اُن کو مطلق یاں کی صحبت کا دھیاں

تجھ پہ ظل اللہ کا اطلاق شایاں راست ہے
چتر ہے خورشید تیرا سبز خط تیرا سائباں

شیر ہونا تیرا کیا سمجھے بزِ اخفش ہے شیخ
قنبر ہے میں سدا رہتا ہے یاں ببرِ بیاں

سن طلسماتِ جہاں کے سب عیاں ہیں تجھ پہ راز
حاصلِ کون و مکاں تو واقفِ رازِ نہاں

نور سے تو ماہِ کامل قدر سے چرخِ بریں
حلم تیرا کوہ تیرا علم بحرِ بیکراں

کیا تسلط کیا تحمّل کیا تموّل کیا شکوہ
تو جہاں ہو ایک واں گو یا کہ ہیں دونوں جہاں

یہ طرح پاتے ہیں تجھ میں سب رسول اللہ کی
رتبہ ہے نامِ خدا تو اب رسول اللہ کی

بند ششم

اے چراغ [illegible] خاندانِ مصطفےٰ
اے مرے والی مرے مقصود ہم نامِ خدا

ہے تو تو مخلوق لیکن عقل میں آتا نہیں
دیکھ کر اندیشہ تجھ کو عرش پر جا تا رہا

تو جہاں ہے اُس جگہ کیا آسماں کی قدر ہے
قدر تیری ہے جہاں واں گفتگو کو قدر کیا

گاہ احمدؐ گہ احمد کا ہے علی پایا تجھے
ہر زماں میں ہر مکاں میں شان تھی تیری جدا

فرطِ عشق اپنے سے کیا حرف و سخن ای کام جاں
تو ہماری آرزو ہے تو ہمارا مدعا

مطلب اپنا مقصد اپنا حاصل اپنی زیست کا
عشق تیرا دوستی تیری فقط تیری ولا

تجھسے ہم خواہانِ مطلب تجھسے ہم جویائے کام
تو ہی یاں حاجت روا ہو تو ہی یاں مشکل کشا

تجھسا حاکم تجھ سا داور تجھ سا یاور چھوڑ کر
کس سے کہیے کس کنے لیجائیے پھر التجا

تو ہے وارث تو ہے مالک تو ہے صاحب تجھسے چشم
اپنے ہاں جو ہے سو تو اے شافعِ روزِ جزا

اعتقاد اپنا یہی یارب رہے ہنگامِ مرگ
ہوں زباں و دل موافق جسگھڑی پہونچے قضا

دم بدم ہو نٹھوں کے اوپر یا علی ہو یا علی
ہے رضا مندی تو اپنی اسمیں آگئے جو رضا

ہم یہی فردوس سمجھے ہیں اسی کے تئیں نجات
رفتگان شوق سے بس اور کیا پوچھو ہو بات

بند ہفتم

اے امامِ واجب التعظیم و بابِ احترام
اے سزائے عزّت و مسجودِ انبوہِ امام

تیری قدر و منزلت ختم رسل سے پوچھیے
تیری قدر و منزلت میں ہے کسی کو کیا کلام

تجھ رخِ پرنور سے نسبت نہیں ہے بدر کو
شہر گرد ایسے بہت دیکھے ہیں پھرتے ناتمام

دے جہاں عرض تجمّل حشمت و شوکت تری
قیصر و فغفور واں ہوں بندگی میں جوں غلام

جب ترے زور آوری کی معرکے میں دھوم ہو
سام کو تب پوچھتا ہے کون رستم ہے کدام

تجھ سوا جور فلک کا کس سے بدلا چاہیے
تو ملیک مقتدر ہے تو عزیز ذی انتقام

دست بستہ اقتدا ہم سے کسو کی کب ہوئی
تو ہی اپنا پیشوا ہے تو ہی اپنا پیش امام

گرچہ کہتا ہے زبانِ ہند میں یہ منقبت
لیک حسانِ[1] عرب سے کم نہیں کچھ میر نام

اس ادا سے گفتگو اس حسن سے طرزِ سخن
اس فصاحت سے عبارت اس بلاغت سے کلام

ہیں متاع نیک یاں اشعار مولانا حسن[2]
گیں مدحت سے ترے پڑھتا ہو عالم صبح و شام

تو خریداری کرے تک بھی تو قیمت ہو دو چند
یعنی ہو وے جنس کاسد کا قبول خاص و عام

سو خدا ناکردہ ہمچشمی نہیں کرتا فقیر
آرزو ہوتی نہیں ہے غیبت ایمان میر

ترجیع بند در منقبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ

قابلِ سجدہ ہے علی کا در
بابِ تعظیم ہے علی کا گھر

ہے علی ہی کا نام موجودات
ہے علی افتخار نوع بشر

فرش رہ عرش ہو نہیں سکتا
منزلت ہے علی کی بالاتر

مبع لطف و مظہر احسان
مصدر صد ہزار فضل و ہنر

تھا پر آشوب جنگ شور سے دہر
کر دیے خاکوں میں ملوں کے سر

قدرت اس کی خدا کی قدرت ہے
زور اپنا عجیب زور آور

اعتقاد اپنے کو چھپایا ہے
یہ جو کہتے ہیں پاس ظاہر کر

ہم علی کو خدا نہیں جانا
پر خدا سے جدا نہیں جانا

ہے علی جہد عزت و اعزاز
جان بھی اپنی ہے علی کی نیاز

غم شریک محمد عربی
حرمت کعبہ آبروئے حجاز

خاک دروازۂ علی رہیے
ہو دمیں یا در جو طالع ساز

۱؎ حسان عرب، یعنی حسان بن ثابت انصاری ہیں جو حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح نظم کرتے تھے ۱۲
۲؎ مولانا حسن کی تصنیفات سے بہت بند [illegible] منقبت حضرت علی میں مشہور [illegible] نظم ہے ۱۲

رو علیؑ کی طرف ہی رکھ اس میں
در فردوس منھ پہ ہو گا باز

ہو سکے تو علیؑ پرستی کر
تو ہو اسلامیوں میں تو ممتاز

ہے علیؑ وہ کہ چرخ و ماہ و مہر
اس کی قدرت پہ سب کریں ہیں ناز

محو یاد علیؑ ہیں جو اُن کو
نے سر سجدہ نے دماغ نماز

ہے علیؑ سے علی طلب شب و روز
دوستی کشتگان قلب گداز

قبلہ کعبہ خدا رسول علیؑ
گفتگو شوق کی بہت ہے دراز

ہم علیؑ کو خدا نہیں جانا
پر خدا سے جدا نہیں جانا

ہے علیؑ جانشیں پیمبرؐ کا
زیب مسجد ہے حسن منبر کا

زور بازو سے اُسکے کیا کہیے
ہے زباں زد فسانہ خیبر کا

کر گیا گم بڑوں بڑوں کے حواس
چیرنا کودکی میں اژدر کا

جذب خورشید کس طرح سے کیا
وقت کم تھا نماز دیگر کا

سرکشان جہاں نے جھاڑے کان
سن کے احوال عمر و عنتر کا

تیغ اُس کی تھی برق ابر بہار
کٹ گیا جس سے رنگ اکثر کا

بارش ابر لطف بن اُس کے
رفع کیا ہو غبار دل پر کا

کیا ہمارا شعور جو سمجھیں
مرتبہ اس سبھوں سے برتر کا

عقل کل پہ بھی کرنا مشکل ہے
فرق ظاہر سے ایسے مظہر کا

ہم علیؑ کو خدا نہیں جانا
پر خدا سے جدا نہیں جانا

ذات پاک اُسکی ہے خدا کی ذات
جمع واجب کے اسمیں سب ہیں صفات

علم و قدرت نہ بابت مذکور
دم زدن پہ نہ جائے حلم و ثبات

وہ نہ ہوتا سبب تو پھر کیا تھا
کیسے ہم تم کہاں کے موجودات

نہ تو دس عقل و نہ فلک ہوتے
نہ ستارے نمود کرتے سات

حال روشن نہ روز کا ہوتا
رہتی تاریکی عدم سے رات

اُس کے مقدم سے نور ہے ورنہ
سوجھتا کس کو ہاتھ سے پھر ہات

مرگ ہے مصلحت سے دشمن کو — بے ولا اُسکے زیست کیا حاصل
درس میں تیرے اے شہ علّام — پیر عقل ایک کودکِ جاہل
تیری ہمت قبول یہ نہ کرے — کہ مکرر ہلے لبِ سایل
اصل مطلب کو دوستی تیری — راہ مطلوب کو ہے یہ واصل
دستِ بخشش سحابِ بارندہ — کفِ ہمت محیط بے ساحل
سیر کر مجمعِ کمال سے تجھے — دیکھ کر تیری قدرت کاہل
طفل و برنا و پیر سارے مقر — عقل و ادراک و فہم سب قایل
یہ عقیدہ نہیں ہے اپنا ہی — کہتے ہیں سارے بالغ و عاقل

ہم علی کو خدا نہیں جانا
پر خدا سے جدا نہیں جانا

ہے علیؑ سایہ گسترِ دو جہاں — دیوے خورشید حشر سے وہ اماں
صورتِ ظاہرِ علیؑ پہ نہ جا — ہے علی خلوتیِ رازِ نہاں
وہ علی کی ہے ذاتِ پاک جسے — جیتے رہتے ہیں اہلِ عالم جاں
کیا کریمی کی ہے صفت اللہ — منیں ~~سے~~ یے نہیں ہی یہاں
شان ارفع ہے اپنے صاحب کی — کام کرتے نہیں قیاس و گماں
ہے جہاں رتبہ وجوب اُس کا — عقل کا درک وھاں ہے کیا امکاں
خوگر اس نام لینے سے جو نہیں — حیف صد حیف وہ دہان و زباں
دونوں یکتا ہیں ذوالفقار و علیؑ — ایسی شمشیر ہے نہ ایسا جواں
سب ہیں حیران منزلت اُسکے — قدر اُسکی کہاں سپہر کہاں

ہم علی کو خدا نہیں جانا
پر خدا سے جدا نہیں جانا

ہے علیؑ مدّعا علیؑ مقصود — وہی مشہور ہے وہی موجود
ہے علیؑ وہ کہ سارے صاحبِ دل — لیتے نام اُسکا بھیجتے ہیں درود
کیا زمیں کیا سپہر کیا مہ و مہر — کی علی کے لیے سبھوں نے نمود
جمع رکھ دل علیؑ سبب ہوگا — کیا ہے اسباب اگر ہوئے مفقود

حکم کے مرتبے میں ہو تو وہی — پردہ پوش و غفور ہے ستّار
عشق پیشوں کو اُسکے کیا وسواس — کہتے ہیں اور پھر کہیں سو بار

ہم علی کو خدا نہیں جانا
پر خدا سے جُدا نہیں جانا

ہے علی وہ بلند قدر امیر — دے دے ڈالے ہیں جسنے تاج و سریر
اُسکی یکتائی میں تردد کیا — جسکا نکلا نہیں عدم سے نظیر
خاکِ در ہو شہِ ولایت کا — شاہیاں لے گئے ہیں یاں سے فقیر
یوں ہے دُرریزِ دستِ جود اُسکا — جیسے برسے ہے کوئی ابر مطیر
صاحب ایسا ہی ہو تو صاحب ہے — گنہ آمرز اور عذر پذیر
ہمسے بندوں کی ورنہ کیونکہ نبھے — دمبدم جن سے ہوتی ہے تقصیر
کچھ محبوں کا معتقد مت پوچھ — ہو علی ہی ہُوَ العَلیِّ کبیر
شان سے کہتے ہیں محیط کل — قدرت سے قادر و خدائے قدیر
تو موالی علی پرست نصیر — چاہیے سو ہمکو کہہ لے اب اے میر

ہم علی کو خدا نہیں جانا
پر خدا سے جُدا نہیں جانا

مدحیات

میر تقی میر دہلوی

سمجھ کے زلف کے کوچہ میں پانوں رکھیو نسیم — کہ نکلی ہے یہیں سے راہ خانۂ زنجیر
ہزار قافلے یوں مصر سے چلے لیکن — گیا نہ ایک نے کنعاں کی سمت کو شبگیر
کھلا نہ منھ پہ ہمارے کہ ہے زباں پر آہ — برنگ خامۂ شق حرف خونچکاں تقریر
جگر ہے رشک کی جا اس شکار کا تیرے — کہ صیدگاہ میں پہلے ہی آ گیا سر تیر
جہاں میں اہل جہاں کو ہو کشمکش بن کیا — کہ ایک تنگ قفس اور جس میں اتنے اسیر
سفر ہے دور کا درپیش آہ کب آئینہ رو — کہ زاد راہ عدم ہو نگاہ وقت اخیر
نہیں تو دیر محبت کی رسم سے آگاہ — کرے ہیں کعبے کے سگاں کی بھی یہاں تکفیر
تمام نالہ ہوں اس بن مگر کہ روز نخست — کیا تھا تن کا مرے سودۂ جگر سے خمیر
غزل کو سن کے کہا ہمنشیں نے تجھ سا شخص — بجا ہو خاک ہو گر پیش آستان وزیر
وہ آستانہ کہ گویا ہے راستوں کی جبین — کرے ہے سجدہ جسے آن کر صغیر و کبیر
شرف ہے جس سے یہ اس آستاں کو کیا کہیے — وزیر کہیے کہ فرماں روا ہے کوئی امیر

غرض جلیس سے شکوہ کہ غم شریک جو تھا
یہ سن کے اسے گنہ آمرز اور عذر پذیر

مطلع ثالث

خلل پذیر ہوا ہے دماغ خامۂ میر — کہ تیری مدح میں کھولا زباں کو کر تقصیر
تمام قدرت و آصف صفت سلیماں جاہ — سوار دولت و گنجینہ بخش و دشمن گیر
فلک شکوہ ستارہ حشم خدیو جہاں — ترے جلال کو کن لفظوں میں کروں تعبیر
زہے یہ حشمت و جاہ و جلال و قدرت و زور — کہ تیرے حکم کے آگے ہے سہل امر خطیر
ترے محرر دفتر کا ہے سدا محتاج — جہاں میں شہرہ عطارد جو ہے فلک کا دبیر
زہے علو مراتب کہ در پہ بار نہ پائے — ہزار بار اگر چرخ مارے چرخ اثیر
شریک مشورۂ کارخانۂ عالم — کیا ہے تجھ کو قضا و قدر میں تیرے مشیر
رواں ہو صبح کا گر مرکب ظفر پیکر — تو تا بشام کرے روم و شام تک تسخیر
کف سخائی تری ریزش کرم کے حضور — گیا ہے قطرہ زناں شرمگیں ہو ابر مطیر
ہمم کو تیری بیاں کیا کروں کہ اے ممدوح — ہوئے ہیں خلق ترے بخشنے کو تاج و سریر
کروں میں عرض سو کیا ہفت گنج خسرو کو — کہ تیرے بخش دیے کے نہیں ہیں عشر عشیر

انھوں سو کیا ترے خدام کی سخاوت کو / نہ پاوے وقت دہش رتبۂ قلیل و کثیر

ثبات حرف کو تیرے قلم کی کیا لکھیے / لکھے تو خامۂ فولاد سے کیا تحریر

برات روزی کسو کی شرف کو دستخط سے / پہونچتی ہے تو نہیں مٹتی جوں خط تقدیر

نہیں ہے شہر میں نام و نشان منہیات / رہی ہے نے کوئی جنگل میں سو برائے حصیر

مزاج شرع پہ بدعت کے ہو تو پھر نہ اٹھے / صدائے نے کا تو کیا ذکر ہے قلم کی صریر

نسق کو کام تو فرماوے ایک آن اگر / تو پھر زمانہ قیامت تلک نہ پاوے تغیر

گیا ہے شور ترے عدل کا جو گردوں تک / کتاں سے آنکھ جھپکتا رہے ہے بدر منیر

بغیر غمزۂ خوباں رہا نہیں اب ایک / جہاں کے بیچ سے پہ اوباش خانہ جنگ شریر

جو چاہے تو کہ رہے فرش چاندنی دن کو / اٹھا کے نہ کرے پردے غلام کے شب قیر

کرے ہے قطع امید آپ سے بدن دشمن / سنے ہے تجھ سے تری جبکہ صولت شمشیر

جو نکلے میان سے تو نامہ نفت کہیے / کہ پہونچے جسکو اسے چھٹنے سے نہیں ہے گزیر

رہے تو زخم لگا اس کا پر نہ ہووے گر / فلک زمیں سے ملے تب ہو اندمال پذیر

نہیں ہے فیل کہ زربفت پوش کوہ بکوہ / کروں شکوہ کو اُسکے سو کس روش تسطیر

رواں رکاب میں ہے آسمان زر گویا / ستارے جھول کے ایک ایک آفتاب نظیر

کمیت خامہ مرے ہاتھ کے ہے زین تلے / صفت کروں میں سمند وزیر کی تحریر

کسو کی آنکھ نہ پڑ سکتی تھی چھلاوے تب / پھرے تھا سطح زمیں پر وہ یوں سپہر مسیر

نظر جو ایک مصور کی آ گئی جاتے / یہ ان نے دیکھ کے چاہا کہ کھینچیے تصویر

خیال دور سے دوڑا کے رہ گیا آخر / ہوا نہ گرد میں گرد بھی اُس کا شکل پذیر

سخن اس انداز کی مدحت کو مت سمجھیو یہ / کرے ہے غرض خرد دینا و بر بیان و تحریر

غرض یہ ہے کہ تری خاک آستان رہے / مگر اُسکے رتبے کو ہرگز نہ پہونچے پھر اکسیر

وہ آستاں کہ گدا و غنی کا ہے مسجود / بقیہ عمر کرے صرف اُس پہ یہ بھی فقیر

ہمیشہ ساتھ ترے دوستوں کے ہو اقبال
ترے عدو کی سدا بد تری کرے تدبیر

قصیدہ در مدح آصف الدولہ بہادر[1]

رات کو مطلق نہ تھی یاں جی کو تاب
آشنا ہوتا نہ تھا آنکھوں سے خواب

لوٹتا تھا سوزِ غم سے آگ میں
دل جگر سنکتے تھے دونوں جوں کباب

ہر زماں تھی ساتھ اپنے گفتگو
کیا کروں شہر اور ہیں دونوں خراب

تھا کرم شیوہ جنھوں کا اُٹھ گئے
بیٹھے بیٹھے کھینچیے کب تک عذاب

جائیے کس کے دراد پہ کون ہے
ملیے کس سے کون ملنے کا ہی باب

لے جوانی سے پھرے پیری تلک
امتحاں میں آ گئے سب شیخ و شاب

ناگہاں مجھ سے لگا کہنے سروش
رہگذر سے لطف کی کر کر خطاب

ہے کریم اب بھی وزیر ابن وزیر
آصف الدولہ فلک قدر و جناب

آسماں رتبہ ہے جس کا آستاں
ناز کر طالع پہ جو ہو بار یاب

اُس کی ہمت سے سخن کیا سر کروں
بات کہتے وے دو دو یا قوتِ ناب

اُسکے دست و دل کے رشک و شرم سے
خون ہے دل کان کا دریا ہے آب

جم حشم انجم سپہ گردوں شکوہ
مرجع خرد و کلاں عالم مآب

دست ہمت اُسکا گر دُر بار ہو
پانی پانی شرم سے ہوئے سحاب

مال کیا ہے ہفت گنج خسروی
اک ہی کو نواب بخشے ہے شتاب

فخر سام و رستم اُس کی بندگی
داخلِ خدّام یاں افراسیاب

جس سحر جرأت سے کھینچی اُن نے تیغ
ڈھال رکھے مُنھ پہ نکلا آفتاب

رزم کے عرصہ میں ہل چل پڑ گئی
آسماں کے خیمے کی کانپی طناب

---

[1] نواب آصف الدولہ یحییٰ علیخاں ہزبر جنگ نواب شجاع الدّولہ کے بیٹے تھے۔ نواب امۃ الزہرا بہو بیگم بنت نواب محمد اسحاق خاں شوشتری ان کی والدہ تھیں۔ ۱۱۸۸ھ میں نواب شجاع الدولہ کی وفات کے بعد رونق بخش مسند وزارت ہوئے۔ سات برس تک فیض آباد میں رہے اور اُسکے بعد لکھنؤ کو اپنا دارالحکومت بنایا۔
نواب موصوف خود شاعر اور شعرا کے نہایت قدر دان تھے۔ میر سوز دہلوی اُنکے اُستاد تھے میرزا رفیع سودا اور میر تقی میر بھی ان کے وابستگانِ دربار اور زمرۂ مصاحبانِ خاص میں سے تھے۔ مرزا رفیع سودا کو چھ ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر مرحمت کی تھی اور میر تقی میر کو تین سو روپیہ ماہوار دیے جاتے تھے۔ اس درماہے کے علاوہ اکرام و انعام کی کوئی حد نہ تھی۔ ۱۲۱۲ھ میں بعارضۂ استسقا انتقال کیا۔ لکھنؤ کی ایک مشہور عمارت امام باڑہ آصف الدولہ انکی بہترین یادگار ہے۔

قصیدہ مدحیہ شاہِ وقت

جو پہونچی قیامت تو آہ و فغاں ہے — مرے ہاتھ میں دامنِ آسماں ہے
کوئی آج سے ہے فلک مدعی کیا — ہمیشہ مرے حال پر مہرباں ہے
کدورت بیاں کیا کروں میں کہے تو — یہ دل گردِ کلفت کا یک کارواں ہے
جو روتا بھی ہوں میں غبارِ دلی سے — تو آنسو کا سیلاب ریگِ رواں ہے
جو دل میں ہے آتا ہے کہنے میں بھی وہ — زباں میری دل کی مگر ترجماں ہے
عجب مخمصے میں ہوں جورِ فلک سے — حوادث کے تیروں کا سینہ نشاں ہے
سحر جامِ خوں ہی جو منھ دھو چکوں ہوں — یہ مفلوک ایسے کے گھر میہماں ہے
رمق ایک جی ہے سو ایک آدھ دم کا — اُسے قصد اتبک مرا امتحاں ہے
اس احوال کا رنگ روپس ہے شاہد — جو دل میں ہے میرے سو منھ پر عیاں ہے
یہ شکوہ تھا درپیش مجھ کو کہ ناگہ — پکاری خرد ہوش تیرا کہاں ہے
تو مر جائیگا یوں تو رُکتے ہی رُکتے — کہ اندوہ و غم آفتِ ناگہاں ہے
غزل لطف کر میرؔ صاحب کی کوئی — کہ اُنکی زباں ہیچ سحر بیاں ہے
کہا میں نے مطلع غزل کا یہ سُن کر — کہ ہر طرف سے جسکے لوہو رواں ہے

مطلعِ ثانی

ترے ہاتھ جب تک کہ تیر و کماں ہے — شکارِ زبوں کی بھی خاطر نشاں ہے
کہے تو کہ شکلِ مثالی ہوں اپنی — مرا جسم اس لطف سے ناتواں ہے
ترے اور اے سادہ رو لعد میرے — مرا نامہ نانوشتہ ہر استخواں ہے
نہ پوچھ اس طلسمات عالم کی صنعت — کہ اس آشکارا میں کیا کیا نہاں ہے
خوشا مرگِ بلبل کہ سائے میں گل کے — کہیں مشت پر ہے کہیں آشیاں ہے
لگے ہے نہ اب عطرداں اُسکے منھ کو — نہ اس بوئے خوش سا نہ گل کا وہاں ہے
غرور خرابات چل شیخ دیکھیں — جو ترسا بچہ ہے سو پیرِ مغاں ہے
نہ کہہ خانوادے تھے یاں کیسے کیسے — خرابہ ہی ہے جبتلک یہ جہاں ہے
دمِ امتحاں میرؔ ہم کیا کریں گے — ہماری گرہ میں تو اک نیمجاں ہے

ولیکن تجاوز نہ ہووے ادب سے
کہ ممدوح اب شاہِ ہندوستاں ہے

و بارغ اب نہیں ہے جو تمہید کر لیے
کہ کل رات ہے اور یہ داستاں ہے

بھٹنی تیری کیجے یہ دل چاہتا ہے
ترے شکر نعمت میں قاصر زباں ہے

ترا عہد تکسیر خوشی ہے جو ہے بھی
گنہگار سا ایک غمِ مہوشاں ہے

ترے یاں ہے سب راستی و درستی
مگر با صدق سچ کا یہ خانداں ہے

زیارت کیے صدق آتا ہے جس کی
ترا جبہہ راستاں آستاں ہے

لکھے کیا شہا کوئی ہمت کو تیری
جہاں صبح اس خوان پر میہماں ہے

زیادہ ہو یہ وسعت رزق تیری
کہ مشرق سے تا غرب دستار خواں ہے

کرے ہمسری کیا وہ خورشید ادبر
فلک پاس کیا ہے یہی ایک ناں ہے

ترے ہاتھ کی ریزشِ جود آگے
خجالت سے یہ ابر قطرہ زناں ہے

تجھے مرجع کل کیا ہے جہاں کا
ترا دست ہے فرقِ خرد و کلاں ہے

دلی نعمتا عدل سے تیرے اب یاں
کتاں تھا سو مہ ہے جو مہ تھا کتاں ہے

ترے ہوش کے آگے ہے طفلِ ناداں
اگرچہ یہ پیرِ خرد کارواں ہے

حسن اے خامہ آ مطلع چارمی لکھ
کہ ممدوح کے زور کا اب بیاں ہے

مطلع رابع

ترے زورِ بازو کی طاقت عیاں ہے
کہ ہر جسکی قوت سے شمشیر زباں ہے

ترے زور کا سکہ ہے اس چمن میں
گلِ اشرفی غنچہ مہر و کاں ہے

قطعہ

ترا ہاتھ پڑ جائے گر رستم اوپر
جہاں میں وہ مشہور کیا پہلواں ہے

اُٹھاتا نہیں اسکو سُن کوئی گردن
وہ اس عرصے میں ایک سنگِ گراں ہے

تو یوں پھینک دے جیسے سنگ فلاخن
جہاں جا کے گر جائے سنگ نشاں ہے

کہ جو کوئی اس راہ نکلے سو دیکھے
یہ افسانہ ہر شہر کا ارمغاں ہے

ثنا کے ترے عرصے میں کرے جولاں
کمیتِ قلم ہاتھ کے زیر راں ہے

اُچک لے جہاں باگ کیا کیا مزے ہیں
زہے نام خدا اسپ کیا خوش عناں ہے

سبک سیر کی تیرے کیا کہیئے جلدی
پھر اس فر بھی پر کہ تختِ رواں ہے

ہے کشش فازۂ تنِ خوباں
دائرہ دور دامنِ خوباں

دائرہ نون اس نمط کھینچا
کہ خطِ دلبراں پہ خط کھینچا

مدعی کو جو خط دکھاویں ہم
جیسے حرف غلط اٹھاویں ہم

قطعہ در تہنیت صحت

مزاج شخص جہاں تھا ترے مرض سے سست
ہوا جو فضل الٰہی سے تندرست و چست

خبر جو گرم ہے اب تیرے غسل صحت کی
دل شکستہ جہاں تھا وہ خود بخود ہے درست

رہے جہاں میں بہت تا جہاں صحیح رہے
سلامت ہمہ آفاق در سلامت تست
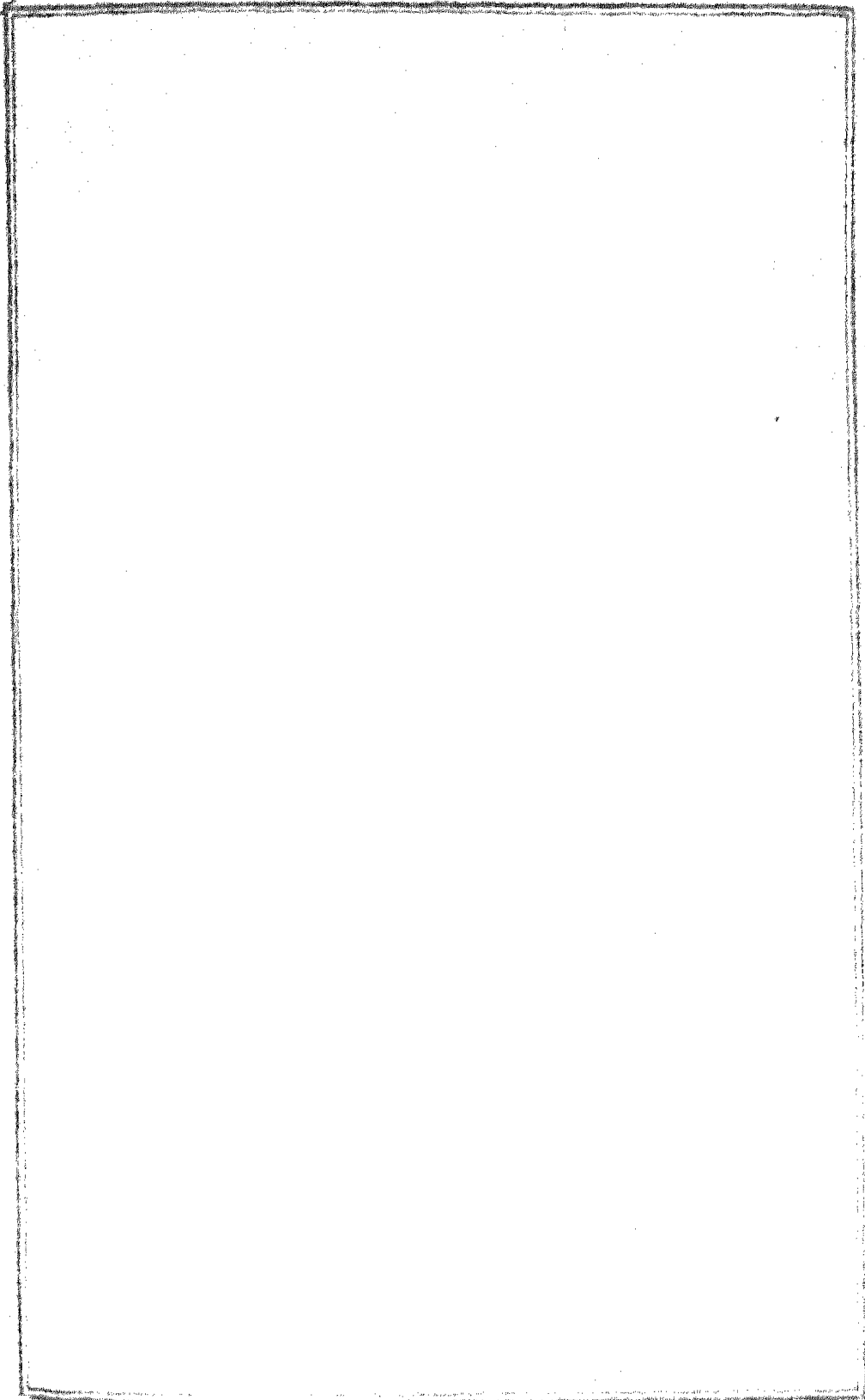
تماشہائے گوناگون

میر تقی میر دہلوی

کر چمن زار دست و دل کی سیر
ہیں نہال آج آشنا و غیر

گل نمط دل شگفتہ سب کے کیے
خلعتِ فاخرہ سبھوں کو دیے

لا کہاں ہے وہ لالہ رنگ شراب
جس سے مست گزارہ ہوں احباب

آ و مطرب لیے رباب و چنگ
کاڑھ مُنھ سے نوائے سیر آہنگ

ہر طرف رقص میں ہیں گلرویاں
پائے کوباں ہیں سلسلہ مویاں

شادمانی سے ہو نوا پرداز
دے بہارِ گزشتہ کو آواز

گل و لالہ سے چشم باز کرے
رنگِ صحبت کو دیکھ ناز کرے

چھیڑ سازِ طرب نوا کے تئیں
باندھ آواز سے ہوا کے تئیں

وجد میں لاوے مے پرستوں کو
یاد دے ٹک سرود مستوں کو

آ و ساقی کہ روشنی ہے خوب
محوِ آرائش آج ہیں محبوب

کاغذیں باغ کیا تماشا ہے
پھول کترا کہ گل تراشا ہے

بگّے سی مشعلوں کا ہوں بندا
نور کا ماہ نے کیا چندا

شیشۂ شراب ہی درکار
صحبتِ عیش کو چھکا یکبار

لالہ رنگِ رُخ نکویاں کو
مایۂ ناز خوبرویاں کو

اس پری کو نکال شیشے سے
رنگ مجلس میں ڈال شیشے سے

ہوئے سرمست ہو تماشائی
حکم کش ہے سپہرِ مینائی

چھوڑ آئینِ بردباری کا
سیر کر لے تزک سواری کا

چل گلابی کو ہاتھ میں لے لے
ایک دم جام متصل دے لے

ہے سواری کے فیل کی وہ جھوم
جیسے ابرِ بہار آوے جھوم

آئے دولت سرا سے ہو کے سوار
لعلِ ناب و گہر ہیں صرفِ نثار

اک مہابت کے ساتھ فیل نشاں
آگے مانند کوہ زر کے رواں

اور ہاتھی ہیں جھومتے جاتے
جیسے آویں جوان مدھ ماتے

جل زربفت کی ہر ساری شب
روکشِ انجمِ فلک ہیں سب

پلٹنیں جاتی ہیں برابر یوں
صف ہو مژگاں ابروں کی جوں

بال بستہ رکاب میں ہیں تُرنگ
جنکے دیکھے کمیت چرخ ہے دنگ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثنوی در جشن ہولی و کتخدائی

آؤ ساقی شراب نوش کریں
شور سا ہے جہاں میں گوش کریں

آؤ ساقی بہار پھر آئی
ہولی میں کتنی شادیاں لائی

شادیاں بے شگوں سراسر ہیں
کوچے سو شہر کے برابر ہیں

دستِ دستور ہے جو زر افشاں
پھر جہانِ کہن ہوا ہے جواں

دونوں رستے عمارت خوش ہے
تازہ کاری شہر دلکش ہے

اور بازاری رنگ لائے ہیں
سارے رنگیں ستون لگائے ہیں

جسطرف دیکھو معرکہ سا ہے
شہر ہے یا کوئی تماشا ہے

چشمِ بد دور ایسی بستی سے
یہی مقصد ہے ملکِ ہستی سے

لکھنؤ دلّی سے بھی بہتر ہے
کہ کسو دل کی لاگ ادھر ہے

آئیں بستہ ہوا ہے سارا شہر
کاغذیں گل سے گلستاں ہے دہر

ایسے گل پھول ہیں جو صرف کار
راہ رستے ہوئے ہیں باغ و بہار

بستہ آئیں دکانیں ہیں یکسر
جن میں ہستی متاعِ لعل و گہر

میوۂ نورس و رسیدہ بہت
گل خوشرنگ بوے چیدہ بہت

شب شادی کو لڑکے ہوں جو سوار
لیں صغیر و کبیر بہرِ نثار

تختِ بہرِ زنانِ رقص کناں
جتنے رستوں میں ہے چنین و چناں

گل کاغذ سے شہر ہے گلزار
تو کہے آئی ہے بہار اے یار

ساقیا عیش کا ہو بزم آرا
سارے لوگوں میں جامِ مے کو پھرا

جس میں تہ پاوے اس پری کو دے
ورنہ شیشے کی شیشے میں رکھنے

ہوگی مجلس جو مستِ آسائش
کون دیکھے گا لطفِ آرائش

سیر کریے کنارِ نہر و گشت
اُنھیں پھولوں کے انعکاس سے آب
سبدِ گل ہوئی ہے ہر کیاری
درمیاں یک شجر نہیں بد برگ
جوش لالہ سے تا او لہ لنج و سنگ
تخت کیونکر نہ ہو دماغ خاک
پھر لبالب ہیں آب گیر رنگ
پاس آتے ہیں مرغ گلشن پھول
زعفرانی لباس تھے سب کے
پگڑیاں جامہ بھیگی سو سو ہیں
چھڑیاں پھولوں کی دلبروں کے ہاتھ
قمقمے جو گلال کے مارے
خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں
جشن نوروز ہند ہولی ہے
عشق ہے اے گروہ آتش زن
ٹھاٹھ کیا روشنی کے باندھ دیے
دور دو تھے خیال سوانگ آئے
روشنی وار سے ہی پار تلک
در دولت سے لے کے تا سرِ آب
پھر سرِ پل سے تا عمارتِ نو
ہاتھی رنگنے گئے پڑی ہے دھوم
خیمہ استادہ کر چکے شب باز
یاں کی صحبت کا تھا نمونہ سب
آئے شکلیں بنا کے صورت باز
نقل معقول کی سو جا جی بنے

لالہ و گل کھلے ہیں تا سرِ دشت
تو کہے لالہ رنگ سب ہی شراب
ایک ہے گل زمین زمیں ساری
ہے ہزارہ کہ لالۂ صد برگ
شفقی ہو گیا ہوا کا رنگ
دشت در دشت ہے گل تر ایک
اور اُڑے ہے گلال کس کس ڈھنگ
تھے وے دلبر گلال کے سے پھول
رسم سے آئے صبح کو شب کے
ان کو گلہائے تر کہیں تو ہیں
سیکڑوں پھولوں کی چھڑی ہے ساتھ
مہوشاں لالہ رخ ہوئے سارے
گل کی پتی ملا اُڑاتے ہیں
راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے
دونوں رستے چراغ ہیں روشن
شہر میں نام روشن اپنے کیے
گھوڑے دامن سوار کیا لائے
گل کا کاغذ ہے نرق خار تلک
ہے چراغ اور شمع ہی کی تاب
جلتے ہیں مجتمع دیے سو سو
جیسے ابرِ سیاہ آئے جھوم
پتلیوں نے کیا خرامِ ناز
شاہ دستور حکم و کار ادب
ڈوم ڈھاڑی بنے بجا کر ساز
سج کے عمامے سر پہ کتنے جنے

تارے موقوف کچھ سما پہ نہیں — تو ہیں چھوٹیں مگر ہوا پہ نہیں
ماہ بھی چشم روشنی کے لیے — ہے چراغاں ستارگاں سے کیے
گنج چھوٹے ہیں یا کہ باڑ جھڑی — یا ہوائی ہے جگنیوں کی جھڑی
گل فشاں ہیں پڑی جو پھلجھڑیاں — کھلتیاں ہیں دلوں کی کلجھڑیاں
چھوٹتے ہیں انار وہتابی — رنگ ہیں دلبروں کے مہتابی
باؤسے دودیے ہوئے گر ماند — دغیں مہتابیاں کہ نکلے چاند
آؤ اے مطربانِ سیر آہنگ — ساتھ اپنے لیے رباب و چنگ
ہو غزلخوان بزمِ عیش و طرب — پر نہ کر تو خیال ترکِ ادب
منعقد مجلس شہانہ ہے — ادبِ آصفِ زمانہ ہے
آؤ ساقی مجھے قرابہ دے — ور بغل شیشہ ساتھ اپنے لے
بحرِ بخشش کی لہریں اب آئیں — زر و گوہر کی کشتیاں لائیں
ہے بلند اس کرم کا کیا پایہ — دیتے ہیں خلعت گرانمایہ
طرہ ہائے زری و بادلہ تاش — تختہ ہائے دوشالہ تحفہ لباس
بہت اُن میں سے بہت نہ سئے — ایک دم میں سبھوں کو بخشدیے
خاص ملبوس نوع نوع تمام — لے گئے شاہ و بھر کے مردمِ عام
کیا بچھا ہے فراخ دستر خوان — جیسے ہے خلق یک جہاں مہماں
تورہ بندی ہوئی تکلف سے — کھانے نکلے نئے تصرف سے
لطف کے ساتھ نعمتوں کا وفور — زیرِ ہر جعبہ قاب ہے پر نور
عام تھا ان لطافتوں سے طعام — دیتے لیتے تھے ہر سحر ہر شام
کس کو اسباب یہ میسّر ہیں — ظرف سیمین جعبہ زر ہیں
ہیں جو مہمان بادشاہ و گدا — حرص دونوں کی سیر ہے یکجا
عمر و دولت ہو اُسکی حد سے زیاد — ہے اُسی سے جہان نشاط آباد
آؤ ساقی غزل سرا بھی ہو — لذّت شعر سے مزا بھی ہو

غزل

(بہار کیا کیا دریا پہ رنگ لائی — اک شہر نکلے لالہ پھر اس میں ہو نی آئی

کی فکر سالِ تاریخ آوازِ غیب آئی
ہم[1] نے کبھی نہ دیکھی اس رنگ کی خدائی

آنکھوں کی روشنی تھی اپنی ہوئی دو چنداں
طالع نے چاندنی میں کیا روشنی دکھائی

ہو باد جس طرف کی آنکھیں اُدھر ہیں اُسکی
نرگس کا اس ہوا میں دیدہ بھی ہے ہوائی

بے گل رہے نہ یکدم بلبل کے آہ و نالے
محبوب سے کسو کو یارب نہ ہو جُدائی

گل تک ہنسا نہ مجھسے بلبل نہ بولی ہرگز
برسوں کسو کی بیدماغی بے یار میں اُٹھائی

ہم بھی رہے ہوا وہ جبتک جوان جاہل
کی عمر رفتنی نے بارے نہ بیوفائی

اخوانِ زمانہ کے تو کیا جانیں دل لگی کو
لگتی ہے جیسے دل کو وہ جانتا ہے بھائی

ہے دامگاہ دنیا ہر جا فریب اس میں
دیتی نہیں دکھائی اپنی مجھے رہائی

گزری جو کچھ سو گزری یاں زیب نہ بروں کی
میر اب کسو سے تم تو کریو نہ آشنائی

قطعہ در تعریفِ اسپِ وزیرِ زماں آصفِ دوراں نواب آصف الدولہ بہادر

وزیرِ زماں نے لیا ایک اسپ
کہ ہے رشکِ گلگونِ بادِ بہار

نظر پوست سے اُسکے آتا ہے خوں
کیا جلد نے اُسکے گل کو نثار

اُڑا گر کرے بادپا سیر کی
نہ نکلے کبھو ابلقِ روزگار

کروں اُسکی کیا تیزگامی کی شرح
ہرن اُسپہ شمشیر سے ہو شکار

ٹک اک کسمسائے جو رکب تو پھر
نہیں اُسکو رانوں میں ہرگز قرار

جہاں باگ اُچک جائے محبوب کی
عناں دار اُسکے ہے بے اختیار

کرے عزم ابد کا ازل سے اگر
وہ جائے نہ جو اُس پہ ہووے سوار

کہے اُسکو ٹک چھیڑ کے کرکے [illegible]
تو یہ بادپیما کرے یوں گزار

کہ بیچے قدم گرد جو اُٹھ چلے
نہ پھر تے تک اُسکے وہ بیٹھے غبار

غرض اسپ ہے یا چھلاوا ہے میر
رہے پا نہ دیدار اُسکے پیچھے ہزار

[1] یعنی [illegible] ہجری۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثنوی در بیان ہولی

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر — رنگ صحبت سے عجب ہیں خرد و پیر
جشن نوروزی اہل ہند سب — ہے یہی تب محو عشرت ہینگے اب
شیشہ شیشہ رنگ صرف دوستاں — صحنِ دولتخانہ رشکِ بوستاں
اس چمن میں باغ پر گل سرخ و زرد — نکہت گل جھاڑینگے واں آکے گرد
پھول گل آویں نظر دیکھو جدھر — لالہ و صد برگ سب باغ نظر
دستہ دستہ رنگ میں بھیگے جواں — جیسے گلدستہ تھے جوؤں پر رواں
زعفرانی رنگ سے رنگیں لباس — عطر مالی سے سبھوں میں گل کی باس
رنگ افشانی سے پڑتی ہے پھوہار — رنگِ باراں تھا مگر ابرِ بہار
مرغِ گلشن گلرخاں کو جان پھول — بیٹھتے ہیں پاس آکر پھول پھول
قمقمے جو مارتے بھر کر گلال — جسکے لگتا آن کر پھر منہ ہو لال
برگ گل ملواں اُڑاتے تھے عبیر — تھی ہوا میں گرد تا چرخ اثیر
روشن الدولہ نے کی تھی روشنی — کب ہوئی تھی لیکن ایسی روشنی
وہ چراغاں گرچہ تھے درگاہ تک — تھے تماشائی گدا و شاہ تک
راہ میں ترپولیے مینار سے تھے — روشنی کے کوچہ و بازار تھے
گرم کچھ ہنگامہ یہ بھی کم نہ تھا — اس روش کی دھوم کا اودھم نہ تھا
اب تو ہفت اقلیم کا عالم ہے یاں — دیکھو تو ہر جنس کا آدم ہے یاں
ٹٹیاں دریا کے باندھیں دو طرف — کیا چراغاں آسماں کی ہو طرف
تھا جہاں تک آب دریا کا بہاؤ — واں تلک تھا اس چراغاں کا دکھاؤ
ایک عالم دیکھتا تھا دور سے — رات دن تھی روشنی کے نور سے
کوچہ و بازار و بام و در بنے — روشنی کے دونوں رستہ گھر بنے

سوانگ کیا کیا بنکے آئے دریاں — پگھلنے کا سوانگ تھا سارا جہاں

آئے کس کس رنگ سے دریچ ار — بادکے رنگوں جھنوں کا تھا گزار

ہاتھی آئے کوہ پیکر کیا بنے — جیسے مدہ ماتے جواں ہوں ٹھنے

کیسی کیسی دیکھی شکلیں تازیاں — سحر کرتے تھے کہ صورت بازیاں

اُن دیوں کے عکس سے دریا کا آب — آئینے کے سطح کی رکھتا تھا آب

کشتیوں میں جو دیے بھر کر چلے — پانی میں شعلوں کے دیپے ہی چلے

منعکس تھے جو چراغاں تہ تلک — آب کی وسعت تھی پر انجم فلک

کیا ہوائی چھوٹنے کا ہے بیاں — ذو ذنب جیسے ستارے ہوں عیاں

جاہی جوہی چھوٹنا ہے یادبود — روشناں ذو ذوانب تھے نمود

گنج چھوٹے ایک سے روشن تھے جھاڑ — دو طرف جس طرح سے جھڑتی ہو باڑ

اس روش سے تھے ستارے چھوٹتے — انگنھاں جو ہو دیں تارے ٹوٹتے

دیکھے جاتے تھے چراغاں آب میں — شعلے تھے لہروں کی پیچ و تاب میں

ہر دو جانب چن گئے ناری انار — گلفشانی سے تھی خوبی کی بہار

ماہتابی اک طرف سے جو دغی — چاند سا نکلا ہوئے حیراں سبھی

آفریں صناع کو تو قدر میں — کیا لگایا باغ آکر کاغذ میں

گل کتر کر پھول گل ہی کر دیے — رنگ تازے کاغذوں میں بھر دیے

متصل توپیں ستاروں کی نہیں — لوگوں کی آنکھیں تنک سے جگ بجیں

دغیاں کیا کیا نہ شعلہ خیزیاں — تھیں ہوا میں سے ستارہ ریزیاں

نذر کو نواب کی اہل فرنگ — لیکے آتشبازی آئے رنگ رنگ

عرصہ گلریزی سے گلشن ہو گیا — چرخ اُن تاروں سے روشن ہو گیا

دغیاں توپیں ہوائی ایک بار — چھپے تارے آسماں پر بے شمار

کیا ہوائی باد میں لہرا گئی — ناری سانپوں کے سے سن پھیلا گئی

کیا ہی آتش دستیاں دکھلا گئے — شعلوں سے پانی کی لہریں بھر گئے

ہمت سے آتش زناں کیا آگ ہے — تہ بساط آب دریا آگ ہے

مجھ غزل لب میر رنگیں ہو کوئی — تشنے ہو مخمور جسکو ہر کوئی

غزل

لالہ کنار دریا نکلا ہے کیا زمیں سے
اُگتی نہیں ہیں آنکھیں دیکھو ادھر کہیں سے

بالیدگی سے پہونچے گل آدمی کے سر تک
ہو واں تو رنگ ٹپکے جیب اور آستیں سے

خوش رنگ تر ہے ہر گل رخسار سے پری کے
صد برگ واں طرف ہے خورشید کی جبیں سے

مُنھ پر عبیر عاشق اصرار سے ملے ہیں
کب ہاتھ کھینچتے ہیں معشوق کی نہیں سے

صندل بھری جبیں سے کیا صبح چہرہ ہو وے
اس قطعۂ چمن کے محبوب خوش نشیں سے

یکسو گلال منھ پر خوباں کے مل رہے ہیں
اُلجھے ہیں ہاتھ یکسو گیسوئے نازنیں سے

جب میر جان دینا بوسے کے بدلے ٹھہرا
تب خوف کیجیے کیا پیشانیوں کی چیں سے

مثنوی دیگر

تھا کبھی کا بچہ اک درویش پاس
باش و بود اُس کی تھی مجھ دلریش پاس

اس قلندر نے بحسب احتیاج
بیچنے اُس کو نکالا لاعلاج

میں نے اُس کو ایک جا دلوا دیا
مول ٹھہرا تھا جو کچھ سو لا دیا

بوزنہ یا کوئی تحفہ دھر کا
عزت افزا بندا ابن شہر کا

نام منوا اس کا اب مشہور ہے
شوخی اُسکی ہر کہیں مذکور ہے

ہے ہنومانی نسب یہ باب دید
قابل وصف اسکے حضرت بو حمید

ہے جو لکھنؤ بندری مشہور اب
اسکی جد مادری تھی بو العجب

اُس کے پردادا نے ہی یہ حرف دی
ایک دم لابہ میں لنکا پھونک دی

ایک چنچل ہے بلائے روزگار
ہاتھ رہ جائے تو با سرگرم کار

ہے تو بچہ سا ولیکن دور ہے
پست اُس کی جست کا لنگور ہے

کیا کوئی انداز شوخی کا کہے
ہو معلّق زن تو آدم تک رہے

اچپلاہٹ اسکی سب معلوم ہے
معرکوں میں چوک کے اک دھوم ہے

ہوتے ہیں قلّاد کب دیکھے سے سیر
اچپلی اس کی رہے ہے یاد دیر

حرکتیں دلکش ہیں سب انداز خوب
پر ضروری ہے کہ ہاتھوں میں ہو چوب

ورنہ بوزنہ سا جو قد ہے جھاڑ ہے
کنگھنا تجنا ہے کپڑے پھاڑ ہے

لونڈی باندی سب کو اس سے احتراز
ڈر سے اکثر بی بیوں کے دل گداز

یہ جو چاہے چھوٹے تو تدبیر کیا
رسی ڈوری لوہے کی زنجیر کیا

ربط اسے جس سے ہو اُس سے ربط ہو
مار کھانے پر بھی اُس کو ضبط ہے

جب وہ چھوٹے شور و ہنگامے رہیں
اتو چھوٹا اتو چھوٹا سب کہیں

چھوٹتا ہے گر پڑے کوئی بجوگ
بندروں سے اچٹتے پھرتے ہیں لوگ

ہوتے ہیں اس جنس میں بھی ذی خرد
آدم و حیواں میں یہ برزخ ہیں بد

طنز ہے یہ بات اگرچہ سے کہی
جو کرے انسان تو بوزنہ بھی

لیکن اس جاگہ تو صادق ہے یہ قول
سارے ڈھنگ آدمی کے ہیں ہول

ہے تماشا آئینہ کے روبرو
عکس سے اپنے اسے ہے گفتگو

دیکھنا جھک جھک کے سر کا ہو زنخند
آرسی بندر کا ہے مشہور ربط

گاہ بوسہ گاہ غرغر بولنا
گاہ آنکھیں موندنا گہ کھولنا

آگے تھا اک بوزنہ شطرنج باز
چال سے اُس کی نکلتا امتیاز

کہنہ قرادوں سے ہم کو یاد ہے
یہ اسی انسان کا داماد ہے

جان دیں بندر اگر چھینیں چنے
رہتے ہیں جانوں پڑے سکتے گنے

آنکھ کب ورڑے ہے اُس کی ہر طرف
ست یہ ہے نوع کا فخر و شرف

الغرض منوا عبارت جاں سے ہے
نام اس ترکش کا منوا یاں سے ہے

خوش رہے منوا تو خوش خوش ہو میر
ورنہ آدم ہے جوانی میں بھی پیر

دہر میں یارب نہ یہ محزوں رہے
جس کو منوا ہے اُسے میموں رہے

مثنوی دیگر

ایک بلی موہنی تھا اُس کا نام
اُن نے میرے گھر کیا آ کر مقام

ایک دو سے ہو گئی الفت گزیں
کم بہت جانے لگی اٹھ کر کہیں

ربط پھر پیدا کیا میرے بھی ساتھ
دیکھتی رہنے لگی میرا ہی ہاتھ

آ رہے ہے مجھ پاس یہ اُٹھ کر سویر / گربۂ زردِ فلک نکلے ہے دیر

یعنی وقتِ گرگ و میش آئے ہے پاس / پھر مرا پھیروں کیا ہے اُن نے پاس

چھیچھڑا ٹکڑا جو کچھ پایا کرے / فقر میرا دیکھ کر کھایا کرے

بختوں سے ٹوٹا ہے چھینکا بھی اگر / اُن نے اودھر کی نہیں مطلق نظر

دخل کیا ہے جھانکے یہ چھینکے کی اور / ٹکڑے کو دیکھے نہ گو بھوکی ہو زور

اس مروت پیشہ سے کیا ہے گلا / خوف سے آ بھی سکے چوہا ملا

ایک بلّی کچھ گئی تھی آ کے چکھ / یہ لڑی تو منھ پہ پنجہ اپنے رکھ

برسوں یاد آوے گی یہ پاکیزہ خو / آ گئے آئی ہی نہیں چلتے کبھو

لانگھے ہو جو گھر سے جاتے تدریوں / چلتے چھینکا ہو کبھو تو کچھ کہوں

تھی جو ظاہر جوں کڑاہی تیرہ رنگ / پر تماشا کردنی تھے اُس کے ڈھنگ

شوق میں ہمسائیاں اُس کے رہیں / جو گئی بھی ٹک تو مانگے سے کہیں

پھرنے کو تو پھرتی کیا دلّی نہ تھی / پر چلے پانوں کی یہ بلّی نہ تھی

رفتہ رفتہ کوٹھوں پر جانے لگی / پہروں پہروں میں یہ پھر آنے لگی

حاملہ ہو کر کئی بچے دیے / ایک دو بھی سو نہ ان میں سے جیے

متصل ایسا ہوا جو اتفاق / مرگ ان بچوں کی گزری سب پہ شاق

حفظ اس کی کوکھ کا لازم ہوا / جھاڑے پھونکے کا ہر اک عازم ہوا

نذریں مانیں نقش لائے ڈھونڈھ کر / نیل کے ڈوروں میں باندھے پیٹ پر

چھیچھڑوں پر بعضوں نے افسوں لکھے / بعضوں نے تعویذ لے کر خوں لکھے

بی بلائی سے بہت کی التجا / گربۂ محراب سے چاہی دعا

گوشت کی چیلوں کو پھینکیں بوٹیاں / ماش کی موٹی پکائیں روٹیاں

لڑکیاں بٹھلائیاں کھاٹوں تلے / اس طرح جوں دیکھی بلّی کم ملے

دیتے ٹکڑا منھ کو ہر اک ٹھوسلتے / اور بولی بلیوں کی بولتے

صدقے اُترے چھیچھڑے جو ڈھیر ڈھیر / گربۂ لاوہ نے کھائے ہو گئے سیر

کیں مناجاتیں دلِ شب لاتعد / گربۂ زاہد سے بھی چاہی مدد

بوہریرہ کے تئیں مانا بہت / بلیوں کو بھی دیا کھانا بہت

گرد رو باندھے تو چہرہ حور کا ۔ چاندنی میں ہو تو بکّا نور کا
گرم شوخی ہو اگر یہ مثلِ برق ۔ تجلی میں اُس میں نہ کچھ کر سکیے فرق
یا پری اس پردے میں ہے جلوہ گر ۔ اُٹھتی اودھر سے نہیں ہرگز نظر
کیسی ہی بلی ولایت کی ہو زور ۔ خوب دیکھو تو ہے اُسکے صدقے حور
ربط ہے اپنے بھی جی کو اسکے ساتھ ۔ بیٹھے ہی تو پیٹھ پر میرا ہے ہاتھ
ایک دن جاکر کہیں ٹک سوگئی ۔ مانی مانی سارے گھر میں ہوگئی
بلی کا ہوتا نہیں اسلوب یہ ۔ ہے کبودی چشم یک محبوب یہ
دیکھے جسدم یک ذرا کوئی اسکو گھور ۔ چشم شور آفتاب اس دم ہو کور
حسن کیا کیا مانی کے کریے بیاں ۔ ہو جہاں جبتک یہ ہووے درمیاں
خوبی منی کی نہ کوئی کہہ سکے ۔ دیکھے اُس کو تو نہ اُس بن رہ سکے
داغ گلزاری سے اسکے تازہ باغ ۔ اس زمانِ تیرہ کی چشم و چراغ
کیا دماغ اعلیٰ طبیعت کیا نفیس ۔ کیا مصاحب بے بدل کیسے جلیس
یہ نفاست یہ لطافت یہ تمیز ۔ آنکھ دوڑے ہے نہ ہو کیسی ہی چیز
اسکو گر کعبے میں یہ ہو شوخ و چست ۔ ہے کبوتر مارنا واں کا درست
چوہا چڑیاں اُن نے کچھ کھایا نہیں ۔ حج کو جانا اُسکے تئیں آیا نہیں
محبِّ ہرّہ جو کہ ہے ایمان میں ۔ ہے اسی بلی کی شاید شان میں
تھا بہت منی کا جبّا آرزو ۔ سو جنی دو بلیاں یہ ماہرو
خال ہیں ان پر بھی ماں کے سے عیاں ۔ پر وہ خوبی اور محبوبی کہاں
موہنی اور سوہنی ہے ان کا نام ۔ پھرتی ہیں پھندنا سی دونوں صبح و شام
نیلے دھاگے گردنوں میں ہیں پڑے ۔ لوگ آنکھوں میں ہی رہتے ہیں کھڑے
حفظ ابھی بلّوں سے انکا ہے ضرور ۔ رہیو ان دونوں سے چشم شور دور
دیکھے اُن کی اور جو ٹک کرکے خشم ۔ کاڑھ کر دیں بلیوں کو اُسکی چشم
قصّہ کوتاہ موہنی آگئے موئی ۔ یک قیامت جان پر اس بن ہوئی
صبر بن چارہ نہ تھا آخر کیا ۔ بلی باروں میں اُسے گڑوا دیا
شاد وہ جسکے رہیں قائم مقام ۔ وائے اُسپر جس کسو کا لیں نام

مثنوی در تعریف سگ و گربہ در خانۂ فقیر بودند باہم ربط داشتند

سگ و گربہ ہیں دو ہمارے ہاں
دو ہیں قالب اور ان کی ایک ہی جاں

رنگ گربہ سے شیر نر ہے داغ
آنکھیں اس کی اندھیرے گھر کا چراغ

کھائے نہ جو نہ ہو وہ مادہ سگ
بھوکھا بیٹھا رہے قیامت تک

کب مروت سے جائے کھا اچکھ
ٹرے بھی ہے تو منھ پہ پنجہ رکھ

سارے ہمسایوں پر ہے یہ معلوم
موش کی نسل ہو گئی معدوم

چوہا کیا ہے جو سامنے آوے
گھونسوں سے بھی یہ شیر بھڑ جاوے

ان نے جو ماریاں ہیں گھونسیں ٹھونس
موش دشتی ہوا ہے کونے گھونس

گھونس جب نگر ہی میں مرتی ہو
موش دشتی پہ کیا گزرتی ہو

کوئی چھچھوندر جو بستی میں یاں ہے
سو وہ چوہوں کی مرثیہ خواں ہے

ایک دن گھر میں ایک گھونس آئی
اپنے پاؤں اجل سے [illegible] لائی

گھونس کیسی بتاؤں غیرت سونس
طاق ہے جسکے آگے حالت سور

یا کوئی مادہ خوک آبستن
یا کسو کچھوے کی برادرزن

پھرتی پھرتی جو صحن میں خوشحال
پائے دیوار بیٹھی سر کو نکال

کہیں اودھر سے شیر جاتا تھا
پھیر منھ پہ پیچھے آتا تھا

پڑ گئی اس کی اس پہ چشم کبود
نیلا پیلا ہو دکھ جوں دود

پنجہ جھنجھلا کے ان نے گر مارا
بارے کچھ گھونس نے مرے جانا

پر مرے سے خوف جاں نہ آیا کچھ
غالب آیا نہ اس کا سایہ کچھ

ٹھنک ٹھنکا یا پھر ان نے جانا تو
کیونکہ تھا یہ تو شیر کا خالو

پھر تو بگڑی ہے دونوں میں آکر
چوٹ ہوتی تھی داؤ پا پاکر

غصہ خر موش کو بھی آن چڑھا
اتفاق اس جگہ تھا ایک گڑھا

دونوں لڑتے ہوئے گرے تہ میں
بیچ کا کاٹتے پھرے اس میں

[illegible] اس شیر کا کچھ ایک گڑا
شور محشر گڑھے کے بیچ پڑا

شور کیسا کھٹکے جو بک اٹھے
سگ بازاری بھونکنے لگ اٹھے

یاں تو گھر بیچ کیا ہے کیا ہے پڑی ، گھونس بلی نے چھیچھڑے کر دی
کھڑے مونچھوں کے بال انگڑاتا ، شیر نکلا گڑھے سے گھبراتا
لیک جی سے تھا سب بدن خالی ، کیونکہ سر سے بلا بڑی ٹالی
گھونس کے وارثوں کی کیا ہے تاب ، کہ قدم کو رکھیں وہ حتی الباب
کوئی چھچھوندر اب اس پہ روتی ہے ، کہ تری لاش خوار ہوتی ہے
تو ہو تھی ساری قوم کی سردار ، سو اُٹھا یا ہے زخم دامن دار
ہم بہت غم میں تیرے روئیں گے ، بل کے بل اب خراب ہووینگے
فخر ہے اپنی نسل کا یہ شیر ، جن نے گھونسوں کے کر دکھائے ڈھیر
سنا ہے موش گربہ کا قصہ ، وہ جو ہے گا عبید کا حصہ
جسکو باندھا عبید زاکانی ، لگتی تھی اسکی وہ سگی نانی
گربہ تا بود فاسق و فاجر ، ق ، صیدِ او یک بُدے بسالانا
ایں زماں پنج پنج می گیرد ، کہ شدہ مومن و مسلمانا

در تعریف مادہ سگ

ہے جو وہ مادہ سگ تماشا ہے ، دوڑ پڑنے کے وقت باشا ہے
کسی کے لقمے پہ نہ منھ ڈالا ، سگِ اصحاب کہف کی خالا
نہیں کتوں سی خواریاں کے یہ ، ہے سگوں میں عزیز خاں کے یہ
دے ہرن کو بھی جلد ہی میں بُتّا ، ہے گا یاں سگِ لوند کیا کُتّا
اُڑتی چڑیا انھیں نے ماری ہے ، استخوانِ سگِ شکاری ہے
یہ جو غصے میں آ وے تو ہے غضب ، اسکے مارے ہوئے ہیں ہارے سب
منھ میں دیتے ہیں اسکے جب مشعل ، طرفہ دم لابہ کرتی ہے اچپل
منھ میں اپنے لیے فتیلے سے ، سگِ لیلے کے ہے قبیلے سے
باہم اس کتے بلی کا یہ ربط ، کوئی دیکھے نہ ہووے اس سے ضبط
کبھو جاتا جو ہے یہ کوٹھے پر ، لگی رہتی ہے اسکی چھت سے نظر
اور ہے دشمنیِ جانی ہے ، اسکی یہ باؤلی دِوانی ہے
دونوں شوخی سے مار سہتے ہیں ، سگ و گربہ کی چال رہتے ہیں

خموش میر تجھی کو نہیں یہ رنج و تعب
کباب آتشِ غم میں ہیں مرغ و ماہی سب

مثنوی در بیان بز

کہتے ہیں جو تم نداری بز خبر
سو ہی لی میں ایک بکری ڈھونڈھ کر

شعر زورِ طبع سے کہتا ہوں چار
دزدی بز گیری نہیں اپنا شعار

دزد ہے شایستہ خونریزی کا یاں
بلکہ بابت ہے بز آخر بزی کا یاں

میں پڑھوں ہوں اُسکے آگے شعر گہ
اپنے ہاں گویا بز اخفش ہے یہ

بکروں کی داڑھی کے تئیں جانے ہیں سب
تکہ ریشی بکری کی ہے بوالعجب

رنگ سر سے پاؤں تک اُس کا سیاہ
چکنی ایسی جس پہ کم ٹھہرے نگاہ

چار پستاں اُس کے آئے دید میں
دو جہاں ہوتے ہیں وہیں جید میں

ایک میں اُن میں سے تھا مطلق نہ شیر
ایک کو کہتے ہیں اندھی خرد و پیر

اسپ کالے بکرے دو خیلا جنے
ناز نخرے سے رہے پھر اُسنے

چارہ بیٹھے کھاتے اک انداز سے
دیتی بیٹھ تو ہوتے خوش اُس ناز سے

دودھ ہو چوچی میں تو بچا پیئے
بیٹھا دیکھے اُس طرف مُنہ کو کیے

بھوک سے گرم تظلم وے ہوئے
اپنی شایان ترحم وے ہوئے

دودھ منگوایا گئے بازار سے
پھوہوں سے دینا کیا انکار سے

گھاس دانہ بارے کچھ کھانے لگے
گرتے پڑتے پاس بھی آنے لگے

پرورش سے حق کی بارے جی گئے
آب و دانہ دوڑ کر کھا پی گئے

اب جوانی پر جو ہیں وہ شیر مست
کودتے ہیں ہر زماں ہر دم ہیں جست

مستی اپنی ماں پہ کرتے شاد ہیں
عاقبت بکرے ہی کی اولاد ہیں

زور و قوت سے حریفوں کے ہیں ڈھینگ
آہوئے جنگی کو دکھلاتے ہیں سینگ

ٹکر ان کی کیا جگہ مینڈھا اٹھائے
قوچ سرزن سامنے ہرگز نہ آئے

سرزنی میں شہرۂ آفاق ہیں
لوگ بز گدنی کے سب مشتاق ہیں

رنگ کو اس جنگ کا کیا ڈھنگ ہے
دیتے ہی میداں کا عرصہ تنگ ہے

ہوتے ہی استادہ طاری ہو غشی
کیا بزکوہی سے ہو میداں کشی

تیس اُن کی دھاک سُن کر مر گیا
غم گوزنوں کو انھوں کا چر گیا

گو وہ ٹکر کھا جو ڈکراتا رہا
بزدلی سے گرگ بھی جاتا رہا

مارے پانی پانی کر بکرے اصیل
لکھنؤ سے غل ہے آ بکرے کی جھیل

پاس جانا اُن کے اب مسدود ہے
ذبح کرنے کو ہر اک موجود ہے

اس ادا سے جائیں گے چھریوں تلے
کاشکے ہوتے نہ ہاتھوں میں پلے

میر تقی میر دہلوی

سب سے اُس کو ہے ایک جنگ و جدل

لات مُکّی ہے گہ رہیلوں سے
کم نہیں ہے پچھری میلوں سے

ڈھول جھکڑ ہے گاہ چیلوں سے
آتے جاتے ہیں لوگ ریلوں سے

نکلے ہے تیغ کھڑکے ہے واں ڈھال

ان دنوں آگیا ہے ازپس و پیش
شان میں اپنی گو ہے بدکیش

آج کم بھی ہے اُس کا سب سے بیش
بوریا پوش گرسنہ درویش

پشم جانے ہے یہ قبا و شال

کیا کوئی جھاڑ جی کی خوبی کہے
چاٹے اُس کے نہیں درخت رہے

اس زیادہ سری کو کون سہے
برد باری زہے وقار رہے

بات کہتے ہیں تو کریں ہیں نہال

دیکھو مُنھ تو خدا ہی خیر کرے
کب تک ایسے نحس سے کوئی بھرے

پاک ہو شہر جو کہیں یہ مرے
کہنی ٹیکے یہ اُسکو دیکھے دھرے

جن نے دیکھے نہ ہوویں خرس جوال

ایک صف خاک دھول اُڑاتی ہے
لو ہے پتھر کی اُسکی چھاتی ہے

سنگ و خشت ایک صف چلاتی ہے
اک قیامت جلو میں آتی ہے

نکلے ہے گھر سے جبکہ یہ دجال

مردہ شو خصم جان اہل ہنر
پڑتے ہیں میرزائی پر پتھر

جس کسو دن رہے ہے اپنے گھر
یوں پھرے ہے کمر میں رکھ کے تبر

جوں کفن چور کوئی رکھّے کدال

نے حیا ہے نہ کچھ مروّت ہے
کیا خدا جانے بھڑوے کی مت ہے

نے کچھ اس خر میں آدمیت ہے
گالی ہے دھول ہے یہ عزّت ہے

کہیں غیرت کا سر میں کچھ ہے خیال

جورو گھر میں رکھے ہے اک شتاہ
آتے جاتے ہر ایک اُس سے راہ

کہیں چشمک کرے کہیں وہ نگاہ
واہ رے راے جی کی غیرت واہ

طرفہ دیوث زن جلب چنڈال

یہ کمر باندھ کر گئے دربار | وہ ہوئی گرم جستجوئے یار
آنے دروازہ پر لگی سو بار | سر پہ رکھ بانکی پگڑی کھڑکی دار
پھر ہوئی چہرہ بند بوڑھی چھنال

کچھ حمیت نہ زنجلب کے تئیں | ساتھ لیجائے گھر میں سب کے تئیں
نہ رہے پاس جورو شب کے تئیں | نہ تو پاتے ہیں اسکے ڈھب کے تئیں
نہ سمجھتے ہیں اس چھنال کی چال

قصہ کوتاہ بعد چند یں ماہ | میری اس بھڑوے پر ہوئی تنخواہ
جانے آدم لگا کہو دسبے گاہ | یہ تو مغرور ہے تبہ و گمراہ
مفتری کاذب و سفیہ و ضلال

سہل سا مجکو بھی سمجھ کے فقیر | رکھنے دہ دوں ہی میں لگا بے پیر
یہ نہ جانا نہیں ہے اس کی نظیر | اسکو جانے ہے بادشاہ و وزیر
دور تک پہونچے گی یہ قیل و قال

اسکی خاطر کہیں گے خورد و کلاں | سعی اس میں کرینگے عمدے بجاں
دوست اسکو رکھیں ہیں پیر و جواں | ہے گا سنت علی محمد خاں
رکھنا ان پیسوں کا ہے کس کی مجال

آپ نواب سن کے اس کا نام | کہے گا دو یہ پیچ جلد تمام
یاں نہ زنہار کیجو صبح و شام | ہو نہ ایسا کہ پاوے طول کلام
ایک سے دس روپے ہیں کچھ بھی نال

ہوتا شرف تو یہ تھا سو پاتا | کاہے کو نیچے پردے اٹھواتا
سو جلاہوں سے اسکے تئیں ناتا | کبھو نیچے تھا بڑھیا کا کاتا
کبھو ہوتا تھا سوت کا دلال

اب ترقی ہوئی وکیل ہوا | ایک عمدہ کے گھر دخیل ہوا
فوج کے لوگوں کا کفیل ہوا | مجھ سے اڑ کر عبث ذلیل ہوا
جہل پر اس کے ہے یہ حجت دال

جو گیا آدمی تو خود داغ آیا | ٹک نہ یہ کس کباب شرمایا

جب تقاضے سے اُس کو گھبرایا | پھیر مُنھ لب پہ یہ سخن لایا
تم تو کاٹو ہو پہلے جو مے گال

یوں تو سو بار آؤ جاؤ گے | پیسے تدریج ہی سے پاؤ گے
اور اُس پر بھی جو ستاؤ گے | اپنے پیسوں سے ہاتھ اُٹھاؤ گے
بوجھ میں اپنے سر سے دونگا ٹال

یاں کھڑا دو دو دن رہے ہے دواب | مطبخی خاص کو ملے ہے جواب
مُنھ تکا دیر کرتے ہیں نوّاب | کس کا اللہ میاں کہاں کا ثواب
بے زری سے ہے زیست تلخ و نکال

کام جوں توں کے میں چلاتا ہوں | سو بھی سو سو دکاں پہ جاتا ہوں
قرض کچھ بنگیا تو لاتا ہوں | جیسا میں نے کیا ہے پاتا ہوں
متصدّی گری ہے یا جنجال

باز آتا نہیں ہے نفس شوم | ورنہ کس سے اُٹھے ہے ایسی دھوم
ہر سحر روز والوں کا ہے ہجوم | ہے تمھیں حال یاں کا کیا معلوم
تم تو سونٹا لیے کرو ہو سوال

ایک دن جا کیا نفر نے شور | اُن نے دیکھا نہ مطلق اُسکے اور
ہے غرض صحبت اپنی اُسکے زور | وہ تو مچھر کی جھول کا ہے چور
میں بھی کھینچوں گا خوب اُسکی کھال

اس پہ تنخواہ جو کہ کر لادے | سو وہ اپنا کیا ہی پھر پاوے
پا شکستوں کو برسوں دوڑادے | ایسے سے ہاتھ خاک کیا آوے
جس سے دل ہوں تہ غبار ملال

بد زبانی نہیں ہے اتنی خوب | بات اچھی نہیں ہے بے اسلوب
گفتگو اس طرح کی ہے معیوب | مل رہے گا جو کچھ کہ ہے مطلوب
بس قلم اب زبان اپنی سنبھال

کہ رہے جوں خدا ہی ہے آگاہ

قصّہ کوتہ کہاں نہ رو گزرا — کونسی شکل میں نہ ہو گزرا

آبرو رفتہ رفتہ کھو گزرا — یاں گزرنا تھا ظلم جو گزرا

اس پہ جسکو ہو قصد بسم اللہ

قطعہ در ہجو خواجہ سرائے

ایک جو خوجے سے ملا ایک حکیم — دونوں وے آپس میں ہوئے ہمکلام

خوجے نے یوں اُس سے کہا تجھسے ہی — مردے حکیموں کا ہوا زندہ نام

کتنے دنوں سے ہے مجھے دردسر — اسکی میں پامالی میں ہوں صبح و شام

نیند نہیں رات کو نے دن کو چین — خواب و خورش مجھ پہ ہوئی ہے حرام

تیری توجہ ہے ضروری ادھر — کیونکہ یہ ناکام کا ہے اتنا کام

کہنے لگا سُن کے وہ حاذق طبیب — مجکو یہی کام رہے ہے مدام

تیرے تملّق کی نہیں احتیاج — اور نہ دے دردسرائے تلخ کام

نسخہ میں پاشوئے کا لکھدوں تجھے — کر تو اسے جاکے اذیّت تمام

سُنکے تعجب سے کہا خوجے نے — پختہ تجھے جانا تھا نکلا تو خام

سمجھ بھی ہے سر پانوں تری بات کا — چپ نہ ہنسیں سُن کے کہیں خاص و عام

پانوں کہاں سر کہاں ناداں کہ ہیں — تجھ سے تو دانا بمراتب عوام

سخت تر آشفتہ ہو بولا طبیب — خوجوں میں ہوتا نہیں ہوش اکدام

نقل ہے اک یاد چنانچہ سے مجھے — رات کو خوجے کو ہوا احتلام

آلت جنبش تو منی کی نہ تھی — بہہ کے گئی اُسکی دُبر پہ تمام

اُسکو کہا زعم نے لوطی کوئی — دے گیا تکلیف ہی بیہہ لاکلام

صبح کو اُٹھ قینچی کھڑی گھڑیاں کی — کیا کہوں میں کیسی ہوئی دھوم دھام

ٹھہرے امین آکے کئی معتبر — ایک حویلی میں ہوا اژدحام

بانس تلک ٹوٹ چکے نفروں پر — پوچھ چکے لوگوں کا لے لے کے نام

نسبت پا سر سے ہے کیا پوچھ مت — اپنی طرف دیکھ تو ٹک تیرہ فام

خوجے کے اپنے ہی سے کرلے قیاس
ریش کج کجا اے غلام

سمجھے نہ سمجھے تو مرے .... سے
میں تو نظیر اسکی کہی والسّلام

مثنوی دربیان مرغ بازاں

دلی سے ہم جو لکھنؤ آئے
گرم پرخاش مرغ یاں پائے

پر و پرزا درست یکساں ہے
مرغ تصویر کا بھی حیراں ہے

مرغ ہے ایک ایک جیسے کلنگ
قاز و سارس سے جنگ جسکا ننگ

حوصلہ کس قدر حواصل کا
ذکر کیا کرگس شتردل کا

لات کی گھات کر جو مڑ جاوے
نسر طائر کا رنگ اُڑ جاوے

زہرہ ققنس کا اس خطر سے آب
شب نہ سووے ہراس سے سُرخاب

بکری سا فیل مرغ کو مارا
کب شتر مُرغ سے ہوا چارا

آدمی جو بڑے کہاتے ہیں
مُرغ ان کے بغل میں آتے ہیں

سُرخ و سبزوار کے سب مُرغ
ہیں تماشاگر ایسے تھے کب مُرغ

ہو جو کیں مرغ خانگی کے تئیں
مت سُن اس ہرزہ جانگی کے تئیں

لات ماری جو کاٹ کر حلقوم
حیدر آباد تک پڑی ہے دھوم

کھا کے سینے کی تہ کی سووے
نسر واقع کا واقعہ ہووے

نے تماشے بطیں ہی ہیں تر لب
مُرغ عیسیٰ ہیں مدح خواں ہر شب

ٹینی کے سر پہ تاج ٹیکا ہے
اس کے آگے تئیں پھیکا ہے

کیا عجب ان کی رہگزر کا فرش
ہوں پر افشاں تو ہو خروس عرش

اُڑ گیا حلق کا جو لڑتے پوست
کی صدا مرغ دوست نے ہی دوست

گیں اس رنگ ہوتے ہیں مخصوس
جوں گلستاں میں ہو دیں تاج خروس

شور جنگ آوری کا تا کہسار
کبک کا مگر خروس پہ ہے بار

کب ہیں جیتے سے مرغ زریں لال
حُسن لاکھے کا سمجھے مُرغ خیال

کر سکے وصف مرغ کیا کوئی
مرغ آمین کو دعا گوئی

وقر اتنا کہ دیر بچے لیں — جان دے کوئی تخم مرغ نہ دیں
مرغ بازوں سے ساز کر دیکھا — در الطاف باز کر دیکھا
ربط رکھا بہت اُنھوں کے ساتھ — ایک پر مرغ کا نہ آیا ہاتھ
مرغ کا مرغ ہووے مرغ انداز — مرغ ایسا ہو تو بجا ہے ناز
یعنی اپنا حریف جب پاوے — پر ہلانے نہ دیوے کھا جاوے
سینہ کیا سینہ بال کیا پر و بال — جیسے چشم خروس آنکھیں لال
بازی بدبد کے جب لڑاتے ہیں — کانٹے لوہے کے باندھ لاتے ہیں
آیا حلقوم کے کہ حلق کے پار — پھوٹا چھاتی میں ایک لگ کے دو چار
ہاتھ جس مرغ باز کے تھا وہ — پانی کرنے لگا تر آ کر وہ
کچھ تو ٹھہرا تو دم دیا اُن نے — تعبیہ کر کے رکھ لیا اُن نے
اور جو سست ہو ہوا اکھیلا — دونوں بازو کے پر دیئے پھیلا
دم سے کیا ہو یہ بیدم و مجروح — قصد پرواز میں تھا مرغ روح
ہو چکا ہو چکا ہوا یہ شور — ڈھلکی گردن گیا وہ سار از ور
پھیلا پانی میں وہ غم جانسوز — دل زدہ پھر ہیں مرغ دست آموز
جانور رنگ باختہ سب ہیں — یعنی حیران فاختہ سب ہیں
مرغ قبلہ نما کو وحشت ہے — بال کھولے ہیں پر نہ طاقت ہے
ورنہ اُڑ کر کہیں چلا جاتا — دیر اپنے مقام پر آتا
جیسے منگل کو پالی کی ہے دھوم — گلیوں میں روز حشر کا ہے ہجوم
مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش — جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش
مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں — سیکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
اُن نے پر جھاڑے یہ پھڑکنے لگے — اُن نے کی نوک یہ کڑکنے لگے
وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج — ساتھ اس کے بدلتے ہیں سج دھج
مرغ کی ایک پر فشانی ہے — ان کی صد رنگ بدزبانی ہے
ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ — ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ
جھکتے ہیں آپ کو تراتے ہیں — لاتیں گو یا کہ یہ ہی کھاتے ہیں

کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک — کہیں چھڑ چھڑ کے ڈھیر ہی ہے خاک
کہیں گھونسوں نے کھود ڈالا ہے — کہیں چوہے نے سر نکالا ہے
کہیں گھر ہے کسو چھچھوندر کا — شور ہر کونے میں ہے مچھّر کا
کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے — کہیں جھینگر کے بے مزہ نالے
کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں — پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں
اینٹ چونا کہیں سے گرتا ہے — جی اسی حجرے ہی میں پھرتا ہے
رکھ کے دیوار ادھر ادھر سے — لاکے یارب بناؤں کس گھر سے
چارپائی جب اس میں بچھوائی — پہلے چلپاسہ ہی نظر آئی
سام ابرص کہ ہے دو لے خراج — ہر جگہ یاں سے ہے نمایاں آج
پیکر اپنی خدا نے رکھی ہے — ڈانس ایک ایک جیسے مکھی ہے
آگئے آبس حجرے کے سو اک ایوان — وہی اس تنگ حلق کا ہے مکان
کڑی تختے سبھی دھوئیں سے سیاہ — اُس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ
کبھو کوئی سنپولیا ہے پھرے — کبھی چھت سے ہزار پائے گرے
کوئی تختہ کہیں سے ٹوٹا ہے — کوئی دا سا کہیں سے چھوٹا ہے
دیکھے مرنا ہمیشہ مد نظر — گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر
مٹی تودہ جو ڈالی چھت پہ ہم — تھے جو شہتیر جوں کماں ہیں خم
مضطرب ہوگئے جو چھائی بہت — ہر کڑی نے کڑی اُٹھائی بہت
پڑے اس مینھ میں کہ سختی ہے — تختے تختا ہوئے یہ سختی ہے
ہوئیں اڑ دار یں پھر جو حد سے زیاد — چل ستوں سے مکان دے ہے یاد
اینٹ مٹی کا در کے آگے ڈھیر — گرتی جاتی ہے ہوے ہوے منڈیر
جیتے ہیں جب تلک نہیں پہونچے — ورنہ کیا بس ہے جو ہمیں پہونچے
گنگنی دیوار کی نپٹ بے حال — پدڑی کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال
طوطا نہ تب تک بابت ہے — پوونا چُھد سکے تو قیامت ہے
کیونکہ [illegible] نہ کہیں گا — تھر تھرا وے بھنبھیری سی دیوار
ہوگئی [illegible] پھر [illegible] — ناق گزرے ہے کیا کہوں کیسا

ہو کے مضطر لگے ہیں کہنے سب
تیتری یاں جو کوئی آتی ہے
نہیں دیوار کا یہ اچھا ڈھنگ
ایک دن ایک کوا آ بیٹھا
چیل سے لوگ دوڑے کرتے شور
ہو نہ ایسا کہ اپنی چال چلے
نہیں وہ زاغ چار پاؤں پھرا
مٹی اس کی کہیں کہیں بھسکی
سان کر خاک لگ گئے دو چار
اچھے ہو گئے کھنڈر بھی اس گھر سے
اکھڑے بکھرے کواڑ ٹوٹی دیمہ
خاک لوہے کو جیسے کھا دے پاک
بند رکھتا ہوں در جو گھر میں رہوں
گھر بھی پھر ایسا جیسا ہے گور
جس سے پوچھو اسے بتا دے شتاب
ایک چھپر ہے شہرۂ دلی کا
بانس کی جا دیے تھے سرکنڈے
گل کے بندھن ہوئے تھے جیسے سب
مینھ میں کیوں نہ بھیگ گئے یکسر
مٹی ہو کر گرا ہے سب ڈالا
واں پہ بیٹھا تو یاں سرک بیٹھا
حال کس کو ہے اولتی کا یاد
نہیں سنگ رکھوں کہیں بنیاد
ٹپکے دو چار جا تو بند کروں
یاں تو ٹھاٹے ہزار ہیں تنہ

آہ و بھنبھیری کہ ساون آیا اب
جانِ محزوں نکل ہی جاتی ہے
کہیں کھسکی تو ہے قیامت ننگ
بےگماں جیسے ہوا آ بیٹھا
کہ نہ حائط میں کچھ رہا تھا زور
دوڑے اچھلے کہ ہاں ہاں چلے
ایک کالا پہاڑ آن گرا
جی ڈرا در چھاتی بھی دھسکی
بارے جلدی درست کی دیوار
پر ہے اک خرابی گھر در سے
زنگ نے زنجیر ایک کہنہ حدید
چھیڑ دیجے تو پھر نری ہے خاک
قدر کیا گھر کی جبکہ میں ہی نہ ہوں
ہے خرابی سے شہر میں مشہور
ساری بستی میں ہے یہی تو خراب
جیسے روضہ ہو شیخ چلّی کا
سو وے منہوں میں سب ہوئے کھنڈے
پکھے رہنے لگے ہیں کیلے سب
پھونس تو بھی نہیں ہے چھپر پر
وہ رہے یاں جو ہووے ڈھب والا
یاں جو جھینکا تو واں تنک بیٹھا
گھڑی اس جھگڑے میں گئی برباد
کہیں باندی کے تھونے لالا
ب [illegible] بھرنے رکھو دیں
[illegible] بھرے عاشق ہلکتا

بسکہ بدرنگ ٹپکے ہے پانی
کوئی جانے کہ ہولی کھیلا ہوں
مجھ سے کیا واقعی ہوا چارا
بان جھینگر تمام چاٹ گئے
تنکے جاندار ہیں جو جنبش و کم
ایک کھینچے ہے چونچ سے کر زور
پوچھ مت زندگانی کیسی ہے
کیا کہوں جو جفا چکش سے سہی
بوریا پھیل کر بچھا نہ کبھو
ڈیوڑھی کی ہے یہ خوبی دراِیسا
جنس اعلیٰ کوئی کھٹولا کھاٹ
کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی
شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں
کیڑا ایک ایک پھر کوڑا ہے
ایک چٹکی میں ایک چھنگلی پر
گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا
ملتے راتوں کو گھس گئیں پوریں
ہاتھ تکیے پہ گہ بچھونے پر
سلسلایا جو پائنتی کے اور
تو شک ان رگڑوں ہی میں سب پھاٹی
جھاڑتے جھاڑتے گیا سب بان
نہ کھٹولا نہ کھاٹ سونے کو
[illegible] نہ تب پنڈے پر لیے پائے
[illegible] نہ بان میں کھٹمل
[illegible] پھر کا کہ جی بسے تاب گئی

کپڑے رہتے ہیں میرے افشانی
کوئی سمجھے ہے یہ کہ کھیلا ہوں
آسماں جو پھٹے تو کیا چارا
بھیگ کر بانس پھاٹ پھاٹ گئے
تن پہ چڑیوں کو جنگ ہے باہم
ایک نگری پہ کر رہی ہے شور
ایسے چھپّر کی ایسی تیسی ہے
چارپائی ہمیشہ سر پہ رہی
کونے ہی میں کھڑا رہا یکسو
چھپر اس جو نچلے کا گھر ایسا
پائے پٹی رہے ہیں جنکے پھاٹ
چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی
سر پہ روز سیاہ لاتا ہوں
سانجھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے
ایک انگوٹھا دکھا دے انگلی پہ
پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا
ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں
کبھو چادر کے کونے کونے پر
وہیں مسلا کرا ایڑیوں کا زور
ایڑیاں یوں رگڑتے ہیں کاٹی
ساری کھاٹوں کی چھٹ گئی [illegible]
پائے پٹی لگا کے کونے کو
سیتلا کے سے دانے مرجھائے
آنکھ منھ ناک کان میں کھٹمل
[illegible] سے تا پگاہ خواب گئی

اب وہی گھر ہے بے سروسایہ
اور میں ہوں وہی فرومایہ

دن کو ہے دھوپ رات کو ہے اوس
خواب راحت ہے یاں سے سو سو کوس

قصہ کوتہ دن اپنے کھوتا ہوں
رات کے وقت گھر میں سوتا ہوں

نہ اثر بام کا نہ کچھ در کا
گھر ہے [illegible] کا نام ہے گھر کا

مثنوی در ہجو خانۂ خود کہ بہ [illegible]ب شدت باراں خراب شدہ بود

جسم خاکی میں جس طرح جاں ہے
اس طرح خانہ ہم پہ زنداں ہے

ظلمتیں اسکی سب پہ روشن ہیں
زندہ در گور ہم کئی تن ہیں

ہے جو سر کوب اک بڑی دیوار
واں سے جھانکو تو ہے اندھیر اغار

بخت بد دیکھ سارے پرنالے
اس کے معمار نے ادھر ڈھالے

اب جو آیا ہے موسم برسات
دن کو ہے اپنے ہاں اندھیری رات

صحن میں آب نیزہ بالا ہے
کوچۂ موج ہے کہ نالا ہے

مینھ میں گھر کے پانچ چھ چھپّر
ہم غریبوں کے ہوتے ہیں سر پر

پر تلک تنکے تھے سمجھ ایک نئے
سو وے چڑیوں کے گھونسلوں کو گئے

ڈال ہے کچھ لکڑیوں کا احسان مند
کہ جنھوں نے کیے ہیں جھانکے بند

پھوس کچھ ہے کہیں سو اٹکا ہے
بانس کو جھینگروں نے چاٹا ہے

اڑ گئی گھاس مٹی ہے والا
ہے جو بندھن سو مکڑی کا جالا

اپنے بندھن سے جو کہ چھوٹا ہے
ہم پہ گویا وہ بانس ٹوٹا ہے

کیا کہوں آہ گھر ہے کہنے کو
باندھتا ہوں مچان رہنے کو

بند جھانکوں کو کیجیے تا کے
یاں تو اک آسمان ٹوٹا ہے

ٹھیکے دینے کو جا اڑے ہیں ہم
سر پہ ٹھٹر لیے کھڑے ہیں ہم

ٹٹیاں تھیں جو آگے چھپّر کے
بہتی پھرتی ہیں اب [illegible]

تا گلے سب کھڑے ہیں پانی میں
خاک بی ہے شہر کے اندر

ہے تو اپنا بھی حال سے بدتر
مینھ ہے یا کہ تیر باراں ہے

صف کی صف نکلی اس خرابی سے
تا کہ پہونچیں کہیں شتابی سے

میر جی اس طرح سے آتے ہیں
جیسے کنجے کہیں کو جاتے ہیں

جن نے اس وقت آنکھ کو کھولا
ہنسکے بے اختیار وہ بولا

ہنسکے اس بات کو نرائے ہم
یارے اک بھائی کے گھر آئے ہم

تب سے رہنے کو اب تلک ہیں خراب
نہیں ملتا ہے گھر بقدر حباب

جس میں خوش یکنفس معاش کریں
طور پر اپنے بود و باش کریں

مثنوی در مذمت برشکال کہ باراں دراں سال بسیار شدہ بود

کیا کہوں ابکی کیسی ہے برسات
جوش باراں سے بہہ گئی ہے بات

بوند تھمتی نہیں ہے اب کی سال
چرخ گویا ہے آب در غربال

وہی یکساں اندھیر برسے ہے
آسماں چشم واکو ترسے ہے

ماہ و خورشید اب نکلتے نہیں
تارے ڈوبے ہوئے اچھلتے نہیں

آب میں کوئی بولتا ہی نہیں
آسماں دیدہ کھولتا ہی نہیں

چرخ تک ہو گیا ہے پانی جو
ماہ و ماہی ہیں ایک جا ہر دو

لے زمیں سے ہے تا فلک غرقاب
چشمۂ آفتاب ہیں گرداب

خشک بن اب کی بار سبز ہوئے
موش دشتی کے خار سبز ہوئے

ہر کس کس سیاہ مستی سے
ہوتے جا ہیں بلند و پستی سے

لڑکوں نے کی زمانہ سازی ہے
خاک بازی اب آب بازی ہے

ابر کرتا ہے قطرہ افشانی
پانی باقی رہے ہے بارانی

تنک آبی سے جان مت اغراق
ڈوبنے پر ہے کشتی آفاق

عقل مینھوں نے سب کی کھوئی ہے
بات باراں نے یاں ڈبوئی ہے

کیسا طوفان مینھ چھایا ہے
زخم دل نے بھی آب اٹھایا ہے

بیٹھے اٹھتے نہیں ہیں بام و در
یہ خرابی ہے شہر کے اندر

سقف آ تاج بوند پیکاں ہے
مینھ ہے یا کہ تیر باراں ہے

جیسے دریا اُبلتے دیکھے ہیں | یاں سو پرنالے چلتے دیکھے ہیں
بحرِ رحمت ہے یا کہ زحمت ہے | ایک عالم غریقِ رحمت ہے
لے گئے ہیں جہان کو سیلاب | نقشِ عالم کا نقش تھا بر آب
نہ ہے جلسہ نہ ربطِ یاراں ہے | شہر میں ہے تو باد و باراں ہے
روز و شب یاں ہمیشہ جھمکا ہے | ان دنوں رنگِ برق چمکا ہے
بڑی بوندوں کی چوٹ سے ڈریئے | سنگباراں جہاں ہو واں مریئے
پڑھتے ہیں یار وردِ حیرانی | آرسی کے بھی گھر میں ہے پانی
آدمی ہیں سو کب نکلتے ہیں | مردمِ آبی پھرتے چلتے ہیں
کتنے ڈوبے گئے کہاں ہیں اب | سنگِ آبی ہیں جہاں ہیں اب
وسعتِ آب پوچھ مت کچھ یار | کوچے موجوں کے ہو گئے بازار
معبد اب سارے گرتے آتے ہیں | زاہدِ خشک ڈوبے جاتے ہیں
تھا ٹھہرنا برابر اُن کے شاق | مسجدوں میں کیا ہے استغراق
مینھ تو یاں اب لگے ہی رہتے ہیں | سارے عالم کے کان بجتے ہیں
غرق ہے چڑیا اور گھری ہے | خشکی کا جانور بھی بحری ہے
مینھ ازبسکہ بہا سے ہے گا | آب جہاں کو ڈبو رہا ہے گا
شعر کی بحر میں بھی ہے پانی | بہتی پھرتی ہے اب غزلخوانی
لائی یاں زندگی کی حب الاشی | آب خشک تھمہ چمن کی
بے زراعت جو پانی سے ہاری | ہو گئی سب نجست ترکاری
آب ہے گا جہاں کے سر تا سر | خوف سے سوکھتا ہے میوۂ تر
مست ہو ہو گئے ہیں مستِ شرب | غوطے کھاتے پھرے ہیں عالمِ آب
مستی ہے اب جو چاہیں سیرابی | بطے تو ہوئی سب مرغابی
دستِ غم اس قدر بڑھتیاں ہے | گھر ہر اک گوشہ پیچ طوفاں ہے
سیل دیکھے ہے کوہسار ان کی | سب کشتی گدا ہیں باراں کی
جزر و مد جس کا تا فلک جا ہے | جو ہے تالاب اب تو دریا ہے
ہر طرف ہیں نظر میں ابرِ سیاہ | پانی ہے جس طرف کو کریے نگاہ

سیلہا در رکاب دیدۂ ماست
چشم تا کار میکند دریاست

پانی عالم کے تا بسر ہے گا
خشک مغزوں کا مغز تر ہے گا

خضر کیونکر کے زیست کرتا ہے
آب حیواں میں پانی مرتا ہے

لکھے کیا میر مینھ کی طغیانی
ہو گئی ہے سیاہی بھی پانی

مثنوی در ہجو نااہل مسمّیٰ بہ زبان زد عالم

سنیو اے اہل سخن بعد از سلام
چھیڑتا ہے مجکو اک تخم حرام

پر تمہیں مرغی کا گرم طیر ہے
وہم میں شہباز کا ہم سیر ہے

کام مجکو کچھ نہیں ہے اور سے
بلکہ اس بھی طرز سے اس طور سے

شاعری کو میری ہو گے جانتے
تم چنانچہ سب مجھے ہو مانتے

میں ہمیشہ سے رہا ہوں باوقار
کن دنوں تھا ہجو کا کرنا شعار

گر کنھوں نے کچھ کہا میں چپ رہا
ہجو اس کی ہو گئی اس کا کہا

کیا ہوا اگر چاند پر پھینکے ہیں خاک
پڑتی ہے اُن سب کے منھ پر میں ہوں پاک

رہیو شاہد کچھ نہیں میرا گناہ
مدّعی بے ہیچ ہے یہ روسیاہ

تھا تحمل مجھ کو میں درویش تھا
ورد مند و عاشق و دلریش تھا

پر کروں کیا لاعلاجی سی ہو اب
غصّے کے مارے چڑھی ہی مجکو تب

ایسے کتنے ہیں جواب شاعر بنے
مدّتوں یہ لونڈے آئے مجھ کنے

ایک باتوں سے مری آدم ہوا
اک نظر سے شہرۂ عالم ہوا

ایک نے دیواں کی میرے نقل لی
اس دوانے کی کنھوں نے عقل لی

ایک میرے طرز سے کہنے لگا
دوسرا پیرو مرا رہنے لگا

سارے عالم میں ہو نہیں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

دور سے کرتا ہوں بیٹھا سبکی دید
کوئی سر کھینچو ہے میرا مستفید

کوئی ہے تہ گو نہ جانے میری قدر
پائیں ہے پائین آخر صدر صدر

ہے گی شخصیت خدا کی اور سے
ہاتھ کب آوے بزرگی زور سے

ایک بولا دیکھ کر حیران ہو / یہ جزائر کا کوئی حیوان ہو
یاں تو ایسا جانور دیکھا نہیں / سر کہیں ہے پاؤں اسکے ہیں کہیں
ایک کے آیا کموڑا وہم میں / ایک کے مور سواری فہم میں
ایک نے ہنس کر دیا اسکو ڈھکیل / اور بولا اے تری قدرت کے کھیل
کیسا اعجوبہ نیا پہونچا ہے یاں / چونچ ہو تو ہے شتر مرغ کلاں
ایک بولا کرکے چشمک میری اور / واہ صاحب جانور پالا ہے زور
ایک دن باہر تو ہو لینگے کھڑے / یہ اچنبھے یوں نہیں رہتے پڑے
جائے اُس وحشی کا ٹک وسواس بھی / چوک بھی ہے پاس یہ نسناس بھی
اسکو یاروں نے غرض کیا کیا کہا / لیک یہ خر نا مشخص ہی رہا
یہ جو ہے موشنگ دوان و شور چشم / موشخشی چہرہ و شبکور چشم
بے سبب سرگرم کیں ہمسے ہوا / مستحق لعنت عالم ہوا
چل قلم اب ہے ارادہ جنگ کا / پاس کب تک کیجیے نام و ننگ کا
یاں زبردستوں کو دعوی کھا گیا / یہ چھپا رستم کہاں سے آگیا
ناقباحت فہم کو دعوے نے بڑا / ہو کے تنکا سا پہاڑوں سے اڑا
ہاتھی کی ٹکر کو ہاتھی ہی اُٹھائے / چیونٹی کا کیا جگر جو مُنھ پہ آئے
جنگ ہاتھی کی ہو گو اُس کو ہوس / پر اُسے ہے موت کا ریلا ہی بس
ایک دھکے میں کہاں وہ کامنی / پودنے کی سی ہے اُس کی ضامنی
میں نے پاس اس کا کیا حد سے زیاد / پر کمی کرتا ہے یہ ابتر زیاد
قبلہ کہتے کہتے ہا جی ہو گیا / پاس ظاہر چھوڑ پاجی ہو گیا
رشک شہرت سے مری مرنے لگا / میری عزت کا حسد کرنے لگا
لگ گئی چپ اس کو میرے شور سے / یہ نہ سمجھا ہے خدا کی اور سے
یہ قبول خاطر لطف سخن / دے ہے کب سبکو خدائے ذوالمنن
ایک دو ہی ہوتے ہیں خوش طرز و طور / اب چنانچہ میر و مرزا کا ہے دور
خصمی وہ کریے کہ ہو معقول خلق / نے انھوں سے جو کہ ہو مقبول خلق
دشمنی تھی اُس کو مجھ سے کیا ضرور / حیف ایسی عقل لعنت یہ شعور

کاشکے ہوویں مخدر شیخ و شاب
چھوٹے سے منھ جو پکارے کیا ہو باب

گو کہ یہ پچھن کرے کیا مال ہے
آگے میرے ..... کا سا بال ہے

جا ہوں گا جب پھینک ہی دنگا اکھاڑ
ایسی ...... سیکڑوں ڈالی ہیں جھاڑ

بد نمائی اُس کی ہے بیساختہ
کیا ہے یاں پیش بچہ انداختہ

دیکھ اسے یاد آوے قدرت کاملہ
کیا بلا ہے مادہ خوک حاملہ

گرگ گردن خوک چشم و غوک سر
غول صحرائی کا بچہ ہے مگر

چار سکھیاں کہہ کے شاعر ہو گیا
اس فن مشکل کا ماہر ہو گیا

باپ کو اُن نے بنا رکھا ہے اوت
ہیں کہاں ایسے سعادتمند پوت

کم ہوا ہے گا جو اُس کا زور پا
جانتا ہے اس کو پیری کا عصا

کچھ نہیں معلوم اس کو سرکار
تب تو ٹھہرایا ہے اسکو راز دار

اس زنا زادے نے جو لب وا کیا
پہلے ماں کا راز ہی رسوا کیا

ایک ہی شب کے تئیں جلوا دیے
یار ماں کے باپ کو دکھلا دیے

پھر حقیقی باپ سے جا کر ملا
اس مجازی کا کیا اس سے گلا

پیسے اُسکے کھا کے جب کتا ہوا
یاں کسی تقریب آ پیدا ہوا

تب سے روز و شب اسی کے ساتھ ہے
اس خرف کی داڑھی اُسکے ہاتھ ہے

بس قلم نفریں سے میری بس اُسے
ہے دماغ بحث یا جی اب کسے

رکھ زباں کیدھر گیا تیرا مزاج
پوچ گو بہتیرے پھرتے ہیں لواج

ہجو عاقل نام ناکسے کہ بسگاں انسے تمام داشت

اک جو لچر کو رزق کی وسعت سی ہو گئی
تنگی کی حوصلے نے تو رجعت سی ہو گئی

کتوں کے ساتھ کھانے لگا کتوں سے معاش
بچڑی کی طرح شام و سحر کتوں کی تلاش

پاکیزگی طبع و لطافت وہ برطرف
کتا بغل میں مار کے لگا پھرنے ہر طرف

دتکار و کتے کو تو لہو اپنا وہ پیے
ہے اُس کی استخواں شکنی کتوں کے لیے

یا چھوٹے ہاتھ کتے کو مارا نہ تھا کبھی
یا کتوں سے چٹایا ہے اب اپنے منھ کو بھی

توراں کے لوگ ہوویں کہ ہوں اہل اصفہان
کتا تو کشتنی ہے سب اسلامیوں کے ہاں

جسکو خدا خراب کرے پھر وہ کیا کرے
کیونکر زبان نکالے نہ جوں سگ پھرا کرے

آواز دے وے کتوں کو توڑے ہے اپنی جان
مرجائے گا یہ بھونکتے ہی بھونکتے ندان

ہے بسکہ سگ پرست مرے گا جو یہ دنی
توشے میں اسکے ہوگا نہ کچھ غیر سگ کنی

کتوں کے پیچھے پھرتا ہے گلیوں میں خوار ہو
یہ سب ہے اسلیے کہ ہر اک جائے شور ہو

اس وضع ساختہ کے ہوں احمق فریفتہ
بہرہ ہے جنکو عقل سے وے کیوں ہوں شیفتہ

ہے اس طرح کے معرکہ گیروں سے پُر جہاں
بہتیرے ایسے کتے نچاتے پھرے ہیں یاں

مثنوی مسمّٰی بہ تنبیہ الجہال

صحبتیں جب تھیں تو یہ فن شریف
کسب کرتے جنکی طبعیں تھیں لطیف

تھے ممیّز درمیاں انصاف تھا
خار و خس سے کیا یہ عرصہ صاف تھا

دخل اس فن میں نہ تھا اجلاف کو
کچھ بتاتے تھے بھی سو اشراف کو

تھے جو اس ایام میں اُستاد فن
ناکسوں سے وے نہ کرتے تھے سخن

پھر حصول اس سے نہ دنیا ہے نہ دین
کوئی حاجت اُس سے وابستہ نہیں

گر چمار اس کارخانہ میں نہ ہو
ٹوٹے جوتے کو کہاں لے کر پھرو

چار و ناچار اس کنے جانا پڑے
کوڑیاں دے جوتی گٹھوانا پڑے

حاجت اس فرقے سے مطلق یاں نہیں
جو نہ ہو شاعر تو کچھ نقصاں نہیں

یہ تو دنیا میں ہے اس فن کا کمال
دین کا اس فرقے کے پوچھو نہ حال

کذب ہو جس جائے رونق بخش سمع
واں کی دینداری رکھو اور دل کو جمع

جھوٹ آوے اسقدر جب درمیاں
گو یقین ایمان کیسا دیں کہاں

ہم تلک تھی بھی وہی رسم قدیم
یعنی جن کے ہوتے تھے ذہن سلیم

پیار کرتے تھے انھیں اُستاد فن
ان کے ہوتے رہبر راہِ سخن

سِفلے واں زنہار پاتے تھے نہ بار
شاعری کا ہے کو تھی ان کا شعار

نکتہ پردازی سے اجلافوں کو کیا
شعر سے بزازوں ندافوں کو کیا

الغرض یاروں نے قیدیں دیں اُٹھا
جو کوئی آیا اُسے دی پاس جا

استقدر مار کہ بے دم ہوگیا
کھینچ کر ڈلوا دیا دربار میں
وارث اُس کے لے گئے اُس رات کو
یعنی دستور زماں دشمن نہ تھا
غالباً پایا غلط اشعار کو
ورنہ شیوہ اس کا ہے لطف و کرم
مجھکو کیوں شلاق کرتا اتنی شب
پس مجھے ہے تربیت اپنی ضرور
صحبت اکثر رکھوں اس استاد سے
مو پہنچے اک رتبہ کو میری قیل و قال
اُٹھ کے آیا مولوی جامی کنے
جب ہوا کچھ شعر کا رتبہ بلند
پھر گیا اک دن درِ دستور پر
کاے امیر اس روز کا شلاق خوار
کی اشارت سدّرہ کوئی نہ ہو
سامنے آیا تو کی نیچی نظر
بعد ازاں ایماے ابرو کی کہ ہاں
پھر وہیں سے دے صلہ رخصت کیا
اگلی صحبت کی تھی عزت استقدر
ابکی اس کو جائزہ دیگر گراں
میں نہ سمجھا یہ کہ وہ کیا تھا یہ کیا
ایسی ہی ہوتی ہیں تضحیک سلف
استقدر اس کا تنبہ تھا ضرور
جو سُنے سو خود سری سے باز آئے
ورنہ کرتا پوچ گوئی ہر دبنگ

سوج دست و پا سراک تھم ہوگیا
یہ خبر پہونچی جو ہر بازار میں
جب بخود آیا تو پایا بات کو
یا وہ کچھ ناآشنائے فن نہ تھا
خوش نہ آیا اُس کریم کردار کو
جائزے میں دے ہے دینار و درم
کاہے کو بدنام ہوتا بے سبب
جا کے بیٹھوں اک سرآمد کے حضور
شاید اس کی دولت ارشاد سے
ہو مجھے اس فن میں یک گونہ کمال
مشق کی یک چند اس نامی کنے
اور مولانا لگے کرنے پسند
حاجب درگاہ نے کی جا خبر
آج دروازے پر ہے پھر خواہانِ بار
قصد ہے برخورد کا تو آنے دو
دھوپ میں جلتا رہا تو اک پہر
صحن ہی میں سے ہوا وہ مدح خواں
اک مصاحب نے جگر کر کر کہا
سو ہوئی شلاق حد سے بیشتر
تو نے فرمایا مرخص واں سے واں
در جواب اس برگزیدہ نے کہا
دست ہو تو اُن کے تئیں کرتے تلف
تاکہ پہونچے یہ خبر نزدیک و دور
تربیت ہونے کو اُستادوں کی جا لگے
رفتہ رفتہ شاعری ہوجاتی ننگ

کہ تھا دشت میں ایک اژدر مقیم
نکلتے نہ تھے اُس طرف ہو کے شیر
جہاں شیر کا زہرہ ہوتا ہو آب
وہ صحرا تھا اس کے سبب ہولناک
نکلتا تھا جب بہر برگ و نوا
کہاں سایہ اس جا و سبزہ کہاں
صدا جب مہیب اُس کی ہوتی بلند
درندوں کے بجا نہ رہتے حواس
وحوش اُس بیاباں میں جاتے نہ تھے
کبھو اُس کی رہ میں جو اُٹھتا غبار
پہونچتا تھا گردوں تلک شور و شر
رہا کرتی کوسوں تلک اسکی دھوم
ہوئے ساکنانِ بیاباں بتنگ
گئے جان لے لے وحوش و طیور
گئی لومڑی ایک سوکھی ہوئی
گلی میں جو یاں کے کھلے اُسکے لب
خراطین و خرموش و موش و شغال
رواں ساتھ اُسکے شبانہ ہوئے
رعونت سے مینڈھک اُچھلتے چلے
قریب اُس بیاباں کے جبدم گئے
قضارا وہ آفت تھی سرگرم سیر
اُس آشوب سے دست و پا گم کئے
لگا ڈرنے خرموش سا پہلوان
وہ گرگٹ کہ جس کو تھی گردن کشی
قدم غوک سے گرد کا جل گیا

درندوں کے بھی دل تھے اُس سے دو نیم
پلنگ و نمر واں نہ رہتے تھے دیر
شغال اور روبہ کا واں کیا حساب
دم اس کے نے واں کی اُڑا دی تھی خاک
شجر کے شجر ہوتے تھے تب ہوا
درخت اُسکے چاٹے رہے تھے نہ واں
جگر چاک کرتے ہوا سے پرند
چرندے مکانوں سے ہوتے اُداس
طیور آشیانوں میں آتے نہ تھے
تو وہ دشت تھا ایک تاریک غار
ہوا صاف ہوتی نہ دو دو پہر
نہ اُس راہ آتا کوئی جُز سموم
اُٹھے کوہ و وادی سے شیر و پلنگ
کوئی رہ گیا موش و مینڈھک سا دو
کسو اور جنگل میں بھوکی ہوئی
ہوئی واں کی اعیان گرم غضب
اس اژدر کو کر جنس اپنی خیال
کئی گرگٹ آگے روانہ ہوئے
بلوں میں سے چوہے نکلتے چلے
اُنھوں میں سے آگے بہت کم گئے
چلے آتے تھے بھاگتے وحش و طیر
فراموش سب نے سر و دم کئے
ہوا مضطرب کیچوا سا جوان
ہوئی خوف سے اُسپہ طاری غشی
بھروسا تھا گیدڑ پہ سو ٹل گیا

جہاں پہلواں موش رستم معاش
لگا کرنے سیدان میں بل تلاش

کہ سوراخ پاوے تو روپوش ہو
یہ تشویش یکدم فراموش ہو

ولے چھوڑ تاکب ہے خصم قوی
کہ ہو خوف جاں سے کوئی منزوی

پراگندگی تھی اس انبوہ میں
کہ گو بچی بالائے سیہ کوہ میں

اس آواز سے جی نکل ہی گئے
جو ثابت قدم تھے بچل ہی گئے

سیہ جب ہوا ہو گئے منھ سفید
ہوئے مدعی جان سے ناامید

پھر ایک دم اُن نے وا کر دہاں
کہ پایا اس انبوہ کو نیم جاں

دم دیگر اُن سے نہ کوئی رہا
وہی دشت خالی وہی اژدہا

زبانہ وہی آگ کا چار اور
ہوا گرم ویسی ہی ویسا ہی شور

وہی دم کشی شام سے تا سحر
اٹھی ہولناکی سے وہ دشت و در

گئی یہ خبر جس بیابان میں
رہی سدھ نہ کچھ واں کے سکان میں

کنھوں نے کبھی منھ نہ ادھر کیا
نہ پھر نام اس اژدہے کا لیا

مری ان گزندوں کی صحبت ہے یہ
طرف ہوں مری کس کی طاقت ہے یہ

جو مجھ کو ہو کچھ بھی انھوں کا خیال
تو یہ مارگیری کریں کیا مجال

تو کیا ہو انھوں سے بہت دور تیا
ہوں اپنی جگہ شاد و مسرور رہیں

مری قدر کیا اُن کے کچھ ہاتھ پر
جو رتبہ ہے میرا مرے ساتھ پر

کہاں ہو سکیں مجھ تک یہ کیڑے حقیر
گیا سانپ پیٹا کریں اب لکیر

مثنوی در مذمت آئینہ دار

آج سے مجکو نہیں رنج و ملال
جب سے نکلے بال تب سے ہے یہ حال

موشگافوں کا نہیں ہے نام اب
مدعی شعر ہیں حجام اب

ان سے کیں اک مو برابر بھی نہیں
جلف اشرافوں کے ہمسر بھی نہیں

پر ہوئے سر چڑھ کے یہ موئے دماغ
دود ہو جانے لگے سوئے داغ

ہو گئے گرم سخن تب تو قلم
ورنہ یوں بیہودہ کب نکلا ہے دم

ایسے مونڈے میں نے کتنے بے شعور
بے نجابت اس بھی فرقہ کی غرور

یاں نہ سید کچھ ہے نے نائی ہے شرط
سگ کو نجم الدین کے سرداری ہوئی
میر و مرزا میں حکم ہو وے خرد
سمجھے مرزا میر کو مرزا کو میر
مجھ میں مرزا میں تفاوت ہے بہت
جس جگہ میں نے رکھی منھ میں زباں
استرے کانوں میں اپنے باندھ کر
ان کمینوں کا گلہ کیا کیجیے
کہتے ہیں سرگرم بیباکی ہے یہ
لکھیے اس فرقہ کے اب تا چند دم
گرچہ ان کو کہتے ہیں آئینہ دار
صاف قینچی پر انھیں چڑھوائیے
جا ہو ہوا اس قوم کی کیا شرح حال
اک سفید ان کو نہیں چننے کی تک
کیا کہوں کیسے ہیں اوندھے یہ لچر
گھر چیں ایسا سر کہ کر دیں پائمال
معتبر اُنکے جو حجّامی ہیں اب
کوئی لے جائے جو حاجت غسل کی
لعنتیں کرتے ہی گزرے اسکو واں
بیٹھے جامے خانے میں کیا غسل کر
لیک پھر اجرت کے اوپر جنگ ہے
اس سقا دے میں گیا تھا اک حریف
دھو کے پاجامہ نہانے بھی گیا
غسل کے پیچھے جو منھ گھر کو کیا
نائی نے پوچھا کہ پیسا یا ٹکا
ہو کسو کسوت میں دانائی ہے شرط
نوح کے بیٹے کی وہ خواری ہوئی
نے کی نائی جن پہ سب کا دست رد
نے وہ رگ زن جو نہ سمجھے سیر شیر
یاں تأنّی واں عجالت ہے بہت
ہوتے اس جاگہ جو مرزا بیگماں
کب کے اب تک گھسگئے ہوتے ادھر
ایسے دس پیدا ہوں گر نہ لیجیے
ہوں تو ہوں ناپاک کیا پاکی ہے یہ
خط بناویں ایسا کریے کف قلم
لیک انکا منھ نہ دیکھیں کاش یار
گر نمد مواس میں پھر ہو جایئے
آگے ہی آویں گے جتنے ہونگے بال
ہوتے ہیں دشمن یہ کالے بال تک
کیجیے اصلاح عاید ہو وے شر
سیدھیاں جب سُن لیں تب لیں اُلٹے بال
ہند میں وہ تیرہ رو شامی ہیں اب
چلّو چلّو پانی پر دیتے ہیں جی
غسل میں فرصت تشہد کی کہاں
جیب شاگردوں نے واں رکھی کتر
لات ہے گالی ہے پھر سر جنگ ہے
اسکی فی الجملہ طبیعت تھی ظریف
یکطرف پھر پائخانہ بھی گیا
ہاتھ نائی کے سوا پیسا دیا
دمڑی یہ کیسی ہے میں قرباں گیا

مثنوی در ہجو اکول

ایک ہے پرخور آشنا بے پیر سینہ سوراخ جس سے ہو کف گیر

صد منی دیگ ہے شکم اُس کا نفس اژدہا ہے دم اُس کا

آنت شیطان کی ہے اُسکی آنت دانت اُس کا ہے ہاتھی کا سا دانت

خستۂ جوع وہ جو آوے نہار منھ ہے گویا کہ زخم دامن دار

شکل مت پوچھ کھانے کا ہے بلی منھ ہے چھیپوں سے جیسے روٹی جلی

گال کلّے سے پھر توے سے سیاہ کاسۂ سر ہے جیسے اوندھا کڑاہ

توند کالی جو کھول جائے لیٹ آہنیں ہے تنور اُس کا پیٹ

راہ مطبخ میں پاوے ہے جو کبھی چاٹ جاتا ہے دیگچوں تک بھی

کھینچے باورچیوں کے کیا کیا ناز کتری گئی اُس کے چوتڑوں پر پیاز

کھانا نکلے پر آوے ہے کیسے چیل ٹوٹے ہے گوشت پر جیسے

وقت کھانے کے ہاتھ سے اسکا قاب پر نان پنجہ کش گویا

کیا وہ دو پیازہ کھاکے ہو تازہ اک نوالا ملا ہے دو پیازہ

گوشت ہانڈی بھرا ہے خشک میں ہنڈیاں گویا تھیں اُسکی خشتک میں

خام طمعی سے اک کرے ہے آہ دیکھ کر شبکو نان ہالۂ ماہ

نہ ٹلے دیکھ کر وہ قاب پلاؤ منھ ہے منھ بیٹھا گرچہ کھاوے گھاؤ

کھانے پر جب وہ جی چلاتا ہے لاٹھی پاٹھی بھی کھائے جاتا ہے

نہیں پہونچے جو کھانا کھانے لگ ہڈیوں پر لڑے ہے جیسے سگ

بھوکھ کا باؤلا جو آتا ہے لوگوں کو کاٹ کاٹ کھاتا ہے

دہوں میں دشمنوں سے بھی وہ لئیم جائے گھل بل اگر سُنے ہے حلیم

آش بغرا یہ مار بھی کھا دے اس میں گو بو غرا نکل جاوے

کسی مفلس کے گھر جو جاتا ہے کچھ نہیں خفتیں ہی کھاتا ہے

بھوکھ سے جب کہ غصّے میں آوے برکو ہی کی طرح جھنجھلاوے

ٹھنڈیوں کو نگہ سے کھا جاوے چنے لوہے کے بھی چبا جاوے

دہر کا جلنا آگ سے مانوں
نکلے بازار میں وہ جب چربوز
گھاس پات اور کانس کھاتا ہے
اُسکے آنے کی سُن کے بازاری
کوئی تختہ کرے ہے دوکاں کو
کنجڑے ڈھانکے ہیں ساگ پات اپنا
کہ مبادا ادھر کو آجاوے
اینٹ پتھر بھی کھا گزر جاوے
کیا کیا جیسے کی کہیے چکھتا ہے
پیٹ اپنا بڑا جو پاتا ہے
وہ قضارا ہوا مرا مہماں
گھر میں جو کچھ تھا بیچ منگوایا
کتنا کھانا بیان کروں تجھ سے
مجھ سے تھی روزگار سے ان بن
چار من گاجروں کا تلیہ تھا
روٹیاں کس قدر بتاؤں میں
چاہ کرکے گرا جو وہ بلاع
تھی ابھی روٹیوں کی جیسٹ کی بیٹ
کھانا کوئی اور کیا کہے اُس کا
جب مریگا وہ بھوکھ کا روگی
کھانے کی بو جو ناک میں پہنچے
عقل باور اگرچہ کرتی نہیں

بھوک اُسکی جلے تو میں جانوں
سر ہی پھوڑے ہے دیکھ کر تربوز
نیشکر پر وہ بانس کھاتا ہے
کرتے ہیں سودوں کی خبرداری
کوئی لادے بلا گزر یاں کو
تکتے ہیں بنیے داؤ گھات اپنا
سودے کیسو ہمیں نہ کھا جاوے
الغرض پیٹ اپنا بھر جاوے
لیک پیٹ اُس کو وادے رکھتا ہے
گو وہ تک کا بھی جیف کھاتا ہے
کھا گئی اس کی میزبانی جان
کھانا اُس کے لیے میں پکوایا
جس پہ سو میہماں کروں تجھ سے
خوب کھانا تو تجھ پہ ہے روشن
دہ منی دیگ بیچ دلیہ تھا
جس کو دو چار سال کھاؤں میں
دور روح نشست حماع
تب رہا کتنا کھ گیا وہ سمیٹ
سادے منھ دیکھتے رہے اُسکا
روح تو سختی کی روٹی میں ہوگی
مرگیا ہووے تو بھی اٹھ بیٹھے
وہ مرے بھوک اسکی مرتی نہیں

بھوکے اس کا جو جی نکل جاوے
گور میں بھی کفن نگل جاوے
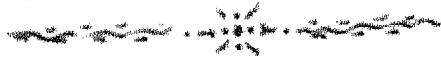
مثنوی دیگر در بیان کذب

اے جھوٹ آج شہر میں تیرا ہی دور ہے — شیوہ یہی سبھوں کا یہی سب کا طور ہے

اے جھوٹ تو شعار ہوا ساری خلق کا — کیا شہ کا کیا وزیر کا کیا اہل دلق کا

اے جھوٹ تجھ سے ایک خرابی میں شہر ہے — اے جھوٹ تو غضب ہی قیامت ہی قہر ہے

اے جھوٹ رفتہ رفتہ ترا ہو گیا رواج — تیری متاع باب ہے ہر چارسو میں آج

اے جھوٹ کیا کہوں کہ بلا ریز سر ہے تو — اے جھوٹ سچ یہ ہے کہ عجب فتنہ گر ہے تو

اے جھوٹ کب ہے عرصہ میں تجھسا حریف اب — تیرے ہی حکم کش ہیں وضیع و شریف اب

اے جھوٹ تیرے شہر میں ہیں تابعیں سبھی — مر جائے کیوں نہ کوئی وے سچ بولیں نے کبھی

کہنے سے آج اُن کے کوئی دل نہ شاد ہو — فردا کہیں تو اس سے قیامت مراد ہو

وعدے گھڑی کے پہروں کے سب آزما چکے — برسوں تلک انتظار کیا جی ہی جا چکے

اے جھوٹ رنگ تیرے کرے کوئی کیا بیاں — رکھتا ہے جیسے غنچہ زباں تو تہِ زباں

یوسف کہ تھا نبی و صداقت شعار تھا — پھر حسن ظاہری سے بھی باغ و بہار تھا

پایانِ کار تیرے سبب چاک پیرہن — زنداں میں جا کے برسوں رہا چھوڑ کر وطن

اے جھوٹ تو تو ایک دلآویز ہے بلا — آشوب گاہ تجھ سے زمانہ رہا سدا

کس جانکنی سے کوہکنی کوہکن نے کی — تصویر کھود شیریں کی پیش نظر رکھی

نزدیک جب ہوا کہ وہ مطلوب سے ملے — اب صبح و شام غنچۂ مقصود دل کھلے

دلالہ کے تو پردے میں آ کام کر گیا — دو باتوں میں وہ عاشق دل خستہ مر گیا

اے جھوٹ تجھ سے فتنے ہزاروں اُٹھا گئے — ہنگامہ و فساد ہی ہر سو رہا کیے

اے جھوٹ راستی سے نہیں گفتگو کہیں — کہنے کو ہاں کہیں ہیں حقیقت میں ہے نہیں

اے جھوٹ اُس طرح ہیں بہت جی سے جا چکے — وعدوں میں آہ لوگوں کے وعدے ہی آ چکے

اے جھوٹ اس زمانے میں کیونکر چلے معاش — ہے تنگ جھوٹ بولنے سے عرصۂ تلاش

سردار جس سے سب متعلق ہے کاربار — سچ بولنا ہے اُسکے تئیں سخت ننگ و عار

پھر سب مدار کار دروغی و مفتری — صدق و صفا و راستی کے عیب سے بری

جھوٹا سوار دولت الٰہی کا ہے یہ امیر — ورنہ قسم کسو کی بھی تھی حرف بارگیر

مشکل حصول کام ہے یاں حاصل کلام — باتوں ہی باتوں کام ہوا خلق کا تمام

سوانش

واسوخت

میر تقی میر دہلوی

نام لیتے ہو کراہت سے مرا جو لو ہو — لگ چلے غیر تو تابع اسی کے ہو لو ہو

روے حرف اُسکی طرف چشم حمایت اودھر
ابرو اودھر کو جھکے لطف و عنایت اودھر

پیار تجھ کو نہ کیا کرتے اگر جانتے ہم — کاشکے تیری روش پہلے ہی پہچانتے ہم
جھوٹے جھوٹے ترے وعدے نہ کبھو مانتے ہم — جی میں اب ٹھانی ہے جو کچھ سو بھی ٹھانتے ہم

اسقدر تجھ سے نہ لگ چلتے نہ آتے اس راہ
تو بری ہوتا تو کرتے نہ تری اور نگاہ

یہ فریبندہ سخن گوش نہ کرتے ہرگز — خواہش کنج دہن دل پہ نہ دھرتے ہرگز
بے شب وصل دن اس طور نہ بھرتے ہرگز — لعل جاں بخش پہ یوں تیرے نہ مرتے ہرگز

اتفاقات سے ہو جاتی ملاقات تو خیر
دل تجرد یہ رکھا جب نہ کوئی یار نہ غیر

عشوہ و ناز و ادا سے کسو کو پھر کیا کام — جی نہ بیچین رہا کرتا نہ دل بے آرام
ہو گیا یوں تو کبھو ہو گیا آپس میں کلام — بے رُخ و زلف رکن کا ہے کو ہر صبح و شام

جنس اچھی تری پر گرمی بازار کہاں
سرگراں تو تو بہت ہو یہ خریدار کہاں

تجھسے بے مہر و وفا دل کا لگانا تھا غلط — آپ کو حرف غلط رنگ مٹانا تھا غلط
خط دے قاصد کو ترے اور چلانا تھا غلط — آتش غم سے مرے جی کا جلانا تھا غلط

اپنی نادانی نہ سمجھے کہ تو کیا نسخہ ہے
آدمی بھی کسو دانا کا لکھا نسخہ ہے

غم نہیں تجکو مری یاری و فاداری کا — نہ خیال آوے ہے بندے کی گرفتاری کا
طور چھوڑا نہ تنک تو نے ستمگاری کا — وہی عشوہ ہے شب و روز دل آزاری کا

پرسش حال کا بھی مجھ کو نہ ممنون رکھا
ہے یہ خاطر کہ حزیں دل کے تئیں خون رکھا

ترک اخلاص کیا سب سے تجھے پیار کیا — الم دل پہ نہ کیا جان کو آزار کیا
چاہ سے اپنی عبث تجھ کو خبردار کیا — کیا کیا ہم نے کہ اس معنی کا اظہار کیا

جو کہ الفاظ نہ شایاں تھے سو تو کہنے لگا
وجہ بوجہ تو درویش ہی اب رہنے لگا

آرسی کی کبھی صورت نہ دکھاتے تجھکو
دلربائی کے نہ انداز بتاتے تجھکو
طرز یہ سرمہ کشی کی نہ سمجھاتے تجھکو
کیوں بگڑتا تو جو ایسا نہ بناتے تجھکو

مستی چشم سے ہوتی نہ اگر تجھکو خبر
ایسی ہشیاری سے کرتا نہ تو ادھر کو نظر

اور مہ پارہ بھی اس شہر میں مشہور ہے اب
دیکھنا کچھ ہو اسی کا مجھے منظور ہے اب
اسکی محبوبی و خوبی ہی کا مذکور ہے اب
صدقے اسپر کروں گا اپنا جو مقدور ہے اب

اس کے صدقے تری شام و سحر جاؤں گا
گھر سے جسدم اٹھونگا اسکے ہی گھر جاؤں گا

وہ بھی حسن شور دہ مجھے نا چاہے ہے
کوئی دن راتوں کو مجھ پاس رہا چاہے ہے
تحفہ لطف و عنایت سے ہوا چاہے ہے
کام دل اول ہوں ہی سے جو خدا چاہے ہے

یاد کا رخ تجھے بتلاؤں دم اس مہ کا بھروں
خط تری بندگی کا کاغذ پہ اس کا کروں

میں بھی ناچار ہوں تو چند جگہ میں رہوں
یا اسی ماہ کے بیمار ہوں گو میں نہیں
قصد رکھتا ہوں کہ اس شہر میں ہرگز نہ رہوں
خوبیاں ورتر سے حسن و سلوک اس سے کہوں

لیکن تجھ سے مری دونوں ہیں پر معلوم
اسکے معصوم ہوئے رو سے دل و دفتر معلوم

پھر تو جی کو میں کروں گا اسی مہ پر قرباں
بس بجوا سا ہوا تیرے لیے سرگرداں
راہ و منزل میں پھروں گا اسی کے دست نشاں
اس قدر مجبور وہ غائب ہے کہاں لا دکھاں

گر رہوں بیخود و بیتاب شبوں کو روتا
کاش مشتاق ترے مکھڑے کا نہ تب ہوتا

اب تو جو کچھ ہو دل اس ساتھ لگا بیٹھوں گا
ہاتھ دل سوختہ ہو تجھ سے لگا بیٹھوں گا
اسکے دروازے پہ درویش ہو جا بیٹھوں گا
آؤں گا بھی تو ترے پاس نہ آ بیٹھوں گا
دور سے ایک نظر کرکے چلا جاؤں گا

سو بھی کتنے دنوں پھر کاہے کو میں آؤں گا

لاگ ہے جس سے نئی اُس سے رکھوں قیل و قال
دلنشیں اُسکے کروں خوب طرح کہنہ مقال
ساری مجلس کے تئیں اُسکی کروں واقفِ حال
بعد ازاں ترک کروں کھا کے قسم تیرا خیال
پھر کبھو وہم میں بھی گزرے نہ ملنا تیرا
جب نہ تب در پہ اُسی کے رہے ماتھا میرا

لگ چلوں اس سے صبا کی سی طرح شام و سحر
اُسکے پاؤں تلے کی خاک کروں کحلِ بصر
روئے گلرنگ سے اُسکے نہ اُٹھے میری نظر
چپکے اُسکے لبِ شیریں سے رہیں دیدۂ تر
درہمی حال کی اُس گیسوئے برہم سے رہے
جی کو بیطاقتی اُس قد کے چم و خم سے رہے

ناز بیجا ترے دل پھر نہ اُٹھاوے ہرگز
بات یہ تیری فریبندہ نہ بھاوے ہرگز
طرزِ رفتار تری جی میں نہ آوے ہرگز
آنکھ خوبی کی طرف تیری نہ جاوے ہرگز
وہ جو سادا ہے تو پرکار بھی ہو جاوے گا
اب جو بیگانہ سا ہے یار بھی ہو جاوے گا

فنِ معشوقی میں تیار کروں گا اُس کو
شانہ و آئینہ سے یار کروں گا اُس کو
حُسن سے اُسکے خبردار کروں گا اُس کو
ضد سے میں تیری بہت پیار کرونگا اُس کو
فرشِ رہ دیدۂ نمناک کروں گا واں کے
پلکوں سے خار و خسک پاک کرونگا واں کے

ہو گیا مجھ سے جو مانوس تو مرزا ہوگا
پوششِ تنگ کا مصروف مہیّا ہوگا
گھیر جامے کا نہ سو گز سے کم اُسکا ہوگا
لپٹے بندوں کا بر دوش پہ پلّا ہوگا
چلتے دامن کے تئیں لگتی رہے گی ٹھوکر
ہو گا ہنگامہ اُدھر نکلے گا جیدھر ہوکر

کس و ناکس اُسی مہ پارے کا مفتوں ہوگا
ایسی سج سے تو اُسے دیکھ کے محزوں ہوگا
رشک سے اُسکے ترا حال دگرگوں ہوگا
دلِ نازک ترا دھڑکے گا جگر خوں ہوگا
شرم سے ہوئیگا نہ اک آنکھ اُٹھانا مشکل
بلکہ ہو جاویگا اس کوچے میں آنا مشکل

مسدّس دیگر

سچ کہو شہر میں صحرا میں کہاں رہتے ہو
ان دنوں یاروں کی آنکھوں سے نہاں رہتے ہو
یاں بہت رہتے ہو خوش باش کہ واں رہتے ہو
خوش رہو میر مری جان جہاں رہتے ہو
اک طرف بیٹھے ہوئے ہم بھی لہو پیتے ہیں
عشق کی جان کو دیتے ہیں دعا جیتے ہیں

دل خوشی ہوتا نہیں سبزے سے یا سنبل سے
ہمنشیں داغ کھلے دل پہ مرے سب گل سے
یعنی اب عشق نہیں مجکو خطِ کاکل سے
آ چمن زار میں گل بازی کروں بلبل سے
شاخ گل پر تو وہ ہوا و رلب جو پر میں
داغ کو دل پہ وے گل کے تئیں رو پر میں

ہے زمیں خشک مرے دیدۂ تر سے نایاب
ہر طرف اشک سے میرے ہیں رواں صد سیلاب
شہر و کہسار و بیابان سبھی ہیں شاداب
کام کرتی ہے جہاں تک کہ نظر آب ہے آب
ہے عبث جیتے جی میرے تجھے بارش کا خیال
میں تو روتا ہوں ترے غم میں علی قدر حال

ریزے الماس کے ہیں مشت نمک شک کی لو
لذت درد سے مقدور ہو جب تک کر خو
کسکو یہ سارے ہم پہونچے ہیں انسے مل تو
دیکھو زنہار نہ دے مرہم بد رو کو رو
ننگ و ناموس کو مجروحوں کو رکھ مد نظر
منھ بھرائی میں مری جان لے لے زخم نظر

مدتیں گزریں کہ اے شوخ یہ خواری ہے مجھے
روز و شب درد و غم و نالہ و زاری ہے مجھے
تجھ سے بیرحم ستمگار سے یاری ہے مجھے
بلکہ ہر روز کی شب ہجر میں بھاری ہے مجھے
اہل دل جان سے رکھتا ہے تجھے عشق یہ ننگ
کاشکے دل کے عوض کوئی ملا ہوتا سنگ

عاقبت کا نظر آیا نہ یک آثار ہمیں
حیف صد حیف میسر نہ ہوا یار ہمیں
دل کی بیتابی نے ہر چند رکھا خوار ہمیں
تیرے کوچے میں کہیں سایہ دیوار ہمیں
تا کہ واں نالہ و فریاد کیا کرتے ہم

طور پر اپنے ترے پاس ہم آجاتے تھے
حسبِ خواہش تجھے ہر شام و سحر پاتے تھے

بند جامے کا جو وا ہوتا تھا وا رہتا تھا
تھوڑی رنجش میں گلے ہی سے لگا رہتا تھا
بے تکلف مرے گھر رات کو آ رہتا تھا
ٹک جدا رہتے تو دیر آنکھ ملا رہتا تھا

اسقدر قدر نہ تھی اپنی تری آنکھوں میں
لعب و بازی میں بھی رہتا تھا مری آنکھوں میں

آستینوں میں نہ تھے چاک نہ زہ دامن میں
یہ طرح کب تھی دوپٹے کے تلے جتون میں
تکیے کاہے کے تپکیں لگتے تھے پیراہن میں
پھرتے کس روز تھے یوں کپڑے پہن آنگن میں

بند ملتے ہوئے ہر دم نہ کھڑے رہتے تھے
پیچ پگڑی کے گلے میں نہ پڑے رہتے تھے

کس دن اتنا تھا پراگندگیِ مو کا خیال
لعل جاں بخش نہ رہتے تھے کبھو اتنے لال
دو دو دو دن چہرے پہ بکھرے ہی رہا کرتے تھے بال
خوبیِ خندہ نہ لوگوں کی جیوں کی تھی وبال

پان سے شوق نہ تھا کیسا مسی کا مذکور
غصے ہو جاتے تھے سن ایسی کسی کا مذکور

تنگ پوشی سے نہ محظوظ تمھیں پاتے تھے
مسکی چولی سے نہ تم در پہ کبھو آتے تھے
تنگ جامے جو سیے جاتے تو گھبراتے تھے
لپٹے دامن میں الٹ گھر ہی میں پھر جاتے تھے

یا تو اب کہنی پھٹی مونڈھے چپسے رہتے ہیں
باہر اندر ہو کہیں بند کسے رہتے ہیں

شوق زینت سے نہ تھا ربط نہ رعنائی سے
اب تو سو بار کمر بندھتی ہے اکلائی سے
دل نہ اتنا تھا لگا خوبیِ مرزائی سے
دیکھتے رہتے ہو ترکیب ہے خود رائی سے

روسیہ آئینہ سے تم کو فراغت ہی نہیں
سرمۂ تیرہ دردل سے کہیں فرصت ہی نہیں

شانہ اب ہاتھ میں ہی زلف بنا کرتی ہے
پاس سرمے کی سلائی بھی رہا کرتی ہے
مسی دانتوں میں کئی بار لگا کرتی ہے
آنکھ رعنائی پہ اپنی ہی پڑا کرتی ہے

جان آنکھوں میں کسی کی ہو نظر تم کو نہیں

دست افشاں ہو تو عزت تری اب ہاتھ سے جائے
مار ٹھوکر چلے دامن کو تو تو سر نہ ہلائے
چشم مکھول کو دکھلائے تو تو آنکھ چھپائے
جسطرف اُسکا گزر ہووے تو ادھر کو نہ جائے
چھیڑے گالی دے اشارت کرے چشمک مارے
عشوۂ و غمزۂ و انداز بھلادے سارے

زندگانی ہو تجھے ہاتھ سے اُسکے دشوار
پہونچیں ہر آن میں اُن سے تجھے سو سو آزار
کوئی دن تو بھی پھرے جان سے اپنی بیزار
طنز و تعریض کنائے کی رہی اک بوچھار
جاکے ٹک سامنے اُسکے تو بہت ترا وے
عرق شرم میں ڈوبا ہوا سب گھر آوے

دل واسوختہ کو اپنے لیے جاتے ہیں
اپنی جا غیروں کو ناچار دیے جاتے ہیں
غصے سے خون جگر اپنا پیے جاتے ہیں
اسکے یوں جاتے نہیں عہد کیے جاتے ہیں
آوے گا تو بھی منانے کو نہ آوینگے ہم
جان سے جاوینگے یہاں سے نہ جاوینگے ہم

بازگشت ابکی کسو طرح نہیں ہے منظور
جانا ٹھانا تو پھر آنے کا یہاں کیا مذکور
گو کہ در پیش ہمیں آوے رہ دور از دور
جی سے اپنے بھی گزر جائیے پر تا مقدور
مُنھ ادھر کریے نہ جس جا سے نبے اُٹھ جانا
قدر کھو دیوے ہے ہر بار کا آنا جانا

میر اعراض بھی لوگوں نے کیا ہے آگے
خلق عالم سے کنارہ بھی کیا ہے آگے
دل کے واسوز سے لوہو بھی بہا ہے آگے
عزت و وقر بھی بہ باد دیا ہے آگے
پر کنھوں نے نہیں اس ڈھب سے زباں بازی کی
یہ بھی ظالم ہے کوئی طرز سخن سازی کی

* * *

آرسی چھوڑے تجھے ٹک تو ادھر دیکھے تو

مجھ کو کس روز تجھے پاتے تھے رعنائی کا
ذوق رہتا تھا تجھے کاہیکو خود رائی کا
کب کب آنچل رہے تھا ہاتھ میں کلائی کا
اتنا دل بستہ نہ تھا جامۂ زیبائی کا

سُرخ سنجاف نہ لگتی تھی نہ ہوتے تھے چاک
خون سے عشق کے ماروں کے یہ دامن تھا پاک

ایسے اوباشوں کی تقلید میں کب تھی تنگ دو
تنگ چولی کے نہ رہتا تھا کبھی اتنا گرو
پاٹ دامن کے نہوتے تھے ترے ساٹھ کے سو
اب تو ہے قہر جو ڈھیلی ہو کمر ایک بھی جو

درزی کا نیاہی کرے ٹھیک نہ جبتک سی لے
کاڑھے ہے ٹانکے میں سوئی کے کرے ٹانکے ڈھیلے

خط بھی آیا پہ مری تیری صفائی نہ ہوئی
کس گھڑی آن کے بیٹھے کہ لڑائی نہ ہوئی
اپنی سج دیکھنے سے تجکو رہائی نہ ہوئی
اک بلا جی کی ہوئی تنگ قبائی نہ ہوئی

رک گئے دیکھتے دس جاسے ترے مونڈھے جیسے
چولی مسکی ہوئی سب دھجیوں میں پہونچے پھنسے

بند لنبے نہ کبھو اتنے سیے جاتے تھے
شانے پر ڈالے ہوئے تجھے سے کب آتے تھے
زہ سراسر نہ گریبان میں لگواتے تھے
گھیر دامن کا بہت ہوتا تو گھبراتے تھے

اب تو پوشاک ہے کچھ تازہ نکالی تم نے
طرح داری کی طرح اور ہی ڈالی تم نے

کن دنوں ساتھ کئی یار رکھا کرتے تھے
کن شبوں غیر سے یہ پیار رکھا کرتے تھے
کس گھڑی ہاتھ میں تلوار رکھا کرتے تھے
کسکو یوں میری طرح مار رکھا کرتے تھے

میان سے اب تو لیے آٹھ پہر رہتے ہو
گھر سے جب نکلو ہو تب خون ہی کر رہتے ہو

بال واں سنوریں ترے یاں مجھے جی ہے جنجال
میں ملوں خاک میں منظور تجھے اپنی چال
ہو جگر داغ مرا منھ پہ بنے تیرے خال
مہندی پانوں سے لگے گھل کے رہوں میں پامال

سرمہ آنکھوں میں جگہ تیری کرے شام و سحر
مطلق احوال مرا تجھکو نہ ہو اللہ نظر

۱۰

تھیں فریب انگیز نگاہیں وہ تمھاری بارے
شوق کے ہاتھ شب و روز سر دوں پہ پڑے

دامن و جیب پھٹے یاد ہیں ان کی سارے
چھاتیاں کوٹتے ہی کوٹتے آخر ہارے

روئے اتنا کہ جگر میں نہ رہی لوہو کی بوند
اب سماں وہ ہے کہ دیکھو گے میاں آنکھیں موند

تنگ اب حد سے زیادہ ہوئے ہیں یاد رہے
کب تلک اس طور کرو گے ستم ایجاد رہے

بس بہت ہی ترے اطوار سے ناشاد رہے
دن کو بیداد رہے رات کو فریاد رہے

ہے قریب اب کہ ترے کوچے سے [illegible]
بے محبت ہی نہیں کچھ اگر پھر آویں

اک طرف مر رہیں گے جا کے بھلا کیا کریے
سر گریبان میں یوں ڈال رہا کیا کریے

ہر زماں ہر کسو سے حال کہا کیا کریے
میر کے طور ترا شکوہ کہا کیا کریے

جی نہ نکلا اگر اس بن تو گلہ کریے گا
مرثیہ اپنا کہیں بیٹھے کہا کریے گا

مثنویات شکار نامہ

میر تقی میر دہلوی

سنا جس طرف فیل وحشی کا میل
رواں فوج اودھر کو ہوئی سیل سیل

اگر ٹک بھی اٹکا تو مارا گیا
پڑے سیکڑوں پھاند چارا گیا

وگر سرکشی سے کی استادگی
تو پیش آئی اک طرفہ افتادگی

پہاڑ ایک ہاتھی مقابل ہوا
بزور آمد و شد کا حائل ہوا

جٹے دونوں وے دیو میدان میں
اٹھا شور محشر بیابان میں

جہاں دونوں فیلوں کی تھی سرزنی
شتر مرغ سے واں نہ ہو پرزنی

جو اس مار کھانے پہ اکڑا رہا
کئی روز رسوں سے جکڑا رہا

رہے کس طرح پھٹ گیا تھا جگر
موا دو پہر میں لہو موت کر

مگر سرکشی سے نہ اپنی ہٹا
نہ میدان میں ٹک دیا ٹک گھٹا

اشارہ ہوا اس کے چورنگ کا
سبھوں کو ارادہ ہوا جنگ کا

برسنے لگا مینھ تیروں کا زور
ہوا فیل باراں کا جنگل میں شور

لگی پڑنے بجلی سی تیغ سیاہ
پریشان ہو جیسے ابر سیاہ

نہایت وہ ہاتھی ہوا لخت لخت
گرا یوں کہ جیوں پارۂ کوہ سخت

رکھا لا کے لشکر میں اثنائے راہ
سر اس کا کٹا جیسے برج سیاہ

رہے کہتے اس دن عجب سب ہو یہ
سر فیل ہے یا سر شب ہے یہ

اگر دیو ہیں سرگرانی کے ساتھ
نہ اس تیرگی و کلانی کے ساتھ

وہاں خشمگیں جیسے آتش یہ تھا
مگر فیل سر دیو سرکش یہ تھا

گوزن اور ہرنوں کی کیا دیجے شرح
گئے شیر مارے سو کتوں کی طرح

گیا دشت در دشت شور شکار
ہوئے گرگ آہو کے اوپر سوار

ہرن جھکیتوں میں رہے گھومتے
چھپے فیل بیلوں ہی میں جھومتے

برابر رہے گور و شیر ژیاں
برابر تھا دونوں کو وسواس جاں

گئے پیشتر چھوٹ نخچیر گہ
شغالوں کی روباہ بازی تھی یہ

اس اوقات سے جو نہ بیہوش تھے
بہیر و بنہ تا جگر خرگوش تھے

اگر ریچھ نکلا تو تھا سو بسو
بہت مضطرب تھا وہ آشفتہ مو

قلندر سپاہی بے جاں ہوئے
لیے اسکو سر در گریباں ہوئے

گئے ارنے مارے سو مانند فیل
ہوا خون جنگل میں ان کا سبیل

رہے گور راتوں کے تئیں جاگتے
گئے بر کو سوں تلک بھاگتے

پکڑ لائے چیتے گوزن اور گور
عصا سے چلے راہ یاں مار و مور

بہت ہم نے دیکھے وزیر و شہاں
شکار ایسے دستور سے تھا کہاں

نمکخوار مجھ سے تو ہیں گے ہزار
پہ میر ابھی ہونا ہے یہاں یادگار

غرض میر تا دور چرخ بلند
رہے آصف الدولہ اقبال مند

کرے اس کا اقبال ہر لحظہ کام
شکار اسکے دشمن رہیں صبح و شام

غزل میر کوئی کہا چاہیے
ٹک اس بھی زمیں پر رہا چاہیے

غزل

ہم وحشیوں پہ کچھ ہو کاہے کو یار ہے تو
اے ترک صید پیشہ کس کا شکار ہے تو

ہووے بھی قریب شاید نخچیر گاہ اس کی
جوں صید خوں گرفتہ دل بیقرار ہے تو

دل تجھ تلک رسائی مشکل ہے چشم تر سے
عسر العبور کیسے دریا کے پار ہے تو

شہری ہیں اسکی آنکھیں کیا تجھ کو اس سے نسبت
اے آہوئے بیاباں اچھا گنوار ہے تو

کیا صبح جلوہ گر ہو خوبی کے آگے تیری
اے گل دم تبسم باغ و بہار ہے تو

یہاں دو قدم بھی چلنا بن سر دیئے نہ ہووے
اے راہ عشق کتنی مشکل گزار ہے تو

لیتا ہے تجھ سے عبرت جو کوئی دیکھتا ہے
کیا میر اس گلی میں بے اعتبار ہے تو

باز قدم رنجہ فرمودن آصف الدولہ بہادر روز دیگر برائے شکار

چلا پھر بھی نواب گردوں شکار
اسد باؤ کے گھوڑے پر ہو سوار

روانہ ہوئی فوج دریا مثال
نہنگوں کی اب کھینچی جاویگی کھال

گیا شور تا آسمان برین
ہوئی گرد افواج گردوں قرین

زمیں ہوگئی جائے خوف و خطر
فلک کو لگے دیکھنے شیر نر

چڑھا بسکہ دریائے فوج گراں
اُتر ہاتھیوں کی گئیں مستیاں

محیط آبگیروں کے تھے مرد کار | موئے مالک الحزن چندیں ہزار
بہت دام پانی کی جانب جھکے | کھڑے رہ گئے رود گیا کیا رکے
ٹھٹک سونس گھڑیال رہ رہ گئے | مگرمچھ نہ جانے کدھر بہ گئے
نہ قشقل نہ سلی نہ سرخاب ہے | تمام اُن کے لوہو سے سُرخ آب ہے
عجب روغنِ قاز ملتے تھے یار | کہ قازوں کو لیتے ہوا ہیں سے مار
منگاتے تھے بطخ کی چربی ظریف | سو وہ چربی اب پھینکدیں ہیں حریف
ہوئے کتنے اقسام ماہی شکار | نہ آوے قسم کھائے بن اعتبار
مگر مرگ ماہی تھی جالوں کے بیچ | کہ یوں مچھلیاں سب نکالیں اینچ
تہ ارنب ہے جنگل میں نے سیماز | کوئی بدوی کیا کھاوے پروردگار
کلنگوں کی اُلٹی گئی صف کی صف | ہوئے بیچ میں قرقرے بھی تلف
نہ جنبش سے گئے سبزہ کھا کھا کے چیت | نہ رہے ویسے ہی آئے کھیتوں میں کھیت
ٹٹیرا اور تیتر کا ہے کیا شمار | کہ باز آ گئے جُرّے کرتے شکار
ہوا زرد سنگ بہت دل میں ڈر | نمد مو ہوا گرد سے شانہ سر
خطرناک تھا دشت کیا کہیئے مور | دبا یوں پھرے جیسے دبتا ہے چور
نہ پاڑھا نہ نیلا نہ چیتل کوئی | بنوں میں جو دوں لگی گیا جل کوئی

کوئی میر صاحب غزل یاں کہو
پہ ایسی کہ ویسی کسی سے نہ ہو

غزل

کیا کشت و خوں یہ اندنوں میلانِ یار ہے | ہر جائے پوچھتا ہے کہ یاں کچھ شکار ہے
جاتا ہے اس کشندے کی جانب چلا ہوا | صیدِ اجل رسیدہ ہے دل بیقرار ہے
آنکھیں جو میری باز ہیں جوں صید بسملی | اس ترک صید بند کا یہ انتظار ہے
عزت جو اُس گلی میں ہے اپنی نہ پوچھیئے | جب جائیے تو خشم ہے گالی ہے مار ہے
جانیں چلی گئیں ہیں بہت تلف گاہ سے | تو رہ سکے جا کہ راہ ابھی پُر غبار ہے
ہے زلف و روئے یار سے ہر لحظہ بحث یہاں | یہ وجہ ہے کہ شعر مرا پیچدار ہے
کم اختلاطی کا ہے گلہ یار سے عبث | کس کشتۂ وفا سے بہت اسکو پیار ہے

بیابانِ وحشت اثر پُر خطر — یہی ڈر رہے ڈر گیا اِدھر گیا اُدھر
جہاں تک نظر جائے سوکھی ہی کانس — اگر سبزہ بھی تھا تو تھوہڑ کا بانس
کہیں دل رُکے بند ہو جائے دم — لکھوں کیا نیستاں ہی تھے یک قلم
چلے باد دن کو تو ہو سائیں سائیں — پڑے رات تو پھر کرے بھائیں بھائیں
نہ سبزہ نہ کھیتی نہ آبِ رواں — کوئی شیر غراں کہ پیل دماں
سو وہ شیر مارا گیا مثلِ سگ — وہ ہاتھی پکڑ لائے بے تاز و تگ
کوئی دشت ایسا کہ تھا سبزہ زار — ہوا دلکش و جبہ گہ جرگہ شکار
اگر آہو گیری کا ہوتا نہ عیب — تو وہ ہم بھی رکھ لیتے بیشک و ریب
مسطح زمیں میل در میل تھی — نہ دریا چہ تھا کوئی نہ جھیل تھی
اگر آ گیا رودِ خانہ کہیں — نہ دلخواہ تھا واں سے جانا کہیں
بڑا لطف تھا سیر میں گشت میں — نہ تھی درخت رز حیف اس دشت میں
ہوا اک جبل سامنے سے سیاہ — اسی کی طرف کو پڑی سب کی راہ
عجب لطف کا تھا وہ کوہِ گراں — کہ صد چشمہ کا اُس میں پانی رواں
شجر سبز و پتھر بہت صاف تھے — سبھی جیسے الماس شفاف تھے
ہوا ایک ابر اس جبل سے بلند — ہوا پر بھی اسکی یزدی پرند
پھر دن سے بارش لگی ہونے زور — رہا ساری وہ رات طوفاں کا شور
ہوئے خیمے پانی کے اوپر حباب — سب اسباب لوگوں کا تھا زیر آب
نہ پوچھ اور اسباب مردم کا حال — نہ چادر رہی خشک نے کوئی پال
قنات اور تنبو بسر سب گئے — کھڑے تھے جو کندے اتر سب گئے
بھرا پانی لشکر میں پھیلا ہوا — اگر فرش بستر تھا بھیگا ہوا
ہوا سرد از بس ہوئی ایک بار — کلیجوں کے ہوتی تھی برچھی ہی پار
پھرے باد سے لوگ منھ ڈھانپتے — جگر چھاتیوں میں رہے کانپتے
رہا ایسی سردی میں کیدھر شکار — ہوئے لوگ خیموں کے اندر شکار
بہت پیر جب جی کو تجنے لگے — جوانوں کے بھی دانت بجنے لگے
تہِ میغ خورشید پنہاں ہوا — نہ دیکھا مگر روئے جاناں ہوا

نکل شیر جنگل سے حیراں ہوئے
جہاں چلتے پھرتے نہ تھے مار و مور
شغال اور خرگوش و ہم روبہاں
ہوا پر جو تھے مرغ پرواز میں
بہت جانور کھا گئے شر کباب
ہوا اصل تھا کیا جو کہوں تھا کہیں
بہت مضطرب جھکیتوں میں پھرے
انھوں ہی میں سیمرغ بھی تھا مگر
نہیں فیل مرغ اور شتر مرغ اب
کسو بن میں تھے نیستاں اور کانس
برس مینھ دو دن میں کھل بھی گیا
کہ اندھیر تھا جیسے ظاہر ہو دود
بلا دھوم سے کوئی گھبرا پڑے
ہوا سرد ہو کر گئی جان مار
دل اس دود تیرہ سے گھبرا گیا
یہی چال تھی ایک دو چار کوس
کسو کوہ کے پاس نکلی جو راہ
بلندی تھی اس کوہ کی تا فلک
نہ اس رنگ سے صید ہونگے کہیں
جہاں دام اور دد کی تھی بود و باش
ہوا ایک جنگل میں آکر گزر
تراکم قیامت تھا اشجار کا
کہ اس مرتبہ بارد و سرد تھی
کوئی خار بن حایل رہ ہوا
درختانِ بے برگ و بر بد نما

اڑا سے جو تھے صاف میداں ہوئے
چلے پھروں واں تیر بندوق زور
شکاری سگوں نے کیے نوش جاں
گرے سیکڑوں ایک آواز میں
ہوئے آشیانے ہزاروں خراب
کہ تعداد کشتوں کی پاتے نہیں
سلامت نہ آخر گئے بر سرے
کہ پر مارتا ہی نہیں کوہ پر
کہ بعضوں کے طعموں کے کام آئے سب
چلے راہ واں لے نہ سکتے تھے سانس
ولیکن ہے کہرا لطیفہ نیا
ہوئے ہونٹھ سردی سے سب کے کبود
جنھیں دیکھو وے کانپتے ہیں کھڑے
اٹھایا بڑا لطفِ سیر و شکار
کہیں آگ دیکھی تو جی آگیا
ہوا ٹھنڈی ٹھنڈی پڑی ایسی اوس
گئی کوہ کی تیغ تک کم نگاہ
نگہ جاتے ہی جاتے جاتی تھی تھک
ہوئی خون کے رنگ رنگیں زمیں
لگے چوک لوگوں نے کی واں معاش
کسو کو نہ تھی واں کسو کی خبر
ستم دہر ہوا اے ستمگار کا
ہوئے سن مگر برف پرورد تھی
سٹنے پیرہن ہوش سب تہ ہوا
نہ اک شاخ پر مرغ رنگیں نوا

لیے کتنے زوروں میں بانک پٹے
جواں اس سے آگے بھی جاکر ڈٹے

تفنگ اسطرف کے بجاروں کے سُن
پلنگ ان بنوں سے چلے سر کو دُھن

غریب اشتلم جنگلوں میں رہا
نہ جھانکا ادھر کوہ سے اژدہا

گیا سیکڑوں کوس شور شکار
رہے ڈھور حیوان یکجا ہزار

چلا باز چھاتی کو کھولے جہاں
پرندہ رہا وہم کا بے گماں

زمیں گرد جرہ ہے کیا تیز بال
رکھا جنے اُٹھتے ہی مُرغ خیال

فلک سیر شاہیں کی پرواز دیکھ
لگے جوں نگہ جاکے انداز دیکھ

نہ جھاڑا گیا نسر طائر سے شمر
گھٹا کر گس چرخ چھوٹا نہ پر

رواں جس گھڑی ہوتی فوج گراں
بھیر و بنہ ہر طرف سے عیاں

زمیں پر قدم کوئی کیونکر دھرے
بیاباں فراخی سے تنگی کرے

کوئی شعبہ آیا اگر درمیاں
ہوا شور لشکر سے محشر عیاں

بلندی و پستی تھی اتنی کہ ڈھب
کہ گاہے زمیں گہ فلک پر تھے سب

کوئی نالہ کھولا اگر آگیا
تو اپنا کنیا پھر کوئی پاگیا

گرے یاں رہے یاں یہی حال تھی
جہاں در جہاں خلق پامال تھی

ہوا دن تو یوں کھینچتے رنج شام
گئی رات چوروں کے ڈر میں تمام

کہے ہے کوئی کون آتا ہے یہ
پکارے کوئی کون جاتا ہے یہ

لگے آنکھ سیکڑوں کے تئیں زد رہو
پھر آرام سے رات کو سو رہو

ہوا خیمہ گہ دامن کوہ سب
رہا آکے نواب واں تین شب

قریب ایک ٹٹیا پہاڑی تھی واں
لگا اُس سے کم کم تھا آب رواں

پہاڑی کہ تودا کھوں خاک کا
کہ انبار تھا خار و خاشاک کا

محاذی تھا اُس کوہ کے ایک دشت
کہ دشوار تھا اُس میں آدم کا گشت

ہوا بد بہت اور پانی سے لگے
قدم راہ چلتے ہوئے ڈگمگے

چلے پاؤ تو ایک موحش ہے شور
رکھے پاؤں دامن کو کھینچے بزور

فقط خار بن کیا کہ جھاڑ تھا
کہ بوٹا بھی واں جھاڑ جھنکاڑ تھا

چلو ہی چلو ہے یہ چلتے نہیں
کہ اشجار آگے سے ٹلتے نہیں

شجر جنگل ایسے تھے انبوہ سے ۔ کہ ان میں سے جانا ہو اندوہ سے
کہیں بید کے برگ، خنجر گزار ۔ کہیں پا نہ رکھنے دیں سرتیز خار
تنک دو درختوں کے اودھر ہوئے ۔ نیستاں پھرتے ہی پھرتے موئے
اگر بید آئے تو بن بید باف ۔ نہ آئے نظر دور تک راہ صاف
اگر بانس تھے واں تو تھے دشت دشت ۔ کہ دشوار تھا دو قدم کا بھی گشت
ہمیں چار نالے اترنے پڑے ۔ کنارے پہ دو دو گھڑی تھے کھڑے
رہا ہر قدم گرنے ہی کا خطر ۔ چلے دو قدم راہ پائی اگر
بہت لوگ دشت قلم کو گئے ۔ بہت اسپ و اشتر عدم کو گئے
لگے ہاتھ فیلان دشتی کی راہ ۔ ولے ڈر نہ ہو فیل کوئی سیاہ
نہ ہاتھی ملا کوئی بارے نہ شیر ۔ ہوئی خیر گو طے ہوئی راہ دیر
شجر سر کشیدہ بہت کیا کہوں ۔ جو دیکھوں تو پگڑی سنبھالے رہوں
چنار اُن درختوں کے تھے پائمال ۔ سفیدار رکھتے تھے حکم نہال
اگر کوئی دریاچہ آتا ہے بیچ ۔ تو لوگوں کے روندوں سے ہوتا ہے کیچ
تل کوہ رفعت نمودار ہو ۔ گیا آمد و شد میں ہموار ہو
کوئی گل زمین آئے ایسی نظر ۔ کہ عالم نے اودھر لگائی نظر
کہیں سبزۂ تر سے جی جا لگے ۔ کہیں سرسوں پھولے دلوں کو ٹھگے
نہ تھا پر گل زرد دامانِ کوہ ۔ یہی رنگ تھا تا گریبانِ کوہ
فضا دلکشا آب یکسر صفا ۔ شجر خوشنما نرم نرمک ہوا
چکارے بہت مارے کہسار میں ۔ دو رستہ بکا گوشت بازار میں
یہ انبوہ اشجار تا شش کروہ ۔ پھر آگے بیاباں وہ ہے اور کوہ
کناروں میں اُسکے کہیں کوئی کھیت ۔ دگر نہ یہی سنگ بے رتبہ ریت
نہ سبزہ کہیں تھا نہ آبِ رواں ۔ نہ دامن میں اُسکے چکارا دواں
دکھائی نہ دیتا تھا خوش قد نہال ۔ سیاہی پکڑتے تھے چشم غزال
وہی جنگلہ دو طرف بد نمود ۔ مقام اسطرح کے بھی ہیں یا دبود
نہ پھولی تھی سرسوں نہ کچھ تھی بہار ۔ نہ ظاہر میں اُسکے کہیں لالہ زار

ور اُس کا ہے باب ہجو و ہیراں — رہیں حکم کش اُسکے زور آوراں
سدا وہ رہے یوں ہی دشمن شکار — جہاں میں سخن ہے مرا یادگار
بہانے نہ کر میر اب شاخ شاخ — غزل کہہ زمیں گو کہ ہو سنگلاخ

غزل

نہیں خوں بستگی سے چشم تر بند — جراحت نے کیے ہیں چشم پر بند
گیا ہے وہ سو دل کھلتا نہیں ہے — پڑا ہے ایک مدت سے یہ گھر بند
کریں ہیں شوق گل خوں دل میں ناچار — اسیران شکستہ بال و پر بند
گئے دن ٹکٹکی کے باندھنے کے — اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند
بہت ہے یار کا کم بولنا بھی — نہیں چنداں ہم ان باتوں کے در بند
سبھوں سے آرسی کے مثل وا ہو — کسو کے منھ پہ دروازہ نہ کر بند
ہمارے ہاتھ خنجر سے کرو قطع — نہ کھلوایا کبھو اُسکا کمر بند
رُکے ہے یار آنکھیں ہی دکھا کر — ہم اُسکے اندنوں میں ہیں نظر بند
نہ خط آتا ہے اودھر سے نہ قاصد — لکھوں کیا مدتوں سے ہے خبر بند

غزل کا قافیہ تغیر کر میر
ہنر کچھ اس زمیں میں میر کر بند

جگر خوں کن ہیں خوبان حنا بند — دل ان کے دست رنگیں کا ہے پابند
گرہ بند قبا میں وے ہیں دیکھ — ہوا کیا آہ باغ دلکشا بند
رکھ آہ سرد ہی سے گرم جوشی — رُکے ہے دل جو ہوتی ہے ہوا بند
ہمیں سے کیا وہ جادوگر نہ بولے — کسو دشمن نے اُسکا منھ کیا بند
نہیں تھمتا ہے اب پلکوں سے رونا — بہت خاشاک سے دریا رہا بند
ہمیں منظور ہر صورت میں ہے دید — کھلی ہو چشم جوں آئینہ یا بند
نہیں کام آتی اتنی تیز گامی — سمند عمر ہوتا کاش جا بند
زبردستوں کی کشتی ہو گئی پاک — نکالا عشق زور آور نے کیا بند

یہی انداز باندھے ہیں یہی ناز
قیامت میر صاحب ہیں ادا بند

ہوا ہے یہی تو یہ ہوتی نہیں
کہ ہو خانۂ آکر سیہ یاں کہیں

جگہ کیا کہ پر زن ہو اس بن میں زاغ
یہ زہرہ نہیں رکھتے کوہی کلاغ

شتر مرغ سیمرغ از بس ہراس
نہیں آتے کوہ شمالی کے پاس

غزل کہہ کہ ہے میر لطف ہوا
بیاباں خوش آئندہ و خوش فضا

غزل

سبزہ ہے آبجو ہے فصل بہار بھی ہے
سرگرم جلوہ دیکھو پہلو میں یار بھی ہے

یہ تو نہیں کہ ہم پہ ہر دم ہے بیدماغی
آنکھیں دکھاتے ہیں تو چتون میں پیار بھی ہے

گل ہمکنار ہوگا ہنس کر کبھو چمن میں
پر کم بغل ہے بلبل اسکو قرار بھی ہے

ہوں وعدہ گاہ میں تو پر میں ہی جانتا ہوں
کچھ اضطراب بھی ہے کچھ انتظار بھی ہے

جوں موج ہم بغل ہوں نایاب اس گہر سے
دریا کی سیر بھی ہے بوس و کنار بھی ہے

ہم جبریوں سے کیا ہو بیدست و پا و عاجز
کہنے کو کہتے ہیں تو کچھ اختیار بھی ہے

کون اس بھبھو کے سا ہے دیکھو ٹک بھی تو
شمع و چراغ و شعلہ برق و شرار بھی ہے

جانا مسلم آیا اس خاکداں سے گو پھر
مشکل گزر ہے رستہ گرد و غبار بھی ہے

دل تنگ میر کیوں ہے ہمرہ و تدیرے کے تو
دریا فضا ہوا ہے سیر و شکار بھی ہے

اٹھا فوج میں سے یہ گرد و غبار
کہ منہ پر تھا خورشید آئینہ دار

فلک گھر سے تھا دھواں سا نمود
سماں شب کا رکھتا تھا ملک شہود

زمیں تھی سو تھی فرش بالائے آب
تحلحل سے مطلق نہ رکھتی تھی تاب

نہ پوچھو کہ لوگوں کا کیا حال تھا
جو رکھے قدم واں تو بھونچال تھا

روندے لگے چلنے تیزی سے چال
ہوا مذہب شیعیاں اعتزال

کسی ڈھب سے جوں توں کے چلنا ہوا
عجب جھلکے سے نکلنا ہوا

اُتر لوگ دریا سے آگے گئے
ہژبران خونخوار بھاگے گئے

پلنگان مردم دراییے ڈرے
کہ جاتے ہیں کوہوں کے چھوڑ کر درے

بیاباں میں مرنا کہاں سر دھریں
نہ لیں راہ برِّ عرب کیا کریں

غزل میر یاں کہہ اگر ہو دماغ
رُکے دل ہمارے بھی ہوں باغ باغ

کہیں جی اٹھی تھی زمیں بعد مرگ
نہال اسکے خوش قد بسیار برگ

نہ بستی سے صحرا تلک سبز تھے
نظر جائے جس جا تلک سبز تھے

ہوا دلکش و ہر طرف سبزہ زار
کہ سرسوں نے کی تھی قیامت بہار

کھڑے لوگ محو تماشا تھے واں
کہ کہنے لگی بلبل خوش زباں

کہ خاطر جنوں سے نہ رکھتے بجنت
خبر بھی ہے تم کو کہ آئی بسنت

یہ عہد جنوں ہے جنوں کیجیے
جگر کو غزل کہتے خوں کیجیے

غزل

بلبل کے بولنے سے آزار دل نے پایا
کیا کہہ گئی کہ ہم کو سنتے ہی غش سا آیا

نخچیر گہ میں اس کے جاتا نہیں ہے کوئی
ہم کو تو شوق مفرط واں کا لگا کے لایا

انواع رنج ہم نے کھینچے تھے عاشقی میں
پر ہجر کے الم نے جیکا بہت بنایا

صوفی صاف مشرب بیہوش و بیخود ہیں
مستی نے اس نگہ کی مجلس کے تئیں جھکایا

مہر و وفا و الفت کرتے تھے لوگ باہم
رحمت خدا کی تم نے اس رسم کو اٹھایا

سر مارے تو پری کو ایسی روش نہ آئے
کس ناز سے زمیں پر پڑتا ہے اس کا سایا

یہ جانتا تو ہرگز بازار میں نہ جاتا
یوسف عـ کے طور میں بھی سستا بہت بکایا

غیرت سے عاشقی کے جاتا نہیں ہوں میں تو
وہ خود بخود ہی آوے کاش اس طرف خدایا

معشوق تو ہے پردہ اوباش گجروش ہے
کیا کہیئے میر جی سے دل کو کہاں لگایا

کسو ایسے جنگل میں جانا ہوا
کہ مشکل قدم کا اٹھانا ہوا

نظر گرد لشکر پہ تھی دمبدم
نہ تھا واں کے غنیم کو کچھ اور غم

کوئی ارسلاں بھیجتا گر رسول
تو شاید کہ الحاح ہوتی قبول

سو وے خوں گرفتہ تو بھولے ہوئے
بہت اپنے زوروں پہ پھولے ہوئے

چلے ہر طرف اب جو آکر تفنگ
نہ اوقات صلح و نہ ہنگام جنگ

لگی آگ جنگل میں چارا گیا
بن آئی نہ کچھ مفت مارا گیا

ہوا چہرہ گولی تو جوں شیر سنگ
نہ شیری دلیری نہ چہرے پہ رنگ

لگی گولی پڑنے نہ پھر چل سکا
نہ جاگہ سے اکسا نہ ٹک ہل سکا

اس بیکسی سے کون جہاں میں موا کہ میں
جز داغ سینہ آج چراغ لحد نہیں

کیا سرو و گل سے ہووے تسلّی کہ اہل شوق
گل سو نہیں ہے یار کا سرو اسکا قد نہیں

بے سوز دل کنھوں نے کہا ریختہ تو کیا
گفتار خام پیش عزیزاں سند نہیں

سو بار مست کعبے میں پکڑے گئے ہیں ہم
رسوائی کے طریق سے کچھ نابلد نہیں

لطف سخن بھی پیری میں رہتا نہیں ہے میر
اب شعر ہم پڑھیں ہیں تو وہ شد و مد نہیں

کسو ایسے بن سے نکلنا ہوا
کہ کوسوں تلک اس میں چلنا ہوا

کشیدہ قد اس بن کے سارے درخت
چمن کے سے نوبادگاں سبز بخت

برابر برابر کھڑے سربسر
پھرے دیر اودھر کو جاکر نظر

پرے چل کہ آیا ترا کم بہت
حواس اس میں جاکر ہوئے گم بہت

کہیں راہ نکلی تو چلتے پڑے
رہے پال ویرتل بہت واں کھڑے

کہ شاخوں نے جھک جھک لیے تھے
بہت آگے جاجا کے آئے تھے پھر

وہی راہ دربیش دکثرت ہوئی
قیامت کے اوپر قیامت ہوئی

سروں پر اودھر توپ آئی چلی
پڑی تھی اودھر لوگوں میں کھلبلی

کہیں اسپ و اشتر کہیں فیل مست
زمیں ہر سر گام بالا و پست

گزر جس طرح اس طرح سے کیا
رونْدوں نے خون جگر ہی پیا

وہیں بیچ آیا میانا مرا
کوئی دیکھتا رنج اُٹھانا مرا

سواری سے مجکو ندامت ہوئی
کہ چاروں طرف سے ملامت ہوئی

لگے کہنے آیا فرنگی کہاں
کہ چوپائی کی رسم چھوڑے ہے یاں

جسے دیکھو چار اُن نے رکھ کر کہار
لگا ہونے ہر صبح اسپ سوار

چلو ہی چلو ہے کہ بیچ جائیو
کہ چوپایے کے پاس تم آئیو

رونْدے اودھر کے ادھر ہیں خراب
یہ جاتے ہیں مجرے کو کھا کے شتاب

چڑھے چار کے کاندھے جیتے ہی جی
لیا اٹکل اس سودے میں نفع بھی

کہ گھوڑے دیے چھوڑ یکبارگی
سپاتوں میں کرتے ہیں آوارگی

نہ اس حال سے اہل دفتر خبر
توجہ نہ عمدوں کی کچھ ہے ادھر

چوپائے

کیا ایک نالے سے ہم نے گزر — ہوئی قائم اس جا پہ حشر دگر
گرے گاڑی چھکڑے پیادے سوار — کہ مقصد تھا سب کا عبور ایک بار
گزارا جو فیلوں کا پہلا ہوا — ملا خاک میں آب چہلا ہوا
کمر تک لگے پھنسنے دلدل کے بیچ — کہ نالے کا پانی تھا یکدست کیچ
پھنسے گاؤ اشتر گرے بار خر — ہوئے اسپ و اشتر بھی زیر و زبر
اگرچند باندھے تھے وہ جسر خام — ہوئے ایک ریلے میں دونوں تمام
نہ دیکھے تھے آگے کبھو یہ سمیں — ولیکن خدا نے اتارا ہمیں
سلامت رہا اپنا اسباب سب — رہے لوگ لشکر کے کرتے عجب
چلے واں سے آگے بہت ڈیلا ملا — کیا اُن نے ایک ایک کو وہ ولا
عجب راہ پر خوف مشکل گزار — نہ ہوتے تھے معلوم ہاتھی سوار
خطر شیر کا شور بنگاہ کا — تعب واں کے جانے کا غم راہ کا
کہ جائے زمیں کچھ ہویدا نہ تھی — کہیں اس میں پگڈنڈی پیدا نہ تھی
گڑھے غار پاؤں کے لغزش بلا — چلی باؤ تو تنے کی لرزش بلا
صدا برگ نے کی نہایت مہیب — طریق عجیب و مسافر غریب
جنوں پیشہ وہ دشت وحشت شعار — کہ فیل اُس کے طفلان بازی مدار
کہیں پانی آیا سو حالت خراب — کہ تھا زیر کاہ اس میں ہر جائے آب
نہ ہاتھی نہ اسباب اپنے کنے — یہی اک میانہ بنے سو بنے
چنانچہ گئے راوتی کے کنار — نہ ربط آشنائی کسو سے نہ پیار
کھڑے ہم رہے ہاتھ پر رکھکے ہاتھ — کریں پار جانے کی کس منھ سے بات
کہار اک میانے میں اپنے دیئے — پھر اُسکے جو تھے چاروں ہمنے لیے
چڑھے اُن کے سر آنروئے دریا ہوئے — ہوئے پانی پانی کہ رسوا ہوئے
نہ جانا کہ آتا ہے کس کا قدم — کہ صید بیاباں گئے کر کے رم
گوزن ایک دو مار لائے کبھو — اُڑے باز جرّے کہیں ایک سو

نہ صید ایک دیکھا بھرے لاکھ رنگ
غزل میر نے بھی کہی اور ڈھنگ

کہی اور ہی بحر میں یہ غزل
مگر میر کو ہے دماغی خلل

غزل

کر لطف عارض مت چھپا عاشق سے اے یار اس قدر
یک جان کو یہ عارضے یک دل کو افکار اس قدر

جو کچھ ہے سو دل کے سبب غم غصّہ و رنج و تعب
تھے چاہنے سے پیشتر کاہے کو بیمار اس قدر

ہر دم جو اس کے ابرواں جنبش میں ہیں کانپے ہے جاں
یعنی ہیں آنکھیں جھپتیاں چلتی ہے تلوار اس قدر

شب نالہ و زاری رہے دن خستگی خواری رہے
وہ دل نہیں باقی رہا کھینچے جو آزار اس قدر

دے دل زدے ہیں خستہ جاں مرجاتے ہیں جو ناگہاں
ورنہ قضا کس شخص کی پہونچی ہے یکبار اس قدر

طُرے سے طراری کرے مستی میں ہشیاری کرے
آیا نظر اب تک نہیں طرار و عیّار اس قدر

اُلفت کہاں کلفت ہے یاں یہ بھی عجب صحبت ہے میاں
بیزار وہ اس مرتبہ جس سے ہمیں پیار اس قدر

تم آگے کب تھے بدگماں سب حجت و یکسر زباں
اب اک سخن پر مہرباں کرتے ہو تکرار اس قدر

آنکھیں کھلی ہیں میر کی جب دیکھو تب آئینہ ساں
آدم نہیں ہوتے کہیں مشتاق دیدار اس قدر

بہا سنگ ریزوں پہ اس رنگ آب	کہ قدر اُن کی جوں قدر یاقوت ناب
لیے عمدے ہاتھوں میں دیکھیں بہار	کہ ہر شئے کا ہے وقت لیل و نہار
اسی آب کا راہی یاں ہے نام	نہیں ساتھ اسکے ہے ربط تمام
کنارے کنارے اسی کے ہے راہ	چلے جاتے ہیں جو نہ ہووے پناہ

جھمکی کچھ کہ جی میں چبھی سبھی ہلی ٹک کہ دل میں کھبی سبھی
یہ جو لاگ پلکوں میں اُسکے ہے نہ چھری میں ہے نہ کٹار میں

مرے ایک دل میں جو غم یہ ہے سو قرون ہے میرے شمار سے
نہ تو دس میں ہے نہ پچاس میں نہ تو سو میں ہے نہ ہزار میں

بڑے جانور خوار کیا کیا ہوئے ‏ ‏ پتند تھے پائے فیلاں سے رسوا ہوئے
بہت نالے کھولے پچھالے گئے ‏ ‏ بحیروں سے رو ہو نکالے گئے
لگر کی پس از مرگ عزت ہوئی ‏ ‏ کہ ہاتھی پہ چڑھنے کی رخصت ہوئی
کشف کا ہوا ہے یہ اوصاف اب ‏ ‏ کہ جھینگوں سنے کی شرح کشاف اب
نہ تیتر بٹیر اور کبوتر ملا ‏ ‏ دیے باز جرّوں کو سارے کھلا
کہیں بحری پانی میں یوں جا لگے ‏ ‏ کہ پنجوں میں بے صید ادھر آ لگے
ہوا میں سے یوں گر آتا رہے کلنگ ‏ ‏ کہ بازوں نے چڑیا سے مارے کلنگ
کسو اور ارنوں کو دیکھا کھڑے ‏ ‏ کبھے تو بیاباں میں ہاتھی پڑے
جگر کر کے جاتے تھے مردان کار ‏ ‏ تو وہ ایک دو کر ہی لاتے شکار
وگرنہ بشر کا نہ مقدور تھا ‏ ‏ قریب اسکے جانا بہت دور تھا
نہ ان چار شانوں کا روکش ہے شیر ‏ ‏ نہ سو فیل دو چار رکھتے ہیں گھیر
مددگار تھے حضرت زندہ فیل ‏ ‏ پکڑ لاتے تھے لوگ تب زندہ فیل
بحیرہ نہ دریائے اعظم سے کم ‏ ‏ اکٹھا کرتے تھے لچّے لطیے بہم
ہر اک موج اس کی سمندر کی لہر ‏ ‏ کنارے پہ گرداب غرقاب قہر
یہی جنگل اُس جھیل کے آس پاس ‏ ‏ درختوں کا انبوہ نے کا اگاس
اسی بن میں شیر اور یوز و پلنگ ‏ ‏ اسی بن میں گور و گوزن اور رنگ
اسی بن میں ہاتھی وہیں کرگدن ‏ ‏ وہیں قورچ سرزن اسی میں ہرن
اسی بن میں لنگور بندر بھی تھے ‏ ‏ وہیں ایک دو ہم قلندر بھی تھے
اسی بن میں باڑھا دہیں نیل گاؤ ‏ ‏ اسی بن میں یہ صید بندی کا چاؤ
اسی بن میں تھے حضرت بوحمید ‏ ‏ اسی بن میں نسناسی اُن کے مرید
اسی بن میں تھے خوک جاموش رنگ ‏ ‏ کیا اس سور بن نے لوگوں کو تنگ

نواڑوں کی سیر اس میں ہر شام گہ
وہی سیر گاہ وہ وہی دوام گہ

وہیں صید ہوں مرغ و ماہی تمام
مقام ایسے ہوویں تو کریے مقام

ہوا خیمہ آ کر جو نواب کا
فلک سائے تھا فرق اس آب کا

ہوا ہوتا واں کاش وہ آب زر
ہوئے جیسے شایستۂ سیر نہر

عجب ڈھب سے کی روشنی صد عجب
کہ دیں چھوڑنا دیں دیے بھر کے سب

جدا ہوویں تو غنچہ غنچہ چراغ
ملے جیسے عاشق کی چھاتی کے داغ

ورے روشنی شعلہ انگیز نار
پرے سطح پانی کا آئینہ وار

ہوئیں کشتیاں کچھ ورے سے پرے
چراغوں سے موجوں کے کوچے بھرے

حبابوں میں تھی جو چراغوں کی تاب
حبابی تھا آئینہ سب سطح آب

نمودار چرخ پر انجم تھی شب
دلوں سے وہ پھیلاؤ پانی کا سب

غرض روشنی کی عجب کچھ تھی لاگ
لگا دی ہے گویا کہ پانی میں آگ

غزل میر کوئی کہا چاہیے
کسو تو زمیں پر رہا چاہیے

غزل

کب آوے گا کیا جانے وہ سرو قامت
ہمارے تو سر پر ابھی ہے قیامت

نماز سفر ہے اشارت اسی سے
کہ تھوڑا بہت یاں ہے وقت اقامت

رہا رابطہ غارت دل تلک بس
نہیں اب تو بندے سے صاحب سلامت

گریباں کو گل چاک کرنے لگیں گے
کھلے رکھ گلستاں میں بند قبا مت

اٹھا کر نہ یک زخم شمشیر اس کا
غزالِ حرم نے اٹھائی ملامت

بگڑتی ہے صورت علاقے سے دل کے
کسو بے وفا سے دل اپنا لگا مت

کوئی فصل گل میں بھی توبہ کرے ہے
رہے گی ہمیں دیر اس کی ندامت

کہیں دل کی لاگیں لگی چھپتیاں ہیں
کہ چہرے کی زردی بڑی ہے علامت

گئی سو گئی پیشتر تھی جوانی
رہِ عشق میں میر آئندہ جا مت

زمانے میں ہے رسم کہنے کی کچھ
امید اس سے ہے نام رہنے کی کچھ

کبھو سر دل پر ہے تیغ نالہ کبھو سناں فغاں جگر پر
کسو سے کہنے کا کچھ بھی حاصل گئے ہیں جوں توں کے وقت بارے

بھری تھی آتش کہاں کی یارب دل و جگر میں کہ نصف شب کو
لگا جو رونے تو جائے آنسو مری مژہ سے گرے شرارے

قبول عشق و محبت اتنا ہوا ہے اسے **میر** سیر قاتل
مدام جاتے دکھائی دوں ہوں کبھو نہ اُن نے کہا کہ آرہے

رباعی

چلنے کو ہوئے بادیے سے ہم جو کڑے
دل چلنے کے اتفاق بہتیرے پڑے
مجنوں نے کہا تھا میں بھی آتا ہوں میر
آیا نہ رہے راہ میں ہم دیر کھڑے

آئی ہے بہار وہر خیاباں | ہے لطف ہوا سے گل بداماں
آئی ہے بہار زہد کیشاں | ہے توبۂ بادہ دل پریشاں
آئی ہے بہار مرغ گلزار | کرتا ہے نوائے سینہ افگار
لایا ہے بزور اس کا نالہ | مجھ کو بھی برائے سیر لالہ
ساقی جو کروں میں بے ادائی | معذور رکھ اب بہار آئی
گل باد صبا کے تا کمر ہے | دامان بلند ابر تر ہے
غنچہ کی گلابیاں بھری ہیں | تکلیف کی منتظر دھری ہیں
ظالم مئے ناب دے ہوا ہے | اک جرعہ شراب دے ہوا ہے
ہر سر میں ہے شور فصل دے کا | چھلکے ہے ہوا سے رنگ مے کا
اطراف چمن کھلا ہے لالہ | ہر پھول شراب کا ہے پیالہ
آتا ہے چمن پہ ابر جوشاں | آب رخ کار سبز پوشاں
تحریک نسیم دمبدم ہے | تکلیف ہوائے گل ستم ہے
ابروں نے بھی کی ہے مے پرستی | اٹھتے ہیں بصد سیاہ مستی
بوندوں کا جو لگ رہا ہے جھمکا | رنگ گل و لالہ زور چمکا
ہے گل کی ہوا سبو کشی میں | بلبل کا دماغ بو کشی میں
ہر شاخ ہے شوخ جام در دست | نرگس ہے کسو کی نرگس مست
ہے رنگ ہوا کا آفتابی | جھومیں ہیں نہال جوں شرابی
ہے سرو جوان نشہ در سر | لوٹے ہے روش پہ سبزۂ تر
چشمک کرے ہے حباب جو کا | یعنی کہ ہے دور اب سبو کا

ساقی قدحے کہ ذوق مل ہے
مطرب غزلے کہ فصل گل ہے

غزل

شب وہ جو پیے شراب نکلا | جانا یہ کہ آفتاب نکلا
قربان پیالہ سے مئے ناب | جس سے کہ ترا حجاب نکلا
تجھ بن جو پیا تھا قطرہ مے کا | آنکھوں سے ہو خون ناب نکلا

اب دل میں مرے بھی جوش آیا — اب وقت وداع ہوش آیا

کھینچوں میں کہاں تلک دمِ سرد — ساقی وہ شراب شعلہ پرورد

وہ داروئے دردِ بے حضوراں — وہ مایۂ نورِ چشمِ کوراں

سرمایۂ عمرِ جاودانی — یعنی ہے وہ آبِ زندگانی

وہ میوۂ خوش رسیدہ بارے — وہ عیشِ دلِ گزیدہ بارے

آئینۂ حسنِ خود پسنداں — زینت دہِ عنبریں کمنداں

وہ رنگِ رخِ بہار یعنی — وہ بادۂ خوشگوار یعنی

یاقوت گداز دادۂ عشق — یعنی وہ ہے جامِ بادۂ عشق

وہ لطفِ ہوا وہ سیرِ مہتاب — وہ شعلۂ غوطہ خوردہ در آب

وہ کام دلِ سبو بدوشاں — یعنی کہ وہ ہے شراب جوشاں

وہ موجبِ دل خوشی کہاں ہے — وہ داروئے بے ہشی کہاں ہے

وہ جس کی طرف کو ہے تہِ دل — یعنی وہ ہے ماہِ شیشہ منزل

وہ آتشِ تیز آب آمیز — وہ عربدہ جو وہ فتنہ انگیز

وہ مقصدِ جانِ ناامیداں — وہ روسیہیِ رو سفیداں

وہ رونقِ کارگاہِ شیشہ — وہ شوکتِ بارگاہِ شیشہ

وہ جس سے ہے توبہ مو پریشاں — وہ جس سے ہو گفتگو پریشاں

وہ دامنِ خشک جس سے جل جائے — ثابت قدموں کا پاؤں چل جائے

وہ سرخیِ چشمِ خوب رویاں — اسبابِ خرابیِ نکویاں

وہ دلبرِ خود سر و شر آئیں — وہ رہزنِ راہِ دین و آئیں

وہ جس سے غبارِ دل سے دھوؤں — مینا کے گلے سے لگ کے روؤں

مستی کی مجھے بھی خواہشیں ہیں — اس عقل سے دل کو کاہشیں ہیں

لا اُس کو جو آستین جھاڑوں — پھر ہاتھ چلے تو جیب پھاڑوں

بیہوش شرابِ ناب رہیئے — یوں تا بہ کجا کباب رہیئے

ہے مستی بیخودی ضروری — کھل جائے مقامِ بے شعوری

دل غم سے بھرا ہے زور میرا — تا عرش گیا ہے شور میرا

ہے دل میں کہ گل کی اور رو ہو — شیشہ ہو بغل میں اور تو ہو
ہر گام پہ لغزش قدم ہو — تکلیف شراب دمبدم ہو
جب سجدہ کناں ہوں صبح خیزاں — جب کاکل صبح ہو پریشاں
جب نکلے ستارۂ سحر گہ — کر نعرۂ الصبوح یک رہ
بے ذوق شراب صبح گاہی — بے لطف نہیں ہے روسیاہی
جب ہووے نشہ ترنگ آئے — مستی مجھے باغ میں لٹا دے
شیشہ مرے منہ کو تو لگائے — کر ایسی نگاہ جو چھکا دے
جب بیخودی تمام آوے — سر پر مرے ہوش رو کے جائے
رخصت ہے تجھے کہ میں نہ ہونگا — بیہوش و خرد ہی پھر رہوں گا
بیٹھا تو کروں گا شکر تیرا — ہو ورنہ قبول عذر میرا

مقولہ شاعر

کیا میر شراب تو نے پی ہے — بیہودہ یہ گفتگو جو کی ہے
یا آپ سیہ ترے قلم نے — یہ تجھسے عجب کیا ہے ہم نے
تو کا ہے کو اتنا ہرزہ گو تھا — تب دور گرد شراب تو تھا
بس مے سے زبان اب نہ تر کر — مستی سخن پہ ٹک نظر کر

لب تشنۂ سامعہ رہو ہا
پھر حرف نہ جانے گا سنبھالا

مثنویاتِ جذباتِ عشق

میر تقی میر دہلوی

محبّت سے آتا ہے جو کچھ کہو
محبّت سے ہو جو وہ ہرگز نہ ہو

محبّت سے پروانہ آتش بجاں
محبّت سے بلبل ہے گرمِ فغاں

اسی آگ سے شمع کو ہے گداز
اسی کے لیے گل ہے سرگرمِ ناز

محبّت ہی ہے تحت سے تا بفوق
زمین آسماں سب ہیں لبریزِ شوق

محبّت سے یاروں کے ہیں رنگ زرد
دلوں میں محبّت سے اُٹھتے ہیں درد

گیا قیس ناشاد اس عشق میں
کھپی جان فرہاد اس عشق میں

ہوئی اس سے شیریں کی حالت تباہ
کیا اس سے لیلیٰ نے خیمہ سیاہ

سنا ہوگا وامق پہ جو کچھ ہوا
نل اس عشق میں کسطرح سے موا

جو عذرا پہ گزرا سو مشہور ہے
دمن کا بھی احوال مذکور ہے

ستم اس بلا کے ہی سہتے گئے
سب اس عشق کو عشق کہتے گئے

اس آتش سے گرمی ہے خورشید میں
یہی ذرے کی جان نومید میں

اسی سے دل ماہ ہے داغدار
کتاں کا جگر ہے سراسر فگار

نئے اسکے چرچے حکایت سُنی
گہے شکر گاہے شکایت سُنی

اسی سے قیامت ہے ہر چار اور
اسی فتنہ گر کا ہے عالم میں شور

کوئی شہر ایسا نہ دیکھا کہ واں
نہ ہو اُس سے آشوبِ محشر عیاں

کب اس عشق نے تازہ کاری نہ کی
کہاں خون سے غازہ کاری نہ کی

زمانے میں ایسا نہیں تازہ کار
غرض ہے یہ اعجوبۂ روزگار

آغازِ قصّہ

عجب کام پٹنے میں اس سے ہوا
عجب اہلِ عالم کو جس سے ہوا

کہ واں اک جواں تھا پرسرام نام
خوش اندام و خوش قامت و خوش خرام

جوانی کے گلشن کا وہ آب و رنگ
گلستاں پہ کام اسکی خوبی سے تنگ

جدھر نکلے رنگیں ادائی کے ساتھ
چلے جائیں جی خوش نمائی کے ساتھ

کھلے بال چلتا تھا وہ سروِ ناز
قدمبوس کو آتی عمرِ دراز

جدھر کو وہ ٹک گرمِ رفتار ہو
قیامت اُدھر سے نمودار ہو

نگہ گرم اُس کی جدھر جا لڑی
کہے تو کہ اودھر کو بجلی پڑی

وے کافر جو ہیں ہندوئے جہاں — کریں سجدہ اس جا پہ اسلامیاں
نگہ تیغ مجروح جس کے پڑے — پلک سیل جوں دل میں جاکر گڑے
سیہ چشم اُسکے وہ بدمست سے — نگاہوں سے شمشیر در دست تھے
رُخ اُسکا کہاں اور مہ و خور کہاں — تفاوت زمین آسماں کا ہے یاں
وہ لب لعل کو جن سے شرمندگی — دم حرف سرمایۂ زندگی
دہن کی جو تنگی نظر کیجیے — تو آگے سخن مختصر کیجیے
نہ ہم تم زنخ دیکھ حیراں رہیں — کبھی دست زیر زنخداں رہیں
سراپا ہیں اُس کے جہاں دیکھیے — وہیں وہ ہے مقصود جاں دیکھیے
خراماں نکلتا وہ جس راہ سے — قیامت تھی واں ناز و ادا سے
فدا اُس پہ جی جان ہر ایک کا — کہ مقصود وہ تھا بد و نیک کا
کئی گرد و پیش اُسکے وارفتگاں — کئی ایدھر اودھر جگر تفتگاں
بہت رفتگان ادائے کلام — بہت مبتلائے ادائے خرام
کوئی کشتۂ شوق رفتار کا — کوئی نیم جاں ذوق دیدار کا
کوئی والۂ خندۂ برق وش — کسو کے تئیں جنبش لب سے غش
کسو کی نظر میں نگہ کی چمک — کسو کے جگر میں پلک کی کسک
کئی حیرتی طرز گفتار کے — کئی آرزوکش نگہ کار کے
کوئی زلف سے اُسکی مجنوں رہے — کسو کا تبسم سے دل خوں رہے
کوئی دل ستم کشتۂ یک نگاہ — کوئی جاں بہ آنکھوں پہ موقوف آہ
کسو پر فسون گردش چشم کا — کسو پر غضب غمزہ و خشم کا
کوئی دست بر دل کوئی بے قرار — کوئی بے خبر کوئی بے اختیار
انھوں میں سے اک عاشق زار تھا — اُسی وقت کو جس سے سروکار تھا
محبت میں تھا جذب کامل اُسے — مراد دل اپنی تھی حاصل اُسے
شب و روز ہم بستر کام دل — ہمیشہ ہم آغوش آرام دل
دم اُسکے میں جاں تک تاثیر تھی — محبت اس آتش سے درگیر تھی
بہم رہتے جیسے بہم [illegible] — [illegible] نہ کم اختلاط

مرو کوئی غم سے کوئی ہو ہلاک
وہ شعلہ اُسی خس سے رکھتا تپاک

کہاں حسن میں تھا وفا کا یہ پاس
یہ سُنیے کہ ہے گا خلافِ قیاس

بہت سے بہت اُسکا مالوف تھا
اُسی کی تسلّی سے مصروف تھا

کہ ناگہ وہ دلبر ہوا کدخدا
رہا اپنے عاشق سے چندے جُدا

زن و شو سے اخلاص باہم ہوا
اُس آشفتہ سے رابطہ کم ہوا

نگاہیں بہم دل میں کاوش کریں
سخن سے وفائیں تراوش کریں

ہوا ربط چسپاں بہم اس قدر
کہ دشوار اُٹھے ہمدگر سے نظر

رہیں دونوں دست و بغل روز و شب
کبھو مُنھ بہ مُنھ ہو کبھو لب بہ لب

وفا نے جو تکلیف کی ایک روز
گیا اپنے عاشق کے وہ دل فروز

کئی دن میں جا کر جو اس سے ملا
کیا اُس نے حد سے زیادہ گلا

کہ اے نازنیں آہ کن نے کہا
کہ تو حال سے میرے غافل رہا

مگر سدّ رہ تھا کسو کا فریب
ملا کوئی تجھ سے بھی دشمن شکیب

کوئی زلف زنجیرِ پا ہوگئی
کہ مسدود راہِ وفا ہوگئی

طرح کس کی چتون کی دل میں کھبی
جگر میں پلک شوخ کس کی چبھی

کسو چشم نے تجھ کو جادو کیا
مرے جامِ عشرت کو لوہو کیا

کہا اُن نے تھی کدخدائی مری
نہ تھی بے سبب یہ جدائی مری

رکھ اب مجھ کو معذور ناچار ہوں
محبت کا میں تو گرفتار ہوں

نہ فرصت مجھے صبح ہے اب نہ شام
طرف اُس کے ہے دل کو میل تمام

اُسے بھی مرے ساتھ اخلاص ہے
دلوں کو بہم رابطہ خاص ہے

اُسے مجھ سے ہے نسبت عاشقی
وہ رہتی ہے بے طاقتِ عاشقی

نہیں اُس کو یک لحظہ تابِ فراق
جُدائی مری اُس پہ گزرے ہے شاق

نکلتا ہوں گھر سے جو میں ایک آن
تو پاتا ہوں جا کر اُسے نیم جان

نہ دیکھے جو مجھ کو تو مر جاوے وہ
وہیں جی سے اپنے گزر جاوے وہ

جو پہونچے مری چھونٹھ اُسے بدخبر
تو کر بیٹھے بیچ اپنے جی کا ضرر

غرض اُس کو تاب و تحمل نہیں
شکیبائی ہجر بالکل نہیں

موئی غم میں اس جملہ تن نازکے
وہ آیا جو تھا دل پریشاں گیا
خبر لے گیا اُس کنے زود تر
کہ وہ رشکِ مہ امتحاں دے گئی
مو اسن پر سرام کے تئیں موئی
اگرچہ نہ کچھ اُن نے مُنھ سے کہا
یہ سُن کر وہ نافہم حیراں ہوا
گیا ہوش سُنکر پرسرام کا
اُٹھا بیخود و بےخرد بےحواس
لگا کہنے اے مایۂ زندگی
کیا جلد رختِ سفر تو نے بار
نہ میری سُنی کچھ نہ اپنی کہی
زمیں پر سے آخر اُٹھایا اُسے
جب آنکھ اُسکے پیکر پہ سب چھا گئی
یہ سرگرمِ فریاد و زاری ہوا
جگر غم میں یک لخت خوں ہوگیا
گئے ہوش و صبر اسکے اکبارگی
سراسیمگی سے بگولا ہوا
نہ جی کو تسلی نہ دل کو قرار
کبھو یاد کر اُس کو نالاں رہے
کبھو یاں کبھو واں بحالِ خراب
رہے گھر تو آشوبگہ وہ گلی
کبھو متصل ہو نٹھ پر آہ سرد
ہوئی رفتہ رفتہ جو وحشت زیادہ
سمجھ اپنے بد و نیک کی سُدھ نہیں

گئی جان ہمرہ سخن ساز کے
کہ اس واقعے سے پشیماں گیا
جو تھا درپئے امتحاں بےخبر
محبّت کے ناموس کو لے گئی
مرے اک سخن میں قیامت ہوئی
دیا جی و لے جی اسی میں رہا
خجالت سے سر در گریباں ہوا
دوانہ ہوا عشق کے کام کا
گرا آکے اس پیکرِ مردہ پاس
مجھے مُنھ سے تیرے ہے شرمندگی
نہ میرا کیا آہ تک انتظار
مرے تیرے دونوں کے جی میں رہی
لب آب جاکر جلایا اُسے
محبّت عجب داغ دکھلا گئی
لہو اُس کی آنکھوں سے جاری ہوا
رُکا دل کہ آخر جنوں ہوگیا
طبیعت میں آئی اک آوارگی
پھرے اسطرح جیسے بھولا ہوا
کفِ غم میں سر رشتۂ اختیار
کبھو ٹک جو بھولے تو حیراں رہے
وہی بیقراری وہی اضطراب
چمن میں جو لیجائیں تو بےکلی
کبھو دست بر دل کہ دل میں ہے درد
لگا بھاگنے سب سے وہ نامراد
نکل جائے تنہا کہیں کا کہیں

نہ ہوتے جو دلگیریاں متصل
کہاں عقل کی اُن نے باتیں جو واں
لگا کہنے یہ آرزو تھی مجھے
سو یہ دن خدا نے دکھایا مجھے
ندامت سے ہوں تنگ شاہد ہیں سب
نہ خجلت سے رو ہے جو کچھ میں کہوں
نہ تقدیر کا میں نے سمجھا فریب
ہوا اک سخن میں مرے یہ غضب
کروں گا زمانہ میں جب تک معاش
مقرر کیا ہے کئی دن سے یہ
جو اس میں ہے خوش تو ہوں میں بھی ساتھ
دل پر کو خالی کریں گے بہم
ہوئے عاقبت سوئے دریا رواں
کہ اک آگ سلگی ہے واں یک کنار
کسو اشتعال کی ہے منتظر
ہوئے ناؤ پر شام گہہ جب سوار
جہاں قفل ہو راہ دریا تو واں
سے سات لو تو بڑی بات ہے
لیا آخر الامر ہمرہ اُسے
تنک دور چل کر کیا یہ سوال
کہاں شعلۂ سرکش آتا ہے یاں
کہاں لے ہے دریا یہ اکدم قرار
ٹھہرتا ہے کس جا وہ آتش فگن
یہ صیاد سے تھا ہی محو سراغ
کہ ہو کر فروغ اک سوئے آسماں

نہ ہوتی یہ آتش کبھو مشتعل
وہ عاشق جو تھا درپئے امتحاں
کہ اک روز ہشیار دیکھوں تجھے
سخن تیرے مُنھ کا سُنایا تجھے
گرفتار ہوں میں بحالِ عجب
نہ قدرت اجل پر کہ مر بھی رہوں
نہ جانا کہ اتنی ہے وہ ناشکیب
خرابی کا تیری ہوا میں سبب
رہوں گا اسی درد سے دلخراش
کہ آئندہ رہیئے تری خاک رہ
رہینگے لب آب ہی آج رات
پھرینگے ترے ساتھ خوش کوئی دم
نہ پیدا کسو پر یہ راز نہاں
محبت کمیں میں ہے سرگرم کار
جہاں سر کو کھینچا قیامت ہے پھر
کہا اُن نے یارِ عشق ہے بدبلا
کفایت سے ہے اُلٹے ہیں اس عشق نے
کہ دریا میں پھر اُن تند آتش نے شہر
بٹھایا قریب
مجھے ہے تم
کدھر پیچ
کدھر منف
طرف کو
جگر الا
مرط

گئے مضطرب حال سارے رواں
تڑپتا تھا وہ شعلہ آکر جہاں

تلاش اُسکی کی اور لے لے کے نام
پکارے بہت پر کہاں پر سرام

محبت نے ایسا کھپایا اُسے
کہ ہرگز کنھوں نے نہ پایا اُسے

یقینی ہوا یہ کہ وہ تیز آگ
اُسی نیم کشتہ سے رکھتی تھی لاگ

لپٹ اُسکو شعلہ ہی وہ لے گیا
عجب طور کا داغ یہ دے گیا

پھرے خوار ہو ہو کے ناچار سب
کسی کو تحیر کسی کو عجب

کوئی منفعل ساتھ آنے سے تھا
کوئی بر لب آب جانے سے تھا

خصوصاً وہ عاشق ہوا پر خجل
ندامت ہوئی یہ جیسے متصل

نہ تھا اگلی خجلت ہی سے روے حرف
ہوا دوسرا ماجرائے شگرف

تفکر کے دریا میں ڈوبا ہوا
کنارے پہ بیٹھا تھا روتا ہوا

کہ پوچھیں گے جو اُسکے واماندگاں
تو یہ واقعہ کیا کروں گا بیاں

کہوں کیونکہ یکبار وہ جل گیا
کفِ خاک ہو خاک میں مل گیا

کھنچی جرم کو بے گناہی مری
ہوئی شہر میں روسیاہی مری

وہ شعلہ جلاتا مجھے کاشکے
لیے ساتھ جاتا مجھے کاشکے

مقولۂ شاعر

اگرہے یہ قصّہ بھی حیرت فزا
ولے **میر** یہ عشق ہے بد بلا

بہت جی جلائے ہیں اس عشق نے
بہت گھر لٹائے ہیں اس عشق نے

فسانوں سے اسکے لبالب ہے دہر
جلائے ہیں اس تند آتش نے شہر

محبت نہ ہو کاش مخلوق کو
نہ چھوڑے یہ عاشق نہ معشوق کو

الخ

ایک عالم میں دردمندی کی
ایک محفل میں جا سپندی کی

ایک دل سے اٹھے ہے ہو کر دود
ایک لب پر سخن ہے خون آلود

اک زمانے میں دل کی خواہش تھا
اک سمیں میں جگر کی کاہش تھا

کہیں بیٹھے ہے جی میں ہو کر چاہ
کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ

خار خارِ دلِ غریباں ہے
انتظارِ بلا نصیباں ہے

کہیں شیون ہے اہلِ ماتم کا
کہیں نوحہ ہے جان پر غم کا

آرزو تھا امیدواروں کی
دردمندی جگر فگاروں کی

نمک زخم سینہ ریشاں ہے
نگہ یاس مہر کیشاں ہے

حسرت آلودہ آہ تھا یہ کہیں
شوق کی یک نگاہ تھا یہ کہیں

کشش اس کی ہے ایک اعجوبہ
ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا

کون محروم وصل یاں سے گیا
کہ نہ یار اس کا پھر جہاں سے گیا

کام میں اپنے عشق پکا ہے
ہاں یہ نیرنگ ساز یکا ہے

جسکو ہو اس کی التفات نصیب
ہے وہ مہمانِ چند روزہ غریب

ایسی تقریب ڈھونڈھ لاتا ہے
کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے

آغاز قصۂ جانگداز

ایک جا اک جوان رعنا تھا
لالہ رخسار و سرو بالا تھا

عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم
دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم

شوق تھا اسکو صورتِ خوش سے
انس رکھتا تھا وضع دلکش سے

تھا طرحدار آپ بھی لیکن
رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن

کوئی ترکیب اگر نظر آتی
صورتِ حال اور ہو جاتی

دیکھتا گر وہ کوئی خوش پرکار
رہتا خمیازہ کش ہی لیل و نہار

زلف ہوتی کسو کی گر برہم
دیکھتے اس کے حال کو درہم

دیکھتا گر کہیں وہ چشم سیاہ
دل سے بے اختیار کرتا آہ

سر میں تھا شور شوق دل میں تھا
عشق ہی اسکے آب و گل میں تھا

الغرض وہ جوانِ خوش اسلوب
ناشکیبا رہے تھا بے محبوب

ایک دن بے کلی سے گھبرایا
سیر کرنے کو باغ میں آیا

کسو گل پاس وہ صنم ٹھہرا
کہیں سبزے میں ایک دم ٹھہرا

اک خیاباں میں سے ہو نکلا
ایک سائے تلے سے رو نکلا

نہ تسلی ہوا دل بیتاب
نہ تھما چشم تر سے خون ناب

دل کی وا شد سے بے توقع ہو
ہر شجر کے تلے بہت سا رو

دیکھ گلشن کو ناامیدانہ
منھ کیا اُن نے جانب خانہ

دل کے مرجھانے کا اُسکو اک غم تھا
راہ چلنے میں خیال درہم تھا

ناگہ اُس کوچہ سے گزار ہوا
آفت تازہ سے دوچار ہوا

ایک غرفے سے ایک مہ پارہ
تھی غرض اُسکے گرم نظارہ

پڑ گئی اُس پہ اک نظر اُس کی
پھر نہ آئی اُسے خبر کس کی

تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی
وہ نظر ہی وداع طاقت تھی

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ
صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

بیقراری نے کج ادائی کی
تاب و طاقت نے بے وفائی کی

منھ جو اُس کا طرف سے اسکے پھرا
مضطرب ہو کے خاک پر یہ گرا

وہ تو رکھتی نہ تھی خیال اُسکا
بیطرح ہو رہے گو کہ حال اُس کا

جھاڑ دامن کے تئیں وہ مہ پارہ
اُٹھ گئی سامنے سے یکبارہ

وہ گئی اُس کے سر ہو آئی
خاک میں مل گئی وہ رعنائی

دل پہ کرنے لگا جپید ناز
رنگ چہرے سے کر چلا پرواز

ہاتھ جانے لگا گریباں تک
خاک کے چھیپے بونوں داماں تک

صبح نے اک جنوں کیا پیدا
شام نے رنگ خوں کیا پیدا

سوزش دل سے جل بجھی جی کی
داغ نے آ جگر کو آتش دی

بستر خاک پر گرا وہ زار
درد کا گھر ہوا دل بیمار

خاطر انگار خار خار ہوئی
جان تن کشتنی نگار ہوئی

اُسکے منھ پر پڑی جو اُسکی نگاہ
ناامیدی کے ساتھ ہی سر کی آہ

خو ہوئی نازنیں کے ساتھ
ربط آہ آتشیں کے ساتھ

ہونٹھ سوکھے تو خون ناب ملا / خواب و خور دونوں کو جواب ملا
خلق اُس کی ہوئی تماشائی / پر نہ وہ دیکھنے کبھو آئی
کچھ کہا گر کسو نے شفقت سے / رو دیا اُن نے ایک حسرت سے
جاکے اُسکے قریب در بیٹھا / قصد مرنے کا اپنے کر بیٹھا
دل نہ سمجھا کہ اضطراب کیا / شوق نے کام کو خراب کیا
جو کہ سمجھے تھے اُس کو دیوانہ / رحم کرتے تھے آشنا یا نہ
عاشق اُس کو کسو کا جان گئے / سب بُرا اس ادا کو مان گئے
کیونکہ باہم معاش تھی سب کی / ایک جا بود و باش تھی سب کی
وارث اُس کے بھی بدگمان ہوئے / درپئے دشمنیِ جان ہوئے
مشورت تھی کہ مار ہی ڈالیں / دفعتًا اُس بلا کے تئیں ٹالیں
پھر یہ ٹھہری کہ ہونگے ہم بدنام / سُن کے آخر کہیں گے خاص و عام
کیا گنہ تھا کہ یہ جوان مارا / کن نے مارا اُسے کہاں مارا
ہووے یہ خون خفتہ گر بیدار / کھینچنی ہووے خفتِ بسیار
کیجیے ایک ڈھب سے اسکو تنگ / تا نہ عاید ہو اپنی جانب ننگ
تہمت خبط رکھیے اُس کے سر / کیجیے سنگسار اُس کو پھر
دے کے دیوانہ اُس جوان کو قرار / ہوگئے سارے درپئے آزار
ایک نے سخت کہہ کے تنگ کیا / ایک نے آکے زیر سنگ کیا
ایک آیا تو ہاتھ میں شمشیر / ایک بولا کہ اب ہے کیا تاخیر
کی اشارت کہ کودکانِ شہر / آئے لبریز غصّہ و پرقہر
گرچہ ہنگامہ اُسکے سرپر تھا / لیک روئے دل اُسکا ادھر تھا
محو تھا اُس کے یہ خیال کے بیچ / تھا گرفتار اپنے حال کے بیچ
ہونٹھ پر حسن کا بیان اُس کا / تھا سرو سنگ آستاں اُس کا
ایک دم آہِ سرد بھر اُٹھتا / نالہ گرم گاہ کر اُٹھتا
جی میں کہتا کہ آہ مشکل ہے / اسطرف یک نگاہ مشکل ہے
دوست کو میرے نام سے ہے ننگ / دشمنوں سے ہے جی پہ عرصہ تنگ

چشم تر سے لہو بہا کرتا / صبح کے باد سے کہا کرتا
کہ اے نسیم سحر یہ اس سے کہہ / مت تغافل کر اور غافل رہ
ان بلاؤں میں کوئی کیونکہ جیے / جان پہ آ بنی ہے تیرے لیے
جان دوں تیرے واسطے سو تو / آنکھ اٹھا کر ادھر نہ دیکھے کبھو
رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی / دور پہونچی ہے میری رسوائی
نام کو بھی ترے نہ جب آہ / مجھسے کیونکر سخن کی نکلے راہ
نا امید اک نگر کروں ہوں نگاہ / دیکھتا ہوں ہزار روز سیاہ
سخت مشکل ہے سخت ہے بیداد / ایک میں خوں گرفتہ سو جلاد
کوئی مشفق نہیں کہ ہووے شفیق / بیکسی بن نہیں ہے کوئی رفیق
نالہ ہوتا ہے گہ گہے دل جو / گریہ آنسو سے پونچھتا ہے کبھو
آہ جو بے دمی سی کرتی ہے / اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے
چشم رکھتا ہے وصل کی یہ دل / جی ہے اس سے اسیر بیدل
ورنہ ترکیب یہ کہاں ہوتی / صورت اک معنی نہاں ہوتی
اب ٹھہرتا نہیں ہے پائے ثبات / ایک میں اور کتنے تصدیات
سنگباراں سے سخت ہوں دلتنگ / شیشۂ دل نہیں ہے پارۂ سنگ
محرم یک نگاہ بیش نہیں / کم ہے سینے میں جا کہ ریش نہیں
کیونکہ کہیے کہ تو نہیں آگاہ / اک قیامت بپا ہے یاں سر راہ
کچھ چھپا تو نہیں رہا یہ راز / اک جہاں اس سے ہے خبر پرداز
بس تلف ہی ہوا ترحم کر / گوشۂ دل جانب تظلم کر
کون کہتا ہے رہ نہ محو ناز / پر نہ اتنا کہ جی سے جائے نیاز
ان بلاؤں پہ ان نے صبر کیا / اختیار اپنے جی پہ جبر کیا
اس طرف کا نہ دیکھنا چھوڑا / اس کے اندوہ سے نہ منہ موڑا
اور یہ ماجرا ہوا مشہور / شور رسوائیوں کا پہونچا دور
دیکھ کر اس کو بیخود و مجذوب / جانا ہر ایک نے عاشق بیتاب
منہ پہ اس کے جو رنگ خوں نہیں / عشق ہے اسکو یہ جنون نہیں

ہے نگہ اُس کی جس طرف مائل / اُس طرف ہی گیا ہے اسکا دل
جب ہوا ذکر اقل و اکثر میں / چاہ ثابت ہوئی اُسے گھر میں
عشق بے پردہ جب فسانہ ہوا / مضطرب کد خدائے جانہ ہوا
گھر میں جا بہرِ دفعِ رسوائی / بیٹھ کر مشورت یہ ٹھہرائی
یاں سے یہ غیرتِ مہِ تاباں / جا کے چندے کہیں رہے پنہاں
شب محافے میں اُسکو کرکے سوار / ساتھ دے ایک دایۂ غدّار
پار دریا کے جلد رخصت کی / اس طرح فکر دفعِ تہمت کی
گھر تھا اک آشنا کا مدِّ نگاہ / واں ہو رو پوش تا یہ غیرتِ ماہ
ہو وے جب اس بلا سے خاطر جمع / نور افزائے خانہ ہو جوں شمع
گھر سے باہر محافہ جو نکلا / اُس جواں ہی کے پاس ہو نکلا
طپش دل سے ہوکے یہ آگاہ / ہو لیا ساتھ اُس کے بھر کر آہ
واں کے رہنے سے اُسکو کام نہ تھا / وہ گلی اس کا کچھ مقام نہ تھا
جس سے جی کو کمال ہو اُلفت / جس سے دل کی درست ہو نسبت
جنبش اُس کی پلک کو گرداں ہو / دل میں یاں کاوش نمایاں ہو
واں اگر مو شکست کا ہو باب / یاں رگ جاں کو ہووے پیچ و تاب
واں اگر پاؤں میں لگے ہے خار / دل سے یاں سر نکالے ہے یکبار
یار کو درد چشم اگر ہو وے / چشم عاشق لہو میں تر ہو وے
چاک دامن ہیں واں پئے زینت / یاں گریباں ہے چاک گل کی صفت
واں دہن تنگ یاں ہے دلتنگی / حسن اور عشق میں ہے یکرنگی
دست افشاں وہ پائے کوباں یہ / تھا محافے کے ساتھ گرم رہ
قطرہ زن اشک سا وہ راہ تمام / در پئے یار تھا یہ بے آرام
ہر قدم تھا زباں پر جاری / خواب ہے یا کہ ہے یہ بیداری
ہمسری اُس کی تھی میسر کب / ہے مجھے بخت واژگوں سے عجب
شوق مفرط نے بے تہی کی سخت / ناشکیبی نے دل سے باندھا رخت
رفتہ رفتہ سخن ہوئے نالے / اُڑنے لاگے جگر کے پرکالے

لیک درپردہ اُن نے یہ ٹھانی
کیجیے اس سے خصمی جانی

یہ تو دل تفتۂ محبت تھا
سخت وارفتۂ محبت تھا

وقت نزدیک تھا جو آپہونچا
تا سرِ آب پا بپا پہونچا

آب کیسا کہ بحر تھا زخار
تند و موّاج و تیرۂ و تہ دار

موج کا ہر کنایہ طوفاں پر
مارے چشمک حباب عمّاں پر

ہمکنار بلا ہر اک گرداب
لجّہ سرمایہ بخش تیرہ سحاب

گزرے موج جب نہ تب دیکھا
ساحل اُس کا نہ خشک لب دیکھا

کشتی اک آن کر ہوئی موجود
ہو فلک سے ہلال جیسے نمود

کی کنارے پہ لاکے استادہ
تھا محافہ رکوب آمادہ

اس سفینے میں جلد جا پہونچا
یہ بھی واں ساتھ ہی لگا پہونچا

بیچ دریا میں دایہ نے جاکر
کفش اس گل کی اسکو دکھلاکر

پھینکی پانی کی سطح پر اِکبار
اور بولی کہ اے جگر افگار

حیف تیرے نگار کی پاپوش
موجِ دریا سے ہووے ہم آغوش

غیرت عشق ہے تو لا اُس کو
چھوڑ مت یوں برہنہ پا اُسکو

اُس طرف آب کے اُترنا ہے
اس نواحی کی سیر کرنا ہے

پانوں اُس کے جو ہیں نگار آلود
ظلم ہے ہوویں گر غبار آلود

جس کفِ پا کو رنگ گل ہو بار
منصفی ہے کہ خار سے ہو فگار

ان پہ نرمی میں گل سے ہوں جو کہے
آبلہ چشم کو سیاہ کرے

یہ روا ہے تو اپنے حال پہ رو
مفت ناموسِ عشق کو مت کھو

جی اگر تھا عزیز اے ناکام
کیوں عبث عشق کو کیا بدنام

سُنکے یہ حرف دایۂ مکار
دل سے اُسکے گیا شکیب و قرار

بے خبر کارِ عشق کی تہ سے
جست کی اُن نے اپنی جاگہ سے

تھا سفینے میں یا کہ دریا میں
موج زنجیر ہوگئی پا میں

کھینچ گیا قعر کو یہ گوہر ناب
تھی کشش عشق کی مگر تہ آب

کہتے ہیں ڈوبتے اُچھلتے ہیں
لیکن ایسے کوئی نکلتے ہیں

ہو محافے میں دلخوشی سے سوار / شاد و شاداں کر آب سے تو گزار
دل سے اپنے پدر کے غم کم کر / مادرِ مہرباں کو خرّم کر
کر ملاقات ہمدموں سے تو / گرم بازی ہو محرموں سے تو
یہ نہ سوچی کہ بد بلا ہے عشق / گھات میں اپنی لگ رہا ہے عشق
جس کسو سے یہ پیار رکھتا ہے / عاقبت اُس کو مار رکھتا ہے
جذب سے اپنے جب کرے ہے کام / عاشق مردہ سے بھی لے ہے کام
صبح گاہاں وہ غیرتِ خورشید / اس جگہ سے رواں ہوئی نومید
پہونچی نصف النہار دریا پر / روئی بے اختیار دریا پر
حد سے افزوں جو بیقرار ہوئی / دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی
حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ / یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ
موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش / تھا تلاطم سے کس طرف ہمدوش
تجھکو آیا نظر کہاں آ کر / پھر جو ڈوبا تو کس جگہ جا کر
مجھکو دیجو نشان اُس جا کا / میں بھی دیکھوں خروش دریا کا
ہوں میں ناآشنائے سیرِ آب / ناشناسائے موجہ و گرداب
لجہ کیا لطمہ کس کو کہتے ہیں / گھر میں ہم نام سنتے رہتے ہیں
ہیں میسر کہاں یہ سیرِ عبور / اتفاقی ہیں اس طرح کے امور
کمر میں گرچہ دایہ تھی کاہل / لیک تہ سے سخن کے تھی غافل
یہ نہ سمجھی کہ ہے فریب عشق / ہے یہ مہ پارہ ناشکیبِ عشق
بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف / یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف
یاں وہ بیٹھا حباب کے مانند / پھر نہ تھا کچھ سراب کے مانند
سنتے ہی یہ کہاں کہاں کر کر / گر پڑی قصد ترک جاں کر کر
موج ہر اک کمند شوق تھی آہ / لپٹی اُس کو بہ رنگ مارِ سیاہ
دام گستردہ عشق تھا تہ آب / جس کے حلقے تمام تھے گرداب
حسن موجوں میں یوں نظر آوے / نورِ مہتاب جیسے لہراوے
تھیں وہ اُس کی حنائی انگشتاں / غیرت افزائے پنجۂ مرجاں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثنوی عشقیہ

چمن سے عنایت کے بادام وار — الٰہی زباں دے مجھے مغز دار

صفت عشق کی تا کروں میں بیاں — رہوں عشق کہنے سے میں تر زباں

عجب عشق ہے مرد کار آمدہ — جہاں دونوں اسکے ہیں برہم زدہ

جہاں جنگ صف کی یہ ظالم لڑا — صف اُلٹی جہاں ایک مارا پڑا

اگر لوگ مارے گئے سر بسر — ولے فتح اس کی ہے یہ طرفہ تر

کوئی کشتنی جو طرف ہو گیا — تہ تیغ اس کے تلف ہو گیا

جہاں جس کسو سے اسے چاہ ہے — وہیں اُس کے تا قتل ہمراہ ہے

کسو سے اگر ہو گئی لاگ سی — درونے میں اسکے لگی آگ سی

ہوا ملتفت یہ کسو سے کہیں — تو نام و نشاں اسکا پھر واں نہیں

وفاق اس کا نکلا سراسر نفاق — پڑا عاشقوں میں عجب اتفاق

جواں کیسے کیسے موئے عشق میں — بہت گھر خرابے ہوئے عشق میں

بہت عشق میں لوگ روگی ہوئے — بہت خاک مل منہ پہ جوگی ہوئے

گئے دشت میں کچھ نہ مو ہوئے — کچھ اک شہر میں پھر کے یکسو ہوئے

نہ مرغ چمن ہی ہے نالان و زار — گئے داغ کہسار سے لالہ زار

کسو کا جگر غم سے خوں ہو گیا — کسو کوہ کن کو جنون ہو گیا

کوئی زار باراں بہت رو چکا — کوئی برق سا جل بجھا ہو چکا

غرض عشق کا ہر طرف شور ہے — نئی روز شہروں میں اک گور ہے

کوئی ہوش میں اپنے رہتا نہیں
ہر اک چپ ہے کچھ کوئی کہتا نہیں

رباطی ہیں خانہ سیہ عشق میں
محلّے ہوئے ان کے تہ عشق میں

ہمہ خاندانِ تفاوت خراب
خرابے سے ہیں بے تفاوت خراب

یہی عشق جس سے کہ حاصل ہو کام
یہی عشق ہے جس سے نکلا ہے نام

اسی عشق سے روسیہ روسفید
رکھیں عشق سے نااُمیداں اُمید

یہی عشق ہے عقدۂ دل ہے یہ
یہی عشق حلّال مشکل ہے یہ

کہیں اس کو رہنے سے پایا معاف
کہیں ان نے میدان مارے ہیں صاف

کہیں مومنانہ اسے درد دین
کہیں کافرانہ ہوا بے یقین

غرض عشق ہے طرفہ نیرنگ ساز
کہیں ناز یکسر کہیں ہے نیاز

حکایت

حکایت ہے عشقی حکایات میں
کہ افغاں پسر ایک گجرات میں

جواں خوش تھا پر کار و پرہیزگار
بہت حسن کا اُسکے واں اشتہار

بصورت یہ طاعت یہ دامانِ پاک
نہ دامن پہ مانند گل گرد خاک

اگر ہووے حور بہشتی دوچار
وہ دریائے حسن اس سے ڈھونڈے کنار

وگر آگے سے ہو پری کا گزر
حیا سے نہ اُس پر کرے ٹک نظر

رہے محو پاکیزگی و صلوٰۃ
نہ ہوں ترک سہواً کبھی واجبات

تناسب بہت اُسکے اعضا سے خوب
سراپا میں دیکھو تو ہر جا سے خوب

زباں نرم طالع وری و صلاح
نہ طنز و کنایہ نہ رمز و مزاح

خوش اندام و خوش رو و پاکیزہ خو
کسو وقت رہتا نہ تھا بے وضو

جوانی کا ہنگام طاعت کا صرف
لب سُرخ پر دلبروں کا نہ حرف

حیا کو سیاہی سے پلکوں کی راہ
نکلتی تھی باہر نہ گاہے نگاہ

بہت پاک دامن معیشت ہوئی
لطافت نزاہت میں مدت ہوئی

کہ ناگاہ اس راہ یک زن گئی
جیوں پر خدا جانے کیا بن گئی

جواں کی نظر شرگیں جا لڑی
وہ شرمائی آنکھ اُسکے اوپر پڑی

نہ دل مستقل ناشکیبا ہوا
دل طرف ثانی بھی بیجا ہوا

پیام ایک کا یہ کہ اے بادِ نرم / کہ اسکو محبت سے کچھ بھی ہے شرم
تنِ زار بیجان کیونکر جیے / جگر میں نہ ہو خوں تو کیا خوں پیئے
ملاقات کا رکھے کیونکر خیال / رہے کیونکہ جان ناامیدِ وصال
اگر دیکھیں آنکھیں ہیں وہ اسطرف / وگر منھ ہمارا ہے سو اس طرف
اسے دیکھنا ہی ہے ارمان بھی / ادھر ہی چلی جائے ہے جان بھی
کہ اس سے کہ مرتے ہیں تیرے لیے / کیا عشق یا جرم ہم نے کیے
نہیں صبر آتا ترے بن سلے / لبوں سے جگر تک بھرے ہیں گلے
کسو سے کسو کو نہ ہو جائے لاگ / کہے تو لگائی ہے سینے میں آگ
کسو کا کسو سے نہ لگ جائے دل / کہ کہنا پڑے ہائے دل وائے دل
کسو کی نہ اچھی لگے کوئی آن / کہ جانِ المناک و تنجے ندان
کسو کے مجعد نہ کھل جائیں بال / کہ ہو دل کے عقدوں کی وہ اشکال
کسو لالہ رُخ کا نہ اُٹھے نقاب / کہ ہوں داغ دونوں مہ و آفتاب
قدآرا نہ ہو فتنہ درسر کوئی / کہ سر پر قیامت رکھے ہر کوئی
کسو کے نہ چاہ زنخ میں گریں / مبادا کہ واں سے نہ جیتے پھریں
کسو کے نہ انداز پر جا سے جا / صبا ہوئے کیا جانیے کیا سے کیا
کسو کی نہ آنکھوں کو دیکھا کریں / کہ لوگ اس کا آخر یہ دیکھا کریں
کسو کے نہ ایمائے ابرو پہ جائیں / فریب فریبندگاں تا نہ کھائیں
صبا چلتے اس سے یہ کہہ آئیو / کہ غافل ہی ہم سے نہ ہو جائیو
دلِ زار تجھ بن ہے بے کل بہت / نہ جی کو مرے بن سلے مل بہت
گئے ہم سے پھر ہاتھ آتے نہیں / یہ گم گشتہ پھر پائے جاتے نہیں
انھیں کا نہیں رہتا نام و نشاں / کوئی ان کو ڈھونڈھے تو پھر یہ کہاں
کہیں یوں فراموش ہوتے ہیں یار / ہمارا ترا عشق ہے یادگار
ترحم کہ اب بھی گیا کچھ نہیں / تلطف کہ ہم میں رہا کچھ نہیں
نہ کر یوں کہ افسوس باقی رہے / گلِ تر پہ چند اوس باقی رہے
گھٹی جان جاتی ہے یوں ہر زماں / تلف جیسے ہر دم ہو آب رواں

تعب کش ہوں میں آتش تیز کا
اُسے قصد تھا میرے خونریز کا

لے آئے مجھے گرمی سے تم نکال
کیا گھر بھی لے چلنے کا اب خیال

نہیں متصل راہ چلنے کی تاب
کہ ہوں نیم سوز آگ کا میں کباب

کہیں مجکو سائے میں ٹھہرائیے
جو دم ٹھہرے تو آگے لے جائیے

کوئی دم مرا کھینچئے انتظار
کہ گرمی سے ہوں بیخود و بیقرار

توقف کیا سب نے زیر درخت
کہا واقعی رنج کھینچا ہے سخت

نہ جانا کہ ہے مانع راہِ عشق
رکھے ہے عجب جذب جانکاہِ عشق

نہ آتش نہ گرمی نہ بے طاقتی
بہانے ہیں سب جذب ہے اتفقی

عجب تر نظر آتے ہیں کار عشق
نہیں سمجھے جاتے ہیں اسرار عشق

اُٹھانے کو کہنے تو کہلائے تھا
دل اسکا ادھر ہی چلا جائے تھا

اگر آنکھیں کھلتیں تو ادھر نظر
ہوئی خاک معشوقہ جل کر جدھر

گیا منتظر اُس کو وہ دن تمام
نظر کرکے کیا دیکھتا ہے کہ شام

خراماں چہاں آتی ہے وہ پری
وہی ناز عشوہ وہی دلبری

وہی صورت اسکی ہے جلوہ نما
وہی رنگ رو گل کا غیرت فزا

اسی طرز و انداز و خوبی کے ساتھ
اُٹھایا اُسے ہاتھ میں لے کے ہاتھ

گئی اس طرف سے جدھر تھی چلی
نظر کرتے تھے واقعی یہ سبھی

وے انعیت کا کس کو جگر
کہ حیران سب رہ گئے دیکھ کر

ہوئے جاتے جاتے نظر سے نہاں
گیا عشق کیا جانے لے کر کہاں

بہت سے ہوئے لوگ گرم سراغ
کنھوں نے نہ پایا نشاں غیر داغ

نہ کر میر اب عشق کی گفتگو
قلم اور کاغذ کو رکھدے بھی تو

فسانے ہیں اسکے ہزاروں ہزار
یہی کشت و خوں کا ہے یہ گرم کار

بہت خاک جل جل کے یاں ہو گئے
رہِ عشق میں جی بہت کھو گئے

غرض ایک ہے عشق بیخوف و باک
کئے دونوں معشوق و عاشق ہلاک

تمام

عشق میں ایک جی کو کھو بیٹھے — ایک آنکھوں کو رو کے رو بیٹھے
ایکوں کا جیب تا بدامن چاک — ایک ڈالے ہے سر کے اوپر خاک
شان ارفع ہے جنگی خوار ہیں یاں — عقل والے جنوں شعار ہیں یاں
خستۂ عشق کچھ نہ میر ہوئے — بادشہ عشق میں فقیر ہوئے
کوئی دلتنگ ہو کنویں میں گرا — کوئی ڈوبا کوئی گیا نہ پھرا
جب پتنگا ہوا تھا اس سے داغ — تب دیا جی کو ان نے بیش چراغ
عشق کی ناختہ کشمکش ہے — عشق سے عندلیب دلکش ہے
عشق باعث ہوا وطن چھوٹے — مرغ پکڑے گئے چمن چھوٹے
مایۂ درد و رنج سب ہے عشق — متصل رونے کا سبب ہے عشق
پڑ گئے دل جگر میں آخر چھید — کچھ نہ پایا کنھوں نے عشق کا بھید
اپنی تیغ ستم جو اینچے عشق — جامے بہتوں کے خوں میں کھینچے عشق
عشق سے قمری ہے حریف سرو — مہ سے آنکھیں لڑا رہا ہے تدرو
عشق کے دل فگار سارے ہیں — ان نے کیا کیا جوان مارے ہیں
کہیں حق ناحق ان نے خون کیے — کہیں سر پر کھڑا ہے تیغ لیے
کوئی محو گزاف ہیں اس سے — کہیں میدان صاف ہیں اس سے
اس سے یک جمع نے لیا ہے جوگ — ایک فرقہ کا ہے یہ جی کا روگ
ایک کے لب پہ آہ ہے اس سے — ایک کا دن سیاہ ہے اس سے
ایک کو شیوہ اس سے نالہ کشی — ایک کو بیدمی ہے جیسے غشی
ایک نفرت و زندگانی سے — ایکوں کے دل گداز پانی سے
ایک کے پھول گل پہ نالے ہیں — ایک کی جان ہی کے لالے ہیں
ایک نے کوہ اس سے توڑ دیے — ایک تنکا گر ان نے چھوڑ دیے
چپ لگی ہے کسو کو اسکے سبب — بند رہتے نہیں کسو کے لب
کوئی باتیں کرے ہے شوق کیساتھ — کوئی چپکا ہوا ہے ذوق کے ساتھ
ہے تواجد کسو کو حال کہیں — کہیں نقصان ہے کمال کہیں
ایک محو لباس عریانی — ایک سرگرم دامن افشانی

معاملۂ دوّم

ایک مدت تلک یہ صحبت تھی — کبھو الفت کبھو یہ کلفت تھی

رفتہ رفتہ سلوک بیچ آیا — ہاتھ پاؤں کو اپنے لگوایا

گاہ بیگاہ پاؤں پھیلاتے — میری آنکھوں سے تلوے ملواتے

چلکر آتے تھے جب کبھو ایدھر — پاؤں رکھتے تھے میری آنکھوں پر

دیکھنے میں تو پائمالی تھی — حُسن سے جاں یہ نہ خالی تھی

جلتی چھاتی تو ہوتا میں سائل — کہ ٹک اسے سرو ہو ادھر مائل

کفِ پا رکھیے یاں تو احساں ہے — تیرے پاؤں تلے مری جاں ہے

ہنسکے سینے پہ پاؤں رکھ دیتے — دل مرا یوں بھی ہاتھ میں لیتے

کیا کہوں کیسا قد بالا ہے — قالب آرزو میں ڈھالا ہے

ایک جاگہ سے ایک جاگہ خوب — پیکرِ نازک اسکے سب محبوب

موئے سر سے جی بھی کرے نیاز — بل ہی کھایا کرے یہ عُمرِ دراز

اس کے کاکل سے حرف سر نہ کرو — کاکلِ صبح پر نظر نہ کرو

کچھ بھی نسبت ہے تمکو سودا ہے — کالے کوسوں کی بات کا کیا ہے

اُسکی زلفوں کے دن گئے نہ پھرے — رہے سنبل کے پیچ پاچ دھرے

اُس جبیں سے ہے دل کی کب جاذب — صبحِ صادق کے دعوے ہیں کاذب

ویسی بھویں کشیدہ بھی ہیں کہیں — یہ کمانیں کسو سے کھنچتی نہیں

پھری پلکوں کی اور سب کی نگاہ — چشم پر میری تیری چشمِ سیاہ

کہوں چتنوں کے دیکھنے کے طور — اس قیامت پہ وہ قیامت اور

سطحِ رخسار آئینے سے صاف — جو نہ ٹھہرے نگہ تو رکھیے معاف

لطف بینی کا فہم ہے دشوار — ایک باریک بینی ہے درکار

کیا جھمکتا ہے اسکے رنگِ قبول — جیسے کھڑا گلاب کا سا پھول

ہے دہن تنگی سے سخن کوتاہ — کچھ نکلتی نہیں سخن کی راہ

بس سے گل کیا چنے کوئی ہمدم — غنچۂ ناشگفتہ سے بھی کم

برگِ گل سے زباں ہے نازک تر — پھول جھڑتے ہیں بات بات اوپر

وہ کفِ دست راحتِ جاں ہے
کیا بیاں خوبیِ شکم کو کرے
صدر کے ناچے سے لے تا ناف
اس سے پھر آگے غنچۂ گل ہے
پردے میں بھی جو کچھ کہا جاوے
گئی نظروں سے وہ کمر باریک
اور کیا دل زدے کو بات آوے
نازکی اس میاں کی کیا کہیے
ٹک اگر جھکے تو قیامت ہے
کیوں پڑی ران پر نظر تا ساق
پائے جاناں سے گفتگو ہے اب
وہ قدم کاش فرق سر پہ ہو
وہ کفِ پا قریب ہو میرے
پنڈلی نازک ہے شاخِ سنبل کی
یوں نصیبوں سے ہو حنا کا ناؤ
ناخنِ پا حنائی ہیں ایسے
ہو خراماں تو اس طرف تکہیں
گل و بلبل سبھی تماشائی
رنگِ رفتار دیکھ مجنوں ہو
سر سے پاؤں تلک وہ محبوبی
کہ بہت دل ہے آشنائے رحم
اب جو ثابت ہوئی ہے میری چاہ
طعن و تعریض بیچ میں آئے
راستے میں اک طرف وفا کے لیے
نہیں آزار کی روا داری
کاش سینے پہ رکھ دے غم یاں ہے
دیکھنے سے کبھو نہ پیٹ بھرے
جیب کی جاگہ ہے کیونکہ کہیے صاف
یاں سخن بابتِ تامل ہے
آپ سے تو نہ ٹک رہا جاوے
ہو نہ آنکھوں میں کیوں جہاں تاریک
کہیں یا رب شتاب ہاتھ آوے
نہ نے تو ہاتھوں میں لیے رہیے
پھر قیامت تلک ندامت ہے
اس بن اب زندگی ہوئی ہے شاق
خاک میں ملنے کا یہی ہے ڈھب
ساق سیمیں مری کمر پہ ہو
ٹھوکر اس کی نصیب ہو میرے
پشتِ پا پنکھڑی سی ہے گل کی
ورنہ ڈوبے ہیں میرے خوں سے پانو
برگِ گل پا سے سرد ہوں ایسے
گل کفشِ اسکی لوگ دیکھ رہیں
آ گئے جس طرف بہار آئی
طرزِ گفتار جیسے افسوں ہو
ساتھ ان خوبیوں کے یہ خوبی
دردمندوں کو جانے جائے رحم
اس کو مدّ نظر ہے مجھ سے نباہ
کچھ نہ خاطر میں وے مجھے لائے
چلے جاتے ہیں مجھ پہ لطف کیے
مہر ورزی ہے یا وفاداری

پھر وہی کرتے ہیں جو کچھ کہتا ایک پردہ سا بیچ میں رہتا
دوستی رابطہ وفا اخلاص ساتھ میرے تھا اُن کو رابطۂ خاص
ہیں تقاضائی ملنے کا رہتا مختلط ہونے کو سدا کہتا
میری تسکیں تھی ہر زماں منظور آپ بھی کرتے ملنے کا مذکور
وصل کے وعدے ہی رہا کرتے آج کل رات دن کہا کرتے
دل تو تھا رسم آشنا از بس کڑھتے تھے جان کر مجھے بیکس
جانتے تھے کہ ہے یہ دل دادہ ستم دیدہ خستہ خاک اُفتادہ
دیکھتے مجھ کو جو پریشاں دل کہتے اے میر کچھ نہیں حاصل
دیکھ ٹک تو ہی تیرا حال ہے کیا جانے دے اب بھی یہ خیال ہے کیا
آفتِ جاں ہے دوستی کرنا کب تلک گھٹ کے اس طرح مرنا
میں جو دیوانہ اُن کے رو کا تھا شیفتہ پیچدار مو کا تھا
کچھ نہ سمجھی گئی کہن اُن کی اب جدائی کہ جو ہے کٹھن اُن کی
یاد کرتا ہوں اور روتا ہوں وعدہ بن ہی ہلاک ہوتا ہوں

معاملۂ ششم

ٹکڑوں بن جگر ہے داغ کباب گیسوؤں بن ہے جی کو پیچ و تاب
صورت اُن کی خیال میں ہر دم خواب میں جو ہوں وہ مژہ باہم
میں تو بستر پہ دل شکستہ اداس چاند سا منھ اُنھوں کا تکیے پاس
میں بچھونے پہ بیخود و بیخواب ایک پیکر پری کا سا ہمخواب
فرش پر پاؤں یہ غبار آلود ان میں وے دونوں پانگار آلود
میں تو افتادہ محوِ عجز و نیاز بازو میرے کسو کی بالش ناز
جلتی آنکھوں کنے گل رخسار جس پہ کچھ بکھرے موئے عنبر بار
پاس منھ کے وے لالِ تر نازک دستِ گستاخ پر کمر نازک
فرش اُس گلبدن سے سب بویا پھول میں نے بچھائے تھے گویا
شب کٹی صورت خیالی سے دن کو ہوں میں شکستہ حالی سے

یاں نہ تفصیل کرنے کا تھا مقام — کہ محبت سے یاں ہے حرف کلام

معاملۂ ہفتم

بارے کچھ بڑھ گیا ہمارا ربط — ہو سکا پھر نہ دو طرف سے ضبط
تب ہوا بیچ سے یہ رفع حجاب — جب بدن میں رہی نہ مطلق تاب
ایک دن ہم وے متصل بیٹھے — اپنے دلخواہ دونوں مل بیٹھے
شوق کا سب کہا قبول ہوا — یعنی مقصود دل حصول ہوا
واسطے جسکے تھا میں آوارہ — ہاتھ آئی مرے وہ مہ پارہ
گہہ گہے دست دی ہم آغوشی — ہمسری ہمکناری ہمدوشی
چند روز اس طرح رہی صحبت — پیار اخلاص رابطہ الفت
پھر کہوں جو اُنھوں کی ہو تقصیر — نارسائی تھی طالعوں کی میر
ہو گئے بخت اپنے برگشتہ — پھر گیا آسماں نے سرگشتہ
بات ایسی ہی اتفاق پڑی — کہ ہوئی سر پہ فرقت آن کھڑی
لگی کہنے کہ مصلحت ہے یہ — کتنے روز دن جدا تو مجھ سے رہ
یوں بھی آتا ہے عشق میں درپیش — کہ نشان بلا ہوں اُلفت کیش
میں اُٹھایا نہیں ہے تجھ سے ہاتھ — گرڈھو مت تو ہے میری جانکے ساتھ
اس جدائی کا مجھ کو بھی غم ہے — کیا کروں آبرو مقدم ہے
میں کہوں کیا مجھے نہ اپنا ہوش — جیسے تصویر سامنے خاموش
آنسو آنکھوں میں بھر پئے جاؤں — وے کہیں کچھ تو ہاں کیے جاؤں
ان سے رخصت ہوئے جو بعد شام — تیرہ دیکھا جہان کو ہر گام
دل ٹھہرتا نہ تھا ملالت تھی — جان کو رفتگی کی حالت تھی
یوں ہوا اُن کے کوچہ سے آنا — جیسے ہووے جہان سے جانا
اب جو گھر میں ہوں تو فسردہ سا — چارپائی پہ ہوں تو مردہ سا
جی اُنھوں میں فسردہ قالب یاں — متحرک ہو کیا تن بیجاں
حال دل کا کہوں جو ہمدم ہو — کروں پیغام کچھ جو محرم ہو

جی میں کچھ آیا رو کے بیٹھ رہا
دل زدہ چپکا ہو کے بیٹھ رہا

کوئی آیا جو واں سے جی آیا
سو نہ آیا کبھی کبھی آیا

دیکھیے چند یوں رہیں گے جدا
چاہیے ہے کیا ہمارے حق میں خدا

خون دل کب تلک پئیں گے ہم
رنج یہ ہے تو کیا جئیں گے ہم

آہ کیا کیا بیاں کروں خوبی
دل دہی حال پرسی محبوبی

تند ہو کر نہ بات کو کہنا
ملتفت حال زار پہ رہنا

لطف بند دل حال پر ہر آن
تازہ ہر دم مروت و احسان

لب سے جاں بخش حرف سے دلجو
لطف سے پوچھنا کہ خوش ہے تو

یاد کر روؤں ان کی کون سی بات
کس طرح کاٹوں ہجر کے اوقات

تھا اُن سے ہو پھر گئے غم بھی
آئے جینوں میں جانیے ہم بھی

مدت ہجر کب تمام ہوئی
ورنہ یہی تو صبح شام ہوئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثنوی جوشِ عشق

ضبط کروں میں کب تک آہ اب — چل اے خامے بسم اللہ اب
کر ٹک دل کا راز نہانی — ثبت جریدہ میری زبانی
یعنی میرؔ اک خستۂ غم تھا — سر تا پا اندوہ و الم تھا
آنکھ پڑی اُس کی اک جا گہ — بیخود ہو گئی جانِ آگہ
صبر نے چاہی دل سے رخصت — تاب نے ڈھونڈھی اکدم فرصت
تاب و توان و شکیب و تحمل — رخصت اس سے ہو گئے بالکل
سینہ فگاری سامنے آئی — بیتابی نے طاقت پائی
کرنے آئے داغ سیاہی — کام جگر کا کرنے تباہی
خون جگر ہو بہنے لاگا — پلکوں ہی پر رہنے لاگا
خواب و خورش کا نام نہ آیا — ایک گھڑی آرام نہ پایا
چاک جگر سے محبت ٹپکی — آنسو کی جاگہ حسرت ٹپکی
سوز سے چھاتی تابہ گویا — اور پلک خوں نابہ گویا
آہ سے اُس کی مشکل جینا — درد فقط تھا سارا سینا
دل میں تمنا داغ جگر میں — شیون لب پر یاس نظر میں
نالے شبگو اُس کے سُن کر — مر گئے کتنے سر کو دھن کر

گل اُن نے ازبسکہ کھائے ۔ پھولوں کی چھڑیاں ہاتھ بنائے
دل کے غبار نے راہ جو پائی ۔ شہر میں گویا آندھی آئی
سر پہ اُس کے سنگ ہمیشہ ۔ جی پہ عرصہ تنگ ہمیشہ
آہ سرد کرے وہ عریاں ۔ بید سا کانپے موئے پریشاں
گرد کی تہ اس کا پیراہن ۔ دامن صحرا جس کا دامن
پارہ دامن تار گریباں ۔ دامن قرب و جوار گریباں
پامال میں مثل جادہ ۔ نقش قدم سا خاک اُفتادہ
دشت تلک گئی آبلہ پائی ۔ دور کھنچی اُس کی رسوائی
اُس کے جو پامال ہوئے سب ۔ خار بیاباں لال ہوئے سب
جن نے دیکھا اُس کو یکدم ۔ اُن نے کہا یہ بھول کے سب غم
چندے یہ ناشاد رہے گا ۔ پر مدت تک یاد رہے گا
جلنا اُس سے کرے نہ کنارہ ۔ جیسے چراغِ وقف بچارا
لو ہو ٹپکے آہِ سحر سے ۔ لالہ گنتھواں لختِ جگر سے
رکھتا سدا تھا وہ دیوانا ۔ ورد زباں یہ شعرِ دانا
صار فوادی شقاً شقاً ۔ حقاً حقاً حقاً حقاً
ہوش خرد ناشاد گئے سب ۔ دین و دل برباد گئے سب
دردِ دل سے کچھ نہ کہے وہ ۔ ہر اک کا منھ دیکھ رہے وہ
حسرت اُس کی ایک اعجوبا ۔ آب دہن کی موج میں ڈوبا
غیر سے بولے نہ یاروں ہی سے ۔ بات کہے تو اشاروں ہی سے
سمجھے تو کوئی داد کو پہونچے ۔ عاشق کی فریاد کو پہونچے
ورنہ رہے من مار کر اپنا ۔ سر دے مارے ہار کر اپنا
کیونکر غم سے ہو آزادی ۔ جان کے ساتھ اُسکی ناشادی
کوئی نہ اس پر سایہ گستر ۔ اپنا ہاتھ اپنے ہی سر پر
نے کعبے نے دیر کے قابل ۔ مذہب اس کا سیر کے قابل
کیسا کہیے کیسا کچھ تھا ۔ القصہ وہ ایسا کچھ تھا

سبھوں کی کشش کا دوانہ عالم — تیرِ نگہ کا نشانہ عالم
تیغ و تبر تھی ابرو اُس کی — آتشِ سرکش جو تھی اُس کی
ناز کی مے سے مست رہے وہ — اکثر دست بدست رہے وہ
زلفوں کے سب تار پریشاں — سر او پہ دستار پریشاں
سایہ سے اُسکے سرو بنایا — خاک رہی سے تدرو بنایا
ہووے خراماں جب وہ کافر — کبک کی ہووے جان مسافر
چشم کرشمہ جان تغافل — شایاں اُس کی شانِ تغافل
کیا جانے وہ حال کسو کا — پتھر دل اُس آئینہ رو کا
پاتے ہی ابرو کا اشارا — غمزے نے اک خنجر مارا
جب وہ خرام ناز کرے ہے — جی کو جو ر نیاز کرے ہے
رخصت دے گر عشوہ گری کو — ایک ہی جلوہ بس ہے پری کو
ہنسنے میں وہ صفائے دنداں — برقِ خرمن عالمِ امکاں
رشکِ سحر کو صافی تن پر — خونِ صراحی اُس گردن پر
آہ صفائی اُس سینے کی — غیرت افزا آئینے کی
شکل چیں میں یہ ناز کہاں ہے — صورت ہے انداز کہاں ہے
ایسا خوب جہاں میں کہیں ہے — رحم ہے اسپراب جو نہیں ہے
جب وہ شکل نظر آتی تھی — کلفت دل کی نکل جاتی تھی
رنگیں اس کی اس کفِ پا سے — جائیں نہ کیوں یاں اپنی جا سے
چشم کرو انصاف کی گر وا — یوسف و شیریں لیلیٰ عذرا
کون ہوا اس محبوبی سے — خوبی تھی پہ اس خوبی سے
بارِ نزاکت کیونکر اُٹھاوے — شاخِ گل سا لہکا جاوے
ہے گی رگِ گل پا رگِ جاں ہے — پر نازک اسرار میاں ہے
صید ملک قربانی اُس کا — یوسف اک زندانی اُس کا
اور جو خوباں پاویں اُس کو — یکہ نگیر دکھلاویں اُس کو
جاویں اس پہ جان سبھوں کی — تیغ رہے درمیاں سبھوں کی

قلم سے فرصت اُس کو کہاں ہے — قاصد اشک ہمیشہ رواں ہے
خط لکھتا ہے اس مضموں سے — تر ہو بال کبوتر خوں سے
خط سے اک آتش پر ہووے — جس سے کباب کبوتر ہووے
جب دردِ دل اُن نے لکھا ہے — شعلہ خط میں لپیٹ دیا ہے
سوز کے آوے جب وہ بیاں پر — شعلہ اک جوں شمع زباں پر
جب کرے خونِ جگر سے انشا — یار کا اپنے شوقِ کفِ پا
ہو انگشت بُریدہ خامہ — اور حنائی کاغذ نامہ
راہ پہ بیٹھا وہ سرگشتہ — دیکھے راہِ عمرِ گزشتہ
آگے تھا کب ہجراں دیدہ — آہ وہ تازہ ظلم رسیدہ
کیا کیا بے طاقت ہوتا ہے — ہر دم جی رخصت ہوتا ہے
حال عجب ہے رنجوری سے — مرنے قریب ہے وہ دوری سے
جب وہ دردِ دل کو جتاوے — باتوں پر اُسکے رونا آوے
دستہ دستہ داغ بسر ہے — پرکالہ پرکالہ جگر ہے
اشک نہیں آنکھوں سے ٹپکتا — ہے یہ گرہ اک دل کی تمنا
داغ دروں ہے گلشن گلشن — گل یہ چنے وہ دامن دامن
چھوڑے نہ راہ و رسم وفا کو — دے پیغام ہمیشہ صبا کو
پاس اس کے گر تیرا ہو جانا — بھولوں ہوؤں کو یاد دلانا
زیرِ لب اُس کے بات یہی ہے — شام سحر دن رات یہی ہے
کھینچیں گے کب تک یہ سختی ہم — پھر بھی ملیں گے جیتے جی ہم
بس اے خامہ رکھ لے زباں کو — تاب نہیں ہے اہلِ جہاں کو

قصۂ غم کو نہایت کب ہے
اس سے خموشی اب انسب ہے

سبھوں میں نمود اسکی ہی شان ہے — یہ قالب ہیں سارے وہی جان ہے
گل و غنچہ و رنگ و بوئے بہار — یہ سب رنگ اللہ ہی کے ہیں یار
اگرچہ سبھوں کی ہیں طرحیں جدا — یہ سب طرحیں ہیں ایک نام خدا
سما ارض و خورشید یا ماہ ہے — جدھر دیکھو اللہ ہی اللہ ہے
نظر کرکے ٹک دیکھو ہر جا ہے وہ — نہان و عیاں سب میں پیدا ہے وہ
بہر صورت آئینہ ہے گا جہاں — یہ سب عکس اسکے ہی پڑتے ہیں یاں
ملک جن و حیواں جماد و نبات — جو اس بن ہیں توحیف ہے کائنات
وجود عدم اس سے دونوں ہیں شاد — وہی ہے گا مبدا وہی ہے معاد
مجھے ساقی دے کوئی جام عقیق — ولیکن لبالب ہو اس میں رحیق
رکھے آپ میں جس کی آمد مجھے — کہ درپیش ہے نعت احمد مجھے

در نعت سید المرسلینؐ

ثنا جان پاک محمدؐ کے تئیں — درود تحیات احمدؐ کے تئیں
رسول خدا و سر انبیا — زہے حشمت و جاہ صلِّ علیٰ
دیا مجلس کبریا کا ہے وہ — شرف دودمان قضا کا ہے وہ
سب اس صفحے میں ہیں ظہور خدا — پر اس سے عبارت ہے نور خدا
جہاں وہ ہے واں جبرئیل ہیں — اُڑے حشر تک تو پہونچتا نہیں
کروں اُس کی قربت کا کیا میں بیاں — کہ تھا قاب قوسین ادنیٰ مکاں
مرندیدہ پا اُس کے فرقِ نیاز — کیا جس کی خلقت پہ صانع نے ناز
بصورت اگر عبد مشہود ہے — حقیقت کو پہونچو تو معبود ہے
نہیں پا شکستوں کا اب دستگیر — محمدؐ بن اور آل بن اُسکے میر
گنہگار ہوں چشم ایک اُس سے ہے — توقع شفاعت کی ایک اُس سے ہے
درود آل پر اُسکے ہر صبح و شام — وہ ہے شافع حشر و خیر الانام
پلا ساقیا بادۂ لعل گوں — کہ ہو جائیں سرخ آنکھیں مانند خوں
ہے اب حرف مستانہ کا دل میں جوش — کر آویزۂ گوش گر کچھ ہے ہوش

تجھی سے ہے آب رخ زرد زرد / تجھی سے مرے دل میں اٹھتا ہے درد
تجھے ربط کفار و دیندار سے / تجھے رشتہ تسبیح و زنار سے
تجھی سے ہے بلبل کو نوحہ گری / تجھی پر ہے قمری بھی خاکستری
ترا جذب دریا کو بہنے نہ دے / ترا شور صحرا کو رہنے نہ دے
تجھی سے دل شاد غمناک ہے / تجھی سے مرا سینہ صدچاک ہے
تمنا کو تو نے کیا ہے شہید / تجھی سے نہ بر آئی میری اُمید
تجھی سے ہے مجنون صحرا نورد / تجھی سے ہے فرہاد کوہوں پہ مرد
تجھی سے گلو بند ہے خستگی / تجھی سے ہے وابستہ دل بستگی
تجھی سے دل عاشقاں ہے کباب / تجھی سے ہے پروانہ آتش کا باب
ترا کام دینا ہے بدنامیاں / تری ریجھ دیکھی ہیں ناکامیاں
تجھی سے سراسیمہ ہیں یار لوگ / تری تیغ سے قیمہ ہیں یار لوگ
تجھی میں ہیں یہ کارپردازیاں / تجھی پر ہیں موقوف جانبازیاں
مجھے اس کے چھپنے کا سودا رہا / ولیکن ترا راز رسوا رہا
ہوا پینا عاشق پیا ہی کیے / ترے جرم پر جی دیا ہی کیے
ترا ہی نمک خوار ہے زخم دل / کہ مرہم سے بیزار ہے زخم دل
تجھی اک ہی مژگاں سے پیلطا اشک / کہ مشکل ہوا ہے مجھے ضبط اشک
کدھر ہے تو اے ساقی لالہ فام / نہ لغزش ہے تجھ بن کہ بہکا کلام
کہاں تک کوئی خون دل کو پیے / کوئی کیونکہ اس رنگ ظالم جیے

زبانی درویش جگر ریش کہ ایں بلا در سر آمد

کسو معتبر سے روایت ہے اک / کہ درویش سے یہ حکایت ہے اک
کہ اک ملک میں میں قضارا گیا / جواں ایک واں مفت مارا گیا
وہ جس طور مارا گیا اب کہوں / تعجب میں اسکے کہاں تک ہوں
سُن اب آ جو کچھ اسکے جی پر ہوا / مصیبت زدہ بن اجل ہی موا
اُٹھا سیر کرنے کو میں ایک روز / پشیمانی اس کی ہے مجھکو ہنوز

کرے دیدۂ اشک افشاں پہ ناز
بدے لختِ دل رونے کی کچھ نیاز

وہ کاندھے پہ نعشِ تمنا کے تئیں
کرے تعزیت خانۂ دنیا کے تئیں

سنے نہ کسو کی نہ اپنی کہے
بیاں اُس کا کچھ گو مگو ہی رہے

لے آ ساقی گر بادہ کا شوق ہے
سیہ مستی کا ہم کو بھی ذوق ہے

کھلا چاہتا ہے گلِ رازِ عشق
کہ پردے میں کب تک بجے سازِ عشق

رفتن درویش پیش آں جوانِ رفتہ از خویش و دلدہی کردن او و بیش از بیش

یہ قصہ جہاں میں فسانہ ہوا
مجھے بھی سخن کا بہانہ ہوا

ہوئے گاہ وہ شمعِ مجلس فروز
کئی بیتیں پڑھتا تھا وہ سینہ سوز

کہ جن کا یہ مضمون تھا دوستاں
جلے ہیگی تقریر کرتے زباں

بڑی آتشِ عشق سرکش ہے یاں
جگر کیوں نہ جل جائے آتش ہے یاں

نظر آ کہیں جا رہا ہے یہ جی
کہ آنکھوں میں اب آ رہا ہے یہ جی

زن و مرد کی ہوں زباں سے تنگ
ہوا ہوں میں سارے قبیلے کا ننگ

سدا خونِ دل میں طپیدہ ہوں میں
کہ آہِ بلب نارسیدہ ہوں میں

تری دوری میں پہنچی ہے اے حبیب
وداعِ دمِ واپسیں بھی قریب

جگر تو ہوا پانی بہا غم کے بیچ
یہ دم بھی ہوا ہے کوئی دم کے بیچ

سمجھنا یہ بھی ہے مرے سر پہ خاک
کس امید پہ میں ہوا ہوں ہلاک

تو جب سے ورا در پہ نظر آ گئی
رہیں آفتیں میرے سر پہ نئی

نہ نامہ نہ پیغام نے رسم و راہ
تو نہیں ہوتی جاتی ہے حالت تباہ

دل و دیدہ سب مدعی ہو گئے
تماشائی مجھ پہ بہت رو گئے

کئی بار جاں لب پہ آ کے پھر گئی
کہاں ہے تو اے گل ہوا پھر گئی

یہ حیراں ہوں صبر آتا نہیں
تصوّر ترا جی سے جاتا نہیں

خراشِ جگر سے ہے چھاتی میں درد
کہ جس سے ہوا جائے ہے رنگ زرد

دعا کرتی ہے داد بیداد یاں
دلِ شب سے گزرے ہے فریاد یاں

سرِ رہ تک آ دیکھ یہ خستہ حال
کہ ہے نقشِ پا کی طرح پائمال

یہ سُنکر جوانِ زخود رفتہ نے
کیا سوزِ دل کو لبوں پر نمود
سخن ہونے لاگے نمودار کچھ
کہ جس سے یہ معنی ہوئے مستفاد
جو دلجوئی میری ہے مدِّ نظر
نہیں اُسکو درکار کچھ جستجو
زبانی مری در پہ یہ جاکے کہہ
ترے واسطے خوب رسوا ہوا
تسلّی شکیبائی مطلق نہیں
رہی جب تلک تن میں تاب و تواں
شتابی سے دے ساقیا جامِ عشق
ہوا آخراب دل کا سب خونِ ناب
سنے کہنے سے جواں کے غرض قصد کر
سُن آوازِ دستک کی اک رشکِ حور
دو چار آکے مجھسے ہوئی ایکبار
ہوئی دیکھنے سے جب حقیقت عیاں
بشر کیا کہ دیکھ ایسی آفت کے تئیں
کہا میں نے پیغام جس آیا بن
مژہ بختِ عاشق کی برگشتگی
قد و قامت اس کا کروں کیا بیاں
وہ ناز اس حد سر آتی تھی اپسلی
میں سودائی اس زلفِ تاریک کا
شکن اُس کی کاکل کا دامِ بلا
بھوؤں کی کمانوں سے لگتے تھے ناز
اگر ابرو اُس کی جھک جاتی تھی

جگر سوختہ اور دل تفتہ نے
زباں تاب کھانے لگی جیسے دود
لگا کرنے پیچیدہ گفتار کچھ
کہ اے غمگسارِ دلِ نامراد
تو یاں اک محلّہ ہے ٹک قصد کر
سرا ایک ترسا کی ہے قبلہ رو
کہ احوال سے میرے غافل نہ رہ
مرے سر پہ ہنگامہ برپا ہوا
پر اب تابِ تنہائی مطلق نہیں
اُٹھایا تحمّل کا بارِ گراں
کہ لکھنے لگا ہوں میں پیغامِ عشق
پیوں کب تلک اک گلابی شراب
گیا بندہ ترسا کے دروازے پر
مہِ چاردہ سی نپٹ باشعور
گیا جسکے دیکھے سے صبر و قرار
کہا میں کہ تا جس پری تھا جہاں
فرشتہ بھی رو بیٹھے عصمت کے تئیں
یہ خوبی سے اس کی کروں کیا سخن
نگہ ایک عالم کی سرگشتگی
قیامت کا ٹکڑا ہوا تھا عیاں
قیامت بھی آتی جلو میں چلی
ہر اک مو سبب رنج باریک کا
ہر اک حلقۂ زلف کامِ بلا
اُٹھتے تھے اُڑ اُڑ کے جوں تیر مار
مہِ نو کی گردن ڈھلک جاتی تھی

اُسے لغزشِ پائے ناز سے — وہ مستِ سر انداز انداز سے
نہ ہووے وہ دن جس میں ہووے نقاب — چلا جائے پردے ہی میں آفتاب
اُسی بت کا ہر اک تئیں ذکر ہے — خدا کو خدائی کی اب فکر ہے
چڑھاوے اگر ہاتھ سے آستیں — تو پھر دستِ موسیٰ بھی کچھ ہے نہیں
ہوئیں طرح اس سے جفاکاریاں — نکالی ہیں اُن نے دل آزاریاں
ترحم کو پاؤں تلے وہ ملے — ستم اُس کے کوچے سے بچکر چلے
جو آمد ہو اُس کی نصیب چمن — کرے ترکِ گل عندلیب چمن
گلی اس کی فردوس کا تھی شرف — بہشت اک گنہگار سی اک طرف
زمیں اس کی یکدست گلزار تھی — نسیم چمن واں گرفتار تھی
گلی اُسکی وہ قتلگاہ عجیب — شہادت جہاں خضر کو ہو نصیب
رہی جائے باشِ دلِ عاشقاں — اسی پر معاشِ دلِ عاشقاں
صبا گر اُڑا دے تنک اس کی خاک — تو نکلے زمیں سے دلِ چاک چاک
کئی نعرہ کش واں کئی نعرہ زن — کئی خوں گرفتہ کئی بے کفن
کئی بے وطن واں سفر کر گئے — سسکتے ہیں کتنے کئی مر گئے
ہر اک جان سے شخص ناکام کی — ہوا دار اس کے لبِ بام کی
پھروں گرد ساقی نشے میں ترے — گلابی ہی منھ کو لگا ہے مرے
مجھے مست آبِ سیہ دیکھے کر — چلوں جوں قلم پھر بھی مطلب ویر
سُنا وہ جگر سوز پیغام جب — سنے آشنا حرف سے لعل لب
پڑھی اک رباعی یہ کر اعتبار — کہ مضموں جس کا یہ موزوں ہے یار
کہ ہجراں میں جو بیقراری کرے — سرِ راہ فریاد و زاری کرے
نہ سونے دے نالوں سے ہمسایہ کو — بھلی مرگ ایسے فرومایہ کو
محبت کی رہ میں یہ پہلا ہے کام — کہ سر سے گزر جائیے شادکام
نہیں شرطِ اُلفت میں چینِ جبیں — اگر پیش آوے دمِ واپسیں
جو پھوڑا ہی پڑتا ہو جوں آبلہ — وہ ہے دم میں وا ماندۂ قافلہ
نہ ہو جو سکے ہجر کا پائمال — تو بہتر ہے ہونا ہی اُسکا وصال

نہ مشغول یوں ہیں وہ زاری سے تھا　　وہ بیتاب بے اختیاری سے تھا
نہ سمجھی یہ رشک پری اسکے تئیں　　دکھائی دی عشوہ گری اسکے تئیں
چڑھا اُن نے تیوری اک انداز سے　　کہا بیمزہ ہو کے یوں ناز سے
کہ جس کو نہ ہو تاب لانے کی تاب　　شتابی سے مرنا ہے قم اسکا صواب
ہوا سامنے اُسکے میں حرف زن　　یہ اُسکی زباں سے کہا میں سخن
جواں سنتے ہی کرکے ادھر نگاہ　　سفر کر گیا جان سے بھر کے آہ
یہی ماجرا کہنے آیا ہوں یاں　　خبر اُسکے مرنے کی لایا ہوں یاں
کہا اس سے کہ اے کشتۂ غم کی جان　　گیا آخر الامر جی سے جوان
یہ کہہ دس قدم واں سے میں تھا چلا　　کہ اک شور کانوں میں میرے پڑا
گزرنے لگی دل سے آواز آہ　　لگا ہونے آنکھوں میں عالم سیاہ
صدا ایک نوحے کی آنے لگی　　کہ یعنی وہ دختر ٹھکانے لگی
محبت نے کام اپنا پورا کیا　　کہ ان دونوں لعلوں کو چورا کیا
یقیں آن کر سخت نادم ہوا　　کہ میرے سبب دونوں کا جی گیا
یہ بھی جائے گر یہ ہے ساقی سنا　　کہ بدلے گزک کے ہے یاں دل بھنا
تھوڑی دارو دے سایۂ تاک میں　　برنگ گل اب لوٹیے خاک میں

مقولۂ شاعر

عجب کچھ نہیں جا نہ کھا پیچ و تاب　　یہ میر اب جو ہے عشق خانہ خراب
سنا ہے کہ فرہاد پر کیا ہوا　　پھر اس عشق نے شیریں سے کیا کیا
عزا کا ہے مجنوں کی نوحہ پڑا　　سیہ خیمہ لیلیٰ کا بھی ہے کھڑا
گئی جان وامق کی کس رنگ سے　　ہوا خاک عذرا کا سر سنگ سے
گئی آہ نل کی فلک سے ادھر　　دمن سے بگولہ زمیں کے اوپر
بہت عشق کی آگ میں جل گئے　　بہت اُٹھتے جاتے ہیں شعلے نئے
گئی جل کے آخر پتنگوں کی جاں　　چراغوں سے اک دود دل ہے کشاں
ہے بیتاب ذرہ اسی سے کباب　　جلے ہے اسی آگ میں آفتاب

دل اس داغ سے مہ کا بجھتا ہی ہو
گلستاں کا جگر چاک لٹتا ہی ہے

سیہ رنگ اگتا ہے سرو سہی
وہی رنگ قمری ہے خاکستری

بھنورے کے بھی جی پر پڑے گل گئی
کنول کی کھلی آنکھ پھر مند گئی

کوئی نالہ بلبل سے ہے یادگار
خزاں اس چمن میں ہے گل کی بہار

کہیں ساقی دے آب گلرنگ کو
کشادہ بھی کر اس دل تنگ کو

گلے تنگ کے مینا کے کب رو دیئے
فسانہ بھی آخر ہے اب سویئے

بعض سوانحات میر

میر تقی میر دہلوی

در پہ ہر اک دنی کے سماجت مری گئی
نالایقوں سے ملتے لیاقت مری گئی
کیا منفعت ہائے شان شرافت مری گئی
ایسا پھرایا اُس نے کہ طاقت مری گئی
مشہور شہر اب ہوں سبکسار و بے وقار

عرصہ تھا مجھ پہ تنگ اُٹھا ہو کے نیمجاں
پوچھا نہ مجکو یک لب ناں سے کنھوں نے یاں
کم پائی پر بھی سیر کیا میں نے سب جہان
آشفتہ خاطری نے پھرایا کہاں کہاں
برسوں کا راز مجھ سے ہوا آکے آشکار

پرداخت میری ہو نہ سکی اک امیر سے
عقدہ کھلا نہ دل کا دعائے فقیر سے
رخنے ہمیشہ آتے رہے سر پہ تیر سے
ہر چند التجا کی صغیر و کبیر سے
لیکن ہوا نہ دفع مرے دل کا اضطرار

کن نے کی اپنے حال پہ شفقت سے یک نگاہ
نکلے ہے کس سے طور پر اپنے سخن کی راہ
بولا نہ کوئی ہم سے کہ تم کیوں ہوئے تباہ
اسلوب اپنے جینے کا ہو کسطرح سے آہ
ہم ایک ناتوان و ضعیف اور غم ہزار

حاجت مری روا دل پر درد نے نہ کی
تاثیر اشک سرخ و رخ زرد نے نہ کی
تدبیر ایک دم بھی دم سرد نے نہ کی
دلجوئی میری حیف کسی فرد نے نہ کی
طاقت رہی نہ دل میں گیا جان سے قرار

ہر ترک شوخ چشم کرے مجھ پہ کب نظر
ہر چند بند باندھے مرے خوں پہ کیا کمر
ہر وامدار قصد کرے یہ کہاں جگر
یہ منھ نہیں کسی کا جو منھ کو کرے ادھر
ہر کوئی جانتا ہے کسی کا ہوں میں شکار

دل سر بسر خراب ہے تعمیر کیا کروں
آشفتگی حال کی تعبیر کیا کروں
خونابہائے چشم کی تقریر کیا کروں
زردی رنگ چہرہ کی تحریر کیا کروں
آیا جو میں چمن میں خزاں ہو گئی بہار

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دل سوزش درونی سے جلتا ہی جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں مرا میر بیدماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

پہونچنا اُن تلک بہت ہے دور — بات کہنے کا واں کسے مقدور

حاصل ان سے نہ دل کو غیر خراش

چار بچے ہیں مستعدِ کار — دس تلنگے جو ہوں تو ہے دربار
ہیں وضیع و شریف سارے خوار — لوٹ سے کچھ ہے گرمی بازار

سو بھی قند سیاہ ہے یا ماش

در پہ عمدوں کے روز و شب شر و شور — صرف یکسر فریب در رشوت خور
بے لیے دیکھیں نے کسو کی اور — مردہ شو پر وہ سب کفن کے چور

رحمۃ اللہ بر اوّلیں نبّاش

یک بہ یک گر کسو کی موت آئی — اُسکے مردے کی پھر ہے رسوائی
کیونکہ پہونچی ہے جن کو امرائی — سب وہ اولاد حاتم طائی

کون دیگر کفن اُٹھاوے لاش

بالضرورت گیا میں جس کے گھر — آدمی کی نہ جنس تھا وہ خر
بات کرنے لگا تو نیچے نظر — بیمروت سفیہ بدّ نظر

قابل صد ہزار شاش و تراش

ہے جنھیں کچھ بھی رویت دربار — سو فریبندہ مکری و غدّار
کاذب و مفت بر ہے دل آزار — ڈول انکا ہے یہ کہ کریے خوار

کام انکا ہے یہ خراش و تراش

جس پہ ٹھہرے ہے آکے سرداری — اُن سے ہمکو تھی چشم دلداری
معرفت اُن کے بعد صد خواری — فرد دستخط ہوئی جو اکبّاری

جیسے کھینچے لکیریں کوئی نقاش

اس لکھے کا نہیں ٹھکانا کچھ — وہم میں بھی نہیں ہے پانا کچھ
جس پہ دستخط نہ آنے جانا کچھ — بن نہ آیا مجھے بہانا کچھ

غیر اس کے کہ رہے اُٹھوں بشاش

واں سے اُٹھ کر میں یاں ہیں آیا — سخت تغییر حال میں آیا
بارہا یہ خیال میں آیا — کہ زیاں شہ کے مال میں آیا

دل میں دھن جو عیش و عشرت کی — پوچھتے ہیں دوائی شہوت کی
باتیں ہیں رنڈیوں کی صحبت کی — دیکھتے ہے کوئی کتاب حکمت کی
کرتے ہیں بہمنین استعمال

نحور رعنائی کتنے ہیں اللہ — مسی سے کرتے ہیں مسوڑے سیاہ
رکھتے ہیں سر پہ اب ہمیشہ کلاہ — شانہ سے کام ہے گہ و بے گاہ
کپڑے نارنجی سر پہ اودی شال

قیر و چرکیں لباس تنگ معاش — ساتھ رکھتے ہیں ایک موئے تراش
قینچی لیتے ہیں گاہ و گہ منقاش — ہر سر مو پہ اس سے ہے پرخاش
لوگ کہتے ہیں شیخ ہیں چنڈال

آشنا میرے بھی پرانے تھے — ہیں وے اک عمر اک ٹھکانے تھے
یار تھے دوست تھے یگانے تھے — صحبتیں تھیں بہم زمانے تھے
روز و شب ہم گر تھی قال و مقال

اب وے مختار کے ہوئے مختار — ان پہ ٹھہرا ہے سلطنت کا مدار
وہی اس عہد میں ہیں کار برآر — اس طرف سے مرا ہوا جو گزار
نکلے سن نام بہر استقبال

جب ملاقات درمیاں آئی — دستخطی فردیں نے دکھلائی
لے کے میری تسلی فرمائی — پھر نفر پاس اپنے رکھوائی
اور لگے کہنے رکھیے استقلال

فرد نواب کو دکھاؤں گا — حال صاحب کا سب جتاؤں گا
ہے مقدر تو کر ہی لاؤں گا — لے کے دفتر میں آپ جاؤں گا
آگے میرے کسے سخن کی مجال

قدر والا ہماری ہے معلوم — خلق خادم ہے اور تو مخدوم
اس سعادت سے جو رہے محروم — ہے یقینی کہ وہ الاغ ہے شوم
حشر کو ہوگا مرکب دجال

تم بنی فاطمہ ہو ہم ہیں غلام — ہے غلامی تمھاری اپنا کام

تنگ آیا ہیں مفلسی سے کمال

کچھ طرح اور جب نہ بن آئی
کھینچی کیا کیا اُنھوں کی مرزائی
میں ہوا شیخ جی سے مجرائی
پر تسلّی مری نہ فرمائی

مفت عزّت گئی ہوا پامال

ایک مدّت تھی آج کل پر بات
ہے بہت شیخ کی غنیمت ذات
اب تو ہے صبح اب ہوئی ہے رات
جمع آدم میں اتنے کب ہیں صفات

مفتری وردوغی و محتال

ایک دن میں کہا جو ہو مضطر
ہنس کے بولے بہت تلطف کر
کہیئے اس در سے جاؤں اب کیدھر
سر منڈائے ہو تم بھی اس گھر پر

آگے آویں گے جتنے ہونگے بال

راتوں کے تئیں مصیبتیں گزریں
کچھ نہ پوچھو جو حالتیں گزریں
اور دنوں کو قیامتیں گزریں
باتوں باتوں میں مدّتیں گزریں

وعدہ دو چار دن نہ ماہ و سال

پھر جو اُس فرد کا ہوا مذکور
جانتا ہے تمھیں کہ ہو مشہور
کہنے لاگے کہ نائب و دستور
پر کہے ہے رکھو مجھے معذور

جاری کرنا ہے اس کا امر محال

آٹھ آنے ہیں شاہ پر بھاری
آپ ہے تو یہ ہے گرفتاری
اس کی لوگوں نے کی ہے اب خواری
فوج ہے گی تو قحط کی ماری

کیوں نہ جھجار ہے ہیں ان کا کال

عمدے جو ہیں دنوں کو بھرتے ہیں
ہیں سپاہی سو بھوکے مرتے ہیں
سو بھی اسباب گروی دھرتے ہیں
لوہو پی پی کے زیست کرتے ہیں

ایک تلوار نیچے ہے اک ڈھال

رہگیا میں سوچ جی جلاتا ہوں
یعنی ہر یک کے تئیں بلاتا ہوں
کچھ کہے کوئی سر ہلاتا ہوں
کام سرکار کا چلاتا ہوں

کار پرداز ہیں سفیہ و ضلال

ان خیالات کو اڑا دیجے — بند چڑیا کی سی چھڑا دیجے
بس بچھایا بہت فریب کا جال

ہنس کے بولے کہ فرد ہے حاضر — اور سمجھیے نہ مجھ کو بھی قاصر
جان کا ہوں تمھاری میں ناظر — جمع فرمائیے خاطر عاطر
اب نہیں پھر یہ کام ہونگا سنبھال

تب سے اب تک وہ فرد لاتا ہوں — گاہ بیگاہ ان کے جاتا ہوں
وقت پاتا ہوں تو جتاتا ہوں — پر جواب ان سے صاف پاتا ہوں
ایکی باری کا ہے یہ قیل و مقال

مثنوی نسنگ نامہ

پاؤ توفیق تک تو سر کو دھنو — یہ بھی اک سانحہ ہے میر سنو
ہم کو درپیش تب سفر آیا — جبکہ برسات سر ہی پر آیا
ابر ہونے لگے سپید و سیاہ — پانی رستوں میں کیچ ساری راہ
بیچ میں ہوتے کچھ اگر اسباب — منھ اٹھانے کی جی میں ہوتی تاب
سو تو تمل نہ تنبو نہ لوئی — سایہ گستر نہ ابر بن کوئی
ابر ہی بیکسی پہ روتا تھا — ابر ہی سر کا سایہ ہوتا تھا
کیچ پانی میں کپڑے خوار ہوئے — وہ ہیں گاڑی میں جا سوار ہوئے
رہروی کا کیا جو ہم نے میل — بھینس چھیلے کہ تھے بہل کے بیل
آسماں آب سب زمیں سب کیچ — خاک ہے ایسی زندگی کے بیچ
شب کہ دریا پہ ہو کے راہ پڑی — پانی کے سطح پر نگاہ پڑی
سب کے نکلے کا کیا کہوں میں اوج — باتیں کرتی ہے آسماں سے موج
دامن ابر پاٹ دریا کا — دے گرہ تو کہے کہ باندھا تھا
ہوش جاتا تھا دیکھ جوش آب — گوش کرتا تھا کر خروش آب
آب تہ دار اور تیرہ بہت — لہر اٹھتی جو تھی سو خیرہ بہت
پانی پانی تھا شور سے طوفان — دیکھ دریا کو سوکھتی تھی جان

ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے سرا پائی ۔ ویسے گھر چھوٹے ویسی جا پائی
رہنا بھٹیاری کے غنیمت جان ۔ جو کہا اُن نے ہم گئے سب مان
کچھ پکانے کا جب سوال کیا ۔ میں نے اظہار اپنا حال کیا
یاں جو لائے ہیں مجھکو اپنے ساتھ ۔ زندگانی مری ہے ان کے ہاتھ
پہونچے ہے اُنکے روبرو سے طعام ۔ صبح کا صبح مجھ کو شام کا شام
اور پکوا لیجے تو زاید ہو ۔ خامے سے اپنے اور عاید ہو
جو کچھ آیا سو کھا لیا میں نے ۔ کچھ رہا سو اُٹھا دیا میں نے
سُن کے اک دل سے کھینچی اُن نے آہ ۔ اور بولی کہ واہ صاحب واہ
ہم تو جانا تھا آدمی ہو بڑے ۔ چار پانچ آدمی ہیں پاس کھڑے
کچھ یہ کھا دیں گے کچھ کھلا دینگے ۔ ہم کچھ اُن کے سبب سے پا دینگے
سو تو نکلے ہو کورے بالم تم ۔ ہو گدا جیسے شاہ عالم تم
کھانے پینے کی کچھ نہیں یہ بات ۔ دیکھیے کس طرح سے گزرے رات
صدقے ہیں اپنے بھی آتائے کے ۔ سو گئے بخت گھر ہمارے کے
میں کہا مہترانی جی کچھ تو ۔ مجھ سے آزردہ دل نہ اتنی ہو
بعضے کھاتے ہیں کچھ کھلاتے ہیں ۔ بعضے مجھ سے بھی آتے جاتے ہیں
بارے جوں توں ہوئی وہ رات تمام ۔ صبح کو صاحبوں کا ٹھہرا مقام
یہ بھی دن شب ہوا سحر تھا کوچ ۔ غازی آباد کو گئے سب پوچ
راہ طے کر سرا میں جا اُترے ۔ کچھ ستم دیدہ پاس آ اُترے
صاحب اُترے حویلی میں آ کر ۔ باغ میں اُسکے سب تفرجا کر
بار ور تھے درخت سب یہ بھی ۔ پھل ولیکن کنھوں نے پایا بھی
اس بھی منزل میں ایک روز رہے ۔ گزرے جس طور کوئی کس سے کہے
لوگ جبدم سوار ہونے لگے ۔ اور اسباب بار ہونے لگے
سو بھی اس روا روی میں گئی ۔ لوگ تھے مضطرب جگہ تھی نئی
وحشت اسکو زبس کہ طاری ہوئی ۔ سر ٹپک کر کسی طرف کو ہوئی
ادہر اودہر تلاش کر دیکھا ۔ گم شدہ کو نہ پھر نظر دیکھا

کھنڈر نے اس میں تین چار مکان ‌ ‌ جنکا گرنے پہ سخت ہے میلان
وہ گڑھی ساری کھتّے ناج کے تھے ‌ ‌ برسوں سے تھے پڑے ناج کے تھے
خاک مٹی سے ان گڑھوں کو بھرا ‌ ‌ بنگلا اک لاکے اُسکے بیچ دھرا
خشتی پائے اگر نہ بنواتے ‌ ‌ باؤ میں اس سمیت اُڑ جاتے
باؤ جنگل کی تُند کچھ نہ رکاؤ ‌ ‌ مینھ میں چل پڑے تو کانپے جاؤ
اک گڑھی جس کی سیکڑوں راہیں ‌ ‌ واں ٹھہرنے کو چاہیئے باہیں
وہ رہے جو رکھے بہت سے لوگ ‌ ‌ یا کوئی جوگی جو کرے واں جوگ
ورنہ مشکل بہت ثبات قدم ‌ ‌ دل میں اک ہول ہی رہے ہر دم
باؤسی دن کو سائیں سائیں کرے ‌ ‌ رات ہووے تو بھائیں بھائیں کرے
گر شکستہ ہوئی کہیں دیوار ‌ ‌ بے زری سے بنانا ہے دشوار
ہفتہ ہفتہ تلک پڑی ہے خراب ‌ ‌ پردہ کا ہے کا پھر ہے رفع حجاب
کار پردازوں کو تقیّد ہے ‌ ‌ شور ہے گالی ہے تشدد ہے
وے بچارے بہانے کرتے ہیں ‌ ‌ رات دن لوگ چوکی بھرتے ہیں
کہتے اُن سے تو یہ ملے ہے جواب ‌ ‌ کس کے گھر سے بناویں لاکے شتاب
ہم کو کھانے ہی کا تردّد ہے ‌ ‌ صبح بقّال کا تشدّد ہے
بنیا مُنھ کو چھپائے جاتا ہے ‌ ‌ روٹی کا فکر کھائے جاتا ہے
حال کب پوچھنے کے ہے قابل ‌ ‌ ہم فقیروں کے رنگ ہیں سائل
سوچیں ہیں جب تو بھول جاتے ہیں ‌ ‌ بات کہتے ہیں بھول جاتے ہیں
تم کو دیوار پاکھے ہیں گے یاد ‌ ‌ ہم کو کرتا نہیں خدا آزاد
کس کو سوسیں کہاں سے کچھ لادیں ‌ ‌ دال آٹا جو تم کو پہونچاویں
تم کہو دال ماش کی ہے زبوں ‌ ‌ یاں بہم پہونچے ہے جگر ہو خوں
تم کہو آٹا کرکرا کھایا ‌ ‌ یاں کلیجہ چھنا تو ہاتھ آیا
اور دو چار روز یہ بھی ہے ‌ ‌ ایک غم سینہ سوز یہ بھی ہے
فصل ہونے ابھی نہیں پائی ‌ ‌ پیشگی سب سے قرض لے کھائی
جس سے جھوٹے ہوئے ہیں ہم دن اس ‌ ‌ چوٹھا وہ کہے ہے ساہوکار

گھر میں چھپکلے اگر تھے توڑ دیے
ہانڈی باسن گرا کے پھوڑ دیے

لوگ سوتے ہیں کتنے پھرتے ہیں
لڑتے ہیں دوڑتے ہیں گرتے ہیں

جبکہ ہڈی پہ چار چار لڑیں
گوشت پر بھیڑیے سے دوڑ پڑیں

ایک کے پیچھے ایک روز و شب
لینڈی سی واں نہ بندھ رہی تھی کب

کتے ہی واں دو چار رہتے ہیں
دو گئے بھی تو چار رہتے ہیں

جاگتے ہو تو دو بدو کتے
سو کر اٹھو تو روبرو کتے

سر پہ دربان کے بلا ہی رہے
کتا ایک آدھ گھر میں جا ہی رہے

منھ میں کت دور دور کرنے سے
حال بیحال شور کرنے سے

تو کہے لگے وہ گلا پھاٹا
باؤلے کتے نے اسے کاٹا

کتوں کی کیا سماجتوں کو کہیں
چچڑی سے رات دن لگے ہی رہیں

باہر اندر کہاں کہاں کتے
بام و در چھت جہاں تہاں کتے

جھڑ جھڑا دے ہے کان کو کوئی
رووے ہے اپنی جان کو کوئی

ایک طرف ہے چپڑ چپڑ کی صدا
یعنی کتا ہے چپلی چاٹ رہا

ایک چپنے کو منھ میں لے آیا
ایک چوٹھے کو کھودتا پایا

ایک کے منھ میں ہنڈی ہو کالی
ایک نے چلنی چاٹ ہی ڈالی

تیل کی کپی ایک لے بھاگا
ایک چپنے گھڑے سے جا لاگا

کتے یارو یک جان کا تھا روگ
جاں بلب ہوں نہ کس طرح سے لوگ

آدمی کی معاش ہو کیونکر
کتوں میں بود و باش ہو کیونکر

بستی دیکھی سو ایسی تھی آباد
کہ بیابان سخت ہے دے یاد

چار چھپر کہیں چاروں کے
سو بھی ٹوٹے گرے بچاروں کے

پھر چلو تم گے تو نہیں ہے کچھ
ڈھنڈھ سا اور جو کہیں ہے کچھ

پھوٹی ٹوٹی سو کوئی حویلی ہے
سو بھی میدان میں اکیلی ہے

ایک دو مردے سے پڑے ہیں واں
زرد ہو ہو گئے ہیں بے لب ناں

لوگ ایسے مکان سب ایسے
ایسی جاگہ سے اچٹیں دل کیسے

اور جو چار گھر نظر آئے
ان کی خوبی کھلے وہیں جائے

ایک تکیہ نہ جس میں فرش کاہ
ٹکڑے ٹکڑے کی احتیاج اسکو
برسوں جیلا کے ناامید ہوا
آتے جاتے سے اُن نے جو پایا
گرد جو چار خاک کے سے ڈھیر
اپنا تو اعتقاد تھا ہی کم
کچھ نہ دیکھا ہم اُن بھی گوروں سے
کی توجہ جو ٹک دردوں کی اور
جس سے چھاتی میں درد ہونے لگا
پھر زمینداروں میں نفاق ہوا
دونوں کا اک جدا ہی مطلب ہے
آس پاس اُس گڑھی کے آئی جھیل
ایدھر اودھر اُتر کے پانی جاتو
اُس سے واں کی ہوا بہت مرطوب
کتنے روزوں میں ہوتی ہے کھانسی
پھر وہ درجہ ہے جس میں ہوتے دق
پڑی آفت خطر تھا سکھوں کا
اس میں آ جاتے تو قیامت تھی
نہ کوئی دادرس نہ وقت داد
کیا کڑھب چرخ کج نے پھینکا تھا
جس نے قدرت نمائی کی اپنی
بس ستم ہے صریر تیری تند
بے نیازی کا تجھ کو کب ہے دماغ
ہو چکی صاحبوں کی فرمایش

حالِ درویش قابل صد آہ
مرض جوع لاعلاج اُس کو
پچکی سادھی جگر میں چھید ہوا
اُسی پر رہ گیا وہی کھایا
جن کو کہتے تھے لیٹے ہیں یاں شیر
پر کبھو بلی بھی نہ دیکھی ہم
کام نکلا سو اپنے زوروں سے
دل جگر پر مرے پڑا کچھ زور
رنگ چہرے کا زرد ہونے لگا
یہ عجب اور اتفاق ہوا
یہ کہے روز وہ کہے شب ہے
گم تھے برسات میں طریق وسبیل
نہر ہے پھر جو ٹک بھی ہووے چڑھاؤ
ہووے نزلہ زکام بے اسلوب
ایسی جیسے گلے میں دیں پھانسی
یہ کوئی نکلی ایک ثالث شق
کیونکہ وہ ملک گھر تھا سکھوں کا
مال وجاں عرض سب کی رخصت تھی
مفت ہی ہم گئے تھے سب برباد
پر خدا کچھ ہمارا سیدھا تھا
اس بلا سے رہائی کی اپنی
شور سے تو پڑا جہاں میں ڈوند
ایسی باتوں سے میں کیا ہی فراغ
چپ رہ اب ہے زمان آسایش

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مثنوی خواب خیال میر

خوشا حال اس کا جو معدوم ہے
کہ احوال اپنا تو معلوم ہے

[illegible]

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی / در و بام پر چشم حسرت پڑی

کہ ترک وطن پہلے کیونکر کروں / مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں

دل مضطرب اشک حسرت ہوا / جگر رخصتانے میں رخصت ہوا

کھنچا ساری رہ دامن چاک دل / رہا بر قفا روے غمناک دل

پس از قطع رہ لائے دلی میں بخت / بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت

جگر جور گردوں سے خوں ہو گیا / مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا

ہوا خبط سے مجھ کو ربط تمام / لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام

کبھو کف بلب مست رہنے لگا / کبھو سنگ در دست رہنے لگا

کبھو غرق بحر تحیر رہوں / کبھو سر بجیب تفکر رہوں

یہ وہم غلط کاریاں تک کھنچا / کہ کار جنوں آسماں تک کھنچا

نظر رات کو چاند پر گر پڑی / تو گویا کہ بجلی سی دل پر پڑی

مہ چاردہ کار آتش کرے / ڈروں یاں تلک میں کہ جی غش کرے

توہم کا بیٹھا جو نقش درست / لگی ہونے وسواس سے جان سست

نظر آئی اک شکل مہتاب میں / کمی آئی جس سے خور و خواب میں

اگرچند پرتو سے مہ کے ڈروں / ولیکن نظر اس طرف ہی کروں

ڈروں دیکھ مائل اسے اس طرف / بحدے کہ آ جائیں ہونٹھوں پہ کف

رہی فکر یاں میرے احباب کو / اڑا دیویں سب گھر کے اسباب کو

ہوئے پاس کوئی تفاوت سے ہو / سراسیمہ کوئی محبت سے ہو

کوئی نزد دیدہ سے گریہ ناک / گریباں کسو کا مرے غم سے چاک

جو دیکھوں تو آنکھوں سے لوہو بہے / نہ دیکھوں تو جی پر قیامت رہے

لگے چشم بندی کو ہر بار غیر / وے منزل دل میں اس مہ کی سیر

وہی جلوہ ہر آن کے ساتھ تھا / تصور مری جان کے ساتھ تھا

اگر ہوش میں ہوں وے بے خبر / وہ صورت رہے میرے پیش نظر

اسے دیکھوں جب سر کروں میں نگہ / وہی ایک صورت ہزاروں جگہ

نگہ گردش چشم سے فتنہ ساز / مژہ آفت روزگار دراز

رہوں زرد میں گاہ بیمار سا | پریشاں سخن گہ پریدار سا
پری خواں کو لا کوئی افسوں پڑھائے | کسو سے کوئی جا کے تعویذ لائے
طبیبوں کو آخر دکھایا مجھے | نہ پینا جو کچھ تھا پلایا مجھے
دوا جو لکھی سو خلاف مزاج | کھنچا اس خرابی سے کار علاج
کہ سررشتہ تدبیر کا گم ہوا | دل اوپر ہجوم توہم ہوا
دروں خود بخود بیحواسی رہی | پریشاں دلی اور اداسی رہی
کہوں نکل جاؤں باہر کہیں | نہ گھر میں لگے جی نہ باہر کہیں
قیامت جنوں کا رہے سر میں شور | کھنچا جائے دل کوہ و صحرا کی اور
رہے شوق سر در گریبانِ دل | ہوا کھینچے صحرا کو دامانِ دل
سر آشفتہ زلف گرہ گیر کا | قدم حلقہ در گوش زنجیر کا
جنوں آہ درپے ہوا جان کے | تجویز ہوئے یار زندان کے
کیا بند اک کوٹھری میں مجھے | کہ آتش جنوں کی نگرداں مجھے
لب نان اک بار دینے لگے | دم آب دشوار دینے لگے
کہاں علم کا کسب فرصت نہ آہ | ہوا کا بھی واں گشت روزن کی راہ
نہ آوے کوئی ڈر سے میرے کنے | کہ کیا جانیے کیسی صحبت بنے
وہ آشفتہ سر ہوشمندی سے دور | نہیں رابطہ مقتضائے شعور
وہ حجرہ جو تھا گور سے تنگ تر | در اس کا نہ کھلتا تھا دو دوپہر
جو اس میں کبھو میں سنبھل بیٹھتا | تو باہر بھی اک دم نکل بیٹھتا
سر شام بیٹھا تھا میں ایک روز | افاقت نہ آئی تھی مجھ کو ہنوز
کہ یاروں نے برجستہ تدبیر کی | مرے خون میں کچھ نہ تقصیر کی
اگرچند کہنے کو خوں کم کیا | لیا لوہو اتنا کہ بیدم کیا
بڑی دیر تک خون جاری رہا | میں بیہوش وہ رات ساری رہا
جگایا سحر مجھ کو اک شور سے | کھلی آنکھ میری بڑے زور سے
وہی دست فصاد میں نیشتر | وہی رنگ صحبت کا پیش نظر
وہی لوہو لینے کا ہنگامہ پھر | وہی تر لہو میں مرا جامہ پھر

کہیں لب پہ وہ شکوۂ خوں چکاں
کہ ٹپکا کرے جس سے آزار جاں

کہیں وہ نگہ جس سے یہ پائیے
کہ یہ درد دل ہے تو مٹ جائیے

کہیں وہ روش جس سے نکلے عتاب
کہیں وہ طرح جس سے رہیے خراب

کہیں حرف زن اس طرح ناز سے
کہ دیکھا گیا دل کس انداز سے

کہیں وہ ادا جس سے معلوم ہو
کہ جیسے وہ عاشق کہ محروم ہو

کہیں وہ سخن جو جگر خوں کرے
کہیں طرز ایسی کہ مفتوں کرے

کہیں وضع ایسی کہ بیگانہ ہے
کہیں آشنا ہے تو دیوانہ ہے

کسو جا ہے جلوے میں اس آن سے
کہے تو کہ بیزار ہے جان سے

کسو وقت اُس کا یہ اسلوب ہے
کہ شرم محبت سے محجوب ہے

کبھو بیقراری ہے اس رنگ سے
کہ پھرتی ہے سر مارتی سنگ سے

کبھو بے ادائی و دشنام ہے
کبھو باد کے ہاتھ پیغام ہے

کہ اے بیوفا آہ دل نرم کر
محبت کی بھی مُنھ سے کچھ شرم کر

کبھو وہ تمسخر کہ پروا نہیں
کبھو کیونکہ کہیے کہ سودا نہیں

کبھو یہ سخن جس سے ہو مستفاد
کہ اے بیوفا حرف من یاد باد

کہ ظاہر میں میرؔ اب تو آنا گیا
کہ وہ دوستی کا زمانہ گیا

غرض ناامیدانہ کر اک نگاہ
وہ نقش توہم گیا سوے ماہ

نہ آیا کبھو پھر نظر اس طرح
نہ دیکھا اُسے جلوہ گر اس طرح

مگر گاہ سایا سا مہتاب میں
کبھو وہم سا عالم خواب میں

دل خوپذیر وصال دوام
رہے خواب میں روز و شب صبح و شام

اگر وصل خواب فراموش تھا
ولیکن وہی خواب کا جوش تھا

پلک سے پلک آشنا ہے وہی
ز خود رفتگی کی ادا ہے وہی

کھڑا ہوں تو سوتا ہوں اک ذوق میں
رگ خواب دل ہے کف شوق میں

جو بیٹھا ہوں خواب گراں ہے مجھے
وہ غفلت جہاں در جہاں ہے مجھے

خیال اس کا آوے کہ سن ہو رہوں
تلے سر کے پتھر رکھوں سو رہوں

مجھے آپ کو یوں نہیں کھوتے گئی
جوانی تمام اپنی سوتے گئی

بھلا جی کے جانے کا کیا ہے بیاں
جوانی گئی موسم شیب ہے
ہنسوں کیونکہ ہنسی میں دنداں نما
گیا شور سر سے جھکا ہے بہت
نہ وہ ذائقہ ہے نہ وہ ہے مشام
کمر میں لس کیا ہر گھڑی ہو صداع
بلا ارتعاشیں تن زار ہے
ہوا حافظہ بسکہ نسیاں کا صرف
ہوئے شعر کیا کیا فراموش ہائے
نہ پوچھو لب و لہجہ بے طور ہے
نہیں گور کے کام سے کچھ فراغ
نہ کچھ یوں نہیں عینک نظر چڑھ گئی
نہ رکھیے جو عینک نہ آوے نظر
رہیں دیکھ جو حرف زن ہو حریف
صد افسوس لطفِ سماعت نہیں
شباب آہ داغِ جگر دے گیا
نہ کچھ زورِ بازو بہت کم ہوا
جوانی کی شب کیا بسر ہو گئی
بدن زار اعضا سبھی رعشہ دار
جو یہ چال ہی جا رہے ہیں ہم اب
کھڑے ہوں تو تھرائے ان دو ساق
جو یوں پاؤں چلتے بچلتے رہے
اگر ضعف سے چپ ہی بیٹھے ہیں ہم
گئے ہیں نہیں اپنے تک پا و دست
جو بازو ہیں اپنے وہ بازو نہیں

عیاں ہے کہ کہتے ہیں جاں کو رواں
شہود ایک دو روز کو غیب ہے
کہ ہے جا سے دنداں ہی دنداں نما
گئی وا شد اب دل رکا ہے بہت
مزا کچھ نہیں ہو چکی صبح و شام
نہیں لذت اکل و شرب و وقاع
ہر اک عضو چلنے کو تیا رہے
نہیں یاد آتا ہے دوشینہ حرف
کہوں کیا گزرتی ہے خاموش ہائے
سخن کرنے کا ڈھنگ ہی اور ہے
کسے ذوقِ صحبت کہاں ہے دماغ
بصارت کی بیطاقتی بڑھ گئی
کہے تو کہ اعمیٰ ہیں ہم بے بصر
رہا سننے کے گوں نہ سمعِ شریف
صدا دور سے جیسے آوے کہیں
قدِ خم زمیں کی طرف لے گیا
جھکا سر سو زانو کا ہمدم ہوا
سفیدی مو سے سحر ہو گئی
کرے کون خوباں سے بوس و کنار
دموں پر غرض آ رہے ہیں ہم اب
جئیں بیٹھے کیونکر کہ جینا ہے شاق
تو دیکھو گے ہم یاں سے چلتے رہے
یہ سوچو تو کیا کیا نہ کہتے ہیں ہم
کیا خاک میں مجھ کو پیری نے سخت
اگر منھ کو دیکھو تو وہ رد نہیں

فرہنگ کلیاتِ میرؔ

(از مصور درد مولانا عبد الباری آسی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف الف

آبخست ترکاری۔ وہ ترکاری یا پھل جو اندر سے خراب اور ترش ہو گئے ہوں۔ یا پانی کی وجہ سے خراب ہوں۔

آجکل بتانا۔ جھوٹے وعدے کرنا۔ روز حیلے حوالے کرنا۔

آدمی گری۔ آدمی بنا دینا مجازاً تمیز سکھانا۔ فارسی لغت میں معنی ایجاد کردن آدم لکھا ہے۔ یہ لفظ اکثر طنزاً مستعمل ہوتا ہے۔

آش بغرا۔ آش ہر رقیق غذا کو کہا جاتا ہے نیز کہا جاتا ہے کہ آش بغرا بغرا خاں کی ایجاد ہے جو ترکستان کے سرداروں میں سے تھا۔ بعض نے خوارزم کا بادشاہ بتایا ہے۔ اس کے بنانے کی ترکیب یہ بتائی گئی ہے کہ کاغذی لیمو کے برابر یا اس سے کچھ چھوٹی بیسن کی گولیاں بناتے ہیں اور اس کو شوربا دے کر پکاتے ہیں آئین اکبری میں لکھا ہے کہ ایک قسم کا پلاؤ ہے۔ جو گوشت بیسن گھی۔ شکر۔ سرکہ۔ گاجر وغیرہ سے تیار کیا جاتا ہے۔

آشنالب۔ خوشامدی۔ آشنائی وہ خوشامد جو اکثر شکم پرست اپنے پیٹ بھرنے اور کھانا ملنے کے لیے کرتے ہیں۔

آفتابہ۔ ایک خاص طرح کا لوٹا جس سے ہاتھ منہ وغیرہ دھوتے ہیں۔

آفتابی۔ عالی شان مکانوں میں ایک جگہ ماہتابی کی طرح بناتے ہیں جو دھوپ میں بیٹھنے کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ ۲۔ ماہی مراتب میں چاندی سونے کا ایک دائرہ ہوتا ہے جس میں ایک ڈنڈی لگی ہوتی ہے بادشاہوں کے جلوس میں ساتھ ہوتا ہے اور اسی کا سایہ چتر کی طرح سر پر ہوتا ہے۔ (نور اللغات) ایک قسم کی آتشبازی! ایک قسم کی چھوٹی پنکھیا۔

اکراہ۔ زبردستی۔ فارسی والے کراہت کے معنے میں بھی استعمال کرتے ہیں۔

اکلائی۔ وہ اوڑھنے کا کپڑا جو اکہرا ہو۔ دولائی۔ دوہرا۔

اکہہ۔ مادرزاد اندھا۔

اُکساس۔ اُکتا اُٹھنے کی حالت۔

اُلٹ پلٹ۔ ہیرا بازی۔ داؤ پیچ۔

الجھاؤ۔ جھگڑا۔ بکھیڑا۔ دقت۔ مشکل۔ ۔ اُلجھنا۔

الحاح۔ رونا دھونا۔ عاجزی کرنا۔ گڑگڑانا۔

القاص لا یحب القاص۔ قصہ گو قصہ گو کو دوست نہیں رکھتا مراد یہ کہ دو ہم پیشہ باہم صاف نہیں رہتے ہیں۔

اَلنج۔ کلام میر میں یہ لفظ ایک ساقی نامہ میں آیا ہے ؎ جوش بادہ سے النج و سنگ ؛ شفقی ہو گیا ہوا کا رنگ ؛ لیکن النج لغت میں مجھے نہیں ملا۔ غالباً یہ النگ بروزن کلنگ کا بدل ہے جو مرغزار و سبزہ زار کے معنے میں ہے اور یہ یہاں موزوں اور درست ہے۔ اسی طرح النج اورنگ کا بدل ہے۔ نیز النگ اس دیوار کے معنے میں ہے جو لشکر کی محافظت کو بناتے ہیں۔

اُلو ماخڑا۔ بیوقوف۔ گدھا۔

الیچنا۔ کوئی رقیق شئے یا پانی کسی جگہ سے نکال کر پھینکنا۔

انابت۔ بُرے کاموں سے باز آنا۔ خدا کی طرف متوجہ ہونا۔ کسی کو نائب بنانا۔

انتعاش۔ بھڑک۔ صحت

انتھا لینا۔ تھاہ لینا۔

اندرونہ۔ مجازاً دل۔

اندھیرا پاکھ۔ ہر قمری مہینے کے دو پاکھ ہوتے ہیں۔ پہلا اندھیرا پاکھ اور دوسرا اُجالا پاکھ کہلاتا ہے۔

انگدان۔ جسم کا دان جسم کی زکوٰۃ اور صدقہ۔

انگڑانا۔ انگڑائی لینا۔

انمنا۔ اُداس۔

اُن نے۔ اُس نے۔

انوٹھا۔ انوکھا۔ وہ کھانے کی چیز جس میں سے کسی نے کچھ کھایا نہ ہو۔

اَور۔ بروزن مور۔ طرف۔ جانب

اوک دینا۔ قے کرنا۔

ایجاز۔ اختصار۔

اینا تینا۔ ایک کلمہ جو تحقیر کے لیے۔ غصہ اور آزردگی کی حالت میں کہتے ہیں۔

ایک اور ایک گیارہ۔ چونکہ ایک کے ہندسے پر ایک اور بڑھانے سے گیارہ کا ہندسہ بنجاتا ہے۔ اس لیے یہ فقرہ اس جگہ بولتے ہیں جہاں یہ دکھانا مقصود ہوتا ہے کہ ایک سے دو کی طاقت زیادہ ہوتی ہے

ایکون بجائے ایک استعمال کیا ہے۔

ایل۔ بزکوہی۔ گوزن۔ بارہ سینگا۔

اینٹ کا گھر مٹی ہونا۔ کنایۃً تباہی۔ بربادی۔ کیا کرایا سب خاک میں ملجانا۔ گھر برباد ہونا۔

برافتادہ ہونا۔ دور ہونا۔ محو ہونا
ناپید ہونا۔
برخورد۔ ملاقات۔
براق۔ نہایت چمکدار۔
برخویش چیدہ۔ وہ شخص
جسکی وضع اپنی حیثیت و مقدور
سے زیادہ ہو۔ مغرور و متکبر۔
بر مجنوں۔ مراد وادی نجد سے۔
برآویزی۔ اُلٹا لٹکانا۔ مراد
سزا ہے۔
بز اخفش۔ اخفش جو علم صرف و
نحو کا ایک عالم تھا اس نے ایک
بکرا پال رکھا تھا جب اخفش دیر تک
سبق حفظ کرتا رہتا تو وہ بکرا بوت
تھا۔ اخفش اُسکو اپنے حفظ کی تصدیق
سمجھ کر اُسوقت خاموش ہو جاتا تھا
بزگیری۔ کنایتاً چوری۔
بزن گاہ۔ قتل گاہ۔
بزرد۔ ایک پرندہ آبی۔
بسا ہنا۔ مول لینا۔ خریدنا۔ لگانا
جیسے رنگ بسا ہنا۔
بستار۔ پھیلاؤ۔
بسرام۔ آرام۔
بسنا۔ بھوتنا۔ مجازاً بگڑنا۔ خراب ہونا۔
بصل۔ پیاز۔

بغل پروردۂ طوفان۔ وہ کہ
جس نے طوفان میں آنکھ کھولی ہو
جس نے مصیبت میں پرورش پائی ہو۔
بکانا۔ بکنا۔
بکرے کی اولاد غیر صحیح النسب
جو حلالی نہ ہو۔
بکرے کی جھیل۔ لکھنؤ کے
کسی محلہ یا مقام کا نام تھا۔
بکھیرنا۔ پراگندہ کرنا۔ پریشان کرنا
بلانج۔ بہت زیادہ نگلنے والا
مراد ہے پرخور سے۔
بلونا۔ دہی کو متھانی یا رہی سے
متھنا۔ مجازاً گھنگھولنا۔
بلی۔ طاقتور۔ زوردار۔
بناگوش۔ کان کی لو۔
بندرابن۔ ایک مقام کا نام
جو متھرا کے قریب ہے۔
بندیلا۔ جنگلی سور۔
بنگاہ۔ منزل مکان۔ نقد و جنس
و اسباب رکھنے کی جگہ۔
بوتیار۔ بگلا۔
بوغا نکل جانا۔ پٹتے پٹتے
بھرکس نکل جانا۔
بو کرنا۔ سونگھنا۔
بہبہا۔ زبردست۔ سخت۔

بھدرک۔ لطف۔ مزہ۔ خوبی۔ برکت
بھرنے بھرنا۔ مینھ کا تیزی اور
بڑی بڑی بوندوں کے ساتھ برسنا۔
اسی کو بھرن کہتے ہیں۔
بھبھر۔ دلدل کی زمین۔
بھسم۔ جلی ہوئی چیز جو خاک ہو جائے۔
بھسمنت۔ جلکر راکھ ہوئی چیز۔
بھگت۔ مقدس آدمی امور
مذہبی کا پابند۔ ایک فرقہ جو ناچنے
گانے والے لڑکوں کو تعلیم دیتا ہے۔
بھلاوا۔ دھوکا۔ مغالطہ۔
بھیڑ بھیہ۔ لشکر کے ساتھ کے شاگرد پیشہ
اور سودا سلف بیچنے والے لوگ۔
بھیچک۔ حیران۔ بھوچکا۔
بیاہ رچنا۔ شادی کی خوشی
منانا۔ شادی کے سامان ہونا۔
بیت بحثی۔ بچوں کا شعر خوانی
میں باہمی مقابلہ۔
بیتیل۔ بیتال۔ بہت زیادہ کڑ صعب۔
بے تہ۔ بے اصل۔ بے حوصلہ
معمولی لیاقت والا۔ بات کی
اصل کو نہ پہنچنے والا۔
بے تہی۔ بات کی تہ کو نہ پہنچنا۔
بید مجنوں۔ ایک قسم بید کی۔
بے ہیچ۔ کم مایہ۔ فرومایہ۔ بے تہ

تائے فوقانی

تابہ۔ توا۔

تاج خروس۔ مرغ کیس۔ ایک بوٹا جس پر مرغ کے کیس کی طرح پھول آتا ہے۔

تانی۔ دیر۔ ڈھیل۔

تبختر۔ ناز اور غرور کے ساتھ چلنا

تپک۔ پھوڑے کے درد کی ٹیس

تجنا۔ چھوڑنا مجازاً قربان کرنا۔

تخفیفہ۔ ایک قسم کی چھوٹی پگڑی۔

تخلل۔ کسی چیز کا گزر جانا کسی چیز میں خلل پیدا ہونا۔

تد۔ بجائے تب۔

تراکم۔ انبوہ۔ ہجوم۔ ایک جگہ جمع ہونا۔

تردامن۔ گنہگار۔ فاسق۔ فاجر

تردستی۔ چابکدستی۔ چستی۔ چالاکی۔

ترسا۔ قوم نصاریٰ کا عابد۔ راہب

ترسل۔ مکتوب۔ وہ کاغذ جس میں بہت سے خط جوڑے جاتے ہیں اور شکستہ خط پڑھنے کی مشق کے لیے بچوں کو پڑھاتے ہیں

ترک۔ چھوڑنا۔ کسی کتاب کے صفحہ کا ابتدائی کلمہ جو اس سے پہلے صفحے کے آخر میں گوشہ پر اس غرض سے لکھتے ہیں کہ اُسکے بعد کے صفحے کا پتہ چل سکے رکاب

تسبیح سلیمانی۔ سنگ سلیمانی کی تسبیح۔ سنگ سلیمانی میں باریک خط سے ہوتے ہیں

تسیر بھی۔ بجائے اسیر بھی۔

تشتت۔ پریشانی۔ پراگندہ ہونا۔ فکر۔

تظلم۔ فریاد ظلم کی فریاد۔ دادخواہی

تعریض۔ کنایۃً کوئی بات کرنا۔ کسی چیز کو پھیلانا۔ اسباب سے اسباب بدلنا۔ بیمار ہونا۔

تعلل۔ کسی کام میں مشغول ہونا کوئی علت پیدا کرنا۔ مجازاً بہانہ بازی۔ حجت کرنا۔

تغدار۔ ایک قوی الجثہ پرند جسے تگدار بھی کہتے ہیں۔

تفحص۔ کاوش کرنا کسی امر میں۔

تفرج۔ کشایش پانا تنگی سے دور ہونا۔ مجازاً سیر و تفریح۔

تک۔ تاک۔ موقع کا انتظار

تکمہ ریشی۔ تکمہ بزبز۔ ریش داڑھی۔ بکرے کی داڑھی۔

تگرگ۔ اولا۔

تگ و پو۔ دوڑ دھوپ۔

تل۔ زیت وغیرہ کا ٹیلہ۔

تلنگا۔ وہ سپاہی جو انگریزی وردی پہنے ہو۔ چونکہ ابتدائے عہد سلطنت میں انگریزوں نے تلنگانہ میں فوج بھرتی کرکے اُس کو انگریزی لباس پہنایا تھا اسی واسطے سپاہی کے معنے میں یہ لفظ مشہور ہوا اب مجازاً سپاہی کے معنے میں مستعمل ہے۔

تلوار کرنا۔ بجائے تلوار چلانا۔

تلواسہ۔ اضطراب بیقراری۔

تمھارے منھ میں کے دانت ہیں۔ پرسان حال ہو۔ کہا جاتا ہے کہ کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ تمھارے منھ میں کے دانت ہیں۔

تنک۔ تھوڑا سا۔ ذرا سا۔

تنک حوصلہ۔ کم حوصلہ۔

تنک شراب۔ وہ شخص جو تھوڑی شراب پینے کے بعد بہک جائے

تنگ۔ گون۔ ایک قسم کی بوری

حرف جیم عربی

جاذبہ۔ جذبہ۔

جاگہ۔ جگہ۔

جام داری۔ ساقی گری

جامہ خانہ۔ وہ جگہ جس میں سلے ہوئے اور بے سلے کپڑے رکھے جاتے ہیں اور جہاں لباس بدلتے ہیں۔

جامہ کرتی۔ زرد رنگ کا کپڑا۔

جان پر آنا۔ جان پر بننا۔

جاہی جوہی۔ ایک آتشبازی کا نام

جائے گور۔ دار۔ گور کے قابل جگہ۔

جبال۔ جبل کی جمع بہت سے پہاڑ۔

جباہ۔ جبہہ کی جمع پیشانیاں۔

جب نہ تب۔ وقتاً فوقتاً۔

وقت بے وقت۔ مراد زمانے کے غیر متعین ہونے سے۔

جتن۔ تدبیر۔ ترکیب۔

جتنا۔ بھڑنا۔ گتھنا۔ باہم لڑنا۔

جحب۔ بجائے جیب۔

جدول۔ ندی۔ خط۔

جرگہ۔ حلقہ۔ گھیرا۔ صف۔ وہ گھیرا جو شکاری اسلیے باندھتے ہیں کہ شکار باہر نہ جائے۔ اکھاڑا

جریدہ۔ دفتر۔ تنہا۔

جسد۔ جسم۔ بدن۔

جسمِ رنج فرسا۔ وہ جسم جسے رنجوں نے لاغر کر دیا ہو۔

جلاب لگ جانا۔ دست آنا۔

جلف۔ بیوقوف۔ احمق۔ بُرا آدمی

جماہنا۔ جماہی لینا۔

جمل۔ نر اونٹ۔

جناغ۔ زناخ مرغ یا کبوتر کے سینے کی ہڈی جو دو شاخ ہوتی ہے۔ اسی سے زناخ توڑنا بولا جاتا ہے۔ دو عورتیں سینۂ مرغ کی ہڈی کو باہم مل کر توڑتی ہیں۔ اور وہ دونوں ایک دوسری کو زناخی کہتی ہیں۔ زناخی سے مراد ہمراز ہم نوالہ و ہم پیالہ سہیلی ہوتی ہے۔

جنگلہ۔ جنگل۔

جواد۔ جیدار۔ دلیر۔

جوگا۔ لائق۔ قابل۔

جوں جوں۔ جیسے جیسے۔

جوہرِ اوّل۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام۔

جھاڑا ہونا۔ جھڑ جھڑ کر صاف ہونا۔ خالی ہو جانا۔ صفایا ہو جانا۔

جھاڑ جھنکاڑ۔ اُلجھے سُلجھے درخت جھاڑیاں وغیرہ جو ملے ہوئے اُگے ہوں۔

جھانجھ۔ ایک قسم کا باجہ جو بڑے مجیرے کی قسم کا ہوتا ہے اور ڈھول کے ساتھ بجایا جاتا ہے۔ ۲۔ غصّہ۔ جھنجھلاہٹ۔

جھانکا۔ سوراخ۔ رخنہ۔

جھپاکا۔ پھرتی۔ تیزی۔ جلدی

جھرمٹ مارنا۔ کپڑے سے سر سے پاؤں تک جسم کو چھپانا۔

جھمکّڑ۔ مینہ کا بھاری چھینٹا

چمک دمک۔ زور کی روشنی جھم جھماہٹ۔

جھوجرا۔ بال پڑا ہوا برتن۔

جھوک۔ دھچکا یا ہچکولا ہونے میں جو ایک خمیدگی یا لچک کی سی صورت پیدا ہوتی ہے۔ جھکنا

کے آگے آگے چلتے ہیں بیسوں
کے محل کا دربان مجازاً سپاہی۔
چوبالا۔ ایک قسم کی سواری جسے
کہار اٹھاتے ہیں۔ اور اکثر
چوپہلا کہتے ہیں
چوٹوں پر پیاز کتری جانا
مجازاً فریب کھانا۔ چوٹ لگنا۔
چور جائے کہ اندھیاری
مطلب یہ کہ ابھی موقع نکلنے کی ہے
یا ابھی موقع پاکر پھر بدی کرتا ہے۔
چونگ ہونا۔ تلوار کے خاص
قسم کے وار سے مارا جانا۔

چوکی بھرنا۔ اپنی اپنی باری سے
چوکی پہرا دینا۔ ۲۔ ایک قسم کی نذر و نیاز۔
چھوٹتے ہی گال کاٹنا۔ ابتدائے
کار ہی میں نقصان پہونچانا۔
چھانہہ۔ سایہ۔ چھاؤں۔
چھبڑا۔ ٹوکرا۔ جھوا۔
چھپاؤ۔ پردہ۔
چھچھند۔ چال۔ فریب مکر۔ حیلہ۔
چھڑا۔ اکیلا۔ تنہا۔
چھڑیاں۔ ایک میلہ جو مدار کی
چھڑیوں کے نام سے مشہور ہے۔
چھلا۔ کیچڑ۔

چھلاوا۔ اگیا بیتال۔ غول بیابانی
چھل بل۔ شوخی۔ طراری۔
چالاکی۔ حیلہ گری۔
چھلنا۔ فریب دینا۔
چھوپنا۔ مٹی گارا وغیرہ دیوار
پر تھوپنا۔
چیت۔ بڑے قسم کا سانپ
جو اژدہے کے قریب ہوتا ہے
چیتنا۔ ہوشیار ہونا۔
چیرہ بند۔ وہ بازاری عورت
جس کی نتھ نہ اتری ہو۔
چیں مانی۔ ہار مانی۔

حائے حطی

حال۔ طاقت زور۔ صوفیانہ وجد
جو کسی نغمہ وغیرہ سے ہو۔
حال حال چلنا۔ آہستہ آہستہ
چلنا۔
حائط۔ دیوار۔
حبذا۔ ایک کلمہ تحسین۔
حبس دم۔ فقیروں اور جوگیوں
کا ایک عمل۔ جسے پرانایام بھی
کہتے ہیں۔
حتی الباب۔ دروازے تک
حدیقہ۔ باغ۔

حرکت مذبوحی۔ ذبح کیے ہوئے
جانور کی تڑپ۔ چونکہ یہ حرکت آخری
اور ناپائدار ہوتی ہے اسلیے مجازاً اسکے
یہ معنی لیے جاتے ہیں کہ کسی کام کے
تمام ہونے پر حالت اضطرار میں
کچھ ایسے کام کرے کہ جن سے
فائدہ متصور نہ ہو۔
حسن عمل۔ اچھے کام۔
حصیر۔ بوریا۔
حضرت۔ درگاہ۔ آستانہ۔ بارگاہ۔
حظیرہ۔ قبرستان جسکے چار طرف چاردیواری

قبرستان جسمیں کچھ درخت وغیرہ لگے ہوں۔
حلیم۔ ایک قسم کا کھچڑا۔
حمل۔ ایک برج آسمانی کا نام
کہ جب آفتاب اس میں داخل ہوتا ہے
تو وہی دن نوروز کا ہوتا ہے۔
حواس مختل۔ دماغی خلل۔
حواصل۔ ایک پرند جو اکثر دریاؤں
وغیرہ کے کنارے پر پایا جاتا ہے۔
حور بعد الکور۔ نقصان بعد
افزونی۔ مجازاً دشواری بعد آسانی
حیدرآباد۔ لکھنؤ کے ایک محلہ کا نام

دست بیچ۔ بکا ہوا۔ یا بکنے کی فکر میں ہونا۔

دست و بغل ملا ہوا۔ ایک دوسرے کی بغل میں ہاتھ ڈالے ہوئے۔

دست و پا گم کرنا۔ گھبرا جانا۔

دریاچہ۔ چھوٹا دریا۔ بڑا حوض۔

دریائے لنگردار۔ وہ دریا جسکا پانی ٹھہرا ہوا ہو۔

دکھنا۔ دکھائی دینا۔

دل۔ ہوائی ضخامت۔ بھیڑ۔ انبوہ

دل جا بجا ہونا۔ مجازاً مضطرب ہونا

دل مردہ۔ وہ شخص جس کا دل مر گیا ہو۔ رنجیدہ۔ ملول۔ غمگین۔

دل شب۔ نصف شب۔

دل خواہ۔ دلپسند۔

دم لابہ۔ تملق۔ چاپلوسی۔ دم ہلانا۔

دم بلب آنا۔ بے دم ہونا۔

دندان مزد۔ فقیروں وغیرہ کو کھانا کھلانے کے بعد کچھ نقد بطور خیرات دینا

دند مچانا۔ شور مچانا۔

دوآبہ۔ وہ جگہ جہاں دو دریا ہوں یا دو دریا کے بیچ کی زمین۔

دواب۔ چوپائے۔

دوار۔ سر میں چکر آنے کا مرض۔

دوڑ دھپاڑ۔ دوڑ دھوپ۔

دوس۔ الزام۔ قصور۔

دوکان تختہ کرنا۔ دکان بند کرنا

دول لگنا۔ آگ لگنا۔ درختوں کی رگڑ سے بنوں اور جنگلوں میں آگ لگنا۔ پہاڑ وغیرہ میں جو آگ لگاتے ہیں کہ وہ اور نمو پائے۔

دہا۔ محرم کا عشرہ۔

دہنا۔ دوڑ پڑنا۔ ڈھل پڑنا۔

دہانہ۔ منہ۔ دریا کے گرنے یا ختم ہونے کی جگہ۔ مشک وغیرہ کا منہ۔

دہ گھنا۔ ہمت ہارنا۔ صبر کر بیٹھنا۔ کوشش کر کے بیٹھ رہنا۔

دہ دلہ۔ کنایتاً متلون مزاج۔

دہڑ دہڑ جلنا۔ شعلہ زنی کے ساتھ جلنا۔

دہم۔ دم بخود۔ گم سم۔

دھمال۔ قلندر فقیروں کی اچھل کود۔ قلندروں کا ایک خاص وضع کے ساتھ کودنا۔ شور و غل۔

دھما چوکڑی۔ غل شور کرنا۔ قلندروں کا آگ میں کودنا۔

دھولانا۔ چیتیانا۔

دھیر بندھنا۔ آس بندھنا۔ امید ہونا۔

دھیری ہے لبے دھیری ہے۔ لڑکے پتنگ بازی میں شکست دینے والے کیلیے یہ لفظ کہتے ہیں۔

دھینگ۔ ہٹا کٹا۔ مشٹنڈا۔

دھینور۔ دھیمر۔ کہاروں کی ایک قسم

دیا۔ چراغ۔

دیر خوابی۔ دیر تک سونا۔

دیوث۔ وہ شخص جو اپنی بیوی سے کسب کرائے۔ بھڑوا۔

دیہی۔ جسم۔ بدن۔

[illegible] انگریزی میں [illegible] میں بھوتوں کی قسم کی ایک [illegible] جنیر۔ بدنظر۔

[illegible] بچہ۔ بچھڑ۔

دال ہندی

ڈبور ہونا۔ فریفتہ ہونا۔

ڈول۔ ڈھنگ۔ اسلوب۔ طور۔ طریقہ

ڈھنڈھ۔ ویرانہ۔ کھنڈر۔

ڈھیر۔ مزار۔ قبر۔

ڈھینڈس۔ کدو کی قسم کی ایک ترکاری۔ کنایتاً عضو مخصوص۔

ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا۔ جدا طور طریقہ ایجاد کرنا۔

دامن میں کاڑھا جاتا ہے ۔ یا
حلقہ دار لکیر کاڑھتے ہیں ۔ یا
کوئی بنا ہوا تاگا لگاتے ہیں ۔
زنجیری ۔ بستۂ زنجیر ۔ دیوانہ ۔

زنخ زن ۔ شرمندہ ۔
زندیق ۔ کافر ۔ مرتد ۔
زوّار ۔ زائر کی جمع ۔
زوریں کش ۔ جو چیز زور کے
ساتھ کھینچی جائے ۔
زہ گریباں ۔ گریبان کا دور
گریبان پر ٹکی ہوئی ڈوری ۔
زیادہ سری ۔ خود پسندی غرور

سین مہملہ

سارا ۔ اعتبار ۔ بھروسہ ۔ ساکھ ۔
ساکھا کرنا ۔ ساکھا کرنا چند
آدمیوں کا یکدل اور متفق ہو کر
کوئی کام کرنا ۔ کوئی بڑا کام کرنا
سال ۔ سالنا کا حاصل مصدر
رنج ۔ تکلیف ۔
سالنا ۔ لکڑی میں چھید کرنا
مجازاً تکلیف دینا ۔
سام ۔ رستم کے دادا کا نام ۔
سام ابرص ۔ چھپکلی ۔
سانجھ ۔ شام ۔
سانسا ۔ فکر ۔ اندیشہ ۔ خوف
جھگڑا ۔
سانسنا ۔ شہم کرنا ۔
ساںواں ۔ ایک باریک دانے
کا غلہ ۔
سبز باغ دکھانا ۔ کوئی امید
دلا کر دھوکا دینا ۔
سبز ۔ جنگلی کوا ۔ اور بعض
کے نزدیک ایک دوسری
چڑیا ہے ۔ بعض کا خیال ہے
کہ وہ نیل کنٹھ ہے ۔
سبزہ ۔ ایک پرند کا نام بعض
کے نزدیک ہریل بعض کے
نزدیک ہریوا ۔
سبزۂ بیگانہ ۔ سبزۂ خودرو ۔
سبزی ۔ بھنگ ۔
سبکروحی ۔ لطافت شگفتگی ۔
بے تکلفی ۔ سادہ مزاجی ۔
سب کو چار رہنا ۔ سب کو
دھوکا دینا ۔ سب سے غرور
کے ساتھ پیش آنا ۔
سبھاؤ ۔ عادت ۔ ڈھنگ قاعدہ ۔
ستارہ ۔ ایک آتشبازی ۔
ستارہ ۔ نیک ستارہ ۔
سج ۔ بناؤ ۔ زینت ۔
سجادۂ محرابی ۔ وہ جانماز
جس پر محرابی شکل بنی ہو ۔
سحبان ۔ عرب کے ایک
فاضل کا نام ۔
سحور ۔ سحری کھانا ۔ سرگہی ۔
(سحر گہی) ۔
سخن رس ۔ بات کو سمجھنے والا
سُدھ بسرنا ۔ سُدھ جاتی رہنا
عقل خراب ہو جانا ۔
سراہنا ۔ تعریف کرنا ۔
سرپٹا سینٹھا ۔ سرکڑا پتیا ور ۔
سر جوڑنا ۔ جمع ہونا مشورے
کے لیے اکٹھا ہونا ۔
سر جوڑ کر بیٹھنا ۔ مشورے
کے لیے جمع ہونا ۔
سُرخہ ۔ ایک پرند کا نام ۔
ایک جگہ کا نام ۔
سرڈوب ۔ غرقاب ۔ سر
سے پاؤں تک بھیگا ہوا ۔
سر زدہ آنا ۔ بے طلب
بے اجازت ۔ ناگاہ آنا ۔

پانا کے ساتھ بولا جاتا ہے۔
سنمکھ - مقابل۔ روبرو۔ آمنے سامنے
سواد - سیاہی۔ وہ نقطہ سیاہ جو دل پر ہوتا ہے۔ سواد شہر وہ سیاہی جو کسی باہر سے آنے والے کو قریب شہر نظر آتی ہے اور فضا تاریک سی معلوم ہوتی ہے۔
سوجھنا - انتظام سُجھنا۔
سُور - دلیر۔ بہادر۔
سوس - ایک آبی جانور جسے جونک آبی بھی کہتے ہیں۔
سوسر کا ہو کر آنا - تمرد اور سرکشی پر آمادہ ہو کر آنا۔ پہلے سے بہت زیادہ تیار ہو کر آنا۔

سوسمار - گوہ۔ ایک جانور ہوتا ہے اور زمین کے سوراخوں میں رہتا ہے۔
سوں - قسم کی جگہ بولتے ہیں
سوں کرنا - جان بوجھ کر غافل اور سوتا ہوا بنجانا۔
سنّانا - بے خبر لمبی سانسیں لے لے کر سونا۔
سوکھنا - خشک ہونا۔ مجازاً ڈرنا۔
سوئی کا ناکا - سوئی میں تاگا ڈالنے کی جگہ۔
سہل - بے وقوف۔ بیکار۔ معمولی۔ آسان۔ نرم خو۔
سہو القلم - کتابت کی غلطی۔
سیان - ہوشیاری۔

سیدھیاں سُنانا - سخت کلامی کرنا۔
سیستر - کمان کا وہ فیتہ جس میں تیر رکھ کر پھینکتے ہیں۔
سیلی - بالوں یا سیاہ ریشم کی ڈوری جو ہندو فقیر گلے میں ڈالتے اور اکثر حسین کبھی ہاتھ پر پہنتے یا گلے میں ڈالتے ہیں۔
سیم بندی - چراغاں کہ شمعوں اور چراغوں کو تار میں باندھ کر لٹکایا جائے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیم کے مجازی معنی یہاں تار کے لیے گئے ہیں۔
سیہ کاسہ - کنایتاً ممسک۔ بخیل۔

شین معجمہ

شان - شہد کا چھتّہ۔
شانہ بیں - ایک قسم کے فال دیکھنے والے جو بکرے کی استخوان شانہ بز کے ساتھ مخصوص ہے اسواسطے مجازاً شانہ بیں نام ہوا۔
شانہ سر - ہدہد۔

شب - پوتھ۔
شبگز - ہوام اور وہ کیڑے جو رات کو ستاتے ہیں کھٹمل۔
شبگیر کرنا - آخر شب اور قبل صبح سفر کرنا۔
شتّاہ - (عربی میں شطّاح) بیحیا۔ بے شرم۔ بدچلن عورت۔

شُتُردل - کنایتاً بزدل ڈرپوک۔
شریف مکہ - مکہ کے حکمراں کا خطاب۔
شعبہ - شاخ - اور وہ چیز جو دو شاخوں کے درمیان ہو۔ بفتح گھاٹی پہاڑ وغیرہ کی۔

بال۔ بچہ۔
طفلان تہ بازار۔ آوارہ اور بازاری لڑکے جن کے گھر در نہ ہو۔
طیر نوپر۔ وہ پرند جس کے نئے نئے پر نکلے ہوں۔

عین مہملہ

عالم جان۔ عالمِ ارواح۔
عالم دنیا۔ عناصر اربعہ۔
عالم کون و فساد۔ دنیا۔
عامل۔ کارندہ! اہلکار سرکاری۔
عُبید۔ عُبید زاکانی فارسی کا ایک مشہور شاعر جو آخر میں ظرافت اور ہزل کہنے لگا تھا اور اس کی ایک کتاب موش و گربہ کے متعلق بھی ہے۔
عنبر۔ ایک خوشبو خشک جو کپڑوں پر چھڑکتے ہیں ایک پوڈر جو ہونٹوں میں منہ پہ ملتے ہیں۔
عجول۔ جلد باز۔
عذرا۔ ایک حسینہ کا نام جس پر وامق عاشق تھا۔ ۲۔ دوشیزہ لڑکی۔
عرابہ۔ گاڑی۔
عرض۔ عزت۔ آبرو۔
عشق اللہ عشق ہے۔ آزاد فقیروں کا سلام۔
عصفور۔ چڑیا۔
عقدِ انامل۔ ایک قسم کی مسنون گنتی جو انگلیوں پر گنی جاتی ہے۔
عقلِ اوّل کنایتاً حضرت جبریل۔
عقدۂ لاینحل۔ وہ گتھی جو سلجھ نہ سکے۔
عَلف۔ گھاس۔
علی الدّوام۔ ہمیشہ۔
عُمدہ۔ اعلیٰ عہدہ دار۔ معتمد۔
عور۔ ننگا۔
عُہدے سے برآنا۔ کسی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا اور اُس کو انجام تک پہونچانا۔

غین معجمہ

غربال کرنا۔ چھاننا۔
غضبناک۔ غصہ ور جھلے مزاج والا۔
غضنفر۔ شیر۔
غُل۔ طوق۔
غنجوارک۔ بگلا۔
غنچہ پیشانی۔ بدماغ ترش رو۔
غنچہ خاطر۔ افسردہ دل تنگدل۔

حرف فا

فتراک۔ شکار بند۔ وہ تسمہ جو زین کے ادھر اُدھر شکار یا اور سامان کے باندھنے کے لیے لگا ہوتا ہے۔
فسانۂ اصحابِ فیل۔ ان لوگوں کا قصہ۔ اصحابِ فیل وہ لوگ جنھوں

کاکا۔ باپ کا چھوٹا بھائی
چچا۔ بڑا بھائی۔
کال۔ قحط
کالا چور۔ زبردست چور۔
نامی چور۔
کالے بال۔ موئے زہار۔
کلاٹا سا نکل جانا۔
کھٹکا جاتا رہنا۔
کانس۔ ایک گھاس جس سے
بان وغیرہ بٹے جاتے ہیں۔
کانِ طلق۔ ابرک کی کان۔
کان ہونا۔ ہوشیار ہو جانا۔
متنبہ ہو جانا۔
کانوں میں اُچھبے
باندھ کر گھس جانا گالی
کے مقام پر مستعمل ہے اور
اس کے ساتھ ایک غیر مہذب
جملہ بھی ہے۔
کاوش۔ محنت خلش۔
کاوکاو۔ جگر۔
[illegible] گندھک۔
[illegible] پیٹ پھاڑنے والا۔
[illegible] بندر۔
[illegible] تحریر۔
[illegible] کتے پالنے والا۔

کٹکھنا۔ کاٹنے والا۔
کٹ مُتّا۔ سخت مست۔ یہ
لفظ کٹ مُلّا کے طرز پر ہے۔
کٹیل۔ کاٹنے والا۔
کجدار و مریز۔ ناممکن کام۔
کجلی بن۔ وہ جنگل جس میں
ہاتھی رہتے ہوں۔
کچی نرد۔ وہ نرد جو چوپسی کے
خانوں میں گھوم کر ہنوز اپنے
اصلی گھر تک نہ پہونچی ہو اور
اس کے پٹنے کا ہنوز اندیشہ ہو
کُد۔ کب۔
کراڑا۔ دریا کا کنارا۔ دریا
کے کنارے کا بلند ٹیلا۔
کر بندھنا۔ کسی کام کا
سر پڑنا کہ خواہ مخواہ وہ کرنا
ہی پڑے۔
کرجانا۔ کسی دھاردار آلہ
کی دھار گر جانا۔
کرس۔ خراب رس والا۔
کریل۔ ایک خاردار جھاڑی
درخت کا نام۔
کسالا۔ محنت مشقت۔ تکلیف۔
کسکسا۔ کرکرا۔
کسی کا پروانہ ہونا۔

کسی چیز کی محبت میں اُس کا
خواہشمند ہونا۔
کشف۔ کچھوا۔
کشتی پاک ہونا۔ کشتی
ختم ہو جانا۔
کشتی لگ جانا۔ کشتی بند ہو
جانا۔ جوڑ بدی جانا۔
کفتار۔ ایک جانور جو بجّو
کو کھا جاتا ہے۔
کفل۔ سُرین۔ چوتڑ۔
کل کنجا۔ جس کے سر
میں گنج ہو۔
کلال۔ کمھار۔ کلوار۔
کلبہ۔ چھوٹا سا تنگ و تاریک
گھر۔
کل مکل۔ بے چینی کشمکش
شور و غوغا۔
کلول۔ مصیبت۔ پریشانی۔
کلید پیچ۔ رقعہ یا خط کو
اس طرح پلیٹتے ہیں کہ وہ
بصورت کلید معلوم ہو۔
کمان پاک۔ بھاری اور
زوردار کمان۔
کما ینبغی۔ جیسا چاہیئے۔
کما حقہ۔

گرگ آشتی۔ وہ صلح جو دکھاوے کی ہو اور در اصل دل میں بغض و نفاق ہو۔
گریانی۔ رونا۔
گریبان کوہ۔ پہاڑ کا درمیانی حصہ جس کو کمر کوہ بھی کہتے ہیں۔
گڑھی۔ چھوٹا سا قلعہ۔
کلنگ۔ ایک لمبی ٹانگوں والا پرند۔
گلابی۔ ایک ظرف جس میں گلاب یا شراب وغیرہ بھرتے ہیں۔
گل اشرفی۔ ایک پھول جو زرد رنگ ہوتا ہے۔
گل افشاں کرنا۔ پھول بکھیرنا
گلال۔ ایک سرخ پوڈر جو ہولی میں اہل ہنود ایک دوسرے پر ڈالتے اور ملتے ہیں۔
گل تریاک۔ پوستے کا پھول۔
گلا توڑنا۔ گلا پھاڑنا کی جگہ چلانا۔
گلچھڑی۔ گتھی۔ گرہ۔
گلزمین۔ سرسبز و شاداب زمین
گلستانہ۔ کسی جگہ کا نام۔
گنجائی۔ گنجایش۔
گور۔ گورخر جو ایک جنگلی جانور ہوتا ہے۔
گورگڑھا۔ کفن دفن تجہیز و تکفین۔
گوزن۔ باڑھا۔
گوں۔ قابل۔ لائق۔ کام کا۔
گھتیا۔ وہ شخص جو گھات میں لگا رہے۔
گھر۔ خانے جو بساط اور پچیسی وغیرہ میں ہوتے ہیں۔
گھر گیا۔ خانہ برباد۔
گھر ہونا۔ گھر آباد ہونا۔
گھنگی۔ بھنگے یا مچھر کی قسم کا ایک اڑنے اور کاٹنے والا کیڑا۔ اس کو کنٹکی بھی کہتے ہیں۔ بھولی۔ دبلی ڈرپوک۔
گھگھیانا۔ عاجزی کرنا۔ گڑگڑانا۔
گھوپا۔ ایک قسم کا جھونپڑا جو پھونس وغیرہ سے باغوں اور کھیتوں میں بناتے ہیں۔ کٹی۔
گئی کرنا۔ درگزر کرنا۔
گیدی۔ مکار۔ فیلیا۔ لالچی۔ بے غیرت۔ فسادی۔ جھگڑالو۔

حرف لام

لاکھی۔ لاکھ کے رنگ کا۔
لاگا۔ لگا۔
لاگو۔ آرزومند۔ مشتاق۔ ۲۔ پیچھے پڑنے والا دشمن۔ ۳۔ وہ جانور جسے خون کا چسکا پڑ گیا ہو۔
لاگ لپٹ۔ شغلہ۔
لب چش۔ ذائقہ وغیرہ معلوم کرنے کے لیے کسی چیز کو چکھنا۔
لب گزی۔ ہونٹ چبانا۔ غصے۔ شرم۔ حیا۔ یا کسی امر کے افسوس یا ممانعت کے لیے۔
لٹ جانا۔ کمزور ہو جانا۔ دبلا لاغر ہو جانا۔
لُجّہ۔ دریا کا دھارا۔
لڑاکا۔ فسادی۔ لڑاک۔
لساع۔ ڈنک مارنے والے کیڑے مکوڑے۔

اطلاع عام
تمام علوم و فنون کی
کتابیں نہایت
نول کشور